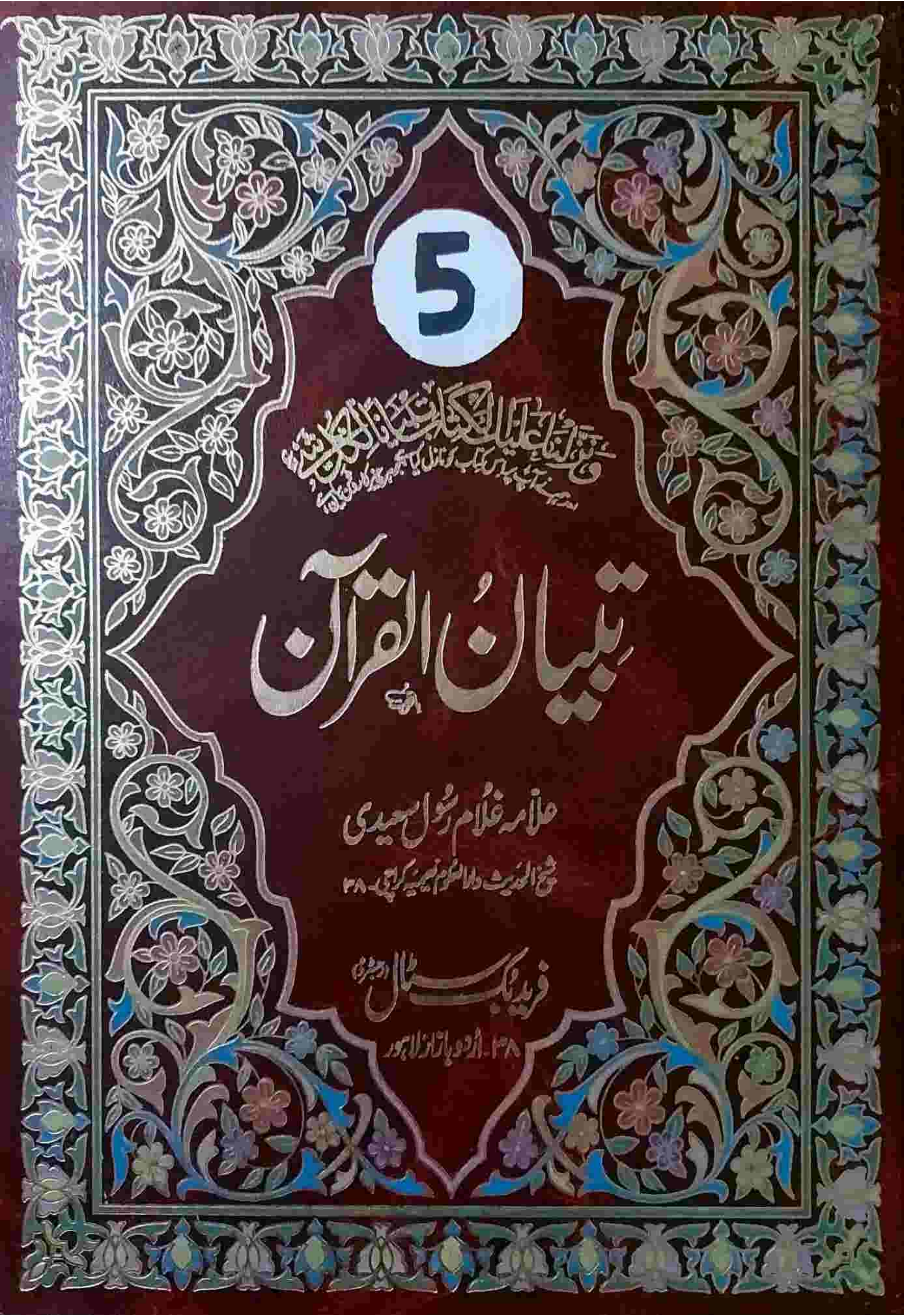
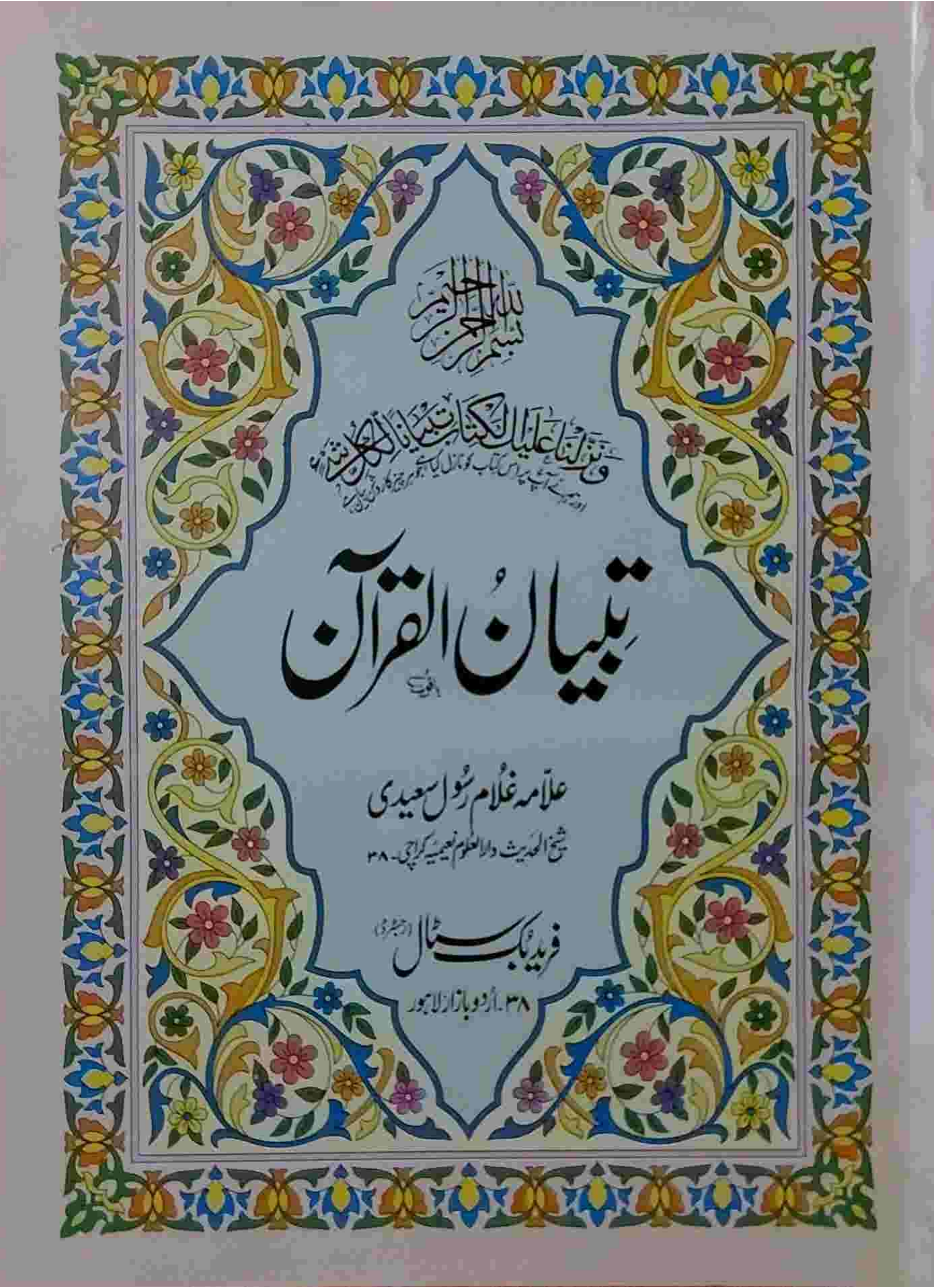
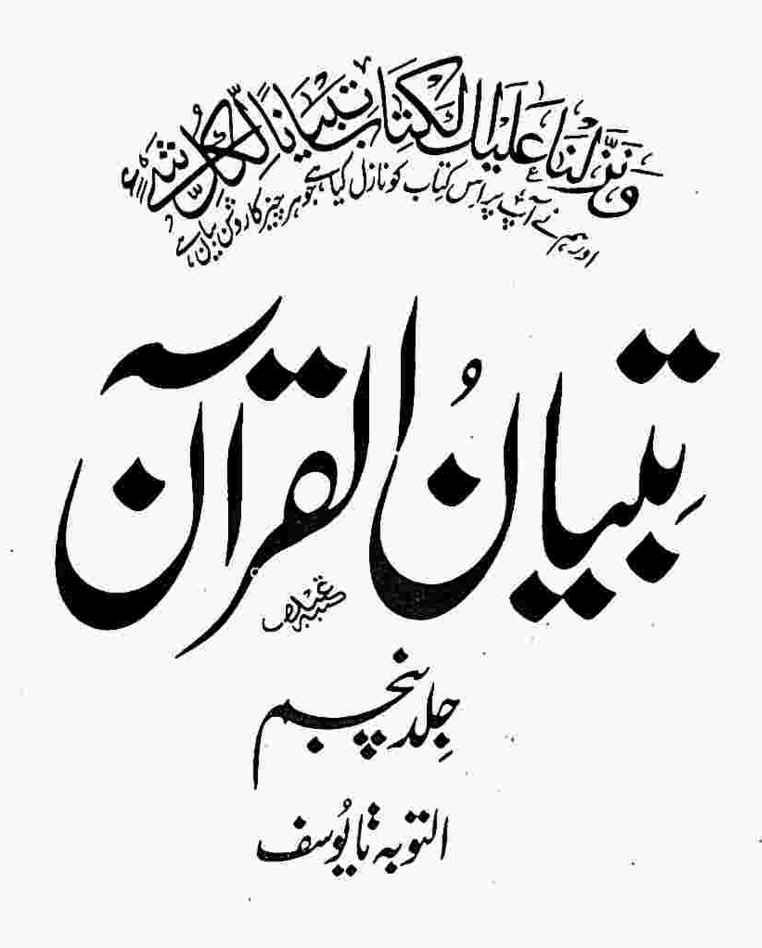

5
وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ
ترجمہ: اور ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل کی جو ہر چیز کا روشن بیان ہے
تبیان القرآن
علامہ غلام رسول سعیدی
شیخ الحدیث دارالعلوم نعیمیہ کراچی-۳۸
فرید بک سٹال (رجسٹرڈ)
۳۸- اردو بازار لاہور


بسم اللہ الرحمن الرحیم
ونزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شیء
تبیان القرآن
علامہ غلام رسول سعیدی
شیخ الحدیث دارالعلوم نعیمیہ کراچی۔ ۳۸
فرید بک سٹال (رجسٹرڈ)
۳۸۔ اردو بازار لاہور



علامہ غلام رسول سعیدی

شیخ الحدیث دار العلوم نعیمیہ کراچی۔ ۳۸

ناشر

فرید بک سٹال، ۳۸۔ اردو بازار لاہور۔ ۲



ISBN 969-563-014-6



تصحیح : مولانا حافظ محمد ابراہیم فیضی فاضل علومِ شرقیہ
مطبع : رومی پبلیکیشنز اینڈ پرنٹرز لاہور
الطبع الاوّل : ذوالقعدۃ 1421ھ/ فروری 2000ء
الطبع السادس : صفر 1429ھ/ فروری 2008ء

Farid Book Stall®
Phone No:092-42-7312173-7123435
Fax No.092-42-7224899
Email:info@faridbookstall.com
Visit us at:www.faridbookstall.com

فرید بک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸۔ اُردو بازار لاہور
فون نمبر ۰۹۲۔۴۲۔۷۳۱۲۱۷۳۔۷۱۲۳۴۳۵
فیکس نمبر ۰۹۲۔۴۲۔۷۲۲۴۸۹۹
ای۔میل : info@faridbookstall.com
ویب سائٹ : www.faridbookstall.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

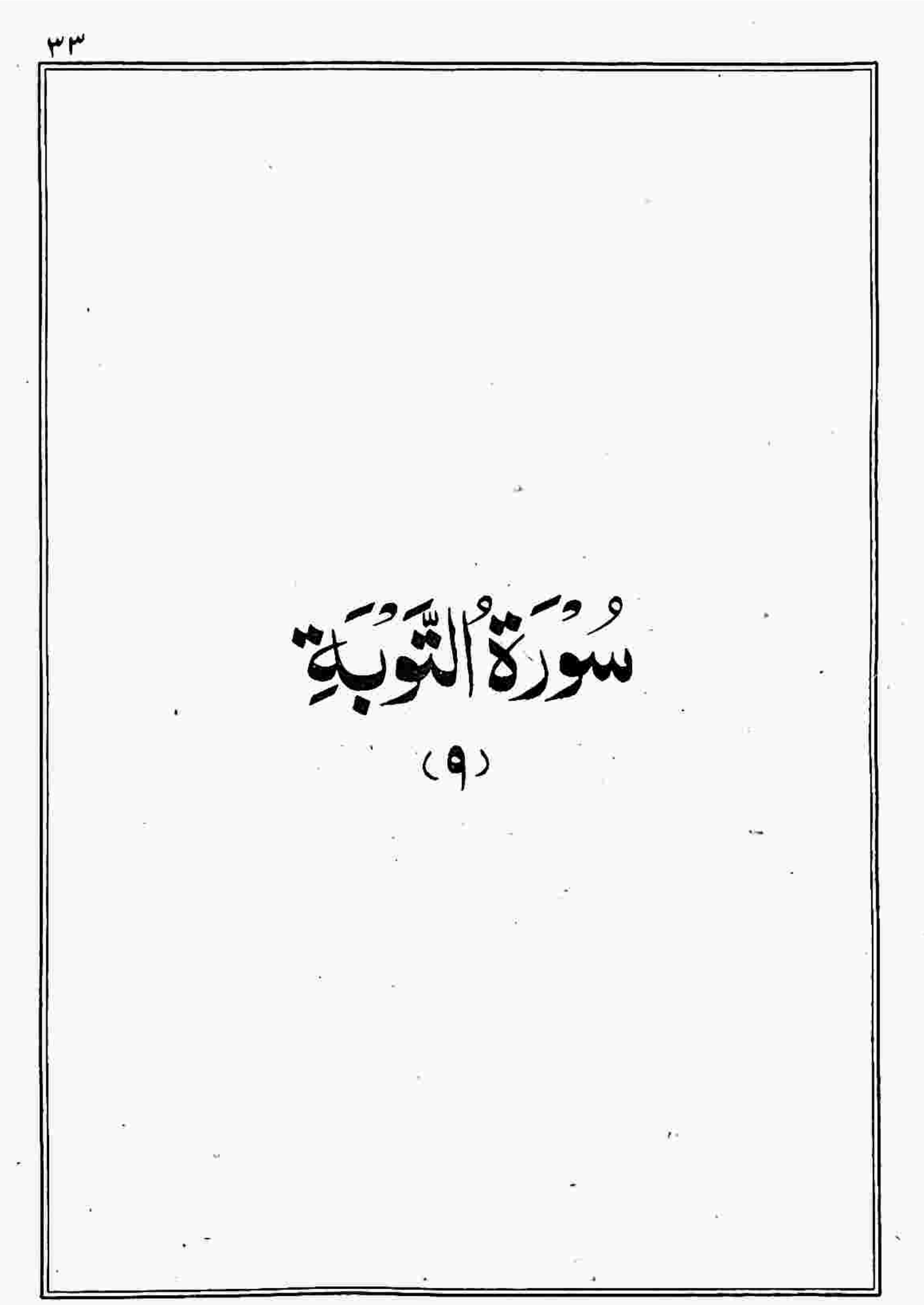
فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ رب العالمین الذی استغنی فی حمدہ عن الحامدین وانزل القرآن تبیانا لکل شیٔ عند العارفین والصلوۃ والسلام علی سیدنا محمد الذی استغنی بصلوۃ اللہ عن صلوۃ المصلین واختص بارضاء رب العالمین الذی بلغ الینا ما انزل علیہ من القراٰن وبین لنا ما نزل علیہ بتبیان وکان خلقہ القراٰن وتحدی بالفرقان وعجز عن معارضتہ الانس والجان وھو خلیل اللہ حبیب الرحمٰن لواءہ فوق کل لواء یوم الدین قائد الانبیاء والمرسلین امام الاولین والاٰخرین شفیع الصالحین والمذنبین واختص بتنصیص المغفرۃ لہ فی کتاب مبین وعلی اٰلہ الطیبین الطاھرین وعلی اصحابہ الکاملین الراشدین وازواجہ الطاھرات امھات المؤمنین وعلی سائر اولیاء امتہ وعلماء ملتہ اجمعین۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ واشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ۔ اعوذ باللہ من شرور نفسی ومن سیئات اعمالی من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ اللّٰھم ارنی الحق حقا وارزقنی اتباعہ اللّٰھم ارنی الباطل باطلا وارزقنی اجتنابہ اللّٰھم اجعلنی فی تبیان القراٰن علی صراط مستقیم وثبتنی فیہ علی منھج قویم واعصمنی عن الخطأ والزلل فی تحریرہ واحفظنی من شر الحاسدین وزیغ المعاندین فی تقریرہ اللّٰھم الق فی قلبی اسرار القراٰن واشرح صدری لمعانی الفرقان ومتعنی بفیوض القراٰن ونورنی بانوار الفرقان واسعدنی لتبیان القراٰن، رب زدنی علما رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا۔ اللّٰھم اجعلہ خالصا لوجھک ومقبولا عندک وعند رسولک واجعلہ شائعا ومستفیضا ومفیضا ومرغوبا فی اطراف العالمین الی یوم الدین واجعلہ لی ذریعۃ للمغفرۃ ووسیلۃ للنجاۃ وصدقۃ جاریۃ الی یوم القیامۃ وارزقنی زیارۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الدنیا وشفاعتہ فی الاخرۃ واحینی علی الاسلام بالسلامۃ وامتنی علی الایمان بالکرامۃ اللّٰھم انت ربی لا الٰہ الا انت خلقتنی وانا عبدک وانا علی عھدک ووعدک ما استطعت اعوذ بک من شر ما صنعت ابوء لک بنعمتک علی وابوء لک بذنبی فاغفر لی فانہ لا یغفر الذنوب الا انت اٰمین یا رب العالمین۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لئے مخصوص ہیں جو ہر تعریف کرنے والے کی تعریف سے مستغنی ہے جس نے قرآن مجید نازل کیا جو عارفین کے حق میں ہر چیز کا روشن بیان ہے اور صلوٰۃ وسلام کا سیدنا محمد ﷺ پر نزول ہو جو خود اللہ تعالیٰ کے صلوٰۃ نازل کرنے کی وجہ سے ہر صلوٰۃ بھیجنے والے کی صلوٰۃ سے مستغنی ہیں۔ جن کی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ رب العالمین ان کو راضی کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان پر جو قرآن نازل کیا اس کو انہوں نے ہم تک پہنچایا اور جو کچھ ان پر نازل ہوا اس کا روشن بیان انہوں نے ہمیں سمجھایا۔ ان کے اوصاف سراپا قرآن ہیں۔ انہوں نے قرآن مجید کی مثال لانے کا چیلنج کیا اور تمام جن اور انسان اس کی مثال لانے سے عاجز رہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے خلیل اور محبوب ہیں قیامت کے دن ان کا جھنڈا ہر جھنڈے سے بلند ہو گا۔ وہ نبیوں اور رسولوں کے قائد ہیں اولین اور آخرین کے امام ہیں۔ تمام نیکوکاروں اور گنہ گاروں کی شفاعت کرنے والے ہیں۔ یہ ان کی خصوصیت ہے کہ قرآن مجید میں صرف ان کی مغفرت کے اعلان کی تصریح کی گئی ہے اور ان کی پاکیزہ آل' ان کے کامل اور ہادی اصحاب اور ان کی ازواج مطہرات امہات المومنین اور ان کی امت کے تمام علماء اور اولیاء پر بھی صلوٰۃ وسلام کا نزول ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں وہ واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ سیدنا محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں اپنے نفس کے شر اور بداعمالیوں سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔ جس کو اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جس کو وہ گمراہی پر چھوڑ دے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ اے اللہ! مجھ پر حق واضح کر اور مجھے اس کی اتباع عطا فرما اور مجھ پر باطل کو واضح کر اور مجھے اس سے اجتناب عطا فرما۔ اے اللہ! مجھے "تبیان القرآن" کی تصنیف میں صراط مستقیم پر برقرار رکھ اور مجھے اس میں معتدل مسلک پر ثابت قدم رکھ۔ مجھے اس کی تحریر میں غلطیوں اور لغزشوں سے بچا اور مجھے اس کی تقریر میں حاسدین کے شر اور معاندین کی تحریف سے محفوظ رکھ۔ اے اللہ! میرے دل میں قرآن کے اسرار کا القاء کر اور میرے سینہ کو قرآن کے معانی کے لئے کھول دے' مجھے قرآن مجید کے فیوض سے بہرہ مند فرما۔ قرآن مجید کے انوار سے میرے قلب کی تاریکیوں کو منور فرما۔ مجھے "تبیان القرآن" کی تصنیف کی سعادت عطا فرما۔ اے میرے رب! میرے علم کو زیادہ کر' اے میرے رب! تو مجھے (جہاں بھی داخل فرمائے) پسندیدہ طریقے سے داخل فرما اور مجھے (جہاں سے بھی باہر لائے) پسندیدہ طریقہ سے باہر لا' اور مجھے اپنی طرف سے وہ غلبہ عطا فرما جو (میرے لئے) مددگار ہو۔ اے اللہ! اس تصنیف کو صرف اپنی رضا کے لئے مقدر کر دے' اور اس کو اپنی اور اپنے رسول ﷺ کی بارگاہ میں مقبول کر دے اس کو قیامت تک تمام دنیا میں مشہور' مقبول' محبوب اور اثر آفریں بنا دے' اس کو میری مغفرت کا ذریعہ' میری نجات کا وسیلہ اور قیامت تک کے لئے صدقہ جاریہ کر دے۔ مجھے دنیا میں نبی ﷺ کی زیارت اور قیامت میں آپ کی شفاعت سے بہرہ مند کر' مجھے سلامتی کے ساتھ اسلام پر زندہ رکھ اور عزت کی موت عطا فرما' اے اللہ! تو میرا رب ہے تیرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں تو نے مجھے پیدا کیا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں اور میں تجھ سے کئے ہوئے وعدہ اور عہد پر اپنی طاقت کے مطابق قائم ہوں۔ میں اپنی بداعمالیوں کے شر سے تیرے پناہ میں آتا ہوں۔ تیرے مجھ پر جو انعامات ہیں میں ان کا اقرار کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ مجھے معاف فرما کیونکہ تیرے سوا اور کوئی گناہوں کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔ آمین یارب العالمین!



سُورَةُ التَّوْبَةِ

(٩)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

سورۃ التوبہ

سورۃ التوبہ کے اسماء اور وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام البراءۃ ہے، اس کے علاوہ اس کے اور بھی اسماء ہیں۔ التوبہ، المقشقشۃ، البحوث، المبعثرۃ، المنقرۃ، المثیرۃ، الحافرۃ، المخزیہ، الفاضحہ، المنکلہ، المشردۃ، المدمدۃ اور سورۃ العذاب۔

(انوار التنزیل واسرار التاویل ج ٣ ص ١٢٦، مع الکازرونی، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ١٤١٦ھ)

اس سورت کا نام التوبہ اس لیے ہے کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کی توبہ قبول کرنے کا ذکر فرمایا ہے، خصوصاً حضرت کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن الربیع رضی اللہ عنہم۔ ان تین صحابہ کی توبہ قبول کرنے کا ذکر فرمایا ہے:

وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (التوبہ: ١١٨)

اور ان تین شخصوں (کی توبہ قبول فرمائی) جن کو مؤخر کیا گیا تھا، حتیٰ کہ جب زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور خود وہ بھی اپنے آپ سے تنگ آ گئے اور ان کو یقین ہو گیا کہ اللہ کے سوا ان کی کوئی جائے پناہ نہیں ہے، پھر ان کی (بھی) توبہ قبول فرمائی تاکہ وہ (ہمیشہ) تائب رہیں، بے شک اللہ ہی بہت توبہ قبول کرنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

اور اس سورت کا نام البراءۃ ہے کیونکہ البراءۃ کا معنی کسی سے بری اور بیزار ہونا ہے اور اس سورت کے شروع میں ہی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین سے بری اور بیزار ہیں:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (التوبہ: ١)

اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کی طرف بیزاری کا اعلان ہے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا۔

اور اس سورت کا نام المقشقشۃ ہے کیونکہ تقشقش کا لغوی معنی ہے کسی شخص کو خارش اور چیچک کی بیماری سے نجات اور شفا دینا اور یہاں اس سے مراد ہے مسلمانوں کو منافقین سے نجات دینا، کیونکہ اس سورت میں منافقین کی سزا کے متعلق ایک

آیت نازل ہوئی جس کے نتیجہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھتیس منافقوں کو نام لے لے کر مسجد نبوی سے نکال دیا۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۝(التوبہ: ۱۰۱)

اور تمہارے گرد بعض دیہاتی منافق ہیں' اور مدینہ والوں میں سے بعض لوگ نفاق کے خوگر اور عادی ہیں' آپ انہیں (از خود) نہیں جانتے' انہیں ہم جانتے ہیں' عنقریب ہم انہیں دو عذاب دیں گے' پھر وہ بہت بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اخروی عذاب عظیم سے قبل منافقین کم از کم دو بار ضرور عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے' ایک عذاب قبر' دوسرا وہ عذاب جو اسی دنیاوی زندگی میں پہنچ کر رہے گا' مثلاً (حضرت) ابن عباس کی ایک روایت کے موافق حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جمعہ کے روز منبر پر کھڑے ہو کر تقریباً چھتیس آدمیوں کو نام بنام پکار کر فرمایا: اخرج فانک منافق یعنی تو منافق ہے مسجد سے نکل جا۔ یہ رسوائی ایک قسم عذاب کی تھی۔

اور اس کا نام البحوث ہے کیونکہ اس میں منافقین کے احوال سے بحث کی گئی ہے اور اسی وجہ سے اس کا نام المنقرة ہے کیونکہ تنقیر کا معنی لغت میں بحث اور تفتیش ہے' اور اس کا نام المبعثرة اور المثیرة ہے' کیونکہ ان کا لغت میں معنی کسی مخفی چیز کو ظاہر کرنا ہے اور اس سورت میں ان کے مخفی نفاق کو ظاہر کیا گیا ہے' اور الحافرہ کا مجازی معنی بحث ہے' اور اس سورت کا نام المخزیہ اور الفاضحہ ہے' کیونکہ ان کا معنی رسوا کرنا ہے اور جب ان کے نفاق کا پردہ چاک کیا گیا تو وہ رسوا ہو گئے' اور المنکلة' المشردة اور المدمدة کا معنی ہے ہلاک کرنے والی اور چونکہ منافقین رسوائی کے عذاب سے ہلاک ہو گئے تھے اور اس سورت میں ان کے اس عذاب کا ذکر ہے اس لیے اس سورت کے یہ اسماء ہیں' اور اسی وجہ سے اس سورت کا نام سورة العذاب بھی ہے۔

(عنایۃ القاضی ج ۴ ص ۲۹۶-۲۹۵' موضحاً' مطبوعہ دار صادر بیروت)

سورة التوبہ کے اسماء کے متعلق احادیث

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ بیان فرماتے ہیں:

امام طبرانی نے المعجم الاوسط میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: منافق سورہ ہود' سورہ براءة' یٰسین' الدخان اور عم یتساءلون کو حفظ نہیں کر سکتا۔

امام ابو عبید' امام سعید بن منصور' امام ابوالشیخ اور امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابو عطیہ الہمدانی سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ سورہ براءة کو سیکھو اور اپنی خواتین کو سورة النور سکھاؤ۔

امام ابن ابی شیبہ' امام طبرانی نے المعجم الاوسط میں' امام حاکم نے اور امام ابن مردویہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا جس سورت کو تم سورہ توبہ کہتے ہو اس کا نام سورة العذاب ہے۔

امام ابو عبید' امام ابن المنذر' امام ابوالشیخ اور امام ابن مردویہ نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا سورة التوبہ؟ انہوں نے کہا توبہ! بلکہ یہ الفاضحہ ہے۔

امام ابوالشیخ اور امام ابن مردویہ' زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں' ایک شخص نے حضرت عبداللہ سے کہا سورہ توبہ؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا سورہ توبہ کون سی سورت ہے؟ انہوں نے کہا سورة البراءة' حضرت ابن عمر نے فرمایا: کیا لوگوں کو یہی کچھ سکھایا گیا ہے' ہم اس سورت کو المقشقشہ کہتے تھے۔

امام ابوالشیخ نے عبداللہ بن عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سورۃ البراءۃ کو سورۃ المنقرہ کہا جاتا تھا' کیونکہ اس میں مشرکین کے دلوں کی باتوں سے بحث کی گئی ہے۔

امام ابن مردویہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ سورہ توبہ کو سورۃ العذاب کہتے تھے۔

امام ابن المنذر امام محمد بن اسحاق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ سورۃ البراءۃ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں المعبرۃ کہا جاتا تھا' کیونکہ اس نے لوگوں کی پوشیدہ باتوں کو منکشف کر دیا تھا۔

(الدر المنثور ج ۴ ص ۱۲۱-۱۲۰' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۴ھ)

سورۃ التوبہ اور سورۃ الانفال کی باہمی مناسبت

سورۃ التوبہ اور سورۃ الانفال میں قوی مشابہت ہے' کیونکہ ان دونوں سورتوں میں اسلامی ملک کے داخلی اور خارجی احکام بیان کیے گئے ہیں' اور صلح اور جنگ کے اصول اور قواعد بیان کیے گئے ہیں اور مومنین صادقین اور کفار اور منافقین کے احوال بیان کیے گئے ہیں' اور دیگر ممالک کے ساتھ معاہدوں اور مواثیق کا بیان کیا گیا ہے' البتہ سورۃ الانفال میں غیر مسلموں کے ساتھ کیے ہوئے معاہدوں کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے اور سورۃ التوبہ میں کفار کی طرف سے عہد شکنی کی ابتدا کی صورت میں ان معاہدوں کو توڑنے کا حکم دیا ہے بلکہ اس سورت کی ابتدا ہی اس حکم سے ہوتی ہے' اور ان دونوں سورتوں میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ مشرکین کو مسجد حرام میں آنے سے روکا جائے اور ان دونوں سورتوں میں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور مشرکین اور اہل کتاب سے جہاد اور قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور منافقین کی سازشوں سے خبردار فرمایا ہے' اسی قوی مشابہت کی وجہ سے سورۃ التوبہ سورۃ الانفال کے تتمہ کے حکم میں ہے لیکن درحقیقت یہ دونوں مستقل الگ الگ سورتیں ہیں اور سورۃ التوبہ' سورۃ الانفال کا جز نہیں ہے' کیونکہ سورۃ التوبہ کے بہ کثرت اسماء ہیں جو اس سورت کو سورۃ الانفال سے ممیز اور ممتاز کرتے ہیں' اور عہد صحابہ سے آج تک تمام مسلمان اس سورت کو سورت الانفال سے الگ شمار کرتے آئے ہیں۔

یزید فارسی بیان کرتے ہیں کہ ہم سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا: سورۃ الانفال مثانی سے ہے' اور سورہ البراءۃ مئین سے ہے' پھر اس کا کیا سبب ہے کہ آپ نے ان دونوں سورتوں کو ملا کر درج کیا ہے' اور ان کے درمیان بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں لکھی؟ اور آپ نے اس سورت کو السبع الطوال میں درج کیا ہے' اس کا باعث کیا ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک زمانہ تک لمبی لمبی سورتیں نازل ہوتی رہیں' جب آپ پر کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ لکھنے والوں کو بلا کر فرماتے' اس آیت کو فلاں فلاں سورت میں رکھو' اور مدینہ کے ابتدائی ایام میں سورت الانفال نازل ہوئی تھی' اور سورۃ البراءۃ قرآن کے آخر میں نازل ہوئی تھی' اور اس کا قصہ' الانفال کے قصہ کے مشابہ تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا اور آپ نے یہ نہیں بیان فرمایا کہ یہ الانفال کا حصہ ہے' سو ہم نے یہ گمان کیا کہ یہ اس کا حصہ ہے' سو اس وجہ سے میں نے ان دونوں سورتوں کو ملا کر لکھا اور ان کے درمیان بسم اللہ الرحمن الرحیم کو نہیں لکھا۔ یہ حدیث امام بخاری اور امام مسلم کی شرط پر صحیح ہے لیکن انہوں نے اس کو روایت نہیں کیا۔

(المستدرک ج ۴ ص ۲۲۱' حافظ ذہبی نے لکھا ہے یہ حدیث صحیح ہے تلخیص المستدرک ج ۲ ص ۲۲۱' مطبوعہ دار الباز مکہ مکرمہ' سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۷۸۶' سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۹۷' السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۸۰۰۷)

فائدہ: سورہ فاتحہ کے بعد پہلی سات سورتیں جن میں ایک سو یا اس سے زیادہ آیتیں ہیں ان کو السبع الطوال کہا جاتا

ہے' وہ یہ ہیں: البقرہ' آل عمران' النساء' المائدۃ' الانعام' الاعراف اور الانفال' اور جن سورتوں میں ایک سو آیتیں ہیں' ان کو ذوات المئین کہتے ہیں' اور جن میں اس سے کم آیتیں ہوں ان کو مثانی کہتے ہیں اور ان کے بعد مفصل ہیں' سورۃ الحجرات سے سورۃ البروج تک طوال مفصل ہیں اور سورۃ البروج سے سورۃ البینہ تک اوساط مفصل ہیں' اور سورۃ البینہ سے آخر قرآن تک قصار مفصل ہیں۔ (درمختار و ردالمحتار ج ۱ ص ۳۶۳' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

سورۃ التوبہ کا زمانہ نزول

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۃ البراءۃ مکمل نازل ہوئی اور جو آپ پر آخری آیت نازل ہوئی وہ سورۃ النساء کی یہ آیت ہے: یستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ' (النساء:۱۷۶)... (مسند احمد ج ۴ ص ۲۹۸' مطبوعہ دار الفکر بیروت' طبع قدیم)

امام ابوالسعادات المبارک بن محمد الشیبانی المعروف بابن الاثیر الجزری المتوفی ۶۰۶ھ نے بخاری' مسلم اور ترمذی کے حوالہ سے یہ حدیث ذکر کی ہے:

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں آخری سورت جو مکمل نازل ہوئی وہ سورۃ التوبہ ہے اور جو آخری آیت نازل ہوئی وہ آیت الکلالہ ہے۔

(جامع الاصول ج ۱۱ رقم الحدیث:۸۸۶۱' تاہم صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت میں کاملہ یا تامہ کا لفظ نہیں ہے' دیکھئے صحیح البخاری رقم الحدیث:۴۳۶۴' ۴۶۵۴' ۴۶۰۵' ۴۶۰۵ اور صحیح مسلم رقم الحدیث:۱۶۱۸' اور سنن ترمذی میں یہ روایت نہیں ہے' یہ پورا متن مسند احمد میں ہے' حافظ سیوطی نے مصنف ابن ابی شیبہ کا حوالہ بھی دیا ہے (الدرالمنثور ج ۴ ص ۱۱۹) اور اس میں صرف یہ مذکور ہے کہ قرآن مجید کی آخری آیت یستفتونک... ہے۔)

ہجرت کے بعد اوائل مدینہ میں الانفال نازل ہوئی اور سورۃ البراءۃ یا التوبہ قرآن مجید کی آخری سورت ہے' یہ سورۃ نو ہجری میں نازل ہوئی ہے' جس سال غزوۂ تبوک ہوا' اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری غزوہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سخت گرمی اور مسلمانوں کی بہت تنگی اور عسرت میں غزوۂ تبوک کے لیے روانہ ہوئے تھے' اس وقت کھجوریں پک چکی تھیں' اس میں مسلمانوں کے لیے سخت آزمائش تھی' اور اسی غزوہ سے منافقوں کے نفاق کا پردہ چاک ہو گیا تھا۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے آخری غزوہ تھا۔ اس سورت کا ابتدائی حصہ فتح مکہ کے بعد نازل ہوا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مکہ روانہ کیا تاکہ وہ ایام حج میں مشرکین سے کیے ہوئے معاہدہ کو فسخ کرنے کا اعلان کر دیں۔

یہ سورت نزول کے اعتبار سے بالاتفاق آخری سورت ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق یہ سورت سورۃ الفتح کے بعد نازل ہوئی ہے' اور بہ اعتبار نزول کے اس کا نمبر ۱۱۴ ہے۔ روایت ہے کہ یہ سورت اوائل شوال ۹ ہجری میں نازل ہوئی' ایک قول یہ ہے کہ یہ ذوالقعدہ ۹ ہجری میں نازل ہوئی' اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر روانہ کر چکے تھے اور جمہور کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ سورت الانعام کی طرح مکمل یکبارگی نازل ہوئی ہے' اور بعض مفسرین نے یہ ذکر کیا ہے کہ اس سورت کی بعض آیات مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہیں اور مکمل یکبارگی نازل ہونے کی یہ توجیہ ہے کہ اس سورت کے نزول کے دوران کوئی اور سورت درمیان میں نازل نہیں ہوئی ہے۔

اس پر روایات متفق ہیں کہ جب رمضان نو ہجری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے لوٹے' تو آپ نے یہ ارادہ کیا کہ آپ اس سال ذوالحجہ کے مہینہ میں حج کر لیں' لیکن آپ نے اپنے حج میں مشرکین کے ساتھ اختلاط کو ناپسند کیا' کیونکہ وہ

اپنے تلبیہ میں اپنے بنائے ہوئے خدا کے شرکاء کا بھی ذکر کرتے تھے' ان کا تلبیہ یہ تھالبیک لا شریک لک الا شریکا ھولک تملکہ وما ملک ''میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں البتہ تیرا وہ شریک ہے جس کا تو مالک ہے اور اس کے مملوک کا بھی تو مالک ہے'' اور وہ بیت اللہ کا برہنہ طواف کرتے تھے' اور اس وقت تک آپ کا مشرکین سے کیا ہوا معاہدہ قائم تھا اور مقام رسالت اس کے خلاف ہے کہ آپ کفریہ کلمات سنیں اور غیر شرعی امور دیکھیں اور ان کو تبدیل نہ کریں کیونکہ برائی کو اپنی قوت سے مٹا دینا ہی ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے۔

سورۃ التوبہ کے نزول کا پیش منظر و پس منظر

۶ ھ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں مشرکین کے ساتھ صلح اور امان کا دس سال تک کا معاہدہ کیا تھا' بنو خزاعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں داخل تھے اور بنو بکر مشرکین قریش کے عہد میں داخل تھے' پھر اس مدت کے ختم ہونے سے پہلے قریش نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔

امام عبدالملک بن ہشام متوفی ۲۱۸ھ لکھتے ہیں:

امام ابن اسحاق نے کہا غزوہ موتہ کی طرف لشکر بھیجنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمادی الآخرۃ اور رجب تک قیام فرمایا' پھر ۸ھ میں بنو بکر نے بنو خزاعہ کے ایک شخص کو قتل کر کے اس کا مال لوٹ لیا' اور قریش نے بھی رات کو چھپ کر بنو بکر کے ساتھ مل کر قتال کیا' حتیٰ کہ بنو خزاعہ نے حرم میں پناہ لی لیکن قریش اور بنو بکر نے حرم کا بھی احترام نہیں کیا۔ امام ابن اسحاق نے کہا جب قریش اور بنو بکر نے بنو خزاعہ پر حملہ کیا اور ان کا مال لوٹ لیا' اور انہوں نے اس معاہدہ کو توڑ دیا جو ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تھا تب عمرو بن سالم الخزاعی اور بنو کعب کا ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمرو بن سالم تمہاری امداد کر دی گئی ہے۔ (دلائل النبوۃ ج ۵ ص ۷' السنن الکبریٰ ج ۹ ص ۳۴) قریش نے پھر معاہدہ کی تجدید کے لیے ابوسفیان کو مدینہ بھیجا لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کی تجدید نہیں کی۔)

(السیرۃ النبویہ لابن ہشام مع الروض الانف ج ۴ ص ۱۴۹۔۱۴۱' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۸ھ)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو جنگ کی تیاری کا حکم دیا اور ۸ھ میں مکہ فتح کر لیا' پھر ۸ھ میں ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس سے زیادہ راتوں تک طائف کا محاصرہ کیا اور ان سے بہت شدید قتال کیا' تیروں اور منجنیق سے ان پر حملہ کیا اور طائف کو فتح کر لیا' پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے لیے تشریف لے گئے۔ یہ آپ کا آخری غزوہ تھا اور سورۃ التوبہ کی اکثر آیات اسی غزوہ میں نازل ہوئی ہیں۔

تبوک ایک مشہور مقام ہے جو مدینہ اور دمشق کے درمیان ہے اور مدینہ سے چودہ منزل پر ہے۔ غزوہ موتہ کے بعد سے رومی' مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کا پروگرام بنا رہے تھے اور قیصر روم نے غسانیوں کو اس مہم پر روانہ کیا تھا' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رومیوں کے عزائم کا علم ہوا تو آپ نے از خود ان پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور تیس ہزار مسلمانوں کی فوج لے کر تبوک کی طرف روانہ ہوئے۔ تبوک پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس دن قیام کیا' ایلہ (خلیج عقبہ کے پاس ایک مقام) کا سردار جس کا نام یوحنا تھا وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے جزیہ دینا منظور کر لیا۔ جرباء اور اذرح کے عیسائی سردار بھی حاضر ہوئے اور انہوں نے جزیہ ادا کرنا منظور کر لیا' اسی طرح ایک عرب سردار جو رومیوں کے زیر اثر تھا اس نے بھی اطاعت قبول کی' اس کا نام اکیدر تھا۔ جب تبوک کے گرد تمام عیسائی ریاستوں کے سرداروں نے آپ کی اطاعت قبول

کرلی اور آپ کی ہیبت سے قیصر روم اور اس کے گماشتوں کو آپ کے مقابلہ میں آنے کی جرأت نہیں ہوئی تو آپ فاتحانہ شان کے ساتھ مدینہ منورہ میں پہنچے اور آپ کا شاندار استقبال کیا گیا۔ غزوۂ تبوک کی پوری تفصیل ہم ان شاء اللہ اس سے متعلق آیتوں کی تفسیر میں بیان کریں گے۔

غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا ارادہ کیا، پھر آپ نے خیال فرمایا کہ اپنی عادت کے مطابق ان دنوں میں مشرکین بھی حج کے لیے آئیں گے اور برہنہ طواف کریں گے اور تلبیہ میں شرکیہ کلمات پڑھیں گے، اس لیے آپ نے ان کے ساتھ حج کرنے کو ناپسند فرمایا، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کے حج کا امیر بنا کر بھیجا تاکہ وہ مسلمانوں کو مناسک حج کی تعلیم دیں اور یہ اعلان کر دیں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کر سکے گا اور چونکہ عرب معاہدہ کے فسخ میں اصل شخص کی بات کا اعتبار کرتے تھے یا اس کے قریبی رشتہ دار کی، اس لیے حضرت ابوبکر کے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تاکہ وہ یہ اعلان کر دیں کہ اب اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بری ہیں اور حدیبیہ کا معاہدہ اب ختم ہو چکا ہے۔ (الطبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۱۲۸۔۱۲۵، ملخصاً، السیرۃ النبویہ لابن ہشام مع الروض الانف ج ۴ ص ۳۲۰۔۲۹۱ ملخصاً)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس میں بھیجا۔ ہم منیٰ میں یہ اعلان کرنے والے تھے کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا، اور نہ کوئی برہنہ بیت اللہ کا طواف کرے گا۔ حمید بن عبدالرحمٰن نے کہا، پھر بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور ان کو یہ حکم دیا کہ وہ براءت کا اعلان کر دیں۔ حضرت ابوہریرہ نے کہا، پھر حضرت علی نے ہمارے ساتھ قربانی کے دن منیٰ والوں میں اعلان کیا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک طواف کرے گا نہ برہنہ طواف کرے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث ۳۶۹، ۴۶۵۵، مطبوعہ المکتبۃ العصریہ بیروت، ۱۴۱۸ھ، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۳۴۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۹۴۶)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو براءت کا اعلان کرنے کے لیے بھیجا، پھر ان کو بلایا اور فرمایا یہ اعلان صرف اسی شخص کو کرنا چاہیے جو میرے اہل سے ہو، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۰۱، اس کی سند میں حماد بن سلمہ ہیں، بڑھاپے میں ان کا حافظہ خراب ہو گیا تھا، اسی وجہ سے امام بخاری نے ان کو ترک کر دیا تھا، تقریب التہذیب ج ۱ ص ۲۳۸، تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۱، تہذیب الکمال: ۱۴۸۲، لہٰذا یہ حدیث ضعیف ہے)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو (امیر حج بنا کر) بھیجا اور ان کو حکم دیا کہ وہ ان کلمات کا اعلان کریں، پھر ان کے پیچھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو بھیجا، حضرت ابوبکر ابھی راستے ہی میں تھے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی قصواء کی آواز سنی۔ حضرت ابوبکر گھبرا کر باہر آئے، انہوں نے یہ گمان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، دیکھا تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے حضرت ابوبکر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب دیا، جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ ان کلمات کے ساتھ اعلان کریں، پھر وہ دونوں گئے اور ان دونوں نے حج کیا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایام تشریق میں یہ اعلان کیا کہ اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ ہر مشرک سے بری ہو چکا ہے، اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا، اور نہ کوئی بیت اللہ میں برہنہ طواف کرے گا، اور مومن کے سوا کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر یہ

اعلان کرتے تھے اور جب وہ تھک جاتے تھے تو حضرت ابوبکر کھڑے ہو کر یہ اعلان کرتے تھے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۰۲، یہ حدیث بھی ضعیف ہے، اس کا ایک راوی سفیان بن حسین ہے، امام محمد بن سعد نے کہا یہ اپنی حدیث میں بہت خطا کرتا تھا، یعقوب بن شیبہ نے کہا یہ صادق ہے مگر اس کی حدیث میں ضعف ہے، تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۰۷، تہذیب الکمال رقم الحدیث: ۲۳۹۹، سفیان بن الحسین نے اس حدیث کو الحکم بن عتیبہ سے روایت کیا ہے، العجلی نے کہا اس میں تشیع تھا، امام ابن حبان نے کہا یہ تدلیس کرتا تھا، تقریب التہذیب ج ۱ ص ۲۳۲، رقم: ۱۴۵۸، تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۳۲، تہذیب الکمال رقم: ۱۴۳۷)

سورۃ التوبہ کے مسائل اور مطالب

سورۃ التوبہ میں مشرکین کو مسجد حرام میں داخل ہونے اور مناسک حج ادا کرنے سے روک دیا گیا ہے، مشرکین کے ان مناصب کو معطل اور فسخ کر دیا جن پر وہ زمانہ جاہلیت میں فخر کیا کرتے تھے، مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان حالت جنگ کا اعلان کر دیا گیا، اہل کتاب جب تک جزیہ ادا نہ کریں ان سے بھی حالت جنگ کا اعلان کر دیا گیا اور یہ کہ وہ مشرکین سے کم برے نہیں ہیں اور اللہ عزوجل اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں ان کا مال اور ان کی قوت کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے، حرمت والے مہینوں کی تعظیم کا بیان کیا، زمانہ جاہلیت میں مشرکین اپنی ہوس کو پورا کرنے کے لیے سال کے مہینوں کو جو آگے پیچھے کرتے رہتے تھے اس کو باطل اور منسوخ کرنا، اللہ کی راہ میں قتال کے لیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طلب کرنے پر مسلمانوں کو جہاد کے لیے روانہ ہونے کی ترغیب دینا، یہ فرمانا کہ اللہ خود اپنے رسول کی مدد فرمانے والا ہے، جنگ حنین میں اللہ کی نصرت کو یاد دلانا، غزوۂ تبوک میں لشکر اسلام کے ساز و سامان اور رسد کی تیاری کے لیے مسلمانوں کو ترغیب دینا، بلاعذر غزوۂ تبوک میں نہ جانے والے منافقوں کی مذمت کرنا، صدقات پر منافقوں کی حرص اور ان کے بخل پر ان کو ملامت کرنا، منافقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ کلمات کہہ کر آپ کو اذیت پہنچائی، پھر جھوٹی قسمیں کھا کر منکر ہوئے، انہوں نے برائی کی ترغیب دی اور نیکی سے روکا اور ضعفاء مسلمین کا مذاق اڑایا، ان کی ان کارستانیوں کا بیان کرنا، اہل کتاب پر جزیہ مقرر کرنا، اور ان کے احبار اور رہبان نے دین میں جو عقائد باطلہ شامل کر دیئے تھے ان کی مذمت کرنا۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کا حکم دیا ہے، مسلمانوں کو اپنے جہاد میں کافروں سے مدد لینے کی ممانعت کی ہے اور کفار اور منافقین کے لیے استغفار کرنے سے منع فرمایا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی نماز جنازہ پڑھنے سے منع فرمایا ہے، گزشتہ امتوں کی مثالیں بیان کی ہیں، جن منافقوں نے مسجد ضرار بنائی تھی ان کی بدنیتی کا ذکر فرمایا ہے، مسجد قبا اور مسجد نبوی کی فضیلت بیان کی ہے، اعراب (دیہاتیوں) میں سے نیکوں اور بروں کا ذکر فرمایا ہے، کفار اور منافقین کے مقابلہ میں مسلمانوں کی ان کے برعکس صفات بیان کی ہیں اور مسلمانوں کی نیک صفات کے مقابلہ میں کفار اور منافقین کی بری صفات بیان کی ہیں، اور مسلمانوں کی جزاء اور ان کی سزا کا ذکر فرمایا ہے، نیز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور مہاجرین اور انصار اور ان کی اتباع بالاحسان کرنے والے مسلمانوں کی فضیلت کا ذکر فرمایا ہے اور اللہ کی راہ میں صدقہ کرنے، توبہ کرنے اور نیک کام کرنے کی ترغیب دی ہے، اور جہاد کے فرض کفایہ ہونے کے متعلق آیات ہیں، غزوۂ حنین میں مسلمانوں کی مایوسی کے بعد ان کی مدد کرنے کی نعمت کو یاد دلایا ہے، غزوۂ تبوک اور اس کے لشکر کی اہمیت بیان فرمائی ہے، جن تین مسلمانوں نے بغیر کسی عذر کے غزوۂ تبوک میں اپنی سستی اور غفلت کی وجہ سے شرکت نہیں کی تھی، ان کی ندامت اور تنگی کے بعد ان کی توبہ قبول فرمانے کا ذکر فرمایا ہے، اور مسلمانوں پر اپنے اس احسان کا ذکر فرمایا جس کی ہر صفت میں ان کے لیے رحمت، خیر اور برکت ہے،

زکوٰۃ کی مشروعیت کو بیان فرمایا ہے اور علم دین حاصل کرنے کو فرض کفایہ قرار دیا ہے کہ مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ ہونا چاہیے جو علم دین حاصل کرے پھر اس کی تبلیغ اور نشرواشاعت کرے۔

سورۃ التوبہ کے اس تعارف کو پیش کرنے کے بعد اب ہم اس کی تفسیر شروع کرتے ہیں، ہم اس سورت کی تفسیر میں کتب حدیث، کتب سیرت اور کتب فقہ سے زیادہ تر مواد پیش کریں گے، ہماری کوشش ہوگی کہ ہمارے قارئین کو زیادہ سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آپ کی سیرت تک رسائی ہو جائے، فنقول وباللہ التوفیق وبہ الاستعانۃ یلیق۔

سُوْرَةُ التَّوْبَةِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّتِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّسِتَّةَ عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۃ التوبہ مدنی ہے، اس میں ایک سو انتیس آیتیں اور سولہ رکوع ہیں۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ①

اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے، ان مشرکین سے اعلان برأت (بیزاری) ہے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا۔

فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى

سو (اے مشرکو!) اب تم (صرف) چار ماہ (آزادی سے) چل پھر لو۔ اور یقین رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور

اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ② وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ

یہ کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔ اور سب لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف

رَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ

سے اعلان ہے کہ حج اکبر کے دن، اللہ مشرکین سے بری الذمہ

الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ

ہے اور اس کا رسول (بھی) پس اگر تم توبہ کر لو تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر

تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

تم اعراض کرتے ہو تو تم یقین رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، اور آپ کافروں کو دردناک عذاب

بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ ③ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ

کی خوشخبری دیجیے۔ ماسوا ان مشرکوں کے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا، پھر انہوں نے

يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ

اس معاہدہ کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان سے ان کے معاہدہ کو

عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۴ فَاِذَا انْسَلَخَ

اس کی مدت معینہ تک پورا کرو، بے شک اللہ متقین کو پسند فرماتا ہے ○ پس جب حرمت والے

الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ

مہینے گذر جائیں تو تم مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کر دو، ان کو گرفتار کرو، اور

خُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا

ان کا محاصرہ کرو اور ان کی تاک میں ہر گھات کی جگہ بیٹھو، پس اگر وہ توبہ کر لیں

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، بے شک اللہ بہت بخشنے

رَّحِيْمٌ ۝۵ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى

والا بے حد رحم فرمانے والا ہے ○ اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپ سے پناہ طلب کرے تو آپ اسے پناہ

يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا

دے دیجئے حتیٰ کہ وہ اللہ کا کلام سنے پھر آپ اسے اس کے امن کی جگہ پہنچا دیجئے، یہ (حکم) اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ

ع ۱ ٧ يَعْلَمُوْنَ ۝۶ ع

علم نہیں رکھتے ○

سورۃ التوبہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم نہ لکھنے کی توجیہات

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا: سورۃ الانفال مثانی (جس سورت میں ایک سو سے کم آیتیں ہوں) سے ہے اور سورۃ البراءۃ مئین (جس سورت میں ایک سو یا اس سے زیادہ آیتیں ہوں) سے ہے، اور آپ نے اس سورت کو السبع الطوال (سورۃ الفاتحہ کے بعد کی سات سورتیں جن میں ایک سو یا اس سے زیادہ آیتیں ہیں) میں درج کیا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک زمانہ تک لمبی لمبی سورتیں نازل ہوتی رہیں، جب بھی آپ پر کوئی چیز نازل ہوتی تو آپ کسی لکھنے والے کو بلاتے اور فرماتے ان آیات کو

فلاں فلاں نام کی سورتوں میں لکھ دو، اور جب آپ پر کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ فرماتے اس آیت کو فلاں نام کی سورت میں لکھ دو، اور سورۃ الانفال مدینہ کے اوائل میں نازل ہوئی تھی، اور سورۃ البراءۃ قرآن کے آخر میں نازل ہوئی ہے، اور التوبہ کا قصہ الانفال کے قصہ کے مشابہ تھا، پس میں نے یہ گمان کیا کہ سورۃ البراءۃ الانفال کا جز ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرما گئے اور انہوں نے ہم سے یہ نہیں بیان فرمایا کہ سورۃ التوبہ سورۃ الانفال کا جز ہے، پس اس وجہ سے میں نے ان دونوں سورتوں کو ملا کر رکھا، اور میں نے ان کے درمیان بسم اللہ الرحمن الرحیم کی سطر نہیں لکھی اور میں نے اس سورت کو السبع الطوال میں درج کر دیا۔

امام ابو عیسیٰ الترمذی متوفی ۲۷۹ھ نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے اور ہمارے علم کے مطابق حضرت ابن عباس سے اس حدیث کو صرف یزید فارسی نے روایت کیا ہے، نیز امام ترمذی نے کہا ہے کہ یزید فارسی یزید بن ہرمز ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث ۳۰۹۷، سنن ابو داؤد رقم الحدیث:۷۸۶، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۸۰۰۷، المستدرک ج ۲ ص ۲۲۱۔ حافظ ذہبی نے لکھا ہے یہ حدیث صحیح ہے، تلخیص المستدرک ج ۲ ص ۲۲۱)

حافظ جمال الدین ابو الحجاج یوسف المزی المتوفی ۷۴۲ھ لکھتے ہیں:

امام عبدالرحمن بن ابی حاتم نے کہا ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ یزید بن ہرمز، یزید فارسی ہے یا نہیں، عبدالرحمن بن مہدی نے کہا یزید فارسی ہی ابن ہرمز ہے، امام احمد بن حنبل نے بھی اسی طرح کہا ہے، یحییٰ بن سعید القطان نے اس کا انکار کیا ہے کہ یہ دونوں ایک ہیں، انہوں نے کہا یہ شخص امراء کے ساتھ ہوتا تھا، ابو ہلال نے کہا یہ شخص عبیداللہ بن زیاد کا منشی تھا، امام ابن ابی حاتم نے کہا کہ یزید بن ہرمز، یزید فارسی نہیں ہے۔

(تہذیب الکمال ج ۲۰ ص ۳۹۴ - ۳۹۳، رقم:۷۶۵۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ کی بھی یہی تحقیق ہے کہ یزید فارسی یزید بن ہرمز نہیں ہے۔

(تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۲۱، تقریب التہذیب ج ۲ ص ۳۳۳)

اس بحث سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ متعین نہیں ہو سکا کہ اس حدیث کا راوی یزید فارسی ہے یا یزید بن ہرمز۔

سند پر بحث کے علاوہ اس حدیث کا متن بھی مخدوش ہے، امام رازی نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر اس بات کو جائز قرار دیا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں بتایا تھا کہ سورۃ التوبہ کو سورۃ الانفال کے بعد رکھا جائے اور بعض سورتوں کی ترتیب وحی کے موافق نہیں کی گئی بلکہ صحابہ نے اپنے اجتہاد سے ان میں ترتیب قائم کی تھی تو باقی سورتوں میں بھی یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ ان کی ترتیب بھی وحی سے نہ کی گئی ہو، بلکہ ایک سورت کی آیات میں بھی یہ احتمال ہوگا کہ ان آیتوں کی ترتیب بھی صحابہ نے اپنی رائے سے قائم کی ہو اور اس سے رافضیوں کے اس عقیدہ کو تقویت ہوگی کہ قرآن مجید میں زیادتی اور کمی کا ہونا جائز ہے اور پھر قرآن مجید حجت نہیں رہے گا، اس لیے صحیح یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی سے مطلع ہو کر خود یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اس سورت کو سورۃ الانفال کے بعد رکھا جائے اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی سے مطلع ہو کر اس سورت کی ابتداء میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کو نہ لکھنے کا حکم فرمایا تھا۔

(تفسیر کبیر ج ۵ ص ۵۲۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

سورۃ التوبہ سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم نہ لکھنے کی صحیح وجہ تو یہی ہے جو امام رازی نے ذکر فرمائی ہے، اس کے علاوہ علماء کرام نے اور بھی توجیہات کی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ سورۃ البراءۃ کی ابتداء میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کیوں نہیں لکھی گئی؟ انہوں نے فرمایا اس لیے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم امان ہے اور البراءۃ میں تلوار سے مارنے کی آیتیں ہیں اس میں امان نہیں ہے۔
(المستدرک ج ۲ ص ۳۳۱، مطبوعہ دار الباز مکہ المکرمہ)

مبرد سے بھی ایسی ہی توجیہ مروی ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم رحمت ہے اور البراءۃ اظہار غضب سے شروع ہوتی ہے، اسی کی مثل سفیان بن عیینہ نے کہا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم رحمت ہے اور رحمت امان ہے اور یہ سورت منافقین اور تلوار کے متعلق نازل ہوئی ہے اور منافقین کے لیے امان نہیں ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس سورت سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم کو اس لیے نہیں لکھا گیا کہ اس سورت سے پہلے جبریل بسم اللہ الرحمن الرحیم کو لے کر نازل نہیں ہوئے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۸ ص ۴۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

اور بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس میں اختلاف تھا کہ الانفال اور التوبہ الگ سورتیں ہیں یا دونوں مل کر ایک سورت ہیں، کیونکہ مجموعی طور پر ان کی آیات دو سو چھ (۲۰۶) ہیں اور یہ طوال میں سے ایک ہیں، اور ان دونوں سورتوں میں قتال اور مغازی کا مضمون ہے، اس اختلاف کی بنا پر انہوں نے ان دونوں سورتوں کے درمیان خالی جگہ رکھی تاکہ اس سے ان لوگوں کے قول پر تنبیہ ہو جو کہتے ہیں کہ یہ دو سورتیں ہیں اور سورۃ التوبہ سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں لکھی تاکہ ان لوگوں کے قول پر تنبیہ ہو جو یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں مل کر ایک سورت ہیں، تو انہوں نے ایسا عمل کیا جو صحابہ کرام کے اس اختلاف اور اشتباہ پر دلالت کرتا ہے، اور ان کا یہ عمل اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ دین کو منضبط کرنے میں اور قرآن مجید کو تغییر اور تحریف سے محفوظ رکھنے میں بہت متشدد تھے، اس سے رافضیوں کا قول باطل ہو جاتا ہے اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سورۃ التوبہ اور سورۃ الانفال دونوں مل کر ایک سورت ہیں، ان کے قول کی اس سے تائید ہوتی ہے کہ سورۃ الانفال کے آخر میں ہے مومن ایک دوسرے کے ولی اور وارث ہیں اور وہ کفار سے بالکل منقطع ہیں۔ سورۃ التوبہ براءۃ من اللہ ورسولہ سے شروع ہوتی ہے اور التوبہ کی ابتداء الانفال کے آخر کی تاکید ہے کیونکہ براءت کا معنی ہے عصمت اور حفاظت کا منقطع ہونا تو الانفال کا آخر اور التوبہ کا اول دونوں کا حاصل مسلمانوں کا مشرکین کی ولایت اور ان کی حفاظت کو منقطع کرنا ہے۔ (غرائب القرآن و رغائب الفرقان ج ۳ ص ۴۲۸، مطبوعہ ۱۴۱۶ھ)

سورۃ التوبہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنے میں مذاہب ائمہ

سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

علامہ سخاوی سے جمال القراء میں یہ منقول ہے کہ سورۃ التوبہ کے اول میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کو ترک کرنا مشہور ہے اور عاصم کی قرأت میں سورۃ التوبہ کے اول میں بسم اللہ الرحمن الرحیم مذکور ہے، اور قیاس کا بھی یہی تقاضا ہے کیونکہ بسم اللہ کو یا تو اس لیے ترک کیا جائے گا کہ اس سورت میں تلوار سے قتل کرنے کے احکام نازل ہوئے ہیں یا اس وجہ سے بسم اللہ کو ترک کیا جائے گا کہ صحابہ کرام کو یہ یقین نہیں تھا کہ سورۃ التوبہ مستقل سورت ہے یا سورۃ الانفال کا جز ہے، اگر پہلی وجہ ہو تو پھر بسم اللہ کو ترک کرنا ان لوگوں کے ساتھ مختص ہو گا جن کو کفار اور منافقین کے قتل کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور ہم تو سورۃ التوبہ کو تبرکاً پڑھتے ہیں، اور اگر بسم اللہ کو اس وجہ سے ترک کیا گیا ہے کہ یہ سورۃ الانفال کا جز ہے تو سورتوں کے اجزا اور بعض آیات کو پڑھنے سے پہلے بھی تو بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنا جائز ہے

اور روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں سورۃ التوبہ سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم مذکور ہے۔

ابن مناذر کا موقف ہے کہ سورۃ التوبہ سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنا چاہیے اور الاقناع میں بھی اس کا جواز لکھا ہوا ہے' اور صحیح یہ ہے کہ سورۃ التوبہ سے پہلے بسم اللہ کو نہ پڑھنا مستحب ہے کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف میں سورۃ التوبہ سے پہلے بسم اللہ الرحمن مذکور نہیں ہے' اور اس کے سوا اور کسی مصحف کی اقتدا نہیں کی جاتی، بعض مشائخ شافعیہ نے یہ کہا ہے کہ سورۃ التوبہ سے پہلے بسم اللہ کو پڑھنا حرام ہے اور اس کا ترک واجب ہے' لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی شخص سورت کے درمیان سے قرأت شروع کرے پھر بھی قرأت سے پہلے بسم اللہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (روح المعانی جز ۱۰ ص ۴۲' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

میری رائے میں علامہ آلوسی کی یہ دلیل صحیح نہیں ہے اور سورۃ التوبہ کے اول کو سورت کے درمیان سے قرأت پر قیاس کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ سورۃ التوبہ کے اول میں بسم اللہ کو نہ پڑھنا مصحف عثمان کے مطابق ہے اور ظاہر یہ ہے کہ ان کا یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع پر محمول ہے لہٰذا سورۃ التوبہ سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم کو نہ پڑھنا توقیفی ہے اور اتباع سنت ہے جبکہ کسی سورت کے درمیان سے جب قرأت کی جائے تو وہاں بسم اللہ کو نہ پڑھنے کی کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ بسم اللہ کو پڑھنے کی دلیل موجود ہے کیونکہ قرآن مجید خواہ کہیں سے پڑھا جائے ایک مہتم بالشان کام ہے اور ہر مہتم بالشان کام سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم کو پڑھنا مستحب ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہر وہ مہتم بالشان کام جس کو بسم اللہ سے شروع نہ کیا جائے وہ ناتمام رہتا ہے۔

حافظ سیوطی نے اس حدیث کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن فضائل اعمال میں احادیث ضعیفہ معتبر ہیں۔

(الجامع الصغیر ج ۲ ص ۲۷۷' رقم: ۶۲۸۴' الجامع الکبیر ج ۶ ص ۴۳۰' رقم: ۱۵۷۱۱' تاریخ بغداد ج ۵ ص ۷۷' کنز العمال ج ۱' رقم الحدیث: ۲۴۹۱)

حافظ سیوطی نے کہا ہے اس حدیث کو عبدالقادر رہاوی نے اپنی اربعین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

فائدہ: جس طرح بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ابتداء کے متعلق حدیث ہے اسی طرح الحمدللہ سے ابتداء کے متعلق بھی حدیث ہے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہر وہ مہتم بالشان کام جس کو الحمدللہ سے شروع نہ کیا جائے وہ ناتمام رہتا ہے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۸۴۰' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸۹۴' مسند احمد ج ۳ رقم الحدیث: ۸۷۲۰' سنن کبریٰ للبیہقی ج ۳ ص ۲۰۹)

ان دونوں حدیثوں میں اس طرح موافقت کی گئی ہے کہ بسم اللہ سے ابتداء' ابتداء حقیقی پر محمول ہے اور الحمدللہ سے ابتدا' ابتداء اضافی یا ابتداء عرفی پر محمول ہے اور یہی اسلوب قرآن مجید کے مطابق ہے۔

اس لیے ہر اس کام کو جو شرعاً محمود ہو بسم اللہ سے شروع کرنا چاہیے البتہ جو کام شرعاً مذموم ہو اس کی ابتداء بسم اللہ سے کرنا جائز نہیں ہے۔

سورۃ التوبہ کے مدنی ہونے سے بعض آیتوں کا استثناء

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم، قتادہ اور بہت سے علماء نے یہ کہا ہے کہ سورۃ التوبہ مدنی سورت ہے، ابن الفرس نے کہا یہ سورت مدنی ہے لیکن اس کی آخری دو آیتیں لقد جاء کم رسول من انفسکم اور فان تولوا فقل حسبی اللہ (التوبہ: ۱۲۹-۱۲۸) یہ دو آیتیں مکہ میں نازل ہوئی ہیں، لیکن اس پر یہ اشکال ہے کہ حاکم نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور امام ابوالشیخ نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قرآن مجید کی آخری آیت جو نازل ہوئی ہے وہ لقد جاء کم رسول من انفسکم ہے۔ اور دوسرے علماء نے ان دو آیتوں کا استثناء کیا ہے ما کان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین۔ الایہ (التوبہ: ۱۱۴-۱۱۳) کیونکہ یہ دو آیتیں اس وقت نازل ہوئیں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب سے یہ فرمایا تھا: میں تمہارے لیے ضرور اس وقت تک استغفار کرتا رہوں گا جب تک کہ مجھے اس سے منع نہ کر دیا جائے اور یہ آیتیں ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی تھیں۔ (روح المعانی جز ۱۰ ص ۴۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین سے اعلان براءت (بیزاری) ہے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا○ سو (اے مشرکو!) اب تم (صرف) چار ماہ (آزادی سے) چل پھر لو اور یقین رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے○ اور سب لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان ہے کہ حج اکبر کے دن، اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول (بھی) پس اگر تم توبہ کر لو تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم اعراض کرتے ہو تو تم یقین رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، اور آپ کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری دیجئے○ (التوبہ: ۳-۱)

مشکل اور اہم الفاظ کے معانی

براءۃ: علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ نے لکھا ہے براءۃ کا اصل معنی یہ ہے کہ انسان اس چیز سے منفصل ہو جائے جس سے اتصال اس کو ناپسند ہو، اس لیے کہا جاتا ہے کہ میں مرض سے بری ہو گیا اور میں فلاں شخص سے بری ہوں، قرآن مجید میں ہے:

اَنۡتُمۡ بَرِیۡٓـــُٔوۡنَ مِمَّاۤ اَعۡمَلُ وَاَنَا بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ۔ (یونس: ۴۱) — تم میرے عمل سے بری ہو اور میں تمہارے اعمال سے بری ہوں۔

(المفردات ج ۱ ص ۵۷، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

مرض سے بری ہونے کا معنی ہے مرض سے نجات پانا، عہد سے بری ہونے کا معنی ہے عہد کو ختم کرنا یا فسخ کرنا، گناہ سے بری ہونے کا معنی ہے گناہ کو ترک کرنا، قرض سے بری ہونے کا معنی ہے قرض کو ساقط کرنا۔

عاھدتم: عہد کا معنی ہے کسی چیز کی بتدریج رعایت اور حفاظت کرنا، وہ پختہ وعدہ جس کی رعایت کرنا لازم ہو اس کو بھی عہد کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ اِنَّ الۡعَهۡدَ کَانَ مَسۡـــُٔوۡلًا۔ (بنو اسرائیل: ۳۴) — پختہ وعدہ کو پورا کرو، بے شک پختہ وعدہ کے متعلق پوچھا جائے گا۔

اللہ سے کیا ہوا پختہ وعدہ کبھی ہماری عقلوں میں مقرر ہوتا ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ کتاب اور سنت کے واسطے سے ہم سے پختہ وعدہ لیتا ہے، اور کبھی ہم کسی چیز کو از خود اپنے اوپر لازم کر لیتے ہیں اور شریعت نے اس چیز کو ہم پر لازم نہیں کیا تھا، اس کی مثال نذریں ہیں، قرآن مجید میں ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ۔ (التوبہ: ۷۵) اور ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا۔

اصطلاح شرع میں معاہد، ذمی کو کہتے ہیں یعنی مسلمان جس کافر سے جزیہ لے کر اس کے جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیں اور اس کی حفاظت کا عہد کریں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان کو کافر کے بدلہ قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ معاہد (ذمی) کو اس کے عہد میں قتل کیا جائے گا۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۵۰۶، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۱۴۱۲، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۶۶۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۵۹۹۶، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۸ ص ۳۰)

(المفردات ج ۲ ص ۴۵۵، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ دو فریق چند شرائط کے ساتھ جس عقد کا التزام کریں اس کو معاہدہ کہتے ہیں، یہاں معاہدین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے بغیر کسی مدت کے تعین کے عہد کیا تھا، یا جن لوگوں کا عہد چار ماہ کی مدت سے کم تھا، سو ان دونوں کو چار ماہ مکمل کرنے کی مہلت دی گئی اور جن لوگوں کا عہد چار ماہ سے زیادہ کی مدت کے لیے تھا (حدیبیہ میں مشرکین سے دس سال کی مدت کے لیے معاہدہ کیا گیا تھا) لیکن انہوں نے عہد کی خلاف ورزی کی ان کو بھی صرف چار ماہ کی مہلت دی گئی اور جن لوگوں نے عہد کی پابندی کی، ان کے ساتھ ان آیتوں میں مدت عہد کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

فسیحوا فی الارض: ساحۃ کھلی جگہ کو کہتے ہیں، مکان کے صحن کو بھی ساحۃ کہتے ہیں۔ جو پانی کھلی جگہ میں مسلسل بہتا رہتا ہو اس کو سائح کہتے ہیں، جو شخص مسلسل بہتے ہوئے پانی کی طرح آزادی سے چلتا رہتا ہو اس کو بھی سائح کہتے ہیں اور اس کو سیاح بھی کہتے ہیں۔ (المفردات ج ۱ ص ۳۲۴، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

اس سے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں سے بغیر تعین مدت کے عہد کیا تھا یا جن سے چار ماہ سے کم مدت کا عہد تھا ان لوگوں کو اس مدت میں امان کے ساتھ زمین میں چلنے کی مہلت ہے۔ اس مدت کی ابتداء زہری کے قول کے مطابق شوال ۹ھ سے ہوئی، کیونکہ سورۃ التوبہ شوال میں نازل ہوئی تھی، اور پھر چار ماہ کے بعد تمہارے لیے امان نہیں ہوگی۔ سیاحت کے معنی زمین میں آزادی کے ساتھ چلنا ہے۔

الحج الاکبر: حج کا معنی لغت میں زیارت کا قصد کرنا ہے، اور اصطلاح شرع میں بیت اللہ کی زیارت کا قصد کرنا ہے اور ۹ ذوالحج کو احرام باندھے ہوئے میدان عرفات میں وقوف کرنا اور ۹ تاریخ کے بعد طواف زیارت کرنا ہے، یہ حج کے ارکان ہیں، اس کے علاوہ حج کی شرائط، حج کے واجبات، سنن، آداب اور موانع ہیں جن کی تفصیل ہم البقرہ: ۱۹۶ اور آل عمران: ۹۷-۹۶ میں بیان کر چکے ہیں۔ علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ نے لکھا ہے کہ حج اکبر سے مراد یوم قربانی اور یوم عرفہ ہے اور روایت ہے کہ عمرہ حج اصغر ہے۔ (المفردات ج ۱ ص ۱۴۱، مجمع بحار الانوار ج ۱ ص ۴۴۲، مطبوعہ مدینہ منورہ) اور زبان زد خلائق ہے کہ جس سال نو ذوالحج جمعہ کے دن ہو وہ حج اکبر ہوتا ہے اور اس کا ثواب ستر حجوں کے برابر ہے، اس کی تحقیق ہم ان شاء اللہ اس آیت کی تفسیر میں کریں گے۔

آیات سابقہ سے مناسبت

سورۃ الانفال میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ○ (الانفال: ۵۸)

اور اگر آپ کسی قوم سے عہد شکنی کرنے کا خطرہ محسوس کریں تو ان کا عہد ان کی طرف برابر سرابر پھینک دیں، بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اور سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے دو ٹوک الفاظ میں مشرکین سے مسلمانوں کے کیے ہوئے معاہدہ کو فسخ کرنے کا اعلان فرما دیا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۶ھ میں مسلمانوں نے مشرکین سے حدیبیہ میں صلح کی تھی، پھر ۹ھ میں بنو ضمرہ اور بنو کنانہ کے سوا سب نے عہد شکنی کی، تب مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ مشرکین سے کیے ہوئے معاہدہ سے بری الذمہ ہو جائیں، اور ان کو چار ماہ کی مہلت دی، اس کے بعد یہ حکم دیا گیا کہ اگر مشرکین اسلام قبول کرلیں تو فبہا ورنہ ان کو قتل کر دیا جائے، مشرکین اس انتظار میں تھے کہ روم اور ایران کی طرف سے مسلمانوں پر حملہ کیا جائے تو اس دوران مسلمانوں پر حملہ کر کے مسلمانوں کو ہزیمت سے دو چار کر دیا جائے، لیکن اللہ اور اس کے رسول نے اس وقت کے آنے سے پہلے ہی ان کی بساط ان پر الٹ دی اور ان سے اعلان براءت کر کے انہیں اس پر مجبور کر دیا کہ یا تو وہ اسلام قبول کرلیں یا مسلمانوں سے لڑ کر فنا کے گھاٹ اتر جائیں، پھر وہ وقت آیا کہ ان کی آنکھوں نے دیکھ لیا کہ اس وقت کی دو بڑی طاقتیں فارس و روم بھی مسلمانوں کی قوت کے سامنے سرنگوں ہو گئیں اور جو یہ چاہتے تھے کہ قیصر و کسریٰ کی یلغار کے سامنے مسلمان تنکوں کی طرح بہہ جائیں، انہوں نے دیکھ لیا کہ مسلمانوں کی قوت کے سامنے قیصر و کسریٰ تنکوں کی طرح بہہ گئے اور یوں اللہ اور اس کے رسول کی حکمت اور تدبیر سے ان کی بازی ان پر الٹ گئی۔

ان مشرکین کا مصداق جن کو چار ماہ کی مہلت دی گئی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: سو (اے مشرکو!) اب تم (صرف) چار ماہ (آزادی سے) چل پھر لو۔ (التوبہ: ۱) اس میں مفسرین کے چار اقوال ہیں کہ اس آیت میں کن مشرکین کو چار ماہ کے لیے امان دی گئی ہے۔

امام ابوالفرج عبدالرحمن بن علی بن محمد الجوزی المتوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ اور ضحاک نے یہ کہا ہے کہ جن مشرکین سے مسلمانوں نے چار ماہ کی مدت سے زیادہ معاہدہ کیا تھا ان کی مدت کم کر کے چار ماہ کر دی گئی اور جن سے چار ماہ سے کم کا معاہدہ کیا تھا ان کے معاہدہ میں چار ماہ تک توسیع کر دی گئی اور جن سے کوئی معاہدہ نہیں تھا ان کو محرم ختم ہونے تک پچاس راتوں کی مہلت دی گئی۔

(۲) مجاہد، زہری اور قرظی نے یہ کہا ہے کہ اس آیت میں چار ماہ کے لیے تمام مشرکین کو امان دی گئی خواہ ان کا عہد ہو یا نہ ہو۔

(۳) امام ابن اسحاق نے کہا اس آیت میں ان کے لیے امان ہے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار ماہ سے کم مدت کے لیے امان دی تھی یا ان کی امان غیر محدود تھی اور جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امان نہیں دی تھی ان سے بدستور حالت جنگ ہے۔

(۴) ابن السائب نے کہا اس آیت میں ان لوگوں کو امان دی ہے جن کے لیے پہلے امان نہیں تھی یا ان سے کوئی معاہدہ نہیں تھا اور جن سے معاہدہ کیا گیا تھا ان کے لیے معاہدہ کی آخری مدت تک امان ہے، اس قول کی اس سے تائید ہوتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس دن اعلان کرتے ہوئے فرمایا: جن لوگوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی معاہدہ ہے وہ اپنے معاہدہ کی مدت پوری کریں گے اور بعض روایات میں ہے ان کی مدت چار ماہ ہے۔

(زاد المسیر ج ۳ ص ۳۹۴، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت ۱۴۰۷ھ)

حافظ اسماعیل بن کثیر القرشی الشافعی المتوفی ٧٧٤ھ لکھتے ہیں:

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کا بہت اختلاف ہے، امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار یہ ہے کہ اس آیت میں ان مشرکین کو چار ماہ کی مہلت دی ہے جن سے بغیر تعیین مدت کے معاہدہ کیا گیا تھا یا جن سے چار ماہ سے کم مدت کے لیے معاہدہ تھا تو وہ چار ماہ کی مدت کو پورا کریں، اور جن سے کسی خاص مدت تک کے لیے معاہدہ تھا تو وہ اپنی مدت پوری کریں خواہ وہ مدت جتنی بھی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ماسوا ان مشرکوں کے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا، پھر انہوں نے اس معاہدہ کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان سے اس معاہدہ کو مدت معینہ تک پورا کرو۔ (التوبہ: ٤) اور جیسا کہ عنقریب حدیث میں آئے گا کہ جس شخص کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی معاہدہ ہے تو وہ اس مدت کو پورا کرے۔ یہ قول تمام اقوال میں زیادہ عمدہ اور زیادہ قوی ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت اس طرح ہے: جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کیا تھا ان کو اللہ تعالیٰ نے چار ماہ کی مہلت دی اور جن لوگوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی معاہدہ نہیں تھا ان کو یوم النحر (قربانی کے دن) سے لے کر آخر محرم تک مہلت دی ہے اور محرم گزرنے کے بعد یا تو وہ اسلام قبول کرلیں ورنہ ان کو قتل کردیا جائے۔

(تفسیر ابن کثیر ج ٣ ص ٣٥٧، مطبوعہ دار الاندلس بیروت، ١٣٨٥ھ)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ٣١٠ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں ان مشرکین کو چار ماہ کی مہلت دی گئی ہے جنہوں نے معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کی تھی اور جن لوگوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کی ان کی مدت پوری ہونے تک ان کو امان دینے کا حکم دیا ہے جیسا کہ التوبہ: ٤ سے ظاہر ہے اور یہی قول تمام اقوال میں راجح ہے۔ (جامع البیان جز ١٠ ص ٨١، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ١٤١٥ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اہل مکہ کی طرف براءت کا اعلان کرنے کے لیے بھیجا تھا تو میں ان کے ساتھ تھا، ان کے بیٹے نے پوچھا آپ لوگ کیا اعلان کرتے تھے؟ انہوں نے کہا ہم یہ اعلان کرتے تھے کہ مومن کے سوا کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا، اور کوئی شخص بیت اللہ کا برہنہ طواف نہیں کرے گا، اور جس شخص کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی معاہدہ تھا اس کی انتہائی مدت چار ماہ ہے اور جب چار ماہ گزر جائیں گے تو اللہ اور اس کا رسول مشرکین سے بری الذمہ ہیں اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا پس میں یہ اعلان کرتا رہا حتیٰ کہ میری آواز کی تیزی ختم ہوگئی۔

(سنن النسائی رقم الحدیث: ٢٩٥٨، مسند احمد ج ٣ رقم الحدیث: ٧٩٨٢، طبع جدید)

زید بن یثیع بیان کرتے ہیں کہ ہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا آپ کو حج میں کس چیز کا اعلان کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا؟ انہوں نے کہا مجھے چار چیزوں کا اعلان کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، بیت اللہ کا کوئی شخص برہنہ طواف نہیں کرے گا، جس شخص کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ ہو اس کو چار ماہ کی مہلت ہے اور سوائے مومن کے جنت میں کوئی شخص داخل نہیں ہوگا، اور اس سال کے بعد مسلمان اور مشرک جمع نہیں ہوں گے۔ امام ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ٣١٠٣، مسند احمد ج ١ رقم الحدیث: ٥٩٤، طبع جدید، مسند الحمیدی رقم الحدیث: ٤٨، سنن الدارمی رقم الحدیث: ١٩١٩، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ٤٥٢، سنن کبریٰ للبیہقی ج ٩ ص ٢٠٧، مسند البزار رقم الحدیث: ٤٨٥، المستدرک ج ٤ ص ١٧٨)

ہو سکتا ہے کہ یہ سوال کیا جائے کہ پہلی حدیث جو امام نسائی اور امام احمد سے مروی ہے اس میں مذکور ہے جس شخص کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی معاہدہ تھا اس کی انتہائی مدت چار ماہ ہے اور دوسری حدیث جو امام ترمذی اور امام احمد سے مروی ہے اس میں مذکور ہے جس شخص کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی معاہدہ ہو وہ اپنی مدت پوری کرے گا اور یہ تعارض ہے اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی حدیث اس صورت پر محمول ہے کہ جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ حدیبیہ کیا اور پھر اس کی خلاف ورزی کی ان کو صرف چار ماہ کی مہلت دی گئی ہے اور دوسری حدیث اس صورت پر محمول ہے کہ جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کیا اور اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کی وہ اپنے معاہدہ کی انتہائی مدت کو پورا کریں گے۔

چار ماہ کے تعین میں متعدد اقوال

جن چار ماہ کی مشرکین کو مہلت دی گئی تھی ان کے تعین میں بھی مختلف اقوال ہیں، امام عبدالرحمن علی بن محمد جوزی متوفی ۵۹۷ھ نے حسب ذیل اقوال ذکر کیے ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ مہینے رجب، ذوالقعدۃ، ذوالحجہ اور محرم ہیں۔

(۲) مجاہد، سدی اور قرظی نے کہا ان کی ابتداء یوم النحر (دس ذوالحجہ) سے ہے اور ان کی انتہا دس ربیع الثانی کو ہے۔

(۳) زہری نے کہا یہ مہینے شوال، ذوالقعدۃ، ذوالحجہ اور محرم ہیں، کیونکہ یہ آیت شوال میں نازل ہوئی تھی۔ ابوسلیمان الدمشقی نے کہا یہ سب سے ضعیف قول ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ان میں اعلان کرنے کے لیے ذوالحجہ تک تاخیر نہ کی جاتی کیونکہ ان پر اس حکم کی پیروی اعلان کے بعد ہی لازم تھی۔

(۴) علامہ ماوردی نے کہا ہے اس مہلت کی ابتداً دس ذوالقعدہ سے ہوئی اور اس کی انتہا دس ربیع الاول کو ہوئی، کیونکہ اس سال حج اس دن ہوا تھا، پھر اس کے اگلے سال دس ذی الحج کو ہوا اور اسی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج ادا کیا تھا، اور فرمایا تھا زمانہ گھوم کر اپنی اصل ہیئت پر آگیا ہے۔ (زاد المسیر ج ۳ ص ۳۹۵-۳۹۴، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

امام ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ لکھتے ہیں:

ان چار مہینوں کی ابتدا ۱۰ ذوالقعدہ سے ہوئی اور ذوالحجہ، محرم، صفر اور دس دن ربیع الاول کے۔ اور اسی سال حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مکہ میں لوگوں کے ساتھ سورۃ التوبہ پڑھی تھی، پھر اس کے اگلے سال جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا تھا اس سال حج ذوالحجہ میں تھا اور یہ وہی وقت تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے حج مقرر فرمایا تھا، کیونکہ مشرکین مہینوں کو موخر کرتے رہتے تھے، اور جس سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا تھا اس سال حج لوٹ کر اپنے اصل وقت میں آگیا تھا جس وقت میں ابتداءً اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حج فرض کیا تھا اور ان کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ لوگوں کو حج کے لیے ندا کریں:

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ۔ (الحج: ۲۷)

(اے ابراہیم!) لوگوں میں بہ آواز بلند حج کا اعلان کیجئے وہ آپ کے پاس پیادہ اور ہر دبلی اونٹنی پر آئیں گے جو ہر دور دراز سے پہنچیں گی۔

اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان عرفات میں کھڑے ہو کر فرمایا: سنو زمانہ گھوم کر اپنی اصل ہیئت پر آچکا ہے جس ہیئت پر وہ اس دن تھا جب اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا تھا، پس ثابت ہو گیا کہ حج نو ذوالحجہ کو ہوتا ہے۔ وہ یوم

عرفہ ہے اور دس ذوالحجہ یوم النحر ہے اور یہ ان لوگوں کا قول ہے جو کہتے ہیں کہ مشرکین کو جن چار مہینوں میں زمین پر آزادی سے چلنے پھرنے کی مہلت دی گئی ہے وہ یہی چار ماہ ہیں۔ (احکام القرآن ج ۳ ص ۷۷، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۴۰۰ھ)

امام جصاص نے جس حدیث کا ذکر کیا ہے اس کا متن مع تخریج یہ ہے:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زمانہ اپنی اصل ہیئت میں گھوم کر آ چکا ہے جس ہیئت پر وہ اس دن تھا جب اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا تھا، سال میں بارہ مہینے ہیں، ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں تین مہینے مسلسل ہیں: ذوالقعدۃ، ذوالحجہ، محرم اور قبیلہ مضر کا رجب جو جمادیٰ اور شعبان کے درمیان ہے، (پھر آپ نے پوچھا:) یہ کون سا مہینہ ہے؟ ہم نے کہا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں، آپ خاموش رہے حتیٰ کہ ہم نے یہ گمان کیا کہ شاید آپ اس مہینہ کے (معروف) نام کے سوا کوئی اور نام رکھیں گے، آپ نے پوچھا کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟ ہم نے کہا کیوں نہیں! آپ نے پوچھا یہ کون سا شہر ہے؟ ہم نے کہا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپ خاموش رہے حتیٰ کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ اس شہر کے (معروف) نام کے سوا کوئی اور نام رکھیں گے، آپ نے فرمایا کیا یہ بلد حرام نہیں ہے؟ ہم نے کہا کیوں نہیں! آپ نے پوچھا آج کون سا دن ہے؟ ہم نے کہا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپ خاموش رہے حتیٰ کہ ہم نے یہ گمان کیا کہ آپ اس دن کے (معروف) نام کے سوا کوئی اور نام رکھیں گے، آپ نے فرمایا کیا یہ یوم النحر (قربانی کا دن) نہیں ہے؟ ہم نے کہا کیوں نہیں! آپ نے فرمایا: تمہارے خون اور تمہارے مال اور تمہاری عزتیں تم پر اس طرح حرام ہیں جس طرح تمہارے اس دن کی، اس مہینہ اور اس شہر میں حرمت ہے، اور عنقریب تم اپنے رب سے ملاقات کرو گے تو وہ تم سے تمہارے اعمال کے متعلق پوچھے گا، سنو! تم میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا، کہ تم ایک دوسرے کی گردنیں اڑا دو، سنو! حاضر (یہ پیغام) غائب کو پہنچا دے، شاید بعض وہ لوگ جن کو یہ پیغام پہنچایا جائے وہ بعض سننے والوں سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوں (امام بخاری جب اس حدیث کا ذکر کرتے تو کہتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا) پھر آپ نے فرمایا: سنو کیا میں نے تبلیغ کر دی ہے؟ سنو کیا میں نے تبلیغ کر دی ہے!

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۵۵، ۴۶۶۲، ۳۱۹۷، صحیح مسلم، الحدود: ۲۹ (۱۶۷۹) ۴۳۰۴، مسند احمد ج ۵ ص ۳۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۹۴۷، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۵۸۵۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اعلانِ براءت کرنا حضرت ابوبکر کی خلافت میں وجہ طعن نہیں ہے

چھٹی صدی کے شیعہ عالم ابو منصور احمد بن علی بن ابی طالب الطبرسی لکھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے استحقاق خلافت میں حضرت ابوبکر کے مقابلہ میں حضرت ابوبکر کے سامنے اپنی وجوہ ترجیح بیان کیں اور ان میں فرمایا:

میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ یہ بتاؤ کہ حج کے موسم میں مجمع عظیم کے سامنے سورۃ البراءۃ کا اعلان کرنے والا میں تھا یا تم تھے؟ حضرت ابوبکر نے فرمایا بلکہ تم تھے۔ (الاحتجاج ج ۱ ص ۱۱۶، مطبوعہ مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات بیروت، ۱۴۰۳ھ)

پھر تمام وجوہ ترجیح بیان کرنے کے بعد حضرت علی نے فرمایا: ان دلائل کی وجہ سے تم امت محمد کی امارت کے مستحق ہوتے ہو؟ وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے تم اللہ، اس کے رسول اور اس کے دین سے بھٹک گئے اور تم ان چیزوں سے خالی ہو جن کے دین دار محتاج ہوتے ہیں، پھر (حضرت) ابوبکر رونے لگے اور کہا: اے ابوالحسن! تم نے سچ کہا مجھے ایک دن کی مہلت دو تاکہ میں اس پر غور کروں۔ (الاحتجاج ج ۱ ص ۱۲۹، مطبوعہ بیروت، ۱۴۰۳ھ)

ایک اور شیعہ عالم محمد باقر الموسوی خراسانی نے اس کتاب پر حاشیہ لکھا ہے وہ سورۃ البراءۃ کے اعلان کے متعلق لکھتے

ہیں:

(حضرت) ابو سعید اور (حضرت) ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہما) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حج کا امیر بنا کر بھیجا۔ جب وہ مقام ضجنان پر پہنچے تو انہوں نے حضرت علی کی اونٹنی کی آواز سنی، وہ ان کو پہچان کر ان کے پاس آئے اور کہا کیا بات ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا خیر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سورۃ البراءۃ کا اعلان کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ جب وہ دونوں واپس آئے تو حضرت ابو بکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور کہا یا رسول اللہ! میرا کیا مقام ہے؟ فرمایا اچھا ہے تم میرے غار کے صاحب ہو مگر بات یہ ہے کہ یہ اعلان یا میں پہنچا سکتا تھا یا میرا رشتہ دار یعنی حضرت علی۔ اس حدیث کو امام ابو حاتم نے روایت کیا ہے (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۷۴۵ رقم الحدیث: ۹۲۱۵) اور انہوں نے حضرت جابر سے ایک روایت اس طرح بیان کی ہے کہ: حضرت ابو بکر نے حضرت علی سے کہا آپ امیر ہیں یا سفیر ہیں؟ انہوں نے کہا بلکہ میں سفیر ہوں، مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے بھیجا ہے تاکہ میں حج کے موقع پر لوگوں کے سامنے سورۃ البراءۃ کا اعلان کروں، اور امام احمد نے حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت ابو بکر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا: ابھی میرے پاس حضرت جبرئیل آئے تھے اور یہ کہا کہ معاہدہ فسخ کرنے کا اعلان آپ خود کریں گے یا آپ کا کوئی قرابت دار۔ (ذخائر العقبیٰ ص ۹۶)

(تعلیقات الموسوی علی الاحتجاج ج ۱ ص ۱۱۶، مطبوعہ بیروت، ۱۴۰۳ھ)

دیگر شیعہ مفسرین نے بھی یہی لکھا ہے کہ مشرکین پر یہ اعلان اسی وقت حجت ہو سکتا تھا جب آپ کا کوئی قرابت دار یہ اعلان کرتا۔

شیخ الطائفہ ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسی متوفی ۴۶۰ھ لکھتے ہیں:

حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے قربانی کے دن مکہ میں لوگوں کے سامنے سورۃ البراءۃ پڑھی، کیونکہ اس سال حج کے موسم میں ابو بکر لوگوں کے امیر تھے، ان کے پیچھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علی علیہ السلام کو بھیجا اور فرمایا میری طرف سے صرف میرا رشتہ دار ہی اعلان کر سکتا ہے۔ (التبیان ج ۵ ص ۱۶۹ دار احیاء التراث العربی بیروت)

شیخ ابو علی الفضل بن الحسن الطبرسی (چھٹی صدی کے اکابر علماء امامیہ میں سے تھے) لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر کو بھیجا اور ان کو یہ حکم دیا کہ وہ سورۃ البراءۃ کی پہلی دس آیتیں پڑھ کر سنائیں اور جس کا بھی کوئی معاہدہ تھا اس کو فسخ کر دیں، پھر ان کے پیچھے حضرت علی کو بھیجا تاکہ وہ ان سے یہ کام لے لیں اور وہ لوگوں کے سامنے پڑھیں، پس حضرت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی عضباء پر بیٹھ کر گئے، حتیٰ کہ وہ ذوالحلیفہ کے مقام پر حضرت ابو بکر سے جا ملے اور ان سے یہ کام لے لیا، اور ایک قول یہ ہے کہ جب حضرت ابو بکر واپس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کیا میرے متعلق کوئی حکم نازل ہوا ہے، آپ نے فرمایا خیر کے سوا کوئی چیز نازل نہیں ہوئی، لیکن میری طرف سے میں خود اعلان کر سکتا ہوں یا میرا کوئی رشتہ دار۔ (مجمع البیان ج ۵ ص ۶، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ۱۴۰۶ھ)

ان مستند علماء شیعہ کی تصریحات سے واضح ہو گیا کہ حضرت علی نے حضرت ابو بکر کی امارت میں فریضہ حج ادا کیا تھا، اور ان کا اعلان کرنا ایک خاص سبب سے تھا، اس سے حضرت ابو بکر کی امارت کو عزل کرنا لازم نہیں آتا جیسا کہ شیخ فتح اللہ کاشانی متوفی ۹۷۷ھ نے سمجھا ہے، وہ لکھتے ہیں:

حضرت ابو بکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور کہا: آپ نے مجھے ایسا منصب دیا تھا جس سے لوگوں کی

گردنیں میری طرف اٹھنے لگیں، پھر ابھی میں نے کچھ راستہ ہی طے کیا تھا تو آپ نے مجھے معزول کر دیا! آپ نے فرمایا: یہ میں نے نہیں کیا، یہ اللہ نے کیا ہے۔ (منہج الصادقین ج ۴ ص ۲۲۰، مطبوعہ کتاب فروشے علمیہ اسلامیہ طہران)

اور نہ یہ واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی دلیل ہے جیسا کہ شیخ طبرسی صاحب الاحتجاج نے سمجھا ہے۔

کتب امامیہ سے اس واقعہ کی روایات پڑھنے کے بعد اب اہل سنت کی روایت ملاحظہ فرمائیں:

حضرت ابو سعید یا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ جب وہ مقام ضجنان پر پہنچے تو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اونٹنی کی آواز سنی، تو انہوں نے اس کو پہچان لیا اور وہ حضرت علی کے پاس گئے اور پوچھا میرے متعلق کوئی بات ہے؟ انہوں نے کہا خیر ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سورۃ البراءۃ کا اعلان کرنے کے لیے بھیجا ہے، جب ہم واپس آگئے تو حضرت ابو بکر گئے اور پوچھا یا رسول اللہ! میرے لیے کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا خیر ہے، تم میرے غار کے صاحب ہو البتہ میرا غیر میری طرف سے اعلان نہیں کر سکتا، میں اعلان کروں گا یا وہ شخص جو میرے خاندان سے ہو، آپ کی مراد حضرت علی تھے۔

(صحیح ابن حبان ج ۱۵ ص ۱۷ رقم الحدیث: ۶۶۴۴، خصائص علی للنسائی رقم الحدیث: ۷، فضائل الصحابہ رقم الحدیث: ۷، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۹۰، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۶۵۶)

حج اکبر کے مصداق کے متعلق احادیث

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور سب لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان ہے کہ حج اکبر کے دن اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی، پس اگر تم توبہ کر لو تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم اعراض کرتے ہو تو تم یقین رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو اور آپ کافروں کو عذاب کی خوش خبری دے دیجئے○ (التوبہ: ۳-۱)

حج اکبر کی تعیین میں مختلف اقوال ہیں، امام عبد الرزاق بن ہمام صنعانی متوفی ۲۱۱ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حسن اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ جس سال حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حج کیا تھا اس میں مسلمان اور مشرکین جمع تھے اور اسی دن یہود اور نصاریٰ کی عید بھی تھی اس لیے اس حج کو حج اکبر فرمایا۔

حارث حضرت علی سے اور معمر زہری سے روایت کرتے ہیں کہ یوم النحر (قربانی کا دن) حج اکبر ہے۔

ابو اسحاق بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن شداد رضی اللہ عنہ سے حج اکبر اور حج اصغر کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا: حج اکبر یوم النحر ہے اور حج اصغر عمرہ ہے۔

عطا نے کہا حج اکبر یوم عرفہ ہے۔

ابو اسحاق بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے حج اکبر کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا وہ یوم عرفہ ہے۔ میں نے پوچھا یہ آپ کی رائے ہے یا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی؟ انہوں نے کہا سب کی، پھر میں نے حضرت عبد اللہ بن شداد سے سوال کیا تو انہوں نے کہا حج اکبر یوم النحر ہے اور حج اصغر عمرہ ہے۔

(تفسیر امام عبد الرزاق ج ۱، ص ۲۴۱، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ۱۴۱۱ھ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حج ادا کیا تو آپ یوم النحر (۱۰ ذوالحجہ) کو جمرات کے درمیان کھڑے ہوئے اور فرمایا: یہ حج اکبر کا دن ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۷۴۲، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۱۹۴۵، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۶۶، سنن ابن ماجہ رقم

الحدیث:۳۰۵۵، الطبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۱۴۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، المستدرک ج ۲ ص ۳۳۱)

امام ابو بکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ نے عبداللہ بن ابی اوفیٰ اور سعید بن جبیر سے، عبداللہ بن شداد سے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے، حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے، عامر سے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے اپنی اسانید کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حج اکبر یوم النحر ہے۔

(المصنف ج ۳ ص ۳۶۰، رقم الحدیث:۱۵۱۱۱-۱۵۱۰۲)

حج اکبر کے مصداق کے متعلق مذاہب فقہاء

حافظ ابو العباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی المالکی المتوفی ۶۵۶ھ لکھتے ہیں:

امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ حمید بن عبدالرحمن کہتے تھے کہ یوم النحر، یوم الحج الاکبر ہے۔ (البخاری:۳۶۹، مسلم:۱۳۴۷، سنن ابو داؤد:۱۹۴۶، سنن النسائی:۲۳۴، مسند احمد ج ۲ ص ۲۹۹) یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ حج اکبر کا دن یوم النحر ہے، جیسا کہ حمید نے کہا ہے، اور یہ سعید بن جبیر اور امام مالک کا قول ہے، اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ حج اکبر یوم عرفہ ہے اور یہی حضرت عمر کا قول ہے، امام شافعی کا بھی یہی مذہب ہے، مجاہد نے کہا حج اکبر قِران ہے اور حج اصغر افراد ہے، اور شعبی نے کہا حج اکبر، حج ہے اور حج اصغر عمرہ ہے، اور پہلا قول اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا کہ وہ لوگوں میں حج اکبر کا اعلان کریں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حج اکبر یوم النحر ہے۔ (سنن ابو داؤد، رقم الحدیث:۱۹۴۵)

(المفہم ج ۳ ص ۴۶۰-۴۵۹، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

حج اکبر کے مختلف اقوال میں تطبیق

ملا علی بن سلطان محمد القاری الحنفی المتوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں:

خلاصہ یہ ہے کہ یوم حج اکبر کے متعلق چار قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ حج اکبر یوم عرفہ ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ یہ یوم نحر ہے تیسرا قول یہ ہے کہ حج اکبر طواف زیارت کا دن ہے، چوتھا قول یہ ہے کہ حج کے تمام ایام یوم حج اکبر ہیں، اور در حقیقت ان اقوال میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ اکبر اور اصغر امر اضافی ہیں، لہٰذا جمعہ کے دن کا حج دوسرے ایام کی بہ نسبت اکبر ہے اور حج قِران حج افراد سے اکبر ہے اور مطلقاً حج، عمرے سے اکبر ہے اور جمیع ایام حج بھی اکبر ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے نورانی مقامات کے اعتبار سے مختلف ہے، اسی طرح ایام میں یوم عرفہ، حج اکبر کی تحصیل کا دن ہے جو مطلقاً حج ہے، اور یوم نحر حج اکبر کے افعال کے مکمل ہونے اور ان سے حلال ہونے کا دن ہے۔

(الحظ الاوفر فی الحج الاکبر مع المسلک المتقسط ص ۴۸۱، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، ۱۴۱۷ھ)

جب یوم عرفہ جمعہ کے دن ہو تو اس کے حج اکبر ہونے کی تحقیق

احادیث اور آثار صحابہ میں مختلف ایام پر حج اکبر کا اطلاق آیا ہے اور کسی دن کے حج اکبر ہونے پر اتفاق نہیں ہے، اور عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ جب جمعہ کے دن یوم عرفہ ہو تو وہ حج اکبر ہوتا ہے۔ اس کے ثبوت میں ہر چند کہ کوئی صریح حدیث نہیں ہے تاہم بکثرت دلائل شرعیہ سے اس دن کا حج اکبر ہونا ثابت ہے، اس لیے اس کو حج اکبر کہنا صحیح ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ جس سال جمعہ کے دن یوم عرفہ ہو اس سال کے حج کا ثواب ستر حج سے زیادہ ہوتا ہے۔

ملا علی قاری متوفی ۱۰۱۴ھ نے جب یوم عرفہ جمعہ کے دن ہو تو اس کے حج اکبر ہونے کے ثبوت میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

جب یوم عرفہ جمعہ کے دن ہو تو اس پر حج اکبر کا اطلاق کرنا بہت مشہور ہے اور زبان زد خلائق ہے، اور خلق خدا کی زبانیں، حق کا قلم ہوتی ہیں اور (حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:) جس چیز کو مسلمان حسن (اچھا اور نیک) سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی حسن ہے اور جس چیز کو مسلمان برا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی برا ہے۔ (مسند احمد ج۱ ص ۳۷۹، شیخ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے، مسند احمد ج ۳ رقم الحدیث: ۳۶۰۰، مطبوعہ دار الحدیث القاہرہ، حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کو امام احمد، امام بزار اور امام طبرانی نے المعجم الکبیر میں روایت کیا ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں، مجمع الزوائد ج۱ ص ۱۷۷-۱۷۸، ج ۸ ص ۲۵۲، حاکم نے کہا اس کی سند صحیح ہے، المستدرک، ج ۳ ص ۷۸-۷۹، تاریخ بغداد ج ۴ ص ۱۶۵، کشف الخفاء ج ۲ ص ۲۶۳) اس رسالہ میں ہمارا مقصود اس مسئلہ کی تحقیق کرنا ہے۔

امام رزین بن معاویہ نے تجرید الصحاح میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا افضل الایام، یوم عرفہ ہے اور جب یہ جمعہ کے دن ہو تو یہ بغیر جمعہ کے ستر حج سے افضل ہے۔

(اتحاف السادۃ المتقین ج ۴ ص ۲۷۴، مطبوعہ مطبع میمنہ مصر)

ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ بعض محدثین نے یہ کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، اگر بالفرض یہ واقع میں ضعیف ہو بھی تو کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ فضائل اعمال میں حدیث ضعیف بھی معتبر ہوتی ہے اور بعض جاہلوں کا یہ کہنا کہ یہ حدیث موضوع ہے، باطل اور مردود ہے (علامہ مناوی اور حافظ ابن قیم نے اس حدیث کو باطل کہا ہے) کیونکہ رزین بن معاویہ عبدری کبراء محدثین اور عظماء مخرجین میں سے ہیں، اور محققین کے نزدیک ان کا کسی حدیث کو نقل کر دینا معتمد سند ہے، جبکہ انہوں نے اس کو صحاح ستہ کی تجرید میں بیان کیا ہے، اس لیے یہ سند اگر صحیح نہیں ہے تو ضعیف سے کسی حال میں کم نہیں ہے اور اس حدیث کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ جمعہ کے دن عبادات کا ثواب ستر یا سو گنا بڑھ جاتا ہے، اور علامہ نووی نے اپنے مناسک میں بیان کیا ہے کہ جب عرفہ جمعہ کے دن ہو تو تمام اہل موقف کی مغفرت کر دی جاتی ہے، علامہ ابو طالب مکی نے اس حدیث کو قوت القلوب میں بیان کیا ہے۔ ابن جماعہ نے اس حدیث کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مسند کر کے بیان کیا ہے، اور علامہ سیوطی نے اس کو ابن جماعہ سے نقل کر کے مقرر رکھا ہے اور یہ چیز قواعد میں سے ہے کہ جب کسی حدیث کے متعدد طرق ہوں تو وہ قوی ہو جاتی ہے اور اس پر دلیل ہوتی ہے کہ اس حدیث کی اصل ہے۔

(الحظ الاوفر فی الحج الاکبر مع المسلک المتقسط ص ۴۸۲، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی)

جمعہ کے دن مغفرت اور نیکیوں میں اضافہ کے متعلق احادیث

ملا علی قاری رحمہ اللہ نے فضائل جمعہ میں چند احادیث ذکر کی ہیں جن کو ہم تخریج کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ ۝ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُودٍ ۝ (البروج: ۲-۳)

وعدہ کیے ہوئے دن کی قسم اور حاضر ہونے والے کی اور حاضر کیے ہوئے کی قسم۔

اس کی تفسیر اس حدیث میں ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یوم موعود قیامت کا دن ہے، اور یوم مشہود یوم عرفہ ہے اور شاہد یوم الجمعہ ہے، اور آپ نے فرمایا سورج کسی ایسے دن پر طلوع ہوا، نہ غروب ہوا جو جمعہ کے دن سے افضل ہو، اس دن میں ایک ایسی ساعت ہے کہ بندہ اس میں جس خیر کی بھی دعا کرے اللہ اس کو قبول فرماتا ہے اور

جس چیز سے بھی پناہ طلب کرے اس کو اس سے پناہ میں رکھتا ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۳۵۰، مسند احمد ج ۲ ص ۲۹۹-۲۹۸، سنن کبریٰ ج ۳ ص ۱۷۰، شرح السنۃ للبغوی ج ۷ ص ۲۲۶، کامل ابن عدی ج ۲ ص ۷۶ ۴، حاکم نے کہا یہ حدیث صحیح ہے، المستدرک ج ۲ ص ۵۱۹، المشکوۃ رقم الحدیث:۱۳۶۲، شعب الایمان ج ۳ ص ۸۸، کنز العمال رقم الحدیث:۲۱۰۶۵)

ملا علی قاری اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: اس حدیث میں یہ ظاہر دلیل ہے کہ تنہا جمعہ یوم عرفہ سے افضل ہے، پس ثابت ہوا کہ جمعہ سیّد الایام ہے جیسا کہ زبان زد خلائق ہے۔ (الحظ الاوفر فی الحج الاکبر مع المسلک المتقسط ص ۴۸۳)

میں کہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں بھی احادیث وارد ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کا دن سید الایام ہے، اس میں حضرت آدم کو پیدا کیا گیا، اسی دن ان کو جنت میں داخل کیا گیا، اسی دن وہ جنت سے باہر لائے گئے اور قیامت صرف جمعہ کے دن ہی قائم ہو گی۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۵۵۰۷، شعب الایمان ج ۳ ص ۹۰ رقم الحدیث:۲۹۷۱، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۰ھ)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رمضان سید الشھور (مہینوں کا سردار) ہے اور جمعہ سید الایام ہے۔

(المعجم الکبیر ج ۹ ص ۴۰۵ رقم الحدیث:۹۰۰۰، مجمع الزوائد ج ۳ ص ۱۴۵، کنز العمال ج ۷ رقم الحدیث:۲۱۰۶۷، مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۵۵۰۸)

اس کے بعد ملا علی قاری نے جمعہ کے دن مغفرت کے متعلق یہ احادیث ذکر کی ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ جمعہ کے دن ہر مسلمان کی مغفرت فرما دیتا ہے۔

(المعجم الاوسط، ج ۵ ص ۲۰۰، رقم الحدیث:۴۸۱۴، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث:۳۴، کنز العمال رقم الحدیث:۲۱۰۵۳، اس کا ایک راوی محمد بن بحر الہجیمی بہت ضعیف ہے)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کے دن اور اس کی رات کے چوبیس گھنٹوں کی ہر ساعت میں چھ سو گنہ گار دوزخ کی آگ سے آزاد ہوتے ہیں، ان میں سے ہر گنہ گار پر دوزخ واجب ہوتی ہے۔

(مسند ابو یعلیٰ ج ۶ ص ۲۰۲-۲۰۱ رقم الحدیث:۳۴۸۴ اس کی سند میں عبدالواحد بصری ضعیف ہے، مجمع الزوائد ج ۲ ص ۱۶۵، المطالب العالیہ رقم الحدیث:۸۵۲، کنز العمال ج ۷، ص ۷۱۹، رقم الحدیث:۲۱۰۸۰)

امام محمد بن سعد نے طبقات کبریٰ میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یوم عرفہ کو اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے اپنے بندوں کی وجہ سے فخر فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کہ میرے بندے بکھرے ہوئے غبار آلود بالوں کے ساتھ میری رحمت کی طلب میں آئے ہیں، میں تمہیں گواہ کرتا ہوں کہ میں نے ان کے نیکوں کو بخش دیا اور ان کے نیکوں کو ان کے بروں کے لیے شفاعت کرنے والا بنا دیا اور جمعہ کے دن بھی اسی طرح فرماتا ہے (مجھ کو طبقات یا کسی اور کتاب میں یہ حدیث نہیں ملی۔)

ان احادیث کو ذکر کرنے کے بعد ملا علی قاری فرماتے ہیں: اس حدیث میں اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جمعہ اور عرفہ کا اجتماع زیادہ مغفرت کا موجب ہے، اور جو شخص اس کا انکار کرتا ہے، وہ جاہل ہے اور منقول اور معقول پر مطلع نہیں ہے۔ اس کے بعد ملا علی قاری جمعہ کے دن اجر میں زیادتی کے متعلق احادیث بیان کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جمعہ کے دن نیکیوں کو دگنا کر دیا جاتا ہے۔

(المعجم الاوسط ج ۸ ص ۴۳۵، رقم الحدیث: ۷۸۹۱، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱ رقم الحدیث: ۵۵۱۲، کنز العمال رقم الحدیث: ۲۱۰۵۷)

ملا علی قاری فرماتے ہیں: بعض احادیث میں ستر گنا اضافہ کا بھی ذکر ہے اور امام احمد بن زنجویہ نے فضائل اعمال میں مسیب بن رافع سے روایت کیا ہے اس کو باقی ایام کی بہ نسبت دس گنا زائد اجر دیا جائے گا، میں کہتا ہوں کہ یہ ستر گنا اضافہ بلکہ سو گنا اضافہ کو بھی شامل ہے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو شامل ہے کہ جب یوم عرفہ جمعہ کے دن ہو تو اس کا اجر ستر گنا زائد ہوتا ہے۔ (الحظ الاوفر فی الحج الاکبر مع المسلک المتقسط ص ۴۸۴)

میں کہتا ہوں کہ جمعہ کے دن اجر و ثواب میں زیادتی کے متعلق یہ حدیث بہت واضح ہے:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کی عیدوں میں جمعہ کی عید سے بڑھ کر کوئی عید نہیں ہے، جمعہ کے دن ایک رکعت نماز پڑھنا باقی دنوں میں ہزار رکعات سے افضل ہے اور جمعہ کے دن ایک تسبیح پڑھنا باقی دنوں میں ہزار تسبیحات پڑھنے سے افضل ہے۔

(الفردوس بماثور الخطاب ج ۳ ص ۳۸۳ رقم الحدیث: ۵۱۶۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۶ھ)

جس جمعہ کو یوم عرفہ ہو اس دن حج اکبر ہونے پر ایک حدیث سے استدلال

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دن حج کیا وہ جمعہ کا دن تھا۔ علامہ حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ لکھتے ہیں:

الیوم اکملت لکم دینکم۔ (المائدۃ: ۳) یہ آیت جمعہ کے دن یوم عرفہ کو عصر کے بعد حجۃ الوداع میں نازل ہوئی۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم میدان عرفات میں اپنی اونٹنی عضباء پر تشریف فرما تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک یہودی کے سامنے یہ آیت پڑھی: الیوم اکملت لکم دینکم۔ (المائدۃ: ۳) اس یہودی نے کہا اگر ہم میں یہ آیت نازل ہوتی تو ہم اس دن عید مناتے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت دو عیدوں کے دن نازل ہوئی ہے، جمعہ کے دن اور عرفہ کے دن۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۵۵، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۵، ۴۴۰۷، ۴۶۰۶، ۷۲۶۸، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۳۰۱۷، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۰۰۲، ۵۰۲۷، سنن کبریٰ للنسائی، رقم الحدیث: ۱۱۱۳۷، سنن کبریٰ للبیہقی، ج ۵ ص ۱۱۸، صحیح ابن حبان، ج ۱ ص ۱۸۵)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن حج کیا اور جس دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا اسی دن حج کرنا حج اکبر ہے۔

امام ابن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ روایت کرتے ہیں:

شہاب بن عباد العصری اپنے والد سے روایت کرتے ہیں: حضرت عمر نے فرمایا یوم عرفہ حج اکبر ہے، میں نے اس بات کا سعید بن مسیب سے ذکر کیا، انہوں نے کہا مجھ سے عون بن محمد نے بیان کیا کہ میں نے محمد بن سیرین سے حج اکبر کے متعلق سوال کیا تھا، انہوں نے کہا جس دن حج اس دن کے موافق ہو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام اہل ملل نے حج کیا تھا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۳۶۰، رقم الحدیث: ۱۵۱۰۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۶ھ)

اور اس حدیث سے محدث رزین کی اس حدیث کی تائید ہوتی ہے کہ جب یوم عرفہ جمعہ کے دن ہو تو اس حج کا ثواب ستر

حج سے افضل ہے۔

جمعہ کے حج کے متعلق مفسرین کے اقوال

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے حج اکبر کے متعلق ایک یہ قول ذکر کیا ہے:

ابن عون بیان کرتے ہیں کہ میں نے محمد بن سیرین سے حج اکبر کے متعلق سوال کیا' انہوں نے کہا جو حج اس دن کے موافق ہو جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور تمام دیہاتیوں نے حج کیا تھا۔ (وہ حج اکبر ہے)

(جامع البیان' جز ۱۰' ص ۹۳' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

امام ابن شیبہ کی روایت میں اہل ملل کے الفاظ ہیں اور امام ابن جریر کی روایت میں اہل وبر (دیہاتیوں) کے الفاظ ہیں اور امام ابن جریر کی روایت ہی صحیح ہے کیونکہ تمام اہل ملل نے اس سال حج کیا تھا جس سال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حج کیا تھا اور جس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا تھا اس سال صرف مسلمانوں نے حج کیا تھا جن میں اہل وبر بھی تھے۔

بہرحال اس روایت کا ذکر حسب ذیل علماء نے کیا ہے:

- امام بغوی شافعی' متوفی ۵۱۶ھ۔ (معالم التنزیل ج ۲ ص ۲۲۶' مطبوعہ بیروت)
- علامہ قرطبی مالکی' متوفی ۶۶۸ھ (الجامع لاحکام القرآن جز ۸' ص ۱۱)
- علامہ ابوالحیان اندلسی' متوفی ۷۵۴ھ۔ (البحر المحیط ج ۵ ص ۳۶۹' مطبوعہ دار الفکر بیروت)
- حافظ ابن کثیر شافعی' متوفی ۷۷۴ھ۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۶۳' مطبوعہ دار الاندلس بیروت)
- حافظ جلال الدین شافعی' متوفی ۹۱۱ھ۔ (الدر المنثور ج ۴ ص ۱۲۸' مطبوعہ دار الفکر بیروت)
- نواب صدیق حسن خان بھوپالی (غیر مقلد)' متوفی ۱۳۰۷ھ۔

(فتح البیان ج ۵ ص ۲۳۳' مطبوعہ المکتبۃ العصریہ بیروت' ۱۴۱۵ھ)

علامہ علی بن محمد خازن شافعی متوفی ۷۲۵ھ لکھتے ہیں:

جو حج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے موافق ہو اس کو حج اکبر کہا گیا ہے اور یہ دن جمعہ کا دن تھا۔

(لباب التاویل ج ۲ ص ۲۱۷' مطبوعہ مکتبہ دار الکتب العربیہ پشاور)

علامہ اسماعیل حقی حنفی متوفی ۱۱۳۷ھ لکھتے ہیں:

حدیث میں وارد ہے کہ جب یوم عرفہ جمعہ کے دن ہو تو اس کا اجر ستر حج کے برابر ہے اور یہی حج اکبر ہے۔

(روح البیان' ج ۳ ص ۳۸۵' مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ)

صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ۱۳۶۷ھ لکھتے ہیں:

اور ایک قول یہ ہے کہ اس حج کو حج اکبر اس لیے کہا گیا کہ اس سال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج فرمایا تھا اور چونکہ یہ جمعہ کو واقع ہوا تھا اس لیے مسلمان اس حج کو جو روز جمعہ ہو حج وداع کا مذکر (یاد دلانے والا) جان کر حج اکبر کہتے ہیں۔

(خزائن العرفان ص ۳۰۱' مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور)

مفتی احمد یار خاں نعیمی متوفی ۱۳۹۱ھ لکھتے ہیں:

اس سے اشارۃً معلوم ہوا کہ اگر حج جمعہ کا ہو تو حج اکبر ہے کیونکہ جمعہ کے ایک حج کا ثواب ستر حج کے برابر ہے' حضور کا حجۃ الوداع جمعہ ہی کو ہوا تھا۔ (نور العرفان ص ۲۹۷' مطبوعہ ادارہ کتب اسلامیہ گجرات)

مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی ۱۳۹۶ھ لکھتے ہیں:

عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ جس سال یوم عرفہ بروز جمعہ واقع ہو صرف وہی حج اکبر ہے' اس کی اصلیت اس کے سوا نہیں ہے کہ اتفاقی طور پر جس سال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حج وداع ہوا ہے اس میں عرفہ بروز جمعہ ہوا تھا۔
(معارف القرآن ج ۴ ص ۳۱۵، مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی' ۱۴۱۴ھ)

شیخ محمد ادریس کاندھلوی (دیوبندی) متوفی ۱۳۹۴ھ لکھتے ہیں:

عوام الناس میں جو یہ مشہور ہے کہ حج اکبر وہ حج ہے جو خاص جمعہ کے دن ہو اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔
(تفسیر معارف القرآن ج ۳ ص ۴۸۶، مطبوعہ مکتبہ عثمانیہ لاہور' ۱۴۰۲ھ)

جمعہ کے حج کے متعلق فقہاء کے اقوال

علامہ عثمان بن علی زیلعی حنفی متوفی ۷۴۳ھ لکھتے ہیں:

حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام ایام میں افضل یوم عرفہ ہے اور جب یوم عرفہ جمعہ کے دن ہو تو وہ باقی دنوں کی بہ نسبت ستر حج سے افضل ہے۔ اس حدیث کو رزین بن معاویہ نے تجرید الصحاح میں ذکر کیا ہے اور علامہ نووی نے اپنے مناسک میں ذکر کیا ہے۔ جب یوم عرفہ یوم جمعہ کو ہو تو تمام اہل موقف کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ (تبیین الحقائق ج ۲ ص ۲۶، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان' ایضاً حاشیۃ الشلبی ج ۲ ص ۲۶، مطبوعہ ملتان)

علامہ زین الدین بن نجیم حنفی متوفی ۹۷۰ھ لکھتے ہیں:

اور ایک قول یہ ہے کہ جب یوم عرفہ یوم جمعہ کو ہو تو تمام اہل موقف کی مغفرت کر دی جاتی ہے اور جمعہ کا حج باقی ایام کی بہ نسبت ستر حج سے افضل ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۳۴۰، مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ)

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

علامہ رملی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تمام دنوں میں افضل یوم عرفہ ہے اور جب یوم عرفہ جمعہ کے دن ہو تو وہ باقی دنوں کی نسبت ستر حج سے افضل ہے۔ اس حدیث کو رزین نے روایت کیا ہے' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کے دن اللہ تعالیٰ تمام اہل موقف کی مغفرت فرما دیتا ہے اور شیخ عزالدین بن جماعہ نے کہا میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ جمعہ کے دن کے حج کی باقی دنوں پر کیا فضیلت ہے؟ انہوں نے کہا جمعہ کے حج کو باقی دنوں کے حج پر پانچ وجہ سے فضیلت ہے: پہلی اور دوسری وجہ تو مذکور الصدر حدیثوں سے واضح ہے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح جگہ کی فضیلت سے بھی عمل کی فضیلت ہوتی ہے مثلاً مکہ میں عمل کی دوسرے شہروں کے عمل کی بہ نسبت فضیلت ہے اسی طرح زمانہ کی فضیلت سے بھی عمل کی فضیلت ہوتی ہے اور جمعہ کا دن ہفتہ کے باقی دنوں سے افضل ہے (بلکہ سید الایام ہے) پس واجب ہوا کہ جمعہ کے دن کا عمل باقی دنوں کے عمل سے افضل ہو' اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ جمعہ کے دن میں ایک ایسی ساعت ہوتی ہے جس میں مسلمان بندہ اللہ تعالیٰ سے جو سوال بھی کرے اللہ اسے وہ عطا فرماتا ہے اور یہ فضیلت باقی دنوں میں نہیں ہے اور پانچویں فضیلت یہ ہے کہ جمعہ کے حج میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حج سے موافقت ہے کیونکہ حجۃ الوداع جمعہ کے دن تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سب سے افضل عمل اختیار کیا جاتا تھا۔ بعض طلبہ نے میرے والد سے سوال کیا کہ حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ تمام اہل موقف کی مغفرت فرما دیتا ہے' پھر اس میں جمعہ کے دن کی کیا خصوصیت ہے جیسا کہ مذکور الصدر حدیث میں ہے تو میرے والد نے جواب دیا کہ ہو سکتا ہے کہ جمعہ کے دن اللہ تعالیٰ بلاواسطہ مغفرت فرمائے اور باقی ایام کے حج میں بعض لوگوں

کے واسطہ سے مغفرت فرمائے۔ شیخ نورالدین الزیاری الشافعی کے حاشیہ میں بھی اسی طرح مذکور ہے۔
(منحۃ الخالق علی ہامش البحرالرائق ج ۲ ص ۳۴۰، مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ)

علامہ حسن بن عمار بن علی الشرنبلالی الحنفی المتوفی ۱۰۶۹ھ لکھتے ہیں:

تمام دنوں میں افضل یوم عرفہ ہے اور جب یوم عرفہ جمعہ کے دن ہو تو وہ باقی دنوں کی بہ نسبت ستر حج سے افضل ہے، اس حدیث کو معراج الدرایہ نے اپنے اس قول کے ساتھ روایت کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث صحیح مروی ہے کہ تمام دنوں میں افضل یوم عرفہ ہے اور جب یوم عرفہ جمعہ کے دن ہو تو وہ ستر حج سے افضل ہے۔ یہ حدیث تجرید الصحاح میں علامۃ الموطا کے ساتھ مذکور ہے (الموطا کے موجودہ مطبوعہ نسخوں میں یہ حدیث مذکور نہیں ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے اگر اس حدیث کی کوئی اصل ہے تو ہو سکتا ہے ستر سے مراد ستر درجے ہوں یا مبالغہ مراد ہو اور حقیقت حال اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۲۷۱)... (مراقی الفلاح مع حاشیۃ الطحطاوی ص ۴۴۵، مطبوعہ مصر، ۱۳۵۶ھ)

علامہ علاء الدین محمد بن علی بن محمد الحصکفی الحنفی المتوفی ۱۰۸۸ھ لکھتے ہیں:

جب عرفہ جمعہ کے دن ہو تو ستر حج کا ثواب ہے اور (میدان عرفات میں) ہر فرد کے لیے بلاواسطہ مغفرت کردی جاتی ہے۔
(الدرالمختار مع ردالمحتار ج ۲ ص ۲۵۴، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

اس کے حاشیہ پر علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

الشرنبلالیہ نے زیلعی سے نقل کیا ہے کہ تمام دنوں میں افضل یوم عرفہ ہے اور جب عرفہ جمعہ کے دن ہو تو اس دن حج کرنا باقی دنوں کے ستر حج سے افضل ہے۔ اس حدیث کو رزین بن معاویہ نے تجرید الصحاح میں روایت کیا ہے۔ علامہ مناوی نے بعض حفاظ سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث باطل ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ (فیض القدیر ج ۳ ص ۱۱۷۳، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ) البتہ امام غزالی نے احیاء العلوم میں ذکر کیا ہے کہ بعض سلف نے کہا ہے کہ جب یوم عرفہ جمعہ کے دن ہو تو تمام اہل عرفہ کی مغفرت کردی جاتی ہے اور یہ دن دنیا کے تمام دنوں سے افضل ہے، اسی دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا تھا جو حجۃ الوداع تھا، اور جب آپ وقوف فرما رہے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی: الیوم اکملت لکم دینکم۔ (المائدہ: ۳) اہل کتاب نے کہا اگر ہم پر یہ آیت نازل ہوتی تو ہم عید مناتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ آیت دو عیدوں کے دن نازل ہوئی ہے: یوم عرفہ اور یوم جمعہ۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرفہ میں وقوف فرما رہے تھے۔ (علامہ شامی نے معراج کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ ردالمحتار، ج ۲ ص ۱۷۸)

نیز علامہ شامی لکھتے ہیں:

علامہ سندی نے المنسک الکبیر میں لکھا ہے کہ تمام اہل موقف کی مطلقاً مغفرت کردی جاتی ہے پھر جمعہ کی تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ اس کا یہ جواب ہے کہ جمعہ کے دن بلاواسطہ مغفرت کی جاتی ہے اور باقی ایام میں بعض لوگوں کی بعض کے واسطے سے مغفرت کی جاتی ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ دوسرے دنوں میں صرف حجاج کی مغفرت کی جاتی ہے اور جب عرفہ جمعہ کے دن ہو تو حجاج اور غیر حجاج سب کی مغفرت کی جاتی ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ میدان عرفات میں بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کا حج قبول نہیں ہوتا تو سب کی مغفرت کیسے ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی مغفرت تو ہو جائے گی لیکن ان کو حج مبرور کا ثواب نہیں ملے گا اور مغفرت حج کے مقبول ہونے کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ ان احادیث میں تمام اہل موقف کی مغفرت کا ذکر ہے، اس لیے اس قید کا اعتبار کرنا واجب ہے۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۲۵۴، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

علامہ سید احمد الطحطاوی الحنفی المتوفی ۱۲۳۱ھ لکھتے ہیں:
جب یوم عرفہ جمعہ کے دن ہو تو اس دن حج کرنا دوسرے ایام کی بہ نسبت ستر حج سے افضل ہے۔
(حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ج ۱ ص ۵۵۹، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ۱۳۹۵ھ)

امام محمد بن محمد غزالی شافعی متوفی ۵۰۵ھ لکھتے ہیں:
بعض اسلاف نے یہ کہا ہے کہ جب جمعہ کے دن یوم عرفہ ہو تو تمام میدان عرفات والوں کی مغفرت کر دی جاتی ہے اور یہ دن دنیا کے تمام دنوں سے افضل ہے اور اسی دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کیا تھا۔
(احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۳۲۰، مطبوعہ دار الخیر بیروت، ۱۴۱۳ھ)

اس کی شرح میں علامہ سید محمد زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں:
رزین بن معاویہ العبدری نے تجرید الصحاح میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام دنوں میں افضل یوم عرفہ ہے اور جس دن عرفہ جمعہ کے دن ہو تو وہ ستر حج سے افضل ہے۔ اس حدیث پر موطا کی علامت ہے لیکن یہ حدیث یحییٰ بن یحییٰ کی موطا میں نہیں ہے، شاید یہ کسی اور موطا میں ہے۔
(اتحاف السادۃ المتقین ج ۴ ص ۲۷۴، مطبوعہ مطبعہ میمنہ مصر)

علامہ یحییٰ بن شرف نواوی شافعی متوفی ۶۷۶ھ لکھتے ہیں:
اور بے شک یہ کہا گیا ہے کہ جب یوم عرفہ جمعہ کے دن ہو تو تمام اہل موقف (میدان عرفات کے تمام لوگوں) کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔
(شرح المہذب ج ۸ ص ۱۱۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت، الایضاح فی مناسک الحج والعمرۃ، ص ۲۸۶، مطبوعہ المکتبۃ الامدادیہ مکہ مکرمہ ۱۴۱۷ھ)

مناسک نووی کی یہی وہ عبارت ہے جس کا اکثر علماء نے حوالہ دیا ہے اور اس عبارت سے استدلال کیا ہے۔
علامہ عبد الفتاح مکی مناسک الحج والعمرۃ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تمام دنوں میں افضل یوم عرفہ ہے، اگر اس میں وقوف جمعہ کے دن ہو تو وہ دوسرے دنوں کی بہ نسبت ستر دنوں سے افضل ہے۔
(الافصاح علی مسائل الایضاح، ص ۲۸۷، مطبوعہ المکتبۃ الامدادیہ مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

علامہ ابن حجر الہیتمی المکی الشافعی المتوفی ۹۷۴ھ لکھتے ہیں:
جمعہ کے دن کے فضائل میں سے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تمام دنوں میں افضل یوم عرفہ ہے، اگر وقوف عرفہ جمعہ کے دن ہو تو وہ غیر جمعہ کے ستر حج سے افضل ہے۔
(حاشیہ ابن حجر الہیتمی علی شرح الایضاح فی مناسک الحج للامام النووی ص ۳۲۸، مطبوعہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ، ۱۴۱۹ھ)
میں نے شرح صحیح مسلم کی تیسری جلد میں بھی حج اکبر کے موضوع پر لکھا تھا اور یہ واضح کیا تھا کہ جب یوم عرفہ جمعہ کے دن ہو تو وہ حج اکبر ہوتا ہے اور وہ حج دیگر ایام کی بہ نسبت ستر حج سے افضل ہوتا ہے۔ اس وقت میرے وسائل عمرہ یا حج کرنے کے نہیں تھے اور میرے وہم و گمان میں بھی عمرہ یا حج کی سعادت نہیں تھی۔ میں نے کتاب الحج کے اخیر میں دعا لکھی اے اللہ! مجھے عمرہ اور حج کی سعادت عطا فرما، یہ دعا ۱۹ جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ کو لکھی تھی (شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۷۷۳) اور ۱۴۱۰ھ میں اللہ

تعالیٰ نے مجھے عمرہ کی سعادت عطا فرمائی اور ۱۴۱۴ھ میں مجھے حج کی سعادت عطا فرمائی اور یہ حج، حج اکبر تھا! اور اب سورۃ التوبہ کی تفسیر میں حج اکبر کا لفظ آیا تو ذہن میں وہ پچھلی یادیں تازہ ہوگئیں اور میں نے دوبارہ حج اکبر کے موضوع پر لکھا اور حسن اتفاق یہ ہے کہ جن دنوں میں اس موضوع پر لکھ رہا تھا وہ ایام بھی حج کے تھے اور اس سال (۱۴۱۹ھ) کا حج بھی حج اکبر تھا' اللہ تعالیٰ میری اس تحریر کو قبول فرمائے، میں نے اس بحث میں یہ حدیث لکھی ہے کہ جب یوم عرفہ جمعہ کے دن ہو تو اللہ تعالیٰ اپنے بے پایاں کرم سے دنیا کے تمام مسلمانوں کی مغفرت فرمادیتا ہے اور میں اپنی اس تحریر یا کسی اور نیکی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا طالب نہیں ہوں، میں صرف اس کے فضل و کرم کی وجہ سے اس سے مغفرت طلب کرتا ہوں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا امیدوار ہوں۔ ۷ ذوالحجہ بروز ہفتہ بعد عصر ۱۴۱۹ھ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ماسوا ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا' پھر انہوں نے اس معاہدہ کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی، اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان سے ان کے معاہدہ کو اس کی مدت معینہ تک پورا کرو، بے شک اللہ متقین کو پسند فرماتا ہے○ (التوبہ: ۴)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکین سے بری ہے ماسوا ان لوگوں کے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا اور وہ اپنے عہد پر قائم رہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جن مشرکین سے معاہدہ کیا گیا تھا ان میں سے بعض نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ان سے اللہ تعالیٰ نے برأت کا اظہار کردیا اور بعض نے معاہدہ کی پابندی کی ان سے اللہ تعالیٰ نے معاہدہ کی پابندی پورا کرنے کا حکم دیا۔

امام بغوی متوفی ۵۱۶ھ نے لکھا ہے کہ اس آیت کا مصداق بنو ضمرہ تھے جن کا تعلق کنانہ سے تھا' اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ان سے معاہدہ کی مدت کو پورا کریں' اور نزول آیت کے وقت ان کی مدت ختم ہونے میں نو ماہ باقی تھے اور اس کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے عہد شکنی نہیں کی تھی۔

(معالم التنزیل ج ۲ ص ۲۲۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو تم مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کردو' ان کو گرفتار کرو اور ان کا محاصرہ کرو اور ان کی تاک میں ہر گھات کی جگہ بیٹھو' پس اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو' بے شک اللہ بہت بخشنے والا' بے حد رحم فرمانے والا ہے○ (التوبہ: ۵)

مشکل اور اہم الفاظ کے معانی

انسلخ: سلخ کا معنی ہے جانور کی کھال اتارنا' پھر اس کو زرہ اتارنے کے لیے بھی استعارہ کیا ہے۔ (المفردات ج ۲ ص ۳۱۴) یہاں اس کا معنی ہے جب حرمت والے مہینے گزر جائیں زمانہ کے گزرنے کو جانور کی کھال اتارنے سے تشبیہ دی ہے کیونکہ جس طرح کھال جانور کو محیط ہوتی ہے، اسی طرح مہینہ اپنے دنوں کو محیط ہوتا ہے اور جب ایک مہینہ گزر جاتا ہے تو وہ ان دنوں سے منفصل ہو جاتا ہے جن کو وہ محیط تھا۔

الاشھر الحرم: حرمت والے مہینے' ان مہینوں سے مراد یا تو وہ مہینے ہیں جن مہینوں کی مشرکین کو مہلت دی گئی تھی، اور امام ابوبکر رازی کی تحقیق کے مطابق وہ مہینے ۱۰ ذوالقعدہ سے لے کر ۱۰ ربیع الاول تک ہیں' اور یا ان مہینوں سے مراد وہ مہینے ہیں جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے قتال حرام تھا' ان کا بیان اس حدیث میں ہے:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زمانہ اپنی اصل ہیئت پر گھوم کر آ

چکا ہے، جس ہیئت پر وہ اس دن تھا جب اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا تھا، سال میں بارہ مہینے ہیں ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، تین مہینے مسلسل ہیں: ذوالقعدۃ، ذوالحجہ، محرم اور قبیلہ مضر کا رجب جو جمادیٰ اور شعبان کے درمیان ہے۔ الحدیث۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۵۵۰، ۴۶۶۲، ۳۱۹۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۶۷۹، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۹۴۷)

وخذوھم: ان کو گرفتار کر کے پکڑ لو، الاخیذ کا معنی ہے الاسیر۔

واحصروھم: الحصر اور الاحصار کا معنی ہے گھر کے راستہ کو بند کر دینا، ظاہری ممانعت اور باطنی ممانعت دونوں کے لیے یہ لفظ مستعمل ہے، ظاہری ممانعت جیسے دشمن کا محاصرہ کرنا اور باطنی ممانعت جیسے مرض کسی مریض کو کسی کام سے روک دے۔ الحصر کا معنی تنگی کرنا بھی ہے اور واحصروھم کا معنی ہے ان پر تنگی کرو اور زمین پر آزادی کے ساتھ ان کے چلنے پھرنے کو بند کر دو۔ (المفردات ج ۱ ص ۱۵۸) یعنی ان کو باہر نکلنے اور دوسرے شہروں میں منتقل ہونے سے منع کرو، ان کے گھروں اور ان کے قلعوں کا محاصرہ کرو حتیٰ کہ وہ قتل کیے جائیں یا اسلام قبول کرلیں۔

واقعدوالھم کل مرصد: رصد کا معنی ہے کسی چیز پر نگاہ رکھنے کی تیاری کرنا اور مرصد کا معنی ہے کسی چیز پر نگاہ رکھنے کی جگہ۔ (المفردات ج ۱ ص ۲۶۰) یعنی ان تمام جگہوں پر نظر رکھو جہاں سے مشرکین گزر سکتے ہیں اور کسی دوسرے شہر کی طرف نکل سکتے ہیں۔

اس آیت کی آیت سابقہ سے مناسبت یہ ہے کہ یہ آیت اس سے پہلی آیتوں پر متفرع ہے، کیونکہ اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین سے برأت کا اعلان فرمادیا تھا اور ان کو چار ماہ کی امان دی تھی اور اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ چار ماہ گزرنے کے بعد مسلمانوں پر کیا لازم ہے۔

حرمت والے مہینوں میں ممانعت قتال کا منسوخ کرنا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس جب حرمت والے مہینے گزر جائیں گے تو تم مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔ (التوبہ: ۵)

اس آیت سے مراد یہ ہے کہ جن مشرکین نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی تھی اور ان کو چار ماہ کی مہلت دی گئی تھی، اس مدت کے گزرنے کے بعد ان مشرکین کو قتل کر دو، اسی طرح جن مشرکین نے معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کی تھی جو بنو کنانہ ہیں ان کو معاہدہ کی مدت پوری کرنے کی مہلت دی گئی تھی اور ان سے معاہدہ کی میعاد ابھی نو ماہ تک باقی تھی سو نو ماہ گزرنے کے بعد ان کو بھی قتل کر دو، اور اس آیت میں حرمت والے چار ماہ یعنی ذوالقعدۃ، ذوالحج، محرم اور رجب مراد نہیں ہیں کیونکہ ان کی حرمت فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم سے منسوخ ہوگئی کیونکہ اس آیت کا معنی ہے تمام مشرکین کو جہاں بھی پاؤ ان کو قتل کر دو، خواہ ان کو حرم میں پاؤ یا غیر حرم میں اور ان کو حرمت والے مکان میں قتل کرنے کا حکم اس کو مستلزم ہے کہ ان کو حرمت والے زمانہ میں بھی قتل کر دیا جائے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ طائف میں حرمت والے مہینوں میں قتال جاری رکھا تھا۔

امام محمد بن سعد متوفی ۲۳۰ھ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شوال آٹھ ہجری میں طائف پر حملہ کیا اور اٹھارہ دن تک ان کا محاصرہ کیا اور چالیس دن تک ان پر منجنیق کو نصب کیے رکھا۔

(الطبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۱۲۱-۱۲۰، دار الکتب العلمیہ، المنتظم ج ۲ ص ۴۰۷، دار الفکر بیروت)

اس کا تقاضا یہ ہے کہ شوال کے دو ماہ بعد تک ذوالقعدہ اور ذوالحجہ میں طائف پر حملہ جاری رہا اور ذوالقعدہ اور ذوالحجہ حرمت والے مہینے ہیں۔

اور حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ نے امام ابن اسحاق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ طائف کا محاصرہ ایک ماہ تک جاری رہا۔
(البدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۳۵۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ امام مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ طائف کے محاصرہ کی مدت چالیس دن تھی۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۴۵، مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۱ھ)

اس کا تقاضا یہ ہے کہ ۲۰ ذوالحجہ تک طائف پر حملہ جاری رہا۔

اور علامہ شہاب الدین خفاجی متوفی ۱۰۶۷ھ لکھتے ہیں کہ صحت سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۰ محرم تک طائف کا محاصرہ کیا۔ (عنایت القاضی ج ۴ ص ۳۰۱، مطبوعہ دار صادر بیروت)

ان حوالہ جات سے یہ واضح ہوگیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حرمت والے مہینوں میں طائف پر حملہ جاری رکھا اور یہ اس کی ظاہر دلیل ہے کہ حرمت والے مہینوں میں قتال کی ممانعت منسوخ ہو چکی ہے، نیز اس کی ممانعت کے منسوخ ہونے پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔

فاقتلوا المشرکین سے منسوخ ہونے والی آیات کا بیان

امام ابوبکر رازی متوفی ۳۷۰ھ نے لکھا ہے کہ اس آیت فاقتلوا المشرکین نے حسب ذیل آیات کو منسوخ کر دیا:

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ۔ (الغاشیہ: ۲۲) آپ ان کو جبراً مسلمان کرنے والے نہیں ہیں۔

وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ۔ (ق: ۴۵) آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہیں۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ۔ (المائدہ: ۱۳) آپ ان کو معاف کر دیجئے اور درگزر کیجئے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ۔ (الجاثیہ: ۱۴) آپ ایمان والوں سے فرما دیجئے کہ وہ ان لوگوں کو معاف کر دیں جو اللہ کے دنوں کی امید نہیں رکھتے۔

اسی طرح حسب ذیل آیت بھی ان مذکور الصدر آیتوں کے لیے ناسخ ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۔ (التوبہ: ۲۹)

ان لوگوں سے قتال کرو جو نہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر اور وہ اس کو حرام نہیں کہتے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے اور وہ دین حق کو قبول نہیں کرتے وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو کتاب دی گئی، (ان سے قتال کرتے رہو) حتیٰ کہ وہ ذلت کے ساتھ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

حضرت موسیٰ بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے کہا اس سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں سے قتال نہیں کرتے تھے جو آپ سے قتال میں پہل نہیں کرتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا۔ (النساء: ۹۰)

پس اگر وہ تم سے الگ ہو جائیں اور تم سے قتال نہ کریں اور تمہاری طرف صلح کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لیے ان کے خلاف کوئی راستہ نہیں رکھا۔

پھر اس حکم کو اللہ تعالیٰ نے فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم سے منسوخ کر دیا۔
(احکام القرآن ج ۳ ص ۸۱، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۴۰۰ھ)

فاقتلوا المشرکین میں قتل کے عمومی حکم سے مستثنیٰ افراد

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کے مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے لیکن (التوبہ:۲۹) نے اس حکم سے ان اہل کتاب کو مستثنیٰ کر لیا جو جزیہ ادا کردیں۔

اسی طرح حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: کفار سے قتال کرنے سے پہلے ان کو اسلام کی دعوت دو، اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو ان سے قتال نہ کرو اور اگر وہ قبول نہ کریں تو پھر ان کو دعوت دو کہ وہ اپنا ملک چھوڑ کر دار مہاجرین میں منتقل ہو جائیں۔ اگر وہ قبول کرلیں تو ان سے قتال نہ کرو، اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو پھر ان سے جزیہ کا سوال کرو۔ اگر وہ اس کو قبول کرلیں تو پھر ان سے قتال سے رک جاؤ، اور اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو پھر اللہ کی مدد سے ان سے قتال کرو۔ اور ان سے خیانت نہ کرو اور ان سے عہد شکنی نہ کرو اور ان کو مثلہ نہ کرو اور ان کے بچوں کو قتل نہ کرو۔
(صحیح مسلم الجہاد: ۲ (۱۷۳۱) ۴۴۴۱، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۲۶۱۲، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۶۱۷، ملخصاً)

ایک اور حدیث میں ہے:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی غزوہ میں ایک عورت کو مقتول پایا تو آپ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۰۱۴، صحیح مسلم، الجہاد: ۲۵ (۱۷۴۴) ۴۴۶۶، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۲۶۶۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۵۶۹، السنن الکبریٰ للنسائی، رقم الحدیث ۸۶۱۸)

فاقتلوا المشرکین۔ الآیہ سے ائمہ ثلاثہ کا تارک نماز کو قتل کرنے پر استدلال اور اس کے جوابات

جو شخص فرضیت نماز کا قائل ہو لیکن نماز کا تارک ہو اور کہنے کے باوجود بھی نماز نہ پڑھتا ہو، امام احمد کا اس کے متعلق مختار قول یہ ہے کہ وہ کافر ہو گیا اور اس کو قتل کرنا واجب ہے، امام مالک اور امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ اس کو حداً قتل کر دیا جائے اور امام ابو حنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ اس کو قید کیا جائے اور اس پر تعزیر لگائی جائے حتیٰ کہ وہ نماز پڑھنے لگے۔ اس مسئلہ کی پوری تفصیل اور تحقیق ہم نے تبیان القرآن ج ا میں البقرہ: ۳ کی تفسیر میں کر دی ہے۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ نے فاقتلوا المشرکین۔ الآیہ سے تارک نماز کے متعلق امام شافعی کے موقف کی تائید میں استدلال کی تقریر کی ہے، ہم پہلے امام رازی کے استدلال کی تقریر پیش کریں گے پھر اس کے جوابات کا ذکر کریں گے۔

امام رازی فرماتے ہیں:

امام شافعی رحمہ اللہ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ تارک نماز کو قتل کر دیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے خون بہانے کو ہر طریقہ سے مباح کر دیا، پھر تین چیزوں کا مجموعہ پائے جانے کی صورت میں ان کے خون کو حرام کر دیا: (۱) کفر سے توبہ کریں، (۲) نماز قائم کریں (۳) زکوٰۃ ادا کریں اور جب یہ مجموعہ نہ پایا جائے تو ان کا خون بہانے کی اباحت اپنی اصل پر باقی رہے گی۔

اگر یہ جواب دیا جائے کہ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے ان کی فرضیت کا اعتقاد مراد ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تارک زکوٰۃ کو قتل نہیں کیا جاتا تو یہ کہا جائے گا کہ یہ جواب صحیح نہیں ہے کیونکہ اقاموا الصلوٰۃ اور اتوا الزکوٰۃ سے ان کی فرضیت کا اعتقاد مراد لینا مجاز ہے اور بلا ضرورت حقیقت سے عدول کرنا جائز نہیں اور تارک زکوٰۃ کو اس لیے قتل نہیں کیا جاتا کہ اس میں تخصیص ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۵ ص ۵۲۹-۵۲۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

ہم نے اس آیت میں اقاموا الصلوٰۃ اور اتوا الزکوٰۃ سے یہ مراد لیا ہے کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت کا اعتقاد رکھیں، یہ بلا ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کا ظاہری اور حقیقی معنی مراد نہیں ہو سکتا، اس کا ظاہری اور حقیقی معنی یہ ہے کہ جب وہ شرک اور کفر سے توبہ کرلیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو ورنہ ان کا راستہ نہ چھوڑو، پس ایک مشرک شرک سے تائب ہو گیا لیکن اس نے فوراً نماز نہیں پڑھی کیونکہ ابھی نماز کا وقت نہیں آیا، یا ابھی نماز کا وقت ختم ہونے میں کافی دیر ہے تو ظاہر معنی کے اعتبار سے اس کو قتل کرنا واجب ہے یا اس نے شرک سے توبہ کرنے کے بعد فوراً زکوٰۃ ادا نہیں کی کیونکہ وہ بقدر نصاب مال کا مالک نہیں یا مال کا مالک تو ہے لیکن ابھی اس پر سال نہیں گزرا تو اس آیت کے ظاہر معنی کے اعتبار سے اس کو قتل کرنا واجب ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس آیت کا یہ معنی کیا جائے کہ جس شخص نے شرک سے توبہ کرلی اور نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت کا اعتقاد رکھا اس کا راستہ چھوڑ دو ورنہ اس کو قتل کر دو۔

اس معنی کا موجب اور تارک نماز کو قتل نہ کرنے کا باعث یہ حدیث بھی ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں تشریف فرما ہوئے اور آپ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، جو مسلمان شخص اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، اور بے شک میں اللہ کا رسول ہوں ایسے کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں ہے ماسوا تین شخصوں کے: جو شخص اسلام کو ترک کرنے والا ہو اور مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہونے والا ہو اور شادی شدہ زنا کرنے والا اور جس شخص کو کسی شخص کے قصاص میں قتل کیا جائے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۸۷۸، صحیح مسلم، القسامہ: ۲۵ (۱۶۷۴) ۴۲۹۶، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۴۳۵۲، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۴۰۲، سنن النسائی رقم الحدیث: ۴۰۱۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۵۳۴، مسند احمد، ج ۱ ص ۴۰، ج ۶ ص ۵۸)

اس حدیث میں کسی بھی مسلمان شخص کو ان تین وجہوں کے علاوہ قتل کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا ہے اور جو نماز کا تارک ہو وہ ان تین وجہوں میں داخل نہیں ہے لہٰذا اس کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔

علامہ شہاب الدین خفاجی متوفی ۱۰۶۸ھ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

امام شافعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام احوال اور تمام صورتوں میں کفار کے قتل کو مباح فرما دیا پھر اس صورت میں ان کے قتل کو حرام فرمایا جب وہ کفر سے توبہ کرلیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں، اور جس صورت میں یہ مجموع نہیں پایا جائے گا اس صورت میں ان کو قتل کرنا اپنی اصل پر مباح ہو گا، پس تارک نماز کو قتل کر دیا جائے گا اور شاید اسی آیت کی بنا پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ سے قتال کیا تھا، اور ان دو فرضوں کی تخصیص اس لیے کی گئی کہ ان کا اظہار کرنا لازم ہے اور باقی فرائض کی ادائیگی پر مطلع ہونا دشوار ہے۔

علامہ مزنی شافعی نے فقہاء شافعیہ پر اس مسئلہ میں ایک اعتراض کیا ہے جس کا جواب دینے میں فقہاء شافعیہ حیران اور مبہوت ہو گئے، جیسا کہ علامہ سبکی شافعی نے طبقات میں اس کا اعتراف کیا ہے، علامہ مزنی نے کہا جس نماز کا وقت گزر چکا ہے یا تو

تارک نماز کو اس کے ترک کرنے پر قتل کیا جائے گا اور یا اس نماز کے ترک پر قتل کیا جائے گا جس کو اس نے ادا نہیں کیا اور اس کا وقت موجود ہے۔ اول الذکر صورت میں اس کو قتل کرنا اس لیے درست نہیں کہ قضا نماز کی ادائیگی کو ترک کرنے پر قتل نہیں کیا جاتا اور ثانی الذکر صورت میں اس کو قتل کرنا اس لیے درست نہیں کہ جب تک کہ نماز کا وقت ختم نہ ہو جائے اس کے لیے نماز کو موخر کرنا جائز ہے۔ فقہاء شافعیہ نے اس اعتراض کا ایک جواب یہ دیا کہ یہ اعتراض امام ابو حنیفہ پر بھی وارد ہو گا جو یہ کہتے ہیں کہ تارک نماز کو قید کیا جائے یا اس کو مارا پیٹا جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم اس کا یہ جواب دیں گے کہ جس شخص نے بغیر کسی عذر کے عمداً نماز کو ترک کر دیا تو اس نماز کا وقت نکلنے کے بعد اس کو قید کر لیا جائے گا اور جب تک وہ ترک نماز سے توبہ نہیں کرے گا اور وقت پر نماز پڑھنے کا عادی نہیں ہو جائے گا اس کو قید سے نہیں چھوڑا جائے گا اور اس جواب میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ فقہاء شافعیہ نے دوسرا جواب یہ دیا کہ جس نماز کا وقت نکل گیا اس کے بعد اس کو قتل کیا جائے گا کیونکہ اس نے اس نماز کو بلاعذر ترک کیا ہے۔ یہ جواب اس لیے مردود ہے کہ قضاء نماز کو فوراً ادا کرنا واجب نہیں ہے اور امام شافعی رضی اللہ عنہ نے یہ تصریح کی ہے کہ کسی شخص کو قضا نماز کی وجہ سے مطلقاً قتل نہیں کیا جائے گا اور امام شافعی کے اصحاب کا مذہب بھی یہ ہے کہ قضا نماز میں تاخیر کی وجہ سے کسی کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ فقہاء شافعیہ نے تیسرا جواب یہ دیا کہ اگر کسی شخص نے وقت پر نماز ادا نہیں کی اور نماز کا آخری وقت آگیا تو آخری وقت میں اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ اس جواب پر یہ اعتراض ہے کہ اس صورت میں یہ لازم آئے گا کہ تارک نماز قتل کی سزا کا مرتد سے بھی زیادہ حقدار ہو کیونکہ مرتد کو بھی فوراً قتل نہیں کیا جاتا بلکہ اس کو توبہ کرنے کے لیے تین دن کی مہلت دی جاتی ہے اور اس شخص کو اتنی مہلت بھی نہیں دی گئی کہ اس نماز کا وقت نکل جائے کیونکہ اگر نماز کا وقت نکل جائے گا تو وہ نماز قضا ہو جائے گی اور قضاء نماز کی ادائیگی میں تاخیر پر ان کے نزدیک بھی قتل نہیں کیا جاتا۔ امام شافعی کے مسلک پر علامہ مزنی شافعی کا یہ وہ قوی اعتراض ہے جس کا فقہاء شافعیہ میں سے کسی سے بھی جواب نہیں بن پڑا۔ (عنایت القاضی ج ۴ ص ۳۰۲، مطبوعہ دار صادر بیروت، ۱۲۸۳ھ)

فقہاء احناف نے اس آیت کا ایک یہ جواب بھی دیا ہے کہ یہ معنی کرنا: اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو پھر ان کو چھوڑ دو، ورنہ ان کو قتل کر دو۔ یہ مفہوم مخالف سے استدلال ہے اور فقہاء احناف مفہوم مخالف سے استدلال کے قائل نہیں ہیں اور اس آیت کی صحیح توجیہ یہی ہے کہ اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کو مان لیں اور ان کا التزام کر لیں تو ان کو چھوڑ دو ورنہ ان کا راستہ نہ چھوڑو کیونکہ توبہ کرتے ہی فوراً تو نماز پڑھنا اور زکوٰۃ ادا کرنا متصور نہیں ہے اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت کسی نماز کا وقت نہ ہو اور اگر نماز کا وقت ہو بھی تو اس کو آخر وقت تک موخر کرنا جائز ہے، اور زکوٰۃ کا ادا کرنا تو اس وقت واجب ہوتا ہے جب مسلمان بہ قدر نصاب مال کا مالک ہو اور اس پر سال گزر جائے۔ علامہ ابوبکر جصاص، علامہ نسفی، علامہ خفاجی اور علامہ آلوسی نے اسی توجیہ کو اختیار کیا ہے۔ ایک اور جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اگر وہ توبہ نہ کریں اور نماز قائم نہ کریں اور زکوٰۃ ادا نہ کریں تو ان کا راستہ نہ چھوڑو، اور راستہ نہ چھوڑنے کا مطلب لازماً قتل کرنا نہیں ہے بلکہ ان کو قید کرنا اور مارنا بھی اس میں شامل ہے۔

مفتی محمد شفیع متوفی ۱۳۹۶ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

آٹھواں مسئلہ مذکورہ پانچویں آیت سے یہ ثابت ہوا کہ کسی غیر مسلم کے مسلمان ہو جانے پر اعتماد تین چیزوں پر موقوف ہے: ایک توبہ، دوسرے اقامت صلوٰۃ، تیسری اداء زکوٰۃ۔ جب تک اس پر عمل نہ ہو محض کلمہ پڑھ لینے سے ان کے ساتھ جنگ بند نہ کی جائے گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جن لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا ان کے مقابلہ پر

صدیق اکبر نے جہاد کرنے کے لیے اسی آیت سے استدلال فرما کر تمام صحابہ کو مطمئن کر دیا تھا۔
(معارف القرآن ج ۴ ص ۳۱۴، مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی، ۱۴۱۴ھ)

مفتی محمد شفیع صاحب حنفی ہیں، لیکن اس آیت کی جو انہوں نے تفسیر کی ہے وہ شافعی مذہب کے مطابق ہے۔ ہم علامہ ابوبکر جصاص حنفی، علامہ نسفی حنفی، علامہ خفاجی حنفی اور علامہ آلوسی حنفی کے حوالوں سے بیان کر چکے ہیں کہ احناف کے نزدیک اس آیت کا معنی یہ ہے کہ مشرکین کو قتل نہ کرنا اس پر موقوف ہے کہ وہ شرک سے توبہ کریں اور اقامت نماز اور اداء زکوٰۃ کی فرضیت کو مانیں اور اس کا التزام کریں اور اقامت نماز اور اداء زکوٰۃ کا عمل اس آیت میں مراد نہیں ہے اور نہ ہی ان کا عمل متصور ہو سکتا ہے جبکہ مفتی صاحب نے یہ لکھا ہے "جب تک اس پر عمل نہ ہو محض کلمہ پڑھ لینے سے ان کے ساتھ جنگ بند نہ کی جائے گی"۔

باقی مفتی صاحب نے مانعین زکوٰۃ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جہاد سے جو استدلال کیا ہے، یہ بھی دراصل فقہاء شافعیہ کا استدلال ہے۔ ہم پہلے اس حدیث کو باحوالہ ذکر کریں گے، پھر اس حدیث سے فقہاء شافعیہ کے استدلال اور پھر احناف کی طرف سے اس حدیث کے جوابات کا ذکر کریں گے، فنقول وباللہ التوفیق۔

مانعینِ زکوٰۃ سے حضرت ابوبکر کے قتال سے ائمہ ثلاثہ کا استدلال اور اس کے جوابات

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا اور عرب کے قبائل میں سے جو کافر ہوئے وہ کافر ہو گئے، تو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا آپ کیسے لوگوں سے قتال کریں گے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: مجھے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے حتیٰ کہ وہ لا الہ الا اللہ کہیں، پس جس نے لا الہ الا اللہ کہا اس نے مجھ سے اپنی جان اور مال کو محفوظ کر لیا ماسوا اس کے حق کے اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔ حضرت ابوبکر نے کہا: اللہ کی قسم! میں ضرور اس شخص سے قتال کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا، کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، اللہ کی قسم! میں نے یہ جان لیا کہ اللہ عزوجل نے قتال کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سینہ کھول دیا ہے اور میں سمجھ گیا کہ یہی حق ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۳۹۹، ۱۴۵۶، ۶۹۲۴، ۷۲۸۴، ۷۲۸۵، صحیح مسلم، الایمان: ۳۲ (۲۰) ۱۲۴، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۵۵۶، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۴۴۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۶۱۶، مسند احمد ج ۳ رقم الحدیث: ۱۰۸۲۴، صحیح ابن حبان ج ۱ رقم الحدیث: ۲۱۶، مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث ۱۸۷۱۸، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۴ ص ۱۰۴)

علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں:

علامہ نووی شافعی متوفی ۶۷۶ھ نے کہا اس حدیث سے اس پر استدلال کیا جاتا ہے کہ جو شخص نماز کے وجوب کا معتقد ہو اور عمداً نماز کا تارک ہو اس کو قتل کر دیا جائے گا، جمہور کا یہی موقف ہے اور امام ابوحنیفہ اور علامہ مزنی شافعی نے یہ کہا ہے کہ اس کو قید کر لیا جائے گا حتیٰ کہ وہ توبہ کرے اور اس کو قتل نہیں کیا جائے گا، جمہور فقہاء (امام شافعی، امام مالک اور امام احمد) پر یہ اعتراض ہے کہ انہوں نے اس حدیث سے نماز کے تارک کو قتل کرنے پر استدلال کیا ہے اور وہ مانع زکوٰۃ کو قتل کرنے کا نہیں کہتے، حالانکہ یہ حدیث ان دونوں کو شامل ہے اور ان کا مذہب یہ ہے کہ مانع زکوٰۃ سے جبراً زکوٰۃ وصول کی جائے گی اور زکوٰۃ نہ دینے کی وجہ سے اس کو تعزیر دی جائے گی، نیز اس حدیث سے عمداً تارک نماز کو قتل کرنے پر استدلال کرنا اس لیے بھی درست نہیں ہے کہ اس حدیث میں مانعین زکوٰۃ سے قتال کرنے کا ذکر ہے نہ کہ ان کو قتل کرنے کا اور قتال اور قتل میں فرق ہے، قتال

جانبین سے ہوتا ہے اور قتل جانب واحد سے۔
(عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۸۲-۱۸۱، ملخصاً مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر، ۱۳۴۸ھ)

شیخ انور شاہ کشمیری متوفی ۱۳۵۲ھ نے لکھا ہے کہ امام شافعی کے نزدیک عمداً تارک نماز کو حداً قتل کر دیا جائے گا اور ہمارے امام اعظم کے نزدیک اس کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کو تین دن قید رکھا جائے گا، اگر اس نے نماز پڑھ لی تو فبہا ورنہ اس پر ضرب لگائی جائے گی۔ (فیض الباری ج ۱ ص ۱۰۶، مطبوعہ ہند ۱۳۵۷ھ)

شیخ بدر عالم میرٹھی نے فیض الباری کے حاشیہ میں علامہ عینی کے مذکور صدر کلام کا خلاصہ لکھا ہے۔
(حاشیہ فیض الباری ج ۱ ص ۱۰۸)

شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

امام احمد، امام شافعی، امام مالک کے نزدیک اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ تارک صلوٰۃ اگر توبہ نہ کرے تو اس کو قتل کر دے اور امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ اسے خوب زدو کوب کرے اور قید میں رکھے حتیٰ کہ مرجائے یا توبہ کرے، بہرحال تخلیۂ سبیل (تارک نماز کا راستہ چھوڑ دینا) کسی کے نزدیک نہیں، رہے مانعین زکوٰۃ ان کے اموال میں سے حکومت جبراً زکوٰۃ وصول کرے اور اگر وہ لوگ مل کر حکومت سے آمادۂ پیکار ہوں تو راہ راست پر لانے کے لیے جنگ کی جائے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ سے جو جہاد کیا تھا اس کا واقعہ کتب حدیث و تاریخ میں مشہور و معروف ہے۔
(حاشیہ شبیر احمد عثمانی ص ۲۴۹، مطبوعہ المملکۃ العربیہ السعودیہ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپ سے پناہ طلب کرے تو آپ اسے پناہ دے دیجئے حتیٰ کہ وہ اللہ کا کلام سنے پھر آپ اسے اس کے امن کی جگہ پہنچا دیجئے یہ (حکم) اس لیے ہے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے ○ (التوبہ: ۶)

آیات سابقہ سے ارتباط

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ واجب کر دیا تھا کہ مشرکین کو جن مہینوں کی مہلت دی گئی ہے اس مہلت کے گزر جانے کے بعد ان کو قتل کر دیا جائے، کیونکہ ان پر اللہ تعالیٰ کی حجت قائم ہو چکی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے ایسے دلائل اور براہین بیان کر دیئے جو ان کے شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لیے کافی ہیں اور اب ان سے صرف اسلام کا مطالبہ ہے یا پھر ان کو قتل کر دیا جائے گا، اس لیے یہاں پر یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر کسی شخص کو دین اسلام سمجھنے کے لیے کسی مزید دلیل یا حجت کی ضرورت ہو تو وہ آپ کے پاس اپنے اطمینان کے لیے نہیں آسکتا، اس شبہ کو دور کرنے کے لیے فرمایا اگر کوئی شخص اسلام کے متعلق اپنے شرح صدر اور اطمینان قلب کے لیے آنا چاہے تو آپ اس کو اسلامی ریاست میں آنے کی اجازت دے دیں اور بعد میں جس جگہ وہ اپنے لیے امن اور عافیت سمجھتا ہے وہاں اسے پہنچا دیں۔

مشرکین کو دارالاسلام میں آنے کی اجازت دینے کے مسائل اور احکام

علامہ ابوبکر احمد بن علی الرازی الجصاص الحنفی المتوفی ۳۷۰ھ لکھتے ہیں:

مشرک جب مسلمانوں کے ملک میں آنے کی اجازت طلب کرے تاکہ وہ دین اسلام کو سمجھے تو اس کو اجازت دینی چاہیے اور اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی توحید اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دلائل بیان کرنے چاہئیں اور اس آیت میں یہ بھی دلیل ہے کہ جو شخص ہم سے جو دینی مسئلہ معلوم کرے، ہمیں اس کو وہ مسئلہ بتانا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دیں۔ اس میں یہ دلیل ہے کہ جو مشرک ہماری اجازت سے ہمارے ملک میں آیا ہے ہم

پر اس کی جان، اس کے مال اور اس کی عزت کی حفاظت کرنا لازم ہے اور اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ کسی مشرک کو زیادہ مدت تک دارالاسلام میں نہیں ٹھہرانا چاہیے اور اس کو صرف اتنی مدت تک ٹھہرانا چاہیے جتنی مدت میں اس کا اسلام کے احکام سمجھنا ضروری ہو، اور یہ کہ کسی عذر اور سبب کے بغیر کسی مشرک کو دارالاسلام میں نہیں ٹھہرانا چاہیے۔

(احکام القرآن ج ۳ ص ۸۴ - ۸۳، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۴۰۰ھ)

علامہ برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی المتوفی ۵۹۳ھ لکھتے ہیں:

جب کوئی مسلمان آزاد مرد یا آزاد عورت کسی کافر کو یا کافروں کی جماعت یا قلعہ بند لوگوں کو یا کسی شہر کے لوگوں کو امان دے دیں (یعنی دارالاسلام میں داخل ہونے کی اجازت دے دیں) تو ان کی یہ اجازت صحیح ہے اور مسلمانوں میں سے کسی شخص کے لیے ان سے قتال کرنا جائز نہیں ہے، اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام مسلمانوں کا خون ایک جیسا ہے اور غیر مسلموں کے خلاف وہ ایک دوسرے کے دست و بازو ہیں، ان کا ادنیٰ فرد بھی اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا اور جو شخص (لشکر میں) دور ہو گا اس کو بھی غنیمت پہنچائی جائے گی اور عمرو بن شعیب کی روایت میں ہے اور مسلمانوں کا ادنیٰ فرد بھی کسی شخص کو امان دے سکتا ہے۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۶۸۵، ۲۶۸۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۵۳۰، سنن النسائی رقم الحدیث: ۴۷۴۸، مسند احمد، ج ۲ ص ۱۹۲، ۲۱۱، سنن کبریٰ للبیہقی، ج ۸ ص ۲۹)

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ فتح مکہ کے سال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئی، اس وقت آپ غسل فرما رہے تھے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کپڑے سے آپ پر پردہ کر رہی تھیں۔ میں نے آپ کو سلام کیا، آپ نے پوچھا کون ہے؟ میں نے کہا میں ہوں ام ہانی بنت ابی طالب، آپ نے فرمایا مرحبا ام ہانی، جب آپ غسل سے فارغ ہوئے تو آپ نے (چاشت کی) آٹھ رکعات پڑھیں، جب آپ فارغ ہو گئے تو میں نے عرض کیا کہ میری ماں کا بیٹا (حضرت علی رضی اللہ عنہ) یہ کہتا ہے کہ وہ اس شخص کو قتل کرے گا جس کو وہ امان دے چکی ہیں، وہ ابن ہبیرہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم نے اس کو پناہ دی جس کو اے ام ہانی تم نے پناہ دی ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۵۷، صحیح مسلم صلاۃ المسافرین: ۸۲ (۳۳۶) ۱۶۳۹، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۲۹۱، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۴۷۴، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۴۸۶، مسند احمد ج ۶ ص ۳۴۱، المستدرک ج ۴ ص ۵۴ - ۵۳، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ۵۹، موطا امام مالک رقم الحدیث: ۲ج ۱۵، تہذیب تاریخ دمشق ج ۴ ص ۱۰، الطبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۱، کامل ابن عدی ج ۷ ص ۲۵۱۸، المنتقیٰ رقم الحدیث: ۱۰۵۵، کنزالعمال رقم الحدیث: ۱۰۹۵۰)

امام ابن ہشام نے امام ابن اسحاق سے روایت کیا ہے کہ حضرت زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوالعاص بن الربیع کو امان دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی امان کو نافذ کر دیا اور فرمایا: مسلمانوں کا ادنیٰ فرد بھی امان دے سکتا ہے۔ (السیرۃ النبویہ ج ۲ ص ۲۶۹، المعجم الکبیر ج ۲۲ ص ۴۳۰)

ہاں اگر کسی شخص کو امان دینے میں اگر کوئی بڑا خطرہ یا فساد ہو تو اس سے امان واپس لے لی جائے گی، جیسے خود امام نے امان دی پھر امان واپس لینے میں کوئی مصلحت دیکھی تو وہ امان واپس لے سکتا ہے۔ ذمی کا کسی شخص کو امان دینا جائز نہیں ہے، اور نہ اس مسلمان کا امان دینا جائز ہے جو خود دارالحرب میں قید ہو یا وہاں تجارت کے لیے گیا ہو، اور مجنون اور کم عمر بچے کا امان دینا

بھی صحیح نہیں ہے البتہ جو بچہ جنگ کر سکتا ہو اس کا امان دینا صحیح ہے۔ (ہدایہ اولین ص ۵۶۶ - ۵۶۴ 'مطبوعہ شرکت علمیہ ملتان)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ ھ لکھتے ہیں:

جس مشرک نے دین کو سمجھنے کے لیے مسلمانوں کے ملک میں داخل ہونے کی اجازت اور امان طلب کی ہو اس کے جواز میں سب کا اتفاق ہے لیکن جس مشرک نے تجارت یا کسی اور غرض سے مسلمانوں کے ملک میں دخول کی اجازت طلب کی ہو تو اگر مسلمان حکمران یہ سمجھیں کہ اس میں مسلمانوں کی مصلحت اور منفعت ہے تو یہ جائز ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۸ ص ۱۵ 'مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ ھ)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ ھ لکھتے ہیں:

فقہاء نے کہا ہے کہ جب کافر حربی اپنا مال لے کر دار الاسلام میں داخل ہو تو اس کا مال بھی مال غنیمت ہوتا ہے' ماسوا اس کے کہ وہ کسی غرض شرعی کی بنا پر امان لے کر داخل ہو مثلاً وہ اسلام قبول کرنے کیلئے اللہ کا کلام سننا چاہتا ہو یا وہ تجارت کیلئے داخل ہو' اور جو کافر حربی دار الاسلام میں کافروں کا سفیر بن کر آئے تو سفارت بھی امان ہے اور جس شخص کا مال دار الاسلام میں امان ہو تو اس کا اپنا مال لینے کیلئے آنا بھی صحیح ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۵ ص ۵۳۱ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۵ ھ)

امام محمد بن حسن الشیبانی المتوفی ۱۸۹ ھ لکھتے ہیں:

قاعدہ یہ ہے کہ جب تک ہمارے ملک میں امان حاصل کرنے والے کافر رہیں' مسلمانوں کے امیر پر ان کی نصرت کرنا واجب ہے اور اس پر واجب ہے کہ اگر کوئی شخص ان پر ظلم کرے تو اس کو انصاف مہیا کرے جس طرح مسلمانوں پر اہل ذمہ کے حق میں یہ واجب ہے۔

شمس الائمہ محمد بن احمد السرخسی المتوفی ۴۸۳ ھ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

کیونکہ امان حاصل کرنے والے کافر جب تک دار الاسلام میں رہیں وہ مسلمانوں کی ولایت میں ہیں اور ان کا حکم ذمیوں کی طرح ہے۔ (شرح السیر الکبیر ج ۵ ص ۱۸۵۳ 'مطبوعہ بالحرکۃ الثورۃ اسلامیہ' افغانستان)

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا

اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک ان مشرکین کے ساتھ کیونکر کوئی عہد سکتا ہے ؟ ماسوا ان

الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا

لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا، جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں

لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۷ كَيْفَ

تم بھی ان سے کیے ہوئے عہد کے پابند رہو، بے شک اللہ متقین کو پسند فرماتا ہے ۝ ان کے عہد کا

وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ

کیسے اعتبار ہو سکتا ہے، جب کہ ان کا حال یہ ہے کہ جب وہ تم پر غالب ہوں تو وہ نہ تمہاری رشتہ داری کا لحاظ کریں گے اور نہ تم سے

يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۸ ج

کیسے ہوئے عہد کا پاس کریں گے وہ تمہیں صرف اپنی زبانی باتوں سے خوش کرتے ہیں اور ان کے دل اس کے خلاف ہیں، اور ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں ○

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ

انہوں نے تھوڑی قیمت کے عوض اللہ کی آیتوں کو فروخت کر دیا پھر اللہ کے راستہ سے روکا بے شک وہ

سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۹ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ

بہت برے کام کرتے تھے ○ وہ نہ کسی مومن کی رشتہ داری کا لحاظ کرتے ہیں نہ اس کے کسی عہد کا پاس کرتے ہیں

وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۱۰ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا

اور یہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں ○ پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا

الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۱۱

کریں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور ہم صاحبانِ علم کے لیے تفصیل سے آیات بیان کرتے ہیں ○

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ

اور اگر یہ عہد کرنے کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمہارے دین پر طنز کریں تو تم

فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۱۲

کفر کے علم برداروں سے جنگ کرو، ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں ہے، شاید کہ وہ باز آ جائیں ○

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ

کیا تم ان لوگوں سے جنگ نہیں کرو گے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور انہوں نے رسول کو بے وطن کرنے کا قصد کیا

وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ

اور پہلی بار جنگ کی انہوں نے ہی ابتداء کی تھی، کیا تم ان سے ڈرتے ہو! سو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم

تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۱۳ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ

اس سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو ○ ان سے جنگ کرو، اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو

بِاَیۡدِیۡکُمۡ وَیُخۡزِهِمۡ وَیَنۡصُرۡکُمۡ عَلَیۡهِمۡ وَیَشۡفِ صُدُوۡرَ قَوۡمٍ

عذاب دے گا، ان کو رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمہاری مدد کرے گا، اور مومنوں کے دلوں کو

مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۴﴾ وَیُذۡهِبۡ غَیۡظَ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ وَیَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلٰی

ٹھنڈک پہنچائے گا ○ اور ان کے دلوں کے غیظ کو دُور فرمائے گا اور اللہ جس کی چاہے گا توبہ

مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۱۵﴾ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَکُوۡا وَ

قبول فرمائے گا، اور اللہ بہت جاننے والا، بے حد حکمت والا ہے ○ (اے مسلمانو!) کیا تمہارا گمان یہ ہے کہ تم (ایسے ہی) چھوڑ دیے

لَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡکُمۡ وَلَمۡ یَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ

جاؤ گے، حالانکہ اللہ نے ابھی تک تم میں سے ان لوگوں کو متمیز نہیں فرمایا جنہوں نے کامل طریقہ سے جہاد کیا ہو، اور انہوں نے اللہ، اور اس

اللّٰهِ وَلَا رَسُوۡلِهٖ وَلَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَلِیۡجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا

کے رسول، اور مومنوں کے سوا کسی کو اپنا محرم راز نہ بنایا ہو، اور اللہ تمہارے سب کاموں کی خوب

تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶﴾ ع

خبر رکھتا ہے ○

ع ۸

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک ان مشرکین کے ساتھ کیونکر کوئی عہد ہو سکتا ہے؟ ماسوا ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا تو جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی ان سے کیے ہوئے عہد کے پابند رہو، بے شک اللہ متقین کو پسند فرماتا ہے ○ (التوبہ: ۷)

ان مشرکوں کا بیان جنہوں نے معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کی اور جنہوں نے اس معاہدہ کی پابندی کی

جن لوگوں نے مسجد حرام کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد کر کے پھر اس عہد کو توڑا، ان کے متعلق امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

امام ابن اسحاق نے کہا کہ عام معاہدہ یہ کیا گیا تھا کہ نہ مسلمان مشرکوں کو حرم میں جانے سے روکیں گے اور نہ مشرک مسلمانوں کو حرم میں داخل ہونے سے روکیں گے اور نہ حرمت والے مہینوں میں جنگ کریں گے۔ یہ معاہدہ حدیبیہ کے مقام پر ہوا تھا جو مسجد حرام کے پاس ہے۔ یہ معاہدہ مسلمانوں اور قریش کے درمیان ہوا تھا۔ اس معاہدہ میں بنو بکر قریش کے حلیف تھے اور بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے، پھر معاہدہ کی مدت پوری ہونے سے پہلے بنو بکر نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا۔

اور جن لوگوں نے عہد کی پاس داری کی وہ بنو خزاعہ تھے۔ امام ابو جعفر نے کہا وہ لوگ بنو بکر کے بعض افراد تھے جن کا تعلق کنانہ سے تھا' جب بنو بکر نے بنو خزاعہ پر حملہ کیا تو کنانہ نے بنو بکر کا ساتھ نہیں دیا اور اپنے عہد پر قائم رہے۔ یہ قول اس سے اولیٰ ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سورۃ البراءۃ کا پیغام سنانے کے لیے مکہ مکرمہ گئے تھے تو اس وقت تک اہل مکہ میں سے قریش اور بنو خزاعہ سے جنگ ہو چکی تھی اور فتح مکہ کے بعد ان آیات کے نزول سے پہلے وہ سب مسلمان ہو چکے تھے' اس وقت کنانہ ہی شرک پر تھے لیکن انہوں نے چونکہ معاہدہ حدیبیہ کی پاس داری کی تھی اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا جب تک وہ عہد پر قائم رہیں تم بھی ان کے ساتھ عہد نبھاؤ اور جو شخص اپنے فرائض کی ادائیگی میں اللہ سے ڈرتا ہے اور خوف خدا سے معاہدہ کی پابندی کرتا ہے' اللہ کی نافرمانی سے اجتناب کرتا ہے' اور معاہدہ کر کے غداری نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس کو پسند کرتا ہے۔ (جامع البیان جز ۱۰ ص ۱۰۷-۱۰۶ ملخصاً' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

امام رازی متوفی ۶۰۶ھ نے لکھا ہے: جنہوں نے عہد کی پاسداری کی تھی وہ بنو کنانہ اور بنو ضمرہ تھے۔
(تفسیر کبیر ج ۵ ص ۵۳۱' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۰ھ)

جن لوگوں نے عہد شکنی کی تھی ان کے متعلق امام ابن جوزی متوفی ۵۹۷ھ نے تین قول لکھے ہیں: (۱) بنو ضمرہ' (۲) قریش' (۳) خزاعہ۔ (زاد المسیر' ج ۳ ص ۴۰۰' مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان کے عہد کا کیسے اعتبار ہو سکتا ہے' جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ جب وہ تم پر غالب ہوں تو وہ نہ تمہاری رشتہ داری کا لحاظ کریں گے اور نہ تم سے کیے ہوئے عہد کا پاس کریں گے وہ تمہیں صرف اپنی زبانی باتوں سے خوش کرتے ہیں' اور ان کے دل اس کے خلاف ہیں اور ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں ○ انہوں نے تھوڑی قیمت کے عوض اللہ کی آیتوں کو فروخت کر دیا' پھر اللہ کے راستہ سے روکا بے شک وہ بہت برے کام کرتے تھے ○ وہ نہ کسی مومن کی رشتہ داری کا لحاظ کرتے ہیں نہ اس کے کسی عہد کا پاس کرتے ہیں اور یہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں ○ (التوبہ: ۱۰-۸)

مشکل اور اہم الفاظ کے معانی

وان یظھروا علیکم: ظہر کا معنی ہے جسم کی پشت' جس سے قوت حاصل ہو اس کے لیے بھی ظہر کا استعارہ کیا جاتا ہے۔ ظھر علیہ کا معنی ہے اس پر غالب ہوا۔ (المفردات ج ۲ ص ۴۱۳) وان یظھروا علیکم کا معنی ہے اگر وہ تم پر فتح اور غلبہ حاصل کریں۔ لیظھرہ علی الدین کلہ۔ (التوبہ: ۳۳) تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر دے' ظہر کا معنی کسی چیز کو ظاہر کرنا بھی ہے' اس میں نکتہ یہ ہے کہ جس شخص کو دوسرے پر غلبہ حاصل ہوتا ہے اس کو ایک کمال حاصل ہوتا ہے اور جس کے پاس کوئی کمال ہو وہ اس کو ظاہر کرنا چاہتا ہے اور جو شخص مغلوب ہو اس کو نقص حاصل ہوتا ہے' اور نقص کو انسان چھپانا چاہتا ہے اس لیے ظہور' غلبہ اور کامیابی سے کنایہ ہوگا۔

لا یرقبوا فیکم: رقب کا معنی گردن ہے' پھر رقبہ کو غلام سے کنایہ کیا گیا' رقیب کا معنی محافظ ہے' قرآن مجید میں ہے: الا لدیہ رقیب عتید۔ (ق: ۱۸) مگر اس کے پاس اس کا محافظ (نگہبان) لکھنے کے لیے تیار ہوتا ہے' مرقب اس بلند جگہ کو کہتے ہیں جس پر کھڑا ہو کر نگہبان کسی کو جھانک کر دیکھتا ہے۔ (المفردات ج ۱ ص ۲۶۵) اس لیے رقوب کا معنی انتظار کرنا بھی ہے۔ وارتقبوا انی معکم رقیب۔ (ھود: ۹۳) اور انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں' اس آیت میں اس کا معنی حفاظت کرنا ہے یعنی وہ تمہارے قرابت کی حفاظت کریں گے اور نہ تمہارے عہد کی حفاظت کریں گے۔

الّا: الّ کا معنی ہے صاف شفاف اور چمک دار چیز' جب گھوڑا تیز دوڑے یا بجلی چمکے تو الّ کہا جاتا ہے' قسم کھا کر عہد کیا

جائے یا قرابت کو بھی اِلّ کہا جاتا ہے اور چونکہ عہد بھی غدر سے صاف اور چمکدار ہوتا ہے اس لیے اس کو بھی اِلّ کہتے ہیں' بعض لوگ کہتے ہیں کہ الّ اور ایل اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ (المفردات ج ا ص ۲۵)

ذمہ: ذمہ کا معنی ہے عہد' یعنی ہر وہ کام جو کسی شخص کو لازم ہو اور اس کے ترک کرنے کی وجہ سے اس کو مذمت کا سامنا ہو اس کو ذمہ کہتے ہیں۔

یرضونکم بافواھھم وتابی قلوبھم: یعنی وہ اپنی زبانوں سے میٹھی باتیں کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں اس کے خلاف ہوتا ہے' کیونکہ ان کے دلوں میں صرف شر اور فساد ہوتا ہے اگر ان کو موقع ملے تو وہ مسلمانوں کو زک پہنچانے میں کوئی کمی نہ کریں۔

بعض سوالوں کے جوابات

اللہ تعالیٰ نے التوبہ: ۸ کے آخر میں فرمایا ہے: اور ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں' اس پر یہ اعتراض ہے کہ ان لوگوں سے مراد ہیں مشرک اور کافر اور شرک اور کفر فسق سے بہت بڑا گناہ ہے تو مشرکین کی مذمت میں فسق کی صفت ذکر کرنا کیسے مناسب ہو گا' اس کا جواب یہ ہے کہ بعض مشرکین اور کفار اپنے دین کے قواعد کے لحاظ سے نیک ہوتے ہیں مثلاً وہ امانت دار ہوں' سچ بولتے ہوں اور عہد پورا کرتے ہوں' اور بعض مشرکین اپنے دین کے قواعد کے اعتبار سے بھی بدکار اور اخبث ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ جھوٹ بولتے ہوں اور عہد شکنی کرتے ہوں' سو یہ مشرکین شرک کرنے کے علاوہ اپنے دین کے قواعد کے اعتبار سے بھی فاسق ہیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں' تو کیا تمام مشرک فاسق نہیں ہیں۔ اس کا جواب بھی پہلے اعتراض کے جواب سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ مشرکین میں سے بعض لوگ اپنے دین کے قواعد کے اعتبار سے نیک ہوتے ہیں۔ مثلاً امانت دار ہوں' سچے ہوں اور عہد پورا کرنے والے ہوں لیکن مشرکین میں سے اکثر فاسق ہوتے ہیں جو جھوٹے' خائن اور عہد شکن ہوتے ہیں۔

التوبہ: ۹ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: انہوں نے تھوڑی قیمت کے عوض اللہ کی آیتوں کو فروخت کر دیا' اگر اس سے مراد یہود ہوں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ تورات کی آیات کی عمداً غلط تشریح کرتے تھے اور جب ان سے پوچھا جاتا کہ تورات میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا صفات بیان کی ہیں تو وہ دجال کی صفات بیان کر دیتے تاکہ ان کے عام لوگ ان کے دین سے برگشتہ نہ ہوں' لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ کلام کا سیاق و سباق یہود کے متعلق نہیں ہے بلکہ ان مشرکین کے متعلق ہے جنہوں نے معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مشرکین کے لیے یہ موقع حاصل تھا کہ وہ اللہ کی آیات پر ایمان لے آتے لیکن وہ دنیاوی مفاد کی خاطر اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لائے اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: انہوں نے تھوڑی قیمت کے عوض اللہ کی آیات کو فروخت کر دیا' نیز ان کے متعلق فرمایا: اور یہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں' اس سے مراد ان کی دیگر برائیوں کے علاوہ عہد شکنی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور ہم صاحبان علم کے لیے تفصیل سے آیات بیان کرتے ہیں ○ (التوبہ: ۱۱)

اہل قبلہ کی تکفیر اور عدم تکفیر میں مذاہب

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس آیت نے اہل قبلہ کا خون حرام کر دیا۔

(جامع البیان جز ١٠ ص ١١٢، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ١٤١٥ھ)

اس آیت سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص شرک اور کفر سے تائب ہو، نماز پڑھے اور زکوٰۃ ادا کرے وہ مسلمانوں کا دینی بھائی ہے، اس کی تکفیر جائز نہیں ہے۔

علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی ٧٩١ھ لکھتے ہیں:

اہلسنت و جماعت کے قواعد میں سے یہ ہے کہ اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر قرار دینا جائز نہیں ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں:

ان کا یہ کہنا کہ اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں، پھر یہ کہنا کہ جو شخص قرآن کو مخلوق کہے، یا آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دیدار کو محال کہے یا حضرت ابوبکر اور عمر کو گالی دے یا ان کو لعنت کرے وہ کافر ہے، ان دونوں قولوں کو جمع کرنا مشکل ہے۔

(شرح عقائد نسفی ص ١٢٢-١٢١، مطبوعہ کراچی)

علامہ عبد العزیز پرہاروی نے اس کے حسب ذیل جواب دیئے ہیں:

(١) اہل قبلہ کو کافر نہ کہنا شیخ اشعری اور ان کے متبعین کا مذہب ہے اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے بھی المنتقیٰ میں اسی طرح منقول ہے، اور فقہاء نے ان لوگوں کو کافر کہا ہے، اس لیے تعارض نہیں ہے۔

(٢) قرآن مجید کا کلام اللہ ہونا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہونا، کتاب، سنت اور اجماع سلف کے دلائل قطعیہ سے ثابت اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا ایمان اور ان کا شرف عظیم بھی دلائل قطعیہ سے ثابت ہے، سو جو شخص ان امور کا منکر ہو وہ اللہ اور اس کے رسول کا مصدق نہیں ہے اور اس کا اہل قبلہ سے ہونا معتبر نہیں ہے۔

(٣) فقہاء نے جو تکفیر کی ہے وہ تغلیظ اور تہدید پر محمول ہے، اس کا ظاہر مراد نہیں ہے۔

(نبراس ص ٥٧٢، مطبوعہ شاہ عبد الحق اکیڈمی بندیال، ١٣٩٧ھ)

ملا علی بن سلطان محمد القاری متوفی ١٠١٤ھ لکھتے ہیں:

اہل قبلہ سے مراد وہ مسلمان ہیں جو ضروریات دین پر متفق ہوں مثلاً عالم کا حادث ہونا، قیامت کے بعد لوگوں کا دوبارہ زندہ ہونا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کو تمام کلیات اور جزئیات کا علم ہے، اور اس طرح کے دیگر اعتقادی امور، پس جو شخص ساری عمر لمبی لمبی عبادات اور ریاضات میں مشغول رہا حالانکہ اس کا اعتقاد یہ تھا کہ یہ عالم قدیم ہے یا اس کا اعتقاد تھا کہ حشر نہیں ہو گا یا اس کا یہ اعتقاد تھا کہ اللہ سبحانہ کو جزئیات کا علم نہیں ہے وہ اہل قبلہ سے نہیں ہے۔ (اسی طرح جو شخص غلام احمد قادیانی کو نبی یا مجدد مانتا ہے یا جو شخص قرآن مجید کی تحریف کا قائل ہے یا حضرت عائشہ پر بدکاری کی تہمت لگاتا ہے، یا یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد چھ کے سوا تمام صحابہ مرتد ہو گئے تھے یا جو شخص ائمہ اربعہ کے مقلدین کو حقیقتاً مشرک کہتا ہے یا جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں صریح کلمات کفریہ کہتا ہے ایسے تمام لوگ قرآن مجید کے مصدق نہیں ہیں خواہ وہ ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہوں لیکن وہ اہل قبلہ سے نہیں ہیں) اور اہل سنت نے جو یہ کہا ہے کہ اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کی جائے گی اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک اس میں کفر کی علامات اور کفر کی وجوہات نہیں پائی جائیں گی اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی، ہم نے جو اصول بیان کیے ہیں اہل قبلہ ان پر متفق ہیں، ان کا دیگر اصول میں اختلاف ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی صفات، اعمال کا مخلوق ہونا، اس کے ارادہ کا عموم، اللہ کے کلام کا قدیم ہونا اور آخرت میں اس کے دیدار کا ممکن ہونا، اس قسم کے اور دیگر امور جن کے متعلق اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حق صرف ایک ہے، اور اس میں بھی ان کا اختلاف ہے

کہ جو ان امور میں حق کا منکر ہو اس کی تکفیر کی جائے گی یا نہیں۔ امام اشعری اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ ان امور میں جو حق کا منکر ہو وہ کافر نہیں ہے۔ امام شافعی کے ایک قول سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے کہا ہے کہ اہل الاھواء (نئے مذاہب اختیار کرنے والوں) میں سے میں صرف خطابیہ کی شہادت کو مسترد کرتا ہوں کیونکہ وہ جھوٹ بولنے کو حلال کہتے ہیں اور المنتقیٰ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے یہ منقول ہے کہ ہم اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے اور اکثر فقہاء کا اسی پر اعتماد ہے اور ہمارے بعض اصحاب ان امور میں مخالفین کو کافر کہتے ہیں اور قدماء معتزلہ انہیں کافر کہتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی صفات قدیمہ کے قائل تھے اور اعمال کو مخلوق کہتے تھے اور استاذ ابواسحٰق نے کہا ہم اس کو کافر کہیں گے جو ہمیں کافر کہے اور جو ہمیں کافر نہ کہے ہم اس کو کافر نہیں کہیں گے، اور امام رازی کا مختار یہ ہے کہ اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہ کی جائے، اور اصل اشکال کا جواب یہ ہے کہ تکفیر نہ کرنا متکلمین کا مذہب ہے اور تکفیر کرنا فقہاء کا مذہب ہے، پس کوئی تعارض نہیں ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ تکفیر کرنا مخالفین کے رد میں تغلیظ کے لیے ہے اور تکفیر نہ کرنا اہل قبلہ کے احترام کے لیے ہے، کیونکہ وہ بعض امور میں ہمارے موافق ہیں۔ (شرح فقہ اکبر ص ١٥٥۔ ١٥٤، مطبوعہ مصر)

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ٣١٠ھ روایت کرتے ہیں:

ابن زید نے کہا نماز اور زکوٰۃ دونوں فرض کی گئی ہیں اور ان کی فرضیت میں فرق نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ نے بغیر زکوٰۃ کے نماز کو قبول کرنے سے انکار فرما دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے وہ کس قدر زیادہ فقیہ تھے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم کو نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جو شخص زکوٰۃ ادا نہ کرے اس کی نماز مقبول نہیں ہے۔ (جامع البیان جز ١٠ ص ١١٣۔ ١١٢، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ١٤١٥ھ)

صحابہ کرام کو دینی بھائی کے بجائے میرے اصحاب کیوں فرمایا؟

اس آیت میں توبہ کرنے والوں، نماز قائم کرنے والوں اور زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے متعلق فرمایا وہ تمہارے دینی بھائی ہیں، بظاہر ایک حدیث اس آیت کے خلاف ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبرستان تشریف لے گئے اور فرمایا: السلام علیکم اے مومنو! ہم بھی ان شاء اللہ تمہارے پاس آنے والے ہیں، میری خواہش ہے کہ ہم اپنے دینی بھائیوں کو دیکھیں۔ صحابہ کرام نے پوچھا: یارسول اللہ! کیا ہم آپ کی دینی بھائی نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: تم میرے صحابہ ہو اور ہمارے (دینی) بھائی وہ لوگ ہیں جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئے... الحدیث۔

(صحیح مسلم، الطہارۃ: ٣٩ (٢٤٩) ٥٧٣، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ٤٣٠٦، مسند احمد ج ٢ ص ٤٠٨، سنن کبریٰ ج ٤ ص ٧٨)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد کے مسلمانوں کو اپنا دینی بھائی فرمایا اور صحابہ کو دینی بھائی نہیں فرمایا حالانکہ جن مشترک اوصاف کی وجہ سے آپ نے بعد کے مسلمانوں کو اپنا دینی بھائی فرمایا وہ اوصاف صحابہ کرام میں بھی تھے بلکہ زیادہ احسن اور زیادہ اکمل تھے، اس کے باوجود آپ نے فرمایا کہ تم میرے اصحاب ہو دینی بھائی تو بعد کے لوگ ہیں، کیونکہ دینی بھائی ہونے میں صحابہ کرام کی کوئی انفرادیت اور خصوصیت نہیں تھی، وہ تو قیامت تک کے سارے مسلمان ہیں ان کی خصوصیت صحابی ہونے میں تھی، کیونکہ بعد کے مسلمان کتنے ہی کامل کیوں نہ ہوں درجہ صحابیت کو نہیں پا سکتے۔

کسی شخص کے تعارف میں اس کی خصوصی صفات ذکر کی جائیں

اس حدیث سے یہ قاعدہ مستنبط ہوتا ہے کہ جب کسی شخص کے اوصاف کا ذکر کیا جائے تو ان اوصاف کا ذکر کرنا چاہیے

جو اس کے خصوصی اوصاف ہوں نہ کہ وہ اوصاف جو کہ عام ہوں، مثلاً کسی مفتی اور عالم کا ذکر کیا جائے اور کہا جائے کہ یہ لکھنے پڑھنے والے ہیں تو یہ درست نہیں ہے کیونکہ لکھنے پڑھنے والے تو بہت لوگ ہیں، اس کی خصوصیت مفتی اور عالم ہونے میں ہے، اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں اگر آپ کو صرف بشر کہا جائے تو یہ درست نہیں ہے، بشری تو مسلمانوں کے ساتھ بھی خصوصیت نہیں ہے کیونکہ کافر بھی بشر ہیں، آپ کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ سید البشر ہیں، بشر کامل ہیں، افتخار بشر ہیں، بشر تو اپنی جگہ ہے صرف نبی ہونا بھی آپ کی خصوصیت نہیں ہے، آپ سید الانبیاء ہیں، قائد المرسلین ہیں، خاتم النبیین ہیں، سو جب آپ کا ذکر کیا جائے تو آپ کے خصوصی اوصاف کے ساتھ آپ کا ذکر کیا جائے کیونکہ عام اوصاف کے ساتھ تو آپ نے اپنے صحابہ کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر یہ عہد کرنے کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمہارے دین پر طنز کریں تو تم کفر کے علم برداروں سے جنگ کرو ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں ہے شاید کہ وہ باز آ جائیں O (التوبہ: ۱۲)

کفر کے علم برداروں کا مصداق

جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا تھا کہ وہ تم سے جنگ نہیں کریں گے اور تمہارے خلاف تمہارے دشمنوں کی مدد نہیں کریں گے اور وہ مشرک اس معاہدہ کو توڑ دیں اور تمہارے دین اسلام کی مذمت اور برائی کریں تو تم کفر کے ان علم برداروں سے جنگ کرو کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس طرح تمہارے دین کی مذمت کرنے سے اور تمہارے خلاف تمہارے دشمنوں کی مدد کرنے سے باز آ جائیں۔ قتادہ نے کہا کفر کے ان علم برداروں سے مراد ابوسفیان بن حرب، امیہ بن خلف، عتبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام اور سہیل بن عمرو ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کر کے توڑا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکالنے کا قصد کیا۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۲۸۳۷) نکث کا معنی ہے نقض اور توڑنا، جب کوئی شخص اپنی مضبوط رسی کو توڑ دے تو اس موقع پر نکث کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

توہین رسالت کرنیوالے غیر مسلم کو اسلامی ملک میں قتل کرنے کے ثبوت میں احادیث اور آثار

امام رازی نے لکھا ہے کہ زجاج نے کہا ہے کہ جب ذمی دین اسلام میں طعن کرے تو یہ آیت اس کے قتل کو واجب کرتی ہے کیونکہ ان کی جان اور مال کی حفاظت کا جو مسلمانوں نے عہد کیا تھا وہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھا کہ وہ دین اسلام میں طعن نہیں کرے گا اور جب اس نے دین اسلام میں طعن کیا تو اس نے اپنے عہد کو توڑ دیا۔

(تفسیر کبیر ج ۵ ص ۵۳۵، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

میں کہتا ہوں کہ اس آیت کی رو سے اسلامی ملک میں رہنے والے ان غیر مسلموں کو بھی قتل کرنا واجب ہے جو ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا انبیاء سابقین میں سے کسی نبی کی بھی توہین کریں یعنی ان کی شان کے خلاف کوئی ایسا لفظ بولیں یا لکھیں جو لفظ عرف میں توہین کے لیے متعین ہو، اور حسب ذیل احادیث اور آثار اس پر شاہد ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کعب بن اشرف کو کون قتل کرے گا؟ کیونکہ اس نے اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دی ہے۔ حضرت محمد بن مسلمہ نے کہا یا رسول اللہ! کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس کو قتل کر دوں؟ آپ نے فرمایا ہاں! حضرت محمد بن مسلمہ، کعب کے پاس گئے اور کہا اس شخص نے یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تھکا دیا ہے اور ہم سے صدقہ کا سوال کرتا رہتا ہے، نیز کہا بخدا تم اس کو ضرور ملال میں ڈال دو گے، اور کہا ہم نے اس کی پیروی کی ہے اور اب ہم اس کو چھوڑنا ناپسند کرتے ہیں، حتیٰ کہ ہم جان لیں کہ آخر کار ان کا ماجرا کیا ہو گا، وہ

اسی طرح کعب بن اشرف سے باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ موقع پا کر اس کو قتل کر دیا۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث ۲۵۱۰، ۳۰۳۱، ۳۰۳۲، ۴۰۳۷، صحیح مسلم رقم الحدیث ۱۸۰۱، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۷۶۸)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک نابینا کی باندی ام ولد تھی، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو برا کہتی تھی اور آپ کو سب و شتم کرتی تھی۔ وہ نابینا اس کو منع کرتے رہتے تھے اور وہ باز نہیں آتی تھی۔ ایک رات جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کر رہی تھی انہوں نے ایک مغول (گیتی یا بھادو، پیکان والی لاٹھی) لے کر اس کو اس کے پیٹ پر رکھ کر دبایا حتیٰ کہ اس کو قتل کر دیا اور اس کی ٹانگوں میں ایک بچہ آ کر اس کے خون میں لتھڑ گیا۔ صبح کو لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ آپ نے سب لوگوں کو جمع کر کے فرمایا: جس شخص نے بھی یہ کام کیا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ کھڑا ہو جائے۔ وہ نابینا لوگوں کو پھلانگتا ہوا آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور کہا یا رسول اللہ! میں اس باندی کا مالک ہوں! وہ آپ کو سب و شتم کرتی تھی اور برا کہتی تھی۔ میں اس کو منع کرتا تھا لیکن وہ باز نہیں آتی تھی اور اس سے موتیوں کی مانند میرے دو بچے بھی ہوئے اور وہ میری رفیقہ تھی۔ گزشتہ رات وہ پھر آپ کو سب و شتم کر رہی تھی اور برا کہہ رہی تھی۔ میں نے اس کے پیٹ پر گیتی رکھ کر اس کو دبایا حتیٰ کہ اس کو قتل کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سنو! گواہ ہو جاؤ کہ اس کا خون رائیگاں ہے۔ (یعنی اس کا کوئی قصاص یا تاوان نہیں ہوگا)
(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۳۶۱، سنن نسائی رقم الحدیث: ۴۰۸۱، المطالب العالیہ رقم الحدیث: ۱۹۸۵)

حضرت عرفہ بن الحارث کو مصر کا ایک نصرانی ملا جس کا نام مذقون تھا، انہوں نے اس کو اسلام کی دعوت دی۔ اس نصرانی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی۔ انہوں نے حضرت عمرو بن العاص کے پاس یہ معاملہ پیش کیا۔ انہوں نے حضرت عرفہ سے کہا ہم ان سے عہد کر چکے ہیں۔ حضرت عرفہ نے کہا ہم اس سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی ایذاء پر عہد کریں، ہم نے ان سے صرف اس بات کا عہد کیا تھا کہ ہم ان کو ان کے گرجوں میں عبادت کرنے دیں گے، اور اس بات کا عہد کیا تھا کہ ہم ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالیں گے اور اس بات کا عہد کیا تھا کہ ہم ان کی حفاظت کے لیے لڑیں گے، اور اس بات کا عہد کیا تھا کہ وہ آپس میں اپنے مذہب کے مطابق عمل کریں گے لیکن جب وہ ہمارے پاس آئیں گے تو ہم ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ حضرت عمرو بن العاص نے کہا: تم نے سچ کہا۔
(المعجم الاوسط ج ۹ رقم الحدیث: ۸۷۴۳، مطبوعہ ریاض، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ۲۰۰، المطالب العالیہ رقم الحدیث: ۱۹۸۷)

حضرت عمیر بن امیہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی بہن مشرکہ تھی، جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتے تو وہ آپ کو سب و شتم کرتی اور آپ کو برا کہتی۔ انہوں نے ایک دن اس کو تلوار سے قتل کر دیا، اس کے بیٹے کھڑے ہوئے اور کہنے لگے ہم کو معلوم ہے اس کو کس نے قتل کیا ہے۔ کیا امن دینے کے باوجود اس کو قتل کیا گیا ہے، اور ان لوگوں کے ماں باپ مشرک تھے، حضرت عمیر کو یہ خوف ہوا کہ یہ لوگ کسی اور بے قصور کو قتل کر دیں گے، انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر اس واقعہ کی خبر دی، آپ نے فرمایا: کیا تم نے اپنی بہن کو قتل کیا تھا؟ میں نے کہا: ہاں! آپ نے پوچھا کیوں؟ میں نے کہا یا رسول اللہ! وہ آپ کے متعلق مجھے ایذاء پہنچاتی تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹوں کے پاس کسی کو بھیجا تو انہوں نے کسی اور کا نام لیا جو اس کا قاتل نہیں تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خون کو رائیگاں قرار دیا۔
(المعجم الکبیر ج ۱۷، رقم الحدیث ۱۲۴، ص ۶۵، ۶۴، مطبوعہ بیروت)

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک یہودیہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرتی تھی۔ ایک شخص نے اس کا گلا گھونٹ دیا حتی کہ وہ مرگئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خون کو رائیگاں قرار دیا۔
(السنن الکبریٰ ج ۹ ص ۲۰۰، طبع بیروت)

حصین بن عبدالرحمن بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر کے پاس ایک راہب کو لایا گیا اور بتایا گیا کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرتا ہے۔ انہوں نے کہا اگر میں سنتا تو اس کو قتل کر دیتا۔ ہم نے ان کو اس لیے امان نہیں دی کہ یہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کریں۔ (المطالب العالیہ رقم الحدیث: ۱۹۸۶، طبع بیروت)

توہین رسالت کرنے والے غیر مسلم کو اسلامی ملک میں قتل کرنے کے متعلق مذاہب فقہاء

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

علامہ ابن المنذر نے کہا ہے کہ عام اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ جس شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دی اس کو قتل کرنا واجب ہے۔ امام مالک، لیث، امام احمد اور اسحاق کا یہی قول ہے اور یہی امام شافعی کا مذہب ہے اور امام ابوحنیفہ سے یہ منقول ہے کہ جو ذمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دے اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں کہ اکثر علماء کا یہ مذہب ہے کہ جو ذمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دے، یا آپ کو تعریضاً اور کنایتاً برا کہے یا آپ کی شان میں کمی کرے یا آپ کی ایسی صفت بیان کرے جو کفر ہو تو اس کو قتل کر دیا جائے گا کیونکہ ہم نے اس بات پر اس کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا نہ اس پر اس سے معاہدہ کیا ہے، البتہ امام ابوحنیفہ، ثوری اور اہل کوفہ میں سے ان کے متبعین نے کہا ہے کہ اس کو قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس کا مذہب جس پر وہ قائم ہے، وہ شرک ہے اور وہ سب سے بڑا جرم ہے لیکن اس کو سزا دی جائے گی اور اس پر تعزیر لگائی جائے گی۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۸ ص ۲۱-۲۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

میں کہتا ہوں کہ جمہور فقہاء احناف نے امام ابوحنیفہ کے اس قول پر فتویٰ نہیں دیا بلکہ ان کا یہی مسلک ہے کہ جو ذمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرے وہ واجب القتل ہے اور توہین سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے عقیدہ کفریہ اور شرک کے علاوہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی ایسی بات کہے جو عرف میں توہین ہو۔

توہین رسالت کرنے والے غیر مسلم کو اسلامی ملک میں قتل کرنے کے متعلق فقہاء احناف کا مذہب

علامہ برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی الحنفی المتوفی ۵۹۳ھ لکھتے ہیں:

جو ذمی جزیہ ادا کرنے سے رک جائے یا کسی مسلمان کو قتل کردے یا کسی مسلمان عورت سے زنا کرے تو اس کا عہد نہیں ٹوٹے گا، جس غایت کی وجہ سے اس سے قتال موقوف ہوا ہے وہ جزیہ کا التزام ہے نہ کہ اس کو ادا کرنا اور التزام باقی ہے، اور امام شافعی نے کہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینا، عہد ذمہ کو توڑنا ہے اور جب اس نے عہد توڑ دیا تو اس کو دی ہوئی امان بھی ٹوٹ گئی، اس نے ذمہ کا عقد کر کے اس کی خلاف ورزی کی، اور ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینا اس کا کفر ہے، اور جو کفر ابتداً اس کے ساتھ قائم تھا وہ اس عقد ذمہ سے مانع نہیں تھا جو کفر بعد میں طاری ہوا وہ بھی اس عقد سے مانع نہیں ہوگا لہٰذا اس کفر طاری سے اس کا عہد ذمہ نہیں ٹوٹے گا۔ (ہدایہ اولین ص ۵۹۸، مطبوعہ شرکت علمیہ ملتان)

علامہ کمال الدین محمد بن عبدالواحد المعروف بابن الہمام الحنفی المتوفی ۸۶۱ھ لکھتے ہیں:

اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا السام علیک (سام کے معنی موت ہیں، یعنی تم کو موت آئے) آپ نے فرمایا: وعلیکم (یعنی تم پر) حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے سمجھ لیا تھا انہوں نے کیا کہا ہے۔ میں نے کہا علیکم السام واللعنۃ (یعنی تم پر موت آئے اور لعنت ہو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ٹھہرو اے عائشہ! بے شک اللہ تعالیٰ ہر معاملہ میں نرمی کو پسند فرماتا ہے۔ حضرت عائشہ نے کہا میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ نے سنا نہیں انہوں نے کیا کہا تھا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اس کا جواب دے چکا ہوں وعلیکم۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٦٠٢٤، صحیح مسلم رقم الحدیث: ٢١٦٥، سنن الترمذی رقم الحدیث: ٢٧٠١، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ٣٦٨٨، شرح السنہ رقم الحدیث: ٣٣١٣، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ١٩٤٦٠، مسند احمد ج ٦ ص ٨٥، سنن بیہقی ج ٩ ص ٢٠٣)

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ یہود کا توہین پر مبنی کلمہ تھا، اور اگر اس سے عہد ذمہ ٹوٹ جاتا، تو آپ ان کو قتل کر دیتے، کیونکہ اس صورت میں وہ حربی ہو چکے تھے، اس پر یہ اعتراض ہے کہ حضرت ابن عمر سے ایک شخص نے کہا: میں نے سنا کہ ایک راہب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دے رہا تھا، حضرت ابن عمر نے فرمایا اگر میں سنتا تو اس کو قتل کر دیتا، ہم نے ان سے اس پر عہد نہیں کیا تھا۔ (المطالب العالیہ رقم الحدیث: ١٩٨٦) علامہ ابن ہمام جواب دیتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور ہو سکتا ہے کہ حضرت ابن عمر نے ان سے عہد میں یہ شرط لگائی ہو کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سب و شتم نہیں کریں گے۔ (علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:) اس مسئلہ میں جو میرا مذہب ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرے یا اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرے یا کسی ایسی چیز کی جو اس کی شان کے لائق نہیں، جب ذمی ایسی بات کو ظاہر کرے گا تو اس کا عہد ٹوٹ جائے گا اور اس کو قتل کر دیا جائے گا اور اگر وہ اس کا اظہار نہ کرے وہ چھپا کر ایسی بات کہہ رہا ہو اور کوئی اس پر مطلع ہو جائے تو پھر اس کا عہد نہیں ٹوٹے گا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سے جزیہ اس شرط کے ساتھ قبول کیا گیا تھا کہ وہ ذلت کے ساتھ رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۔ (التوبہ: ٢٩)

حتیٰ کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں درآنحالیکہ وہ ذلیل ہوں۔

اور اللہ اور رسول پر سب و شتم کرنے کا اظہار کرنا جزیہ قبول کرنے کی شرط اور ان سے قتل کی مدافعت کے منافی ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ وہ چھوٹے بن کر رہیں اور ذلت سے جزیہ دیں، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں جن یہود کا ذکر کیا گیا ہے وہ ذمی نہ تھے اور نہ جزیہ ادا کرتے تھے، بلکہ ان سے مال لیے بغیر دفع شر کے لیے ان سے صلح کی گئی تھی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان پر قادر کر دیا۔ اور اس بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب کوئی ذمی مسلمانوں کے خلاف سرکشی کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے کیونکہ ان سے قتل کو اس صورت میں دور کیا گیا ہے کہ وہ چھوٹے بن کر ذلت سے رہیں۔

(فتح القدیر ج ٦ ص ٥٩-٥٨، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ١٤١٥ھ)

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ٨٥٥ھ لکھتے ہیں:

اس مسئلہ میں حق اصحاب شافعی کے ساتھ ہے، امام شافعی نے کہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرنا عہد کو توڑنا ہے، اگر وہ بالفرض مسلمان بھی ہوتا تو اس کی امان ٹوٹ جاتی، اسی طرح ذمی کی امان بھی ٹوٹ جائے گی۔ امام مالک اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔ (بنایہ، ج ٦ ص ٦٩٠-٦٨٩، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ١٤١١ھ)

علامہ بدرالدین عینی حنفی نے مزید لکھا ہے:
امام شافعی نے کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرنے سے ذمی کا عہد ٹوٹ جائے گا کیونکہ اس سے ایمان جاتا رہتا ہے تو امان بطریق اولیٰ نہیں رہے گی، اور یہی امام مالک اور امام احمد کا قول ہے اور میں نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے، کیونکہ جب کوئی مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرے تو اس کی تکفیر کر دی جائے گی اور اگر حاکم اس کو قتل کرنے کا حکم دے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا تو اگر کسی دین کے دشمن اور مجرم (غیر مسلم ذمی) سے یہ سب و شتم صادر ہو تو اس کو قتل کیوں نہیں کیا جائے گا؟ (شرح العینی علی کنز الدقائق ج ۱ ص ۲۵۸، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی)

علامہ ابن ہمام حنفی اور علامہ عینی حنفی نے دلائل کے ساتھ اس مسئلہ میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اختلاف کیا ہے اور اس سے یہ واضح ہو گیا کہ یہ فقہاء کرام محض مقلد جامد نہیں ہیں اور یہ امام اعظم کی ان ہی مسائل میں موافقت کرتے ہیں جہاں امام اعظم کا قول قرآن اور حدیث پر مبنی ہو، اور جہاں امام اعظم کا قول قرآن و حدیث کے مطابق نہ ہو وہاں ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ شمس الائمہ سرخسی، علامہ حصکفی اور علامہ شامی نے بھی سب و شتم کرنے والے ذمی کے قتل کو جائز لکھا ہے۔ البتہ علامہ ابن نجیم نے علامہ عینی کے اس قول کا رد کیا ہے کہ ''میں نے اسی قول کو اختیار کیا ہے'' اور علامہ شامی نے علامہ عینی کا دفاع کیا، اس کی تفصیل بھی عنقریب ہم ذکر کریں گے۔

شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی حنفی متوفی ۴۸۳ھ لکھتے ہیں:
اس طرح اگر کوئی عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہراً سب و شتم کرتی ہو تو اس کو قتل کرنا جائز ہے۔ کیونکہ ابواسحٰق ہمدانی نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہا یا رسول اللہ! میں نے ایک یہودی عورت کو سنا وہ آپ کو گالی دے رہی تھی اور بخدا یا رسول اللہ! وہ میرے ساتھ نیکی کرتی تھی لیکن میں نے اس کو قتل کر دیا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خون کو رائیگاں قرار دیا۔
(شرح السیر الکبیر ج ۴ ص ۴۱۸-۴۱۷، مطبوعہ افغانستان، ۱۴۰۵ھ)

علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں:
میں اس کے ساتھ ہوں جو یہ کہتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سب و شتم کرنے والے کو مطلقاً قتل کرنا جائز ہے۔
(عمدۃ القاری ج ۱۳ ص ۱۷، مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر، ۱۳۴۸ھ)

علامہ محمد بن علی بن محمد الحصکفی الحنفی المتوفی ۱۰۸۸ھ لکھتے ہیں:
ہمارے نزدیک حق یہ ہے کہ جب کوئی شخص علی الاعلان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا کیونکہ سیر، ذخیرہ میں یہ تصریح ہے کہ امام محمد نے فرمایا جب کوئی عورت علی الاعلان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا کیونکہ روایت ہے کہ حضرت عمر بن عدی نے سنا کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دیتی تھی، انہوں نے رات میں اس کو قتل کر دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فعل کی تعریف فرمائی۔
(الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۳ ص ۲۸۰-۲۷۹، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۹ھ)

علامہ سید محمد امین ابن عابدین حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:
جو شخص علی الاعلان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرے یا عادتاً سب و شتم کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا خواہ وہ عورت ہو۔ (ردالمحتار ج ۳ ص ۲۷۸، مطبوعہ بیروت، ۱۴۰۹ھ)

نیز علامہ شامی لکھتے ہیں:

علامہ ابن نجیم نے لکھا ہے کہ علامہ عینی نے یہ کہا ہے کہ میں نے اس قول کو اختیار کیا ہے جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرے اس کو قتل کر دیا جائے، علامہ ابن نجیم نے کہا کہ علامہ عینی کے اس قول کی کسی روایت (فقہیہ) میں اصل نہیں ہے، علامہ شامی فرماتے ہیں کہ ابن نجیم کا یہ قول فاسد ہے کیونکہ تمام فقہاء احناف نے یہ تصریح کی ہے کہ اس شخص پر تعزیر لگائی جائے گی اور اس کو سزا دی جائے گی اور یہ قول اس پر دلالت کرتا ہے کہ دوسروں کی عبرت کے لیے اس کو قتل کرنا جائز ہے کیونکہ جب جرم بڑا ہو تو تعزیر کی قتل تک ترقی جائز ہے۔

(منحۃ الخالق علی البحر الرائق ج ۵ ص ۱۱۵، مطبوعہ کوئٹہ)

ایک انگریز نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک سخت توہین آمیز عبارت لکھی۔ ایک مسلمان ممتحن نے انگریزی سے عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے اس عبارت پر مشتمل امتحانی پرچہ بنایا۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی سے اس کے متعلق سوال کیا گیا۔ سوال اور جواب حسب ذیل ہیں:

مسئلہ: از جونپور ملاٹولہ مرسلہ مولوی عبدالاول صاحب ۶ رمضان مبارک ۳۵ھ

یہ جواب صحیح ہے یا نہیں اگر صحیح ہو تو اور بھی دلائل سے مبرہن و مزین فرما کر مہر و دستخط سے ممتاز فرمایا جائے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں ایک شخص مسلمان ممتحن نے زیر نگرانی دو شخص مسلمان کے پرچہ زبان دانی انگریزی سے عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے مرتب کیا جس میں سب سے بڑے سوال جس میں نصف نمبر رکھے تھے، حضرت رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان مبارک میں گستاخی اور توہین کے فقرات استعمال کیے تاکہ مسلمان طالب علم لامحالہ مجبور ہو کر اپنے قلم سے جناب رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی معصوم و مقدس شان میں بدگوئی لکھیں جو برائے فتویٰ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

اس سخت توہین آمیز عبارت کو نقل کرنے کا اس عاجز میں حوصلہ نہیں ہے، جو قارئین اس عبارت کو پڑھنا چاہیں وہ فتاویٰ رضویہ ج ۶ ص ۷۳ میں ملاحظہ فرمائیں، اعلیٰ حضرت کا جواب درج ذیل ہے:

الجواب: رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُبِکَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ وَاَعُوْذُبِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ○ وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ○ اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا○ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ○ ان نام کے مسلمان کہلانے والوں میں جس شخص نے وہ ملعون پرچہ مرتب کیا وہ کافر مرتد ہے، جس نے اس پر نظر ثانی کر کے برقرار رکھا وہ کافر مرتد، جس جس کی نگرانی میں تیار ہوا وہ کافر مرتد، طلبہ میں جو کلمہ گو تھے اور انہوں نے بخوشی اس ملعون عبارت کا ترجمہ کیا، اپنے نبی کی توہین پر راضی ہوئے یا اسے ہلکا جانا یا اسے اپنے نمبر گھٹنے یا پاس نہ ہونے سے آسان سمجھا وہ سب بھی کافر مرتد، بالغ ہوں خواہ نابالغ، ان چاروں فریق میں ہر شخص سے مسلمانوں کو سلام کلام حرام، میل جول حرام، نشست برخاست حرام، بیمار پڑے تو اس کی عیادت کو جانا حرام، مرجائے تو اس کے جنازے میں شرکت حرام، اسے غسل دینا حرام، کفن دینا حرام، اس پر نماز پڑھنا حرام، اس کا جنازہ اٹھانا حرام، اسے مسلمانوں کے گورستان میں دفن کرنا حرام، مسلمانوں کی طرح اس کی قبر بنانا حرام، اسے مٹی دینا حرام، اس پر فاتحہ حرام، اسے کوئی ثواب پہنچانا حرام بلکہ خود کفر و قاطع اسلام، جب ان میں کوئی مرجائے اس کے اعزہ اقربا مسلمین اگر حکم شرع مانیں تو اس کی لاش دفع عفونت کے لیے مردار کتے کی طرح بھنگی چماروں سے ٹھیلے میں اٹھوا کر کسی تنگ گڑھے میں ڈلوا کر اوپر سے آگ پتھر جو چاہیں

پھینک پھینک کرپاٹ دیں کہ اس کی بدبو سے ایذا نہ ہو- یہ احکام ان سب کے لیے عام ہیں اور جو جوان میں نکاح کیے ہوئے ہوں ان سب کی جوروئیں ان کے نکاحوں سے نکل گئیں، اب اگر قربت ہوگی حرام حرام حرام و زنائے خالص ہوگی اور اس سے جو اولاد پیدا ہوگی ولد الزنا ہوگی، عورتوں کو شرعاً اختیار ہے کہ عدت گزر جانے پر جس سے چاہیں نکاح کرلیں، ان میں جسے ہدایت ہو اور توبہ کرے اور اپنے کفر کا اقرار کرتا ہوا پھر مسلمان ہو اس وقت یہ احکام جو اس کی موت سے متعلق تھے منتہی ہوں گے اور وہ ممانعت جو اس سے میل جول کی تھی جب بھی باقی رہے گی یہاں تک کہ اس کے حال سے صدق ندامت و خلوص توبہ و صحت اسلام ظاہر و روشن ہو مگر عورتیں اس سے بھی نکاح میں واپس نہیں آسکتیں، انہیں اب بھی اختیار ہوگا کہ چاہیں تو دوسرے نکاح کرلیں یا کسی سے نہ کریں، ان پر کوئی جبر نہیں پہنچتا، ہاں ان کی مرضی ہو تو بعد اسلام ان سے بھی نکاح کر سکیں گی-

وجیز امام کردری جلد ۳ ص ۳۲۱ میں مذکور ہے:

جو شخص معاذاللہ مرتد ہو جائے اس کی عورت حرام ہو جاتی ہے، پھر اسلام لائے تو اس سے تجدید نکاح کیا جائے- اس سے پہلے اس کلمۂ کفر کے بعد کی صحبت سے جو بچہ ہوگا حرامی ہوگا اور یہ شخص اگر عادت کے طور پر کلمہ شہادت پڑھتا رہے کچھ فائدہ نہ دے گا جب تک اپنے اس کفر سے توبہ نہ کرے کہ عادت کے طور پر مرتد کے کلمہ پڑھنے سے اس کا کفر نہیں جاتا اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی نبی کی شان میں گستاخی کرے دنیا میں بعد توبہ بھی اسے سزا دی جائے گی یہاں تک کہ اگر نشہ کی بے ہوشی میں کلمہ گستاخی بکا جب بھی معافی نہ دیں گے اور تمام علمائے امت کا اجماع ہے کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کرنے والا کافر ہے اور کافر بھی ایسا کہ جو اس کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے- فتح القدیر امام محقق علی الاطلاق جلد چہارم ص ۴۰۷ میں لکھتے ہیں: یعنی جس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کینہ ہو وہ مرتد ہے، تو گستاخی کرنے والا بدرجہ اولیٰ کافر ہے اور اگر نشہ بلا اکراہ پیا اور اس حالت میں کلمہ گستاخی بکا جب بھی معاف نہ کیا جائے گا-

(فتاویٰ رضویہ، ج ۶ ص ۳۹-۷-۳، مطبوعہ دارالعلوم امجدیہ کراچی)

شریعت کی توہین کرنے والا تورات کی تصریح کے مطابق واجب القتل ہے

پاکستان میں توہین رسالت کا قانون بنایا گیا ہے جس کے مطابق سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا انبیاء سابقین میں سے کسی نبی کی بھی توہین کرنے والے کو پھانسی کی سزا دی جاسکے گی، اس پر پاکستان میں رہنے والے غیر مسلم خصوصاً عیسائی آئے دن احتجاج کرتے رہتے ہیں اور باقی دنیا کے غیر مسلم بھی اس کو مسلمانوں کی بنیاد پرستی قرار دیتے ہیں اور اس قانون کو اقلیت پر ظلم قرار دیتے ہیں جبکہ بائبل میں یہ لکھا ہوا ہے کہ قاضی یا کاہن کی توہین کرنے والا بھی واجب القتل ہے اور نبی کی حرمت اور اس کا مقام تو کاہن اور قاضی سے کہیں زیادہ ہے، سو معلوم ہوا کہ توہین رسالت کا یہ قانون قرآن، حدیث، آثار اور مذاہب ائمہ کے علاوہ بائبل کے بھی مطابق ہے- بائبل کی عبارت یہ ہے:

شریعت کی جو بات وہ تجھ کو سکھائیں اور جیسا فیصلہ تجھ کو بتائیں اسی کے مطابق کرنا اور جو کچھ فتویٰ وہ دیں اس سے دہنے یا بائیں نہ مڑنا○ اور اگر کوئی شخص گستاخی سے پیش آئے کہ اس کاہن کی بات جو خداوند تیرے خدا کے حضور خدمت کے لیے کھڑا رہتا ہے یا اس قاضی کا کہنا نہ سنے تو وہ شخص مار ڈالا جائے تو اسرائیل میں سے ایسی برائی کو دور کر دینا○ اور سب لوگ سن کر ڈر جائیں گے اور پھر گستاخی سے پیش نہیں آئیں گے○

(استثناء باب: ۱۷ آیت: ۱۳-۱۱، پرانا عہد نامہ ص ۱۸۳، مطبوعہ بائبل سوسائٹی لاہور)

شرح صحیح مسلم ج ۲ میں ہم نے توہین رسالت کرنے والے مسلمان کا حکم بیان کیا تھا، اور الاعراف کی تفسیر میں توہین

رسالت کرنے والے ذمی کا حکم لکھا تھا اور اس میں احادیث اور آثار کے علاوہ مذاہب اربعہ کے فقہاء کی تصریحات پیش کی تھیں اور یہاں پر ہم نے احناف کے مذہب کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے اور بائبل کا حوالہ بھی پیش کیا ہے اور ان تینوں مباحث کا مطالعہ کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا تم ان لوگوں سے جنگ نہیں کرو گے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور انہوں نے رسول کو بے وطن کرنے کا قصد کیا اور پہلی بار جنگ کی انہوں نے ہی ابتداء کی تھی، کیا تم ان سے ڈرتے ہو سو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو○ (التوبہ: ۱۳)

آیات سابقہ سے ارتباط

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: کفر کے علم برداروں سے قتال کرو، اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان سے قتال کا محرک اور باعث بیان فرمایا ہے، اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار سے قتال کے تین اسباب بیان فرمائے ہیں: پہلا سبب یہ بیان فرمایا کہ انہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے معاہدہ حدیبیہ کو پکا کرنے کے بعد اس کو توڑ ڈالا، اور انہوں نے بنو خزاعہ کے خلاف بنو بکر کی مدد کی اور دوسروں کی بہ نسبت ان سے قتال کرنا زیادہ اولیٰ ہے جنہوں نے عہد شکنی کی۔ اور دوسرا سبب یہ بیان فرمایا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے وطن کرنے کا قصد کیا اور یہ ان سے جنگ کرنے کا بہت بڑا داعیہ اور محرک ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے وطن کرنے سے مراد یا تو یہ ہے کہ ان کی وجہ سے آپ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی، اور یا اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے بار بار مدینہ منورہ پر حملے کیے اور آپ کے خلاف آپ کے دشمنوں کی مدد کی تاکہ آپ یا شہید ہو جائیں یا ان کی مخالفت سے تنگ آ کر مدینہ منورہ سے بھی چلے جائیں اور تیسرا سبب یہ ہے کہ جنگ کی ابتدا انہوں نے خود کی تھی جب انہوں نے بدر میں حملہ کیا، حالانکہ قافلہ ان کے پاس صحیح سلامت پہنچ چکا تھا لیکن انہوں نے کہا ہم اس وقت تک واپس نہیں جائیں گے جب تک کہ اسلام کو جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان سے جنگ کرو، اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو عذاب دے گا، ان کو رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمہاری مدد کرے گا، اور مومنوں کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچائے گا○ اور ان کے دلوں کے غیظ کو دور فرمائے گا اور اللہ جس کی چاہے گا توبہ قبول فرمائے گا، اور اللہ بہت جاننے والا بے حد حکمت والا ہے○ (التوبہ: ۱۵-۱۴)

اس آیت میں ان سابقہ آیات کی تاکید ہے، جن میں کفار کے ظالمانہ افعال ذکر فرما کر کفار سے جنگ کے لیے مسلمانوں کی غیرت کو ابھارا تھا، علاوہ ازیں اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنگ میں فتح کی بشارت دی ہے اور کفار کی ہزیمت کی نوید سنائی ہے اور کفار کے خلاف اللہ نے اپنی مدد کا وعدہ فرمایا ہے۔ نیز اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے خلاف اس جنگ میں مسلمانوں کے متعدد فوائد بیان فرمائے ہیں۔

فتح مکہ کے لیے جہاد کرنے کے فوائد

(پہلا فائدہ): اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ذریعہ سے کافروں کو عذاب دے گا، اس عذاب سے مراد دنیا کا عذاب ہے اور یہ عذاب کافروں کو قتل کرنے کی صورت میں حاصل ہو گا، اور ان کو قید کرنے کی صورت میں اور میدان جنگ میں ان کے اموال پر بطور مال غنیمت کے قبضہ کی صورت میں حاصل ہو گا، اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں عذاب دینے کا ذکر فرمایا ہے، اور ایک آیت میں ان پر عذاب بھیجنے کی نفی فرمائی ہے۔ ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ۔ اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ ان کو عذاب دے درآنحالیکہ آپ ان میں موجود ہیں۔ (الانفال: ۳۳)

اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ التوبہ میں جس عذاب دینے کا ذکر ہے اس سے مراد جنگ میں ان کے قتل اور قید ہونے کا عذاب ہے اور سورۃ الانفال میں جس عذاب دینے کی نفی ہے اس سے مراد ہے آسمانی عذاب۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ سورۃ التوبہ میں جس عذاب دینے کا ذکر ہے وہ صرف بعض لوگوں کو پہنچے گا اور سورۃ الانفال میں جس عذاب کی نفی ہے اس سے مراد ہے ان پر ایسا عذاب نہیں آئے گا جس سے پوری قوم کفار ملیامیٹ ہو جائے۔

(دوسرا فائدہ:) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ان کو رسوا کرے گا، اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مسلمانوں کے ہاتھ سے ذلت آمیز اور عبرت ناک شکست سے دوچار کیا، اور جن مسلمانوں کو وہ بہت کمزور اور پس ماندہ سمجھتے تھے انہوں نے ان کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا اور ان کا فخر اور غرور خاک میں مل گیا۔

(تیسرا فائدہ:) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ تمہاری مدد فرمائے گا، اللہ تعالیٰ کی اس بشارت کی وجہ سے مسلمانوں کو حالت جنگ میں طمانیت حاصل ہوگی۔

(چوتھا فائدہ:) اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دلوں کو ٹھنڈا کرے گا، ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ بنو خزاعہ اسلام لا چکے تھے اور وہ مسلمانوں کے حلیف تھے اور بنو بکر کفار قریش کے حلیف تھے۔ بنو بکر نے بنو خزاعہ پر حملہ کیا اور قریش نے معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے بنو بکر کی مدد کی، پھر مسلمانوں نے معاہدہ حدیبیہ کو فسخ کر کے مکہ پر حملہ کیا، کفار قریش کو شکست ہوئی اور بنو خزاعہ کا دل ٹھنڈا ہو گیا۔

(پانچواں فائدہ:) اور ان کے دلوں کے غیظ کو دور فرمائے گا، ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ مسلمانوں کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچانا اور ان کے دلوں سے غیظ دور کرنا یہ ایک ہی بات ہے، اور یہ تکرار ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں کے مفہوموں میں فرق ہے، دشمنوں کی شکست سے مسلمانوں کے دلوں کا غم و غصہ اور غیظ دور ہو گا اور اللہ تعالیٰ نے ان سے فتح کا جو وعدہ فرما لیا ہے اس کی وجہ سے وہ انتظار کی کوفت سے بچ جائیں گے، کیونکہ انتظار موت سے زیادہ سخت ہوتا ہے، اور جب اللہ نے ان کو فتح کی بشارت دے دی تو ان کے دلوں میں ٹھنڈک پڑ گئی۔

(چھٹا فائدہ:) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور اللہ جس کی چاہے گا توبہ قبول فرمائے گا، اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ بعض مسلمان طبعی طور پر کفار سے جہاد کرنے سے گھبراتے تھے اور اس میں تساہل کرتے تھے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے انہیں غیرت دلائی اور جہاد کے فوائد اور اجر و ثواب کی ترغیب دی تو وہ جہاد کے لیے شرح صدر سے تیار ہو گئے اور ان کا جہاد کرنا اللہ تعالیٰ سے توبہ کے قائم مقام ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے فتح اور نصرت کی جو بشارت دی ہے وہ بہت بڑا انعام ہے اور جب بندہ اپنی بے شمار کوتاہیوں اور گناہوں کے باوجود اللہ عزوجل کے انعامات کو دیکھتا ہے تو اس پر ندامت طاری ہوتی ہے اور وہ صدق دل سے توبہ کرتا ہے۔

(ساتواں فائدہ:) یہ آیت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل ہے اور آپ کا معجزہ ہے کیونکہ اس آیت میں جن امور کی پیشگی خبر دی گئی ہے وہ سب فتح مکہ میں حاصل اور واقع ہو گئے، سو اس آیت میں غیب کی خبر دی گئی ہے اور غیب کی خبر معجزہ ہے، نیز اس آیت میں یہ بھی دلیل ہے کہ اللہ عزوجل کے علم میں صحابہ کرام حقیقی مومن تھے کیونکہ ان کے قلوب کفار کے خلاف غیظ و غضب سے بھرے ہوئے تھے اور یہ ان کی دینی حمیت تھی، اور دین اسلام کی سربلندی کے لیے وہ بہت راغب اور سخت کوشاں تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے مسلمانو!) کیا تمہارا گمان یہ ہے کہ تم (ایسے ہی) چھوڑ دیئے جاؤ گے، حالانکہ اللہ نے ابھی

تک تم میں سے ان لوگوں کو متمیز نہیں فرمایا جنہوں نے کامل طریقہ سے جہاد کیا ہو، اور انہوں نے اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے سوا کسی کو اپنا محرم راز نہ بنایا ہو اور اللہ تمہارے سب کاموں کی خوب خبر رکھتا ہےO (التوبہ: ۱۶)

ولیجۃ کا معنی ہم نے محرم راز کیا ہے۔ کیونکہ ولوج کا معنی ہے داخل ہونا اور ولیجۃ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی شخص کے گھر میں بار بار آتا جاتا ہو۔ (المفردات ج ۲ ص ۶۹۰) اور یہ وہی شخص ہوتا ہے جو اس کا محرم راز ہو۔

اس سے پہلی آیتوں میں جہاد کی ترغیب دی گئی تھی اور اس آیت میں بھی جہاد پر مزید برانگیختہ فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو مستقبل کے واقعات کا علم ہے اور جس چیز کا مطلقاً وقوع نہ ہو اس کے وقوع کو اللہ کا علم شامل نہیں

اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے: اور ابھی تک اللہ نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کو نہیں جانا۔ اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو صرف ان ہی کاموں کا علم ہوتا ہے جو ہو چکے ہوں اور جو کام ہونے والے ہوں ان کا اس کو علم نہیں ہوتا۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ ہشام بن الحکم نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اسی چیز کا علم ہوتا ہے جو وجود میں آچکی ہو، پھر امام رازی نے اس کا رد کیا ہے اور فرمایا کہ اس آیت میں علم سے مراد معلوم ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ ابھی تک اللہ نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کو موجود نہیں فرمایا، اور اس کو علم سے اس لیے تعبیر فرمایا ہے کہ کسی شے کے موجود ہونے کو یہ لازم ہے کہ اللہ کو اس کا علم ہو اس لیے اللہ کو کسی چیز کے وجود کا علم اس چیز کے موجود ہونے سے کنایہ ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز کے موجود ہونے کا اللہ کو علم نہ ہو وہ چیز موجود نہیں ہوتی، کیونکہ وہ چیز موجود نہ ہو اور اللہ کو یہ علم ہو کہ وہ چیز موجود ہے تو یہ علم معلوم کے موافق نہیں ہوگا اور جو علم معلوم کے مطابق نہ ہو وہ جہل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ جہل سے منزہ اور پاک ہے۔

قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی شافعی متوفی ۶۸۵ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں بعض مومنین سے خطاب ہے جنہوں نے قتل کرنے کو ناپسند کیا تھا اور ایک قول یہ ہے کہ اس آیت میں منافقین سے خطاب ہے، اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ابھی تک تم میں سے مخلصین غیر مخلصین سے متمیز نہیں ہوئے۔ مخلصین وہ ہیں جو جہاد کرنے والے ہوں، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے علم کی نفی کی ہے اور اس سے مبالغتاً معلوم کی نفی کا ارادہ کیا ہے، اور اس میں یہ دلیل ہے کہ کسی چیز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے علم کا تعلق اس کے وقوع کو مستلزم ہوتا ہے۔

(انوار التنزیل علی ہامش عنایت القاضی ج ۴ ص ۳۰۹، مطبوعہ دار صادر بیروت)

علامہ شہاب الدین احمد خفاجی مصری حنفی متوفی ۱۰۶۷ھ لکھتے ہیں:

میرے نزدیک اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علم کی نفی کی ہے اور اس سے معلوم کی نفی کا ارادہ کیا ہے، یعنی انہوں نے بہت زیادہ کامل طریقہ سے جہاد نہیں کیا، کیونکہ اگر انہوں نے کامل جہاد کیا ہوتا تو اس کا اللہ کو علم ہوتا، کیونکہ کسی چیز کے ساتھ اللہ کے علم کا تعلق اس کے وقوع کا تقاضا کرتا ہے اور اس کے وقوع کو مستلزم ہوتا ہے ورنہ اللہ کا علم واقع کے مطابق نہیں ہوگا اور یہ محال ہے، اور جس چیز کا اللہ کو علم نہ ہو وہ اس چیز کے عدم وقوع کو مستلزم ہوتا ہے، کیونکہ اگر وہ چیز واقع ہو تو کائنات میں ایسی چیز ہوگی جس کا اللہ کو علم نہ ہو اور یہ بھی محال ہے۔ (علامہ آلوسی نے بھی اس آیت کی یہی تقریر کی ہے)

(روح المعانی ج ۱۰ ص ۶۳، عنایت القاضی ج ۴ ص ۳۱۰-۳۰۹، مطبوعہ دار صادر بیروت، ۱۲۸۳ھ)

قاضی بیضاوی نے جہاد کے ساتھ مبالغہ کی قید لگائی ہے اور علامہ خفاجی نے کامل کی قید لگائی ہے کیونکہ مسلمانوں نے فتح مکہ سے پہلے جہاد تو کیا تھا لیکن بہت زیادہ مبالغہ سے جہاد نہیں کیا تھا یا کامل طریقہ سے جہاد نہیں کیا تھا۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ اس آیت میں مسلمانوں سے خطاب ہو اور اگر اس میں منافقوں سے خطاب ہو تو پھر معنی یوں ہو گا حالانکہ اللہ نے ابھی تک تم میں سے ان لوگوں کو متمیز نہیں فرمایا جنہوں نے خوش دلی سے جہاد کیا ہو۔

سورۃ التوبہ کی آیت: ۱۶ کے چند تراجم

شیخ سعدی شیرازی متوفی ۶۹۱ھ لکھتے ہیں:

آیا پنداشید شما آنکہ شما بہ گزاردہ شوید ونہ بیند خدائے آنانرا کہ جہاد می کنند از شما در راہ او۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ لکھتے ہیں:

آیا گمان کردید کہ گزاشتہ شوید و ہنوز متمیز نساختہ است خدا آنانرا کہ جہاد کردہ اند از شما۔

شاہ عبد القادر محدث دہلوی متوفی ۱۲۳۰ھ لکھتے ہیں:

کیا جانتے ہو کہ چھوٹ جاؤ گے اور ابھی معلوم نہیں کیے اللہ نے تم میں سے جو لوگ لڑے ہیں۔

شاہ رفیع الدین محدث دہلوی متوفی ۱۲۳۳ھ لکھتے ہیں:

کیا گمان کرتے ہو تم یہ کہ چھوڑے جاؤ اور حالانکہ ابھی نہیں جانا اللہ نے ان لوگوں کو کہ جہاد کرتے ہیں تم سے۔

شیخ محمود حسن دیوبندی متوفی ۱۳۳۹ھ لکھتے ہیں:

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ چھوٹ جاؤ گے حالانکہ ابھی معلوم نہیں کیا اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ فرماتے ہیں:

کیا اس گمان میں ہو کہ یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے اور ابھی اللہ نے پہچان نہ کرائی ان کی جو تم میں سے جہاد کریں۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ لکھتے ہیں:

کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے (اس کی راہ میں) جاں فشانی کی۔

ہمارے شیخ ضیغم اسلام سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ متوفی ۱۴۰۶ھ تحریر فرماتے ہیں:

(اے مسلمانو!) کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم (یوں ہی) چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو ابھی ظاہر نہیں فرمایا جنہوں نے جہاد کیا۔

اور ہم نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

(اے مسلمانو!) کیا تمہارا گمان یہ ہے کہ تم (ایسے ہی) چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ اللہ نے ابھی تک تم میں سے ان لوگوں کو متمیز نہیں فرمایا جنہوں نے کامل طریقہ سے جہاد کیا ہو۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ

مشرکین کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اللہ کی مساجد تعمیر کریں در آں حالیکہ وہ خود



عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِى

اپنے خلاف کفر کی گواہی دینے والے ہوں، ان کے اعمال ضائع ہو گئے اور وہ

النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ

دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ○ اللہ کی مساجد صرف وہی لوگ تعمیر کر سکتے ہیں، جو اللہ اور روز

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ

آخرت پر ایمان لائے اور انہوں نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی اور اللہ کے سوا وہ

اِلَّا اللّٰهَ ۫ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾

کسی سے نہیں ڈرے اور عنقریب یہی لوگ ہدایت یافتہ لوگوں میں سے ہوں گے ○

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ

کیا تم نے حجاج کے پانی پلانے کو اور مسجد حرام کے آباد کرنے کو اس شخص (کی نیکیوں) کی مثل کر دیا جو

اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ

اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان لایا اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اللہ کے نزدیک یہ

عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وقف لازم

برابر نہیں ہوں گے اور اللہ ظلم کرنے والے لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ○ جو لوگ ایمان لائے

وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ

اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور اپنے مالوں کے ساتھ جہاد کیا،

اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾

اللہ کے نزدیک ان کا بہت بڑا درجہ ہے، اور وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں ○

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا

ان کا رب ان کو اپنی رحمت اور رضا کی خوش خبری دیتا ہے اور ان جنتوں کی جن میں ان

نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿٢١﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ

کے لیے دائمی نعمت ہے ○ وہ ان جنتوں میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، بے شک اللہ کے پاس بہت

عَظِيْمٌ ﴿٢٢﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ

بڑا اجر ہے ○ اے ایمان والو اپنے باپ دادا اور اپنے بھائیوں کو بھی دوست

اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ

نہ بناؤ اگر وہ کفر کو ایمان پر ترجیح دیتے ہوں اور تم میں سے جو لوگ ان کو دوست

مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٣﴾ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ

بنائیں گے تو وہی لوگ ظالم ہیں ○ (اے رسول مکرم!) آپ کہیے کہ اگر تمہارے باپ دادا اور

اَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ

تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے رشتہ دار اور تمہارے کمائے

اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ

ہوئے مال اور تمہاری تجارت جس کے گھاٹے کا تمہیں خطرہ ہے اور تمہارے پسندیدہ

تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ

مکان تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ

سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي

محبوب ہوں تو تم انتظار کرو حتیٰ کہ اللہ اپنا حکم لے آئے اور اللہ

الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٤﴾ ع

نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ○

٣ع٨ ٩

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مشرکین کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اللہ کی مساجد تعمیر کریں۔ درآنحالیکہ وہ خود اپنے خلاف کفر کی گواہی دینے والے ہوں، ان کے اعمال ضائع ہو گئے اور وہ دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ○ (التوبہ: ١٧)

تعمیر کا معنی

عمر الدار کا معنی ہے مکان تعمیر کرنا اور عمر المنزل کا معنی ہے گھر بسانا اور آباد کرنا۔ (المنجد ص ۵۲۹ بیروت) انما یعمر مساجد اللہ (التوبہ: ۱۸) میں اس کا معنی ہے تعمیر کرنا یا زیارت کرنا۔ (المفردات ج ۲ ص ۴۵۱) عمارت کا جو حصہ ٹوٹ پھوٹ جائے اس کی مرمت کرنا اور اس کی حفاظت کرنا، اس کی صفائی اور آرائش و زیبائش کرنا، اس میں روشنی کا انتظام کرنا۔ اور مسجد کی تعمیر میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کو دنیاوی باتوں سے محفوظ رکھا جائے اور اس میں اللہ کے ذکر اور علم دین کی تدریس میں مشغول رہا جائے۔ (مجمع بحار الانوار ج ۲ ص ۶۷۸، مطبوعہ المدینۃ المنورہ)

علامہ ابوبکر احمد بن علی جصاص حنفی رازی متوفی ۳۷۰ھ لکھتے ہیں:

مسجد کی تعمیر کے دو معنی ہیں: ایک معنی ہے مسجد کی زیارت کرنا اور اس میں رہنا اور دوسرا معنی ہے مسجد کو بنانا اور اس کا جو حصہ بوسیدہ ہو گیا ہو اس کو نیا بنانا۔ کیونکہ اعتمر اس شخص کے لیے کہا جاتا ہے جس نے مسجد کی زیارت کی اور اس سے لفظ عمرہ ماخوذ ہے کیونکہ عمرہ بیت اللہ کی زیارت کرنے کو کہتے ہیں اور جو شخص مسجد میں بکثرت آتا جاتا ہو اور مسجد میں ہی رہتا ہو اس کو عمار کہتے ہیں، پس اس آیت کا یہ تقاضا ہے کہ کفار کو مسجد میں داخل ہونے اور مسجد کو بنانے اور مسجد کی دیکھ بھال کا انتظام کرنے اور مسجد میں قیام کرنے سے منع کیا جائے کیونکہ یہ لفظ دونوں معنوں کو شامل ہے۔

(احکام القرآن ج ۳ ص ۸۷، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۴۰۰ھ)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

یعمر، عمارۃ سے بنا ہے اور مسجد کی عمارۃ کی دو قسمیں ہیں: (۱) مسجد میں بکثرت آنا جانا اور مسجد کو لازم پکڑ لینا، (۲) مسجد کو بنانا اور اس کی تعمیر کرنا۔ اگر دوسرا معنی مراد ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ کافر کے لیے مسجد کی مرمت کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ مسجد عبادت کی جگہ ہے اس لیے اس کا معظم ہونا واجب ہے اور کافر مسجد کی اہانت کرتا ہے اور اس کی تعظیم نہیں کرتا، نیز کافر حکماً نجس ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: مشرکین محض نجس ہیں۔ (التوبہ: ۲۸) اور مسجد کی تطہیر واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کرو۔ (البقرہ: ۱۲۵) نیز کافر نجاسات سے احتراز نہیں کرتا اور اس کا مسجد میں داخل ہونا مسجد کو نجاست سے ملوث کرنے کا موجب ہے نیز کافر کا مسجد میں داخل ہونا بعض اوقات مسلمانوں کی عبادت میں خلل اور فساد کا موجب ہو گا۔ نیز کافر کا مسجد کی مرمت کرنا مسلمانوں پر کافر کے احسان کا موجب ہو گا اور کافر کو مسلمان پر احسان کرنے کا موقع دینا جائز نہیں ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۵ھ)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: درآنحالیکہ وہ خود اپنے خلاف کفر کی گواہی دینے والے ہوں، کیونکہ جب تم کسی عیسائی سے پوچھو تمہارا کیا مذہب ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں عیسائی ہوں اور یہودی سے پوچھو تو وہ کہتا ہے کہ میں یہودی ہوں۔ ستارہ پرست یا آتش پرست سے پوچھو تو وہ کہے گا میں ستارہ پرست ہوں یا آتش پرست ہوں اور بت پرست سے پوچھو تو وہ کہے گا میں بت پرست ہوں۔

کافروں سے مسجد کے لیے چندہ لینے میں مذاہب فقہاء

فقہاء حنبلیہ کے نزدیک کافر کا کسی جگہ کو عبادت کے لیے وقف کرنا جائز ہے۔ مثلاً کسی جگہ کو مسجد بنانا جائز ہے۔

علامہ ابو عبداللہ شمس الدین مقدسی متوفی ۷۶۳ھ لکھتے ہیں:

مسلمان یا ذمی کی جانب سے کسی جگہ کو نیک کام کے سوا وقف کرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً مسجد وغیرہ بنانے کے لیے، کیونکہ اس کا نفع مسلمانوں کو پہنچے گا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ مباح ہے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ مکروہ ہے، البتہ کسی جگہ کو یہودیوں یا عیسائیوں کی عبادت گاہ کے لیے وقف کرنا جائز نہیں ہے۔

(کتاب الفروع ج ۴ ص ۵۸۷-۵۸۶، مطبوعہ عالم الکتب بیروت، ۱۴۰۵ھ)

علامہ ابوالحسین علی بن سلیمان مرداوی حنبلی متوفی ۸۸۵ھ لکھتے ہیں:

دوسری شرط یہ ہے کہ کسی جگہ کو نیک کام کے لیے وقف کرنا چاہیے خواہ وقف کرنے والا مسلمان ہو یا ذمی، اس کی امام احمد رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے۔ مثلاً مسکینوں کے لیے وقف کرنا، مسجدوں کے لیے، پلوں کے لیے اور رشتہ داروں کے لیے، یہی مذہب ہے اور اسی پر جمہور اصحاب حنبلیہ کا اتفاق ہے۔

(الانصاف ج ۷ ص ۱۳، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۳۷۶ھ)

فقہاء شافعیہ کے نزدیک کفار کا مسجد بنانا جائز نہیں ہے۔ اس سے پہلے ہم امام رازی شافعی کی عبارت نقل کر چکے ہیں، اور علامہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی الشافعی المتوفی ۴۵۰ھ لکھتے ہیں:

سورۂ توبہ کی اس آیت کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ کفار کے لیے مسجدوں کی تعمیر جائز نہیں ہے، کیونکہ مساجد صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور ان کو صرف ایمان کے ساتھ تعمیر کیا جا سکتا ہے، دوسرا معنی یہ ہے کہ کفار کے لیے مسجدوں میں داخل ہونا اور زیارت کے لیے مسجدوں میں آنا جائز نہیں ہے۔ (النکت والعیون ج ۲ ص ۳۴۶، مطبوعہ مؤسسۃ الکتب الشافعیہ بیروت)

فقہاء مالکیہ کے نزدیک بھی کفار کا مسجد بنانا جائز نہیں ہے، علامہ دسوقی مالکی متوفی ۱۲۱۹ھ لکھتے ہیں:

کافر ذمی کا مسجد بنانا جائز نہیں ہے۔ (حاشیہ الدسوقی علی الشرح الکبیر ج ۴ ص ۷۹-۷۸، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

فقہاء احناف کے نزدیک بھی کافر کا مسجد بنانا جائز نہیں ہے، اس سے پہلے ہم علامہ ابوبکر جصاص حنفی کی عبارت لکھ چکے ہیں اور علامہ شامی حنفی لکھتے ہیں:

ذمی کا اس چیز کے لیے وقف کرنا صحیح ہے جو اس کے اور ہمارے دونوں کے نزدیک عبادت ہو لہٰذا ذمی کا حج اور مسجد کے لیے وقف کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ صرف ہمارے لیے عبادت ہیں ذمی کے لیے نہیں ہیں، اور نہ ذمی کا گرجا کے لیے وقف کرنا صحیح ہے کیونکہ وہ صرف اس کے نزدیک عبادت ہے، البتہ مسجد قدس کے لیے ذمی کا وقف کرنا صحیح ہے کیونکہ مسجد قدس اس کے نزدیک بھی عبادت ہے اور ہمارے نزدیک بھی۔

(منحۃ الخالق علی البحر الرائق ج ۵ ص ۱۸۹، مطبوعہ کوئٹہ، تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ ج ۱ ص ۱۱۹، مطبوعہ مطبع حبیبیہ کوئٹہ)

غیر مقلدین کے نزدیک بھی کافر کا مسجد بنانا جائز نہیں ہے۔ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی متوفی ۱۳۰۷ھ لکھتے ہیں:

کہا گیا ہے کہ اگر کافر نے مسجد بنانے کی وصیت کی تو اس کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

(فتح البیان ج ۵ ص ۲۵۲، مطبوعہ المکتبۃ العصریہ بیروت، ۱۴۱۵ھ)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں:

کافر نے مسجد کے لیے وقف کیا وقف نہ ہو گا کہ یہ اس کے خیال میں کار ثواب نہیں۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۶ ص ۳۳۸، مطبوعہ دار العلوم امجدیہ کراچی)

صدر الشریعہ مولانا امجد علی متوفی ۱۳۷۶ھ لکھتے ہیں:

وہ کام جس کے لیے وقف کرتا ہے فی نفسہ ثواب کا کام ہو، یعنی واقف کے نزدیک بھی وہ ثواب کا کام ہو اور واقع میں بھی ثواب کا کام ہو۔ اگر ثواب کا کام نہیں تو وقف صحیح نہیں (الی قولہ) اگر نصرانی نے حج و عمرہ کے لیے وقف کیا جب بھی وقف صحیح نہیں کیا کہ اگرچہ یہ کار ثواب ہے مگر اس کے اعتقاد میں ثواب کا کام نہیں۔ (الی قولہ) ذمی نے اپنے گھر کو مسجد بنایا اور اس کی شکل صورت بالکل مسجد کی سی کر دی اور اس میں نماز پڑھنے کی مسلمانوں کو اجازت بھی دے دی اور مسلمانوں نے اس میں نماز پڑھی بھی جب بھی مسجد نہیں ہوگی اور اس کے مرنے کے بعد میراث جاری ہوگی، یونہی اگر گھر کو گرجا وغیرہ بنا دیا جب بھی اس میں میراث جاری ہوگی۔ (بہار شریعت جز ۱۰ ص ۳۰-۲۹، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور)

کافروں سے مسجد کے لیے چندہ لینے میں علماء دیوبند کا نظریہ

مفتی محمد شفیع دیو بندی متوفی ۱۳۹۶ھ لکھتے ہیں:

اگر کوئی غیر مسلم ثواب سمجھ کر مسجد بنا دے یا مسجد بنانے کے لیے مسلمانوں کو چندہ دے دے تو اس کا قبول کرنا بھی اس شرط سے جائز ہے کہ اس سے کسی دینی یا دنیوی نقصان یا الزام کا یا آئندہ اس پر قبضہ کر لینے کا یا احسان جتلانے کا خطرہ نہ ہو۔ (در المختار، شامی، مراغی) (معارف القرآن ج ۴ ص ۳۳۱، مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی، ۱۴۱۴ھ)

علامہ احمد مصطفیٰ المراغی نے اسی طرح لکھا ہے (تفسیر المراغی ج ۱۰ ص ۴۷، مطبوعہ بیروت) لیکن علامہ المراغی کوئی مسلم فقیہ نہیں ہیں اور در المختار میں اس طرح لکھا ہوا نہیں ہے، رہے علامہ شامی تو انہوں نے اس کے خلاف لکھا ہے جیسا کہ ہم اس سے پہلے منحۃ الخالق اور تنقیح الفتاوی الحامدیہ کے حوالوں سے لکھ چکے ہیں اور اب ایک مزید حوالہ پیش کر رہے ہیں:

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ تحریر فرماتے ہیں:

درمختار میں صحت وقف کی ایک یہ شرط بھی بیان کی ہے کہ اس کا فی نفسہ عبادت ہونا معروف ہو، علامہ شامی فرماتے ہیں یہ صرف مسلمان کے وقف کرنے کی شرط ہے ورنہ البحر الرائق میں مذکور ہے کہ ذمی کے وقف کی صحت کی شرط یہ ہے کہ وہ اس کے نزدیک اور ہمارے نزدیک عبادت ہو جیسے فقراء پر وقف کرنا یا مسجد بیت المقدس پر وقف کرنا برخلاف اس کے کہ ذمی کسی گرجا پر وقف کرے کیونکہ وہ صرف اس کے نزدیک عبادت ہے، یا وہ حج اور عمرہ پر وقف کرے کیونکہ وہ صرف ہمارے نزدیک عبادت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ دونوں کے نزدیک عبادت ہونا صرف ذمی کے وقف کے لیے شرط ہے کیونکہ مسلمان کے وقف کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ ان کے نزدیک بھی عبادت ہو بلکہ وہ صرف ہمارے نزدیک عبادت ہو جیسے حج اور عمرہ۔

(ردالمختار ج ۳ ص ۳۹۴، مطبوعہ کوئٹہ، ردالمختار ج ۳ ص ۳۶۰، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ، ردالمختار ج ۶ ص ۴۱۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۹ھ طبع جدید)

اور چونکہ کافروں کے مذہب میں مسجد بنانا یا مسجد کے لیے چندہ دینا عبادت نہیں ہے اس لیے ان امور میں ان سے چندہ لینا فقہاء مالکیہ، فقہاء شافعیہ اور فقہاء احناف کے نزدیک جائز نہیں ہے اور دینی حمیت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ اپنی عبادات میں کافروں سے مدد نہ لی جائے اور اپنے دین میں ان کا احسان نہ اٹھایا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ کی مساجد صرف وہی لوگ تعمیر کر سکتے ہیں، جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے اور انہوں نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی اور اللہ کے سوا وہ کسی سے نہیں ڈرے اور عنقریب یہی لوگ ہدایت یافتہ لوگوں میں سے ہوں گے○ (التوبہ: ۱۸)

مسجد بنانے کا جواز اور استحقاق کن امور پر موقوف ہے

اللہ تعالیٰ نے تعمیر مساجد کا جواز پانچ چیزوں میں منحصر فرمایا ہے: (۱) اللہ پر ایمان' (۲) قیامت پر ایمان' (۳) نماز قائم کرنا' (۴) زکوٰۃ ادا کرنا' (۵) اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرنا۔

مساجد بنانے کے لیے اللہ پر ایمان رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ مسجد وہ جگہ ہے جہاں اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کی جاتی ہے' سوجو شخص اللہ کی وحدانیت پر ایمان نہ رکھتا ہو اس کے لیے اللہ کی عبادت کی جگہ بنانا ممنوع ہو گا۔

قیامت پر ایمان رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ جس شخص کا قیامت پر ایمان نہیں ہو گا اس شخص کے لیے اللہ کی عبادت کا کوئی محرک اور باعث نہیں ہو گا۔

نماز قائم کرنا اس لیے ضروری ہے کہ مسجد بنانے کی غرض ہی نماز کی ادائیگی ہے' سوجو شخص نماز نہ پڑھتا ہو اس کے لیے مسجد بنانا ممنوع ہو گا۔ زکوٰۃ ادا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ مسجد میں داخل ہونے کے لیے بدن کی طہارت ضروری ہے اور نماز کے لیے وضو اور پاک اور صاف لباس ضروری ہے اور اس کے لیے مال خرچ کرنا ہو گا اور اس کے لیے فراخ دلی سے مال وہی خرچ کرے گا جو زکوٰۃ ادا کرتا ہو' نیز فقراء' مساکین اور مسافروں کو زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے اور مسجد کے نمازیوں میں فقراء' مساکین' مسافر اور دیگر مستحقین زکوٰۃ ہوتے ہیں اور مسجد میں آنے والے کو انہیں زکوٰۃ ادا کرنے کا موقع ملتا ہے۔

مسجد بنانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مسجد بنانے والا اللہ عزوجل کے سوا کسی سے نہ ڈرتا ہو' کیونکہ بعض اوقات غیر مسلم مسجد بنانے میں مزاحم ہوتے ہیں جیسا کہ بھارت اور دیگر غیر مسلم ممالک میں اس کا بکثرت مشاہدہ کیا گیا ہے' ایسے میں مسجد بنانے کی جرأت وہی شخص کرے گا جو اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتا ہو' نیز اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ مسجد بنانے والا نام و نمود اور اپنی تعریف و شہرت کے لیے مسجد نہ بنائے بلکہ صرف اللہ عزوجل کی رضا اور خوشنودی کے لیے مسجد بنائے۔

مسجد بنانے کے انحصار میں ایمان بالرسول ذکر نہ کرنے کی توجیہات

اس آیت میں مسجد بنانے کے لیے ایمان باللہ اور دیگر امور کا تو ذکر فرمایا ہے لیکن ایمان بالرسول کا ذکر نہیں فرمایا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان باللہ ایمان بالرسول کو مستلزم ہے' کیونکہ اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے تمام ارشادات پر ایمان لایا جائے اور اللہ کا ایک ارشاد یہ بھی ہے محمد رسول اللہ (الفتح: ۲۹) سو جس نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول نہیں مانا اس نے اللہ عزوجل کو نہیں مانا' دوسرا جواب یہ ہے کہ اس میں نماز کا ذکر ہے اور نماز سے پہلے اذان اور اقامت ہوتی ہے اور اذان اور اقامت میں ہے محمد رسول اللہ' تیسرا جواب یہ ہے کہ اس میں نماز کا ذکر ہے اور نماز سے مراد وہ نماز ہے جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۳۱' ۷۲۴۶) چوتھا جواب یہ ہے کہ خود نماز کے تشہد میں ہے: السلام علیک ایھا النبی اور نماز کے دوران میں ہے اللھم صل علی محمد وعلی ال محمد اور صراحتاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اس لیے نہیں فرمایا تاکہ مشرکین کے اس قول کا رد ہو کہ (نبیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم) دین اسلام کی دعوت اپنی ریاست اور حکومت کی طلب کی خاطر دیتے ہیں۔

مسجد بنانے کے فضائل اور مسجد کے اجر و ثواب کے متعلق احادیث

جب لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد (مسجد نبوی) کو از سر نو بنانے کے سلسلہ میں بہت اعتراض کیے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے بہت اعتراض کیے ہیں اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے

سنا ہے: جس شخص نے اللہ کی رضا کی طلب کے لیے مسجد بنائی اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث:۴۵۰، صحیح مسلم رقم الحدیث:۵۳۳، مسند احمد ج ۱ ص ۶۱، رقم الحدیث:۴۳۴، سنن الدارمی رقم الحدیث:۱۳۹۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۷۳۶، سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۱۸، جامع الاصول رقم الحدیث:۸۷۱۹)

حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جس نے اس لیے مسجد بنائی تاکہ اس میں اللہ کا ذکر کیا جائے اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث:۱۶۳۵، سنن النسائی رقم الحدیث:۶۳۵، مسند احمد ج ۴ ص ۳۸۶)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص صبح کو مسجد میں جائے یا شام کو مسجد میں جائے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر صبح اور شام کو جنت سے مہمانی تیار کرتا ہے۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث:۶۶۲، صحیح مسلم رقم الحدیث:۶۶۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ اس دن اپنے سایہ میں رکھے گا جس دن اللہ کے سایہ کے سوا اور کسی کا سایہ نہیں ہوگا: (۱) امام عادل، (۲) جو شخص اللہ کی عبادت میں جوان ہوا، (۳) جس شخص کا دل مسجد سے نکلنے کے بعد بھی مسجد میں معلق رہا حتیٰ کہ وہ دوبارہ مسجد میں آیا، (۴) وہ دو آدمی جو اللہ کی محبت میں جمع ہوئے اور اللہ کی محبت میں الگ الگ ہوئے، (۵) جس شخص نے تنہائی میں بیٹھ کر اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھوں نے آنسو بہائے، (۶) جس شخص کو خوبصورت اور مقتدر عورت نے گناہ کی دعوت دی اور اس نے کہا میں اللہ سے ڈرتا ہوں، (۷) جس شخص نے چھپا کر صدقہ دیا حتیٰ کہ بائیں ہاتھ کو پتا نہ چلا کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث:۶۶۰، ۱۴۲۳، صحیح مسلم رقم الحدیث:۱۰۳۱)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان کو اپنے گھر میں نماز پڑھنے سے ایک نماز کا اجر ملتا ہے اور قبائل کی مسجد میں نماز پڑھنے سے پچیس نمازوں کا اجر ملتا ہے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنے سے پانچ سو نمازوں کا اجر ملتا ہے، اور مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نمازوں کا اجر ملتا ہے اور میری مسجد (مسجد نبوی) میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نمازوں کا اجر ملتا ہے اور مسجد حرام میں نماز پڑھنے سے ایک لاکھ نمازوں کا اجر ملتا ہے۔
(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۴۱۳)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مسجد نبوی کے گرد جگہ خالی ہوئی تو بنو سلمہ نے مسجد کے قریب منتقل ہونے کا ارادہ کیا، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے ان سے فرمایا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تم مسجد کے قریب منتقل ہونے کا ارادہ کر رہے ہو۔ انہوں نے کہا ہاں! یا رسول اللہ! ہمارا یہ ارادہ ہے۔ آپ نے فرمایا: اے بنو سلمہ! اپنے گھروں میں ہی رہو، تم جس قدر قدم چلتے ہو تمہاری اتنی ہی نیکیاں لکھی جاتی ہیں، (پھر فرمایا) اپنے گھروں میں ہی رہو تم جس قدر قدم چلتے ہو تمہاری اتنی نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث:۶۶۵)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اندھیروں میں چل کر مسجدوں تک جاتے ہیں انہیں قیامت کے دن نور تام کی بشارت دے دو۔
(سنن ابو داؤد رقم الحدیث:۵۶۱، سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۲۳، المعجم الکبیر ج ۲ رقم الحدیث:۵۸۰۰)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ فرماتا ہے: مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم! میں زمین والوں کو عذاب دینے کا ارادہ کرتا ہوں پھر میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں جو میرے گھروں کو آباد رکھتے ہیں

اور جو میری وجہ سے آپس میں محبت رکھتے ہیں اور جو سحر کے وقت اٹھ کر مجھ سے استغفار کرتے ہیں تو میں ان سے عذاب کو پھیر دیتا ہوں۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۸۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۸ھ)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب تم کسی شخص کو مسجد کی حفاظت کرتے ہوئے دیکھو تو اس کے ایمان کی گواہی دو، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: انما یعمر مساجد اللہ من امن باللہ والیوم الاخر۔ (التوبہ: ۱۸)

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۶۱۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۸۰۲، سنن الدارمی رقم الحدیث: ۱۲۲۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم جنت کے باغات سے گزرو تو اس میں چرا کرو۔ کہا گیا یا رسول اللہ! جنت کے باغات کون سے ہیں؟ آپ نے فرمایا: مساجد۔ پوچھا گیا ان میں چرنا کس طرح ہے؟ فرمایا سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر (کہنا) (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۵۰۹)

مسجد کے احکام کے متعلق احادیث

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو وہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز (تحیۃ المسجد) پڑھے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۴۴، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۷۱۴)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اس بدبودار درخت (لہسن اور پیاز) میں سے کچھ کھایا وہ ہماری مسجدوں کے قریب نہ آئے، کیونکہ جس چیز سے انسانوں کو ایذاء پہنچتی ہے اس سے فرشتوں کو بھی ایذاء پہنچتی ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۸۵۵، ۸۵۴، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۵۶۴)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے تمام اعمال اچھے اور برے مجھ پر پیش کیے گئے، میں نے نیک اعمال میں دیکھا کہ تکلیف دہ چیز راستہ سے ایک طرف کر دی گئی، اور برے اعمال میں، میں نے دیکھا کہ بلغم کو مسجد میں دفن کیے بغیر چھوڑ دیا گیا۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۵۵۴)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص مسجد میں جس نیت سے آیا اس کا وہی حصہ ہے۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۴۷۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم کسی شخص کو مسجد میں خرید و فروخت کرتے ہوئے دیکھو تو کہو اللہ تیری تجارت میں نفع نہ دے اور جب تم دیکھو کہ کوئی شخص اپنی گم شدہ چیز کی تلاش کے لیے مسجد میں چلا رہا ہے تو کہو اللہ تیری چیز کو واپس نہ کرے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۳۲۱، سنن الدارمی رقم الحدیث: ۱۴۰۱)

حسن بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ وہ مسجد میں دنیاوی باتیں کریں گے تم ان کے پاس مت بیٹھو اللہ کو ان کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ (مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۷۴۳)

امام مالک فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے مسجد کے باہر ایک کھلی جگہ بنوا دی تھی، جس کا نام 'بطیحا' تھا، آپ نے فرمایا جو آدمی پہیلیاں اور بجھارتیں ڈالنا چاہتا ہو یا شعر پڑھنا چاہتا ہو یا آواز بلند کرنا چاہتا ہو وہ اس کھلی جگہ میں چلا جائے۔

(موطا امام مالک اثر: ۴۲۴، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، موطا مع الزرقانی رقم: ۴۲۴، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بچوں کو اور اپنے لڑائی جھگڑوں کو اور اپنی حدود (کے نفاذ) کو اور اپنی خرید و فروخت کو اپنی مسجدوں سے دور رکھو اور جمعہ کے دنوں میں مسجدوں میں کثرت سے جمع ہو اور اپنی مسجدوں کے دروازوں پر وضو کرنے کی جگہیں بناؤ۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۱۷۲۶، المعجم الکبیر ج ۲۰ رقم الحدیث: ۳۶۹، مسند الشامیین رقم الحدیث: ۳۵۸۱)

حضرت ابوالدرداء، حضرت ابو امامہ اور حضرت واثلہ رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بچوں کو اور اپنے پاگل لوگوں کو اور اپنے برے لوگوں کو اور اپنی خرید و فروخت کو اور اپنے لڑائی جھگڑوں کو اور اپنی آوازوں کو اور اپنی تلوار سونتنے کو اور اپنی حدود قائم کرنے کو اپنی مسجدوں سے دور رکھو اور جمعہ کے دنوں میں کثرت سے اپنی مسجدوں میں جمع ہو اور اپنی مسجدوں کے دروازوں پر اپنی وضو کی جگہیں بناؤ۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۷۵۰، المعجم الکبیر ج ۸ رقم الحدیث: ۷۶۰۱، مسند الشامیین رقم الحدیث: ۳۶۲۹، مجمع الزوائد ج ۲ ص ۲۶)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا تم نے حجاج کے پانی پلانے کو اور مسجد حرام کے آباد کرنے کو اس شخص (کی نیکیوں) کی مثل کر دیا جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان لایا اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا؟ اللہ کے نزدیک یہ برابر نہیں ہوں گے اور اللہ ظلم کرنے والے لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا○ (التوبہ: ۱۹)

اللہ پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا کعبہ کو آباد کرنے سے افضل ہے

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے پاس بیٹھا ہوا تھا، ایک شخص نے کہا اسلام قبول کرنے کے بعد مجھے کسی اور عمل کی ضرورت نہیں ہے سوا اس کے کہ میں حجاج کو پانی پلاتا رہوں گا۔ دوسرے شخص نے کہا مجھے اسلام لانے کے بعد کسی اور عمل کی ضرورت نہیں ہے مگر میں مسجد حرام کی زیارت کروں گا اور اس کو آباد رکھوں گا۔ تیسرے شخص نے کہا تم نے جو چیزیں بیان کی ہیں ان سے جہاد کرنا زیادہ افضل ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ڈانٹا اور فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آوازیں بلند نہ کرو اور وہ جمعہ کا دن تھا، لیکن میں جمعہ کی نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مسئلہ میں دریافت کروں گا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

(صحیح مسلم الامارۃ: ۱۱۱ (۱۸۷۹) ۴۷۸۸، مسند احمد رقم الحدیث ۱۸۳۹۵، المعجم الاوسط ج ۱ رقم الحدیث: ۲۲۳، جامع البیان جز ۱۰، رقم الحدیث: ۱۲۸۶۰، تفسیر امام ابن ابی حاتم، رقم الحدیث: ۱۰۰۶۳)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: غزوۂ بدر میں جب حضرت عباس بن عبد المطلب کو قید کیا گیا تو انہوں نے کہا ہرچند کہ تم اسلام کو قبول کرنے میں اور ہجرت کرنے میں اور جہاد کرنے میں ہم پر سبقت کر چکے ہو لیکن ہم مسجد حرام کو آباد رکھتے ہیں، حجاج کو پانی پلاتے ہیں اور قیدیوں کو چھڑاتے ہیں تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ نیز حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ مشرکین نے کہا کہ بیت اللہ کی تعمیر کرنا اور حجاج کو پانی پلانا، ایمان لانے اور جہاد کرنے سے افضل ہے اور وہ لوگ حرم کی دیکھ بھال کرنے کی وجہ سے فخر اور تکبر کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیتیں بھی نازل فرمائیں:

قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِیْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ○ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ○ (المومنون: ۶۷-۶۶)

بے شک تم پر میری آیتیں تلاوت کی جاتی تھیں تو تم اپنی ایڑیوں پر پلٹ کر بھاگ جاتے تھے درآنحالیکہ تم تکبر کرتے تھے اور رات کو (اللہ کی آیتوں کے متعلق) بے ہودہ باتیں کرتے تھے۔

پس مشرکین نے جو کعبہ کی دیکھ بھال کی ہے اور حجاج کو پانی پلایا ہے' اس سے اللہ پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا کہیں افضل ہے۔
(جامع البیان جز ۱۰ص ۱۲۳-۱۲۲' تفسیر امام ابن ابی حاتم ص ۱۷۶۷' تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۸۴-۳۸۳ طبع بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ جہاد کیا' اللہ کے نزدیک ان کا بہت بڑا درجہ ہے اور وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں○ ان کا رب ان کو اپنی رحمت اور رضا کی خوشخبری دیتا ہے اور ان جنتوں کی جن میں ان کے لیے دائمی نعمت ہے○ وہ ان جنتوں میں ہمیشہ رہنے والے ہیں' بے شک اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے○ (التوبہ: ۲۲-۲۱-۲۰)

سابقین صحابہ کی فضیلت اور اللہ کی رضا کا جنت سے افضل ہونا

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ وہ مشرک جنہوں نے کعبہ کی حفاظت کی اور حجاج کو پانی پلایا ان مسلمانوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں انہوں نے اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ جہاد کیا' ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اس کی مزید وضاحت کی اور فرمایا: ان کا بہت بڑا درجہ ہے' اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ کی حفاظت کرنے والے مشرکوں کا بھی اللہ کے نزدیک کوئی درجہ ہے لیکن مسلمانوں کا بڑا درجہ ہے حالانکہ مشرکوں کے تمام نیک اعمال اکارت ہو جاتے ہیں اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ واقع میں اللہ کے نزدیک ان کا کوئی درجہ نہیں ہے' البتہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ ان کاموں کی وجہ سے اللہ کے نزدیک ان کا کوئی درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تمہارے گمان میں تمہارا جو بھی درجہ ہے ایمان لانے والوں' ہجرت کرنے والوں اور جہاد کرنے والوں کا تم سے بہت بڑا درجہ ہے' اس کی نظیر یہ آیت ہے:

آٰللّٰهُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِكُوْنَ○ (النمل: ۵۹) (آپ کہئے) کیا اللہ بہتر ہے یا جن کو وہ اللہ کا شریک قرار دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے وضاحت کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ اللہ کے نزدیک ایمان لانے والوں' ہجرت کرنے والوں اور جہاد کرنے والوں کا درجہ تمام مخلوق سے بڑا ہے' اور ان کا درجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اللہ کی رحمت اور اس کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے' فوز کا معنی ہے اپنے مطلوب کو پالینا اور ان کا مطلوب عذاب سے نجات اور ثواب کا حصول ہے اور اس کا مصداق فتح مکہ سے پہلے جہاد کرنے والے صحابہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓىٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى۔ (الحدید: ۱۰)

(اے مسلمانو!) تم میں سے جن لوگوں نے فتح (مکہ) سے پہلے (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا اور جہاد کیا' ان کے برابر کوئی نہیں ہو سکتا ان کا ان سے بہت بڑا درجہ ہے جنہوں نے بعد میں (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا اور جہاد کیا اور اللہ نے ان سب سے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔

اس کی تائید اس حدیث میں ہے:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اصحاب کو سب و شتم نہ کرو (برا نہ کہو) پس اگر تم میں سے کوئی شخص (اللہ کی راہ میں) احد پہاڑ جتنا بھی خرچ کرے تو وہ ان کے خرچ کیے ہوئے ایک کلو

یا نصف کلو کے برابر نہیں ہو سکتا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۳۶۷۳، صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۵۴۰، سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۴۶۵۸، سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۸۶۱، مسند احمد ج ۳ ص ۵۴، ۶۳، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۱۰ ص ۲۰۹، تاریخ بغداد ج ۷ ص ۱۴۴، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۱۶۱)

آیت:۲۱ میں فرمایا ہے: ان کا رب ان کو رحمت اور رضا کی خوشخبری دیتا ہے۔ یہ رب کریم کا وعدہ ہے اور حدیث میں ہے:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اہل جنت سے فرمائے گا: اے اہل جنت! وہ کہیں گے اے ہمارے رب! ہم حاضر ہیں اور تیری اطاعت کے لیے موجود ہیں اور تمام خیر تیرے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم راضی ہو گئے؟ وہ کہیں گے: اے رب! ہم کیوں راضی نہیں ہوں گے حالانکہ تو نے ہمیں وہ کچھ دیا ہے جو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا میں تم کو اس سے زیادہ افضل چیز نہ دوں؟ وہ کہیں گے: اے رب! اس سے زیادہ افضل اور کیا چیز ہے؟ اللہ فرمائے گا: میں تم پر اپنی رحمت اور رضا نازل کرتا ہوں، اس کے بعد میں کبھی بھی تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۶۵۴۹، صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۸۲۹، سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۵۵۵، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۷۷۴۹، مسند احمد ج ۳ ص ۸۸)

سب سے بڑی نعمت اللہ کی رضا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ورضوان من اللہ اکبر۔ (التوبہ:۷۲) اللہ کی تھوڑی سی رضا بھی بہت بڑی چیز ہے، لیکن اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ جنت کو معمولی نعمت سمجھا جائے اور جنت کی تحقیر کی جائے۔ جیسا کہ جاہل صوفی کرتے ہیں، جنت اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اس سے بھی بڑی نعمت اللہ کی رضا ہے لیکن یہ نعمت ہم کو جنت میں ہی حاصل ہوگی، اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں جنت کی طلب اور زیادہ فرمائے اور اپنے فضل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے ہمیں جنت عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! اپنے باپ دادا اور اپنے بھائیوں کو بھی دوست نہ بناؤ اگر وہ کفر کو ایمان پر ترجیح دیتے ہوں، اور تم میں سے جو لوگ ان کو دوست بنائیں گے تو وہی لوگ ظالم ہیں O

کفار اور مشرکین سے محبت کا تعلق رکھنا منع ہے اور بغیر محبت کے معاملات جائز ہیں

اس آیت میں تمام مومنین سے خطاب ہے اور اس کا حکم قیامت تک باقی ہے اور اس آیت میں مسلمانوں کو کفار کے ساتھ دوستی رکھنے سے منع فرمایا ہے، لیکن مسلمان ملکوں میں جو کافر مسلمانوں کی اجازت سے رہتے ہیں ان کے ساتھ خرید و فروخت، مزدوری کرنے اور مزدوری کرانے اور ملکی، ملی اور سماجی امور میں ان سے تعاون کرنا جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے دوستی اور محبت رکھنے سے منع کیا ہے، اس آیت میں فرمایا ہے: تم اپنے کافر باپ دادا اور بھائیوں سے دوستی اور محبت نہ رکھو۔ اس آیت میں بیٹوں کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ بیٹے باپ کے تابع ہوتے ہیں اور فرمایا ہے: تم میں سے جو لوگ ان کو دوست بنائیں گے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: وہ لوگ مشرک ہیں کیونکہ جو شخص شرک کے ساتھ راضی ہوا وہ مشرک ہے لیکن یہ اس پر محمول ہے کہ جب وہ ان کے شرک کی وجہ سے ان کو پسند کرے اور اس وجہ سے ان سے محبت کرے اور اگر وہ کسی اور وجہ سے ان سے دوستی اور محبت رکھتا ہے تو وہ حرام کا مرتکب ہوگا، کافر اور مشرک نہیں ہوگا۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ۔ (المائدہ:۵۱)
اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔

یہود و نصاریٰ اور دیگر کافروں سے دوستی اور محبت کا تعلق رکھے بغیر مسلمانوں کے مفاد میں ان سے دفاعی اور تجارتی معاہدے کرنے جائز ہیں، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے یہودیوں سے معاہدے کیے اور حدیبیہ میں مکہ کے کافروں سے معاہدہ کیا اور آپ نے معاہدہ کی پابندی فرمائی تو ضرورت کی بنا پر کافر ملکوں سے معاہدے کرنا جائز ہیں۔

اسی طرح اگر کسی شخص کے ماں باپ کافر ہیں تو ان سے صلہ رحم کرنا اور کافر رشتہ داروں سے حسن سلوک کرنا بھی جائز ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا۔ (لقمان:۱۵)
دنیا میں مشرک ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

اور حدیث شریف میں ہے:

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما بیان کرتی ہیں، انہوں نے کہا میرے پاس میری ماں آئیں درآنحالیکہ وہ مشرکہ تھیں اور جب قریش نے مسلمانوں سے معاہدہ کیا تھا تو وہ ان کے ساتھ تھیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: یارسول اللہ! میرے پاس میری ماں آئی ہیں درآنحالیکہ وہ اسلام سے اعراض کرنے والی ہیں، کیا میں ان کے ساتھ صلہ رحم کروں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحم کرو۔
(صحیح مسلم، زکوٰۃ:۵۰(۱۰۰۳)۲۲۸۸، صحیح بخاری رقم الحدیث:۲۶۲۰، سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۱۶۶۸)

اسی طرح جن مشرکین نے مسلمانوں کے ساتھ قتال کیا نہ کوئی اور ظلم کیا ان کے ساتھ بھی نیک سلوک کرنا جائز ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ (الممتحنہ:۸)
جن لوگوں نے دین میں تم سے جنگ نہیں کی اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، اللہ تم کو ان کے ساتھ نیکی کرنے سے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

امام بخاری نے لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ کے ساتھ ہجرت کی۔ وہ ایک ایسی بستی میں داخل ہوئے جس میں ایک ظالم بادشاہ تھا۔ اس نے حضرت سارہ کے متعلق کہا ان کو آجر (ہاجر) دے دو، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک زہر آلود بکری ہدیہ کی گئی، اور ابوحمید نے کہا: ایلہ کے بادشاہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سفید خچر ہدیہ کیا، اور آپ کو ایک چادر پہنائی اور آپ نے اس سرزمین پر اس بادشاہ کی حکومت کے لیے لکھا۔ (صحیح البخاری باب قبول الھدیۃ من المشرکین ص ۵۴۳، مطبوعہ دارارقم بیروت)

قرآن مجید کی ان آیات اور احادیث سے یہ واضح ہو گیا کہ کفار اور مشرکین سے دوستی اور محبت کرنا منع ہے، اور بغیر دوستی اور محبت کے ان کے ساتھ نیک سلوک کرنا، ان سے تحائف لینا اور ان کو تحائف دینا، ان سے قرض اور خرید و فروخت کا معاملہ کرنا جائز ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے ایک ماہ کے ادھار پر طعام خریدا اور اس کے پاس اپنی زرہ گروی رکھ دی۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث:۲۰۶۸، صحیح مسلم رقم الحدیث:۱۶۰۳) اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی

اللہ علیہ وسلم نے ایک مشرک سے ایک بکری خریدی۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۶۱۸، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۰۵۶)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے رسول مکرم!) آپ کہئے کہ اگر تمہارے باپ دادا اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے رشتہ دار اور تمہارے کمائے ہوئے مال اور تمہاری تجارت جس کے گھاٹے کا تمہیں خطرہ ہے اور تمہارے پسندیدہ مکان، تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہوں تو تم انتظار کرو حتیٰ کہ اللہ اپنا حکم لے آئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتاO (التوبہ: ۲۴)

اپنے باپ، بیٹے، بھائی، بیوی، قریبی اعزہ، وطن، تجارت اور مال و دولت سے زیادہ اللہ اور اس کے رسول کا محبوب ہونا

انسان کو فطری طور پر اپنے باپ دادا، بیٹے، بیویاں اور دیگر قریبی رشتہ دار بہت محبوب ہوتے ہیں، اسی طرح اس کو اپنا کمایا ہوا مال اور اپنا کاروبار بھی بہت مرغوب ہوتا ہے اور اپنے رہائشی مکان بھی اس کو بہت پسند ہوتے ہیں اور ان سب کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں چلے جانا اس کے لیے بہت دشوار ہوتا ہے اس لیے ہجرت کرنا اس پر طبعاً گراں ہوتا ہے اور اپنی جان بھی اس کو بہت پیاری ہوتی ہے اس لیے اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اس پر بہت شاق ہوتا ہے، اور شیطان بھی اس کو ہجرت کرنے اور جہاد کرنے سے ورغلاتا ہے۔ حدیث میں ہے:

حضرت سبرہ بن ابی فاکہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ شیطان ابن آدم کے راستوں میں بیٹھ جاتا ہے، وہ اسلام کے راستہ میں بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے تم اپنے دین اور اپنے آباء و اجداد کے دین کو چھوڑ رہے ہو؟ ابن آدم شیطان کی بات رد کر کے اسلام قبول کر لیتا ہے، پھر وہ اس کی ہجرت کے راستہ میں بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے تم ہجرت کر کے اپنے وطن کی زمین اور آسمان کو چھوڑ رہے ہو، مہاجر کی مثال تو اس گھوڑے کی طرح ہے جو رسی سے بندھا ہوا ہو (یعنی تم ایک اجنبی شہر میں جا کر مقید ہو جاؤ گے اور کسی جگہ آ جا نہیں سکو گے) ابن آدم شیطان کی اس بات کو بھی رد کر کے ہجرت کرتا ہے، پھر شیطان اس کے جہاد کے راستہ میں بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے تم جہاد کرنے جا رہے ہو، تم اپنی جان اور مال کو خطرہ میں ڈالو گے، تم جہاد میں مارے جاؤ گے، تمہاری بیوی دوسرا نکاح کر لے گی، تمہارا مال تقسیم ہو جائے گا۔ ابن آدم اس کی اس بات کو بھی رد کر کے جہاد کے لیے چلا جاتا ہے۔ جس مسلمان نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہے کہ وہ اس کو جنت میں داخل کر دے...... الحدیث۔ (سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۱۳۴)

اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مسلمانوں پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں، مال و دولت، اپنے مکانوں بلکہ خود اپنی جانوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو محبوب رکھیں، اور اللہ کے رسول کی محبت میں اپنے وطن سے ہجرت کریں اور اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔

اللہ کی محبت کا کیا معنی ہے، اللہ بندوں سے کس طرح محبت کرتا ہے اور بندے اس سے کس طرح محبت کریں، اس کی پوری تفصیل ہم نے آل عمران: ۳۱ میں بیان کر دی ہے، اس کو وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا کیا معنی ہے، آپ سے محبت کی کیا وجوہات ہیں اور آپ سے محبت کی کیا علامات ہیں، اس کو ہم نے شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۵۱-۴۲۵ میں بیان کر دیا ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائیں اور تبرکاً چند حدیثیں یہاں بھی ذکر کی جاتی ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک

مومن نہیں ہو گا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد' اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث:۱۵' صحیح مسلم رقم الحدیث:۴۴' سنن النسائی رقم الحدیث:۵۰۱۴' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۶۷' مسند احمد رقم الحدیث:۱۲۸۱۴' طبع جدید)

زہرہ بن معبد اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں' ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ آپ نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ حضرت عمر نے کہا: اللہ کی قسم یا رسول اللہ! اپنی جان کے سوا آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں' تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو گا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہوں۔ پھر حضرت عمر نے کہا: اللہ کی قسم! یا رسول اللہ! اب آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اب اے عمر! (مسند احمد ج ۴ ص ۳۳۶' طبع قدیم)

صحابہ کرام محبت کے اس معیار کا کامل نمونہ تھے

اس آیت میں فرمایا ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے باپ دادا اور اولاد سے زیادہ محبوب ہوں اور جنگ بدر میں جب عتبہ بن ربیعہ نے مبارزت کی اور مسلمانوں کو مقابلے لے لیے للکارا تو حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ مقابلہ کے لیے آگے بڑھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: تم بیٹھ جاؤ۔
(کتاب المغازی للواقدی ج ۱ ص ۷۰' مطبوعہ عالم الکتب بیروت' ۱۴۰۴ھ)

ابن شوذب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جنگ بدر کے دن حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے باپ ان کو اپنے بت دکھا رہے تھے اور حضرت ابوعبیدہ ان سے اعراض کر رہے تھے' لیکن جب ان کے باپ باز نہ آئے' بت دکھاتے رہے اور ان کی تعریف کرتے رہے تو حضرت ابوعبیدہ نے اپنے باپ کو قتل کر دیا اور پھر ان کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (المجادلہ:۲۲)

(اے رسول مکرم!) جو لوگ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں آپ ان کو اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت کرنے والا نہ پائیں گے خواہ (وہ دشمن) ان کے باپ ہوں یا بیٹے ہوں یا بھائی ہوں یا ان کے قریبی رشتہ دار ہوں' یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو جاگزین کر دیا ہے اور اپنی طرف کی پسندیدہ روح سے ان کی تائید فرمائی ہے' اور وہ ان کو ان جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں' اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے' یہی لوگ اللہ کا لشکر ہیں۔ سنو! اللہ کے لشکر کے لوگ ہی کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔

(المعجم الکبیر رقم الحدیث:۳۶۰' المستدرک ج ۳ ص ۲۶۵۔۲۶۴' حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ امام طبرانی کی سند جید ہے' الاصابہ ج ۳ ص ۴۷۶' رقم:۴۴۱۸' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' حافظ ابن کثیر نے اس روایت کو حافظ بیہقی کے حوالہ سے ذکر کیا ہے' تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۳۸۵' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۸ھ)

نیز اس آیت میں فرمایا ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول ان کے رشتہ داروں سے زیادہ محبوب ہوں اور

حدیث میں ہے کہ جنگ بدر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے مسلمانوں کو لڑنے کے لیے للکار رہے تھے۔ حضرت ابوبکر نے ان کے مقابلہ پر جانا چاہا لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنی ذات سے ہمیں فائدہ پہنچاؤ۔ (الاستیعاب ج ۲ ص ۳۶۸، رقم: ۱۴۰۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جنگ بدر میں اپنے ماموں العاص بن ہشام بن المغیرہ کو قتل کر دیا تھا۔

(سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۲۴، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام ابوالحسن علی بن احمد الواحدی المتوفی ۴۶۸ھ مذکور الصدر آیت (المجادلہ: ۲۲) کے شان نزول میں لکھتے ہیں:

ابن جریج نے کہا مجھے یہ حدیث بیان کی گئی ہے کہ ابو قحافہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دی تو حضرت ابوبکر نے ابو قحافہ (حضرت ابوبکر کا باپ) کو اس زور سے تھپڑ مارا کہ وہ گر پڑا، پھر انہوں نے اس واقعہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا۔ آپ نے پوچھا: کیا تم نے ایسا کیا؟ عرض کیا: ہاں! آپ نے فرمایا: دوبارہ ایسا نہ کرنا۔ حضرت ابوبکر نے کہا: اللہ کی قسم! اگر میرے پاس تلوار ہوتی تو میں اس کو قتل کر دیتا، تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کی شان میں نازل ہوئی جب انہوں نے جنگ احد میں اپنے باپ عبداللہ بن الجراح کو قتل کر دیا اور حضرت ابوبکر کی شان میں نازل ہوئی جب جنگ بدر میں ان کے بیٹے عبدالرحمن نے مسلمانوں کو جنگ کے لیے للکارا تو حضرت ابوبکر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے مقابلہ میں لڑنے کی اجازت مانگی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنی ذات سے ہمیں فائدہ پہنچاؤ۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تم میرے لیے میری آنکھوں اور میرے کانوں کے مرتبہ میں ہو۔ اور حضرت مصعب بن عمیر کی شان میں نازل ہوئی جب انہوں نے اپنے بھائی عبید بن عمیر کو جنگ احد میں قتل کر دیا اور حضرت عمر کی شان میں نازل ہوئی جب انہوں نے اپنے ماموں العاص بن ہشام بن المغیرہ کو جنگ بدر میں قتل کر دیا اور حضرت علی اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کی شان میں نازل ہوئی جب انہوں نے عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ کو قتل کر دیا اور یہ صحابہ اس آیت کے اس حصہ کے مصداق ہیں خواہ وہ (دشمن) ان کے باپ ہوں یا بیٹے ہوں یا بھائی ہوں یا ان کے قریبی رشتہ دار۔

(اسباب النزول للواحدی ص ۴۳۴ رقم الحدیث: ۴۱۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، اسباب النزول للسیوطی ص ۸۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

سورۂ توبہ کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر واجب کیا ہے کہ وہ اپنے باپ دادا، اپنے بیٹوں، اپنے بھائیوں، اپنی بیویوں اور اپنے قریبی رشتہ داروں سے زیادہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھیں اور ان احادیث سے واضح ہو گیا کہ مختلف جنگوں میں صحابہ کرام نے اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں اپنے باپ، بھائی اور دیگر قریبی رشتہ داروں کو قتل کر دیا اور ہم اس سے پہلے التوبہ: ۱۲ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ ایک نابینا صحابی کے ایک باندی سے دو کمسن بچے تھے لیکن وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتی تھی تو انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۳۶۱) اور حضرت عمیر بن امیہ کی ایک بہن تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرتی تھی تو انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔ (المعجم الکبیر ج ۱۷ ص ۶۵-۶۴) اسی طرح صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں مکہ سے مدینہ ہجرت کی اور اپنے رشتہ داروں کے علاوہ اپنے وطن، اپنے پسندیدہ مکانوں اور اپنے جمع شدہ مال اور اپنے کاروبار اور تجارت کو چھوڑ کر مدینہ چلے آئے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

امام ابن عدی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت صہیب بن سنان سے روایت کیا ہے کہ میں بعثت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں تھا، کہا جاتا ہے کہ جب حضرت صہیب نے ہجرت کی تو مشرکین کی ایک جماعت نے ان کا پیچھا کیا۔ حضرت صہیب نے کہا: اے قریش کی جماعت! میں تم سب سے بڑا تیرانداز ہوں اور جب تک میرے ترکش میں ایک تیر بھی باقی ہے تو تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ تیر ختم ہونے کے بعد میں اپنی تلوار سے تم پر وار کروں گا سو اگر تم میرا مال چاہتے ہو تو میں تم کو اس کا پتا بتاتا ہوں۔ کفار قریش اس پر راضی ہو گئے۔ حضرت صہیب نے ان سے معاہدہ کیا اور ان کو اپنے مال کا پتا بتا دیا، وہ واپس گئے اور حضرت صہیب کا مال اپنے قبضہ میں کرلیا۔ جب حضرت صہیب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہاری تجارت فائدہ مند رہی، اور اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ۔ (البقرہ: ۲۰۷)
اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی رضا کی طلب میں اپنی جان کو بیچ ڈالتے ہیں۔

(الاصابہ ج ۳ ص ۳۶۵، رقم: ۴۱۲۴، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، کامل ابن عدی ج ۷ ص ۲۶۲۶، مطبوعہ دارالفکر بیروت)

سو واضح ہو گیا کہ صحابہ کرام کو اپنے باپ، بیٹوں اور تمام رشتہ داروں، وطن، مکان، تجارت اور مال و دولت ہر چیز سے زیادہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِىْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ
بے شک اللہ نے بہ کثرت مواقع پر تمہاری مدد فرمائی اور (غزوہ) حنین کے دن (بھی) جب

اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ
تمہاری کثرت نے تمہیں گھمنڈ میں مبتلا کر دیا تھا (حالانکہ) اس کثرت نے تم سے کسی چیز کو دور نہیں کیا اور زمین اپنی

الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝۲۵ ۚ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ
وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ پھیرتے ہوئے لوٹے ○ پھر اللہ نے اپنے رسول پر

سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا
طمانیت قلب نازل فرمائی اور ایمان والوں پر (بھی) اور اس نے ایسے لشکر اتارے

لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۶
جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کو عذاب دیا اور کافروں کی یہی سزا ہے ○

ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ
پھر اس کے بعد اللہ جس کی چاہے گا توبہ قبول فرمائے گا اور اللہ

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ

بہت بخشنے والا بے حد مہربان ہے ○ اے ایمان والو تمام مشرک

نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ

محض نجس ہیں، سو وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے قریب نہ

هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ

آئیں، اور اگر تم فقر کا خوف کرو تو اگر اللہ نے چاہا تو وہ تم کو عنقریب اپنے

فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۸﴾ قَاتِلُوا

فضل سے غنی کردے گا، بے شک اللہ بے حد جاننے والا بہت حکمت والا ہے ○ ان لوگوں سے قتال

الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا

کرو جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ روزِ آخرت پر اور نہ

يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ

وہ اللہ اور اس کے رسول کے حرام کیے ہوئے کو حرام قرار دیتے ہیں اور نہ وہ دین حق کو

الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ

قبول کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کو کتاب دی گئی (تم ان سے قتال کرتے رہو) حتیٰ کہ وہ ذلت کے

يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ ع ۱۰/۵

ساتھ ہاتھ سے جزیہ دیں ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک اللہ نے بکثرت مواقع پر تمہاری مدد فرمائی اور (غزوہ) حنین کے دن (بھی) جب تمہاری کثرت نے تمہیں گھمنڈ میں مبتلا کر دیا تھا، (حالانکہ) اس کثرت نے تم سے کسی چیز کو دور نہیں کیا اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھیرتے ہوئے لوٹے ○ پھر اللہ نے اپنے رسول پر طمانیت قلب نازل فرمائی، اور ایمان والوں پر (بھی) اور اس نے ایسے لشکر اتارے جن کو تم نے نہیں دیکھا، اور کافروں کو عذاب دیا اور کافروں کی یہی سزا ہے ○ پھر اس کے بعد اللہ جس کی چاہے گا توبہ قبول فرمائے گا، اور اللہ بہت بخشنے والا بے حد مہربان ہے ○ (التوبہ: ۲۷-۲۵)

آیات سابقہ سے ارتباط

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ وہ اپنے مشرک باپ، بیٹوں، بھائیوں، بیویوں اور قریبی رشتہ داروں سے احتراز کریں اور اپنے اموال، تجارت، مکانوں اور کاروبار کو دین کے مفاد کے لیے ترک کر دیں اور چونکہ یہ امر طبعی طور پر مسلمانوں کے لیے مشکل اور دشوار تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے غزوہ حنین کی مثال سے یہ بیان فرمایا کہ جو شخص دین کی خاطر دنیا کو ترک کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیاوی مطلوب بھی عطا فرماتا ہے، کیونکہ غزوہ حنین میں جب مسلمانوں نے اپنی کثرت پر اعتماد اور بھروسہ کیا تو وہ شکست کھا گئے، پھر جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف گڑگڑا کر رجوع کیا تو انہوں نے کفار کے لشکر کو شکست دے دی اور کافی مال غنیمت ان کے ہاتھ آیا، اس سے معلوم ہوا کہ جب انسان دنیا پر اعتماد کرتا ہے تو دین اور دنیا دونوں اس کے ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں اور جب وہ اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اور دین کو دنیا پر ترجیح دیتا ہے تو اللہ اس کو دین اور دنیا دونوں عطا فرماتا ہے۔

وادی حنین کا محل وقوع

مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک وادی ہے جس کا نام حنین ہے۔ (کتاب المغازی للواقدی ج ۲ ص ۸۸۵، طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۴۹) حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ ذوالمجاز کے پہلو میں طائف کے قریب یہ وادی ہے۔ عرفات کی جہت میں یہ مکہ سے دس بارہ میل ہے، ابوعبید بکری نے کہا ہے کہ حنین بن قابشہ بن مہلائل کے نام پر اس وادی کا نام حنین پڑ گیا۔
(فتح الباری ج ۸ ص ۲۷)

اہل حنین کی مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاری

ہرچند کہ مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا لیکن جب تک مکہ فتح نہیں ہوا تھا، قبائل عرب مطمئن تھے، ان کا خیال تھا کہ اگر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کر لیا تو وہ واقعی سچے نبی ہیں، اور جب مکہ فتح ہو گیا تو بہت سے قبائل نے اسلام قبول کر لیا، لیکن ہوازن اور ثقیف دو قبیلے بہت جنگجو اور فنون حرب کے ماہر تھے، انہوں نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ اس وقت مسلمان مکہ میں جمع ہیں اس لیے سب مل کر ان پر حملہ کر دیں، ان کے لشکر میں ہوازن اور ثقیف کی تمام شاخیں شریک تھیں لیکن کعب اور کلاب ان سے الگ رہے۔ ان کے لشکر کے سپہ سالار مالک بن عوف تھے۔ (یہ بعد میں طائف میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ انہوں نے دمشق کو فتح کیا اور جنگ قادسیہ میں شہید ہوئے۔ الاصابہ رقم: ۷۶۸۹)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اہل حنین سے جہاد کی تیاری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب مکہ میں ہوازن اور ثقیف کی جنگی تیاریوں کی خبر پہنچی تو آپ نے حضرت عبداللہ بن ابی حدرد رضی اللہ عنہ کو تحقیق کے لیے حنین بھیجا۔ انہوں نے حنین میں کئی دن جاسوسی کی پھر آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حالات سے مطلع کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقابلہ کی تیاری کی، مکہ میں صفوان بن امیہ امیر شخص تھا اور اس کے پاس کافی اسلحہ تھا۔ وہ اس وقت تک اسلام نہیں لایا تھا، آپ نے اس سے اسلحہ مستعار لیا، امام ابوداؤد نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: اے صفوان! کیا تمہارے پاس ہتھیار ہیں؟ اس نے پوچھا: آپ عاریتاً لینا چاہتے ہیں یا غصب کرنا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں! میں عاریتاً لینا چاہتا ہوں۔ اس نے آپ کو تیس چالیس زرہیں عاریتاً دیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ حنین میں گئے۔ جب مشرکین شکست کھا گئے تو صفوان کی زرہیں جمع کی گئیں تو اس نے کئی زرہیں گم پائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان سے فرمایا: ہم سے تمہاری کئی زرہیں گم ہو گئیں، کیا ہم تم کو ان کا تاوان ادا

کریں؟ اس نے کہا: نہیں یا رسول اللہ! کیونکہ میرے دل میں جو اب (آپ کی محبت) ہے وہ اس وقت نہیں تھی۔
(سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۳۵۶۳، سیرت ابن ہشام مع الروض الانف ج ۴ ص ۲۰۸، البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۵۲۷ طبع جدید)

اسماعیل بن ابراہیم اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ حنین کے لیے گئے تو ان سے تیس یا چالیس ہزار درہم قرض لیے، پھر جب آپ واپس آئے تو آپ نے وہ سب قرض ادا کر دیا، پھر ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تمہارے اہل اور مال میں برکت دے۔ قرض کی جزا یہ ہے کہ اس کو واپس کیا جائے اور (قرض خواہ کا) شکریہ ادا کیا جائے۔ (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۴۲۴)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا غزوہ حنین کے لیے روانہ ہونا

امام ابن اسحٰق نے کہا ہے کہ ان تیاریوں کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہوازن کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ کے ساتھ دس ہزار وہ صحابہ تھے جو مدینہ سے آپ کے ساتھ فتح مکہ کے لیے آئے تھے اور دو ہزار وہ نومسلم صحابہ تھے جو مکہ میں مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کو طلقاء کہا جاتا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۵۲۷) نیز امام محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ بیس رمضان آٹھ ہجری کو مکہ فتح ہوا تھا، اور پانچ شوال آٹھ ہجری کو آپ ہوازن کی طرف روانہ ہوئے، اس طرح ان کا گمان یہ ہے کہ فتح مکہ کے پندرہ دن بعد آپ ہوازن کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرت ابن مسعود سے یہی روایت ہے اور عروہ بن الزبیر کا بھی یہی قول ہے۔ امام احمد کا اور امام ابن جریر کا بھی یہی مختار ہے اور امام واقدی نے یہ کہا ہے کہ آپ چھ شوال کو روانہ ہوئے اور دس شوال کو حنین پہنچ گئے۔ بارہ ہزار کا کثیر تعداد لشکر دیکھ کر حضرت ابوبکر نے یہ کہا کہ آج ہم لشکر کی قلت کی وجہ سے شکست یاب نہیں ہوں گے، تو مسلمانوں کو شکست ہوئی، پہلے بنو سلیم کو شکست ہوئی، پھر اہل مکہ کو، پھر تمام مسلمانوں کو۔

(البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۵۲۴، طبع جدید، ۱۴۱۸ھ)

بعض نومسلم صحابہ کا حنین کے راستے میں ذات انواط کی تمنا کرنا

امام ابن اسحاق نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حارث بن مالک بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حنین کی طرف گئے۔ ہم اس وقت زمانہ جاہلیت سے نئے نئے نکلے ہوئے تھے۔ کفار قریش اور دیگر عرب کے لیے ایک سرسبز درخت تھا جس کو ذات انواط کہتے تھے۔ وہ ہر سال اس درخت پر آتے اور اس پر اپنا اسلحہ لٹکاتے اور وہاں جانور ذبح کرتے اور وہاں ایک دن اعتکاف کرتے۔ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حنین کی طرف جا رہے تھے تو ہم نے بیری کا ایک بہت بڑا سرسبز درخت دیکھا، ہم نے کہا یا رسول اللہ! اس درخت کو ہمارے لیے ذات انواط کر دیجئے جیسے ان کا ایک درخت ذات انواط ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اکبر! تم نے ایسی بات کہی ہے جیسی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہی تھی: ہمارے لیے بھی ایک ایسا معبود بنا دیجئے جیسے ان کے معبود ہیں، حضرت موسیٰ نے فرمایا: تم جاہل لوگ ہو۔ (الاعراف: ۱۳۸) یہ ان لوگوں کی عادتیں تھیں اور تم میں بھی ان کی عادتیں سرایت کریں گی۔ (سیرت ابن ہشام مع الروض الانف ج ۴ ص ۲۱۲)

(مسند احمد ج ۵ ص ۲۱۸، المعجم الکبیر ج ۳ ص ۲۷۵، مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۲۰۷۶۳، مسند الحمیدی رقم الحدیث: ۸۴۸)

حنین میں ابتدائی شکست، شکست کے اسباب اور آپ کو چھوڑ کر بھاگنے والوں کی تعداد

ابو اسحاق بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے کہا: اے ابو عمارہ! کیا تم جنگ حنین کے دن بھاگ پڑے تھے، انہوں نے کہا نہیں خدا کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیٹھ نہیں پھیری تھی، بلکہ امر واقعہ یہ تھا کہ

آپ کے اصحاب میں سے چند جلد باز اور نہتے نوجوان آگے نکلے اور ان کا مقابلہ ہوازن اور بنو نضر کے تیراندازوں سے ہوا جن کا کوئی تیر خطا نہیں جاتا تھا۔ انہوں نے اس طرح تاک تاک کر تیر برسائے کہ ان کا کوئی تیر خطا نہیں گیا' پھر یہ جوان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہٹ آئے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفید خچر پر سوار تھے' اور ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب اس کے آگے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خچر سے اترے اور اللہ سے مدد طلب کی' اس وقت آپ یہ فرما رہے تھے: میں نبی ہوں یہ جھوٹ نہیں ہے' میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۲۹۳۰' صحیح مسلم مغازی:۷۸' (۱۷۷۶) ۴۵۳۵' سنن الترمذی رقم الحدیث:۱۶۸۸' مسند احمد ج ۴ ص ۲۸۰)

ابو اسحاق بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ قیس کے ایک شخص نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے سوال کیا' کیا تم غزوۂ حنین کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ حضرت براء نے کہا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں کے سامنے سے نہیں ہٹے۔ ہوازن کے جوان اس دن تیراندازی کر رہے تھے' ہم نے جب ان پر حملہ کیا تو وہ بھاگ گئے' اور جب ہم مال غنیمت لوٹنے لگے تو انہوں نے ہمیں تیروں پر رکھ لیا اور میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سفید خچر پر سوار تھے اور حضرت ابوسفیان بن حارث اس کی لگام پکڑے ہوئے تھے اور آپ فرما رہے تھے: میں نبی ہوں یہ جھوٹ نہیں ہے' میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔ (صحیح مسلم' مغازی:۸۰' (۱۷۷۶) ۴۵۳۷)

امام عبدالملک بن ہشام متوفی ۲۱۳ھ لکھتے ہیں:

جب ہوازن کی تیراندازی سے بھگدڑ مچی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں جانب ہوگئے' پھر آپ نے فرمایا: لوگ کہاں ہیں؟ میرے پاس آئیں' میں اللہ کا رسول ہوں اور میں محمد بن عبداللہ ہوں' کچھ نہیں ہوا' اونٹ ایک دوسرے پر حملہ کر رہے تھے' اور مسلمان بھاگ گئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مہاجرین اور انصار اور آپ کے اہل بیت میں سے چند لوگ تھے۔ مہاجرین میں سے جو آپ کے ساتھ ثابت قدم رہے وہ حضرت ابوبکر اور عمر تھے اور اہل بیت میں سے حضرت علی بن ابی طالب' حضرت عباس بن عبدالمطلب' حضرت ابوسفیان بن الحارث اور ان کے بیٹے' اور حضرت فضل بن عباس اور ربیعہ بن الحارث اور حضرت اسامہ بن زید اور ایمن بن عبید تھے اور ایمن اس دن شہید ہوگئے تھے۔

(سیرت ابن ہشام مع الروض الانف ج ۴ ص ۲۱۲' البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۵۲۹ طبع جدید' سیرت ابن کثیر ج ۳ ص ۲۶۶' بیروت)

امام محمد بن عمر بن واقد متوفی ۲۰۷ھ لکھتے ہیں:

روایت ہے کہ جب مسلمان شکست کھا گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حارثہ بن النعمان سے فرمایا: اے حارثہ ثابت قدم رہنے والے کتنے ہیں؟ تو انہوں نے دائیں بائیں دیکھ کر کہا ایک سو ہیں' حتیٰ کہ جس دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کے دروازے پر حضرت جبرئیل سے کلام کر رہے تھے اس وقت وہاں سے حضرت حارثہ گزرے تو حضرت جبرئیل نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ حارثہ بن النعمان ہے' تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: یہ ان سو مسلمانوں میں سے ہیں جو یوم حنین میں ثابت قدم رہے اور روایت ہے کہ ان سو میں سے تینتیس مہاجرین تھے اور باقی انصار تھے۔ (کتاب المغازی للواقدی ج ۳ ص ۹۰۱۔۹۰۰ ملخصاً' مطبوعہ عالم الکتب بیروت' ۱۴۰۴ھ)

غزوۂ حنین میں ابتدائی شکست کے بعد فتح اور کامرانی

حضرت عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ حنین میں' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا' میں اور

حضرت سفیان بن الحارث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہے، اور آپ سے بالکل الگ نہیں ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سفید رنگ کی خچر پر سوار تھے جو آپ کو فروہ بن نفاثہ جذامی نے ہدیہ کی تھی۔ جب مسلمانوں اور کفار کا مقابلہ ہوا تو مسلمان پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خچر کو کفار کی جانب دوڑا رہے تھے، حضرت عباس نے کہا میں خچر کی لگام تھام کر اس کو تیز بھاگنے سے روک رہا تھا اور حضرت ابو سفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رکاب پکڑے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عباس اصحاب سمرہ کو آواز دو، حضرت عباس بلند آواز شخص تھے۔ وہ کہتے ہیں میں نے بہ آواز بلند پکارا اصحاب سمرہ کہاں ہیں (سمرہ وہ درخت ہے جس کے نیچے صحابہ نے بیعت رضوان کی تھی، اس کا معنی یہ ہے کہ ان مسلمانوں کو آواز دو جنہوں نے حدیبیہ کے دن بیعت رضوان کی تھی) حضرت عباس نے کہا بخدا یہ آواز سنتے ہی وہ اس طرح پلٹے جیسے گائے اپنے بچوں کی طرف پلٹتی ہے۔ وہ یالبیک! یالبیک! کہتے ہوئے دوڑے آئے اور انہوں نے کافروں سے لڑنا شروع کر دیا۔ انہوں نے انصار کو بلایا وہ کہتے تھے اے انصار کی جماعت! اے انصار کی جماعت! پھر بنو حارث بن خزرج کو بلایا گیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گردن اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ درآنحالیکہ آپ خچر پر سوار تھے، آپ ان کی جنگ کا منظر دیکھ رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس وقت تنور گرم ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند کنکریاں اٹھائیں اور کفار کے چہروں کی طرف پھینکیں اور فرمایا: رب محمد کی قسم! یہ شکست کھا گئے۔ حضرت عباس کہتے ہیں کہ میں دیکھ رہا تھا کہ لڑائی اسی تیزی کے ساتھ جاری تھی کہ آپ نے چند کنکریاں اٹھا کر کفار کے چہروں پر ماریں (اس باب کی آخری روایت میں ہے آپ نے فرمایا "ان کا منہ کالا ہو گیا") بخدا میں نے دیکھا کہ ان کا زور ٹوٹ گیا اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگے۔

(صحیح مسلم، مغازی: ۷۶ (۱۷۷۵) ۴۵۳۲، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۸۶۵۳، تفسیر عبد الرزاق رقم الحدیث: ۱۰۶۴)

یوم حنین میں فرشتوں کا نزول

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: پھر اللہ نے اپنے رسول پر طمانیت قلب نازل فرمائی اور ایمان والوں پر (بھی) اور اس نے ایسے لشکر اتارے جن کو تم نے نہیں دیکھا۔

ہوازن کی تیر اندازی سے جو مسلمان اچانک گھبرا گئے تھے اور مسلمانوں کے بھاگنے سے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تشویش لاحق ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے کفار کو مغلوب کر دیا اور اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشویش دور ہوگئی اور مسلمانوں کے دل مطمئن ہوگئے۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ غزوۂ حنین میں فرشتوں کا نزول صرف اس لیے ہوا تھا کہ وہ مسلمانوں کے دلوں کو مطمئن کریں۔ (تفسیر کبیر، ج ۶ ص ۲۰، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت) علامہ بیضاوی نے لکھا ہے کہ فرشتوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ فرشتے پانچ ہزار تھے، ایک قول ہے آٹھ ہزار تھے اور ایک قول ہے سترہ ہزار فرشتے تھے۔ (بیضاوی علی ہامش الخفاجی ج ۴ ص ۳۱۵) علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ فرشتوں کا نزول حنین میں اس لیے ہوا تھا کہ وہ مسلمانوں کے دل مضبوط کریں اور کافروں کے دل کمزور کریں۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۸ ص ۳۷)

اہل حنین کو عذاب دینے کا معنی

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور کافروں کو عذاب دیا یعنی مسلمانوں کی تلواروں سے ہوازن اور ثقیف کو قتل کیا گیا اور ان کو قید کیا گیا۔ علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ جنگ حنین میں حضرت علی نے اپنے ہاتھ سے چالیس کافروں کو قتل کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار ہزار کو گرفتار کیا۔ ایک قول چھ ہزار کا ہے اور ایک قول بارہ ہزار اونٹ سواروں کا ہے۔ (الجامع

لاحکام القرآن جز ١٢ ص ٣٥) امام ابن اسحٰق نے کہا کہ غزوۂ حنین میں ثقیف کے ستر کافر قتل کیے گئے۔ (البدایہ ج ٣ ص ٥٤٠) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ مال غنیمت جمع کیا جائے لہٰذا اونٹ، بکریوں اور غلاموں کو جمع کیا گیا اور آپ نے حکم دیا کہ تمام مال غنیمت کو جعرانہ میں محفوظ کیا جائے اور مال غنیمت کی نگرانی پر آپ نے حضرت مسعود بن عمر غفاری کو مامور فرمایا۔ (البدایہ والنہایہ ج ٣ ص ٥٤٣، طبع جدید)

اہل حنین میں سے ہوازن اور ثقیف کا اسلام قبول کرنا

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پھر اس کے بعد اللہ جس کی چاہے گا توبہ قبول فرمائے گا۔ یعنی حنین کے رہنے والے ہوازن اور ثقیف جو شکست کھا چکے تھے ان میں سے جس کی اللہ چاہے گا توبہ قبول فرمائے گا اور ان کو اسلام کی ہدایت دے گا۔ چنانچہ حنین کے رئیس مالک بن عوف نصری اور ان کی قوم نے اسلام قبول کر لیا۔

علامہ بدر الدین عینی حنفی لکھتے ہیں: امام ابن اسحاق نے مغازی میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حنین میں تھے۔ جب آپ نے ہوازن کا مال و متاع بطور غنیمت لے لیا اور ان کے لڑنے والوں کو غلام اور باندیاں بنالیا، اور یہ مال غنیمت اور قیدی جعرانہ بھیج دیئے۔ ہوازن مسلمان ہو گئے اور ان کا وفد جعرانہ میں آیا، ادھر ہوازن کا مال غنیمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ میں داخل ہونے سے پہلے تقسیم ہو چکا تھا اور اس سے پہلے کہ آپ جعرانہ سے عمرہ کے لیے روانہ ہوئے، امام ابن اسحٰق نے کہا کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے لوٹے اور جعرانہ پہنچے اس وقت آپ کے پاس ہوازن کے بہت سے قیدی تھے۔ آپ سے ایک شخص نے کہا تھا یارسول اللہ! ثقیف کے لیے دعاء ضرر کیجئے۔ آپ نے دعا کی اے اللہ! ثقیف کو ہدایت دے اور ان کو یہاں لے آ، پھر آپ کے پاس ہوازن کا وفد جعرانہ میں آیا۔ اس وقت آپ کے پاس ان کے چھ ہزار قیدی تھے اور ان کے اموال میں سے چوبیس ہزار اونٹ اور چالیس ہزار بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی۔ ہوازن کے وفد کی درخواست اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب درج ذیل حدیث میں ہے۔ (عمدۃ القاری ج ١٢ ص ١٢٦)

حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جس وقت ہوازن کا وفد مسلمان ہو کر آپ کے پاس آیا تو آپ کھڑے ہو گئے، انہوں نے یہ سوال کیا کہ ان کے اموال اور ان کے قیدی ان کو واپس کر دیئے جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے نزدیک سب سے پسندیدہ بات وہ ہے جو سب سے سچی ہو، تم دو چیزوں میں سے ایک کو اختیار کر لو۔ قیدی یا مال۔ رہا مال تو میں تمہارا انتظار کرتا رہا، اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے لوٹے تو دس پندرہ دن ان کا انتظار کرتے رہے تھے۔ جب ہوازن کو یہ یقین ہو گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو چیزوں میں سے صرف ایک چیز واپس کریں گے تو انہوں نے کہا ہم اپنے قیدیوں کو اختیار کرتے ہیں۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں میں کھڑے ہوئے، پہلے آپ نے اللہ کی وہ حمد و ثناء کی جس کے وہ لائق ہے پھر آپ نے فرمایا، حمد و ثنا کے بعد میں یہ بتاتا ہوں کہ تمہارے یہ بھائی ہمارے پاس توبہ کر کے آئے ہیں اور میں نے یہ مناسب جانا ہے کہ ان کے قیدی ان کو واپس کر دوں، تم میں سے جس کو یہ فیصلہ پسند ہو وہ ان کے قیدی واپس کر دے اور تم میں سے جو شخص اپنا حصہ اپنے پاس رکھنا چاہتا ہو تو اس کے بعد اللہ ہمیں جو مال غنیمت عطا فرمائے گا ہم اس میں سے اس کو دے دیں گے تو وہ ایسا کر لے۔ مسلمانوں نے کہا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر ان لوگوں کو ان کے آدمی خوشی سے واپس کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم از خود نہیں جانتے تم میں سے کس نے (خوشی سے) اجازت دی ہے اور کس نے اجازت نہیں دی، تم واپس جاؤ اور ہمارے پاس ان لوگوں کو بھیجو جو تمہارے معاملات کی دیکھ

بھال کرتے ہیں، لوگ واپس گئے اور انہوں نے اپنے مختاران کار اور اپنے وکیلوں سے مشورہ کیا پھر واپس آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر دی کہ انہوں نے خوشی سے قیدی واپس کرنے کی اجازت دے دی ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۳۰۷-۲۳۹۸، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۲۶۹۳، تفسیر عبد الرزاق ج ۱ ص ۲۴۴)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! تمام مشرک محض نجس ہیں، سو وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے قریب نہ آئیں اور اگر تم فقر کا خوف کرو تو اگر اللہ نے چاہا تو وہ تم کو عنقریب اپنے فضل سے غنی کر دے گا، بے شک اللہ بے حد جاننے والا، بہت حکمت والا ہے O (التوبہ: ۲۸)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ۹ ہجری کے بعد کافروں اور مشرکوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے منع فرما دیا ہے، اس میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ یہ ممانعت صرف مسجد حرام کے ساتھ مختص ہے یا کسی مسجد میں بھی مشرکوں کا داخل ہونا جائز نہیں ہے اور یہ کہ مشرکین کسی صورت میں مسجد میں داخل نہیں ہو سکتے یا یہ ممانعت کسی قید کے ساتھ مقید ہے، اس میں فقہاء کے حسب ذیل مسالک ہیں:

مسجد میں کافر کے دخول کے متعلق فقہاء شافعیہ کا نظریہ

امام فخر الدین رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

امام شافعی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ کفار کو صرف مسجد حرام میں دخول سے منع کیا جائے گا، اور امام مالک کے نزدیک ان کو تمام مساجد میں دخول سے منع کیا جائے گا اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک مسجد حرام میں دخول سے منع کیا جائے گا نہ کسی اور مسجد سے، اس آیت کے صریح الفاظ سے امام ابو حنیفہ کا مذہب باطل ہے اور اس آیت کے مفہوم مخالف سے امام مالک کا قول باطل ہے: ہم یہ کہتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ کفار کو مسجد میں دخول سے نہ منع کیا جائے لیکن اس صریح نص قطعی کی وجہ سے ہم نے اس اصل کی مخالفت کی اور کفار کو مسجد میں دخول کی اجازت دی اور مسجد حرام کے علاوہ باقی مساجد میں ہم نے اصل پر عمل کیا اور ان مساجد میں کفار کو داخل ہونے کی اجازت دی۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۲۲، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۵ھ)

مسجد میں کافر کے دخول کے متعلق فقہاء مالکیہ کا نظریہ

علامہ قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

اہل مدینہ (مالکیہ) نے کہا کہ یہ آیت تمام مشرکین اور تمام مساجد کے حق میں عام ہے۔ عمر بن عبد العزیز نے اپنے عمال کو یہی حکم لکھوایا تھا اور اس حکم کی تائید قرآن مجید کی اس آیت سے ہوتی ہے:

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ۔ (النور: ۳۶)

اللہ کے ان گھروں میں، جنہیں اللہ نے بلند کرنے کا حکم دیا ہے، ان میں اللہ کا نام لیا جائے۔

اور کفار کا مساجد میں داخل ہونا اللہ کی مساجد کے بلند کرنے کے منافی ہے اور صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں مذکور ہے: "ان مساجد میں پیشاب کرنا یا کسی قسم کی کوئی اور نجاست ڈالنا جائز نہیں ہے" اور کافر ان نجاستوں سے خالی نہیں ہے (یعنی وہ استنجا کرتا ہے نہ پاکیزگی حاصل کرتا ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں مسجد کو حائض اور جنبی کے لیے حلال نہیں کرتا، اور کافر جنبی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انما المشرکون نجس (التوبہ: ۲۸) مشرکین نجس ہیں، اب یا تو یہ نجس العین ہیں یا حکماً نجس ہیں اور ہر صورت میں ان کو مساجد سے منع کرنا واجب ہے کیونکہ منع کرنے کی علت "نجاست" ان میں موجود ہے اور مساجد میں حرمت موجود ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۸ ص ۴۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

مسجد میں کافر کے دخول کے متعلق فقہاء حنبلیہ کا نظریہ

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

حرم میں ذمیوں کا داخل ہونا کسی صورت میں جائز نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا۔ مشرکین نجس ہیں تو اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ جائیں۔

(التوبہ:۲۸)

غیر حرم کی مساجد کے متعلق دو روایتیں ہیں: ایک روایت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اجازت کے بغیر ان کا مساجد میں داخل ہونا جائز نہیں ہے، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ایک مجوسی مسجد میں داخل ہو کر منبر پر بیٹھ گیا تو حضرت علی نے اس کو منبر سے اتار کر مارا اور مسجد کے دروازوں سے نکال دیا اور مسلمانوں کی اجازت سے ان کا مسجد میں داخل ہونا جائز ہے اور یہی صحیح مذہب ہے، کیونکہ اسلام لانے سے پہلے اہل طائف کا وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا اور سعید بن مسیب نے کہا کہ ابوسفیان حالت شرک میں مدینہ کی مسجد میں آتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عمیر بن وہب آپ کو قتل کرنے کے ارادہ سے مسجد نبوی میں داخل ہوئے (اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بتادیا کہ تم کس ارادہ سے آئے ہو) تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دولت اسلام سے سرفراز کردیا۔

اور دوسری روایت ہے کہ کافروں کا کسی صورت میں بھی مسجد میں دخول جائز نہیں ہے کیونکہ حضرت ابوموسیٰ، حضرت عمر کے پاس گئے۔ ان کے پاس ایک مکتوب تھا جس میں عمال کا حساب لکھا ہوا تھا۔ حضرت عمر نے کہا اس کے لکھنے والے کو لاؤ تاکہ وہ اس کو پڑھ کر سنائے۔ حضرت ابوموسیٰ نے کہا وہ مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا۔ حضرت عمر نے پوچھا: کیوں؟ حضرت ابوموسیٰ نے کہا وہ نصرانی ہے، اس اثر میں یہ دلیل ہے کہ کافروں کا مسجد میں داخل نہ ہونا صحابہ کرام کے درمیان مشہور و معروف اور مقرر ہے، نیز جنابت، حیض اور نفاس کا حدث مسجد میں دخول سے مانع ہے تو شرک کا حدث بطریق اولیٰ مانع ہوگا۔

(المغنی ج۹ ص ۲۸۷-۲۸۶، دارالفکر بیروت، ۱۴۰۵ھ)

مسجد میں کافر کے دخول کے متعلق فقہاء احناف کا نظریہ

علامہ ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے، امام مالک اور امام شافعی یہ کہتے ہیں کہ مشرک مسجد حرام میں داخل نہیں ہوگا اور امام مالک یہ کہتے ہیں کہ وہ کسی اور مسجد میں بھی داخل نہیں ہو سکتا، البتہ ذمی کسی ضرورت کی بناء پر مسجد میں جا سکتا ہے، مثلاً کسی مقدمہ کی پیروی کے لیے حاکم کے پاس مسجد میں جا سکتا ہے، اور ہمارے اصحاب (فقہاء احناف) نے یہ کہا ہے کہ ذمی کے لیے تمام مساجد میں داخل ہونا جائز ہے، اور اس آیت کے دو محمل ہیں: اول یہ کہ یہ آیت غیر ذمی مشرکین کے لیے ہے جو مشرکین عرب ہیں، ان کو مکہ مکرمہ اور تمام مساجد میں دخول سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ یہ ذمی نہیں ہو سکتے ان کے لیے صرف دو راستے ہیں: اسلام یا تلوار! دوسرا محمل یہ ہے کہ اس آیت میں مشرکین کو حج کے لیے مکہ میں داخل ہونے سے منع کیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جس سال حضرت ابوبکر نے حج کیا تو اس سال حضور نے حضرت ابوبکر کے ساتھ حضرت علی کو یہ اعلان کرنے کے لیے بھیجا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا، پھر اس کے اگلے سال جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا تو کسی مشرک نے حج نہیں کیا اور اس معنی پر دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں اس کے متصل بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”تو اگر تم کو تنگ

دستی کا خوف ہو تو اگر اللہ نے چاہا تو وہ اپنے فضل سے تمہیں غنی کر دے گا"۔ اور تنگ دستی کا خوف اس وجہ سے ہو سکتا تھا کہ حج کے موسم میں بکثرت لوگ حج کے لیے آتے تھے اور اہل مکہ ان سے تجارت اور خرید و فروخت کے ذریعہ نفع اٹھاتے تھے اور جب کہ مشرکین کو حج پر آنے سے روک دیا گیا تو اہل مکہ کی تجارت میں کمی کا خطرہ پیدا ہو گیا، سو اللہ تعالیٰ نے اس کا ازالہ فرمایا کہ عنقریب اللہ تعالیٰ تم کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اس معنی کی مزید تائید اس بات سے ہے کہ تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ مشرکین کو عرفات اور مزدلفہ میں وقوف کرنے اور حج کے تمام افعال سے منع کیا جائے گا خواہ وہ افعال مسجد میں نہ کیے جاتے ہوں، اور ذمیوں کا ان جگہوں میں جانا منع نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں مشرکین کو حج کرنے سے منع کیا گیا ہے اور حج کے بغیر مسجد میں داخل ہونے سے منع نہیں کیا گیا، نیز اس آیت میں مسجد حرام کے قریب جانے کی ممانعت ہے مسجد حرام میں جانے کی ممانعت نہیں ہے اور مسجد حرام کے قریب جانا حج کے لیے جانے میں متحقق ہو سکتا ہے۔

حماد بن سلمہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عثمان بن ابی العاص سے روایت کیا ہے کہ جب ثقیف کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا تو آپ نے ان کے لیے مسجد میں خیمہ لگوایا۔ صحابہ نے کہا یا رسول اللہ! یہ تو نجس لوگ ہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں کی نجاست زمین پر نہیں لگتی ان کی نجاست ان میں ہی رہتی ہے اور زہری نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے کہ ابوسفیان زمانہ کفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں داخل ہوتا تھا البتہ ان کا مسجد حرام میں داخل ہونا جائز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "وہ (غیر ذمی مشرک) مسجد حرام کے قریب نہ ہوں"۔

علامہ ابوبکر رازی کہتے ہیں کہ ثقیف کا وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (آٹھ ہجری میں) فتح مکہ کے بعد آیا تھا اور یہ آیت نو ہجری میں نازل ہوئی ہے جب حضرت ابوبکر صدیق امیر حج بن کر گئے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا اور یہ خبر دی کہ کفار کی نجاست ان کو مسجد میں داخل ہونے سے منع نہیں کرتی اور ابوسفیان فتح مکہ سے پہلے صلح کی تجدید کے لیے آئے تھے وہ اس وقت مشرک تھے اور یہ آیت اس کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اس آیت کا تقاضا صرف مسجد حرام کے قریب جانے سے ممانعت ہے اور یہ آیت کفار کو باقی مساجد میں داخل ہونے سے منع نہیں کرتی۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ زید بن یشیع حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہ ندا کی کہ حرم میں کوئی مشرک داخل نہیں ہوگا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ان الفاظ کے ساتھ روایت صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حرم میں کوئی مشرک حج کیلئے داخل نہیں ہوگا کیونکہ حضرت علی سے احادیث میں یہ روایت ہے کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا، اسی طرح حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اس حدیث میں حج کیلئے حرم میں دخول سے ممانعت ہے اور شریک نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس سال کے بعد مشرکین مسجد حرام کے قریب نہ جائیں، البتہ کسی ضرورت کی وجہ سے غلام یا باندی مسجد حرام میں داخل ہو سکتی ہے"۔ اس حدیث میں آپ نے ضرورت کی وجہ سے غلام یا باندی کا مسجد حرام میں دخول جائز قرار دیا ہے اور حج کیلئے اجازت نہیں دی، اور یہ اس پر دلیل ہے کہ آزاد ذمی بھی ضرورت کی وجہ سے مسجد حرام میں داخل ہو سکتا ہے، کیونکہ اس مسئلہ میں کسی نے بھی آزاد اور غلام میں فرق نہیں کیا اور حدیث میں غلام اور باندی کا بالخصوص اس لیے ذکر کیا ہے کہ یہ عام طور پر حج کیلئے نہیں جاتے اور امام عبدالرزاق نے سورۂ توبہ کی اس آیت کی تفسیر میں یہ روایت ذکر کی ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ اس آیت کی تفسیر میں کہتے تھے البتہ غلام یا کوئی ذمی شخص ہو تو وہ جا سکتا ہے۔

(تفسیر عبدالرزاق، رقم الحدیث: ١٠٦٩)، (احکام القرآن ج ٣ ص ٨٩-٨٨، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ١٤٠٠ھ)

علامہ محمود آلوسی حنفی متوفی ١٢٧٠ھ لکھتے ہیں:

امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک اس آیت میں مشرکین کو حج اور عمرہ کرنے سے منع کیا گیا ہے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس ممانعت کو اس سال (یعنی نو ہجری) کے بعد سے مقید کیا ہے اور جو کام سال بہ سال کیا جاتا ہے وہ حج یا عمرہ ہے۔ اگر مشرکین کو مسجد میں مطلقاً داخل ہونے سے منع کرنا مقصود ہوتا تو اس سال کے بعد کی قید لگانے کی ضرورت نہ تھی اور دوسری دلیل یہ ہے کہ مشرکین کو اس سال کے بعد مسجد حرام کے قریب جانے سے ممانعت کے بعد اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے فرماتا ہے "اور اگر تم کو تنگ دستی کا خوف ہو تو اگر اللہ نے چاہا تو وہ عنقریب تم کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا" اور تنگ دستی کا خوف اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ مشرکین کو حج کے لیے آنے سے روک دیا جائے، کیونکہ حج کے موقع پر مشرکین کے آنے سے مسلمانوں کو تجارت میں بہت فائدہ ہوتا تھا اور ان کے نہ آنے سے اس تجارت کے منقطع ہونے کا خدشہ تھا، اس لیے امام اعظم کے نزدیک مشرکین اہل ذمہ کا مسجد حرام اور دیگر مساجد میں دخول جائز ہے۔

(روح المعانی جز ١٠ص ٧٧، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ١٢٥٢ھ لکھتے ہیں:

امام شافعی وغیرہ نے قرآن مجید کی آیت کریمہ لایقربوا المسجد الحرام "مشرکین مسجد حرام کے قریب نہ جائیں" سے استدلال کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نہی تکوینی ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان میں مسجد حرام کے قریب جانے کا فعل پیدا نہیں کرے گا، اور یہ منقول نہیں ہے کہ اس ممانعت کے بعد مشرکین میں سے کسی نے برہنہ ہو کر حج یا عمرہ کیا ہو، اور اس نہی کو تکوینی اس لیے قرار دیا ہے کہ فقہاء احناف کے نزدیک کفار احکام فرعیہ کے مکلف نہیں ہیں۔

(ردالمحتار ج ٥ ص ٣٤١۔٣٤٠، مطبوعہ استنبول، ج ٥ ص ٢٤٨، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ١٤٠٧ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان لوگوں سے قتال کرو جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ روز آخرت پر اور نہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے حرام کیے ہوئے کو حرام قرار دیتے ہیں اور نہ وہ دین حق کو قبول کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کو کتاب دی گئی (تم ان سے قتال کرتے رہو) حتیٰ کہ وہ ذلت کے ساتھ ہاتھ سے جزیہ دیں O

ربط آیات اور مناسبت

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے احکام بیان فرمائے تھے کہ نو ہجری کے بعد ان کو مسجد حرام میں حج اور عمرہ کے لیے آنے کی اجازت نہیں ہوگی اور نہ مشرکین کے لیے مساجد کو بنانا جائز ہے، اور یہ کہ مشرکین جہاں پائے جائیں ان کو قتل کرنا واجب ہے، اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ اہل کتاب کا حکم بیان فرما رہا ہے کہ اہل کتاب اگر ایمان نہ لائیں تو ان سے قتال کرو حتیٰ کہ وہ ذلت کے ساتھ جزیہ ادا کریں۔

جزیہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی

علامہ ابو عبید القاسم بن سلام ہروی متوفی ٢٢٤ھ نے لکھا ہے کہ جزیہ کا لغوی معنی ہے اکتفا۔ (غریب الحدیث ج ١ ص ٤٣، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت) اور علامہ راغب اصفہانی متوفی ٥٠٢ھ نے لکھا ہے کہ جزیہ وہ رقم ہے جو اہل ذمہ سے لی جاتی ہے اور وہ رقم ان کی جان کی حفاظت کے لیے کفایت کرتی ہے۔ (المفردات ج ١ ص ١٢١، مطبوعہ بیروت ۔۔۔) امام رازی نے واحدی سے نقل کیا ہے کہ جزیہ جزی سے بنا ہے اور اس کا معنی ہے کسی واجب کو ادا کرنا اور اصطلاح میں جزیہ اس رقم کو کہتے ہیں جو ذمی اپنی حفاظت کے لیے ادا کرتا ہے۔ (تفسیر کبیر ج ٥ ص ٢٥)

علامہ علاء الدین محمد بن علی الحصکفی الحنفی المتوفی ۱۰۸۸ھ لکھتے ہیں:
جزیہ کا لغوی معنی ہے الجزاء یعنی بدلہ اور یہ قتل کا بدل ہے، کیونکہ جب کوئی ذمی جزیہ ادا کردیتا ہے تو اس سے قتل ساقط ہو جاتا ہے اور الجزاء سزا کو بھی کہتے ہیں اور جزیہ کی رقم ذمی کے کفر کی سزا ہے۔ جزیہ کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ قسم ہے جو صلح سے لی جاتی ہے اس کی کوئی مقدار معین نہیں ہے اور نہ اس میں تغیر کیا جاتا ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران سے اس پر صلح کی کہ وہ ہر سال دو ہزار حلے ادا کیا کریں گے (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۰۴۱) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بنو تغلب کے نصاریٰ سے اس پر صلح کی کہ ان کے ہر شخص سے زکوٰۃ سے دگنی رقم لی جائے گی اور جزیہ کی دوسری قسم وہ ہے جو اہل کتاب سے جبراً ہر سال لی جاتی ہے اور اس کے عوض ان کو ان کے املاک پر برقرار رکھا جاتا ہے۔
(در مختار مع رد المحتار، ج ۶، ص ۲۳۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۹ھ، طبع جدید)

جزیہ کن سے وصول کیا جائے گا

امام شافعی، امام احمد اور امام ابوحنیفہ کا یہ مذہب ہے کہ قرآن مجید کی اس آیت کی رو سے جزیہ صرف اہل کتاب سے لیا جائے گا خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی اور سنت کی رو سے بھی جزیہ لیا جائے گا، اور امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ مرتد کے سوا ہر کافر اور مشرک سے جزیہ لیا جائے گا خواہ اس کا کفر اور شرک کسی قسم کا ہو۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۸ ص ۴۵)
علامہ علاء الدین محمد بن علی الحصکفی الحنفی المتوفی ۱۰۸۸ھ لکھتے ہیں:
جزیہ اہل کتاب پر مقرر کیا جائے گا، ان میں یہود السامرہ بھی داخل ہیں کیونکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو مانتے ہیں، اور نصاریٰ پر مقرر کیا جائے گا ان میں افرنگی اور رومی بھی داخل ہیں اور رہے الصائبہ تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک ان پر بھی جزیہ مقرر کیا جائے گا کیونکہ وہ یہودی ہیں یا عیسائی، اس لیے وہ اہل کتاب میں داخل ہیں اور امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک وہ ستارہ پرست ہیں اور اہل کتاب میں داخل نہیں ہیں اس لیے ان پر جزیہ مقرر نہیں کیا جائے گا اور مجوسی پر بھی جزیہ مقرر کیا جائے گا خواہ وہ عربی ہوں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوسیوں پر جزیہ مقرر کیا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اہل بحرین میں سے اسبذیین (بحرین کا ایک شہر) کا ایک شخص آیا اور وہ اہل ہجر (یمن کی زمین) کا ایک مجوسی تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چند دن ٹھہر کر چلا گیا۔ میں نے اس سے پوچھا اللہ اور اس کے رسول نے تمہارے متعلق کیا فیصلہ کیا۔ اس نے کہا برا فیصلہ کیا۔ میں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ اس نے کہا یا اسلام لاؤ ورنہ قتل کر دیا جائے گا، اور حضرت عبدالرحمن بن عوف نے کہا آپ نے اس سے جزیہ قبول فرمالیا تھا۔ حضرت ابن عباس نے کہا پھر مسلمانوں نے حضرت عبدالرحمن کے قول پر عمل کیا اور اس کے قول کو ترک کر دیا جو میں نے خود اس السبذی سے سنا تھا۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۰۴۴) اور حضرت عمرو بن اوس اور حضرت ابوالشعثاء بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس وقت تک مجوس سے جزیہ قبول نہیں کیا جب تک کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے یہ شہادت نہیں دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوس سے جزیہ وصول کیا تھا۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۰۴۳، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۱۵۶، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۵۸۶) اور امام ابوعبید نے زہری سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بحرین سے جزیہ وصول کیا تھا اور وہ مجوسی تھے۔ (الاموال رقم الحدیث: ۸۵) اور عجمی بت پرست پر بھی جزیہ مقرر کیا جائے گا کیونکہ اس کو غلام بنانا جائز ہے اور عربی بت پرست پر جزیہ مقرر نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ اہل زبان تھے اور قرآن مجید کا معجزہ ہونا ان کے حق میں بہت ظاہر تھا۔ اس لیے ان کا عذر مقبول نہیں ہے اور نہ مرتد سے جزیہ قبول کیا جائے گا، اس سے صرف اسلام قبول کیا جائے گا

یا اس کو قتل کر دیا جائے گا اور اگر ہم ان پر غالب آجائیں تو ان کی عورتوں اور بچوں کو باندیاں اور غلام بنالیا جائے گا کیونکہ حضرت ابوبکر نے بنو حنیفہ کے مرتدین کی عورتوں اور بچوں کو باندیاں اور غلام بنالیا تھا اور ان کو مجاہدوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

(در مختار مع ردالمحتار ج ۶ ص ۲۴۲-۲۴۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۹ھ، طبع جدید)

عجمی بت پرست پر جزیہ مقرر کرنے کی دلیل یہ حدیث ہے:

حسن بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ یمن کی طرف یہ خط لکھا جو شخص ہماری نماز پڑھے، ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے پس وہ مسلمان ہے اور وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ میں ہے اور جو انکار کرے اس پر جزیہ ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۳۲۶۲۴، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۶ھ)

جزیہ کی مقدار میں مذاہب فقہاء

جزیہ کی مقدار میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ آزاد اور بالغ پر ہر سال ایک دینار مقرر کیا جائے گا خواہ وہ غنی ہو یا فقیر، ان کی دلیل یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تو ان کو حکم دیا کہ وہ ہر بالغ سے ایک دینار یا اس کے مساوی کپڑا وصول کریں۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۰۳۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۶۲۳، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۴۵۱، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸۰۳) امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ سونا رکھنے والوں سے ہر سال چار دینار وصول کیے جائیں گے، اور چاندی رکھنے والوں سے ہر سال چالیس درہم وصول کیے جائیں گے، اس میں کوئی زیادتی اور کمی نہیں ہوگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح منقول ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۸ ص ۷۴) امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ امیر آدمی سے اڑتالیس درہم سالانہ لیے جائیں گے، متوسط سے چوبیس اور فقیر سے بارہ درہم، اور اثرم نے امام احمد سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ان کی مالی حیثیت کے لحاظ سے اس میں کمی زیادتی بھی ہو سکتی ہے اور یہ امام وقت کے اجتہاد پر موقوف ہے۔ (زادالمسیر ج ۳ ص ۴۲۲)

علامہ علاء الدین محمد بن علی بن محمد الحصکفی المتوفی ۱۰۸۸ھ لکھتے ہیں:

فقیر سے بارہ درہم سالانہ لیے جائیں گے، متوسط سے چوبیس درہم سالانہ اور امیر سے اڑتالیس درہم سالانہ لیے جائیں گے اور جو شخص دس ہزار درہم یا اس سے زیادہ کا مالک ہو وہ غنی ہے اور جو شخص دو سو یا اس سے زیادہ درہم کا مالک ہو وہ متوسط ہے اور جو شخص دو سو درہم سے کم کا مالک ہو یا کسی چیز کا مالک نہ ہو وہ فقیر ہے۔

(در مختار مع ردالمحتار ج ۶ ص ۲۴۰-۲۳۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۹ھ طبع جدید)

فقہاء احناف کی دلیل یہ حدیث ہے:

محمد بن عبید اللہ الثقفی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے مردوں پر جزیہ مقرر کیا، غنی پر اڑتالیس درہم، متوسط پر چوبیس درہم اور فقیر پر بارہ درہم۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۳۲۶۳۳، الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۲۱۴، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ)

اس زمانہ میں درہم کی مالیت کا یہ حساب ہے: ایک درہم = ۶۲۵ء۰ (صفر اعشاریہ چھ دو پانچ تولہ چاندی)، دس درہم = ۶۲۵ء۲ (۲ اعشاریہ چھ دو پانچ تولہ چاندی)، بارہ درہم = ۱۵ء۳ (تین اعشاریہ ایک پانچ تولہ چاندی)، دو سو درہم = ۵ء۵۲ (باون اعشاریہ پانچ تولہ چاندی)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: حتیٰ کہ وہ ذلت کے ساتھ ہاتھ سے جزیہ دیں۔ ہاتھ سے مراد احسان ہے، یعنی ان پر مسلمانوں کا احسان

ہے کہ وہ ان کو قتل کرنے کے بدلہ ان سے صرف جزیہ لے رہے ہیں اور ذلت کے ساتھ کا معنی یہ ہے کہ وہ اس طرح جزیہ کی رقم نہ دیں جیسے کوئی افسر اپنے ماتحت کو انعام دیتا ہے کیونکہ اس میں دینے والے کی بڑائی ہے بلکہ وہ اس طرح جزیہ کی رقم دیں جس طرح مجرم حاکم کو جرمانہ ادا کرتا ہے اور اس میں اس پر حاکم کا احسان ہے کہ وہ جرمانہ وصول کر کے اس کی سزا معاف کر رہا ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى

اور یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا کہ

الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ

مسیح اللہ کا بیٹا ہے، یہ محض ان کے منہ سے کہی ہوئی (بے سروپا) باتیں ہیں،

يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ

یہ اپنے سے پہلے کافروں کی کہی ہوئی باتوں کی مشابہت کرتے ہیں، ان پر اللہ کی پھٹکار

اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ

یہ کہاں اوندھے جا رہے ہیں ○ انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور

اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ

پیروں کو خدا بنا لیا ہے اور مسیح ابن مریم کو (بھی)

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ

حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ یہ صرف ایک خدا کی عبادت کریں، اس کے سوا کوئی عبادت کا

سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ

مستحق نہیں ہے وہ ان کے خود ساختہ شرکاء سے پاک ہے ○ وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو

اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ

اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں ہے خواہ کافروں کو

الْكٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ

ناگوار ہو ○ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ

الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

بھیجا تاکہ اس کو ہر دین پر غالب کردے خواہ مشرکین کو ناگوار ہو ○

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ

اے ایمان والو! بے شک (اہل کتاب کے) بہت سے علماء اور پیر

لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ

لوگوں کا ناحق مال کھاتے ہیں اور (لوگوں کو) اللہ کے

سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَ

راستے سے روکتے ہیں، اور جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور

لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾ ۙ

اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو آپ ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سُنا دیجئے ○

يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ

جس دن وہ (سونا اور چاندی) دوزخ کی آگ میں پتایا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیوں کو

وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ

اور ان کے پہلوؤں کو اور ان کی پیٹھوں کو داغا جائے گا، یہ ہے وہ (سونا اور چاندی) جس کو تم نے

فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾

اپنے لیے جمع کرکے رکھا تھا سو اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے، یہ محض ان کے منہ سے کہی ہوئی (بے سروپا) باتیں ہیں، یہ اپنے سے پہلے کافروں کی کہی ہوئی باتوں کی مشابہت کرتے ہیں، ان پر اللہ کی پھٹکار یہ کہاں اوندھے جا رہے ہیں ○ (التوبہ: ۳۰)

حضرت عزیر کا نام و نسب، ان کا تعارف اور ان کو ابن اللہ کہنے کا سبب

حافظ ابو القاسم علی بن الحسن المعروف بابن العساکر المتوفی ۵۷۱ھ لکھتے ہیں:

حضرت عزیر کا نام و نسب یہ ہے: عزیر بن جروہ (ایک قول ابن شویرق ہے) بن عریاء بن ایوب بن درتا بن عزی بن بقی

بن الیشوع بن فنحاس بن الغازر بن ہارون بن عمران- اور ان کو عزیر بن سروخا بھی کہا جاتا ہے- کہا گیا ہے کہ دمشق میں ان کی قبر ہے-

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ حضرت عزیر انبیاء کی اولاد میں سے ہیں- انہوں نے تورات کو محکم کیا تھا' اور ان کے زمانہ میں تورات کا ان سے بڑا عالم کوئی نہیں تھا- ان کا انبیاء کے ساتھ ذکر کیا جاتا تھا- جب انہوں نے اللہ سے تقدیر کے متعلق سوال کیا تو اللہ نے ان کا نام مٹا دیا- جب یہ نو عمر لڑکے تھے تو ان کو بخت نصر نے قید کر لیا تھا اور جب یہ چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت عطا فرمائی- (یہ ضعیف روایت ہے' ابن کثیر) نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں (از خود) نہیں جانتا کہ عزیر نبی تھے یا نہیں-

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۴۶۷۴' البدایہ والنہایہ ج ا ص ۴۹۵' طبع جدید)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا عزیر بن سروخا ہی وہ شخص ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ- الایہ- (البقرہ: ۲۵۹)

یا اس شخص کی طرح جو ایک بستی پر گزرا در آنحالیکہ وہ بستی اپنی چھتوں پر گری ہوئی تھی' اس نے (تعجب سے) کہا' اللہ اس بستی والوں کو مرنے کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟ تو اللہ نے سو برس تک اس پر موت طاری کر دی' پھر اس کو زندہ کر کے اٹھایا-

ہم نے تبیان القرآن جلد اول میں اس بستی کا بیان کیا ہے اور حضرت عزیر کے زندہ ہونے کی کیفیت بھی بیان کر دی ہے- اس کی تفصیل وہاں ملاحظہ کریں-

حضرت عزیر سو سال کے بعد جب زندہ ہوئے تو اپنے محلہ میں گئے- لوگ ان کے شناسا نہ تھے اور نہ یہ لوگوں کے شناسا تھے' اور اپنا مکان بھی انکل پچو سے تلاش کیا' وہاں ایک سو بیس سال کی عمر کی ایک بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی جو فالج زدہ تھی' وہ دراصل حضرت عزیر کی باندی تھی- حضرت عزیر نے اس سے پوچھا اے خاتون! کیا یہی عزیر کا گھر ہے؟ اس نے کہا ہاں یہ عزیر کا گھر ہے- نیز اس نے کہا میں نے اتنے سالوں سے کسی کو عزیر کا ذکر کرتے نہیں سنا' لوگ اس کو بھول چکے ہیں- انہوں نے کہا میں عزیر ہوں- اس نے کہا سبحان اللہ! عزیر کو تو ہم ایک سو سال سے گم کر چکے ہیں اور ہم نے کسی سے ان کا ذکر نہیں سنا-

انہوں نے کہا میں عزیر ہوں' اللہ نے مجھ پر ایک سو سال تک موت طاری کر دی تھی پھر زندہ کر دیا- اس عورت نے کہا عزیر مستجاب الدعوات تھے ان کی دعا سے بیمار تندرست ہو جاتا تھا اور مصیبت زدہ کی مصیبت دور ہو جاتی تھی- آپ اللہ سے دعا کیجئے کہ اللہ میری بینائی لوٹا دے تاکہ میں آپ کو دیکھ لوں' اور اگر آپ واقعی عزیر ہیں تو میں آپ کو پہچان لوں گی- حضرت عزیر نے دعا کی اور اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا- وہ تندرست ہو گئی- پھر حضرت عزیر نے اس فالج زدہ سے کہا تم اللہ کے حکم سے کھڑی ہو جاؤ- سو وہ بالکل تندرست ہو کر کھڑی ہو گئی- اس نے آپ کو دیکھ کر کہا میں گواہی دیتی ہوں کہ آپ عزیر ہیں-

جب یہودیوں کو حضرت عزیر کا پتا چلا تو انہوں نے کہا ہم میں عزیر کے سوا کوئی تورات کا حافظ نہیں تھا' اور بخت نصر نے تورات کو جلا دیا تھا' اور اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں ہے سوا چند سورتوں کے جو لوگوں کو حفظ ہیں- آپ ہمیں مکمل تورات لکھوا دیں- حضرت عزیر کے والد سروخا نے بخت نصر کے ایام میں ایک جگہ تورات کو دفن کر دیا تھا جس کا حضرت عزیر کے سوا کسی کو علم نہیں تھا' حضرت عزیر اس جگہ لوگوں کو لے گئے اور تورات کو کھود نکالا' اس کے اوراق گل گئے تھے اور لکھائی مٹ چکی تھی- وہ ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے اور بنو اسرائیل ان کے گرد بیٹھ گئے- آسمان سے دو ستارے نازل ہوئے اور ان کے

پیٹ میں گھس گئے اور ان کو تورات یاد آگئی اور انہوں نے بنو اسرائیل کے لیے از سرنو تورات لکھوا دی۔ جب بنو اسرائیل نے حضرت عزیر سے یہ غیر معمولی امور دیکھے تو وہ کہنے لگے کہ عزیر اللہ عزوجل کے بیٹے ہیں۔
(مختصر تاریخ دمشق ج ۱۷، ص ۳۹۔ ۳۵، ملخصًا دارالفکر بیروت، البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۴۹۷، طبع جدید دارالفکر بیروت)

آیا حضرت عزیر نبی ہیں یا نہیں

حافظ عمر بن اسماعیل بن کثیر الدمشقی متوفی ۷۷۴ھ لکھتے ہیں:
عطا بن رباح، حسن بصری اور عثمان بن عطاء الخراسانی کا نظریہ یہ ہے کہ حضرت عزیر نبی نہیں تھے، کیونکہ عطا بن ابی رباح نے کہا کہ زمانہ فترت (انقطاع نبوت کا زمانہ) میں نو چیزیں تھیں: ان میں سے ایک بخت نصر کو بیان کیا اور اسحاق بن بشر نے اپنی سند کے ساتھ حسن بصری سے روایت کیا کہ عزیر اور بخت نصر کا واقعہ زمانہ فترت میں ہوا اور حدیث صحیح میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں عیسیٰ بن مریم کے تمام لوگوں سے زیادہ قریب ہوں ان کے اور میرے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۴۴۲، سنن ابو داؤد رقم الحدیث ۴۶۷۵، مسند احمد ج ۳ رقم الحدیث: ۱۰۹۸۱، طبع جدید) اور وہب بن منبہ نے کہا کہ حضرت عزیر حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰ کے درمیان تھے، اور حافظ ابن عساکر نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ حضرت عزیر حضرت موسیٰ بن عمران کے زمانہ میں تھے۔ (مختصر تاریخ دمشق ج ۱۷ ص ۴۹)
البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۴۹۸، طبع جدید دارالفکر بیروت، ۱۴۱۹ھ)
بہر حال روایات مختلف ہیں اور حضرت عزیر کا نبی ہونا حتمی اور یقینی نہیں ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کے تمام اہم پہلو اور ان کے ابن اللہ ہونے کی بحث ہم نے آل عمران: ۵۸۔۴۵ میں بیان کر دی ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔
نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہ اپنے سے پہلے کافروں کی کہی ہوئی باتوں کی مشابہت کرتے ہیں۔ اس مشابہت میں تین اقوال ہیں: (۱) بت پرست کہتے تھے کہ لات، منات اور عزیٰ خدا کے شریک ہیں۔ (۲) بعض کافر کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ (۳) یہ اس قول میں اپنے باپ دادا کی اندھی تقلید کرتے تھے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور پیروں کو خدا بنا لیا ہے اور مسیح ابن مریم کو (بھی) حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ یہ صرف ایک خدا کی عبادت کریں، اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے وہ ان کے خود ساختہ شرکاء سے پاک ہے O (التوبہ: ۳۱)
اس سے پہلی آیت میں یہودیوں کی یہ بدعقیدگی بیان فرمائی تھی کہ انہوں نے عزیر کو ابن اللہ کہا اور اس آیت میں ان کی یہ بداعمالی بیان فرمائی ہے کہ انہوں نے اپنے احبار اور رہبان کو خدا بنا رکھا تھا۔

احبار اور رہبان کا معنی

امام ابو عبید متوفی ۲۲۴ھ نے لکھا ہے کہ احبار، حبر کی جمع ہے۔ حبر عالم کو کہتے ہیں، کعب کو حبر کہا جاتا تھا۔
(غریب الحدیث ج ۱ ص ۶۰)
علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ نے لکھا ہے حبر کا معنی ہے: نیک اثر اور اچھی نشانی۔ جب علماء لوگوں کے دلوں میں اپنے علوم سے اچھے تاثرات اور اپنے افعال کے نیک آثار چھوڑتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی نیکیوں کی اقتداء کی جاتی ہے تو ان کو احبار کہتے ہیں، اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: علماء تو قیامت تک باقی رہیں گے اور احبار گم ہو گئے اور ان

کے آثار دلوں میں موجود ہیں۔ (المفردات ج ا ص ١٣٨)

نیز علامہ راغب نے لکھا ہے کہ رہب کا معنی ہے گھبراہٹ کے ساتھ ڈر اور خوف' اور راہب کا معنی ہے اللہ سے ڈرنے والا اور رہبان راہب کی جمع ہے۔ (المفردات ج ا ص ٢٦٩) امام فخرالدین رازی المتوفی ٦٠٦ ھ نے لکھا ہے کہ حبر اس عالم کو کہتے ہیں جو عمدہ بیان کرتا ہو اور راہب اس شخص کو کہتے ہیں جس کے دل میں خوف خدا جاگزیں ہو اور اس کے چہرے اور لباس سے خوف خدا ظاہر ہوتا ہو' اور عرف میں احبار کا لفظ علماء یہود کے ساتھ خاص ہے اور رہبان کا لفظ ان علماء نصاریٰ کے ساتھ خاص ہے جو گرجوں میں رہتے ہیں۔ (تفسیر کبیر ج ٦ ص ٣١-٣٠)

قرآن اور حدیث کے مقابلہ میں اپنے دینی پیشواؤں کو ترجیح دینے کی مذمت

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ کیا یہودیوں نے اپنے احبار (علماء) کی اور عیسائیوں نے اپنے رہبان (گرجا میں رہنے والے علماء) کی عبادت کی تھی؟ اور اس آیت کی کیا توجیہ ہے؟ انہوں نے کہا: انہوں نے اپنے علماء کی عبادت نہیں کی لیکن جب وہ ان کے لیے حرام کو حلال کر دیتے تو وہ اس کو حلال کہتے اور جب وہ ان کے لیے حلال کو حرام کر دیتے تو وہ اس کو حرام کہتے تھے اور یہی ان کا اپنے اپنے علماء کو خدا بنانا تھا۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ٨ ص ٥٤' مطبوعہ بیروت)

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا' اس وقت میری گردن میں سونے کی صلیب تھی۔ آپ نے فرمایا: اے عدی! اس بت کو اتار کر پھینک دو' میں نے آپ سے اس آیت کے متعلق پوچھا: اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم۔ (التوبہ: ٣١) آپ نے فرمایا: وہ اپنے علماء کی عبادت نہیں کرتے تھے لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کر دیتے تو وہ اس کو حلال کہتے اور جب وہ کسی چیز کو حرام کر دیتے تو وہ اس کو حرام کہتے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ٣٠٩٥' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ١٤١٤ھ)

قرآن مجید کی اس آیت اور اس حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مقابلہ میں اپنے کسی دینی پیشوا کے قول کو ترجیح دینا اور اس پر اصرار کرنا اس دینی پیشوا کو خدا بنا لینا ہے' اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح حدیث کے مقابلہ میں اپنے کسی دینی پیشوا کے قول کو ترجیح دینا اس کو رسول کا درجہ دینا ہے' اسی گمراہی کا قلع قمع کرنے کے لیے امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ جب میرے قول کے خلاف کوئی حدیث صحیح مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے اور امام شافعی نے فرمایا اگر میرا قول کسی حدیث کے خلاف ہو تو میرے قول کو دیوار پر مار دو اور حدیث پر عمل کرو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے متقدمین فقہاء پر رحمتیں نازل فرمائے' انہوں نے کتنے ہی مسائل میں ائمہ کے اقوال کے خلاف احادیث پر عمل کیا ہے اور اس گمراہی کی جڑ کاٹ دی ہے' لیکن اس زمانہ میں ہم نے دیکھا کہ اگر کسی شخص کے دینی پیشوا کے کسی قول کے خلاف قرآن اور حدیث کتنا ہی کیوں نہ پیش کیا جائے وہ اپنے دینی پیشوا کے قول کے ساتھ چمٹا رہتا ہے اور کہتا ہے کیا یہ قرآن کی آیت اور یہ حدیث ان کو معلوم نہیں تھی اور وہ قرآن اور حدیث کو تم سے بہت زیادہ جاننے والے تھے!

امام عبدالبر مالکی متوفی ٤٦٣ھ نے متعدد اسانید کے ساتھ عتیبہ اور مجاہد سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہر شخص کا قول قبول بھی کیا جاتا ہے اور ترک بھی کیا جاتا ہے۔

(جامع بیان العلم وفضلہ ج ٢ ص ٩٢٧-٩٢٥' دار ابن الجوزیہ جدہ)

نبی کے سوا کسی بشر کا قول خطاء سے معصوم نہیں

مروان بن الحکم بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے پاس تھا' حضرت عثمان حج تمتع سے

منع کر رہے تھے، حضرت علی نے یہ دیکھ کر حج تمتع کا احرام باندھا اور فرمایا میں کسی شخص کے قول کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ترک نہیں کروں گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۵۶۳، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۲۲۳، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۷۳۳، سنن دارمی رقم الحدیث: ۱۹۲۳)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں حج تمتع کیا اور قرآن نازل ہوا اور ایک شخص نے اپنی رائے سے جو چاہا کہا۔ امام مسلم کی روایت میں ہے ان کی مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۵۷۱، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۲۲۶، سنن نسائی رقم الحدیث: ۲۷۳۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۹۷۸، سنن دارمی رقم الحدیث: ۱۸۱۳)

سالم بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حج تمتع کے متعلق سوال کیا، انہوں نے کہا جائز ہے۔ اس نے کہا آپ کے باپ تو حج تمتع سے منع کرتے تھے؟ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ بتاؤ کہ میرا باپ ایک کام سے منع کرتا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کو کیا ہو تو آیا میرے باپ کے حکم پر عمل کیا جائے گا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل کیا جائے گا؟ اس شخص نے کہا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل کیا جائے گا۔ حضرت ابن عمر نے کہا: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج تمتع کیا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۸۲۵، دارالفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوت ہوگئے تو میں نے حضرت عائشہ سے ذکر کیا کہ حضرت عمر کہتے تھے کہ میت کے گھر والوں کے رونے سے میت کو قبر میں عذاب ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت عمر پر رحم فرمائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ میت کے گھر والوں کے رونے سے اللہ اس میت کو عذاب دیتا ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ کافر پر اس کے گھر والوں کے رونے سے اللہ اس کے عذاب میں زیادتی کرتا ہے، اور تمہارے لیے قرآن مجید کی یہ آیت کافی ہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔ (الانعام: ۱۶۴) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۲۸۸-۱۲۸۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۹۲۹-۹۲۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۰۰۲، سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۸۵۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۵۹۴)

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک قوم کو جلوا دیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تک یہ خبر پہنچی تو انہوں نے کہا اگر میں ہوتا تو ان کو نہ جلاتا، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اللہ کے عذاب سے سزا نہ دو، البتہ میں ان کو قتل کر دیتا، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو شخص اپنا دین بدلے اس کو قتل کر دو۔ ترمذی کی روایت میں ہے حضرت علی کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے کہا: ابن عباس نے سچ کہا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۹۲۲، ۳۰۱۶، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۴۶۳، سنن النسائی رقم الحدیث: ۴۰۷۱، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۵۳۵، مسند احمد ج ۱ رقم الحدیث: ۱۸۷۱، المستدرک ج ۳ ص ۵۳۸، سنن بیہقی ج ۸ ص ۱۵۹، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۲۵۳۲)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک زانیہ حاملہ کو رجم کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا جو بچہ اس کے

پیٹ میں ہے اس کو ہلاک کرنے کا آپ کے پاس کیا جواز ہے؟ تو حضرت عمر نے فرمایا: اگر معاذ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا!

(جامع بیان العلم و فضلہ ج ٢ ص ٩٢٠، رقم: ١٧٤٥-١٧٤٢، مطبوعہ دار ابن الجوزیہ ریاض، ١٤١٩ھ)

ایک عورت کے نکاح کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہو گیا۔ حضرت عمر کے پاس یہ مقدمہ پیش ہوا تو حضرت عمر نے اس عورت کو رجم (سنگسار) کرنے کا حکم دیا تو حضرت علی نے فرمایا: اس کو رجم کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے۔ قرآن مجید میں ہے: عورتیں پورے دو سال تک بچوں کو دودھ پلائیں۔ (البقرہ: ٢٣٣) اور فرمایا: حمل کی مدت اور دودھ چھڑانے کی (مجموعی) مدت تیس ماہ ہے۔ (الاحقاف: ١٥) تو حضرت عمر نے حضرت علی کے قول کی طرف رجوع کر لیا۔

(جامع بیان العلم و فضلہ ج ٢ ص ٩٢٠، رقم: ١٧٤٦، مطبوعہ ریاض)

عبداللہ بن مصعب بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: عورتوں کا مہر چالیس اوقیہ (دس چھٹانک چاندی) سے زیادہ نہ باندھو، اور جس نے اس سے زیادہ مہر باندھا میں وہ زیادہ مقدار بیت المال میں داخل کر دوں گا، تب ایک چپٹی ناک والی دراز قد عورت پچھلی صف میں کھڑی ہوئی اور اس نے کہا: آپ کے لیے یہ حکم دینا جائز نہیں ہے۔ حضرت عمر نے پوچھا: کیوں؟ اس نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا۔ (النساء: ٢٠)

اور تم ان میں سے کسی بیوی کو ڈھیروں مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔

حضرت عمر نے فرمایا: عورت نے صحیح کہا اور مرد نے خطا کی۔

(مصنف عبدالرزاق ص ١٨٠، سنن کبریٰ للبیہقی، ج ٧، ص ٢٣٣، سنن سعید بن منصور رقم الحدیث: ٥٩٨-٥٩٧ جامع بیان العلم و فضلہ ج ١ ص ٥٣٠، رقم: ٨٦٤، تفسیر ابن کثیر ج ١ ص ٥٢٨، دار الفکر، ١٤١٨ھ، الدر المنثور ج ٢ ص ٤٦٦، دار الفکر، ١٤١٤ھ)

غور کیجیے جب اکابر صحابہ کے اقوال خطاء سے معصوم نہیں ہیں تو بعد کے ائمہ، فقہاء اور علماء کے اقوال کی خطاء سے معصوم ہونے کی کیا ضمانت ہے؟ اس لیے کسی امام، عالم اور فقیہ کے متعلق یہ عقیدہ نہیں رکھنا چاہیے کہ اس کے قول میں خطاء نہیں ہو سکتی اور ایسا عقیدہ رکھنا شرک فی الرسالت کے مترادف ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ١٣٤٠ھ لکھتے ہیں:

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والثناء کے سوا کوئی بشر معصوم نہیں اور غیر معصوم سے کوئی نہ کوئی کلمہ غلط یا بے جا صادر ہونا کچھ نادر کالمعدوم نہیں، پھر سلف صالحین و ائمہ دین سے آج تک اہل حق کا یہ معمول رہا ہے کہ ہر شخص کا قول مقبول بھی ہوتا ہے اور مردود بھی ماسوا اس قبر والے کے صلی اللہ علیہ وسلم۔ (فتاویٰ رضویہ ج ٦ ص ٢٨٣، مطبوعہ مکتبہ رضویہ کراچی)

اعلیٰ حضرت سے سوال کیا گیا کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی متوفی ١٢٣٩ھ نے لکھا ہے کہ پیر کے نام کا بکرا حرام ہے خواہ بوقت ذبح تکبیر کہی جائے، اس کے جواب میں اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

اس مسئلہ میں حق یہ ہے کہ نیت ذابح کا اعتبار ہے، اگر اس نے اراقت دم تقربا الی اللہ کی (اللہ کے لیے جانور کا خون بہایا) اور وقت ذبح نام الٰہی لیا، جانور بنص قطعی قرآن عظیم حلال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ (الانعام: ١١٩)

تمہیں کیا ہوا کہ تم اس کو نہیں کھاتے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے۔

تفصیل فقیر کے رسالہ سبل الاصفیاء میں ہے، شاہ صاحب سے اس مسئلہ میں غلطی ہوئی اور وہ نہ فقط فتاویٰ بلکہ تفسیر

عزیزی میں بھی ہے اور نہ ایک ان کا فتاویٰ بلکہ کسی بشر غیر معصوم کی کوئی کتاب ایسی نہیں، جس میں سے کچھ متروک نہ ہو۔ سیدنا امام مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہر شخص کا قول مقبول بھی ہے اور مردود بھی سوا اس قبر والے کے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ (فتاویٰ رضویہ ج ٨ ص ٣٥٦، مطبوعہ مکتبہ رضویہ کراچی)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھادیں اور اللہ اپنے نور کو مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں ہے خواہ کافروں کو ناگوار ہو ○ (التوبہ: ٣٢)

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے صدق پر دلائل

اس آیت میں یہودیوں کی ایک اور اسلام دشمنی بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دلائل کو جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں اور آپ کی نبوت کے دلائل کی اہم پانچ قسمیں ہیں:

(١) حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کی نبوت ان کے معجزات سے ثابت ہوئی۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کے اثبات کے لیے بے شمار معجزات پیش کیے۔

(٢) نبی صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے اور آپ نے قرآن مجید کو پیش کیا جس کی فصاحت اور بلاغت کی نظیر آج تک کوئی نہیں لاسکا۔ اس کی دی ہوئی پیشین گوئیاں درست ثابت ہوئیں اور اس کے اس دعویٰ کو بھی کوئی رد نہیں کر سکا کہ اس میں کمی اور زیادتی نہیں ہو سکتی۔

(٣) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیم اور شریعت کا حاصل یہ ہے کہ صرف اللہ عزوجل کی عبادت کی جائے، آپ سے جو بھی علمی اور عملی کمالات ظاہر ہوئے آپ نے فرمایا: یہ سب اللہ کا دیا ہوا ہے، آپ نے علم اور عمل کے ہر کمال کی اپنی ذات سے نفی کر دی، آپ نے اپنے نیک اعمال کو کبھی موجب نجات قرار نہیں دیا بلکہ یہی فرمایا کہ میری نجات بھی صرف اللہ کے فضل سے ہوگی۔ آپ کی پوری سیرت کو دیکھ لیں آپ اپنی نبوت اور رسالت سے اپنے لیے کوئی کبریائی، کوئی بڑائی نہیں چاہتے تھے بلکہ یہی فرماتے تھے کہ ساری کبریائی اور عظمت و جلالت صرف اللہ کے لیے ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا دعویٰ نبوت سچا ہے جبکہ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ چاہتا ہے لوگوں میں اس کے کمالات کا چرچا ہو اور لوگ کہیں کہ یہ اس کے کمالات ہیں خواہ ان کمالات کا ذریعہ کوئی اور ہو!

(٤) آپ نے بہت سے شہر فتح کیے لیکن اپنے لیے دنیا جمع نہیں کی، آپ کے کھانے، پینے، لباس اور گھر کے ساز و سامان میں کوئی آسودگی، عیش اور تنعم نہیں تھا۔ ڈھیروں مال غنیمت آتا لیکن آپ اس کو تقسیم کیے بغیر مسجد سے نہیں اٹھتے تھے، اس سے بھی معلوم ہوا کہ آپ سچے نبی تھے اور اس دعویٰ نبوت سے آپ کا مقصود اپنی ذات کی منفعت نہیں تھی۔

(٥) آپ نے لوگوں کو جس قدر عبادت کا حکم دیا، خود اس سے زیادہ عبادت کی، لوگوں کو پانچ نمازوں کا حکم دیا خود تہجد سمیت چھ نمازیں پڑھتے تھے، لوگوں کو چالیسواں حصہ زکوٰۃ کا حکم دیا، خود پاس کچھ نہیں رکھتے تھے، لوگوں سے کہا تمہارا ترکہ وراثت ہے اور میرا ترکہ صدقہ ہے، لوگوں کو طلوع فجر سے غروب آفتاب تک روزہ کا حکم دیا اور خود وصال کے روزے رکھے جس میں سحری ہوتی ہے نہ افطار، کوئی مہینہ روزوں سے خالی نہیں ہوتا تھا اور راتوں کو اتنا طویل قیام کرتے تھے کہ پاؤں مبارک سوج جاتے تھے، لوگوں کو چار بیویوں میں عدل کرنے کا حکم دیا اور خود بیک وقت نو ازواج میں عدل کر کے دکھایا، آپ کا عبادت اور ریاضت میں اس قدر کوشاں ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کا دعویٰ نبوت اپنے عیش و آرام، اپنی آسودگی اور اپنی بڑائی کے لیے نہیں تھا۔ آپ سچے نبی ہیں اور آپ کا پیغام سچا ہے اور جس طرح کوئی شخص سورج کے نور کو بجھانے کے لیے پھونکیں مارتا

رہے تو سورج کا نور کم نہیں ہوگا، اسی طرح یہودی اور دیگر مخالفین اسلام کی اسلام دشمن کوششوں سے اسلام کی اشاعت اور فروغ میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو ہر دین پر غالب کردے خواہ مشرکین کو ناگوار ہو○ (التوبہ: ۳۳)

تمام ادیان پر دین اسلام کا غلبہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور بعثت کا ذکر فرمایا، رسالت دلائل اور معجزات سے ثابت ہوتی ہے اور آپ کے دلائل اور معجزات سب رسولوں سے زیادہ تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ سب سے عظیم اور کامل رسول ہیں۔

نیز فرمایا آپ کو دین حق کے ساتھ بھیجا یعنی آپ کا دین اور آپ کی شریعت متوازن اور معتدل ہے، فطرت سلیمہ کے مطابق ہے، آپ کا کوئی حکم خلاف عقل نہیں ہے اور آپ کی تعلیم میں دین اور دنیا کی بے شمار حکمتیں ہیں۔ واضح ہوا کہ آپ کی شریعت ہی کامل ہے۔

پھر فرمایا تاکہ آپ کا دین ہر دین پر غالب ہو جائے اور غلبہ سے مراد دلائل اور حجت کے اعتبار سے غلبہ ہے تو تمام ادیان کے مقابلہ میں اسلام کے دلائل غالب ہیں اور اسلام کے آنے سے ہر دین پر عمل منسوخ ہوگیا ہے اور اگر سے مراد مادی غلبہ ہو تو یہ پیش گوئی اس وقت پوری ہوگی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور امام مہدی کا ظہور ہوگا۔

امام سعید بن منصور، امام ابن المنذر اور امام بیہقی نے اپنی سنن میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نازل ہوں گے تو ہر یہودی اور ہر عیسائی مسلمان ہو جائے گا حتیٰ کہ بکریاں بھیڑیوں سے مامون ہو جائیں گی اور گائے شیروں سے اور انسان سانپوں سے اور حتیٰ کہ چوہا جراب کو نہیں کترے گا اور جزیہ موقوف ہو جائے گا اور صلیب توڑ دی جائے گی اور خنزیر قتل کر دیئے جائیں گے۔

(الدر المنثور ج ۴ ص ۱۷۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! بے شک (اہل کتاب کے) بہت سے علماء اور پیر لوگوں کا ناحق مال کھاتے ہیں اور (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، اور جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو آپ ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے○ (التوبہ: ۳۴)

یہودی اور عیسائی علماء کے مال کھانے کے ناجائز طریقے

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں اور عیسائیوں کے عالموں کی مذموم صفات بیان فرمائی تھیں کہ وہ اپنے آپ کو عام لوگوں سے بلند اور برتر سمجھتے ہیں اور تکبر کی وجہ سے اسلام قبول نہیں کرتے، اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ اس تکبر کے باوجود وہ لوگوں سے مال لینے میں بہت حریص ہیں اور لوگوں سے ناجائز طور پر مال حاصل کرنے کے لیے ان کے کئی طریقے ہیں:

(۱) وہ رشوت لے کر شرعی احکام میں تخفیف کر دیتے تھے، اگر تورات میں رجم یا کوڑوں کی سزا ہو تو وہ صرف جرمانہ عائد کر کے چھوڑ دیتے تھے۔

(۲) انہوں نے عام لوگوں کے ذہنوں میں یہ بٹھا دیا تھا کہ انہیں آخرت میں نجات اسی وقت حاصل ہوگی، جب وہ ان کی

خدمت اور اطاعت کریں گے۔

(۳) تورات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ ان کی ایسی باطل تاویل کرتے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر منطبق نہ ہوتی، وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے عوام ان سے کٹ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطیع ہو جائیں اور ان کے نذرانے شکرانے بند ہو جائیں۔

(۴) انہوں نے لوگوں کو یہ باور کرا دیا تھا کہ صحیح دین یہودیت یا عیسائیت ہے اور اس دین کی تقویت اسی وقت ہو گی جب اس دین کے حاملین کی مالی خدمت کی جائے، سو وہ ان باطل طریقوں سے اپنے عوام کا ناجائز طریقہ سے مال کھاتے تھے، ہرچند کہ وہ اس ناجائز مال کو کھانے کے علاوہ دیگر مصارف میں بھی خرچ کرتے تھے لیکن عرف میں کسی سے ناجائز مال لینے کو مال کھانے سے تعبیر کیا جاتا ہے اس لیے فرمایا وہ لوگوں کا ناحق مال کھاتے ہیں، اور مفسرین نے اس کی یہ توجیہ بھی کی ہے کہ کسی کا مال لینے سے بڑا مقصود اس مال کو کھانے اور پینے پر صرف کرنا ہوتا ہے، اس لیے فرمایا وہ لوگوں کا ناحق مال کھاتے ہیں۔

لوگوں کا اس دنیا میں بڑا مقصود مال اور عزت اور سرداری کا حصول ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ ناجائز طریقوں سے لوگوں کا مال حاصل کرتے تھے اور عزت اور سرداری کے حصول کے لیے لوگوں کو اسلام اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے روکتے تھے کیونکہ اگر ان کے عوام مسلمان ہو جاتے تو پھر لوگ ان کی تعظیم اور تکریم چھوڑ دیتے۔

کنز کا معنی

علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ کنز کا معنی ہے مال کو اوپر تلے رکھنا، مال جمع کر کے اس کی حفاظت کرنا، خزانہ کو کنز کہتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مال جمع کرنے اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کی مذمت فرمائی ہے۔

(المفردات ج ۲ ص ۷۰)

زکوٰۃ نہ دے کر مال جمع کرنے والوں کی قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے مذمت

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (آل عمران: ۱۸۰)

جو لوگ ان چیزوں (کو خرچ کرنے) میں بخل کرتے ہیں جو ان کو اللہ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی ہیں، وہ ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ یہ بخل ان کے حق میں بہتر ہے، بلکہ وہ ان کے حق میں بہت برا ہے، وہ (مال) قیامت کے دن ان کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ○ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ○ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ○ كَلَّا لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ○ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ○ نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ ○ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ○ إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ ○ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ۔ (الھمزہ)

ہر طعنہ دینے والے، غیبت کرنے والے کے لیے تباہی ہے ○ جس نے مال جمع کیا اور اس کو گن گن کر رکھا ○ وہ گمان کرتا ہے کہ وہ (مال) اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا ○ ہرگز نہیں! وہ چورا چورا کرنے والی میں ضرور پھینک دیا جائے گا ○ اور آپ کیا جانیں کہ چورا چورا کرنے والی کیا چیز ہے ○ وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں پر چڑھ جائے گی ○ بے شک وہ ان پر ہر طرف سے بند کی ہوئی ہو گی ○ (بھڑکتے ہوئے شعلوں کے) لمبے لمبے ستونوں میں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو اللہ نے مال عطا کیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی، قیامت کے دن اس کے لیے ایک گنجا سانپ بنایا جائے گا جس کے دو زہریلے ڈنک ہوں گے، اس سانپ کو اس کا طوق بنا دیا جائے گا، پھر وہ اس کو اپنے جبڑوں سے پکڑے گا، پھر کہے گا: میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔ پھر آپ نے آل عمران:۱۸۰ کی تلاوت فرمائی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۱۴۰۳، سنن النسائی رقم الحدیث:۲۴۴۰، موطا امام مالک رقم الحدیث:۳۰۵، صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث:۲۲۵۷، مسند احمد ج ۲ ص ۹۸، تمہید ابن عبدالبر، ج ۶، ص ۵۴۶، المنتقیٰ للباجی رقم:۵۳۰، فتح المالک رقم:۳۰۴)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہر وہ شخص جس کے پاس سونا اور چاندی ہو اور وہ اس کا حق ادا نہ کرتا ہو، جب قیامت کا دن ہو گا تو اس کے لیے آگ کے پترے تیار کیے جائیں گے، اور ان کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا، پھر ان کے ساتھ اس شخص کے پہلو، پیشانی اور پیٹھ کو داغا جائے گا اور جب وہ پترے ٹھنڈے ہو جائیں گے تو ان کو دوبارہ آگ میں گرم کیا جائے گا، یہ عذاب اس دن دیا جائے گا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہو گی، اس کو یہ عذاب دیا جاتا رہے گا حتیٰ کہ تمام لوگوں کا فیصلہ کر دیا جائے گا، پھر وہ دیکھے گا اس کا ٹھکانا، جنت کی طرف ہو گا یا دوزخ کی طرف، اور جو اونٹوں کا حق ادا نہیں کرے گا اس کو اس پورے دن اونٹ اپنے پیروں سے روندتے رہیں گے اور اپنے مونہوں سے کاٹتے رہیں گے، حتیٰ کہ تمام لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا۔ پھر وہ دیکھے گا اس کا ٹھکانا جنت کی طرف ہو گا یا دوزخ کی طرف اور جو شخص بکریوں اور بھیڑوں کا حق ادا نہیں کرے گا وہ اس کو اس پورے دن تک اپنے سینگھوں سے زخمی کرتی رہیں گی اور اپنے پیروں سے روندتی رہیں گی، حتیٰ کہ تمام لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا۔ پھر وہ دیکھے گا اس کا ٹھکانا جنت کی طرف ہو گا یا دوزخ کی طرف۔ الحدیث۔

(صحیح مسلم، الزکوٰۃ:۲۴ (۹۸۷) ۲۲۵۴، صحیح البخاری رقم الحدیث:۲۸۶۱، سنن النسائی رقم الحدیث:۳۵۶۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۱۶۵۸، مسند احمد، ج ۲، ص ۳۸۳، السنن الکبریٰ ج ۴ ص ۸۱، التمہید لابن عبدالبر، ج ۶ ص ۵۴۸)

جس مال کی زکوٰۃ ادا کر دی گئی وہ موجب عذاب نہیں ہے

اس آیت میں پہلے یہودی اور عیسائی علماء کی مذمت کی گئی ہے کہ وہ ناجائز طریقہ سے لوگوں کا مال کھاتے ہیں اور پھر ان لوگوں کی مذمت فرمائی ہے جو سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ قاضی بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ نے لکھا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان مال جمع کرنے والوں سے مراد یہودی اور عیسائی علماء ہوں اور ان کی زیادہ مذمت کرنا مقصود ہو کہ وہ مال پر حریص بھی ہیں اور مال پر بخیل بھی ہیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ مسلمان ہوں جو مال جمع کرتے ہیں اور اس کا حق ادا نہیں کرتے، اور یہودی اور عیسائی رشوت خوروں کے ساتھ بر بناء تغلیظ ان کا ذکر کیا گیا ہو اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر یہ آیت بہت شاق گزری اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب آیت نازل ہوئی والذین یکنزون الذھب والفضۃ۔ (التوبہ:۳۴) تو مسلمانوں پر یہ آیت بہت شاق گزری، حضرت عمر نے فرمایا چلو میں تمہارے لیے اس معاملہ کو کشادہ کراتا ہوں، پھر انہوں نے حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: اے اللہ کے نبی! آپ کے اصحاب پر یہ آیت بہت شاق گزری ہے، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ صرف اس لیے فرض کی ہے کہ تمہارا باقی مال پاکیزہ ہو جائے اور وراثت

تمہارے بعد والوں کے لیے فرض کی ہے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۴۶۴، مسند ابویعلی رقم الحدیث: ۲۴۹۹، المستدرک ج ۲ ص ۳۳۳، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۴ ص ۸۳)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں سونے کی پازیب پہنتی تھی، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا یہ کنز (خزانہ، جمع شدہ مال جس پر آگ کے عذاب کی وعید ہے) ہے؟ آپ نے فرمایا: جو مال زکوٰۃ کی حد تک پہنچ گیا اور اس کی زکوٰۃ ادا کردی گئی وہ کنز نہیں ہے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۵۶۴، الاستذکار رقم الحدیث: ۱۲۷۰۸)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کردی تو تم نے اس حق کو ادا کردیا جو تم پر واجب تھا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۶۱۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۷۸۸، السنن الکبریٰ للبیہقی، ج ۴، ص ۸۴، معرفۃ السنن والآثار رقم الحدیث: ۷۸۴۲)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جس مال کی تم نے زکوٰۃ ادا کردی ہو تو خواہ وہ مال سات زمینوں کے نیچے ہو وہ کنز نہیں ہے اور جس مال کی تم نے زکوٰۃ ادا نہیں کی تو خواہ وہ ظاہر ہو وہ پھر بھی کنز ہے۔

(مصنف عبدالرزاق ج ۴ ص ۱۰۶، الاستذکار رقم الحدیث: ۱۲۷۰۳)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جس دن وہ (سونا اور چاندی) دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیوں کو اور ان کے پہلوؤں کو اور ان کی پیٹھوں کو داغا جائے گا یہ ہے وہ (سونا اور چاندی) جس کو تم نے اپنے لیے جمع کر کے رکھا تھا سو اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو○ (التوبہ: ۳۵)

اس آیت میں پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو سونے اور چاندی کے ساتھ داغنے کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ کیونکہ یہ اشرف اعضاء ہیں۔ جو اعضاء رئیسہ دل، دماغ اور جگر پر مشتمل ہیں اور چونکہ انسان اپنے ان ہی اعضاء کی سلامتی کے لیے مال جمع کرتا ہے اس لیے ان اعضاء کو اس مال کے ساتھ جلایا جائے گا یا اس لیے کہ انسان کے بدن کی چار اطراف ہیں، اگلا حصہ اور پچھلا حصہ، چہرہ اگلے حصہ پر اور پیٹھ پچھلے حصہ پر دلالت کرتی ہے اور دو پہلو دائیں اور بائیں جانبوں پر دلالت کرتے ہیں اور مقصود یہ ہے کہ ہر جانب سے اس کو عذاب محیط ہوگا۔

ادائیگی زکوٰۃ کے بعد مال جمع کرنے میں اختلاف صحابہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس میں اختلاف تھا کہ جس کنز (جمع شدہ مال) کی اللہ تعالیٰ نے مذمت کی ہے اور اس پر عذاب کی وعید سنائی ہے اس کا مصداق کیا ہے؟ اکثر صحابہ کا موقف یہ تھا کہ جس مال کی زکوٰۃ ادا کردی گئی وہ کنز مذموم نہیں ہے اور جس مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کی گئی وہ کنز مذموم ہے اور بعض صحابہ کا مسلک یہ تھا کہ جس مال کو بھی جمع کیا گیا وہ کنز مذموم ہے اور موجب عذاب ہے خواہ اس کی زکوٰۃ ادا کی گئی ہو یا نہ، ان کا استدلال اس آیت کے ظاہر سے ہے کیونکہ اس آیت میں بغیر کسی قید اور استثناء کے اللہ تعالیٰ نے مال جمع کرنے پر عذاب کی وعید فرمائی ہے کہ دوزخ کی آگ سے سونا چاندی جمع کرنے والوں کے بدنوں کو داغا جائے گا۔ نیز حدیث میں ہے:

عبداللہ بن ابی ہذیل بیان کرتے ہیں کہ میرے صاحب نے یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: سونے اور چاندی کے لیے ہلاکت ہو! میرے صاحب نے کہا پھر وہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نے فرمایا ہے کہ سونے اور چاندی کے لیے ہلاکت ہو، پھر ہم

کس مال کو حاصل کریں؟ آپ نے فرمایا: ذکر کرنے والی زبان، شکر کرنے والا دل اور آخرت میں مدد کرنے والی بیوی۔
(مسند احمد ج ۵ ص ۳۶۶، کنز العمال رقم الحدیث: ۱۳۳، ۱۳۳، ۱۳۲، ۲۱۱۲)

زید بن وہب بیان کرتے ہیں کہ میں الربذۃ (مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مشہور جگہ) کے پاس سے گزرا تو وہاں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ تھے۔ میں نے پوچھا آپ یہاں کس سبب سے آگئے؟ انہوں نے کہا میں شام میں تھا، میرا اور حضرت معاویہ کا اس آیت میں اختلاف ہوا: الذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ۔ (التوبہ: ۳۴) حضرت معاویہ نے کہا یہ آیت اہل کتاب کے متعلق نازل ہوئی ہے، میں نے کہا یہ آیت ان کے اور ہمارے دونوں کے متعلق نازل ہوئی ہے، پھر میرے اور ان کے درمیان بحث ہوئی، انہوں نے حضرت عثمان کی طرف میری شکایت لکھ کر بھیجی، حضرت عثمان نے مجھے مدینہ بلایا، میں مدینہ آگیا تو بہت زیادہ لوگ میرے گرد اکٹھے ہو گئے جیسے اس سے پہلے انہوں نے مجھے دیکھا ہی نہیں تھا، میں نے حضرت عثمان سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا اگر آپ چاہیں تو مدینہ کے قریب کسی اور جگہ چلے جائیں تو اس سبب سے میں یہاں آگیا اور اگر مجھ پر کسی حبشی کو بھی حاکم بنا دیا جاتا تو میں اس کی (بھی) اطاعت کرتا۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۴۰۶، مسند احمد ج ۲ ص ۴۷۹، المستدرک ج ۱ ص ۳۸۹، شرح السنہ ج ۵ ص ۴۸۰)

احنف بن قیس بیان کرتے ہیں کہ میں مدینہ میں آیا، میں وہاں قریش کی ایک جماعت میں بیٹھ گیا، وہاں ایک شخص آیا جس کا جسم اور چہرہ سخت تھا، اور اس نے موٹا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس نے قریش کے پاس کھڑے ہو کر کہا مال جمع کرنے والوں کو اس گرم پتھر کی بشارت دو جس کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا اور اس پتھر کو ان میں سے کسی ایک کے پستان کے سر پر رکھ دیا جائے گا حتیٰ کہ وہ ان کے کندھے کی باریک ہڈی سے نکل جائے گا، پھر کندھے کی باریک ہڈی پر رکھا جائے گا اور ان کے پستان کے سرے سے نکل جائے گا اور اسی طرح حرکت کرتا رہے گا، لوگوں نے اس شخص کی طرف سر اٹھا کر دیکھا اور میں نے کسی شخص کو اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے نہیں دیکھا، پھر وہ چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا حتیٰ کہ وہ ایک ستون کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے کہا میرا گمان ہے کہ ان لوگوں نے آپ کی بات کو ناپسند کیا ہے، اس نے کہا ان لوگوں کو سمجھ نہیں ہے، ایک دن میرے محبوب ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا، میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: اے ابوذر! تم احد (پہاڑ) کو دیکھ رہے ہو؟ میں نے سورج کی طرف دیکھا اور میں یہ سمجھا کہ شاید آپ مجھے کسی کام سے بھیجنا چاہتے ہیں، میں نے کہا میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اگر میرے پاس احد پہاڑ جتنا سونا ہو تو مجھے یہ پسند نہیں ہو گا کہ میں اس میں سے تین دینار سے زیادہ اپنے پاس رکھوں اور میں وہ سب اللہ کی راہ میں خرچ کردوں گا، پھر یہ لوگ دنیا کو جمع کر رہے ہیں ان کو عقل نہیں ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا ان قریشی بھائیوں کے ساتھ کیا معاملہ ہے، کیونکہ آپ ان کے پاس جاتے ہیں نہ کوئی سوال کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا: تمہارے پروردگار کی قسم! میں ان سے دنیا کا کوئی سوال کروں گا نہ دین کا، حتیٰ کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جاملوں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۴۰۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۹۹۲، مسند احمد ج ۵ ص ۱۶۰)

اس قسم کی احادیث سے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ یہ استدلال کرتے تھے کہ جو شخص اپنی ضرورت سے زائد مال کو جمع کرے اس پر عذاب کی وعید ہے، لیکن یہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی منفرد رائے تھی۔ حضرت ابوذر کی طرف سے یہ توجیہ کی گئی ہے کہ وہ ان حکام اور سلاطین پر رد کرتے تھے جو بیت المال سے اپنے لیے مال لے لیتے تھے۔ حضرت علی، حضرت ابوذر، ضحاک اور بعض اہل زہد سے منقول ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں حق ہے اور حضرت ابوذر سے ایسے آثار منقول ہیں کہ جو چیز کھانے پینے اور گزر بسر سے زائد ہو اس کو جمع کرنا مال مذموم ہے اور اس آیت میں اسی کے متعلق وعید ہے۔ حضرت ابوذر

رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زیادہ مال والے قیامت کے دن سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے ماسوا ان لوگوں کے جو مال کو دائیں بائیں آگے پیچھے تقسیم کردیں۔ (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۱۳۰)
(الاستذکار ج ۹ ص ۱۲۳، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ بیروت ۱۴۱۴ھ ' المفہم ج ۳ ص ۳۴ مطبوعہ بیروت ' ۱۴۱۷ھ)

تاہم صحیح نظریہ وہ ہے جو جمہور صحابہ کا ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد مال جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور بغیر سوال اور بغیر طلب کے مال لینا جائز ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے عطا فرماتے تو میں عرض کرتا جو مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہو اس کو عطا کردیں تو آپ نے فرمایا: یہ مال لے لو، جب تمہیں اس مال سے کوئی چیز بغیر طلب اور سوال کے ملے تو اس کو لے لو اور جو اس طرح نہ ہو تو اس کے پیچھے نہ پڑو۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۴۷۳، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۰۴۵، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۶۰۸، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۶۴۷)

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتٰبِ
بے شک اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد، اللہ کی کتاب میں

اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ
بارہ مہینہ ہے، جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا، ان میں سے چار مہینے

حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنْفُسَكُمْ
حرمت والے ہیں یہی دین مستقیم ہے سو ان مہینوں میں تم اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو،

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً
اور تم تمام مشرکین سے قتال کرو جیسا کہ وہ تم سب سے قتال کرتے ہیں

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿۳۶﴾ إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ
اور یاد رکھو کہ اللہ متقین کے ساتھ ہے ○ مہینہ کو مؤخر کرنا

فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا
محض کفر ہے، اس سے کافروں کو گمراہ کیا جاتا ہے وہ کسی مہینہ کو ایک سال حلال قرار دیتے ہیں

وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوا
اور اسی مہینہ کو دوسرے سال حرام قرار دیتے ہیں: تاکہ اللہ کے حرام کیے ہوئے مہینوں کی تعداد پوری کرلیں، پھر جس کو اللہ نے حرام کیا ہے

مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا

اس کو حلال کرلیں، ان کے برے کام ان کے لیے خوش نما بنادیئے گئے ہیں، اور اللہ

يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ ع

کافروں کو ہدایت نہیں دیتا ○

ع ۱۱ ۵

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد اللہ کی کتاب میں بارہ مہینے ہیں، جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا، ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، یہی دین مستقیم ہے، سو ان مہینوں میں تم اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو، اور تم تمام مشرکین سے قتال کرو جیسا کہ وہ تم سب سے قتال کرتے ہیں اور یاد رکھو کہ اللہ متقین کے ساتھ ہے ○

(التوبہ: ۳۶)

عبادات اور معاملات میں قمری تقویم کا اعتبار ہے

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ عبادات اور معاملات کے احکام ان مہینوں اور سالوں کے اعتبار سے مقرر کیے جائیں گے جو مہینے اور سال اہل عرب کے نزدیک معروف تھے نہ کہ وہ مہینے جو عجمیوں، رومیوں، قبطیوں اور ہندیوں کے نزدیک معروف تھے، غیر عرب کے نزدیک مہینہ تیس دنوں سے زیادہ کا بھی ہوتا ہے اور عرب کے نزدیک مہینہ کا اعتبار چاند کے حساب سے ہوتا ہے اور ایک مہینہ تیس دن سے زیادہ کا نہیں ہوتا، البتہ تیس دن سے کم کا مہینہ بھی ہوتا ہے، قرآن مجید میں ہے:

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ۔ (یونس: ۵)

وہی جس نے سورج کو روشنی دینے والا بنایا اور چاند کو روشن اور چاند کے لیے منزلیں مقرر کیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب جان لو۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ۔ (البقرہ: ۱۸۹)

لوگ آپ سے نئے چاندوں کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہیے کہ وہ لوگوں (کی عبادات اور معاملات اور خصوصاً) حج کے لیے اوقات کی نشانیاں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان بارہ مہینوں کو مقرر کیا اور ان کے نام رکھے، جب سے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں پر جو کتابیں نازل کیں ان میں ان مہینوں کا ذکر کیا، اللہ کی کتاب سے مراد لوح محفوظ بھی ہو سکتی ہے۔

حرمت والے مہینوں کا بیان اور ان کا شرعی حکم

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زمانہ گھوم کر اپنی اصل شکل پر آچکا ہے، جب اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا تھا، سال کے بارہ مہینے ہیں، ان میں سے چار حرمت والے مہینے ہیں، تین مہینے متواتر ہیں: ذوالقعدۃ، ذوالحجہ اور محرم اور (قبیلہ) مضر کا رجب جو جمادیٰ اور شعبان کے درمیان ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۶۶۲، مطبوعہ دار ارقم بیروت)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: سو تم ان مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو، ہرچند کہ کسی مہینہ میں بھی ظلم کرنا جائز نہیں ہے، لیکن یہ مہینے چونکہ حرمت والے ہیں اس لیے ان مہینوں میں گناہ کرنا زیادہ شدت سے ممنوع ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کی ایک وجہ سے عظمت اور حرمت مقرر فرماتا ہے تو وہ ایک وجہ سے محرم اور مکرم ہوتی ہے اور جس چیز کی دو یا دو سے زیادہ وجہ سے حرمت اور عظمت مقرر فرماتا ہے تو وہ دو یا دو سے زیادہ وجہ سے مکرم اور محرم ہوتی ہے، پس اس میں برے کاموں پر عذاب بھی دگنا چوگنا ہوتا ہے جس طرح اس میں نیک کاموں کا اجر و ثواب بھی دگنا اور چوگنا ہوتا ہے سو جو شخص حرمت والے مہینہ مثلاً ذوالحجہ میں یا حرمت والی جگہ مثلاً مکہ مکرمہ یا مسجد حرام میں عبادت کرے گا اس کا اجر و ثواب دوسرے اوقات اور دوسری جگہوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہوگا اور جو شخص اس حرمت والے مہینہ اور حرمت والی جگہ میں برے کام کرے گا اس پر مواخذہ بھی دگنا چوگنا ہوگا اس کی نظیر یہ آیت ہے:

یٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنۡ يَّاۡتِ مِنۡكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفۡ لَهَا الۡعَذَابُ ضِعۡفَيۡنِ۔	اے نبی کی بیویو! اگر تم میں سے کوئی ایک کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرے تو اس کو دگنا عذاب دیا جائے گا۔

(الاحزاب: ۳۰)

پہلے ان مہینوں میں قتال کرنا جائز نہیں تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم منسوخ کر دیا اور تمام مہینوں میں قتال کو مباح کر دیا، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن سے حنین میں اور ثقیف سے طائف میں قتال کیا اور شوال اور ذوالقعدہ کے بعض ایام میں ان کا محاصرہ کیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مہینہ کو موخر کرنا محض کفر ہے، اس سے کافروں کو گمراہ کیا جاتا ہے، وہ کسی مہینہ کو ایک سال حلال قرار دیتے ہیں اور اسی مہینہ کو دوسرے سال حرام قرار دیتے ہیں، تاکہ اللہ کے حرام کیے ہوئے مہینوں کی تعداد پوری کر لیں، پھر جس کو اللہ نے حرام کیا ہے اس کو حلال کر لیں، ان کے برے کام ان کے لیے خوش نما بنا دیئے گئے ہیں، اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا ○ (التوبہ: ۳۷)

مشرکین کا حرمت والے مہینوں کو موخر کرنا

النسیئی کا معنی ہے موخر کرنا، مشرکین حرمت والے مہینوں کو موخر کرتے رہتے تھے ان کے رد میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ محرم حرمت والا مہینہ تھا، اس میں قتال حرام تھا، مشرکین عرب لوٹ مار اور قتل و غارت کرنے والے لوگ تھے، اور ذوالقعدہ، ذوالحج اور محرم یہ تین مہینے متواتر حرمت والے تھے، ان تین مہینوں میں قتال سے صبر کرنا مشرکین عرب کے لیے بہت مشکل اور دشوار تھا، انہیں جب محرم کے مہینے میں کسی سے لڑنے کی ضرورت پیش آتی تو وہ محرم کے مہینہ کو موخر کر دیتے اور صفر کے مہینہ کو محرم قرار دیتے اور اصل محرم کے مہینہ میں قتال کر لیتے۔ اسی طرح وہ ہر سال محرم کے مہینہ کو ایک ماہ موخر کرتے رہتے، حتیٰ کہ جس سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا، اس سال گیارہ مرتبہ محرم کا مہینہ موخر ہو کر اپنی اصل ہیئت پر آچکا تھا، اس لیے آپ نے فرمایا: زمانہ گھوم کر اپنی اصل ہیئت پر آچکا ہے، جس ہیئت پر وہ اس وقت تھا جب اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا تھا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَا لَـكُمۡ اِذَا قِيۡلَ لَـكُمُ انْفِرُوۡا فِىۡ

اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لیے

سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ

کہا جاتا ہے تو تم بوجھل ہو کر زمین سے چپک جاتے ہو! کیا تم نے آخرت کے بدلہ دنیا کی زندگی کو پسند

الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي

کر لیا ہے؟ سو دنیا کی زندگی کا نفع تو آخرت کے مقابلہ میں

الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿٣٨﴾ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ

بہت تھوڑا ہے ○ اگر تم (اللہ کی راہ میں) نہیں نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا

وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ

اور تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا اور تم اس کو بالکل نقصان نہیں پہنچا سکو گے اور اللہ

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٣٩﴾ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ

ہر چیز پر قادر ہے ○ اگر تم نے رسول کی مدد نہیں کی تو بے شک اللہ ان کی مدد کر چکا ہے،

اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ

جب کافروں نے ان کو بے وطن کر دیا تھا، درآں حالیکہ وہ دو میں سے دوسرے تھے، جب وہ دونوں غار میں تھے

اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ

جب وہ اپنے صاحب سے فرما رہے تھے، غم نہ کرو، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے، سو اللہ نے

اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ

ان پر طمانیت قلب نازل کی اور ان کی ایسے لشکروں سے مدد فرمائی جن کو تم نے نہیں دیکھا اور

كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ

کافروں کی بات کو نیچا کر دیا، اور اللہ کا دین ہی بلند و بالا ہے،

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٤٠﴾ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا

اور اللہ بہت غلبہ والا بڑی حکمت والا ہے ○ (اللہ کی راہ میں) نکلو خواہ ہلکے ہو کر خواہ بوجھل ہو کر اور اپنے مالوں

بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ

اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٤١﴾ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا

اگر تم جانتے ہو تو ○ (اے رسول مکرم! آپ نے جس طرف نکلنے کے لیے کہا تھا) اگر وہ سہل الحصول مال ہوتا اور متوسط

قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ

سفر ہوتا تو (یہ منافقین) ضرور آپ کے پیچھے چل پڑتے لیکن دور دراز کا سفر ان کو بھاری لگا،

وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ

اور عنقریب یہ اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم میں طاقت ہوتی تو ہم ضرور آپ کے ساتھ روانہ ہوتے،

ع ٦ ٥ ١٢ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٤٢﴾ ع

وہ اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں . اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک وہ ضرور جھوٹے ہیں ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لیے کہا جاتا ہے تو تم بوجھل ہو کر زمین سے چپک جاتے ہو، کیا تم نے آخرت کے بدلہ دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا ہے؟ سو دنیا کا نفع تو آخرت کے مقابلہ میں بہت تھوڑا ہے○ (التوبہ: ۳۸)

غزوۂ تبوک کی تیاری

یہ آیت غزوۂ تبوک کے موقع پر نازل ہوئی ہے، یہ غزوہ نو ہجری میں ہوا تھا۔ تبوک ایک چشمہ ہے جو وادی قریٰ میں تھا، یہ مدینہ سے بارہ مرحلہ پر شام کے نزدیک واقع ہے۔

امام ابن اسحٰق نے بیان کیا ہے کہ طائف کی مہم سے فارغ ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نو ہجری میں ذوالحجہ سے رجب تک مدینہ میں قیام فرمایا، پھر آپ نے مسلمانوں کو روم کے عیسائیوں سے جہاد کی تیاری کرنے کا حکم دیا۔ یہ بہت تنگی کا زمانہ تھا، گرمی بہت شدید تھی، اور شہروں میں کھجوریں پکنے والی تھیں اور لوگ چاہتے تھے کہ مدینہ میں ٹھہریں اور درختوں کے سائے اور پکی ہوئی کھجوروں سے راحت حاصل کریں، اور اس موسم میں مدینہ سے باہر نکلنا ان پر بہت شاق اور دشوار تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی کسی غزوہ کے لیے نکلتے تھے تو اس کا صراحتاً ذکر نہ کرتے بلکہ اس کا کنایۃً ذکر فرماتے تھے لیکن تبوک کا آپ نے صراحتاً ذکر فرمایا کیونکہ یہ بہت دور کا سفر تھا اور اس میں مشقت بہت تھی اور جس دشمن سے آپ نے جنگ کا ارادہ کیا تھا اس کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس لیے آپ نے صراحتاً بیان فرمادیا کہ آپ رومیوں سے جنگ کے لیے جا رہے ہیں۔ منافقوں نے ایک دوسرے سے کہا اس قدر سخت گرمی میں جہاد کے لیے نہ جاؤ۔ اسحاق بن ابراہیم اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ منافقین سویلم یہودی کے گھر جمع ہو رہے ہیں اور وہ مسلمانوں کو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ تبوک میں جانے سے منع کر رہے ہیں، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ کو چند اصحاب کے ساتھ بھیجا اور ان کو یہ حکم دیا کہ وہ سویلم کے گھر آگ لگا دیں، سو حضرت طلحہ نے ایسا ہی کیا۔

امام ابن اسحاق کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کی تیاری شروع کی، اور مال دار مسلمانوں کو جہاد میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک میں دل کھول کر مال خرچ کیا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن خباب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے لیے مسلمانوں کو برانگیختہ فرما رہے تھے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں اللہ کی راہ میں ایک سو اونٹ مع کجاووں اور کپڑوں کے پیش کرتا ہوں۔ آپ نے پھر مسلمانوں کو برانگیختہ کیا تو حضرت عثمان نے کھڑے ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ! میں دو سو اونٹ اللہ کی راہ میں مع ان کے کجاووں اور کپڑوں کے پیش کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر مسلمانوں کو لشکر کی مدد کے لیے برانگیختہ کیا، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پھر کھڑے ہوئے اور کہا: میں اللہ کی راہ میں تین سو اونٹ مع ان کے کجاووں اور کپڑوں کے پیش کرتا ہوں۔ تب میں نے دیکھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہوئے منبر سے اترے: آج کے بعد عثمان جو عمل بھی کرے اس کو ضرر نہیں ہو گا، آج کے بعد عثمان جو عمل بھی کرے اس کو ضرر نہیں ہو گا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ٣٧٠٠، مسند احمد رقم الحدیث: ١٦٦٩٦، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ٨٥٢)

حضرت عبدالرحمٰن بن السمرہ بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے لشکر کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک ہزار دینار لے کر آئے، میں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان دیناروں کو اپنی گود میں الٹ پلٹ رہے تھے اور فرما رہے تھے۔ آج کے بعد عثمان جو عمل بھی کرے اس کو ضرر نہیں ہو گا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ٣٧٠١، البدایہ والنہایہ ج ٣ ص ٥٩٧، طبع جدید)

اس حدیث کا معنی یہ نہیں ہے کہ حضرت عثمان نیک کام کریں یا بد ان کو اس کا ضرر نہیں ہو گا، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ ان کو برائی سے محفوظ رکھے گا اور اگر بشری تقاضے سے کوئی غلطی ہو گئی تو مرنے سے پہلے ان کو توبہ کی توفیق دے دے گا۔

واضح رہے کہ اس آیت میں جو فرمایا ہے کہ اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے جہاد کے لیے نکلنے کے لیے کہا جاتا ہے تو تم زمین سے چپک جاتے ہو، اس سے مراد تمام مسلمان نہیں ہیں، بلکہ بعض مسلمان ہیں کیونکہ اکثر مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق غزوۂ تبوک پر خوشی سے روانہ ہو گئے تھے جن کی تعداد تیس ہزار تھی، اور بعض مسلمان بغیر کسی عذر کے اپنی سستی کی وجہ سے رہ گئے تھے جن کو بہت سخت ملامت کی گئی اور منافقین جھوٹے حیلے بہانے کر کے رہ گئے تھے۔ (البدایہ والنہایہ ج ٣ ص ٥٩٣، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ١٤١٩ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اگر تم (اللہ کی راہ میں) نہیں نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا، اور تم اس کو بالکل نقصان نہیں پہنچا سکو گے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے○ (التوبہ: ٣٩)

جہاد کے لیے نکلنے کا وجوب

اس آیت سے مسلمانوں کو یہ تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ دشمنانِ اسلام کی سرکوبی کرنے اور ان سے جنگ کرنے والوں کی مدد کرنے کے لیے خود کافی ہے، اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے مسلمانوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طلب کرنے پر جہاد کے لیے جانے میں سستی کی تو اللہ تعالیٰ کو کوئی کمی نہیں ہے وہ اپنے نبی کی مدد کے لیے کوئی اور قوم لے آئے گا،

اس لیے وہ یہ گمان نہ کریں کہ دین کا غلبہ صرف ان ہی سے ہو سکتا ہے۔
اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تم اللہ کو بالکل نقصان نہیں پہنچا سکو گے، اس سے مراد یہ ہے کہ تم اللہ کے رسول کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکو گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو نقصان پہنچانا تو متصور ہی نہیں ہے۔
اس آیت میں فرمایا ہے: اگر تم جہاد کے لیے نہیں نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا، اس سے معلوم ہوا کہ جہاد کرنا واجب ہے، نیز اس سے پہلی آیت میں ان مسلمانوں کی مذمت کی ہے جو جہاد پر بلانے کے باوجود جہاد کے لیے نہیں جاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب بھی مسلمانوں کا امیر مسلمانوں کو جہاد کے لیے بلائے تو ان پر واجب ہے کہ وہ اس کی دعوت پر لبیک کہیں، نیز اس آیت میں جہاد نہ کرنے پر عذاب کی وعید سنائی ہے اور جس طرح جہاد فرض ہے اسی طرح نماز، روزہ، زکوۃ اور حج بھی فرض ہیں اور جب جہاد نہ کرنے پر عذاب کی وعید ہے تو باقی فرائض کے ادا نہ کرنے پر بھی عذاب ہو گا، کیونکہ بہ حیثیت فرض ان عبادات میں کوئی فرق نہیں ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اگر تم نے رسول کی مدد نہیں کی تو بے شک اللہ ان کی مدد کر چکا ہے، جب کافروں نے ان کو بے وطن کر دیا تھا درآنحالیکہ وہ دو میں سے دوسرے تھے، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے صاحب سے فرما رہے تھے: غم نہ کرو، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے، سو اللہ نے ان پر طمانیت قلب نازل کی اور ان کی ایسے لشکروں سے مدد فرمائی جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کی بات کو نیچا کر دیا اور اللہ کا دین ہی بلند و بالا ہے اور اللہ بہت غلبہ والا بڑی حکمت والا ہے○
(التوبہ: ۴۰)
اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی ہے، اور یہ بتایا ہے کہ اگر مسلمانوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ تبوک میں جا کر ان کی مدد نہیں کی تو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی کمی نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی اور اس سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی مدد فرمائی تھی جب قریش مکہ نے آپ کو بے وطن کر دیا تھا، آپ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی اور غار ثور میں تین راتیں گزاریں اس سفر میں اور غار میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے رفیق تھے، ان کا ذکر بھی اس آیت میں ہے اور غار ثور میں حضرت ابوبکر کی رفاقت کی تفصیل اس طرح ہے:

غار ثور میں حضرت ابوبکر کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رفاقت

امام عبدالملک بن ہشام متوفی ۲۱۸ھ لکھتے ہیں:
امام ابن اسحاق نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے نکلنے کا ارادہ کیا تو کسی کو اس کا علم نہیں تھا، ماسوا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور آل ابوبکر کے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں چھوڑ دیا تھا اور ان کو یہ حکم دیا تھا کہ لوگوں کی جو امانتیں آپ کے پاس ہیں وہ ان کو ادا کر دیں، اس کے بعد مدینہ آ جائیں اور مکہ میں جس شخص کے پاس بھی کوئی اہم چیز ہوتی تھی وہ اس کو آپ کے پاس رکھوا دیتا تھا کیونکہ سب لوگ آپ کی صداقت اور امانت پر یقین رکھتے تھے۔
جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے نکلنے کا ارادہ کیا تو آپ حضرت ابوبکر کے پاس گئے اور ان کے مکان کے پیچھے سے غار ثور کی طرف نکلے جو مکہ کے نشیب میں ایک پہاڑ ہے، وہ دونوں اس پہاڑ میں داخل ہو گئے، حضرت ابوبکر نے اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ وہ بغور سنیں کہ لوگ ان کے متعلق کیا باتیں کرتے ہیں پھر شام کو آ کر ہمیں خبر دیں اور اپنے غلام عامر بن فہیرہ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ دن میں بکریاں چرائیں اور شام کو ان کے پاس آ جائیں اور حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما شام کو ان

کے پاس کھانا لے کر آتی تھیں۔

امام ابن ہشام فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رات کو غار میں پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت ابوبکر غار میں داخل ہوئے اور غار کو ٹٹول کر دیکھا کہ اس میں کہیں سانپ یا بچھو تو نہیں ہے، تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے اثر سے محفوظ رکھیں۔

(سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۹۹، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم حضرت ابوبکر کی ایک رات اور ایک دن، عمر کی تمام عمر سے افضل اور بہتر ہے، کیا میں تمہیں ان کی ایک رات اور ایک دن کے متعلق بتاؤں؟ راوی نے کہا ہاں! اے امیر المومنین! حضرت عمر نے فرمایا: رات تو وہ ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کے ساتھ ہجرت فرمائی، حضرت ابوبکر کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چلتے، کبھی آگے چلتے، کبھی دائیں چلتے، کبھی بائیں چلتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: اے ابوبکر! ایسا کیوں کر رہے ہو؟ حضرت ابوبکر نے کہا: میں آپ کے چاروں طرف اس لیے چل رہا ہوں کہ اگر کوئی اچانک آپ پر حملہ آور ہو تو اس کا پہلا نشانہ میں بنوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس رات چلتے رہے حتیٰ کہ آپ کے مبارک پاؤں گھس گئے، یہ دیکھ کر حضرت ابوبکر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا اور آپ کو اٹھا کر دوڑنا شروع کیا حتیٰ کہ غار ثور کے دہانہ پر پہنچ گئے، وہاں انہوں نے آپ کو اتارا اور کہا: آپ کو اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے، آپ غار میں پہلے داخل نہ ہوں، پہلے میں داخل ہوں گا، تاکہ اگر اس میں کوئی مضر چیز ہے تو پہلے مجھے اس کا ضرر پہنچے۔ حضرت ابوبکر غار میں گئے اور کوئی مضر چیز نہیں پائی، غار میں بہت سوراخ تھے جن میں مختلف اقسام کے سانپ تھے۔ ابوبکر کو یہ خوف ہوا کہ کہیں ان سوراخوں سے کوئی سانپ نکل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء نہ پہنچائے، انہوں نے سوراخ میں اپنا قدم رکھ دیا، سانپ ان کے پیر پر ڈنک مارنے لگے اور ڈسنے لگے اور تکلیف کی شدت سے حضرت ابوبکر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا: یہ حضرت ابوبکر کی رات ہے، الحدیث۔

(دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲ ص ۴۷۷، البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۵۶۳، طبع جدید، الریاض النضرۃ للمحب الطبری ج ۱ ص ۱۰۶، الدر المنثور ج ۴ ص ۱۹۸، مختصر تاریخ دمشق ج ۱۳ ص ۵۵)

امام ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی جوزی المتوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے کہا: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم غار میں ہیں، اگر کسی نے اپنے قدموں کے نشان کو دیکھا تو وہ ہمارے قدموں کے نشانوں کو بھی دیکھ لے گا۔ آپ نے فرمایا: اے ابوبکر! تمہارا ان دونوں کے متعلق کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہے! (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۶۵۳، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۸۱، مسند احمد ج ۱ ص ۴) نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ غار کی شب حضرت ابوبکر نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے پہلے غار میں داخل ہونے دیں، آپ نے فرمایا: تم داخل ہو، حضرت ابوبکر داخل ہو کر اپنے ہاتھ سے ٹٹول ٹٹول کر غار کے سوراخوں کو دیکھتے رہے، پھر انہوں نے اپنے کپڑے کو پھاڑ کر غار کے تمام سوراخ بند کر دیئے، ایک سوراخ باقی رہ گیا تو اس میں اپنی ایڑی رکھ دی۔ جب رسول اللہ داخل ہوئے تو آپ نے پوچھا: اے ابوبکر تمہارا کپڑا (قمیص) کہاں ہے، تو حضرت

ابوبکر نے یہ واقعہ بیان کیا' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر یہ دعا فرمائی: اے اللہ! ابوبکر کو جنت میں میرے ساتھ میرے درجہ میں رکھنا۔

(المنتظم ج ۲ ص ۱۷٦' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ١٤١٥ھ' سبل الہدیٰ والرشاد' ج ۳ ص ۲۴۰' دارالکتب العلمیہ بیروت' ١٤١٨ھ)

امام ابن جوزی نے الوفاء میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب حضرت ابوبکر نے سوراخ پر اپنی ایڑی رکھ دی تو سانپ ان کی ایڑی میں ڈنک مارنے لگے' اور حضرت ابوبکر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: اے ابوبکر غم نہ کرو' بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے تو اللہ تعالیٰ نے ابوبکر کے دل میں سکون نازل فرمایا۔

(الوفاج ١ ص ۲۳۸' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ لائل پور)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ١٠٥٢ھ نے بھی اتنا ہی لکھا ہے۔

(مدارج النبوت ج ۲ ص ۵۸' مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر' ۱۳۹۷ھ)

امام ابو جعفر احمد' المحب الطبری المتوفی ٦٩٤ھ لکھتے ہیں:

ابن السمان نے کتاب الموافقہ میں بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر غار میں داخل ہوئے اور اس میں جو سوراخ بھی دیکھا اس میں اپنی انگلی داخل کر دی حتیٰ کہ ایک بڑا سوراخ دیکھا اس میں ران تک اپنی ٹانگ داخل کر دی پھر کہا یا رسول اللہ! اب آپ غار میں آ جائیے' میں نے آپ کے لیے جگہ تیار کر دی ہے۔ (الی ان قال) رات بھر سانپ حضرت ابوبکر کی ٹانگ میں ڈنک مارتے رہے اور حضرت ابوبکر نے بڑی تکلیف میں رات گزاری' صبح کو انہیں دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! یہ کیا ہوا؟ ان کی پوری ٹانگ سوجی ہوئی تھی' حضرت ابوبکر نے کہا: یا رسول اللہ! یہ سانپ کے ڈنک مارنے کا اثر ہے۔ آپ نے فرمایا: تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ حضرت ابوبکر نے کہا: میں نے آپ کی نیند کو خراب کرنا ناپسند کیا' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر پر اپنا ہاتھ پھیرا تو ان کے جسم کا سارا درد جاتا رہا اور وہ بالکل ٹھیک ہو گئے۔

(الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ ج ١ ص ١٠٢' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت)

اس سلسلہ میں دوسری روایت المحب الطبری نے اس طرح بیان کی ہے:

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایک رات کی عظمت اور خصوصیت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جب حضرت ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غار ثور میں پہنچے تو انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ پہلے غار میں داخل نہ ہوں پہلے میں داخل ہوتا ہوں تاکہ اگر اس میں کوئی مضر چیز ہو تو اس کا ضرر مجھے لاحق ہو' نہ کہ آپ کو۔ جب حضرت ابوبکر غار میں داخل ہوئے تو اس میں بہت سوراخ تھے' انہوں نے اپنی چادر پھاڑ کر وہ تمام سوراخ بھر دیئے۔ دو سوراخ باقی رہ گئے تو انہوں نے ان پر اپنا پیر رکھ دیا' پھر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور حضرت ابوبکر کی گود میں سر رکھ کر سو گئے' سانپ نے حضرت ابوبکر کے پیر میں ڈنک مارنے شروع کر دیئے اور حضرت ابوبکر نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کی کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار نہ ہو جائیں۔ ان کے آنسو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر گرے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہو گئے' آپ نے پوچھا: اے ابوبکر! کیا ہوا؟ انہوں نے کہا: آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں مجھے سانپ نے ڈس لیا' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پیر پر لعاب دہن لگایا تو ان کی تمام تکلیف دور ہو گئی۔ (الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ ج ١ ص ١٠٤' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت)

علامہ احمد قسطلانی متوفی ۹۱١ھ لکھتے ہیں:

نیز روایت کیا گیا ہے کہ حضرت ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے غار میں داخل ہوئے تاکہ آپ کو ضرر سے محفوظ رکھیں، انہوں نے ایک سوراخ دیکھا تو اس میں اپنی ایڑی رکھ دی تاکہ اس میں سے کوئی سانپ نکل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرر نہ پہنچائے، پھر سانپ حضرت ابوبکر کی ایڑی پر ڈنک مارنے لگے اور حضرت ابوبکر کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر حضرت ابوبکر کی گود میں تھا، جب سانپ نے حضرت ابوبکر کی ایڑی پہ ڈنک مارا تو حضرت ابوبکر کے آنسو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر گرے، آپ نے پوچھا: اے ابوبکر! کیا ہوا؟ انہوں نے کہا: آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں مجھے سانپ نے کاٹ لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ اپنا لعاب دہن لگا دیا اس سے حضرت ابوبکر کی تکلیف جاتی رہی۔ اس حدیث کو رزین بن معاویہ متوفی ۵۳۰ھ نے روایت کیا ہے۔

(المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۱۴۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۶ھ، شرح الزرقانی علی المواہب ج ۱ ص ۱۳۵، دار المعرفہ بیروت)

علامہ علی بن برہان الدین حلبی متوفی ۱۰۴۴ھ نے بھی اس روایت کو درج کیا ہے۔

(انسان العیون ج ۲ ص ۲۰۵، مطبوعہ مصر، ۱۳۸۴ھ)

امام ابن اسحاق نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تین دن غار میں رہے اور قریش نے آپ کو واپس لانے والے کے لیے ایک سو اونٹ کا انعام مقرر کر دیا تھا اور حضرت ابوبکر کے بیٹے عبداللہ بن ابی بکر دن میں قریش کی باتیں سنتے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کے متعلق کرتے تھے اور شام کو آ کر ان کی خبر پہنچاتے تھے۔ عبداللہ بن ابی بکر کے جانے کے بعد حضرت ابوبکر کے غلام عامر بن فہیرہ اس جگہ بکریوں کو لے جاتے اور بکریوں کے چلنے کی وجہ سے عبداللہ بن ابی بکر کے غار کے پاس چلنے کے نشان مٹ جاتے اور حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما تین دن تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کے لیے کھانا پہنچاتی رہیں، پھر تین دن کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار سے نکل کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔

(سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۰۰-۹۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

قریش جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈھونڈنے میں ناکام ہو گئے تو وہ کھوجی کو لائے جو قدموں کے نشان سے اپنے ہدف تک پہنچتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ شخص غار پر جا کر ٹھہر گیا۔ اس نے کہا یہاں آ کر نشانات ختم ہو گئے ہیں، مکڑی نے اسی وقت غار کے منہ پر جالا تن دیا تھا، اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکڑی کو مارنے سے منع فرمایا ہے، جب انہوں نے مکڑی کے جالے کو دیکھا تو ان کو یقین ہو گیا کہ اس غار میں کوئی نہیں ہے اور وہ واپس چلے گئے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۸ ص ۷۵)

حضرت ابوبکر صدیق کی افضلیت کی وجوہ

(۱) کفار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے درپے تھے اور آپ ان سے چھپ کر غار ثور میں داخل ہوئے تھے۔ اگر آپ کو حضرت ابوبکر کے ایمان اور ان کی جانثاری پر مکمل اعتماد نہ ہوتا تو ان کو اپنے ساتھ لے کر کبھی غار میں داخل نہ ہوتے۔

(۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہجرت کرنا اللہ کے حکم سے تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبی قرابت دار بھی بہت تھے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سفر میں رفاقت کے لیے صرف حضرت ابوبکر کو ساتھ لیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر ہجرت میں حضرت ابوبکر کو ساتھ لینا اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا اور حضرت ابوبکر کی بہت بڑی فضیلت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر کو چن لیا۔

(۳) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر کو ثانی اثنین (دو میں سے دوسرا) فرمایا ہے، اور دین کے اکثر مناصب میں

حضرت ابوبکر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ثانی تھے۔ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہوگئے، پھر حضرت ابوبکر نے حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت عثمان بن عفان کو اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہوگئے۔ اس طرح اسلام کی دعوت دینے میں اول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ثانی حضرت ابوبکر تھے۔ اسی طرح ہر غزوہ میں حضرت ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور آپ کی خدمت میں حاضر رہے، اس طرح وہ غزوات میں بھی ثانی اثنین ہیں اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو آپ نے حضرت ابوبکر کو امام مقرر فرمایا، پس امامت میں بھی حضرت ابوبکر ثانی اثنین ہیں، اور جب حضرت ابوبکر فوت ہوئے تو وہ آپ کے پہلو میں دفن ہوئے اس طرح وہ قبر میں بھی ثانی اثنین ہیں، اور حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے قبر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھیں گے اور آپ کے بعد حضرت ابوبکر اٹھیں گے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۶۹۲) اور جنت میں سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوں گے اور امت میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر داخل ہوں گے۔ (سنن ابوداؤد: ۴۶۵۲) خلاصہ یہ ہے کہ تبلیغ دین میں، ہجرت کرنے میں، مغازی میں، امامت میں، امارت میں، قبر میں، حشر میں، دخول جنت میں، تمام اہم دینی مناصب میں اول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ثانی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔

(۴) اس آیت میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابوبکر غمگین ہوئے تو ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی دی اور فرمایا: غم نہ کرو بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے اور یہ حضرت ابوبکر کی بہت بڑی فضیلت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تسلی دینے والے ہوں۔

(۵) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ تصریح کی ہے حضرت ابوبکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب ہیں اور یہ نص قطعی ہے جس کا انکار کفر ہے اور تمام صحابہ میں صرف حضرت ابوبکر کی صحابیت منصوص ہے اور آپ کے صحابی ہونے کا انکار کفر ہے۔

(۶) اس آیت میں فرمایا ہے: اللہ ہمارے مع (ساتھ) ہے، اور اس معیت سے حفاظت اور نصرت کی معیت مراد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حفاظت اور نصرت فرمائے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں حضرت ابوبکر کو بھی شامل فرمالیا اور یہ حضرت ابوبکر کی بہت بڑی فضیلت ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ متقین اور محسنین کے مع (ساتھ) ہوتا ہے۔ اس سے حضرت ابوبکر کا متقی اور محسن ہونا بھی منصوص ہوا۔

(۷) احادیث اور کتب سیر سے ثابت ہے کہ غار ثور میں قیام کے دوران حضرت ابوبکر کے بیٹے، عبداللہ بن ابی بکر اور ان کی بیٹی حضرت اسماء، ان کا غلام عامر بن فہیرہ آپ تک مکہ کی خبریں پہنچانے اور آپ کے لیے طعام پیش کرنے میں لگے رہے اور یہ بھی حضرت ابوبکر کی فضیلت ہے کہ ان کی اولاد اور ان کے خدام اس خطرے کے موقع پر جان کی بازی لگا کر آپ کی خدمت میں مشغول رہے۔

(۸) حضرت ابوبکر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مدینے پہنچے تو سب لوگوں نے جان لیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس شخص کو سفر و حضر میں ساتھ رکھتے ہیں وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔

(۹) اس آیت میں حضرت ابوبکر کی خلافت کی دلیل ہے کیونکہ حاکمیت میں اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ثانی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ سالم بن عبید بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو انصار نے کہا: ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک امیر تم میں سے ہوگا، تو حضرت عمر نے کہا: ایسا کون شخص ہے جس کے متعلق یہ تین آیتیں ہوں: اذهما في الغار (جب وہ دونوں غار میں تھے) وہ دونوں کون تھے؟ اذ يقول لصاحبه (جب وہ اپنے صاحب سے کہہ رہے تھے) وہ صاحب کون ہیں؟ لا تحزن ان الله معنا (غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے) یہ دونوں کون ہیں؟ پھر

حضرت ابو بکر نے ہاتھ بڑھایا اور سب لوگوں نے حضرت ابو بکر کی بیعت کرنی شروع کر دی۔ اور یہ بہت عمدہ بیعت تھی۔
(السنن الکبریٰ ج ۶ ص ۳۵۵، رقم الحدیث: ۱۱۲۱۹، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۱ھ)

(۱۰) غار ثور کی ان تین راتوں میں حضرت ابو بکر میں انوار رسالت اس طرح جذب ہو گئے تھے کہ جب حضور اور حضرت ابو بکر مدینہ پہنچے تو استقبال کے لیے آئے ہوئے مسلمانوں نے حضرت ابو بکر کو سمجھا کہ یہ رسول اللہ ہیں اور وہ سب آگے بڑھ کر حضرت ابو بکر سے ملنے لگے، تب حضرت ابو بکر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر چادر کا سایہ کیا تاکہ لوگ جان لیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، میں تو ان کا ایک غلام اور امتی ہوں۔

امام بخاری حدیث ہجرت کے اخیر میں عروہ بن الزبیر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلمانوں کی ایک جماعت میں حضرت زبیر سے ملاقات ہوئی جو شام سے تجارت کر کے لوٹ رہے تھے، پھر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر کو سفید کپڑے پہنائے اور مدینہ کے مسلمانوں نے سن لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے تشریف لا رہے ہیں، وہ ہر روز صبح مدینہ کی پتھریلی زمین پر جاتے اور آپ کا انتظار کرتے اور دوپہر کو لوٹ آتے، حتیٰ کہ ایک روز جب ان کا انتظار بہت طویل ہو گیا اور وہ اپنے گھروں کو لوٹ گئے، ایک یہودی کسی ٹیلہ پر کھڑا ہوا کسی کا انتظار کر رہا تھا تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو سفید لباس میں آتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ یہودی بے اختیار بلند آواز سے چلا کر بولا: اے معاشر العرب! یہ ہیں وہ تمہارے بزرگ جن کا تم انتظار کر رہے تھے۔ مسلمان اپنے ہتھیاروں کی طرف دوڑے اور انہوں نے اس پتھریلی زمین پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دائیں جانب مڑ گئے اور بنو عمرو بن عوف کے محلہ میں ٹھہرے۔ یہ ماہ ربیع الاول کا پہلا دن تھا۔ حضرت ابو بکر لوگوں کے سامنے کھڑے رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش بیٹھے رہے۔ پھر انصار کے جن لوگوں نے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا تھا وہ حضرت ابو بکر کو تعظیم دینے لگے۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دھوپ آ گئی۔ تب حضرت ابو بکر نے اپنی چادر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سایہ کیا، اس وقت لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا...... الحدیث۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۹۰۵، مطبوعہ دار ارقم، بیروت)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ ظاہر حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنہوں نے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا تھا انہوں نے حضرت ابو بکر کو رسول اللہ گمان کیا اسی لیے انہوں نے ابتداءً حضرت ابو بکر کو سلام کیا اور جب دھوپ آ گئی اور حضرت ابو بکر نے چادر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سایہ کیا تب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۲۴۴، طبع لاہور)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر میں انوار رسالت اس طرح جذب ہو گئے تھے کہ دیکھنے والے حضرت ابو بکر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گمان کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اللہ کی راہ میں) نکلو خواہ ہلکے ہو کر خواہ بوجھل ہو کر اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے اگر تم جانتے ہو○ (التوبہ: ۴۱)

خفافا وثقالا کے معانی

اس آیت میں پھر مسلمانوں کو جہاد کی جانب متوجہ کیا ہے اور فرمایا ہے: تم خفیف ہو یا ثقیل جہاد کے لیے نکلو، خفیف اور ثقیل کے مفسرین نے متعدد معانی بیان کیے ہیں۔ (۱) تمہارے لیے نکلنے میں خواہ آسانی ہو یا مشقت ہو (۲) اہل و عیال کی کمی ہو یا

زیادتی ہو (۳) ہتھیاروں کی زیادتی ہو یا کمی ہو (۴) سوار ہو کر نکلو یا پیادہ (۵) جوان ہو یا بوڑھے (۶) طاقتور ہو یا کمزور (۷) تندرست ہو یا بیمار (۸) خوشی سے نکلو یا ناخوشی سے (۹) خواہ غنی ہو یا فقیر (۱۰) کاروبار دنیا سے فارغ ہو یا اس میں مشغول (۱۱) کھیتی باڑی سے فارغ ہو یا مشغول ہو (۱۲) بہادر ہو یا بزدل- خلاصہ یہ ہے کہ جب تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کے لیے بلائیں تو خواہ تم کسی حال میں ہو یا کسی کیفیت میں ہو، تم پر جہاد کے لیے جانا واجب ہے۔

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت لیس علی الاعمی حرج- (الفتح:۱۷) "اندھے پر کوئی گناہ نہیں" سے منسوخ ہے اور بعض نے کہا یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً- (التوبہ:۱۲۲) اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سب مسلمان ایک ساتھ نکل کھڑے ہوں-

اور تحقیق یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں ہے اور اس آیت کا یہ معنی نہیں ہے کہ تمام مسلمان جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوں خواہ وہ معذور ہوں یا غیر معذور بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب جن مسلمانوں کو جہاد کے لیے بلائیں تو ان کا جہاد کے لیے جانا واجب ہے خواہ وہ کسی حالت یا کسی صفت پر ہوں۔

جہاد کی اقسام

نیز اس آیت میں فرمایا ہے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو، اس آیت کا محمل یہ ہے کہ جس کے پاس مال بھی ہو اور اس کا بدن بھی تندرست اور قوی ہو تو وہ اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کرے اور جس کے پاس مال نہ ہو لیکن وہ توانا اور تندرست ہو تو وہ اپنی جان کے ساتھ جہاد کرے اور جس کا بدن کمزور ہو یا وہ بیمار یا معذور ہو لیکن مالدار ہو تو وہ اپنے مال کے ساتھ جہاد کرے، حدیث میں ہے:

حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے کسی غازی کو اللہ کی راہ میں سامان دیا تو اس نے بھی جہاد کیا، اور جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کسی غازی کے پیچھے اس کے گھر کی دیکھ بھال کی اور ان کے ساتھ نیکی کی تو اس نے بھی جہاد کیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۸۴۳، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۸۹۵، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۲۵۰۹، سنن الترمذی: ۱۶۲۷)

جہاد کی پہلی قسم فرض عین ہے، اور یہ اس وقت ہے کہ جب دشمن اسلام مسلمانوں کے کسی شہر پر حملہ کر کے اس پر غلبہ حاصل کرے، اس وقت اس شہر کے تمام لوگوں پر جہاد کرنا فرض عین ہے خواہ نہتے ہوں یا مسلح، جوان ہوں یا بوڑھے، اگر اس شہر کے لوگ دشمن سے مقابلہ کے لیے ناکافی ہوں تو اس سے متصل شہر کے مسلمانوں پر دشمن سے جہاد کرنا فرض عین ہے وعلی ھذا القیاس۔

جہاد کی دوسری قسم فرض کفایہ ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے امیر پر واجب ہے کہ وہ سال میں ایک مرتبہ تبلیغ اسلام کے لیے جہاد کرے حتیٰ کہ مخالفین اسلام میں داخل ہوں یا ذلت کے ساتھ جزیہ دیں۔

الانفال: ۶۰-۷۰ میں ہم نے جہاد سے متعلق تمام امور پر مفصل گفتگو کی ہے، اس موضوع کو وہاں دیکھ لیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے رسول مکرم! آپ نے جس طرف نکلنے کے لیے کہا تھا) اگر وہ سہل الحصول مال ہوتا اور متوسط سفر ہوتا تو (یہ منافقین) ضرور آپ کے پیچھے چل پڑتے لیکن دور دراز کا سفر ان کو بھاری لگا، اور عنقریب یہ اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم میں طاقت ہوتی تو ہم ضرور آپ کے ساتھ روانہ ہوتے، وہ اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اور

اللہ جانتا ہے کہ بے شک وہ ضرور جھوٹے ہیں○ (التوبہ: ۴۲)

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل

یہ آیت ان منافقین کے متعلق نازل ہوئی ہے جو غزوۂ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں گئے تھے، اور اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مسافت قریب ہوتی اور مال غنیمت کے منافع ملنے کا ظن غالب ہوتا تو یہ منافقین ان منافع کے لالچ میں آپ کے ساتھ ضرور جاتے لیکن ایک تو سفر بہت دور کا تھا، دوسرے ان کے خیال میں رومی بہت طاقتور اور تعداد میں بہت زیادہ تھے اس لیے مسلمانوں کا ان پر غالب آنا اور ان سے مال غنیمت حاصل کرنا بہت مشکل تھا اس وجہ سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس سفر میں نہیں گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ جب آپ جہاد سے لوٹ کر آئیں گے تو یہ قسمیں کھا کر کہیں گے کہ اگر ہمیں طاقت ہوتی تو ہم ضرور آپ کے ساتھ جاتے اور یہ ابتداءً کہیں گے تاکہ ان کے لیے غزوۂ تبوک میں نہ جانے کا عذر ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انہوں نے کذب اور نفاق کی وجہ سے جو جھوٹی قسمیں کھائی ہیں اس کی وجہ سے یہ اللہ کے عذاب میں ہلاک ہو جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے ذریعہ پہلے ہی خبر دے دی تھی کہ یہ عنقریب قسمیں کھائیں گے سو یہ غیب کی خبر ہے اور پیش گوئی ہے اور پھر بعد میں انہوں نے قسمیں کھائیں اور آپ کی پیش گوئی سچی ہوگئی اور یہ آپ کی نبوت کے صدق پر دو طرح دلیل ہے: ایک آپ نے غیب کی خبر دی، دوسرے آپ کی پیش گوئی سچی ہوئی اور یہ عظیم پیش گوئی ہے، کیونکہ آپ نے ایسی پیش گوئی کی جس کا پورا ہونا یا نہ ہونا دشمن کے اختیار میں تھا۔ اگر منافقین بعد میں قسمیں نہ کھاتے تو آپ کی پیش گوئی جھوٹی ہو جاتی لیکن منافقین نے قسمیں کھائیں اور آپ کی پیش گوئی سچی ہوگئی۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ

اللہ آپ کو معاف فرمائے آپ نے انہیں (غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونے کی) کیوں اجازت دیدی (اگر آپ اجازت نہ دیتے) تو آپ کو

الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَا يَسْتَاْذِنُكَ

معلوم ہو جاتا کہ عذر پیش کرنے میں سچے کون ہیں اور آپ جھوٹوں کو جان لیتے ○ جو لوگ اللہ پر اور روزِ آخرت

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا

پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے میں

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾

(کبھی رخصت کی) اجازت نہیں طلب کریں گے اور اللہ متقین کو خوب جاننے والا ہے ○

اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

آپ سے وہی لوگ (جہاد میں رخصت کی) اجازت طلب کرتے ہیں جو اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان



الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾

نہیں رکھتے اور ان کے دلوں میں (اسلام کے متعلق) شکوک ہیں پس وہ اپنے شکوک میں حیران ہوتے رہیں گے ○

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ

اور اگر وہ (جہاد کے لیے) نکلنے کا ارادہ کرتے تو اس کے لیے زادِ راہ کی تیاری کرتے، لیکن اللہ کو ان کا

اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

نکلنا ناپسند تھا تو اس نے ان کو پست ہمت کر دیا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں (بیماروں اور عورتوں) کے ساتھ بیٹھے رہو ○

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَا اَوْضَعُوْا

اور اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے تو وہ تم میں فساد زیادہ پھیلاتے اور تم میں فتنہ ڈالنے کے لیے

خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَ

بہت تیزی کے ساتھ تم میں افواہیں پھیلاتے اور تم میں ان کے لیے باتیں سننے والے موجود ہیں اور

اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ

اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے ○ بے شک انہوں نے پہلے بھی (اوائل ہجرت میں) فتنہ پھیلانے کی کوشش کی

وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ

تھی اور انہوں نے آپ کے لیے کئی تدبیریں الٹ پلٹ کی تھیں حتیٰ کہ اللہ کی مدد آگئی اور اللہ کا دین غالب آگیا

وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا

اور وہ (اس کو) ناپسند کرنے والے تھے ○ اور ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ مجھے (جہاد سے رخصت کی) اجازت دیجئے اور مجھے

تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ م

آزمائش میں نہ ڈالیے، سنو! یہ فتنے میں گر چکے ہیں اور بے شک جہنم کافروں کو

بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾

ضرور محیط ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ آپ کو معاف فرمائے آپ نے انہیں (غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونے کی) کیوں اجازت دے دی، (اگر آپ اجازت نہ دیتے) تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ عُذر پیش کرنے میں سچے کون ہیں، اور آپ جھوٹوں کو جان لیتے○ (التوبہ: ۴۳)

شانِ نزول

منافقین کی ایک جماعت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ انہیں غزوۂ تبوک میں شامل ہونے سے رُخصت دی جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دے دی، اس موقع پر یہ آیت بصورت عتاب نازل ہوئی کہ آپ نے ان کو کیوں اجازت دی، اور عتاب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ آپ کو معاف فرمائے تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دل مطمئن رہے۔

عفا اللہ عنک کے متعلق مفسرین سابقین کی تقاریر

امام فخرالدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ فرماتے ہیں:

منکرینِ عصمت انبیاء نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ انبیاء سے گناہ کا صدور ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ معاف کرنا گناہ کی فرع ہے اگر آپ نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا تو پھر معاف کرنے کا کیا معنی ہوا۔ قتادہ اور عمرو بن میمون نے کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو کام بغیر وحی کے کیے تھے: ایک منافقین کو غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونے کی اجازت دی اور دوسرا کام یہ تھا کہ آپ نے بدر کے قیدیوں سے فدیہ لیا۔

امام رازی نے اس اعتراض کے دو جواب دیئے ہیں: پہلا جواب یہ ہے کہ عفا اللہ عنک (اللہ آپ کو معاف فرمائے) کلام عرب میں تعظیم اور تکریم کا کلمہ ہے جس کو کلام کی ابتداء میں ذکر کیا جاتا ہے اور جو شخص متکلم کے نزدیک بہت معظم اور مکرم ہو اس کے متعلق کہتا ہے اللہ آپ کو معاف فرمائے آپ نے میرے معاملہ میں کیا کیا ہے، یا اللہ آپ سے راضی ہو میری بات کا کیا جواب ہے۔ لہٰذا اس آیت میں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے عفا اللہ عنک اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ نے کوئی گناہ کیا ہو۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منافقین کو جہاد میں شامل نہ ہونے کی اجازت دینا آیا گناہ تھا یا نہیں۔ اگر یہ گناہ تھا تو عفا اللہ عنک سے اللہ نے اس کو معاف فرما دیا تھا پھر کیوں فرمایا آپ نے ان کو اجازت کیوں دی، اور اگر یہ گناہ نہیں تھا تو یہ کیوں فرمایا اللہ نے آپ کو معاف فرما دیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر تقدیر پر آپ نے ان کو اجازت کیوں دی یہ فرمانا گناہ کو مستلزم نہیں ہے، لہٰذا اس قول کو ترکِ اولیٰ اور ترکِ اکمل پر محمول کیا جائے گا۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۵۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴ھ اس آیت کے متعلق لکھتے ہیں:

ابو محمد مکی نے کہا عفا اللہ عنک افتتاح کلام کا کلمہ ہے، جیسے کہتے ہیں اصلحک اللہ واعزک اللہ (اللہ تمہاری اصلاح کرے، اللہ تمہیں عزت دے)

علامہ سمرقندی نے بعض علماء سے نقل کیا ہے اس کا معنی ہے: اللہ آپ کو عافیت سے رکھے آپ نے ان کو کیوں اجازت دی اور اگر کلام اس طرح شروع ہوتا کہ آپ نے ان کو کیوں اجازت دی تو اس کا اندیشہ تھا کہ اس کلام کی ہیبت سے آپ کا قلب شق ہو جاتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے پہلے یہ ذکر فرمایا اللہ آپ کو معاف کرے تاکہ آپ کا دل مطمئن اور پُرسکون رہے پھر فرمایا آپ نے ان کو جہاد میں شامل نہ ہونے کی اجازت کیوں دی حتیٰ کہ آپ پر یہ منکشف ہو جاتا کہ کون اپنے

عُذر میں سچا ہے اور کون جھوٹا ہے، اور اس اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا مرتبہ ہے۔ نظفویہ نے کہا کہ بعض علماء کا یہ مذہب ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس آیت میں عتاب کیا گیا، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عتاب کیے جانے سے بہت بعید ہیں بلکہ آپ کو اختیار تھا کہ آپ ان کو اجازت دیں یا نہ دیں اور جب آپ نے اجازت دے دی تو اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ اگر آپ اجازت نہ دیتے پھر بھی یہ اپنے نفاق کی وجہ سے غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہوتے اور آپ کے اجازت دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ (الشفاء ج ۱ ص ۲۸، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں عفا اللہ عنک فرمانا ایسے ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: مجھے یوسف علیہ السلام کے کرم اور صبر پر تعجب ہے اور اللہ ان کی مغفرت فرمائے جب ان سے دُبلی اور موٹی گایوں کے متعلق سوال کیا گیا تھا اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو میں اس وقت تک ان کو خواب کی تعبیر نہ بتاتا جب تک ان سے یہ شرط نہ منوالیتا کہ وہ مجھ کو قید سے رہا کر دیں گے۔ (اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ حضرت یوسف کی مغفرت فرمائے اور پھر جس کام پر مغفرت کا ذکر فرمایا ہے وہ کوئی گناہ نہیں ہے، اسی طرح اس آیت میں جس کام کے متعلق عفا اللہ عنک فرمایا ہے وہ بھی کوئی گناہ نہیں ہے... سعیدی) عون بن عبد اللہ نے کہا: اس سے زیادہ حسین اور کون سا عتاب ہوگا جس میں اللہ تعالیٰ نے عتاب سے پہلے معاف کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔ (ہمارے نزدیک یہ حقیقتاً عتاب نہیں ہے صورتاً عتاب ہے... سعیدی غفرلہ) سفیان بن عیینہ نے کہا کہ یہ کیسا لطف ہے کہ پہلے معافی کا ذکر فرمایا پھر اس چیز کا ذکر فرمایا جس پر معافی دی۔ اس کے بعد علامہ آلوسی نے زمخشری پر سخت رد کیا ہے جس نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: یہ آپ کے جُرم سے کنایہ ہے۔ (الکشاف ج ۲ ص ۲۷۴)

(روح المعانی ج ۱۰ ص ۱۰۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ احمد خفاجی نے بھی امام رازی اور قاضی عیاض کی طرح تقریر کی ہے اور قاضی بیضاوی نے زمخشری کی اتباع میں جو یہ لکھا ہے کہ عفا اللہ عنک فرمانا اس بات سے کنایہ ہے کہ آپ کا اجازت دینا خطا تھی کیونکہ معاف کرنا خطا کی فرع ہے، علامہ خفاجی نے زمخشری اور بیضاوی دونوں کا رد بلیغ کیا ہے۔

(عنایت القاضی ج ۴ ص ۵۷۴ - ۵۷۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ)

علامہ محی الدین شیخ زادہ متوفی ۹۵۱ھ نے قاضی بیضاوی کی عبارت کی توجیہ کی ہے اور کہا ہے کہ قاضی بیضاوی کی خطا سے مراد اجتہادی خطا ہے اور اجتہادی خطا گناہ نہیں ہوتی بلکہ اس پر اجر ملتا ہے اور آپ کا یہ فعل ترکِ اولیٰ کے قبیل سے تھا۔

(حاشیہ شیخ زادہ علی البیضاوی ج ۴ ص ۴۶۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ نے لکھا ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب فرمایا ہے اور بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ آپ سے ترکِ اولیٰ صادر ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس خطاب میں عفو کو مقدم کیا جو صورتِ عتاب میں ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۸ ص ۸۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

عفا اللہ عنک کے متعلق مصنف کی تقریر

میرے نزدیک اس آیت کی تقریر اس طرح ہے کہ جس کام سے اللہ نے لازماً منع کیا ہو اس کام کا کرنا حرام اور گناہِ کبیرہ ہے اور جس کام سے اللہ نے لازماً منع نہ کیا ہو بلکہ ترجیحاً منع کیا ہو یعنی اس کا نہ کرنا راجح ہو تو اس کام کا کرنا گناہ تو نہیں لیکن مکروہ تنزیہی یا خلافِ اولیٰ ہے، اب اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے آپ کو منافقین کو اجازت دینے سے لازماً منع کیا ہوتا تو یہ فعل حرام اور

گناہ کبیرہ ہوگا اور اگر ترجیحاً منع کیا ہوتا تو گناہ تو نہ ہوتا مگر یہ فعل مکروہ تنزیہی یا خلافِ اولیٰ ہوتا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے پہلے آپ کو منع کیا ہی نہیں تھا تو آپ کا ان کو اجازت دینا کسی قسم کا گناہ ہے نہ یہ فعل مکروہ تنزیہی یا خلافِ اولیٰ ہے، بلکہ آپ کے لیے ان کو اجازت دینا یا نہ دینا دونوں فعل مباح تھے اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ سے محبت آمیز خطاب فرمایا ہے کہ اللہ آپ کو معاف فرمائے آپ نے ان کو جہاد میں شامل نہ ہونے کی کیوں اجازت دے دی حالانکہ اگر آپ اجازت نہ دیتے تو یہ پھر بھی جہاد میں شریک ہونے والے نہ تھے یعنی ان کے حق میں آپ کا اجازت دینا اور نہ دینا دونوں امر برابر تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو لوگ اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے میں (کبھی رخصت کی) اجازت طلب نہیں کریں گے، اور اللہ متقین کو خوب جاننے والا ہے○ (التوبہ: ٤٤)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جو لوگ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ آپ سے جہاد میں شامل نہ ہونے کی یا اپنے گھروں میں بیٹھنے کی اجازت طلب نہیں کریں گے، بلکہ جب بھی آپ کسی بات کا حکم دیں گے وہ اس کی تعمیل میں جھپٹ پڑیں گے اور اس وقت جہاد میں شامل نہ ہونے کی اجازت طلب کرنا علاماتِ نفاق سے تھا اسی لیے اس کے بعد فرمایا:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ سے وہی لوگ (جہاد میں رخصت کی) اجازت طلب کرتے ہیں جو اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دلوں میں (اسلام کے متعلق) شکوک ہیں، پس وہ اپنے شکوک میں حیران ہوتے رہیں گے○ (التوبہ: ٤٥)

اس آیت میں فرمایا ہے: ان کے دلوں میں شکوک ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شکوک کا محل قلب ہے اور جب شک کا محل قلب ہوگا تو معرفت اور ایمان کا محل بھی قلب ہوگا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ۔ (المجادلہ: ٢٢) یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو ثبت فرما دیا ہے۔

نیز فرمایا ہے: وہ اپنے شکوک میں حیران ہوتے رہیں گے، کیونکہ جس شخص کو کسی مسئلہ میں شک ہوتا ہے وہ نہ اس کی مخالف جانب کوئی حکم لگا سکتا ہے نہ موافق جانب اور وہ نفی اور اثبات کے درمیان متردد اور حیران رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر وہ (جہاد کے لیے) نکلنے کا ارادہ کرتے تو اس کے لیے زادِ راہ کی تیاری کرتے، لیکن اللہ کو ان کا نکلنا ناپسند تھا تو اس نے ان کو پست ہمت کر دیا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں (بیماروں اور عورتوں) کے ساتھ بیٹھے رہو○ (التوبہ: ٤٦)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر منافقین کا جہاد کرنے کا ارادہ ہوتا تو وہ اس کے لیے زادِ راہ کی تیاری کرتے اور سامانِ سفر جمع کرتے اور ان کا سامانِ سفر کی تیاری نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ غزوۂ تبوک میں شامل ہونا نہیں چاہتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ ان کے جہاد میں نکلنے کو ناپسند کرتا تھا تو اس نے ان پر بزدلی طاری کر کے ان کو جہاد میں شامل ہونے سے روک دیا، تثبیط کے معنی ہیں کسی شخص کو اس کے ارادہ پر عمل کرنے سے روک دینا اور ان سے کہا گیا کہ تم بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھ جاؤ، بیٹھنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو جہاد میں شامل ہونے سے معذور ہوں، جیسے اندھے، اپاہج، بیمار، عورتیں اور بچے، اس میں اختلاف ہے کہ ان سے یہ کہنے والا کون تھا، ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے خود ایک دوسرے سے یہ کہا تھا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھ جاؤ، دوسرا قول یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ناراض ہو کر فرمایا تھا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھ جاؤ، انہوں نے آپ کے اس قول کو حجت بنا لیا اور کہا ہمیں بیٹھنے کی اجازت مل گئی ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ اللہ نے یہ بات ان

کے دلوں میں ڈال دی تھی۔

جب منافقین کا جہاد کے لیے نکلنا اللہ کو ناپسند تھا تو ان کی مذمت کیوں کی گئی؟

حافظ محمد بن ابی بکر ابن القیم الجوزیہ متوفی ۷۵۱ھ لکھتے ہیں:

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر منافقین جہاد کے لیے نکلتے تو ان کا یہ فعل اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور عبادت ہوتا، تو اللہ عزوجل نے اپنی اطاعت کو کیسے ناپسند فرمایا، اور جب ایک چیز مکروہ ہو تو اس کی ضد محبوب ہوتی ہے، اور جب منافقین کا جہاد کے لیے نکلنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکروہ تھا تو اس کی ضد یعنی جہاد کے لیے نہ نکلنا اور مدینہ میں بیٹھے رہنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب قرار پایا اور جب ان کا جہاد کے لیے نہ جانا اور بیٹھے رہنا اللہ کے نزدیک محبوب تھا تو اللہ تعالیٰ ان کو جہاد کے لیے نہ نکلنے پر کیونکر عذاب دے گا، یہ بہت اہم سوال ہے اور مختلف فرقوں نے اس کے مختلف جواب دیئے ہیں:

جبریہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال کسی حکمت اور مصلحت پر موقوف نہیں ہوتے اور ہر ممکن اللہ کے لیے جائز ہے، اس لیے یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس فعل پر عذاب دے جو اللہ کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہو اور اس فعل پر عذاب نہ دے جو اس کے نزدیک مبغوض اور غیر پسندیدہ ہو، اور اللہ کے اعتبار سے سب کچھ جائز ہے۔

اور قدریہ (معتزلہ) نے اپنے قواعد کے مطابق یہ جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جہاد کے لیے نکلنے سے حقیقتاً منع نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے آپ کو جہاد کے لیے نکلنے سے منع کیا اور روکا اور وہ کام کیا جو اللہ کا ارادہ نہ تھا، اور جب کہ ان کے نکلنے میں خرابی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کے لیے نکلنے کی کراہت اور ناپسندیدگی ڈال دی اور اللہ تعالیٰ کا ان کے دلوں میں کراہت کا ڈالنا اس کی مشیت کی کراہت ہے اور خود اللہ تعالیٰ کو ان کا نکلنا ناپسند نہیں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جہاد کے لیے نکلنے کا حکم دیا تھا، اللہ تعالیٰ ان کو اس چیز کا حکم کیسے دے گا جس کو وہ ناپسند کرتا ہو، خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا "لیکن اللہ کو ان کا نکلنا ناپسند تھا" اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نکلنے کی ناپسندیدگی اور کراہت ڈال دی جب کہ اللہ تعالیٰ کو ان کا نکلنا پسند تھا۔

جس شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ نے علم کی نورانیت رکھی ہو اس پر ان دونوں جوابوں کا فساد مخفی نہیں ہے، اور اس اعتراض کا صحیح جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منافقین کو جہاد کے لیے نکلنے کا حکم دیا اور ان کا جہاد کے لیے نکلنا اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت تھا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع تھا، اور آپ کی اور مومنین کے لیے نصرت تھی، اور ان کا یہ عمل محبوب اور پسندیدہ تھا، لیکن اللہ سبحانہ کو یہ علم تھا کہ اگر یہ جہاد کے لیے نکلے تو ان کی نیت اللہ کی رضاجوئی، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور مسلمانوں کی نصرت نہیں ہوگی، بلکہ ان کا نکلنا اس لیے ہوگا کہ وہ راستہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کریں، اِدھر کی اُدھر لگائیں اور مسلمانوں میں فساد ڈالنے کی کوشش کریں اور ان کا مطمع نظر یہ ہوگا کہ کسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو ناکام کیا جائے اور اس جہاد میں مسلمانوں کو شکست سے دوچار کیا جائے، اس لیے ان کا جہاد کے لیے نکلنا اگرچہ بظاہر اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اتباع تھا لیکن درحقیقت ان کا نکلنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی بدخواہی پر مبنی تھا اور ان کا نکلنا اس چیز کو مستلزم تھا جو اللہ کے نزدیک مکروہ اور مبغوض تھی سو ان کا نکلنا اس اعتبار سے اللہ کے نزدیک مکروہ اور ناپسندیدہ تھا اور جس اعتبار سے مسلمان جہاد کے لیے نکلے تھے اس اعتبار سے ان کا نکلنا محبوب اور پسندیدہ تھا، اور اللہ کو علم تھا کہ منافقین نے اسی اعتبار سے جہاد کے لیے نکلنا تھا جو اللہ کو ناپسندیدہ اور مبغوض ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کو ان کا نکلنا ناپسند تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی اس لیے مذمت کی کہ جس طرح ان کو

جہاد کے لیے نکلنا چاہیے تھا وہ اس طرح جہاد کے لیے نہیں نکلے اور ان کے اس طرح نہ نکلنے اور بیٹھے رہنے کی وجہ سے ان کو عذاب دے گا۔ اس بنا پر جواب میں یہ کہا جائے گا کہ ان کو جہاد کے لیے جس طرح نکلنا چاہیے تھا اس طرح ان کا نہ نکلنا اللہ کو مبغوض اور ناپسندیدہ ہے اور اس کی ضد ہے جہاد کے لیے اس طریقہ سے نکلنا یہ اللہ کو پسندیدہ ہے لیکن وہ اس طرح نہیں نکلنا چاہتے تھے، وہ برِبناء فساد جہاد کے لیے نکلنا چاہتے تھے اور یہ نکلنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض اور ناپسندیدہ تھا، غرض یہ کہ ان کا جہاد کے لیے نکلنا بھی ناپسندیدہ تھا اور نہ نکلنا بھی اللہ کے حکم کی خلاف ورزی اور موجبِ عذاب تھا۔

تمام مخلوق میں نیکی کی صلاحیت کیوں نہیں پیدا کی گئی

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اللہ نے ان کو ایسی توفیق کیوں نہ دی کہ وہ جہاد کے لیے اس طرح نکلتے جس طرح نکلنا اللہ کو محبوب اور پسندیدہ تھا اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ غیر محل اور غیر اہل میں اپنی توفیق نہیں رکھتا، اللہ تعالیٰ کو خوب علم ہے کہ اس نے اپنی ہدایت، اپنی توفیق اور اپنے فضل کو کہاں رکھنا ہے اور ہر محل اس کی صلاحیت نہیں رکھتا، اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر محل میں ہدایت اور توفیق کی صلاحیت کیوں نہ پیدا کر دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کمال ربوبیت اور عالمِ خلق اور امر میں اس کے اسماء اور صفات کا ظہور اس بات سے انکار کرتا ہے اور اگر اللہ سبحانہ ایسا کرتا تو یہ اس کو محبوب ہوتا کیونکہ وہ اس کو پسند کرتا ہے کہ اس کا ذکر کیا جائے اور اس کا شکر ادا کیا جائے اور اس کی اطاعت کی جائے، اس کی توحید بیان کی جائے اور اس کی عبادت کی جائے لیکن ایسا کرنا اس سے زیادہ محبوب چیز کے فوت ہونے کا باعث تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اس کے دشمنوں سے جہاد کیا جائے اور ان سے انتقام لیا جائے اور اس کے اولیاء کے مرتبہ اور شرف کا اظہار کیا جائے اور ان کے فضل کی تخصیص کی جائے اور وہ اپنی جانوں کو اللہ کے دشمنوں سے جنگ میں خرچ کریں اور اللہ کی عزت، قدرت اور سطوت کا ظہور ہو اور اس کی زبردست پکڑ اور اس کے دردناک عذاب کا اظہار ہو، اس کے علاوہ اور بے شمار حکمتیں ہیں جن تک مخلوق کے علم اور عقل کی رسائی نہیں ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جبراً ہر شخص میں ہدایت اور توفیق نہیں پیدا کی۔ (بدائع التفسیر ج ۲ ص ۳۵۷-۳۵۵، مطبوعہ دار ابن الجوزیہ ریاض، ۱۴۱۴ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے تو وہ تم میں فساد زیادہ پھیلاتے اور تم میں فتنہ ڈالنے کے لیے بہت تیزی کے ساتھ تم میں افواہیں پھیلاتے اور تم میں ان کے لیے باتیں سننے والے موجود ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے ○ (التوبہ: ۴۷)

خبال کے معنی ہیں فساد ڈالنا، چغلی کرنا، لوگوں کے درمیان پھوٹ ڈالنا۔ اس آیت میں مومنوں کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر منافقین تمہارے ساتھ جہاد کے لیے نہیں گئے تو یہ بآل کار تمہارے لیے بہتر ہوا، کیونکہ اگر وہ تمہارے ساتھ جاتے تو فساد ڈالتے، چغلیاں کرتے اور تم کو ایک دوسرے سے لڑانے کی کوشش کرتے اور فتنہ ڈالنے کے لیے بہت تیزی سے افواہیں پھیلاتے، نیز فرمایا ہے اور تم میں ان کے لیے باتیں سننے والے موجود ہیں، اس کا معنی یہ ہے کہ تمہارے اندر ان کے جاسوس موجود ہیں جو تمہاری خبریں ان تک پہنچاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک انہوں نے پہلے بھی (اوائل ہجرت میں) فتنہ پھیلانے کی کوشش کی تھی اور انہوں نے آپ کے لیے کئی تدبیریں اُلٹ پلٹ کی تھیں حتیٰ کہ اللہ کی مدد آگئی اور اللہ کا دین غالب آگیا اور وہ (اس کو) ناپسند کرنے والے تھے ○ (التوبہ: ۴۸)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے رسول مکرم! یہ منافقین اس سے پہلے بھی ایسی سازشیں کرتے تھے

جس کے نتیجہ میں آپ کے اصحاب آپ کے دین سے پھر جائیں، جیسے جنگِ احد میں عبداللہ بن ابی عین معرکہ کے وقت اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر میدانِ کارزار سے نکل گیا، اور وہ آپ کے دین کو اور آپ کی مہم کو ناکام کرنے کے لیے مختلف سازشیں کرتے رہے ہیں حتیٰ کہ اللہ کی مدد آگئی اور اللہ کا دین غالب آگیا، اسی طرح اب بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے اصحاب کو رومیوں کے مقابلہ میں فتح اور نصرت عطا فرمائی اور آپ تبوک سے کامیاب و کامران ہو کر واپس آئے اور تبوک کی عیسائی ریاستوں نے آپ کا باج گزار بننا قبول کر لیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ مجھے (جہاد سے رخصت کی) اجازت دیجئے اور مجھے آزمائش میں نہ ڈالیے۔ سنو، یہ فتنے میں گر چکے ہیں اور بے شک جہنم کافروں کو ضرور محیط ہے○ (التوبہ: ۴۹)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا تو آپ نے جد بن قیس سے فرمایا: اے جد بن قیس! بنوالاصفر (زرد رو قوم) سے جہاد کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا: یارسول اللہ! میرے پاس عورتیں ہیں، اور جب میں بنوالاصفر کی عورتیں دیکھوں گا تو فتنہ میں پڑ جاؤں گا تو آپ مجھے یہاں بیٹھنے کی اجازت دیں اور فتنہ میں نہ ڈالیں، تب اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: اور ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ مجھے (جہاد سے رخصت کی) اجازت دیجئے اور فتنہ میں نہ ڈالیے۔ (المعجم الکبیر ج ۱۲ رقم الحدیث: ۱۲۶۵۴، مجمع الزوائد ج ۷ ص ۳۰)

امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ عاصم بن عمر بن قتادہ سے روایت کرتے ہیں: جن دنوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کی تیاری فرما رہے تھے ایک دن آپ نے بنوسلمہ کے بھائی جد بن قیس سے فرمایا: اے جد! اس سال بنوالاصفر (زرد رو عیسائیوں) سے جہاد کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا: یارسول اللہ! کیا آپ مجھے اس سے اجازت دیں گے! اور مجھے فتنہ میں نہ ڈالیں، میری قوم کو معلوم ہے کہ میں عورتوں میں سب سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہوں اور جب میں بنوالاصفر کی عورتیں دیکھوں گا تو ان سے صبر نہیں کر سکوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اعراض فرمایا اور فرمایا: میں نے تم کو اجازت دی، تو اس موقع پر جد بن قیس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی کہ وہ کہتا ہے مجھے فتنہ میں نہ ڈالیے، سنو یہ فتنے میں گر چکے ہیں۔ یعنی اگر واقعی وہ بنوالاصفر کی عورتوں کے فتنہ سے ڈرتا تھا تو یہ فتنہ تو اس کو لاحق نہیں ہوا لیکن وہ اس سے بڑے فتنہ میں پڑ گیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شامل نہیں ہوا اور اس نے حضور کے حکم کے مقابلہ میں اپنی رائے کو ترجیح دی اور یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ (جامع البیان جز ۱۰ ص ۱۹۲-۱۹۱، مطبوعہ دارالفکر، بیروت)

إِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَإِنْ تُصِبْكَ مُصِيبَةٌ

اگر آپ کو کوئی بھلائی پہنچے (آسمانی مدد یا مالِ غنیمت) تو ان کو بُرا لگتا ہے، اور اگر آپ کو کوئی مصیبت پہنچے

يَقُولُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا

تو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو پہلے ہی احتیاط کر لی تھی (کہ جہاد میں نہیں گئے تھے) اور یہ خوشیاں

وَهُمْ فَرِحُونَ ﴿٥٠﴾ قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ

مناتے ہوئے لوٹتے ہیں ○ آپ کہیے کہ ہمیں ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہنچتی ماسوا اس کے جو

اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

اللہ نے ہمارے لیے مقدر کر دی ہے، وہی ہمارا مالک ہے، اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر

الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى

توکل کرنا چاہیے ○ آپ کہیے کہ تم ہماری دو بھلائیوں (فتح یا شہادت) میں سے ایک کا انتظار کر رہے ہو،

الْحُسْنَيَيْنِ ۖ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ

اور ہم تمہارے متعلق صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ تمہیں اپنے پاس سے

بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ

عذاب پہنچاتا ہے یا ہمارے ہاتھوں عذاب دلواتا ہے، سو تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی تمہارے ساتھ

مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾ قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ

انتظار کرنے والے ہیں ○ آپ کہیے کہ تم (اللہ کی راہ میں) خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے تم سے ہرگز قبول نہیں کیا

مِنْكُمْ ۖ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ

جائے گا، کیوں کہ تم فاسق لوگ ہو ○ ان کے خرچ کیے ہوئے کو صرف اس

تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ

وجہ سے قبول نہیں کیا گیا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کرتے تھے

وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا

اور صرف سستی اور کاہلی کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے آتے تھے اور (اللہ کی راہ میں) صرف ناخوشی سے

وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۖ

خرچ کرتے تھے ○ سو ان کے مال اور اولاد سے آپ متعجب نہ ہوں

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ

اللہ یہ ارادہ فرماتا ہے کہ ان کو ان کے مال اور ان کی اولاد کے سبب سے ان کو دنیا کی زندگی میں عذاب دے اور



تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ

ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کفر کرنے والے ہوں ○ اور وہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں

اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾

کہ بے شک وہ ضرور تم میں سے ہیں، حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں لیکن وہ تقیہ کرتے ہیں (کہ اگر تم ان سے مشرکوں جیسا سلوک نہ کرو) ○

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ

اگر انہیں کوئی پناہ کی جگہ مل جائے، یا تہ خانے یا دخول کی کوئی بھی جگہ تو وہ اس میں تیزی سے

وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ ۚ

رسیاں تڑاتے ہوئے گھس جائیں ○ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو صدقات کی تقسیم میں آپ پر اعتراض کرتے ہیں،

فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ

اگر ان کو ان صدقات سے دے دیا جائے تو وہ راضی ہو جاتے ہیں اور اگر ان کو ان صدقات سے نہ دیا جائے تو

يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ

وہ ناراض ہو جاتے ہیں ○ اور اگر وہ اس چیز پر راضی ہو جاتے جو ان کو اللہ اور اس کے رسول نے دی ہے،

وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ

اور کہتے کہ ہمیں اللہ کافی ہے، عنقریب اللہ اور اس کا رسول ہمیں اپنے فضل سے

ع ۱۳/۷ رَسُوْلُهٗۤ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع

عطا فرمائیں گے اور ہم اللہ ہی کی طرف رغبت کرنے والے ہیں (تو یہ ان کے لیے بہت بہتر ہوتا) ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اگر آپ کو کوئی بھلائی پہنچے (آسمانی مدد یا مالِ غنیمت) تو ان کو برا لگتا ہے، اور اگر آپ کو کوئی مصیبت پہنچے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو پہلے ہی احتیاط کر لی تھی، (کہ جہاد میں نہیں گئے تھے) اور یہ خوشیاں مناتے ہوئے لوٹتے ہیں ○ (التوبہ: ۵۰)

اس آیت میں منافقین کے خبث بواطن کی ایک اور نوع بیان فرمائی ہے، کہ بعض غزوات میں اگر آپ کو کامیابی حاصل ہو یا مالِ غنیمت حاصل ہو، یا جن بادشاہوں کے خلاف آپ نے جہاد کیا تھا وہ مطیع اور باج گزار ہو گئے ہوں تو ان کو برا لگتا ہے اور اگر مسلمانوں کو کوئی مصیبت یا پریشانی لاحق ہو تو اس پر یہ خوش ہوتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے

کہ بھلائی سے مراد جنگِ بدر میں مسلمانوں کی فتح ہے اور مصیبت سے مراد جنگِ احد میں مسلمانوں کی شکست ہے۔ اگر یہ روایت ثابت ہو تو اس آیت کو اسی معنی پر محمول کرنا واجب ہے ورنہ اس آیت میں عموم مراد لینا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ منافقین کو مسلمانوں کی ہر بھلائی سے رنج ہوتا تھا اور ان کو مسلمانوں کی ہر مصیبت سے خوشی ہوتی تھی۔

امام ابن جریر نے اس آیت کے شانِ نزول میں اپنی سند کے ساتھ اس حدیث کو روایت کیا ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جد بن قیس نے کہا کہ غزوۂ تبوک کے اس سفر میں مسلمانوں کو کوئی بھلائی پہنچی یعنی فتح حاصل ہوئی، تو اس کو اور دیگر منافقین کو بُرا لگے گا۔ (جامع البیان جز ۱۰ ص ۱۹۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہیے کہ ہمیں ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہنچتی ماسوا اس کے جو اللہ نے ہمارے لیے مقدر کر دی ہے، وہی ہمارا مالک ہے اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے ○ (التوبہ: ۵۱)

مسئلہ تقدیر

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم کو کوئی خیر یا شر، کوئی رنج یا راحت، کوئی سختی یا آسانی نہیں پہنچتی مگر وہ ہمارے لیے مقدر ہوتی ہے اور اللہ کے پاس لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہوتی ہے اور اس کے خلاف ہونا محال ہے، کیونکہ اللہ کو ازل میں علم تھا کہ بندے اپنے اختیار اور ارادہ سے کیا کریں گے اور کیا نہیں کریں گے اور اس نے اس کو لوحِ محفوظ میں لکھ دیا، اب اگر کوئی یہ کہے کہ اس کے خلاف ہو سکتا ہے تو گویا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ اللہ کے علم کے خلاف ہو سکتا ہے اور علم کے خلاف ہونا جہل ہے اور جہل اللہ کے لیے محال ہے، سو اللہ کے علم اور تقدیر کے خلاف ہونا بھی محال ہے۔

اس کے بعد فرمایا: اللہ ہمارا مالک ہے، اس میں یہ اشارہ ہے کہ انسان کے ارادہ اور اس کے فعل دونوں کو اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے، اب اگر کوئی یہ کہے کہ جب بندہ کا ارادہ بھی اللہ نے پیدا کیا ہے اور اس کا فعل بھی اللہ نے پیدا کیا ہے تو بندے کو بُرے کاموں پر عذاب اور نیک کاموں پر ثواب کیوں ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ ہمارا مالک ہے اور ہم اس کے مملوک ہیں اور مالک اپنی ملکیت میں جس طرح چاہے تصرف کرے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ مخلوق کے عام احوال میں یہی ہوتا ہے کہ جو شخص کسی چیز کا مالک ہو وہ اس میں جس طرح تصرف کرے کسی کو اس پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے تو اللہ عزوجل اپنی مخلوق میں جس طرح تصرف فرمائے اس پر کسی کو اعتراض کا کیا حق ہے۔

ابن دیلمی بیان کرتے ہیں کہ میرے دل میں تقدیر کے متعلق ایک شک پیدا ہوا اور مجھے یہ شک ہوا کہ اس سے میرا دین فاسد ہو جائے گا، میں حضرت ابی بن کعب کے پاس گیا۔ انہوں نے مجھے ایک حدیث سنائی اور کہا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی پوچھنا، حضرت عبداللہ نے بھی وہی حدیث سنائی اور کہا کہ حضرت حذیفہ سے بھی پوچھنا۔ انہوں نے بھی جواب میں وہی حدیث سنائی جو ان دونوں نے سنائی تھی اور کہا کہ حضرت زید بن ثابت کے پاس جاؤ۔ انہوں نے بھی وہی حدیث سنائی کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر اللہ تمام آسمان والوں اور تمام زمین والوں کو عذاب دے تو وہ ان کو عذاب دے گا اور یہ اس کا ظلم نہیں ہوگا، اور اگر وہ ان پر رحمت فرمائے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے بہتر ہے، اور اگر تمہارے پاس احد پہاڑ جتنا سونا ہو جس کو تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو تو اللہ اس کو تم سے اس وقت تک قبول نہیں کرے گا جب تک تم اللہ کی ہر تقدیر پر ایمان نہ لے آؤ، اور تم یہ یقین رکھو کہ تم کو جو چیز بھی پہنچی ہے وہ تم سے ٹل نہیں سکتی تھی اور جو چیز تم کو نہیں پہنچی وہ تم پر آ نہیں سکتی تھی اور اگر تم اس عقیدہ کے علاوہ کسی اور عقیدہ پر مرے تو دوزخ میں داخل ہو گے۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۷۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۶۹۹، مسند احمد ج ۸ رقم الحدیث: ۲۱۶۶۷)

متکلمین نے اس اشکال کو دُور کرنے کے لیے یہ کہا ہے کہ ارادہ کو اللہ تعالیٰ نے پیدا نہیں کیا بندہ اس کا خود احداث کرتا ہے' اور معتزلہ نے یہ کہا ہے کہ ارادہ کو بندہ خود پیدا کرتا ہے اور اعمال کو بھی خود پیدا کرتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے' اس میں ایک اشارہ یہ ہے کہ منافقین اور کفار دنیاوی اسباب پر توکل کرتے ہیں اس لیے ایمان والوں کو چاہیے کہ صرف اللہ پر توکل کریں' دوسرا اس میں یہ اشارہ ہے کہ ہرچند کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے لیکن مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر آس لگائے رکھیں اور ہرچند کہ ہو گا وہی جو تقدیر میں لکھا ہوا ہے لیکن بندوں کو چاہیے کہ وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار رہیں اور اس سے دعا کرنا نہ چھوڑیں کیونکہ دعا اور دوا بھی مقدرات میں سے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہیے کہ تم ہماری دو بھلائیوں (فتح یا شہادت) میں سے ایک کا انتظار کر رہے ہو' اور ہم تمہارے متعلق صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ تمہیں اپنے پاس سے عذاب پہنچاتا ہے یا ہمارے ہاتھوں عذاب دلواتا ہے' سو تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں○ (التوبہ: ۵۲)

مسلمانوں اور منافقوں کی دو حالتوں کی تفصیل

مسلمانوں کے مصائب پر منافقین جو خوشی کا اظہار کرتے تھے اس آیت میں اس کا دوسرا جواب ذکر فرمایا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمان جب میدانِ جہاد میں جاتا ہے تو اگر وہ مغلوب ہو کر قتل کر دیا جائے تو اس کو دنیا میں شہید کہا جاتا ہے اور موت کے بعد دنیا میں بھی اس کی بہت تکریم ہوتی ہے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے' وہ اپنی قبر میں جسمانی حیات کے ساتھ زندہ ہوتا ہے اور اس کی رُوح سبز پرندوں میں بیٹھ کر جنت کی کیاریوں میں سیر کرتی ہے اور اگر مسلمان میدانِ جنگ میں غالب ہو تو وہ فتح و کامرانی' مالِ غنیمت اور نیک نامی کے ساتھ لوٹتا ہے' اور منافق جب جہاد کے لیے نہیں جاتا اور گھر میں بیٹھ رہتا ہے تو دنیا میں وہ بزدلوں میں شمار ہوتا ہے اور اندھوں' اپاہجوں' بیماروں' کمزوروں' عورتوں اور بچوں کے ساتھ اس کا شمار ہوتا ہے' اور اس کے باوجود اس کو اپنی جان' مال اور اولاد کا خوف دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں ان کے نفاق کا پردہ چاک ہو گیا تو پھر ان کو مشرکوں کے ساتھ لاحق کر کے قتل کر دیا جائے گا۔ یہ وہ عذاب ہے جو مسلمانوں کے ہاتھوں ان کو لاحق ہو گا اور مرنے کے بعد ان کو قیامت میں دائمی عذاب ہو گا' پس منافق مسلمان کی جن دو حالتوں کا منتظر ہے ان میں سے ہر حالت عزت و تکریم کی حامل ہے اور مسلمان منافق کی جن دو حالتوں کا منتظر ہے وہ دنیا میں ذلت اور آخرت میں عذاب کی حالتیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہیے کہ تم اللہ کی راہ میں خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے تم سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ تم فاسق لوگ ہو○ ان کے خرچ کیے ہوئے کو صرف اس وجہ سے قبول نہیں کیا گیا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کرتے تھے اور صرف سستی اور کاہلی کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے آتے تھے اور (اللہ کی راہ میں) صرف ناخوشی سے خرچ کرتے تھے○ (التوبہ: ۵۴-۵۳)

شانِ نزول

امام ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے اس آیت کے شانِ نزول میں اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جد بن قیس نے کہا میں عورتوں کو دیکھ کر اپنے نفس پر ضبط نہیں کر سکتا' لیکن میں اپنے مال کے ساتھ آپ کی امداد کروں گا۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی کہ تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے'

تم سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ تم فاسق لوگ ہو۔

کافر کی زمانۂ کفر میں کی ہوئی نیکیوں پر اجر ملنے یا نہ ملنے کی تحقیق

کافر جب دنیا میں کوئی نیک کام کرتا ہے مثلاً رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کرے، کسی کے نقصان کی تلافی کرے، کسی مصیبت زدہ کی مدد کرے اور کسی بھوکے پیاسے کو کھلائے اور پلائے تو اس کو آخرت میں ان نیک کاموں کا اجر نہیں ملے گا البتہ ان نیکیوں کے عوض دنیا میں اس کو نعمتیں اور راحتیں دی جائیں گی، اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ابن جدعان زمانہ جاہلیت میں رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کرتا تھا اور مسکینوں کو کھلاتا تھا، کیا یہ کام اس کو نفع دیں گے؟ آپ نے فرمایا: (یہ کام) اس کو نفع نہیں دیں گے، اس نے ایک دن بھی یہ نہیں کہا اے اللہ! حساب کے دن میری خطاؤں کو بخش دینا۔

(صحیح مسلم، الایمان: ٣٦٥ (٢١٤) ٥٠٧، مسند احمد ج ٦ ص ١٢٠، ٩٣)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کسی مومن کی نیکی میں کوئی کمی نہیں کرے گا، اس کو اس نیکی کا عوض دنیا میں بھی دے گا اور آخرت میں بھی اس کو اجر دیا جائے گا اور رہا کافر تو اس نے اللہ کے لیے جو نیکیاں دنیا میں کی ہیں ان کا تمام عوض اللہ اس کو دنیا میں دے دے گا حتیٰ کہ جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو اس کے پاس کوئی نیکی نہیں ہوگی جس کا اس کو اجر دیا جائے۔ (صحیح مسلم، صفات المنافقین: ٥٦، (٢٨٠٨) ٦٩٥٦)

اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ کفر کی نیکیوں پر بھی اجر ملتا ہے:

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں زمانہ جاہلیت میں چند امور بطور عبادت کرتا تھا، کیا ان کا مجھ کو کچھ اجر ملے گا؟ تو ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے پہلے جو نیکیاں کی تھیں تم نے ان کو سلامت رکھا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٢٢٢٠، صحیح مسلم، الایمان: ١٩٤ (١٢٣) ٣١٦)

امام مسلم کی دوسری روایت (١٩٥) میں ہے: وہ صدقہ کرتے تھے، غلام آزاد کرتے تھے اور رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جو کافر کفر پر ہی مرے اس کو اس کی نیکیوں کا آخرت میں اجر نہیں ملتا اور جو کافر اسلام لے آئے اس کو زمانہ کفر کی نیکیوں کا اجر ملتا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کافر مسلمان ہو جائے اور مسلمان ہو کر نیک عمل کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی ہر پچھلی نیکی کو بھی لکھ لیتا ہے اور اس کے ہر پچھلے گناہ کو مٹا دیتا ہے اور اسلام کے بعد جو نیکی کرے گا اس کا اجر دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ملے گا، اور ایک گناہ کو ایک ہی لکھا جائے گا سوا اس کے کہ اللہ اس کو معاف کر دے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ٤١، سنن النسائی رقم الحدیث: ٥٠١٣)

اس پر پھر یہ اعتراض ہے کہ بعض کافر کفر پر مرے اور ان کو نیکیوں کا پھر بھی اجر دیا گیا جیسا کہ اس حدیث میں ہے:

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! کیا آپ نے ابوطالب کو کچھ نفع پہنچایا، وہ آپ کی حفاظت کرتا تھا اور آپ کا دفاع کرتا تھا اور آپ کی وجہ سے لوگوں پر غضب ناک ہوتا تھا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! وہ ٹخنوں تک آگ میں ہے اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوتا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٣٨٨٣، ٦٢٠٨، ٦٥٧٢، صحیح مسلم، الایمان: ٣٥٧، (٢٠٩) ٥٠٠)

اس کا جواب یہ ہے کہ جس کافر کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تعلق کی وجہ سے شفاعت فرمادیں اللہ تعالیٰ ان کے عذاب میں تخفیف فرمادیتا ہے جیسا کہ ابوطالب کے معاملہ میں ہوا اور جو کافر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اظہارِ محبت کا کوئی نیک عمل کرے اللہ تعالیٰ اس کو بھی محروم نہیں کرتا۔ حدیث میں ہے:

عروہ بیان کرتے ہیں کہ ثویبہ ابولہب کی لونڈی تھی۔ ابولہب نے اس کو آزاد کر دیا تھا، اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا تھا۔ جب ابولہب مرگیا تو اس کے بعض رشتہ داروں نے اس کو بہت بُرے حال میں دیکھا۔ اس سے پوچھا تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ ابولہب نے کہا تم سے جُدا ہونے کے بعد مجھے کوئی خیر نہیں ملی البتہ مجھے اس انگلی سے پلایا جاتا ہے کیونکہ میں نے ثویبہ کو آزاد کیا تھا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۱۰۱) محدث رزین کی روایت میں کچھ اضافہ ہے، عروہ نے کہا: ثویبہ ابولہب کی باندی تھی، اس باندی نے جب ابولہب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی بشارت دی تو اس نے اس کو آزاد کر دیا۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا تھا۔ جب ابولہب کفر پر مرا تو (حضرت) عباس (بن عبدالمطلب) نے اسلام لانے کے بعد اس کو خواب میں بُری حالت میں دیکھا، اس سے پوچھا تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ اس نے کہا: تمہارے بعد میں نے کسی بھلائی کو نہیں دیکھا، سوا اس کے کہ مجھے اس انگلی سے ہر پیر کی رات پلایا جاتا ہے، کیونکہ میں نے ثویبہ کو اس انگلی کے اشارے سے آزاد کیا تھا۔ (جمع الفوائد ص ۱۲۵-۱۲۴، رقم الحدیث: ۴۱۹۸)

ابوطالب اور ابولہب کے عذاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور آپ کے ساتھ اظہارِ محبت کے نیک عمل کی وجہ سے تخفیف کی گئی ہے لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ یہ حدیثیں قرآنِ مجید کی اس آیت کے خلاف ہیں جس میں کفار کے متعلق فرمایا ہے:

خَالِدِیْنَ فِیْهَا لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ○ (البقرہ: ۱۶۲)

کفار دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے ان کے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے عذاب میں کمیت اور مدت کے اعتبار سے تخفیف نہیں کی جائے گی اور جو تخفیف کی گئی ہے وہ کیفیت کے اعتبار سے ہے، دوسرا جواب یہ ہے کہ بطریق عدل ان کے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی اور جو تخفیف کی گئی ہے وہ بطریق فضل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس کافر نے زمانہ کفر میں کوئی نیکی کی ہو اور وہ پھر مسلمان ہو جائے یا وہ مسلمان تو نہیں ہوا لیکن اس کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شفاعت کی ہو یا اس نے آپ کی محبت میں کوئی نیک عمل کیا ہو تو اس کی نیکیوں پر اجر ملتا ہے یا اس کے عذاب میں تخفیف کر دی جاتی ہے، اور جو کافر کفر پر مرا ہو نہ اس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شفاعت کی ہو اور نہ اس نے آپ کی محبت میں کوئی نیک عمل کیا ہو، تو اس کی زمانہ کفر کی تمام نیکیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ قرآنِ مجید میں ہے:

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۔ (الفرقان: ۲۳)

ہم ان کے (نیک) کاموں کی طرف قصد فرمائیں گے پھر ہم انہیں فضا میں بکھرے ہوئے غبار کے باریک ذرے بنادیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے تصریح فرمادی ہے کہ ایمان کے بغیر کوئی نیک عمل مقبول نہیں ہوتا:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (النحل: ۹۷)

جس نے کوئی نیک عمل کیا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو ضرور پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رکھیں گے اور ہم ان کے کیے ہوئے نیک کاموں کا ان کو ضرور اجر عطا فرمائیں گے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور وہ صرف سستی اور کاہلی کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے آتے تھے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: اگر وہ لوگوں کے ساتھ ہوتے تو نماز پڑھ لیتے اور اگر اکیلے ہوتے تو نماز نہ پڑھتے' ایسا شخص نماز پڑھنے پر کسی اجر کی امید رکھتا ہے اور نہ نماز نہ پڑھنے سے اس کو کسی عذاب کا خوف ہوتا ہے' اور منافق عبادت کی ادائیگی میں کاہلی اور سستی پیدا کرتا ہے۔ اس آیت کی مکمل تفسیر النساء: ۱۴۲ میں بیان کی جاچکی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور اللہ کی راہ میں صرف ناخوشی سے خرچ کرتے تھے کیونکہ وہ زکوٰۃ اور صدقات کو جُرمانہ سمجھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو ان کے مال اور اولاد سے آپ متعجب نہ ہوں' اللہ یہ ارادہ فرماتا ہے کہ انہیں ان کے مال اور ان کی اولاد کے سبب سے ان کو دنیا کی زندگی میں عذاب دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کفر کرنے والے ہوں○ (التوبہ: ۵۵)

مال اور اولاد کا سبب عذاب ہونا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی تحقیر کی ہے اور یہ بیان فرمایا ہے کہ ان کو جو اللہ تعالیٰ نے مال اور اولاد کی کثرت عطا کی ہے وہ صرف اس لیے ہے کہ ان کو دنیا کی زندگی میں عذاب میں مبتلا فرمائے' دنیا کی زندگی میں ان پر جو مصائب آتے ہیں ان پر ان کو آخرت میں کوئی اجر نہیں ملتا' اس لیے یہ مصائب ان کے لیے محض عذاب ہیں' اس کے علاوہ شریعت نے ان کو زکوٰۃ اور دیگر صدقات واجبہ کی ادائیگی کا بھی مکلف کیا ہے جس کو وہ عذاب سمجھتے ہیں۔

جو شخص مال اور اولاد کی محبت میں مبتلا ہو وہ دن رات جائز اور ناجائز طریقہ سے مال اور دولت کو جمع کرنے میں لگا رہتا ہے اور جیسے جیسے اس کے دل میں مال اور اولاد کی محبت بڑھتی جاتی ہے وہ آخرت اور یادِ خدا سے غافل ہوتا جاتا ہے' جس شخص کے دل میں مال اور اولاد کی محبت نہ ہو بلکہ وہ دنیاوی امور سے بے رغبت اور بے پروا ہو اسے مرتے وقت اور دنیا سے جُدا ہوتے وقت کوئی تکلیف نہیں ہوتی' لیکن جو شخص مال و دولت اور اولاد سے شدت کے ساتھ محبت کرتا ہو اس پر موت بہت بھاری اور دُشوار ہوتی ہے۔ اس کا دل دنیا میں لگا ہوا ہوتا ہے اور اب وہ دنیا سے رُخصت ہوا چاہتا ہے' اسے یوں لگتا ہے جیسے وہ باغ سے نکل کر قید خانہ کی طرف جا رہا ہو اور اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی مجالس سے نکل کر تنہائی اور غربت کی جگہ جا رہا ہو تو اس کا رنج و غم بہت بڑھ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور وہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ بے شک وہ ضرور تم میں سے ہیں' حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں لیکن وہ تقیہ کرتے ہیں (کہ تم ان سے مشرکوں جیسا سلوک نہ کرو)○ اگر انہیں کوئی پناہ کی جگہ مل جائے یا تہ خانے یا دخول کی کوئی بھی جگہ تو وہ اس میں تیزی سے رسیاں تڑاتے ہوئے گھس جائیں○ (التوبہ: ۵۷-۵۶)

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ منافقین دنیا اور آخرت کی زندگی میں نقصان اٹھانے والے ہیں اور ان کے لیے آخرت میں کوئی اجر و ثواب نہیں ہے اور اس آیت سے پھر ان کے قبیح اوصاف اور بُرے کام بیان کرنے شروع فرمائے ہیں' چنانچہ فرمایا کہ وہ قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں یعنی تمہارے دینِ اسلام پر ہیں اور حالانکہ وہ دینِ اسلام پر قائم نہیں ہیں' وہ صرف اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنے پوشیدہ کفر کو ظاہر کر دیا تو ان کے ساتھ مشرکین جیسا سلوک ہوگا' ان کو قتل کر دیا جائے گا اور ان کا مال بطور مالِ غنیمت کے ضبط کر لیا جائے گا۔

دوسری آیت میں ملجاء سے مراد قلعے' اور مغارات سے مراد ہے پہاڑوں میں غار اور مدخل سے مراد ہے زمین

کے تہہ خانے--- اس آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ مسلمانوں سے اس قدر خوف زدہ ہیں کہ وہ جلد سے جلد مسلمانوں کی پہنچ اور ان کی گرفت سے نکلنا چاہتے ہیں، انہیں کوئی قلعہ مل جائے، یا کسی پہاڑ میں غار یا زمین کے نیچے کوئی تہہ خانہ تو وہ تیزی سے دوڑتے ہوئے اس میں گھس جائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو صدقات کی تقسیم میں آپ پر اعتراض کرتے ہیں، اگر ان کو ان صدقات سے دے دیا جائے تو یہ راضی ہو جاتے ہیں اور اگر ان کو ان صدقات سے نہ دیا جائے تو وہ ناراض ہو جاتے ہیںO (التوبہ: ۵۸)

لمز کے معنی ہیں کسی کو طعنہ دینا اور اس کے منہ پر اس کی بُرائی بیان کرنا اور ھمز کے معنی ہیں کسی کے پسِ پشت اس کی بُرائی بیان کرنا اور اس کی غیبت کرنا اور توسعًا ان کا ایک دوسرے پر بھی اطلاق آتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ منافقین صدقات کی تقسیم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کیا کرتے تھے، بکثرت احادیث میں ان منافقین کا ذکر کیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم پر اعتراض کرنے والوں کے متعلق احادیث

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حنین سے واپسی پر جعرانہ میں تھے، اسی اثناء میں ایک شخص آپ کے پاس آیا درآنحالیکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے کپڑے میں چاندی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مٹھی بھر بھر کر لوگوں کو دے رہے تھے، ایک شخص نے کہا: اے محمد! عدل کیجئے۔ آپ نے فرمایا: تمہیں عذاب ہو اگر میں عدل نہیں کروں گا تو کون عدل کرے گا، اگر میں عدل نہ کرتا تو میں (اپنے مشن میں) ناکام اور نامراد ہو جاتا۔ حضرت عمر بن الخطاب نے کہا: یارسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس شخص کو قتل کر دوں۔ آپ نے فرمایا: معاذ اللہ! کہیں لوگ یہ نہ کہیں کہ میں اپنے اصحاب کو قتل کرتا ہوں، یہ شخص اور اس کے اصحاب قرآن پڑھتے ہیں مگر قرآن ان کے گلوں سے نیچے نہیں اترتا اور یہ لوگ قرآن سے اس طرح صاف نکل جائیں گے جس طرح تیر نشانہ سے نکل جاتا ہے۔

(صحیح مسلم، الزکوٰۃ: ۱۴۲ (۱۰۶۳) صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۱۳۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۷۲، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۸۰۸۷، مسند احمد ج ۳ ص ۳۵۴۔ ۳۵۳)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کچھ تقسیم فرما رہے تھے کہ بنو تمیم سے ذوالخویصرہ نامی ایک شخص آیا اور اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! عدل کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تجھے عذاب ہو اگر میں عدل نہیں کروں گا تو اور کون عدل کرے گا! اگر میں عدل نہیں کروں گا تو میں (اپنے مشن میں) ناکام اور نامراد ہو جاؤں گا۔ حضرت عمر بن الخطاب نے کہا: یارسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اُڑا دوں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رہنے دو، کیونکہ اس کے ایسے ساتھی ہیں جن کی نمازوں کے مقابلہ میں تم اپنی نمازوں کو حقیر سمجھو گے، اور ان کے روزوں کے مقابلہ میں تم اپنے روزوں کو حقیر گردانو گے، یہ لوگ قرآن مجید پڑھیں گے لیکن وہ ان کے حلقوم سے نیچے نہیں اُترے گا، اور یہ لوگ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار سے اس طرح نکل جاتا ہے کہ تیرانداز تیر کے پھل کو دیکھتا ہے اور اس میں خون کا اثر نہیں ہوتا پھر پھل کی جڑ کو دیکھتا ہے تو اس میں بھی خون نہیں ہوتا، پھر اس کے پر کو دیکھتا ہے تو اس میں بھی کچھ نہیں ہوتا، حالانکہ تیر شکار کی بیٹ اور خون کے درمیان سے نکلتا ہے، ان لوگوں کی نشانی یہ ہے کہ ان میں ایک کالا آدمی ہوگا جس کا ایک شانہ عورت کے پستان کی طرح ہوگا، یا

جیسے ہلتا ہوا گوشت کا لوتھڑا ہو، یہ گروہ اس وقت ظاہر ہو گا جب لوگوں میں تفرقہ ہو گا۔ حضرت ابو سعید کہتے ہیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے قتال کیا اور میں اس وقت حضرت علی کے ساتھ تھا۔ حضرت علی نے اس آدمی کو تلاش کرنے کا حکم دیا۔ وہ مل گیا اور اس کو حضرت علی کے پاس لایا گیا اور میں نے اس شخص کو ان ہی صفات کے ساتھ پایا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی تھیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۶۱۶۳، صحیح مسلم، الزکوۃ: ۱۴۸ (۱۰۶۴) ۲۴۱۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۱۶۹، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۸۰۸۹)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یمن سے کچھ سونا بھیجا جس میں کچھ مٹی بھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ سونا چار آدمیوں میں تقسیم فرما دیا۔ اقرع بن حابس، حنظلی، عیینہ بن بدر الفزاری اور علقمہ بن علاثہ العامری، پھر بنو کلاب کے ایک شخص کو اور زید الخیر الطائی کو، پھر بنو نبہان کے ایک شخص کو۔ حضرت ابن مسعود کہتے ہیں کہ قریش ناراض ہو گئے کہ حضور نجد کے سرداروں کو دے رہے ہیں اور ہمیں چھوڑ رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ میں ان لوگوں کی تالیف قلب کروں۔ پھر ایک شخص آیا جس کی ڈاڑھی گھنی تھی، گال اُبھرے ہوئے تھے اور آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں، پیشانی اُونچی تھی اور سر منڈا ہوا تھا۔ اس نے کہا: اے محمد! اللہ سے ڈرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں گا تو پھر کون اللہ سے ڈرے گا، اللہ تعالیٰ نے مجھے زمین پر امین بنا کر بھیجا ہے اور تم مجھے امین نہیں مانتے، پھر وہ شخص پشت پھیر کر چل دیا۔ مسلمانوں میں سے ایک شخص نے اس کو قتل کرنے کی اجازت طلب کی، راوی کا گمان ہے وہ حضرت خالد بن ولید تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی نسل سے ایک ایسی قوم پیدا ہو گی جو قرآن پڑھے گی اور قرآن اس کے گلے سے نیچے نہیں اُترے گا، یہ لوگ مسلمانوں کو قتل کریں گے اور کافروں کو چھوڑ دیں گے اور یہ لوگ اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار سے نکل جاتا ہے، اگر میں ان لوگوں کو (یعنی ان کا زمانہ) پالیتا تو قوم عاد کی طرح ان کو قتل کر ڈالتا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۳۳۵۱، صحیح مسلم رقم الحدیث:۱۰۶۴، الزکوۃ: ۱۴۴، سنن ابو داؤد رقم الحدیث:۴۷۶۴، سنن النسائی رقم الحدیث:۴۱۱۲، مسند احمد ج ۳ ص ۴)

جس شخص نے آپ کی تقسیم پر اعتراض کیا آپ نے اس کو سزا کیوں نہیں دی؟

قاضی عیاض مالکی فرماتے ہیں: جس شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم پر اعتراض کیا تھا آپ نے اس کو قتل کرنے کی اجازت اس لیے نہیں دی کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو قتل کرتے ہیں کیونکہ وہ شخص منافق تھا اور مسلمانوں کی وضع اختیار کر کے رہتا تھا، آپ نے صبر کیا اور تحمل کیا اور دوسرے نو مسلموں کی تالیف کے لیے اس کو قتل نہیں فرمایا۔ اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر اور حلم اور مواضع تہمت سے بچنے کا ثبوت ہے۔

(اکمال المعلم بفوائد مسلم ج ۳ ص ۶۰۸، مطبوعہ دار الوفا بیروت، ۱۴۱۹ھ)

جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرے یا آپ کی شان میں گستاخی کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر اس پر ہم اس سے پہلے تفصیل سے لکھ چکے ہیں، اس کے لیے مطالعہ فرمائیں: الاعراف: ۱۵۷، التوبہ: ۱۲، شرح

صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۰۱۰-۱۰۰۰۔

جس شخص نے آپ کی تقسیم پر اعتراض کیا تھا اسی کی نسل سے خارجی پیدا ہوئے

اس حدیث میں یہ ذکر ہے کہ اس منافق کی نسل سے ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو مسلمانوں کو قتل کریں گے اور کافروں کو چھوڑ دیں گے۔ علامہ ابوالعباس احمد بن عمر بن ابراہیم مالکی قرطبی المتوفی ۶۵۶ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث میں یہ ثبوت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غیب کی خبر دیتے تھے کیونکہ آپ نے جو پیش گوئی کی تھی وہ حرف بحرف پوری ہوئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں خارجیوں کا ظہور ہوا جو کافروں کو چھوڑ کر مسلمانوں کو قتل کرتے تھے اور یہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر بہت قوی دلیل ہے۔ ان کا امام وہ شخص تھا جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ظلم اور ناانصافی کی نسبت کی، اگر اس میں ادنیٰ بصیرت ہوتی تو وہ جان لیتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ظلم اور بے انصافی کی نسبت کرنا اسی طرح جائز نہیں ہے جس طرح اللہ کی طرف ظلم اور بے انصافی کی نسبت جائز نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا مالک ہے اور اس پر کسی کا حق نہیں ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے متعلق بے انصافی اور ظلم کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانے والے ہیں تو جس طرح اللہ کے متعلق ظلم کا تصور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی ظلم اور بے انصافی کا تصور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آپ کا ہر قول اور فعل وحی کے مطابق ہوتا ہے۔ ان خارجیوں کی جہالت اور گمراہی کے لیے یہ کافی ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اصحاب کو کافر کہتے تھے جن کے صحتِ ایمان اور جنتی ہونے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت دی تھی، مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ (المفہم ج ۳ ص ۱۱۴)

خارجیوں کے ظہور کا سبب

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے یہ لوگ مسلمانوں کے بہترین فرقے کے خلاف خروج کریں گے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۱۶۳، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۰۶۴، الزکوٰۃ: ۱۴۸) علامہ قرطبی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

ان لوگوں نے اس وقت خروج کیا تھا جب مسلمان دو فرقوں میں بٹ گئے تھے: ایک فرقہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے کو درست قرار دیتا تھا اور ایک فرقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے کو درست قرار دیتا تھا اور ہر فریق دوسرے سے قتال کر رہا تھا اور اس گروہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا اور آپ کے ساتھ اکابر صحابہ تھے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ آپ ہی امام عادل تھے اور آپ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے افضل تھے بلکہ اس زمانہ میں ہر شخص سے افضل تھے، اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرقہ پر یہ صادق آتا ہے کہ وہ مسلمانوں کا سب سے بہتر فرقہ تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ان سے وہ جماعت قتال کرے گی جو مسلمانوں کی دو جماعتوں میں حق کے زیادہ قریب ہوگی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت نے ان سے قتال کیا لہٰذا ان ہی کا فرقہ مسلمانوں کے تمام فرقوں میں بہتر تھا۔ (المفہم ج ۳ ص ۱۱۷-۱۱۶)

خارجیوں کے متعلق اہلسنّت کا نظریہ

نیز علامہ قرطبی خارجیوں کے متعلق لکھتے ہیں:

ہمارے ائمہ نے خارجیوں کو کافر قرار دیا ہے اور بعض ائمہ نے اس میں توقف کیا ہے، لیکن اس باب کی احادیث کی روشنی میں پہلا قول درست ہے، اس قول کی بنا پر ان سے قتال کیا جائے گا اور ان کے اموال کو ضبط کر لیا جائے گا اور دوسرے

قول کی بنا پر ان میں سے بھاگنے والوں کا پیچھا نہیں کیا جائے گا اور نہ ان کے قیدیوں کو قتل کیا جائے گا اور نہ ان کا مال لوٹا جائے گا' اور یہ حکم اس وقت ہے جب یہ لوگ مسلمانوں کی مخالفت کریں اور ان کے اتحاد کی لاٹھی کو توڑیں اور بغاوت کا جھنڈا بلند کریں، لیکن ان میں سے جو شخص اپنی بدعت کو مخفی رکھے، اور بغاوت کا جھنڈا بلند نہ کرے، اس کی اس بدعت کو رد کرنے اور اس کو راہِ راست پر لانے کی پوری کوشش کی جائے گی اور اس سے قتال نہیں کیا جائے گا۔ (المفہم ج ۳ ص ۱۱۰)

خارجیوں کی علامت

حضرت سہل بن حنیف کی روایت میں ہے: یہ لوگ سر منڈایا کریں گے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۰۶۸، الزکوٰۃ: ۱۵۹) علامہ قرطبی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: ان لوگوں نے سر منڈانا اس لیے اختیار کیا کہ یہ ان کی دنیا سے بے رغبتی اور زہد کی علامت ہو جائے اور ان کی شناخت اور شعار بن جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے متعلق ارشاد ہے ان کی علامت سر منڈانا ہے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۶۶، مسند احمد ج ۳ ص ۶۴) یہ ان کی جہالت ہے کہ جس چیز میں زہد نہیں ہے یہ اس کو زہد شمار کرتے ہیں اور یہ اللہ کے دین میں بدعت ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کا طریقہ اس کے خلاف تھا اور کسی سے یہ مروی نہیں ہے کہ اس نے سر منڈانے کو اپنی شناخت بنالیا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال تھے جن میں آپ مانگ نکالتے تھے، اور کبھی آپ کے بال کانوں کی لو تک ہوتے اور کبھی اس سے زیادہ لمبے ہوتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جس کے بال ہوں وہ ان کی تکریم کرے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۶۶، مسند احمد ج ۳ ص ۶۴) اور امام مالک کے نزدیک احرام سے باہر آنے کے سوا یا کسی ضروری حاجت کے سوا سر منڈانا مکروہ ہے۔

(المفہم ج ۳ ص ۱۲۲، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر وہ اس چیز پر راضی ہو جاتے جو ان کو اللہ اور اس کے رسول نے دی ہے اور کہتے کہ ہمیں اللہ کافی ہے، عنقریب اللہ اور اس کا رسول ہمیں اپنے فضل سے عطا فرمائیں گے اور ہم اللہ ہی کی طرف رغبت کرنے والے ہیں (تو یہ ان کے لیے بہت بہتر ہوتا)○ (التوبہ: ۵۹)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت سے جتنا ان کو عطا فرمایا تھا اگر یہ لوگ اسی پر راضی ہو جاتے اور خواہ وہ مال کم ہوتا لیکن وہ اس پر خوش ہوتے اور یہ کہتے کہ ہمیں یہ مال کافی ہے، اور عنقریب ہمیں اللہ تعالیٰ کسی اور مالِ غنیمت سے عطا فرمائے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو دوبارہ اس مرتبہ سے زیادہ عطا فرمائیں گے اور ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے فضل و کرم کی طرف رغبت کرتے ہیں تو یہ ان کے حق میں زیادہ بہتر ہوتا۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص دنیا کی لذات کی وجہ سے دنیا کو طلب کرتا ہے یا دنیا برائے دنیا طلب کرتا ہے تو وہ نفاق کے خطرہ میں ہے اور جو شخص دنیا اس لیے طلب کرتا ہے کہ اس سے عبادات کی انجام دہی میں آسانی ہو، دین کی زیادہ اور موثر طریقہ سے تبلیغ کر سکے تو یہ مستحسن اور محمود ہے۔ نیز اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو جو کچھ عطا فرمائیں انہیں اس پر اور قضاء و قدر پر راضی رہنا چاہیے اور اپنی رضا کا زبان سے بھی اظہار کرنا چاہیے اور یہ کہنا چاہیے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور عبادات میں اس کا مقصود صرف اللہ کی رضا ہونا چاہیے۔

عذاب کے خوف، ثواب کے شوق اور محض رضاالٰہی کے لیے عبادت کرنے کے تین مراتب

امام رازی نے نقل کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک جماعت سے گزر ہوا جو اللہ کا ذکر کر رہی تھی۔ آپ نے پوچھا کہ تمہیں اللہ کے ذکر پر کس نے برانگیختہ کیا؟ انہوں نے کہا: اللہ کے عذاب کے خوف نے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے

فرمایا: تمہاری نیت درست ہے، پھر ایک اور جماعت کے پاس سے گزر ہوا جو اللہ کا ذکر کر رہی تھی، ان سے پوچھا کہ تم کو اس ذکر پر کس نے ترغیب دی؟ انہوں نے کہا: حصولِ ثواب نے۔ آپ نے فرمایا: تمہاری نیت صحیح ہے، پھر ایک تیسری قوم کے پاس سے گزر ہوا جو اللہ کا ذکر کر رہی تھی۔ آپ نے ان سے اس ذکر کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا: ہم عذاب کے خوف سے ذکر کر رہے ہیں نہ ثواب کے شوق میں ذکر کر رہے ہیں، ہم محض ذلتِ عبودیت کی وجہ سے اور عزتِ ربوبیت کی وجہ سے ذکر کر رہے ہیں اور اپنے دل کو اس کی معرفت سے مشرف کرنے کے لیے اور اپنی زبان کو اس کی صفاتِ قدسیہ کے الفاظ سے مکرم کرنے کے لیے اس کا ذکر کر رہے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تم ہی حقیقت میں حق رسیدہ ہو۔

(تفسیر کبیر ج ٦ ص ٧٧، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ١٤١٥ھ)

اس حکایت سے یہ مطلب نہیں اخذ کرنا چاہیے کہ انسان عذاب کے خوف اور ثواب کے شوق سے بالکل عبادت نہ کرے اور صرف اظہارِ عبودیت اور حصولِ رضا کے لیے عبادت کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن اور حدیث میں جو دوزخ کے عذاب کی شدت اور ہولناکی بیان کی ہے وہ عبث نہیں ہے اور قرآن اور حدیث میں جنت کی نعمتوں کا جو بکثرت ذکر فرمایا ہے وہ بھی بے فائدہ نہیں ہے اور بشمول ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سب نبیوں نے دوزخ کے عذاب سے نجات اور جنت کے حصول کی دعائیں کی ہیں، اس لیے انسان کو خدا کے سامنے بے باک اور جری نہیں بننا چاہیے اور دوزخ کے خوف سے بھی عبادت اور دعا کرنی چاہیے اور نہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے مستغنی ہونا چاہیے اور جنت کی طلب کے لیے بھی عبادت کرنا چاہیے اور کبھی کبھی اس کے دل میں یہ کیفیت بھی ہونی چاہیے کہ ثواب اور عذاب سے قطع نظر کر کے وہ اللہ کی عبادت صرف اس لیے کرے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور بندگی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے مولیٰ کی خدمت میں لگا رہے خواہ اس کو مولیٰ کچھ دے یا نہ دے اور اس کا مطمح نظر صرف یہ ہونا چاہیے کہ اس کا مولیٰ اس سے راضی رہے، یہی صراط مستقیم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عطا کرنے کی نسبت

اس آیت کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دینے اور عطا کرنے کی نسبت درست ہے اور اس کو شرک کہنا درست نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس کی ترغیب دی ہے کہ یوں کہنا چاہیے کہ عنقریب اللہ اور اس کا رسول ہمیں اپنے فضل سے عطا فرمائیں گے اور اللہ اور رسول کے دینے میں فرق ہے، اللہ بالذات عطا فرماتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی دی ہوئی طاقت، اس کے اذن اور اس کے حکم سے عطا فرماتے ہیں۔ قرآنِ مجید کی اور آیات میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عطا کرنے کی نسبت کی گئی ہے:

وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ۔ (التوبہ: ٧٤)

اور ان کو صرف یہ بات بُری لگی کہ ان کو اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ۔ (الاحزاب: ٣٧)

اور جب آپ اس شخص سے کہتے تھے جس پر اللہ نے انعام کیا اور آپ نے (بھی) اس پر انعام کیا۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ

زکوٰۃ کے مصارف صرف فقراء اور مساکین ہیں اور زکوٰۃ کی وصولیابی



عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ

پر مامور لوگ، اور جن کے دلوں کو اسلام کی طرف راغب کرنا مقصود ہو اور جن غلاموں کو آزاد کرنا ہو، اور مقروض لوگ

وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ

اور اللہ کی راہ میں اور مسافرین، یہ اللہ کی جانب سے ایک فریضہ ہے

وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٦٠﴾ وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ

اور اللہ بہت علم والا بے حد حکمت والا ہے ○ اور بعض منافقین نبی کو ایذا پہنچاتے ہیں

وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ ۚ قُلْ أُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ

اور کہتے ہیں کہ وہ کانوں کے کچے ہیں، آپ کہیے کہ وہ تمہاری بھلائی کے لیے ہر ایک کی بات سنتے ہیں وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں

وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ ۚ

اور مومنین کی باتوں کی تصدیق کرتے ہیں اور تم میں سے ایمان والوں کے لیے رحمت ہیں،

وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٦١﴾

اور جو لوگ رسول اللہ کو ایذاء پہنچاتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے ○○

يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ

(اے مسلمانو!) منافقین تمہیں راضی کرنے کے لیے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں حالانکہ اللہ اور اس کا رسول اس کے زیادہ حقدار تھے

أَن يُرْضُوهُ إِن كَانُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٦٢﴾ أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّهُ

کہ وہ ان کو راضی کرتے اگر وہ مومن تھے ○ کیا یہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ جو

مَن يُحَادِدِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَأَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا

اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے تو بے شک اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ

فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ ﴿٦٣﴾ يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ

ہمیشہ رہے گا یہ بہت بڑی رسوائی ہے ○ منافقین اس سے ڈرتے ہیں کہ

اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ
مسلمانوں پر ایسی سورت نازل ہو جائے گی جو مسلمانوں کو منافقوں کے دل کی باتوں کی خبر دے دے گی
قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾
آپ کہیے تم مذاق اڑاتے رہو، بے شک اللہ اس چیز کو ظاہر کرنے والا ہے جس سے تم ڈر رہے ہو ○
وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ؕ
اور اگر آپ ان سے (ان کے مذاق اڑانے کے متعلق) سوال کریں تو وہ ضرور یہ کہیں گے کہ ہم تو محض خوش طبعی اور دل لگی کرتے تھے
قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾
آپ کہیے کہ کیا تم اللہ کا اور اس کی آیتوں کا اور اس کے رسول کا مذاق اڑاتے تھے ○
لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ
اب عذر نہ پیش کرو، بے شک تم اپنے ایمان کے اظہار کے بعد کفر کر چکے ہو، اگر ہم تمہاری ایک جماعت سے
طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۶۶﴾ ع
(اس کی توبہ کی وجہ سے) درگزر کرلیں تو بیشک ہم دوسرے فریق کو عذاب دیں گے، کیونکہ وہ مجرم تھے (وہ کفر اور مذاق اڑانے پر اصرار کرتے تھے) ○

۱۴/۱۷

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: زکوٰۃ کے مصارف صرف فقراء اور مساکین ہیں اور زکوٰۃ کی وصولیابی پر مامور لوگ، اور جن کے دلوں کو اسلام کی طرف راغب کرنا مقصود ہو، اور جن غلاموں کو آزاد کرنا ہو، اور مقروض لوگ، اور اللہ کی راہ میں اور مسافرین، یہ اللہ کی جانب سے ایک فریضہ ہے اور اللہ بہت علم والا، بے حد حکمت والا ہے ○

(التوبہ: ۶۰)

آیاتِ سابقہ کے ساتھ ارتباط

اس سے پہلی آیتوں میں یہ بتایا تھا کہ منافقین زکوٰۃ اور صدقات کی تقسیم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے تھے، تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے مصارف کا بیان فرمایا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ کو اس کے مصارف میں تقسیم فرماتے ہیں اور زکوٰۃ اور صدقات میں سے اپنے نفس کے لیے کوئی چیز نہیں رکھتے، اس لیے زکوٰۃ کی تقسیم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن اور اعتراض کا کوئی جواز نہیں ہے۔

زکوٰۃ کا لغوی اور شرعی معنی، زکوٰۃ کا نصاب اور وجوبِ زکوٰۃ کی شرائط ہم البقرہ: ۴۳ میں بیان کر چکے ہیں، اس مقام پر ہم زکوٰۃ کی حکمتیں، زکوٰۃ کی مصلحتیں اور زکوٰۃ کے فوائد بیان کر رہے ہیں، ان میں سے بعض حکمتوں کا تعلق زکوٰۃ دینے والے کے ساتھ ہے اور بعض حکمتوں کا تعلق زکوٰۃ لینے والے کے ساتھ ہے۔

زکوٰۃ دینے والے کے حق میں زکوٰۃ کی حکمتیں اور مصلحتیں

امام ابو حامد محمد بن محمد غزالی متوفی ۵۰۵ھ نے زکوٰۃ کے حسب ذیل اسرار اور فوائد بیان فرمائے ہیں:

(۱) انسان جب کلمہ شہادت پڑھ لیتا ہے تو گویا وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔(البقرہ: ۱۶۵) اور جو لوگ ایمان لائے وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

یعنی مومن اپنی جان اور اپنے مال سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے، تو مسلمانوں پر جہاد فرض کرکے ان کی جان سے زیادہ محبت کو آزمایا گیا اور زکوٰۃ کو فرض کرکے ان کی مال سے زیادہ اللہ سے محبت کو آزمایا گیا' اور اللہ کی محبت میں مال خرچ کرنے والے مسلمانوں کے تین درجات ہیں:

(الف) وہ لوگ جو اللہ کی محبت میں سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے ہیں اور اپنے پاس ایک درہم اور ایک دینار بھی نہیں رکھتے اس لیے جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ دو سو درہم پر کتنی زکوٰۃ ہے تو وہ کہتے ہیں کہ عوام پر تو پانچ درہم زکوٰۃ ہے اور ہم پر تمام مال کو خرچ کرنا واجب ہے۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ اس دن اتفاق سے میرے پاس مال تھا' میں نے دل میں کہا اگر میں کسی دن حضرت ابوبکر پر سبقت کر سکتا ہوں تو وہ آج کا دن ہے۔ میں اپنا آدھا مال لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا' آپ نے پوچھا تم نے اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟ میں نے عرض کیا اتنا ہی مال ہے۔ حضرت عمر نے کہا پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے گھر کا تمام مال و متاع لے کر آ پہنچے۔ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تم نے اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا؟ حضرت ابوبکر نے کہا: میں نے ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑا ہے' تب میں نے دل میں کہا میں حضرت ابوبکر پر کبھی سبقت نہیں کر سکتا۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۶۷۸' سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۶۷۵' المستدرک ج ۱ ص ۴۱۴' سنن بیہقی ج ۴ ص ۱۸۱' کنز العمال رقم الحدیث: ۳۵۶۱۱' مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۶۰۲۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مکمل صدق کے مقام پر فائز تھے۔ انہوں نے اپنے پاس صرف اسی چیز کو رکھا جو انہیں سب سے زیادہ محبوب تھی اور وہ ان کے نزدیک اللہ اور اس کے رسول ہیں۔

(ب) دوسرا درجہ اس پہلے درجہ والوں سے کم ہے' یہ اپنے پاس مال کو بچا کر رکھتے ہیں تاکہ ان کی ضروریات کے موقع پر کام آئے اور جب نیک کاموں پر خرچ کرنے کے مواقع آئیں تو وہ مال کو خرچ کر سکیں' پس وہ مال کو اس لیے جمع کر کے رکھتے ہیں تاکہ ضرورت کے مواقع پر خرچ کر سکیں نہ کہ عیش و عشرت پر خرچ کرنے کے لیے اور یہ ضرورت سے زائد مال کو نیکی کے راستوں پر خرچ کرتے ہیں' اور یہ لوگ صرف زکوٰۃ کی مقدار پر اقتصار نہیں کرتے' اور تابعین میں سے نخعی' شعبی' عطا اور مجاہد کا یہ نظریہ ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور حقوق بھی ہیں' ان کا استدلال قرآن مجید کی درج ذیل آیتوں سے ہے:

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ۔(البقرہ: ۱۷۷) اور مال سے (طبعی) محبت کے باوجود (اللہ کی محبت میں) اپنا مال رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں اور غلام آزاد کرانے کے لیے دے' اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ - (المنافقون: ۱۰) اور جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے تم (ہماری راہ میں) خرچ کرو۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ - (الانفال: ۳) اور ہم نے ان کو جو رزق دیا ہے وہ اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔

(ج) اور تیسرا درجہ ان لوگوں کا ہے جو صرف مقدار واجب ادا کرنے پر اقتصار کرتے ہیں ان پر جتنی زکوٰۃ فرض ہے وہ صرف اتنی ہی ادا کرتے ہیں اس سے زیادہ نہ اس سے کم اور یہ سب سے کم مرتبہ ہے اور تمام عام لوگوں کا یہی طریقہ ہے کیونکہ وہ مال کی طرف مائل ہوتے ہیں اور مال خرچ کرنے میں بخل کرتے ہیں اور آخرت کے ساتھ ان کی محبت کمزور ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ۝ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ - (محمد: ۳۸-۳۷) اگر اللہ تم سے تمہارا مال طلب کرے تو تم بخل کرو گے اور وہ تمہارے دلوں کے زنگ کو ظاہر کردے گا ۝ ہاں تم ہی وہ لوگ ہو جن کو اللہ کی راہ میں خرچ کے لیے بلایا جاتا ہے تو تم میں سے کوئی بخل کرتا ہے اور جو بخل کرتا ہے وہ صرف اپنی جان سے ہی بخل کرتا ہے۔

(۲) زکوٰۃ ادا کرنے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے سے انسان سے بخل کی صفت زائل ہو جاتی ہے اور بخل سے نجات کی اللہ تعالیٰ نے مدح فرمائی ہے:

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ - (الحشر: ۹) اور جو لوگ اپنے نفس کے بخل سے بچائے گئے سو وہی لوگ کامیاب ہیں۔

نیز حدیث صحیح میں بھی بخل کی مذمت کی گئی ہے۔ حضرت ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم یہ دیکھو کہ بخل کی اطاعت کی جارہی ہے اور خواہش نفس کی اتباع کی جارہی ہے اور دنیا کو ترجیح دی جارہی ہے اور ہر شخص اپنی رائے کو اچھا سمجھ رہا ہے، تو تم عام لوگوں سے الگ ہو کر عزلت نشین ہو جاؤ۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۳۴۱، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۵۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۱۴)

(۳) زکوٰۃ ادا کرنے کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کر کے انسان اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کے بدن اور مال کی نعمت عطا فرمائی، عباداتِ بدنیہ انجام دے کر وہ نعمت بدن کا شکر ادا کرتا ہے اور زکوٰۃ ادا کر کے وہ نعمت مال کا شکر ادا کرتا ہے اور یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ وہ ایک فقیر کو دیکھے جس پر رزق کی تنگی ہو اور وہ اس سے سوال کرنے کا محتاج ہو، پھر اس کے دل میں رحم نہ آئے اور وہ اس بات پر اللہ کا شکر ادا نہ کرے کہ اللہ نے اس کو سوال کرنے سے اور دوسرے کی طرف محتاج ہونے سے مستغنی کر دیا ہے اور وہ اس ضرورت مند فقیر کو زکوٰۃ، عشر اور صدقہ و خیرات دے کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہ کرے۔ (احیاء علوم الدین ج۱ ص ۲۰۳-۲۰۲، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ)

اور امام فخرالدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

(۴) جب انسان کے پاس مال اس کی ضروریات سے بہت زیادہ ہوگا تو وہ اس مال سے اپنے عیش و عشرت کے ذرائع اور وسائل مہیا کرے گا اور یوں اس کا دل دنیا کی رنگینیوں میں اور دنیا کی مرغوب چیزوں اور لذتوں میں لگا رہے گا اور آخرت کی

طرف بالکل متوجہ نہیں ہوگا یا کم متوجہ ہوگا' اور وہ سوچے گا کہ عبادات اور نیک کاموں اور زکوٰۃ' عشر اور صدقہ و خیرات ادا کرنے سے اس کے مال میں کمی ہوگی اور اس وجہ سے وہ نیک کاموں میں اپنے مال کو بالکل خرچ نہیں کرے گا یا کم کرے گا۔

(۵) مال کی کثرت سے انسان میں غرور اور تکبر پیدا ہوگا اور سرکشی اور بغاوت پیدا ہوگی اور زکوٰۃ اور صدقات ادا کرنے سے اس کے تکبر اور سرکشی میں کمی ہوگی اور اس کا دل اللہ سے مغفرت طلب کرنے اور اس کی رضاجوئی کی طرف متوجہ ہوگا۔

(۶) جب انسان زکوٰۃ اور عشر ادا کرے گا اور صدقہ و خیرات کرے گا تو ضرورت مند لوگ اس کے لیے دعائیں کریں گے اور اس کی دعاؤں سے اس کا مال نقصان اور بربادی سے محفوظ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔ (الرعد: ۱۷)

اور رہی وہ چیز جو لوگوں کو نفع پہنچاتی ہے تو وہ زمین میں برقرار رہتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زکوٰۃ سے اپنے اموال کی حفاظت کرو' اور صدقات سے اپنے بیماروں کی دوا کرو اور مصائب کے لیے دعا کو تیار رکھو۔

(المعجم الکبیر ج ۱۰ رقم الحدیث: ۱۰۱۹۶' حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۱۰۴' ج ۴ ص ۲۳۷' المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۱۹۶۳' تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۳۴' حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کا ایک راوی متروک الحدیث ہے' مجمع الزوائد ج ۳ ص ۶۴' حافظ سیوطی نے کہا یہ حدیث ضعیف ہے' الجامع الصغیر ج ۱ رقم الحدیث: ۳۷۲۸)

(۷) مال بہت جلد ختم ہو جاتا ہے' لیکن جب انسان اس مال کو نیکی کی راہ میں خرچ کرے گا تو وہ نیکیاں باقی رہیں گی' دنیا میں ان کی تعریف کی جائے گی اور آخرت میں اجر ملے گا۔ ایک شخص نے کہا: کاش! میں اپنے تمام مال کو قبر میں لے جا سکتا! میں نے کہا: یہ ممکن ہے' تم اپنے تمام مال کو اللہ کی راہ میں اور اس کی رضا میں خرچ کر دو تم کو یہ مال قبر میں بھی ملے گا اور آخرت میں بھی۔

(۸) مال داروں کے پاس بہت زیادہ مال ان کی ضروریات سے زائد ان کی تجوریوں اور بینکوں میں معطل پڑا رہتا ہے اور فقراء اور ضرورت مندوں کے پاس اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی مال نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی حکمت اس کی متقاضی ہوئی کہ زکوٰۃ اور صدقات کے ذریعہ مال داروں کے زائد مال میں سے بقدرِ ضرورت زکوٰۃ اور صدقات کے ذریعہ ضرورت مندوں تک پہنچایا جائے۔

(۹) اگر مال دار ضرورت مندوں اور فقیروں کی مالی امداد نہ کریں تو ہو سکتا ہے کہ ضرورت مند فقراء اپنی تنگی اور فقر سے تنگ آ کر بغاوت پر اتر آئیں اور چوریاں' ڈاکے اور لوٹ مار اور بھتہ خوری شروع کر دیں اور زکوٰۃ اور صدقات کی ادائیگی کے ذریعہ اس بغاوت کا سدِباب ہو سکتا ہے۔

(۱۰) زکوٰۃ اور صدقات کی ادائیگی کر کے انسان اللہ کی مخلوق پر شفقت کرتا ہے اور ان کی پرورش کرتا ہے' ان کے لیے رزق فراہم کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت سے متصف ہوتا ہے اور انبیاء اور صالحین کے اخلاق سے متخلق ہوتا ہے۔

زکوٰۃ لینے والے کے حق میں زکوٰۃ کی حکمتیں اور مصلحتیں

(۱) مغیرہ بن عامر نے کہا: شکر نصف ایمان ہے اور صبر نصف ایمان ہے اور یقین مکمل ایمان ہے۔

(موسوعہ رسائل ابن ابی الدنیا ج ۳ ص ۳۰' مؤسسۃ الثقافیہ بیروت ۱۴۱۴ھ' شعب الایمان ج ۴ ص ۱۰۹' رقم الحدیث: ۴۴۴۸)

زکوٰۃ دینے والا اپنے مال کے کم ہونے پر صبر کرتا ہے اور ضرورت مند فقیر زکوٰۃ کی صورت میں مال لے کر شکر ادا کرتا ہے

یا یوں کہا جائے کہ مال دار نے پہلے مال ملنے پر اللہ کا شکر ادا کیا، پھر زکوٰۃ کی ادائیگی سے جو مال میں کمی ہوئی اس پر صبر کیا تو زکوٰۃ کی وجہ سے اس کا ایمان مکمل ہوگیا، اسی طرح حاجت مند فقیر نے پہلے مال نہ ہونے پر صبر کیا اور زکوٰۃ کی شکل میں مال ملنے پر اللہ کا شکر ادا کیا تو زکوٰۃ کی وجہ سے اس کا ایمان بھی مکمل ہوگیا- نیز حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص مصیبت میں مبتلا ہو تو اس نے صبر کیا اور اس کو نعمت دی گئی تو اس نے شکر ادا کیا، اس پر ظلم کیا گیا تو اس نے معاف کر دیا اور اس نے خود ظلم کیا تو اس پر استغفار کیا، پوچھا گیا اس کے لیے کیا اجر ہے؟ تو آپ نے فرمایا: یہی لوگ عذاب سے مامون ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں-

(۲) ہرچند کہ اللہ تعالیٰ نے غنی کو بہت مال دیا ہے اور فقیر کو مال نہیں دیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے غنی کو اس بات کا مکلف کیا ہے کہ وہ فقیر کو زکوٰۃ ادا کرے اور فقیر کا غنی پر احسان ہے کہ وہ اس سے زکوٰۃ قبول کر کے اس کو دوزخ کے عذاب سے چھڑاتا ہے، غنی کا فقیر کو زکوٰۃ دینے کی وجہ سے اس کی دنیا پر احسان ہے اور فقیر کا غنی کی آخرت پر احسان ہے اور اخروی احسان دنیاوی احسان سے زیادہ بڑا ہے-

(۳) اللہ تعالیٰ نے فقیر کو اس بات کا مکلف نہیں کیا کہ وہ غنی کے پاس جا کر اس سے زکوٰۃ مانگے، بلکہ غنی کو اس بات کا مکلف کیا ہے کہ وہ فقیر کے پاس جا کر زکوٰۃ ادا کرے- فقیر اپنی دنیا میں غنی کا محتاج ہے تو غنی اپنی آخرت میں فقیر کا محتاج ہے-

فقیر کا معنی

فقیر کا لفظ چار معانی میں استعمال ہوتا ہے:

(۱) حاجتِ ضروریہ کا وجود مثلاً جن کو غذا، لباس اور مکان کی حاجت ہو اور اس معنی میں ہر شخص فقیر ہے- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ-(فاطر: ۱۵) اے لوگو! تم سب اللہ کی طرف محتاج ہو-

(۲) جس شخص کے پاس مال جمع نہ ہو، فقہی اصطلاح میں جو شخص دو سو درہم (باون اعشاریہ ۵ تولہ چاندی) کا مالک نہ ہو یا اس کے پاس اس کی حاجت اصلیہ سے زائد دو سو درہم کے مساوی رقم نہ ہو اور وہ مستحق زکوٰۃ ہو، فقہاء احناف کے نزدیک فقیر کا یہی معنی ہے اور سورہ توبہ: ۶۰ میں یہی معنی مراد ہے، اسی طرح یہ آیت بھی ہے:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ- (البقرۃ: ۲۷۳)

(یہ خیرات) ان فقراء کا حق ہے جو خود کو اللہ کی راہ میں وقف کیے ہوئے ہیں جو (اس میں شدت اشتغال کی وجہ سے) زمین میں سفر کی طاقت نہیں رکھتے، ناواقفِ حال ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے ان کو غنی سمجھتا ہے-

(۳) نفس کا بہت زیادہ حریص ہونا، اس حدیث میں فقر اسی معنی میں ہے- یزید بن ابان رقاشی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قریب ہے کہ فقر (زیادہ حرص) کفر ہو جائے اور قریب ہے کہ حسد تقدیر پر غالب ہو جائے- (حلیۃ الاولیاء ج ۳ ص ۵۳، طبع قدیم، ج ۳ ص ۶۲-۶۱، رقم: ۳۱۶۹، طبع جدید، تاریخ اصفہان ج ۱ ص ۹۰، الضعفاء للعقیلی ج ۴ ص ۲۰۶، کنز العمال رقم الحدیث: ۱۶۶۸۲، مشکوۃ المصابیح رقم الحدیث: ۵۰۵۱، العلل المتناہیہ ج ۲ ص ۳۲۰) اور اس فقر کے مقابل غنی کا یہ معنی ہے: "غنی وہ شخص ہے جس کا دل غنی ہو-"

(۴) اللہ تعالیٰ کی طرف محتاج ہونا، قرآن مجید میں ہے:

فَقَالَ رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ۔ (القصص: ۲۴) موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! میں اس خیر و برکت کا محتاج ہوں جو تو نے میری طرف نازل کی ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی ہے: اے اللہ! مجھے اپنی طرف محتاج کر کے (دنیا سے) مستغنی کر دے اور اپنے آپ سے (یعنی اللہ سے) مستغنی کر کے مجھے (دنیا کا) محتاج نہ کر۔

(المفردات ج ۲ ص ۴۹۶-۴۹۵، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، ۱۴۱۸ھ)

مسکین کا معنی

مسکین کا معنی ہے جس کے پاس کوئی چیز نہ ہو اور یہ فقیر کی بہ نسبت زیادہ تنگ دست ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

اَمَّا السَّفِیۡنَۃُ فَکَانَتۡ لِمَسٰکِیۡنَ۔ (الکہف: ۷۹) رہی کشتی تو وہ مسکینوں کے لیے تھی۔

اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسکین کے پاس کوئی چیز ہوتی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ کشتی چھن جانے کے بعد ان کو مسکین فرمایا ہے، دوسرا جواب یہ ہے کہ ان پر اس قدر زیادہ غربت اور مسکینی تھی کہ اس کے مقابلہ میں اس کشتی کا ہونا لائق شمار نہ تھا۔ (المفردات ج ۱ ص ۳۱۲) اور علامہ طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ نے لکھا ہے کہ مسکین کا معنی ہے جس کے پاس کوئی چیز نہ ہو اور ایک قول یہ ہے کہ اس کے پاس تھوڑی سی چیز ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی ہے کہ اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ اور مجھے مسکینی کی حالت میں موت عطا فرما۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۵۲، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۱۲۶، سنن بیہقی ج ۷ ص ۱۲، المستدرک ج ۴ ص ۳۲۲) آپ نے اس سے تواضع کا ارادہ فرمایا اور یہ کہ آپ جبارین اور متکبرین میں سے نہ ہوں۔ (مجمع بحار الانوار ج ۳ ص ۹۶، مطبوعہ مدینہ منورہ، ۱۴۱۵ھ)

فقیر اور مسکین کے معنی میں مذاہب ائمہ اور تحقیق مقام

حسن بصری نے کہا: فقیر وہ ہے جو اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور مسکین وہ ہے جو سعی کرتا رہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: مساکین گھومنے پھرنے والے ہیں اور فقراء، فقراء مسلمین ہیں۔ جابر بن زید نے کہا: فقراء وہ ہیں جو سوال نہیں کرتے اور مساکین وہ ہیں جو سوال کرتے ہیں۔ زہری اور مجاہد کا بھی یہی قول ہے۔ قتادہ نے کہا: فقیر اپاہج ہے اور مسکین وہ ہے جو تندرست اور محتاج ہو، اور عکرمہ نے کہا کہ فقراء کا اطلاق فقراء مسلمین پر ہوتا ہے اور مساکین کا اطلاق، اہل کتاب کے مساکین پر ہوتا ہے۔ امام ابو جعفر طبری کا مختار یہ ہے کہ جو سوال نہیں کرتے وہ فقراء ہیں اور جو سوال کرتے ہیں وہ مساکین ہیں۔ (جامع البیان جز ۱۰ ص ۲۰۵-۲۰۲، ملخصاً، مطبوعہ بیروت)

امام ابو حنیفہ کے نزدیک فقیر وہ شخص ہے جس کے پاس کچھ مال ہو لیکن وہ نصابِ زکوٰۃ سے کم ہو، اور مسکین وہ شخص ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو، اور امام شافعی کا قول اس کے برعکس ہے اور امام مالک کے نزدیک فقیر اور مسکین مساوی ہیں، اور امام احمد کا مذہب بھی امام شافعی کی مثل ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۸ ص ۹۸-۹۶، عنایت القاضی ج ۴ ص ۵۸۶-۵۸۵، زاد المسیر ج ۳ ص ۴۵۶)

امام شافعی کی دلیل یہ ہے کہ مسکین کے متعلق قرآن مجید میں ہے: رہی کشتی تو وہ مسکینوں کے لیے تھی۔ (الکہف: ۷۹) اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسکین کے پاس کچھ مال ہوتا ہے، امام ابو حنیفہ کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ کشتی ان کی ملکیت نہیں تھی وہ اس کو کرائے پر چلاتے تھے یا انہوں نے اس کشتی کو عاریتاً لیا ہوا تھا، یا در اصل وہ فقیر تھے ان کو ازراہِ ترحم

مجازاً مسکین فرمایا۔ امام شافعی کا دوسرا استدلال اس حدیث سے ہے: حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: اے اللہ! مجھے بحالت مسکین زندہ رکھ اور بحالت مسکین مجھے موت عطا فرما، اور قیامت کے دن مساکین کی جماعت میں میرا حشر فرما۔ حضرت عائشہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! آپ نے یہ دعا کیوں کی ہے؟ آپ نے فرمایا: مساکین اغنیاء سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے، اے عائشہ! مسکین کو رد نہ کرو، خواہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی دو، اے عائشہ! مساکین سے محبت رکھو اور ان کو قریب رکھو، قیامت کے دن اللہ تمہیں قریب رکھے گا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۳۵۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۴۱۲۶، المستدرک ج ۴ ص ۳۲۲، سنن بیہقی ج ۷ ص ۱۲) اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکین کے حال میں رہنے کی دعا کی ہے اور ایک اور حدیث میں آپ نے فقر سے پناہ مانگی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کرتے تھے: اے اللہ! میں فقر، قلت اور ذلت سے تیری پناہ طلب کرتا ہوں، اے اللہ! میں ظلم کرنے یا ظلم سہنے سے تیری پناہ طلب کرتا ہوں۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۵۴۴، سنن النسائی رقم الحدیث:۵۴۷۵، صحیح البخاری رقم الحدیث:۶۳۶۸)

امام شافعی کی دلیل کا حاصل یہ ہے کہ اگر مسکین مالی طور پر فقیر سے کم ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فقر سے پناہ مانگیں اور مسکین ہونے کی دعا فرمائیں جو کہ فقیر سے زیادہ ابتر حال ہے اور یہ تناقض کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر سے پناہ مانگی ہے اس حدیث میں فقر سے مراد قلت مال نہیں ہے بلکہ اس سے مراد فقر النفس ہے یعنی وہ شخص جو مال پر بہت حریص ہو، اور اس فقر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا بھی فرماتے تھے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کرتے تھے: اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت، تقویٰ سوال سے بچنے اور غناء کا سوال کرتا ہوں۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۷۲۱، سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۴۸۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۳۸۳۲، الادب المفرد رقم الحدیث:۶۷۴، مسند احمد ج ۱ ص ۴۱۱) اور اس حدیث میں غنیٰ سے مراد کثرتِ مال نہیں ہے بلکہ اس سے غنی النفس مراد ہے یعنی نفس کا مستغنی ہونا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکین کے حال میں رہنے کی جو دعا کی ہے اس سے مراد آپ کی تواضع اور انکسار ہے۔ امام شافعی کی طرف سے یہ دلیل بھی دی گئی ہے کہ سورۂ توبہ کی اس آیت میں فقیر کو مسکین پر مقدم کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فقیر کا حال مسکین سے زیادہ بُرا ہوتا ہے اور فقیر وہ ہے جس کے پاس بالکل مال نہ ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ کچھ مال ہو۔ اس کا یہ جواب ہے کہ تقدم کے کئی اعتبار ہوتے ہیں اور یہاں تقدم ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کے طور پر ہے، پہلے فقیر کا ذکر کیا جس کے پاس کچھ مالیت ہوتی ہے، اس کے بعد مسکین کا ذکر کیا جس کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا اور مسکین کے اس معنی پر امام ابوحنیفہ کی طرف سے یہ دلیل دی جاتی ہے: مسکینا ذا متربة۔ (البلد: ۱۶) یعنی مسکین وہ شخص ہے جس نے بھوک کی شدت سے اپنا پیٹ زمین سے چمٹایا ہوا ہے۔

والعاملین علیہا کا معنیٰ اور اس کے شرعی احکام

یعنی جو لوگ زکوٰۃ اور صدقات کو وصول کر کے لاتے ہیں ان کو ان کی محنت اور مشقت کے مطابق مالِ زکوٰۃ سے اُجرت دی جائے لیکن یہ اُجرت اتنی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ زکوٰۃ کی وصول کردہ تمام رقم یا اس کے نصف پر محیط ہو۔ (عنایت القاضی ج ۴ ص ۵۸۷) اگر عامل کو اس مہم کے دوران کوئی شخص ذاتی طور پر کچھ ہدیہ اور تحفہ دے تو وہ اس کے لیے جائز نہیں ہے، وہ اس کو بھی وصول شدہ زکوٰۃ کی مد میں شامل کر دے۔

حضرت ابو حمید الساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن اللتبیہ کو بنو سلیم کے صدقات وصول کرنے کا عامل بنایا، جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ نے اس سے حساب لیا تو اس نے کہا: یہ وہ مال ہے جو آپ کے لیے دیا گیا ہے اور یہ وہ ہدیہ ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنے باپ یا اپنی ماں کے گھر میں کیوں نہ بیٹھے رہے حتیٰ کہ تمہارے پاس ہدیے آتے اگر تم سچے ہو، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: میں تم میں سے کسی شخص کو کسی کام پر عامل بناتا ہوں جس کام کا اللہ نے مجھے ولی بنایا ہے، پھر تم میں سے کوئی شخص میرے پاس آ کر کہتا ہے یہ حصہ تمہارے لیے ہے اور یہ حصہ مجھے ہدیہ کیا گیا ہے، پس وہ شخص کیوں نہ اپنے باپ کے گھر میں یا اپنی ماں کے گھر میں جا کر بیٹھا حتیٰ کہ اس کے پاس ہدیہ آتا، اگر وہ سچا ہے، اللہ کی قسم! تم اس مال میں سے جو چیز بھی ناحق لو گے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس چیز کو اس کے اوپر لاد دے گا، سنو! میں اس شخص کو قیامت کے دن ضرور پہچان لوں گا، جس کے اوپر اللہ بلبلاتا ہوا اونٹ لاد دے گا اور جس کے اوپر ڈکراتی ہوئی گائے لاد دے گا یا ممیاتی ہوئی بکری لاد دے گا، پھر آپ نے اپنے ہاتھ بلند کیے حتیٰ کہ میں نے آپ کی بغلوں کی سفیدی (کی جگہ) دیکھی، پھر آپ نے فرمایا: سنو! کیا میں نے پیغام پہنچا دیا ہے!

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٧١٩٧، صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٨٣٢، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٢٩٤٦، سنن دارمی رقم الحدیث: ١٦٦٩)

حضرت عدی بن عمیر کندی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! تم میں سے جس شخص نے ہمارے لیے کوئی عمل کیا پھر اس میں سے کوئی چیز چھپالی خواہ وہ سوئی ہو یا اس سے بھی کمتر چیز تو وہ خیانت ہے اور وہ قیامت کے دن اس چیز کو لے کر آئے گا، تب ایک سیاہ فام انصاری اٹھا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! اپنا عمل مجھ سے لے لیجئے، آپ نے پوچھا: کیوں؟ اس نے کہا: میں نے آپ کو اس اس طرح فرماتے سنا ہے۔ آپ نے فرمایا: میں نے یہ کہا ہے کہ جس کو ہم کوئی کام سونپیں تو وہ قلیل اور کثیر ہر چیز لے کر آئے، پھر اس کو جو دے دیا جائے وہ لے لے اور جو نہ دیا جائے وہ نہ لے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٨٣٣، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٣٥٨١)

مؤلفۃ القلوب کی تعریف اور ان کو زکوٰۃ میں سے دینے کے متعلق مذاہب فقہاء

ادائیگی زکوٰۃ کا چوتھا مصرف مؤلفۃ القلوب ہیں یعنی وہ لوگ جن کے دلوں کو اسلام کی طرف راغب کرنا مقصود ہو، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ وہ آزاد اور معزز لوگ ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ حنین میں عطا فرمایا تھا، یہ پندرہ آدمی تھے: ابوسفیان، اقرع بن حابس، عیینہ بن حصن، حویطب بن عبد العزیٰ، سہل بن عمرو، حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو الجمحی، ابو السنابل، حکیم بن حزام، مالک بن عوف، صفوان بن امیہ، عبد الرحمٰن بن یربوع، جد بن قیس، عمرو بن مرداس اور العلاء بن الحارث۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے ہر شخص کو سو اونٹ دیئے اور ان کو اسلام کی ترغیب دی، ماسوا عبد الرحمٰن بن یربوع کے، اس کو آپ نے پچاس اونٹ دیئے اور حکیم بن حزام کو آپ نے ستر اونٹ دیئے۔ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! میرے خیال میں آپ کی عطاء کا مجھ سے زیادہ کوئی اور مستحق نہیں ہے تو آپ نے ان کو بھی سو اونٹ پورے کر دیئے۔

مؤلفۃ القلوب کی دو قسمیں ہیں: مسلمان اور کفار۔ مسلمانوں کو صدقات میں سے اس لیے دیا جاتا ہے کہ ان کا ایمان قوی رہے، یا ان کے مماثل لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لیے اور کفار کو اسلام کی ترغیب دینے کے لیے یا ان کے شر سے بچنے کے لیے ان کو زکوٰۃ اور صدقات سے دیا جاتا ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان بن امیہ کو عطا فرمایا ہے

جب آپ نے ان کا اسلام کی طرف میلان دیکھا۔

علامہ واحدی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مشرکین کے قلوب کی تالیف سے مستغنی کر دیا ہے، اگر مسلمانوں کا سربراہ یہ دیکھے کہ اس میں مسلمانوں کا کوئی فائدہ ہے اور ان کے مسلمان ہو جانے سے مسلمانوں کو نفع پہنچے گا تو ان کو مال فئے سے عطا کرے، زکوٰۃ سے نہ دے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ مؤلفتہ القلوب کا مصرف، مصارفِ زکوٰۃ سے اب ساقط ہو چکا ہے اور یہی شعبی کا قول ہے۔ امام مالک، ثوری، امام ابو حنیفہ اور اسحاق بن راہویہ کا یہی مذہب ہے، اور حسن بصری سے یہ مروی ہے کہ ان کا حصہ اب بھی ثابت ہے۔ زہری، ابو جعفر محمد بن علی اور ابو ثور کا یہی مذہب ہے اور امام احمد نے یہ کہا ہے کہ اگر مسلمانوں کو ان کی ضرورت ہو تو ان کو زکوٰۃ سے دیا جائے گا ورنہ نہیں۔

(اللباب فی علوم الکتاب ج ١٠ ص ١٢٦-١٢٥، دار الکتاب العلمیہ بیروت، ١٤١٩ھ)

قاضی بیضاوی شافعی نے کہا: مؤلفتہ القلوب وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا اور اسلام قبول کرنے میں ان کی نیت ضعیف تھی، تو ان کے قلوب کو اسلام پر قائم اور برقرار رکھنے کے لیے ان کو عطا کیا جاتا ہے، یا ایسے معزز لوگ کہ اگر ان کو عطا کیا جائے تو ان کو دیکھ کر ان جیسے دوسرے معزز لوگ اسلام لے آئیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیینہ بن حصین، اقرع بن حابس اور عباس بن مرداس کو اسی وجہ سے عطا فرمایا تھا، اور ایک قول یہ ہے کہ معزز لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے عطا کیا جائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو عطا کرتے تھے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو خمس کے اس پانچویں حصہ سے عطا فرماتے تھے جو خالص آپ کا حصہ تھا، اور کفار اور مانعین زکوٰۃ سے قتال کرنے کی طرف مائل کرنے کے لیے جن کو عطا کیا جائے وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ مؤلفتہ القلوب کو اس لیے دیا جاتا تھا کہ مسلمانوں کی تعداد میں کثرت ہو اور اب جبکہ اللہ نے مسلمانوں کو غلبہ عطا فرما دیا ہے اور مسلمانوں کی کثرت ہو گئی ہے تو ان کا حصہ ساقط ہو گیا۔ (انوار التنزیل مع عنایت القاضی ج ٤ ص ٥٨٧، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ١٤١٧ھ)

علامہ برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی الحنفی المتوفی ٥٩٣ھ لکھتے ہیں:

مصارفِ زکوٰۃ میں سے مؤلفتہ القلوب کا حصہ اب ساقط ہو چکا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا فرما دیا ہے اور ان سے مستغنی کر دیا ہے اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ (ہدایہ اولین ص ٢٠٤، مطبوعہ مکتبہ شرکت علمیہ ملتان)

علامہ کمال الدین محمد بن عبد الواحد المعروف بابن الہمام الحنفی المتوفی ٨٦١ھ لکھتے ہیں:

اس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں صحابہ کرام کا اجماع منعقد ہو چکا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو رد کر دیا تھا۔ عیینہ اور اقرع نے حضرت ابو بکر سے ایک زمین کو طلب کیا، حضرت ابو بکر نے ان کو خط لکھ دیا۔ حضرت عمر نے اس خط کو پھاڑ دیا، اور کہا: یہ وہ چیز ہے جو تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا کرتے تھے، تاکہ تم کو اسلام پر راغب کریں لیکن اب اللہ نے اسلام کو غلبہ عطا کر دیا ہے اور تم سے مستغنی کر دیا ہے، اب اگر تم اسلام پر ثابت قدم رہتے ہو تو فبہا ورنہ اب ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار ہے۔ پھر وہ حضرت ابو بکر کے پاس گئے اور کہا: خلیفہ آپ ہیں یا عمر؟ حضرت ابو بکر کی رائے حضرت عمر کے موافق ہو گئی اور صحابہ میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا، اگر حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کی رائے برحق نہ ہوتی تو صحابہ اس پر ضرور انکار کرتے اور یقیناً ان کے پاس کوئی ایسی دلیل ہو گی جس سے ان کو علم ہو گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پہلے اس حکم کو منسوخ کر دیا تھا، یا یہ حکم آپ کی حیات کے ساتھ مقید تھا، یا یہ حکم کسی علت کے

ساتھ معلل تھا اور اب وہ علت نہیں تھی، اور حضرت عمر نے ان کے سامنے یہ آیت پڑھی تھی:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (الکہف: ۲۹)

آپ کہیے کہ حق تمہارے رب کی جانب سے ہے سو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔

(فتح القدیر ج ۲ ص ۲۶۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ محمد بن محمود بابرتی حنفی متوفی ۷۸۶ھ لکھتے ہیں:

علامہ علاء الدین عبدالعزیز نے کہا: ان کی تالیف قلوب سے مقصود دین کا اعزاز اور غلبہ تھا، کیونکہ غلبہ کفر کے زمانہ میں اسلام کمزور تھا، اس وقت تالیف قلوب کے لیے عطا کرنے میں دین کا اعزاز تھا اور جب حال بدل گیا اور اللہ نے اسلام کو غلبہ عطا فرما دیا تو اب دین کا اعزاز ان کو نہ دینے میں ہے اور اصل مقصود دین کا اعزاز ہے، وہ اپنے حال پر باقی ہے اور منسوخ نہیں ہوا، اس کی مثال یہ ہے کہ جب پانی نہ ہو تو طہارت کے حصول کے لیے مٹی سے تیمم کرنا ضروری ہے، اور جب حال بدل جائے اور پانی مل جائے تو اب مٹی سے تیمم کرنے کا حکم ساقط ہو جائے گا اور پانی کا استعمال کرنا ضروری ہو گا کیونکہ اب طہارت کے حصول کے لیے پانی کا استعمال کرنا متعین ہے، اسی طرح دین کا اعزاز پہلے مؤلفۃ القلوب کو دینے میں تھا اب نہ دینے میں ہے اور اصل حکم دین کا اعزاز ہے، وہ منسوخ نہیں ہوا۔ (العنایۃ ج ۲ ص ۲۶۶-۲۶۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے زکوٰۃ میں حصہ

جس غلام کے متعلق اس کے مالک نے یہ کہا ہو کہ اگر اس نے اتنے روپے مجھے ادا کر دیئے تو یہ آزاد ہے، اس غلام کو مکاتب کہتے ہیں اور اس کی آزادی میں تعاون کرنے کے لیے زکوٰۃ میں سے اس کو حصہ دینا مشروع کیا گیا ہے۔

حسین بیان کرتے ہیں کہ ایک مکاتب حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے پاس گیا، وہ اس وقت جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے۔ اس نے حضرت ابوموسیٰ سے کہا: اے امیر! لوگوں کو میرے لیے برانگیختہ کیجئے۔ تو حضرت ابوموسیٰ نے مسلمانوں کو برانگیختہ کیا، پس لوگوں نے اس کو کپڑے اور انگوٹھیاں دیں، حتیٰ کہ بہت مال جمع ہو گیا۔ حضرت ابوموسیٰ نے اس مال کو جمع کر کے فروخت کیا اور اس کی مکاتبت ادا کر دی اور باقی مال بھی غلاموں کو آزاد کرانے میں صرف کر دیا، اور لوگوں کو یہ رقم واپس نہیں کی، اور یہ کہا کہ لوگوں نے یہ رقم غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے دی ہے۔

(جامع البیان جز ۱۰ ص ۲۱۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ ابوحفص عمر بن علی الدمشقی الحنبلی المتوفی ۸۸۰ھ لکھتے ہیں:

الرقاب (غلاموں کو آزاد کرانے) کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں: (۱) اس سے مراد مکاتب ہیں تاکہ ان کو زکوٰۃ کے مال سے آزاد کرایا جائے، (۲) امام مالک وغیرہ نے یہ کہا کہ مالِ زکوٰۃ سے غلام خرید کر ان کو آزاد کرایا جائے، (۳) امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے یہ کہا ہے کہ مالِ زکوٰۃ سے مکمل غلام آزاد نہ کرایا جائے بلکہ مالِ زکوٰۃ سے کچھ رقم غلام کے لیے دی جائے اور اس سے مکاتب کی گردن آزاد کرانے میں مدد کی جائے، کیونکہ وفی الرقاب فرمانے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا مالِ زکوٰۃ میں کچھ دخل ہونا چاہیے اور یہ اس کے منافی ہے کہ مالِ زکوٰۃ سے مکمل غلام آزاد کیا جائے۔

غلاموں، مقروضوں، اللہ کی راہ میں اور مسافروں پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے کے لیے تملیک ضروری نہیں

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ احتیاط اس میں ہے کہ مکاتب کی اجازت سے زکوٰۃ میں اس کا حصہ اس کے مالک کو دے دیا

جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے چار مصارف کا ذکر لام تملیک کے ساتھ کیا ہے اور جب رقاب کا ذکر کیا تو لام کے بجائے "فی" کا ذکر کیا اور فرمایا وفی الرقاب اور اس فرق کا کوئی فائدہ ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے چار مصارف میں زکوٰۃ میں سے ان کا حصہ ان کو دے کر ان کو ان حصص کا مالک بنادیا جائے اور باقی مصارف میں زکوٰۃ میں ان کا حصہ ان کے مصالح اور ان کی بہتری اور ان کے فوائد میں خرچ کیا جائے اور ان کو ان کا مالک نہ بنایا جائے۔

زمخشری نے کہا ہے کہ آخری چار مصارف میں لام کے بجائے "فی" کا ذکر کیا ہے اور اس میں یہ بتانا ہے کہ آخری چار مصارف پہلے چار مصارف سے صدقہ اور زکوٰۃ دیئے جانے کے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ "فی" ظرفیت کے لیے آتا ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ وہ صدقات کا ظرف اور محل ہیں اور فی سبیل اللہ وابن السبیل میں جو "فی" کا تکرار کیا ہے اس میں یہ تنبیہ ہے کہ ان دو مصرفوں کو یعنی فی سبیل اللہ اور ابن السبیل کو پہلے دو مصرفوں پر زیادہ ترجیح ہے اور غلام آزاد کرانے اور مقروض کا قرض ادا کرنے کی بہ نسبت مالِ زکوٰۃ کو اللہ کے راستہ میں اور مسافروں پر خرچ کرنا زیادہ راجح ہے۔

(اللباب فی علوم الکتاب ج ۱۰ص ۱۳۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ)

قاضی شہاب الدین احمد بن محمد بن عمر خفاجی حنفی متوفی ۱۰۶۹ھ لکھتے ہیں:

پہلے چار مصارف کے ساتھ لام اور آخری چار مصارف کے ساتھ "فی" ذکر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ پہلے چار مصارف میں ان کو زکوٰۃ سے ان کا حصہ ادا کر کے ان کو ان حصوں کا مالک بنادیا جائے اور آخری چار مصارف میں ان کو زکوٰۃ میں سے ان کے حصہ کا مالک نہیں بنایا جائے گا بلکہ ان کا حصہ ان کی فلاح اور ان کے مصالح میں خرچ کیا جائے گا، مکاتب کا مال اس کے مالک کو دیا جائے گا اور مقروض کا مال (اس کے حصہ کی زکوٰۃ) اس کے قرض خواہ کو دیا جائے گا اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا بالکل واضح ہے، اور مسافر بھی اللہ کے راستے میں داخل ہے، اس کو علیحدہ اس لیے ذکر کیا ہے تاکہ اس کی خصوصیت پر تنبیہ ہو۔

(عنایت القاضی ج ۴ ص ۵۸۸، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ پہلے چار مصارف میں لام اور آخری چار مصارف میں "فی" کو ذکر کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: پہلے چار مصارف میں ان کو زکوٰۃ سے ان کا حصہ دے کر ان کو مالک بنادیا جائے گا کہ وہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں اور غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے ان کا حصہ ان کو نہیں دیا جائے گا اور نہ ان کو اس پر تصرف کی قدرت دی جائے گی کہ وہ اس میں جس طرح چاہیں تصرف کریں بلکہ ان کی طرف سے ان کی قیمت ادا کر دی جائے گی، اسی طرح مقروضوں کی زکوٰۃ کا حصہ ان کے قرض خواہوں کو دے دیا جائے گا، اسی طرح مجاہدین کی زکوٰۃ کا حصہ ان کی ضرورت کا اسلحہ خریدنے میں خرچ کیا جائے گا اور اسی طرح مسافروں کی ضرورت کی چیزوں میں ان کا حصہ خرچ کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ پہلے چار مصارف میں ان کے حصص ان کو دے دیئے جائیں گے کہ وہ جس طرح چاہیں خرچ کریں اور آخری چار مصارف میں ان کو ان کے حصص نہیں دیئے جائیں گے بلکہ جس جہت سے وہ زکوٰۃ کے مستحق ہیں اس جہت میں ان کے حصہ کی زکوٰۃ کو خرچ کیا جائے گا۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۸۷-۸۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

مفسرینِ حنبلیہ میں سے علامہ عمر بن علی الدمشقی حنبلی نے اور مفسرینِ شافعیہ میں سے امام رازی کے علاوہ، علامہ خازن شافعی متوفی ۷۲۵ھ نے یہی لکھا ہے کہ زکوٰۃ کے پہلے چار مصارف میں تملیک ضروری ہے اور آخری چار مصارف میں تملیک کے بجائے ان کی ضروریات اور مصالح میں زکوٰۃ خرچ کی جائے۔ (تفسیر خازن ج ۲ ص ۲۵۳) اور مفسرینِ احناف میں سے علامہ خفاجی کے علاوہ علامہ محی الدین شیخ زادہ حنفی متوفی ۹۵۱ھ اور علامہ ابو السعود محمد بن عمادی حنفی متوفی ۹۸۲ھ اور علامہ آلوسی حنفی

متوفی ١٢٧٠ھ نے بھی یہی لکھا ہے۔ (حاشیہ محی الدین شیخ زادہ ج ۴ ص ۴۷۸، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ١٤١٩ھ، تفسیر ابو السعود ج ۳ ص ١٦٢، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ١٤١٩ھ، تفسیر روح المعانی ج ١٠ ص ١٢۴، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت) غیر مقلدین میں سے نواب صدیق حسن خاں بھوپالی متوفی ١٣٠٧ھ نے بھی یہی لکھا ہے۔ (فتح البیان ج ۵ ص ٣٣٢)

جن مفسرین نے ژرف نگاہی سے کام لیا اور اس پر غور کیا کہ پہلی چار اصناف کے لیے اللہ تعالیٰ نے لام کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور باقی چار اصناف کے لیے "فی" کا لفظ استعمال فرمایا ہے، انہوں نے اس سے یہ مستنبط کیا کہ پہلی چار قسموں میں سے جس کو زکوٰۃ ادا کی جائے اس کو اس مالِ زکوٰۃ کا مالک بنانا ضروری ہے اور دوسری چار قسموں کے شروع میں چونکہ لام تملیک نہیں ہے بلکہ "فی" کا ذکر ہے اس لیے ان میں ان کو مالِ زکوٰۃ کا مالک نہیں بنایا جائے گا بلکہ ان کے حصہ کی زکوٰۃ کو ان کی ضروریات اور ان کے مصالح میں خرچ کیا جائے گا۔ حنبلی، شافعی اور حنفی مفسرین کی تصریحات اس مسئلہ میں گزر چکی ہیں اور فقہاء مالکیہ کا بھی یہی موقف ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ غلام کو زکوٰۃ کا حصہ ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کے حصہ سے غلام کو خرید کر آزاد کر دیا جائے۔ علامہ ابو عبداللہ قرطبی مالکی متوفی ٦٦٨ھ لکھتے ہیں:

امام مالک نے فرمایا کہ غلام کو آزاد کر دیا جائے اور اس کی ولاء مسلمانوں کے لیے ہوگی، (الی قولہ) اس میں اختلاف ہے کہ آیا مکاتب کو آزاد کرانے میں اس کی معاونت کی جائے یا نہیں، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ رقبہ (غلام) کا ذکر فرماتا ہے تو اس سے مکمل غلام آزاد کرنے کا ارادہ فرماتا ہے اور رہا مکاتب تو وہ غارمین (مقروضوں) کے کلمہ میں داخل ہے کیونکہ اس کے اوپر مکاتبت کا قرض ہوتا ہے اس لیے وہ رقاب میں داخل نہیں ہوگا۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ٨ ص ١٠٩)

زکوٰۃ کے تمام مصارف میں تملیک ضروری ہونے پر فقہاء احناف کے دلائل

ہرچند کہ علامہ خفاجی حنفی، علامہ ابو سعود حنفی، علامہ شیخ زادہ حنفی اور علامہ آلوسی حنفی نے یہ تصریح کی ہے کہ ادائیگی زکوٰۃ میں مالک بنانے کا تعلق اصنافِ زکوٰۃ میں سے صرف پہلی چار اصناف کے ساتھ ہے اور باقی چار اقسام میں تملیک نہیں کی جائے گی بلکہ مالِ زکوٰۃ کو ان کی ضروریات اور مصالح میں خرچ کیا جائے گا لیکن جمہور فقہاء احناف تملیک کو ادائیگی زکوٰۃ کا رکن قرار دیتے ہیں اور یہ زکوٰۃ کی تمام اصناف کے لیے رکن ہے۔

علامہ ابو بکر بن مسعود کاسانی حنفی متوفی ۵٨٧ھ لکھتے ہیں:

زکوٰۃ کا رکن یہ ہے کہ نصاب میں سے ایک جز کو اللہ کی طرف نکالا جائے اور اس کو اللہ کے سپرد کر دیا جائے اور فقیر کو مالک بنا کر اس کے سپرد وہ مال کر کے مالک کا قبضہ اس جز سے منقطع ہو جائے، یا فقیر کے نائب کے سپرد کر دے جو زکوٰۃ وصول کرنے والا ہے اور ملک فقیر کے لیے اللہ کی طرف سے ثابت ہوگی اور صاحبِ مال فقیر کو مالک بنانے اور اس کے سپرد کرنے میں اللہ کی طرف سے نائب ہوگا۔ اس پر دلیل یہ آیت ہے:

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ۔ (التوبہ: ١٠۴)

کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہی صدقات لیتا ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فقیر کی ہتھیلی پر آنے سے پہلے صدقہ رحمٰن کے ہاتھ میں آتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فقیر کو مالک بنانے کا حکم دیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اتوا الزکوۃ۔ (البقرہ: ۴٣) زکوٰۃ دو، اور الایتاء (دینا) تملیک ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو صدقہ فرمایا ہے، انما الصدقات للفقراء۔ (التوبہ: ٦٠) اور تصدق کا معنی تملیک ہے، پس نصاب کا مالک زکوٰۃ کی مقدار کو اللہ کی طرف نکالنے والا ہوتا ہے۔

ہم نے یہ کہا ہے کہ فقیر کو زکوٰۃ سپرد کرتے وقت اس سے زکوٰۃ کی نسبت منقطع ہو جائے گی اور یہ خالص اللہ کے لیے ہو جائے گی، اور اللہ کی طرف زکوٰۃ نکالنے کا معنی عبادت اس وقت بنے گا جب فقیر کو مالک بنا کر وہ اس سے اپنی ملک کو باطل کر دے، بلکہ حقیقت میں مالک اللہ بناتا ہے اور صاحبِ مال تو اللہ کی طرف سے نائب ہے۔

اس قاعدہ کے مطابق مساجد، سرائے اور پانی کی سبیلیں بنانے، پلوں کی مرمت کرنے، مردوں کو دفن کرنے اور دیگر نیکی کے کاموں میں زکوٰۃ کو صرف کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ان میں تملیک (کسی کو مالک بنانا) بالکل نہیں پائی جاتی (کیونکہ یہ چیزیں وقف ہوتی ہیں اور وقف کا کوئی مالک نہیں ہوتا) اسی طرح اگر کسی شخص نے مالِ زکوٰۃ سے طعام خریدا اور فقراء کو صبح اور شام کھانا کھلایا اور ان کو بعینہٖ طعام نہیں دیا تو یہ بھی جائز نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں تملیک نہیں ہوئی، اور اگر اس نے مالِ زکوٰۃ سے کسی زندہ فقیر کا قرض اس کے حکم کے بغیر ادا کر دیا تو یہ بھی جائز نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں بھی فقیر کو مالک نہیں بنایا گیا اور اگر فقیر کے حکم سے اس کا قرض ادا کیا گیا ہے تو جائز ہے کیونکہ اب فقیر کے لیے تملیک پائی گئی گویا کہ فقیر نے مالِ زکوٰۃ پر قبضہ کیا اور اس کو قرض کی ادائیگی کے لیے وکیل بنا دیا، اسی طرح اگر کسی شخص نے مالِ زکوٰۃ سے غلام خرید کر آزاد کر دیا تو یہ جائز نہیں ہے اور امام مالک کے نزدیک یہ جائز ہے اور قرآن مجید میں جو ہے: وفی الرقاب۔ (التوبہ: ۶۰) ان کے نزدیک اس کا یہی معنی ہے کہ مالِ زکوٰۃ سے غلام خرید کر آزاد کر دیا جائے، اور ہمارے نزدیک تملیک واجب ہے اور آزاد کرنا ملک کو زائل کرنا ہے اور ہمارے نزدیک وفی الرقاب کا معنی یہ ہے کہ مالِ زکوٰۃ سے مکاتبین کی امداد کی جائے۔

(بدائع الصنائع ج ۲ ص ۴۵۷-۴۵۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ)

اسی طرح علامہ کمال الدین محمد بن عبد الواحد المعروف بابن ہمام حنفی متوفی ۸۶۱ھ لکھتے ہیں:

مالِ زکوٰۃ سے مسجد بنائی جائے گی اور نہ میت کو کفن دیا جائے گا کیونکہ اس صورت میں تملیک نہیں ہے اور وہ رکن ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو صدقہ فرمایا ہے اور صدقہ کی حقیقت یہ ہے کہ فقیر کو مال کا مالک بنا دیا جائے۔

(فتح القدیر ج ۲ ص ۲۷۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

تملیک کی رکنیت کے دلائل کا تجزیہ

علامہ کاسانی نے تملیک پر یہ دلیل دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: واتوا الزکوٰۃ اور الایتاء کا معنی ہے کسی کو کسی چیز کا مالک بنانا، ہم اب کتب لغت میں الایتاء کا معنی دیکھتے ہیں۔ علامہ مجد الدین فیروز آبادی متوفی ۸۱۷ھ لکھتے ہیں: الایتاء کا معنی ہے کسی کو کوئی چیز عطا کرنا۔ (قاموس ج ۴ ص ۴۳۰) علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ نے لکھا ہے: الایتاء کا معنی ہے: الاعطاء۔ (المفردات ج ۱ ص ۱۰) علامہ زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ نے لکھا ہے کہ کشاف میں ہے: الایتاء کا معنی الاعطاء میں مشہور ہو گیا۔ اس کا اصل معنی ہے کسی چیز کو حاضر کرنا۔ (تاج العروس ج ۱۰ ص ۸، مطبوعہ المطبعۃ المیمنہ مصر، ۱۳۰۶ھ) کتب لغت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ الایتاء کا معنی تملیک ہے، اور قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اور وہاں اس کا معنی مالک بنانا متصور نہیں ہو سکتا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَاٰتٰىنِىْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ۔ (ھود: ۲۸)

(نوح نے) کہا: اے میری قوم! یہ بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت دی ہو سو وہ تم پر مخفی کر دی گئی۔

فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا

پھر جب وہ حاملہ ہو گئی تو ان دونوں نے اپنے رب سے دعا کی

صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ۔ اگر تو نے ہمیں نیک بیٹا دیا تو ہم ضرور تیرے شکر گزار ہو جائیں گے۔ (الاعراف: ۱۸۹)

فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا۔ (الاعراف: ۱۹۰) پس اللہ نے جب انہیں بہترین بچہ دیا۔

فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ۔ (البقرہ: ۲٦۵) تو اس باغ نے دگنا پھل دیا۔

اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ۔ (الکہف: ۹٦) مجھے لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے لا کر دو۔

اس لفظ کے تمام صیغوں اور قرآن مجید اور احادیث میں اس کے اطلاقات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ الایتاء کا معنی حاضر کرنا اور کسی چیز کو دینا اور مہیا کرنا ہے اور اس کے مفہوم میں تملیک داخل نہیں ہے۔

علامہ کاسانی اور علامہ ابن ہمام نے یہ بھی لکھا ہے کہ صدقہ کا معنی تملیک ہے۔ علامہ فیروز آبادی نے لکھا ہے: صدقہ وہ چیز ہے جس کو تم اللہ عزوجل کی ذات کے لیے دو۔ (قاموس ج ۳ ص ۳٦۸) علامہ زبیدی نے لکھا ہے کہ صحاح میں مذکور ہے: جس چیز کو تم فقراء پر صدقہ کرو اور مفردات میں مذکور ہے: جس چیز کو انسان اپنے مال سے بطورِ عبادت نکالتا ہے جیسے زکوٰۃ' لیکن صدقہ اصل میں نفلی خیرات کو کہتے ہیں اور زکوٰۃ خیراتِ واجبہ کو۔ (المفردات ج ۲ ص ۳٦۵' تاج العروس ج ٦ ص ۴۰۵) ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ صدقہ کے لغوی معنی میں تملیک کا مفہوم داخل نہیں ہے۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ادائیگی زکوٰۃ میں تملیک کا رکن نہ ہونا

ائمہ ثلاثہ نے زکوٰۃ کی جو تعریف بیان کی ہے اس میں تملیک کا ذکر نہیں کیا' ان کے نزدیک تملیک زکوٰۃ کا رکن ہے نہ شرط۔

علامہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی الشافعی المتوفی ۴۵۰ھ لکھتے ہیں:

کسی مخصوص چیز کو مخصوص مال سے اوصافِ مخصوصہ کے ساتھ جماعتِ مخصوصہ کے لیے لینا شرعاً زکوٰۃ ہے۔

(الحاوی الکبیر ج ۴ ص ۳' مطبوعہ دار الفکر بیروت)

علامہ محمد بن عبد الباقی بن یوسف الزرقانی المالکی المتوفی ۱۱۲۲ھ لکھتے ہیں:

علامہ ابن العربی نے کہا ہے کہ زکوٰۃ کا اطلاق صدقہ واجبہ پر' صدقہ مستحبہ پر' نفقہ پر' عفو پر اور حق پر کیا جاتا ہے اور اس کی شرعی تعریف یہ ہے: سال گزرنے کے بعد نصاب کے ایک جز کو فقیر اور اس کی مثل کو دینا وہ فقیر غیر ہاشمی اور غیر مطلبی ہو' اس کا رکن اخلاص ہے' اس کا سبب ایک سال تک نصاب کا مالک ہونا ہے' اس کی شرط عقل' بلوغ اور حریت ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ دنیا میں واجب ساقط ہو جاتا ہے اور آخرت میں ثواب ملتا ہے اور اس کی حکمت مال کو میل کچیل سے پاک کرنا ہے۔

(شرح الزرقانی علی الموطا امام مالک ج ۴ ص ۱۳۵ - ۱۳۴' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۷ھ)

حافظ احمد بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ نے بھی ابن عربی مالکی کی اس تعریف کو ذکر کر کے لکھا ہے۔ یہ بہت عمدہ تعریف ہے لیکن وجوب کی شرط میں اختلاف ہے۔ (فتح الباری ج ۳ ص ۲٦۴' مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور' ۱۴۰۱ھ)

علامہ منصور بن یونس بہوتی متوفی ۱۰۴٦ھ لکھتے ہیں:

زکوٰۃ کا شرعی معنی یہ ہے کہ یہ وہ حق ہے جو مالِ مخصوص میں جماعتِ مخصوصہ (فقراء وغیرہ) کے لیے وقتِ مخصوص میں واجب ہے یعنی نصاب پر سال گزرنے کے بعد' اور مالِ مخصوص سے مراد مویشی' سونا' چاندی (درہم' دینار) اور مالِ تجارت ہے۔ (کشاف القناع ج ۲ ص ٦-۵' مطبوعہ عالم الکتب بیروت' ۱۴۱۷ھ)

آخری چار مصارف میں تملیک کا اعتبار نہ کرنے کا ثمرہ

فقہاء احناف نے تملیک کے ثبوت میں جو دلیل دی ہے کہ ایتوا اور صدقہ کرنے کا معنی فقیر کو مالک بنانا ہے وہ کتب لغت اور قرآنِ مجید کی آیات سے ثابت نہیں ہے، اور ائمہ ثلاثہ نے زکوٰۃ میں تملیک کو رکن یا شرط قرار نہیں دیا، البتہ سورۂ توبہ کی اس آیت میں مذاہبِ اربعہ کے مفسرین نے للفقراء والمساکین والعملین علیھا والمؤلفۃ قلوبھم میں لام کو تملیک کے لیے قرار دیا ہے اور وفی الرقاب والغرمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل میں لام کی جگہ "فی" لانے کی وجہ ان مفسرین نے یہ بیان کی ہے کہ غلام آزاد کرنے اور مقروضوں کے قرض ادا کرنے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں پر خرچ کرنے کے لیے زکوٰۃ کی رقم کا ان کو مالک بنانا ضروری نہیں ہے بلکہ زکوٰۃ کی رقم کو ان کی ضروریات اور مصلحتوں میں بھی خرچ کیا جاسکتا ہے، خصوصاً حنفی مفسرین میں سے علامہ خفاجی، علامہ شیخ زادہ، علامہ ابوسعود اور علامہ آلوسی کا یہی مختار ہے، سو اگر ہمارے علماء احناف اس نظریہ سے اتفاق کرلیں تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دینی مدارس، مساجد، ہسپتالوں اور دیگر فلاحی کاموں پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جاسکے گی اور حیلہ کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ہمارے اہلِ علم اور اہلِ فتویٰ حضرات کو اس پر غور کرنا چاہیے۔

زکوٰۃ میں مقروضوں کا حصہ

مقروض سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی جائز ضروریات میں مقروض ہوں نہ کہ وہ لوگ جنہوں نے کسی گناہ کے ارتکاب کے لیے قرض لیا ہو، مثلاً کسی نے سینما ہاؤس، وڈیو شاپ یا شراب کی دکان کھولنے کے لیے قرض لیا ہو یا مثلاً کسی نے بے جا خرچ اور اسراف کے لیے قرض لیا ہو مثلاً کسی نے اپنے بچوں کی شادی کے سلسلہ میں مروجہ رسومات بڑے پیمانہ پر منعقد کی ہوں اور مقروض ہوگیا ہو اور اس قرض کو ادا کرنے کے لیے اس کے پاس رقم نہ ہو تو اس کو زکوٰۃ کی رقم نہیں دینی چاہیے، البتہ علامہ نووی شافعی نے "الروضہ" میں یہ لکھا ہے کہ اگر وہ توبہ کرلے تو پھر اس کو بھی زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے، مقروض خواہ غنی ہو لیکن اگر اس کے پاس قرض اتارنے کے لیے رقم نہیں ہے تو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ حدیث میں ہے:

عطاء بن یسار بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی غنی کے لیے صدقہ لینا جائز نہیں ہے مگر پانچ کے لیے: جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو، یا وہ صدقہ وصول کرنے والا عامل ہو، یا مقروض ہو یا جس شخص نے صدقہ کو اپنے مال سے خرید لیا ہو، یا جس شخص کا کوئی مسکین پڑوسی ہو اور اس پر کوئی چیز صدقہ کی گئی ہو اور وہ مسکین غنی کو وہ چیز ہدیہ کردے۔ (یہ روایت مرسل ہے)

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۶۳۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸۴۱، موطا امام مالک رقم الحدیث: ۳۰۷)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی غنی کے لیے صدقہ لینا جائز نہیں ہے مگر اس غنی کے لیے جو اللہ کی راہ میں ہو، یا مسافر ہو، یا وہ کسی فقیر کا پڑوسی ہو اس فقیر پر صدقہ کیا جائے اور وہ غنی کو ہدیہ دے یا اس کی دعوت کرے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۶۳۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸۴۱، فردوس بماثور الخطاب رقم الحدیث: ۷۶۴۶، مسند احمد ج ۳ ص ۵۶، المستدرک ج ۱ ص ۴۰۷۔ اس حدیث کی سند حسن ہے اور اس کے راوی ثقہ اور مشہور ہیں)

زکوٰۃ میں فی سبیل اللہ کا حصہ

اس سے مراد یہ ہے کہ جہاد کرنے والوں پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جائے اور ان کے لیے اسلحہ، گھوڑے اور کھانے پینے کی

چیزیں خریدی جائیں۔ امام شافعی اور امام ابو یوسف کا یہی مذہب ہے اور امام محمد کے نزدیک جو مسلمان حج کے لیے جائیں وہ بھی اللہ کی راہ میں ہیں اور ان کو بھی زکوٰۃ کی رقم دینا جائز ہے۔ اس پر یہ اشکال ہے کہ اگر مجاہد یا حاجی کے پاس اس کے وطن میں نصاب کے برابر مال ہے اور سفر میں نہیں ہے تو وہ مسافر میں داخل ہے اور اگر سفر اور حضر دونوں میں وہ صاحب نصاب نہیں ہے تو پھر وہ فقیر میں داخل ہے تو پھر فی سبیل اللہ ایک مستقل اور الگ مصرف نہ ہوا' اس کا جواب یہ ہے کہ وہ شخص اپنے وطن میں مال دار ہے لیکن جب وہ جہاد کے لیے روانہ ہوتا ہے تو اس کو اسلحہ اور سواری کی ضرورت ہوتی ہے' اس کے برخلاف مسافر کو اسلحہ اور سواری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک غازی اور مجاہد کو اسی وقت زکوٰۃ دی جاسکتی ہے جب وہ محتاج ہو' باقی ائمہ کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے۔

امام فخرالدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

فی سبیل اللہ کے الفاظ صرف غازیوں اور مجاہدین میں منحصر نہیں ہیں' اسی وجہ سے قفال نے اپنی تفسیر میں بعض فقہاء سے یہ نقل کیا ہے کہ فقہاء نے زکوٰۃ کو نیکی کے تمام راستوں میں خرچ کرنے کی اجازت دی ہے' مثلاً مردوں کو کفن دیا جائے' قلعے بنائے جائیں اور مساجد بنائی جائیں۔ ان تمام امور میں زکوٰۃ کو خرچ کرنا جائز ہے کیونکہ فی سبیل اللہ کا لفظ ان سب کو شامل ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۸۷' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۵ھ)

زکوٰۃ میں مسافروں کا حصہ

اس سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس سفر میں مال اور اسباب نہ ہوں اور اس کو مدد کی ضرورت ہو' اس کو زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

مسافر سے مراد وہ مسافر ہے جس کے پاس مال نہ ہو' وہ زکوٰۃ قبول کرنے کے بجائے قرض مانگ لے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ "فتح القدیر" میں مذکور ہے کہ مسافر کے لیے اپنی ضرورت سے زیادہ زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہے اور مسافر کے ساتھ ہر وہ شخص لاحق ہے جس کے پاس مال نہ ہو خواہ اس کے شہر میں اس کے پاس مال ہو' اور "محیط" میں مذکور ہے کہ اگر تاجر کی رقوم لوگوں کے پاس قرض ہوں اور وہ ان سے قرض وصول کرنے پر قادر نہ ہو اور اس کے پاس مال نہ ہو تو اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے کیونکہ وہ مسافر کی طرح اس حال میں فقیر ہے' اور "خانیہ" میں اس کی تفصیل ہے' اس میں مذکور ہے کہ اگر تاجر کا لوگوں پر میعادی قرض ہو اور وہ کھانے پینے میں محتاج ہو تو اس کے لیے قرض وصول ہونے کی مدت تک زکوٰۃ وصول کرنا جائز ہے اور اگر قرض غیر میعادی ہو لیکن مقروض تنگ دست ہو تب بھی اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے کیونکہ وہ مسافر کی طرح ہے اور اگر مقروض امیر ہو تو پھر اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہے' اور اگر گواہ عادل نہیں ہیں پھر بھی زکوٰۃ لینا جائز نہیں الا یہ کہ مقروض قاضی کے سامنے حلف اٹھالے کہ اس نے اس تاجر کا قرض نہیں دینا' پھر وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے' اس مسئلہ میں قرض کی رقم نصاب سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ (روح المعانی ج ۱۰ ص ۱۲۴' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

کسی ایک صنف کے ایک فرد پر زکوٰۃ تقسیم کرنے کا جواز

مشہور یہ ہے کہ شافعیہ کے نزدیک لام تملیک کے لیے ہے اور یہی ان کے مذہب کا مقتضی ہے کیونکہ انہوں نے کہا کہ جب یہ تمام اصناف موجود ہوں تو ان تمام اصناف پر زکوٰۃ کو تقسیم کرنا واجب ہے اور چونکہ اس آیت میں ہر صنف کو جمع کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا ہے اس لیے ہر صنف کے تین افراد پر تقسیم کرنا واجب ہے اور ہمارے اور مالکیہ اور حنبلیہ کے نزدیک یہ

جائز ہے کہ زکوٰۃ دینے والا ہر صنف پر زکوٰۃ تقسیم کرے یا کسی ایک صنف پر زکوٰۃ کی رقم صرف کرے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر صنف کے تین افراد پر زکوٰۃ کو تقسیم کرے، وہ کسی ایک فرد کو بھی پوری زکوٰۃ کی رقم دے سکتا ہے کیونکہ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ کن لوگوں کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، اور یہ نہیں فرمایا کہ ان سب کو زکوٰۃ دینا ضروری ہے، اور اس کی دلیل یہ آیت ہے:

وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔ (البقرہ: ۲۷۱)

اگر تم صدقات خفیہ طریقہ سے دو اور وہ صدقات فقراء کو دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔

اس آیت میں فقراء کو زکوٰۃ دینے کو زیادہ بہتر فرمایا ہے اور فقراء ایک صنف ہیں، اور ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صدقہ کا مال آیا تو آپ نے صرف ایک صنف میں دیا اور وہ مؤلفۃ القلوب تھے، پھر دوسری مرتبہ مال آیا تو آپ نے صرف مقروضوں کو دیا، اس میں یہ دلیل ہے کہ صرف ایک صنف پر اقتصار کرنا جائز ہے اور اس آیت میں جمع کے صیغوں پر الف لام جنس کا ہے، کیونکہ عہد اور استغراق کا الف لام متصور نہیں ہے، اور جنس صدقہ کو کسی صنف کی جنس پر خرچ کرنے کو بیان فرمایا ہے، اس لیے کسی صنف کے ایک فرد پر بھی زکوٰۃ کی پوری رقم خرچ کی جا سکتی ہے۔

(روح المعانی جز ۱۰ ص ۱۲۵-۱۲۴، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، الجامع لاحکام القرآن جز ۸ ص ۹۵، زاد المسیر ج ۳ ص ۴۵۹)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بعض منافقین نبی کو ایذاء پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ کانوں کے کچے ہیں، آپ کہیے کہ وہ تمہاری بھلائی کے لیے ہر ایک کی بات سنتے ہیں وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور مومنین کی باتوں کی تصدیق کرتے ہیں اور تم میں سے ایمان والوں کے لیے رحمت ہیں اور جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء پہنچاتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (التوبہ: ۶۱)

منافقین کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو "کان" کہنا اور اس پر اللہ کا رد کرنا

اس آیت میں مذکور ہے کہ منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ اُذُنٌ (کان) ہیں، عربی میں اُذُنٌ (کان) اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ہر اس بات کو سنے جو اس سے کہی جائے اور اس کی تصدیق کرے جیسا کہ جاسوس کو وہ عین (آنکھ) کہتے ہیں کیونکہ وہ ہر چیز کو بغور دیکھتا ہے، گویا کہ وہ سراپا آنکھ ہے، اسی طرح جو ہر بات کو سن کر اس کی تصدیق کر دیتا ہے گویا کہ وہ سراپا کان ہے۔

علامہ خفاجی حنفی متوفی ۱۰۶۹ھ لکھتے ہیں:

اس آیت کے شانِ نزول میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ منافقین کی ایک جماعت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نامناسب باتیں کہیں، پھر انہوں نے یہ کہا کہ ہمیں یہ خوف ہے کہ ہماری باتیں ان تک پہنچ جائیں گی تب جلاس بن سوید نے کہا: ہم جو چاہیں گے کہیں گے پھر اگر ان تک یہ باتیں پہنچ گئیں تو ہم قسم کھالیں گے اور وہ ہماری بات قبول کرلیں گے کیونکہ وہ تو سراپا کان ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ اگر (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ کہتے ہیں وہ برحق ہے تو ہم تو گدھے سے بھی بدتر ہیں۔ یہ سن کر اس کی بیوی کے بیٹے نے کہا: بخدا! وہ برحق ہیں اور تم گدھے سے بھی بدتر ہو۔ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچ گئی تب ان میں سے ایک شخص نے کہا: بے شک (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو کان ہیں اگر تم ان کے لیے حلف اٹھالو تو وہ تمہاری تصدیق کر دیں گے۔

(عنایت القاضی ج ۴ ص ۵۹۱، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ)

اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا: آپ کہیے کہ وہ تمہاری بھلائی کے لیے ہر ایک کی بات سنتے ہیں، لیکن وہ اس طرح نہیں سنتے جس طرح تم ان کے سننے کا بطورِ مذمت ذکر کرتے ہو، بلکہ وہ نیکی کی بات سنتے ہیں اور اس کو قبول کرتے ہیں، آپ کے نزدیک جس بات پر دلائل قائم ہوں آپ اس کی تصدیق کرتے ہیں، مومنین کی باتوں کی آپ تصدیق کرتے ہیں کیونکہ آپ کو ان کے خلوص کا علم ہے، اس میں یہ تعریض ہے کہ منافقین بُرے کان ہیں، وہ اللہ کی آیات سنتے ہیں اور ان پر ایمان نہیں لاتے، اور مسلمانوں کی باتیں سنتے ہیں اور ان کو قبول نہیں کرتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی باتیں ازراہ شفقت سنتے ہیں لیکن ان کو قبول نہیں کرتے۔ منافقین میں سے جو ایمان کا اظہار کرتا ہے اس کو قبول کرتے ہیں اور اس کا پردہ فاش نہیں کرتے اور اس میں یہ تنبیہ ہے کہ وہ تمہارے حال سے ناواقفیت کی بناء پر تمہارے قول کو قبول نہیں کرتے بلکہ تم پر شفقت اور رحمت کی وجہ سے تمہاری باتوں کو قبول کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا: اور جو لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایذاء پہنچاتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے خیر اور رحمت ہیں اور وہ بہت خبیث اور گمراہ ہیں۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احسان کا بدلہ بُرائی سے دیا۔ آپ نے بطور شفقت ان کی بات سنی اور انہوں نے کہا کہ یہ کانوں کے کچے ہیں، اس لیے وہ عذابِ شدید کے مستحق ہوگئے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء پہنچانا در حقیقت اللہ کو ایذاء پہنچانا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے مسلمانو!) منافقین تمہیں راضی کرنے کے لیے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں، حالانکہ اللہ اور اس کا رسول اس کے زیادہ حق دار تھے کہ وہ ان کو راضی کرتے اگر وہ مومن تھے ○ (التوبہ: ۶۲)

شانِ نزول اور اللہ اور رسول کے لیے ضمیر واحد لانے کی توجیہ

اس آیت میں منافقین کی ایک اور بُرائی بیان فرمائی ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت پہلی آیت سے مربوط ہے، پہلی آیت کے شانِ نزول میں ذکر کیا تھا کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نامناسب باتیں کہیں، اور جب انہیں یہ خوف ہوا کہ یہ باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائیں گی تو جلاس بن سوید نے کہا: ہم قسم کھالیں گے کہ ہم نے یہ باتیں نہیں کہیں اور وہ تو کان ہیں، وہ ہماری قسمیں قبول کرلیں گے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی کہ وہ تمہیں راضی کرنے کے لیے قسمیں کھاتے ہیں...... دوسرا قول یہ ہے کہ منافقین کی ایک جماعت غزوۂ تبوک میں نہیں گئی اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس مدینہ آگئے تو انہوں نے اپنے نہ جانے پر جھوٹے بہانے تراشے اور اس پر جھوٹی قسمیں کھائیں تو یہ آیت نازل ہوئی کہ منافقین تمہیں راضی کرنے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔

اس آیت کے دوسرے حصہ میں فرمایا ہے: اللہ اور اس کا رسول اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ وہ اس کو راضی کرتے اور یرضوہ میں واحد کی ضمیر ہے اور چونکہ پہلے اللہ اور اس کے رسول دونوں کا ذکر ہے اس لیے بہ ظاہر تثنیہ کی ضمیر ہونی چاہیے تھی جس کا معنی ہو تاکہ وہ ان کو راضی کرتے، اس کا جواب یہ ہے کہ واحد کی ضمیر اس لیے لائے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کی رضا واحد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا یہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے تو بے شک اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، یہ بہت بڑی رُسوائی ہے ○ (التوبہ: ۶۳)

اس آیت میں بھی منافقین کی بُرائیوں کا بیان ہے کہ واضح دلائل سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صدق ظاہر ہو چکا ہے، وہ کتنے عرصے سے آیات اور معجزات کا مشاہدہ کر رہے ہیں اس کے باوجود منافقین اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کر رہے ہیں۔

منافقین اگرچہ اللہ کو مانتے تھے اور اپنے گمان میں وہ اللہ کی مخالفت نہیں کرتے تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرنا ہی درحقیقت اللہ کی مخالفت کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: منافقین اس سے ڈرتے ہیں کہ مسلمانوں پر ایسی سورت نازل ہو جائے گی جو مسلمانوں کو منافقوں کے دل کی باتوں کی خبر دے دے گی، آپ کہیے تم مذاق اڑاتے رہو بے شک اللہ اس چیز کو ظاہر کرنے والا ہے جس سے تم ڈر رہے ہو○ (التوبہ: ٦٤)

اس آیت کے شانِ نزول میں تین قول ہیں:

(١) منافقین آپس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بُرائی بیان کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ عنقریب اللہ ہماری باتوں سے ان کو مطلع کر دے گا، تو یہ آیت نازل ہوئی۔

(٢) ایک منافق نے کہا: میں یہ چاہتا ہوں کہ خواہ مجھے سو کوڑے مار دیئے جائیں لیکن ہمارے متعلق کوئی ایسی چیز نہ نازل ہو جس سے ہماری رُسوائی ہو، تو یہ آیت نازل ہوئی۔

(٣) ابن کیسان نے کہا کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس آرہے تھے تو اندھیری رات میں منافقین کی ایک جماعت راستہ میں کھڑی ہو گئی تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر آپ کو خبر دے دی اور یہ آیت نازل ہوئی۔ (زادالمسیر ج ٣ ص ٤٦٣، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ١٤٠٧ھ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کا علم عطا کیا جانا

امام ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی المتوفی ٥١٦ھ لکھتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ستر منافقین کا نام بنام ذکر کیا اور ان کے آباء کا نام بھی ذکر کیا، پھر ان کے ناموں کا ذکر مٹا دیا تاکہ مومنین پر رحم ہو، اور بعض مسلمان دوسرے مسلمانوں کو عار نہ دلائیں کیونکہ ان کی اولاد مومن تھی۔

ابن کیسان نے کہا: یہ آیت بارہ منافقوں کے متعلق نازل ہوئی جو ایک گھاٹی کے اوپر کھڑے ہوئے تھے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے لوٹیں تو وہ آپ پر حملہ کریں، ان کے ساتھ ایک مسلمان بھی تھا جس نے اپنا حال ان سے چھپایا ہوا تھا، وہ اندھیری رات میں بھیس بدل کر کھڑے ہوئے تھے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے منصوبہ کی خبر دی، اور یہ کہا کہ آپ ان کے پاس ان لوگوں کو بھیجیں جو ان کی سواریوں پر ضرب لگائیں۔ حضرت عمار بن یاسر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کے آگے تھے اور حضرت حذیفہ پیچھے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کی سواریوں کے اوپر ضرب لاؤ۔ حضرت حذیفہ نے ان کی سواریوں کو مار کر بھگا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ سے پوچھا: تم نے ان کو پہچانا؟ حضرت حذیفہ نے کہا: میں ان میں سے کسی کو نہیں پہچانا، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ فلاں اور فلاں تھے حتیٰ کہ ان سب کے نام بتا دیئے۔ حضرت حذیفہ نے پوچھا: آپ ان کے پیچھے کسی شخص کو بھیج کر ان کو قتل کیوں نہیں کرا دیتے۔ آپ نے فرمایا: میں اس کو ناپسند کرتا ہوں کہ عرب یہ کہیں کہ جب (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے اصحاب فتح یاب ہوتے ہیں تو وہ ان کو قتل کرنا شروع کر دیتے ہیں، بلکہ ہمارا بدلہ اللہ ان سے لے گا۔

(معالم التنزیل ج ٢ ص ٢٦١، بیروت، ١٤١٤ھ، الجامع لاحکام القرآن جز ٨ ص ١٢٢، مطبوعہ بیروت، ١٤١٥ھ)

امام فخرالدین محمد بن عمر رازی متوفی ٦٠٦ھ لکھتے ہیں:

حسن بیان کرتے ہیں کہ بارہ منافقین اپنے نفاق پر جمع ہوئے، حضرت جبرئیل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے نفاق کی خبر دے دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگ اس اس بات پر جمع ہوئے ہیں، وہ کھڑے ہو کر اعتراف کریں اور اپنے رب سے استغفار کریں حتیٰ کہ میں ان کی شفاعت کروں۔ جب وہ کھڑے نہیں ہوئے تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے فلاں کھڑے ہو، اے فلاں کھڑے ہو، حتیٰ کہ آپ ان سب کے پاس گئے۔ پھر وہ کہنے لگے کہ ہم اعتراف کرتے ہیں اور استغفار کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اب کہہ رہے ہو حالانکہ میں پہلے تمہاری شفاعت کرنے والا تھا، اور اللہ قبول فرمالیتا، میرے پاس سے نکل جاؤ۔ پھر ان سب کو نکال دیا۔ (تفسیر کبیر ج ٦ ص ٩٣، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ١٤١٥ھ)

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑاتے تھے اور آپ کی تکذیب کرتے تھے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس بات سے ڈرتے کہ کہیں اللہ ان کے احوال کی آپ کو وحی سے خبر نہ کردے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہرچند کہ وہ کافر تھے لیکن ان کو بارہا تجربہ ہوا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دل کی باتوں کی وحی کے ذریعہ سے خبر دی، سو وہ اپنے سابقہ تجربہ کی بنا پر ڈرتے تھے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ اس بات کے معترف تھے کہ آپ سچے نبی ہیں لیکن وہ حسد اور عناد کی وجہ سے آپ کا کفر کرتے تھے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ ان کو آپ کی نبوت کی صحت کے متعلق شک تھا اور شک کرنے والا ڈرتا رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر آپ ان سے (ان کے مذاق اڑانے کے متعلق) سوال کریں تو وہ ضرور یہ کہیں گے کہ ہم تو محض خوش طبعی اور دل لگی کرتے تھے۔ آپ کہیے کہ کیا تم اللہ کا اور اس کی آیتوں کا اور اس کے رسول کا مذاق اڑاتے تھے!O اب عذر نہ پیش کرو بے شک تم اپنے ایمان کے اظہار کے بعد کفر کر چکے ہو، اگر ہم تمہاری ایک جماعت سے (اس کی توبہ کی وجہ سے) درگزر کرلیں تو بے شک ہم دوسرے فریق کو عذاب دیں گے، کیونکہ وہ مجرم تھے (وہ کفر اور مذاق اُڑانے پر اصرار کرتے تھے)O (التوبہ: ٦٦-٦٥)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں توہین کا لفظ کہنا کفر ہے خواہ توہین کی نیت ہو یا نہیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اُڑانے والے منافقین کے متعلق امام ابن جریر متوفی ٣١٠ھ نے حسب ذیل روایات بیان کی ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: غزوۂ تبوک کی ایک مجلس میں ایک شخص نے کہا: ہمارے قرآن پڑھنے والے جتنے پیٹ کے حریص ہیں اور جتنی باتوں میں جھوٹے ہیں اور مقابلہ کے وقت جتنے بزدل ہیں، اتنا میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ اس مجلس میں دوسرے شخص نے کہا: تم نے جھوٹ بولا اور تم منافق ہو، میں ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچاؤں گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچ گئی اور قرآن نازل ہوا۔ حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ میں نے اس شخص کو دیکھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے پیچھے چل رہا تھا اور پتھروں سے اس کے پاؤں زخمی ہو رہے تھے اور وہ کہہ رہا تھا: یارسول اللہ! ہم تو محض خوش طبعی اور دل لگی کر رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما رہے تھے: کیا تم اللہ کا اور اس کی آیتوں کا اور اس کے رسول کا مذاق اُڑاتے تھے۔

قتادہ اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے سفر میں جا رہے تھے اور آپ کے آگے کچھ منافق تھے۔ ان میں سے کسی نے کہا: اس شخص کو یہ امید ہے کہ یہ شام کے محلات اور قلعے فتح کرلے گا حالانکہ یہ بہت بعید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات سے مطلع کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان

سواروں کو روکو، پھر آپ نے پوچھا: تم نے اس اس طرح کہا تھا۔ انہوں نے کہا: اے اللہ کے نبی! ہم تو محض خوش طبعی اور دل لگی کرتے تھے۔

مجاہد نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: ایک منافق نے کہا (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں یہ حدیث سناتے ہیں کہ فلاں شخص کی اونٹنی، فلاں وادی میں، فلاں فلاں دن ہے، یہ غیب کو کیا جانیں!

(جامع البیان ج ۱۰ ص ۲۲۱-۲۲۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ ابو عبداللہ قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں: منافقین نے یہ کلماتِ کفریہ سنجیدگی سے کہے تھے یا مذاق سے اور جس طرح بھی انہوں نے یہ کلمات کہے ہوں یہ کفر ہے کیونکہ اس میں ائمہ کا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مذاق سے کلمہ کفریہ کہنا بھی کفر ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۸ ص ۱۲۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

نیز اس سے یہ معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی ایسا کلمہ کہنا جو عرف میں توہین کے لیے متعین ہو وہ کفر ہے اور اس کا قائل واجب القتل ہے خواہ اس نے توہین کی نیت کی ہو یا نہیں، کیونکہ منافقین نے کہا: ہم نے توہین کی نیت سے ایسا نہیں کہا تھا، مذاق سے کہا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب بہانے نہ بناؤ تم ایمان کا اظہار کرنے کے بعد کفر کر چکے ہو۔

علامہ قرطبی نے لکھا ہے: یہ تین آدمی تھے، دو نے مذاق اُڑایا اور ایک ان کی بات پر ہنسا تھا۔ جو آدمی ہنسا تھا وہ صدقِ دل سے نادم اور تائب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف کر دیا۔ اس نے دُعا کی تھی کہ اللہ اس کو شہادت عطا فرمائے اور اس کی قبر کا کسی کو پتا نہ چلے۔ وہ جنگِ یمامہ میں شہید ہو گیا اور مذاق اُڑانے والے کفر اور نفاق پر قائم رہے اور مستحق عذاب ہوئے۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۸ ص ۱۲۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

وقف لازم

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ

منافق مرد اور منافق عورتیں (نفاق میں) سب ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، برائی کا

بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ

حکم دیتے ہیں اور نیکی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں

نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۶۷﴾

انہوں نے اللہ کو بھلا دیا سو اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا بے شک منافقین ہی فاسق ہیں ○

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ

اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کفار کو دوزخ کی آگ کی وعید سنائی ہے

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ ان کے لیے کافی ہے اور اللہ نے ان پر لعنت فرمائی ہے اور ان کے لیے

مُّقِيْمٌ ﴿٦٨﴾ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً

دائمی عذاب ہے ○ اے منافقو! تم ان لوگوں کی مثل ہو جو تم سے پہلے تھے، وہ تم سے زیادہ قوت والے تھے،

وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ

اور تم سے زیادہ مال دار اور اولاد والے تھے، سو انہوں نے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا تو تم نے بھی

بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ

اپنے حصہ سے فائدہ حاصل کر لیا، جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں نے اپنے حصے سے فائدہ حاصل کیا تھا

وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي

اور تم بھی فضول کاموں میں مشغول ہوگئے جیسا کہ وہ فضول کاموں میں مشغول ہوگئے تھے، ان لوگوں کے اعمال دنیا اور

الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَلَمْ يَاْتِهِمْ

آخرت میں ضائع ہوگئے اور وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں ○ کیا ان لوگوں کے پاس

نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۙ وَقَوْمِ

ان سے پہلے لوگوں کی خبر نہیں پہنچی، نوح کی قوم کی اور عاد اور ثمود کی، اور ابراہیم

اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ

کی قوم کی اور اصحاب مدین کی اور (ان کی) جن کی بستیوں کو الٹ دیا گیا تھا، ان کے پاس ان کے رسول

بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

معجزات لے کر آئے تھے، سو ان پر ظلم کرنا اللہ کے شایان شان نہیں تھا لیکن وہ خود اپنی جانوں پر

يَظْلِمُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وقف لازم

ظلم کرتے تھے ○ اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے کارساز ہیں،

يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ

وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نماز

الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ

قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں،

اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾ وَعَدَ

ان ہی لوگوں پر عنقریب اللہ رحم فرمائے گا، بے شک اللہ بہت غلبہ والا بے حد حکمت والا ہے ○ اللہ نے

اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ان جنتوں کا وعدہ فرمایا ہے جن کے نیچے سے

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ

دریا بہتے ہیں، جس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور دائمی جنتوں میں پاکیزہ رہائش گاہوں کا (وعدہ فرمایا ہے)

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾ ع ۱۵ ۶

اور اللہ کی رضا (ان سب سے) بڑی ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: منافق مرد اور منافق عورتیں (نفاق میں) سب ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں، انہوں نے اللہ کو بھلا دیا سو اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا، بے شک منافقین ہی فاسق ہیں ○ (التوبہ: ۶۷)

اللہ تعالیٰ کے بھلانے کا معنی

اس آیت سے اللہ تعالیٰ منافقین کی ایک اور قسم کی خرابیاں بیان فرما رہا ہے اور اس آیت سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ان کی عورتیں بھی ان کے مردوں کی طرح نفاق کی خرابیوں میں ملوث ہیں، نیز فرمایا ہے کہ منافق برائی کا حکم دیتے ہیں یعنی وہ لوگوں کو کفر کرنے اور معصیت کا حکم دیتے ہیں، اس سے مراد ہر قسم کی برائی اور معصیت ہے اور خصوصیت کے ساتھ وہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تکذیب کا حکم دیتے ہیں اور ہر قسم کے نیک کاموں سے منع کرتے ہیں اور خصوصاً سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانے سے منع کرتے ہیں اور فرمایا وہ اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں یعنی ہر خیر سے اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں، ایک قول یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ، صدقات اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں، اور اس سے یہ بھی مراد ہے کہ وہ ہر اس نیک کام کو نہیں کرتے جو فرض یا واجب ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ صرف فرض یا واجب کے ترک پر ملامت فرماتا ہے، اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ وہ جہاد میں شریک نہیں ہوتے۔

نیز اس آیت میں فرمایا ہے: انہوں نے اللہ کو بھلا دیا اس پر اعتراض ہے کہ بھول پر تو مواخذہ نہیں ہوتا اور نہ اس پر ملامت کی جاتی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ان کا فسق فرمایا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بھلانے کا لازمی معنی مراد ہے اور وہ ہے اللہ کے احکام پر عمداً عمل نہ کرنا اور ان کو اسی وجہ سے فاسق فرمایا ہے، پھر فرمایا ہے سو اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا، اس

پر یہ اعتراض ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے بھولنا محال ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بھی بھلانے سے اس کا لازمی معنی مراد ہے یعنی ان پر لطف و کرم نہ فرمانا اور ان کو عذاب میں مبتلا کرنا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کفار کو دوزخ کی آگ کی وعید سنائی ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور وہ ان کے لیے کافی ہے اور اللہ نے ان پر لعنت فرمائی ہے اور ان کے لیے دائمی عذاب ہےO (التوبہ: ۶۸)

عذاب مقیم کا معنی

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے جرائم بیان فرمائے تھے کہ وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے منع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل نہیں کرتے اور اس آیت میں ان جرائم کی سزا بیان فرمائی ہے کہ وہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں رہیں گے، اور اللہ نے ان پر لعنت فرمائی ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی رحمت سے بالکل دور کر دیا، پھر فرمایا ان کے لیے عذاب مقیم ہے، اس پر اعتراض ہے کہ عذاب مقیم کا معنی ہے دائمی عذاب اور اس کا ذکر تو خالدین فیھا میں ہو چکا لہٰذا یہ تکرار ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے فرمایا تھا ان کو دوزخ کی آگ کا دائمی عذاب ہوگا اور عذاب مقیم سے مراد کسی اور قسم کا عذاب ہے جو ان کو دائمی ہوگا، دوسرا جواب یہ ہے کہ عذاب مقیم سے مراد ان کا دنیاوی عذاب ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کو اپنے نفاق کی وجہ سے ہر وقت یہ خوف رہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے نفاق سے مطلع کر دے گا اور ان کو ہر وقت اپنی رسوائی کا خطرہ رہتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے منافقو! تم) ان لوگوں کی مثل ہو جو تم سے پہلے تھے، وہ تم سے زیادہ قوت والے تھے، اور تم سے زیادہ مالدار اور اولاد والے تھے، سو انہوں نے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا تو تم نے بھی اپنے حصہ سے فائدہ حاصل کر لیا، جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں نے اپنے حصہ سے فائدہ حاصل کیا تھا، اور تم بھی فضول کاموں میں مشغول ہو گئے جیسا کہ وہ فضول کاموں میں مشغول ہو گئے تھے، ان لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیںO (التوبہ: ۶۹)

منافقین کی پہلے زمانہ کے کافروں کے ساتھ مشابہت

اللہ تعالیٰ نے ان منافقین کو ان کفار کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو ان سے پہلے زمانہ میں تھے۔ وہ بھی برائی کا حکم دیتے تھے اور نیکی سے منع کرتے تھے، اور خیرات کرنے سے اپنے ہاتھ بند رکھتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ وہ کافر ان منافقین سے زیادہ قوت والے تھے اور ان سے زیادہ مال اور اولاد والے تھے، پھر انہوں نے اس فانی زندگی سے چند روز فائدہ اٹھایا اور پھر بالآخر دائمی عذاب کی طرف لوٹ گئے، اور تم جبکہ ان کی بہ نسبت کمزور ہو اور تمہارے پاس دنیاوی اچھائیاں بھی ان کی بہ نسبت کم ہیں تو تمہارا دائمی عذاب کی طرف لوٹنا زیادہ لائق ہے۔

دوسری وجہ تشبیہ یہ ہے کہ منافقین نے دنیاوی عیش و آرام اور لذتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت سے اعراض کیا تھا، جس طرح ان سے پہلے زمانہ کے کافروں نے دنیاوی لذتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت سے عدول کیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے مال اور اولاد کی کثرت اور قوت کو بیان کر کے فرمایا انہوں نے اپنے حصے کی دنیاوی بھلائی سے فائدہ اٹھایا اسی طرح اے منافقو! اب تم بھی اپنے حصہ کی دنیاوی لذتوں سے فائدہ اٹھالو۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں ضائع ہو گئے، یعنی ان کی کی ہوئی نیکیاں ان کے مرنے کے بعد باطل ہو گئیں کیونکہ مرنے کے بعد کافر کو اس کی نیکیوں پر کوئی اجر نہیں ملتا، پھر فرمایا: سو وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں،

کیونکہ ان منافقوں اور کافروں نے انبیاء علیہم السلام اور رسل عظام کارد کرنے میں اپنے آپ کو سخت مشقت میں ڈالا لیکن اس کے عوض میں انہوں نے دنیا اور آخرت کی نیکیوں کے ضائع ہونے کے سوا اور کچھ نہیں پایا، اور دنیا اور آخرت میں جو عذاب ان کو ملا وہ اس پر مستزاد ہے۔ اس مثال سے مقصود یہ ہے کہ ان سے پہلے کے کافروں کو اعمال ضائع ہونے اور رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا جبکہ وہ کافران منافقوں سے زیادہ طاقت ور تھے اور ان کے اموال اور اولاد بھی بہت زیادہ تھی، تو یہ منافقین اس بات کے زیادہ لائق ہیں کہ یہ دنیا اور آخرت کے فوائد سے محروم ہوں اور دنیا اور آخرت کے عذاب میں مبتلا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا ان لوگوں کے پاس ان سے پہلے لوگوں کی خبر نہیں پہنچی نوح کی قوم کی اور عاد اور ثمود کی اور ابراہیم کی قوم کی اور اصحاب مدین کی اور (ان کی) جن کی بستیوں کو الٹ دیا گیا تھا، ان کے پاس ان کے رسول معجزات لے کر آئے تھے سو ان پر ظلم کرنا اللہ کے شایان شان نہیں تھا لیکن وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے○ (التوبہ: ۷۰)

سابقہ قوموں کے عذاب سے منافقوں کو نصیحت فرمانا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: کیا ان لوگوں کے پاس ان سے پہلے لوگوں کی خبر نہیں پہنچی اور پہلے لوگوں میں اللہ تعالیٰ نے چھ قوموں کا ذکر فرمایا ہے: (۱) حضرت نوح علیہ السلام کی قوم، ان کو اللہ تعالیٰ نے طوفان میں غرق کر دیا تھا (۲) قوم عاد، ان کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہولناک آندھی کے عذاب سے ہلاک کر دیا تھا (۳) قوم ثمود، ان کو اللہ تعالیٰ نے گرج اور کڑک کے عذاب سے ہلاک کر دیا تھا (۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم، اللہ تعالیٰ نے ان کو دی ہوئی نعمتیں ان سے چھین کر ان کو ہلاک کر دیا تھا اور نمرود کے دماغ میں ایک مچھر مسلط کر دیا تھا (۵) حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم، اور یہ اصحاب مدین تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مدین بن ابراہیم کی اولاد تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے یوم الظلۃ کے عذاب سے ہلاک کر دیا، الظلۃ کے معنی ہیں سائبان، ان کے پاس سائبان کی طرح ابر آیا اور اس میں سے آگ برسی اور زمین میں زلزلہ آیا جس سے سخت ہولناک آواز آئی اور پوری قوم تباہ ہو گئی۔ (۶) المؤتفکات، یہ مؤتفکہ کی جمع ہے اور لغت میں الائتفاک کا معنی ہے انقلاب، اس سے مراد ہے قوم لوط۔ ان کی زمین کو اللہ تعالیٰ نے پلٹ دیا تھا زمین کا نچلا حصہ اوپر، اور اوپر کا حصہ نیچے کر دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا ان لوگوں کے پاس ان سے پہلے لوگوں کی خبر نہیں پہنچی؟ پھر اللہ تعالیٰ نے ان چھ قوموں کا ذکر فرمایا، کیونکہ عرب والوں کے پاس ان لوگوں کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ وہ لوگوں سے بھی ان کے متعلق خبریں سنتے رہتے تھے، کیونکہ جن علاقوں سے متعلق یہ خبریں تھیں وہ ان کے آس پاس تھے، مثلاً شام اور عراق وغیرہ اور وہ ان علاقوں کے سفر میں ان کے آثار کا مشاہدہ کرتے تھے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سو ان پر ظلم کرنا اللہ کے شایان نہیں تھا لیکن وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ آیت کے اس حصہ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان قوموں پر جو عذاب نازل فرمایا وہ اللہ کی طرف سے ان پر کوئی ظلم نہیں تھا، کیونکہ وہ اپنے ناجائز افعال کی وجہ سے اور انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی بے حد تکذیب کرنے کی وجہ سے اس عذاب کے مستحق ہو چکے تھے، اس وجہ سے انہوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے کارساز ہیں، وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، ان ہی لوگوں پر عنقریب اللہ رحم فرمائے گا بے شک اللہ بہت غلبہ والا بے حد حکمت والا ہے○ (التوبہ: ۷۱)

منافقوں اور مومنوں میں تقابل

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی صفات قبیحہ ان کے عقائد فاسدہ اور ان کے اعمال خبیثہ بیان فرمائے تھے، اور اب اس کے بعد کی آیات میں ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ مومنوں کی صفات حسنہ، ان کے عقائد صحیحہ اور ان کے اعمال صالحہ بیان فرما رہا ہے، نیز پہلے منافقوں کے بد اعمال بیان فرما کر ان کی سزا کا بیان فرمایا تھا اور اب مومنوں کے نیک اعمال بیان فرما کر ان کی جزاء کا ذکر فرمائے گا۔

پہلی آیتوں میں فرمایا تھا کہ منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اور اب اس آیت میں فرما رہا ہے کہ مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے کارساز ہیں، منافق ہوائے نفس کی بناء پر ایک دوسرے کی تقلید کرتے تھے اور مومنوں کو جو ایک دوسرے کی موافقت حاصل ہوئی وہ اندھی تقلید کی بناء پر نہیں تھی بلکہ وہ سب حق کی تلاش کے لیے استدلال کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان کو توفیق اور ہدایت عطا فرماتا تھا، منافق برائی کا حکم دیتے تھے اور نیکی سے منع کرتے، نمازوں میں سستی کرتے تھے اور زکوٰۃ اور صدقات ادا کرنے میں اپنے ہاتھ بندھے رکھتے اور مومن نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے منع کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ اور صدقات خوش دلی اور فراخ دستی سے ادا کرتے ہیں، سو اللہ تعالیٰ مومنین کی جزاء کا ذکر فرماتا ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ان جنتوں کا وعدہ فرمایا ہے جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور دائمی جنتوں میں پاکیزہ رہائش گاہوں کا (وعدہ فرمایا ہے) اور اللہ کی رضا (ان سب سے) بڑی ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے ○ (التوبہ: ۷۲)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لیے ان جنتوں (باغات) کا ذکر فرمایا ہے جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں اور ان دائمی جنتوں کا ذکر فرمایا ہے جو مومنوں کی دائمی پاکیزہ رہائش گاہیں ہیں، ہوسکتا ہے کہ پہلی قسم کی جنتیں مسلمانوں کی سیر و تفریح اور احباب سے ملاقات کے لیے ہوں اور دوسری قسم کی جنتیں مسلمانوں کی رہائش کے لیے ہوں۔

دائمی جنتوں میں پاکیزہ رہائش گاہیں اور جنت کی نعمتیں

امام محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عمران بن حصین اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسکن طیبۃ فی جنات عدن کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: یہ موتیوں کا ایک محل ہے، اس میں سرخ یاقوت کی ستر حویلیاں ہیں، ہر حویلی میں سبز زمرد کے ستر گھر ہیں، ہر گھر میں ستر تخت ہیں، ہر تخت پر ہر رنگ کے ستر بستر ہیں، ہر بستر پر بڑی آنکھوں والی ایک گوری بیوی ہے، ہر گھر میں ستر دسترخوان ہیں، ہر دسترخوان پر ستر قسم کے کھانے ہیں، ہر گھر میں ستر خدمت گار ہیں اور مومن کو ہر صبح اتنی قوت دی جائے گی کہ وہ ان تمام چیزوں کو صرف کر سکے۔

(جامع البیان ج ۱۰، ص ۲۲۹، تفسیر امام بن ابی حاتم ج ۶، ص ۱۸۴۰)

حضرت عبداللہ بن قیس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو جنتیں چاندی کی ہیں، ان کے برتن اور ان میں جو کچھ ہے وہ چاندی کا ہے اور دو جنتیں سونے کی ہیں، ان کے برتن اور ان میں جو کچھ ہے وہ سونے کا ہے، لوگوں کے اور ان کے رب کے درمیان صرف کبریائی کی چادر ہے جو اللہ کے چہرہ پر جنت عدن میں ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۸۷۸، ۷۴۴۴، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۸۰، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۵۲۸، سنن ابن ماجہ رقم

الحدیث:۱۸۶)

حضرت عبداللہ بن قیس اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن کے لیے جنت میں کھوکھلے موتیوں کاایک خیمہ ہے جس کا طول ساٹھ میل ہے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۸۳۸، صحیح البخاری رقم الحدیث:۴۸۸۰، سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۵۲۸، سنن الدارمی رقم الحدیث:۲۸۳۳)

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جنت میں سو درجے ہیں: ہر دو درجوں میں زمین و آسمان جتنا فاصلہ ہے اور فردوس ان میں سب سے بلند درجہ ہے، اسی سے جنت کے چار دریا نکلتے ہیں اور اس کے اوپر عرش ہے پس جب تم اللہ سے سوال کرو تو فردوس کا سوال کرو۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۵۳۰، سنن نسائی رقم الحدیث:۳۱۳۱، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۴۳۳۱، المستدرک ج ۳، ص ۸۰، مسند احمد رقم الحدیث:۲۱۹۸۶، ۲۲۵۹۴، مطبوعہ دارالحدیث قاہرہ، حافظ شاکر نے کہا اس کی سند صحیح ہے)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو پہلا گروہ جنت میں داخل ہوگا اس کی صورت چودھویں رات کے چاند کی طرح ہوگی، پھر جو ان کے قریب ہوں گے ان کی صورت چمک دار ستارے کی طرح ہوگی، وہ پیشاب اور پاخانہ نہیں کریں گے، تھوکیں گے نہ ان کی ناک نکلے گی، ان کی سونے کی کنگھی ہوگی اور ان کا پسینہ مشک کی طرح ہوگا، ان کی انگیٹھیوں میں عود سلگتا ہوگا، ان کی بیویاں بڑی آنکھوں والی حوریں ہوں گی، ان سب کی تخلیق ایک شخص کی طرح ہوگی، وہ سب اپنے باپ (حضرت) آدم کی صورت پر ہوں گے، جن کا قد آسمان میں ساٹھ گز کے برابر ہوگا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۳۳۲۷، صحیح مسلم رقم الحدیث:۱۶۲۵، سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۵۳۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۴۳۳۳، سنن الدارمی رقم الحدیث:۲۸۲۳، شرح السنہ ج ۱۵، ص ۲۱۲)

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک جنتی شخص کو کھانے پینے، جماع اور شہوت میں سو آدمیوں کی طاقت ہوگی۔ ایک یہودی نے یہ سن کر کہا جو شخص کھائے گا اور پئے گا اس کو قضاء حاجت بھی ہوگی، آپ نے فرمایا: اس کے جسم سے پسینہ نکلے گا جس سے اس کا جسم سکڑ جائے گا۔

(سنن دارمی رقم الحدیث:۲۸۲۵، مسند احمد رقم الحدیث:۱۹۲۱۰، مطبوعہ دارالحدیث قاہرہ)

امام ترمذی نے حضرت انس سے اس باب کی حدیث کو روایت کیا ہے، (سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۵۳۶) اور امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ مسند احمد رقم الحدیث:۱۹۲۱۰، مطبوعہ دارالحدیث قاہرہ)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہل جنت میں سے ادنیٰ شخص وہ ہوگا جس کے اسی ہزار خادم ہوں گے اور اس کی بہتر (۷۲) بیویاں ہوں گی اور اس کے لیے موتی، زمرد اور یاقوت کا اتنا بڑا گنبد بنایا جائے گا جتنی جابیہ اور صنعاء میں مسافت ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۵۶۲)

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ منبر پر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا: جنت میں سب سے کم درجہ کس شخص کا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ ایک شخص ہوگا جو تمام جنتیوں کے جنت میں داخل ہونے کے بعد جنت میں جائے گا، اس سے کہا جائے گا جنت میں چلے جاؤ۔ وہ شخص کہے گا اے میرے رب میں جنت میں کہاں جاؤں، جنت کے محلات اور مناصب پر تو لوگوں نے پہلے ہی قبضہ کرلیا ہے۔ اس سے کہا

جائے گا: کیا تم اس بات پر راضی ہو کہ تم کو جنت میں اتنا علاقہ مل جائے جتنا دنیا میں کسی بادشاہ کے ملک کا علاقہ ہوتا ہے۔ وہ شخص عرض کرے گا: اے میرے رب! میں راضی ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: جاؤ یہ علاقہ لے لو اور اس کا پانچ گنا علاقہ اور لے لو اور اس کے علاوہ وہ چیز بھی لے لو جو تمہارے دل کو پسند آئے اور تمہاری آنکھوں کو اچھی لگے۔ وہ شخص کہے گا اے میرے رب! میں راضی ہوں، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: اور جن لوگوں کا جنت میں سب سے بڑا درجہ ہوگا وہ کون لوگ ہوں گے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ وہ گروہ ہے جس کو میں نے پسند کرلیا اور ان کی عزت و کرامت پر میں نے مہر لگادی، ان کو وہ نعمتیں ملیں گی جن کو کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا، اور نہ کسی کے ذہن میں اس کا تصور آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان نعمتوں کی تصدیق قرآن مجید کی اس آیت میں ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ (السجدۃ: ۱۷)

کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے لیے کیا کیا نعمتیں چھپائی ہوئی ہیں۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۸۹، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۹۸، مسند احمد ج ۳، ص ۹۵، ۸۸)

اللہ کی رضا اور اس کے دیدار کا سب سے بڑی نعمت ہونا

اللہ تعالیٰ نے جنات اور مساکن طیبہ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ان سب سے بڑی چیز اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اہل جنت سے فرمائے گا: اے اہل جنت! وہ کہیں گے لبیک اے ہمارے رب، ہم تیری اطاعت کے لیے حاضر ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم راضی ہوگئے؟ وہ کہیں گے: ہم کیوں نہیں راضی ہوں گے، تو نے ہمیں اتنا کچھ عطا فرمایا ہے جو تو نے اپنی مخلوق میں کسی کو عطا نہیں فرمایا: اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں تم کو اس سے افضل چیز عطا فرماؤں گا۔ وہ عرض کریں گے: اس سے افضل چیز اور کیا ہوگی؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں نے تم پر اپنی رضا حلال کردی ہے، میں اب تم سے کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۵۱۸، صحیح مسلم الحدیث: ۲۸۲۹، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۵۶۴)

اللہ کی رضا سب سے بڑی نعمت ہے، بندہ کو جب یہ علم ہو جائے کہ اس کا مولیٰ اس سے راضی ہے تو اس کو ہر نعمت سے زیادہ خوشی ہوتی ہے، جیسا کہ اس کو جسمانی آرام اور آسائش حاصل ہو لیکن اس کو یہ علم ہو کہ اس کا مولیٰ اس سے ناراض ہے تو تمام عیش اور آرام مکدر ہو جاتا ہے اور اس کو پھولوں کی سیج بھی کانٹوں کی طرح چبھتی ہے اور جب اس کو اپنے مولیٰ اور محبوب کی رضا کا علم ہو تو جسمانی تکالیف اور بھوک و پیاس کا بھی احساس نہیں ہوتا چہ جائیکہ جسمانی نعمتوں اور لذتوں کے ساتھ اس کو یہ علم ہو کہ اس کا مالک اور مولیٰ اور محبوب بھی اس سے راضی ہے تو اس کی خوشی اور راحت کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔

حسن بصری نے کہا: اللہ کی رضا سے ان کے دلوں میں جو لذت اور خوشی حاصل ہوتی ہے وہ جنت کی تمام نعمتوں سے زیادہ لذیذ ہوتی ہے اور ان کی آنکھیں سب سے زیادہ اس نعمت سے ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ زمخشری نے کہا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اللہ کی رضا سب سے بڑی ہے، اس میں مقربین کے درجات کی طرف اشارہ ہے ہرچند کہ تمام جنتی اللہ تعالیٰ سے راضی ہوتے ہیں لیکن ان کے درجات مختلف ہوتے ہیں، ہر فلاح اور سعادت کا سبب اللہ کی رضا ہے۔

(البحر المحیط ۵ ص ۴۶۲-۴۶۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۲ھ)

اللہ تعالیٰ کی رضا اس وقت حاصل ہوگی جب اہل جنت اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے

چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھا۔ آپ نے فرمایا: تم عنقریب اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو، اگر تم سے ہو سکے تو طلوع شمس سے پہلے اور غروب شمس سے پہلے کی نمازوں (فجر اور عصر کی نمازوں) سے عاجز نہ ہونا' پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی:

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝ (ق: ٣٩) طلوع شمس سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجئے اور غروب سے پہلے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٥٥٤، صحیح مسلم رقم الحدیث: ٦٣٣، سنن الترمذی رقم الحدیث: ٢٥٥١، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٤٧٢٩، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ١٧٧)

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائے گا: تم کوئی اور چیز چاہتے ہو جو میں تم کو عطا فرماؤں! وہ عرض کریں گے: کیا تو نے ہمارا چہرہ سفید نہیں کیا! کیا تو نے ہم کو جنت میں داخل نہیں کیا!! کیا تو نے ہم کو دوزخ سے نجات نہیں دی!!! آپ نے فرمایا: پھر اللہ تعالیٰ حجاب منکشف کر دے گا، اور اہل جنت کو ایسی کوئی چیز نہیں عطا کی گئی ہوگی جو ان کو اپنے رب عزوجل کے دیدار سے زیادہ محبوب ہو۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٨١، سنن الترمذی رقم الحدیث: ٢٥٥٢، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ١٨٧، مسند احمد رقم الحدیث: ١٨٩٦٣، ١٨٩٥٨، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں یہ دعا کرتے تھے: اے اللہ! اپنے علم غیب سے اور مخلوق پر اپنی قدرت سے مجھے اس وقت تک زندہ رکھنا جب تک میرے لیے زندہ رہنا بہتر ہو اور مجھے اس وقت وفات دینا جب تیرے علم میں میرے لیے وفات بہتر ہو، اے اللہ! میں تجھ سے غیب میں (جب کوئی دیکھ نہ رہا ہو) اور شہادت میں (لوگوں کے سامنے) تیرے خوف کا سوال کرتا ہوں، اور میں رضا اور غضب میں کلمہ حق کہنے کا سوال کرتا ہوں، اور فقر اور غنا میں میانہ روی کا سوال کرتا ہوں اور میں تجھ سے ختم نہ ہونے والی نعمت کا سوال کرتا ہوں، اور زائل نہ ہونے والی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سوال کرتا ہوں، اور تقدیر واقع ہونے کے بعد اس پر راضی رہنے کا سوال کرتا ہوں اور موت کے بعد ٹھنڈی زندگی کا سوال کرتا ہوں اور تیرے چہرے کی طرف دیکھنے کی لذت کا اور تجھ سے ملاقات کے شوق کا سوال کرتا ہوں جو بغیر کسی ضرر اور گمراہ کرنے والے فتنہ کے حاصل ہو، اے اللہ! ہمیں ایمان کی زینت کے ساتھ مزین کر اور ہمیں ہدایت یافتہ اور ہدایت دینے والا بنا دے۔ (سنن النسائی رقم الحدیث: ١٣٠٤، مسند احمد ج ٤، ص ٢٦٤)

اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے دیدار کرنے اور اس کی ملاقات کے شوق کے حصول کی دعا کی ہے۔

ابویزید نے کہا: اللہ کے کچھ ایسے بندے ہیں کہ اگر اللہ جنت میں اپنے چہرے کو حجاب میں کرے تو وہ جنت میں اس طرح فریاد کریں گے جس طرح دوزخی دوزخ میں فریاد کرتے ہیں۔

بعض حکایات میں ہے کہ کسی نے خواب میں دیکھا کہ معروف کرخی کے متعلق کہا گیا کہ یہ معروف کرخی ہیں، جب یہ دنیا سے گئے تو اللہ کی طرف مشتاق تھے تو اللہ عزوجل نے اپنا دیدار ان کے لیے مباح کر دیا۔

کہا گیا ہے کہ اللہ عزوجل نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ جو لوگ مجھ سے روگردانی کیے ہوئے ہیں کاش وہ جانتے کہ مجھ کو ان کا کتنا انتظار ہے اور ان کے لیے کیسی نرمی ہے اور ان کے گناہ ترک کرنے کا مجھ کو کتنا شوق ہے تو وہ میرے اشتیاق میں مرجاتے اور میری محبت میں ان کی رگیں کٹ جاتیں، اے داؤد! یہ تو مجھ سے روگردانی کرنے والوں کے لیے میرا

ارادہ ہے تو جو میری طرف بڑھنے والے ہیں ان کے متعلق میرا ارادہ کیسا ہوگا!

استاذ ابو علی الدقاق یہ کہتے تھے: حضرت شعیب علیہ السلام روئے حتیٰ کہ نابینا ہو گئے، پھر اللہ عزوجل نے ان کی بینائی لوٹا دی، وہ پھر روئے حتیٰ کہ نابینا ہو گئے، اللہ عزوجل نے پھر ان کی بینائی لوٹا دی، وہ پھر روئے حتیٰ کہ نابینا ہو گئے، پھر اللہ عزوجل نے ان کی طرف وحی کی اگر تمہارا یہ رونا جنت کے لیے ہے تو میں تمہارے لیے جنت مباح کر دیتا ہوں، اور اگر تمہارا یہ رونا دوزخ کی وجہ سے ہے تو میں تمہیں دوزخ سے پناہ دے دیتا ہوں۔ انہوں نے کہا: نہیں بلکہ میں تجھ سے ملاقات کے شوق میں رو رہا ہوں۔ اللہ عزوجل نے ان کی طرف وحی کی: اسی وجہ سے میں نے اپنے نبی اور اپنے کلیم کو دس سال تمہاری خدمت میں رکھا۔

اور کہا گیا ہے کہ جو اللہ کی طرف مشتاق ہو اس کی طرف ہر چیز مشتاق ہوتی ہے، اور حدیث میں ہے: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت تین شخصوں کی مشتاق ہے: علی، عمار اور سلمان۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۸۲۳، تاریخ دمشق ج ۵، ص ۲۵۹)

(رسالہ قشیریہ ص ۳۶۱-۳۵۹، ملحصا، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ)

جنت کی تخفیف نہ کی جائے

سورۂ توبہ کی اس آیت کریمہ: ۷۲ اور مذکورہ الصدر احادیث اور اقوال صوفیہ کا یہ تقاضا ہے کہ عذاب نار سے نجات اور جنت کی تمام نعمتوں سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کا دیدار اور اس کی رضا ہے اور یہ بالکل برحق ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عذاب نار سے نجات اور جنت کوئی معمولی نعمت ہے اور جنت کی تخفیف کی جائے یا العیاذ باللہ جنت کی تحقیر کی جائے، قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں بہت زیادہ جنت کی تعریف کی گئی ہے اور اس کی طرف رغبت دلائی گئی ہے اور تمام نبیوں اور رسولوں نے دوزخ کے عذاب سے پناہ مانگی ہے اور جنت کے حصول کی دعا کی ہے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ تلقین کی ہے کہ ہم عذاب نار سے پناہ مانگیں اور جنت الفردوس کے حصول کی دعا کریں اور یہ ذہن میں رکھیں کہ اللہ کی رضا اور اس کا دیدار بھی ہمیں جنت میں ہی حاصل ہوگا اس لیے بھی جنت مقصود ہے اور ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دائمی قیام گاہ بھی جنت ہے اور محبوب کا دیار اور اس کا گھر بھی محبوب ہوتا ہے اس لیے بھی جنت ہمیں مطلوب اور محبوب ہونی چاہیے۔ اے اللہ! ہمیں دوزخ کے اور ہر قسم کے عذاب سے اپنی پناہ میں رکھ اور ہمیں جنت الفردوس عطا فرما، ہم سے راضی ہو جا اور ہمیں اپنا دیدار عطا فرما! بے شک تیری رضا اور تیرا دیدار سب سے بڑی نعمت ہے سو ہم سے وہ کام کرا جن سے تو راضی ہو! اور ان کاموں سے بچا جن سے تو ناراض ہو۔ آمین یارب العلمین بحرمۃ نبیک سیدنا محمد خاتم النبیین، قائد المرسلین شفیع المذنبین وعلی الہ الطاھرین واصحابہ الراشدین وعلی اولیاء امتہ وعلماء ملتہ وسائر المؤمنین والمسلمین اجمعین۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ

اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے،

وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا

ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے ○ وہ (منافق) اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ

قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ

انہوں نے نہیں کہا، حالانکہ بے شک انہوں نے کلمہ کفر یہ کہا ہے اور وہ اپنے اسلام کے بعد کافر ہو گئے

وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ

اور انہوں نے اس کام کا قصد کیا جو ان کو حاصل نہ ہو سکا، اور ان کو صرف یہ ناگوار گزرا کہ اللہ

وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ

اور اس کے رسول نے انہیں اپنے فضل سے غنی کر دیا، پس اگر وہ توبہ کرلیں تو ان کے حق میں بہتر ہوگا، اور اگر

يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ

وہ اعراض کریں تو اللہ دنیا اور آخرت میں ان کو دردناک عذاب دے گا۔

وَمَا لَهُمْ فِى الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ

اور ان کے لیے زمین میں کوئی کارساز اور مددگار نہیں ہوگا ○ اور ان میں سے

عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ

بعض (منافقین) وہ ہیں جنہوں نے اللہ سے یہ عہد کیا تھا اگر ہم کو اللہ نے اپنے فضل سے (مال) دیا تو ہم ضرور بہ ضرور صدقہ کریں گے اور

مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ

ضرور بہ ضرور نیکوکاروں میں سے ہو جائیں گے ○ پس جب اللہ نے اپنے فضل سے انہیں (مال) عطا کیا تو انہوں نے اس میں بخل کیا

وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ

اور انہوں نے پیٹھ پھیرلی درآں حالیکہ وہ اعراض کرنے والے تھے ○ سو اس کے بعد اللہ نے ان کے دلوں میں اس دن تک کے

اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا

لیے نفاق ڈال دیا جس دن وہ اس کے حضور پیش ہوں گے، کیونکہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور اس لیے

يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ

بھی کہ وہ جھوٹ بولتے تھے ○ کیا انہیں یہ معلوم نہیں کہ اللہ ان کے دل کے راز کو اور ان کی سرگوشیوں کو (بھی) جانتا ہے

وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۷۸﴾ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ

اور بے شک اللہ تمام غیبوں کو بہت زیادہ جاننے والا ہے ○ بے شک جو (منافق) خوشی سے صدقہ دینے والے

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ

مومنوں کو طعنہ دیتے ہیں اور ان کو جن کے پاس (صدقہ کے لیے) اپنی محنت کی مزدوری کے سوا اور کچھ نہیں ہے

فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾

سو وہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں، اللہ ان کو ان کے مذاق اڑانے کی سزا دے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ○

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ

آپ ان کے لیے مغفرت طلب کریں یا نہ کریں اگر آپ ان کے لیے ستر مرتبہ بھی مغفرت طلب کریں

مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ

تو اللہ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾ ع ۱۰ ع ۸ ۱۶

اور اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے، ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے○ (التوبہ: ۷۳)

منافقوں کے خلاف جہاد کی توجیہ

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی قبیح صفات بیان کیں، اور مسلمانوں کے خلاف ان کی سازشوں کا بیان فرمایا اور آخرت میں ان کی سزا کا ذکر فرمایا پھر اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی نیک صفات اور آخرت میں ان کے اجر و ثواب کا ذکر فرمایا، اب پھر دوبارہ اللہ تعالیٰ نے منافقوں اور کافروں کا ذکر فرمایا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو کفار اور منافقین سے جہاد کرنے اور ان کے ساتھ سختی کرنے کا حکم دیا۔ اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ منافق اپنے کفر کو خفیہ رکھتا ہے اور زبان سے کفر کا انکار کرتا ہے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا معاملہ کیا جاتا ہے اور منافق کا قصہ تو الگ رہا کسی شخص کے بھی باطن پر حکم نہیں لگایا جاتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں صرف ظاہر پر حکم لگاتا ہوں اور باطن کا حال اللہ کے سپرد ہے۔

(احیاء علوم الدین ج ۴، ص ۱۸۶، مطبوعہ ۱۴۱۹ھ)

نیز امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ تبوک سے واپس آئے تو اسی (۸۰) سے زیادہ لوگوں نے قسم کھا کر آپ کے ساتھ نہ جانے کے متعلق عذر پیش کیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر کا اعتبار کر کے ان کے عذر قبول

کیے اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۷۷۹)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ منافقین کے ساتھ ان کے ظاہر کے مطابق معاملہ کیا جاتا ہے تو پھر ان کے خلاف جہاد کرنے کی کیا توجیہ ہوگی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں فرمایا ہے کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجئے اور ان دونوں سے الگ الگ نوعیت کا جہاد مطلوب ہے، کافروں کے ساتھ تلوار کے ساتھ جہاد مطلوب ہے اور منافقوں کے ساتھ جہاد کا معنی یہ ہے کہ ان کے سامنے اسلام کی حقانیت پر دلائل پیش کیے جائیں، اور اب ان کے ساتھ نرم رویہ کو ترک کر دیا جائے اور ان کو زجر و توبیخ اور ڈانٹ ڈپٹ کی جائے۔

اس حدیث کی تحقیق کہ میں صرف ظاہر پر حکم کرتا ہوں (الحدیث)

ہم نے مذکورہ الصدر پیراگراف میں احیاء العلوم کے حوالہ سے یہ حدیث ذکر کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں صرف ظاہر پر حکم کرتا ہوں اور باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ قاضی شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ نے اس حدیث کے متعلق لکھا ہے: اہل اصول اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

(الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ ص ۲۰۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۶ھ)

اور حافظ زین الدین عبدالرحیم بن الحسین العراقی المتوفی ۸۰۶ھ نے اس حدیث کے متعلق لکھا ہے: مجھے اس حدیث کی اصل نہیں ملی اور جب مزی سے سوال کیا گیا تو انہوں نے بھی اسی طرح کہا۔ (المغنی عن حمل الاسفار مع احیاء العلوم ج ۴، ص ۱۸۶)

میں کہتا ہوں کہ متعدد احادیث سے اس حدیث کا معنی ثابت ہے: حضرت ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے قتال کروں حتیٰ کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب وہ یہ کرلیں گے تو مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کرلیں گے ماسوا حق اسلام کے اور ان کا حساب اللہ کے سپرد ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۵، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۲)

نیز حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند لوگوں کے مناقشہ کی آواز دروازہ کے باہر سے سنی۔ آپ ان کے پاس گئے اور فرمایا: میں محض بشر ہوں اور میرے پاس ایک فریق (اپنا مقدمہ لے کر) آتا ہے، پس ہو سکتا ہے کہ بعض فریق بعض سے زیادہ چرب زبان ہو اور میں یہ گمان کروں کہ وہ سچا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ کردوں پس (اگر بالفرض) میں اس کو کسی مسلمان کا حق دے دوں تو وہ محض آگ کا ٹکڑا ہے، وہ خواہ اس کو لے یا ترک کر دے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۴۵۸، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۷۱۳)

ان دونوں حدیثوں سے یہ ثابت ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف ظاہر کے مطابق فیصلہ فرماتے تھے اور باطن کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتے تھے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ میں لوگوں کے دلوں کی چھان بین کروں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۳۵۱، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۰۶۴)

علامہ نووی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے: اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ مجھے ظاہر پر حکم کرنے کا امر کیا گیا ہے اور باطن کے معاملات اللہ کے سپرد ہیں، نیز ایک حدیث میں ہے: حضرت اسامہ بن زید نے جہینہ کے ایک کافر پر حملہ کیا۔ اس نے کہا لا الہ الا اللہ، انہوں نے اس کو قتل کر دیا انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: اس نے لا الہ الا اللہ کہا، تم نے اس کو قتل کر دیا۔ حضرت اسامہ نے کہا: یا رسول اللہ! اس نے ہتھیار کے ڈر سے کہا تھا! آپ نے فرمایا: تم نے

کیوں نہ اس کا دل چیر کے دیکھ لیا کہ آیا اس نے ڈر سے کہا تھا یا نہیں!

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۹۶، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۶۴۳، مسند احمد ج ۴، ص ۴۳۳)

"مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ میں لوگوں کے دلوں کی چھان بین کروں" اس کی شرح میں علامہ ابو العباس قرطبی متوفی ۶۵۶ھ نے لکھا ہے: اس کا معنی یہ ہے کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے ظواہر کا اعتبار کروں اور ان کے بواطن کو اللہ کے سپرد کر دوں۔ (المفہم ج ۳، ص ۱۱۳) علامہ ابی مالکی متوفی ۸۲۸ھ نے بھی یہی تقریر کی ہے۔ (اکمال اکمال المعلم ج ۳، ص ۵۶۵)

قاضی شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ نے بھی علامہ نووی کی تقریر نقل کی ہے۔ (نیل الاوطار ج ۲، ص ۱۰، مطبوعہ مکتبہ الکلیات الازہریہ مصر، ۱۳۹۸ھ) نیز قاضی شوکانی نے لکھا ہے کہ تمام امور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ آپ ظواہر احوال کا اعتبار کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جب جنگ بدر میں آپ کے چچا عباس نے یہ عذر پیش کیا کہ مجھ کو جبراً لایا گیا تھا، تو آپ نے فرمایا: ہم پر تمہارا ظاہر حجت ہے، اور یہ حدیث کہ ہم صرف ظاہر پر حکم کرتے ہیں ہرچند کہ اس کی عبارت کسی معتبر سند سے ثابت نہیں ہے لیکن اس پر ایسے شواہد ہیں جن کی صحت پر سب اتفاق ہے اور ظاہر کا اعتبار کرنے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ منافقین کے ساتھ ان کے ظاہر کے اعتبار سے معاملہ کرتے تھے۔ (نیل الاوطار ج ۲، ص ۱۲، مطبوعہ مصر)

اس مسئلہ میں بہت واضح دلیل یہ حدیث ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں لوگوں پر وحی سے مواخذہ (بھی) کیا جاتا تھا اور اب وحی منقطع ہو چکی ہے، اب ہم تمہارا ان چیزوں پر مواخذہ کریں گے جو تمہارے ظاہری اعمال ہیں، پس جو شخص ہمارے لیے خیر کو ظاہر کرے گا اس کو ہم امن سے رکھیں گے اور اس کو اپنے قریب کریں گے اور اس کے باطنی امور سے کوئی چیز ہمارے ذمہ نہیں ہے، اس کے باطن کا اللہ حساب کرے گا، اور جس نے ہمارے لیے برائی کو ظاہر کیا، ہم اس کو امن سے رکھیں گے نہ اس کی تصدیق کریں گے خواہ وہ یہ کہے کہ اس کا باطن نیک ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۶۴۱)

اس مسئلہ کی مزید تفصیل کے لیے دیکھئے المقاصد الحسنہ ص ۱۱۱-۱۱۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، اور کشف الخفاء و مزیل الالباس ج ۱، ص ۱۹۴-۱۹۲۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث "میں ظاہر پر حکم کرتا ہوں اور باطن کو اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔" ہرچند کہ ان الفاظ کے ساتھ کسی معتبر سند کے ساتھ ثابت نہیں ہے لیکن یہ احادیث صحیحہ اور آثار قویہ سے معناً ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہ (منافق) اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے نہیں کہا حالانکہ بے شک انہوں نے کلمہ کفریہ کہا ہے اور وہ اپنے اسلام کے بعد کافر ہو گئے اور انہوں نے اس کام کا قصد کیا جو ان کو حاصل نہ ہو سکا اور ان کو صرف یہ ناگوار گزرا کہ اللہ اور اس کے رسول نے انہیں اپنے فضل سے غنی کر دیا پس اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہو گا، اور اگر وہ اعراض کریں تو اللہ دنیا اور آخرت میں ان کو دردناک عذاب دے گا اور ان کے لیے زمین میں کوئی کارساز اور مددگار نہیں ہو گا○ (التوبہ: ۷۴)

منافقین نے جو کلمۂ کفر کہا تھا اس کے متعلق مفسرین کے اقوال

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ منافقین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف توہین پر مبنی کلمہ کہا جس کو اللہ تعالیٰ نے کلمہ کفریہ قرار دیا، وہ کلمہ کفریہ کیا تھا اس کے متعلق مفسرین کے کئی اقوال ہیں:

(۱) امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عروہ بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت جلاس بن سوید بن الصامت کے متعلق نازل ہوئی ہے، اس نے کہا تھا کہ (سیدنا) محمد (صلی

اللہ علیہ وسلم) جو پیغام لے کر آئے ہیں اگر وہ پیغام برحق ہے تو ہم لوگ گدھے سے بھی بدتر ہیں۔ یہ سن کر اس کی بیوی کے بیٹے نے کہا: اے اللہ کے دشمن! تو نے جو کچھ کہا ہے میں ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر پہنچاؤں گا، اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو ضرور مجھ پر کوئی آفت آپڑے گی ورنہ تیری گرفت کی جائے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جلاس کو بلا کر پوچھا: اے جلاس! کیا تم نے ایسا ایسا کہا تھا؟ تو جلاس نے قسم کھالی کہ اس نے یہ نہیں کہا تھا، تب یہ آیت نازل ہوئی: وہ منافق اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے نہیں کہا حالانکہ بے شک انہوں نے کلمہ کفریہ کہا ہے۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۱۹۰)

امام ابن ابی حاتم نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور لکھا ہے کہ پھر جلاس نے توبہ کرلی تھی اور توبہ کے بعد اس نے اسلام میں نیک کام کیے۔

(۲) نیز امام عبدالرحمن بن محمد بن ادریس الرازی ابن ابی حاتم المتوفی ۳۲۷ھ روایت کرتے ہیں:

قتادہ اس آیت کی تفسیر میں روایت کرتے ہیں: دو آدمیوں نے آپس میں قتال کیا، ان میں سے ایک جہینہ میں سے تھا اور دوسرا غفار سے تھا، اور جہینہ انصار کے حلیف تھے۔ غفاری جہنی پر غالب آگیا، تب عبداللہ بن ابی نے ندا کی اے بنو اوس! اپنے بھائی کی مدد کرو اور کہا خدا کی قسم ہماری اور (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مثال صرف ایسی ہے جیسا کہ کسی نے کہا اپنے کتے کو خوب موٹا کرو، وہ تمہیں کھا جائے گا اور کہا اگر ہم مدینہ کی طرف واپس آگئے تو ضرور عزت والے ذلت والوں کو نکال دیں گے۔ ایک مسلمان شخص نے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچادی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کو بلوایا، اور اس سے پوچھا۔ اس نے قسم کھالی کہ اس نے یہ بات نہیں کہی تب یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۰۱۱۰)

(۳) امام ابن ابی حاتم نے اپنی سند کے ساتھ تیسری یہ روایت ذکر کی ہے: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کسی گھاٹی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سواری سے گرا دینے کا ارادہ کیا تھا، جب کہ آپ رات کے وقت تبوک سے واپس آرہے تھے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ان کے منصوبہ کو سن لیا، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کے پیچھے تھے اور حضرت عمار بن یاسر سواری کے آگے تھے۔ حضرت حذیفہ نے اونٹوں کے چلنے کی آواز سنی۔ حضرت حذیفہ نے کہا اے اللہ کے دشمنو! پرے ہٹو۔ انہیں ایک طرف ہٹایا گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم گزر گئے حتیٰ کہ آپ صبح کے وقت اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ صبح کے وقت آپ نے ان سب کو بلوایا اور فرمایا: تم نے اس طرح کا ارادہ کیا تھا؟ انہوں نے اللہ کی قسم کھائی کہ انہوں نے اس طرح نہیں کہا تھا اور نہ اس کا ارادہ کیا تھا، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۰۱۱۱)

اس آیت کے شان نزول میں پہلی دو حدیثیں جو بیان کی گئی ہیں، ان پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ پہلی حدیث میں صرف جلاس کے کلمہ کفر کے کہنے کا ذکر ہے اور دوسری حدیث میں صرف عبداللہ بن ابی کے کلمہ کفر کہنے کا ذکر ہے، جبکہ قرآن مجید میں جمع کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے کہ منافقوں نے کلمہ کفر کہا، اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ باقی منافقین بھی اس کلمہ کفر کے ساتھ متفق تھے اس لیے قرآن مجید نے جمع کے صیغہ کے ساتھ فرمایا: انہوں نے کلمہ کفر کہا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ کلمہ کفریہ کے متعلق لکھتے ہیں:

ایک اور روایت میں ہے کہ تبوک کے سفر میں ایک جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی گم ہوگئی، مسلمان اس کو تلاش کرتے پھر رہے تھے، اس پر منافقوں کے ایک گروہ نے اپنی مجلس میں بیٹھ کر خوب مذاق اڑایا اور آپس میں کہا "یہ حضرت آسمان کی خبریں تو خوب سناتے ہیں مگر ان کو اپنی اونٹنی کی کچھ خبر نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔" (تفہیم القرآن ج ۲، ص ۲۱۶)

اس روایت کا ذکر ان تفسیروں میں ان الفاظ سے ہے: مجاہد بیان کرتے ہیں کہ ایک منافق نے کہا (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

بیان کرتے ہیں کہ فلاں کی اونٹنی فلاں فلاں وادی میں فلاں فلاں دن تھی، ان کو غیب کی کیا خبر۔ یہ روایت التوبہ: ۶۵ کی تفسیر میں امام ابن جریر، امام ابن ابی حاتم اور امام ابن جوزی نے ذکر کی ہے۔

(جامع البیان جز ۱۰ ص ۲۲۱، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶، ص ۱۸۳۰، زاد المسیر ج ۳، ص ۴۶۵)

اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب کے انکار کرنے کو یا اس پر اعتراض کرنے کو اللہ تعالیٰ نے کفر قرار دیا ہے اور یہ کہ آپ کے علم غیب کا انکار اور اس پر اعتراض منافقین کا طریقہ ہے۔

منافق جس مقصد کو حاصل نہ کر سکے اس کے متعلق مفسرین کے اقوال

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور انہوں نے اس کام کا قصد کیا جو ان کو حاصل نہ ہو سکا، امام ابن ابی حاتم نے اس آیت کا ایک محمل یہ بیان کیا کہ عروہ نے کہا کہ جلاس نے ایک گھوڑا خریدا تھا تاکہ اس پر بیٹھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرے مگر وہ اپنے اس مقصد میں ناکام رہا (رقم الحدیث: ۱۰۰۰۰) دوسرا محمل یہ بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اسود نام کے ایک منافق نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا اور وہ ناکام رہا۔ (جامع البیان: ۱۳۱۹۷، ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۰۰۰۲) تیسرا محمل یہ ہے کہ مجاہد نے کہا کہ جب جلاس نے کہا تھا کہ اگر (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ کہتے ہیں وہ برحق ہے تو ہم گدھے سے بھی بدتر ہیں، اس وقت ایک مسلمان شخص نے کہا: بے شک وہ حق کہتے ہیں اور تم ضرور گدھے سے بدتر ہو تو اس منافق نے اس مسلمان شخص کو قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ (رقم الحدیث: ۱۰۰۰۳، جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۱۹۲) چوتھا محمل یہ ہے کہ انہوں نے عبداللہ بن ابی کے سر پر تاج رکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ (رقم الحدیث: ۱۰۰۰۴)

مفسرین نے اس کا یہ معنی بھی بیان کیا ہے کہ غزوۂ تبوک سے واپسی کے موقع پر منافقین نے یہ ارادہ کیا تھا کہ رات کے اندھیرے میں کسی بلند گھاٹی سے آپ کو سواری سے نیچے گرا دیں گے تاکہ آپ ہلاک ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کے ذریعہ آپ کو بروقت خبردار کر دیا اور منافقین اپنی سازش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

منافقین کو غنی کرنے کی تفصیل

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور ان کو صرف یہ ناگوار گزرا کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے ان کو غنی کر دیا، امام ابن ابی حاتم اپنی سند کے ساتھ اس کی تفسیر میں عکرمہ سے روایت کرتے ہیں کہ بنوعدی بن کعب کے ایک شخص نے ایک انصاری کو قتل کر دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت بارہ ہزار درہم ادا کی تب یہ آیت نازل ہوئی یعنی ان کو دیت کی یہ رقم لینی ناگوار ہوئی۔ (رقم الحدیث: ۱۰۴۰۰، جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۲۰۱) اور عروہ نے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ جلاس پر قرض تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا قرض ادا کر دیا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (رقم الحدیث: ۱۰۴۰۲)

جلاس بن سوید کی توبہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پس اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہوگا، امام ابو حاتم نے اس کی تفسیر میں عروہ سے روایت کیا ہے کہ جب جلاس نے وہ کفریہ کلمہ کہا کہ اگر (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) برحق ہیں تو ہم گدھے سے بھی بدتر ہیں، تو ایک صحابی عمیر بن سعد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتا دیا، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جلاس کو بلا کر پوچھا تو اس نے انکار کیا اور قسم کھائی کہ اس نے یہ کلمہ کفر نہیں کہا لیکن جب بعد میں یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہوگا تو جلاس نے اعتراف کیا کہ اس نے یہ کلمہ کفر کہا تھا، اور اپنے اس قول سے صدق دل سے توبہ کر لی اور پھر نیک عمل کیے اور نبی

صلی اللہ علیہ وسلم نے عمیر سے فرمایا: تمہارے رب نے تمہاری تصدیق کر دی۔
(رقم الحدیث: ۱۰۴۰۳، جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۱۹۱)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان میں سے بعض (منافقین) وہ ہیں جنہوں نے اللہ سے یہ عہد کیا تھا کہ اگر ہم کو اللہ نے اپنے فضل سے (مال) دیا تو ہم ضرور بہ ضرور صدقہ کریں گے اور ضرور بہ ضرور نیکو کاروں میں سے ہو جائیں گے ○ پس جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے (مال) عطا کیا تو انہوں نے اس میں بخل کیا اور انہوں نے پیٹھ پھیرلی درآنحالیکہ وہ اعراض کرنے والے تھے ○ سو اس کے بعد اللہ نے ان کے دلوں میں اس دن تک کے لیے نفاق ڈال دیا جس دن وہ اس کے حضور پیش ہوں گے، کیونکہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور اس لیے بھی کہ وہ جھوٹ بولتے تھے ○ کیا انہیں یہ نہیں معلوم کہ اللہ ان کے دل کے راز کو اور ان کی سرگوشیوں کو (بھی) جانتا ہے، اور بے شک اللہ تمام غیبوں کو بہت زیادہ جاننے والا ہے ○ (التوبہ: ۷۸-۷۵)

اللہ سے عہد کر کے اس کو توڑنے والا منافق

عام کتب حدیث، کتب تفسیر اور کتب سیرت میں یہ مذکور ہے کہ قرآن مجید کی ان آیات میں جس منافق کی وعدہ خلافی کا ذکر کیا گیا ہے اس کا نام ثعلبہ بن حاطب بن عمرو انصاری تھا، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، صحیح یہ ہے کہ اس کا نام ثعلبہ بن ابی حاطب تھا اور یہ واقعی منافق تھا، اور اول الذکر یعنی حضرت ثعلبہ بن حاطب انصاری بدری صحابی تھے اور جنگ احد میں شہید ہو گئے تھے، پہلے ہم عام روایت کے مطابق اس واقعہ کا ذکر کریں گے، پھر یہ واضح کریں گے کہ یہ واقعہ ثعلبہ بن ابی حاطب کا ہے نہ کہ حضرت ثعلبہ بن حاطب انصاری رضی اللہ عنہ کا۔

امام ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی متوفی ۳۶۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ثعلبہ بن حاطب الانصاری، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور کہا: یا رسول اللہ! اللہ سے دعا کیجئے کہ اللہ مجھے مال عطا فرمائے آپ نے فرمایا تم پر افسوس ہے اے ثعلبہ کم مال ہو اور تم اس کا شکر ادا کرو یہ اس سے بہتر ہے کہ زیادہ مال ہو اور تم اس کا شکر نہ ادا کر سکو، وہ پھر دوبارہ آپ کے پاس آیا اور کہا یا رسول اللہ آپ دعا کیجئے کہ اللہ مجھے مال عطا فرمائے آپ نے فرمایا: ثعلبہ! تم پر افسوس ہے کیا تم یہ نہیں چاہتے ہو کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثل ہو جاؤ؟ اللہ کی قسم! اگر میں سوال کروں کہ پہاڑ میرے لیے سونا اور چاندی بہائیں تو وہ ضرور بہائیں گے، وہ پھر آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! میرے لیے اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے مال عطا کرے، اللہ کی قسم! اگر اللہ نے مجھے مال دیا تو میں ہر حقدار کا حق ادا کروں گا تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: اے اللہ ثعلبہ کو مال عطا فرما۔ اس نے بکریاں پالیں ان میں اس قدر افزائش ہوئی کہ مدینہ کی گلیاں ان سے تنگ ہونے لگیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتا پھر بکریوں کی طرف چلا جاتا تھا، ان میں اور افزائش ہوئی تو اس نے نماز جمعہ اور باجماعت نماز پڑھنا ترک کر دیا، اس کے پاس سے سوار گزرتے تو وہ ان سے حالات معلوم کرتا تھا حتیٰ کہ اللہ عزوجل نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل فرمائی:

خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا۔ (التوبہ: ۱۰۳)

ان کے اموال سے زکوٰۃ لیجئے جو ان کو پاکیزہ کرے اور ان کے باطن کو اس کے سبب سے صاف کرے۔

تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے زکوٰۃ کی وصول یابی پر دو شخص مقرر کیے، ایک شخص انصار میں سے تھا اور ایک شخص بنو سلیم سے، اور ان کے لیے زکوٰۃ کی مقدار اور جانوروں کی عمریں لکھ دیں اور ان کو حکم دیا کہ وہ لوگوں سے زکوٰۃ

وصول کریں- اور ثعلبہ کے پاس جائیں اور اس سے بھی اس کے مال کی زکوۃ لیں- سو انہوں نے ایسا کیا، جب وہ ثعلبہ کے پاس گئے اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب پڑھوایا، تب اس نے کہا پہلے اور لوگوں سے زکوۃ وصول کر لو پھر میرے پاس آنا، جب وہ لوگوں سے فارغ ہو کر اس کے پاس گئے تو اس نے کہا خدا کی قسم! یہ زکوۃ تو جزیہ کی بہن ہے، ان دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر یہ واقعہ عرض کیا، تب اللہ عزوجل نے اپنے رسول پر یہ آیات نازل فرمائیں اور ان میں سے بعض (منافقین) وہ ہیں جنہوں نے اللہ سے یہ عہد کیا تھا کہ اگر ہم کو اللہ نے اپنے فضل سے مال دیا تو ہم ضرور بہ ضرور صدقہ کریں گے- الآیہ (التوبہ: ۷۷-۷۵) پھر انصار کا ایک شخص جو ثعلبہ کے قریب رہتا تھا، وہ ثعلبہ کے پاس گیا اور کہا تجھ پر افسوس ہے اے ثعلبہ! تو ہلاک ہو گیا، تیرے متعلق قرآن مجید میں اس طرح آیات نازل ہوئی ہیں، تب ثعلبہ گیا، اس نے اپنے بالوں میں خاک ڈالی اور رونے لگا، اور کہنے لگا یا رسول اللہ! یا رسول اللہ! لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زکوۃ کو قبول نہیں فرمایا، حتیٰ کہ آپ کا وصال ہو گیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور کہا: اے ابوبکر! آپ کو معلوم ہے کہ اپنی قوم میں میرا کیا مقام ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک میرا کیا مقام تھا، آپ مجھ سے زکوۃ قبول کر لیجئے- حضرت ابوبکر نے اس سے زکوۃ قبول کرنے سے انکار کر دیا، پھر حضرت عمر کے زمانہ میں ان کے پاس گیا، انہوں نے بھی انکار کر دیا، پھر حضرت عثمان کے دور میں ان کے پاس گیا، انہوں نے بھی انکار کر دیا، پھر ثعلبہ حضرت عثمان کے دور خلافت میں مر گیا-

(المعجم الکبیر ج ۸، ص ۲۱۹-۲۱۸، رقم الحدیث: ۷۸۷۳، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۵، ص ۲۹۲-۲۸۹، معرفۃ الصحابہ ج ۱، ص ۴۹۴، رقم: ۴۱۵، مطبوعہ دار الوطن بیروت، مجمع الزوائد ج ۷، ص ۳۲-۳۱، احیاء علوم الدین ج ۳، ص ۲۴۲-۲۴۱، جامع البیان جز ۱۰، ص ۲۴۲-۲۴۱، ۱۳۲۰۵، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۲، ص ۱۸۴۹-۱۸۴۷، معالم التنزیل ج ۲، ص ۲۶۴-۲۶۳، اسباب نزول القرآن ص ۲۵۹-۲۵۷، تفسیر ابن کثیر ج ۲، ص ۴۱۹، مطبوعہ دار الفکر، تفسیر کبیر ج ۶، ص ۱۰۶-۱۰۵، تفسیر بیضاوی و خفاجی ج ۴، ص ۶۰۶-۶۰۴، الدر المنثور ج ۴، ص ۲۴۷-۲۴۶، روح المعانی جز ۱۰، ص ۱۴۴-۱۴۳، خزائن العرفان، معارف القرآن، تفسیر عثمانی وغیرہ)

ان کے علاوہ اور بھی بہت کتب تفسیر میں یہی لکھا ہے کہ اس منافق کا نام ثعلبہ بن حاطب تھا-

یہ منافق حضرت ثعلبہ بن حاطب تھے یا کوئی اور شخص؟

علامہ ابن الاثیر الجزری المتوفی ۶۳۰ھ لکھتے ہیں:

سب نے یہ قصہ اسی طرح بیان کیا ہے جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے- (اسد الغابہ ج ۱، ص ۴۶۴، ۴۶۳) ابن الکلبی نے کہا کہ ثعلبہ بن حاطب بدری صحابی تھے اور غزوہ احد میں شہید ہوئے، اگر ثعلبہ بن حاطب وہی ہیں جن کے متعلق سورۂ توبہ کی مذکورہ آیات نازل ہوئیں تو یا تو ابن الکلبی کو ان کے جنگ احد میں شہید ہونے کے متعلق وہم ہوا ہے یا پھر ثعلبہ بن حاطب کے متعلق یہ قصہ صحیح نہیں ہے اور یا پھر اس قصہ میں ثعلبہ بن حاطب کے علاوہ کوئی اور شخص ہے-

(اسد الغابہ ج ۱، ص ۴۶۴، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

حافظ شہاب الدین احمد بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق نے ثعلبہ بن حاطب انصاری کا بدری صحابہ میں ذکر کیا ہے، اسی طرح ابن الکلبی نے ذکر کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ وہ غزوہ احد میں شہید ہو گئے تھے، اس کے بعد حافظ ابن حجر نے اس قصہ کا خلاصہ ذکر کیا ہے، پھر لکھتے ہیں: ثعلبہ بن حاطب کے متعلق یہ قصہ ہو میرے گمان میں یہ صحیح نہیں ہے، حضرت ثعلبہ بن حاطب انصاری رضی اللہ عنہ بدری

صحابی تھے اور وہ جنگ احد میں شہید ہوئے اور اس قصہ میں جس شخص کا ذکر ہے، وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مرا تھا، اور اس کی تقویت اس بات سے ہوتی ہے کہ امام ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس سے سورۂ توبہ کی اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ ایک شخص تھا جس کا نام ثعلبہ بن ابی حاطب انصاری تھا، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور پھر پورا قصہ بیان کیا اور کہا کہ یہ شخص ثعلبہ بن ابی حاطب تھا، اور جو بدری صحابی ہیں، ان سے متعلق اتفاق ہے کہ وہ ثعلبہ بن حاطب تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص غزوہ بدر یا حدیبیہ میں حاضر ہوا وہ دوزخ میں داخل نہیں ہوگا نیز آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کے متعلق فرمایا: تم جو چاہو، عمل کرو، میں نے تم کو بخش دیا ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۰۰۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۴۹۴) پس جس بدری صحابی کی یہ شان ہو، وہ ان آیات کا کیسے مصداق ہو سکتا ہے جن میں مذکور ہے کہ قیامت تک ان کے دل میں نفاق رہے گا، پس ظاہر ہے کہ اس قصہ میں جس شخص کا ذکر ہے وہ حضرت ثعلبہ بن حاطب رضی اللہ عنہ کا غیر تھا اور تفسیر ابن مردویہ میں حضرت ابن عباس کی روایت کے مطابق وہ شخص ثعلبہ بن ابی حاطب تھا۔ (الاصابہ ج ۱، ص ۵۱۷-۵۱۶، رقم: ۹۳۱-۹۳۰، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۵ھ)

علامہ محمد بن یوسف الصالحی الشامی المتوفی ۹۴۲ھ اور علامہ السید محمد بن محمد الزبیدی المتوفی ۱۲۰۵ھ نے بھی حافظ ابن حجر عسقلانی کی اس تحقیق سے اتفاق کیا ہے۔

(سبل الہدیٰ والرشاد ج ۴، ص ۹۵-۹۴، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۴ھ، اتحاف السادۃ المتقین ج ۸، ص ۲۲۷، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۴ھ)

ہمیں بھی حافظ ابن حجر عسقلانی کی تحقیق پر اعتماد ہے۔

حضرت ثعلبہ بن حاطب کے بدری صحابی ہونے پر تصریحات

امام ابن ہشام متوفی ۲۱۸ھ لکھتے ہیں: غزوہ بدر میں بنوامیہ سے جو صحابہ شریک ہوئے ان میں حضرت ثعلبہ بن حاطب بھی ہیں۔ (سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۳۰۰، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام محمد بن عمرو واقد المتوفی ۲۰۷ھ لکھتے ہیں: بنوامیہ میں سے غزوہ بدر میں جو صحابہ شریک ہوئے، ان میں حضرت ثعلبہ بن حاطب بھی ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو مقام روحاء سے واپس کر دیا تھا اور ان کو مدینہ پر عامل مقرر کیا تھا اور مال غنیمت میں سے حصہ عطا فرمایا تھا۔ (کتاب المغازی ج ۱، ص ۱۵۹، مطبوعہ عالم الکتب بیروت، ۱۴۰۴ھ)

امام محمد بن سعد متوفی ۲۳۰ھ لکھتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثعلبہ بن حاطب اور حضرت معتب بن الحمراء خزاعی کے درمیان مواخات کرائی تھی اور حضرت ثعلبہ بن حاطب غزوہ بدر اور غزوہ احد میں شریک ہوئے تھے۔

(الطبقات الکبریٰ ج ۳، ص ۴۶۰، مطبوعہ دار صادر بیروت، ۱۳۸۷ھ)

امام یوسف بن عبدالبر القرطبی المالکی المتوفی ۴۶۳ھ لکھتے ہیں:

حضرت ثعلبہ بن حاطب اور حضرت معتب بن عوف بن الحمراء کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخات قائم کی تھی اور حضرت ثعلبہ غزوہ بدر اور غزوہ احد میں شریک ہوئے تھے۔

(الاستیعاب ج ۱، ص ۲۸۴، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ)

یہ معتمد اور مستند تصریحات ہیں جن سے واضح ہو گیا کہ حضرت ثعلبہ بن حاطب رضی اللہ عنہ بدری صحابی ہیں اور بدریوں کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ سب نجات یافتہ اور جنتی ہیں تو ان کو ایک منافق کے متعلق نازل

شدہ آیات کا مصداق قرار دینا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔

حضرت ثعلبہ بن حاطب کو منافق قرار دینے والی روایت کا شدید ضعف

حضرت ابوامامہ باہلی کی طرف منسوب جس روایت میں حضرت ثعلبہ کو منافق قرار دیا ہے اس کو ائمہ حدیث نے بالاتفاق ضعیف قرار دیا ہے۔

علامہ ابوعبداللہ قرطبی مالکی المتوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں: امام ابن عبدالبر نے کہا ایک قول یہ ہے کہ ثعلبہ بن حاطب ہی وہ شخص ہے جس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی (منھم من عاھد اللہ۔ التوبہ: ۷۵) کیونکہ اس نے زکوٰۃ دینے سے منع کیا تھا اور ان کے متعلق یہ وارد ہے کہ وہ بدر میں حاضر ہوئے اور وہ اس آیت کے معارض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں حشر تک نفاق ڈال دیا۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت ثعلبہ بن حاطب رضی اللہ عنہ بدری صحابی ہیں اور ان صحابہ میں سے ہیں جن کے ایمان کی اللہ اور اس کے رسول نے شہادت دی ہے، جیسا کہ الممتحنہ کے شروع میں آئے گا، پس ان کے متعلق حضرت ابوامامہ باہلی اور حضرت ابن عباس کی طرف جو روایت منسوب ہے، وہ صحیح نہیں ہے اور امام ابن عبدالبر نے کہا کہ یہ قول صحیح نہیں ہے کہ حضرت ثعلبہ بن حاطب نے زکوٰۃ ادا کرنے سے منع کیا تھا اور ان کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی اور ضحاک نے کہا کہ یہ آیت چند منافقین کے متعلق نازل ہوئی ہے، وہ یہ ہیں نبتل بن الحارث اور جد بن قیس اور معتب بن قشیر۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۸، ص ۱۳۴۔ ۱۳۳، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حافظ شہاب الدین احمد بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

یہ روایت طبرانی نے اور بیہقی نے دلائل النبوۃ اور شعب الایمان میں اور ابن ابی حاتم اور طبری اور ابن مردویہ نے روایت کی ہے اور ان سب نے اس سند سے روایت کی ہے۔ علی بن یزید از قاسم بن عبدالرحمن از ابوامامہ اور یہ بہت زیادہ ضعیف سند ہے۔ سہیلی نے ابن اسحٰق سے روایت کیا ہے کہ حضرت ثعلبہ بدری صحابی ہیں اور ابن اسحٰق ہی سے یہ منقول ہے کہ یہ آیت ثعلبہ کے متعلق نازل ہوئی ہے، پس یہ ثعلبہ بن حاطب کے نام کے دو الگ الگ شخص ہیں۔

(الکافی والشاف فی تخریج احادیث الکشاف علی تفسیر کشاف ج ۲، ص ۲۹۲، مطبوعہ من منشورات البلاغہ ایران)

نیز حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

امام ابن اثیر متوفی ۶۳۰ھ نے کہا ہے کہ ثعلبہ بن حاطب کے متعلق جو زکوٰۃ نہ دینے کی طویل حدیث مروی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ نو ہجری میں فرض ہوئی ہے لیکن وہ حدیث ضعیف ہے، اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

(فتح الباری ج ۳، ص ۲۶۶، مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۱ھ)

واحدی نے نقل کیا ہے کہ ثعلبہ بن حاطب انصاری ہی وہ شخص ہے جس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی (منھم من عاھد اللہ التوبہ: ۷۵) اور انہوں نے اس پر کوئی دلیل ذکر نہیں کی اور نہ ہی یہ ذکر کیا کہ وہ بدری صحابی ہیں، ہاں امام ابن اسحٰق نے ان کا بدریین میں ذکر کیا ہے اور میرے نزدیک حضرت ثعلبہ بن حاطب اس شخص کے غیر ہیں جس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے کیونکہ وہ شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں فوت ہوا تھا، اور حضرت ثعلبہ بن حاطب کے متعلق ابن الکلبی نے ذکر کیا ہے کہ وہ غزوہ احد میں شہید ہوئے تھے، نیز واحدی اور اس کے شیخ ثعلبی اور المھدوی نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت حاطب بن ابی بلتعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے لیکن اس پر بھی اعتراض ہے کیونکہ حضرت حاطب بھی بدری صحابی ہیں اور مہاجرین میں سے ہیں۔ (فتح الباری ج ۶، ص ۳۵، مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۱ھ)

امام ابو بکر احمد بن حسن بیہقی متوفی ۴۵۸ھ لکھتے ہیں:

یہ حدیث مفسرین کے درمیان مشہور ہے اور وہ اس کو متعدد اسانید موصولہ کے ساتھ روایت کرتے ہیں اور وہ سب ضعیف اسانید ہیں۔ (دلائل النبوۃ ج ۵، ص ۲۹۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۰ھ)

امام عبد الرحیم بن الحسین العراقی المتوفی ۸۰۶ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث کو امام طبرانی نے سند ضعیف کے ساتھ روایت کیا ہے۔

(المغنی عن حمل الاسفار فی الاسفار مع احیاء العلوم ج ۳، ص ۲۴۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ)

حافظ نور الدین الہیثمی متوفی ۸۰۷ھ اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں:

اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں علی بن یزید الالہانی ہے اور وہ متروک الحدیث ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۷، ص ۳۲، مطبوعہ دار الکتاب العربی، ۱۴۰۲ھ)

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں:

امام طبرانی، امام ابن مردویہ، امام ابن ابی حاتم اور امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں اس حدیث کو سند ضعیف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ (اسباب النزول ص ۴۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

نیز حافظ سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں:

حافظ عسقلانی نے الاصابہ میں لکھا ہے کہ ابن الکلبی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ثعلبہ بن حاطب بدری صحابی ہیں اور وہ احد میں شہید ہوئے تھے اور اس قصہ میں جس ثعلبہ کا ذکر ہے وہ حضرت عثمان کی خلافت میں مرا تھا، پس ظاہر ہو گیا کہ یہ دونوں الگ الگ شخص ہیں۔ ملخصاً (ہم الاصابہ کی مفصل عبارت نقل کر چکے ہیں)

(الحاوی للفتاوی ج ۲، ص ۹۷-۹۶، مطبوعہ المکتبۃ النوریہ الرضویہ، لائل پور پاکستان)

علامہ شمس الدین عبد الرؤف مناوی متوفی ۱۰۰۳ھ لکھتے ہیں:

امام بیہقی نے کہا اس حدیث کی سند پر اعتراض ہے، اور یہ مفسرین کے درمیان مشہور ہے اور الاصابہ میں اشارہ ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اور اس قصہ کا مصداق حضرت ثعلبہ کو بنانا درست نہیں۔

(فیض القدیر ج ۸، ص ۴۳۸۲، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفی الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

اس روایت کے راویوں پر جرح

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا کہ طبرانی، بیہقی، ابن ابی حاتم اور طبری نے یہ حدیث اس سند کے ساتھ روایت کی ہے: علی بن یزید الالہانی از قاسم بن عبد الرحمن از ابو امامہ باہلی، اب ہم اسماء رجال کی کتب سے علی بن یزید الالہانی اور قاسم بن عبد الرحمن کے احوال نقل کرتے ہیں جس سے اس امر پر بصیرت حاصل ہو جائے گی کہ حضرت ثعلبہ بن حاطب کی طرف اس روایت کو منسوب کرنے والے کس درجہ ساقط الاعتبار ہیں۔

حافظ جمال الدین ابو الحجاج یوسف مزی متوفی ۷۴۲ھ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

حافظ ابو زرعہ نے کہا یہ قوی نہیں ہے، عبد الرحمن بن ابی حاتم نے کہا: میں نے اپنے والد سے علی بن یزید کے متعلق پوچھا انہوں نے کہا یہ ضعیف الحدیث ہے، اس کی احادیث منکرہ ہیں، اور جب علی بن یزید قاسم سے روایت کرے تو وہ قابل غور ہیں، محمد بن ابراہیم الکنانی نے کہا: میں نے ابو حاتم سے پوچھا آپ اس سند کے متعلق کیا کہتے ہیں: علی بن یزید از قاسم از

ابوامامہ انہوں نے کہا یہ سند قوی نہیں ہے، ضعیف ہے، امام بخاری نے کہا یہ منکر الحدیث، ضعیف ہے، امام ترمذی نے کہا حسن بن علی بن نصرالطوسی اس کو حدیث میں ضعیف کہتے تھے۔ ایک اور جگہ پر کہا بعض اہل علم نے علی بن یزید میں کلام کیا ہے اور اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ امام نسائی نے کہا یہ ثقہ نہیں ہے، ایک اور جگہ کہا یہ متروک الحدیث ہے، ابوالحسن الدار قطنی نے اس کو متروک کہا۔ حاکم ابو احمد نے کہا یہ ذاہب الحدیث ہے۔

(تہذیب الکمال فی اسماء الرجال ج ۱۳، ص ۴۲۶۔ ۴۲۵، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد لکھا الساجی نے کہا کہ تمام اہل علم کا اس کے ضعف پر اتفاق ہے۔

(تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۳۴، رقم: ۴۹۹۴، التقریب رقم: ۴۸۳۳، التاریخ الکبیر رقم: ۲۴۷۰، الجرح رقم: ۱۱۴۲، المیزان رقم: ۵۹۶۶)

اور قاسم بن عبدالرحمن کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

امام احمد نے کہا یہ جعفر، بشیر بن نمیر اور مطرح سے منکر احادیث روایت کرتا ہے، نیز کہا یہ ثقات سے منکر احادیث روایت کرتا ہے، ابراہیم بن جنید نے کہا، یہ مشائخ ضعفاء سے ایسی احادیث روایت کرتا ہے جو ضعیف ہیں، العجلی نے کہا یہ قوی نہیں ہے، ابوحاتم نے کہا کہ اگر یہ ثقات سے روایت کرے تو اس کی احادیث میں کوئی حرج نہیں، اس کی ان روایات پر انکار کیا جائے گا جو یہ ضعفاء سے روایت کرتا ہے، غلابی نے کہا یہ منکر الحدیث ہے، یعقوب بن شیبہ نے ایک بار کہا، یہ ثقہ ہے، دوسری بار کہا اس میں اختلاف ہے۔

(تہذیب التہذیب ج ۸، ص ۲۸۱، رقم: ۵۶۸۶، تہذیب الکمال رقم: ۴۸۰۰، التاریخ الکبیر رقم: ۷۱۲، الجرح رقم: ۶۴۹)

اس روایت پر درایتاً جرح

ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم الاندلسی المتوفی ۴۵۶ھ لکھتے ہیں:

ایک روایت میں ہے کہ یہ آیت (التوبہ: ۷۵) حضرت ثعلبہ بن حاطب کے متعلق نازل ہوئی ہے، یہ روایت باطل ہے کیونکہ حضرت ثعلبہ معروف بدری صحابی ہیں، نیز از علی بن یزید از قاسم بن عبدالرحمن از ابوامامہ روایت ہے کہ ثعلبہ بن حاطب اپنا صدقہ لے کر حضرت عمر کے پاس گئے تو انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا اور کہا کہ اس صدقہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہیں کیا اور نہ حضرت ابوبکر نے اور نہ ہی میں اس کو قبول کروں گا۔ یہ روایت بلاشک باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی زکوٰۃ قبول کرنے کا حکم دیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت یہ حکم دیا کہ جزیرہ عرب میں دو دین باقی نہ رہیں، پس ثعلبہ مسلمان ہوں گے یا کافر، اگر وہ مسلمان ہیں تو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے لیے یہ جائز نہیں تھا کہ وہ ان سے زکوٰۃ قبول نہ کرتے اور اگر وہ کافر تھے تو اس مفروض کے خلاف ہے کہ جزیرہ عرب میں دو دین باقی نہ رہیں، پس بلاشک یہ روایت ساقط ہو گئی اور اس روایت کی سند میں معان بن رفاعہ، قاسم بن عبدالرحمن اور علی بن یزید ہیں اور یہ سب ضعیف ہیں۔ (المحلی ج ۱۱، ص ۲۰۸۔ ۲۰۷، مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، ۱۳۵۲ھ)

شیخ محمد عبدہٗ لکھتے ہیں:

اس حدیث میں کئی اشکالات ہیں جو ان آیات کے نزول سے متعلق ہیں:

(۱) قرآن مجید کے سیاق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ غزوہ تبوک کے سفر کے موقع کا ہے، اور اس حدیث کے ظاہر سے یہ

معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ زکوٰۃ کے فرض ہونے کے بعد پیش آیا اور مشہور یہ ہے کہ زکوٰۃ دو ہجری کو فرض ہوئی تھی اور غزوہ تبوک رجب نو ہجری میں ہوا تھا اور یہ واضح تعارض ہے۔ (۲) اس حدیث میں ہے کہ ثعلبہ نے پہلی بار جو زکوٰۃ نہیں دی اور اس کو جزیہ کی بہن کہا تھا وہ اس پر نادم ہوئے اور روئے اور توبہ صادقہ کی پھر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی توبہ قبول نہیں کی اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عام سیرت کے خلاف ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم منافقین کے ساتھ ان کے ظاہر حال کے اعتبار سے معاملہ فرماتے تھے۔ (۳) اس حدیث میں مذکور ہے کہ ثعلبہ نے توبہ صادقہ کر لی تھی جب کہ ان آیات کے ظاہر کا یہ معنی ہے کہ ان کی موت نفاق پر ہوگی اور وہ اپنے بخل اور زکوٰۃ سے اعراض سے توبہ نہیں کریں گے حالانکہ اس حدیث میں صراحت ہے کہ وہ بخل سے توبہ کر چکے تھے اور بار بار زکوٰۃ پیش کرتے تھے۔ (۴) نیز اس حدیث میں مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے ان کی زکوٰۃ کو قبول نہیں کیا اور ظاہر شریعت پر عمل نہیں کیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کفر، نفاق اور معصیت سے توبہ قبول فرمالیتا ہے اور یہ ایسی چیز ہے کہ اس کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور اسلام میں کوئی نظیر نہیں ہے۔ (۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے قتال کروں حتیٰ کہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں، الحدیث۔ (صحیح البخاری: ۲۵) اس حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ جب ثعلبہ نے زکوٰۃ نہیں دی اور اس کو جزیہ کہا تو آپ اس سے قتال کرتے نہ یہ کہ بعد میں جب وہ نادم ہو کر زکوٰۃ دینے آتا تو آپ اس کی زکوٰۃ کو رد کر دیتے، سو اس حدیث میں صرف حضرت ثعلبہ پر افتراء نہیں ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی افتراء ہے، اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر پر بھی افتراء ہے کیونکہ اس روایت کے مطابق انہوں نے بھی اس سے زکوٰۃ قبول نہیں کی۔

(المنار ج ۱۰، ص ۵۶۱، موضحاً و مزیداً، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت)

اس روایت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج کے خلاف ہونا

یہ روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ ابوسفیان نے متعدد بار مدینہ پر حملہ کیا لیکن جب وہ اسلام لائے تو آپ نے ان کا اسلام قبول کر لیا۔ وحشی نے آپ کے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کیا لیکن جب وہ اسلام لانے کے لیے آیا تو آپ نے اس کا اسلام قبول کر لیا۔ ہند نے آپ کے چچا کا کلیجہ دانتوں سے چبایا اس کا اسلام قبول کر لیا، عمیر بن وہب آپ کو قتل کرنے کے ارادہ سے مدینہ آئے تھے آپ نے ان کا اسلام قبول کر لیا، صفوان بن امیہ عمیر کو بھیجنے والے تھے آپ نے ان کا اسلام قبول کر لیا اور ایسی بہت سی مثالیں ہیں تو اگر ثعلبہ بن حاطب نے ایک بار زکوٰۃ دینے سے انکار کیا، پھر بعد میں اس پر توبہ کر لی اور سخت نادم ہوا تو پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آپ اس کی توبہ قبول نہ کرتے اور اس سے زکوٰۃ نہ لیتے۔ اس مسئلہ پر قیاس کرنے کے لیے ہم ایک اور حدیث پیش کر رہے ہیں:

مصعب بن سعد اپنے والد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار شخصوں اور دو عورتوں کے سوا سب کے لیے امن کا اعلان کر دیا، اور فرمایا ان کو قتل کر دو خواہ تم ان کو کعبہ کے پردوں کے ساتھ لٹکا ہوا پاؤ، وہ چار شخص یہ تھے: عکرمہ بن ابی جہل، عبداللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ اور عبداللہ بن سعد بن ابی السرح، رہا عبداللہ بن خطل۔ وہ کعبہ کے پردوں کے ساتھ چمٹا ہوا پایا گیا۔ حضرت سعید بن حریث اور حضرت عمار بن یاسر نے اس کو پکڑا اور حضرت سعید نے حضرت عمار پر سبقت کر کے اس کو قتل کر ڈالا اور رہا مقیس بن صبابہ تو مسلمانوں نے اس کو بازار میں پکڑ کر قتل کر دیا اور رہا عکرمہ تو وہ سمندر میں کشتی میں سوار ہوا اور تند و تیز آندھیوں کی وجہ سے وہ کشتی طوفان میں پھنس گئی، پھر

کشتی والوں نے کہا اب اخلاص کے ساتھ اللہ سے دعا کرو، تمہارے خود ساختہ معبود یہاں تمہارے کسی کام نہیں آ سکتے، تب عکرمہ نے دل سے کہا اللہ کی قسم! اگر سمندر میں اخلاص کے سوا کوئی چیز نجات نہیں دے سکتی تو خشکی میں بھی اس کے سوا کوئی چیز نجات نہیں دے سکتی، اے اللہ! میں تجھ سے یہ عہد کرتا ہوں کہ اگر تو نے اس طوفان سے مجھے عافیت میں رکھا، تو میں سیدھا (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا، اور میں ان کو ضرور معاف کرنے والا اور کریم پاؤں گا، پس وہ حاضر ہوئے اور اسلام لے آئے۔ اور رہے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح تو وہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس چھپ گئے تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو عام بیعت کے لیے بلایا تو حضرت عثمان نے ان کو لا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا کر دیا، اور کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! عبداللہ کو بیعت کر لیجئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار سر اٹھا کر دیکھا اور ہر بار انکار کیا، پھر تین مرتبہ کے بعد اس کو بیعت کر لیا، پھر آپ نے اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: کیا تم میں کوئی سمجھ دار شخص نہیں تھا جو اس کو قتل کر دیتا جب اس نے یہ دیکھا کہ میں اس کو بیعت کرنے سے ہاتھ کھینچ رہا ہوں! صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! ہمیں کیا پتا، آپ کے دل میں کیا ہے؟ آپ ہمیں آنکھ سے اشارہ کر دیتے! آپ نے فرمایا: نبی کے لیے یہ جائز نہیں کہ اس کی خیانت کرنے والی آنکھ ہو۔

(سنن النسائی رقم الحدیث: ۴۰۷۸، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۲۶۸۳)

غور فرمائیے، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا تھا، اس کو قتل کر دیا جائے خواہ وہ کعبہ کے پردوں کے ساتھ لپٹا ہوا ہو لیکن وہ بھی جب آپ کے سامنے اسلام لانے کے لیے حاضر ہوا تو آپ نے اس کو بیعت کر لیا۔ اب اگر بالفرض ثعلبہ بن حاطب نے پہلی بار زکوٰۃ نہیں دی اور اس کو جزیہ کی بہن کہا تو وہ زیادہ سے زیادہ اس جرم کی بنا پر قتل کا مستحق تھا لیکن جب وہ اس پر نادم ہوا اور توبہ کر کے روتا ہوا زکوٰۃ دینے کے لیے حاضر ہوا تو آپ کے مزاج اور آپ کی سیرت کا تقاضا یہی تھا کہ آپ اس کی توبہ قبول کر لیتے اور اس سے زکوٰۃ لے لیتے۔ آپ نے اس سے کہیں زیادہ جرائم کے مرتکب اور معاصی میں ملوث لوگوں کو معاف فرما دیا تھا۔ کیا آپ نے عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر آپ اس کے متعلق ستر مرتبہ بھی استغفار کریں تو میں نہیں بخشوں گا۔ آپ نے فرمایا: اگر مجھے علم ہوتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے سے اللہ اس کو بخش دے گا تو میں ستر مرتبہ سے زیادہ اس کے لیے استغفار کرتا۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۱۳۶۶) اور کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جب ماعز نے زنا کر لیا تو ان کے دوست ہزال نے ان کو مشورہ دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جا کر یہ بتائیں، اور جب ماعز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے تو آپ نے ان سے چار مرتبہ (زنا کا) اقرار کرایا پھر ان کو سنگسار کرنے کا حکم دیا اور ہزال سے فرمایا: اگر تم اس پر پردہ رکھ لیتے تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوتا۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۴۳۷۷، ۴۳۷۸) اور اس روایت میں یہ مذکور ہے کہ ثعلبہ نے اپنے بالوں میں خاک ڈالی اور روتا ہوا یا رسول اللہ! یا رسول اللہ! کہتا ہوا زکوٰۃ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن آپ نے اس سے زکوٰۃ قبول نہیں فرمائی، ایسا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج نہ تھا!

سورۃ التوبہ کی ان آیات کا صحیح مصداق

صحیح بات یہ ہے کہ کچھ منافقوں نے یہ قسم کھائی تھی کہ اگر اللہ نے انہیں مال دیا تو وہ ضرور زکوٰۃ ادا کریں گے۔ پھر جب اللہ نے انہیں مال دیا تو انہوں نے بخل کیا اور زکوٰۃ نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس جرم کی سزا میں ان کے دلوں میں تا حیات نفاق کو پختہ کر دیا، وہ منافق کون تھے؟ امام ابن مردویہ کی تفسیر کے مطابق جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ وہ ثعلبہ بن ابی

حاطب تھے جیسا کہ حافظ عسقلانی کے حوالے سے گزر چکا ہے اور امام ابن جوزی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے (دوسری روایت میں) فرمایا: وہ بنو عمرو بن عوف کا ایک شخص تھا' اس کا شام میں مال تھا' ایک بار اس مال کے پہنچنے میں دیر ہو گئی اور اس نے بہت تنگی اٹھائی تب اس نے قسم کھائی کہ اگر اللہ نے اپنے فضل سے اس کو وہ مال عطا کر دیا تو وہ ضرور صدقہ کرے گا اور نماز پڑھے گا پھر جب اس کے پاس اس کا مال آ گیا تو اس نے بخل کیا اور اپنی قسم پوری نہیں کی۔ ابن السائب نے کہا اس شخص کا نام حاطب بن ابی بلتعہ تھا' امام رازی نے بھی اس روایت کو اختیار کیا ہے' امام ابن جوزی نے ضحاک کی ایک اور روایت ذکر کی ہے کہ نبتل بن الحارث' جد بن قیس' ثعلبہ بن حاطب اور معتب بن قشیر نے یہ قسم کھائی تھی کہ اگر اللہ نے ہمیں مال دیا تو ہم ضرور صدقہ کریں گے اور جب اللہ نے اپنے فضل سے انہیں مال دیا تو انہوں نے اس میں بخل کیا۔ (ہماری تحقیق کے مطابق اس روایت میں ثعلبہ بن حاطب کا شمار درست نہیں ہے یا پھر ہو سکتا ہے کہ وہ ثعلبہ بن ابی حاطب ہو)

(زاد المسیر ج ۳' ص ۴۷۴' مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

اس روایت کی تحقیق میں حرف آخر

ہمارے زمانہ میں اردو کی عام دستیاب تفسیروں میں بھی حضرت ثعلبہ بن حاطب انصاری رضی اللہ عنہ کی طرف اس واقعہ کو منسوب کیا گیا ہے اور جو خطباء اور واعظین ان اردو کی تفاسیر پر اعتماد کرتے ہیں' وہ ایک عظیم بدری صحابی پر افتراء باندھتے ہیں' سو میں نے یہ چاہا کہ اس عظیم بدری صحابی سے اس افتراء کو دور کروں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی مغفرت فرمائے اور ہم کو تحقیق کرنے کی توفیق دے اور سنی سنائی اور بے سند باتوں سے ہم کو اجتناب کی توفیق عطا فرمائے' میں نے ان آیات کی تفسیر میں حضرت ثعلبہ رضی اللہ عنہ کی نفاق اور بخل سے براءت میں بہت مفصل گفتگو کی ہے تاکہ حضرت ثعلبہ کی براءت ہر اعتبار سے مکمل ہو جائے اور اس کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک جو (منافق) خوشی سے صدقہ دینے والے مومنوں کو طعنہ دیتے ہیں' اور ان کو جن کے پاس (صدقہ کے لیے) اپنی محنت کی مزدوری کے سوا اور کچھ نہیں ہے' سو وہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں' اللہ ان کو ان کے مذاق اڑانے کی سزا دے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔O (التوبہ: ۷۹)

صحابہ کرام کے صدقات پر منافقین کے طعنے

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں جب ہم کو صدقہ دینے کا حکم دیا گیا تو ہم مشقت کر کے صدقہ لاتے تھے' ابو عقیل نصف صاع (دو کلو گرام) لے کر آئے اور کوئی انسان اس سے زیادہ لے کر آتا تو منافقین نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ اس صدقہ سے مستغنی ہے اور جو شخص زیادہ لے کر آیا ہے' وہ محض دکھاوے کے لیے لے کر آیا ہے' تب یہ آیت نازل ہوئی: بے شک جو (منافق) خوشی سے صدقہ دینے والے مومنوں کو طعنہ دیتے ہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۶۶۸' صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۰۱۸)

عمرو بن ابی سلمہ اپنے والد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقہ کرو کیونکہ میں ایک لشکر بھیجنا چاہتا ہوں' حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا: یا رسول اللہ! میرے پاس چار ہزار درہم ہیں' میں دو ہزار اللہ کو قرض دیتا ہوں اور دو ہزار اپنے عیال کے لیے رکھتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو تم نے اللہ کے لیے دیئے' اللہ اس میں بھی برکت دے اور جو تم نے اپنے عیال کے لیے رکھ لیے' اللہ اس میں بھی برکت دے' تب ایک انصاری نے کہا: یا رسول اللہ! میرے پاس دو صاع کھجوریں ہیں' ایک صاع میں اپنے رب کے لیے دیتا ہوں اور ایک صاع میں

اپنے لیے رکھ لیتا ہوں، تب منافقین نے طعنہ دیتے ہوئے کہا: ابن عوف نے محض ریاکاری کے لیے صدقہ دیا ہے اور کہا: اس شخص کے ایک صاع سے اللہ تعالیٰ مستغنی ہے۔

(جامع البیان جز ۱۰، ص ۲۴۹، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۸۵۰، اسباب النزول للواحدی ص ۲۶۰، تفسیر ابن کثیر ج ۲، ص ۴۲۱)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ ان کے لیے مغفرت طلب کریں یا نہ کریں، اگر آپ ان کے لیے ستر مرتبہ (بھی) مغفرت طلب کریں تو اللہ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا، یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا○ (التوبہ: ۸۰)

عبداللہ بن اُبی کی نماز جنازہ پڑھنے کا شانِ نزول

شعبی بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عبداللہ بن ابی ابن سلول نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے باپ کی نماز جنازہ کے لیے بلایا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ سے یہ ارشاد فرمایا گیا ہے: آپ ان کے لیے مغفرت طلب کریں یا نہ کریں، اگر آپ ان کے لیے ستر مرتبہ (بھی) مغفرت طلب کریں تو اللہ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا۔ اور میں اس کے لیے ستر، ستر اور ستر مرتبہ استغفار کروں گا، دوسری روایت میں ہے آپ نے فرمایا میں ان کے لیے ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کروں گا شاید اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرما دے، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ان کے حق میں برابر ہے آپ ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا۔ (المنافقین: ۶) ... (جامع البیان جز ۱۰ ص ۲۵۵-۲۵۴، ملخصاً)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب عبداللہ بن ابی فوت ہو گیا تو اس کا بیٹا عبداللہ بن عبداللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ نے اس کو اپنی قمیص دی اور فرمایا: اس میں اس کو کفن دینا، پھر آپ اس پر نماز جنازہ پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو حضرت عمر بن الخطاب نے آپ کے دامن کو پکڑا اور عرض کیا: آپ اس کی نماز جنازہ پڑھ رہے ہیں حالانکہ یہ منافق ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے لیے استغفار کرنے سے منع فرمایا ہے! آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے، آپ ان کے لیے مغفرت طلب کریں یا نہ کریں، اگر آپ ان کے لیے ستر مرتبہ (بھی) مغفرت طلب کریں تو اللہ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا، آپ نے فرمایا: میں عنقریب ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کروں گا، پھر آپ نے اس پر نماز جنازہ پڑھائی اور ہم نے بھی اس پر نماز جنازہ پڑھی، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ان میں سے جو شخص مر جائے آپ ان میں سے کسی کی نماز جنازہ نہ پڑھیں اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔ (التوبہ: ۸۴)

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۶۷۲، ۱۲۶۹، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۷۷۴)

عبداللہ بن اُبی کے کفن کے لیے قمیص عطا فرمانے کی وجوہ

عبداللہ بن ابی منافقوں کا سردار تھا پھر اس کی کیا وجہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنی قمیص عطا فرمائی، علماء کرام نے اس کے متعدد جوابات دیے ہیں:

(۱) عبداللہ بن ابی نے عمرہ حدیبیہ کے موقع پر مشرکین کی پیشکش کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر عمرہ کرنے سے انکار کر دیا تھا اس کی جزا میں آپ نے قمیص عطا فرمائی۔

(۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عبداللہ بن ابی کی دلجوئی کی خاطر قمیص عطا فرمائی تھی کیونکہ وہ خالص مومن اور صحابی تھے۔

(۳) کفن کے لیے قمیص کا نہ دینا مکارم اخلاق کے خلاف تھا، اس لیے آپ نے قمیص عطا فرمائی۔

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کسی چیز کا سوال کیا جائے اور وہ چیز آپ کے پاس ہو تو آپ منع نہیں فرماتے تھے۔

(۵) قرآن مجید میں ہے: واما السائل فلا تنھر۔ (الضحیٰ: ۱۰) اور سائل کو نہ جھڑکیں، آپ نے اس آیت پر عمل کیا۔

(۶) اکثر علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس دراز قامت تھے اور بدر کے دن ابن ابی کی قمیص کے سوا اور کسی کی قمیص ان کو پوری نہیں آئی، ابن ابی نے اپنی قمیص ان کے لیے دی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا بدلہ اتارنے کے لیے اپنی قمیص اس کو دی، اس وجہ کا ثبوت حسب ذیل حدیث میں ہے:

امام بخاری اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں: بدر کے دن قیدیوں کو اور عباس کو لایا گیا عباس کے اوپر کوئی کپڑا نہیں تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے قمیص کو دیکھا تو صرف عبداللہ بن ابی کی قمیص ان کے ناپ کی تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ قمیص ان کو پہنادی، اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیص اتار کر عبداللہ بن ابی کو پہنائی تھی۔ ابن عیینہ نے کہا: عبداللہ بن ابی کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان تھا، آپ نے اس احسان کا بدلہ اتار نا پسند کیا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۰۰۸)

(۷) علامہ بدرالدین عینی نے بیان کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری قمیص اس سے اللہ کے عذاب کو بالکل دور نہیں کر سکتی، مجھے امید ہے کہ اس سبب سے اللہ تعالیٰ (لوگوں کو) اسلام میں داخل کر دے گا۔ روایت ہے کہ خزرج کے لوگوں نے جب دیکھا کہ ابن ابی آپ کی قمیص کو طلب کر رہا ہے اور آپ سے نماز کی درخواست کر رہا ہے تو ایک ہزار آدمی اسلام میں داخل ہو گئے۔ (عمدۃ القاری ج ۸، ص ۵۴)

اللہ تعالیٰ کے منع کرنے کے باوجود عبداللہ بن اُبی کے لیے استغفار کی توجیہات

اکثر روایات صحیحہ میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کریمہ استغفر لھم اولا تستغفر لھم (التوبہ: ۸۰) آپ ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں" سے یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو استغفار کرنے یا استغفار نہ کرنے کا اختیار دیا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے، اکابر علماء کی ایک جماعت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر اشکال پیدا ہوا، کیونکہ قرآن مجید کی اس آیت سے آپ کو استغفار کا اختیار دینا واضح نہیں ہوتا، اس لیے بعض اکابر علماء نے اس حدیث پر جرح کی، حالانکہ یہ حدیث بکثرت طرق صحیحہ سے مروی ہے۔ امام بخاری، امام مسلم، اور صحیحین کے مخرجین کا اس کی صحت پر اتفاق ہے، اس لیے اس حدیث کا انکار علم حدیث سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ علامہ ابن منیر نے کہا، اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں لوگوں کو لغزش ہوئی، حتیٰ کہ قاضی ابوبکر نے اس حدیث کا انکار کیا اور کہا اس حدیث کو قبول کرنا جائز نہیں ہے، اور امام الحرمین نے کہا یہ حدیث "صحیح" نہیں ہے، علامہ داؤدی نے کہا یہ حدیث غیر محفوظ ہے، اس انکار کی وجہ وہی ہے جو حضرت عمر نے سمجھی تھی کہ "آپ ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں اگر آپ ان کے لیے ستر بار بھی استغفار کریں تو اللہ ان کو نہیں بخشے گا۔" اس آیت سے منافقین کی مغفرت کی نفی میں مبالغہ مراد ہے، ستر کے عدد کی خصوصیت اور اختیار دینا مراد نہیں ہے، جیسا کہ اس آیت کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول پر اشکال ہے کہ میں ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کروں گا۔ بعض متاخرین نے یہ جواب دیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ابی کی قوم کی تالیف کے لیے یہ فرمایا تھا اور آپ کا یہ ارادہ نہیں تھا کہ اگر آپ نے ستر بار سے زیادہ استغفار کیا تو اس کی مغفرت ہو جائے گی، اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے کہ "اگر مجھے یہ علم ہو تا کہ ستر بار سے زیادہ استغفار کرنے سے اس کی مغفرت ہو جائے گی تو میں ستر بار سے زیادہ استغفار کرتا۔" (صحیح بخاری ج ۲، ص ۶۷۴) لیکن ثابت وہ روایت ہے جس کے یہ الفاظ ہیں: "میں عنقریب ستر

بار سے زیادہ استغفار کروں گا۔" بعض علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد استصحاب حال پر مبنی ہے، کیونکہ اس آیت کے نزول سے پہلے ان کے لیے استغفار کرنا جائز تھا، اس لیے وہ اپنی اصل کے مطابق اب بھی جائز ہے، اور یہ اچھا جواب ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت سے نفی مغفرت کے مبالغہ کو سمجھنے کے باوجود اصل کے حکم کو باقی قرار دے کر اس پر عمل کرنے میں کوئی تنافی نہیں ہے گویا کہ آپ نے ستر بار سے زیادہ استغفار کرنے پر حصول مغفرت کو جائز قرار دیا لیکن اس پر یقین نہیں کیا۔ بعض علماء نے یہ جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنا فی نفسہ عبادت ہے، سو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ قصد عبادت ستر بار سے زیادہ استغفار کیا اور اس سے آپ کا یہ ارادہ نہیں تھا کہ عبداللہ بن ابی کی مغفرت ہو جائے، اس جواب پر یہ اشکال ہے کہ اس اعتبار سے پھر جس کی مغفرت محال ہو، اس کے لیے بھی مغفرت طلب کرنا جائز ہوگا حالانکہ یہ جائز نہیں ہے۔ (فتح الباری ج ۸، ص ۳۳۸، لاہور)

ہمارے نزدیک اس اشکال کا صحیح جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین کی مغفرت نہیں کرے گا اور آپ کو اس وقت تک ان کے لیے استغفار کرنے سے منع نہیں فرمایا تھا، اس لیے آپ نے فرمایا: میں ان کے لیے استغفار کروں گا اور استغفار کرنے سے آپ کی غرض ان کے لیے مغفرت حاصل کرنا نہیں تھی بلکہ ابن ابی کے بیٹے اور اس کی قوم کی دلجوئی اور اس حسن خلق کی وجہ سے اس کی قوم کو مسلمان کرنا آپ کا مطلوب تھا۔

ابن اُبَی کی نماز جنازہ پڑھنے کے متعلق امام رازی کا تسامح

امام رازی اس بحث میں لکھتے ہیں:

اگر یہ اعتراض ہو کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ علم تھا کہ عبداللہ بن ابی کافر ہے اور کفر پر مرا ہے تو آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھنے میں کیوں رغبت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کی نماز جنازہ پڑھنا اس کے اعزاز و اکرام کے مترادف ہے اور کافر کی تکریم جائز نہیں ہے، نیز اس کی نماز جنازہ پڑھنا، اس کے لیے دعائے مغفرت کو مستلزم ہے اور یہ بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو خبر دے چکا ہے کہ وہ کفار کی بالکل مغفرت نہیں کرے گا۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جب عبداللہ بن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی کہ آپ اس کو اپنی وہ قمیص عطا فرمائیں جو آپ کے جسم مبارک کے ساتھ لگی ہو تاکہ اس قمیص میں اس کو دفن کیا جائے تو اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ظن غالب ہوا کہ وہ اس وقت میں ایمان کی طرف منتقل ہو گیا ہے کیونکہ یہ وہ وقت ہے جس میں فاسق توبہ کر لیتا ہے اور کافر ایمان لے آتا ہے، سو جب آپ نے اس سے اظہار اسلام دیکھا اور اس کی ان علامات کا مشاہدہ کیا جو دخول اسلام پر دلالت کرتی ہیں تو آپ کا یہ ظن غالب ہو گیا کہ اب وہ مسلمان ہو گیا ہے تو آپ نے اپنے ظن غالب کے مطابق اس کی نماز جنازہ پڑھانے میں رغبت کی، اور جب جبرائیل علیہ السلام نے نازل ہو کر یہ خبر دی کہ وہ کفر اور نفاق پر مرا ہے تو پھر آپ اس کی نماز جنازہ پڑھانے سے باز رہے۔ (تفسیر کبیر ج ۶، ص ۱۱۶، مطبوعہ بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام رازی کی یہ تقریر صحیح نہیں ہے، صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر کتب احادیث صحیحہ میں یہ حدیث موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھی ہے اور کسی حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ جبریل علیہ السلام نے آپ کو یہ خبر دی تھی کہ ابن ابی کفر اور نفاق پر مرا ہے۔۔۔ باقی رہا یہ سوال کہ ابن ابی کا نفاق مشہور تھا پھر آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھانے میں کیوں رغبت کی، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات مقرر ہے کہ جب منافق ایمان کا اظہار کرے تو اس میں کفر کے باوجود اس پر اسلام کے احکام جاری کیے جاتے ہیں اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے کیونکہ احکام شرعیہ ظاہر حال پر مبنی ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم ظاہر پر حکم لگاتے ہیں اور باطن کا معاملہ اللہ کی طرف مفوض ہے، اور ابن ابی کے معاملہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری

قمیص اور میری نماز اس سے اللہ کے عذاب کو دور نہیں کر سکتی اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے سبب سے اس کی قوم کے ایک ہزار آدمیوں کو اسلام میں داخل کردے گا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول مغفرت کے لیے اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھائی تھی، آپ پر اعتراض تب ہوتا جب آپ حصول مغفرت کے لیے اس کی نماز جنازہ پڑھاتے۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ

جن کو (جنگ میں) رسول اللہ سے پیچھے رہ جانے کی اجازت دی گئی تھی وہ اللہ کی راہ میں اپنے بیٹھے رہنے سے خوش ہوئے اور انہوں

يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا

نے اس کو ناپسند کیا کہ وہ اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور انہوں نے کہا گرمی میں

فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿٨١﴾

نہ نکلو، آپ کہیے کہ جہنم کی آگ اس سے بہت زیادہ گرم ہے اگر وہ سمجھتے ○

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٢﴾

پس ان کو چاہیے کہ ہنسیں کم اور روئیں زیادہ یہ ان کاموں کی سزا ہے جو وہ کرتے تھے ○

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَاۗىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ

سو (اے رسول مکرم!) اگر اللہ آپ کو ان منافقوں کے کسی گروہ کی طرف واپس لائے اور یہ آپ سے جہاد میں جانے کی اجازت طلب کریں

فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ۭ

تو آپ ان سے کہیں کہ اب تم کبھی بھی میرے ساتھ نہ جا سکو گے اور کبھی میرے ہمراہ دشمن سے قتال نہیں کرو گے،

اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿٨٣﴾

تم پہلی بار بیٹھے رہنے پر راضی ہوئے سو اب پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو ○

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓي اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰي قَبْرِهٖ ۭ

اور جو ان میں سے مر جائے تو آپ ان میں سے کبھی بھی کسی کی نماز جنازہ نہ پڑھیں اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں،

اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَلَا تُعْجِبْكَ

بے شک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور بہ نافرمانی کی حالت میں مرے ○ آپ ان کے

اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِی الدُّنْیَا

اموال اور اولاد پر تعجب نہ کریں، اللہ یہ چاہتا ہے کہ ان چیزوں کی وجہ سے ان کو دنیا میں عذاب دے

وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ

اور حالت کفر میں ان کی جانیں نکلیں ○ اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے کہ

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ

تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ جہاد کرو تو ان میں سے متمول لوگ آپ سے اجازت

مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِیْنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوْا بِاَنْ یَّكُوْنُوْا

مانگتے ہیں، اور کہتے ہیں ہم کو چھوڑ دیجئے ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہ جائیں ○ انہوں نے یہ پسند کیا کہ وہ پیچھے رہ جانے

مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾ لٰكِنِ

والی عورتوں کے ساتھ ہو جائیں اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے سو وہ نہیں سمجھتے ○ لیکن

الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ

رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں نے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا،

وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَیْرٰتُ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ

اور ان ہی کے لیے سب اچھائیاں ہیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں ○ اللہ نے ان کے لیے

لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ

ان جنتوں کو تیار کر رکھا ہے جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۸۹﴾ ع ۱۱ ۹ ۱۷

اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جن کو (جنگ میں) رسول اللہ سے پیچھے رہ جانے کی اجازت دی گئی تھی، وہ اللہ کی راہ میں اپنے بیٹھے رہنے سے خوش ہوئے اور انہوں نے اس کو ناپسند کیا کہ وہ اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور انہوں نے کہا گرمی میں نہ نکلو، آپ کہئے کہ جہنم کی آگ اس سے بہت زیادہ گرم ہے، اگر وہ سمجھتے ○ (التوبہ: ۸۱)

ربط آیات

یہ آیت ان منافقین کی مذمت میں نازل ہوئی ہے جو غزوۂ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے ساتھ نہیں گئے تھے اور پیچھے بیٹھے رہ گئے تھے، اور ان کو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلنا ناگوار ہوا تھا اور بعض منافقین نے بعض سے کہا اس گرمی میں نہ نکلو، کیونکہ غزوہ تبوک کی طرف روانگی سخت گرمی میں ہوئی تھی اس وقت پھل پک چکے تھے اور درختوں کا سایہ اور پھل اچھے لگتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے فرمایا کہ ان سے کہیے کہ جہاد سے پیچھے رہنے کی وجہ سے تم جس جہنم میں جانے والے ہو، وہ اس گرمی سے بہت زیادہ گرم ہے۔

دوزخ کی گرمی

جہنم کی گرمی اور تپش کے متعلق حسب ذیل احادیث ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنو آدم جس آگ کو جلاتے ہیں، وہ جہنم کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے، الحدیث۔

(موطا امام مالک رقم الحدیث: ۸۳۹، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۲۶۵، صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۲۸۴۳)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک ہزار سال تک دوزخ کی آگ کو بھڑکایا گیا حتیٰ کہ وہ سرخ ہو گئی، پھر اس کو ایک ہزار سال تک بھڑکایا گیا حتیٰ کہ وہ سفید ہو گئی، پھر اس کو ایک ہزار سال تک بھڑکایا گیا حتیٰ کہ وہ سیاہ ہو گئی، پس وہ سیاہ تاریک ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۵۹۱، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۳۲۰)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس ان کو چاہیے کہ ہنسیں کم اور روئیں زیادہ، یہ ان کاموں کی سزا ہے جو وہ کرتے تھے۔

(التوبہ: ۸۲)

امام رازی نے فرمایا اس آیت میں اگرچہ امر کے صیغے ہیں لیکن ان کا معنی خبر ہے یعنی عنقریب ان منافقین کو یہ حالت حاصل ہوگی یعنی دنیا کی عمر کم ہے اس لیے ان کے ہنسنے کے مواقع کم ہوں گے اور آخرت غیر متناہی ہے اور اس میں ان کو درد اور عذاب کی وجہ سے رونا پڑے گا، سو یہ غیر متناہی زمانہ تک روتے رہیں گے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ ان کاموں کی یعنی ان کے کفر اور نفاق کی سزا ہے جو یہ دنیا میں کرتے تھے۔ (تفسیر کبیر ج ۶، ص ۱۱۴) حافظ ابن کثیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت ذکر کی ہے کہ دنیا قلیل ہے، یہ منافق اس میں جتنا چاہیں، ہنس لیں اور جب یہ دنیا منقطع ہو جائے گی اور یہ اللہ عزوجل کی طرف جائیں گے تو پھر یہ روئیں گے اور یہ رونا کبھی ختم نہیں ہو گا۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۲، ص ۴۲۳، مطبوعہ ۱۴۱۸ھ)

کم ہنسنے اور زیادہ رونے کی تلقین

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ان چیزوں کو دیکھ رہا ہوں جن کو تم نہیں دیکھ سکتے، اور میں ان چیزوں کو سنتا ہوں جن کو تم نہیں سن سکتے، آسمان چرچرا رہا ہے اور اس کو چرچرانے کا حق ہے، اس میں ہر چار انگشت پر ایک فرشتہ اپنی پیشانی کو اللہ کے لیے سجدہ میں رکھے ہوئے ہے، اللہ کی قسم! اگر تم ان چیزوں کو جان لو جن کو میں جانتا ہوں تم کم ہنسو اور روؤ زیادہ اور تم بستروں پر عورتوں سے لذت لینا چھوڑ دو، اور تم اللہ سے فریاد کرتے ہوئے جنگلوں کی طرف نکل جاؤ۔ حضرت ابوذر نے کہا: کاش میں ایک درخت ہوتا جس کو کاٹ دیا جاتا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۱۲، مسند احمد ج ۵، ص ۱۷۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۱۹۰، حلیۃ الاولیاء ج ۲، ص ۲۳۶، ج ۶،

ص۲۶۹، شرح السنۃ رقم الحدیث: ۴۱۷۲)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: اے لوگو روؤ اگر تم کو رونا نہ آئے تو رونے کی کوشش کر کے روؤ، کیونکہ دوزخی دوزخ میں روئیں گے حتیٰ کہ ان کے آنسو ان کے چہروں پر اس طرح بہیں گے گویا کہ وہ نہریں ہیں، حتیٰ کہ ان کے آنسو ختم ہو جائیں گے، پھر ان کا خون بہنے لگے گا اور وہ خون اتنا زیادہ بہہ رہا ہو گا کہ اگر اس میں کشتی چلائی جائے تو وہ چل پڑے گی۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۱۹۶، مسند ابویعلی رقم الحدیث: ۴۱۳۴، مجمع الزوائد ج۱۰ ص۳۹۱، المطالب العالیہ رقم الحدیث: ۴۶۷۳)

سالم بن ابی الجعد بیان کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اس شخص کے لیے خوشی ہو جس نے اپنی زبان کی حفاظت کی اور اپنے گھر میں وسعت رکھی اور اپنے گناہ پر رویا۔ (کتاب الزہد لابن المبارک رقم الحدیث: ۱۳۴)

عبداللہ تیمی نے کہا جس کو ایسا علم دیا گیا جس کی وجہ سے وہ رویا نہیں، وہ اس لائق ہے کہ اس کو نفع آور علم دیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رونے والے علماء کی تعریف کی ہے، وہ فرماتا ہے: بے شک اس سے پہلے جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا، جب ان پر اس قرآن کی تلاوت کی جاتی تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر جاتے اور کہتے ہمارا رب پاک ہے بے شک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہونا تھا○ اور وہ روتے ہوئے ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں اور یہ قرآن ان کے خشوع کو اور بڑھاتا ہے○ (بنواسرائیل: ۱۰۹-۱۰۷) (کتاب الزہد رقم الحدیث: ۱۲۵، حلیۃ الاولیاء ج۵، ص۸۸)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو (اے رسول مکرم!) اگر اللہ آپ کو ان منافقوں کے کسی گروہ کی طرف واپس لائے، اور یہ آپ سے جہاد میں جانے کی اجازت طلب کریں تو آپ ان سے کہیں کہ اب تم کبھی بھی میرے ساتھ نہ جا سکو گے، اور کبھی میرے ہمراہ دشمن سے قتال نہیں کرو گے، تم پہلی بار بیٹھے رہنے پر راضی ہوئے، سو اب پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو○ (التوبہ: ۸۳)

غزوۂ تبوک کے بعد منافقوں کو کسی غزوہ میں شرکت سے ممانعت کی توجیہ

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے برے کاموں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف ان کی سازشوں کا بیان فرمایا تھا اور یہ بتایا تھا کہ مسلمانوں کی بھلائی اس میں ہے کہ منافق ان کے ساتھ کسی غزوہ میں نہ جائیں کیونکہ ان کا کسی غزوہ میں شریک ہونا انواع واقسام کے شر اور فساد کا موجب ہوتا ہے، اب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر آپ کو اللہ تعالیٰ منافقین کے کسی گروہ کی طرف واپس لائے، منافقین کے ایک گروہ کی قید اس لیے لگائی کہ مدینہ میں مخلص مسلمان بھی موجود تھے، جو معذور تھے اور عذر کی وجہ سے غزوہ تبوک میں نہیں جا سکے تھے، سو جب آپ مدینہ میں واپس آئیں اور یہ منافقین آپ سے پھر کسی غزوہ میں شریک ہونے کی اجازت طلب کریں تو آپ کہہ دیں کہ تم اب کبھی بھی کسی غزوہ میں میرے ساتھ نہیں جا سکو گے، یہ ارشاد ان کے نفاق کے اظہار، ان کی اہانت اور مذمت اور ان پر لعنت کرنے کے قائم مقام ہے، کیونکہ جب انہوں نے جھوٹے حیلے بہانے کر کے آپ سے جہاد میں نہ شریک ہونے کی اجازت طلب کی تو ان کا چھپا ہوا کفر ظاہر ہو گیا، کیونکہ دین اسلام میں مسلمانوں کی جہاد کی طرف رغبت تو سب کو بداہتاً معلوم ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا آئندہ ان کو جہاد میں شرکت سے منع فرمانا اس لیے تھا کہ مسلمان ان کے شر اور فساد اور ان کے مکر و فریب اور ان کی سازشوں سے محفوظ رہیں اور چونکہ یہ پہلی بار یعنی غزوہ تبوک میں اس بات کو پسند کرتے تھے کہ مدینہ میں معذوروں کے ساتھ بیٹھے رہیں سو وہ آئندہ بھی

اسی کو پسند کریں، گویا جب ایک بار انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں جانا پسند نہیں کیا تو اس کی سزا ان کو یہ دی گئی کہ اب اگر آئندہ یہ آپ کے ساتھ جانا چاہیں گے پھر بھی ان کو اجازت نہیں ملے گی، اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص اس کے خلاف سازشیں کرتا ہے تو وہ آئندہ اس کو اپنا رفیق اور مصاحب بنانے سے گریز کرے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اور جو ان میں سے مرجائے تو آپ ان میں سے کبھی بھی کسی کی نماز جنازہ نہ پڑھیں اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں، بے شک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور یہ نافرمانی کی حالت میں مرے۔** (التوبہ: ۸۴)

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی اہانت اور ان کی مذمت کرنے کا حکم دیا تھا اور اس آیت میں ان کی مزید اہانت کرنے کا حکم دیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی نماز جنازہ پڑھنے سے بھی منع فرما دیا اور اس سے بڑی اور کیا مذمت ہوگی!

منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے کی ممانعت کا شان نزول

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب عبداللہ بن ابی فوت ہو گیا تو اس کے فرزند حضرت عبداللہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، آپ نے انہیں اپنی قمیص دے کر یہ فرمایا کہ اس میں اس کو کفن دیا جائے، پھر آپ اس کی نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ حضرت عمر بن الخطاب نے آپ کا دامن پکڑ کر کہا: آپ اس کی نماز پڑھا رہے ہیں، حالانکہ وہ منافق تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے لیے استغفار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے اور فرمایا ہے: استغفرلهم اولا تستغفرلهم ان تستغفرلهم سبعين مرة فلن يغفر الله لهم۔ (التوبہ: ۸۰) آپ ان کے لیے استغفار کریں یا ان کے لیے استغفار نہ کریں، اگر آپ ان کے لیے ستر بار استغفار کریں تب بھی اللہ ان کو نہیں بخشے گا۔" آپ نے فرمایا: "میں ستر بار سے زیادہ استغفار کروں گا۔" پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور ہم نے آپ کے ساتھ اس کی نماز جنازہ پڑھی، پھر آپ پر یہ آیت نازل ہوئی:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ۔ (التوبہ: ۸۴)	اور آپ ان میں سے کسی کی میت پر کبھی نماز نہ پڑھیں، اور نہ (کبھی) ان میں سے کسی کی قبر پر کھڑے ہوں، بے شک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور وہ نافرمان ہونے کی حالت میں مر گئے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۶۷۲، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۷۷۴)

عبداللہ بن اُبی کے نفاق کے باوجود اس کی نماز جنازہ پڑھانے کی توجیہات

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یقین سے کہا کہ ابن ابی منافق ہے، اس کا یہ یقین ابن ابی کے ظاہر احوال پر مبنی تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس یقین پر عمل نہیں کیا کیونکہ وہ بظاہر مسلمانوں کے حکم میں تھا اور آپ نے بطور استصحاب اسی ظاہری حکم پر عمل کرتے ہوئے اس کی نماز جنازہ پڑھائی، نیز آپ کو اس کے بیٹے کی عزت افزائی منظور تھی، جو نہایت مخلص اور صالح مومن تھے، اور اس کی قوم کی تالیف قلوب میں مصلحت تھی، اور ایک شر کو دور کرنا مقصود تھا اور ابتداء میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کی دی ہوئی اذیتوں پر صبر کرتے تھے اور ان کو معاف اور درگزر کرتے تھے، پھر آپ کو مشرکین سے قتال کا

حکم دیا گیا اور جو لوگ اسلام کو ظاہر کرتے تھے، خواہ باطن میں اسلام کے مخالف ہوں، ان کے ساتھ آپ کے درگزر کرنے کا معاملہ بدستور جاری رہا، اور ان کو متنفر نہ کرنے اور ان کی تالیف قلوب کرنے میں مصلحت تھی، اسی لیے آپ نے فرمایا تھا "کہیں لوگ یہ نہ کہیں کہ محمد اپنے اصحاب کو قتل کر رہے ہیں۔" اور جب مکہ فتح ہو گیا اور مشرکین اسلام میں داخل ہو گئے اور کفار بہت کم اور پست ہو گئے تب آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ منافقین کو ظاہر کر دیں اور خاص طور پر ابن ابی کی نماز جنازہ پڑھانے کا واقعہ اس وقت پیش آیا تھا، جب منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے کی صراحتاً ممانعت نہیں کی گئی تھی، اس تقریر سے ابن ابی کی نماز جنازہ پڑھانے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو اشکال ہے، وہ دور ہو جاتا ہے۔

علامہ خطابی نے کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کے ساتھ جو حسن سلوک کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ جس شخص کا دین کے ساتھ معمولی سا بھی تعلق ہو، آپ اس پر نہایت شفقت فرماتے تھے، نیز آپ اس کے بیٹے کی دل جوئی کرنا چاہتے تھے جو نیک صحابی تھے اور اس کی قوم خزرج کی تالیف قلوب کرنا چاہتے تھے جن کا وہ رئیس تھا، اگر آپ اس کے بیٹے کی درخواست قبول نہ فرماتے اور اللہ تعالیٰ کے صراحتاً منع فرمانے سے پہلے اس کی نماز جنازہ پڑھانے سے انکار فرما دیتے تو اس کے بیٹے کی دل شکنی ہوتی اور اس کی قوم کے لیے باعث عار ہوتا، اس لیے آپ نے صراحتاً ممانعت کے وارد ہونے سے پہلے انتہائی مستحسن امر کو اختیار فرمایا۔

بعض محدثین نے یہ جواب دیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھائی اس میں دلیل ہے کہ اس کا ایمان صحیح تھا، لیکن یہ جواب صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ ان آیات اور احادیث کے خلاف ہے جن میں اس کے ایمان نہ ہونے کی صراحت ہے۔

امام ابن جریر طبری نے اس قصہ میں اپنی سند کے ساتھ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری قمیص اس سے اللہ کے عذاب کو دور نہیں کر سکتی لیکن مجھے امید ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی قوم کے ایک ہزار آدمی مسلمان ہو جائیں گے۔

(فتح الباری ج ۸ ص ۳۳۶، مطبوعہ لاہور، عمدۃ القاری ج ۱۸، ص ۲۷۳، مطبوعہ مصر، ارشاد الساری ج ۷، ص ۱۴۸، مطبوعہ مصر، فیض الباری ج ۴، ص ۴۵۲، مطبوعہ لاہور)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام ابن جریر طبری کی جس روایت کا حوالہ دیا ہے، اس کو امام ابن جریر کے علاوہ دیگر ائمہ نے بھی روایت کیا ہے اور متعدد مفسرین نے اس روایت کا ذکر کیا ہے:

امام ابن جریر نے دو سندوں کے ساتھ اس کو قتادہ سے روایت کیا ہے: جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۲۶۱، ۱۳۲۶۲، اسباب النزول للواحدی ص ۲۶۲، امام ابن جوزی نے اس کو قتادہ اور زجاج کے حوالے سے ذکر کیا ہے، زاد المسیر ج ۳، ص ۴۸۰، معالم التنزیل ج ۲، ص ۲۶۷، تفسیر خازن ج ۲، ص ۲۶۹، الدر المنثور ج ۴، ص ۲۵۹، روح المعانی ج ۱۰، ص ۱۵۴، حاشیۃ الشیخ زادہ علی البیضاوی ج ۴، ص ۴۹۷، مطبوعہ بیروت، ۱۴۱۹ھ۔

مشرکین کے لیے استغفار کی ممانعت کے باوجود عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھانے کی توجیہات

حافظ شہاب الدین احمد بن علی ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھانے پر ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے استغفار کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے اور یہ فرمایا کہ میں ستر بار سے زیادہ استغفار کروں گا، حالانکہ عبداللہ بن ابی کی وفات ۹ھ میں ہوئی ہے

اور ہجرت سے پہلے جب ابو طالب کی وفات ہوئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تک مجھے منع نہ کیا جائے، میں تمہارے لیے استغفار کرتا رہوں گا، اس وقت قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ۔

نبی اور ایمان والوں کی شان کے یہ لائق نہیں کہ وہ مشرکین کے لیے استغفار کریں، خواہ وہ ان کے قرابت دار ہوں، جب کہ ان پر یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ وہ جہنمی ہیں۔

(التوبہ: ۱۱۳)

تو جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے مشرکین کے لیے استغفار کرنے سے منع کر دیا تھا تو پھر آپ نے ہجرت کے نو سال بعد عبداللہ بن ابی کے لیے استغفار کیوں کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو اس استغفار سے منع کیا گیا ہے جس میں حصول مغفرت اور قبولیت دعا کی توقع کی جائے جیسا کہ ابو طالب کے لیے استغفار کے معاملہ میں تھا، اس کے برخلاف آپ نے عبداللہ بن ابی کے لیے جو استغفار کیا تھا اس سے غرض اس کی مغفرت کا حصول نہیں تھا، بلکہ اس سے غرض یہ تھی کہ اس کے بیٹے کی دلجوئی کی جائے اور اس کی قوم کی تالیف قلوب کی جائے۔

علامہ زمخشری نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا تھا کہ "اگر آپ ستر مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو نہیں بخشے گا۔" زبان و بیان کے اسلوب کے مطابق ستر بار کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ نے بکثرت استغفار کیا پھر بھی اللہ تعالیٰ ان کو نہیں معاف کرے گا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام مخلوق سے زیادہ فصیح ہیں۔ آپ سے یہ معنی کیسے مخفی رہا حتیٰ کہ آپ نے اس کو عدد کی خصوصیت پر محمول کیا اور فرمایا میں اکثر مرتبہ استغفار کروں گا، اسی طرح دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا "آپ ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ استغفار سے ان کو نفع نہیں ہو گا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو اس پر محمول کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اختیار دیا ہے کہ آپ استغفار کریں یا نہ کریں، اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر معنی مخفی نہیں تھے، ان آیتوں کے قریب اور متبادر معنی یہی تھے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور توریہ کے بعید معنی مراد لیے تاکہ امت پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نہایت شفقت اور غایت رحمت کا اظہار ہو، جیسا کہ حضرت ابراہیم نے کہا:

وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

اور جس نے میری معصیت کی تو یقیناً تو بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

(ابراہیم: ۳۶)

کیونکہ حضرت ابراہیم نے اس آیت میں معصیت سے مراد اللہ کی معصیت یعنی بت پرستی کو مراد نہیں لیا بلکہ اپنی معصیت مراد لی جبکہ سیاق و سباق سے یہاں اللہ تعالیٰ کی معصیت مراد ہے اور یہ اپنی امت پر رحمت اور شفقت کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا توریہ ہے، اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت پر رحمت اور شفقت کے غلبہ کی وجہ سے بعید معنی مراد لیا۔

بعض علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے استغفار کرنے سے منع کیا ہے جس کا خاتمہ شرک پر ہوا ہو، اور یہ ممانعت اس کے لیے استغفار کرنے سے ممانعت کو مستلزم نہیں ہے جو دین اسلام کا اظہار کرتے ہوئے مرا ہو، اور یہ بہت اچھا جواب ہے۔ (فتح الباری ج ۸، ص ۳۳۹-۳۳۸، مطبوعہ لاہور)

ہمارے نزدیک بہترین جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں اس استغفار سے منع کیا ہے جس سے مقصود مغفرت کا حصول ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ابی کے لیے جو استغفار کیا تھا' اس سے مراد اس کے بیٹے کی دلجوئی اور اس کی قوم کے ایک ہزار آدمیوں کا اسلام تھا، جیسا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری قمیص اور میری نماز اس سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دور نہیں کر سکتی لیکن مجھے امید ہے کہ اس وجہ سے اس کی قوم کے ایک ہزار آدمی اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ اس روایت کو امام جریر طبری نے روایت کیا ہے۔

کیا ابن ابی کے حق میں مغفرت کی دعا کا قبول نہ ہونا آپ کی محبوبیت کے منافی ہے؟

اگر یہ سوال کیا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ابی کی مغفرت کے لیے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول نہیں فرمایا' اور یہ آپ کی شان محبوبیت کے خلاف ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ بعض دفعہ کسی لفظ سے اس کا صریح معنی مراد ہوتا ہے اور کبھی اس لفظ سے متکلم کا خاص منشاء مراد ہوتا ہے۔ آپ نے جو ابن ابی کے لیے مغفرت کی تھی اس سے مراد اس کے لیے مغفرت کا حصول نہیں تھا' بلکہ اس سے آپ کا منشاء اس کی قوم کے لیے ایمان کا حصول تھا' اور جو اس دعا سے آپ کا منشاء تھا وہ اللہ تعالیٰ نے پورا کر دیا۔ اس کی نظیر قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا۔ (کہف: ۲۹)

اور فرما دیجئے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کی ہے جس کی چار دیواری ان کو (ہر طرف سے) گھیر لے گی۔

اس آیت کا منطوق صریح یہ ہے جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے' یعنی انسان کو کفر کرنے کا بھی اختیار دیا ہے اور اس کا حکم دیا ہے لیکن اس آیت کا منشاء تہدید ہے اور کفر کرنے پر آگ کے عذاب کی وعید ہے۔

امام رازی لکھتے ہیں:

یہ آیت پچھلی آیت سے اس طرح مربوط ہے کہ مال دار مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا تھا کہ اگر آپ فقراء کو اپنے پاس سے بھگا دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے' اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے یہ فرمایا کہ آپ ان کی طرف التفات نہ کریں اور ان لوگوں سے یہ کہیں کہ دین حق اللہ کی طرف سے ہے' اگر تم نے اس کو قبول کر لیا تو تم کو نفع ہو گا اور اگر تم نے اس کو قبول نہیں کیا تو تم کو نقصان ہو گا اور یہ جو فرمایا ہے "جو چاہے کفر کرے۔" تو قرآن مجید میں بہت جگہ امر کا لفظ فعل کی طلب کے لیے نہیں آیا' حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا: یہاں امر کا لفظ تہدید اور وعید کے لیے ہے' تخییر کے لیے نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر ج۵' ص ۴۸۴' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۳۹۸ھ)

علامہ آلوسی' علامہ خفاجی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

یعنی اس آیت میں امر اور تخییر اپنی حقیقت پر محمول نہیں ہے بلکہ یہاں مجازاً یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان مالدار کافروں کی کوئی پرواہ نہیں ہے اور کفر کا حکم دینا مراد نہیں ہے' بلکہ یہ ان کو رسوا کرنے سے کنایہ ہے۔ (روح المعانی ۱۵' ص ۲۶۷)

اسی طرح قرآن مجید میں ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ (البقرہ: ۲۳)

اگر تم کو اس کلام کے متعلق شک ہو' جس کو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس کلام کی مثل کوئی سورت لے آؤ۔

اس آیت کا منطوق صریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں شک کرنے والوں کو یہ حکم دیا کہ وہ قرآن مجید کی مثل ایک سورت بنا کر لائیں لیکن اس کا منشاء یہ ہے کہ وہ اس کی مثل سورت نہیں بنا سکتے اور اس سے مکمل عاجز ہیں۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

علامہ خفاجی نے یہ کہا ہے کہ اس آیت سے مراد عرب کے بلغاء کو چیلنج دینا ہے اور ان کو قرآن مجید کی مثل سورت لانے سے عاجز کرنا ہے۔ (روح المعانی ج ۱۱ ص ۱۹۴)

ہم نے دو مثالیں ذکر کی ہیں، ورنہ قرآن مجید میں بکثرت ایسی مثالیں ہیں، جہاں کسی لفظ سے اس کا منطوق اور مدلول صریح مراد نہیں ہوتا بلکہ اس سے کوئی خاص منشاء مراد ہوتا ہے، اسی طرح جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بظاہر ابن ابی کی مغفرت کے لیے دعا کی تو اس دعا سے اس کا منطوق اور مدلول صریح مراد نہیں تھا بلکہ اس لفظ سے آپ کا خاص منشاء مراد تھا اور وہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے حسن اخلاق کی وجہ سے اس کی قوم کے ایک ہزار لوگوں کو مسلمان کر دے، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول کر لی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ وللہ الحمد علی ذالک۔

دفن کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر اللہ کا ذکر کرنا، اور اس سے قبر پر اذان کا استدلال

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ منافقین میں سے کسی کی قبر پر کھڑے نہ ہوں۔ (التوبہ: ۸۴)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ مبارکہ یہ تھا کہ میت کے دفن کیے جانے کے بعد اس کی قبر پر کھڑے رہتے اور اس کے لیے دعا فرماتے کہ اللہ تعالیٰ ان کو منکر نکیر کے سوالوں کے جواب میں ثابت قدم رکھے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم میت کے دفن سے فارغ ہوتے تو اس کی قبر پر ٹھہرتے اور فرماتے: اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو اور اس کے لیے ثابت قدم رہنے کی دعا کرو، کیونکہ اب اس سے سوال کیا جائے گا۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۲۲۱) اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جس دن حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ فوت ہوئے، اس دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد کی نماز جنازہ پڑھائی، ان کو قبر میں اتارا، جب ان کی قبر کی مٹی برابر کر دی گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے سبحان اللہ کہا اور ہم نے بہت دیر تک سبحان اللہ کہا، پھر آپ نے اللہ اکبر کہا اور ہم نے بھی اللہ اکبر کہا، آپ سے پوچھا گیا: یا رسول اللہ! آپ نے سبحان اللہ اور اللہ اکبر کس وجہ سے کہا، آپ نے فرمایا: اس نیک بندے پر قبر تنگ ہو گئی تھی، حتیٰ کہ اللہ نے اس پر کشادگی کر دی۔

(مسند احمد ج ۱، ص ۳۶۰، احمد شاکر نے کہا ہے اس حدیث کی سند صحیح ہے، مسند احمد ج ۱۲، رقم الحدیث: ۱۴۸۰۹، مطبوعہ دار الحدیث القاہرہ، ۱۴۱۶ھ)

حافظ جلال الدین سیوطی نے اس حدیث کو متعدد اسانید کے ساتھ ذکر کیا ہے:

(اللآلی المصنوعہ ج ۲، ص ۳۶۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ)

علامہ ابوالحسن علی بن محمد عراق الکنانی المتوفی ۹۶۳ھ نے بھی اس حدیث کو دار قطنی، ابن شاہین، نسائی، حاکم، بیہقی اور طبرانی کے حوالوں سے درج کیا ہے۔ (تنزیہ الشریعہ ج ۴، ص ۳۷۲-۳۷۱)

تاہم تسبیح اور تکبیر کا ذکر صرف مسند احمد کی روایت میں ہے اور وہ روایت صحیح ہے اور ہمارے علماء نے اس حدیث سے

یہ استدلال کیا ہے کہ دفن کے بعد قبر پر اذان دینا جائز ہے کیونکہ اذان میں بھی اللہ کا ذکر ہے اور اس سے میت سے عذاب ساقط ہوتا ہے اور توحید اور رسالت کے ذکر سے میت کو سوالات کے جوابات کی تلقین ہوتی ہے، تاہم اس عمل کو کبھی کبھی کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ فرض اور واجب کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے۔

سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا کے ایمان پر استدلال

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی والدہ ماجدہ کی زیارت کے لیے اجازت طلب کی تو آپ کو اجازت دے دی گئی اور اس اجازت سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ سیدتنا آمنہ رضی اللہ عنہا موحدین میں سے تھیں، نہ کہ مشرکین میں سے اور یہی میرا مختار ہے اور وجہ استدلال یہ ہے کہ آپ کو کافروں کی قبر پر کھڑے ہونے سے منع فرمایا ہے اور آپ کو آپ کی والدہ کی قبر پر قیام کی اجازت دی گئی اور یہ اس کی دلیل ہے کہ آپ کی والدہ کافروں میں سے نہیں تھیں، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی قبر پر کھڑے ہونے کی اجازت نہ دی جاتی، اور ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ علم ہو کہ زمانہ جاہلیت میں آپ کی والدہ توحید پر تھیں اور آپ کو وحی کے ذریعہ اس کی صحت پر اطلاع دی گئی، اس لیے اب یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ آپ کا اجازت طلب کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کی والدہ مشرکین میں سے تھیں ورنہ آپ بغیر اجازت کے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کر لیتے، کیونکہ آپ کا اجازت طلب کرنا اپنے علم کو مقرر اور ثابت کرنے کے لیے تھا۔

(روح المعانی جز ۱۰، ص ۱۵۵، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ ان کے اموال اور اولاد پر تعجب نہ کریں، اللہ یہ چاہتا ہے کہ ان چیزوں کی وجہ سے ان کو دنیا میں عذاب دے اور حالت کفر میں ان کی جانیں نکلیں ○ (التوبہ: ۸۵)

التوبہ: ۵۵ میں اس آیت کی تفسیر گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے کہ تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ جہاد کرو تو ان میں سے متمول لوگ آپ سے اجازت مانگنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں ہم کو چھوڑ دیجیے، ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہ جائیں ○ (التوبہ: ۸۶)

اس آیت کا مضمون التوبہ: ۸۳ میں گزر چکا ہے اور اللہ پر ایمان لاؤ کا معنی ہے اللہ پر ایمان کو برقرار رکھو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انہوں نے یہ پسند کیا کہ وہ پیچھے رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ ہو جائیں اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے سو وہ نہیں سمجھتے ○ (التوبہ: ۸۷)

ان کے دلوں پر مہر لگانے کا معنی یہ ہے کہ ان کا دل کفر کی طرف رغبت کرتے کرتے اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ اس کے بعد ایمان لانے کا امکان باقی نہیں رہا یا انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سخت نافرمانی اور گستاخی کی ہے کہ سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی، اب وہ ایمان لانا بھی چاہیں تو ایمان نہیں لا سکتے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لیکن رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں نے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا اور ان ہی کے لیے سب اچھائیاں ہیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں ○ اللہ نے ان کے لیے ان جنتوں کو تیار کر رکھا ہے جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے ○ (التوبہ: ۸۹-۸۸)

ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے اور قرآن مجید کا اسلوب ہے کہ وہ کافروں اور منافقوں کی صفات بیان کرنے کے بعد

مومنوں کی صفات کا ذکر فرماتا ہے اور کافروں اور منافقوں کی سزا کے بعد مومنوں کی جزا کا ذکر فرماتا ہے، پہلے بیان فرمایا تھا کہ منافق حیلے بہانے کر کے جہاد سے بھاگتے ہیں اور ان کی سزا دوزخ ہے، اب بیان فرمایا کہ مومن اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ جہاد کرتے ہیں اور ان کی جزا جنّت ہے۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ

اور بہانہ بناتے ہوئے دیہاتی آئے تاکہ ان کو (بھی جہاد سے) رخصت دی جائے اور جن لوگوں نے اللہ اور

كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ

اس کے رسول کی تکذیب کی تھی وہ (گھروں میں) بیٹھ گئے، ان میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کو عنقریب عذاب

اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى

ہوگا ○ کمزوروں اور بیماروں اور جو لوگ خرچ کرنے کی طاقت نہیں

الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَ

رکھتے، ان پر (جہاد میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے) کوئی حرج نہیں ہے، جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول

رَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾

کے لیے اخلاص سے عمل کریں، نیکی کرنے والوں پر (طعنہ کرنے کی) کوئی راہ نہیں ہے اور اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے ○

وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ

اور نہ ان لوگوں پر کوئی حرج ہے جو آپ کے پاس آئے تاکہ آپ انہیں جہاد کے لیے سواری مہیا کریں تو آپ نے فرمایا تمہارے

اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا

لیے میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے، وہ اس حال میں واپس گئے کہ ان کی آنکھوں سے اس غم میں آنسو بہہ رہے تھے

اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ؕ ﴿۹۲﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ

کہ ان کے پاس جہاد میں خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے ○ مذمت کے مستحق تو صرف وہ لوگ ہیں جو

يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ

مال دار ہونے کے باوجود آپ سے جہاد میں رخصت کو طلب کرتے ہیں، وہ اس کو پسند کرتے ہیں کہ پیچھے رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ

وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۳﴾

(گھروں میں) رہیں، اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے تو وہ کچھ نہیں جانتے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بہانہ بناتے ہوئے دیہاتی آئے تاکہ ان کو (بھی جہاد سے) رخصت دی جائے اور جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کی تھی وہ (گھروں میں) بیٹھ گئے، ان میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کو عنقریب دردناک عذاب ہوگا○ (التوبہ: ۹۰)

اس سے پہلی آیتوں میں مدینہ میں رہنے والے منافقوں کے احوال بیان فرمائے تھے، اب مدینہ کے اردگرد رہنے والے دیہاتیوں کا حال بیان کیا جا رہا ہے۔

امام رازی نے لکھا ہے کہ المعذر (ذال پر تشدید کے بغیر) وہ شخص ہے جو کسی کام کی کوشش کرنا چاہے مگر اس کو عذر درپیش ہو، اور المعذّر (ذال پر تشدید کے ساتھ) وہ شخص ہے جو فی الواقع معذور نہ ہو اور جھوٹے عذر پیش کرے۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۲۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ الدینوری المتوفی ۲۷۶ھ لکھتے ہیں:

المعذرون: یہ وہ لوگ ہیں جو جدوجہد نہیں کرتے، یہ ان چیزوں کو پیش کرتے ہیں جن کو کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے، جب کوئی شخص کسی کام میں تقصیر کرے تو کہا جاتا ہے عذّرت (ذال پر زبر) اور جب کسی کام میں احتیاط کرے تو کہا جاتا ہے اعذرت۔ (تفسیر غریب القرآن ص ۱۶۶، دار و مکتبۃ الہلال بیروت، ۱۴۱۱ھ)

امام ابن اسحٰق نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: یہ بنو غفار کی ایک جماعت تھی، انہوں نے آکر عذر پیش کیے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں معذور قرار نہیں دیا۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۸۶۰، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفی الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کمزوروں اور بیماروں اور جو لوگ خرچ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ان پر (جہاد میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے) کوئی حرج نہیں ہے جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے اخلاص سے عمل کریں، نیکی کرنے والوں پر (طعنہ کرنے کی) کوئی راہ نہیں ہے اور اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے○ (التوبہ: ۹۱)

معذورین کی اقسام

قرآن مجید کا اسلوب ہے ایک چیز بیان کرکے پھر اس کی ضد کو بیان کرنا، اس اسلوب پر پہلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو جھوٹے عذر پیش کرتے تھے اور اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر فرمایا جن کو حقیقی اعذار لاحق تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا: ان سے جہاد کے احکام ساقط ہیں۔

ان معذورین کی اللہ تعالیٰ نے تین قسمیں بیان فرمائیں: (۱) اول وہ ہیں جو بدن کے اعتبار سے تو تندرست ہوں لیکن بوڑھے ہونے کی وجہ سے کمزور ہوں، یا وہ لوگ جو اپنی اصل خلقت کے اعتبار سے کمزور اور نحیف ہوں۔ (۲) ثانی وہ ہیں جو بیمار ہوں، ان میں اندھے، لنگڑے، لولے اور اپاہج بھی داخل ہیں۔ (۳) ثالث وہ ہیں جو طاقتور اور تندرست ہوں لیکن ان کے پاس سواری اور زادِ راہ نہ ہو جس کی وجہ سے آپ کے ساتھ جہاد کے سفر پر نہ جا سکیں۔

جہاد اور نماز میں معذورین کے متعلق احادیث

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غزوہ (تبوک) کے دوران فرمایا: ہم مدینہ

میں کچھ لوگوں کو چھوڑ آئے ہیں، ہم جس وادی اور گھاٹی میں بھی گئے وہ ہمارے ساتھ رہے، وہ عذر کی وجہ سے نہیں جا سکے۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۸۳۸، مطبوعہ دار ارقم بیروت)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم مدینہ میں ایسے لوگوں کو چھوڑ کر آئے ہو کہ تم نے جو سفر بھی کیا یا جو خرچ بھی کیا یا تم جس وادی میں بھی گئے وہ تمہارے ساتھ تھے۔ صحابہ نے کہا: یارسول اللہ! وہ ہمارے ساتھ کیسے ہوں گے حالانکہ وہ مدینہ میں ہیں۔ آپ نے فرمایا: وہ عذر کی وجہ سے نہیں جا سکے۔
(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۵۰۸، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۴۲۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۷۶۴)

ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمرو بن الجموح رضی اللہ عنہ انصار میں سے آخر میں اسلام لائے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو غزوۂ بدر میں شرکت کے لیے بلایا اور انہوں نے دیگر صحابہ کے ساتھ غزوۂ بدر کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا تو ان کے بیٹوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی وجہ سے ان کو منع کیا کیونکہ ان کی ٹانگ میں شدید لنگ تھا، پھر جب جنگِ احد کا دن آیا تو انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا: تم لوگوں نے مجھے غزوۂ بدر کی طرف نکلنے نہیں دیا تھا، سو اب تم مجھے غزوۂ احد کی طرف نکلنے سے منع نہیں کرنا۔ انہوں نے کہا: اللہ نے آپ کو جہاد میں شرکت سے معذور رکھا ہے، پھر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر عرض کیا: یارسول اللہ! میرے بیٹے مجھے اس لنگ کی وجہ سے آپ کے ساتھ جہاد میں جانے سے منع کرتے ہیں اور اللہ کی قسم! مجھے امید ہے کہ میں اپنی اس لنگڑی ٹانگ کے ساتھ جنت میں چلوں گا، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم کو اللہ نے جہاد سے معذور قرار دیا ہے اور تم پر جہاد فرض نہیں ہے اور ان کے بیٹوں سے کہا: تم پر کوئی حرج نہیں ہے اگر تم ان کو منع نہ کرو، شاید کہ اللہ انہیں شہادت عطا فرمائے۔ پھر حضرت عمرو بن الجموح نے اپنے ہتھیار اٹھائے اور احد کے لیے روانہ ہو گئے اور دعا کی: اے اللہ! مجھے شہادت عطا فرما! اور مجھے اپنے اہل کی طرف نامراد واپس نہ کر، اور جب یہ جنگِ احد میں شہید ہو گئے تو ان کی بیوی ہند بنت عمرو جو حضرت جابر کی پھوپھی تھیں وہ آئیں اور انہوں نے ان کو اور اپنے بھائی عبداللہ بن عمرو بن حرام (حضرت جابر کے والد) کی لاشوں کو اٹھایا اور ان دونوں کو ایک قبر میں دفن کیا گیا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے بیشک میں نے اس کو دیکھا وہ اپنی لنگڑی ٹانگ کے ساتھ جنت میں چل رہا تھا۔
(اسد الغابہ ج ۴ ص ۱۹۶۔ ۱۹۵، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ۲۴، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۳ ص ۲۴۶، اتحاف السادۃ المتقین ج ۱۰ ص ۳۳۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک نابینا شخص آیا اور اس نے کہا: یارسول اللہ! مجھے مسجد میں کوئی لے جانے والا نہیں ہے، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اس کو گھر میں نماز پڑھنے کی رخصت دی جائے۔ آپ نے اس کو رخصت دے دی۔ جب وہ واپس چلا گیا تو آپ نے اس کو بلایا اور پوچھا: کیا تم اذان سنتے ہو؟ اس نے کہا: ہاں! فرمایا: پھر تم اذان پر لبیک کہو۔ (یعنی مسجد میں جا کر نماز پڑھو)
(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۶۵۳، سنن النسائی رقم الحدیث: ۸۵۰)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم یہ جانتے تھے کہ نماز کو صرف منافق ہی ترک کرتا تھا جس کا نفاق معلوم ہو، یا وہ بیمار ہو اور بے شک ایک بیمار شخص دو آدمیوں کے درمیان سہارے سے چلتا ہوا نماز پڑھنے کے لیے آتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سنن الہدیٰ کی تعلیم دی اور جس مسجد میں اذان دی گئی ہو اس میں نماز پڑھنا سنن الہدیٰ میں سے ہے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۶۵۴، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

اللہ تعالیٰ کے لیے نصیحت کا معنی

اس آیت میں فرمایا ہے: جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے نصیحت کریں۔

نصیحت کا معنی ہے اخلاص۔ (اساس البلاغہ للزمخشری ج ۲ ص ۲۷۴، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ)

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دین نصیحت ہے۔ ہم نے پوچھا: کس کے لیے؟ آپ نے فرمایا: اللہ کے لیے، اس کی کتاب کے لیے، اس کے رسول کے لیے، ائمہ مسلمین کے لیے اور عام مسلمانوں کے لیے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۵۵، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۹۴۴، سنن النسائی رقم الحدیث: ۴۱۹۸)

اللہ کے لیے نصیحت کا معنی یہ ہے کہ بندہ اللہ پر ایمان لائے، اس سے شریک کی نفی کرے، اس کی صفات میں الحاد نہ کرے (اس کی طرف ایسی صفت منسوب نہ کرے جو اس کی شان کے لائق نہ ہو) اور تمام عیوب اور نقائص سے اللہ تعالیٰ کی براءت بیان کرے اور ان کو اللہ تعالیٰ کے لیے محال مانے، اس کے احکام کی اطاعت کرے اور اس کی نافرمانی سے اجتناب کرے، اللہ تعالیٰ کی وجہ سے محبت اور اس کی وجہ سے بغض رکھے، اس کی اطاعت کرنے والوں سے دوستی اور اس کی نافرمانی کرنے والوں سے دشمنی رکھے، اس کے منکروں سے جہاد کرے، اس کی نعمتوں کا اعتراف کرے اور اس کا شکر بجالائے، اور تمام اُمور میں اس کے ساتھ اخلاص رکھے۔

کتاب اللہ کے لیے نصیحت کا معنی

اللہ کی کتاب کے لیے نصیحت کا یہ معنی ہے کہ بندہ اس پر ایمان رکھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور مخلوق کا کوئی کلام اس کے مشابہ نہیں، اور مخلوق میں سے کوئی شخص اس کلام کی مثل لانے پر قادر نہیں ہے، اس کی آیتوں میں زیادتی یا کمی محال ہے، اس کی تعظیم کرے اور اس کی اس طرح تلاوت کرے جس طرح تلاوت کرنے کا حق ہے، مخالفین اسلام اس پر جو اعتراض کرتے ہیں ان کے جواب دے اور مبتدعین جو اس کی آیات کی باطل تاویل کرتے ہیں ان کا رد کرے۔ اس کے علوم اور اس کی مثالوں کو سمجھے، اس کے مواعظ (نصیحتوں) میں غور و فکر کرے، اس کے عجائب میں تدبر کرے، عقائدِ اسلام پر اس سے دلائل تلاش کرے، اس کی آیات سے احکام شرعیہ مستنبط کرے، اس کے عموم، خصوص اور ناسخ و منسوخ سے بحث کرے، اس کے اوامر پر عمل کرے اور نواہی سے اجتناب کرے، اس کے علوم کی نشر و اشاعت کرے اور لوگوں کو اس کی دعوت دے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نصیحت کا معنی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نصیحت کا معنی ہے، آپ کی رسالت کی تصدیق کرنا، آپ اللہ کے پاس سے جو کچھ لے کر آئے اس کو ماننا، اور امر اور نہی میں آپ کی اطاعت کرنا، آپ کے دوستوں سے دوستی اور آپ کے دشمنوں سے دشمنی رکھنا، آپ کی تعظیم و توقیر کرنا، آپ کی سُنّت اور آپ کے طریقہ کو زندہ کرنا، آپ کی شریعت کی نشر و اشاعت کرنا، اور اس سے اعتراضات کو دُور کرنا، آپ کی احادیث سے فقہی احکام نکالنا اور ان کی طرف عمل کی دعوت دینا، آپ کی احادیث کی حجیت بیان کرنا اور ان کی نشر و اشاعت کرنا، حدیث پڑھتے وقت آداب کا لحاظ رکھنا، آپ کی سیرت اور آپ کے اخلاق اور آداب کو اپنانا، آپ کے اہلِ بیت، آپ کے اصحاب اور آپ کی ازواج سے عقیدت رکھنا، مبتدعین نے آپ کی احادیث کی جو باطل تاویلات کی ہیں ان کا رد کرنا، احادیث صحیحہ، حسنہ، ضعیفہ اور موضوعہ کو الگ الگ پہچاننا اور ان کے مراتب اور درجات کی رعایت کرنا۔

ائمہ مسلمین کے لیے نصیحت کا معنی

ائمہ مسلمین کے لیے نصیحت کا معنی یہ ہے: حق بات پر ان کی معاونت کرنا، اور اس میں ان کی اطاعت کرنا، ان کی خطاپر

نرمی سے ان کو متوجہ کرنا، جن سے وہ غافل ہوں اس کی ان کو خبر دینا، جن مسلمانوں کے حقوق ان کو مستحضر نہ ہوں وہ ان کو یاد دلانا، ان کی بیعت پر قائم رہنا اور ان کے خلاف بغاوت نہ کرنا، ان کی اطاعت پر لوگوں کو مائل کرنا، ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا، اور ان کے ساتھ جہاد کے لیے روانہ ہونا، ان کو زکوٰۃ اور عشر لا کر دینا، اگر ان سے ظلم یا کوئی بُرائی ظاہر ہو تو ان کے خلاف طاقت استعمال کرنے سے گریز کرنا الا یہ کہ العیاذ باللہ ان سے علی الاعلان کفر صادر ہو، ان کے سامنے ان کی جھوٹی تعریف نہ کرنا، ان کو نیکی کی تلقین کرنا، یہ تمام امور اس وقت ہیں جب ائمہ مسلمین سے خلفاء اور حکام مراد ہوں، اور اگر ائمہ مسلمین سے علماء اور مجتہدین مراد ہوں تو ان کے لیے نصیحت کا معنی یہ ہے کہ ان کی روایت کردہ احادیث کو ماننا اور ان کے احکام اور فتاویٰ کی تقلید کرنا، اور ان کے ساتھ حُسنِ ظن رکھنا۔

عام مسلمانوں کے لیے نصیحت کا معنی

عامتہ المسلمین کے لیے نصیحت کا معنی یہ ہے: دنیا اور آخرت میں ان کی سعادت اور فلاح پر رہنمائی کرنا، ایذاء دینے والی چیزوں کو ان سے دُور کرنا، جن شرعی احکام سے وہ لاعلم ہوں وہ ان کو بتانا اور ان میں ان کی قول اور فعل سے مدد کرنا، ان کے عیوب کو چھپانا، اور مضر چیزوں کو ان سے دُور کرنا، اور مفید چیزوں کو ان کے لیے مہیا کرنا، نرمی اور اخلاص کے ساتھ ان کو نیکی کا حکم دینا اور ان کو بُرائی سے روکنا، ان کے چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی تعظیم کرنا، ان سے حسد نہ کرنا، نہ دھوکا دینا، ان کے لیے اسی اچھی چیز کو پسند کرنا جس کو اپنے لیے پسند کرتا ہو اور اس بُری چیز کو ان کے لیے ناپسند کرنا جس کو وہ اپنے لیے ناپسند کرتا ہو، ان کی جان، مال اور عزت سے ضرر اور بُرائی کو دُور کرنا، اور ان امور کی طرف ان کو بھی متوجہ کرنا۔

ہر شخص پر اس کی طاقت کے مطابق نصیحت کرنا لازم ہے، جب کہ اس کو یہ علم ہو کہ اس کی نصیحت قبول کی جائے گی اور اس کے حکم کی اطاعت کی جائے گی اور اس کو یہ اطمینان ہو کہ نصیحت کرنے کی وجہ سے اس کو کوئی ناگوار صورتِ حال پیش نہیں آئے گی، اور اگر اس کو یہ خطرہ ہو کہ نصیحت کرنے کی وجہ سے وہ کسی مصیبت میں پڑ جائے گا تو پھر نصیحت کرنا اس پر لازم نہیں ہے۔

حضرت جریر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس پر بیعت کی کہ وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے اور ہر مسلمان کے لیے نصیحت کریں گے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۲۴، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۵۶، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۹۲۵)

بڑے سے بڑا نیک بھی اللہ کی بخشش اور اس کی رحمت سے مستغنی نہیں

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نیکی کرنے والوں پر (طعنہ کرنے کی) کوئی راہ نہیں اور اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

اس آیت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ بخشش اور رحمت کا تعلق تو بُرائی کرنے والوں اور گنہ گاروں کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ۔ اس کے دو جواب ہیں: اوّل یہ کہ بخشش اور رحمت کا تعلق بُرائی کرنے والوں اور گنہ گاروں کے ساتھ ہے بشرطیکہ وہ توبہ کرلیں اور یہ محذوف ہے اور اس کا تعلق محسنین (نیکی کرنے والوں) کے ساتھ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے اپنی نیکیوں کی وجہ سے اپنے اوپر دنیا میں مذمت کا اور آخرت میں عذاب کا دروازہ بند کر دیا ہے لہٰذا ان کی مذمت کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ نیکی کرنے والے خواہ نیکیوں کی انتہا کو پہنچ جائیں وہ اپنے اور اللہ کے درمیان کسی گناہ سے اور اپنے اور بندوں کے درمیان کسی بُرائی سے خالی نہیں ہوتے لیکن اگر وہ گناہ کبیرہ نہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان کے صغیرہ گناہوں کو بخش دیتا ہے اور ان پر رحم فرماتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے بچو جن سے تم کو منع

کیا گیا ہے تو ہم تمہارے صغیرہ گناہوں کو مٹا دیں گے۔ (النساء: ٣١) نیز حدیث میں ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر بنی آدم خطاکار ہے اور بہترین خطاکار وہ ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:٢٤٩٩، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:٤٢٥١، مسند احمد ج ٣ ص ١٩٨، سنن الدارمی رقم الحدیث:٢٧٣٠، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث:٢٩٢٢، المستدرک ج ٤ ص ٢٤٤، الکامل لابن عدی ج ٥ ص ١٨٥٠، اتحاف السادۃ المتقین ج ١ ص ٤٠٩، ج ٨ ص ٥٩٦، مشکوٰۃ رقم الحدیث:٢٣٤١، کنز العمال رقم الحدیث:١٠٢٢٠)

اس حدیث سے ہماری اس بات کی تائید ہو گئی کہ کوئی شخص کتنا بڑا نیکی کرنے والا کیوں نہ ہو وہ کسی نہ کسی درجہ میں گنہگار ہے، اور وہ توبہ کرنے سے اور اللہ تعالیٰ کی بخشش اور رحمت سے مستغنی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور نہ ان لوگوں پر کوئی حرج ہے جو آپ کے پاس آئے تاکہ آپ انہیں جہاد کے لیے سواری مہیا کریں تو آپ نے فرمایا تمہارے لیے میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے، وہ اس حال میں واپس گئے کہ ان کی آنکھوں سے اس غم میں آنسو بہہ رہے تھے کہ ان کے پاس جہاد میں خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۝ (التوبہ: ٩٢)

عبادت سے محروم ہونے کی بناء پر رونا

امام عبد الرحمٰن بن محمد بن ادریس الرازی ابن ابی حاتم متوفی ٣٢٧ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ آپ کے ساتھ جہاد میں جائیں، آپ کے پاس آپ کے اصحاب کی ایک جماعت آئی جن میں حضرت عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ بھی تھے، انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ہمیں کوئی سواری عطا کیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: اللہ کی قسم! میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے جس پر میں تمہیں سوار کروں۔ وہ روتے ہوئے واپس چلے گئے کیونکہ جہاد سے رہ جانا ان پر بہت شاق تھا، اور ان کے پاس نہ زادِ راہ تھا نہ سواری تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اللہ اور اس کے رسول سے محبت اور جہاد پر حرص کی وجہ سے ان کے عذر میں یہ آیتیں نازل فرمائیں۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ٦ ص ١٨٦٤-١٨٦٣، رقم الحدیث:١٠٢٠٠، مطبوعہ مکہ مکرمہ، ١٤١٧ھ)

زہدم بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ مرغی کا ذکر چل پڑا۔ ان کے پاس بنو تیم اللہ کا ایک سُرخ رنگ والا شخص تھا گویا کہ وہ آزاد شدہ غلاموں میں سے تھا۔ اس کو کھانے کے لیے بلایا۔ اس نے کہا: میں نے اس مرغی کو کوئی چیز کھاتے ہوئے دیکھا تھا، مجھے اس سے گھن آئی اور میں نے اس کو نہ کھانے کی قسم کھائی ہے۔ حضرت ابو موسیٰ نے کہا: آؤ میں تمہیں اس کے متعلق ایک حدیث سناؤں: میں اشعریوں کی ایک جماعت کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم آپ سے سواری طلب کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم! میں تم کو سوار نہیں کروں گا اور نہ میرے پاس کوئی سواری ہے جس پر میں تمہیں سوار کروں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مالِ غنیمت سے اونٹ آ گئے، آپ نے ہمارے متعلق پوچھا اور فرمایا: اشعریوں کی جماعت کہاں ہے؟ پھر ہمارے لیے پانچ اونٹوں کا حکم دیا جو سفید کوہان والے اور فربہ تھے۔ جب ہم چل پڑے تو ہم نے آپس میں کہا: یہ ہم نے کیا کیا، ہمیں برکت نہ دی جائے، ہم دوبارہ آپ کے پاس گئے، ہم نے عرض کیا: ہم نے آپ سے سواری کا سوال کیا تھا، آپ نے قسم کھائی تھی کہ آپ ہم کو سواری نہیں دیں گے، کیا آپ بھول گئے تھے۔ آپ نے فرمایا: میں نے تم کو سواری نہیں دی تھی، یہ سواری تم کو اللہ نے دی

تھی، اور اللہ کی قسم! میں جس کسی کام کے نہ کرنے کی قسم کھاؤں پھر اس کام کے کرنے میں خیر دیکھوں تو میں اس کام کو کروں گا اور اس قسم کا کفارہ دوں گا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۱۳۳، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۶۴۹)

اس آیت میں اور اس کے شانِ نزول میں جو حدیث ذکر کی گئی ہے اس میں مذکور ہے کہ جہاد میں شرکت سے محروم ہونے کی وجہ سے صحابہ شدتِ غم سے رو رہے تھے، ہم لوگ جان، مال اور اولاد کے نقصان کے غم میں روتے ہیں، کبھی ایسا ہوا ہے کہ نماز قضا ہونے پر ہم روئے ہوں یا حج سے یا جہاد سے محروم ہونے پر ہم روئے ہوں!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مذمت کے مستحق تو صرف وہ لوگ ہیں جو مال دار ہونے کے باوجود آپ سے جہاد میں رخصت کو طلب کرتے ہیں، وہ اس کو پسند کرتے ہیں کہ پیچھے رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ (گھروں میں) رہیں اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے تو وہ کچھ نہیں جانتے ○ (التوبہ: ۹۳)

اس آیت کی تفسیر التوبہ: ۸۷-۸۶ میں گزر چکی ہے۔

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ۭ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا

(اے مسلمانو!) جب تم ان (منافقین) کی طرف لوٹ کر جاؤ گے تو وہ تمہارے سامنے بہانے بنائیں گے، (اے رسول مکرم!) آپ کہیے کہ تم بہانے نہ

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ۭ وَسَيَرَى اللّٰهُ

بناؤ ہم ہرگز تمہاری بات کا یقین نہیں کریں گے، اللہ نے ہم کو تمہارے حالات سے مطلع کر دیا ہے اور اب اللہ اور اس کا رسول

عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ

تمہارے (طرز) عمل کو دیکھے گا، پھر تم اس ذات کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو ہر غیب اور ہر ظاہر کو جاننے والا ہے،

فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا

پس وہ تم کو ان کاموں کی خبر دے گا جو تم کرتے رہے تھے ○ جب تم ان کی طرف لوٹ کر جاؤ گے تو وہ

انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ اِنَّهُمْ

تمہارے سامنے عنقریب اللہ کی قسمیں کھائیں گے تاکہ تم (ان کے جھوٹے بہانوں سے) ان سے صرف نظر کرو پس تم ان کی طرف توجہ

رِجْسٌ ۡ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾

نہ کرو، بے شک وہ ناپاک ہیں، اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے (یہ) ان کے ان کاموں کی سزا ہے جو وہ کرتے تھے ○

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ

وہ تم کو راضی کرنے کے لیے تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے، پس اگر تم ان سے راضی ہو (بھی) گئے تو اللہ فاسق

الجزء ۱۱



لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٩٦﴾ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ

لوگوں سے راضی نہیں ہوتا ○ مدینہ کے (گرد رہنے والے) دیہاتی کفر اور نفاق میں

نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ

بہت سخت ہیں وہ اسی لائق ہیں کہ ان احکام شرعیہ سے جاہل رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیے ہیں

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٩٧﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ

اور اللہ بہت علم والا، بے حد حکمت والا ہے ○ اور بعض دیہاتی وہ ہیں جو (راہ حق میں) اپنے خرچ

مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَ

کرنے کو جرمانہ قرار دیتے ہیں اور وہ تم پر گردش ایام کے منتظر ہیں حالانکہ بری گردش ان ہی پر مسلط ہے اور

اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٩٨﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ

اللہ خوب سننے والا بہت جاننے والا ہے ○ اور بعض دیہاتی وہ ہیں جو اللہ پر اور یوم آخرت پر

الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ

ایمان لاتے ہیں اور (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے کو اللہ کے نزدیک تقرب کا اور رسول کی نیک دعاؤں کے حصول

الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ

کا ذریعہ قرار دیتے ہیں، سنو! یہ ان کے تقرب کا ذریعہ ہے، اللہ عنقریب ان کو اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩٩﴾ ع ١٠

بیشک اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے مسلمانو!) جب تم ان (منافقین) کی طرف لوٹ کر جاؤ گے تو وہ تمہارے سامنے بہانے بنائیں گے، (اے رسول مکرم!) آپ کہیے کہ تم بہانے نہ بناؤ ہم ہرگز تمہاری بات کا یقین نہیں کریں گے، اللہ نے ہم کو تمہارے حالات سے مطلع کر دیا ہے اور اب اللہ اور اس کا رسول تمہارے (طرز) عمل کو دیکھے گا پھر تم اس ذات کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو ہر غیب اور ہر ظاہر کو جاننے والا ہے، پس وہ تم کو ان کاموں کی خبر دے گا جو تم کرتے رہے تھے ○ (التوبہ: ٩٤)

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقوں کے بہانوں کو اس لیے قبول نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع فرما دیا تھا کہ منافق جھوٹ بول رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ مستقبل میں

منافقوں کی کیا روش ہوگی- آیا جس صدق اور اخلاص کا وہ اظہار کر رہے ہیں وہ اس پر قائم رہیں گے یا نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے اعمال کا جائزہ لے رہے ہیں-

اللہ تعالیٰ کا عالم الغیب ہونا

اس کے بعد فرمایا: وہ (اللہ تعالیٰ) ہر غیب اور ہر ظاہر کو جاننے والا ہے' اور ہر غیب اور ہر ظاہر کو جاننا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے- الغیب میں لام استغراق کا ہے اس لیے مخلوق کو عالم الغیب کہنا جائز نہیں ہے-

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ فرماتے ہیں:

علمِ غیب بالذات اللہ عزوجل کے لیے خاص ہے' کفار اپنے معبودانِ باطل وغیرہم کے لیے مانتے تھے لہٰذا مخلوق کا عالم الغیب کہنا مکروہ اور یوں کوئی حرج نہیں کہ اللہ کے بتائے سے امورِ غیب پر انہیں اطلاع ہے-

(الامن والعلیٰ ص ۱۸۸' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت عالم الغیب کو اس لیے بیان فرمایا ہے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ اللہ ان کے باطن میں چھپی ہوئی خباثتوں کو اور ان کے دلوں میں جو مکر و فریب اور سازشیں ہیں ان سب کو جاننے والا ہے' اس آیت میں ان کو ڈرایا گیا ہے اور ان کو ڈانٹ ڈپٹ کی گئی ہے-

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جب تم ان کی طرف لوٹ کر جاؤ گے تو وہ تمہارے سامنے عنقریب اللہ کی قسمیں کھائیں گے تاکہ تم (ان کے جھوٹے بہانوں سے) ان سے صرفِ نظر کرو پس تم ان کی طرف توجہ نہ کرو بے شک وہ ناپاک ہیں' اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے (یہ) ان کے ان کاموں کی سزا ہے جو وہ کرتے تھے○ (التوبہ: ۹۵)

منافقین سے ترکِ تعلق کا حکم

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ منافقین غزوۂ تبوک میں نہ جانے کے متعلق جھوٹے بہانے بناتے تھے' اور اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ وہ اپنے ان بہانوں کو جھوٹی قسموں کے ساتھ موکد کرتے ہیں-

منافقین نے قسم کھا کر یہ کہا تھا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ تبوک میں جانے پر قادر نہ تھے' اور انہوں نے یہ قسمیں اس لیے کھائی تھیں تاکہ مسلمان ان سے درگزر کریں اور ان کی مذمت نہ کریں-

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے لوٹے تو لوگوں سے ملاقات کے لیے بیٹھ گئے' پھر آپ سے ملنے وہ لوگ آئے جو آپ کے ساتھ غزوۂ تبوک میں نہیں گئے تھے' وہ آ کر قسمیں کھا کھا کر جھوٹے عُذر پیش کرتے رہے' وہ اسی (۸۰) سے کچھ زیادہ لوگ تھے- نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ظاہری عُذر کو قبول کر کے انہیں بیعت کر لیا اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کر دیا- حضرت کعب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلام کی ہدایت دینے کے بعد مجھ پر جو سب سے بڑا احسان کیا وہ یہ تھا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی جھوٹا عُذر پیش نہیں کیا-

(جامع البیان جز۱۱ ص ۵' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان سے اعراض کرو یعنی ان کی طرف توجہ نہ کرو-

امام عبدالرحمن بن محمد بن ادریس الرازی ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے لیے روانہ ہوئے تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بعد

خلیفہ بنایا اور ان کو اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ منافقین نے کہا: آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی ناراضگی کی بناء پر اپنے ساتھ نہیں لے گئے، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ راستے میں آپ سے جاملے اور منافقین کی باتوں سے آپ کو مطلع کیا، تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے پاس گئے تو انہوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنایا تھا اور میں نے اپنے بعد تم کو خلیفہ بنایا ہے، کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تم میرے لیے ایسے ہو جیسا کہ حضرت ہارون، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے تھے، ہاں مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا: کیوں نہیں یارسول اللہ! جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس آئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کا استقبال کیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سواری پر اپنے ساتھ بٹھایا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ منافقین اور مخالفین پر لعنت فرمائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مومنین سے فرمایا: ان کے ساتھ بات کرو نہ ان کے ساتھ بیٹھو اور ان سے اس طرح اعراض کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۸۶۵، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک وہ ناپاک ہیں۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ان کا باطن خبیث اور نجس ہے اور ان کی رُوح ناپاک ہے، اور جس طرح جسمانی نجاستوں سے احتراز کرنا واجب ہے اسی طرح رُوحانی نجاستوں سے بھی احتراز کرنا واجب ہے تاکہ ان کی نجاستیں انسان میں سرایت نہ کر جائیں اور تاکہ ان کے بُرے کاموں کی طرف انسان کی طبیعت راغب نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہ تم کو راضی کرنے کے لیے تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے، پس اگر تم ان سے راضی ہو (بھی) گئے تو اللہ فاسق لوگوں سے راضی نہیں ہوتا ○ (التوبہ: ۹۶)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے مسلمانو! یہ منافقین جھوٹے عُذر پیش کر کے تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ اور اگر تم ان سے راضی ہوگئے اور تم نے ان کی معذرت کو قبول کر لیا، کیونکہ تم کو ان کے سچ اور جھوٹ کے درمیان امتیاز نہیں ہے، سو تمہارا راضی ہونا اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے باطنوں کو اور ان کے خفیہ اُمور کو جانتا ہے جن کو تم نہیں جانتے، یہ اللہ کے ساتھ کفر پر قائم ہیں اور ایمان سے کفر کی طرف اور اطاعت سے معصیت کی طرف جانے والے ہیں، پس اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو اللہ ان سے راضی ہونے والا نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مدینہ کے (گرد رہنے والے) دیہاتی کفر اور نفاق میں بہت سخت ہیں وہ اسی لائق ہیں کہ ان احکام شرعیہ سے جاہل رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیے ہیں اور اللہ بہت علم والا بے حد حکمت والا ہے ○ (التوبہ: ۹۷)

العرب اور الاعراب کا معنی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: الاعراب کفر اور نفاق میں بہت سخت ہیں۔ الاعراب، الاعرابی کی جمع ہے، العرب اور الاعراب کے معنی حسب ذیل ہیں:

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

العرب، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں، اور الاعراب اصل میں اس کی جمع ہے۔ پھر یہ گاؤں اور دیہات میں رہنے والوں کے لیے اسم بن گیا، عرف میں جنگلوں اور صحراء میں رہنے والوں کو الاعرابی کہا جاتا ہے، اور الاعراب کا معنی ہے بیان۔ حدیث میں ہے:

الثیب تعرب عن نفسھا۔ — بے نکاح عورت اپنے متعلق خود بیان کرے گی۔

(صحیح مسلم، النکاح: ٦٨)

(المفردات ج ٢ ص ٤٢٦، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ١٤١٨ھ)

علامہ نظام الدین الحسن بن محمد القمی نیشاپوری المتوفی ٧٢٨ھ لکھتے ہیں:

اہلِ لغت نے کہا ہے کہ جب کسی شخص کا نسب عرب کی طرف ثابت ہو تو اس کو عربی کہتے ہیں، اور جب کوئی شخص جنگل یا صحرا کا رہنے والا ہو تو اس کو اعرابی کہتے ہیں، خواہ وہ عرب سے ہو یا عرب کے آزاد شدہ غلاموں میں سے ہو اور اس کی جمع اعراب ہے، جیسے مجوسی اور مجوس اور یہودی اور یہود، لہٰذا جب اعرابی سے کہا جائے یااعرابی تو وہ خوش ہوتا ہے اور جب عربی سے کہا جائے یااعرابی تو وہ غضب ناک ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس نے عرب کے شہروں کو وطن بنایا وہ عربی ہے، اور جس نے جنگلوں اور صحرا میں رہنے کو اختیار کیا وہ اعرابی ہے، اسی وجہ سے مہاجرین اور انصار کو اعراب کہنا جائز نہیں ہے، وہ عرب ہیں۔ حدیث میں ہے: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سنو کوئی عورت مرد کی امام نہ بنے اور نہ کوئی اعرابی مہاجر کا امام بنے اور نہ کوئی فاجر مومن کا امام بنے سوا اس کے کہ اس کو سلطان مجبور کرے، وہ اس کی تلوار اور کوڑوں سے ڈرتا ہو۔ الحدیث: (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:١٠٨١) ایک قول یہ ہے کہ عرب کو عرب اس لیے کہتے ہیں کہ وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہیں جن کی العربہ میں نشوونما ہوئی۔ العربہ، تہامہ کا ایک حصہ ہے، ان کی اپنے شہر کی طرف نسبت کی گئی ہے، اور ہر وہ شخص جو جزیرۂ عرب میں رہتا ہو اور ان کی زبان بولتا ہو وہ ان میں سے ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی زبان ان کے مافی الضمیر کا بیان کرنے والی ہو کیونکہ ان کی زبان میں فصاحت اور بلاغت بہت زیادہ تھی (اور الاعراب کا معنی ہے بیان کرنا) اور بعض حکماء سے منقول ہے کہ روم کی حکمت ان کے دماغوں میں ہے اور ہند کی حکمت ان کے اوہام میں ہے اور یونان کی حکمت ان کے دلوں میں ہے، اور عرب کی حکمت ان کی زبانوں میں ہے اور یہ ان کے الفاظ اور ان کی عبارات کی مٹھاس کی وجہ سے ہے، اور الاعراب کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ کفر اور نفاق میں بہت سخت ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ وحشیوں کے مشابہ ہیں، کیونکہ ان پر گرم ہوا کا غلبہ ہوتا ہے جو کثرتِ طیش اور اعتدال سے خروج کا موجب ہوتی ہے اور جن لوگوں پر صبح و شام انوارِ نبوت کا فیضان ہوتا ہو اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مواعظ سنتے رہتے ہوں اور دن رات آپ کی تربیت سے بہرہ مند ہوتے ہوں ان کے برابر جنگل میں رہنے والے وہ لوگ کب ہو سکتے ہیں جن کی کوئی تربیت کرتا ہو نہ ادب سکھاتا ہو اور اگر تم چاہو تو جنگلی اور پہاڑی پھلوں کا باغات کے پھلوں سے مقابلہ کر لو، حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سنو! شقاوت اور دلوں کی سختی فدادین (چرواہوں) میں ہے جو اونٹوں کی دموں کے پاس چیخ و پکار کرتے ہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:٣٣٠٢، صحیح مسلم رقم الحدیث:٥١، مسند احمد ج ٢ ص ٢٥٨)

اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے الاعراب کو شقی اور سخت دل قرار دیا ہے۔

(غرائب القرآن ج ٣ ص ٥٢١-٥٢٠، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ١٤١٦ھ)

علامہ ابو حفص عمر بن علی الدمشقی الحنبلی المتوفی ٨٨٠ھ لکھتے ہیں:

عرب اور اعراب میں یہ فرق ہے کہ اعراب کی اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مذمت فرمائی ہے، اور عرب کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدح فرمائی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین وجوہ سے عرب سے محبت رکھو: کیونکہ میں عربی ہوں، اور قرآن عربی ہے اور اہلِ جنت کی زبان عربی ہوگی۔

(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ١١٤٤١، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ٥٥٧٩، اس کی سند میں العلاء بن عمرو الحنفی ضعیف ہے، مجمع الزوائد ج١٠ص ٥٢)

علامہ نیشاپوری نے عرب کی وجہ تسمیہ میں جو اقوال ذکر کیے ہیں علامہ ابو حفص حنبلی نے ان کا رد کیا ہے اور لکھا ہے کہ جب حضرت اسمٰعیل پیدا ہوئے تو ان کی والدہ حضرت ہاجرہ جرہم کے پاس رہیں اور حضرت اسمٰعیل نے ان کے پاس نشو و نما پائی۔ وہ سب حضرت اسمٰعیل سے پہلے عرب تھے، اور حضرت اسمٰعیل نے جرہم سے عربی سیکھی تھی، اور صحیح یہ ہے کہ عرب حضرت اسمٰعیل سے پہلے تھے، اور عاد، ثمود، طسم، جدیس، جرہم، عمالیق یہ سب عرب تھے اور نسابین نے کہا ہے کہ سام بن نوح ابو العرب تھے اور بعض علماء نے کہا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے عربی اور دوسری زبانوں میں کلام کیا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عربی زبان تمام زبانوں میں فصیح اور بلیغ زبان ہے۔

(اللباب فی علوم الکتاب ج١٠ص ١٨٠-١٧٩، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ١٤١٩ھ)

الاعراب سے مراد مدینہ کے گرد رہنے والے دیہاتی ہیں

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ٦٠٦ھ لکھتے ہیں:

جب جمع کا صیغہ معرف باللام ہو تو اس میں اصل یہ ہے کہ اس سے مراد معہود سابق ہو، اور اگر معہود سابق موجود نہ ہو تو اس کو ضرورتاً استغراق پر محمول کیا جائے گا، کیونکہ جمع کا صیغہ تین یا تین سے زیادہ افراد کے لیے ہوتا ہے اور الف، لام، تعریف کے لیے ہوتا ہے پس اگر جمع کے معنی میں کوئی معہود سابق ہو تو اس کو مراد لینا واجب ہے اور اگر معہود موجود نہ ہو تو اس کو استغراق پر محمول کیا جائے گا اور جب یہ ثابت ہوگیا تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہاں الاعراب سے مراد منافقین اعراب کی ایک جماعتِ معینہ ہے جو مدینہ کے منافقین سے دوستی رکھتی تھی لہٰذا اس لفظ سے مدینہ کے گرد رہنے والے منافق دیہاتی مراد ہیں۔

(تفسیر کبیر ج٦ص ١٢٥، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ١٤١٥ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بعض دیہاتی وہ ہیں جو (راہِ حق میں) اپنے خرچ کرنے کو جُرمانہ قرار دیتے ہیں اور وہ تم پر گردشِ ایام کے منتظر ہیں حالانکہ بُری گردش ان ہی پر مسلط ہے اور اللہ خوب سننے والا بہت جاننے والا ہے○ (التوبہ: ٩٨)

اعراب کی سنگ دلی اور شقاوت

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص جنگلوں میں رہتا ہے وہ سخت دل ہوتا ہے اور جو شخص شکار کے پیچھے جاتا ہے وہ غافل ہو جاتا ہے اور جو شخص سلطان کے دروازوں پر جاتا ہے وہ فتنوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ٢٢٥٦، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٢٨٥٩، سنن النسائی رقم الحدیث: ٤٣٢٠، مسند احمد ج١ص ٣٥٧، اتحاف السادۃ المتقین ج١ص ٣٨٧، حلیۃ الاولیاء ج٤ص ٧٢، کنز العمال رقم الحدیث: ١٥٨٨٨، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ٣٧٠١)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک اعرابی آیا۔ اس نے پوچھا: کیا آپ بچوں کو بوسہ دیتے ہیں ہم تو ان کو بوسہ نہیں دیتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر اللہ نے تمہارے دل سے رحمت نکال لی ہے تو کیا میں اس کا مالک ہوں؟

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٥٩٩٨، صحیح مسلم رقم الحدیث: ٢٣١٧، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ٣٦٦٥، مسند احمد ج٦ص ٧٠)

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ چونکہ بادیہ نشینوں اور اعراب میں شقاوت اور سخت دلی غالب ہوتی ہے' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بادیہ نشینوں میں سے کوئی رسول نہیں بھیجا بلکہ جو رسول بھیجے وہ شہر کے رہنے والوں میں سے بھیجے جیسا کہ اس آیت میں ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى -(یوسف: ۱۰۹)

ہم نے آپ سے پہلے مردوں کے سوا کسی کو رسول بنا کر نہیں بھیجا جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے جو بستیوں کے رہنے والے تھے۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۲۹' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۹ھ)

الدوائر اور دائرۃ السوء کے معانی

الدوائر: دائرہ کی جمع ہے' نعمت سے مصیبت کی طرف پلٹنے والی حالت کو دائرہ کہتے ہیں۔ اصل میں دائرہ اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کا احاطہ کرے' اور دوائر الزمان' زمانہ کی گردش کو کہتے ہیں اور اس کا استعمال صرف ناپسندیدہ چیزوں اور مصائب میں ہوتا ہے۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ منافقین تم پر زمانہ کی گردش کا انتظار کر رہے ہیں' زمانہ کی گردش سے کبھی راحت آتی ہے اور کبھی مصیبت' وہ اس انتظار میں ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا جائیں اور مشرکین کا غلبہ ہو جائے۔

علیھم دائرۃ السوء: سوء (سین پر زبر کے ساتھ) کا معنی فساد اور ردی ہونا ہے اور سوء (سین پر پیش کے ساتھ) کا معنی بلاء اور ضرر ہے' ظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں اسم ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ دونوں مصدر ہوں' اور بعض نے کہا کہ سوء (زبر کے ساتھ) کا معنی مذمت ہے اور سوء (پیش کے ساتھ) کا معنی عذاب اور ضرر ہے اور سوء (زبر کے ساتھ) اسم ہے اور سوء (پیش کے ساتھ) مصدر ہے۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ منافقین' مسلمانوں پر بری گردش کے منتظر تھے' اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ بری گردش صرف ان ہی پر ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بعض دیہاتی وہ ہیں جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے کو اللہ کے نزدیک تقرب کا اور رسول کی نیک دعاؤں کے حصول کا ذریعہ قرار دیتے ہیں' سنو! یہ ان کے تقرب کا ذریعہ ہے اللہ عنقریب ان کو اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا بے شک اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے○ (التوبہ: ۹۹)

شانِ نزول اور ربط آیات

اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا: بعض اعراب وہ ہیں جو راہِ حق میں اپنے خرچ کرنے کو (مغرم) جرمانہ قرار دیتے ہیں' امام ابن ابی حاتم نے اپنی سند کے ساتھ زید بن اسلم سے روایت کیا ہے: یہ اعراب میں سے منافقین تھے جو دکھاوے کے لیے راہِ حق میں خرچ کرتے تھے اور اس ڈر سے خرچ کرتے تھے کہ ان کو قتل کر دیا جائے گا اور اپنے خرچ کرنے کو جرمانہ قرار دیتے تھے۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۸۶۶' جامع البیان جز ۱۰ ص ۷) اور اب اس آیت میں اعراب کی دوسری قسم بیان فرمائی ہے جو اپنے خرچ کرنے کو اللہ سے قرب کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔ امام ابن ابی حاتم نے کہا: یہ مزینہ سے بنو مقرن تھے' اور امام ابن جریر نے کہا' حضرت عبداللہ بن مغفل نے فرمایا: یہ مقرن کے دس بیٹے تھے اور یہ آیت ہم میں نازل ہوئی ہے۔

(جامع البیان جز ۱۰ ص ۹' تفسیر امام ابن ابی حاتم جز ۶ ص ۱۸۶۷)

قربات اور صلوات کے معنی

قربات: قربۃ کی جمع ہے اور یہ وہ چیز ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی طرف تقرب حاصل کیا جائے اور اس کا معنی یہ ہے کہ

وہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے تھے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف قُرب کا ذریعہ قرار دیتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے حصول کا سبب قرار دیتے تھے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدقہ کرنے والوں کے لیے دعا فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَوٰتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۗ آپ ان کے لیے دعا کیجئے، آپ کی دعا ان کے لیے طمانیت ہے۔ (التوبہ: ١٠٣)

حضرت ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی شخص صدقہ لے کر آتا تو آپ فرماتے: اے اللہ! آلِ فلاں پر صلوٰۃ نازل فرما یعنی اس پر رحم فرما اور اس کی مغفرت فرما، اور جب میرے باپ آئے تو آپ نے فرمایا: اے اللہ! آلِ ابو اوفیٰ پر صلوٰۃ بھیج۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ١٤٩٧، صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٠٧٨، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ١٥٩٠، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ١٧٩٦)

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ صلوات الرسول کا معنی ہے آپ کا استغفار کرنا اور دعا کرنا، اور صلوٰۃ کی کئی قسمیں ہیں۔ اللہ عزوجل کی صلوٰۃ کا معنی ہے رحمت، خیر اور برکت۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ وہی ہے جو تم پر صلوٰۃ نازل فرماتا ہے اور اس کے فرشتے۔ (الاحزاب: ٤٣)

اور فرشتوں کے صلوٰۃ بھیجنے کا معنی ہے دُعا کرنا، اور یہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صلوٰۃ بھیجنے کا معنی ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ٨ ص ١٥٨، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ١٤١٥ھ)

وَالسَّٰبِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَٰجِرِينَ وَالْأَنصَارِ

اور مہاجرین اور انصار میں سے (نیکی میں) سبقت کرنے والے اور سب سے پہلے ایمان لانے

وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا

والے اور جن مسلمانوں نے نیکی میں ان کی اتباع کی، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے

عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ

راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسی جنتیں تیار کی ہیں جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں وہ ان میں

فِيهَا أَبَدًا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١٠٠﴾ وَمِمَّنْ حَوْلَكُم مِّنَ

ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے یہی بہت بڑی کامیابی ہے ○ اور تمہارے گرد بعض اعرابی

الْأَعْرَابِ مُنَٰفِقُونَ ۖ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ ۖ مَرَدُوا معٰ

(دیہاتی۔ بدوی) منافق ہیں اور بعض اہل مدینہ (بھی منافق ہیں) وہ نفاق پر

وقف منزل

عَلَى النِّفَاقِ قف لَا تَعْلَمُهُمْ ط نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ط سَنُعَذِّبُهُمْ

ڈٹ چکے ہیں، آپ انہیں نہیں جانتے انہیں ہم جانتے ہیں، عنقریب ہم ان کو دو مرتبہ

مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴿١٠١﴾ ج وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا

عذاب دیں گے، پھر وہ بہت بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے ○ اور بعض دوسرے وہ (مسلمان) ہیں جنہوں

بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ط عَسَى اللّٰهُ

نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا، انہوں نے نیک کاموں کو دوسرے برے کاموں کے ساتھ ملا دیا، عنقریب اللہ ان کی

اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٠٢﴾ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ

توبہ قبول فرمائے گا، بے شک اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے ○ آپ ان کے مالوں سے

صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ط اِنَّ

زکوٰۃ لیجیے جس کے ذریعہ آپ انہیں پاک کریں گے اور ان کے باطن کو صاف کریں گے اور آپ ان پر صلوٰۃ بھیجیے بے شک

صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ط وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٠٣﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ

آپ کی صلوٰۃ ان کے لیے باعث طمانیت ہے اور اللہ بہت سننے والا بے حد جاننے والا ہے ○ کیا یہ نہیں جانتے کہ

اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ

بیشک اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور صدقات کو لیتا ہے

وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى

اور بے شک اللہ ہی بہت توبہ قبول کرنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے ○ اور آپ کہیے کہ تم عمل کرو پس عنقریب اللہ

اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ

تمہارے عمل کو دیکھ لے گا اور اس کا رسول اور مومنین (بھی)، اور عنقریب تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو ہر غیب اور ہر

الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٥﴾ ج وَاٰخَرُوْنَ

ظاہر کو جاننے والا ہے، پھر وہ تم کو ان کاموں کی خبر دے گا جن کو تم کرتے رہے تھے ○ اور بعض دوسرے وہ ہیں

مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ

جن کو اللہ کا حکم آنے تک مؤخر کیا گیا ہے، یا اللہ ان کو عذاب دے گا یا ان کی توبہ قبول فرمالے گا اور اللہ

عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٠٦﴾

بہت علم والا بے حد حکمت والا ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور مہاجرین اور انصار میں سے (نیکی میں) سبقت کرنے والے اور سب سے پہلے ایمان لانے والے اور جن مسلمانوں نے نیکی میں ان کی اتباع کی، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسی جنتیں تیار کی ہیں جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی بہت بڑی کامیابی ہے○ (التوبہ: ١٠٠)

مہاجرین اور انصار میں سے سابقین اولین کے مصادیق میں اقوال

اس آیت میں مہاجرین اور انصار میں سے جو سابقین اولین ہیں اس کا مصداق کون سے صحابہ ہیں، اس میں متعدد اقوال ہیں:

امام ابن جریر نے متعدد اسانید کے ساتھ عامر اور شعبی سے روایت کیا ہے کہ یہ وہ صحابہ ہیں جو بیعت رضوان کے موقع پر حاضر تھے، اور حضرت ابو موسیٰ اشعری، سعید بن مسیب، ابن سیرین اور قتادہ سے روایت ہے کہ یہ وہ صحابہ ہیں جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دونوں قبلوں بیت اللہ اور بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی سو وہ مہاجرین اولین میں سے ہیں۔ (جامع البیان جز ١١ ص ١١-١٠، تفسیر ابن ابی حاتم ج ٦ ص ١٨٦٨)

امام عبدالرحمن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی ٥٩٧ھ لکھتے ہیں: اس آیت کے مصداق میں چھ قول ہیں:

(١) حضرت ابو موسیٰ اشعری، سعید بن مسیب، ابن سیرین اور قتادہ کا یہ قول ہے کہ اس سے مراد وہ صحابہ ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دونوں قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔

(٢) شعبی نے کہا: یہ وہ صحابہ ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت رضوان کی تھی اور یہ بیعت حدیبیہ ہے۔

(٣) عطاء بن ابی رباح نے کہا: ان سے مراد اہل بدر ہیں۔

(٤) محمد بن کعب القرظی نے کہا: ان سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب ہیں، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں سبقت حاصل ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب کی مغفرت کر دی ہے اور ان کے لیے جنت کو واجب کر دیا ہے خواہ وہ نیکو کار ہوں یا خطاکار۔

(٥) علامہ ماوردی نے کہا: ان سے مراد وہ صحابہ ہیں جنہوں نے موت اور شہادت میں سبقت کی اور اللہ کے ثواب کی طرف سبقت کی۔

(٦) قاضی ابو یعلیٰ نے کہا: ان سے مراد وہ صحابہ ہیں جو ہجرت سے پہلے اسلام لائے۔

(زاد المسیر ج ٣ ص ٤٩١-٤٩٠، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ١٤٠٧ھ)

تاہم اس سے کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ ان تمام اقسام کو اس آیت کا مصداق قرار دیا جائے۔ ابو منصور بغدادی نے کہا کہ ہمارے اصحاب کا اس پر اجماع ہے کہ تمام صحابہ میں افضل خلفاء اربعہ ہیں، پھر عشرہ مبشرہ میں سے باقی چھ، (حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت سعید بن زید، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم) (سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۷۴۷) پھر اصحاب بدر، پھر اصحابِ احد، پھر حدیبیہ میں اہلِ بیعت رضوان۔

(فتح القدیر ج ۲ ص ۵۶۳، مطبوعہ دارالوفاء بیروت، ۱۴۱۸ھ)

امام فخرالدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

میرے نزدیک اس آیت کا مصداق وہ شخص ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت اور آپ کی نصرت میں سب سے سابق اور سب سے اوّل ہو، اور وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور ہر مقام اور ہر جگہ میں آپ کے ساتھ ہوتے تھے، اس لیے حضرت ابوبکر کا مقام دوسرے صحابہ سے بہت زیادہ بلند ہے اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اگرچہ مہاجرین اوّلین میں سے ہیں لیکن انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد ہجرت کی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہمات کو انجام دینے کے لیے مکہ میں رہے لیکن ہجرت میں سبقت کرنے کا شرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت میں بھی سبقت کا شرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۳۸۔ ۱۳۷، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

مہاجرین اور انصار میں سے ایمان میں سبقت کرنے والوں کی تفصیل

امام ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی المتوفی ۵۱۶ھ لکھتے ہیں:

اس میں اختلاف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد سب سے پہلے کون اسلام لایا، جب کہ اس پر اتفاق ہے کہ آپ پر سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اسلام لائیں۔ بعض علماء نے کہا: سب سے پہلے جو ایمان لائے اور جنہوں نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی وہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ حضرت جابر کا قول ہے اور امام ابن اسحٰق نے کہا: حضرت علی دس سال کی عمر میں اسلام لائے تھے، اور بعض نے کہا: حضرت خدیجہ کے بعد جو سب سے پہلے اسلام لائے وہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ حضرت ابن عباس، ابراہیم نخعی اور شعبی کا قول ہے، اور بعض نے کہا: سب سے پہلے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اسلام لائے اور یہ زہری اور عروہ بن الزبیر کا قول ہے اور اسحٰق بن ابراہیم حنظلی نے ان اقوال کو جمع کیا ہے، انہوں نے کہا: مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسلام لائے اور عورتوں میں ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور بچوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور غلاموں میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ۔ امام ابن اسحٰق نے کہا کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو انہوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا اور لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دعوت دی، اور حضرت ابوبکر قریش میں عمدہ نسب کے تھے، نرم مزاج تھے، تاجر تھے اور ان کی خوش اخلاقی بہت مشہور تھی، لوگ ان کے پاس آتے تھے اور متعدد معاملات میں ان سے اُلفت رکھتے تھے کیونکہ وہ ان کے حُسنِ معاملہ کو جانتے تھے۔ حضرت ابوبکر کو جس شخص پر اعتماد ہوتا وہ اس کو اسلام کی دعوت دیتے، لہٰذا حضرت عثمان بن عفان، حضرت زبیر بن عوام، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت طلحہ بن عبیداللہ ان کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ جب انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور نماز پڑھ لی تو حضرت ابوبکر ان کو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر آئے۔ یہ وہ آٹھ شخص تھے جنہوں نے اسلام کی طرف سبقت کی تھی، پھر لوگ پے درپے اسلام میں داخل ہونے لگے، اور رہے انصار میں سے سبقت کرنے والے تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لیلۃ العقبہ میں بیعت کی تھی، العقبۃ الاولی (مکہ کے قریب ایک گھاٹی تھی، مدینہ سے لوگ حج کے لیے آتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس گھاٹی میں تبلیغ فرماتے۔ پہلی بار چھ شخص مسلمان ہوئے تھے، ان کو اصحاب العقبۃ الاولی کہا جاتا ہے) میں چھ شخص مسلمان ہوئے تھے اور دوسرے سال چھ اور آکر مسلمان ہوئے، یہ بھی اصحاب العقبۃ الاولی ہیں، ان کے بعد ستر (۷۰) شخص مسلمان ہوئے تھے، یہ اصحاب العقبۃ الثانیۃ ہیں۔ حضرت مصعب بن عمیر ان کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے، پھر ان کے ساتھ انصار کے مردوں، عورتوں اور بچوں کی ایک بڑی تعداد اسلام لے آئی۔

(معالم التنزیل ج ۲ ص ۲۷۱، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ اللباب فی علوم الکتاب ج ۱۰ ص ۱۸۷-۱۸۶، مطبوعہ بیروت)

مہاجرین سے مراد وہ صحابہ ہیں جنہوں نے اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر اپنی قوم، اپنے قبیلہ اور اپنے وطن کو چھوڑ دیا اور انصار سے مراد وہ صحابہ ہیں جنہوں نے دشمنانِ اسلام کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی اور آپ کو اور آپ کے اصحاب کو مدینہ میں پناہ دی۔

امام محمد بن سعد متوفی ۲۳۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایام حج میں تبلیغ کے لیے تشریف لے گئے تو آپ کو مدینہ سے آئے ہوئے چھ شخص ملے۔ آپ نے ان سے پوچھا: کیا تم یہود کے حلیف ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں! آپ نے ان کو اللہ کی طرف دعوت دی اور ان پر اسلام پیش کیا، اور ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کی، سو وہ مسلمان ہو گئے اور یہ بنو النجار میں سے اسعد بن زرارہ اور عوف بن الحارث اور بنو زریق میں سے رافع بن مالک اور بنو سلمہ سے قطبہ بن عامر بن حدیدہ اور بنو حرام میں سے عقبہ بن عامر بن نابی اور بنو عبید بن عدی بن سلمہ سے جابر بن عبد اللہ بن رئاب تھے اور ان سے پہلے مدینہ سے آکر کوئی مسلمان نہیں ہوا تھا، ان پر سب کا اجماع ہے۔ پھر یہ چھ صحابہ مدینہ گئے اور انہوں نے اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دی، پس جس نے اسلام لانا تھا وہ اسلام لے آیا۔ ان دنوں انصار کے ہر گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہو رہا تھا۔

اس کے دوسرے سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس گھاٹی میں ان چھ کے ساتھ چھ اور نفر آئے، ان میں بنی عوف بن الخزرج میں سے عبادہ بن الصامت، اور یزید بن ثعلبہ اور بنو عامر سے عباس بن عبادہ بن نضلہ تھے اور بنو زریق میں سے ذکوان بن عبد قیس تھے۔ یہ دس افراد خزرج میں سے تھے اور اوس میں سے دو شخص تھے۔ ابو الہیثم بن التیہان، یہ بنو عبد الاشہل کے حلیف تھے اور بنو عمرو بن عوف میں سے عویم بن ساعدہ تھے، یہ سب مسلمان ہو گئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس پر بیعت کی کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے، اور نہ چوری کریں گے نہ زنا کریں گے اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گے اور نہ کسی پر بہتان لگائیں گے اور نیک کام میں کسی کی مخالفت نہیں کریں گے۔ آپ نے فرمایا: اگر تم نے اس عہد کو پورا کیا تو تمہارے لیے جنت ہے اور جس نے ان ممنوع کاموں میں سے کوئی کام کر لیا تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، وہ چاہے تو ان کو معاف کر دے اور چاہے تو ان کو عذاب دے۔ اس وقت تک جہاد فرض نہیں ہوا تھا، وہ مدینہ چلے گئے اور اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا فرمایا اور حضرت اسعد بن زرارہ مدینہ میں مسلمانوں کو جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے، اور یہ سب سے پہلے جمعہ کی نماز تھی۔ یہ بارہ صحابہ اصحابِ عقبہ اولیٰ ہیں اور انصار میں سے سابقین اولین ہیں، ان کے بعد ستر نفر مدینہ سے مکہ کی

گھاٹیوں میں آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مسلمان کیا، یہ اصحاب عقبہ ثانیہ ہیں-
(الطبقات الکبریٰ ج ۱ص ۱۷۱- ۱۷۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۸ھ)

مہاجرین اور انصار کے فضائل

جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ پر ایمان لایا اور اس نے آپ کی حیاتِ ظاہری میں آپ کی صحبت اختیار کی بایں طور کہ آپ کو دیکھا یا آپ کی گفتگو سنی یا آپ کے ساتھ سفر یا حضر کی کسی مجلس میں رہا خواہ یہ صحبت ایک لحظہ کی ہو اور وہ شخص ایمان پر ہی تادم مرگ قائم رہا حتیٰ کہ حالتِ ایمان میں اس کو موت آئی ہو وہ شخص صحابی ہے۔ ان میں سے مہاجرین وہ ہیں جنہوں نے مکہ سے ہجرت کی اور انصار وہ ہیں جنہوں نے مدینہ میں آپ کو اور آپ کے اصحاب کو پناہ دی-

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اصحاب کو بُرا نہ کہو، اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ جتنا سونا بھی خیرات کرے تو وہ ان کے دیئے ہوئے ایک مد یا نصف (ایک کلوگرام یا نصف) کے برابر نہیں ہے-

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۶۷۳، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۵۴۱، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۴۶۵۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۸۶۱، مسند احمد ج ۳ ص ۱۱، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۱۰۸۷، ۱۱۹۸، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۷۲۵۳)

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اصحاب کے بارے میں اللہ سے ڈرو، میرے اصحاب کے بارے میں اللہ سے ڈرو، میرے بعد ان کو اپنے طعن کا نشانہ نہ بناؤ- جس نے ان سے محبت رکھی تو اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت رکھی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو اس نے مجھ سے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھا اور جس نے ان کو ایذا دی اس نے مجھ کو ایذا دی اور جس نے مجھ کو ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا دی اور جس نے اللہ کو ایذا دی عنقریب وہ اس کو پکڑ لے گا-

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۸۶۲، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۷۲۵۶، مسند احمد ج ۴ ص ۸۷، حلیۃ الاولیاء ج ۸ ص ۲۸۷)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو میرے اصحاب کو بُرا کہتے ہیں تو کہو تمہارے شر پر اللہ کی لعنت ہو-

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۸۶۶، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۸۳۶۶، تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۹۵، تہذیب الکمال ج ۱۲ ص ۳۲۷)

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں کے سامنے مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے، ہم میں ایک جماعت انصار کی تھی، ایک جماعت مہاجرین کی اور ایک جماعت بنو ہاشم کی- ہم میں یہ بحث ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کون زیادہ قریب ہے اور کون آپ کو زیادہ محبوب ہے- ہم نے کہا: ہمارا انصار کا گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا اور ہم نے آپ کی اتباع کی اور ہم نے آپ کے ساتھ جہاد کیا اور آپ کے دشمنوں سے لڑے تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ قریب اور زیادہ محبوب ہیں- اور ہمارے برادر مہاجرین نے کہا: ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کی اور ہم نے اپنے خاندان، اہل و عیال اور اموال کو چھوڑ دیا اور جن معرکوں میں تم حاضر رہے ان میں ہم بھی حاضر تھے تو ہم اور لوگوں کی بہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ قریب اور زیادہ محبوب ہیں- اور ہمارے برادر بنو ہاشم نے کہا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ہیں، اور جن مواقع پر تم حاضر تھے ان میں ہم بھی حاضر تھے تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ قریب ہیں اور آپ کے زیادہ محبوب ہیں- تب رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: تم کیا کہہ رہے تھے؟ ہم (گروہ انصار) نے اپنی بات دہرائی، آپ نے فرمایا: تم نے سچ کہا، تمہاری بات کو کون مسترد کر سکتا ہے! پھر ہمارے برادر مہاجرین نے اپنی بات دہرائی، آپ نے فرمایا: انہوں نے سچ کہا، ان کی بات کو کون مسترد کر سکتا ہے! پھر ہمارے برادر بنو ہاشم نے اپنی بات دہرائی، آپ نے فرمایا: انہوں نے سچ کہا، ان کی بات کو کون مسترد کر سکتا ہے! پھر آپ نے فرمایا: کیا میں تمہارے درمیان فیصلہ نہ کروں؟ ہم نے عرض کیا: کیوں نہیں! آپ پر ہمارے ماں باپ فدا ہوں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: اے انصار کے گروہ! میں صرف تمہارا بھائی ہوں، تو انہوں نے کہا: اللہ اکبر! ربِ کعبہ کی قسم! ہم بازی لے گئے۔ اور رہے تم اے گروہِ مہاجرین! تو میں صرف تم میں سے ہوں، تو انہوں نے کہا: اللہ اکبر! ربِ کعبہ کی قسم ہم جیت گئے۔ اور رہے تم اے بنو ہاشم! تو تم مجھ سے ہو اور میری طرف ہو، تو ہم سب کھڑے ہو گئے اور ہم سب راضی تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحسین کرتے تھے۔

(المعجم الکبیر ج ۱۹ ص ۱۳۳، حافظ الہیثمی نے کہا: میں اس حدیث کے ایک راوی کو نہیں پہچانتا، باقی راوی ثقہ ہیں اور بعض میں اختلاف ہے، مجمع الزوائد رقم الحدیث: ۱۶۴۷۲، طبع جدید دار الفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ)

حضرت مسلمہ بن مخلد بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مہاجرین عام لوگوں سے چالیس سال پہلے (جنت کی) نعمتوں میں ہوں گے اور لوگ حساب میں گرفتار ہوں گے، الحدیث۔

(المعجم الکبیر ج ۱۹ ص ۴۳۸، حافظ الہیثمی نے کہا: اس کا ایک راوی عبد الرحمن بن مالک ہے، اس کو میں نہیں پہچانتا اور باقی راوی ثقہ ہیں، مجمع الزوائد رقم الحدیث: ۱۶۴۷۲)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان کی علامت انصار سے محبت کرنا ہے اور نفاق کی علامت انصار سے بغض رکھنا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۷۴، سنن النسائی رقم الحدیث: ۵۰۱۹)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انصار سے صرف مومن محبت رکھتا ہے اور ان سے صرف منافق بغض رکھتا ہے، پس جو ان سے محبت کرے گا تو اللہ اس سے محبت کرے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا اللہ اس سے بغض رکھے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۷۸۳، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۷۵، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۹۰۰، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۶۳، مسند احمد ج ۴ ص ۲۸۳، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۷۲۷۲، تاریخ بغداد ج ۴ ص ۲۴۱، شرح السنہ رقم الحدیث: ۳۹۶۷، مسند ابن الجعد رقم الحدیث: ۴۷۹)

اللہ کی رضا اس پر موقوف ہے کہ مہاجرین اور انصار کی نیکیوں میں ان کی اتباع کی جائے

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور جن مسلمانوں نے نیکی میں ان کی اتباع کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ جو مسلمان مہاجرین اور انصار کے لیے جنت اور رحمت کی دعا کرتے ہیں اور ان کے محاسن بیان کرتے ہیں، اور دوسری روایت یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قیامت تک کے جو مسلمان مہاجرین اور انصار کے دین اور ان کی نیکیوں میں ان کی اتباع کرتے ہیں۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جو ان کی اتباع کرے وہ اللہ کے راضی کرنے کے مرتبہ اور ثواب اور جنت کا اس وقت مستحق ہو گا جب وہ نیکی میں مہاجرین اور انصار صحابہ کی اتباع کرے گا اور احسان سے مراد یہ ہے کہ وہ ان صحابہ کے حق میں نیک کلمات کہے اور ان کے محاسن بیان کرے اس لیے جو شخص صحابہ کرام کے متعلق نیک

کلمات نہیں کہے گا وہ اللہ کی رضا کے مرتبہ اور جنت کا مستحق نہیں ہو گا' کیونکہ ایمان والے صحابہ کرام کی تعظیم میں بہت مبالغہ کرتے ہیں اور اپنی زبانوں پر کوئی ایسا کلمہ نہیں لاتے جو ان کی شان اور ان کے مقام کے نامناسب ہو۔

حافظ ابن کثیر دمشقی متوفی ٧٧٤ھ لکھتے ہیں:

ان لوگوں پر افسوس ہے جو صحابہ کرام سے بغض رکھتے ہیں اور ان کو بُرا کہتے ہیں خاص طور پر اس صحابی کو جو سید الصحابہ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت میں سب سے افضل ہیں اور سب سے برتر اور خلیفہ اعظم ہیں یعنی حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ رضی اللہ عنہما' کیونکہ رافضی افضل الصحابہ سے بغض رکھتے ہیں اور ان کو بُرا کہتے ہیں' اور جب یہ لوگ ان ذواتِ قدسیہ کو بُرا کہیں گے جن سے اللہ راضی ہو گیا تو ان کا قرآن پر ایمان کیسے رہے گا اور رہے اہلسنت تو وہ ان سے راضی ہیں جن سے اللہ راضی ہے اور اس کو بُرا کہتے ہیں جس کو اللہ اور اس کا رسول بُرا کہتے ہیں' اللہ کے دوستوں سے دوستی رکھتے ہیں اور اللہ کے دشمنوں سے دشمنی رکھتے ہیں۔ وہ متبع بالسنت ہیں متبدع نہیں ہیں اور وہی حزب اللہ ہیں اور فلاح پانے والے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ج ٢ ص ٤٣٠-٤٢٩' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ١٤١٩ھ)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت عطا فرمائے گا اور اس سے راضی ہو گا جو مہاجرین اور انصار کی اتباع بالاحسان کرے گا اور ان کے متعلق نیک کلمات کہے گا' سو جس کو جنت اور اللہ کی رضا چاہیے وہ مہاجرین اور انصار صحابہ کی نیکی میں اتباع کرے اور ان کے محاسن بیان کرے' نیز اس آیت سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ مہاجرین اور انصار صحابہ سے اللہ راضی ہے اور جن سے اللہ راضی ہے انہیں اس کی کیا پرواہ ہو گی کہ کوئی ان سے راضی ہو یا ناراض ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور تمہارے گرد بعض اعرابی (دیہاتی' بدوی) منافق ہیں اور بعض اہلِ مدینہ (بھی منافق ہیں) وہ نفاق پر ڈٹ چکے ہیں' آپ انہیں نہیں جانتے انہیں ہم جانتے ہیں' عنقریب ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے' پھر وہ بہت بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے ○ (التوبہ: ١٠١)

مدینہ سے باہر کے منافقین اور ان سے متعلق اعتراضات کے جوابات

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے احوال بیان فرمائے اس کے بعد اعرابیوں اور بدویوں میں سے منافقین کا حال بیان فرمایا' پھر اعرابیوں میں سے خالص مومنوں کا ذکر فرمایا' پھر بیان کیا کہ اکابر مومنین وہ ہیں جو مہاجرین اور انصار میں سے سابقین اولین ہیں' اور اس آیت میں بیان فرمایا کہ مدینہ کے اندر اور باہر دونوں جگہ منافقین ہیں۔

مردوا علی النفاق کا معنی ہے انہیں نفاق کی خوب مشق ہو چکی ہے' وہ نفاق میں خوگر اور نفاق کے ماہر ہیں۔

امام ابن جوزی لکھتے ہیں: ان میں سے بعض عبداللہ بن ابی' جد بن قیس' الجلاس' معتب' وحوح اور ابو عامر راہب ہیں۔ (زاد المسیر ج ٣ ص ٤٩١-٤٩٢) اور مدینہ کے گرد جو منافقین تھے ان کے متعلق امام رازی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: وہ جہینہ' اسلم' اشجع اور غفار تھے' یہ لوگ مدینہ کے گرد رہتے تھے۔ (تفسیر کبیر ج ٦ ص ١٣٠) امام بغوی' امام واحدی' امام ابن الجوزی' نسفی' خازن اور سیوطی وغیرہم نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ انہیں نہیں جانتے انہیں ہم جانتے ہیں۔ امام رازی نے فرمایا: یہ نفاق میں اس قدر ماہر اور مشاق ہو چکے ہیں کہ باوجود اس کے کہ آپ بہت ذہین ہیں اور آپ کی عقل اور فراست بہت کامل اور روشن ہے پھر بھی آپ انہیں نہیں جانتے' انہیں ہم جانتے ہیں۔ (تفسیر کبیر ج ٦ ص ١٣١)

اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس کی روایت کے مطابق اس آیت میں جہینہ' اسلم' اشجع اور غفار کو ماہر

منافق فرمایا ہے اور احادیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں دعا فرمائی ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قریش، انصار، جہینہ، مزینہ، اسلم، اشجع اور غفار میرے دوست ہیں، اللہ اور اس کے رسول کے سوا ان کا کوئی دوست نہیں ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۵۰۴، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۵۲۰)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر فرمایا: غفار کی اللہ مغفرت فرمائے، اور اسلم کو اللہ سلامت رکھے، اور عصیہ نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۵۱۳، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۵۱۸)

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ احادیث جہینہ، اسلم اور غفار وغیرہ کے غالب اور اکثر افراد پر محمول ہیں، اور ان قبیلوں کے بعض افراد منافق تھے جن کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

اس جگہ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے:

وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۭ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ۔ (محمد: ۳۰)

اور اگر ہم چاہتے تو ہم ضرور آپ کو منافقین دکھا دیتے، اور ان کی صورت سے تو آپ ان کو پہچان چکے ہیں اور ان کی باتوں کے لہجہ سے بھی آپ ان کو ضرور پہچان لیں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ توبہ میں منافقین کے جس علم کی نفی ہے وہ قطعی ہے یعنی آپ قطعیت کے ساتھ منافقوں کو نہیں جانتے اور سورۂ محمد میں جس علم کا ثبوت ہے وہ ظنی ہے یعنی آپ علامتوں اور قرینوں سے منافقوں کو پہچان لیتے ہیں۔ واضح رہے کہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو قطعیت کے ساتھ منافقین کی شناخت کرا دی تھی اور ان کا علم دے دیا تھا۔

دو مرتبہ عذاب دینے کی تفصیل

(۱) امام ابن منذر اور امام ابن ابی حاتم نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ان کو بھوک کا عذاب دیا جائے گا اور دوسری مرتبہ ان کو قتل کرنے کا عذاب دیا جائے گا۔

(۲) امام ابن منذر اور امام ابن ابی حاتم نے مجاہد سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ان کو عذابِ قبر دیا جائے گا اور دوسری بار عذابِ نار دیا جائے گا۔ قتادہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔

(۳) امام ابن ابی حاتم، ابو الشیخ اور ربیع سے منقول ہے: ایک بار ان کو دنیا میں آزمائش میں ڈالا جائے گا اور ایک بار عذابِ قبر دیا جائے گا۔

(۴) امام ابو الشیخ نے ابن زید سے نقل کیا ہے کہ ایک بار ان کو مال اور اولاد کی آزمائش میں مبتلا کیا جائے گا اور دوسری بار ان کو مصائب میں مبتلا کیا جائے گا۔

(۵) امام ابن جریر، امام ابن ابی حاتم، امام طبرانی اور امام ابو الشیخ نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ ان کو دنیا میں رُسوائی کے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا اور دوسری مرتبہ عذابِ قبر میں مبتلا کیا جائے گا۔

(الدر المنثور ج ۵ ص ۲۷۴۔۲۷۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

منافقین کی رُسوائی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر منافق کا نام لے کر اس کو مسجد سے نکال دیا، اس کو ہم بکثرت حوالہ جات کے ساتھ بیان کر رہے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بنام منافقین کو مسجد سے نکالنا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت (التوبہ: ۱۰۱) کی تفسیر میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، آپ نے فرمایا: اے فلاں! تو نکل جا تو منافق ہے، اے فلاں! تو نکل جا تو منافق ہے۔ آپ نے منافقوں کا نام لے لے کر ان کو مسجد سے نکال دیا اور ان کو رُسوا کر دیا، اس دن کسی کام کی وجہ سے اس وقت تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں نہیں پہنچے تھے، جس وقت حضرت عمر آئے تو وہ مسجد سے نکل رہے تھے، وہ حضرت عمر سے چھپ رہے تھے، ان کا یہ گمان تھا کہ حضرت عمر کو حقیقتِ واقعہ کا پتا چل گیا ہے۔ ایک شخص نے حضرت عمر سے کہا: آپ کو خوشخبری ہو، اللہ تعالیٰ نے آج منافقین کو رُسوا کر دیا، یہ ان پر عذابِ اول تھا اور عذابِ ثانی عذابِ قبر ہے۔

(المعجم الاوسط ج ۱ ص ۴۴۲ رقم الحدیث: ۷۹۶، حافظ الہیثمی نے کہا کہ اس حدیث کا ایک راوی الحسین بن عمرو بن محمد العنقزی ضعیف ہے۔ مجمع الزوائد ج ۷ ص ۳۳، حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس حدیث پر سکوت کیا ہے، الکافی الشاف فی تخریج احادیث الکشاف ج ۲ ص ۳۰۶)

حسبِ ذیل مفسرین نے اس حدیث کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض نے اس کو اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے:

(۱) امام ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، (جامع البیان جز ۱۱ ص ۱۵)

(۲) امام ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ، (تفسیر القرآن ج ۶ ص ۱۸۷۰)

(۳) امام ابو اللیث سمرقندی متوفی ۳۷۵ھ، (تفسیر سمرقندی ج ۲ ص ۷۱)

(۴) علامہ ابو الحسن الواحدی المتوفی ۴۶۸ھ، (الوسیط ج ۲ ص ۵۲۱)

(۵) امام حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ، (معالم التنزیل ج ۲ ص ۲۷۲)

(۶) علامہ محمود بن عمر زمخشری متوفی ۵۳۸ھ، (الکشاف ج ۲ ص ۲۹۱)

(۷) قاضی ابن عطیہ اندلسی متوفی ۵۴۶ھ، (المحرر الوجیز ج ۸ ص ۲۶۲)

(۸) امام عبد الرحمن جوزی متوفی ۵۹۷ھ، (زاد المسیر ج ۳ ص ۴۹۲)

(۹) امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ، (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۳۱)

(۱۰) علامہ علاء الدین خازن متوفی ۷۲۵ھ، (لباب التاویل ج ۲ ص ۲۹۱)

(۱۱) علامہ نظام الدین نیشاپوری متوفی ۷۲۸ھ، (غرائب القرآن ج ۳ ص ۵۲۴)

(۱۲) علامہ ابو الحیان اندلسی متوفی ۷۵۴ھ، (البحر المحیط ج ۵ ص ۴۹۷)

(۱۳) حافظ ابن کثیر دمشقی متوفی ۷۷۴ھ، (تفسیر القرآن ج ۲ ص ۴۹۷)

(۱۴) علامہ ابو حفص عمر دمشقی متوفی ۸۸۰ھ، (اللباب فی علوم الکتاب ج ۱۰ ص ۱۹۰)

(۱۵) حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ، (الدر المنثور ج ۴ ص ۲۷۳)

(۱۶) قاضی ابو السعود متوفی ۹۸۲ھ، (تفسیر ابو السعود ج ۳ ص ۱۸۶)

(۱۷) قاضی محمد شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ، (فتح القدیر ج ۲ ص ۵۶۷)

(۱۸) علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ، (روح المعانی ج ۱۱ ص ۱۱)

(۱۹) نواب صدیق حسن خان بھوپالی متوفی ۱۳۰۷ھ، (فتح البیان ج ۵ ص ۲۸۶)

(۲۰) صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ۱۳۶۷ھ، (خزائن العرفان ص ۳۲۵)
(۲۱) شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ، (تفسیر عثمانی بر حاشیہ قرآن ص ۲۶۲)

بعض علماء دیوبند اس حدیث کا انکار کرتے ہیں اس لیے ہم نے متعدد حوالہ جات ذکر کیے ہیں جنہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔

حافظ ابن کثیر نے بھی منافقین کے علم کے متعلق دو حدیثیں ذکر کی ہیں:

امام احمد کی سند کے ساتھ ذکر کرتے ہیں کہ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے کہا، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہمیں مکہ کی عبادت کا کوئی اجر نہیں ملے گا! آپ نے فرمایا: تم کو تمہاری عبادتوں کے اجور ملیں گے، خواہ تم لومڑی کے سوراخ میں ہو۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب اپنا سر کر کے کان لگا کر سنا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اصحاب میں منافقین بھی ہیں۔ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ آپ پر بعض منافقین منکشف ہو گئے تھے اور وہ لوگ جو بے پر کی افواہیں اڑاتے تھے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو چودہ، پندرہ معین منافقوں کا علم عطا فرمایا تھا اور یہ تخصیص اس کا تقاضا نہیں کرتی کہ آپ تمام منافقوں کے اسماء پر شخصی طور پر مطلع نہ ہوں، اور امام ابن عساکر نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ ایک شخص جس کا نام حرملہ تھا وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا: ایمان یہاں ہے اور اس نے اپنے ہاتھ سے اپنی زبان کی طرف اشارہ کیا، اور نفاق یہاں ہے، یہ کہہ کر اس نے اپنے دل کی طرف اشارہ کیا اور اس نے اللہ کا ذکر بہت کم کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دُعا کی: اے اللہ! اس کی زبان کو ذکر کرنے والا بنا دے، اور دل کو شکر کرنے والا بنا دے اور اس کو میری محبت عطا فرما اور جو مجھ سے محبت کرتے ہیں ان کی محبت عطا فرما، اور اس کا معاملہ خیر کی طرف کر دے۔ اس نے کہا: یارسول اللہ! میں منافقوں کا سردار تھا، کیا میں ان کو آپ کے پاس لاؤں؟ آپ نے فرمایا: جو ہمارے پاس آئے گا ہم اس کے حق میں استغفار کریں گے اور جو اصرار کرے گا تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، اور تم کسی کا پردہ فاش نہ کرنا۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۳۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بعض دوسرے وہ (مسلمان) ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا، انہوں نے نیک کاموں کو دوسرے بُرے کاموں کے ساتھ ملا دیا، عنقریب اللہ ان کی توبہ قبول فرمائے گا، بے شک اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے○ (التوبہ: ۱۰۲)

حضرت ابولبابہ کی توبہ

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کا ذکر فرمایا تھا جو جھوٹے بہانے تراش کر غزوۂ تبوک میں نہیں گئے تھے۔ بعض مسلمان بھی بغیر کسی سبب اور عُذر کے غزوۂ تبوک میں نہیں گئے تھے، لیکن انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ کر اپنے قصور کا اعتراف کر لیا اور منافقوں کی طرح جھوٹے عُذر پیش نہیں کیے اور انہوں نے یہ امید رکھی کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف کر دے گا۔ امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ یہ دس مسلمان تھے جو غزوۂ تبوک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں گئے تھے، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو ان میں سے سات نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں کے ساتھ باندھ لیا، اور وہ ایسی جگہ تھی جہاں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم گزرتے تھے، جب آپ نے ان کو دیکھا تو فرمایا: یہ کون لوگ

ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں کے ساتھ باندھا ہوا ہے؟ مسلمانوں نے کہا: یہ ابولبابہ اور ان کے اصحاب ہیں جو آپ کے ساتھ غزوۂ تبوک میں نہیں گئے تھے۔ یہ اس وقت تک بندھے رہیں گے جب تک آپ ان کا عُذر قبول کر کے ان کو نہیں کھولیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اور میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں اس وقت تک ان کو نہیں کھولوں گا اور ان کا عُذر قبول نہیں کروں گا جب تک کہ اللہ ہی ان کو کھولنے کا حکم نہ دے' ان لوگوں نے مجھ سے اعراض کیا اور مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں نہیں گئے۔ جب ان مسلمانوں کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے کہا: ہم خود اپنے آپ کو نہیں کھولیں گے حتیٰ کہ اللہ ہی ہمیں کھولے گا' تب اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور بعض دوسرے وہ (مسلمان) ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا' انہوں نے نیک کاموں کو دوسرے بُرے کاموں کے ساتھ ملا دیا عنقریب اللہ ان کی توبہ قبول فرمائے گا۔

حضرت ابن عباس سے دوسری روایت یہ ہے کہ یہ چھ افراد تھے اور ان میں سے ایک حضرت ابولبابہ تھے۔

زید بن اسلم سے روایت ہے کہ جن مسلمانوں نے خود کو ستونوں سے باندھا تھا وہ آٹھ افراد تھے' ان میں کردم' مرداس اور ابولبابہ تھے۔

قتادہ سے روایت ہے کہ یہ سات افراد تھے' ان میں ابولبابہ بھی تھے لیکن وہ تین صحابہ (ہلال بن امیہ' مرارہ بن ربیع اور کعب بن مالک) ان میں نہیں تھے۔

ضحاک نے روایت کیا ہے کہ یہ ابولبابہ اور ان کے اصحاب تھے' اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی تھی اور ان کو کھول دیا تھا۔

مجاہد نے روایت کیا ہے کہ ابولبابہ کا گناہ یہ تھا کہ انہوں نے بنو قریظہ کو اشارہ سے یہ بتایا تھا کہ اگر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کہنے سے قلعہ سے نکل آئے تو وہ تم کو ذبح کر دیں گے' انہوں نے اپنے ہاتھ کو حلقوم پر رکھ کر اشارہ کیا تھا۔

امام ابوجعفر نے کہا: ان روایات میں اولیٰ یہ ہے کہ حضرت ابولبابہ نے غزوۂ تبوک میں مسلمانوں کے ساتھ نہ جانے کی وجہ سے اپنے آپ کو مسجد کے ستون کے ساتھ باندھا تھا۔

(جامع البیان جز ۱۱ ص ۲۲۔ ۱۹' ملخصاً' تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۸۷۳۔ ۱۸۷۲)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ ان کے مالوں سے زکوٰۃ لیجئے جس کے ذریعہ آپ انہیں پاک کریں گے اور ان کے باطن کو صاف کریں گے اور آپ ان پر صلوٰۃ بھیجئے' بے شک آپ کی صلوٰۃ ان کے لیے باعثِ طمانیت ہے' اور اللہ بہت سننے والا بے حد جاننے والا ہے ○ (التوبہ: ۱۰۳)

حضرت ابولبابہ کی توبہ اور شانِ نزول

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابولبابہ اور ان کے اصحاب کو کھول دیا' تو حضرت ابولبابہ اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے اموال لے کر آئے اور کہا: آپ ہمارے اموال لیجئے اور ان کو ہماری طرف سے صدقہ کر دیجئے۔ وہ کہتے تھے کہ آپ ہمارے لیے استغفار کیجئے اور ہم کو پاک کیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اس وقت تک ان میں سے کوئی چیز نہیں لوں گا جب تک کہ مجھے اس کا حکم نہ دیا جائے' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: آپ ان کے مالوں سے زکوٰۃ لیجئے جس کے ذریعہ آپ انہیں پاک کریں گے اور ان کے باطن کو صاف کریں گے اور آپ ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں بے شک آپ کی دعائے رحمت ان کے لیے طمانیت ہے۔ یعنی ان سے جو گناہ سرزد ہو چکے ہیں آپ ان کے لیے استغفار فرمائیں۔

(جامع البیان جز ۱۱ ص ۲۴' تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۸۷۵)

انبیاء علیہم السلام کے غیر پر استقلالاً اور انفراداً صلوٰۃ بھیجنے کی تحقیق

اس آیت میں فرمایا ہے: آپ ان پر صلوٰۃ پڑھیے، بے شک آپ کی صلوٰۃ ان کے لیے باعث طمانیت ہے۔ (التوبہ: ۱۰۳)
اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر، امت کے عام افراد پر بھی مستقل طور پر صلوٰۃ پڑھنا جائز ہے۔ ہم پہلے صلوٰۃ کا معنی بیان کریں گے، پھر اس مسئلہ میں فقہاء اسلام کے مذاہب بیان کریں گے اور فریقین کے دلائل ذکر کریں گے اور آخر میں اپنا موقف بیان کریں گے۔ فنقول وباللہ التوفیق۔

صلوٰۃ کا لغوی اور شرعی معنی

علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ نے لکھا ہے کہ اہل لغت نے کہا ہے کہ صلوٰۃ کا معنی دُعا، تبریک اور تمجید ہے اور اللہ اور رسول کے بندوں اور امت پر صلوٰۃ بھیجنے کا معنی ان کا تزکیہ کرنا اور ان کی تعریف اور توصیف کرنا ہے اور فرشتوں اور مسلمانوں کے صلوٰۃ بھیجنے کا معنی دُعا اور استغفار کرنا ہے اور نماز کو بھی صلوٰۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی اصل دُعا ہے۔ (المفردات ج ۲ ص ۳۷۴)

علامہ ابن قیم جوزی متوفی ۷۵۱ھ کی تحقیق یہ ہے کہ صلوٰۃ کا معنی ثناء (تعریف اور توصیف) کرنا ہے، امام بخاری نے اپنی صحیح میں ابو العالیہ سے روایت کیا ہے: اللہ عزوجل کا اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ پڑھنا ان کی ثناء اور ستائش کرنا اور ان کو سراہنا ہے اور فرشتوں کا آپ پر صلوٰۃ پڑھنا آپ کی ثناء اور ستائش کی دعا کرنا ہے۔ (صحیح البخاری کتاب التفسیر، الاحزاب: ۵۶) اور الاحزاب: ۵۶ میں صلوٰۃ کا معنی رحمت نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا معنی ہے: اللہ اور اس کے فرشتے آپ کی ثناء اور تعریف کرتے ہیں۔ (جلاء الافہام ص ۷۶، دار الکتب العلمیہ بیروت)

اس تحقیق کی بناء پر اللھم صل علی محمد کا معنی ہوگا: اے اللہ! سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور توصیف فرما۔

انبیاء علیہم السلام کے غیر پر انفراداً صلوٰۃ بھیجنے میں مذاہب فقہاء

علماء شیعہ کی ایک جماعت نے لکھا ہے کہ بعض متعصبین اہلسنّت نے لکھا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر مستقلاً صلوٰۃ بھیجنا جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص کہے اے اللہ! امیر المومنین علی پر صلوٰۃ بھیج یا فاطمۃ الزہرا پر صلوٰۃ بھیج تو یہ ممنوع ہے حالانکہ قرآنِ مجید کی اس آیت سے عام مسلمانوں پر بھی صلوٰۃ بھیجنا جائز ہے چہ جائیکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت اور آپ کے ولی پر صلوٰۃ بھیجنا ناجائز ہو۔ (تفسیر نمونہ ج ۸ ص ۱۲۱-۱۲۰، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ طہران، ۱۳۷۵ھ)

علامہ موسیٰ بن احمد صالحی حنبلی متوفی ۹۶۰ھ لکھتے ہیں:
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر پر بھی انفراداً صلوٰۃ بھیجنا جائز ہے۔
(الاقناع مع کشاف القناع ج ۱ ص ۴۳۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ)

قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴ھ لکھتے ہیں:
امام مالک کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کے غیر پر مستقلاً صلوٰۃ بھیجنا مکروہ ہے۔
(اکمال المعلم بفوائد مسلم ج ۲ ص ۳۰۵، مطبوعہ دار الوفاء بیروت، ۱۴۱۹ھ)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:
امام مالک اور جمہور کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کے غیر پر استقلالاً صلوٰۃ بھیجنا مکروہ ہے۔
(فتح الباری ج ۳ ص ۳۶۲، مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۱ھ)

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں:

امام احمد کے نزدیک غیر انبیاء پر استقلالاً صلوٰۃ بھیجنا جائز ہے اور امام ابوحنیفہ، ان کے اصحاب، امام مالک، امام شافعی اور اکثرین کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کے غیر پر انفراداً صلوٰۃ نہ بھیجی جائے لیکن ان پر تبعاً صلوٰۃ بھیجی جا سکتی ہے۔

(عمدۃ القاری جز ۹ ص ۹۵، مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، ۱۳۴۸ھ)

انبیاء علیہم السلام کے غیر پر صلوٰۃ اور سلام بھیجنے میں جمہور کا موقف

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی متوفی ۶۷۶ھ لکھتے ہیں:

ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر انفراداً صلوٰۃ بھیجنے پر اجماع ہے، اسی طرح تمام انبیاء اور ملائکہ پر استقلالاً صلوٰۃ بھیجنے کے جواز اور استحباب پر لائق شمار علماء کا اجماع ہے اور انبیاء علیہم السلام کے غیر کے متعلق جمہور کا موقف یہ ہے کہ ان پر ابتداءً صلوٰۃ نہ بھیجی جائے، مثلاً ابوبکر صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہا جائے گا اور ممانعت میں اختلاف ہے، ہمارے بعض اصحاب نے کہا کہ یہ حرام ہے اور اکثر علماء نے یہ کہا کہ یہ مکروہ تنزیہی ہے، اور بہت سے علماء نے یہ کہا کہ یہ مکروہ تنزیہی بھی نہیں خلافِ اولیٰ ہے، کیونکہ یہ اہلِ بدعت کا شعار ہے اور ہم کو اہلِ بدعت کے شعار سے منع کیا گیا ہے اور مکروہ وہ ہوتا ہے جس میں قصداً ممانعت وارد ہو، ہمارے اصحاب نے کہا: اس کے مکروہ تنزیہی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ سلف کی زبانوں میں صلوٰۃ کا لفظ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے، جیسے اللہ عزوجل کا لفظ اللہ سبحانہ کے ساتھ مخصوص ہے، پس جس طرح محمد عزوجل نہیں کہا جائے گا ہرچند کہ آپ عزیز اور جلیل ہیں، اسی طرح ابوبکر صلی اللہ علیہ وسلم یا علی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہا جائے گا اگرچہ اس کا معنی صحیح ہے، اور اس پر اتفاق ہے کہ غیر انبیاء پر تبعاً صلوٰۃ بھیجی جا سکتی ہے اس لیے یہ کہا جائے گا کہ اللھم صل علی محمد وعلی ال محمد واصحابہ وازواجہ وذریتہ واتباعہ، کیونکہ اس کے متعلق احادیثِ صحیحہ وارد ہیں اور ہم کو تشہد میں اس کا حکم دیا گیا ہے اور خارج از نماز بھی اس پر سلف صالحین کا عمل رہا ہے اور جہاں تک سلام کا تعلق ہے تو ہمارے اصحاب میں سے شیخ ابومحمد جوینی نے یہ کہا ہے کہ غائب کے حق میں یہ بھی صلوٰۃ کی طرح ہے، اور غیر انبیاء پر انفراداً سلام نہیں بھیجا جائے گا، پس علی علیہ السلام نہیں کہا جائے گا اور اس میں زندہ اور مردہ برابر ہیں اور حاضر کو سلام کے ساتھ مخاطب کیا جائے گا مثلاً السلام علیک یا السلام علیکم کہا جائے گا۔

(الاذکار ج ا ص ۱۳۶ - ۱۳۵، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ)

علامہ شمس الدین ابن قیم جوزی حنبلی متوفی ۷۵۱ھ نے سلام بھیجنے کے مسئلہ میں علامہ جوینی سے اختلاف کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

دوسرے علماء نے صلوٰۃ اور سلام میں فرق کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ سلام کا لفظ ہر مومن کے حق میں مشروع ہے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ، حاضر ہو یا غائب، کیونکہ یہ کہنا معروف اور معمول ہے کہ فلاں شخص کو میرا سلام پہنچا دو، اور یہ اہلِ اسلام کی تحیت (تعظیم) ہے بخلاف صلوٰۃ کے کیونکہ وہ رسول کا حق ہے اس لیے نماز کے تشہد میں پڑھتے ہیں السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین اور یوں نہیں پڑھا جاتا الصلوۃ علینا وعلی عباد اللہ الصالحین، اور اس سے ان دونوں کے درمیان فرق معلوم ہو گیا۔ (جلاء الافہام ص ۲۶۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

انبیاء علیہم السلام کے غیر پر استقلالاً صلوٰۃ پڑھنے والوں کے دلائل اور ان کے جوابات

مجوزین کی ایک دلیل سورۂ توبہ کی زیرِ بحث آیت ۱۰۳ ہے:

صَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ آپ ان پر صلوٰۃ بھیجئے، آپ کی صلوٰۃ ان کے لیے باعثِ طمانیت ہے۔

اور دیگر آیتیں یہ ہیں:

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ۔ (البقرہ: ۱۵۷) (یہ) وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی جانب سے صلوات ہیں اور رحمت۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ۔ (الاحزاب: ۴۳) وہی ہے جو تم پر صلوٰۃ بھیجتا ہے۔

ان آیتوں کے علاوہ حسبِ ذیل احادیث سے بھی وہ استدلال کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب لوگ صدقہ لے کر آتے تو آپ ان کے لیے دعا کرتے: اے اللہ! ان پر رحمت بھیج۔ سو میرے باپ ابو اوفیٰ صدقہ لے کر آئے تو آپ نے دعا فرمائی: اے اللہ! ابو اوفیٰ کی آل پر رحمت بھیج۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۴۹۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۰۷۸، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۱۵۹۰، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۴۵۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۵۹۶)

امام دارمی نے ایک طویل حدیث روایت کی ہے اس میں ہے، ایک خاتون نے کہا: یا رسول اللہ! مجھ پر اور میرے خاوند پر صلوٰۃ بھیجئے تو آپ نے ان پر صلوٰۃ بھیجی۔

(سنن الدارمی رقم الحدیث: ۴۶، مسند احمد ج ۳ ص ۳۹۸، ۳۰۳، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۹۵۰، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۵۱۹)

قیس بن سعد بن عبادہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی: اے اللہ! سعد بن عبادہ کی آل پر اپنی صلوات اور رحمت بھیج۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۵۱۸۵، عمل الیوم واللیلۃ للنسائی رقم الحدیث: ۳۲۵)

ان آیات اور احادیث کا جواب یہ ہے کہ ان آیات اور احادیث میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صلوٰۃ بھیجنے کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کسی حکم اور کسی قاعدہ کا پابند نہیں ہے، وہ جس کو چاہے صلوٰۃ بھیجے اور جو چاہے کرے اور صلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ہے، وہ اپنا حق جس کو چاہیں عطا کر دیں، سو یہ آیات اور احادیث ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ ہمارا موضوع یہ ہے کہ امت کسی غیر نبی پر صلوٰۃ بھیجے اور یہ چیز ان آیات اور احادیث سے ثابت نہیں ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے غیر پر انفراداً صلوٰۃ نہ بھیجنے کے دلائل

امام ابن عبد البر متوفی ۴۶۳ھ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے:

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا۔ (النور: ۶۳) تم آپس میں رسول کی دُعا کو ایسا نہ قرار دو جیسا کہ تم ایک دوسرے کے لیے دُعا کرتے ہو۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دُعا میں صلوٰۃ کا ذکر ہو اور مسلمان ایک دوسرے کے لیے دُعا میں بھی صلوٰۃ کا ذکر کریں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں کے لیے دُعا میں کوئی امتیاز نہیں رہے گا حالانکہ اس آیت کا یہ تقاضا ہے کہ ان میں امتیاز ہونا چاہیے۔

(الاستذکار ج ۶ ص ۲۶۲، طبع بیروت ۱۴۱۴ھ، التمہید ج ۷ ص ۹۹، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی شخص کا کسی شخص پر صلوٰۃ بھیجنا میرے علم

میں جائز نہیں ہے۔
(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۵۱۹، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۳۱۱۹، سنن کبریٰ ج ۲ ص ۱۵۳، الاستذکار ج ۶ ص ۲۶۳، التمہید ج ۷ ص ۹۹)

امام عبدالرزاق نے یہ اثر اس طرح روایت کیا ہے:
عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: انبیاء کے سوا کسی شخص پر صلوٰۃ بھیجنا جائز نہیں ہے۔ سفیان نے کہا: نبی کے سوا کسی اور پر صلوٰۃ بھیجنا مکروہ ہے۔
(المصنف رقم الحدیث: ۳۱۱۹، المعجم الکبیر ج ۱۱ رقم الحدیث: ۱۸۸۱۳)

امام مالک وغیرہ نے عبداللہ بن دینار سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر (مبارک) پر کھڑے ہوتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ بھیجتے اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے لیے دعا کرتے۔ (الاستذکار ج ۶ ص ۲۶۳، التمہید ج ۷ ص ۹۹)

موطا امام مالک کے موجودہ نسخوں میں یہ روایت ہے کہ حضرت ابن عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر کھڑے ہوتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر پر صلوٰۃ بھیجتے۔ (رقم الحدیث: ۱۶۶) امام ابن عبدالبر نے اس کا رد کیا ہے اور کہا ہے کہ یحییٰ بن یحییٰ کو اس روایت کے درج کرنے میں مغالطہ ہوا ہے، صحیح روایت اس طرح ہے جس طرح مذکور الصدر عبارت میں ذکر ہے۔ (الاستذکار ج ۶ ص ۲۶۳، التمہید ج ۷ ص ۹۹)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی شخص کسی شخص پر صلوٰۃ نہ بھیجے، باقی لوگوں کے لیے دعا کی جائے اور ان پر رحمت بھیجی جائے۔ (الاستذکار ج ۶ ص ۶۳)

خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے غیر پر تبعاً صلوٰۃ و سلام بھیجنا جائز ہے اور انفراداً اور استقلالاً صلوٰۃ بھیجنا مکروہ تنزیہی ہے اور صرف سلام بھیجنا بلا کراہت جائز ہے۔ یہی جمہور کا مسلک ہے اور یہی ہمارا موقف ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا یہ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور صدقات کو لیتا ہے، اور بے شک اللہ ہی بہت توبہ قبول کرنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے ○ (التوبہ: ۱۰۴)

صدقہ کی ترغیب

اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا: جن بندوں نے اپنے گناہوں پر توبہ کی اور اس کے کفارہ میں صدقہ کیا، عنقریب اللہ ان کی توبہ قبول فرمائے گا۔ اس آیت میں توبہ کو قبول کرنے کی امید دلائی تھی، توبہ قبول کرنے کی خبر نہیں دی تھی، اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حتمی طور پر یہ خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور صدقات کو لیتا ہے، تاکہ بندے زیادہ ذوق و شوق اور رغبت سے صدقہ و خیرات کریں۔

نیز پہلی آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا تھا کہ آپ ان سے صدقات لیں، اور اس آیت میں فرمایا ہے کہ اللہ صدقات لیتا ہے اور یہ بظاہر تعارض ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقات لینا، اللہ ہی کا صدقات لینا ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نائب مطلق ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال اور آپ کے ساتھ کیے جانے والے معاملات کو اپنے افعال اور اپنے ساتھ کیے جانے والا معاملہ قرار دیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ۔ (الفتح: ١٠) بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ دراصل اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ۔ (الاحزاب: ٥٧) بے شک جو لوگ اللہ کو ایذاء دیتے ہیں۔

اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء دینا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ایذاء دینا تو محال ہے۔

یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ۔ (البقرہ: ٩) وہ اللہ کو دھوکا دیتے ہیں۔

اس سے مراد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکا دینا ہے، کیونکہ وہ اپنے عقیدہ میں اللہ کو دھوکا نہیں دیتے تھے۔

صدقہ کی فضیلت میں احادیث

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص بھی کسی پاک چیز کو صدقہ کرتا ہے، اور اللہ پاک چیز کے سوا اور کسی چیز کو قبول نہیں کرتا، تو رحمٰن اس کو اپنے ہاتھ سے لیتا ہے، خواہ وہ ایک کھجور ہے، پھر وہ کھجور رحمٰن کے ہاتھ میں بڑھتی رہتی ہے حتیٰ کہ وہ پہاڑ سے بھی بڑی ہو جاتی ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے گھوڑے کو یا اس کے بچھیرے کو بڑھاتا رہتا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ١٤١٠، صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٠١٤، سنن الترمذی رقم الحدیث: ٦٦٢، سنن النسائی رقم الحدیث: ٢٥٢٥، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ١٨٤٢، مسند احمد ج ٢ ص ٢٦٨، صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: ٢٤٢٦)

ترمذی کی دوسری روایت میں ہے: حتیٰ کہ ایک لقمہ پہاڑ جتنا ہو جاتا ہے اور اس کی تصدیق اللہ عزوجل کی کتاب میں ہے: وہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور صدقات کو لیتا ہے۔ (التوبہ: ١٠٤) اور اللہ سُود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا رہتا ہےO (البقرہ: ٢٧٦)

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بھی یہ اضافہ ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ کون سا صدقہ سب سے افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: تنگ دست کی کمائی، اور فرمایا: اپنے عیال سے ابتداء کرو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٥٣٥٦، سنن الترمذی رقم الحدیث: ٢٤٦٣، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ١٦٧٧، سنن النسائی رقم الحدیث: ٢٥٤٤، سنن الدارمی رقم الحدیث: ١٦٥١)

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ کے متعلق سوال کیا گیا؛ آپ نے فرمایا: مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے، پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: (اصل) نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے مُنہ مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لو، (اصل) نیکی اس شخص کی ہے جو اللہ، قیامت کے دن، فرشتوں، (آسمانی) کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے، اور مال سے محبت کے باوجود رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں اور غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے مال دے۔ (البقرہ: ١٧٧)

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ٦٥٩، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ١٧٨٩، سنن الدارمی رقم الحدیث: ١٦٤٣)

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُوپر والا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے، اور اپنے عیال سے ابتدا کرو، بہترین صدقہ وہ ہے جو انسان خوشحالی کے وقت دے، جو شخص سوال سے رُکے گا اللہ اس کو سوال سے باز رکھے گا، اور جو مستغنی رہے اللہ اس کو مستغنی رکھے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۱۴۲۸، صحیح مسلم رقم الحدیث:۱۰۳۵، سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۴۶۳، سنن النسائی رقم الحدیث:۲۶۰۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۱۶۷۶، سنن الدارمی رقم الحدیث:۲۷۵۰)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی خاتون اپنے گھر کے طعام سے خرچ کرے درآنحالیکہ وہ اس کو ضائع کرنے والی نہ ہو تو اس کو طعام خرچ کرنے کا اجر ملتا ہے، اور اس کے خاوند کو اپنے کمانے کا اجر ملتا ہے اور خازن کو بھی اتنا ہی اجر ملتا ہے اور ان میں سے کسی کا اجر دوسرے کے اجر میں کمی نہیں کرتا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۱۴۲۵، صحیح مسلم رقم الحدیث:۱۰۲۴، سنن الترمذی رقم الحدیث:۶۷۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۱۶۸۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۲۲۹۴)

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے پاس صرف وہ مال ہے جو مجھے (حضرت) زبیر نے دیا ہے، کیا میں صدقہ کروں؟ آپ نے فرمایا: صدقہ کرو اور ہاتھ نہ روکو ورنہ تم سے بھی روک لیا جائے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۲۵۹۰، صحیح مسلم رقم الحدیث:۱۰۲۹، سنن الترمذی رقم الحدیث:۱۹۶۰، سنن النسائی رقم الحدیث:۲۵۵۱، سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۱۶۹۹)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ میرے پاس ایک سائل آیا، اس وقت میرے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے، میں نے اس سائل کو کچھ چیز دینے کے لیے کہا، پھر میں نے اس سائل کو بلایا اور اس چیز کو دیکھا، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم یہ نہیں چاہتیں کہ تمہارے گھر میں جو کچھ آئے اور تمہارے گھر سے جو کچھ جائے اس کا تم کو علم ہو؟ میں نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: ٹھہرو اے عائشہ! تم گن گن کر نہ دیا کرو، ورنہ اللہ عزوجل بھی تم کو گن گن کر دے گا۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۱۷۰۰، سنن النسائی رقم الحدیث:۲۵۴۹)

حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مسلمان کا صدقہ عمر میں زیادتی کرتا ہے، بُری موت کو دُور کرتا ہے اور اللہ اس کی وجہ سے تکبر اور فخر کو دُور کرتا ہے۔

(المعجم الکبیر ج ۱۷ ص ۲۲، حافظ الہیثمی نے کہا: اس میں ایک راوی ضعیف ہے، مجمع الزوائد رقم الحدیث:۴۶۰۹)

حضرت عقبہ بن عامر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقہ، صدقہ دینے والوں کی قبروں سے گرمی کو دُور کرتا ہے اور مسلمان قیامت کے دن صرف اپنے صدقہ کے سائے میں ہوگا۔

(المعجم الکبیر ج ۱۷ ص ۲۸۶، اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے اس میں کلام ہے، مجمع الزوائد رقم الحدیث:۴۶۱۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ گھر والوں نے ایک بکری کو ذبح کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: اس میں سے کچھ بچا ہے؟ حضرت عائشہ نے کہا: اس کا صرف ایک شانہ باقی ہے۔ آپ نے فرمایا: اس شانہ کے علاوہ باقی سب باقی ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۴۷۰، مسند احمد ج ۶ ص ۵۰، حلیۃ الاولیاء ج ۵ ص ۲۳)

حافظ عماد الدین اسمٰعیل بن عمر بن کثیر دمشقی متوفی ۷۷۴ھ لکھتے ہیں:

امام ابن عساکر نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کی قیادت میں مسلمانوں نے جہاد کیا، ایک مسلمان نے مالِ غنیمت میں سے سو رومی دینار غبن کر لیے۔ جب لشکر واپس چلا گیا اور سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے تو وہ مسلمان بہت نادم ہوا، اس نے امیرِ لشکر کے پاس یہ دینار پہنچائے۔ اس نے ان کو لینے سے انکار کر دیا کہ جن اہلِ لشکر میں یہ دینار تقسیم کیے جا سکتے تھے وہ سب تو اپنے اپنے گھر چلے گئے، اب میں ان کو نہیں

لے سکتا، تم قیامت کے دن یہ دینار خدا کو پیش کر دینا۔ اس شخص نے بہت سے صحابہ سے یہ مسئلہ معلوم کیا، سب نے یہی جواب دیا۔ وہ دمشق گیا اور حضرت معاویہ سے ان کو قبول کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے بھی انکار کیا، وہ روتا ہوا عبداللہ بن الشاعر السکسی کے پاس سے گزرا، انہوں نے اس سے رونے کا سبب پوچھا۔ اس نے سارا ماجرا سنایا۔ اس نے کہا: تم حضرت معاویہ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو اس میں سے پانچواں حصہ جو بیت المال کا حق ہے وہ لے لیں اور بیس دینار ان کے حوالے کر دو اور باقی اسی (۸۰) دینار ان اہلِ لشکر کی طرف سے صدقہ کر دو جو ان کے مستحق ہو سکتے تھے، کیونکہ اللہ ان کے ناموں اور ان کے پتوں سے واقف ہے، وہ ان کو ان دینار کا ثواب پہنچا دے گا اور اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرنے والا ہے، سو اس مسلمان نے ایسا ہی کیا۔ حضرت معاویہ نے کہا: اگر یہ فتویٰ میں نے دیا ہوتا تو مجھے یہ فتویٰ اپنی ساری مملکت سے زیادہ محبوب تھا۔

(مختصر تاریخ دمشق لابن عساکر ج ۱۲ ص ۲۵۴، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۰۹ھ، تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۳۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور آپ کہیے کہ تم عمل کرو پس عنقریب اللہ تمہارے عمل کو دیکھ لے گا اور اس کا رسول اور مومنین (بھی) اور عنقریب تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو ہر غیب اور ہر ظاہر کو جاننے والا ہے پھر وہ تم کو ان کاموں کی خبر دے گا جن کو تم کرتے رہے تھے ○ (التوبہ: ۱۰۵)

نیک اعمال کا حکم دینے اور بُرے اعمال سے روکنے کی وجہ

آیاتِ سابقہ سے اس آیت کے ارتباط کی دو صورتیں ہیں:

(۱) اس آیت کا تعلق ان مسلمانوں سے ہے جنہوں نے توبہ کی تھی یعنی کیا یہ مسلمان نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ توبہ صحیحہ کو قبول کرتا ہے، اور خلوصِ نیت سے جو صدقات دیئے جاتے ہیں ان کو قبول فرماتا ہے۔

(۲) اس سے مراد دوسرے لوگ ہیں جنہوں نے توبہ نہیں کی تھی تاکہ ان کو توبہ کی ترغیب دی جائے۔

امام رازی نے لکھا ہے کہ معبودِ برحق کو ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں زیادتی اور کمی محال ہو، مخلوق کی عبادت سے اس میں کسی چیز کا زیادہ ہونا اور مخلوق کی نافرمانی سے اس میں کسی چیز کا کم ہونا محال ہو، عبادت کی طرف اس کی رغبت اور معصیت سے اس کی نفرت محال ہو حتیٰ کہ یہ کہا جائے کہ اس کی نفرت اور اس کا غضب اس کو انتقام پر برانگیختہ کرتا ہے، بلکہ اس کا معصیت سے منع کرنا اور عبادت کی طرف راغب کرنا اس لیے ہے تاکہ مخلوق کو نیک لوگوں کے مقامات حاصل ہوں اور وہ بُرے لوگوں کے انجام سے بچیں۔ پس نافرمانی کرنے والا صرف اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے اور اطاعت کرنے والا صرف اپنے آپ کو فائدہ پہنچاتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اگر تم نیک کام کرو گے تو وہ نیک کام تمہارے نفع کے لیے ہیں، اور اگر تم بُرے کام کرو گے تو ان کا نقصان تمہیں پہنچے گا۔ (الاسراء: ۷) پس اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے: تم عمل کرو اللہ تمہارے عمل کو دیکھ لے گا، اس میں نیک کام کرنے والوں کے لیے ترغیب ہے، اور نافرمانی کرنے والوں کو ڈرایا ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم مستقبل کے لیے جدوجہد کرو کیونکہ تمہارے اعمال کا ایک ثمرہ دنیا میں ہے اور ایک ثمرہ آخرت میں ہے۔ دنیا میں ثمرہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول اور مسلمان تمہارے اعمال کو دیکھ رہے ہیں، اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو دنیا میں تمہاری بہت تعریف ہوگی اور دنیا اور آخرت میں تمہیں اجرِ عظیم ملے گا، اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرو گے تو دنیا میں تمہاری مذمت ہوگی اور آخرت میں تمہیں شدید عذاب ہوگا۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۴۲، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

انسان کے اعمال کو زندہ اور مُردہ لوگ دیکھتے رہتے ہیں

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم کسی بند چٹان کے اندر عبادت کرو جس کا نہ کوئی دروازہ ہو نہ کھڑکی تب بھی لوگوں کے لیے عمل ظاہر ہو جائیں گے خواہ وہ جو عمل بھی ہوں۔

(مسند احمد ج ۳ ص ۲۸، مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۲۲۵، موارد الظمآن رقم الحدیث: ۱۹۴۲، شیخ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند حسن ہے، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۱۷۳۰، مطبوعہ دارالحدیث قاہرہ، ۱۴۱۶ھ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے اعمال تمہارے مرے ہوئے قرابت داروں اور رشتہ داروں پر پیش کیے جاتے ہیں، اگر وہ نیک اعمال ہوں تو وہ ان سے خُوش ہوتے ہیں اور اگر وہ نیک اعمال نہ ہوں تو وہ دُعا کرتے ہیں: اے اللہ! تُو اُن پر اس وقت تک موت طاری نہ کرنا جب تک تُو ان کو اس طرح ہدایت نہ دے جس طرح تُو نے ہمیں ہدایت دی ہے۔

(مسند احمد ج ۳ ص ۱۶۵، مجمع الزوائد ج ۲ ص ۳۲۸، الطیالسی رقم الحدیث: ۱۵۶، حافظ الہیثمی اور شیخ احمد شاکر نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۲۶۱۹، مطبوعہ دارالحدیث قاہرہ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم پر کوئی حرج نہیں ہے اگر تم کسی شخص پر اس وقت تک تعجب نہ کرو جب تک کہ اس کا خاتمہ نہ ہو جائے، کیونکہ ایک عمل کرنے والا ایک زمانہ تک ایسے عمل کرتا رہتا ہے کہ اگر وہ ان اعمال پر مرجائے تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا پھر وہ پلٹتا ہے اور بُرے عمل کرتا ہے، اور ایک بندہ ایک زمانہ تک بُرے عمل کرتا ہے اگر وہ ان اعمال پر مرجائے تو وہ دوزخ میں داخل ہو جائے گا پھر وہ پلٹتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے اور جب اللہ کسی بندہ کے ساتھ نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو موت سے پہلے اس سے (نیک) عمل کرالیتا ہے۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! وہ اس سے کیسے عمل کراتا ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ اس کو نیک عمل کی توفیق دیتا ہے پھر اس کی رُوح قبض کرلیتا ہے۔

(مسند احمد ج ۳ ص ۱۲۰، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۲۰۸، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۶۴۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۸۱، امام ترمذی اور شیخ شاکر نے تصریح کی ہے کہ اس کی سند صحیح ہے، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۲۱۵۳، مطبوعہ دارالحدیث، قاہرہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: جب تمہیں کسی شخص کا عمل اچھا لگے تو یہ آیت پڑھو: تم عمل کرو عنقریب اللہ تمہارے عمل کو دیکھ لے گا اور اس کا رسول اور مومنین بھی۔ (التوبہ: ۱۰۵) (صحیح البخاری کتاب التوحید، باب: ۴۶)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بعض دوسرے وہ ہیں جن کو اللہ کا حکم آنے تک موخر کیا گیا ہے، یا اللہ ان کو عذاب دے گا یا ان کی توبہ قبول فرمالے گا، اور اللہ بہت علم والا بے حد حکمت والا ہے ○ (التوبہ: ۱۰۶)

غزوۂ تبوک میں ساتھ نہ جانے والوں کی چار قسمیں

جو لوگ غزوۂ تبوک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں گئے تھے ان کی چار قسمیں ہیں:

(۱) وہ منافق تھے جن کا اللہ تعالیٰ نے التوبہ: ۱۰۱ میں ذکر فرمایا ہے۔

(۲) وہ مسلمان تھے جو سستی اور غفلت کی بناء پر غزوۂ تبوک میں نہیں گئے تھے، وہ بعد میں نادم ہوئے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر توبہ کرلی۔ ان کا ذکر اللہ تعالیٰ نے التوبہ: ۱۰۲ میں فرمایا ہے۔

(۳) وہ مسلمان تھے جو سستی اور غفلت کی وجہ سے غزوۂ تبوک میں نہیں گئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جلدی حاضری نہیں دی اور توبہ کرنے میں اول الذکر مسلمانوں کے ساتھ شامل نہیں ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے

بھی ان کا معاملہ موخر کر دیا۔ یہ کعب بن مالک، مرارہ بن الربیع اور ہلال بن امیہ تھے۔

(۴) وہ مسلمان جو بہت بوڑھے، کمزور، نابینا یا اپاہج تھے، ان کو ان کے شرعی عذر کی وجہ سے رخصت دی گئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: جب یہ آیت نازل ہوئی خذ من اموالھم صدقۃ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابولبابہ اور ان کے اصحاب سے صدقہ لے لیا، اور تین اصحاب باقی رہ گئے جنہوں نے حضرت ابولبابہ کی طرح اپنے آپ کو ستونوں کے ساتھ نہیں باندھا تھا، انہوں نے کسی چیز کا ذکر نہیں کیا، ان کا عذر نازل نہیں ہوا اور انہیں کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ اور بعض دوسرے وہ ہیں جن کو اللہ کا حکم آنے تک موخر کیا گیا ہے، یا ان کو اللہ عذاب دے گا یا ان کی توبہ قبول فرمالے گا، تب لوگوں نے کہا: یہ لوگ ہلاک ہوگئے کیونکہ ان کے متعلق کوئی عذر نازل نہیں ہوا اور دوسروں نے کہا: ہوسکتا ہے اللہ ان کی مغفرت فرمادے کیونکہ ان کا معاملہ موخر کیا گیا ہے۔ (جامع البیان جز ۱۱ ص ۲۹)

حضرت کعب بن مالک اور ان کے دو ساتھیوں کی توبہ کی تفصیل التوبہ: ۱۱۸-۱۱۷ میں بیان کی جائے گی، ان شاء اللہ۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ

اور وہ لوگ جنہوں نے ضرر پہنچانے کے لیے مسجد بنائی اور کفر کرنے کے لیے اور مسلمانوں کے درمیان

الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ

پھوٹ ڈالنے کے لیے اور اس شخص کی کمین گاہ بنانے کے لیے جو پہلے سے ہی اللہ اور اس کے رسول سے جنگ

قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ

کر رہا ہے اور وہ ضرور بہ قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے صرف بھلائی کا ارادہ کیا ہے اور اللہ گواہی دیتا ہے

اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ

کہ بے شک وہ ضرور جھوٹے ہیں ○ آپ اس مسجد میں کبھی کھڑے نہ ہوں، البتہ جس مسجد کی بنیاد

عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ

پہلے روز سے ہی تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، اس میں

رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ اَفَمَنْ

ایسے مرد ہیں جو خوب پاکیزہ ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ زیادہ پاکیزگی حاصل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے ○ تو کیا جس

اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ

نے اللہ سے ڈرتے اور اس کی رضا پر اپنی مسجد کی بنیاد رکھی وہ بہتر ہے یا وہ شخص جس نے

أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ

اپنی عمارت کی بنیاد ایسے گڑھے کے کنارے پر رکھی جو گرنے کے قریب ہے تو وہ اسے لے کر جہنم کی آگ

جَهَنَّمَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ

میں گر پڑا اور اللہ ظلم کرنے والے لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ○ جس عمارت کو انہوں نے بنایا ہے گرنے کے

الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ

خطرہ کی وجہ سے ہمیشہ ان کے دلوں میں کھٹکتی رہے گی سوا اس کے کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اللہ بے حد جاننے والا

حَكِيْمٌ ﴿١١٠﴾ ع

بڑی حکمت والا ہے ○

١٣ ع ١١ ٢

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور وہ لوگ جنہوں نے ضرر پہنچانے کے لیے مسجد بنائی اور کفر کرنے کے لیے اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کے لیے اور اس شخص کی کمین گاہ بنانے کے لیے جو پہلے سے ہی اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کر رہا ہے اور وہ ضرور یہ قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے صرف بھلائی کا ارادہ کیا ہے اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک وہ ضرور جھوٹے ہیں○ (التوبہ: ١٠٧)

مسجد ضرار کا پس منظر و پیش منظر

حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر متوفی ٧٧٤ھ لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے، مدینہ میں قبیلہ خزرج کا ایک شخص رہتا تھا جس کا نام ابو عامر راہب تھا، یہ شخص ایام جاہلیت میں نصرانی ہو گیا تھا، اور اہل کتاب کا علم حاصل کر چکا تھا۔ ایام جاہلیت میں یہ ایک عبادت گزار شخص تھا، اور اس کو اپنے قبیلہ میں بہت فضیلت حاصل تھی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے اور مسلمان آپ کے گرد جمع ہونے لگے اور اسلام کی مقبولیت ہونے لگی اور غزوۂ بدر میں بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غلبہ عطا فرمایا تو ابو عامر پر یہ تمام امور بہت شاق گزرے اور وہ برملا مسلمانوں سے عداوت ظاہر کرنے لگا، اور مدینہ سے بھاگ کر کفار مکہ اور مشرکین سے جا ملا، یہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ پر مائل کرتا تھا، سو عرب کے سارے قبیلے اکٹھے ہو گئے اور جنگ احد کے لیے پیش قدمی کی۔ اس جنگ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو آزمائش میں مبتلا کیا اور مسلمانوں کو اس جنگ میں نقصان ہوا۔ اس فاسق نے دونوں طرف کی صفوں کے درمیان کئی گڑھے کھود رکھے تھے، ان میں سے ایک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گر پڑے، اور آپ کو چوٹ لگی، آپ کا چہرہ زخمی ہو گیا، نیچے کی طرف سے سامنے کے چار دانتوں میں سے دائیں جانب کا ایک دانت شہید ہو گیا (اس کا ایک کنارہ جھڑ گیا تھا) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سر بھی زخمی ہو گیا تھا۔ ابو عامر نے جنگ شروع ہونے سے پہلے اپنی قوم انصار کی طرف بڑھ کر انہیں مخاطب کیا اور ان کو اپنی موافقت کی دعوت دی، جب انصار نے ابو عامر کی یہ حرکت دیکھی تو انہوں نے کہا: اے فاسق! اے دشمن خدا! اللہ تجھ کو برباد کرے، اور اس کو بہت برا کہا اور اس

کی مذمت کی۔ ابوعامر یہ کہتا ہوا واپس گیا کہ میرے بعد میری قوم بہت بگڑ گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بھاگنے سے پہلے اس کو اسلام کی دعوت دی تھی اور اس کو قرآن پڑھ کر سنایا تھا، لیکن اس نے سرکشی کی اور انکار کیا، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دعاء ضرر فرمائی کہ وہ جلاوطنی کی حالت میں مرے۔ اس دعاء ضرر کا اثر اس طرح ہوا کہ جب ابوعامر نے دیکھا کہ جنگ احد میں مسلمانوں کے نقصان اٹھانے کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی تو وہ روم کے بادشاہ ہرقل کے پاس گیا اور اپنی قوم میں سے منافقین کو مکہ بھیجا کہ میں لشکر لے کر آ رہا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خوب جنگ ہوگی اور میں ان پر غالب آ جاؤں گا، اور منافقین کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ اس کے لیے ایک پناہ کی جگہ بنائیں اور جو لوگ میرا پیغام اور احکام لے کر آئیں ان کے لیے امن کی ایک پناہ گاہ بناؤ تاکہ جب وہ خود مدینہ آئے تو وہ جگہ اس کے لیے کمین گاہ کا کام دے، چنانچہ ان منافقین نے مسجد قبا کے قریب ہی ایک اور مسجد بنا ڈالی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبوک روانگی سے پہلے وہ اس کام سے فارغ بھی ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ درخواست لے کر آئے کہ آپ ہمارے پاس آئیے اور ہماری مسجد میں نماز پڑھئے تاکہ مسلمانوں کے نزدیک یہ مسجد مستند ہو جائے۔ انہوں نے آپ سے کہا کہ ہم نے کمزوروں اور بیماروں کی خاطر یہ مسجد بنائی ہے اور جو ضعیف لوگ سردیوں کی راتوں میں دور کی مساجد میں نہیں جا سکتے ان کے لیے آسانی ہو، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مسجد میں نماز پڑھنے سے بچانا چاہتا تھا، اس لیے آپ نے فرمایا: ہمیں تو اس وقت غزوۂ تبوک کا سفر درپیش ہے، جب ہم واپس ہوں گے تو ان شاء اللہ دیکھا جائے گا اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے فارغ ہو کر مدینہ کی طرف واپس ہوئے، اور ایک دن یا اس سے کچھ کم مدینہ کی مسافت رہ گئی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آئے اور بتایا کہ منافقوں نے یہ مسجد ضرار بنائی ہے اور مسجد قبا کے قریب ایک اور مسجد بنانے سے ان کا مقصد مسلمانوں کی جماعت میں تفریق پیدا کرنا ہے اور اس سے ان کا مقصود ابوعامر راہب کی کمین گاہ بنانا ہے۔ اس وحی کے نازل ہونے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی چند مسلمانوں کو اس مسجد ضرار کی طرف بھیج دیا تاکہ وہ اس کو منہدم کر دیں اور اس کو جلا ڈالیں۔ آپ نے بنو سالم کے بھائی مالک بن دخشم اور معن بن عدی یا اس کے بھائی عامر بن عدی کو بلایا اور فرمایا: تم دونوں ان ظالموں کی مسجد کی طرف جاؤ اور اس کو منہدم کر دو اور جلا ڈالو۔ ان دونوں نے اس مسجد کو گرایا اور جلا ڈالا۔ اس وقت اس مسجد میں یہ کفار موجود تھے اور مسجد کے جلنے سے یہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسجد ضرار کو بنانے والے یہ بارہ افراد تھے: خذام بن خالد، ثعلبہ بن حاطب (یہ وہ نہیں جو بدری صحابی ہیں) معتب بن قشیر، ابوحبیبہ بن الازعر، عباد بن حنیف، حارثہ بن عامر اور اس کے دو بیٹے مجمع اور زید، نبتل الحارث، مخرج، بجاد بن عمران اور ودیعہ بن ثابت --- یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر کہہ رہے تھے کہ ہم نے تو نیک ارادے سے یہ مسجد بنائی تھی، ہمارے پیش نظر صرف مسلمانوں کی خیر خواہی تھی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ شہادت دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹ بولتے ہیں۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۳۵ - ۴۳۲ ملخصاً، مطبوعہ بیروت، ۱۴۱۹ھ، البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۶۱۹ - ۶۱۸، مطبوعہ بیروت، ۱۴۱۸ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ اس مسجد میں کبھی کھڑے نہ ہوں، البتہ جس مسجد کی بنیاد پہلے روز سے ہی تقویٰ پر رکھی گئی ہے، وہ اس بات کی زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، اس میں ایسے مرد ہیں جو خوب پاکیزہ ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ زیادہ پاکیزگی حاصل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے○ (التوبہ: ۱۰۸)

مسجد ضرار میں کھڑے ہونے کی ممانعت

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کی بنائی ہوئی مسجد ضرار میں کھڑے ہونے سے منع فرمایا ہے۔ ابن جریج

نے کہا ہے کہ منافقین جمعہ کے دن اس مسجد کو بنا کر فارغ ہو گئے تھے، انہوں نے جمعہ، ہفتہ اور اتوار کو اس مسجد میں نمازیں پڑھیں، اور پیر کے دن یہ مسجد گرا دی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس مسجد میں نماز پڑھنے کی پہلے یہ وجہ بیان فرمائی تھی کہ یہ مسجد مسلمانوں کو ضرر پہنچانے، کفر کرنے، مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتا تھا اس کی کمین گاہ بنانے کے لیے بنائی گئی ہے اور اس آیت میں دوسری وجہ بیان فرمائی ہے کہ دو مسجدوں میں سے ایک مسجد پہلے روز سے ہی تقویٰ کی بنیاد پر بنائی گئی ہو اور دوسری مسجد میں نماز پڑھنا مسجد تقویٰ میں نماز پڑھنے سے مانع ہو تو اس دوسری مسجد میں نماز پڑھنا بداہتاً ممنوع ہو گا۔

اس مسجد کا مصداق جس کی بنیاد اول یوم سے تقویٰ پر رکھی گئی

حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے سعید بن مسیب اور خارجہ بن زید کا موقف یہ ہے کہ لمسجد اسس علی التقوی کا مصداق مسجد نبوی ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آپ کی بعض ازواج کے حجرہ میں حاضر ہوا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ کون سی مسجد ہے جس کی بنیاد پہلے روز سے ہی تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔ آپ نے اپنی مٹھی میں کنکریاں لیں اور ان کو زمین پر مارا، پھر فرمایا: وہ تمہاری یہ مسجد ہے۔

حضرت ابن عباس، ابن بریدہ اور ابن زید کا موقف یہ ہے کہ وہ مسجد قبا ہے۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے کہا ان مختلف روایتوں میں راجح قول یہ ہے کہ مسجد تقویٰ، مسجد نبوی ہے، کیونکہ اس سلسلہ میں احادیث صحیحہ وارد ہیں:

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں دو شخصوں کا اس میں اختلاف ہوا کہ وہ کون سی مسجد ہے جس کی بنیاد روز اول سے ہی تقویٰ پر رکھی گئی تھی؟ ایک شخص نے کہا وہ مسجد نبوی ہے، دوسرے شخص نے کہا وہ مسجد قباء ہے، پھر وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے اور آپ سے اس کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: وہ مسجد میری مسجد ہے۔ (مسند احمد رقم الحدیث: ۲۱۱۶۴-۲۱۱۶۵)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مسجد کے متعلق سوال کیا گیا جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی تھی۔ آپ نے فرمایا: وہ میری مسجد ہے۔ (مسند احمد رقم الحدیث: ۲۲۸۶۹، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۳۷۳)

(جامع البیان جز ۱۱ ص ۳۹-۳۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میرا اور بنو عمرو بن عوف کے ایک شخص کا اس میں اختلاف ہوا کہ جس مسجد کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی تھی وہ کون سی ہے؟ میں نے کہا کہ وہ مسجد رسول اللہ ہے اور بنو عمرو بن عوف کے شخص نے کہا وہ مسجد قبا ہے، پھر دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے اور آپ سے اس کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: وہ یہ مسجد ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد اور فرمایا: اس میں (مسجد قبا میں) خیر کثیر ہے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۳۹۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۲۳، ۳۰۹۹، سنن النسائی رقم الحدیث: ۶۹۶، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۱۶۲۶، ۱۶۰۴، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۳۷۲، مطبوعہ کراچی، مسند احمد ج ۳ ص ۹۱، ۲۳، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۹۸۵، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲ ص ۵۴۴، المستدرک ج ۱ ص ۴۸۷، ج ۲ ص ۳۳۴، شرح السنہ رقم الحدیث: ۴۵۵)

واضح رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معین فرمادیا ہے کہ جس مسجد کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ میری مسجد ہے یعنی

مسجد نبوی، اس سلسلہ میں صرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی منفرد رائے ہے کہ اس سے مراد مسجد قبا ہے، اور تابعین میں سے ابن بریدہ، ابن زید اور ضحاک کا بھی یہی موقف ہے، اس کے برخلاف کثیر صحابہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاف تصریح یہ ہے کہ اس سے مراد مسجد نبوی ہے جیسا کہ ہم احادیث صحیحہ سے بیان کر چکے ہیں، اور اب ہم مسجد نبوی اور مسجد قبا کے فضائل میں احادیث کا ذکر کریں گے۔

مسجد نبوی اور روضۂ رسول کی زیارت کے فضائل

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی شخص کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا ایک نماز کا ثواب ہے، اور محلہ کی مسجد میں نماز پڑھنا پچیس نمازوں کا ثواب ہے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنا پانچ سو نمازوں کا ثواب ہے، اور اس کا مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنا پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ہے اور اس کا میری مسجد میں نماز پڑھنا پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ہے اور اس کا مسجد حرام میں نماز پڑھنا ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ہے۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۴۱۳)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے میری اس مسجد میں چالیس نمازیں پڑھیں اور ان میں سے کوئی نماز قضا نہ ہوئی ہو اس کے لیے آگ سے نجات لکھ دی جائے گی اور عذاب سے نجات لکھ دی جائے گی اور نفاق سے برأت لکھ دی جائے گی۔

(مسند احمد ج ۳ ص ۱۵۵، شیخ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند حسن ہے، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۵۲۱، مطبوعہ دارالحدیث قاہرہ، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۵۴۴۰، حافظ منذری نے کہا اس حدیث کے راوی صحیح ہیں، الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۲۱۵، حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں، مجمع الزوائد ج ۴ ص ۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بیت اور میرے منبر کے درمیان کی جگہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر حوض پر ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۸۸۸، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۳۹۱، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۹۱۶، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۵۲۴۳، الطبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۲۵۳، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۱ ص ۴۳۹، کراچی، مسند احمد ج ۲ ص ۲۳۶، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۳۷۵۰، المعجم الصغیر رقم الحدیث: ۱۱۱۰، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۵ ص ۲۴۶، التمہید ج ۱ ص ۵۷۸)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اس منبر کے پائے جنت میں نصب ہیں۔

(سنن النسائی رقم الحدیث: ۶۹۵، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۵۲۴۲، مسند حمیدی رقم الحدیث: ۲۹۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۳۷۴۳، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۳۲۹۶، حلیۃ الاولیاء ج ۷ ص ۲۴۸، مجمع الزوائد ج ۴ ص ۲۰۹، المستدرک ج ۳ ص ۵۳۲، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۱ ص ۴۸۰، کنزالعمال رقم الحدیث: ۳۴۹۵۳)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو گئی۔

(سنن دار قطنی ج ۲ ص ۲۷۷، رقم الحدیث: ۲۶۶۹، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۱۸۳۰، مجمع الزوائد ج ۴ ص ۲، تلخیص الحبیر ج ۳ ص ۹۰۲، اتحاف السادۃ المتقین ج ۴ ص ۴۱۷، کنزالعمال رقم الحدیث: ۴۲۵۸۳، کامل ابن عدی ج ۶ ص ۲۳۵۰)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے میری وفات کے بعد حج کر کے میری زیارت کی گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔

(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ١٣٤٩٧، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ٣٤٠٠، مجمع الزوائد ج ٤ ص ٢، سنن دار قطنی رقم الحدیث: ٢٦٦٧، سنن کبریٰ للبیہقی ج ٥ ص ٢٤٦، المطالب العالیہ رقم الحدیث: ١٢٥٤، کنز العمال رقم الحدیث: ٤٢٥٨٢)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے حج کیا اور میری زیارت نہیں کی اس نے مجھ سے بے وفائی کی۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔

(تلخیص الحبیر ج ٣ ص ٩٠٣، کتاب المجروحین لابن حبان ج ٣ ص ٧٣)

مسجد قبا کے فضائل

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب اہل قبا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا کہ ان کے لیے مسجد بنائی جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص کھڑا ہو اور اونٹنی پر سوار ہو، حضرت ابوبکر نے اس پر سوار ہو کر اس کو اٹھانا چاہا وہ نہیں اٹھی، پھر وہ آ کر بیٹھ گئے، پھر حضرت عمر نے اس پر سوار ہو کر اس کو چلانا چاہا وہ نہیں چلی، وہ بھی واپس آ کر بیٹھ گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اپنے اصحاب سے فرمایا: تم میں سے بعض لوگ کھڑے ہوں اور اس اونٹنی پر سوار ہوں، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر اس کی رکاب میں پیر رکھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے علی! اس کی مہار ڈھیلی چھوڑ دو، اور اس کے گھومنے کے گرد مسجد بناؤ کیونکہ یہ اونٹنی اللہ کے حکم کی پابند ہے۔

(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ٢٠٣٣، مجمع الزوائد رقم الحدیث: ٥٨٩٧)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر ہفتہ کے دن مسجد قبا جاتے تھے خواہ پیدل یا سوار، اور حضرت عبداللہ بن عمر بھی اسی طرح کرتے تھے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ١١٩٣، صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٣٩٩، سنن النسائی رقم الحدیث: ٦٩٨، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٢٠٤٠)

حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسجد قبا میں نماز پڑھنے کا اجر عمرہ کے برابر ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ٣٢٤، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ١٤١١)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس (قبا) میں ایسے مرد ہیں جو خوب پاکیزہ ہونے کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ زیادہ پاکیزگی حاصل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

پانی کے ساتھ استنجاء کرنے کی فضیلت

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل قبا سے فرمایا: میں نے اللہ سے سنا کہ وہ تمہاری پاکیزگی حاصل کرنے کی تعریف فرماتا ہے، تم کس طرح پاکیزگی حاصل کرتے ہو؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! ہمیں اور کسی چیز کا پتا نہیں لیکن ہم نے دیکھا کہ ہمارے پڑوسی براز سے فارغ ہونے کے بعد اپنی سرینوں کو پانی سے دھوتے ہیں، پس ہم بھی اس طرح دھوتے ہیں جس طرح وہ دھوتے ہیں۔

(جامع البیان جز ١١ ص ٤١، مسند احمد رقم الحدیث: ١٥٤٨٥، المستدرک ج ١ ص ١٥٥)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ آیت: (التوبہ: ١٠٨) اہل قبا کے

متعلق نازل ہوئی ہے' وہ پانی کے ساتھ استنجاء کرتے تھے' تو ان کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔
(سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۱۰۰' سنن ابو داؤد رقم الحدیث:۴۴' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۳۵۷' سنن کبریٰ للبیہقی ج ۱ ص ۱۰۵)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تو کیا جس نے اللہ سے ڈرنے اور اس کی رضا پر اپنی مسجد کی بنیاد رکھی وہ بہتر ہے یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایسے گڑھے کے کنارے پر رکھی جو گرنے کے قریب ہے تو وہ اسے لے کر جہنم کی آگ میں گر پڑا اور اللہ ظلم کرنے والے لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (التوبہ: ۱۰۹)

مشکل الفاظ کے معانی

شفا کے معنی ہیں طرف یا کنارہ۔ جرف کے معنی ہیں وہ جگہ جس کو سیلاب بہا کر لے جاتا ہے۔ (المفردات ج ۱ ص ۱۱۱) شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے اس کا ترجمہ کھائی کیا ہے اور اعلیٰ حضرت اور ہمارے شیخ علامہ کاظمی نے اس کا ترجمہ گڑھا کیا ہے۔ ھار: یہ اصل میں ھائر تھا' جو چیز گرنے والی ہو۔ فانھار بہ اپنے بنانے والے کے ساتھ گر گیا۔ ریبۃ: شک۔ تقطع: ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان دو مسجدوں کے بنانے والوں میں سے ایک نے اپنی مسجد بنانے سے اللہ سے ڈرنے اور اس کی رضا کا ارادہ کیا اور دوسرے نے اپنی مسجد بنانے سے نافرمانی اور کفر کا ارادہ کیا' پس پہلی بنا نیک ہے اور اس کا باقی رکھنا واجب ہے اور دوسری بنا خبیث ہے اور اس کا گرانا واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جس عمارت کو انہوں نے بنایا ہے گرنے کے خطرہ کی وجہ سے ہمیشہ ان کے دلوں میں کھٹکتی رہے گی سوا اس کے کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اللہ بے حد جاننے والا بڑی حکمت والا ہے ○ (التوبہ: ۱۱۰)

منافقین کے شک میں پڑنے کی وجوہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ منافقین نے جو مسجد ضرار بنائی تو اس کے بنانے کے بعد ان کے دلوں میں یہ خوف رہا کہ اس مسجد کا راز کھل جائے گا اور اس کو منہدم کر دیا جائے گا اور اس کو بنانے کا سبب یہ تھا کہ ان کو دین اسلام کے متعلق شک تھا' اور وہ شک ان کے دلوں سے نکل نہیں سکتا تھا تاوقتیکہ ان کو موت نہ آ جائے اور اس سے مراد یہ ہے کہ یہ مسجد ضرار دین میں شکوک اور شبہات کا مصدر تھی اور کفر اور نفاق کا مظہر تھی' اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منہدم کرنے کا حکم دیا تو یہ ان پر بہت شاق گزرا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا بغض اور زیادہ ہو گیا' اور آپ کی نبوت میں ان کے شکوک اور شبہات اور بڑھ گئے اور ان کو اپنے متعلق یہ پریشانی رہتی تھی کہ آیا ان کو اسی نفاق کی حالت میں برقرار رکھا جائے گا یا ان کو قتل کر دیا جائے گا تو گویا اس مسجد ضرار کو بنانا بجائے خود ایک شک تھا کیونکہ وہ شک کا سبب تھا۔ اس شک کے پیدا ہونے کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(۱) منافقین مسجد ضرار کو بنا کر بہت خوش ہوئے تھے' اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسجد کو گرانے کا حکم دیا تو ان کو یہ حکم بہت ناگوار گزرا اور آپ کی نبوت اور رسالت کے متعلق ان کے شکوک اور شبہات اور زیادہ ہو گئے۔

(۲) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسجد کو منہدم کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے یہ گمان کیا کہ آپ نے ان سے حسد کی وجہ سے یہ حکم دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جو امان دی ہوئی تھی وہ ان کے خیال میں مرتفع ہو گئی اور ان کو ہر وقت یہ خوف اور خطرہ رہا کہ آیا ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا یا ان کو قتل کر دیا جائے گا اور ان کے اموال سلب کر لیے جائیں گے۔

(۳) ان کا اعتقاد یہ تھا کہ اس مسجد کو بنانا ایک نیک کام ہے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو گرانے کا حکم دیا تو یہ اس شک میں پڑ گئے کہ کس وجہ سے اس مسجد کو گرانے کا حکم دیا گیا ہے۔
(۴) وہ مسلسل اس شک میں رہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس جرم کو معاف کر دے گا یا نہیں، لیکن صحیح پہلی وجہ ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم
بے شک اللہ نے ایمان والوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو جنت
بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَ
کے بدلہ میں خرید لیا، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، پس قتل کرتے ہیں اور
يُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ
قتل کیے جاتے ہیں، اس پر اللہ کا سچا وعدہ ہے، تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں،
وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي
اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا اور کون ہے؟ پس تم اپنی اس بیع کے ساتھ خوش ہو جاؤ جو
بَايَعْتُم بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١١١﴾ التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ
تم نے بیع کی ہے، اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے ○ (یہی لوگ ہیں) توبہ کرنے والے عبادت کرنے
الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ
والے حمد کرنے والے روزے رکھنے والے رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے نیکی کا
بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ
حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے
اللَّهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٢﴾ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا
اور آپ ایمان والوں کو خوش خبری سنا دیں ○ نبی اور ایمان والوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے
أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِن بَعْدِ
کہ وہ مشرکین کے لیے استغفار کریں خواہ وہ ان کے قرابت دار ہوں، جب کہ ان پر

مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ

یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ وہ (مشرکین) دوزخی ہیں ○ اور ابراہیم کا اپنے (عرفی) باپ کے لیے

اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ

استغفار کرنا صرف اس وعدہ کی وجہ سے تھا جو اس نے ابراہیم سے کیا تھا اور جب ان پر یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ

اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گئے، بے شک ابراہیم بہت نرم دل اور بہت بردبار تھے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک اللہ نے ایمان والوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، اس پر اللہ کا سچا وعدہ ہے تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا اور کون ہے، پس تم اپنی اس بیع کے ساتھ خوش ہو جاؤ جو تم نے بیع کی ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے○ (التوبہ: ۱۱۱)

اللہ تعالیٰ کا مومنین کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلہ خریدنا

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی ان برائیوں اور خرابیوں اور سازشوں کا ذکر فرمایا تھا جو غزوۂ تبوک میں شامل نہ ہونے کی بنا پر انہوں نے کی تھیں، اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کی فضیلت اور اس کی ترغیب کو بیان فرمایا تاکہ ظاہر ہو کہ منافقین نے جہاد کو ترک کر کے کتنے بڑے نفع کو ضائع کر دیا۔

مجاہدین اپنی جانوں اور مالوں کو جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کے اجر میں اللہ تعالیٰ نے جو ان کو جنت عطا فرمائی اس کو اللہ تعالیٰ نے شراء (خریدنے) سے تشبیہ دی ہے۔ عرف میں خریدنے کا معنی یہ ہے کہ ایک شخص ایک چیز کو اپنی ملک سے نکال کر دوسرے کو کسی اور چیز کے عوض دیتا ہے جو نفع میں اس چیز کے برابر ہوتی ہے یا کم یا زیادہ، پس مجاہدین نے اپنی جانوں اور مالوں کو اللہ کے ہاتھ اس جنت کے بدلے میں فروخت کر دیا جو اللہ نے مومنین کے لیے تیار کی ہے، بایں طور کہ وہ اہل جنت میں سے ہو جائیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے اور اس کو اپنے گھر سے نکالنے کا محرک صرف اس کی راہ میں جہاد کرنے کا جذبہ ہوتا ہے اور اس کے کلام کی تصدیق کرنا ہوتا ہے، اللہ اس شخص کے لیے اس بات کا ضامن ہو گیا ہے کہ اس کو جنت میں داخل کر دے یا اس کو اس کے گھر اجر اور مال غنیمت کے ساتھ لوٹا دے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۴۶۳، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۸۷۶، سنن النسائی رقم الحدیث: ۵۰۲۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۷۵۳، موطا امام مالک رقم الحدیث: ۴۴۳، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ۱۵۷، سنن سعید بن منصور رقم الحدیث: ۲۳۱۱)

یہ آیت آخری بیعت عقبہ کے موقع پر بعثت نبوی کے تیرہویں سال میں نازل ہوئی تھی، اس موقع پر مدینہ سے آئے ہوئے ستر آدمیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

محمد بن کعب قرظی وغیرہ نے بیان کیا کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: آپ اپنے رب کے لیے اور اپنی ذات کے لیے جو چاہیں شرط لگالیں۔ آپ نے فرمایا: میں اپنے رب کے لیے شرط لگاتا ہوں کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ، اور میں اپنے لیے یہ شرط لگاتا ہوں کہ تم میری حفاظت اس طرح کرو گے جس طرح تم اپنی جانوں اور مالوں کی حفاظت کرتے ہو۔ انہوں نے کہا جب ہم یہ کرلیں گے تو ہمیں کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا: جنت! انہوں نے کہا یہ نفع والی بیع ہے، ہم اس کو خود فسخ کریں گے نہ اس کے فسخ کرنے کو پسند کریں گے۔

(جامع البیان جز ۱۱ص ۴۹، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حسن بصری نے کہا روئے زمین پر جو مومن بھی ہے وہ اس بیع میں داخل ہے۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۸۸۶، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

تورات اور انجیل میں اللہ کے عہد کا ذکر

اس آیت میں مذکور ہے کہ یہ وعدہ برحق ہے تورات، انجیل اور قرآن میں۔

موجودہ تورات اور انجیل میں اس وعدہ کی تصریح نہیں ہے، مفتی محمد عبدہ نے لکھا ہے اس وعدہ کی صحت موجودہ تورات اور انجیل پر نہیں ہے، کیونکہ تورات اور انجیل کا کافی حصہ ضائع ہوچکا ہے اور اس میں تحریفات بھی ہوچکی ہیں، بلکہ اس کے اثبات کے لیے قرآن مجید کی تصریح کافی ہے۔ (المنار ج ۱۱ص ۴۹، مطبوعہ دارالمعرفہ بیروت)

تاہم تورات کی بعض آیات میں اس عہد کی طرف اشارے ملتے ہیں:

اس لیے جو فرمان اور آئین اور احکام میں آج کے دن تجھ کو بتاتا ہوں تو ان کو ماننا اور ان پر عمل کرنا○ اور تمہارے ان حکموں کو سننے اور ماننے اور ان پر عمل کرنے کے سبب سے خداوند تیرا خدا بھی تیرے ساتھ اس عہد اور رحمت کو قائم رکھے گا، جن کی قسم اس نے تیرے باپ دادا سے کھائی○ اور تجھ سے محبت رکھے گا اور تجھ کو برکت دے گا اور بڑھائے گا، الخ۔

(تورات: استثناء باب: ۷، آیت ۱۳-۱۱، ص ۱۷۳، مطبوعہ بائبل سوسائٹی لاہور)

اسی طرح انجیل کی بعض آیات میں بھی اس عہد کی طرف اشارے ملتے ہیں:

اور جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوں یا باپ یا ماں یا بچوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سوگنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوگا○ (متی کی انجیل: باب: ۱۹، آیت: ۲۹، ص ۲۳، مطبوعہ بائبل سوسائٹی لاہور)

مبارک ہیں وہ جو راست بازی کے سبب ستائے گئے کیونکہ آسمان کی بادشاہت ان ہی کی ہے○

(متی کی انجیل: باب: ۵، آیت: ۱۰، ص ۷، مطبوعہ بائبل سوسائٹی لاہور)

قرآن مجید کی اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ جہاد کا حکم تمام شریعتوں میں موجود ہے اور ہرامت سے اس پر جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔

جنت کے بدلہ میں جان و مال کی بیع کی تاکیدات

اس کے بعد فرمایا: اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا اور کون ہے! آیت کے اس جز میں مجاہدین کو جہاد کی ترغیب دی ہے تاکہ وہ خوشی سے اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں کو خرچ کریں، پہلے اس نے یہ خبر دی کہ اس نے مومنین کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا ہے، اور جنت ان کی ملکیت ہوچکی ہے، پھر فرمایا: اس کا یہ وعدہ آسمانی کتابوں میں مذکور ہے، پھر تیسری بار فرمایا: اس سے بڑھ کر کون سچا وعدہ کرنے والا ہے، کیونکہ کریم کے اخلاق سے یہ ہے کہ وہ وعدہ کر

کے اس کو ضرور پورا کرتا ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی کریم نہیں ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو مزید خوش کرنے کے لیے فرمایا: پس تم اپنی اس بیع کے ساتھ خوش ہو جاؤ کیونکہ تم نے اس بیع سے ایسا نفع حاصل کیا ہے جو کسی شخص کے ساتھ بیع کر کے نہیں حاصل کر سکتے، پھر فرمایا: یہی بہت بڑی کامیابی ہے یعنی اللہ کا تمہارے ساتھ یہ بیع کرنا تمہاری بہت بڑی کامیابی ہے یا یہ جنت بہت بڑی کامیابی ہے۔

اس بیع کے بعد معصیت کا بہت سنگین ہونا

اس بیع کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی جانوں اور مالوں کو اللہ کے ہاتھ فروخت کر دیا، اللہ تعالیٰ کا اس کو بیع اور شراء قرار دینا بھی مجاز ہے اور اس کا بہت کرم اور احسان ہے کیونکہ ہماری جانوں اور ہمارے مالوں کا تو وہی مالک ہے اور جنت کا بھی وہی مالک ہے تو پھر حقیقت میں وہی مشتری ہے اور وہی بائع ہے، یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے ہماری جانوں اور ہمارے مالوں کو ہماری ملکیت قرار دیا پھر اس جان و مال کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا۔ بایں طور کہ ہم اس جان و مال کو اللہ کے احکام کے مطابق اور اس کی راہ میں خرچ کریں، اگر وہ ہماری جان و مال کو نہ خریدتا پھر بھی ہم کلیتًا اس کے مملوک تھے اور ہم پر لازم تھا کہ ہم اس کی اطاعت کرتے، اس کی راہ میں قتال اور جہاد کرتے اور نہ صرف جہاد بلکہ ہم زندگی میں ہر کام اس کے حکم کے مطابق کرتے اور پھر جب اس نے انتہائی کرم یہ کیا کہ اس نے ہماری جان و مال کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا تو اب کسی طور پر بھی یہ جائز نہیں کہ ہم اس کے حکم کے خلاف کوئی عمل کریں، اور اگر اس بیع کے بعد ہم اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل نہ کریں اور اس کی کھلی نافرمانی کریں تو کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نے اس بیع کو قبول نہیں کیا بلکہ ہم نے اس بیع کو عملاً مسترد کر دیا ہے!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (یہی لوگ ہیں) توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، روزے رکھنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے اور آپ ایمان والوں کو خوش خبری سنا دیں ○ (التوبہ: ۱۱۲)

التائبون کا معنی

توبہ کا معنی ہے: رجوع، اور تائب کا معنی ہے: جو معصیت کی حالت مذمومہ سے اطاعت کی حالت محمودہ کی طرف رجوع کرے۔ توبہ کے چار ارکان ہیں:

(۱) معصیت کے صدور سے نادم ہو اور معصیت کے صدور سے اس کا دل جل رہا ہو اور وہ اپنے آپ سے متنفر ہو۔

(۲) آئندہ اس معصیت کو نہ کرنے کا پختہ عزم کرے۔

(۳) اس معصیت کی تلافی اور تدارک کرے مثلاً جو نماز رہ گئی تھی اس کی قضا کرے، جس کی رقم دبالی تھی اس کو واپس کرے، جس کی غیبت کی تھی اس کے حق میں دعا کرے۔

(۴) ان تین کاموں کا محرک محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے حکم پر عمل کرنا ہو اور اگر اس کی غرض لوگوں کی مذمت کرنا ہو یا لوگوں کی تعریف اور تحسین حاصل کرنا ہو یا اور کوئی غرض ہو تو وہ التائبین میں سے نہیں ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر ابن آدم خطاکار ہے، اور خطاکاروں میں اچھے وہ ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۴۹۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۲۵۱، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۳ ص ۱۸۷، مسند احمد ج ۳ ص ۱۹۸، سنن دارمی رقم الحدیث: ۲۷۳۰، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۲۹۲۲، المستدرک ج ۴ ص ۲۴۴)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تک غرغرۂ موت کا وقت نہ آئے اللہ بندہ کی توبہ قبول فرماتا ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۵۴۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۲۵۳، مسند احمد ج ۲ ص ۱۵۳، ۱۳۲، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۵۶۰۹، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۲۸، حلیۃ الاولیاء ج ۵ ص ۱۹۰، المستدرک ج ۴ ص ۲۵۷، شعب الایمان رقم الحدیث: ۷۰۶۳، شرح السنہ رقم الحدیث: ۱۳۰۶، الکامل لابن عدی ج ۴ ص ۱۵۹۲)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی مثل ہے جس کا کوئی گناہ نہ ہو۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۲۵۰، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۱۰ ص ۱۵۴، حلیۃ الاولیاء ج ۴ ص ۲۱۰، کنز العمال رقم الحدیث: ۱۰۱۴۹، مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۲۰۰، الترغیب والترہیب ج ۴ ص ۹۷، اتحاف ج ۸ ص ۵۰۳، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۲۳۶۳)

العابدون کا معنی

عبادت کا معنی ہے غایت تذلل کا اظہار کرنا، جو لوگ اللہ کے سامنے انتہائی عجز اور ذلت کا اظہار کریں وہ عابدین ہیں۔ (المفردات ج ۲ ص ۴۱۵) جو لوگ اخلاص کے ساتھ اللہ وحدہ کے احکام پر عمل کریں اور اس عمل پر حریص ہوں وہ عابدین ہیں۔ (کشاف ج ۲ ص ۲۹۹) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جو لوگ اللہ کی عبادت کو اپنے اوپر واجب سمجھتے ہوں وہ عابدین ہیں۔ متکلمین نے کہا عبادت کا معنی ہے ایسا کام کرنا جس سے اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا اظہار ہو اور وہ انتہائی تعظیم ہو، سو ایسے کام کرنے والے عابدین ہیں۔ حسن بصری نے کہا عابدین وہ ہیں جو راحت اور تکلیف میں اللہ کی عبادت کریں۔ قتادہ نے کہا جو دن رات اللہ کی عبادت کریں وہ عابدین ہیں۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۵۳)

قرآن مجید میں ہے:

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ۔ (الحجر: ۹۹) اپنے رب کی عبادت کرتے رہئے حتیٰ کہ آپ کے پاس پیغام اجل آ جائے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں کی بہترین زندگی کا طریقہ یہ ہے کہ ایک شخص گھوڑے کی لگام پکڑ کر اللہ کی راہ میں نکل جائے، وہ اس کی پشت پر اڑا جا رہا ہو، جس طرف دشمن کی آہٹ یا خوف محسوس کرے اسی طرف گھوڑے کا رخ کر دے اور قتل یا موت کی تلاش میں نکل جائے، یا اس آدمی کی زندگی بہتر ہے جو چند بکریاں لے کر پہاڑ کی کسی چوٹی یا کسی وادی میں نکل جائے، وہاں نماز پڑھے، زکوٰۃ ادا کرے اور اللہ کی عبادت کرتا رہے حتیٰ کہ اس کو موت آ جائے اور لوگوں کے کسی معاملہ میں بھلائی کے سوا دخل نہ دے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۸۸۹، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۱۰۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۹۷۷)

قرآن مجید اور اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عابدین وہ ہیں جو تادم مرگ عبادت کرتے رہیں۔

الحامدون کا معنی

حمد کے معنی ہیں صفات کمالیہ کا اظہار اور حسن و خوبی کا بیان کرنا، اور اگر حمد نعمت کے مقابلہ میں کی جائے تو وہ شکر ہے اور شکر کا معنی ہے نعمت کی بنا پر منعم کی تعظیم کرنا، اور منعم نے جس مقصد کے لیے نعمت دی ہے اس مقصد میں اس نعمت کو صرف کرنا، پس حمادون وہ لوگ ہیں جو اللہ کی قضا پر راضی رہتے ہیں اور اس کی نعمت کو اس کی اطاعت میں خرچ کرتے ہیں

اور ہر حال میں اللہ کی حمد کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے:

حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ ہر ذی شان کام جس کی ابتداء الحمد للہ سے نہیں کی گئی وہ ناتمام رہتا ہے۔
(شعب الایمان رقم الحدیث: ۴۳۷۲)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: افضل الذکر لا الہ الا اللہ ہے، اور افضل الدعاء الحمد للہ ہے۔ (شعب الایمان رقم الحدیث: ۴۳۷۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے پہلے جنت میں ان لوگوں کو بلایا جائے گا جو راحت اور تکلیف میں اللہ کی حمد کرتے ہیں۔ (شعب الایمان رقم الحدیث: ۴۳۷۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرماتے تھے: اے اللہ! تو نے مجھے جو علم عطا کیا ہے اس سے مجھے نفع عطا فرما، اور مجھے نفع آور علم عطا فرما، اور میرے علم کو زیادہ فرما، ہر حال میں اللہ کی حمد ہے، اور اے میرے رب! میں دوزخ کے حال سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔ (شعب الایمان رقم الحدیث: ۴۳۷۶)

السائحون کا معنی

الساحۃ کا معنی ہے وسیع جگہ، ساحۃ الدار کا معنی ہے مکان کا صحن، السائح: مسلسل جاری رہنے والے پانی کو کہتے ہیں، سائح اور سیاح کا معنی ہے زمین میں سفر کرنے والا، السائحون (التوبہ: ۱۱۲) کا معنی ہے روزہ رکھنے والے۔ روزہ کی دو قسمیں ہیں: حقیقی اور حکمی۔ حقیقی روزہ یہ ہے کہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور عمل ازدواج کو ترک کر دیا جائے، اور حکمی روزہ یہ ہے کہ تمام اعضاء اللہ کی معصیت کو ترک کر دیں اور اس آیت میں السائحون سے یہی معنی مراد ہے۔ (المفردات ج ۱ ص ۳۲۴)

عبید بن عمیر کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے السائحون کے متعلق دریافت کیا گیا، آپ نے فرمایا: وہ روزہ دار ہیں۔

امام ابن جریر نے حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، سعید بن جبیر، مجاہد، حسن بصری، ضحاک اور عطا سے بھی اسی طرح روایت کیا ہے بلکہ حضرت ابن عباس سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی السیاحت کا ذکر آیا ہے اس سے مراد روزہ دار ہیں۔
(جامع البیان جز ۱۱ ص ۵۳۔۵۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! مجھے سیاحت کی اجازت دیجئے! آپ نے فرمایا: میری امت کی سیاحت اللہ عزوجل کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔
(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۴۸۶، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۷۷۶۰، مسند الشامیین رقم الحدیث: ۱۵۲۲، المستدرک ج ۲ ص ۷۳)

الراکعون الساجدون کا معنی

رکوع اور سجدہ سے مراد نمازوں کا قائم کرنا ہے، نماز کی اشکال میں قیام، قعود، رکوع اور سجود ہیں، یہاں پر باقی شکلوں میں سے صرف رکوع اور سجود کا ذکر فرمایا ہے، کیونکہ کھڑے ہونا اور بیٹھنا یہ وہ حالتیں ہیں جو نماز کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، انسان عادتاً اپنے معمولات میں کھڑا ہوتا ہے اور بیٹھتا ہے، اس کے برخلاف رکوع اور سجود کی حالت نماز کے ساتھ مخصوص ہے، لہٰذا جب رکوع اور سجدہ کا ذکر کیا جائے گا تو ذہن صرف نماز کی طرف منتقل ہوگا۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہاتھ باندھ کر کھڑے

ہونا اللہ عزوجل کی بارگاہ میں تواضع اور تذلل کا پہلا مرتبہ ہے اور تواضع اور تذلل کا متوسط درجہ رکوع میں ہے اور غایت تواضع اور تذلل سجدہ میں ہے، پس رکوع اور سجدہ کا بالخصوص اس لیے ذکر فرمایا ہے کہ یہ غایت عبودیت پر دلالت کرتے ہیں تاکہ اس پر تنبیہ ہو کہ نماز سے مقصود انتہائی خضوع اور تعظیم ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے وقت پر نماز پڑھی، پورا وضو کیا اور مکمل رکوع، سجود اور خشوع کیا تو وہ نماز سفید روشن صورت میں پیش ہوتی ہے اور کہتی ہے اللہ تیری حفاظت کرے، جس طرح تو نے میری حفاظت کی ہے۔

(المعجم الاوسط، رقم الحدیث: ۳۱۱۹، الترغیب والترہیب ج ۱ ص ۲۵۸، المغنی عن حمل الاسفار علی الاحیاء ج ۱ ص ۱۴۲)

معدان بن ابی طلحہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے پوچھا: مجھے ایسا عمل بتلایئے جس کو کرنے کے بعد میں جنت میں داخل ہو جاؤں، وہ خاموش رہے، جب دو تین بار یہ سوال کیا تو انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا، آپ نے فرمایا: تم بکثرت اللہ کے لیے سجدے کیا کرو کیونکہ جب تم اللہ کے لیے ایک سجدہ کرتے ہو تو اللہ اس کی وجہ سے تمہارا ایک درجہ بلند کرتا ہے اور تمہارا ایک گناہ مٹا دیتا ہے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۴۸۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۸۹، ۳۸۱، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۴۲۳، صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: ۳۱۶، مسند احمد ج ۲ ص ۵۱، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۲ ص ۴۵۸، شرح السنہ رقم الحدیث: ۳۸۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب سجدہ میں ہوتا ہے، سو تم (سجدہ میں) بکثرت دعا کیا کرو۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۴۸۲، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۸۷۵، سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۱۳۷)

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے عمداً نماز کو ترک کیا اس نے کفر کیا۔

(تلخیص الحبیر ج ۱ ص ۱۹۷، اتحاف السادۃ المتقین ج ۳ ص ۱۰، کنز العمال رقم الحدیث: ۵۰۰۸، الترغیب والترہیب ج ۱ ص ۳۸۲)

یہ حدیث اس پر محمول ہے جب کوئی شخص نماز کے ترک کو جائز سمجھے یا معمولی سمجھے یا اس کی فرضیت کا انکار کرے۔

الآمرون بالمعروف والناهون عن المنكر کا معنی

ابو العالیہ نے کہا کہ قرآن مجید میں جہاں بھی امر بالمعروف کا ذکر ہے، اس سے مراد اسلام کی طرف دعوت دینا ہے اور جہاں بھی نہی عن المنکر کا ذکر ہے اس سے مراد بتوں کی عبادت سے منع کرنا ہے۔ امام ابن جریر نے کہا: امر بالمعروف سے مراد ہر اس نیک کام کا حکم دینا ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے اور نہی عن المنکر سے مراد ہر اس برائی سے روکنا ہے جس سے اللہ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے۔ (جامع البیان جز ۱۱ ص ۵۵، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

طارق بن شہاب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کون سا جہاد افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: ظالم حاکم کے سامنے انصاف کا کلمہ کہنا۔

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۴۳۴۴، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۷۴، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۱۱، مسند احمد ج ۵ ص ۲۵۶، شعب الایمان رقم الحدیث: ۷۵۸۲۔ اس حدیث کی تمام سندیں صحیح ہیں)

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی کا خوف تمہیں اس حق

بات کو کہنے سے منع نہ کرے جس کا تمہیں علم ہو۔ امام بیہقی کی روایت میں ہے کیونکہ کوئی شخص تمہاری موت کو مقدم کر سکتا ہے نہ تمہیں رزق سے محروم کر سکتا ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۹۱، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۰۷، مسند احمد ج ۳ ص ۵، شعب الایمان رقم الحدیث: ۷۵۸۰)

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وآلہ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے تم ضرور نیکی کا حکم دیتے رہنا اور برائی سے روکتے رہنا ورنہ عنقریب تم پر عذاب بھیجا جائے گا، پھر تم دُعا کرو گے اور تمہاری دُعا قبول نہیں ہوگی۔

(شعب الایمان رقم الحدیث: ۷۵۵۸، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۱۰ ص ۹۳)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم نیکی کا اس وقت تک حکم نہ دیں جب تک اس پر عمل نہ کرلیں! اور کسی برائی سے نہ روکیں حتیٰ کہ تمام برائیوں سے اجتناب نہ کرلیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلکہ نیکی کا حکم دیتے رہو، خواہ تم اس نیکی پر عمل نہ کرو اور برائی سے منع کرتے رہو خواہ تم تمام برائیوں سے اجتناب نہ کرو۔

(المعجم الصغیر رقم الحدیث: ۹۸۱، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۶۶۲۴، شعب الایمان رقم الحدیث: ۷۵۷۰، حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کی سند میں دو راوی ضعیف ہیں، مجمع الزوائد ج ۲ ص ۲۷۷)

الحافظون لحدود اللہ کا معنی

اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جن احکام کا مکلف کیا ہے وہ بہت زیادہ ہیں، ان کو دو قسموں میں منضبط کیا جا سکتا ہے: عبادات اور معاملات۔ عبادات جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ اور معاملات جیسے خرید و فروخت، نکاح، طلاق وغیرہ اور جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے: قتل، زنا، چوری، ڈاکہ، شراب نوشی اور جھوٹ وغیرہ، یہ تمام امور اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں۔ جن چیزوں کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ان کو مکمل طریقہ سے ادا کرنا اور جن سے منع کیا ہے ان سے باز رہنا یہ اللہ تعالیٰ کی حدود کی حفاظت ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے آٹھ امور کو تفصیلاً بیان فرمایا اور نواں اور آخری امر یعنی حدود اللہ کی حفاظت ان سب امور کو جامع ہے۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حلال ظاہر ہے اور حرام ظاہر ہے اور ان کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں، جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے، پس جو شخص مشبہات سے بچا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کرلیا، اور جو شخص شبہات کا مرتکب ہوگیا اس کی مثال اس چرواہے کی طرح ہے جو شاہی چراگاہ کے گرد اپنے جانوروں کو چراتا ہے، قریب ہے کہ وہ جانور اس چراگاہ میں بھی منہ ماریں، سنو! ہر بادشاہ کی ایک مخصوص چراگاہ ہوتی ہے، اللہ کی مخصوص چراگاہ زمین پر اس کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں، سنو! جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ ٹھیک ہو تو پورا جسم ٹھیک ہوتا ہے اور جب وہ خراب ہو تو پورا جسم خراب ہوتا ہے۔ سنو وہ دل ہے!

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۲، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۵۹۹، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۳۳۲۹، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۲۰۵، سنن النسائی رقم الحدیث: ۴۴۵۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۹۸۴، مسند احمد ج ۴ ص ۲۶۹، سنن دارمی رقم الحدیث: ۲۵۳۴، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۷۲۱، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۲۲۸۵، حلیۃ الاولیاء ج ۴ ص ۲۷۰)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نبی اور ایمان والوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لیے استغفار کریں خواہ وہ ان کے قرابت دار ہوں، جب کہ ان پر یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ وہ (مشرکین) دوزخی ہیں ○ (التوبہ: ۱۱۳)

ابو طالب کا مرتے وقت کلمہ نہ پڑھنا

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے زندہ کافروں اور منافقوں سے ترک تعلق اور محبت نہ رکھنے کا حکم دیا تھا اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مردہ کافروں سے بھی اظہار براءت کرنے کا حکم دیا ہے' اس آیت کے شان نزول میں اختلاف ہے' صحیح یہ ہے کہ یہ آیت ابو طالب کے متعلق نازل ہوئی ہے جیسا کہ اس صحیح حدیث سے واضح ہوتا ہے:

سعید بن مسیب اپنے والد مسیب بن حزن سے روایت کرتے ہیں کہ جب ابو طالب پر موت کا وقت آیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لے گئے۔ اس وقت اس کے پاس ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ بھی تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے چچا لا الہ الا اللہ کہئے' میں اس کلمہ کی وجہ سے اللہ کے پاس آپ کی سفارش کروں گا' تو ابو جہل اور عبداللہ بن امیہ نے کہا اے ابو طالب! کیا تم عبدالمطلب کی ملت سے اعراض کرتے ہو؟ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تک مجھے منع نہ کیا جائے میں تمہارے لیے استغفار کرتا رہوں گا' تب یہ آیت نازل ہوئی ما کان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین۔ الآیہ۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ١٣٦٠' صحیح مسلم رقم الحدیث: ٢٤' سنن النسائی رقم الحدیث: ٢٠٣٥' مسند احمد ج ٥ ص ٤٣٣' اسباب النزول للواحدی رقم الحدیث: ٥٣٠' سیرت ابن اسحٰق ج ١ ص ٢٣٨-٢٣٧)

اس حدیث پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ابو طالب کی موت ہجرت سے تین سال پہلے ہوئی ہے اور سورۃ التوبہ ان سورتوں میں سے ہے جو مدینہ میں آخر میں نازل ہوئیں' امام واحدی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت سے استغفار کرتے رہے ہوں حتیٰ کہ مدینہ میں اس سورت کے نازل ہونے تک استغفار کرتے رہے ہوں' اور جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے استغفار ترک کر دیا۔ اس جواب کو اکثر اجلہ علماء نے پسند کیا ہے' امام رازی اور علامہ آلوسی اور علامہ ابو حفص دمشقی وغیرہم ان میں شامل ہیں۔ علامہ آلوسی نے ایک اور جواب یہ ذکر کیا ہے کہ سورہ توبہ کے مدنی ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس کی اکثر اور غالب آیات مدنی ہیں' اس لیے اگر یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی ہو تو وہ سورہ توبہ کے مدنی ہونے کے منافی نہیں ہے۔

اس حدیث میں تصریح ہے کہ ابو طالب نے تادم مرگ کلمہ نہیں پڑھا اور اسلام کو قبول نہیں کیا۔

ابو طالب کے ایمان کے متعلق ایک روایت کا جواب

امام ابن اسحٰق نے اپنی سند کے ساتھ حسب ذیل روایت بیان کی ہے' اس سے شیعہ ابو طالب کا ایمان ثابت کرتے ہیں:

از عباس بن عبداللہ بن معبد از بعض اہل خود از ابن اسحٰق' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کی بیماری کے ایام میں اس کے پاس گئے تو آپ نے فرمایا: اے چچا! لا الہ الا اللہ پڑھیے' میں اس کی وجہ سے قیامت کے دن آپ کی شفاعت کروں گا۔ ابو طالب نے کہا اے بھتیجے! اگر مجھے یہ خوف نہ ہو تا کہ میرے بعد تمہیں اور تمہارے اہل بیت کو یہ طعنہ دیا جائے گا کہ میں نے موت کی تکلیف سے گھبرا کر یہ کلمہ پڑھا ہے تو میں یہ کلمہ پڑھ لیتا اور میں صرف تمہاری خوشنودی کے لیے یہ کلمہ پڑھتا' جب ابو طالب کی طبیعت زیادہ بگڑی تو اس کے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھے گئے' عباس نے ان کا کلام سننے کے لیے اپنے کان ان کے ہونٹوں سے لگائے' پھر عباس نے اپنا سر اوپر اٹھا کر کہا یا رسول اللہ! بے شک اللہ کی قسم! اس نے وہ کلمہ پڑھ لیا ہے جس کا آپ نے ان سے سوال کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے نہیں سنا۔

(سیرت ابن اسحٰق ج ١ ص ٢٣٨' مطبوعہ دار الفکر)

یہ روایت صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر احادیث صحیحہ کے خلاف ہے، نیز یہ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ امام ابن اسحٰق نے اس کو ایک مجہول شخص سے روایت کیا ہے، ثانیاً جس وقت کی یہ روایت ہے اس وقت حضرت عباس اسلام نہیں لائے تھے، پھر ان کا یا رسول اللہ کہنا کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ ثالثاً یہ کہ اس روایت میں خود تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے نہیں سنا، رابعاً یہ روایت حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی صحیح روایت کے خلاف ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے۔ امام بیہقی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: اس روایت کی سند منقطع ہے اور حضرت عباس جو اس حدیث کے راوی ہیں اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے، اور مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ابوطالب کی عاقبت کے متعلق سوال کیا کہ آپ نے ابوطالب کو کیا نفع پہنچایا، وہ آپ کی موافقت کرتا تھا؟ آپ نے فرمایا ہاں! وہ ٹخنوں تک آگ میں ہے اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے آخری طبقہ میں ہوتا، اس حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۸۸۳، ۶۲۰۸، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۰۹) اور یہ ضعیف روایت اس صحیح حدیث سے تصادم کی قوت نہیں رکھتی۔ (دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۳۴۶)

سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا کے ایمان پر اعتراض کا جواب

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس آیت کے شان نزول میں امام واحدی متوفی ۴۶۸ھ نے اپنی سند کے ساتھ یہ حدیث روایت کی ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبرستان میں گئے، ہم بھی آپ کے ساتھ گئے۔ آپ نے ہمیں بیٹھنے کا حکم دیا، ہم بیٹھ گئے۔ پھر آپ چند قبروں سے گزر کر ایک قبر کے پاس گئے اور بڑی دیر تک مناجات کرتے رہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رونے لگے اور آپ کے رونے کی وجہ سے ہم بھی رونے لگے، پھر آپ ہماری طرف آئے، حضرت عمر بن الخطاب نے کہا: یا رسول اللہ! آپ کو کس چیز نے رلایا تھا، ہم بھی گھبرا کر رونے لگے تھے۔ پھر آپ ہمارے پاس آکر بیٹھ گئے اور فرمایا: میرے رونے کی وجہ سے تم گھبرا گئے تھے؟ ہم نے عرض کیا ہاں! یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: تم نے جس قبر کے پاس مجھے مناجات کرتے دیکھا تھا وہ (حضرت) آمنہ بنت وہب کی قبر تھی، میں نے اپنے رب سے ان کی (قبر کی) زیارت کی اجازت طلب کی تھی سو مجھے اس کی اجازت دی گئی، پھر میں نے ان کے لیے استغفار کی اجازت طلب کی تو مجھے اس کی اجازت نہیں دی اور یہ آیت نازل ہوئی: نبی اور ایمان والوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لیے استغفار کریں خواہ وہ ان کے قرابت دار ہوں الآیہ۔ (التوبہ: ۱۱۳) پس بیٹے کے دل میں اپنی ماں کی وجہ سے جو رقت ہوتی ہے وہ میرے دل میں اپنی ماں کی وجہ سے طاری ہوئی اس وجہ سے میں رونے لگا۔

(اسباب النزول للواحدی رقم الحدیث: ۵۳۲، المستدرک ج ۲ ص ۳۳۶)

اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آمنہ معاذ اللہ مشرکہ تھیں، اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کے شان نزول کے متعلق صحیح حدیث وہی ہے جس کو ہم نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے حوالے سے پہلے ذکر کیا ہے اور رہی یہ روایت تو اس کی سند ضعیف ہے، اس کی سند میں ابن جریج مدلس ہے اور ایوب بن ہانی ضعیف۔ امام ذہبی نے بھی اس پر تعقب کیا ہے اور کہا ہے کہ ایوب بن ہانی ضعیف ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی لکھا ہے کہ ابن معین نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

(تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۷۷)

حضرت سیدتنا آمنہ رضی اللہ عنہا کی قبر کی زیارت کرنے کے متعلق صحیح حدیث یہ ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی، پھر آپ روئے اور جو لوگ آپ کے گرد تھے وہ بھی روئے، پھر آپ نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی اجازت طلب کی تو میرے رب نے مجھے اجازت دے دی، پھر میں نے اپنی والدہ کے لیے استغفار کرنے کی اجازت طلب کی تو مجھے اجازت نہیں دی، پس تم قبروں کی زیارت کیا کرو، یہ تمہیں آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث:٩٧٦، سنن ابوداؤد رقم الحدیث:٣٢٣٤، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:١٥٧٢، صحیح ابن حبان رقم الحدیث:٣١٦٩، مسند احمد ج ٢ ص ٤٤١، مصنف ابن ابی شیبہ ج ٣ ص ٣٤٣، مطبوعہ کراچی، المستدرک ج ١ ص ٣٧٥)

اس صحیح حدیث میں آپ کو حضرت سیدہ آمنہ کی قبر پر کھڑے ہونے کی اجازت دی ہے، اگر حضرت آمنہ مشرکہ ہوتیں تو یہ اجازت نہ دی جاتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ولا تقم علی قبرہ۔ (التوبہ: ٨٤) آپ ان کی قبر پر کھڑے نہ ہوں، رہا یہ کہ آپ کو حضرت آمنہ کے لیے استغفار کی اجازت نہیں دی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر معصوم کے لیے استغفار کرنا موہم معصیت ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا تھا کہ آپ کی والدہ کے لیے استغفار کیا جائے جس کی وجہ سے لوگوں کو یہ وہم ہو کہ آپ کی والدہ نے غلط اور ناجائز کام کیے تھے جس کی وجہ سے آپ کے لیے مغفرت طلب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا کی توجیہات

ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ کافر زندہ ہوں یا مردہ، ان سے محبت اور دوستی نہیں رکھنی چاہیے اور نہ ان کے لیے مغفرت کی دعا کرنی چاہیے، حالانکہ حدیث صحیح میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے لیے دعائے مغفرت فرمائی:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ احد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سامنے کا نچلا دانت شہید ہو گیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چہرے سے خون کو پونچھتے ہوئے فرما رہے تھے: اے اللہ! میری قوم کی مغفرت فرما، کیونکہ وہ نہیں جانتے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:٦٩٢٩، مسند احمد ج ١ ص ٤٤١، مجمع الزوائد ج ١ ص ١١٧، الترغیب والترہیب ج ٣ ص ٤١٩، کنز العمال رقم الحدیث:٢٩٨٨٣)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ امام طبرانی نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ غزوۂ احد کے دن جب مشرکین چلے گئے تو خواتین مردوں کی معاونت کے لیے گئیں، ان میں حضرت سیدتنا فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں، انہوں نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپ سے لپٹ گئیں اور پانی سے آپ کے زخم دھونے لگیں، لیکن خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ جب انہوں نے یہ دیکھا تو انہوں نے چٹائی کا ایک ٹکڑا جلایا اور اس کی راکھ زخم پر رکھی تو خون رک گیا، اس حدیث کے آخر میں ہے اس دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس قوم پر اللہ کا بہت زیادہ غضب ہو گا جس نے اپنے نبی کا چہرہ خون سے رنگین کر دیا، پھر تھوڑی دیر بعد آپ نے فرمایا: اے اللہ! میری قوم کی مغفرت فرما کیونکہ یہ نہیں جانتے۔ (فتح الباری ج ٧ ص ٣٧٣)

حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! میری قوم کی مغفرت فرما کیونکہ وہ نہیں جانتے۔

(المعجم الکبیر رقم الحدیث:٥٦٩٤، حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کے تمام راوی صحیح ہیں، مجمع الزوائد ج ٦ ص ١١٧، مسند احمد ج ١ ص ٤٥٣، شیخ احمد محمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے، مسند احمد رقم الحدیث:٤٣٣١، مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ)

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود یہ دعا نہیں کی، بلکہ انبیاء سابقین میں سے ایک نبی (حضرت نوح علیہ السلام) کی دعا کی حکایت کی ہے، اس پر دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ گویا اس وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا، آپ انبیاء سابقین میں سے اس نبی کی حکایت کر رہے تھے جس کو اس کی قوم نے ضرب لگائی تھی، آپ اپنے چہرے سے خون پونچھتے ہوئے فرما رہے تھے: اے میرے رب! میری قوم کی مغفرت فرما کیونکہ یہ نہیں جانتے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٣٤٧٧، صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٧٩٢، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ٤٠٢٥، مسند احمد ج ١ ص ٤٣٢، مسند احمد رقم الحدیث: ٤١٠٧، مطبوعہ قاہرہ)

اس اعتراض کا دوسرا جواب یہ ہے کہ مردہ مشرکین کے لیے استغفار کرنا ممنوع ہے اور زندہ مشرکین کے لیے استغفار کرنا جائز ہے، کیونکہ ان کا ایمان لانا متوقع ہے، اس لیے ان کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لیے اور ان کی تالیف قلب کے لیے ان سے اچھے اور نیک کلمات اور دعائیہ الفاظ کہنا جائز ہے۔

زندہ کافروں کے لیے مغفرت اور ہدایت کی دعا کا جواز

علامہ قرطبی مالکی نے لکھا ہے کہ اگر انسان اپنے کافر ماں باپ کے لیے دعا کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اور جب تک وہ زندہ ہوں ان کے لیے استغفار کرتا رہے، البتہ جو شخص مر گیا تو اس کے اسلام لانے کی امید نہیں رہی سو اس کے لیے دعا نہیں کی جائے گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مسلمان اپنے مردوں کے لیے استغفار کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد انہوں نے اپنے مردوں کے لیے استغفار کرنا چھوڑ دیا اور ان کو زندہ مشرکین کے لیے استغفار کرنے سے نہیں منع کیا گیا حتی کہ وہ مر جائیں۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ١٣٤٧٤)

(الجامع لاحکام القرآن جز ٨ ص ١٩٢، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ١٤١٥ھ)

زندہ مشرکین کے لیے دعا کرنے کے جواز میں حسب ذیل احادیث ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ طفیل اور ان کے اصحاب نے آ کر کہا: یا رسول اللہ! دوس نے کفر کیا اور اسلام لانے سے انکار کیا، ان کے خلاف اللہ سے دعا کیجئے۔ پس کہا گیا اب دوس ہلاک ہو گئے، آپ نے فرمایا: اے اللہ! دوس کو ہدایت دے، اور ان کو (یہاں) لے آ۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ٢٥٢٤، صحیح البخاری رقم الحدیث: ٤٣٩٢، مسند احمد ج ٢ ص ٢٤٣، دلائل النبوۃ ج ١ ص ٧٩، الطبقات الکبریٰ ج ٤ ص ١، تہذیب تاریخ دمشق ج ٧ ص ٦٥، مسند حمیدی رقم الحدیث: ١٠٥٠)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے کہا: یا رسول اللہ! ثقیف کے تیروں نے ہمیں جلا ڈالا ہے، ان کے خلاف اللہ سے دعا کیجئے۔ آپ نے فرمایا: اے اللہ! ثقیف کو ہدایت دے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ٣٩٤٢، مصنف ابن ابی شیبہ ج ١٢ ص ٢٠١، مسند احمد ج ٣ ص ٣٤٣، الکامل لابن عدی ج ١ ص ٣١٢، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ٥٩٨٦، الطبقات الکبریٰ ج ٢ ص ١١٥، کنز العمال رقم الحدیث: ٣٤٠٠٧)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: اے اللہ! اسلام کو عزت دے ابو جہل بن ہشام سے یا عمر بن الخطاب سے، پھر اگلی صبح کو حضرت عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۶۸۳، مسند احمد ج ۲ ص ۹۵، الکامل لابن عدی ج ۷ ص ۲۴۸۷، شرح السنہ رقم الحدیث: ۳۸۸۵، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۶۰۴۵، المستدرک ج ۳ ص ۵۰۲، حلیۃ الاولیاء ج ۵ ص ۳۶۱، الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۱)

ان دلائل کی بناء پر اگر کسی غیر مسلم کو کسی موقع پر سلام کرنا پڑے یا اس کے سلام کا جواب دینا پڑے تو اس کے لیے طلب ہدایت کی نیت سے سلام کیا جا سکتا ہے یا سلام کا جواب دیا جا سکتا ہے، اس غیر مسلم کے دائیں بائیں جو فرشتے ہوتے ہیں ان فرشتوں کی نیت کر کے بھی اس کو سلام کیا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ابراہیم کا اپنے (عرفی) باپ کے لیے استغفار کرنا صرف اس وعدہ کی وجہ سے تھا جو اس نے ابراہیم سے کیا تھا، اور جب ان پر یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گئے، بے شک ابراہیم بہت نرم دل اور بہت بردبار تھے O (التوبہ: ۱۱۴)

آزر کے لیے حضرت ابراہیم کے استغفار کی توجیہ

جب مسلمانوں کو مشرک رشتہ داروں کے لیے دعائے مغفرت کرنے سے منع کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تو اپنے عرفی باپ آزر کے لیے استغفار کیا تھا، اللہ سبحانہ نے اس کا یہ جواب دیا کہ حضرت ابراہیم کا اپنے (عرفی) باپ آزر کے لیے استغفار کرنا محض اس کے اسلام لانے کے وعدہ کی وجہ سے تھا اور جب ان پر یہ منکشف ہو گیا کہ وہ ایمان لانے والا نہیں ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گئے اور ان پر یہ انکشاف اللہ تعالیٰ کے وحی فرمانے کی وجہ سے ہوا تھا یا آزر کی کفریہ موت کی وجہ سے ہوا تھا۔

امام ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے (عرفی) باپ کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہے حتیٰ کہ وہ مر گیا، جب وہ مر گیا تو پھر آپ نے اس کے لیے دعا نہیں کی۔

اوّاہ کا معنی

حضرت عبداللہ بن شداد بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اواہ کا کیا معنی ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ سے ڈرنے والا اور گڑگڑا کر دعا کرنے والا، اور حضرت ابن عباس نے فرمایا: اواہ کا معنی ہے بہت زیادہ توبہ کرنے والا، اور مجاہد نے کہا جو شخص تنہائی میں گناہ کرے اور پھر تنہائی میں اس گناہ سے توبہ کرے وہ اواہ ہے۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۸۹۷-۱۸۹۶ ملخصاً، مکہ مکرمہ، جامع البیان جز ۱۱ ص ۷۰، بیروت)

قیامت کے دن آزر کی شفاعت کی توجیہ

اس آیت میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے عرفی باپ آزر سے بیزار ہو گئے تھے، حالانکہ ایک حدیث میں ہے کہ وہ قیامت کے دن اس کے لیے شفاعت کریں گے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قیامت کے دن اپنے (عرفی) باپ آزر سے اس حال میں ملاقات ہو گی کہ آزر کا چہرہ سیاہ اور غبار آلود ہو گا، حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سے فرمائیں گے کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم میری نافرمانی نہ کرو، ان کے (عرفی) باپ کہیں گے میں آج تمہاری نافرمانی نہیں کروں گا، پھر حضرت ابراہیم عرض کریں گے اے میرے رب! تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تو حشر کے دن مجھے شرمندہ نہیں کرے گا اور اس سے بڑی کون سی شرمندگی ہو گی کہ میرا (عرفی) باپ (جنت سے) دور ہو۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں نے جنت کو کافروں پر حرام کر دیا ہے، پھر کہا جائے گا اے ابراہیم! دیکھیں آپ کے پیروں کے نیچے کیا ہے۔ آپ دیکھیں گے تو آزر (مسخ :

کر گندگی میں لتھڑا ہوا بجو ہو گا' پھر اس کو پیروں سے پکڑ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٣٣٥٠' سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ١١٣٧٥' المستدرک ج ٢ ص ٣٣٨' کنزالعمال رقم الحدیث: ٣٢٢٩٢' مشکوٰۃ رقم الحدیث: ٥٥٣٨)

اللہ تعالیٰ مشرکین کی مغفرت نہیں فرمائے گا' حضرت ابراہیم علیہ السلام اس اصول سے لاعلم نہیں تھے پھر انہوں نے آزر کی شفاعت کیوں کی' نیز اس آیت میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آزر سے بیزار ہو گئے تھے پھر قیامت کے دن انہوں نے آزر کی شفاعت کیوں کی۔ اس کے جواب میں علماء نے بہت بحث کی ہے لیکن کوئی شافی جواب نہیں بن سکا' اس اشکال کو دور کرنے کے لیے جو قریب ترین بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو علم تھا کہ مشرکین کی مغفرت نہیں ہو گی' اور ان کے لیے شفاعت کرنا جائز نہیں ہے' اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے جو کہا تھا اے میرے رب! تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا الخ' اس سے آزر کی شفاعت کرنا مقصود نہیں تھا' بلکہ اس سے آزر کے سامنے عذر پیش کرنا مقصود تھا' ان کا اللہ تعالیٰ سے یہ کلام محض صورتاً شفاعت تھا حقیقتاً شفاعت نہیں تھا' حقیقت میں آزر کے سامنے یہ عذر پیش کرنا تھا کہ میں نے تو تمہیں جنت میں داخل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا اور فرمایا: اللہ نے کافروں پر جنت حرام کر دی ہے۔ اس کا ایک جواب یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آزر کے لیے نجات کی دعا کرنے سے بیزار ہو گئے تھے اور اس حدیث میں جس دعا کا ذکر ہے وہ نجات کے لیے نہیں تھی بلکہ تخفیف عذاب کے لیے تھی لیکن اس پر یہ اعتراض ہو گا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا کہ میں نے جنت کافروں پر حرام کر دی ہے' اللہ تعالیٰ کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آزر کے لیے حصولِ جنت کی دعا کی تھی۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا

اور اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد اس کو گمراہ کر دے حتیٰ کہ ان کے لیے یہ بیان کر دے کہ

يَتَّقُوْنَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١١٥﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ

انہیں کس چیز سے بچنا چاہیے' بے شک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ○ بے شک آسمانوں اور زمینوں کی

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

سلطنت اللہ ہی کے لیے ہے' وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور اللہ کے سوا تمہارا

مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١١٦﴾ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ

کوئی مالک اور مددگار نہیں ہے ○ بے شک اللہ نے نبی پر فضل فرمایا اور ان مہاجرین اور

وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا

انصار پر جنہوں نے تنگی کے وقت میں نبی کی اتباع کی جب کہ اس کے بعد یہ قریب

كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّهُ بِهِمْ

تھا کہ ایک گروہ کے دل اپنی جگہ سے ہل جائیں پھر اس کے بعد اس نے ان کی توبہ قبول کی بے شک وہ ان پر

رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١١٧﴾ وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا حَتَّىٰ إِذَا

نہایت مہربان بہت رحم والا ہے ○ اور اس نے ان تین شخصوں کی توبہ (بھی) قبول فرمائی جن کا معاملہ مؤخر کر دیا گیا تھا،

ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ

حتیٰ کہ جب زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور خود ان کی جانیں بھی ان پر تنگ ہو گئیں

وَظَنُّوا أَن لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ

اور انہوں نے یہ یقین کر لیا کہ اللہ کے سوا ان کی کوئی جائے پناہ نہیں ہے، پھر ان کی توبہ قبول فرمائی

منزل ۲

لِيَتُوبُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١١٨﴾ ع

تاکہ وہ توبہ پر قائم رہیں بے شک اللہ بہت توبہ قبول فرمانے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ کر دے حتیٰ کہ ان کے لیے یہ بیان کر دے کہ انہیں کس چیز سے بچنا چاہیے، بے شک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ○ (التوبہ: ۱۱۵)

اشیاء میں اصل اباحت ہے

جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فوت شدہ مشرک قرابت داروں کے لیے مغفرت کی دعا کرنے سے منع فرما دیا تو انہوں نے یہ سوچا کہ اس ممانعت سے پہلے جو وہ ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہے تھے کیا اس پر ان سے مواخذہ ہو گا؟ اور جو مسلمان اس ممانعت سے پہلے فوت ہو گئے اور وہ اس طرح کی دعائیں کرتے رہے تھے آیا ان پر بھی گرفت ہو گی، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اللہ تعالیٰ جب کوئی حکم نازل کر دے اور پھر اس کے بعد اس کی خلاف ورزی کی جائے تو اللہ اس پر مواخذہ فرماتا ہے اور اس کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ اس حکم کے نازل کرنے سے پہلے کیے ہوئے کاموں پر مواخذہ فرمائے، اس سے معلوم ہوا کہ ممانعت سے پہلے مشرکین کے لیے دعائے مغفرت جائز تھی اور اس میں یہ دلیل ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ کر دے، اس کی کئی تفسیریں ہیں: (۱) اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کسی قوم کو جنت کا راستہ دکھانے کے بعد اس کو اس راستہ سے گمراہ کر دے۔ (۲) اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد اس پر گمراہی کا حکم لگا دے۔ (۳) اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد ان کے دلوں میں گمراہی پیدا کر دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت اللہ ہی کے لیے ہے، وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا

ہے' اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مالک اور مددگار نہیں ہے○ (التوبہ: ۱۱۶)

آیاتِ سابقہ سے ارتباط کی وجوہ

سابقہ آیات سے اس آیت کے ربط کی حسبِ ذیل وجوہات ہیں:

(۱) گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے زندہ اور مردہ کافروں سے برأت ظاہر کرنے کا حکم دیا ہے' ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو اس سے یہ خوف ہو کہ کافر انہیں کوئی نقصان پہنچائیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو تسلی دی کہ تمام آسمانوں اور زمینوں کا مالک اللہ ہے اور جب وہ تمہارا حامی اور ناصر ہے تو پھر تمہیں کسی سے ڈرنا نہیں چاہیے۔

(۲) جب مسلمان اپنے مشرک قرابت داروں سے لاتعلق ہو گئے تو ان کو احساسِ محرومی ہوا کہ اب وہ کس سے تعلق رکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ان سے محروم ہو گئے ہو تو کیا ہوا اللہ جو تمہارا مالک اور مددگار ہے' تم اس سے محبت اور تعلق رکھو۔

(۳) اللہ تعالیٰ جب تمام آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے تو اے مسلمانو! وہ تمہارا بھی مالک ہے اور تم اس کے مملوک اور بندے ہو' سو اس کے تمام احکام پر عمل کرنا اس کی بندگی کا تقاضا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک اللہ نے نبی پر فضل فرمایا اور ان مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے تنگی کے وقت میں نبی کی اتباع کی جبکہ اس کے بعد یہ قریب تھا کہ ایک گروہ کے دل اپنی جگہ سے ہل جائیں پھر اس کے بعد اس نے ان کی توبہ قبول کی بے شک وہ ان پر نہایت مہربان' بہت رحم والا ہے○ (التوبہ: ۱۱۷)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے توبہ کرنے اور اللہ تعالیٰ کے توبہ قبول فرمانے کی توجیہات

اس آیت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ نے نبی کی توبہ قبول فرمائی' اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب منافقین نے جھوٹے بہانے پیش کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے غزوۂ تبوک میں نہ جانے کی اجازت لی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ظاہر کا اعتبار کرتے ہوئے ان کو اجازت دے دی' اس کے متعلق اس سے پہلے یہ آیت آ چکی ہے:

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ۔ اللہ آپ کو معاف فرمائے آپ نے ان کو کیوں اجازت دے دی! (التوبہ: ۴۳)

اللہ تعالیٰ نے پہلے آپ سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ آپ ان کے ظاہر حال کا اعتبار نہ کریں اور ان کے پیش کردہ بہانوں کو مسترد کر دیں' اگر آپ کو پہلے منع فرمایا ہوتا اور پھر آپ اجازت دے دیتے تو پھر آپ کا یہ اجازت دینا مکروہِ تنزیہی یا ترکِ اولیٰ یا ترکِ افضل ہوتا' بلکہ صحیح یہی ہے کہ آپ کو ظاہر حال پر عمل کرنے اور باطن کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے کا حکم ہے۔

امام شافعی نے کتاب الام میں حضرت ام سلمہ کی روایت بیان کر کے یہ کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی ہے کہ وہ ظاہر پر حکم کرتے ہیں اور باطن کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں اور حافظ ابو طاہر نے ادارۃ الحکام میں یہ روایت ذکر کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کندی اور حضرمی کے درمیان فیصلہ فرمایا تو جس کے خلاف فیصلہ ہوا اس نے کہا آپ نے میرے خلاف فیصلہ کیا ہے حالانکہ حق میرا تھا' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ظاہر کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں اور باطن اللہ کے سپرد ہے۔ (تحفۃ الطالب بہ معرفۃ احادیث مختصر ابن الحاجب ص ۱۴۵' مطبوعہ دار ابن حزم بیروت' ۱۴۱۶ھ)

سو یہی کہا جائے گا کہ آپ نے اپنے اجتہاد سے ان کو اجازت دی تھی بالفرض اگر یہ اجتہادی خطا بھی ہو تب بھی آپ اس پر ایک اجر کے مستحق ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے اس نے نبی کی توبہ قبول فرمائی اس کا معنی آپ کے درجات کی بلندی

ہے، آپ اللہ کے حکم پر عمل کرنے کے لیے ہر روز توبہ اور استغفار کرتے تھے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: اللہ کی قسم! میں دن میں ستر مرتبہ سے زیادہ اللہ سے توبہ اور استغفار کرتا ہوں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۳۰۷، مسند احمد ج ۲ ص ۳۴۱، الکامل لابن عدی ج ۳ ص ۱۰۴۷، حلیۃ الاولیاء ج ۷ ص ۳۲۵)

حضرت اغر مزنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے دل پر غین (غفلت) طاری ہو جاتی ہے اور میں اللہ سے ایک دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔ امام نسائی کی روایت میں ہے: میں ہر دن سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔

(صحیح مسلم الدعوات: ۴۱ (۲۷۰۲) ۶۷۳۰، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۵۱۵، عمل الیوم واللیلۃ للنسائی رقم الحدیث: ۴۴۷، مسند احمد ج ۴ ص ۳۹۷، سنن بیہقی ج ۷ ص ۵۲)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! اللہ کی طرف توبہ کرو، کیونکہ میں ایک دن میں اس کی طرف سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں۔ امام نسائی کی روایت میں ہے: میں ایک دن میں سو مرتبہ سے زیادہ اس کی طرف توبہ کرتا ہوں۔

(صحیح مسلم، الدعوات: ۴۲، (۲۷۰۲) ۶۷۳۰، عمل الیوم واللیلۃ للنسائی رقم الحدیث: ۴۴۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۸۱۵، ۷۸۹۰۸۱)

قاضی عیاض نے کہا: غین سے مراد غفلت ہے، (یعنی لوگوں کو تبلیغ کرنے، کھانے پینے اور دیگر عوارضِ بشریہ لاحق ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف آپ کی توجہ نہ رہتی) اور آپ اس پر استغفار کرتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ کے دل پر طمانیت طاری ہو جاتی اور آپ اظہارِ عبودیت کے لیے استغفار کرتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ کے دل پر خشیت الٰہی کی کیفیت طاری ہوتی اور آپ استغفار کر کے اس کا شکر ادا کرتے۔

اس حدیث پر یہ اشکال ہے کہ استغفار معصیت کے وقوع کا تقاضا کرتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں، اس اشکال کے متعدد جوابات ہیں:

(۱) ابن بطال نے کہا کہ انبیاء علیہم السلام تمام مخلوق سے زیادہ عبادت میں کوشش کرتے ہیں لیکن پھر بھی وہ کما حقہ عبادت نہیں کر سکتے اور اس تقصیر پر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے ہیں۔

(۲) وہ کھانے پینے، وظیفہ زوجیت، نیند، راحت، لوگوں سے گفتگو، ان کی مصلحتوں میں غور و فکر، دشمنوں سے جنگ اور دیگر مباح کاموں میں مشغول ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ذکر، اس کی طرف رجوع اور مشاہدہ اور مراقبہ سے محجوب ہو جاتے ہیں اور اپنے بلند مقام کی وجہ سے اس کو ذنب خیال فرماتے ہیں اور اس پر استغفار فرماتے ہیں۔

(۳) وہ امت کی تعلیم کے لیے استغفار فرماتے ہیں یا امت کے گناہوں پر استغفار کرتے ہیں۔

یہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے توبہ اور استغفار کرنے کا معنی ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو آپ کی توبہ قبول فرمائی اس کا معنی ہے اس نے آپ پر فضل و کرم فرمایا اور آپ کے درجات اور مراتب میں ترقی فرمائی، ہم نے اپنے ترجمہ میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

مہاجرین اور انصار کی توبہ قبول کرنے کا محمل

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

انسان اپنی طویل زندگی میں سہو، تسامح اور لغزشوں سے خالی نہیں ہوتا، اور یہ امور صغائر کے باب سے ہوتے ہیں یا ترکِ افضل اور خلافِ اولیٰ سے، پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے اس سفر میں بہت تکلیفیں، مشقتیں اور سختیاں اٹھائیں تو اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ان کی یہ تکلیفیں اور سختیاں ان کی اس طویل زندگی کی تمام لغزشوں اور خلافِ اولیٰ کاموں کے لیے کفارہ بن گئیں اور یہ تکلیفیں ان کی اخلاص کے ساتھ توبہ کے قائم مقام ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ نے نبی کی توبہ قبول کی اور ان مہاجرین اور انصار کی جنہوں نے تنگی کے وقت میں نبی کی اتباع کی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس سفر میں ان پر بہت سختیاں اور صعوبتیں آئیں تھیں اور مسلمانوں کے دلوں میں وسوسے آتے رہتے تھے اور جب بھی کسی کے دل میں کوئی وسوسہ آتا تو وہ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتا اور اس وسوسہ کے ازالہ کے لیے اللہ سے گڑگڑا کر دعا کرتا تو ان کی کثرتِ توبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ بعید نہیں ہے کہ اس سفر میں مسلمانوں سے کچھ گناہ ہو گئے ہوں، لیکن اس سفر کی صعوبتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے وہ گناہ معاف فرما دیئے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ نے نبی کی توبہ قبول کی اور ان مہاجرین اور انصار کی جنہوں نے تنگی کے وقت میں نبی کی اتباع کی، ہرچند کہ ان مہاجرین اور انصار کے گناہ معاف کیے تھے لیکن ان کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر دین میں ان کے عظیم مرتبہ پر متنبہ کرنے کے لیے فرمایا کہ وہ اتنے عظیم درجہ پر فائز ہیں کہ قبولیت توبہ میں ان کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ذکر کیا گیا۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۶۲، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

غزوۂ تبوک کی تنگی اور سختی

اس آیت میں فرمایا ہے کہ مہاجرین اور انصار نے تنگی کے وقت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی، اس تنگی کے وقت سے مراد غزوۂ تبوک ہے، کیونکہ اس سفر میں مسلمانوں پر بہت سختیاں اور صعوبتیں آئی تھیں۔ حضرت جابر نے کہا: اس سفر میں سواری کے لیے بھی مشکلات تھیں، پانی کے لیے بھی اور زادِ راہ کے لیے بھی۔ سواری کی مشکلات یہ تھیں کہ حسن نے کہا: دس مسلمان ایک اونٹ پر باری باری سواری کرتے تھے، اور زادِ راہ کی یہ مشکلات تھیں کہ بعض اوقات مسلمانوں کی ایک جماعت باری باری کھجور کی ایک گٹھلی چوستی تھی، ان کے پاس سڑے ہوئے جَو تھے، وہ ناک پکڑ کر اس کا لقمہ کھاتے تھے اور پانی کی مشکلات یہ تھیں کہ حضرت عمر نے کہا: شدتِ پیاس کی وجہ سے ہم میں سے ایک شخص اپنے اونٹ کو ذبح کر کے اس کی اوجھڑی کو نچوڑ کر پیتا۔ (جامع البیان جز ۱۱ ص ۷۵، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۸۹۹-۱۸۹۸، ملخصًا)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر (غزوۂ تبوک) میں تھے، قوم کا زادِ راہ ختم ہو گیا حتیٰ کہ بعض مسلمانوں نے اپنی سواریوں کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا۔ حضرت عمر نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر آپ قوم کے باقی ماندہ زادِ راہ کو جمع کر لیں، پھر اللہ سے اس پر (برکت کی) دعا کریں۔ آپ نے ایسا ہی کیا، پھر کوئی گندم والا گندم لے کر آیا، اور کھجور والا کھجور لے کر آیا۔ مجاہد نے کہا: اور گٹھلی والا گٹھلی لے کر آیا۔ راوی کہتے ہیں میں نے مجاہد سے پوچھا: وہ گٹھلیوں کے ساتھ کیا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا: وہ گٹھلی چوس کو اوپر سے پانی پی لیا کرتے تھے۔ آپ نے دعا کی حتیٰ کہ قوم کے تمام زادِ راہ پر ہو گئے، اس وقت آپ نے فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، جو شخص بھی بغیر کسی شک کے ان شہادتوں کے ساتھ اللہ سے ملاقات کرے گا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔

(صحیح مسلم، الایمان: ۴۴ (۲۷) ۱۳۷، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۵ ص ۲۲۹، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۱۰۸۰، البدایہ والنہایہ ج ۳

ص ۶۰۳، طبع جدید دار الفکر)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ آپ ہمیں تنگی کے وقت کے لشکر کے متعلق کچھ بتایئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم سخت گرمیوں میں تبوک کی طرف گئے، ہم ایک ایسی جگہ ٹھہرے جہاں ہمیں سخت پیاس لگی، حتیٰ کہ ہم نے گمان کیا کہ ہماری گردنیں ٹوٹ جائیں گی، یہاں تک کہ ایک شخص دوسرے شخص کے پاس پانی طلب کرنے جاتا تو اس حال میں واپس آتا کہ اس کی گردن ڈھلکی ہوئی ہوتی، حتیٰ کہ ایک شخص اپنے اونٹ کو ذبح کر کے اس کی اوجھڑی کو نچوڑ کر پیتا، اور باقی ماندہ کو اپنے جگر پر ڈال لیتا، پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! آپ اللہ سے دعا کیجئے۔ آپ نے پوچھا: کیا تم یہ چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں! پس آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، ابھی آپ نے ہاتھ نیچے نہیں کیے تھے کہ آسمان سے پانی برسنے لگا، حتیٰ کہ تمام اہلِ لشکر نے اپنے برتن بھر لیے۔

(دلائل النبوۃ ج ۶ ص ۱۹۵۔ ۱۹۴، مسند البزار رقم الحدیث: ۱۸۴۱، مجمع الزوائد ج ۶ ص ۱۹۵۔ ۱۹۴، الطبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۷ ۱۲۔ ۱۲۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ)

اللہ تعالیٰ کا بار بار توبہ قبول فرمانا

اگر یہ کہا جائے کہ اس آیت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: اللہ نے نبی کی توبہ قبول کی اور مہاجرین اور انصار کی، اور اس آیت کے آخر میں پھر فرمایا...... پھر اس کے بعد اس نے ان کی توبہ قبول کی، اور یہ بظاہر تکرار معلوم ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے گناہ کا ذکر کیے بغیر ان کی توبہ قبول کرنے کا ذکر فرمایا، تاکہ ان کے دل خوش ہوں، پھر فرمایا: انہوں نے تنگی کے وقت میں نبی کی اتباع کی، اس کے بعد یہ قریب تھا کہ ایک گروہ کے دل اپنی جگہ سے ہل جائیں، یعنی غزوۂ تبوک کی سختیوں اور صعوبتوں کو دیکھ کر بعض مسلمان گھبرا گئے تھے اور ان کے دلوں میں وسوسے آنے لگے تھے، اور یہ وسوسہ گناہ کے قائم مقام تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے پھر ان کی توبہ قبول کرنے کا ذکر فرمایا، گویا پہلے گناہ کا ذکر کیے بغیر توبہ قبول کرنے کا ذکر فرمایا اور دوبارہ گناہ کا ذکر کر کے توبہ قبول کرنے کا ذکر فرمایا اور اس سے محض ان کی عظمت اور شان بیان کرنا مقصود ہے اور یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ بار بار توبہ قبول فرماتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے: ایک بندہ گناہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے اللہ! میرے گناہ بخش دے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندہ نے گناہ کیا اور وہ جانتا ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور گناہ پر گرفت کرتا ہے، وہ بندہ دوبارہ گناہ کرتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ اے میرے رب! میرے گناہ کو بخش دے، پس اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے گناہ کیا اور وہ جانتا ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور گناہ پر گرفت فرماتا ہے، وہ بندہ پھر تیسری بار گناہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے رب! میرے گناہ کو بخش دے۔ پس اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندہ نے گناہ کیا اور اس کو معلوم ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور گناہ پر گرفت فرماتا ہے، تو جو چاہے کر میں نے تجھ کو بخش دیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۵۰۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۷۵۸، مسند احمد ج ۲ ص ۴۹۲، اتحاف ج ۵ ص ۵۹)

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جب تک بندہ گناہ کر کے توبہ کرتا رہے گا اللہ تعالیٰ اس کو معاف کرتا رہے گا لیکن یہ واضح رہے کہ اس کی توبہ صحیحہ ہو بایں طور کہ وہ اپنے گناہ پر نادم ہو اور دوبارہ گناہ نہ کرنے کا عزم صمیم کرے اور اس گناہ کی تلافی

اور تدارک بھی کرے اور اگر توبہ کرتے وقت اس کی یہ نیت ہو کہ میں دوبارہ پھر یہ گناہ کروں گا تو یہ ایسی توبہ ہے کہ یہ توبہ بھی گناہ ہے اور اس توبہ سے بھی اس پر توبہ کرنا لازم ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی مثال ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو اور جو شخص گناہ سے استغفار کرے درآنحالیکہ وہ گناہ پر برقرار ہو وہ اس شخص کی طرح ہے جو اپنے رب سے مذاق کر رہا ہو۔ (شعب الایمان رقم الحدیث: ۷۱۷۸، الفردوس بماثور الخطاب رقم الحدیث: ۲۴۳۳)

ذوالنون نے کہا: گناہ کو جڑ سے اکھاڑے بغیر توبہ کرنا کذابین کی توبہ ہے۔ (شعب الایمان رقم الحدیث: ۷۱۷۷)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اس نے ان تین شخصوں کی توبہ (بھی) قبول فرمائی جن کا معاملہ موخر کر دیا گیا تھا، حتیٰ کہ جب زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور خود ان کی جانیں بھی ان پر تنگ ہوگئیں، اور انہوں نے یہ یقین کر لیا کہ اللہ کے سوا ان کی کوئی جائے پناہ نہیں ہے، پھر ان کی توبہ قبول فرمائی تاکہ وہ توبہ پر قائم رہیں، بے شک اللہ بہت توبہ قبول فرمانے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے○ (التوبہ: ۱۱۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، تبوک کے غازیوں اور تین مخلفین کی توبہ کا باہمی فرق

اس آیت کا عطف پچھلی آیت پر ہے اور اس کا معنی اس طرح ہے: اللہ نے نبی کی توبہ قبول فرمائی اور ان مہاجرین اور انصار کی جنہوں نے تنگی کے وقت میں نبی کی اتباع کی اور اس نے ان تین شخصوں کی توبہ (بھی) قبول فرمائی جن کا معاملہ موخر کر دیا گیا تھا، اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ ان کی توبہ کو نبی کی توبہ کے ساتھ ملا کر بیان کیا جائے تاکہ یہ ان کی تعظیم اور اجلال پر دلالت کرے اور اس عطف کا فائدہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توبہ قبول ہونے اور مہاجرین اور انصار کی توبہ اور ان تین کی توبہ قبول ہونے کا ایک حکم ہو اور معطوف اور معطوف علیہ میں تغایر ہوتا ہے اور وہ یہاں یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توبہ بغیر کسی گناہ کے محض اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ہے اور غزوۂ تبوک میں جانے والے مہاجرین اور انصار کی توبہ راستہ کی صعوبتوں کی وجہ سے وسوسوں کی بناء پر ہے اور ان تین کی توبہ بغیر عذر کے غزوۂ تبوک میں نہ جانے کی وجہ سے ہے۔ وہ تین صحابہ یہ ہیں: حضرت کعب بن مالک، حضرت ہلال بن امیہ اور حضرت مرارہ بن الربیع۔ ان کے غزوۂ تبوک میں نہ جانے اور توبہ کی تفصیل اس حدیث میں ہے:

حضرت کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع کی توبہ قبول ہونے کی تفصیل

حضرت کعب بن مالک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ جانے کا واقعہ بیان کیا، حضرت کعب بن مالک نے کہا: میں غزوۂ تبوک کے علاوہ کبھی کسی غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے نہیں رہا، البتہ میں غزوۂ بدر میں بھی پیچھے رہ گیا تھا اور غزوۂ بدر میں پیچھے رہ جانے والوں میں سے کسی پر بھی آپ نے عتاب نہیں کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان، قریش کے قافلہ کے ارادے سے روانہ ہوئے تھے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اور ان کے دشمنوں کے درمیان اچانک مقابلہ کرا دیا، اور جب ہم نے اسلام کا عہد کیا تھا اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس عقبہ کی شب میں بھی حاضر ہوا تھا، ہرچند کہ مسلمانوں میں شرکاء بدر کی وقعت بہت زیادہ ہے لیکن میں شب عقبہ کی حاضری کے بدلہ میں اور کوئی فضیلت پسند نہیں کرتا۔ میرا واقعہ یہ ہے کہ جب میں غزوۂ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہ گیا تھا، اس وقت میں جس قدر قوی اور خوش حال تھا اس سے پہلے کبھی اس قدر قوی اور خوشحال نہیں تھا، اس وقت جہاد کے لیے میرے پاس دو اونٹنیاں تھیں جو اس سے پہلے کبھی کسی جہاد کے وقت میرے پاس نہیں تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم سخت گرمی میں جہاد کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ دُور دراز سفر کے لیے صحرا میں کثیر دشمنوں سے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ نے مسلمانوں پر پورا معاملہ واضح کر دیا تھا تاکہ وہ دشمنوں سے جہاد کے لیے پوری تیاری کر لیں۔ آپ نے مسلمانوں کو اپنے ارادہ سے آگاہ کر دیا تھا' اس وقت مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور کسی رجسٹر میں مسلمانوں کی تعداد کا اندراج نہیں تھا۔ حضرت کعب نے کہا: بہت کم کوئی ایسا شخص ہو گا جو اس غزوہ سے غائب ہونے کا ارادہ کرے اور اس کا یہ گمان ہو کہ بغیر اللہ کی وحی نازل کرنے کے آپ سے اس کا معاملہ مخفی رہے گا۔ جب درختوں پر پھل آ گئے تھے اور ان کے سائے گھنے ہو گئے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوہ کا ارادہ کیا' میں اس وقت پھلوں اور درختوں میں مشغول تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان جہاد کی تیاری میں تھے' میں ہر صبح جہاد کی تیاری کا سوچتا اور واپس آ جاتا۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا اور سوچتا کہ میں جس وقت جانے کا ارادہ کروں گا جا سکوں گا' میں یہی سوچتا رہا حتیٰ کہ مسلمانوں نے سامانِ سفر باندھ لیا اور ایک صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو لے کر روانہ ہو گئے۔ میں نے ابھی تیاری نہیں کی تھی' میں صبح کو پھر گیا اور لوٹ آیا اور میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا' میں یونہی سوچ بچار میں رہا حتیٰ کہ مجاہدین آگے بڑھ گئے' اور میں یہی سوچتا رہا کہ میں روانہ ہو کر ان کے ساتھ جا ملوں گا' کاش میں ایسا کر لیتا' لیکن یہ چیز میرے مقدر میں نہیں تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا کہ میں جن لوگوں کے درمیان چلتا تھا یہ صرف وہی لوگ تھے جو نفاق سے متہم تھے یا وہ ضعیف لوگ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے جہاد سے معذور رکھا تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک پہنچنے سے پہلے میرا ذکر نہیں کیا' جس وقت آپ تبوک میں صحابہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے آپ نے فرمایا: کعب بن مالک کو کیا ہوا؟ بنو سلمہ کے ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! اس کو دو چادروں اور اپنے پہلوؤں کو دیکھنے نے روک لیا۔ حضرت معاذ بن جبل نے کہا: تم نے بُری بات کہی ہے! بخدا! یا رسول اللہ! ہم اس کے متعلق خیر کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے' ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ آپ نے ایک سفید پوش شخص کو ریگستان سے آتے ہوئے دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو ابو خیثمہ ہو جا" تو وہ ابو خیثمہ انصاری ہو گیا۔ یہ وہی شخص تھے جنہوں نے ایک صاع (چار کلو گرام) چھوارے صدقہ کیے تھے تو منافقین نے انہیں طعنہ دیا تھا۔

حضرت کعب بن مالک بیان کرتے ہیں کہ جب مجھے یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس آ رہے ہیں تو میری پریشانی پھر تازہ ہو گئی' میں جھوٹی باتیں بنانے کے لیے سوچنے لگا اور یہ سوچنے لگا کہ میں کل حضور کی ناراضگی سے کیسے بچوں گا' اور اپنے گھر کے اصحابِ رائے سے اس سلسلہ میں مشورہ لینے لگا' پھر جب مجھے یہ بتایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عنقریب تشریف لا رہے ہیں تو میرے ذہن سے وہ سب جھوٹے بہانے نکل گئے اور میں نے یہ جان لیا کہ میں کسی (جھوٹی) بات سے کبھی نجات نہیں پا سکوں گا' پھر میں نے سچ بولنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور آپ جب سفر سے آتے تھے تو پہلے مسجد میں جاتے تھے اور وہاں دو رکعت نماز پڑھتے تھے' پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ جب حضور معمول کے مطابق فارغ ہو گئے تو جو لوگ غزوۂ تبوک میں نہیں گئے تھے وہ آ آ کر عذر پیش کرنے لگے اور قسمیں کھانے لگے۔ یہ لوگ اسی سے زیادہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہری اعتبار سے ان کے عذر کو قبول کر لیا تھا' آپ نے ان سے بیعت لی اور ان کے لیے استغفار کیا' اور ان کے باطنی معاملہ کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا' حتیٰ کہ میں آیا۔ جب میں نے سلام کیا تو آپ مسکرائے جیسے کوئی ناراض شخص مسکراتا ہے۔ آپ نے فرمایا: آؤ! میں آ کر آپ کے سامنے بیٹھ گیا' آپ نے فرمایا: تمہارے نہ آنے کی کیا وجہ ہے؟ کیا تم نے سواری نہیں خریدی تھی؟ میں نے کہا: یا رسول اللہ! بخدا!

اگر میں آپ کے علاوہ کسی دنیادار کے پاس بیٹھا ہوتا تو مجھے معلوم ہے کہ میں کوئی عُذر پیش کر کے اس کی ناراضگی سے بچ جاتا، کیونکہ مجھے کلام پر قدرت عطا کی گئی ہے، لیکن بخدا مجھے معلوم ہے کہ اگر میں نے آج آپ سے کوئی جھوٹی بات کہہ دی حتیٰ کہ آپ اس سے راضی ہو بھی گئے تو عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو مجھ سے ناراض کر دے گا، اور اگر میں آپ سے سچی بات کہوں تو آپ مجھ سے ناراض ہوں گے اور بے شک مجھ کو سچ میں اللہ تعالیٰ سے حُسنِ عاقبت کی امید ہے، بخدا میرا کوئی عُذر نہیں تھا، اور جس وقت میں آپ کے پیچھے رہ گیا تھا تو مجھ سے زیادہ خوش حال کوئی نہیں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہرحال اس شخص نے سچ بولا ہے، تم یہاں سے اٹھ جاؤ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے متعلق کوئی فیصلہ کر دے۔ میں وہاں سے اٹھا اور بنو سلمہ کے لوگ بھی اٹھ کر میرے پاس آئے، انہوں نے مجھ سے کہا بخدا ہم کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اس سے پہلے تم نے کوئی گناہ کیا ہو، کیا تم سے یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس قسم کا عُذر پیش کرتے جس طرح دیگر نہ جانے والوں نے عُذر پیش کیے تھے، تمہارے گناہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تمہارے لیے استغفار کرنا کافی تھا، بخدا وہ مجھ کو مسلسل ملامت کرتے رہے حتیٰ کہ میں نے یہ ارادہ کیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دوبارہ جاؤں اور اپنے پہلے قول کی تکذیب کر دوں، پھر میں نے ان سے پوچھا: کیا کسی اور کو بھی میرے جیسا معاملہ پیش آیا ہے؟ انہوں نے کہا: دو اور شخصوں نے بھی تمہاری مثل کہا ہے، ان سے بھی حضور نے وہی فرمایا ہے جو تم سے فرمایا تھا۔ میں نے پوچھا: وہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا: وہ مرارہ بن ربیع عامری اور ہلال بن امیہ واقفی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے ان دو نیک شخصوں کا ذکر کیا جو غزوۂ بدر میں حاضر ہوئے تھے، وہ میرے لیے نمونہ (آئیڈیل) تھے، جب ان لوگوں نے ان دو صاحبوں کا ذکر کیا تو میں اپنے پہلے خیال پر قائم رہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہم تینوں سے گفتگو کرنے سے منع فرما دیا، جو آپ سے پیچھے رہ گئے تھے، پھر مسلمانوں نے ہم سے اجتناب کر لیا اور ہمارے لیے اجنبی ہو گئے، حتیٰ کہ زمین بھی میرے لیے اجنبی ہو گئی۔ یہ وہ زمین نہیں تھی جس کو میں پہلے پہچانتا تھا، ہم لوگوں کو اسی حال پر پچاس راتیں گزر گئیں، میرے دو ساتھی تو خانہ نشین ہو گئے تھے، وہ اپنے گھروں میں ہی پڑے روتے رہتے تھے، لیکن ان کی بہ نسبت میں جوان اور طاقتور تھا، میں باہر نکلتا تھا، نمازوں میں حاضر ہوتا تھا اور بازاروں میں گھومتا تھا، مجھ سے کوئی شخص بات نہیں کرتا تھا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتا اور نماز کے بعد جب آپ اپنی نشست پر بیٹھتے تو میں آپ کو سلام عرض کرتا۔ میں اپنے دل میں سوچتا کہ آیا حضور نے سلام کا جواب دینے کے لیے اپنے ہونٹ ہلائے ہیں یا نہیں، پھر میں آپ کے قریب نماز پڑھتا اور نظریں چرا کر آپ کو دیکھتا، سو جب میں نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو آپ میری طرف دیکھتے اور جب میں آپ کی طرف متوجہ ہوتا تو مجھ سے اعراض کرتے، حتیٰ کہ جب مسلمانوں کی بے رُخی زیادہ بڑھ گئی تو میں ایک روز اپنے عم زاد حضرت ابو قتادہ کے باغ کی دیوار پر چڑھ گیا، وہ مجھ کو لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب تھے۔ میں نے ان کو سلام کیا، بخدا انہوں نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا۔ میں نے ان سے کہا: ابو قتادہ! میں تم کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کیا تم کو علم ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہوں، وہ خاموش رہے۔ میں نے ان کو قسم دے کر سوال کیا، وہ پھر خاموش رہے۔ میں نے پھر ان کو قسم دی تو انہوں نے کہا: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ علم ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، میں نے دیوار پھاندی اور واپس آ گیا۔ ایک دن میں مدینہ کے بازار میں جا رہا تھا، تو اہلِ شام کا ایک شخص مدینہ میں غلہ بیچنے کے لیے آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کوئی ہے جو مجھے کعب بن مالک سے ملا دے۔ لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ وہ میرے پاس آیا اور اس نے مجھے غسان کے بادشاہ کا ایک خط دیا، میں چونکہ پڑھا لکھا تھا اس لیے میں نے اس کو پڑھا، اس میں لکھا تھا: ”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے صاحب نے تم پر

ظلم کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تم کو ذلت اور رُسوائی کی جگہ میں رہنے کے لیے پیدا نہیں کیا، تم ہمارے پاس آ جاؤ ہم تمہاری دلجوئی کریں گے۔" میں نے جب یہ خط پڑھا تو میں نے کہا یہ بھی میرے لیے ایک آزمائش ہے، میں نے اس خط کو تنور میں پھینک کر جلا دیا حتیٰ کہ جب پچاس میں سے چالیس دن گزر گئے اور وحی رکی رہی تو ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قاصد میرے پاس آیا، اس نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو یہ حکم دیتے ہیں کہ تم اپنی بیوی سے علیحدہ ہو جاؤ۔ میں نے پوچھا: آیا میں اس کو طلاق دے دوں یا کیا کروں؟ اس نے کہا: نہیں بلکہ تم اس سے علیحدہ ہو جاؤ، اور اس کے قریب نہ جاؤ۔ حضرت کعب نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ساتھیوں کو بھی یہی حکم بھیجا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا: تم اپنے میکہ چلی جاؤ اور وہیں رہو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ میرے متعلق کوئی حکم نازل فرمائے۔

حضرت کعب نے کہا: پھر حضرت ہلال بن امیہ کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس نے کہا: یا رسول اللہ! بے شک حضرت ہلال بن امیہ بہت بوڑھے ہیں اور ان کی خدمت کرنے والا کوئی نہیں ہے، کیا آپ اس کو ناپسند کرتے ہیں کہ میں ان کی خدمت کروں۔ آپ نے فرمایا: نہیں، لیکن وہ تم سے مقاربت نہ کرے۔ ان کی بیوی نے کہا: بخدا وہ تو کسی چیز کی طرف حرکت بھی نہیں کر سکتے، اور جب سے یہ معاملہ ہوا ہے بخدا وہ اس دن سے مسلسل روتے رہتے ہیں۔ مجھ سے میرے بعض گھر والوں نے کہا: تم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح اجازت لے لو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ہلال بن امیہ کی بیوی کو ان کی خدمت کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ میں نے کہا: میں اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت نہیں لوں گا، مجھے پتا نہیں کہ اگر میں نے اجازت طلب کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملہ میں کیا فرمائیں گے، اور میں ایک جوان شخص ہوں، پھر میں اسی حال پر دس راتیں ٹھہرا رہا۔ پھر جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے گفتگو کی ممانعت کی تھی، اس کو پچاس دن گزر چکے تھے۔ حضرت کعب کہتے ہیں کہ پچاس روز کے بعد ایک صبح کو میں اپنے گھر کی چھت پر صبح کی نماز پڑھ رہا تھا، پھر جس وقت میں اسی حال میں بیٹھا ہوا تھا، جس کا اللہ عزوجل نے ہمارے متعلق ذکر کیا ہے کہ مجھ پر میرا نفس تنگ ہو گیا اور زمین اپنی وُسعت کے باوجود مجھ پر تنگ ہو گئی، اچانک میں نے سلع پہاڑ کی چوٹی سے ایک چلانے والے کی آواز سنی، جو بلند آواز سے کہہ رہا تھا: اے کعب بن مالک! بشارت ہو (مبارک ہو) حضرت کعب نے کہا: میں اسی وقت سجدہ میں گر پڑا اور میں نے جان لیا کہ اب کشادگی ہو گئی، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھنے کے بعد لوگوں میں اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری توبہ قبول کر لی ہے، پھر لوگ آ کر ہم کو مبارک باد دیتے تھے، پھر میرے ان دو ساتھیوں کی طرف لوگ مبارک باد دینے کے لیے گئے اور ایک شخص گھوڑا دوڑاتا ہوا میری طرف روانہ ہوا اور قبیلہ اسلم کے ایک شخص نے پہاڑ پر چڑھ کر بلند آواز سے مجھے ندا کی، اور اس کی آواز گھوڑے سوار کے پہنچنے سے پہلے مجھ تک پہنچی۔ جب میرے پاس وہ شخص آیا جس کی بشارت کی آواز میں نے سنی تھی، میں نے اپنے کپڑے اتار کر اس شخص کو بشارت کی خوشی میں پہنا دیئے، بخدا اس وقت میرے پاس ان کپڑوں کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھی، اور میں نے کسی سے عاریتاً کپڑے لے کر پہنے، پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کے قصد سے روانہ ہوا، ادھر میری توبہ قبول ہونے پر فوج در فوج لوگ مجھ کو مبارک باد دینے کے لیے آ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تم کو اللہ تعالیٰ کا توبہ قبول کرنا مبارک ہو۔ جب میں مسجد میں داخل ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے اور آپ کے اردگرد صحابہ بیٹھے تھے۔ حضرت طلحہ بن عبید اللہ جلدی سے اٹھے اور مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارک باد دی۔ بخدا مہاجرین میں سے ان کے علاوہ اور کوئی نہیں اٹھا تھا۔ حضرت کعب طلحہ کو نہیں بھولتے تھے، حضرت کعب نے کہا: جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کو سلام کیا تو خوشی سے آپ کا چہرہ چمک رہا تھا اور آپ فرما رہے تھے: مبارک ہو، جب سے تم کو تمہاری ماں نے جنا ہے، اس سے زیادہ اچھا دن تمہارے لیے نہیں آیا۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ (قبولیت توبہ) آپ کی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں بلکہ یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوتے تھے تو آپ کا چہرہ اس طرح منور ہو جاتا تھا جیسے وہ چاند کا ٹکڑا ہو۔ حضرت کعب نے کہا: ہم اس علامت کو پہچانتے تھے۔ انہوں نے کہا: جب میں آپ کے سامنے بیٹھا تو میں نے کہا: یارسول اللہ! میں اپنی توبہ کی خوشی میں اپنے مال کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے لیے کچھ مال کو رکھ لو وہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ میں نے کہا: میں اپنے اس مال کو رکھ لیتا ہوں جو خیبر میں ہے اور میں نے کہا: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے مجھے صدق کی وجہ سے نجات دی ہے اور اب میری توبہ یہ ہے کہ میں اپنی باقی زندگی میں ہمیشہ سچ بولوں گا۔ انہوں نے کہا: بخدا! مجھے یہ معلوم نہیں کہ مسلمانوں میں سے کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے سچ بولنے کی وجہ سے اس طرح سزا میں مبتلا کیا ہو اور جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا ذکر کیا تھا اس وقت سے لے کر آج تک میں نے جھوٹ نہیں بولا، اور آئندہ کے لیے بھی مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے جھوٹ سے محفوظ رکھے گا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل کیں:

(ترجمہ:) بے شک اللہ تعالیٰ نے نبی کی توبہ قبول کی اور ان مہاجرین اور انصار کی جنہوں نے سختی کے وقت نبی کا ساتھ دیا اس کے بعد کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل اپنی جگہ سے ہل جائیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، بے شک وہ ان پر نہایت مہربان بے حد رحم فرمانے والا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کی بھی توبہ قبول فرمائی جن کا معاملہ موخر کیا گیا تھا، یہاں تک کہ جب زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں بھی ان پر تنگ ہو گئی تھیں اور ان کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ اللہ کے سوا ان کی کوئی جائے پناہ نہیں ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی، بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے، اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔ (التوبہ: ۱۱۹-۱۱۷)

حضرت کعب نے کہا: جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے ہدایتِ اسلام کی نعمت دی ہے اس وقت سے لے کر اللہ تعالیٰ نے میرے نزدیک مجھے اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں دی کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچ بولا کیونکہ میں نے آپ سے جھوٹ بولا ہوتا تو میں بھی اسی طرح ہلاک ہو جاتا جس طرح وہ لوگ ہلاک ہو گئے جنہوں نے جھوٹ بولا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے وحی نازل کی تو جتنی ان جھوٹوں کی مذمت فرمائی ہے کسی کی اتنی مذمت نہیں کی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب تم ان کی طرف لوٹ کر جاؤ گے تو وہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان (کی بداعمالیوں) سے اپنی توجہ ہٹائے رکھو، تو تم ان کی طرف التفات نہ کرو، بے شک وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ یہ ان کے کاموں کی سزا ہے، وہ تم کو راضی کرنے کے لیے قسمیں کھائیں گے، سو اگر تم ان سے راضی ہو (بھی) جاؤ تو بے شک اللہ نافرمانی کرنے والوں سے راضی نہیں ہو گا۔

حضرت کعب نے کہا: ہم لوگوں کا معاملہ ان لوگوں سے موخر کیا گیا تھا جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قسمیں کھائی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا عذر قبول کر لیا تھا، ان سے بیعت کر لی تھی اور ان کے لیے استغفار کیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے معاملہ کو موخر کر دیا تھا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کا فیصلہ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کی توبہ بھی قبول فرمائی جن کا معاملہ موخر کیا گیا تھا۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غزوۂ تبوک میں جو پیچھے رہ گئے تھے اس کا ذکر ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قسم کھانے والوں کی بہ نسبت ہمارے

معاملہ کو موخر کیا گیا تھا جنہوں نے قسمیں کھائیں اور آپ نے ان کے عذر کو قبول فرمالیا تھا۔

(صحیح مسلم، التوبہ: ۵۳، (۲۷۶۹) ۶۸۸۳، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۶۷۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۲۰۲، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۰۲، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۴۲۲، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۸۱۰، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۳۹۳، مسند احمد ج ۶ ص ۳۹۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۳۳۷۰، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۵ ص ۲۷۹-۲۷۳، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۱۹۷۴۴، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۴ ص ۵۴۵-۵۴۰، صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: ۲۴۴۲، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۴ ص ۱۸۱، شرح السنہ رقم الحدیث: ۱۶۷۶، المعجم الکبیر ج ۱۹ ص ۵۶-۵۳)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو، اور (ہمیشہ) سچوں کے ساتھ رہو ○

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ

اہل مدینہ اور اس کے گرد رہنے والے بدووں (اعراب) کے لیے یہ جائز نہ تھا

اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ

کہ وہ رسول اللہ کے ساتھ نہ جاتے اور نہ ان کے لیے یہ جائز تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان سے زیادہ اپنی جانوں کی

نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ

فکر کرتے، یہ حکم اس سبب سے ہے کہ انہیں جب بھی اللہ کی راہ میں کبھی پیاس لگے گی یا کوئی تھکاوٹ ہو گی یا

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا

بھوک لگے گی، اور وہ جب بھی کسی ایسی جگہ جائیں گے جس سے کفار غضب ناک ہوں، اور وہ

يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ

جب بھی دشمن سے مال غنیمت حاصل کریں گے تو ان کے لیے اس کے سبب سے نیک عمل لکھا جائے گا،

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً

بے شک اللہ نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا ○ اور وہ جب بھی اللہ کی راہ میں، کوئی چھوٹا یا

صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ

بڑا خرچ کرتے ہیں یا کسی مسافت کو طے کرتے ہیں تو ان کا وہ عمل لکھ دیا جاتا ہے

لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَمَا كَانَ

تاکہ اللہ ان کو ان کے عمل کی بہترین جزا عطا فرمائے ○ اور یہ تو نہیں ہو سکتا

الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ

کہ (اللہ تعالیٰ کی راہ میں) تمام مسلمان روانہ ہو جائیں، تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت

طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا

روانہ ہوتی تاکہ وہ لوگ دین کی سمجھ حاصل کرتے اور جب وہ اپنی قوم کی طرف لوٹتے تو ان کو

اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ ع

(اللہ کے عذاب سے) ڈراتے تاکہ وہ گناہوں سے بچتے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو، اور (ہمیشہ) سچوں کے ساتھ رہو ○ (التوبہ: ۱۱۹)

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ اس نے تین مسلمانوں کی توبہ قبول فرمائی، اور ان کی توبہ ان کے سچ بولنے کی وجہ سے قبول فرمائی تھی اس لیے اس آیت میں سچوں کے ساتھ رہنے کا ذکر فرمایا، نیز ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل نہیں کیا تھا اور آپ کے ساتھ غزوۂ تبوک میں نہیں گئے تھے، اس لیے اس آیت میں پہلے یہ حکم دیا ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ عزوجل اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نہ کرو۔

سچوں سے مراد سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ہیں، ضحاک نے کہا حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور ان کے اصحاب مراد ہیں، حسن بصری نے کہا اگر تم دنیا میں سچوں کے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو دنیا میں بے رغبتی رکھو اور دوسرے ادیان سے بچو۔

صدق کے متعلق احادیث

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدق کو لازم رکھو، کیونکہ صدق نیکی کی ہدایت دیتا ہے، اور نیکی جنت کی ہدایت دیتی ہے، ایک انسان ہمیشہ سچ بولتا رہتا ہے اور سچ کا قصد کرتا ہے حتیٰ کہ وہ اللہ کے نزدیک سچا لکھ دیا جاتا ہے، اور تم جھوٹ سے بچو اور جھوٹ گناہوں کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ دوزخ کی طرف لے جاتے ہیں، ایک بندہ ہمیشہ جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ کا قصد کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ اللہ کے نزدیک جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۰۹۴، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۶۰۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۹۸۹، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۹۷۱، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸ ص ۵۵۰، مسند احمد ج ۳ ص ۳۴۴، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۵۰۴۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۲۷۹، ۲۷۳، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۹۰۱۱، المعجم الصغیر رقم الحدیث: ۶۷۳، المستدرک ج ۲ ص ۵۰)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی بندہ جھوٹ

بولتا ہے تو اس کی بدبو کی وجہ سے فرشتہ ایک میل دور چلا جاتا ہے۔
(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۹۷۲، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۷۳۹۴، حلیۃ الاولیاء ج ۸ ص ۱۹۷، الکامل لابن عدی ج ۱ ص ۲۵)

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے خواب دیکھا کہ میرے پاس دو شخص آئے اور انہوں نے کہا آپ نے جس شخص کو دیکھا تھا کہ اس کا جبڑا چیرا جا رہا تھا یہ وہ شخص تھا جو جھوٹ بولتا تھا، پھر وہ جھوٹ اس سے نقل ہو کر دنیا میں پھیل جاتا تھا، اس کے ساتھ قیامت تک یہی کیا جاتا رہے گا۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۰۹۶، مطبوعہ دار ارقم بیروت)

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا وجہ ہے کہ میں تم کو جھوٹ پر اس طرح گرتے ہوئے دیکھتا ہوں جس طرح پروانے آگ پر گرتے ہیں۔ ہر جھوٹ لامحالہ لکھا جاتا ہے سوا اس کے کہ کوئی شخص جنگ میں جھوٹ بولے، کیونکہ جنگ ایک دھوکا ہے، یا کوئی شخص دو آدمیوں کے درمیان صلح کرانے کے لیے جھوٹ بولے، یا کوئی شخص اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لیے جھوٹ بولے۔
(شعب الایمان رقم الحدیث: ۴۷۹۸، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سنجیدگی سے جھوٹ بولنا جائز ہے نہ مذاق سے۔
(شعب الایمان رقم الحدیث: ۴۷۹۰)

علامہ شامی نے امام غزالی کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر کسی مسلمان کی جان یا اس کی امانت کو بچانا جھوٹ بولنے پر موقوف ہو تو جھوٹ بولنا واجب ہے، نیز اگر اس نے تنہائی میں کوئی بے حیائی کا کام کیا ہو تو اس کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے کیونکہ بے حیائی کا اظہار کرنا بھی بے حیائی ہے اور مبالغہ میں جھوٹ جائز ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا رہا ابوجہم وہ تو اپنے کندھے سے لاٹھی اتارتا ہی نہیں اور توریہ کرنے میں جھوٹ سے بچنے کی وسیع گنجائش ہے۔
(رد المحتار ج ۵ ص ۲۷۴، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں آپ پر ایمان لانا چاہتا ہوں مگر میں شراب نوشی، زنا کرنے، چوری کرنے اور جھوٹ بولنے سے محبت رکھتا ہوں، اور لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ ان چیزوں کو حرام کہتے ہیں اور مجھ میں ان تمام چیزوں کے ترک کرنے کی طاقت نہیں ہے، اگر آپ اس پر قناعت کرلیں کہ میں ان میں سے کسی ایک چیز کو ترک کردوں تو میں آپ پر ایمان لے آتا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم جھوٹ بولنا چھوڑ دو، اس نے اس کو قبول کر لیا اور مسلمان ہو گیا۔ جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گیا تو اس کو شراب پیش کی گئی، اس نے سوچا اگر میں نے شراب پی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے شراب پینے کے متعلق سوال کیا اور میں نے جھوٹ بولا تو عہد شکنی ہو گی اور اگر میں نے سچ بولا تو آپ مجھ پر حد قائم کردیں گے، پھر اس نے شراب کو ترک کردیا، پھر اس کو زنا کرنے کی پیشکش ہوئی، اس کے دل میں پھر یہی خیال آیا، اس نے پھر اس کو بھی ترک کردیا، اسی طرح چوری کا معاملہ ہوا، پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا آپ نے بہت اچھا کیا کہ مجھے جھوٹ بولنے سے روک دیا اور اس نے مجھ پر تمام گناہوں کے دروازے بند کردیئے اور پھر وہ تمام گناہوں سے تائب ہو گیا۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۶۸، اللباب ج ۱۰ ص ۲۳۵)

صدق کی عقلی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے شیطان کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ - (ص: ۸۳-۸۲)

تیری عزت کی قسم میں ضرور ان سب کو بہکا دوں گا ماسوا تیرے ان بندوں کے جو برگزیدہ ہیں۔

اگر شیطان صرف اتنا کہتا کہ میں تیرے سب بندوں کو گمراہ کردوں گا تو یہ جھوٹ ہوتا' اس نے جھوٹ سے بچنے کے لیے کہا ماسوا تیرے ان بندوں کے جو برگزیدہ ہیں تو غور کرنا چاہیے کہ جھوٹ اتنی بری چیز ہے کہ شیطان بھی اس سے احتراز کرتا ہے تو مسلمانوں کو اس سے کتنا زیادہ بچنا چاہیے۔ صدق کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ ایمان قول صادق ہے اور ایمان سب سے بڑی عبادت ہے' اور جھوٹ کی سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ کفر (یعنی خدا کے شریک ہیں) قول کاذب ہے اور کفر اور شرک سب سے بڑا گناہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اہل مدینہ اور اس کے ساتھ رہنے والے بدوؤں (اعراب) کے لیے یہ جائز نہ تھا کہ وہ رسول اللہ کے ساتھ نہ جاتے اور نہ ان کے لیے یہ جائز تھا کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان سے زیادہ اپنی جانوں کی فکر کرتے' یہ حکم اس لیے ہے کہ انہیں جب بھی اللہ کی راہ میں کبھی پیاس لگے گی یا کوئی تھکاوٹ ہوگی یا بھوک لگے گی' اور وہ جب بھی کسی ایسی جگہ جائیں گے جس سے کفار غضب ناک ہوں اور وہ جب بھی دشمن سے مال غنیمت حاصل کریں گے تو ان کے لیے اس سبب سے نیک عمل لکھا جائے گا' بے شک اللہ نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۝ (التوبہ: ۱۲۰)

لشکر اسلام کے ساتھ تمام مسلمانوں کے روانہ ہونے کے وجوب کی تحقیق

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ سچوں کے ساتھ رہو' اس کا تقاضا یہ تھا کہ تمام غزوات اور مشاہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنا واجب ہے' اسی حکم کی تاکید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑنے سے منع فرمادیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس آیت میں جن اعراب کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں: مزینہ' جہینہ' اشجع' اسلم اور غفار۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس آیت میں مدینہ کے گرد رہنے والے تمام اعراب مراد ہیں کیونکہ لفظ مَن عام ہے۔

بہرحال اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ جانے کی ممانعت کردی ہے' اور اب کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو دھوپ' گرمی' بھوک اور پیاس' سفر کی مشقت اور دشمن کے حملوں سے محفوظ اور مامون رکھنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سخت گرمی کے سفر میں بھوک' پیاس اور دشمن کے حملوں کی زد میں جاتا ہوا دیکھتا رہے گویا اس کی جان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان سے زیادہ قیمتی اور حفاظت کے قابل ہے۔

اس آیت کے ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص پر امیر لشکر کے ساتھ جہاد کے لیے جانا واجب ہو لیکن دیگر شرعی دلائل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص پر جہاد کے لیے روانہ ہونا واجب نہیں ہے کیونکہ بیماروں' کمزوروں اور عاجزوں پر جہاد کے لیے جانا واجب نہیں ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا - (البقرہ: ۲۸۶)

اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کرتا۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ - (الفتح: ۱۷)

اندھے پر کوئی حرج نہیں ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی گرفت ہے اور نہ بیمار سے کوئی مواخذہ ہوگا۔

نیز جب مسلمانوں کی تعداد کم تھی تو ہر شخص پر واجب تھا کہ وہ جہاد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جائے لیکن جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو یہ حکم اس آیت سے منسوخ ہو گیا:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً (التوبہ: ۱۲۲) اور یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تمام مسلمان (اللہ کی راہ میں) روانہ ہو جائیں۔

قتادہ نے کہا ہے کہ تمام مسلمانوں پر جہاد کے لیے نکلنے کا وجوب اس وقت تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفسہٖ جہاد کے لیے روانہ ہوں اور اس وقت بغیر عذر کے کسی کے لیے آپ کا ساتھ چھوڑنا جائز نہ تھا' اور ابن عطیہ نے یہ کہا کہ تمام مسلمانوں پر جہاد کے لیے روانہ ہونا اس وقت واجب تھا' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مسلمانوں کو روانہ ہونے کا حکم دیں' اور یہی قول صحیح ہے' کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیں اور بلائیں تو آپ کے حکم کی اطاعت کرنا اور آپ کے بلانے پر جانا واجب ہے اسی طرح بعد میں مسلمانوں کے حکمران جب مسلمانوں کو لشکر اسلام میں شامل ہونے کے لیے بلائیں تو ان کے حکم کی اطاعت کرنا اور ان کے بلانے پر جہاد کے لیے جانا واجب ہے۔

(تفسیر کبیر ج ٦ ص ١٦٩' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' اللباب ج ١٠ ص ٢٣٧-٢٣٦' بیروت' ١٤١٩ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور وہ جب بھی (اللہ کی راہ میں) کوئی چھوٹا یا بڑا خرچ کرتے ہیں یا کسی مسافت کو طے کرتے ہیں تو ان کا وہ عمل لکھ دیا جاتا ہے' تاکہ اللہ ان کو ان کے عمل کی بہترین جزا عطا فرمائے ○ (التوبہ: ١٢١)

اللہ کے نزدیک ہر چھوٹی اور بڑی نیکی مقبول ہے

یعنی اللہ کی راہ میں کوئی چھوٹی سی چیز بھی صدقہ کی جائے یا اللہ کی راہ میں تھوڑی سی مسافت بھی طے کی جائے تو اللہ اس کا اجر عطا فرماتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے پاک کمائی سے ایک کھجور کے برابر بھی صدقہ کیا اور اللہ صرف پاک چیز ہی کو قبول کرتا ہے' تو اللہ اس کو اپنے دائیں ہاتھ سے قبول فرماتا ہے' پھر اس کی پرورش کرتا رہتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی شخص اپنے بچھڑے کی پرورش کرتا ہے حتیٰ کہ وہ صدقہ پہاڑ جتنا ہو جاتا ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث:١٤١٠' صحیح مسلم رقم الحدیث:١٠١٤' مشکوٰۃ رقم الحدیث:١٨٨٨)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر روز جب سورج طلوع ہوتا ہے تو انسان کے ہر جوڑ کے اوپر ایک صدقہ واجب ہوتا ہے' انسان کسی شخص کو سواری میں سوار ہونے پر مدد کرے یا اس کا سامان سواری پر لاد دے تو یہ صدقہ ہے اور نیک بات کہنا صدقہ ہے اور نماز کی طرف ہر قدم چلنا صدقہ ہے' اور راستہ سے کوئی تکلیف دہ چیز ہٹانا صدقہ ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث:٢٩٨٩' صحیح مسلم رقم الحدیث:١٠٠٩' مشکوٰۃ رقم الحدیث:١٨٩٧)

اس آیت میں فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ نیک اعمال کی بہترین جزا عطا فرماتا ہے' نیک اعمال میں فرائض' واجبات' سنن' مستحبات سب شامل ہیں۔ بعض علماء نے کہا کہ ان میں مباح کام (مثلاً لذیذ کھانے کھانا' عمدہ لباس پہننا' بہترین مکان میں رہنا) شامل نہیں ہیں لیکن تحقیق یہ ہے کہ مباح کام بھی اچھی نیت کے ساتھ کیے جائیں تو ان پر بھی ثواب ملتا ہے اور اللہ کی نعمتوں کا اظہار کرنا یہ بھی اچھی نیت ہے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وہ نیک کاموں پر بہترین جزا عطا فرماتا ہے' بہترین جزا کا ذکر اس حدیث میں ہے:

حضرت خریم بن فاتک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ کی راہ میں

کوئی چیز خرچ کرتا ہے اس کے لیے وہ چیز سات سو گنا لکھی جاتی ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۱۶۲۵، سنن النسائی رقم الحدیث:۳۱۸۶، مصنف ابن ابی شیبہ ج۵ ص۳۱۸، مسند احمد ج۴ ص۳۴۵، صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۴۶۴۷، المعجم الکبیر رقم الحدیث:۴۱۵۳، المستدرک ج۲ ص۸۷)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یہ تو نہیں ہو سکتا کہ (اللہ کی راہ میں) تمام مسلمان روانہ ہو جائیں تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت روانہ ہوتی تاکہ وہ لوگ دین کی سمجھ حاصل کرتے اور جب وہ اپنی قوم کی طرف لوٹتے تو ان کو (اللہ کے عذاب سے) ڈراتے تاکہ وہ گناہوں سے بچتے○ (التوبہ: ۱۲۲)

تبلیغ اسلام کے لیے جہاد کا فرض کفایہ ہونا

اس آیت کے شان نزول کے متعلق دو روایتیں ہیں، پہلی روایت یہ ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی غزوہ کی طرف جاتے تھے تو آپ کے ساتھ نہ جانے والوں میں منافق ہوتے تھے یا معذور لوگ، اور جب اللہ سبحانہ نے غزوۂ تبوک میں آپ کے ساتھ نہ جانے والے منافقین کی سخت مذمت فرمائی تو مسلمانوں نے کہا اللہ کی قسم! آئندہ ہم کسی غزوہ سے پیچھے رہیں گے نہ کسی سریہ سے، پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے اور آپ نے کفار کی طرف لشکر بھیجے تو تمام مسلمان لڑنے کے لیے روانہ ہو گئے اور مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا رہ گئے، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس کا معنی یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ سب کے سب جہاد کے لیے روانہ ہو جائیں بلکہ ان پر واجب ہے کہ ان کی دو جماعتیں ہو جائیں: ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہے اور جو احکام نازل ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ارشادات فرمائیں ان کو محفوظ اور منضبط کرتے رہیں اور جب پہلی جماعت جہاد سے واپس آئے تو ان کو احکام سکھائیں اور دوسری جماعت جہاد کے لیے روانہ ہو جائے، احکام شرعیہ تدریجاً نازل ہو رہے تھے، اس لیے ان احکام کو حاصل کرنے کے لیے مدینہ میں آپ کے پاس رہنا بھی ضروری تھا، اور اسلام کی نشرو اشاعت اور تبلیغ دین کے لیے جہاد کرنا بھی ضروری تھا۔

(تفسیر کبیر ج۶ ص۱۷۰، مطبوعہ بیروت، ۱۴۱۵ھ، جامع البیان جز۱۱ ص۹۰، دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حصول علم دین کا فرض کفایہ ہونا

اس آیت کے شان نزول کے متعلق دوسری روایت یہ ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ عرب کے قبائل میں سے ہر قبیلہ سے مسلمانوں کی ایک جماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسائل دین اور احکام شرعیہ سیکھتی تھی، اور ان کو اپنے پیش آمدہ مسائل میں جس شرعی رہنمائی کی ضرورت ہوتی تھی آپ سے وہ رہنمائی حاصل کرتی تھی، پھر جب وہ قوم اپنے قبیلہ میں واپس جاتی تو وہ ان کو نماز، زکوٰۃ اور اسلام کے دیگر احکام کی تعلیم دیتی اور اسلام کی تبلیغ کرتی اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی اور یہ کہتی کہ جو اسلام لے آیا وہ ہم میں سے ہے حتیٰ کہ ایک شخص اپنے ماں باپ سے جدا ہو جاتا۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج۶ ص۱۹۱۱، رقم الحدیث:۱۰۱۲۲، مطبوعہ مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

یہ آیت طلب علم کے وجوب میں اصل ہے، اور یہ کہ کتاب اور سنت کا علم اور اس کی فقہ (سمجھ) حاصل کرنا فرض ہے اور یہ فرض عین نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں پر یہ واجب نہیں کیا کہ وہ علم دین کے حصول کے لیے سفر کریں بلکہ مسلمانوں کی ایک جماعت پر یہ فرض کیا ہے، اس لیے یہ فرض کفایہ ہے۔ طلب علم پر یہ آیت بھی دلالت کرتی ہے:

فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ۔ اگر تم کو علم نہ ہو تو علم والوں سے پوچھو۔

(النحل : ۴۳)

حصول علم دین کے فرض عین ہونے کا محمل

طلب علم کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم فرض عین ہے، اس کا سیکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے، مثلاً نماز ہر شخص پر فرض ہے تو نماز کے احکام اور مسائل کا سیکھنا ہر شخص پر فرض ہے، اسی طرح روزہ بھی ہر مسلمان پر فرض ہے تو اس کے مسائل کا علم حاصل کرنا بھی ہر شخص پر فرض ہے اور جو شخص مالدار ہو اس پر زکوٰۃ کے مسائل کا سیکھنا فرض ہے اور جو حج کے لیے روانہ ہو اس پر حج کے ارکان، فرائض، واجبات اور موانع کا علم حاصل کرنا فرض ہے اور جو شخص نکاح کرے اس پر لازم ہے کہ وہ نکاح، طلاق اور حقوق زوجین کے جملہ مسائل کا پہلے علم حاصل کرے اور اس کی فرضیت پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے اور نااہل کو علم سکھانا ایسا ہے جیسے خنزیروں کو جوہر، موتی اور سونے کے ہار ڈال دیئے جائیں۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۲۲۴، المعجم الکبیر رقم الحدیث:۱۰۴۳۹، تہذیب تاریخ دمشق ج۶ ص۲۷۸، حلیۃ الاولیاء ج۸ ص۳۲۳، تاریخ بغداد ج۱۰ ص۳۷۵، مشکوٰۃ رقم الحدیث:۲۱۸، المطالب العالیہ رقم الحدیث:۳۰۶۵، الترغیب والترہیب ج۱ ص۹۶، مجمع الزوائد ج۱ ص۱۱۹، کنز العمال رقم الحدیث:۲۸۶۵۱)

حصول علم دین کے فرض کفایہ ہونے کا محمل

طلب علم کی دوسری قسم فرض کفایہ ہے یعنی تمام احکام شرعیہ اور مسائل دینیہ کا ان کے دلائل کے ساتھ علم حاصل کرنا حتیٰ کہ جس کسی عام شخص کو زندگی میں جو بھی عملی یا اعتقادی مسئلہ درپیش ہو تو وہ عالم دین اس مسئلہ کا حل پیش کر سکے، اس میں عبادات، معاملات، حدود و تعزیرات، قصاص اور حدیث اور تفسیر کا علم شامل ہے۔ اس علم کا حامل رتبہ اجتہاد پر فائز ہوتا ہے اور اس اجتہاد سے مراد مسائل عصریہ میں اجتہاد ہے جیسے اس زمانہ میں ٹیلی فون پر نکاح، ریڈیو اور ٹیلی وژن پر رمضان اور عید، اور سحر اور افطار کا اعلان، خاندانی منصوبہ بندی، اسقاط حمل، ٹیسٹ ٹیوب بے بی، ریل اور ہوائی جہاز میں نماز، الکوحل آمیز دوائیاں، انتقال خون اور ایسے دیگر مسائل میں شرعی حکم بیان کرنا۔

اس آیت میں مسلمانوں کی ایک جماعت کو علم دین کے حصول کے لیے نکلنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے یہی علم مراد ہے اور جب یہ لوگ اس علم کو حاصل کر کے آئیں اور اپنے علاقہ کے لوگوں کو احکام شرعیہ بتائیں تو ان پر ان کے بتائے ہوئے احکام پر عمل کرنا فرض ہے اور یہی تقلید ہے کیونکہ ہر شخص اتنا وسیع علم حاصل نہیں کر سکتا جو تمام احکام شرعیہ اور پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے متکفل ہو اس لیے وہ ان مسائل میں علماء کی طرف رجوع کرے گا اور ان کی تقلید کرے گا۔

علم دین کے فضائل

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے جو شخص کسی راستہ پر علم کی تلاش میں نکلتا ہے اللہ اس کو جنت کے راستہ کی طرف لے جاتا ہے اور فرشتے طالب علم کی رضا کے لیے پر جھکاتے ہیں اور بے شک جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمینوں میں ہیں اور جو مچھلیاں پانی کی گہرائی میں ہیں، یہ سب عالم کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں، اور بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں اور بے شک انبیاء دینار اور درہم کے وارث نہیں بناتے، وہ صرف علم کے وارث بناتے ہیں، سو جس شخص نے علم کو حاصل کیا اس نے بہت بڑے حصہ کو حاصل کیا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۶۸۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۳۶۴۱، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۲۲۳، سنن الدارمی رقم الحدیث:۳۴۲، صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۸۸، مسند احمد ج ۵ ص ۱۹۶، مسند الشامیین رقم الحدیث:۱۲۳۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک فقیہ شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۶۸۱، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۲۲۲، المعجم الکبیر رقم الحدیث:۱۱۰۹۹، مسند الشامیین رقم الحدیث:۱۱۰۹، الکامل لابن عدی ج ۳ ص ۱۰۰۴، تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۲۴)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: اللہ جس شخص کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی فقہ (سمجھ) عطا فرماتا ہے، میں صرف تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ عطا فرماتا ہے، اور یہ امت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی اور کسی کی مخالفت ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گی حتیٰ کہ قیامت آجائے گی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۷۱، ۳۱۱۲، ۷۳۱۲، صحیح مسلم رقم الحدیث:۱۰۳۷، صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۸۹، مسند احمد ج ۴ ص ۱۰۱، المعجم الکبیر ج ۱۹ ص ۳۲۹، رقم الحدیث:۷۵۵، شرح السنہ ج ۱ ص ۲۸۴، رقم الحدیث:۱۳۱)

فقہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی

اس آیت میں ایک لفظ ہے لیتفقہوا فی الدین اور اس کا مادہ فقہ ہے، فقہ کے لغوی اور اصطلاحی معنی حسب ذیل ہیں:

علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ نے لکھا ہے فقہ کا لغوی معنی ہے علم حاضر سے علم غائب تک پہنچنا، اور اس کا اصطلاحی معنی ہے احکام شرعیہ کا علم، (المفردات ج ۲ ص ۴۹۶) میر سید شریف جرجانی متوفی ۸۱۶ھ نے لکھا ہے، فقہ کا لغوی معنی ہے متکلم کے کلام سے اس کی غرض کو سمجھنا، اور اس کا اصطلاحی معنی ہے: احکام شرعیہ عملیہ کا علم جو ان کے دلائل تفصیلیہ سے حاصل ہو، ایک قول یہ ہے کہ فقہ اس مخفی معنی پر واقف ہونے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ حکم متعلق ہے اور یہ وہ علم ہے جو رائے اور اجتہاد سے مستنبط ہوتا ہے، اس میں غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کو فقیہ نہیں کہا جاتا کیونکہ اس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ (التعریفات ص ۱۱۹ مطبوعہ بیروت) اور امام اعظم ابو حنیفہ سے یہ تعریف منقول ہے الفقہ معرفۃ النفس مالہا وماعلیہا (التوضیح مع التلویح ص ۲۲، مطبوعہ کراچی) ”نفس کا اپنے نفع اور نقصان کی چیزوں کو جان لینا۔“

تقلید شخصی پر دلائل

سورہ توبہ کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور یہ تو نہیں ہو سکتا کہ (اللہ کی راہ میں) تمام لوگ روانہ ہو جائیں تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت روانہ ہوتی تاکہ وہ لوگ دین کی سمجھ حاصل کرتے اور جب وہ اپنی قوم کی طرف لوٹتے تو ان کو (اللہ کے عذاب سے) ڈراتے تاکہ وہ گناہوں سے بچتے۔ (التوبہ: ۱۲۲)

اس آیت کی رو سے جب یہ لوگ واپس آکر اپنے علاقہ کے لوگوں کو احکام شرعیہ بتائیں تو ان کے علاقہ والے لوگوں پر ان کے بیان کیے ہوئے احکام پر عمل کرنا فرض ہے اور یہی تقلید ہے کہ عام آدمی جو دلائل شرعیہ کو نہیں جانتا اور قرآن اور حدیث سے براہ راست احکام حاصل نہیں کر سکتا وہ عالم دین کے بتائے ہوئے حکم شرعی پر عمل کرے اور اس کے لیے دلائل شرعیہ کو جاننا ضروری نہیں ہے۔

تقلید پر دوسری دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے: اگر تم کو علم نہ ہو تو علم والوں سے پوچھو۔ (النحل: ۴۳)

نیز حدیث شریف میں ہے:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا کو حیض آ گیا' انہوں نے اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا' آپ نے فرمایا: کیا یہ ہم کو (واپسی سے) روک لیں گی (انہوں نے طواف وداع نہیں کیا تھا) صحابہ نے بتایا کہ وہ طواف زیارت کر چکی ہیں' آپ نے فرمایا: پھر کوئی حرج نہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ١٧٥٧' مطبوعہ بیروت)

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ اہل مدینہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس عورت کے متعلق سوال کیا جو طواف زیارت کر چکی تھی پھر اس کو حیض آ گیا۔ (آیا وہ طواف وداع کیے بغیر اپنے وطن واپس جا سکتی ہے؟) حضرت ابن عباس نے فرمایا: ہاں وہ جا سکتی ہے۔ (حضرت زید بن ثابت یہ کہتے تھے کہ وہ طواف وداع کیے بغیر نہیں جا سکتی) انہوں نے کہا ہم آپ کے قول پر عمل کر کے حضرت زید کے قول کو نہیں چھوڑیں گے' حضرت ابن عباس نے فرمایا جب تم مدینہ جاؤ تو اس مسئلہ کو معلوم کر لینا' انہوں نے مدینہ پہنچ کر اس مسئلہ کو معلوم کیا' انہوں نے حضرت ام سلیم سے پوچھا' حضرت ام سلیم نے حضرت صفیہ کی حدیث (مذکور الصدر) بیان کی۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ١٧٥٨' مطبوعہ دار ارقم بیروت)

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ٨٥٢ھ نے سنن ابوداؤد طیالسی کے حوالے سے لکھا ہے کہ انصار نے کہا اے ابن عباس! جب آپ زید کی مخالفت کریں گے تو ہم آپ کی اتباع نہیں کریں گے' اور سنن نسائی کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب حضرت زید بن ثابت کو حضرت صفیہ کی حدیث کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے موقف سے رجوع کر لیا۔

(فتح الباری ج ٣ ص ٥٨٨' مطبوعہ لاہور' ١٤٠١ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ اہل مدینہ پیش آمدہ مسائل میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی تقلید کرتے تھے' اور حضرت زید بن ثابت کے قول کے خلاف جب حضرت ابن عباس نے فتویٰ دیا تو انہوں نے حضرت ابن عباس کے قول پر عمل نہیں کیا اور یہی تقلید شخصی ہے۔

امام غزالی متوفی ٥٠٥ھ مسئلہ تقلید پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عام آدمی کے لیے عالم دین کی تقلید پر دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہے کہ عام آدمی احکام شرعیہ کا مکلف ہے اور اگر ہر آدمی درجہ اجتہاد کا علم حاصل کرنے کا مکلف ہو تو زراعت' صنعت و حرفت اور تجارت بلکہ دنیا کے تمام کاروبار معطل ہو جائیں گے کیونکہ ہر شخص مجتہد بننے کے لیے دن رات علم کے حصول میں لگا رہے گا' اور نہ کسی کے لیے کچھ کھانے کو ہو گا نہ پہننے کو اور دنیا کا نظام برباد ہو جائے گا اور حرج عظیم واقع ہو گا اور یہ بداہتاً باطل ہے' اور یہ بطلان اس بات کے ماننے سے لازم آیا کہ عام آدمی درجہ اجتہاد کا مکلف ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ عام آدمی درجہ اجتہاد کا مکلف نہیں ہے اور عام آدمی پر مجتہدین کی تقلید لازم ہے۔ (المستصفیٰ ج ٢ ص ٣٨٩' مطبوعہ مصر)

امام غزالی کی اس تقریر سے یہ اور واضح ہو گیا کہ سورۂ توبہ: ١٢٢ میں اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین صرف ایک جماعت پر لازم کیا ہے اور تمام مسلمانوں پر تفقہ فی الدین حاصل کرنا لازم نہیں کیا ورنہ وہی حرج لازم آتا جس کا امام غزالی نے ذکر کیا ہے اور وہ جماعت مجتہدین کی جماعت ہے۔ تفقہ فی الدین میں وسعت اور گہرائی اور گیرائی حاصل کرنا ان کی ذمہ داری ہے' باقی تمام عام لوگوں پر صرف ان کی تقلید لازم ہے۔

شیخ احمد بن تیمیہ حنبلی متوفی ٧٢٨ھ لکھتے ہیں:

امام احمد بن حنبل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے اور یہ چیز تمام ائمہ

مسلمین کے درمیان اتفاقی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، اللہ اور اس کے رسول کے حلال کردہ کو حلال قرار دینا، اور اللہ اور اس کے رسول کے حرام کردہ کو حرام قرار دینا اور جس چیز کو اللہ اور اس کے رسول نے واجب قرار دیا ہے اس کو واجب ماننا تمام جن وانس پر واجب ہے، اور یہ ہر شخص پر ہر حال میں واجب ہے، ظاہر ہو یا باطن، لیکن چونکہ بہت سے احکام ایسے ہیں جن کو عام لوگ نہیں جانتے، اس وجہ سے عام لوگ ان احکام میں ان علماء کی طرف رجوع کرتے ہیں جو ان کو یہ احکام بتلا سکیں، کیونکہ علماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا زیادہ علم رکھتے ہیں، پس مسلمان جن ائمہ کی اتباع کرتے ہیں وہ عام لوگوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان وسیلہ، راستہ اور رہ نما ہیں۔ وہ عام لوگوں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پہنچاتے ہیں اور اپنے اجتہاد سے بقدر استطاعت احادیث کا مفہوم اور مراد بیان کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان علماء کو ایسا علم اور ایسا فہم عطا فرماتا ہے جو دوسروں کو نہیں دیتا اور بسا اوقات یہ علماء کسی مسئلہ کو اس طرح جانتے ہیں جس طرح دوسرے اس مسئلہ کو نہیں جانتے۔ (مجموع الفتاویٰ ج ۲۰ ص ۲۲۴۔ ۲۲۳، مطبوعہ سعودی عربیہ)

نیز شیخ ابن تیمیہ حنبلی لکھتے ہیں:

جس شخص نے کسی مذہب معین کا التزام کر لیا اور پھر بغیر کسی شرعی عذر یا بغیر کسی دلیل مرجح کے کسی اور عالم کے فتویٰ پر عمل کیا تو وہ شخص اپنی خواہش کا پیروکار ہے۔ وہ مجتہد ہے نہ مقلد اور وہ بغیر عذر شرعی کے حرام کام کا ارتکاب کر رہا ہے، اور یہ چیز لائق مذمت ہے۔ شیخ نجم الدین کے کلام کا یہی خلاصہ ہے۔ نیز امام احمد اور دیگر ائمہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ پہلے کوئی شخص کسی چیز کو حرام یا واجب اعتقاد کرے اور پھر اس کو غیر حرام یا غیر واجب اعتقاد کرے تو یہ اصلاً جائز نہیں ہے، مثلاً پہلے کوئی شخص پڑوس کی بناء پر شفعہ کا مطالبہ کرے (جیسا کہ حنفی مذہب میں ہے) اور جب اس پر پڑوس کی وجہ سے شفعہ ہو تو کہے یہ ثابت نہیں ہے (جیسا کہ شافعی مذہب میں ہے) اسی طرح نبیذ پینے، شطرنج کھیلنے، یا بھائی کے ساتھ دادا کی میراث کے تقسیم کرنے کے اختلافی مسائل میں کبھی ایک پہلو اختیار کرے اور کبھی محض اپنی خواہش سے دوسرا پہلو اختیار کرے، یہ شخص محض اپنی خواہش کا پیروکار ہے اور امام احمد اور دیگر ائمہ نے اس کو ناجائز قرار دیا ہے۔ (اور یہی تقلید شخصی ہے)

(مجموع الفتاویٰ ج ۲۰ ص ۲۲۱۔ ۲۲۰، مطبوعہ سعودی عربیہ)

مسائل فقہیہ میں ائمہ مجتہدین کے اختلاف کے اسباب

علامہ عبدالوہاب الشعرانی المتوفی ۹۷۳ھ لکھتے ہیں:

تمام ائمہ مجتہدین اپنے اصحاب کو اس پر برانگیختہ کرتے تھے کہ وہ کتاب اور سنت کے ظاہر پر عمل کریں اور وہ یہ کہتے تھے کہ جب تم ہمارے کلام کو ظاہر کتاب اور سنت کے خلاف دیکھو تو تم ظاہر کتاب اور سنت پر عمل کرو اور ہمارے کلام کو دیوار پر مار دو، ان کا یہ کہنا احتیاط پر مبنی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادب کا تقاضا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شریعت میں کسی چیز کا اضافہ کر دیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا ہو اور جس سے آپ راضی نہ ہوں۔

(میزان الشریعۃ الکبریٰ ج ۱ ص ۶۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ)

بعض فقہی مسائل میں ائمہ مجتہدین کا باہم اختلاف ہوتا ہے، اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اصول اجتہاد میں اختلاف ہوتا ہے اور اس اختلاف کے اور بھی اسباب ہیں، ہم ان میں سے بعض کا یہاں ذکر کر رہے ہیں:

(۱) بعض اوقات مجتہد کو وہ حدیث نہیں ملتی اور جس کو ایک حدیث نہیں پہنچی وہ اس کا مکلف نہیں ہے کہ وہ اس کے مقتضیٰ پر عمل کرے اور ایسی صورت میں وہ کسی ظاہر آیت پر عمل کرتا ہے یا کسی اور حدیث پر یا استصحاب حال کے موافق اجتہاد

کرتا ہے اور بعض اوقات اس کا یہ اجتہاد اس حدیث کے موافق ہوتا ہے یا مخالف؟ اور یہی سبب غالب ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث کا احاطہ امت کے کسی شخص نے نہیں کیا حتیٰ کہ خلفاء راشدین نے بھی اس کا احاطہ نہیں کیا تھا جو امت میں سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کی سنن کو جاننے والے تھے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل احادیث سے ظاہر ہوتا ہے:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں مدینہ میں انصار کی ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا، ہمارے پاس حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ خوف زدہ حالت میں آئے، ہم نے پوچھا کیا ہوا؟ انہوں نے کہا کہ حضرت عمر نے مجھے بلوایا تھا، میں ان کے دروازے پر گیا، میں نے ان کو تین مرتبہ سلام کیا، انہوں نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا تو میں لوٹ آیا۔ حضرت عمر نے پوچھا تم ہمارے پاس کیوں نہیں آئے تھے؟ میں نے کہا میں آیا تھا اور میں نے دروازہ پر کھڑے ہو کر تین مرتبہ سلام کیا، کسی نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا تو میں لوٹ آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جب تم میں سے کوئی شخص تین مرتبہ سلام کرے پھر اس کو اجازت نہ دی جائے تو وہ واپس چلا جائے۔ حضرت عمر نے کہا تم اس حدیث پر گواہ پیش کرو، ورنہ میں تم کو سزا دوں گا۔ حضرت ابی بن کعب نے کہا اس حدیث کی گواہی قوم کا سب سے کم عمر دے گا۔ حضرت ابوسعید نے کہا میں سب سے کم سن ہوں۔ انہوں نے کہا تم ان کے ساتھ جاؤ۔ دوسری روایت (مسلم: ۵۵۲۳) میں ہے حضرت ابوسعید نے کہا پھر میں گیا اور میں نے حضرت عمر کے سامنے گواہی دی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۲۴۵، صحیح مسلم، الادب: ۳۳ (۲۱۵۳) ۵۵۲۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۵۱۸۰)

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس چند زندیقوں کو لایا گیا۔ حضرت علی نے ان کو جلا ڈالا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے کہا اگر میں وہاں ہوتا تو ان کو نہ جلاتا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو شخص اپنا دین بدلے اس کو قتل کر دو۔ امام ابوداؤد کی روایت میں ہے جب حضرت علی تک حضرت ابن عباس کی حدیث پہنچی تو انہوں نے حضرت ابن عباس کی تعریف فرمائی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۹۲۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۳۵۱، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۴۵۸، سنن النسائی رقم الحدیث: ۴۰۷۰، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۵۳۵، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۵۶۰۶، مسند احمد ج ۱ ص ۲۸۲، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۲۵۳۲)

اور بہت احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد کبار صحابہ کو بعض احادیث کا علم نہیں تھا اور جب ان پر وہ احادیث پیش کی گئیں تو انہوں نے اس حدیث کی موافقت کی۔ اس کی ایک مثال اس مسئلہ میں گزر چکی ہے کہ طواف زیارت کے بعد اگر عورت کو حیض آ جائے تو وہ طواف وداع کے بغیر اپنے گھر کے لیے روانہ ہو سکتی ہے۔

(۲) دوسرا سبب یہ ہے کہ ایک حدیث کی دو سندیں ہوتی ہیں: ایک سند صحیح ہوتی ہے اور دوسری غیر صحیح۔ ایک مجتہد کے علم میں وہ حدیث سند غیر صحیح کے ساتھ ہوتی ہے اس لیے وہ اس کو ترک کر دیتا ہے اور دوسرے مجتہد کے علم میں وہ حدیث سند صحیح کے ساتھ ہوتی ہے اور وہ اس حدیث پر عمل کرتا ہے۔ اس کی مثال ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی حضرت علی سے منقول حدیث ہے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۷۵۴) امام ابوحنیفہ اور امام احمد نے اس پر عمل کیا ہے اور امام شافعی کے نزدیک یہ حدیث ضعیف ہے۔

(۳) حدیث کی ایک ہی سند ہوتی ہے لیکن ایک مجتہد کے نزدیک اس حدیث کے متن یا اس کی سند میں کلام ہوتا ہے اس

لیے وہ اس کو ترک کر دیتا ہے اور دوسرے مجتہد کے نزدیک اس میں کوئی کلام نہیں ہوتا اس لیے وہ اس حدیث پر عمل کرتا ہے۔ اس کی مثال حدیث مصراۃ (جس جانور کے تھنوں میں دودھ روک لیا جائے اس کو ایک صاع کھجور دے کر واپس کرنا) ہے، ائمہ ثلاثہ اس حدیث پر عمل کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ حدیث مضطرب اور معلل ہے اور صریح قرآن کے خلاف ہے اس لیے وہ اس حدیث پر عمل نہیں کرتے۔

(۴) ایک مجتہد کے نزدیک خبر واحد عموم قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے اور دوسرے کے نزدیک نہیں کر سکتی، مثلاً حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوگی۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۵۶، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۳۹۴) ائمہ ثلاثہ اس حدیث کے موافق یہ کہتے ہیں کہ نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ حدیث قرآن مجید کی اس آیت کے عموم کے خلاف ہے:

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ۔ (المزمل: ۲۰) سو قرآن سے جس قدر آسان لگے اتنا پڑھو۔

اس لیے امام ابو حنیفہ نے نماز میں سورہ فاتحہ کے پڑھنے کو اس آیت کے بموجب فرض نہیں کہا اور اس حدیث کے مقتضیٰ سے واجب کہا ہے۔

(۵) ایک مجتہد کے نزدیک وہ حدیث منسوخ ہے اور دوسرے کے نزدیک معمول ہے۔ اس کی مثال رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین کی حدیث ہے، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یہ حدیث معمول ہے اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ حدیث منسوخ ہے، کیونکہ اس حدیث کے راوی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما خود رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر کو تکبیر افتتاح کے علاوہ رفع یدین کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱ ص ۲۳۷، طبع کراچی، الحاوی فی بیان آثار الطحاوی ج ۱ ص ۵۳۴، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ)

ہم نے یہ چند مثالیں اس مسئلہ کو سمجھانے کے لیے ذکر کی ہیں، ورنہ ائمہ مجتہدین کے اصول ہائے اجتہاد کی تعداد بہت زیادہ ہے، اس کی بقدر کفایت مثالیں ہم نے تذکرۃ المحدثین میں ذکر کی ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ

اے ایمان والو! ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے قریب ہیں،

وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ ربع

اور چاہیے کہ وہ تمہارے دلوں میں سختی محسوس کریں، اور اچھی طرح یقین رکھو کہ اللہ متقین کے ساتھ ہے ○

وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ

اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس سورت نے تم میں سے

هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ

کس کے ایمان کو زیادہ کیا؟ سو جو ایمان والے ہیں ان کے ایمان کو تو اس سورت نے (درحقیقت) زیادہ ہی کیا ہے

يَسْتَبْشِرُونَ ﴿١٢٤﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَتْهُمْ

اور وہ خوش ہوتے ہیں ○ اور رہے وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے تو اس سورت نے ان کی

رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿١٢٥﴾ أَوَلَا يَرَوْنَ

(سابق) نجاست میں ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیا اور وہ حالت کفر میں ہی مر گئے ○ کیا وہ یہ نہیں دیکھتے

أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ

کہ ان کو ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈالا جاتا ہے پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے

وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿١٢٦﴾ وَإِذَا مَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ نَظَرَ بَعْضُهُمْ

اور نہ ہی نصیحت قبول کرتے ہیں ○ اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں

إِلَىٰ بَعْضٍ هَلْ يَرَاكُمْ مِنْ أَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوا ۚ صَرَفَ اللَّهُ

ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ تمہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا، پھر وہ پلٹ کر بھاگ جاتے ہیں اللہ نے ان کے دلوں کو

قُلُوبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿١٢٧﴾ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ

پلٹ دیا ہے کیونکہ یہ لوگ سمجھنے والے نہیں تھے ○ بے شک تمہارے پاس تم ہی میں سے

مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ

ایک عظیم رسول آگئے ہیں تمہارا مشقت میں پڑنا ان پر بہت شاق ہے، تمہاری فلاح پر وہ بہت حریص ہیں

بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿١٢٨﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ

مومنوں پر بہت شفیق اور نہایت مہربان ہیں ○ اب اگر یہ لوگ آپ سے منہ پھیرتے ہیں تو آپ کہہ دیں مجھے اللہ

اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿١٢٩﴾ ع ١٦ ٧ ٥

کافی ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں، میں نے اسی پر توکل کیا ہے اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے دلوں میں سختی محسوس کریں اور اچھی طرح یقین رکھو کہ اللہ متقین کے ساتھ ہے ○

(التوبہ: ١٢٣)

قریب کے کافروں سے جہاد کی ابتدا کرنے کی وجوہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ مومنین سے یہ فرمارہا ہے کہ جہاد کی ابتدا ان کافروں سے کرو جو تمہارے درجہ بدرجہ قریب ہیں نہ کہ ان سے جو تم سے درجہ بدرجہ بعید ہوں' اس آیت کے زمانہ نزول میں قریب سے مراد روم کے کافر ہیں کیونکہ وہ شام میں رہتے تھے اور شام عراق کی بہ نسبت قریب تھا اور جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے کئی شہر فتح کر دیئے تو ہر علاقہ کے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اپنے قریبی کافر ملکوں سے جہاد کی ابتداء کریں' اور اس کی متعدد وجوہ ہیں:

(١) بیک وقت تمام دنیا کے کافروں سے جہاد کرنا تو عادتاً ممکن نہیں اور جب قریب اور بعید دونوں کافر ہوں تو پھر قرب مرجح ہے۔

(٢) قرب اس لیے راجح ہے کہ اس میں جہاد کے لیے سواریوں' سفر خرچ اور آلات اور اسلحہ کی کم ضرورت پڑے گی۔

(٣) جب مسلمان قریبی کافروں کو چھوڑ کر بعید کے کافروں سے جہاد کے لیے جائیں گے تو عورتوں اور بچوں کو خطرہ میں چھوڑ جائیں گے۔

(٤) بعید کی بہ نسبت انسان قریب کے حالات سے زیادہ واقف ہوتا ہے' سو مسلمانوں کو اپنے قریبی ممالک کی فوج کی تعداد' ان کے اسلحہ کی مقدار اور ان کے دیگر احوال کی بہ نسبت بعید ممالک سے زیادہ واقفیت ہوگی۔

(٥) اللہ تعالیٰ نے اسلام کی تبلیغ بھی ابتداءً اقربین پر فرض کی تھی' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ -(الشعراء: ٢١٤) اور آپ اپنے زیادہ قریب رشتہ داروں کو ڈرائیے۔

اور غزوات اسی ترتیب سے واقع ہوئے' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اپنی قوم سے جہاد کیا پھر آپ شام کے غزوہ کی طرف منتقل ہوئے اور صحابہ جب شام کے جہاد سے فارغ ہوئے تو پھر عراق میں داخل ہوئے۔

(٦) جب کوئی کام زیادہ آسانی سے ہو سکتا ہو تو اس سے ابتداء کرنا واجب ہے اور بعید ملک کی بہ نسبت قریب ملک سے جہاد کرنا زیادہ آسان ہے' سو اس سے جہاد کی ابتداء کرنا واجب ہے۔

(٧) حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھا رہا تھا اور میں پیالہ کی ہر طرف سے گوشت کو لے رہا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے قریب کی جانب سے کھاؤ۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٥٣٧٤' صحیح مسلم رقم الحدیث: ٢٠٢٢' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ٣٢٦٧' مسند احمد ج ٤ ص ٢٧' ٢٦' مجمع الزوائد ج ٥ ص ٢٣' تہذیب تاریخ دمشق ج ٦ ص ٤٣٩' کنز العمال رقم الحدیث: ٤١٦٩٨)

سو جس طرح دسترخوان میں اپنے قریب سے کھانا چاہیے اسی طرح جہاد بھی اپنے قریب کے کافروں سے کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس سورت نے تم میں سے کس کے ایمان کو زیادہ کیا؟ سو جو ایمان والے ہیں ان کے ایمان کو تو اس سورت نے (درحقیقت) زیادہ ہی کیا ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں○ اور رہے وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے تو اس سورت نے ان کی (سابق) نجاست پر ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیا اور وہ حالت کفر میں ہی مر گئے○ (التوبہ: ١٢٥-١٢٤)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ منافقین کے برے کام بیان فرما رہا ہے اور ان برائیوں میں سے ایک برائی یہ ہے کہ جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ اس سورت نے تم میں سے کس کے ایمان کو زیادہ کیا اور اس سے ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو ایمان سے متنفر کریں' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کا مذاق اڑانے کے لیے ان سے

استہزاءً اس طرح کہتے ہوں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کسی سورت کے نازل ہونے سے مسلمانوں کو دو امر حاصل ہوتے ہیں: ایک تو یہ ہے کہ جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو مسلمان اس سورت پر ایمان لاتے ہیں، اس کی تلاوت کرتے ہیں اور اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں اور یہ امر ان کے ایمان میں اضافہ اور تقویت کا موجب ہوتا ہے اور ان کو اس سے خوشی حاصل ہوتی ہے کیونکہ اس سورت میں جو احکام مذکور ہیں ان پر عمل کر کے وہ اللہ تعالیٰ کی مزید خوشنودی اور اجر آخرت کے مستحق ہوں گے اور ان احکام پر عمل کرنے سے وہ دنیا میں بھی نصرت اور کامرانی حاصل کریں گے۔ پھر دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ کسی نئی سورت کے نازل ہونے سے منافقوں کو بھی دو امر حاصل ہوتے ہیں: ایک امر یہ ہے کہ ان کی سابق نجاست میں اضافہ ہوتا ہے، نجاست سے مراد ان کے عقائد باطلہ اور اخلاق مذمومہ ہیں، وہ پہلے بھی قرآن مجید کے وحی الٰہی ہونے کے منکر تھے اور جب یہ ایک اور سورت نازل ہوئی تو انہوں نے اس کا مزید انکار کیا اور یوں ان کے کفر میں اضافہ ہوا اور ان کے اخلاق مذمومہ میں سے حسد کرنے کا مرض تھا، اور جب نئی سورت نازل ہوتی تو ان کے حسد میں اور اضافہ ہوتا، اور دوسرا امر یہ ہے کہ ان کی موت کفر پر واقع ہوگی اور یہ حالت پہلی حالت سے زیادہ قبیح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کو ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈالا جاتا ہے پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے، اور نہ ہی نصیحت قبول کرتے ہیں ○ (التوبہ: ۱۲۶)

دنیا اور آخرت میں منافقین کے عذاب کی تفصیل

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ یہ منافقین کفر پر مریں گے اور اس سے یہ واضح ہو گیا کہ ان کو آخرت میں عذاب ہوگا اور اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ ان کو دنیا میں بھی ایک یا دو بار عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے۔

دنیا میں ان کو جو عذاب دیا جاتا ہے اس کی کئی تفسیریں کی گئی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ بیماری میں مبتلا ہوتے تھے اور پھر بھی اپنے نفاق سے توبہ نہیں کرتے تھے اور نہ اس مرض سے کوئی نصیحت حاصل کرتے تھے، جس طرح جب مومن بیمار پڑتا ہے تو وہ اپنے گناہوں کو یاد کرتا ہے اور اس کو یہ خیال آتا ہے کہ اس نے ایک دن اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے تو اس وقت اس کا ایمان اور اس کے دل میں اللہ کا خوف زیادہ ہوتا ہے اور اس وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی خوشنودی کا زیادہ امیدوار ہوتا ہے۔ مجاہد نے یہ کہا کہ ان کو ہر سال قحط اور بھوک میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ قتادہ نے کہا کہ ان کو ہر سال ایک یا دو بار جہاد کی آزمائش میں مبتلا کیا جاتا ہے کیونکہ اگر وہ جہاد میں نہ شریک ہوتے تو لوگ ان کو لعن طعن کرتے اور اگر وہ جہاد میں شریک ہوتے تو ان کو جہاد میں اپنے مارے جانے کا خوف ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ تمہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا، پھر وہ پلٹ کر بھاگ جاتے ہیں اللہ نے ان کے دلوں کو پلٹ دیا ہے کیونکہ یہ لوگ سمجھنے والے نہیں تھے ○ (التوبہ: ۱۲۷)

قرآن مجید سے منافقین کی نفرت اور بیزاری

اس سے پہلی آیتوں میں منافقین کے قبیح افعال بیان فرمائے تھے، اسی سلسلہ میں یہ آیت بھی ہے، اس میں یہ فرمایا ہے کہ جب وہ قرآن مجید کی کوئی سورت سنتے ہیں تو ان کو اس کے سننے سے کوفت اور اذیت ہوتی ہے اور ان کے چہروں پر نفرت اور کدورت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، پھر وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اشاروں سے یہ کہتے ہیں کہ تمہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا یعنی ان کے چہروں پر قرآن مجید سننے سے نفرت اور بیزاری کے جو آثار ظاہر ہو رہے ہیں ان کو کسی

نے جانچ تو نہیں لیا، یا قرآن مجید سننے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر قرآن مجید کا مذاق اڑانے کے لیے جو اشارے کیے اور استہزائیہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اس کو کسی نے دیکھ تو نہیں لیا یا قرآن مجید سننے سے ان کو جو اذیت اور تکلیف ہوتی تھی اس کی وجہ سے وہ چپکے سے مجلس سے نکل بھاگنے کا ارادہ کرتے تھے تو پھر یہ کہتے تھے کہ ان کو نکلتے ہوئے کوئی دیکھ تو نہیں رہا، یعنی اگر ان کو کوئی دیکھ نہ رہا ہو تو وہ چپکے سے نکل جائیں تاکہ قرآن مجید سننے سے ان کو جو کوفت اور اذیت پہنچی ہے وہ دور ہو جائے، اور جب ان کو یہ اطمینان ہو جاتا تو وہ مجلس سے نکل جاتے۔ اس آیت کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس مجلس ہی میں موجود رہتے تھے اور قرآن مجید پر اعتراض کرنے اور زبان طعن دراز کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ نے ان کے دلوں کو پلٹا دیا ہے کیونکہ یہ لوگ سمجھنے والے نہیں تھے، اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے خود ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے تو ان کی مذمت کیوں کی جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو ایمان لانے کے بہت مواقع دیئے گئے، معجزات دکھائے گئے اور دلائل پیش کیے گئے، لیکن انہوں نے ان تمام دلائل اور معجزات کا مذاق اڑایا اور ایسا بھاری کفر کیا کہ اس کی سزا میں ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک عظیم رسول آ گئے ہیں، تمہارا مشقت میں پڑنا ان پر بہت شاق ہے تمہاری فلاح پر وہ بہت حریص ہیں مومنوں پر بہت شفیق اور نہایت مہربان ہیں O (التوبہ: ۱۲۸)

سابقہ آیات سے ارتباط

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو سخت اور مشکل احکام کی تبلیغ کریں جن کا برداشت کرنا بہت دشوار تھا، ماسوا ان مسلمانوں کے جن کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی توفیق اور کرامت سے نوازا تھا، اور اس سورت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ایسی آیت نازل فرمائی جس سے ان مشکل احکام کا برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ رسول تمہاری جنس سے ہیں اور اس رسول کو دنیا میں جو عزت اور شرف حاصل ہو گا وہ تمہارے لیے باعث فضیلت ہے، نیز اس رسول کی یہ صفت ہے کہ جو چیز تمہارے لیے باعث ضرر ہو وہ ان پر سخت دشوار ہوتی ہے اور ان کی یہ خواہش ہے کہ دنیا اور آخرت کی تمام کامیابیاں تمہیں مل جائیں اور وہ تمہارے لیے ایک مشفق طبیب اور رحم دل باپ کے مرتبہ میں ہیں کیونکہ حاذق طبیب اور شفیق باپ کبھی اولاد کی بہتری کے لیے ان پر سختی کرتا ہے، سو اسی طرح یہ مشکل اور سخت احکام بھی تمہاری دنیا اور آخرت کی سعادتوں کے لیے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ صفات

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ صفات بیان فرمائی ہیں: (۱) من انفسکم (۲) عزیز علیہ ما عنتم (۳) حریص علیکم (۴) رءوف (۵) رحیم۔

من انفسکم کی دو قرأتیں ہیں: من انفُسکم "ف" پر پیش کے ساتھ، اس کا معنی ہے تمہارے نفسوں میں سے یعنی تمہاری جنس اور تمہاری نوع میں سے اور من انفَسکم "ف" پر زبر کے ساتھ، اس کا معنی ہے وہ تم میں سب سے زیادہ نفیس ہیں۔

من انفُسکم کا معنی

امام فخرالدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اس سے مراد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری مثل بشر ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ۔ (یونس: ۲) کیا لوگوں کو اس پر تعجب ہے کہ ہم نے ان میں سے ایک مرد پر وحی نازل کی۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ۔ (الکھف: ۱۱۰) آپ کہئے کہ میں محض تمہاری مثل بشر ہوں، مجھ پر یہ وحی کی جاتی ہے کہ میرا اور تمہارا معبود واحد ہے۔

اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرشتوں کی جنس سے ہوتے تو لوگوں پر آپ کی اتباع کرنا بہت دشوار ہو جاتا جیسا کہ سورۃ الانعام میں اس کی تقریر گزر چکی ہے:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ○ (الانعام: ۹) اور اگر ہم اس رسول کو فرشتہ بناتے تو اس کو مرد ہی (کی صورت میں) بناتے اور ان پر وہی شبہ ڈال دیتے جس شبہ میں وہ اب مبتلا ہیں۔

۱ (تفسیر کبیر ج ۵ ص ۱۷۸، البحر المحیط ج ۵ ص ۵۳۲، عنایت القاضی ج ۴ ص ۶۶۵، اللباب فی علوم الکتاب ج ۱۰ ص ۲۴۷)

من انفسکم (تمہاری جنس سے رسول آیا) کا دوسرا محمل یہ ہے کہ تمہارے پاس ایسا رسول آیا جو تمہاری قوم سے تھا، تمہاری زبان بولتا تھا اور تم اس کے حسب اور نسب کو پہچانتے تھے:

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے دربار میں کہا: اے بادشاہ! ہم جاہل لوگ تھے، بتوں کی عبادت کرتے تھے اور مردار کھاتے تھے، بے حیائی کے کام کرتے تھے، رشتے منقطع کرتے تھے، پڑوسیوں سے بدسلوکی کرتے تھے، ہمارا قوی، ضعیف کا مال کھا جاتا تھا، ہم اسی حالت میں تھے کہ اللہ نے ہماری طرف ایک رسول بھیج دیا جس کے نسب، اس کے صدق، اس کی امانت اور اس کی پاک دامنی کو ہم پہچانتے تھے، اس نے ہم کو دعوت دی کہ ہم اللہ وحدہ کو مانیں اور اسی کی عبادت کریں اور ہم اور ہمارے باپ دادا جن پتھروں اور بتوں کی عبادت کرتے تھے ان کو ترک کر دیں اور ہم کو سچ بولنے، امانت داری اور پاکیزگی اور رشتہ داروں سے نیک سلوک کرنے، پڑوسیوں سے حسن معاملہ کرنے، حرام کاموں اور خوں ریزی کرنے کو ترک کرنے کا حکم دیا اور ہم کو بے حیائی کے کاموں، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورت پر بدچلنی کی تہمت لگانے سے منع کیا اور ہم کو حکم دیا کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں اور ہم کو نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا پھر ہم نے ان کی تصدیق کی اور ان پر ایمان لے آئے، الحدیث۔

(مسند احمد ج ۱ ص ۲۰۲، شیخ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے، مسند احمد ج ۲ رقم الحدیث: ۱۷۴۰، مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ، الروض الانف ج ۲ ص ۱۱۱، المعجم الکبیر ج ۲۵ ص ۲۹، مجمع الزوائد ج ۶ ص ۲۴)

من انفسکم کا معنی (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نفیس ترین ہونا)

امام رازی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت فاطمہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کی قرأت من انفَسکم ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے پاس آئے درآنحالیکہ وہ تم میں سب سے اشرف اور افضل ہیں۔

(المستدرک ج ۲ ص ۲۴۰) (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۷۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں میں نفیس ترین، افضل اور اشرف ہیں اور اس مطلوب پر حسب ذیل احادیث دلالت کرتی ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ہر قرن میں بنو آدم کے

بہترین لوگوں میں سے مبعوث کیا گیا ہوں حتیٰ کہ جس قرن میں، میں ہوں۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۵۵۷، مسند احمد ج ۲ ص ۳۷۳، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۵۵۳۹)

حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے ابراہیم کی اولاد میں سے اسمٰعیل کو فضیلت دی، اور اسمٰعیل کی اولاد سے بنو کنانہ کو فضیلت دی اور بنو کنانہ میں سے قریش کو فضیلت دی، اور قریش سے بنو ہاشم کو فضیلت دی اور بنو ہاشم میں سے مجھے فضیلت دی۔
(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۲۷۶، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۶۰۵، مسند احمد ج ۴ ص ۱۰۷)

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا تو مجھے سب سے بہتر مخلوق میں رکھا، پھر جب ان کو گروہوں میں تقسیم کیا تو مجھے سب سے بہتر گروہ میں رکھا، پھر جب قبائل پیدا کیے تو مجھے سب سے بہتر قبیلہ میں رکھا، اور جب جانیں پیدا کیں تو مجھے سب سے بہتر جان میں رکھا، پھر جب گھر پیدا کیے تو مجھے سب سے بہتر گھر میں رکھا، پس میرا گھر بھی سب سے بہتر ہے اور میری جان بھی سب سے بہتر ہے۔
(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۶۰۷، مسند احمد ج ۱ ص ۲۱۰، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۱ ص ۱۶۷، دلائل النبوۃ لابی نعیم رقم الحدیث: ۱۶)

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نکاح سے پیدا ہوا ہوں آدم سے لے کر حتیٰ کہ میں اپنی ماں سے پیدا ہوا، زنا سے پیدا نہیں ہوا۔
(المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۴۷۲۵، دلائل النبوۃ لابی نعیم رقم الحدیث: ۱۴، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۷ ص ۱۹۰، مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۱۷، جامع البیان جز ۱۱ ص ۱۰۱، تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۰۱۵۸)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے ماں باپ کبھی زنا سے نہیں ملے، اللہ عزوجل مجھے ہمیشہ پاکیزہ پشتوں سے پاکیزہ رحموں کی طرف منتقل فرماتا رہا در آں حالیکہ وہ صاف اور مہذب تھے، اور جب بھی دو شاخیں نکلیں میں ان میں سے سب سے بہتر شاخ میں تھا۔
(دلائل النبوۃ لابی نعیم رقم الحدیث: ۱۵، تہذیب تاریخ دمشق ج ۱ ص ۳۴۹، الخصائص الکبریٰ ج ۱ ص ۶۴)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ نے ہمارے پاس دوپہر کو آرام فرمایا۔ آپ کو پسینہ آرہا تھا میری والدہ ایک شیشی لے کر آئیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم پر ہاتھ پھیر کر پسینہ کو ایک شیشی میں جمع کر رہی تھیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو آپ نے فرمایا: اے ام سلیم! یہ تم کیا کر رہی ہو؟ انہوں نے کہا یہ آپ کا پسینہ ہے ہم اس کو اپنی خوشبو کے لیے جمع کر رہے ہیں اور یہ ہماری سب سے اچھی خوشبو ہے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۳۱، الخصائص الکبریٰ ج ۱ ص ۱۱۴)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گندمی رنگ کے تھے اور جیسی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو تھی ایسی خوشبو کسی مشک اور عنبر میں نہیں تھی۔
(الطبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۳۱۷، مسند احمد ج ۳ ص ۲۵۹، البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۱۶)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی راستے پر جاتے، پھر آپ کے بعد کوئی اس راستہ پر جاتا تو وہ اس راستہ میں آپ کی پھیلی ہوئی خوشبو سے یہ پہچان لیتا تھا کہ آپ اس راستے سے گزر کر گئے ہیں۔
(سنن الدارمی رقم الحدیث: ۶۶، الخصائص الکبریٰ ج ۱ ص ۱۱۴)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے راستوں میں سے کسی راستہ سے گزرتے تو وہاں مشک کی خوشبو پھیلی ہوئی ہوتی تھی اور لوگ کہتے تھے کہ آج اس راستے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گزرے ہیں۔ (مسند ابو یعلی رقم الحدیث:۳۱۲۵، مجمع الزوائد ج۸ ص ۲۸۲، الخصائص الکبریٰ ج ا ص ۱۱۵)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے اپنی بیٹی کا نکاح کیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کسی چیز سے میری مدد کریں، آپ نے فرمایا: اس وقت میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے لیکن تم کل آنا اور ایک کھلے منہ کی شیشی اور ایک لکڑی لے کر آنا، پھر آپ نے اس شیشی میں اپنا پسینہ ڈال دیا حتیٰ کہ وہ شیشی بھر گئی۔ پھر آپ نے فرمایا: اپنی بیٹی سے کہنا کہ وہ اس لکڑی کو اس شیشی میں ڈبو کر اس سے خوشبو لگائے، پھر جب وہ لڑکی خوشبو لگاتی تو تمام مدینہ میں اس کی خوشبو پھیل جاتی اور ان کے مکان کا نام خوشبو والوں کا گھر پڑ گیا۔

(الکامل لابن عدی ج ۲ ص ۸۶۳ - ۸۶۲، مسند ابو یعلی رقم الحدیث:۶۲۹۵، مجمع الزوائد رقم الحدیث:۱۴۰۵۶، طبع جدید)

اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جبریل علیہ السلام نے کہا میں نے زمین کے مشارق اور مغارب پلٹ ڈالے میں نے کسی شخص کو (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل نہیں پایا اور نہ بنو ہاشم سے افضل کوئی گھر دیکھا۔ (المعجم الاوسط رقم الحدیث:۶۲۸۱، مجمع الزوائد ج۸ ص۲۱۷، طبع قدیم)

امت پر سخت احکام کا آپ پر دشوار ہونا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہارا مشقت میں پڑنا ان پر بہت شاق ہے اور تمہاری فلاح پر وہ بہت حریص ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اور تمہاری مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی، جب آگ نے اس کے ارد گرد کو روشن کر دیا تو یہ پروانے اور کیڑے مکوڑے اس آگ میں گرنے لگے اور وہ شخص ان کو اس آگ میں گرنے سے روک رہا تھا، اور وہ اس پر غالب آکر اس آگ میں گر رہے تھے، پس میں تم کو کمر سے پکڑ کر آگ سے کھینچ رہا ہوں اور تم اس میں گر رہے ہو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۶۴۸۳، صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۲۸۴، مشکوٰۃ رقم الحدیث:۱۴۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر مجھے مسلمانوں پر دشوار نہ ہوتا یا فرمایا: اگر مجھے اپنی امت پر دشوار نہ ہوتا تو انہیں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۵۲، سنن ابو داؤد رقم الحدیث:۴۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۶۹۰)

حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: اگر مجھے اپنی امت پر دشوار نہ ہوتا تو انہیں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا اور عشاء کی نماز کو تہائی رات تک موخر کر دیتا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۳، سنن ابو داؤد رقم الحدیث:۴۳، مسند احمد ج ۴ ص ۱۱۶، شرح السنہ رقم الحدیث:۱۹۸)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات مسجد میں نماز پڑھی، لوگوں نے بھی آپ کی اقتداء میں نماز پڑھی، پھر دوسری رات کو بھی آپ نے نماز پڑھی تو بہت زیادہ لوگوں نے آپ کی اقتداء کی، پھر تیسری یا چوتھی رات کو بھی لوگ جمع ہوگئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہیں لائے، پھر صبح کو آپ نے فرمایا: مجھے معلوم ہے تم نے جو کچھ کیا تھا، لیکن میں صرف اس وجہ سے باہر نہیں آیا کہ مجھے یہ خوف تھا کہ تم پر یہ نماز فرض کر دی جائے

گی، پھر تم اس کو پڑھ نہیں سکو گے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۱۹۰۱، صحیح مسلم رقم الحدیث:۱۷۷۸، ۱۷۷۸، سنن النسائی رقم الحدیث:۲۲۰۶)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ شب معراج نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک دن رات میں پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اللہ کی بارگاہ میں درخواست کی کہ میری امت ان کی طاقت نہیں رکھتی کچھ تخفیف فرمائیے حتیٰ کہ پچاس کی جگہ پانچ نمازیں فرض ہو گئیں اور فرمایا کہ یہ تعداد میں پانچ نمازیں اور اجر میں پچاس نمازیں ہیں۔ (ملخصاً)

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۳۴۹، صحیح مسلم رقم الحدیث:۱۶۳، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۳۱۴، سنن النسائی رقم الحدیث:۴۴۸، سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۳۴۶)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وصال کے روزے نہ رکھو (یعنی بغیر سحرو افطار کے روزے پر روزے نہ رکھو) مسلمانوں نے کہا: یارسول اللہ! آپ بھی تو وصال کے روزے رکھتے ہیں! آپ نے فرمایا: میں تم میں سے کسی کی مثل نہیں ہوں، بے شک مجھے میرا رب کھلاتا اور پلاتا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۱۹۶۱، سنن ابو داؤد رقم الحدیث:۲۳۶۱، مسند احمد ج ۳ ص ۱۷۰، سنن الترمذی رقم الحدیث:۷۷۸، صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۳۵۷۴، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث:۲۸۷۴)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: لوگوں میں سے جو شخص حج کو جانے کی استطاعت رکھے، اس پر حج کرنا فرض ہے۔ مسلمانوں نے پوچھا: یارسول اللہ! کیا ہر سال؟ آپ نے فرمایا: اگر میں ہاں کہہ دیتا تو تم پر ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۸۱۴، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۲۸۸۴، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث:۵۱۷، مسند احمد ج ۱ ص ۱۱۳، مسند البزار رقم الحدیث:۹۱۳، المستدرک ج ۲ ص ۲۹۳)

دنیا اور آخرت میں امت کی فلاح پر آپ کا حریص ہونا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر امت کے سخت اور مشکل احکام دشوار تھے اور آپ ان کی آسانی پر بہت حریص تھے، اس سلسلہ میں بہت احادیث ہیں مگر ہم نے جو احادیث ذکر کر دی ہیں وہ کافی ہیں، اسی طرح امت کی دنیاوی اور اخروی فلاح پر جو آپ حریص تھے اس سلسلے میں ہم چند احادیث پیش کر رہے ہیں: حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت لمبی نماز پڑھی، صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! آپ نے اتنی لمبی نماز پڑھی ہے جتنی آپ عام طور پر نہیں پڑھا کرتے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! یہ اللہ کی طرف رغبت کرتے ہوئے اور اس سے ڈرتے ہوئے نماز پڑھی تھی، میں نے اس نماز میں اللہ سے تین چیزوں کا سوال کیا تھا، اللہ نے دو چیزیں مجھے عطا کر دیں اور ایک چیز کے سوال سے مجھے روک دیا۔ میں نے اللہ سے سوال کیا کہ میری امت کو (عام) قحط سے ہلاک نہ کرے تو اللہ نے مجھے یہ چیز عطا کر دی اور میں نے اللہ سے یہ سوال کیا کہ میری (پوری) امت پر کسی ایسے دشمن کو مسلط نہ کرے جو ان کا غیر ہو، تو اللہ نے مجھے یہ چیز بھی عطا کر دی اور میں نے اللہ سے یہ سوال کیا کہ میری امت کے لوگ ایک دوسرے سے جنگ نہ کریں تو اللہ نے مجھے اس سوال سے روک دیا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۱۷۵، سنن النسائی رقم الحدیث:۱۶۳۷، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۱۳۴۱، صحیح ابن حبان رقم

الحدیث:۲۴۳۶، مسند احمد ج ۵ ص ۱۰۸، المعجم الکبیر رقم الحدیث:۴-۳۶۲۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر نبی کی ایک (خصوصی) مقبول دعا ہوتی ہے، سو ہر نبی نے دنیا میں وہ دعا کرلی، اور میں نے اس دعا کو قیامت کے دن اپنی امت کی شفاعت کے لیے چھپا کر رکھا ہے اور یہ ان شاء اللہ میری امت کے ہر اس فرد کو حاصل ہوگی جس نے شرک نہ کیا ہو۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث:۱۹۹، سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۶۰۲، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۴۳۰۷، مسند احمد ج ۲ ص ۴۲۶، المعجم الاوسط رقم الحدیث:۸۴۷۱، شعب الایمان رقم الحدیث:۳۱۳، السنن الکبریٰ ج ۸ ص ۱۷)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لیے ہے۔ (یہ حدیث حضرت انس سے بھی مروی ہے)

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۶-۲۴۳۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۴۳۱۰، سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۴۷۳۹، صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۶۴۶۸، مسند احمد ج ۳ ص ۲۱۳، المعجم الاوسط رقم الحدیث:۸۵۱۳، مسند ابویعلی رقم الحدیث:۳۲۸۴، المستدرک ج ۱ ص ۶۹، الشریعۃ للآجری ص ۳۳۸، حلیۃ الاولیاء ج ۳ ص ۲۰۰)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اب اگر یہ لوگ آپ سے منہ پھیرتے ہیں تو آپ کہہ دیں کہ مجھے اللہ کافی ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں، میں نے اسی پر توکل کیا ہے اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔ (التوبہ: ۱۲۹)

اللہ تعالیٰ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا

اس آیت میں روئے سخن مشرکین اور منافقین کی طرف ہے، یعنی اگر یہ مشرکین اور منافقین آپ سے اعراض کریں یا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے اعراض کریں یا یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق سے اعراض کریں یا یہ لوگ مشکل اور سخت احکام کو قبول کرنے سے اعراض کریں یا یہ منافق لوگ جہاد میں آپ کے ساتھ جانے اور آپ کی نصرت سے انکار کریں تو آپ کہہ دیں کہ مجھے اللہ کافی ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں، میں نے اسی پر توکل کیا ہے۔

اس آیت سے یہ مقصود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جائے اگر یہ مشرکین اور منافقین آپ کی تصدیق نہیں کرتے تو آپ غم نہ کریں، کیونکہ اسلام کی نشرواشاعت اور دشمنوں کے خلاف آپ کی مدد کے لیے اللہ تعالیٰ کافی ہے۔

عرش کا معنی

عرش کا لغوی معنی ہے: کسی شے کا رکن، گھر کی چھت، خیمہ، وہ گھر جس سے سایہ طلب کیا جائے، اور بادشاہ کا تخت، اللہ تعالیٰ کے عرش کی تعریف نہیں کی جاسکتی، وہ سرخ یاقوت ہے جو اللہ کے نور سے چمک رہا ہے۔

(قاموس ج ۲ ص ۴۰۵، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

عزت، سلطان اور مملکت کا کنایہ عرش سے کیا جاتا ہے، ثل عرشہ کا معنی ہے اس کی عزت جاتی رہی، روایت ہے کہ کسی شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا، ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے رب نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا، تو آپ نے کہا اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت میرا تدارک نہ کرتی تو لثل عرشی (میری عزت جاتی رہتی) اللہ کے عرش کی حقیقت کو کوئی نہیں جانتا، ہمیں صرف یہ معلوم ہے کہ اس کو عرش کہتے ہیں، اور عرش اس طرح نہیں ہے جس طرح عام لوگوں کا وہم ہے، ایک قوم نے یہ کہا ہے کہ عرش فلک اعلیٰ ہے اور کرسی فلک الکواکب ہے اور انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے:

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوذر! سات آسمان کرسی کے مقابلہ

میں ایسے ہیں جیسے کسی جنگل میں انگوٹھی کا ایک چھلا پڑا ہوا ہو' اور عرش کی فضیلت کرسی پر ایسے ہے جیسے جنگل کی فضیلت چھلے پر ہے۔ (کتاب الاسماء والصفات للبیہقی ص ۴۰۵' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

(المفردات ج ۲ ص ۴۲۹ - ۴۲۸' مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ' ۱۴۱۸ھ)

عرش کے متعلق احادیث اور آثار

وہب بن منبہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عرش کو اپنے نور سے پیدا کیا اور کرسی عرش سے ملی ہوئی ہے' اور پانی کرسی کے نیچے اور ہوا کے اوپر ہے اور فرشتوں نے اپنے کندھوں کے اوپر عرش کو اٹھایا ہوا ہے اور عرش کے گرد چار دریا ہیں' اور ان دریاؤں میں فرشتے کھڑے ہوئے اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں' اور عرش بھی اللہ عزوجل کی تسبیح کرتا ہے۔

(کتاب العظمہ رقم الحدیث: ۱۹۲' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۴ھ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ کرسی جو آسمانوں اور زمینوں کو محیط ہے قدموں کی جگہ ہے اور عرش کی مقدار کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا' سوا اس کے جس نے اس کو پیدا کیا ہے اور تمام آسمان گنبد کی طرح ہیں۔

(کتاب العظمہ رقم الحدیث: ۱۹۸؛ المستدرک ج ۲ ص ۲۸۲' یہ حدیث صحیح ہے)

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ایک اعرابی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: یارسول اللہ! لوگ مشکل میں پڑ گئے' بال بچے ضائع ہوگئے' اور مویشی ہلاک ہوگئے' آپ ہمارے لیے اللہ سے بارش کی دعا کیجئے' ہم آپ کو اللہ کی بارگاہ میں شفیع بناتے ہیں اور اللہ کو آپ کی بارگاہ میں شفیع بناتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار سبحان اللہ فرمایا' پھر فرمایا: تم پر افسوس ہے اللہ کو کسی کے حضور سفارشی نہیں بنایا جاتا' اللہ سبحانہ کی شان اس سے بلند ہے' تم پر افسوس ہے تم اللہ کو نہیں جانتے' اس کا عرش تمام آسمانوں اور زمینوں کو گنبد کی طرح محیط ہے اور وہ اس طرح چرچراتا ہے جس طرح پالان سواری کی وجہ سے چرچراتا ہے۔

(کتاب العظمہ رقم الحدیث: ۲۰۰' سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۲۶' کتاب السنہ رقم الحدیث: ۵۷۵' الشریعہ ص ۲۹۳)

عرش کی تفسیر میں اقاویل علماء

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ لکھتے ہیں:

اہل تفسیر نے کہا ہے کہ عرش ایک تخت ہے اور وہ جسم مجسم ہے' اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا اور اس کو اٹھانے کا حکم دیا اور اس کی تعظیم کے لیے طواف کرنے کا حکم دیا جیسے زمین میں ایک بیت پیدا کیا اور بنو آدم کو اس کا طواف کرنے اور اس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا اور اکثر آیات' احادیث اور آثار میں اس نظریہ کی صحت پر دلائل ہیں۔

(کتاب الاسماء والصفات ص ۳۹۲' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

ابوالحسن علی بن محمد الطبری نے کہا کہ رحمٰن کے عرش پر مستوی ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ عرش پر بلند ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ سورج ہمارے سر پر بلند ہے' اللہ سبحانہ عرش پر بلند ہے نہ وہ عرش پر بیٹھا ہوا ہے نہ وہ اس پر کھڑا ہوا ہے' نہ وہ عرش کے ساتھ مماس ہے نہ وہ اس سے مبائن بمعنی متباعد ہے کیونکہ مس کرنا اور بعید ہونا اور کھڑا ہونا اور بیٹھنا اجسام کی صفات ہیں اور اللہ عزوجل احد اور صمد ہے' وہ نہ مولود ہے نہ والد اور نہ اس کا کوئی مماثل ہے اور جسم کے عوارض اور احوال اس کے لیے ممکن نہیں ہیں۔ (کتاب الاسماء والصفات ص ۴۱۱' مطبوعہ بیروت)

علامہ عبدالوہاب احمد بن علی الشعرانی المتوفی ۹۷۳ھ لکھتے ہیں:

رحمٰن کے عرش پر استواء کا معنی یہ ہے کہ اللہ کا خلق کرنا عرش پر مکمل ہو گیا اور اس نے عرش کے ماوراء کسی چیز کو پیدا نہیں کیا اور اس نے دنیا اور آخرت میں جو کچھ بھی پیدا کیا ہے وہ دائرہ عرش سے خارج نہیں ہے کیونکہ وہ تمام کائنات کو حاوی ہے' استوی کا معنی ہم نے تمام ہونا اور مکمل ہونا کیا ہے اور یہ اس آیت سے مستفاد ہے:

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰى - (القصص: ١٤) اور جب وہ اپنے شباب کو پہنچا اور تام اور مکمل ہو گیا۔

اللہ نے قرآن مجید میں چھ جگہ[1] عرش پر استواء کا ذکر کیا ہے اور ہر جگہ آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے کے بعد عرش پر استواء کا ذکر کیا ہے مثلاً پہلی بار سورۃ الاعراف میں ذکر فرمایا ہے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ۔ (الاعراف: ٥٤) بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے چھ دنوں میں آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا پھر اس کا پیدا کرنا عرش پر تام اور مکمل ہو گیا۔

یعنی اس کے پیدا کرنے کا سلسلہ عرش پر تمام ہو گیا اور اس نے عرش کے بعد کسی چیز کو پیدا نہیں کیا۔ یعنی عرش تمام ممالک میں سب سے اعظم ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر بہ اعتبار رتبہ کے بلند ہے' مثلاً جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمارے اوپر ہوا ہے' پھر اس کے اوپر آسمان ہے اور جب ہمارا وہم سات آسمانوں سے ترقی کرتا ہے تو اس کے اوپر کرسی ہے اور جب ہم کرسی سے ترقی کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے اوپر عرش ہے جو مخلوقات کی انتہا ہے' اس کے آگے ہماری فکر کی کوئی سیڑھی نہیں ہوتی اور عرش پر جا کر ہماری فکر کی پرواز ٹھہر جاتی ہے اور عرش کے اوپر اور اس سے بہ اعتبار رتبہ کے بلند اللہ تعالیٰ ہے' خلاصہ یہ ہے کہ اس کائنات کو پیدا کرنے کا سلسلہ عرش پر جا کر ٹھہر گیا اور یہی عرش پر استواء کا معنی ہے۔

(الیواقیت والجواہر ج ١ ص ١٨٥ - ١٨٢' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ١٤١٨ھ)

علامہ شعرانی کی مراد یہ ہے کہ کائنات کے عناصر اور اجسام اور اس کی وضع کو پیدا کرنے کا سلسلہ عرش پر جا کر ٹھہر گیا' اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ مطلقاً خلق اور پیدائش کا سلسلہ عرش کو پیدا کرنے کے بعد موقوف ہو گیا۔

آیا سورہ توبہ کی آخری آیت قرآن مجید کی آخری آیت ہے یا نہیں

امام ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قرآن مجید کی جو آخری آیتیں نازل ہوئیں وہ یہ ہیں: لقد جاء کم رسول من انفسکم - الایہ - (التوبہ: ١٢٩-١٢٨)

(جامع البیان جز ١١ ص ١٠٤' مطبوعہ دار الفکر بیروت)

اس کے معارض یہ حدیث ہے:

حضرت البراء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورت البراءۃ (التوبہ) ہے اور سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت: یستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ - الایہ - (النساء: ١٧٦) ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٤٦٠٥' صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٦١٨)

نیز امام ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آخری آیت یہ ہے: واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ - (البقرہ: ٢٨١) (جامع البیان جز ٣ ص ١٥٦' رقم الحدیث: ٤٩٤١)

امام ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نو راتیں

[1] وہ چھ جگہیں یہ ہیں: (١) الاعراف: ٥٤ (٢) یونس: ٣ (٣) طٰہٰ: ٥ (٤) الفرقان: ٥٩ (٥) السجدہ: ٤ (٦) الحدید: ٤

زندہ رہے۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۲ ص ۵۵۴، رقم الحدیث: ۲۹۴۴)

نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو آخری آیت نازل ہوئی وہ آیت الربو ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۵۴۴، مطبوعہ دار ارقم، بیروت)

واضح رہے کہ البقرہ: ۲۸۰-۲۷۸ تک آیات الربو ہیں اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ البقرہ: ۲۸۱ کا بھی پہلی آیتوں پر عطف ہے، اس لیے ان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۲۰۵، طبع لاہور)

ابن جریج نے کہا یہ آیت (البقرہ: ۲۸۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے نو گھنٹے پہلے نازل ہوئی اور اس کے بعد کوئی چیز نازل نہیں ہوئی، اور ابن جبیر نے کہا یہ آیت آپ کی وفات سے تین گھنٹے پہلے نازل ہوئی، سورۂ توبہ کی آخری آیت کو بھی قرآن مجید کی نازل ہونے والی آخری آیت کہا گیا ہے لیکن البقرہ کی آیت: ۲۸۱ کا آخری آیت ہونا زیادہ صحیح، زیادہ معروف اور زیادہ علماء کا مختار ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۳ ص ۳۴۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سورہ نساء کی آخری آیت قرآن مجید کی آخری آیت ہے اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ۔ (البقرہ: ۲۸۱) قرآن مجید کی آخری آیت ہے، اور اس کی تائید صحیح بخاری میں بھی ہے کہ آخری آیت، آیت الربو ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں قرآن مجید کی آخری آیتیں ہوں اور دونوں قرآن مجید کے آخر میں ایک ساتھ نازل ہوئی ہوں اور ہر آیت دوسری آیت کے اعتبار سے آخری آیت ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ، حقیقی آخری آیت ہو اور یستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ کے آخری آیت ہونے کا یہ معنی ہو کہ وراثت کے احکام کی آخری آیت ہے اور اس کے برعکس ہونا اس لیے راجح نہیں ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی طرف اشارہ ہے جو نزول قرآن مجید کے خاتمہ کو مستلزم ہے، پوری آیت اس طرح ہے:

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ (البقرہ: ۲۸۱)

اور اس دن سے ڈرو جس دن تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کے کیے ہوئے کاموں کی پوری جزا دی جائے گی اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

(فتح الباری ج ۸ ص ۲۰۵، مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۱ھ)

سورۃ النساء کے آخر میں ہم نے قرآن مجید کی آخری آیت کے سلسلے میں مختلف روایتوں میں باہم تطبیق بیان کی ہے۔

حضرت خزیمہ بن ثابت کی گواہی سے لقد جاء کم رسول من انفسکم۔ الآیہ۔ کا سورۂ توبہ میں درج ہونا

جب صحابہ کرام قرآن مجید کو جمع کر رہے تھے تو ان کو سورہ توبہ کی یہ آخری دو آیتیں نہیں ملیں پھر حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ سے یہ آیتیں ملیں اور ان کی شہادت پر انہوں نے اس کو قرآن مجید میں شامل کیا، امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے پیغام بھیجا تو میں نے قرآن مجید کو جمع کرنا شروع کیا حتی کہ جب میں سورہ توبہ کے آخر پر پہنچا تو لقد جاء کم رسول من انفسکم مجھے صرف حضرت

خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس ملی اور ان کے علاوہ اور کسی کے پاس نہیں ملی۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۶۷۹، ۷۴۲۵، ۲۸۰۷، مطبوعہ دار ارقم بیروت)

اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ قرآن مجید تو تواتر سے ثابت ہے، صرف ایک صحابی کے کہنے سے یہ آیت قرآن مجید کا جز کیسے بن گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام کو تواتر سے معلوم تھا کہ یہ آیت سورہ توبہ کی آخری آیت ہے، لیکن مصحف میں ہر آیت کو درج کرنے کے لیے انہوں نے یہ ضابطہ بنایا تھا کہ دو صحابی اس پر گواہی دیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو لکھوایا تھا یا دو صحابی اس پر گواہی دیں کہ جس سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اس سال آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی تھی۔ حضرت خزیمہ بن ثابت کے علاوہ اور کسی صحابی کے پاس اس کی شہادت نہیں تھی لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہ کی شہادت کو دو شہادتوں کے قائم مقام قرار دیا تھا اس لیے اس آیت کو سورۂ توبہ میں درج کر لیا گیا۔

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں:

امام ابن ابی داؤد نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر نے حضرت عمر اور حضرت زید سے کہا کہ آپ دونوں مسجد کے دروازہ پر بیٹھ جائیں اور جب دو گواہ اس پر گواہی دیں کہ یہ آیت کتاب اللہ کی ہے تو اس کو لکھ لیں۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت زید کسی آیت کے صرف اپنے پاس لکھے ہونے پر اکتفا نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ دو گواہ اس پر گواہی دیں اور یہ چیز ان کی غایت احتیاط پر دلالت کرتی ہے۔ علامہ سخاوی نے کہا مراد یہ ہے کہ دو گواہ اس پر گواہی دیں کہ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھی یا دو گواہ اس پر گواہی دیں کہ یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی تھی، اور لیث بن سعد نے کہا کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکر نے قرآن جمع کیا اور اس کو حضرت زید بن ثابت نے لکھا اور جب تک دو عادل (نیک) گواہ گواہی نہ دیتے حضرت زید اس آیت کو مصحف میں درج نہیں کرتے تھے اور سورہ توبہ کی آخری آیت صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس پائی گئی تو مسلمانوں نے کہا اس کو لکھ لو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہ کی گواہی کو دو مردوں کی گواہی کے برابر قرار دیا ہے۔ (الاتقان ج ا ص ۵۸، ملخصاً، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۴۰۰ھ)

حضرت خزیمہ بن ثابت کی گواہی کا دو گواہوں کے برابر ہونا

عمارہ بن خزیمہ کے چچا رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی سے ایک گھوڑا خریدا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے مہلت طلب کی تاکہ گھوڑے کی قیمت لے کر آئیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جلدی جلدی گھوڑے کی قیمت لینے گئے، اس اعرابی نے اس کو تاخیر سمجھا، پھر دوسرے لوگ اس اعرابی سے اس گھوڑے کی قیمت لگانے لگے اور ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس گھوڑے کو خرید چکے ہیں، پھر اس اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارا اگر آپ اس گھوڑے کو خرید رہے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں اس گھوڑے کو بیچ رہا ہوں۔ آپ نے اس اعرابی کی بات سن کر فرمایا: کیا میں تم سے یہ گھوڑا خرید نہیں چکا؟ اس اعرابی نے کہا نہیں خدا کی قسم! میں نے آپ کو یہ نہیں فروخت کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیوں نہیں، میں تم سے یہ گھوڑا خرید چکا ہوں۔ اس اعرابی نے کہا اچھا پھر آپ گواہ لائیں۔ حضرت خزیمہ بن ثابت نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ تم نے یہ گھوڑا آپ کو فروخت کر دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہ کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا: تم کس وجہ سے گواہی دے رہے ہو؟ حضرت خزیمہ نے کہا: یا رسول اللہ! کیونکہ میں آپ کی تصدیق کرتا ہوں، تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہ کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار دیا۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۳۶۰۷، سنن النسائی رقم الحدیث:۴۶۶۱، الطبقات الکبریٰ رقم الحدیث:۵۸۴، المعجم الکبیر رقم الحدیث:۳۷۳۰، مجمع الزوائد ج۹ ص۳۲۰، المستدرک ج۲ ص۱۸، سنن کبریٰ ج۱۰ ص۱۴۶، تہذیب تاریخ دمشق ج۵ ص۱۳۶، کنزالعمال رقم الحدیث:۳۷۰۳۸، الاصابہ رقم:۲۲۵۶، اسد الغابہ رقم:۱۴۴۶)

صحیح بخاری میں بھی اس کی تائید ہے:

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں مصحف میں آیات درج کر رہا تھا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۃ الاحزاب کی ایک آیت پڑھتے ہوئے سنا تھا، وہ مجھے حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری کے سوا اور کسی کے پاس نہیں ملی جن کی شہادت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو گواہوں کے برابر قرار دیا تھا۔ وہ آیت یہ تھی: من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه۔ (الاحزاب: ۲۳) (صحیح البخاری رقم الحدیث:۲۸۰۷)

اس سے معلوم ہوا کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہ کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار دیا تھا، اس وقت نگاہ نبوت میں یہ تھا کہ ایک وقت آئے گا جب جمع قرآن کے وقت سورہ توبہ کی آخری آیت اور الاحزاب کی آیت: ۲۳ پر حضرت خزیمہ کے سوا کوئی گواہ نہیں ہوگا اور اگر ان کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار نہ دیا جائے تو سورہ توبہ اور سورہ احزاب میں یہ آیتیں درج ہونے سے رہ جائیں گی۔

لقد جاء کم رسول من انفسکم۔ الایہ کے وظیفہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت

علامہ شمس الدین محمد بن ابی بکر ابن قیم الجوزیہ المتوفی ۷۵۱ھ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

ابوبکر محمد بن عمر بیان کرتے ہیں کہ میں ابوبکر بن مجاہد کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ شبلی آگئے، ابوبکر بن مجاہد ان کے لیے کھڑے ہوئے اور ان سے معانقہ کیا اور ان کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا۔ میں نے کہا اے سیدی! آپ شبلی کی اس قدر تعظیم کر رہے ہیں حالانکہ آپ کا اور تمام اہل بغداد کا یہ خیال ہے کہ یہ دیوانہ ہے! انہوں نے کہا: میں نے اس کے ساتھ اسی طرح کیا ہے جس طرح میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے ساتھ کرتے ہوئے دیکھا ہے، کیونکہ میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، پھر دیکھا کہ شبلی آرہا تھا۔ آپ اس کے لیے کھڑے ہوئے اور اس کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا۔ میں نے کہا یارسول اللہ! آپ شبلی کی اس قدر تعظیم کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ نماز کے بعد یہ پڑھتا ہے: لقد جاء کم رسول من انفسکم۔ الایہ۔ (التوبہ: ۱۲۹-۱۲۸) اور اس کے بعد مجھ پر درود (شریف) پڑھتا ہے، اور ایک روایت میں ہے یہ ہر فرض کے بعد یہ دو آیتیں پڑھتا ہے، اس کے بعد مجھ پر درود پڑھتا ہے اور تین مرتبہ اس طرح پڑھتا ہے صلی الله علیک یا محمد، انہوں نے کہا پھر جب شبلی آئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نماز کے بعد کیا ذکر کرتے ہیں تو انہوں نے اسی طرح ذکر کیا۔ (جلاء الافہام ص ۲۵۸، مکتبہ نوریہ رضویہ، لائل پور، پاکستان)

حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمن السخاوی متوفی ۹۰۲ھ نے القول البدیع ص ۲۵۲-۲۵۱ میں اور علامہ احمد بن محمد بن حجر ہیتمی متوفی ۹۷۳ھ نے الدر المنثور ص ۱۵۲-۱۵۱ میں اور شیخ محمد زکریا نے فضائل درود ص ۱۱۶ میں اس روایت کا ذکر کیا ہے اور شیخ زکریا نے علامہ سخاوی کے حوالے سے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شبلی کا اسی (۸۰) سال سے یہ معمول ہے۔

حسبی الله لا اله الا هو پڑھنے کی فضیلت

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے ہر صبح اور ہر شام کو

سات مرتبہ یہ پڑھا، حسبی اللہ لا الہ الا ھو علیہ توکلت وھو رب العرش العظیم، اس کے دنیا اور آخرت کے اہم کاموں میں اللہ کافی ہو گا۔

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۵۰۸۱، عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی رقم الحدیث: ۷۱، الاذکار للنووی رقم الحدیث: ۲۱۹)

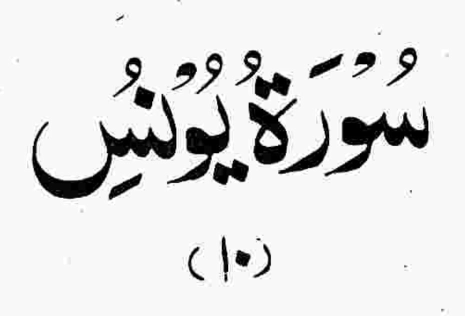
سنن ابو داؤد میں یہ حدیث موقوف ہے اور باقی کتابوں میں مرفوع ہے۔

اور یہاں پہنچ کر سورۂ توبہ کی تفسیر ختم ہو گئی۔

کلمات تشکر

الحمد للہ علی احسانہ آج بروز جمعہ ۱۶ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ / ۳۰ جولائی ۱۹۹۹ء کو سورہ توبہ کی تفسیر مکمل ہو گئی، الہ العالمین! جس طرح آپ نے کرم فرمایا اور سورہ توبہ تک یہ تفسیر کرا دی ہے باقی قرآن مجید کی تفسیر بھی مکمل کرا دیں۔ میں ذیابیطس اور بلند فشار دم کا عرصہ ۱۴ سال سے مریض ہوں اور سولہ سال سے لمباگو (کمر کے درد) کا مریض ہوں اور اب تین سال سے سیدھے ہاتھ کے جوڑ میں بازو کے درد میں مبتلا ہوں اور شوگر کی وجہ سے دیگر امراض لاحق ہیں اس کے باوجود چار مہینوں میں سورہ توبہ کی یہ تفسیر مکمل ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں یہ انسانی طاقت کی کاوش نہیں ہے، یہ محض اللہ کا کرم اور اس کا فضل ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ گندی اور بدبودار کھاد سے مہکتے ہوئے خوشبودار اور پاکیزہ پھول پیدا کر دیتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس گنہ گار اور سیاہ کار بندے کے ہاتھوں یہ پاکیزہ اور نورانی تفسیر لکھوا دی۔ سورۂ توبہ کی تفسیر ختم کرتے ہوئے میں اپنے تمام گناہوں سے توبہ کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے حسن خاتمہ اور نیک عاقبت کی دعا کرتا ہوں۔ الہ العالمین! مجھے تمام امراض سے شفا عطا فرما اور اس تفسیر کو مکمل کرا دے، اس کو اپنی اور اپنے حبیب اکرم کی بارگاہ میں قبول فرما اور قیامت تک تمام مسلمانوں کے دلوں میں اس کی محبت پیدا فرما اور اس میں مذکور عقائد اور اعمال کو قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق پیدا فرما، موافقین کے لیے اس تفسیر کو موجب استقامت اور مخالفین کے لیے موجب ہدایت بنا دے۔ شرح صحیح مسلم اور اس تفسیر کو مخالفین کے بغض اور عناد سے محفوظ رکھ، اس تفسیر کے مصنف، اس کے والدین اور اقرباء، اس کے کمپوزر، اس کے مصحح اور اس کے ناشر اور قارئین کی مغفرت فرما، ان کو دنیا اور آخرت کی ہر آزمائش اور مصیبت اور عذاب سے محفوظ رکھ اور دنیا اور آخرت کی نعمتیں، راحتیں اور سعادتیں ان کے لیے مقدر فرما دے۔ آمین یا رب العالمین بجاہ حبیبک سیدنا محمد افضل الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین صلوات اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وازواجہ وامتہ اجمعین۔




سُورَةُ يُونُسَ
(١٠)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

سورۃ یونس

سورت کا نام اور اس کی وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام سورۃ یونس ہے، کیونکہ یونس علیہ السلام کی قوم باقی انبیاء علیہم السلام کی اقوام سے اس صفت میں منفرد تھی کہ یونس علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا اور انہوں نے عذاب الٰہی کے آثار دیکھ لیے تو وہ اللہ تعالیٰ اور حضرت یونس علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور ان کا ایمان لانا نفع آور ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا اور ان سے عذاب اٹھا لیا جس کا اس آیت میں ذکر ہے:

فَلَوۡلَا كَانَتۡ قَرۡيَةٌ اٰمَنَتۡ فَنَفَعَهَاۤ اِيۡمَانُهَاۤ اِلَّا قَوۡمَ يُوۡنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوۡا كَشَفۡنَا عَنۡهُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡىِ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَمَتَّعۡنٰهُمۡ اِلٰى حِيۡنٍ ○ (یونس: ۹۸)

یونس کی قوم کے سوا اور کسی بستی کے لوگ ان کی طرح کیوں نہ ہوئے کہ وہ لوگ (بھی) ایمان لے آتے اور انہیں (بھی) ان کا ایمان نفع دیتا، (جس طرح) وہ (قوم یونس) ایمان لے آئے تو ہم نے ان سے ان کی دنیا کی زندگی میں عذاب اٹھا لیا اور ایک مخصوص وقت تک انہیں فائدہ پہنچایا۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت یونس علیہ السلام کا تذکرہ سورۃ الصافات میں سورۃ یونس سے بہت زیادہ ہے تو اس کا نام سورۃ یونس کیوں نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ وجہ تسمیہ میں یہ ضروری ہے کہ جس چیز کا نام رکھا جائے اس میں اس چیز کی مناسبت ہونی چاہیے، یہ ضروری نہیں کہ جہاں وہ مناسبت پائی جائے وہاں وہ نام بھی ہو کیونکہ وجہ تسمیہ جامع مانع نہیں ہوتی، اس کی مثال یہ ہے کہ خمر (انگور کی شراب) کو خمر اس لیے کہتے ہیں کہ مخامرہ کا معنی ہے ڈھانپنا اور خمر عقل کو ڈھانپ لیتی ہے، اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بھنگ بھی عقل کو ڈھانپ لیتی ہے سو اس کو بھی خمر کہنا چاہیے، اردو میں اس کی یہ مثال ہے کہ پاجامہ کو پاجامہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ پیروں کا لباس ہے، اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شلوار، تہبند، غرارہ، ساڑھی اور پتلون وغیرہ یہ بھی پیروں کا لباس ہے تو ان کو پاجامہ کیوں نہیں کہتے۔

سورہ یونس کا نام یونس رکھنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ سورہ یونس، سورہ ہود، سورہ یوسف اور سورہ ابراہیم یہ چاروں

سورتیں الٓر سے شروع ہوتی ہیں اور ان میں باہم امتیاز کے لیے ہر سورت کا وہ نام رکھا گیا جس سورت میں ایک نبی کا یا اس کی قوم کا تذکرہ آیا ہو بجائے اس کے کہ ان میں اس طرح امتیاز ہوتا الٓر اولیٰ' الٓر ثانیہ' الٓر ثالثہ اور الٓر رابعہ۔

سورہ یونس کا زمانہ نزول

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ٩١١ھ لکھتے ہیں:

امام النحاس' امام ابوالشیخ اور امام ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ سورہ یونس مکہ میں نازل ہوئی' اور امام ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سورہ یونس مکہ میں نازل کی گئی۔ (الدر المنثور ج ٤ ص ٣٣٩' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ١٤١٤ھ)

نیز لکھتے ہیں کہ مشہور یہ ہے کہ یہ سورت مکی ہے۔ امام ابن مردویہ نے مجاہد کی سند سے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ مکی ہے اور عطا کی سند سے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ مدنی ہے۔

(الاتقان ج ١ ص ٦٣' مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت' ١٤١٩ھ)

بعض علماء نے سورہ یونس کے مکی ہونے سے تین آیتوں کا استثناء کیا ہے' اور ابن الفرس اور علامہ سخاوی نے کہا ہے کہ سورہ یونس کے شروع سے لے کر چالیس آیتوں تک مکی آیتیں ہیں اور باقی آیتیں مدنی ہیں' اس کی ایک سو نو آیتیں ہیں اور شامی کے نزدیک اس کی ایک سو دس آیتیں ہیں۔ (روح المعانی ج ٧ ص ٨٤' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ١٤١٧ھ)

سورہ التوبہ اور سورہ یونس کی مناسبت

سورہ توبہ کا اختتام رسالت کے ذکر پر ہوا تھا لقد جاء کم رسول من انفسکم۔ (التوبہ: ١٢٨) اور سورہ یونس کی ابتداء بھی رسالت کے ذکر سے ہوئی ہے: اکان للناس عجبا ان اوحينا الى رجل منهم۔ (یونس: ٢) "کیا لوگوں کو اس پر تعجب ہوا ہے کہ ہم نے ان ہی میں سے ایک (مقدس) مرد پر وحی نازل کی ہے"۔ نیز سورہ توبہ میں مصیبت نازل ہونے کے باوجود اس سے عبرت اور نصیحت حاصل نہ کرنے اور توبہ نہ کرنے پر منافقین کی مذمت کی تھی:

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِىْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ۔ (التوبہ: ١٢٦)

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں پھر بھی وہ نہ توبہ کرتے ہیں نہ نصیحت قبول کرتے ہیں۔

اور اس سورت میں ان لوگوں کا حال بیان فرمایا ہے جو کسی مصیبت کے موقع پر اللہ سے فریاد کرتے ہیں اور جب وہ مصیبت ٹل جاتی ہے تو پھر وہ اس طرح ہو جاتے ہیں جیسے انہوں نے کبھی اللہ کو پکارا ہی نہیں تھا۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ۔ (یونس: ١٢)

اور جب انسان کو کوئی مصیبت آ پہنچتی ہے تو وہ ہم سے فریاد کرتا ہے خواہ پہلو کے بل یا بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے اور جب ہم اس سے مصیبت دور کر دیتے ہیں تو وہ اس طرح گزر جاتا ہے گویا اس نے کسی مصیبت کے پہنچتے وقت ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔

اس طرح سورہ توبہ کی ابتداء اللہ تعالیٰ نے اللہ اور رسول کی طرف سے مشرکین سے بیزاری کے اعلان سے کی اور اس میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ مشرکین کو جہاں پائیں قتل کر دیں۔ (التوبہ: ٥) اور اس سورت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ وہ مشرکین سے بیزاری کا اظہار کریں:

وَاِنۡ كَذَّبُوۡكَ فَقُلۡ لِّىۡ عَمَلِىۡ وَلَكُمۡ عَمَلُكُمۡ‌ ۚ اَنۡتُمۡ بَرِيۡٓـُٔوۡنَ مِمَّاۤ اَعۡمَلُ وَاَنَا بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ - (یونس: ۴۱)

اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو آپ کہہ دیجئے کہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے، تم ان کاموں سے بری الذمہ ہو جو میں کرتا ہوں اور میں ان کاموں سے بیزار ہوں جن کو تم کرتے ہو۔

سورہ یونس کے مسائل اور مقاصد

☆ اس سورت کی ابتداء الر سے کی گئی ہے جو حروف تہجی ہیں اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ یہ قرآن مجید جس کو ہمارے نبی نے اپنی نبوت کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے ان ہی حروف سے بنا ہے جن سے تم اپنا کلام بناتے ہو اگر یہ تمہارے دعویٰ کے مطابق کسی انسان کا کلام ہے تو تم بھی ایسا ہی کلام بنا کر لے آؤ، سو یہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر دلیل ہے۔

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ثبوت، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے ثبوت کو مستلزم ہے۔

☆ مخلوقات کی حکمتیں بیان فرمائی ہیں اور جزا اور سزا کا فلسفہ بیان فرمایا ہے۔

☆ مشرکین کے لیے وعید بیان کی ہے اور مومنوں کو بشارت دی ہے۔

☆ کافروں پر جلد عذاب نہ بھیجنے کی حکمت بیان فرمائی ہے۔

☆ پچھلی امتوں کو رسولوں کے جھٹلانے کی سزائیں یاد دلائی ہیں۔

☆ خشکی اور سمندر میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی جو نشانیاں ہیں ان کا ذکر فرمایا ہے۔

☆ دنیا کے زیب و زینت کے زوال اور اخروی نعمتوں کی بقا کو بیان فرمایا ہے۔

☆ آخرت میں مومنوں اور کافروں کے احوال کا تفاوت اور باطل خداؤں کی اپنے عبادت گزاروں سے بیزاری کا ذکر فرمایا ہے۔

☆ اللہ عزوجل کے غیر کی الوہیت کا اس دلیل سے رد فرمایا ہے کہ وہ دنیا اور آخرت میں کسی کے کسی کام نہیں آسکتے۔

☆ قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے پر دلائل قائم کیے ہیں اور مشرکین کے اس قول کو باطل کیا ہے کہ قرآن میں من گھڑت باتیں ہیں۔

☆ مشرکین کو چیلنج دیا ہے کہ وہ قرآن مجید کی کسی ایک سورت کی مثل لا کر دکھادیں۔

☆ مشرکین کو اس بات سے ڈرایا ہے کہ پچھلی جن امتوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی تھی ان پر خوفناک عذاب آیا، اور عذاب آنے کے بعد پھر کسی قوم کے ایمان لانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور حضرت یونس علیہ السلام کی قوم پر یہ عذاب اس لیے نہیں آیا تھا کہ وہ عذاب آنے سے پہلے فوراً ایمان لے آئے تھے۔

☆ مشرکین کی اس پر مذمت کی ہے کہ انہوں نے اللہ کے حلال رزق کو حرام کر لیا تھا۔

☆ اولیاء اللہ کو دنیا اور آخرت کی بشارت دینے کا ذکر فرمایا ہے۔

☆ کفار کی دل آزار باتوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے۔

☆ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو روئے زمین کے سب لوگ ایمان لے آتے۔

☆ انبیاء سابقین میں سے حضرت نوح، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے احوال پر غور کی دعوت ہے۔

☆ اہل کتاب کی شہادت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے صدق کو بیان فرمایا ہے۔

☆ آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین کی ہے کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ اگر تم میرے دین میں شک

کرتے ہو تو میں تو اللہ ہی کی عبادت کروں گا اور اگر (بالفرض) اللہ آپ کو کوئی نقصان پہنچائے تو آپ کو اللہ سے کوئی بچا نہیں سکتا، اور اگر وہ آپ کے لیے کسی خیر کا ارادہ کرے تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا، جس نے ہدایت پائی تو اپنے فائدہ کے لیے اور جو گمراہ ہوا تو اس کا وبال صرف اسی پر ہے۔

سُوْرَةُ يُوْنُسَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّتِسْعُ اٰيٰتٍ وَّاحَدَ عَشَرَ رُكُوْعًا

سُورۃ یونس مکی ہے اس میں ایک سو نو آیتیں اور گیارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

اللہ ہی کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے ۝

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝١ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا المنزل ٣

الف لام را، یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو حکمت سے معمور ہے ۝ کیا لوگوں کو اس پر تعجب ہے

اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ

کہ ہم نے ان ہی میں سے ایک (مقدس) مرد پر وحی نازل کی ہے کہ آپ (غافل) لوگوں کو ڈرائیں اور ایمان والوں کو

اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یہ بشارت دیں کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس (ان کے نیک اعمال کا) بہترین اجر ہے، (اس پر) کافروں نے کہا

اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝٢ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

بے شک یہ شخص تو کھلا جادوگر ہے ۝ بلاشبہ تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور

وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ

زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر جلوہ گر ہوا وہ کائنات کو چلانے کا انتظام

الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ

کرتا ہے، اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہے، یہی اللہ تمہارا پروردگار ہے،

فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝٣ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ

سو تم اس کی عبادت کرو، کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ۝ اسی کی طرف تم سب نے لوٹ کر جانا ہے، یہ اللہ کا

اللّٰہِ حَقًّا ۭ اِنَّہٗ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ
برحق وعدہ ہے، بے شک وہ مخلوق کو ابتداءً پیدا کرتا ہے پھر اس کو دوبارہ پیدا کرے گا تاکہ ان لوگوں کو انصاف کے ساتھ جزا دے

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۭ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَھُمْ
جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور جن لوگوں نے کفر کیا ان

شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِیْمٌۢ بِمَا کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ ﴿۴﴾
کے پینے کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہے کیونکہ وہ کفر کرتے تھے ○

ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَاۗءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَہٗ
وہی ہے جس نے سورج کو روشنی دینے والا بنایا اور چاند کو روشن، اور اس کی منزلیں مقرر

مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ ۭ مَا خَلَقَ
کیں تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب کو جان لو، اللہ نے یہ سب برحق

اللّٰہُ ذٰلِکَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۵﴾
ہی پیدا کیا ہے وہ علم والوں کے لیے (اپنی قدرت کی) نشانیاں واضح کرتا ہے ○

اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ فِی السَّمٰوٰتِ
بے شک رات اور دن کے بدلنے میں اور ہر اس چیز میں جس کو اللہ نے آسمانوں اور

وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ﴿۶﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ
زمینوں میں پیدا کیا ہے ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فکر میں غلطی سے بچتے ہیں ○ درحقیقت جو لوگ ہم سے ملاقات

لِقَاۗءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا وَالَّذِیْنَ
کی توقع نہیں رکھتے اور وہ دنیا کی زندگی سے راضی ہو گئے اور اس پر مطمئن ہیں اور جو لوگ

ھُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾ۙ اُولٰۗئِکَ مَاْوٰىھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا
ہماری آیتوں سے غافل ہیں ○ یہ وہی ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے ان کاموں کی وجہ سے

يَكْسِبُوْنَ ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ
جو وہ کرتے رہے تھے ○ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے ان کا رب ان کو
رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ
ان کے ایمان کی وجہ سے دائمی جنتوں کی طرف ہدایت دے گا جن کے نیچے سے دریا
النَّعِيْمِ ۞ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا
بہتے ہیں ○ اور جنتوں میں ان کی بے ساختہ یہ پکار ہوگی "پاک ہے تو اے اللہ"! اور جنتوں میں ان کی ایک دوسرے کیلئے
سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ ع
یہ دعا ہوگی: "سلام (علیکم)" اور ہر بات کے آخر میں ان کا یہ کہنا ہوگا: "الحمد للہ رب العالمین" ○

ع ۱۰/۱ ۶

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الف لام را، یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو حکمت سے معمور ہے ○ (یونس: ۱)

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے الر کی تفسیر میں فرمایا: انا اللہ اری "میں اللہ دیکھتا ہوں" حضرت ابن عباس سے دوسری روایت یہ ہے کہ الر، حم اور نون مل کر اللہ تعالیٰ کا نام "الرحمٰن" بنتا ہے، اور قتادہ سے یہ روایت ہے کہ یہ حروف قرآن مجید کے اسماء ہیں، ان کی مکمل تفسیر البقرہ: ۱ میں گزر چکی ہے۔

(جامع البیان جز ۱۱ ص ۱۰۵، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۲۱)

کتاب حکیم کی تفسیر میں حسب ذیل اقوال ہیں:

(۱) اس سے مراد تورات اور انجیل ہے اور اس کا معنی یہ ہے: اس سورت میں جو قصص بیان کیے گئے ہیں وہ تورات اور انجیل کے موافق ہیں، حالانکہ (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کتابوں کو پڑھا تھا نہ کسی عالم سے ان کو سنا تھا تو پھر اس موافقت کا حصول اس کے سوا ممکن نہیں ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی تھی اور یہ آپ کی نبوت اور رسالت پر دلیل ہے۔

(۲) الر میں یہ اشارہ ہے کہ یہ کتاب حروف تہجی سے مرکب ہے، اگر یہ اللہ کا کلام نہیں ہے اور کسی انسان کا کلام ہے تو تم بھی ان حروف تہجی سے اس کی مثل کلام بنا کر لے آؤ، اور یہ بھی آپ کی نبوت اور رسالت پر دلیل ہے۔

(۳) اس آیت میں حکیم بہ معنی حاکم ہے، یعنی یہ کتاب اس بات کا حکم دیتی ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعویٰ نبوت میں صادق ہیں، کیونکہ آپ کی نبوت کی دلیل قرآن مجید ہے جس کی مثال لانے سے پوری دنیا عاجز ہے۔

(۴) حکیم بہ معنی محکم ہے یعنی یہ کتاب منسوخ نہیں ہے، اس میں کذب، تناقض اور تضاد نہیں ہے اور حادثات زمانہ سے یہ کتاب مٹ نہیں سکتی اور یہ بھی آپ کی نبوت کی دلیل ہے کیونکہ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ قیامت تک کے نبی ہیں اس لیے آپ کی کتاب بھی بلا کسی تغیر کے قیامت تک باقی رہے گی، اس کے برخلاف دوسرے انبیاء علیہم السلام کیونکہ ایک مخصوص

زمانہ کے لیے نبی تھے اس لیے ان کی کتابیں بھی ان کے بعد تغیرات سے محفوظ نہیں رہیں حتیٰ کہ اب وہ زبان بھی موجود نہیں جس زبان میں یہ کتابیں نازل ہوئی تھیں۔

(۵) حکیم کا معنی ہے یہ کتاب حکمت پر مشتمل ہے، حکمت کا معنی ہے علم اور عقل سے حق تک پہنچنا، اللہ تعالیٰ کی حکمت کا معنی یہ ہے کہ اس کو تمام اشیاء کا علم ہے اور اس نے ان اشیاء کو انتہائی خوبی اور بہتری کے ساتھ پیدا کیا ہے اور انسان کی حکمت یہ ہے کہ اس کو موجودات کی معرفت ہو اور وہ نیک کام کرے اور قرآن مجید کی حکمت یہ ہے کہ اس نے صحیح اور برحق باتیں بیان کی ہیں۔ (المفردات ج ۱ ص ۱۶۸)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا لوگوں کو اس پر تعجب ہے کہ ہم نے ان ہی میں سے ایک (مقدس) مرد پر یہ وحی نازل کی ہے کہ آپ (غافل) لوگوں کو ڈرائیں اور ایمان والوں کو یہ بشارت دیں کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس (ان کے نیک اعمال کا) بہترین اجر ہے (اس پر) کافروں نے کہا بے شک یہ شخص تو کھلا جادوگر ہے O (یونس: ۲)

آپ کی نبوت پر مشرکین کا تعجب اور اس کا ازالہ

مشرکین مکہ حسب ذیل وجوہ سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر تعجب کرتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مشرکین مکہ کہتے تھے کہ اللہ کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ وہ ایک بشر کو رسول بنائے۔ (جامع البیان جز ۱۱ ص ۱۰۷، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۲۲)

قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل: ۹۴) کفار نے کہا کیا اللہ نے بشر کو رسول بنایا؟

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس تعجب کو حسب ذیل آیتوں میں زائل فرمایا:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ O (الانعام: ۹) اور اگر ہم فرشتہ کو رسول بناتے تو اسے مرد ہی بناتے اور ان پر وہی شبہ ڈال دیتے جو شبہ وہ اب کر رہے ہیں۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا O آپ کہئے اگر زمین میں (رہنے والے) فرشتے ہوتے جو اس میں اطمینان سے چلنے والے ہوتے تو ہم ضرور ان کے اوپر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر نازل کرتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا جائے وہ اسی قوم کی جنس سے ہوتا ہے تاکہ اس رسول کا عمل اس قوم کے لیے نمونہ اور حجت ہو، نیز اگر رسول کسی اور جنس سے ہو تو قوم اس سے استفادہ نہیں کر سکتی جیسا کہ عام انسان فرشتوں کو دیکھ سکتے ہیں نہ ان کا کلام سن سکتے ہیں نہ ان کو مس کر سکتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ انسان اور بشر کی طرف انسان اور بشر ہی کو رسول بنا کر بھیجا جائے اور اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ سے یہی سنت رہی ہے چنانچہ اس نے فرمایا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ۔ (یوسف: ۱۰۹) اور ہم نے آپ سے پہلے (بھی) صرف مردوں ہی کو رسول بنایا ہے جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔

نیز ان کو اس بات پر بھی تعجب ہوتا تھا کہ ایک غریب اور یتیم شخص کو کیوں رسول بنایا، کسی امیر کبیر شخص کو رسول کیوں نہیں بنایا؟ چنانچہ وہ کہتے تھے:

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ۔ (الزخرف: ۳۱) مشرکین نے کہا یہ قرآن ان دو شہروں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ فقر نیک صفات کے منافی نہیں ہے اور غنا نیک صفات کا موجب نہیں ہے، سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم فقر کے باوجود اپنی نیکی، خیر، تقویٰ، امانت، دیانت، صلہ رحم اور ایثار وغیرہا کے ساتھ معروف اور مشہور تھے اور آپ کا یتیم ہونا کسی نقصان کا موجب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیم اس لیے رکھا کہ آپ پر والدین کی پرورش کا احسان نہ ہو، کیونکہ آپ کو تمام دنیا پر فضل اور احسان کرنے کے لیے بھیجا تھا کسی کا احسان اٹھانے کے لیے نہیں بھیجا تھا اور مالدار اور غنی ہونا کسی خوبی اور نیکی کو مستلزم نہیں ہے، مکہ میں کتنے مال دار اور غنی تھے لیکن ان کی نیکی اور پرہیزگاری کی شہرت نہیں تھی اور نہ مال اور دولت اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى۔ (سبا: ۳۷)

اور نہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایسی چیزیں ہیں جو تم کو ہمارے قریب کر دیں۔

قدم صدق کے متعدد محامل

اس آیت میں فرمایا ہے کہ آپ ایمان والوں کو بشارت دیجئے کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس قدم صدق ہے، قدم صدق کی حسب ذیل تفسیریں کی گئی ہیں۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ قدم صدق سے مراد منزل صدق ہے، یعنی بہترین مقام اور یہ تفسیر اس آیت سے ماخوذ ہے:

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ۔ (بنی اسرائیل: ۸۰)

آپ کہئے کہ اے میرے رب مجھے بہترین مقام میں داخل فرما اور مجھے بہترین مقام سے باہر لا۔

زجاج نے کہا قدم صدق سے مراد بلند مرتبہ ہے۔ (معانی القرآن للزجاج، ج ۳ ص ٦، مطبوعہ عالم الکتب بیروت)

ماوردی نے کہا اس سے مراد نیک بیٹا ہے جو بچپن میں فوت ہو گیا، کیونکہ قدم کا معنی ہے مقدم اور پیش رو، اور نابالغ بچے قیامت کے دن ماں باپ کے لیے مقدم اور پیش رو ہوں گے۔ حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو یہ تلقین کی کہ وہ اپنے نابالغ بیٹے کی نماز جنازہ میں یہ دعا مانگیں: اے اللہ! اس کو ہمارے لیے مقدم اور پیش رو بنا دے اور اس کو (نیکیوں کا) ذخیرہ اور اجر بنا دے۔ (صحیح البخاری کتاب الجنائز باب: ٦۵)

حسن اور قتادہ نے کہا اس سے مراد سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ آپ مسلمانوں کی شفاعت کرنے والے اور ان پر مقدم ہیں: حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں حوض پر تمہارا پیشرو اور مقدم ہوں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ٦۵۸۳، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۴۹، موطا امام مالک رقم الحدیث: ۵۹)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ آپ میدان محشر میں سب پر مقدم ہوں گے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم (بعثت میں) آخر ہیں اور قیامت کے دن سابق ہیں، (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۸۷٦، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۸۵۵) نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پانچ نام ہیں: میں محمد اور احمد ہوں، اور ماحی (مٹانے والا) ہوں، اللہ میرے سبب سے کفر کو مٹا دے گا اور میں حاشر ہوں لوگوں کا حشر میرے قدموں پر ہو گا اور میں عاقب (سب نبیوں کے بعد آنے والا خاتم النبیین) ہوں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۵۳۲، موطا امام مالک رقم الحدیث: ۱۸۹۱)

مجاہد نے کہا: قدم صدق سے مراد نیک اعمال ہیں۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد نیک اعمال کا اجر ہے۔

یہ تمام محامل امام ابن ابی حاتم نے بیان کیے ہیں۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۲۴۔ ۱۹۲۲)

آپ کو ساحر کہنے کا جواب

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (اس پر) کافروں نے کہا یہ تو کھلا جادوگر ہے۔ کافروں کی مراد یہ تھی کہ قرآن مجید اپنی فصاحت اور بلاغت میں اتنے عظیم مرتبہ پر ہے کہ اس جیسا کلام بنانا غیر ممکن ہے اور اسی وجہ سے یہ جادو ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جادوگر ہیں' ان کے اس کلام کا فاسد اور باطل ہونا بالکل بدیہی اور ظاہر تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب نہیں دیا' کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نشوونما ان کے درمیان ہوئی' اور آپ کا کبھی جادوگروں سے واسطہ نہیں پڑا اور نہ ہی مکہ میں جادو سکھانے والے تھے حتیٰ کہ یہ کہا جاتا کہ آپ نے ان سے جادو سیکھ لیا' پھر آپ کا ایسا کلام پیش کرنا جس کی نظیر لانے سے سب عاجز تھے معجزہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بلاشبہ تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا' پھر وہ عرش پر جلوہ گر ہوا وہ کائنات کو چلانے کا انتظام کرتا ہے' اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہے' یہی اللہ تمہارا پروردگار ہے سو تم اس کی عبادت کرو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے O (یونس: ۳)

مشرکین کے تعجب کو زائل کرنا

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے وحی' بعثت اور رسالت پر کفار کے تعجب کو بیان فرمایا تھا اور اس آیت میں ان کے تعجب کو زائل فرمایا ہے بایں طور کہ جس ذات نے تمام مخلوق کو پیدا فرمایا ہے اس کا اس مخلوق کی طرف ایک رسول کو بھیجنا کوئی بعید نہیں ہے جو اس کی مخلوق کو نیک اعمال پر ثواب کی بشارت دے اور برے اعمال پر عذاب سے ڈرائے کیونکہ اس جہان کا ایک پیدا کرنے والا ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور اس کے احکام نافذ ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور وہی اس کائنات کے نظام کو چلا رہا ہے' نیز وہی ثواب اور عذاب دینے والا ہے کیونکہ اس دنیا کی زندگی کے بعد سب نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے' اس لیے تمام مخلوق کو اسی کی عبادت کرنی چاہیے۔

آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کرنے اور عرش پر جلوہ گر ہونے کی تفسیر ہم الاعراف: ۵۴ میں بیان کر چکے ہیں' نیز عرش کی مزید تفسیر ہم نے التوبہ: ۱۲۹ میں بیان کی ہے اور شفاعت کی تفسیر البقرہ: ۴۸ میں اور عبادت کی تفسیر الفاتحہ: ۴ میں بیان کر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اسی کی طرف تم سب نے لوٹ کر جانا ہے' یہ اللہ کا برحق وعدہ ہے' بے شک وہ مخلوق کو ابتداءً پیدا کرتا ہے' پھر اس کو دوبارہ پیدا کرے گا' تاکہ ان لوگوں کو انصاف کے ساتھ جزا دے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے' اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہے کیونکہ وہ کفر کرتے تھے O (یونس: ۴)

حشر اجساد پر دلائل

کفار اور مشرکین مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے' حشر اور جزاء اور سزا کا انکار کرتے تھے' اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حشر اجساد پر بہت زور دیا ہے اور دوبارہ زندہ کرنے پر بہت دلائل قائم کیے ہیں' ان میں سے چند دلائل حسب ذیل ہیں:

(۱) ہم دیکھتے ہیں کہ زمین ایک موسم (خزاں) میں مردہ ہوتی ہے اس پر خشکی غالب ہوتی ہے' پھر ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے موسم (بہار) میں اس پر بارش ہوتی ہے اور وہ زمین زندہ ہو جاتی ہے' اس میں کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں اور بکثرت پھل' پھول اور غلہ پیدا ہوتا ہے' پھر پہلا موسم لوٹ آتا ہے اور وہ زمین مردہ ہو جاتی ہے اور دوسرے موسم میں پھر بارشیں ہوتی ہیں اور پھر

وہ زمین زندہ ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے تو جو زمین کو ایک بار زندہ کرتا ہے پھر مار دیتا ہے اور پھر زندہ کر دیتا ہے تو کیا اس میں یہ نشانی نہیں ہے کہ وہ انسانوں کو بھی مار کر پھر زندہ کرے گا۔

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۔ (فاطر: ۹)

اور اللہ جو ہواؤں کو بھیجتا ہے جو بادل اٹھا لاتی ہیں، پھر ہم بادل کو مردہ شہر کی طرف لے جاتے ہیں، پھر ہم اس کے سبب سے زمین کے مردہ ہونے کے بعد اس کو زندہ کر دیتے ہیں، اسی طرح (قبروں سے) اٹھنا ہے۔

(۲) ہم میں سے ہر شخص اپنا مشاہدہ کرتا ہے کہ کسی بیماری یا عارضہ کی وجہ سے اس کا جسم دبلا ہو جاتا ہے، پھر صحت مند ہونے کے بعد مقوی غذائیں اور فربہ کرنے والی خوراک کھانے سے وہ پھر موٹا اور فربہ ہو جاتا ہے اور پھر کسی عارضہ کی وجہ سے کمزور اور دبلا ہو جاتا ہے اور پھر دوبارہ موٹا ہو جاتا ہے اور کمزوری بمنزلہ موت اور فربہی بمنزلہ حیات ہے تو اللہ تعالیٰ ہمارے جسموں کو کمزور اور دبلا کرنے کے بعد دوبارہ پھر موٹا اور طاقتور کرنے پر قادر ہے اسی طرح وہ ہم کو مارنے کے بعد پھر دوبارہ زندہ کر دینے پر بھی قادر ہے، اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ برسات کے موسم میں مینڈک اور دوسرے برساتی جانور اچانک مٹی سے پیدا ہو جاتے ہیں اور برسات کا موسم ختم ہوتے ہی مر کھپ جاتے ہیں پھر دوبارہ برسات آنے پر وہی جانور دوبارہ پھر پیدا ہو جاتے ہیں تو کیا ان نشانیوں سے یہ واضح نہیں ہو جاتا کہ وہ تمام انسانوں کو مارنے کے بعد دوبارہ پھر پیدا کر دے گا!

(۳) اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی سابق مثال اور نمونہ کے ابتداءً انسانوں کو پیدا فرمایا ہے تو دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے کیا مشکل ہے! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ (یونس: ۳۴)

آپ کہئے کہ اللہ ہی ابتداءً پیدائش کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ فرمائے گا سو تم لوگ کہاں بھٹک رہے ہو۔

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۔ (یٰس: ۷۹-۷۸)

اس (مشرک) نے کہا ہڈیوں کے بوسیدہ ہو جانے کے بعد ان کو، کون زندہ کرے گا؟ ۝ آپ کہئے کہ وہی ان کو زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے بہت بڑے بڑے پہاڑ اور آسمان اور زمین پیدا کیے تو وہ مردہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنے پر کیوں قادر نہیں ہے!

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۔ (الاحقاف: ۳۳)

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور ان کو پیدا کرنے کے بعد تھکا نہیں وہ (ضرور) مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا ۔ (النازعات: ۲۷)

کیا (تمہارے نزدیک) تمہارا بنانا زیادہ سخت ہے یا آسمان کا بنانا۔

(۵) نیند ایک قسم کی موت ہے، انسان پر نیند کے بعد بیداری اور بیداری کے بعد موت کے احوال طاری ہوتے رہتے ہیں تو جو سوئے ہوئے شخص کو دوبارہ بیدار کر دیتا ہے وہ مردہ کو دوبارہ زندہ کیوں نہیں کر سکتا!

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ

اللہ موت کے وقت روحوں کو قبض کرتا ہے اور جن کی

تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (الزمر: ۴۲)

موت نہیں آئی ان کی نیند میں روح قبض کرتا ہے، پھر جس کی موت کا حکم فرمادیا اس کی روح کو روک لیتا ہے اور دوسرے کی روح کو ایک میعاد مقرر تک چھوڑ دیتا ہے' بے شک اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے ضرور نشانیاں ہیں○

(٦) حیات موت کی ضد ہے' اور اللہ تعالیٰ ایک چیز کے بعد اس کی ضد کو پیدا کرنے پر قادر ہے جس طرح نور کے بعد ظلمت اور ظلمت کے بعد نور اور دن کے بعد رات' اور رات کے بعد دن' سو اسی طرح وہ موت کے بعد حیات پیدا کرنے پر قادر ہے۔

عدل کے ساتھ جزا دینے کی توجیہ

حشر اجساد قائم کرنے سے مقصود یہ ہے کہ مسلمان اور کافر اور نیک اور بد کے درمیان فرق کو ظاہر کیا جائے' نیک شخص کو اس کی نیکی پر اجر دیا جائے اور بدکار کو اس کی بدی پر سزا دی جائے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک وہ مخلوق کو ابتداءً پیدا کرتا ہے پھر وہ اس کو دوبارہ پیدا کرے گا تاکہ وہ ان لوگوں کو عدل و انصاف کے ساتھ جزا دے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہے کیونکہ وہ کفر کرتے تھے۔ اس آیت میں فرمایا ہے کہ نیک مسلمانوں کو اجر عطا فرمانا اللہ تعالیٰ کا عدل ہے یعنی ان کو ان کی نیکیوں کا پورا پورا اجر ملے گا اور ان کے اجر میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی' اسی طرح قرآن مجید کی اور آیتوں میں بھی ہے:

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْۤ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (الزخرف: ۷۲)

اور یہ ہے وہ جنت جس کے تم ان (نیک) کاموں کے سبب سے وارث کیے گئے ہو جو تم دنیا میں کرتے تھے۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۤئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔ (النحل: ۳۲)

وہ (نیک مسلمان) جن کی فرشتے روحیں قبض کرتے ہیں درآں حالیکہ وہ خوش ہوتے ہیں' کہتے ہیں کہ تم ان (نیک) کاموں کے سبب سے جنت میں داخل ہو جاؤ جن کو تم کرتے تھے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ○ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ○ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ (المرسلات: ۴۴-۴۱)

بے شک نیک مسلمان سائے اور چشموں میں ہوں گے○ اور اپنی خواہش سے پھلوں میں○ مزے سے کھاؤ پیو ان (نیک) کاموں کے سبب سے جو تم کرتے تھے○ بے شک ہم نیک کام کرنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔

اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ ایک حدیث ان آیات کے معارض ہے:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تم میں سے کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا اور نہ دوزخ سے پناہ میں رکھے گا اور نہ مجھ کو' سوا اس کے کہ اللہ رحم فرمائے' ایک اور روایت میں ہے سوا اس کے کہ اللہ فضل فرمائے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۸۱۷' مسند احمد ج ۲ ص ۵۰۹' مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۲۳۷۲' کنز العمال رقم الحدیث: ۱۰۳۸۴)

اور متکلمین اہلسنت نے کہا ہے کہ نیکوں کو ثواب دینا اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور کافروں کو عذاب دینا اللہ تعالیٰ کا عدل ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ نیکیوں پر اجر و ثواب عطا کرنا حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور حدیث اسی معنی پر محمول ہے' اور ان

آیات میں نیک کاموں کو جو اجر و ثواب کا سبب قرار دیا ہے یہ اسناد بہ اعتبار ظاہر کے ہے اور بندے کی نیکیوں کو اجر و ثواب کا سبب قرار دینا یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کرم اور اس کا فضل ہے تاکہ بندہ خوش رہے اور نیک کاموں کے لیے اس کا جذبہ برقرار رہے اور اس کا حوصلہ بڑھتا رہے کہ وہ جو نیک کام کر رہا ہے وہ بے ثمر اور بے مقصد نہیں ہے' اللہ تعالیٰ ان نیکیوں سے خوش ہوتا ہے اور ان پر انواع و اقسام کی جنت کی دائمی نعمتیں عطا فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہی ہے جس نے سورج کو روشنی دینے والا بنایا اور چاند کو روشن' اور اس کی منزلیں مقرر کیں تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب کو جان لو' اللہ نے یہ سب برحق ہی پیدا کیا ہے' وہ علم والوں کے لیے (اپنی قدرت کی) نشانیاں واضح کرتا ہے○ بے شک رات اور دن کے بدلنے میں اور ہر اس چیز میں جس کو اللہ نے آسمانوں اور زمینوں میں پیدا کیا ہے ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو (فکر میں غلطی سے) بچتے ہیں○ (یونس: ٦-٥)

سورج سے الوہیت اور توحید پر استدلال

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش سے الوہیت اور توحید پر استدلال کیا تھا' اور اس آیت میں سورج اور چاند کو پیدا کرنے سے توحید پر استدلال کیا ہے' اس استدلال کی تقریر یہ ہے کہ سورج' چاند اور باقی تمام سیارے بحیثیت جسم سب مساوی ہیں' اب سورج کو اس وضع مخصوص اور صفات مخصوصہ عطا کرنے کے لیے کوئی مرجح ہونا چاہیے اور وہ مرجح واجب الوجود اور قدیم بالذات ہونا چاہیے کیونکہ ممکن اور حادث تو اپنے وجود میں پھر کسی مرجح کا محتاج ہوگا اور واجب الوجود کا واحد ہونا ضروری ہے کیونکہ اگر دو واجب الوجود ہوں تو ان میں ایک امر مشترک ہوگا اور ایک امر مخصص اور ممیز ہوگا اور جو دو چیزوں سے مرکب ہو وہ اپنے اجزاء کا محتاج ہوتا ہے اور مرکب اور محتاج حادث اور ممکن ہوتا ہے واجب اور قدیم نہیں ہوتا پس ثابت ہوا کہ سورج کی وضع مخصوص اور اس کی صفات مخصوصہ ذاتی نہیں ہیں کیونکہ سورج جسم ہونے میں تمام اجسام کے مساوی ہے سو اگر یہ اس کی جسمیت کا تقاضا ہوں تو تمام اجسام سورج کی طرح ہونے چاہئیں' اس لیے اس وضع اور ان صفات کے لیے کوئی مرجح ہونا چاہیے اور ہم بتا چکے ہیں کہ وہ مرجح واجب الوجود' قدیم اور واحد ہونا چاہیے اور واجب الوجود' قدیم اور واحد اللہ عزوجل ہی کی ذات ہے اور جب وہ سورج کا خالق ہے تو تمام کائنات کا وہی خالق ہے کیونکہ جو دلیل سورج میں جاری ہوئی ہے وہی ساری کائنات میں جاری ہوگی پس ثابت ہوگیا کہ تمام کائنات کا خالق اللہ ہے اور وہ واحد لاشریک ہے۔

تاریخ کا تعین قمری حساب سے کرنا چاہیے

سورج اور چاند کی روشنیوں میں مخلوق کے بہت فائدے ہیں' سورج کی روشنی سے دن میں کاروبار ہوتا ہے اور اس کی حرکت سے مختلف موسم وجود میں آتے ہیں جس سے اس دنیا کی مصلحتیں حاصل ہوتی ہیں اور چاند کی حرکت سے مہینوں اور سالوں کی گنتی اور حساب کا حصول ہوتا ہے' قرآن مجید کی اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تقویم اور تاریخ کا تعین قمری حساب سے کرنا چاہیے نہ کہ شمسی حساب سے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ دن اور رات کے اختلاف میں اور آسمانوں اور زمینوں میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر نشانیاں ہیں اور ان میں اس کی الوہیت اور توحید پر دلیلیں ہیں' اس پر مفصل گفتگو ہم البقرہ ۱۶۴ میں کرچکے ہیں' اس کی تفسیر کو وہاں دیکھ لیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: درحقیقت جو لوگ ہم سے ملاقات کی توقع نہیں رکھتے اور وہ دنیا کی زندگی سے راضی ہوگئے

اور اس پر مطمئن ہیں اور جو لوگ ہماری آیتوں سے غافل ہیں ○ یہ وہی ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے ان کاموں کی وجہ سے جن کو وہ کرتے رہے تھے ○ (یونس: ۸-۷)

منکرین حشر کے احوال

ان آیتوں سے اللہ سبحانہ نے ان لوگوں کے احوال شروع کیے ہیں جو حشر (مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے) پر ایمان نہیں لاتے اور جو حشر پر ایمان لاتے ہیں، اور ان لوگوں کا پہلے ذکر کیا جو حشر پر ایمان نہیں لاتے کیونکہ اس سورت میں ان لوگوں کے ساتھ خطاب ہے، جو ان باتوں پر تعجب کرتے ہیں جن پر تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اور ان چیزوں میں غور و فکر نہیں کرتے جن میں غور و فکر کرنا چاہیے - مذکور الصدر آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان شقی القلب لوگوں کا حال بیان کیا ہے جو قیامت کے دن اللہ سبحانہ سے ملاقات کا انکار کرتے تھے اور اللہ عزوجل سے ملاقات کی بالکل توقع نہیں رکھتے تھے، وہ اس دنیا کی زندگی پر راضی تھے اور ان کے دل اس سے مطمئن تھے - حسن بصری نے کہا یہ لوگ کائنات میں پھیلی ہوئی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں تدبر اور تفکر نہیں کرتے تھے اور اللہ عزوجل کے احکام پر عمل نہیں کرتے تھے، سو حشر کے دن ان کا ٹھکانا جہنم ہو گا کیونکہ انہوں نے دنیا میں جرائم اور گناہ کیے اور اس کے علاوہ وہ اللہ، رسول اور آخرت کا انکار کرتے تھے -

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لا یرجون لقاءنا، رجاء کے معنی یہاں خوف ہیں یعنی وہ اللہ کے عذاب سے نہیں ڈرتے تھے، اور ایک قول یہ ہے کہ رجاء کے معنی یہاں طمع ہیں یعنی وہ اللہ سبحانہ کے اجر و ثواب کی طمع نہیں رکھتے تھے یا اللہ تعالیٰ کے دیدار کی طمع نہیں رکھتے تھے تاہم مناسب یہ ہے کہ یہاں رجاء کا معنی توقع لیا جائے جو حقیقت کے قریب ہے یعنی وہ ہم سے ملاقات کی توقع نہیں رکھتے تھے کیونکہ وہ حشر کے منکر تھے لہٰذا وہ عذاب سے ڈرتے تھے نہ ثواب کی طمع رکھتے تھے -

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، ان کا رب ان کو ان کے ایمان کی وجہ سے دائمی جنتوں کی طرف ہدایت دے گا جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں ○ (یونس: ۹)

حشر پر ایمان لانے والوں کے احوال

اس رکوع کی آخری دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے احوال بیان فرمائے ہیں جو اللہ اور رسول اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو مانا اور نیک عمل کیے، اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کے سبب انہیں قیامت کے دن جنت کی طرف ہدایت دے گا بایں طور کہ ان کو سلامتی کے ساتھ پل صراط سے گزار دے گا اور وہ جنت تک پہنچ جائیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بایمانھم میں باء استعانت کے لیے ہو، کیونکہ قتادہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ مومن کے اعمال کو حسین صورتوں میں متمثل کر دیا جائے گا جن سے خوشبو آ رہی ہو گی، جب وہ قبر سے اٹھے گا تو وہ حسین صورت اس سے ملاقات کر کے اس کو جنت کی بشارت دے گی - مومن پوچھے گا تم کون ہو؟ وہ صورت کہے گی میں تمہارا عمل ہوں، پھر اس کے سامنے نور بچھا دیا جائے گا حتیٰ کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا اور یہی اس آیت کا معنی ہے کہ ان کا رب ان کو دائمی جنتوں کی طرف ہدایت دے گا، اور کافر کے اعمال کو بھیانک اور ڈراونی شکل میں متشکل کر دیا جائے گا جس سے بدبو آ رہی ہو گی - وہ ڈراونی شکل کافر سے چمٹ جائے گی اور اس کو دوزخ میں ڈال کر آئے گی -

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۶۱۶، تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۰۲۳۷)

جنت میں دخول کا سبب کیا چیز ہے، اس میں اہلسنت اور معتزلہ کا اختلاف ہے - معتزلہ کے نزدیک ایمان اور اعمال صالحہ

دونوں مل کر جنت میں دخول کا سبب ہیں اور اہلسنّت کے نزدیک صرف ایمان دخول جنت کا سبب ہے، اگر کوئی شخص ایمان لایا اور اس نے نیک عمل نہیں کیے یا برے عمل کیے تو وہ محض اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے یا اپنے گناہوں کی سزا پا کر جنت میں چلا جائے گا اور یہ آیت اہلسنّت کی مؤید ہے کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اللہ ان کو ان کے ایمان کے سبب سے دائمی جنتوں کی ہدایت دے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جنتوں میں ان کی (بے ساختہ) یہ پکار ہوگی: "پاک ہے تو اے اللہ!" اور جنتوں میں ان کی ایک دوسرے کے لیے یہ دعا ہوگی: "سلام (علیکم)" اور ہر بات کے آخر میں ان کا یہ کہنا ہوگا: "الحمد للہ رب العلمین O" (یونس: ۱۰)

اہل جنت کی گفتگو کا معمول

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ نیک عمل کرنے والے مومنین جنت میں ہوں گے اور اس آیت میں یہ بیان فرما رہا ہے کہ ان کے جنت میں کیا معمولات ہوں گے، اور اس آیت میں بتایا ہے کہ جس طرح مومنین دنیا میں سبحان اللہ کہتے تھے اور ہر قسم کے عیب سے اللہ تعالیٰ کی براءت اور تنزیہ بیان کرتے تھے سو اسی طرح جنت میں بھی وہ ہر وقت تسبیح اور تقدیس کرتے رہیں گے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ دعوٰھم کا معنی ہے ان کی تمنا یعنی ان کی تمنا اور آرزو یہ ہوگی کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تقدیس کرتے رہیں۔ اور بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نیک مسلمانوں سے ثواب عظیم کا وعدہ فرمایا تھا (تاکہ ان لوگوں کو انصاف کے ساتھ جزا دے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے' یونس: ۴) پس جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے اور جنت کی ان عظیم نعمتوں کو دیکھیں گے تو ان کو تصدیق ہو جائے گی کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے جو ان نعمتوں کے دینے کا وعدہ کیا تھا وہ سچا تھا، تو وہ اس وقت بے ساختہ کہیں گے سبحانک اللّٰھم یعنی اے اللہ! تو اس بات سے پاک ہے کہ تو وعدہ کر کے پورا نہ فرمائے یا تیرا قول صادق نہ ہو۔

اس کے بعد فرمایا: جب وہ ایک دوسرے سے ملاقات کریں گے تو کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو، اور اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو وہی دعائیں دیں گے جو فرشتے ان کو دعائیں دیں گے اور فرشتوں کی دعا یہ ہے:

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ۔ (الرعد: ۲۳۔۲۴) اور فرشتے ہر دروازہ سے ان پر (یہ کہتے ہوئے) داخل ہوں گے "سلام علیکم" (تم پر سلامتی ہو)

پھر فرمایا: اور ہر بات کے آخر میں ان کا یہ کہنا ہوگا: "الحمد للہ رب العٰلمین" یعنی ان کی گفتگو کا آغاز اللہ تعالیٰ کی تسبیح سے ہوگا اور ان کی گفتگو کا اختتام اللہ تعالیٰ کی حمد پر ہوگا۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ

اور اگر اللہ لوگوں (کی بداعمالیوں کی سزا میں ان) کو نقصان پہنچانے میں بھی اتنی جلدی کرتا جتنی جلدی وہ (دنیا کے) نفع کی طلب میں

اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ

کرتے ہیں تو انہیں (کب کی) موت آچکی ہوتی (لیکن) جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ہم انہیں ڈھیل دیتے ہیں تاکہ وہ

طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١١﴾ وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا

اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں ○ اور جب انسان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ

لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا ج فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ

پہلو کے بل یا بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے ہم سے دعا کرتا ہے، پس جب ہم اس سے اس مصیبت کو دور کر دیتے ہیں تو وہ

كَأَن لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَّسَّهُ ط كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ

اس طرح گذر جاتا ہے گویا جب اس کو وہ مصیبت پہنچی تھی تو اس نے ہم کو پکارا ہی نہ تھا، اسی طرح حد سے تجاوز کرنے

مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢﴾ وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِن قَبْلِكُمْ

والوں کے کرتوت ان کے لیے خوش نما بنا دیے گئے ہیں ○ (لوگو!) ہم نے تم سے پہلے کی ان قوموں کو ہلاک کر دیا تھا

لَمَّا ظَلَمُوا لا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا

جنہوں نے ظلم کیا تھا اور ان کے پاس ان کے رسول معجزات لے کر آئے تھے اور انہوں نے

لِيُؤْمِنُوا ط كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٣﴾ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ

ایمان لا کر نہ دیا، اور ہم مجرم قوم کو اسی طرح سزا دیتے ہیں ○ پھر ہم نے ان کے بعد

خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِن بَعْدِهِمْ لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿١٤﴾

تم کو زمین میں ان کا جانشین بنایا تاکہ ہم یہ ظاہر فرمائیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو ○

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ

اور جب ان پر ہماری روشن آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو جن لوگوں کو ہمارے سامنے حاضر ہونے کی

لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ط قُلْ مَا يَكُونُ

توقع نہیں ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی اور قرآن لاؤ یا اسی کو تبدیل کر دو، آپ کہیے کہ اس کو

لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي ج إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ج

تبدیل کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے، میں صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جس کی میری طرف وحی کی جاتی ہے،



اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٥﴾ قُلْ

اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں عظیم دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ○ آپ کہیے

لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ

اگر اللہ چاہتا تو میں تم پر اس (قرآن) کی تلاوت نہ کرتا اور نہ تم کو اس کی اطلاع دیتا، پھر بے شک اس (نزولِ قرآن) سے پہلے

فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٦﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ

میں تم میں عمر (کا ایک حصہ) گزار چکا ہوں، کیا تم (پھر) نہیں سمجھتے ○ پس اس سے زیادہ اور کون ظالم ہو گا جو

افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ

جھوٹ بول کر اللہ پر بہتان تراشے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے، بے شک مجرم فلاح

الْمُجْرِمُوْنَ ﴿١٧﴾ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ

نہیں پاتے ○ اور وہ اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں

وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ

نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے پاس ہماری سفارش کرنے والے ہیں،

قُلْ اَتُنَبِّـــُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي

آپ کہیے کہ کیا تم اللہ کو ایسی بات کی خبر دیتے ہو جس کا اللہ کو نہ آسمانوں میں علم ہے نہ

الْاَرْضِ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿١٨﴾ وَمَا كَانَ

زمینوں میں، وہ ان تمام چیزوں سے بری اور بلند ہے جن کو تم اس کے ساتھ شریک کرتے ہو ○ اور پہلے تمام

النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ

لوگ صرف ایک امت تھے، پھر مختلف ہو گئے، اور اگر آپ کے رب کی طرف سے

سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١٩﴾

ایک امر پہلے ہی مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو جن چیزوں میں یہ اختلاف کر رہے ہیں ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ○

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا

اور کہتے ہیں کہ اس (رسول) پر اس کے رب کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل کیا گیا آپ کہیے کہ

الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿٢٠﴾

غیب تو صرف اللہ ہی کے لیے ہے، سو تم بھی انتظار کرو اور میں انتظار کرنے والوں میں سے ہوں○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر اللہ لوگوں (کی بداعمالیوں کی سزا میں ان) کو نقصان پہنچانے میں بھی اتنی جلدی کرتا جتنی جلدی وہ (دنیا کے) نفع کی طلب میں کرتے ہیں تو انہیں (کب کی) موت آچکی ہوتی (لیکن) جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ہم انہیں ڈھیل دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں○ (یونس: ١١)

اپنے آپ کو، اپنی اولاد کو اور اپنے اموال کو بددعا دینے کی ممانعت

اس سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے اس شبہ کا جواب دیا تھا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنانے کی کیا خصوصیت تھی، اس کے بعد درمیان میں مومنوں کا ذکر فرمایا اور اب اس آیت میں پھر مشرکین کے دوسرے شبہ کا جواب دیا ہے، وہ یہ کہتے تھے کہ اگر (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے دعویٰ نبوت میں سچے ہیں اور ہم ان کی مخالفت کرتے ہیں تو ان کی مخالفت کی وجہ سے ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا! اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ جواب دیا کہ اگر تمہارے مطالبہ کی وجہ سے تم پر جلد عذاب بھیج دیا جاتا تو اب تک تمہارا کام تمام ہو چکا ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ تم کو اس لیے ڈھیل دیتا ہے کہ تم اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہو۔ (اللباب ج ١٠ ص ٢٧٥، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ١٤١٩ھ)

مجاہد نے یہ کہا ہے کہ اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی اولاد پر غضبناک ہو تو ان کے خلاف یہ دعا نہ کرے کہ اے اللہ! ان کو برکت نہ دے اور اے اللہ ان پر لعنت فرما ورنہ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول کر لی تو وہ ان کو ہلاک کر دے گا۔ (جامع البیان جز ١١ ص ١٢٢، تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ١٠٢٥٥)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بواط کی جنگ میں گئے۔ آپ مجدی بن عمرو جہنی کو ڈھونڈ رہے تھے، ایک اونٹ پر ہم پانچ، چھ اور سات آدمی باری باری بیٹھتے تھے، ایک انصاری اونٹ پر بیٹھنے لگا، اس نے اونٹ کو بٹھایا پھر اس پر سوار ہوا پھر اس کو چلانے لگا۔ اونٹ نے اس کے ساتھ کچھ سرکشی کی، اس نے اونٹ کو کہا شأ اللہ تجھ پر لعنت کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا اونٹ پر لعنت کرنے والا کون شخص ہے؟ اس نے کہا یا رسول اللہ! یہ میں ہوں! آپ نے فرمایا: اس اونٹ سے اتر جاؤ، ہمارے ساتھ کسی ملعون جانور کو نہ رکھو، اپنے آپ کو بددعا دو، نہ اپنی اولاد کو بددعا دو اور نہ اپنے اموال کو بددعا دو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ وہ ساعت ہو جس میں اللہ سے کسی عطا کا سوال کیا جائے تو وہ دعا مستجاب ہوتی ہو۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ٣٠٠٩)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب انسان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ پہلو کے بل یا بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے ہم سے دعا کرتا ہے، پس جب ہم اس سے اس مصیبت کو دور کر دیتے ہیں تو وہ اس طرح گزر جاتا ہے گویا جب اس کو وہ مصیبت پہنچی تھی تو اس نے ہم کو پکارا ہی نہ تھا، اسی طرح حد سے تجاوز کرنے والوں کے کرتوت ان کے لیے خوش نما بنا دیئے گئے ہیں○ (یونس: ١٢)

کافر کے مُسرِف ہونے کی وجوہ

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ اگر کفار کے مطالبہ پر دنیا میں جلد عذاب نازل کر دیا جاتا تو اب تک وہ سب مر چکے ہوتے اور اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ وہ بہت کمزور اور نہایت عاجز ہیں، ان پر اگر تھوڑی سی مصیبت بھی آئے تو وہ گھبرا کر اس مصیبت کو دور کرنے کی دعائیں کرنے لگتے ہیں۔

یہ آیت مومن اور کافر دونوں کے احوال کو عام ہے، کیونکہ اکثر مسلمانوں کا بھی یہ حال ہے کہ وہ مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعائیں کرتے ہیں اور جب اللہ اپنے فضل سے اس مصیبت کو دور کر دیتا ہے تو وہ اس کو اس طرح بھول جاتے ہیں جیسے کسی مصیبت کے وقت میں انہوں نے اللہ کو پکارا ہی نہ تھا!

نزولِ مصیبت کے وقت مسلمانوں کی فکر اور عمل کیا ہونا چاہیے

مسلمانوں پر جب کوئی مصیبت نازل ہو تو ان پر حسب ذیل امور کی رعایت کرنا لازم ہے۔

(۱) مسلمانوں کو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ ان پر جو مصیبت نازل ہوئی ہے وہ ان کی تقدیر میں لکھی ہوئی تھی اور ان سے ٹل نہیں سکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ۔ (الحدید: ۲۳-۲۲)

ہر مصیبت جو زمین میں اور تمہاری جانوں میں پہنچتی ہے وہ ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے، اس سے پہلے کہ ہم اس مصیبت کو پیدا کریں، بے شک یہ اللہ پر بہت ہی آسان ہے○ یہ اس لیے ہے کہ جو چیز تمہارے پاس سے جاتی رہے تم اس پر غم نہ کرو اور جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے اس پر تم اترایا نہ کرو۔

سو مسلمان کو اللہ کی تقدیر پر راضی اور مطمئن رہنا چاہیے، وہ زبان سے اللہ تعالیٰ کا شکوہ کرے نہ دل میں اللہ عزوجل سے کوئی شکایت کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ مالک علی الاطلاق ہے اور وہ اپنے ملک میں جو چاہے کرے کسی کو اس پر اعتراض یا شکایت کا کوئی حق نہیں ہے، اور وہ حکیم مطلق ہے اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں اور اس کا کوئی فعل عبث اور باطل نہیں۔ اگر وہ اس کو اس مصیبت، تکلیف یا مرض پر باقی رکھے تو یہ اس کا عدل ہے اور اگر وہ اس سے اس مصیبت یا آفت کو زائل کر دے تو یہ اس کا فضل ہے اور بندے پر لازم ہے کہ وہ اس مصیبت پر صبر کرے اور رنج اور قلق کے اظہار کو ترک کر دے۔

(۲) بندہ کو اس مصیبت پر صبر کرنا چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بہت اجر عطا فرماتا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ (البقرہ: ۱۵۷-۱۵۵)

اور ہم تم کو ضرور کچھ ڈر اور بھوک اور مال اور جان کے نقصان اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو بشارت دیجئے○ کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں○ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی جانب سے صلوات (ثنا اور تحسین) اور رحمت ہے اور یہی وہ ہدایت یافتہ ہیں۔

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ-(الزمر: ۱۰)

اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ صبر کرنے والوں کو ان کا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا۔

(۳) نیز بندے کو چاہیے کہ وہ اپنے دل میں یہ سوچے کہ اس پر جو مصیبت آئی ہے وہ اس کے کسی گناہ کا نتیجہ ہے۔ سو اسے اس گناہ پر توبہ کرنا چاہیے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ-(الشوریٰ:۳۰)

اور تم کو جو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھ کی کمائی کی وجہ سے پہنچتی ہے اور (تمہاری) بہت سی خطاؤں کو تو وہ معاف کر دیتا ہے۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ-(النساء: ۷۹)

(اے مخاطب!) تجھ کو جو بھلائی پہنچی ہے تو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور تجھ کو جو برائی پہنچی ہے وہ تیرے نفس کی شامت اعمال کی وجہ سے ہے۔

(۴) جب کسی مسلمان بندے پر مصیبت آئے تو اس کو اس مصیبت سے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ یہ سوچ کر خوش ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس مرض' آفت یا مصیبت کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دے گا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان کو کوئی کانٹا چبھے یا اس سے زیادہ تکلیف ہو تو اللہ اس تکلیف کی وجہ سے اس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے اور اس کا ایک گناہ مٹا دیتا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۵۶۴۷' صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۵۷۲' سنن الترمذی رقم الحدیث:۹۶۵' موطا امام مالک رقم الحدیث:۱۹۷۷' مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:۲۰۳۱۲' صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۲۹۲۵' سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۱۵۹۹۴)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس مسلمان کو کوئی مصیبت پہنچے خواہ وہ تھکاوٹ ہو' غم ہو یا قرض یا بیماری ہو حتیٰ کہ کوئی فکر ہو جس کی وجہ سے وہ پریشان ہو رہا ہو' تو اللہ اس مصیبت کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۵۶۴۱' صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۵۷۳' سنن ترمذی رقم الحدیث:۹۶۶' مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث:۱۲۵۶)

(۵) جب مسلمان پر کوئی مصیبت آئے تو اس کو اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے' اللہ تعالیٰ اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ بندہ اس سے دعا کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً-(الاعراف:۵۵)

اپنے رب سے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعا کرو۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ سے اس کے فضل سے سوال کرو کیونکہ اللہ عزوجل اس کو پسند کرتا ہے کہ اس سے سوال کیا جائے' اور افضل عبادت کشادگی کا انتظار کرنا ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۵۷۱' المعجم الکبیر رقم الحدیث:۱۰۰۸۸' الکامل لابن عدی ج ۲ ص ۶۶۵)

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روئے زمین پر جو مسلمان بھی اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا کرتا ہے تو اللہ اس کی وہ دعا پوری کر دیتا ہے' یا اس دعا کی مقدار کے برابر اس سے کوئی مصیبت دور کر دیتا ہے بشرطیکہ وہ اللہ سے کسی گناہ کا سوال نہ کرے یا قطع رحم کا سوال نہ کرے' مسلمانوں میں سے ایک شخص نے کہا: پھر تو ہم بہت زیادہ دعا کریں گے۔ آپ نے فرمایا: اللہ بہت زیادہ قبول فرمانے والا ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۵۷۳، مسند احمد ج ۵ ص۳۲۹، المعجم الاوسط رقم الحدیث:۱۴۷، کتاب الدعا للطبرانی رقم الحدیث:۶۷، شرح السنہ رقم الحدیث:۱۳۸۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب ہم میں سے کوئی شخص بیمار ہو جاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر دایاں ہاتھ پھیرتے اور یہ دعا فرماتے: اے لوگوں کے رب! اس مصیبت کو دور کردے، اور شفا دے تو ہی شفا دینے والا ہے، تیرے سوا کوئی شفا دینے والا نہیں ہے، ایسی شفا دے جو کسی بیماری کو نہ چھوڑے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۱۹۱، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۱۶۱۹)

(۶) جب کسی مسلمان پر کوئی افتاد پڑے اور وہ اپنی مصیبت کو دور کرنے کی دعا کے بجائے قرآن مجید کی تلاوت اور اس کے مضامین کے مطالعہ اور استنباط مسائل میں مصروف رہے تو اللہ تعالیٰ اس کو دعا کرنے والوں سے زیادہ عطا فرماتا ہے:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رب عزوجل ارشاد فرماتا ہے: جس شخص کو میری یاد اور مجھ سے سوال کرنے کو قرآن نے مشغول رکھا تو میں اس کو سوال کرنے والوں سے زیادہ عطا فرماتا ہوں۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۹۲۶، مسند احمد ج ۳ ص۳۹۰، مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۱۴، ص۳۱۰، سنن الدارمی رقم الحدیث: ۳۳۵۷، سنن ابو داؤد رقم الحدیث:۴۷۳۴، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۲۰۱)

(۷) اللہ سبحانہ جب مسلمان سے مصیبت کو دور کردے تو اس کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ شکر ادا کرے اور خلوت اور جلوت اور تنگی اور آسانی میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہے، کیونکہ شکر کرتے رہنے سے نعمت میں اضافہ ہوتا اور ناشکری کرنے سے زوال نعمت کا خطرہ ہے۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

محققین نے بیان کیا ہے کہ جو شخص حصول نعمت کے وقت نعمت میں مشغول رہتا ہے نہ کہ منعم کی طرف، وہ نزول مصیبت کے وقت مصیبت میں مبتلا رہتا ہے نہ کہ مصیبت نازل کرنے والے کی طرف، اور ایسا شخص مستقل طور پر خوف میں مبتلا رہتا ہے کیونکہ حصول نعمت کے وقت بھی اس کو نعمت کے زوال کا دھڑکا لگا رہتا ہے، اور جو شخص حصول نعمت کے وقت اس نعمت سے لذت حاصل کرنے کے بجائے نعمت دینے والے کی طرف متوجہ رہتا ہے اور اس کو یاد کرتا ہے اور اس کی رضا کا طلبگار رہتا ہے تو وہ مصیبت نازل ہونے کے وقت بھی مصیبت سے گھبراتا نہیں بلکہ مصیبت نازل کرنے والے کی طرف متوجہ رہتا ہے اور اس کو یاد کرتا ہے اور اس کی رضا کا طالب رہتا ہے، سو نعمت کا حصول ہو یا مصیبت کا نزول، اس کا مطلوب واحد ہوتا ہے اور یہ بہت اعلیٰ اور ارفع مرتبہ ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۲۲۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

کافر کو مُسرِف فرمانے کی وجوہ

اس آیت میں کافر کو مسرف فرمایا ہے، کیونکہ کافر اپنی جان اور اپنے مال کو ضائع کر دیتا ہے، جان کو اس طرح ضائع کرتا ہے کہ وہ بتوں کی پرستش کرکے خود کو جہنم کا مستحق بنا لیتا ہے اور مال کو اس لیے ضائع کرتا ہے کہ وہ بتوں کی زیب و زینت کرتا ہے، اور جانور خرید کر بتوں کی بھینٹ چڑھاتا ہے اور یہ مال کو ضائع کرنا ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس شخص کی یہ عادت ہو کہ وہ مصیبت نازل ہونے کے وقت بکثرت دعا اور اللہ تعالیٰ سے فریاد کرے، اور جب مصیبت زائل ہو جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کا شکر ادا کرنے سے اعراض کرے تو ایسا شخص اپنی جان

کو اور اپنے دین کو ضائع کرنے والا ہے۔

مسرف وہ شخص ہے جو اپنے کثیر مال کو کسی خسیس اور گھٹیا مقصد کے حصول میں خرچ کرے' اور یہ معلوم ہے کہ دنیا کی رنگینیاں اور دنیا کی لذتیں اخروی نعمتوں کے مقابلہ میں خسیس اور گھٹیا ہیں' اللہ تعالیٰ نے انسان کو حواس' عقل اور تصرف کی قوتیں اس لیے عطا کی ہیں کہ وہ ان سے اخروی نعمتوں کے حصول میں کوشش کرے' سو جس شخص نے اپنی ان قوتوں کو ان گھٹیا چیزوں کے حصول کی جدوجہد میں خرچ کیا تو اس نے اپنی ان قوتوں کو ضائع کر دیا اور ایسے شخص کے مسرف ہونے میں کیا شک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (لوگو!) ہم نے تم سے پہلے کی ان قوموں کو ہلاک کر دیا تھا جنہوں نے ظلم کیا تھا' اور ان کے پاس ان کے رسول معجزات لے کر آئے تھے اور انہوں نے ایمان لا کر نہ دیا' اور ہم مجرم قوم کو اسی طرح سزا دیتے ہیں○ پھر ہم نے ان کے بعد تم کو زمین میں ان کا جانشین بنایا تاکہ ہم یہ ظاہر فرمائیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو○ (یونس: ۱۴-۱۳)

اللہ تعالیٰ کے آزمانے پر اعتراض کا جواب

کفار اور مشرکین یہ کہتے تھے کہ اگر دین اسلام برحق ہے اور ہم اس کے منکر ہیں تو آپ ہم پر آسمان سے پتھر برسائیں یا کوئی دردناک عذاب لے آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ جواب دیا کہ یہ اپنے اس مطالبہ میں جھوٹے ہیں کیونکہ ان کا حال تو یہ ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ گھبرا کر اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتے ہیں اور پہلو کے بل' بیٹھے ہوئے اور کھڑے ہوئے ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں' اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پچھلی قوموں کے احوال یاد دلائے کہ ان کے پاس ان کے رسول دلائل اور معجزات لے کر آئے اور انہوں نے ان رسولوں کی تکذیب کی تو ہم نے ان قوموں کو ہلاک کر دیا اور یہ اس لیے فرمایا تاکہ مشرکین مکہ نزول عذاب کے مطالبہ سے باز آ جائیں۔

اللہ کے علم پر ایک اشکال کا جواب

دوسری آیت میں فرمایا: پھر ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں تم کس طرح عمل کرتے ہو' اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے علم نہیں تھا اور جب مشرکین عمل کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ کو علم ہوگا' اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرے گا جیسا معاملہ معلومات حاصل کرنے والا اور امتحان لینے والا لوگوں کے ساتھ کرتا ہے تاکہ ان کو ان کے عمل کے مطابق جزا دے' حالانکہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا ہمیشہ سے علم ہے۔ قرآن مجید میں اس کی بہت نظائر ہیں: لیبلوکم ایکم احسن عملا۔ (ھود: ۷) "تاکہ وہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون زیادہ اچھا عمل کرتا ہے"۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت طویل خطبہ روایت کیا' اس میں آپ کا یہ ارشاد ہے: یہ دنیا سرسبز اور میٹھی ہے اور اللہ تمہیں اس میں جانشین بنانے والا ہے پھر وہ دیکھنے والا ہے کہ تم اس میں کس طرح عمل کرتے ہو۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۹۱' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۰۰' ۲۸۷۳' مسند حمیدی رقم الحدیث: ۷۵۲' مسند احمد' ج ۳ ص ۷' مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۱۱۰۱' سنن کبریٰ ج ۷ ص ۹۱' دلائل النبوۃ ج ۶ ص ۳۱۷)

اس حدیث کا بھی یہی معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ایسا معاملہ کرے گا جیسا معاملہ امتحان لینے والا اور آزمانے والا لوگوں کے ساتھ کرتا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا ہمیشہ سے علم ہے۔

لِنَنْظُرَ کے چند مشہور تراجم

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

باز جانشیں ساختیم شمارا در زمین پس از ایشاں تا بہ بینم چگونہ کار می کنند○

شیخ محمود حسن متوفی ۱۳۳۹ھ لکھتے ہیں:

تم کو ہم نے نائب کیا زمین میں ان کے بعد تاکہ دیکھیں تم کیا کرتے ہو○

شیخ اشرف علی تھانوی متوفی ۱۳۶۴ھ لکھتے ہیں:

پھر ان کے بعد دنیا میں بجائے ان کے تم کو آباد کیا تاکہ ہم دیکھ لیں کہ تم کس طرح کام کرتے ہو۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں:

پھر ہم نے ان کے بعد تمہیں زمین میں جانشین کیا کہ دیکھیں تم کیسے کام کرتے ہو۔

حضرت ابوالحامد سید محمد محدث اعظم کچھوچھوی لکھتے ہیں:

پھر بنا دیا ہم نے تم کو جانشین زمین میں ان کے بعد تاکہ نظر کے سامنے کر دیں کہ کس طرح کام کرتے ہو۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ لکھتے ہیں:

اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے، تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

اور ہمارے شیخ سید احمد سعید کاظمی متوفی ۱۴۰۶ھ لکھتے ہیں:

پھر ان کے بعد ہم نے زمین میں تم کو (ان کا) جانشین بنایا تاکہ ہم ظاہر فرمائیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

ان تمام تراجم میں صرف ہمارے حضرت صاحب نے ایسا ترجمہ کیا ہے جس پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا، دیگر مترجمین کا ترجمہ بھی غلط نہیں ہے لیکن انہوں نے لننظر کا لفظی ترجمہ کیا ہے جس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ مشرکین کے عمل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کو علم ہوگا کہ وہ کیا کرتے ہیں، اور ہمارے حضرت صاحب نے نظر کا معنی علم ظہور کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ مشرکین کی کارروائی کو ظاہر فرمائے گا، اصطلاح میں اس کو علم تفصیلی سے تعبیر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب ان پر ہماری روشن آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو جن لوگوں کو ہمارے سامنے حاضر ہونے کی توقع نہیں ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی اور قرآن لاؤ یا اسی کو تبدیل کر دو، آپ کہئے کہ اس کو تبدیل کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے، میں صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جس کی میری طرف وحی کی جاتی ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں عظیم دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں○ (یونس: ۱۵)

مشرکین کا یہ مطالبہ کہ آپ قرآن مجید کو بدل ڈالیں

جس طرح سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر مشرکین کا طعن ذکر کرکے ان کے جوابات ذکر فرمائے تھے، اس آیت میں بھی ان کا ایک طعن ذکر کرکے اس کا جواب ذکر فرمایا ہے۔

امام ابو محمد حسین بن مسعود الفراء البغوی المتوفی ۵۱۶ھ لکھتے ہیں:

قتادہ نے کہا ہے کہ یہ اعتراض کرنے والے مشرکین مکہ تھے، اور مقاتل نے کہا ہے کہ یہ پانچ شخص تھے: عبداللہ بن امیہ المخزومی، ولید بن مغیرہ، مکرز بن حفص، عمرو بن عبداللہ بن ابی قیس العامری اور العاص بن عامر بن ہشام، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا تھا کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں تو آپ اس قرآن کے علاوہ کوئی

اور قرآن لے آئیں جس میں لات' عزیٰ اور مناۃ کی عبادت سے ممانعت نہ ہو' اور نہ ان کی مذمت کی گئی ہو اور اگر اللہ ایسی آیتیں نازل نہ کرے تو آپ ایسی آیتیں بنالیں' یا اس قرآن کو بدل ڈالیں اور عذاب کی آیتوں کی جگہ رحمت کی آیتیں بنادیں یا حرام کی جگہ حلال اور حلال کی جگہ حرام لکھ دیں' اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اے محمد! آپ کہئے کہ اس قرآن کو بدلنا میرے اختیار میں نہیں ہے' میں صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جس کی مجھ پر وحی کی جاتی ہے' اس کے مطابق میں حکم دیتا ہوں یا کسی چیز سے منع کرتا ہوں۔ (معالم التنزیل ج ۲ ص ۲۹۳' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۴ھ)

قرآن مجید میں تبدیلی کے مطالبہ کی وجوہات

کفار جو آپ سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ آپ کوئی اور قرآن لے آئیں یا اسی قرآن کو بدل ڈالیں تو ان کا یہ مطالبہ بطور استہزاء تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ آپ سے یہ مطالبہ کرتے ہوں اور اس سے ان کی غرض یہ ہو کہ اگر آپ نے ان کا یہ مطالبہ مان لیا تو آپ کا یہ دعویٰ باطل ہو جائے گا کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کا نازل کیا ہوا ہے' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی کوئی اور کتاب چاہتے ہوں کیونکہ یہ قرآن ان کے معبودوں کی مذمت پر مشتمل ہے اور ان کے معمولات کو باطل قرار دیتا ہے' اس لیے وہ کوئی اور کتاب چاہتے تھے جس میں یہ چیزیں نہ ہوں۔

نیز اس آیت میں فرمایا ہے: آپ کہئے میں صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جس کی میری طرف وحی کی جاتی ہے' اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس آیت سے یہ لازم آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد نہیں کرتے تھے اور نہ قیاس سے کام لیتے تھے' اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ میں قرآن مجید کے پہنچانے اور اس کی تلاوت کرنے میں وحی کی اتباع کرتا ہوں' اور اپنی طرف سے اس میں کوئی کمی بیشی اور تغیر تبدل نہیں کرتا اور نہ مجھ کو اس کا اختیار ہے۔

باقی اجتہاد اور قیاس پر مکمل بحث ان کی تعریف' ارکان' شرائط' ان کے دلائل اور ان کے نظائر ہم نے الانعام: ۵۰ میں بیان کر دیئے۔ جو حضرات ان مباحث پر مطلع ہونا چاہیں' وہ ان کو وہاں دیکھ لیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہئے اگر اللہ چاہتا تو میں تم پر اس (قرآن) کی تلاوت نہ کرتا اور نہ تم کو اس کی اطلاع دیتا پھر بے شک اس (نزول قرآن) سے پہلے میں تم میں عمر (کا ایک حصہ) گزار چکا ہوں' کیا تم (یہ) نہیں سمجھتے ○ (یونس: ۱۶)

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایک دلیل

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو مجھے تمہاری طرف رسول بنا کر نہ بھیجتا اور میں تم پر قرآن کی تلاوت نہ کرتا' اور نہ میں تمہیں اللہ کے متعلق کوئی خبر دیتا' اس آیت میں کفار اور مشرکین کے اس خیال کا رد ہے کہ یہ قرآن مجید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے کیونکہ مشرکین مکہ نے اول سے آخر تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مشاہدہ کیا تھا اور ان کو آپ کے تمام احوال معلوم تھے' وہ یہ جانتے تھے کہ آپ نے کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ کسی استاذ سے علم حاصل کیا پھر آپ پر اسی طرح چالیس سال کا عرصہ گزر گیا' پھر چالیس سال بعد آپ اچانک اس عظیم کتاب کو لے آئے جس میں اولین اور آخرین کی خبریں ہیں اور تہذیب اخلاق' تدبیر منزل اور ملکی سیاست کے متعلق مفصل احکام اور پیش گوئیاں ہیں اور بہت دقیق علوم ہیں اور تمام علماء' فصحاء اور بلغاء اس کی نظیر لانے میں عاجز اور ناکام رہے تو ہر وہ شخص جس کے پاس عقل سلیم ہو وہ بداہتاً یہ جان لے گا کہ ایسا معجز کلام اللہ کی وحی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا' اس لیے فرمایا کہ میں بے شک اس (نزول قرآن) سے پہلے تم میں عمر کا ایک حصہ گزار چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے!

اس آیت کی دوسری تقریر یہ ہے کہ اس نزول قرآن سے پہلے میں نے تم میں چالیس سال زندگی گزاری اور تم میرے

صدق اور امانت اور میری پاکیزگی کو جان چکے ہو، میں پڑھتا تھا نہ لکھتا تھا پھر میں تمہارے پاس اس معجز کلام کو لے کر آیا تو اب کیا تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ کلام میرا نہیں ہو سکتا اور یہ صرف اور صرف وحی الٰہی ہے، پھر میں نے تم میں اپنے شباب کی پوری عمر گزاری ہے جس میں، میں نے اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی نہیں کی تو اب تم مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کروں گا اور اس کے کلام کو بدل ڈالوں گا، کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس اس سے زیادہ اور کون ظالم ہو گا جو جھوٹ بول کر اللہ پر بہتان تراشے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے، بے شک مجرم فلاح نہیں پاتے○ (یونس: ۱۷)

قرآن مجید کا وحی الٰہی ہونا

مشرکین کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ قرآن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ساختہ کلام ہے اور آپ نے اس کو اللہ کی طرف منسوب کر کے اللہ پر افتراء باندھا ہے، اللہ تعالیٰ ان کا رد کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جو شخص اللہ پر افتراء باندھے اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا، یعنی اگر بفرض محال نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کلام کو اللہ کی طرف منسوب کیا ہوتا تو آپ (العیاذ باللہ) سب سے بڑے ظالم ہوتے، اور جبکہ دلائل سے ثابت ہو چکا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کی وحی ہے تو جو مشرکین اس قرآن کو اللہ کا کلام نہیں مانتے وہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے پاس ہماری سفارش کرنے والے ہیں، آپ کہئے کہ کیا تم اللہ کو ایسی بات کی خبر دیتے ہو جس کا اللہ کو نہ آسمانوں میں علم ہے نہ زمینوں میں، وہ ان تمام سے بری اور بلند ہے جن کو تم اس کے ساتھ شریک کرتے ہو○ (یونس: ۱۸)

غیر اللہ کی عبادت کے باطل ہونے پر دلائل

مشرکین یہ کہتے تھے کہ اس قرآن کو اس لیے بدل دیں کہ اس میں ان کے باطل معبودوں کی مذمت کی گئی ہے اور وہ اپنے بتوں کی مدح اور تعظیم و تکریم چاہتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتوں کی عبادت کی مذمت کی اور ان کی عبادت کے باطل ہونے کو واضح فرمایا ہے۔ مشرکین بتوں کی عبادت بھی کرتے تھے اور ان کو اللہ کی بارگاہ میں شفیع بھی مانتے تھے، پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت کرنے کا رد فرمایا ہے اور اس کی تقریر یہ ہے کہ ان کے تراشیدہ بت جن کی وہ عبادت کرتے ہیں، عبادت کرنے کی بنا پر وہ ان کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتے اور عبادت نہ کرنے کی وجہ سے وہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور دوسری دلیل یہ ہے کہ معبود کو عابد سے اعلیٰ اور افضل ہونا چاہیے اور کفار جن بتوں کی عبادت کرتے ہیں وہ خود ان کی بہ نسبت زیادہ طاقت اور قدرت رکھتے ہیں، اولاً اس لیے کہ ان بتوں کو بنانے والے وہ خود ہیں، وہ چاہیں تو ان بتوں کو بنائیں اور چاہیں تو ان بتوں کو توڑ ڈالیں، تو یہاں معبود کے نفع اور نقصان پر عابد کو قدرت ہے اور چاہیے یہ تھا کہ عابد کے نفع اور نقصان پر معبود کو قدرت ہوتی، اور تیسری دلیل یہ ہے کہ عبادت تعظیم کی سب سے بڑی نوع ہے، اس لیے عبادت اسی کی کرنی چاہیے جس کا سب سے بڑا انعام ہو، اور جس ذات نے انسان کو حیات، علم اور قدرت کی نعمتیں عطا فرمائیں اور زندگی بسر کرنے کے لیے دنیا میں ذرائع اور وسائل پیدا کیے اس سے بڑھ کر انعام دینے والا اور کون ہے تو اس کے علاوہ عبادت کا اور کون مستحق ہو سکتا ہے!

بتوں کو اللہ کے ہاں سفارشی قرار دینے میں مشرکین کے نظریات

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ کفار کا یہ عقیدہ تھا کہ صرف اللہ عزوجل کی عبادت کرنے کی بہ نسبت، اللہ تعالیٰ کی تعظیم اس میں زیادہ ہے کہ بتوں کی عبادت کی جائے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم میں یہ اہلیت نہیں ہے یا ہم اس قابل نہیں ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوں، بلکہ ہم بتوں کی عبادت میں مشغول ہوں گے اور وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہماری شفاعت کریں گے، پھر ان کا اس میں اختلاف ہے کہ وہ بت کس کیفیت سے اللہ تعالیٰ کے پاس ان کی شفاعت کریں گے، اور اس میں ان کے حسب ذیل اقوال ہیں:

(۱) ان کا عقیدہ تھا کہ عالم افلاک میں ہر عالم کے لیے ایک معین روح ہے پھر انہوں نے ہر روح کے مقابلہ میں ایک بت معین کر لیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ روح سب سے بڑے خدا کی عبد ہے، پھر انہوں نے اس بت کی پرستش شروع کر دی۔

(۲) وہ ستارہ پرست تھے اور انہوں نے ستاروں کے مقابلہ میں بت تراش لیے اور ان کی پرستش شروع کر دی۔

(۳) انہوں نے نبیوں اور بزرگوں کی صورتوں کے مطابق بت تراش لیے اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جب وہ ان بتوں کی عبادت کریں گے تو وہ بت اللہ تعالیٰ کے پاس ان کی شفاعت کریں گے۔ اس زمانہ میں اس کی نظیر یہ ہے کہ اس زمانہ میں بہت لوگ بزرگوں کی قبروں کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ جب وہ ان کی قبروں کی تعظیم کریں گے تو وہ بزرگ اللہ تعالیٰ کے پاس ان کی شفاعت کریں گے۔ (غالباً امام رازی کی مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو قبروں کی تعظیم میں غلو کرتے ہیں۔ مثلاً قبروں کا طواف کرتے ہیں، حد رکوع تک قبروں کے آگے جھکتے ہیں، قبروں کو سجدہ کرتے ہیں اور صاحب قبر کی نذر مانتے ہیں، لیکن جو مسلمان بزرگوں کی قبروں پر جا کر قرآن شریف پڑھتے ہیں اور ایصال ثواب کرتے ہیں اور ان کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں وہ اس میں داخل نہیں ہیں کیونکہ یہ تمام امور دلائل شرعیہ سے ثابت ہیں۔)

(۴) ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نور عظیم ہے اور فرشتے انوار ہیں تو انہوں نے اللہ کے مقابلہ میں صنم اکبر بنایا اور فرشتوں کے مقابلہ میں اور بت تراش لیے۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۲۲۷، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

جس چیز کے وجود کا اللہ تعالیٰ کو علم نہ ہو اس کا وجود محال ہے

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ کہئے کہ کیا تم اللہ کو ایسی بات کی خبر دیتے ہو جس کا اللہ کو نہ آسمانوں میں علم ہے نہ زمینوں میں۔ اللہ تعالیٰ کی علم کی نفی سے مراد یہ ہے کہ اس چیز کا فی نفسہ وجود نہیں ہے، کیونکہ وہ چیز اگر کسی زمانہ میں بھی موجود ہوتی تو اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہوتا، اور جب اللہ تعالیٰ کو اس چیز کے موجود ہونے کا علم نہیں ہے تو واجب ہے کہ وہ چیز موجود نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا شریک فی نفسہ محال ہے، اسی طرح اجتماع ضدین وغیرہ کا حکم ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۲۲۷، روح المعانی ج ۷ ص ۱۲۹، دار الفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور پہلے تمام لوگ صرف ایک امت تھے، پھر مختلف ہو گئے اور اگر آپ کے رب کی طرف سے ایک امر پہلے ہی مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو جن چیزوں میں یہ اختلاف کر رہے ہیں ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ○ (یونس: ۱۹)

ابتداء میں تمام لوگوں کے مسلمان ہونے پر احادیث اور آثار

تمام لوگ پہلے صرف ایک امت تھے، صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تمام لوگ پہلے صرف مسلمان تھے، امام عبد الرحمن ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے درمیان دس صدیاں ہیں۔ یہ سب ہدایت پر تھے اور برحق شریعت پر تھے۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت کے بعد ان کے درمیان اختلاف ہوا اور وہ پہلے رسول تھے جن کو

اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کی طرف بھیجا' ان کو اس وقت بھیجا گیا جب ان میں اختلاف پیدا ہو گیا اور انہوں نے حق کو ترک کر دیا تب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو بھیجا اور اپنی کتاب نازل کی جس سے حق پر استدلال کیا گیا۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۴ ص ۲۷ ۱۳' رقم الحدیث: ۱۹۸۹' مطبوعہ مکہ مکرمہ' ۱۴۱۷ھ)

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ بیان فرماتے ہیں:

امام طبرانی نے سند حسن کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زمین کبھی ایسے چالیس آدمیوں سے خالی نہیں رہی جو خلیل الرحمٰن کی مثل ہیں' ان ہی کی وجہ سے بارش ہوتی ہے اور ان ہی کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی ہے۔ ان میں سے جو شخص مرتا ہے' اللہ اس کے بدلہ میں دوسرا پیدا فرما دیتا ہے۔

(المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۴۱۱۳)

امام احمد نے کتاب الزہد میں سند صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد زمین کبھی ایسے سات آدمیوں سے خالی نہیں رہی جن کی وجہ سے اللہ عذاب دور فرماتا ہے۔

امام ابن حبان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زمین کبھی ایسے تیس آدمیوں سے خالی نہیں رہی جو ابراہیم خلیل اللہ کی مثل تھے' ان ہی کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی ہے' ان ہی کی وجہ سے تم کو رزق دیا جاتا ہے اور ان ہی کی وجہ سے تم پر بارش ہوتی ہے۔

امام عبد الرزاق نے اپنی مصنف میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہمیشہ روئے زمین پر سات یا اس سے زیادہ مسلمان رہے ہیں' اگر وہ نہ ہوتے تو زمین اور زمین والے ہلاک ہو جاتے۔

امام احمد نے کتاب الزہد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد زمین ایسے سات آدمیوں سے خالی نہیں رہی جن کی وجہ سے اللہ زمین والوں سے عذاب دور فرماتا ہے۔

(الدر المنثور ج ا ص ۷۶۹ - ۷۶۵' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۴ھ)

پھر فرمایا: اگر آپ کے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی مقدر نہ ہو چکی ہوتی تو جن چیزوں میں یہ اختلاف کر رہے ہیں ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا' اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ فرما چکا ہے کہ عذاب اور ثواب کا فیصلہ قیامت کے دن ہو گا۔

اس آیت کی مزید تفصیل کے لیے البقرہ: ۲۱۳ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور کہتے ہیں کہ اس (رسول) پر اس کے رب کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل کیا گیا' آپ کہئے کہ غیب تو صرف اللہ ہی کے لیے ہے' سو تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرنے والوں میں سے ہوں O

(یونس: ۲۰)

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل

اس آیت میں بھی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر مشرکین کے ایک شبہ کا جواب دیا گیا ہے' وہ کہتے تھے کہ اس قرآن کے علاوہ کوئی اور معجزہ پیش کریں' مثلاً ان پہاڑوں کو سونے کا بنا دیں یا آپ کا گھر سونے کا ہو جائے یا ہمارے مردہ باپ دادا کو زندہ کر دیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید خود بہت عظیم معجزہ ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان پیدا ہوئے اور آپ نے وہیں نشو و نما پائی اور ان کے سامنے آپ نے چالیس سال تک زندگی گزاری اور ان کو معلوم تھا کہ آپ نے کسی استاذ سے پڑھا ہے نہ کسی کتاب کا مطالعہ کیا ہے' پھر آپ نے یکایک اس قرآن کو پیش کر دیا۔ جس کی فصاحت اور بلاغت سے

نظیر تھی اور جس میں اولین اور آخرین کی خبریں تھیں اور تہذیب اخلاق، تدبیر منزل اور ملکی اور بین الاقوامی معاملات کے احکام تھے اور جس شخص کو تعلیم کے اسباب مہیا نہ ہوئے ہوں اس سے اس قسم کے کلام کا صادر ہونا بغیر وحی الٰہی کے محال ہے، سو یہ قرآن مجید آپ کی نبوت پر قاہر معجزہ ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کسی اور معجزہ کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے، اور اس کے بعد کوئی اور معجزہ نازل کرنا یا نہ کرنا یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، وہ چاہے تو کوئی معجزہ ظاہر کرے اور چاہے تو نہ کرے، سو یہ اب باب غیب سے ہے، سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ثابت ہو چکی ہے اور آپ کے دعویٰ رسالت کا صدق ظاہر ہو چکا ہے۔

وَإِذَآ أَذَقْنَا ٱلنَّاسَ رَحْمَةً مِّنۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُم

اور جب ہم لوگوں کو مصیبت پہنچنے کے بعد رحمت کی لذت چکھاتے ہیں تو وہ اسی وقت ہماری آیتوں (کی مخالفت)

مَّكْرٌ فِىٓ ءَايَاتِنَا ۚ قُلِ ٱللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۚ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ

میں سازشیں کرنے لگتے ہیں، آپ کہیے کہ اللہ بہت جلد خفیہ تدبیر کرنے والا ہے۔ بے شک ہمارے فرشتے تمہاری

مَا تَمْكُرُونَ ﴿٢١﴾ هُوَ ٱلَّذِى يُسَيِّرُكُمْ فِى ٱلْبَرِّ وَٱلْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا

سازشوں کو لکھ رہے ہیں ○ وہی ہے جو تم کو خشکی اور سمندر میں سفر کراتا ہے، حتیٰ کہ جب تم

كُنتُمْ فِى ٱلْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا۟ بِهَا

کشتیوں میں (محو سفر) ہو اور وہ کشتیاں موافق ہوا کے ساتھ لوگوں کو لے کر جا رہی ہوں اور لوگ ان سے خوش ہو رہے

جَآءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَآءَهُمُ ٱلْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ

ہوں تو (اچانک) ان کشتیوں پر تیز آندھی آ جائے اور (سمندر کی) موجیں ہر طرف سے ان کو گھیر لیں اور

وَظَنُّوٓا۟ أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا۟ ٱللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَ

لوگ یہ یقین کر لیں کہ وہ (طوفان میں) پھنس چکے ہیں، اس وقت وہ دین میں اللہ کے ساتھ مخلص ہو کر اس سے دعا کرتے

لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَـٰذِهِۦ لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلشَّـٰكِرِينَ ﴿٢٢﴾ فَلَمَّآ

ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس (طوفان) سے بچا لیا تو ہم ضرور تیرا شکر کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے ○ پھر جب

أَنجَىٰهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِى ٱلْأَرْضِ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ ۗ يَـٰٓأَيُّهَا

اللہ نے انہیں بچا لیا تو وہ پھر یکایک زمین میں ناحق بغاوت (فساد) کرنے لگتے ہیں، اے لوگو!

النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ ثُمَّ

تمہاری بغاوت صرف تمہارے لیے ہی (مضر) ہے دنیا کی زندگی کا کچھ فائدہ (اٹھا لو) پھر تم

اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٣﴾ اِنَّمَا مَثَلُ

نے ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر ہم تمہیں ان کاموں کی خبر دیں گے جو تم کرتے تھے ○ دنیا کی

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ

زندگی کی مثال محض اس پانی کی طرح ہے جس کو ہم نے آسمان سے نازل کیا تو اس کی وجہ سے زمین کی وہ پیداوار

الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ

خوب گھنی ہوگئی جس کو انسان اور جانور سب کھاتے ہیں حتیٰ کہ عین اس وقت جب کھیتیاں اپنی ترو تازگی

الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ

اور شادابی کے ساتھ لہلہانے لگیں اور ان کے مالکوں نے یہ گمان کر لیا کہ وہ ان پر

عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ

قادر ہیں تو اچانک رات یا دن کو ان پر ہمارا عذاب آگیا پس ہم نے ان کھیتوں کو کٹا ہوا (ڈھیر) بنا دیا جیسے

لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٤﴾

کل یہاں کچھ تھا ہی نہیں، غور و فکر کرنے والوں کے لیے ہم اسی طرح آیتوں کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں ○

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ

اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف

مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٢٥﴾ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ

ہدایت دیتا ہے ○ جن لوگوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے اچھی جزا ہے اور اس کے علاوہ زائد اجر ہے اور ان کے چہروں پر

وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا

نہ سیاہی چھائے گی نہ ذلت وہی جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ

خٰلِدُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ

رہیں گے ○ اور جن لوگوں نے برے کام کیے ان کو ان ہی کی مثل بری سزا ملے گی

وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ

اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی، ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا؛ گویا ان کے

اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ

چہرے اندھیری رات کے ٹکڑوں سے ڈھانپ دیے گئے، وہی

النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٧﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ

دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ○ جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے، پھر ہم

لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَاۗؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ

مشرکوں سے کہیں گے تم اور تمہارے شریک سب اپنی اپنی جگہ ٹھیریں، پھر ہم ان کے درمیان پھوٹ ڈال دیں گے

وَقَالَ شُرَكَاۗؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿٢٨﴾ فَكَفٰى بِاللّٰهِ

اور ان کے شریک کہیں گے تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے ○ پس ہمارے اور

شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿٢٩﴾

تمہارے درمیان اللہ کافی گواہ ہے کہ بے شک ہم تمہاری عبادت سے غافل تھے ○

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ

اس وقت ہر شخص اپنے بھیجے ہوئے اعمال (کے نتیجہ) میں مبتلا ہوگا، وہ سب اللہ کی طرف لوٹا دیے جائیں گے

مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٣٠﴾ ع

جو ان کا مالک حقیقی ہے اور وہ جو کچھ بہتان باندھتے رہتے تھے وہ ان سے گم ہوجائیں گے ○

ع ٣ — ٨

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب ہم لوگوں کو مصیبت پہنچنے کے بعد رحمت کی لذت چکھاتے ہیں تو وہ اسی وقت ہماری آیتوں (کی مخالفت) میں سازشیں کرنے لگتے ہیں، آپ کہیے کہ اللہ بہت جلد خفیہ تدبیر کرنے والا ہے، بے شک ہمارے فرشتے تمہاری سازشوں کو لکھ رہے ہیں ○ (یونس: ٢١)

مصائب کے بعد کفار پر رحم فرمانا

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ مشرکین آپ سے قرآن مجید کے علاوہ کوئی اور معجزہ طلب کرتے ہیں اور ان کی یہ طلب محض عناد اور کٹ حجتی کے لیے تھی اور اس سے ان کا مقصد ہدایت کو طلب کرنا نہیں تھا، اب اسی معنی کو موکد کرنے کے لیے فرماتا ہے کہ جب اللہ مصیبت کے بعد ان پر رحمت فرماتا ہے تو یہ اللہ کی آیتوں کی مخالفت میں سازشیں کرنے لگتے ہیں۔

مصیبت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفر پر ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر ان سے بارشیں روک لیں اور ان کو خشک سالی اور قحط میں مبتلا کر دیا، پھر اللہ عزوجل نے ان پر رحم فرمایا اور ان پر بارشیں نازل فرمائیں جس سے قحط دور ہو گیا اور ان کے کھیت ہرے بھرے ہو گئے، پھر چاہیے تھا کہ یہ ایمان لے آتے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے، لیکن انہوں نے اس کے بجائے ان رحمتوں کی نسبت اپنے ان بتوں کی طرف کر دی جو کسی نفع اور ضرر پر قادر نہیں ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ قریش نے اسلام قبول کرنے میں بہت تاخیر کر دی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف دعا فرمائی تو ان کو قحط نے جکڑ لیا، حتیٰ کہ وہ اس میں ہلاک ہونے لگے۔ انہوں نے مردار اور ہڈیاں کھائیں، پھر آپ کے پاس ابوسفیان آیا اور اس نے کہا اے محمد! آپ صلہ رحم کا حکم دیتے ہیں، اور آپ کی قوم ہلاک ہو رہی ہے، آپ اللہ سے دعا کیجئے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: آپ اس دن کا انتظار کیجئے جب آسمان واضح دھواں لائے گا۔ (الدخان: ۱۰) پھر وہ دوبارہ اپنے کفر کی طرف لوٹ گئے۔ منصور کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تو ان پر بارش ہوئی، اور پورا آسمان بادلوں سے ڈھک گیا پھر لوگوں نے بارش کی کثرت کی شکایت کی تو آپ نے دعا فرمائی: اے اللہ! ہمارے اردگرد بارش نازل فرما، ہم پر بارش نہ نازل فرما، تو بادل آپ کے سر سے چھٹ گئے۔ پھر لوگوں کے اردگرد بارش ہوئی۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۰۲۰، مطبوعہ دار ارقم بیروت)

حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حدیبیہ میں صبح کی نماز پڑھائی، اس وقت آسمان پر رات کی بارش کا اثر تھا، نماز سے فارغ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے، پھر آپ نے فرمایا: اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا میرے بندوں نے صبح کی، بعض مجھ پر ایمان لانے والے تھے اور بعض میرا کفر کرنے والے تھے، جنہوں نے کہا اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے بارش ہوئی وہ مجھ پر ایمان لانے والے ہیں اور ستارے کا کفر کرنے والے ہیں اور جنہوں نے کہا کہ فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی ہے وہ میرا کفر کرنے والے ہیں اور ستارے پر ایمان لانے والے ہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۸۴۶، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۷۱، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۹۰۶، سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۵۲۵)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: نزول رحمت کے بعد وہ ہماری آیتوں کے خلاف سازشیں کرنے لگتے ہیں، مجاہد نے اس کی تفسیر میں کہا وہ اللہ کی آیتوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور تکذیب کرتے ہیں اور مقاتل نے کہا وہ یہ نہیں کہتے کہ یہ اللہ کا رزق ہے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم پر فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ کہئے کہ اللہ بہت جلد خفیہ تدبیر کرنے والا ہے یعنی وہ ان کو بہت جلد سزا دینے والا ہے اور وہ ان کی سازشوں کی گرفت پر بہت زیادہ قادر ہے۔

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: اور جب انسان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ پہلو کے بل یا بیٹھے ہوئے یا کھڑے

ہوئے ہم سے دعا کرتا ہے پس جب ہم اس سے مصیبت کو دور کر دیتے ہیں تو وہ اس طرح گزر جاتا ہے گویا جب اس کو وہ مصیبت پہنچی تھی تو اس نے ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ (یونس: ۱۲) اس آیت میں تو انسان کے صرف شکر نہ کرنے کا بیان فرمایا تھا اور زیر تفسیر آیت میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ وہ صرف اعراض اور شکر نہ کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اللہ کی نعمتوں کو اور اس کے احسان کو جھٹلاتے ہیں اور اس کی کی ہوئی رحمت کو اپنے باطل معبودوں، یعنی بتوں اور ستاروں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اپنی سازشوں سے اللہ تعالیٰ کی آیات میں شر اور فساد کو طلب کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہی ہے جو تم کو خشکی اور سمندر میں سفر کراتا ہے، حتیٰ کہ جب تم کشتیوں میں (محو سفر) ہو اور وہ کشتیاں موافق ہوا کے ساتھ لوگوں کو لے کر جا رہی ہوں اور لوگ ان سے خوش ہو رہے ہوں تو (اچانک) ان کشتیوں پر تیز آندھی آئے اور (سمندر کی) موجیں ہر طرف سے ان کو گھیر لیں اور لوگ یہ یقین کر لیں کہ وہ (طوفان میں) پھنس چکے ہیں، اس وقت وہ دین میں اللہ کے ساتھ مخلص ہو کر اس سے دعا کرتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس (طوفان) سے بچالیا تو ہم ضرور تیرا شکر کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے ○ پھر جب اللہ نے انہیں بچالیا تو وہ پھر یکایک زمین میں ناحق بغاوت (فساد) کرنے لگتے ہیں، اے لوگو! تمہاری بغاوت صرف تمہارے لیے ہی (مضر) ہے، دنیا کی زندگی کا کچھ فائدہ (اٹھالو)، پھر تم نے ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر ہم تمہیں ان کاموں کی خبر دیں گے جو تم کرتے تھے ○ (یونس: ۲۳-۲۲)

مصائب اور شدائد میں صرف اللہ کو پکارنا

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا: اور جب ہم مصیبت پہنچنے کے بعد لوگوں کو رحمت کی لذت چکھاتے ہیں تو وہ اسی وقت ہماری آیتوں (کی مخالفت) میں سازشیں کرنے لگتے ہیں۔ اب ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ ان کے اس مکر کی مثال بیان فرما رہا ہے کہ جب انسان سمندر میں کسی کشتی میں بیٹھ کر سفر کرتا ہے ہوائیں اس کے موافق ہوتی ہیں پھر اچانک تیز آندھیاں آتی ہیں، ہر طرف سے طوفانی لہریں اٹھتی ہیں اور وہ گرداب میں پھنس جاتا ہے اس وقت اس کو اپنے ڈوبنے کا یقین ہو جاتا ہے اور نجات کی بالکل امید نہیں ہوتی، اس پر سخت خوف اور شدید مایوسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جن باطل معبودوں کی وہ اب تک پرستش کرتا آیا تھا، ان کی بے چارگی اس پر عیاں ہو جاتی ہے اور کٹر سے کٹر مشرک بھی اس وقت اللہ عزوجل کے سوا اور کسی کو نہیں پکارتا، اور اس کے علاوہ اور کسی سے دعا نہیں کرتا، اور جب تمام مخلوق سے امیدیں منقطع ہو جاتی ہیں تو وہ اپنے جسم اور روح کے ساتھ صرف اللہ عزوجل کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور صرف اسی سے فریاد کرتا ہے۔

ام حکیم بنت الحارث عکرمہ بن ابی جہل کے عقد میں تھیں، فتح مکہ کے دن وہ اسلام لے آئیں اور ان کے خاوند عکرمہ مکہ سے بھاگ گئے۔ وہ ایک کشتی میں بیٹھے، وہ کشتی طوفان میں پھنس گئی۔ عکرمہ نے لات اور عزیٰ کی دہائی دی، کشتی والوں نے کہا اس طوفان میں جب تک اخلاص کے ساتھ صرف اللہ کو نہیں پکارو گے کچھ فائدہ نہیں ہوگا، اللہ کے سوا اس طوفان سے کوئی نجات نہیں دے سکتا، تب عکرمہ کی آنکھیں کھل گئیں، انہوں نے دل میں سوچا اگر سمندر میں صرف اللہ فریاد کو سنتا ہے تو خشکی میں بھی اس کے سوا کوئی کام نہیں آسکتا، انہوں نے قسم کھائی کہ اگر اللہ نے مجھے اس طوفان سے بچالیا تو میں پھر سیدھا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور اسلام قبول کر لوں گا، پھر انہوں نے ایسا ہی کیا۔

(دلائل النبوۃ ج ۵ ص ۹۸، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۰ھ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا: اے بیٹے! میں تمہیں چند کلمات کی تعلیم دیتا ہوں تم اللہ (کے احکام) کی حفاظت کرو، اللہ تمہاری

حفاظت کرے گا، تم اللہ (کی رضا) کی حفاظت کرو تم اس (کی رحمت) کو اپنے سامنے پاؤ گے، جب تم سوال کرو تو صرف اللہ سے سوال کرو اور جب تم مدد طلب کرو تو صرف اللہ سے مدد طلب کرو۔ الحدیث۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۵۱۶، مسند احمد ج۱ ص ۲۹۳، ۳۰۳، ۳۰۷، المعجم الکبیر رقم الحدیث:۱۲۹۸۸، ۱۲۹۸۹، مشکوۃ رقم الحدیث:۵۳۰۲، عمل الیوم واللیلہ لابن السنی رقم الحدیث:۴۲۵، شعب الایمان رقم الحدیث:۱۷۴، ۱۹۵، الآجری رقم الحدیث:۱۹۸، المستدرک ج ۳ ص ۵۴۱، حلیۃ الاولیاء ج۱ ص ۳۱۴، کتاب الآداب للبیہقی رقم الحدیث:۱۰۷۳)

ملا علی بن سلطان محمد القاری المتوفی ۱۰۱۴ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

جب تم سوال کرو تو صرف اللہ سے سوال کرو کیونکہ تمام عطاؤں کے خزانے اسی کے پاس ہیں اور تمام داد و دہش کی کنجیاں اسی کے قبضہ میں ہیں، اور دنیا اور آخرت کی ہر نعمت وہی بندوں تک پہنچاتا ہے اور دنیا اور آخرت کی ہر بلا اور مصیبت اسی کی رحمت سے دور ہوتی ہے، اس کی عطا میں کسی غرض اور کسی سبب کا شائبہ نہیں ہے، کیونکہ وہ جواد مطلق اور بے نہایت غنی ہے سو صرف اسی کی رحمت کا امیدوار ہونا چاہیے اور صرف اسی کے غضب سے ڈرنا چاہیے اور تمام مہمات اور مشکلات میں اسی کی پناہ حاصل کرنی چاہیے اور تمام حاجات میں اسی پر اعتماد کرنا چاہیے اور اس کے غیر سے سوال نہ کیا جائے، کیونکہ اس کا غیر دینے پر قادر ہے نہ روکنے پر، دفع ضرر پر قادر ہے نہ تحصیل نفع پر کیونکہ وہ خود اپنی جانوں کے لیے کسی نفع اور نقصان کے مالک نہیں ہیں، نہ موت اور حیات کے مالک ہیں نہ روز قیامت اٹھانے کے مالک ہیں اور زبان حال سے اور زبان قال سے کسی وقت بھی اللہ سے سوال کرنے کو ترک نہ کیا جائے کیونکہ حدیث میں ہے جو شخص اللہ سے سوال نہیں کرتا اللہ اس پر غضب ناک ہوتا ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۳۷۳، مشکوۃ رقم الحدیث:۲۲۳۸)

سوال کرنے میں انکسار کے طریقہ کا اظہار ہے اور عجز کی سمت کا اقرار ہے اور رنج اور فاقہ کی پستی سے قوت اور طاقت کی بلندی کی طرف افتقار ہے، کسی نے کہا ہے کہ بنو آدم سوال کرنے سے غضب ناک ہوتے ہیں اور اللہ عزوجل سوال نہ کرنے سے غضب ناک ہوتا ہے اور جب تم دنیا اور آخرت کے کسی بھی کام میں مدد طلب کرنے کا ارادہ کرو تو اللہ سے مدد طلب کرو کیونکہ ہر زمانہ میں اور ہر مقام پر اسی سے مدد طلب کی جاتی ہے اور اسی پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔

(مرقاۃ المفاتیح ج ۱۰ ص ۵۴، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، ۱۳۹۰ھ)

پیر محمد کرم شاہ الازہری المتوفی ۱۴۱۸ھ لکھتے ہیں:

علامہ قرطبی نے یہاں بڑے نکتہ کی بات رقم فرمائی ہے کہ نفسیات انسانی کے اس تجزیہ سے معلوم ہوا کہ یہ چیز انسانی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ جب تکالیف کے مہیب سائے اسے گھیر لیتے ہیں تو اس کے دل میں اس وقت صرف اپنے رب حقیقی کا ہی خیال پیدا ہوتا ہے، اور اسی کے دامن رحمت میں پناہ کی امید بندھتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہر مضطر اور پریشان حال کی التجا قبول فرماتا ہے خواہ وہ کافر ہی ہو کیونکہ اس وقت جھوٹے سہارے ختم ہو چکتے ہیں اور صرف اسی (اللہ تعالیٰ) کی رحمت کا سہارا باقی رہ جاتا ہے۔ (ضیاء القرآن ج ۲ ص ۲۹۱، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، ۱۴۰۲ھ)

علامہ آلوسی، شیخ شوکانی اور نواب بھوپالی کا انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام سے استمداد کو ناجائز قرار دینا

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ ایسی صورت حال میں کٹر سے کٹر مشرک بھی صرف اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور

اسی کو پکارتا ہے لیکن تم جانتے ہو گے کہ آج کل بعض مسلمان جب خشکی یا سمندر میں کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں تو ان کو پکارتے ہیں جو کسی کو نفع اور نقصان پہنچانے کے مالک نہیں ہیں' وہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں۔ ان میں سے بعض خضر اور الیاس کو پکارتے ہیں اور بعض ابوالخمیس اور عباس کو پکارتے ہیں اور بعض مشائخ امت میں سے کسی شیخ کو پکارتے ہیں اور تم نہیں دیکھو گے کہ ان میں سے کوئی صرف اللہ عزوجل کو پکارتا ہو اور کسی کے دل میں خیال نہیں آتا کہ اس پریشانی سے صرف اللہ تعالیٰ ہی نجات دے سکتا ہے' سوچو کہ جس حالت کا اللہ تعالیٰ نے نقشہ کھینچا ہے' اس حال میں ان مشرکین کا عمل ہدایت کے زیادہ قریب تھا یا ان مسلمانوں کا عمل ہدایت کے زیادہ قریب ہے' اب جو گمراہی کی موجیں شریعت کی کشتی سے ٹکرا رہی ہیں اور غیر اللہ سے استمداد کو جو نجات کا ذریعہ بنالیا گیا ہے اس کی صرف اللہ سے ہی شکایت ہے اور عارفین پر نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ (روح المعانی ج ۷ ص ۱۴۲' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۷ھ)

شیخ محمد بن علی شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ اور نواب صدیق حسن بھوپالی متوفی ۱۳۰۷ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ مخلوق کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ مشکلات اور شدائد میں صرف اللہ کی طرف رجوع کریں اور جو شخص مصیبت کے گرداب میں پھنسا ہوا ہو اور وہ اس وقت صرف اللہ کو پکارے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو سن لیتا ہے خواہ وہ مشرک اور کافر ہو اور یہ کہ ایسی صورت حال میں مشرکین بھی اپنے بتوں کو نہیں پکارتے تھے صرف اللہ سے دعا کرتے تھے۔ تو اس پر کس قدر تعجب ہوتا ہے کہ اب اسلام میں ایسی چیزیں پیدا ہو گئی ہیں کہ لوگ ایسی حالت میں خدا کے بجائے وفات یافتہ بزرگوں کو پکارتے ہیں اور جس طرح مشرکین نے اخلاص کے ساتھ صرف اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی وہ ایسا نہیں کرتے' غور کرو کہ ان شیطانی معتقدات نے لوگوں کو کہاں پہنچادیا ہے اور ان کے دل و دماغ پر کس طرح قبضہ کر لیا ہے کہ وہ ایسا عمل کر رہے ہیں جس کی مشرکین سے بھی توقع نہیں تھی' انا للہ وانا الیہ راجعون ○

(فتح القدیر ج ۲ ص ۶۱۱ مطبوعہ دار الوفاء بیروت' ۱۴۱۸ھ' فتح البیان ج ۶ ص ۴۰-۳۹' مطبوعہ المکتبۃ العصریہ بیروت' ۱۴۱۸ھ)

علامہ آلوسی وغیرہ کی عبارات پر تبصرہ

علامہ آلوسی کا انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام سے استمداد کو بالکل ناجائز قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے' اور اسی طرح علامہ شوکانی اور نواب صدیق حسن بھوپالی کا مشکلات میں فوت شدہ بزرگوں سے استمداد کو شیطانی معتقدات قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے' کیونکہ اس سے بشمول صحابہ کرام بکثرت صالحین امت کے عقائد کو شیطانی قرار دینا لازم آئے گا۔

امام محمد بن اثیر جزری متوفی ۶۳۰ھ لکھتے ہیں:

حضرت خالد بن ولید نے دشمن کو للکارا پھر مسلمانوں کے معمول کے مطابق پکارا یا محمداہ پھر وہ جس شخص کو بھی للکارتے اس کو قتل کر دیتے۔ (الکامل فی التاریخ ج ۲ ص ۲۴۶' البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۳۲۴)

امام ابن ابی شیبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ کراماً کاتبین کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے فرشتے مقرر کیے ہیں جو درختوں سے گرنے والے پتوں کو لکھ لیتے ہیں جب تم میں سے کسی شخص کو سفر میں کوئی مشکل پیش آئے تو وہ یہ ندا کرے "اے اللہ کے بندو! تم پر اللہ رحم فرمائے میری مدد کرو۔"

(المصنف ج ۱۰ ص ۳۹۰' مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی' ۱۴۰۶ھ)

خود علامہ محمد بن علی شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ لکھتے ہیں:

امام بزار نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب تم میں سے کسی شخص کی سواری ویران زمین میں بھاگ جائے تو وہ یہ ندا کرے "اے اللہ کے بندو! اس کو روک لو" کیونکہ زمین میں اللہ کے لیے کچھ روکنے والے ہیں جو اس کو روک لیتے ہیں۔ (کشف الاستار عن زوائد البزار ج ۴ ص ۳۴) اس حدیث کو امام ابویعلیٰ موصلی (مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث:۵۲۶۹) امام طبرانی (المعجم الکبیر رقم الحدیث:۱۰۵۱۸) اور امام ابن السنی (عمل الیوم واللیلۃ ص ۱۶۲، مطبوعہ حیدر آباد دکن) نے روایت کیا ہے۔ علامہ الہیثمی نے کہا اس میں ایک راوی معروف بن حسان ضعیف ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۳۲) علامہ نووی نے اس حدیث کو امام ابن السنی کی کتاب سے نقل کرنے کے بعد کہا مجھ سے بعض بہت بڑے علماء نے یہ کہا ہے کہ ایک ریگستان میں ان کی سواری بھاگ گئی۔ ان کو اس حدیث کا علم تھا، انہوں نے یہ کلمات کہے تو اللہ تعالیٰ نے اسی وقت اس سواری کو روک دیا، اور ایک مرتبہ میں ایک جماعت کے ساتھ تھا، ہمارے ساتھ جو سواری تھی وہ بھاگ گئی، سب اس کو روکنے سے عاجز آگئے، میں نے یہ کلمات کہے تو اسی وقت وہ سواری بغیر کسی سبب کے رک گئی۔

(الاذکار ص ۲۰۱)

امام طبرانی نے حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص کسی چیز کو گم کردے اور وہ کسی اجنبی جگہ پر ہو تو اس کو یہ کہنا چاہیے "اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو، اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو، اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو" کیونکہ اللہ کے کچھ ایسے بندے ہیں جن کو ہم نہیں دیکھتے۔ (المعجم الکبیر ج ۱۷ ص ۱۱۸-۱۱۷) حافظ الہیثمی نے کہا ہے کہ یہ امر مجرب ہے، اس کے راویوں کی توثیق کی گئی ہے باوجود اس کے کہ بعض میں ضعف ہے البتہ زید بن علی نے عتبہ کو نہیں پایا۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۳۲) اور امام بزار نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک کراماً کاتبین کے سوا زمین میں اللہ کے کچھ فرشتے ہیں جو درختوں سے گرنے والے پتوں کو لکھ لیتے ہیں، جب تم میں سے کسی کو جنگل کی زمین میں کوئی مصیبت پیش آئے تو اس کو چاہیے وہ بلند آواز سے کہے: اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو۔ (کشف الاستار عن زوائد البزار رقم الحدیث:۳۱۲۸، شعب الایمان رقم الحدیث:۱۶۷) حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۳۲) اس حدیث میں ان لوگوں سے مدد طلب کرنے پر دلیل ہے جن کو انسان نہیں دیکھتے جو اللہ کے بندوں میں سے فرشتے اور نیک جن ہیں، اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ انسان کے لیے یہ جائز ہے کہ جب اس کی سواری گر جائے یا پھسل جائے یا گم ہو جائے تو وہ بنو آدم سے مدد طلب کرے۔

(تحفۃ الذاکرین ص ۱۵۶-۱۵۵، مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی مصر، ۱۳۵۰ھ و ص ۲۰۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۰۸ھ)

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ اپنے منہیہ میں لکھتے ہیں:

علامہ زیادی نے مقرر رکھا ہے کہ انسان کی جب کوئی چیز ضائع ہو جائے اور وہ یہ ارادہ کرے کہ اللہ سبحانہ اس کی چیز واپس کردے تو اس کو چاہیے کہ وہ قبلہ کی طرف منہ کر کے کسی بلند جگہ کھڑا ہو، اور سورۃ الفاتحہ پڑھ کر اس کا ثواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچائے پھر اس کا ثواب سیدی احمد بن علوان کو پہنچائے اور یہ کہے: اے سیدی! اے احمد بن علوان! اگر آپ نے میری گم شدہ چیز واپس نہ کی تو میں آپ کا نام دیوان اولیاء سے نکال دوں گا تو جو شخص یہ کہے گا اللہ تعالیٰ ان کی برکت سے اس کی گم شدہ چیز واپس کردے گا، اجہوری مع زیادۃ، اسی طرح داؤدی رحمہ اللہ کی شرح المنہج میں ہے۔

(رد المحتار، دار الکتب العربیہ مصر، ج ۳ ص ۳۵۵، مصر ۱۳۲۷ھ، ج ۳ ص ۳۲۴، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

حافظ ابن اثیر اور حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرام اپنی مہمات

میں یامحمداہ پکارتے تھے، علامہ شوکانی نے متعدد احادیث کے حوالوں سے لکھا ہے کہ فرشتوں اور نیک جنوں سے مدد طلب کرنا جائز ہے اور علامہ شامی نے متعدد علماء کے حوالوں سے لکھا ہے کہ سیدی احمد علاوان کی وفات کے بعد ان سے مدد طلب کرنا جائز ہے، اب اگر علامہ آلوسی، علامہ شوکانی اور نواب صدیق حسن خاں بھوپالی کی تصریحات کے مطابق انبیاء کرام اور اولیاء عظام سے مدد طلب کرنے کو ناجائز اور شیطانی عقیدہ قرار دیا جائے تو بشمول صحابہ تمام صالحین امت کو شیطانی عقیدہ کا حامل قرار دینا لازم آئے گا۔

وفات یافتہ بزرگوں سے استمداد کے معاملہ میں راہِ اعتدال

ہر چند کہ قرآن مجید میں وفات شدہ بزرگوں کو پکارنے اور ان سے مدد طلب کرنے کی کہیں تصریح نہیں ہے لیکن اس سلسلہ میں احادیث اور آثار موجود ہیں جو ہم الفاتحہ: ۴ میں بیان کر چکے ہیں اس کے علاوہ علماء اسلام کی بکثرت نقول ہیں اور ان سب کو شرک اور گمراہی پر مجتمع قرار دینا درست نہیں ہے، اب حال یہ ہے کہ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو بغیر کسی قید اور بغیر کسی استثناء کے وفات شدہ بزرگوں سے استمداد کو شرک کہتے ہیں اور دوسری طرف وہ جُہلاء ہیں جو مصائب اور شدائد میں اور اپنی حاجات میں اللہ عزوجل کو چھوڑ کر وفات شدہ بزرگوں کو پکارتے ہیں اور ان ہی کے نام کی دہائی دیتے ہیں، اور ان کے نزدیک افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ وفات شدہ بزرگوں سے مدد طلب کی جائے اور اللہ کو پکارنے اور اس سے مدد طلب کرنے کو وہ وہابیت اور نجدیت قرار دیتے ہیں، حالانکہ بعض احادیث اور آثار اور بعض صوفیاء کرام اور بعض علماء کی نقول سے اگر کچھ ثابت بھی ہوتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وفات شدہ بزرگوں کو پکارنا اور ان سے مدد طلب کرنا جائز ہے، شرک نہیں ہے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ عزوجل کو چھوڑ کر صرف ان کو پکارنا اور ان سے مدد طلب کرنا افضل اور اولیٰ ہے، اور یہ بھی روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد کا ثبوت قطعی اور یقینی ہے اور اس کو پکارنا اس کی عبادت اور کار ثواب ہے اور وفات شدہ بزرگوں کا مدد کرنا قطعی اور یقینی نہیں ہے اور مشکلات اور مصائب میں ان کو پکارنا بہرحال اللہ تعالیٰ کی عبادت اور کار ثواب نہیں ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم، غوث اعظم اور دیگر اولیاء کرام سے کوئی مدد طلب کرے تو وہ اس کے رد میں انبیاء کرام اور اولیاء عظام پر وہ آیات چسپاں کرتے ہیں جو بتوں کے متعلق نازل ہوئی ہیں۔

یہ درست ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کو اللہ تعالیٰ کی امداد کا مظہر مانا جائے اور یہ اعتقاد ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت اور اس کے اذن سے حاجت روائی کرتے ہیں اور اگر اللہ نہ چاہے تو کوئی کسی کے کام نہیں آسکتا لہٰذا یہ شرک اور کفر نہیں ہے، لیکن ایسی صورت حال میں جس کا اللہ نے نقشہ کھینچا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو پکارنا اور اس سے حاجت طلب کرنا مستحسن بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ بہرحال ایک ظنی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری پکار پر ان فوت شدہ بزرگوں کو مطلع کر دے اور ہماری مدد کرنے کی ان کو اجازت دے دے اور طاقت عطا فرمائے لیکن جو چیز قطعی اور یقینی ہے اور جس میں کسی قسم کا شک اور شبہ نہیں ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ سے اور ہر حال میں سننے والا ہے اور ہر قسم کی بلا اور مصیبت کو دور کرنے والا ہے، اسے سننے کے لیے کسی کے اذن کی ضرورت نہیں ہے اور مدد کرنے کے لیے کسی کی قوت آفرینی کی حاجت نہیں ہے تو پھر کیوں نہ صرف اسی کو پکارا جائے اور اسی سے مدد طلب کی جائے جبکہ پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اسی کی دعوت دی ہے کہ اسی کو پکارو، اسی سے دعا کرو اور اسی سے مدد طلب کرو، اور جگہ جگہ بیان فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام بھی شدائد، مشکلات اور اپنی حاجات میں اسی کی طرف رجوع کرتے تھے، اسی کو پکارتے تھے اور اسی سے دعا کرتے تھے تو کیوں نہ ہم بھی اپنی مشکلات اور حاجات میں اس کارساز حقیقی کی طرف رجوع کریں اور انبیاء علیہم السلام اور صالحین کی اتباع کریں!

نیز اس پر غور کرنا چاہیے کہ انبیاء و اولیاء کو مستقل سمجھ کر ان سے مدد مانگنا شرک ہے' لیکن انہیں ایک وسیلہ' سبب اور مظہر امداد الٰہی جان کر ان کی طرف رجوع کرنا کسی طرح ایمان و اسلام کے خلاف نہیں ہے۔

بغاوت کا معنی اور اس کے متعلق احادیث

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے لوگو! تمہاری بغاوت صرف تمہارے لیے ہی (مضر) ہے۔

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

فساد میں حد سے تجاوز کرنے کو بغاوت کہتے ہیں' عورت کی فحاشی اور بدکاری کو بھی بغاوت کہتے ہیں کیونکہ یہ بھی فساد میں حد سے تجاوز کرنا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا۔ (النور: ۳۳)

جب تمہاری باندیاں پاک دامن رہنا چاہتی ہوں تو ان کو بدکاری پر مجبور نہ کرو۔

تکبر کو بھی بغاوت کہتے ہیں کیونکہ اس میں حد سے تجاوز ہے' اور جس چیز میں بھی حد سے تجاوز ہو اس کو بغاوت کہتے ہیں۔ امام کی اطاعت سے خروج کرنے کو بھی بغاوت کہتے ہیں۔ خواہش نفس کے مقابلہ میں اللہ عزوجل کے احکام کو ترک کرنا اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے سرکشی کرنا یہ بھی بغاوت ہے' ان آیات میں بغاوت اسی معنی میں ہے:

يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ (یونس: ۲۳)

زمین میں ناحق بغاوت کرتے ہیں۔

إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَى أَنْفُسِكُمْ۔ (یونس: ۲۳)

اے لوگو! تمہاری بغاوت صرف تمہارے لیے (ہی) مضر ہے۔

امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بغاوت اور رشتہ توڑنے سے زیادہ اور کوئی گناہ اس کا مستحق نہیں ہے کہ اس گناہ کے مرتکب پر اللہ جلد عذاب نازل فرمائے۔ (شعب الایمان رقم الحدیث: ۷۹۶۰)

امام ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر ایک پہاڑ بھی دوسرے پہاڑ کے خلاف بغاوت کرے تو بغاوت کرنے والا ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔

(الادب المفرد رقم الحدیث: ۵۸۸' شعب الایمان رقم الحدیث: ۶۶۹۳)

امام ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں ابو جعفر محمد بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ دعا کرنے سے افضل کوئی عبادت نہیں ہے' تقدیر کو صرف دعا ٹال دیتی ہے' نیکی کا ثواب بہت جلد ملتا ہے' اور بغاوت کی سزا بہت جلد ملتی ہے' کسی شخص کے عیب کے لیے یہ کافی ہے کہ اسے دوسرے لوگوں میں وہ چیزیں نظر آئیں جو اسے اپنے اندر نظر نہیں آتیں' اور وہ لوگوں کو ایسی چیزوں کا حکم دے جن کو وہ خود نہیں چھوڑ سکتا' اور وہ بے فائدہ باتوں سے اپنے ساتھ بیٹھنے والوں کو ایذاء پہنچائے۔

(الدر المنثور ج ۴ ص ۳۵۳-۳۵۲' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۴ھ)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہ سازش کرو اور نہ سازش کرنے والے کی مدد کرو، نہ بغاوت کرو اور نہ بغاوت کرنے والے کی مدد کرو، نہ عہد شکنی کرو اور نہ عہد شکنی کرنے والے کی مدد کرو۔

(المستدرک ج ۲ ص ۳۳۸، شعب الایمان رقم الحدیث: ۶۶۷۱)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: دنیا کی زندگی کی مثال محض اس پانی کی طرح ہے جس کو ہم نے آسمان سے نازل کیا تو اس کی وجہ سے زمین کی وہ پیداوار خوب گھنی ہوگئی جس کو انسان اور جانور سب کھاتے ہیں حتیٰ کہ عین اس وقت جب کھیتیاں اپنی ترو تازگی اور شادابی کے ساتھ لہلہانے لگیں اور ان کے مالکوں نے یہ گمان کرلیا کہ وہ ان پر قادر ہیں تو اچانک رات یا دن کو ان پر ہمارا عذاب آگیا پس ہم نے ان کھیتوں کو کٹا ہوا (ڈھیر) بنا دیا جیسے کل یہاں کچھ تھا ہی نہیں، غور و فکر کرنے والوں کے لیے ہم اسی طرح آیتوں کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں○ اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف ہدایت دیتا ہے○ (یونس: ۲۵-۲۴)

زمین کی پیداوار کی دنیا کے ساتھ مثال

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اے لوگو! تمہاری بغاوت صرف تمہارے لیے ہی مضر ہے، اب اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے متعلق ایک عجیب مثال بیان فرمائی ہے جو دنیا کی لذتوں اور مرغوبات میں منہمک ہوکر آخرت سے اعراض کرلیتا ہے۔ آسمان سے جو پانی نازل ہوتا ہے اس کی وجہ سے زمین کی پیداوار خوب گھنی ہو جاتی ہے اور بارش کی وجہ سے رنگ برنگ کے پھول، خوشنما بیلیں، خوش ذائقہ پھل اور طرح طرح کے غلوں کی اجناس پیدا ہوتی ہیں، حتیٰ کہ باغوں اور کھیتوں کا مالک جب ان ہری بھری لہلہاتی ہوئی فصلوں اور پھلوں سے لدے ہوئے درختوں کو دیکھتا ہے تو خوشی سے پھولا نہیں سماتا، پھر وہ خوش نما منصوبہ بناتا ہے کہ ان باغوں اور کھیتوں سے اتنے منافع اور فوائد حاصل کرے گا، پھر اچانک ٹڈی دل کے بادل امڈ آتے ہیں اور تمام کھیتوں اور باغوں کو چاٹ کر چلے جاتے ہیں، یا آسمان سے زبردست ژالہ باری ہوتی ہے، اور سب کچھ اجڑ جاتا ہے یا دریاؤں میں سیلاب آتا ہے اور تمام فصلوں کو بہا کر لے جاتا ہے، اور وہ غم اور افسوس میں ہاتھ ملتا ہوا رہ جاتا ہے، اسی طرح جو آدمی آخرت سے اعراض کرکے دنیا کمانے کی دھن میں لگا رہتا ہے، جب وہ آخرت میں اجر و ثواب سے محروم اور عذاب میں گرفتار ہوگا تو اس کا بھی یہی حال ہوگا۔

جنت کے داعی کے متعلق احادیث

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

سلامتی کے گھر سے مراد ہے جنت، جس میں ہر قسم کے رنج، بلا اور نقصان سے سلامتی ہے۔ جنت کی طرف لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نائب مطلق ہیں اور آپ کا بلانا اللہ کا بلانا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

حضرت ابوقلابہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا: آپ کی آنکھوں کو سونا چاہیے اور آپ کے قلب کو بیدار رہنا چاہیے اور آپ کے کانوں کو سنتے رہنا چاہیے، سو میری آنکھیں سو گئیں اور دل ہوشیار رہا، اور کان سنتے رہے، پھر کہا گیا کہ ایک سردار نے گھر بنایا پھر دسترخوان سجایا، پھر ایک بلانے والے کو بھیجا، پس جس نے اس بلانے والے کو لبیک کہا اور گھر میں داخل ہوگیا اور دسترخوان سے کھایا اس سے سردار راضی ہوگیا اور جس شخص نے اس داعی کو لبیک نہیں کہا، گھر میں داخل نہیں ہوا اور دسترخوان سے نہیں کھایا اس سے سردار راضی نہیں ہوا، پس اللہ سردار ہے اور گھر اسلام ہے

اور دسترخوان جنت ہے اور داعی (بلانے والے) محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔
(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۴۵۹۷، جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۶۵۱)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر روز جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی دونوں جانب دو فرشتے ندا کر رہے ہوتے ہیں: اے لوگو! اپنے رب کی طرف آؤ! بے شک جو چیز تھوڑی اور کافی ہو وہ اس سے بہتر ہے جو زیادہ ہو اور غافل کرنے والی ہو اور اس ندا کو جن اور انسانوں کے سوا تمام مخلوق سنتی ہے، اور اس کی تائید میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ آیت نازل فرمائی: اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔

(مسند احمد رقم الحدیث: ۲۱۷۸۰، جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۶۵۳، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۸۵، المستدرک ج ۲ ص ۴۴۵، شعب الایمان رقم الحدیث: ۳۱۳۹)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ جبرئیل میرے سر کی جانب ہیں اور میکائیل میرے پیروں کی جانب ہیں، ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا: ان کی کوئی مثال بیان کرو، پس اس نے (مجھ سے) کہا تمہارے کان سنتے رہیں اور تمہارا دل سمجھتا رہے، تمہاری اور تمہاری امت کی مثال اس طرح ہے جیسے ایک بادشاہ نے ایک حویلی بنائی ہو، اور اس حویلی میں ایک گھر بنایا ہو، پھر اس میں ایک دسترخوان سجایا ہو، پھر ایک داعی بھیجا ہو جو لوگوں کو اس دسترخوان کی طرف دعوت دے، پس بعض لوگوں نے اس داعی کی دعوت قبول کی، اور بعض نے اس کی دعوت کو ترک کر دیا، پس اللہ وہ بادشاہ ہے، اور وہ حویلی اسلام ہے، اور وہ گھر جنت ہے اور آپ اے محمد! وہ داعی ہیں، جس شخص نے آپ کی دعوت قبول کی وہ اسلام میں داخل ہو گیا اور جو اسلام میں داخل ہو گیا وہ جنت میں داخل ہو گیا اور جو جنت میں داخل ہو گیا، اس نے اس جنت کی نعمتوں سے کھایا۔

(المستدرک ج ۲ ص ۳۳۸، جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۶۵۴، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۱ ص ۳۷۰)

جنت کو دارالسلام کہنے کی وجوہات

جنت کو دارالسلام کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ جنت کے سات نام ہیں اور ان میں سے ایک نام دارالسلام ہے، وہ سات نام یہ ہیں: (۱) دارالسلام، (۲) دارالجلال، (۳) جنت عدن، (۴) جنت الماویٰ، (۵) جنت الخلد، (۶) جنت الفردوس، (۷) جنت النعیم۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جنتی ایک دوسرے کو دعا دیتے ہوئے کہیں گے سلام (تحیتھم فیھا سلم، ابراہیم: ۲۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ اہل جنت ہر ناپسندیدہ چیز سے سلامت اور محفوظ ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جن لوگوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے اچھی جزاء ہے اور اس کے علاوہ زائد اجر ہے، اور ان کے چہروں پر نہ سیاہی چھائے گی نہ ذلت، وہی جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ○ (یونس: ۲۶)

محشر میں مومنین کی عزت اور سرفرازی

نیک عمل سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر جو احکام فرض اور واجب مقرر کیے ہیں ان کو اچھی طرح ادا کرتے ہیں اور سنن اور مستحبات پر عمل کرتے ہیں، اور جن کاموں کو حرام اور مکروہ تحریمی قرار دیا ہے ان سے دائماً مجتنب رہتے ہیں اور مکروہات اور خلاف اولیٰ کاموں سے بھی بچتے رہتے ہیں اور اگر کوئی فروگذاشت ہو جائے تو فوراً توبہ کر لیتے ہیں اور حسنیٰ (اچھی جزاء) سے مراد جنت ہے۔

اور زیادۃ (زائد اجر) سے مراد ہے اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جو زائد اجر عطا فرمائے گا' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهِ۔ (فاطر: ٣٠) تاکہ اللہ انہیں ان کا پورا اجر عطا فرمائے اور اپنے فضل سے انہیں اور زیادہ دے۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ زیادہ اجر سے مراد ہے اللہ تعالیٰ ایک نیکی کا دس گنا اجر عطا فرماتا ہے اور بعض اوقات سات سو گنا اجر عطا فرماتا ہے اور کبھی اس کو بھی دگنا کر دیتا ہے اور کبھی بے حساب اجر عطا فرماتا ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی رضا زائد اجر ہے اور چوتھا قول یہ ہے اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے دنیا میں بے حساب نعمتیں عطا فرماتا ہے اور پانچواں قول یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ عزوجل کا دیدار کرنا ہے:

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے للذین احسنوا الحسنی وزیادۃ (یونس: ٢٦) کی تفسیر میں فرمایا: جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے، تو ایک منادی ندا کرے گا تمہارے لیے اللہ کے پاس ایک وعدہ ہے' اہل جنت کہیں گے: کیا اللہ نے ہمارے چہروں کو سفید نہیں کیا' کیا اس نے ہم کو دوزخ سے نجات نہیں دی' کیا اس نے ہم کو جنت میں داخل نہیں کیا؟ فرشتے کہیں گے: کیوں نہیں! آپ نے فرمایا: پھر حجاب کھول دیا جائے گا' آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم! اللہ نے اپنی طرف دیکھنے سے زیادہ ان کے نزدیک کوئی محبوب چیز ان کو نہیں دی۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٨١' سنن الترمذی رقم الحدیث: ٢٥٥٢' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ١٨٧' صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ٧٤٤١' مسند احمد ج ٤ ص ٣٣٢)

اللہ تعالیٰ کا دیدار

قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ٥٤٤ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ اہل جنت اپنے رب کو دیکھیں گے' اور تمام اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ عقلاً اللہ تعالیٰ کو دیکھنا جائز ہے اور قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے آخرت میں مومنین کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا ثابت ہے' اس پر امت کے تمام متقدمین کا اجماع ہے اور دس سے زیادہ صحابہ نے اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ معتزلہ' خوارج اور بعض مرجیہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی عقلاً نفی کرتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ دکھائی دینے والا دیکھنے والے کی مقابل جانب میں ہونا چاہیے اور دیکھنے والے کی بصری شعاعیں اس سے متصل ہونی چاہئیں اور اہل حق کہتے ہیں کہ یہ شرائط ممکنات کے لیے ہیں' اللہ تعالیٰ ان شرائط سے بری ہے' آخر وہ دیکھتا بھی تو ہے اور جب وہ بغیر سمت اور جانب کے دیکھتا ہے تو اس کے دکھائی دینے سے کیا چیز مانع ہے۔ (اکمال المعلم بہ فوائد مسلم ج ١ ص ٥٤١' ٥٤٠' مطبوعہ دار الوفا بیروت' ١٤١٩ھ)

اللہ تعالیٰ کے حجاب سے کیا مراد ہے؟

اس حدیث میں ہے پھر حجاب کھول دیا جائے گا' اس حجاب سے مراد نور کا حجاب ہے کیونکہ حدیث میں ہے اللہ کا حجاب نور ہے اگر وہ اس حجاب کو کھول دے تو اس کے چہرے کے انوار منتہائے بصر تک تمام مخلوق کو جلا ڈالیں۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ٢٩٣' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ١٩٥' مسند احمد ج ٤ ص ٤٠١) اس حدیث میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حجاب دنیا کے معروف حجاب کی طرح نہیں ہے' اور اللہ تعالیٰ اپنی عزت اور جلال کے انوار کی وجہ سے مخلوق سے محتجب ہے اور اس کی عظمت اور کبریاء کی شعاعیں ہی وہ حجاب ہیں جس کے سامنے عقلیں مدہوش ہو جاتی ہیں اور نظریں مبہوت ہو جاتی ہیں اور بصیرتیں حیران ہو جاتی ہیں' اگر وہ حقائق صفات اور عظمت ذات کے ساتھ تجلی فرمائے تو ہر چیز خاکستر ہو جائے گی۔

حجاب اصل میں اس ستر کو کہتے ہیں جو دیکھنے والے اور دکھائی دینے والے کے درمیان حائل ہو جائے اور اس حدیث میں حجاب سے مراد یہ ہے کہ اللہ کو دیکھنے سے اس کا نور جلال مانع ہے اور اس مانع کو ستر اور حائل کے قائم مقام کیا گیا ہے اور کتاب اور سنت کی تصریحات سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ یہ حجاب اور دیکھنے سے مانع اس دنیا میں ہے جو فنا کے لیے بنائی گئی ہے نہ کہ آخرت میں جو بقا کے لیے بنائی گئی ہے یعنی آخرت میں یہ حجاب کھول دیا جائے گا اور مومنین اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں گے اور یہ حجاب مخلوق کی طرف راجع ہے کیونکہ وہی اللہ تعالیٰ سے محجوب ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جن لوگوں نے برے کام کیے ان کو ان ہی کی مثل بری سزا ملے گی اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی، ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا، گویا ان کے چہرے اندھیری رات کے ٹکڑوں سے ڈھانپ دیئے گئے، وہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے○ (یونس: ٢٧)

محشر میں کفار کی ذلت اور رسوائی

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے اخروی احوال اور ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا بیان فرمایا تھا اور اس آیت میں اللہ عزوجل کفار کے اخروی احوال اور ان کے عذاب کا بیان فرما رہا ہے، کفار کے اخروی احوال میں سے اللہ تعالیٰ نے حسب ذیل چار امور بیان فرمائے ہیں:

(١) ایک جرم کی ایک ہی سزا ملے گی، اور اس کو بیان کرنے سے مقصود نیکی اور برائی کی جزا اور سزا کا فرق بیان کرنا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی کی جزا دس گنا، سات سو گنا اور اس سے بھی زیادہ عطا فرماتا ہے اور ایک برائی کی ایک ہی سزا دیتا ہے، تاکہ انسان نیکی کی طرف راغب ہو اور برائی سے متنفر ہو۔

(٢) ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی، اس میں ان کی تحقیر اور توہین کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی ذلت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا۔ (بنی اسرائیل: ٩٧)

ہم قیامت کے دن ان کو چہروں کے بل اٹھائیں گے، اس حال میں کہ وہ اندھے اور گونگے اور بہرے ہوں گے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن اٹھنے والے لوگوں کی تین قسمیں ہوں گی: ایک قسم ان لوگوں کی ہوگی جو پیدل چل رہے ہوں گے (یعنی عام مسلمان) اور ایک قسم ان لوگوں کی ہوگی جو سواری پر ہوں گے (یعنی اولیاء اللہ) اور ایک قسم ان لوگوں کی ہوگی جو اپنے چہروں کے بل چل رہے ہوں گے، (یعنی کفار) عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! وہ اپنے چہروں کے بل کیسے چلیں گے؟ فرمایا: جس ذات نے ان کو، ان کے قدموں سے چلایا ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ ان کو چہروں کے بل چلائے؟ وہ ہر بلندی اور ہر کانٹے سے اپنے چہروں سے بچ رہے ہوں گے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ٣١٤٢، مسند احمد ج ٢ ص ٤٠٧ رقم الحدیث: ٨٦٦٨، شعب الایمان رقم الحدیث: ٣٥٦)

اس حدیث میں ان کی تذلیل اور تحقیر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے چہروں سے ہاتھوں اور پیروں کا کام لیں گے، کیونکہ جس ذات نے ان کو پیدا کیا اور ان کو حسین صورت دی انہوں نے اس ذات کے لیے اپنے چہرہ کو نہیں جھکایا تو قیامت کے دن وہ چہرہ ذلیل ہو کر پیروں کا کام کرے گا جس سے وہ چل رہے ہوں گے اور ہاتھوں کا کام کرے گا جس سے وہ راستے کی تکلیف دہ چیزوں کو ہٹائیں گے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن ان کی رسوائی بیان کرتے ہوئے فرمایا:

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ

مجرم اپنی علامتوں سے پہچانے جائیں گے انہیں پیشانی کے

بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ-(الرحمٰن: ۴۱) — بالوں اور پاؤں سے پکڑا جائے گا۔

حضرت ابن عباس نے اس کی تفسیر میں فرمایا: اس کے سر اور پیر کو اکٹھا کر کے رسی سے باندھ دیا جائے گا۔
(البدور السافرۃ رقم الحدیث: ۱۴۲۸)

ضحاک نے اس کی تفسیر میں کہا: اس کی پیشانی اور اس کے پیروں کو پکڑ کر اس کی پشت کے پیچھے سے زنجیر کے ساتھ باندھ دیا جائے گا۔ (البدور السافرۃ رقم الحدیث: ۱۴۲۹)

(۳) ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔ دنیا اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہے، ہاں جس کو اللہ تعالیٰ اپنے حضور شفاعت کی اجازت دے گا اس کی شفاعت سے گنہگار عذاب سے نجات پائیں گے اور سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم گنہگاروں کی شفاعت فرمائیں گے، ان کی عذاب سے نجات ہو گی یا عذاب میں تخفیف ہو گی اور بعض کفار مثلاً ابو طالب کے عذاب میں بھی تخفیف کی شفاعت فرمائیں گے اور آپ کی وجہ سے ابولہب کے عذاب میں بھی تخفیف ہو گی اور حسب ذیل احادیث میں اس پر دلیل ہے:

حضرت عباس بن عبد المطلب نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا آپ نے ابو طالب کو کچھ فائدہ پہنچایا وہ آپ کی حفاظت کرتے تھے اور آپ کے لیے غضب ناک ہوتے تھے؟ آپ نے فرمایا: ہاں وہ بہ مقدار ٹخنوں کے آگ میں ہیں اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوتے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۸۸۳، ۶۲۰۸، ۶۵۷۲، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۰۹)

عروہ نے کہا: ثویبہ ابولہب کی باندی تھی، ابولہب نے اس کو آزاد کر دیا، اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا تھا۔ جب ابولہب مر گیا تو اس کے بعض اہل نے اس کو برے حال میں (خواب میں) دیکھا، اس سے پوچھا: تمہارے ساتھ کیا ہوا؟ ابولہب نے کہا تم سے جدا ہونے کے بعد مجھے کوئی راحت نہیں ملی البتہ ثویبہ کو میرے آزاد کرنے کی وجہ سے مجھے اس (انگلی) سے پلایا جاتا ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۱۰۱، مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۱۳۹۵۵)

محدث رزین کی روایت میں ہے کہ ابولہب کو خواب میں حضرت عباس نے اسلام لانے کے بعد دیکھا تھا، اس کی بری حالت تھی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے پوچھا تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوا، اس نے کہا تمہارے بعد مجھے کوئی راحت نہیں ملی البتہ ہر پیر کی رات کو اس (یعنی انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی) سے پلایا جاتا ہے، کیونکہ میں نے ثویبہ کو آزاد کیا تھا۔
(جمع الفوائد رقم الحدیث: ۳۱۹۸، مطبوعہ دار ابن حزم کویت، ۱۴۱۸ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ حضرت عباس نے اسلام قبول کرنے سے پہلے ابولہب کو خواب میں دیکھا تھا، اور کفار کے عذاب میں بطریق عدل تخفیف نہیں ہوتی لیکن چونکہ ابولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نیکی کی تھی اس لیے بطریق فضل اس کے عذاب میں تخفیف فرما دی۔ (فتح الباری ج ۹ ص ۱۴۶۔۱۴۵، ملخصاً، مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۱ھ)

(۴) گویا ان کے چہرے اندھیری رات کے ٹکڑوں سے ڈھانپ دیئے گئے، اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں کفار کا حال مسلمانوں کے برعکس ہو گا کیونکہ اس سے پہلی آیت میں مسلمانوں کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا: اور ان کے چہروں پر نہ سیاہی چھائے گی نہ ذلت۔ قرآن مجید کی حسب ذیل آیتوں میں بھی یہ بیان فرمایا ہے کہ کافروں کے چہرے سیاہ ہوں گے:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ○ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ○ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ○ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ○ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ

بہت سے چہرے اس دن چمکتے ہوئے ہوں گے ○ مسکراتے ہوئے شاداں و فرحاں ○ اور بہت سے چہرے اس دن غبار آلود ہوں گے ○ ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہو گی ○ یہی لوگ ہیں جو کافر

الْفَجَرَةُ ۝ (عبس: ٤٢-٣٨)
بدکار ہیں ۝

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ - الايه - (آل عمران: ١٠٦)
جس دن بہت سے چہرے سفید ہوں گے اور بہت سے چہرے سیاہ ہوں گے، رہے وہ چہرے جو سیاہ ہوں گے (تو ان سے کہا جائے گا) کیا تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے۔

وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى اللَّهِ وُجُوهُهُمْ مُسْوَدَّةٌ - (الزمر: ٦٠)
اور جن لوگوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا تھا آپ دیکھیں گے قیامت کے دن ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے، پھر ہم مشرکوں سے کہیں گے تم اور تمہارے شریک سب اپنی اپنی جگہ ٹھہریں، پھر ہم ان کے درمیان پھوٹ ڈال دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے ۝ پس ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کافی گواہ ہے کہ بے شک ہم تمہاری عبادت سے غافل تھے ۝ (یونس: ٢٩-٢٨)

قیامت کے دن شرکاء کی مشرکین سے بیزاری اور شرکاء کا مصداق

ان آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن غیر اللہ کی عبادت کرنے والوں اور ان کے معبودوں کو جمع فرمائے گا اور اس دن وہ معبود اپنے عابدوں سے براءت کا اظہار کریں گے اور اس دن یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ان مشرکوں نے ان معبودوں کے علم، ارادہ اور ان کی رضا اور رغبت سے ان کی عبادت نہیں کی، اور اس سے مقصود یہ ہے کہ دنیا میں مشرکین یہ کہا کرتے تھے کہ یہ بت اللہ کے پاس ہماری شفاعت کریں گے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن یہ ظاہر فرمائے گا کہ قیامت کے دن ان کے خود ساختہ معبود اللہ تعالیٰ کے پاس ان کی شفاعت نہیں کریں گے بلکہ ان کی عبادت سے برأت کا اظہار کریں گے جیسا کہ اس آیت میں فرمایا ہے:

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا - (البقرہ: ١٦٦)
جن لوگوں کی دنیا میں پیروی کی گئی تھی، جب وہ ان لوگوں سے بیزار ہوں گے جنہوں نے پیروی کی تھی۔

اس آیت میں شرکاء سے مراد کون ہیں، اس میں تین قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد فرشتے ہیں اور اس پر دلیل یہ آیت ہے:

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَائِكَةِ أَهَؤُلَاءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ ۝ قَالُوا سُبْحَانَكَ أَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُونِهِمْ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُؤْمِنُونَ ۝ (سبا: ٤١-٤٠)
اور جس دن وہ ان سب کو جمع فرمائے گا اور فرشتوں سے فرمائے گا کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے ۝ وہ عرض کریں گے تو (شرکاء سے) پاک ہے، ان کے بغیر تو ہمارا مالک ہے، بلکہ یہ جنات کی عبادت کرتے تھے اور ان میں سے اکثر ان پر ہی ایمان رکھتے تھے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ان شرکاء سے مراد فرشتے نہیں ہیں کیونکہ اس آیت میں جو خطاب ہے وہ تہدید اور وعید پر مشتمل ہے اور وہ ملائکہ مقربین کے مناسب نہیں ہے اور اس آیت میں شرکاء سے مراد بت ہیں، اب رہا یہ سوال کہ وہ بت کیسے کلام کریں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان میں حیات، عقل اور نطق پیدا کر دے گا یا ان میں صرف نطق پیدا کر دے گا۔

تیسرا قول یہ ہے کہ شرکاء سے مراد ہر وہ ذات ہے جس کی اللہ کو چھوڑ کر پرستش کی گئی، خواہ وہ بت ہوں، سورج ہو، چاند ہو، انسان ہو، جن ہو یا فرشتہ ہو۔

شرکاء کے کلام پر کذب کا اعتراض اور اس کے جوابات

اس آیت میں یہ مذکور ہے کہ جن کی یہ مشرکین عبادت کرتے تھے وہ یہ کہیں گے "تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے" حالانکہ فی الواقع ان مشرکین نے ان کی عبادت تو کی تھی تو پھر ان کا یہ کلام خلاف واقع اور جھوٹ ہوا' اس سوال کے حسب ذیل جوابات ہیں:

(۱) میدان محشر میں سب حیرت اور دہشت میں مبتلا ہوں گے سو یہ کلام ان سے دہشت کی صورت میں صادر ہوگا جیسے مجنون اگر کوئی بات خلاف واقع کہے تو اس پر کذب کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔

(۲) ان کے نزدیک کفار کے اقوال اور افعال ساقط الاعتبار تھے' وہ ان کو لائق شمار نہیں سمجھتے تھے' سو ہر چند کہ مشرکین نے ان کی عبادت کی تھی لیکن ان کے نزدیک کفار کا یہ فعل کسی گنتی اور شمار میں نہیں تھا۔

(۳) کفار نے اپنے اوہام اور تخیلات میں ان معبودوں کے لیے ایسی صفات فرض کی ہوئی تھیں جو در حقیقت ان معبودوں کو حاصل نہیں تھیں مثلاً یہ کہ وہ نفع اور ضرر پہنچانے پر قادر ہیں اور اللہ کے پاس ان کی شفاعت کریں گے' تو گویا مشرکین ان معبودوں کی عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ ان چیزوں کی عبادت کرتے تھے جو ان فرضی چیزوں کے ساتھ موصوف تھیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اس وقت ہر شخص اپنے بھیجے ہوئے اعمال (کے نتیجہ) میں مبتلا ہوگا' وہ سب اللہ کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے جو ان کا مالک حقیقی ہے اور وہ جو کچھ بہتان باندھتے رہے تھے وہ ان سے گم ہو جائیں گے○ (یونس: ۳۰)

اس آیت کے دو معنی ہیں: ایک یہ ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کے نتیجہ کی پیروی کرے گا' اگر اس کے نیک اعمال تھے تو وہ جنت کی طرف جائے گا اور اگر اس کے برے اعمال تھے تو دوزخ کی طرف جائے گا' اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال نامے کو پڑھے گا اور اس کے مطابق اپنی جزا یا سزا کو جان لے گا۔

امام ابن جریر نے سند ضعیف کے ساتھ روایت کیا ہے کہ ہر وہ قوم جو اللہ کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کی پرستش کرتی تھی ان کے لیے ان کے معبودوں کو متمثل کر دیا جائے گا' وہ ان کے پیچھے جائیں گے حتیٰ کہ وہ ان کو دوزخ میں داخل کر دیں گے۔

(جامع البیان جز ۱۱ ص ۱۴۸' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

اور تمام مشرکین اس دن اللہ عزوجل کی طرف رجوع کریں گے جو ان کا مالک حقیقی ہے اور دنیا میں وہ اللہ کو چھوڑ کر جن چیزوں کی عبادت کرتے تھے ان کا جھوٹ اور بطلان ان پر منکشف ہو جائے گا۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ

آپ (ان سے) کہیے کہ تمہیں آسمان اور زمین سے کون رزق دیتا ہے؟ یا کان اور آنکھوں کا

الْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ

کون مالک ہے؟ اور مردے سے زندہ کو کون نکالتا ہے اور زندہ سے مردے کو کون

مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ

نکالتا ہے؟ اور نظام کائنات کو کون چلاتا ہے؟ تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ، پھر آپ کہیں

أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٣١﴾ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ

کر تم (اللہ سے) ڈرتے کیوں نہیں! ○ یہی اللہ ہے جو تمہارا برحق رب ہے، تو حق کو چھوڑ کر گمراہی کے سوا

إِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَأَنّٰى تُصْرَفُونَ ﴿٣٢﴾ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ

اور کیا ہے! سو تم کہاں پھرائے جا رہے ہو! ○ فاسقوں پر اسی طرح آپ کے رب کے

رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ فَسَقُوٓا أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٣﴾ قُلْ هَلْ

دلائل قائم ہو چکے ہیں، وہ یقیناً ایمان نہیں لائیں گے ○ آپ کہیے کہ

مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهٗ ۗ قُلِ اللّٰهُ

تمہارے (خود ساختہ) شرکاء میں سے کوئی ہے جو مخلوق کی پیدائش کی ابتداء کر سکے پھر (فنا کے بعد) اس کو دوبارہ پیدا کر سکے؟ آپ

يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهٗ فَأَنّٰى تُؤْفَكُونَ ﴿٣٤﴾ قُلْ هَلْ مِنْ

کہیے کہ اللہ ہی پیدائش کی ابتداء کرتا ہے پھر (فنا کے بعد) اس کو دوبارہ پیدا کرے گا! سو تم کہاں اوندھے پھر رہے ہو ○ آپ کہیے کہ تمہارے

شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيٓ إِلَى الْحَقِّ ۗ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ ۗ

(خود ساختہ) شرکاء میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف ہدایت دے سکے؟ آپ کہیے کہ اللہ ہی حق کی ہدایت دیتا ہے،

أَفَمَنْ يَّهْدِيٓ إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُّتَّبَعَ أَمَّنْ لَّا يَهِدِّيٓ

تو کیا جو حق کی ہدایت دے وہ فرمانبرداری کا زیادہ مستحق ہے یا وہ جو بغیر ہدایت دیے خود

إِلَّآ أَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۚ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿٣٥﴾ وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ

ہی ہدایت نہ پا سکے؟ تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم کیسے فیصلے کر رہے ہو! ○ ان میں سے اکثر لوگ صرف

إِلَّا ظَنًّا ۗ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌۢ

گمان کی پیروی کرتے ہیں، بے شک گمان کبھی یقین سے مستغنی نہیں کرتا، بے شک اللہ خوب جاننے والا ہے

بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾ وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ أَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُونِ

جو کچھ وہ کرتے ہیں ○ اور قرآن ایسی چیز نہیں کہ اللہ کی وحی کے بغیر اس کو گھڑ لیا جائے

اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا

لیکن یہ موجودہ (آسمانی) کتابوں کی تصدیق ہے، اور الکتاب کی تفصیل ہے اور

رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رب العٰلمین کی جانب سے ہے ○ کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ رسول نے اس کتاب کو خود گھڑ لیا ہے؟ آپ

بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ

کہیے کہ پھر اس کی مثل تم کوئی ایک سورت (بنا کر) لے آؤ اور اللہ کے سوا جن کو تم بلا سکتے ہو ان کو (بھی) بلا لو اگر

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا

تم سچے ہو ○ بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اس چیز کو جھٹلایا جس کا انہیں پوری طرح علم نہیں ہو سکا تھا، اور ابھی

يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ

تک اس کے جھٹلانے کا انجام نہیں آیا، اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا، پھر دیکھ لو

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَ

ظالموں کا کیسا انجام ہوا ○ اور ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو اس پر ایمان لائیں گے اور

ع ۴ ۹ مِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾ ع

ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو اس پر ایمان نہیں لائیں گے، اور آپ کا رب فساد کرنے والوں کو خوب جاننے والا ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ (ان سے) کہیے کہ تمہیں آسمان اور زمین سے کون رزق دیتا ہے؟ یا کان اور آنکھوں کا کون مالک ہے؟ اور مردے سے زندہ کو کون نکالتا ہے اور زندہ سے مردے کو کون نکالتا ہے؟ اور نظام کائنات کو کون چلاتا ہے؟ تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ، پھر آپ کہیں کہ تم (اللہ سے) ڈرتے کیوں نہیں! ○ یہی اللہ ہے جو تمہارا برحق رب ہے، تو حق کو چھوڑ کر گمراہی کے سوا اور کیا ہے! سو تم کہاں پھرائے جا رہے ہو! ○ فاسقوں پر اسی طرح آپ کے رب کے دلائل قائم ہو چکے ہیں، وہ یقیناً ایمان نہیں لائیں گے ○ (یونس: ۳۳-۳۱)

توحید کے اثبات پر دلائل

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی مذمت فرمائی تھی اور ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ ان کے مذہب کا بطلان اور اسلام کی حقانیت کو واضح فرما رہا ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رزق، حواس اور موت اور حیات کے احوال سے استدلال فرمایا ہے۔

رزق سے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی نشوونما غذا سے ہوتی ہے اور غذا سبزیوں اور پھلوں سے حاصل ہوتی ہے یا گوشت سے اور گوشت کا مآل بھی نباتات ہیں کیونکہ جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے ان کی غذا بھی زمین کی پیداوار ہے اور زمین کی پیداوار آسمان سے برسنے والے پانی اور زمین کی روئیدگی پر موقوف ہے' اور زمین اور آسمان کے نظام کو چلانے والا صرف اللہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ رزق دینے والا صرف اللہ ہے' اور حواس میں سب سے اشرف کان اور آنکھیں ہیں کیونکہ یہی علم اور ادراک کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں اور حضرت علی نے فرمایا: سبحان ہے وہ ذات جس نے چربی سے دکھایا اور ہڈی سے سنایا اور گوشت کے ایک پارچہ کو گویائی بخشی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ مردے سے زندہ کو نکالتا ہے جس طرح اس نے انسان اور پرندے کو نطفہ اور انڈے سے نکالا جو بظاہر بے جان ہیں یا جس طرح اس نے مومن کو کافر سے پیدا کیا' اور اس نے فرمایا وہ زندہ سے مردے کو نکالتا ہے جس طرح اس نے نطفہ اور انڈے کو انسان اور پرندے سے نکالا یا جس طرح اس نے کافر کو مومن سے پیدا فرمایا۔

اور اے مشرکو! جب تمہیں یہ اعتراف اور اقرار ہے کہ زمین اور آسمان سے رزق دینے والا' اور انسان کو حواس دینے والا' اور موت اور حیات کو پیدا کرنے والا اور اس تمام نظام کائنات کو چلانے والا صرف اللہ ہے' تو پھر تم اللہ کے لیے شریک کیوں بناتے ہو اور شریک بنانے پر اللہ کی گرفت اور عذاب سے کیوں نہیں ڈرتے!

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہی اللہ ہے جو تمہارا برحق رب ہے' یعنی جس کی ایسی عظیم الشان قدرت ہے جس سے اس نے اس ساری مخلوق کو پیدا کیا ہے اور جس کی ایسی وسیع رحمت ہے جس سے وہ اس ساری مخلوق کی پرورش کر رہا ہے یہی تو درحقیقت تمہارا رب ہے تم اس کو چھوڑ کر کہاں مارے مارے پھر رہے ہو' ان گنت دروازوں پر گدا کرنے کی کیا ضرورت ہے' اسی ایک در کے ہو رہو۔

پھر فرمایا: فاسقوں پر اسی طرح آپ کے رب کے دلائل قائم ہو چکے ہیں وہ یقیناً ایمان نہیں لائیں گے۔

اصطلاح میں فاسق اس شخص کو کہتے ہیں جو مومن ہو اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو لیکن اس آیت میں فاسقین سے مراد ایسے کافر ہیں جو ضد اور ہٹ دھرمی سے اپنے کفر پر قائم تھے اور معجزات اور دلائل پیش کیے جانے کے باوجود اپنے آباء و اجداد کی اندھی تقلید سے توبہ نہیں کرتے تھے اور وہ اپنے کفر اور عناد سے اس حد پر پہنچ چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ اب وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اس آیت پر یہ اعتراض ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے تو ان کا ایمان لانا محال ہے حالانکہ وہ ایمان لانے کے مکلف ہیں' اس سے لازم آیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو محال کا مکلف کیا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کرتا' اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس آیت سے قطع نظر کر کے فی نفسہ ایمان لانے کے مکلف ہیں' اس کی مفصل تفسیر البقرہ: ٦ میں ملاحظہ فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہئے کہ تمہارے (خودساختہ) شرکاء میں سے کوئی ہے جو مخلوق کی پیدائش کی ابتداء کر سکے؟ پھر (فنا کے بعد) اس کو دوبارہ پیدا کر سکے؟ آپ کہئے کہ اللہ ہی پیدائش کی ابتداء کرتا ہے پھر (فنا کے بعد) اس کو دوبارہ پیدا کرے گا! سو تم کہاں اوندھے پھر رہے ہو؟○ آپ کہئے کہ تمہارے (خودساختہ) شرکاء میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف ہدایت دے سکے؟ آپ کہئے کہ اللہ ہی حق کی ہدایت دیتا ہے' تو کیا جو حق کی ہدایت دے وہ فرمانبرداری کا زیادہ مستحق ہے یا وہ جو بغیر ہدایت دیئے خود ہی ہدایت نہ پا سکے' تمہیں کیا ہوا ہے! تم کیسے فیصلے کر رہے ہو!○ ان میں سے اکثر لوگ صرف گمان کی پیروی

کرتے ہیں، بے شک گمان کبھی یقین سے مستغنی نہیں کرتا، بے شک اللہ خوب جاننے والا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں O
(یونس: ۳۶-۳۴)

شرک کا بطلان

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے توحید کے اثبات پر دلائل قائم کیے تھے اور ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر دلائل قائم فرما رہا ہے کہ جو ذات ابتداءً مخلوق کو پیدا کرنے پر قادر ہے وہ دوبارہ بھی اس کو پیدا کرنے پر قادر ہے۔

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے: اے محمد! ان مشرکین سے کہئے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی پرستش کرتے ہو کیا وہ بغیر مادے کے کسی چیز کو پیدا کر سکتے ہیں اور پیدا کرنے کے بعد کیا اس کو فنا کر سکتے ہیں اور پھر دوبارہ اس کو اسی شکل و صورت پر پیدا کر سکتے ہیں اور کیا ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ کیا ہے اور اس میں یہ واضح اور قطعی دلیل ہے کہ ان کا جو یہ دعویٰ ہے کہ یہ بت اللہ کے سوا رب ہیں اور یہ استحقاق عبادت میں اللہ تعالیٰ کے شریک ہیں، وہ اپنے اس دعویٰ میں کذاب اور مفتری ہیں۔

اس کے بعد فرمایا: اے محمد! ان مشرکین سے یہ کہہ دیجئے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر جن بتوں کی عبادت کرتے ہو کیا یہ کسی ایسے شخص کو سیدھا راستہ دکھا سکتے ہیں جو سیدھا راستہ گم کر چکا ہو، یہ خود اس بات کا دعویٰ نہیں کرتے کہ ان کے خود ساختہ معبود کسی گم کردہ راہ کو راستہ دکھا سکتے ہیں کیونکہ بالفرض اگر یہ ایسا دعویٰ کریں بھی تو مشاہدہ اور واقعہ ان کی تکذیب کردے گا، اور جب یہ اقرار کرلیں کہ ان کے اختراعی معبود کسی گم کردہ راہ کو راستہ نہیں دکھا سکتے تو پھر ان سے کہئے کہ اللہ تو گمراہوں کو حق کی ہدایت دیتا ہے، تو جو گمراہوں کو حق کی ہدایت دیتا ہو وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی دعوت پر لبیک کہی جائے یا وہ جو بغیر ہدایت دیئے خود بھی ہدایت نہ پا سکے۔ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ جو حق کی ہدایت دیتا ہے وہ اس کی بہ نسبت اطاعت اور فرمانبرداری کا زیادہ مستحق ہے جو بغیر کسی کی ہدایت دینے کے از خود ہدایت نہ پا سکتا ہو لہٰذا تم ان بتوں کی عبادت کو ترک کر کے اس کی اطاعت اور عبادت کرو جو خشکی اور سمندروں میں بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ دکھاتا ہے اور اخلاص کے ساتھ صرف اسی کی عبادت کرو نہ کہ ان بتوں کی جن کو تم نے بغیر کسی دلیل کے اللہ کا شریک بنا لیا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان مشرکین میں سے اکثر صرف ظن اور تخمین کی پیروی کرتے اور اٹکل پچو سے بتوں کو اللہ کا شریک بناتے ہیں اور اس کی صحت اور واقعیت کے متعلق ان کو خود شکوک اور شبہات لاحق رہتے ہیں اور ظن کبھی بھی یقین سے مستغنی نہیں کر سکتا۔

قیاس اور خبر واحد کے حجت ہونے پر ایک اعتراض کا جواب

اس آیت سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس آیت میں اتباع ظن کی مذمت کی گئی ہے اور قیاس اور خبر واحد بھی ظنی ہیں لہٰذا قیاس اور خبر واحد بھی حجت نہ رہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں مطلقاً ظنی دلیل کی اتباع سے منع نہیں کیا گیا بلکہ اس ظنی دلیل کی اتباع سے منع کیا گیا ہے جو ظن یقین اور قطعیت کے خلاف اور اس کے معارض ہو جیسے مشرکین کا اپنے بتوں کی پرستش کرنا محض اپنے ظن کی بناء پر تھا اور ان کا یہ ظن ان دلائل یقینیہ اور براہین قطعیہ کے خلاف تھا، جو شرک کے بطلان پر دلالت کرتے ہیں، سو قیاس اور خبر واحد درجہ ظن میں حجت ہوتے ہیں اور اس سے مراد وہی قیاس ہے جو کسی دلیل قطعی کے خلاف نہ ہو، جیسے ابلیس نے قیاس کر کے خود کو حضرت آدم سے افضل کہا تھا، سو یہ قیاس دلیل قطعی کے خلاف تھا، اور وہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ سب آدم کو سجدہ کریں، اسی طرح جو خبر واحد قرآن مجید یا کسی خبر متواتر کے خلاف ہو وہ بھی حجت

نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور قرآن ایسی چیز نہیں کہ اللہ کی وحی کے بغیر اس کو گھڑ لیا جائے لیکن یہ موجودہ (آسمانی) کتابوں کی تصدیق ہے، اور الکتاب کی تفصیل ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رب العالمین کی جانب سے ہے○ کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ رسول نے اس کتاب کو خود گھڑ لیا ہے؟ آپ کہیے کہ پھر اس کی مثل تم کوئی ایک سورت (بنا کر) لے آؤ اور اللہ کے سوا جن کو تم بلا سکتے ہو ان کو (بھی) بلا لو اگر تم سچے ہو○ بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اس چیز کو جھٹلایا جس کا انہیں پوری طرح علم نہیں ہو سکا تھا، اور ابھی تک اس کے جھٹلانے کا انجام نہیں آیا، اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا، پھر دیکھ لو ظالموں کا کیسا انجام ہوا○ اور ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو اس پر ایمان لائیں گے اور ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو اس پر ایمان نہیں لائیں گے، اور آپ کا رب فساد کرنے والوں کو خوب جاننے والا ہے○ (یونس: ۴۰-۳۷)

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلائل

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے توحید پر دلائل قائم کیے تھے اور شرک کا بطلان ظاہر فرمایا تھا اور ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلائل قائم کیے ہیں اور آپ کی نبوت پر جو ان کے شبہات تھے ان کا ازالہ فرمایا ہے۔ ان کا ایک شبہ یہ تھا کہ اس قرآن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود تصنیف کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کا اس طرح ازالہ فرمایا کہ یہ قرآن ایسی چیز نہیں ہے کہ اللہ کی وحی کے بغیر اس کو گھڑ لیا جائے، لیکن یہ موجودہ (آسمانی) کتابوں کی تصدیق ہے، اور اس کی حسب ذیل تقاریر ہیں:

(۱) سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک امی شخص تھے، آپ نے حصول تعلیم کے لیے کسی شہر کا سفر نہیں کیا تھا، اور مکہ علماء کا شہر نہیں تھا، اور نہ اس میں علم کی کتابیں تھیں، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قرآن پیش کیا جس میں پہلی امتوں اور ان کے نبیوں کی خبریں ہیں، لوگ آپ کے شدید دشمن تھے، اگر قرآن مجید کی دی ہوئی خبریں تورات اور انجیل کے موافق نہ ہوتیں تو وہ قرآن مجید پر زبردست اعتراض کرتے اور کہتے کہ آپ نے گزشتہ امتوں کے جو واقعات بیان کیے ہیں وہ سابقہ آسمانی کتابوں کے مطابق نہیں ہیں اور جب کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا حالانکہ وہ قرآن کریم کے بہت بڑے مخالف تھے اور اس کو باطل ثابت کرنے کے درپے تھے تو معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی دی ہوئی خبریں تورات اور انجیل کے مطابق ہیں جب کہ آپ نے تورات اور انجیل کا مطالعہ نہیں کیا تھا اور نہ ان کا علم حاصل کرنے کے لیے کسی کی شاگردی اختیار کی تھی اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کے احوال اور واقعات کی جو خبریں دی تھیں وہ اللہ عزوجل کی وحی سے دی تھیں لہٰذا ثابت ہو گیا کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور آپ کا بنایا ہوا نہیں ہے۔

تورات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خوشخبری

(۲) سابقہ کتابوں میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خبر دی گئی تھی، آپ کی شریعت اور آپ کے اصحاب کے متعلق تفصیل سے بتایا گیا تھا، تورات میں ہے:

اور اس نے کہا خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے دہنے ہاتھ ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی۔

(کتاب مقدس، استثناء باب: ۳۳، آیت: ۲ ص ۱۹۲، مطبوعہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی، انار کلی لاہور، ۱۹۲۷)

اور تورات کے عربی ایڈیشن میں یہ آیت اس طرح لکھی ہوئی ہے:

اتی من ربوات القدس - دس ہزار قدسیوں سے آیا۔

(مطبوعہ دار الکتاب المقدس فی العالم العربی، ص ۳۳۴، ۱۹۸۰ء)

تورات کی یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس طرح منطبق ہوتی ہے کہ آپ دس ہزار اصحاب کے ساتھ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تھے، یہودیوں نے جب یہ دیکھا کہ یہ آیت آپ کی نبوت پر دلیل ہے تو انہوں نے اس آیت کو بدل دیا چنانچہ تورات کے موجودہ ایڈیشنوں میں انہوں نے دس ہزار کی بجائے لاکھوں لکھ دیا۔

قرآن مجید کی پیش گوئیاں جو مستقبل میں پوری ہوئیں

(۳) سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید میں بہت سی ایسی غیب کی خبریں دیں جو مستقبل میں پوری ہونے والی تھیں اور پھر آپ کی دی ہوئی خبروں کے مطابق ایسا ہی ہوگیا اور آپ کی پیش گوئیوں کا صادق ہونا آپ کی نبوت کے برحق ہونے کی واضح دلیل ہے، اس نوع کی چند آیتیں حسب ذیل ہیں:

الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ۝ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِهِمۡ سَيَغۡلِبُوۡنَ ۝ فِیۡ بِضۡعِ سِنِيۡنَ ۔ (الروم: ۳-۱)

الف، لام، میم، اہل روم (اہل فارس سے) قریب کی زمین میں مغلوب ہوگئے، اور وہ چند سالوں میں اپنے مغلوب ہونے کے بعد غالب ہو جائیں گے۔

اس زمانہ کی دو بڑی سلطنتیں فارس (ایران) اور روم میں عرصہ دراز سے کشمکش اور جنگ چلی آرہی تھی، مکہ والوں میں بھی ان کی جنگ کے متعلق خبریں پہنچتی رہتی تھیں۔ اہل فارس مجوسی اور آتش پرست تھے، اور اہل روم نصاریٰ اور اہل کتاب تھے۔ مشرکین مکہ بت پرست ہونے کی وجہ سے ذہنی طور پر اہل فارس کے قریب تھے اور مسلمان ذہنی طور پر اہل روم کے زیادہ قریب تھے۔ ایرانیوں کی فتح کی خبر سے مشرکین خوش ہوتے تھے اور رومیوں کی فتح کی خبر سے مسلمان خوش ہوتے تھے۔ اعلان نبوت کے پانچ سال بعد ایرانیوں نے رومیوں کو ایک مہلک اور فیصلہ کن شکست دی اور بہت سے علاقے روم کے قبضہ سے نکل گئے حتیٰ کہ بیت المقدس سے عیسائیوں کی سب سے مقدس صلیب بھی ایرانی لے گئے۔ اس خبر سے مشرکین بہت خوش ہوئے اور مسلمان مغموم ہوئے، اس وقت قرآن مجید کی یہ آیات نازل ہوئیں اور قرآن کریم نے ایرانیوں کے خلاف رومیوں کی فتح کی پیش گوئی کی جب کہ عام اسباب ظاہری ایرانیوں کے حق میں اور رومیوں کے خلاف تھے اور پھر چھ سال کے بعد یہ پیش گوئی پوری ہوگئی اور رومی ایرانیوں پر غالب آگئے۔ قرآن مجید کی اس عظیم الشان اور محیر العقول پیش گوئی کی صداقت کا مشاہدہ کرکے بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۹۴، ملخصاً)

اسی طرح قرآن مجید میں ہے:

لَقَدۡ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوۡلَهُ الرُّءۡيَا بِالۡحَقِّ ۚ لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ مُحَلِّقِيۡنَ رُءُوۡسَكُمۡ وَمُقَصِّرِيۡنَ لَا تَخَافُوۡنَ ۔ (الفتح: ۲۷)

بے شک اللہ نے اپنے رسول کا خواب حق کے ساتھ سچا کر دکھایا کہ (اے مسلمانو!) تم ان شاء اللہ ضرور مسجد حرام میں داخل ہوگے اس حال میں کہ تم بے خوف ہوگے، سروں کے بال منڈاتے ہوئے اور کترواتے ہوئے بغیر کسی ڈر کے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا تھا کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے اور سر منڈا کر اور بال کتروا کر حلال ہو رہے ہیں، اتفاق سے آپ نے اسی سال عمرہ کا قصد کر لیا۔ صحابہ نے عموماً یہ سمجھ لیا کہ ہم اسی سال مکہ پہنچیں گے اور عمرہ ادا کریں گے۔ مشرکین نے آپ کو حدیبیہ کے مقام پر روک لیا اور بالآخران سے اس شرط پر صلح ہوگئی کہ

اس سال واپس چلے جائیں اور آئندہ سال آکر عمرہ کرلیں۔ حضرت عمر کے استفسار پر آپ نے فرمایا کہ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ ہم اس سال عمرہ کریں گے، تم ان شاء اللہ امن کے ساتھ مکہ پہنچ کر عمرہ کرو گے سو اگلے سال ایسا ہی ہوا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا۔ (النور: ۵۵)

اللہ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کو ضرور زمین میں حکومت عطا فرمائے گا، جیسا کہ اس نے ان سے پہلے لوگوں کو حکومت عطا فرمائی تھی، اور ان کے لیے ان کے اس دین کو ضرور راسخ کر دے گا جس کو اس نے ان کے لیے پسند کرلیا ہے اور اس کے بعد ان کے خوف کو ضرور امن سے بدل دے گا۔

نیک مسلمانوں کے حق میں قرآن مجید کی یہ پیش گوئی اس وقت پوری ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے خلفاء راشدین کو حکومت عطا فرمائی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں زمین کے مشارق اور مغارب سے خراج اکٹھا کر کے مدینہ منورہ لایا جاتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیش گوئی کا صدق ظاہر ہو گیا: بے شک اللہ نے میرے لیے تمام روئے زمین کو سمیٹ دیا اور میں نے اس کے مشارق اور مغارب کو دیکھ لیا اور جتنی زمین میرے لیے سمیٹی گئی تھی عنقریب میری امت کی حکومت وہاں تک پہنچے گی۔ (ترمذی رقم الحدیث: ۲۱۷۶)

فرعون کے متعلق فرمایا:

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً۔ (یونس: ۹۲)

پس ہم آج تیرے بدن کو نجات دے رہے ہیں تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے ایک نشانی بن جائے۔

صدیاں گزر گئیں اور قرآن مجید کی یہ پیش گوئی آج تک صادق ہے اور فرعون کا جسم اسی طرح محفوظ ہے۔

قرآن مجید کے تفصیل الکتاب ہونے کا معنی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ الکتاب کی تفصیل ہے، قرآن مجید بنیادی طور پر ہدایت کی کتاب ہے، اس میں عقائد اور شرائع کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ عقائد میں اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے کا عقیدہ ہے اور اس کے واحد ہونے کا عقیدہ اور اس کی صفات کا عقیدہ ہے۔ ان میں اللہ تعالیٰ کی حیات، علم، قدرت، کلام، سمع، بصر، ارادہ اور تکوین کی صفات ہیں۔ قرآن مجید میں ان تمام صفات اور ان کے دلائل کا ذکر ہے، اسی طرح فرشتوں کے متعلق عقائد کا ذکر ہے، اور نبیوں اور رسولوں کا تفصیل سے ذکر ہے، اور یہ کہ اللہ کے حکم سے فرشتے نبیوں پر وحی نازل کرتے ہیں، قیامت کا، حشر و نشر کا، حساب و کتاب اور جنت اور دوزخ کا ذکر ہے، اور شرائع میں عبادت کے تمام طریقوں کا بیان ہے اور اخلاق اور آداب سے متعلق احکام کا بھی ذکر ہے اور قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کی احادیث کے حجت ہونے سے متعلق بھی آیات ہیں اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام سنتوں کی اصل بھی قرآن مجید میں ہے اور اجماع اور قیاس کے حجت ہونے کے دلائل بھی قرآن مجید میں ہیں، گویا تمام عقائد اور شرائع کی اصل اور اساس قرآن مجید میں ہے اور ان میں سے بعض قرآن مجید میں تفصیلاً مذکور ہیں اور بعض اجمالاً مذکور ہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر جزئی، جزئی حکم کی تفصیل قرآن مجید میں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ تمام جزئیات کے اصول اور قواعد اور ان کے دلائل کی تفصیل قرآن مجید میں ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ تمام دنیا کے علوم قرآن مجید میں ہیں، قرآن مجید اصالتاً ہدایت کی کتاب ہے، فلسفہ اور سائنس اور تاریخ اور جغرافیہ کی کتاب نہیں ہے، اس کتاب

کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے لیے نازل فرمایا اور اس کی تشریح اور تعبیر کے لیے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا ہے، آپ نے اس کی آیات کی تعلیم دی ہے اور ان کی تفسیر بیان فرمائی ہے اور قرآن مجید کے احکام کا عملی نمونہ پیش فرمایا ہے اور ان تمام چیزوں کا خلاصہ اللہ، اس کے نبی، فرشتوں، کتابوں، تقدیر، قیامت، حشر اور جزا اور سزا پر ایمان لانا ہے، نیک اعمال کرنا اور برے اعمال سے اجتناب کرنا ہے تاکہ انسان کی عاقبت اچھی ہو جائے اور قرآن مجید میں صرف ان ہی چیزوں کی تفصیل ہے اور اس سے یہ مراد لینا صحیح نہیں ہے کہ قرآن مجید میں تمام علوم عقلیہ اور نقلیہ اور تمام حوادث اور کوائف کی تفصیل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: آپ کہئے کہ پھر اس کی مثل تم کوئی ایک سورت (بنا کر) لے آؤ- الآیہ: اس کی مفصل تفسیر البقرہ: ۲۳ میں گزر چکی ہے۔

پھر فرمایا: بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اس چیز کو جھٹلایا جس کا انہیں پوری طرح علم نہیں ہو سکا تھا اور ابھی تک اس کو جھٹلانے کا انجام سامنے نہیں آیا، اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا پھر دیکھ لو ظالموں کا کیسا انجام ہوا○

یعنی ان لوگوں نے قرآن مجید کی تکذیب کی نہ اس کو سمجھا نہ جانا، اور اس قرآن میں عقائد اور شرائع کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اور دین حق کی جو رہنمائی کی گئی ہے نہ اس کو سمجھنے کی کوشش کی، اور اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ ان کی تکذیب کا نتیجہ ابھی تک ان کے سامنے نہیں آیا- امام ابن جریر نے فرمایا: اس قرآن میں ان کی تکذیب پر جو وعید سنائی گئی ہے ابھی تک اس کا مصداق ان کے پاس نہیں پہنچا، اور اے محمد! (صلی اللہ علیک وسلم) جس طرح ان لوگوں نے اللہ کی وعید کی تکذیب کی ہے اس طرح ان سے پہلی امتوں نے بھی اللہ تعالیٰ کی وعید کی تکذیب کی تھی اور اپنے رسولوں کو جھٹلایا تھا اور ان پر ایمان نہیں لائے تھے، پس آپ غور کیجئے، کہ ظالموں کا انجام کیسا ہوا! کیا ہم نے بعض کافروں کو زلزلہ سے ہلاک نہیں کر دیا اور بعض کو زمین میں دھنسا نہیں دیا اور بعض کو غرق نہیں کر دیا، کیا یہ لوگ پہلے کافروں کا انجام دیکھ کر عبرت نہیں پکڑتے اور شرک اور کفر سے توبہ نہیں کرتے!

اس کے بعد فرمایا: اور ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو اس پر ایمان لائیں گے اور ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو اس پر ایمان نہیں لائیں گے- امام ابن جریر نے فرمایا: یعنی: اے محمد! (صلی اللہ علیک وسلم) قریش میں سے بعض وہ ہیں جو اس قرآن پر عنقریب ایمان لے آئیں گے اور بعض وہ ہیں جو اس قرآن پر کبھی بھی ایمان نہیں لائیں گے اور کبھی اس کا اقرار نہیں کریں گے، اور آپ کا رب ان مکذبین کو خوب جاننے والا ہے اور ان کو عنقریب اس کے عذاب کا سامنا ہو گا۔

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓــُٔوْنَ

اور اگر یہ آپ کی تکذیب کریں تو آپ کہیے کہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے تم ان کاموں سے بری الذمہ ہو

مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ

جو میں کرتا ہوں اور میں ان کاموں سے بری الذمہ ہوں جو تم کرتے ہو○ اور ان میں سے بعض آپ کی طرف کان

اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَمِنْهُمْ

لگاتے ہیں تو کیا آپ بہروں کو سنائیں گے خواہ وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں○ اور ان میں سے

مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾

بعض آپ کی طرف دیکھتے ہیں تو کیا آپ اندھوں کو ہدایت دیں گے خواہ وہ کچھ بھی نہ دیکھتے ہوں ○

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـــًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ

بے شک اللہ لوگوں پر بالکل ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم

يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ

کرتے ہیں ○ اور جس دن وہ (اللہ) ان کو جمع فرمائے گا (تو وہ یہ گمان کریں گے کہ) وہ (دنیا میں) دن کی

النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ۭ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ

صرف ایک گھڑی ٹھہر رہے ہیں، وہ ایک دوسرے کو پہچان لیں گے؛ بے شک وہ لوگ نقصان میں رہے جنہوں نے اللہ کے سامنے حاضر ہونے

اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ

کو جھٹلایا تھا اور وہ ہدایت پانے والے نہ تھے ○ اور اگر ہم آپ کو اس عذاب کا بعض حصہ دکھا دیں جس

نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰي

سے ہم نے ان کو ڈرایا ہے یا آپ کی مدت حیات پوری کر دیں تو ان کو تو (بہر حال) اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے، پھر اللہ ان کے

مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ رَسُوْلُهُمْ

افعال پر گواہ ہے ○ اور ہر ایک امت کے لیے رسول ہے تو جب ان کا رسول آ جائے گا تو ان

قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى

کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر (بالکل) ظلم نہیں کیا جائے گا ○ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ

هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ

کب (پورا ہوگا) اگر تم سچے ہو ○ آپ کہیے میں اپنی جان کے لیے نہ کسی ضرر کا

ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۭ اِذَا جَاۗءَ اَجَلُهُمْ

مالک ہوں نہ نفع کا مگر اسی کا جو اللہ چاہے، ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے جب ان کا مقرر وقت آ جائے گا

فَلَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٤٩﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ

تو وہ نہ ایک گھڑی موخر ہو سکیں گے اور نہ (ایک گھڑی) مقدم ہو سکیں گے ○ آپ کہیے کہ بھلا بتاؤ تو سہی

اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ

اگر اس کا عذاب (اچانک) رات کو آجائے یا دن کو تو مجرم کس چیز کو جلدی سے (اپنے بچاؤ کے لیے)

الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٥٠﴾ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ

کریں گے ○ کیا پھر جب یہ عذاب آجائے گا تو پھر تم اس کا یقین کرو گے! (ان سے کہا جائے گا) اب مانا تم نے

بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ

بے شک تم اسی کو جلدی طلب کرتے تھے ○ پھر ظالموں سے کہا جائے گا دائمی عذاب کا مزہ چکھو

الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَيَسْتَنْۢبِئُوْنَكَ

تمہیں صرف ان ہی کاموں کی سزا دی جائے گی جو تم کرتے تھے ○ اور وہ آپ سے معلوم کرتے ہیں کیا

ع اَحَقٌّ هُوَ ؔ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؕ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٥٣﴾

واقعی وہ عذاب برحق ہے؟ آپ کہیے کہ ہاں! میرے رب کی قسم وہ عذاب برحق ہے اور تم (میرے رب کو) عاجز کرنے والے نہیں ہو○

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم ٥

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر یہ آپ کی تکذیب کریں تو آپ کہئے کہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے، تم ان کاموں سے بری الذمہ ہو جو میں کرتا ہوں اور میں ان کاموں سے بری الذمہ ہوں جو تم کرتے ہو○ (یونس: ٤١)

ہر شخص اپنے اعمال کا جواب دہ ہے

یعنی میں نے جو دین اسلام کی تبلیغ کی ہے اور تم کو اللہ تعالیٰ کی توحید کو ماننے اور اس کی عبادت اور اطاعت کرنے کی دعوت دی ہے مجھے اس کا ثواب ملے گا، اور تم کو تمہارے شرک کرنے کی سزا ملے گی اور کسی شخص سے دوسرے شخص کے اعمال کا مواخذہ نہیں ہوگا۔ یہ مضمون قرآن مجید کی حسب ذیل آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ○ (ہود: ٣٥)

کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ اس نے اس (قرآن) کو از خود گھڑ لیا ہے! آپ کہئے کہ اگر میں نے اس کو گھڑ لیا ہے تو میرا گناہ مجھ پر ہے، اور میں تمہارے گناہوں سے بری الذمہ ہوں۔

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۔ (سبا: ٢٥)

آپ کہئے (اگر بالفرض) ہم نے کوئی جرم کیا ہے تو تم سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور تمہارے کاموں کے متعلق ہم سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى - (الانعام: ۱۶۴) اور ہر شخص جو برائی کرتا ہے وہ اسی پر ہے، اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

مقاتل نے کہا کہ زیر تفسیر آیت، جہاد کی آیات سے منسوخ ہے۔ (جامع البیان جز ۱۱ ص ۱۵۵) لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے اعمال کا جواب دہ نہیں ہے اور یہ حکم باقی ہے منسوخ نہیں ہے، دراصل اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ مشرکین آپ کی پیہم تبلیغ کے باوجود مسلمان نہیں ہوتے تو آپ غم اور فکر نہ کریں، آپ کو اپنی تبلیغ پر ثواب ملے گا، اور ان کو اسلام نہ قبول کرنے کی سزا ملے گی، کیونکہ ہر شخص اپنے اعمال کا جواب دہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان میں سے بعض آپ کی طرف کان لگاتے ہیں تو کیا آپ بہروں کو سنائیں گے خواہ وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں ○ اور ان میں سے بعض آپ کی طرف دیکھتے ہیں تو کیا آپ اندھوں کو ہدایت دیں گے خواہ وہ کچھ بھی نہ دیکھتے ہوں ○ بے شک اللہ لوگوں پر بالکل ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں ○ (یونس: ۴۴-۴۲)

کفار کے ایمان نہ لانے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا

یونس: ۴۰ میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی دو قسمیں کی تھیں: بعض آپ پر ایمان لائیں گے اور بعض آپ پر ایمان نہیں لائیں گے اور ان آیتوں میں ایمان نہ لانے والوں کی دو قسمیں کی ہیں: بعض وہ ہیں جو بغض و عناد کی آخری حد کو پہنچے ہوئے ہیں اور بعض وہ ہیں جو اس طرح نہیں ہیں، جو بغض و عناد کی آخری حد کو پہنچے ہوئے ہیں ان کی دو مثالیں بیان فرمائی ہیں: ایک وہ ہیں جو بہروں کی مانند ہیں کیونکہ جب ایک انسان دوسرے انسان سے حد سے زیادہ بغض اور عناد رکھے تو وہ ہر اعتبار سے اس کی برائی کا طالب ہوتا ہے اور ہر لحاظ سے اس کی اچھائی سے اعراض کرتا ہے اور بہرا شخص کسی کی بات سن نہیں سکتا، اسی طرح سے یہ مشرکین بھی آپ کے کلام کے محاسن اور فضائل کا ادراک نہیں کرتے گویا کہ انہوں نے آپ کا کلام سنا ہی نہیں، اور دوسری مثال یہ دی کہ یہ اندھوں کی مانند ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کمالات اور خوبیاں عطا فرمائی ہیں یہ ان کا ادراک نہیں کرتے گویا کہ یہ آپ کو دیکھتے ہی نہیں اور جو لوگ بغض اور عداوت میں اس حد کو پہنچ چکے ہوں ان سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ آپ پر ایمان لائیں گے اور آپ کی اتباع کریں گے، سو اس آیت سے بھی مقصود یہی ہے کہ آپ کو تسلی دی جائے کہ اگر آپ کی تبلیغ سے یہ مشرکین اسلام قبول نہیں کرتے تو آپ غم اور فکر نہ کریں، آپ کی تبلیغ میں کوئی کمی نہیں ہے، کمی تو ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں میں ہے، بغض اور عداوت نے ان کو بہرا اور اندھا کر دیا ہے، یہ توجہ سے آپ کی بات سنتے نہیں، بصیرت سے آپ کو دیکھتے نہیں پھر اگر یہ آپ کی تبلیغ سے متاثر نہیں ہوتے تو اس میں کیا تعجب ہے!

اس کے بعد فرمایا: اللہ لوگوں پر بالکل ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ اپنی جانوں پر خود ظلم کرتے ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو کفر، شرک اور بدکاریوں پر مجبور نہیں کیا، لوگ خود اپنے اختیار سے برے کام کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جس دن وہ (اللہ) ان کو جمع فرمائے گا (تو وہ یہ گمان کریں گے کہ) وہ (دنیا میں) دن کی صرف ایک گھڑی بھر رہے ہیں، وہ ایک دوسرے کو پہچان لیں گے، بے شک وہ لوگ نقصان میں رہے جنہوں نے اللہ کے سامنے حاضر ہونے کو جھٹلایا تھا، اور وہ ہدایت پانے والے نہ تھے ○ اور اگر ہم آپ کو اس عذاب کا بعض حصہ دکھا دیں جس سے ہم نے ان کو ڈرایا ہے یا آپ کی مدت حیات پوری کر دیں تو ان کو تو (بہرحال) اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے، پھر اللہ ان کے افعال پر گواہ ہے ○ (یونس: ۴۶-۴۵)

قیامِ دنیا کو کم سمجھنے کی وجوہات

اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ کفار دنیا میں قیام کو بہت کم خیال کریں گے، اسی طرح ایک اور آیت میں بھی فرمایا ہے:

قٰلَ كَمۡ لَبِثۡتُمۡ فِى الۡاَرۡضِ عَدَدَ سِنِيۡنَ○ قَالُوۡا لَبِثۡنَا يَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ يَوۡمٍ فَسۡـئَلِ الۡعَآدِّيۡنَ○ (المومنون: ۱۱۳-۱۱۲)

اللہ فرمائے گا (بتاؤ) تم کتنے سال زمین میں ٹھہرے؟○ وہ کہیں گے ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے تھے سو گننے والوں سے پوچھ لیجئے۔

وہ دنیا میں قیام کو کم کیوں گمان کرتے تھے، اس کی حسب ذیل وجوہات ہیں:

(۱) چونکہ کفار نے اپنی عمروں کو دنیا کی طلب اور لذتوں کی حرص میں ضائع کر دیا اور دنیا میں کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کا انہیں آخرت میں نفع ہوتا تو ان کا دنیا میں زندگی گزارنا اور نہ گزارنا دونوں برابر تھے اس لیے انہوں نے دنیا کی زندگی کو کم سمجھا۔

(۲) جب وہ آخرت کے دہشت ناک امور دیکھیں گے تو انہیں دنیا کی گزاری ہوئی زندگی بھول جائے گی۔

(۳) آخرت کے دائمی عذاب کے مقابلہ میں انہیں دنیا کا قیام کم معلوم ہو گا۔

(۴) محشر کے طویل دن کے مقابلہ میں (جو پچاس ہزار سال کے برابر ہو گا) انہیں دنیا میں قیام کم معلوم ہو گا۔

(۵) ہرچند کہ انسان کو دنیا میں لذتیں بھی حاصل ہوتی ہیں مگر وہ لذتیں آلام اور مصائب کے ساتھ مقرون ہوتی ہیں اور آخرت کا عذاب خالص عذاب ہوتا ہے اس لیے دنیا کی لذتیں بہت بھی ہوں تو تھوڑی معلوم ہوں گی۔

اس کے بعد فرمایا: وہ ایک دوسرے کو پہچان لیں گے، بے شک وہ لوگ نقصان میں رہے جنہوں نے اللہ کے سامنے حاضر ہونے کو جھٹلایا تھا۔ مشرکین جو ایک دوسرے کو پہچانیں گے اس میں ان کے لیے زجر و توبیخ ہے، ایک دوسرے سے کہے گا تو نے مجھے گمراہ کر دیا اور مجھے دوزخ کا مستحق بنا دیا۔ (زاد المسیر ج ۴ ص ۳۶) جب وہ قبر سے اٹھیں گے تو ایک دوسرے کو پہچان لیں گے، جیسا کہ دنیا میں ایک دوسرے کو پہچانتے تھے، پھر قیامت کے ہولناک اور دہشت ناک مناظر کو دیکھ کر وہ ایک دوسرے کو شناخت نہیں کر سکیں گے، بعض روایات میں ہے کہ انسان اس شخص کو پہچانتا ہو گا جو اس کے پہلو میں کھڑا ہو گا لیکن خوف اور دہشت کی وجہ سے اس سے بات نہیں کر سکے گا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور اگر ہم آپ کو اس عذاب کا بعض حصہ دکھا دیں جس سے ہم نے ان کو ڈرایا ہے یا آپ کی مدت حیات پوری کر دیں تو ان کو تو (بہرحال) اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو دنیا میں کفار کی ذلت اور رسوائی کی کچھ انواع دکھائے گا اور آپ کے وصال کے بعد ان کو مزید ذلت اور رسوائی میں مبتلا فرمائے گا، اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں بھی وہ ذلت اور رسوائی میں مبتلا ہوئے جیسا کہ جنگ بدر اور احزاب وغیرہ میں اور آپ کے بعد بھی ذلیل ہوئے جیسا کہ متعدد جنگوں میں ہوا اور قیامت تک رسوا ہوتے رہیں گے اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ نیک لوگوں کا انجام محمود اور مستحسن ہو گا اور رسوائی بدکاروں کا مقدر ہو گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہر ایک امت کے لیے رسول ہے تو جب ان کا رسول آ جائے گا تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر (بالکل) ظلم نہیں کیا جائے گا○ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب (پورا ہو گا؟) اگر تم سچے ہو○ (یونس: ۴۸-۴۷)

ہرامت کے پاس اس کے رسول آنے کے دو محمل

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشرکین مکہ کی مخالفت کا حال بیان فرمایا تھا' اب فرما رہا ہے کہ ہر نبی کے ساتھ اس کی قوم کا ایسا ہی معاملہ تھا۔

اس آیت میں فرمایا ہے کہ ہر ایک امت کے لیے ایک رسول ہے تو جب ان کا رسول آ جائے گا تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا' اس کے دو محمل ہیں: (۱) تو جب ان کا رسول دنیا میں آ جائے گا' (۲) تو جب ان کا رسول ان کے پاس میدان حشر میں آ جائے گا۔

معنی اول مراد ہو تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ جب دنیا میں ہر قوم کے پاس ایک رسول بھیجا جائے گا تو وہ تبلیغ کر کے اور دین اسلام کے حق ہونے پر دلائل قائم کر کے ہر قسم کے شک اور شبہ کا ازالہ کر دے گا پھر کفار کے پاس دین حق کی مخالفت کرنے اور اس کی تکذیب کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہے گا اور وہ قیامت کے دن یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ ہمارے پاس تو اللہ کی توحید اور اس کی عبادت کی دعوت دینے کے لیے کوئی آیا ہی نہیں تھا اور نہ کوئی عذاب سے ڈرانے والا آیا تھا' اس معنی کی تائید میں حسب ذیل آیات ہیں:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ (بنو اسرائیل: ۱۵)

اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک ہم رسول نہ بھیج دیں۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ۔ (النساء: ۱۶۵)

(ہم نے) بشارت دینے والے اور ڈرانے والے رسول (بھیجے) تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے عذر پیش کرنے کا موقع نہ رہے۔

وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى۔ (طٰهٰ: ۱۳۴)

اور اگر ہم رسول کو بھیجنے سے پہلے انہیں کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو وہ ضرور کہتے اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم (عذاب میں) ذلیل و خوار ہونے سے پہلے تیری آیتوں کی پیروی کر لیتے۔

اور معنی ثانی کی توجیہ یہ ہے کہ جب میدان حشر میں اللہ تعالیٰ حساب کے وقت رسولوں کو اور ان کی امتوں کو جمع فرمائے گا تاکہ رسول ان امتوں پر گواہی دیں اور امتوں کو یہ اعتراف کرنا پڑے کہ بے شک ان کے پاس رسول آئے تھے' اور یہ ان کی بداعمالیوں پر من جملہ دلائل میں سے ایک دلیل ہے جیسا کہ ان کے اعضاء خود ان کی بداعمالیوں پر گواہی دیں گے اور میزان پر ان کے اعمال کا وزن ہوگا اور کراماً کاتبین ان کی بداعمالیوں کے رجسٹر کھولیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے بازپرس بھی کرے گا اور اللہ تعالیٰ خود ان کے اعمال پر گواہ ہے' ان ہی دلائل میں سے ایک دلیل ہے کہ قیامت کے دن ہر رسول اپنی امت پر گواہ ہوگا اور اس معنی کی تائید میں حسب ذیل آیات ہیں:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا (النساء: ۴۱)

اس وقت کیسا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے رسول) ہم ان تمام پر آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا

اور اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا تاکہ تم لوگوں

شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (البقرہ: ۱۴۳) پر گواہ ہو جاؤ اور یہ رسول تم پر گواہ ہوں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہو گا اگر تم سچے ہو؟
جب بھی رسول منکرین نبوت کو اللہ کے عذاب سے ڈراتے اور ایک عرصہ تک عذاب نازل نہ ہوتا تو وہ کہتے کہ نزول عذاب کا یہ وعدہ کب پورا ہو گا، ان کا منشاء اس سے آخرت کے عذاب کے متعلق پوچھنا نہیں تھا کیونکہ آخرت پر تو ان کو یقین ہی نہ تھا، وہ نبی علیہ السلام کی تکذیب اور آپ کا مذاق اڑانے کے لیے یہ کہتے تھے کہ آپ نے جو کہا ہے کہ اللہ کے دشمنوں پر عذاب نازل ہو گا اور اللہ کے دوستوں کی مدد کی جائے گی آخر آپ کا یہ وعدہ کب پورا ہو گا، اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیات میں دیا ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہیے میں اپنی جان کے لیے نہ کسی ضرر کا مالک ہوں نہ نفع کا مگر اسی کا جو اللہ چاہے، ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے، جب ان کا مقرر وقت آ جائے گا تو وہ نہ ایک گھڑی موخر ہو سکیں گے اور نہ (ایک گھڑی) مقدم ہو سکیں گے○ آپ کہیے کہ بھلا بتاؤ تو سہی اگر اس کا عذاب (اچانک) رات کو آ جائے یا دن کو تو مجرم کس چیز کو جلدی سے (اپنے بچاؤ کے لیے) کریں گے○ کیا پھر جب یہ عذاب آ جائے گا تو پھر تم اس کا یقین کرو گے! (ان سے کہا جائے گا) اب مانا تم نے! بے شک تم اسی کو جلدی طلب کرتے تھے○ پھر ظالموں سے کہا جائے گا دائمی عذاب کا مزہ چکھو، تمہیں صرف ان ہی کاموں کی سزا دی جائے گی جو تم کرتے تھے○ (یونس: ۵۲-۴۹)

اس سوال کا جواب کہ مشرکین پر عذاب جلدی کیوں نہیں آتا

اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ دشمنوں پر عذاب کا نازل کرنا اور دوستوں کے لیے مدد کو ظاہر کرنا صرف اللہ عزوجل کی قدرت اور اختیار میں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس وعدہ اور وعید کو پورا کرنے کے لیے ایک وقت معین کر دیا ہے اور اس وقت کا تعین اللہ کی مشیت پر موقوف ہے اور جب وہ وقت آ جائے گا تو وہ وعدہ لامحالہ پورا ہو گا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ کہیے کہ میں اپنی جان کے لیے نہ کسی نفع کا مالک ہوں نہ کسی ضرر کا مالک ہوں مگر اسی کا جو اللہ چاہے۔ اس استثناء کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کا چاہے مجھے مالک اور قادر بنا دیتا ہے، اللہ تعالیٰ رزاق ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم قاسم ہیں۔ آپ دنیا اور آخرت کی نعمتیں تقسیم کرتے ہیں۔ آپ نے دنیا میں لوگوں کو غنی کیا اور آپ کی شفاعت سے مسلمانوں کو جنت ملے گی، جو شخص آپ کا انکار کرے وہ نقصان اٹھائے گا اور دوزخ میں جائے گا اور جو شخص آپ پر ایمان لائے گا وہ نفع پائے گا اور جنت میں جائے گا۔ سو یہ وہ نفع اور ضرر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی قدرت اور اختیار میں دیا ہے ہاں اللہ تعالیٰ کے قادر کیے بغیر آپ کو اپنی جان پر بھی کسی نفع اور ضرر کا اختیار نہیں ہے اور اس آیت میں یہی مراد ہے کہ اے کافرو! تم مجھ سے یہ مطالبہ کیوں کرتے ہو کہ میں جلد دوستوں کے لیے امداد ظاہر کروں اور دشمنوں پر عذاب لاؤں کیونکہ یہ چیز صرف اللہ عزوجل کی مشیت پر موقوف ہے اور اس کے چاہے بغیر تو مجھے اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع اور ضرر کا اختیار نہیں ہے۔

نزول عذاب کے بعد ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ کہیے کہ بھلا بتاؤ تو سہی اگر اس کا عذاب اچانک رات کو آ جائے یا دن کو تو مجرم کس چیز کو جلدی سے (اپنے بچاؤ کے لیے) کریں گے○ یعنی آپ ان مشرکین سے کہیے کہ اگر رات یا دن کے کسی وقت میں تمہارے پاس عذاب آ جائے اور قیامت قائم ہو جائے تو کیا تم قیامت کو اپنے اوپر سے دور کرنے پر قادر ہو، اور اگر تمہارے مطالبہ کی بناء پر بالفرض

عذاب آ جائے تو تم کو اس سے کیا فائدہ ہو گا' اس وقت ایمان لانا تو کار آمد ہے نہیں تو پھر کس لیے تم اس عذاب کے جلد آ جانے کا مطالبہ کر رہے ہو؟

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا پھر یہ عذاب آ جائے گا تو پھر تم اس کا یقین کرو گے! (ان سے کہا جائے گا) اب مانا تم نے! بے شک تم اسی کو جلدی طلب کرتے تھےO

یعنی جب ان پر اللہ کا عذاب واقع ہو جائے گا تو ان سے کہا جائے گا اب تم ایمان لے آئے اور اب تم نے اس کی تصدیق کر دی حالانکہ اس وقت تمہاری تصدیق کوئی فائدہ نہیں دے گی اور تم اس سے پہلے اس عذاب کے جلد آنے کا مطالبہ کرتے تھے اور اس کے نزول کی تکذیب کرتے تھے' سو اب تم اس چیز کو چکھو جس کی تم تکذیب کرتے تھے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پھر ظالموں سے کہا جائے گا دائمی عذاب کا مزہ چکھو' تمہیں صرف ان ہی کاموں کی سزا دی جائے گی جو تم کرتے تھےO دوزخ کے فرشتے کافروں سے کہیں گے: اب اللہ کے دائمی عذاب کو گھونٹ بھر بھر کر پیو' یہ وہ عذاب ہے جو نہ کبھی زائل ہو گا نہ فنا ہو گا اور یہ تمہارے ان کاموں کا نتیجہ ہے جو تم اپنی زندگی میں اللہ کی معصیت میں کرتے تھے۔

وہابی علماء کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ضرر اور نفع پہنچانے کی مطلقاً نفی کرنا

قاضی محمد بن علی بن محمد شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ قل لا املک لنفسی ضرا ولا نفعا (یونس: ۴۹) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت میں ان لوگوں کے لیے سخت زجر و توبیخ ہے جو ان مصائب کو دور کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارتے ہیں جن مصائب کو اللہ کے سوا کوئی دور نہیں کر سکتا' اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان چیزوں کو طلب کرتے ہیں جن کو دینے پر اللہ سبحانہ کے سوا اور کوئی قادر نہیں ہے' کیونکہ یہ رب العالمین کا مقام ہے جس نے انبیاء' صالحین اور تمام مخلوق کو پیدا کیا ہے' اسی نے ان کو رزق دیا' اسی نے ان کو زندہ کیا' وہی ان کو وفات دے گا پس انبیاء میں سے کسی نبی سے یا فرشتوں میں سے کسی فرشتے سے یا ولیوں میں سے کسی ولی سے اس چیز کو کیسے طلب کیا جائے گا جس کے دینے پر وہ قادر نہیں ہیں اور رب الارباب سے جو ہر چیز پر قادر ہے' خالق' رازق' معطی اور مانع ہے اس سے طلب کو ترک کر دیا جائے گا اور تمہارے لیے اس آیت میں کافی نصیحت ہے کیونکہ یہ سید ولد آدم اور خاتم الرسل ہیں- جب ان سے اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ آپ لوگوں سے کہیں کہ میں اپنی جان کے لیے کسی نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں تو آپ کا غیر کیسے نفع اور نقصان کا مالک ہو گا جس کا مرتبہ آپ سے بہت کم ہے اور جس کا درجہ آپ سے بہت نیچے ہے' چہ جائیکہ وہ شخص اپنے علاوہ کسی اور کے نفع اور نقصان پر قادر ہو' پس ان لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جو وفات یافتہ بزرگوں کی قبروں پر بیٹھتے ہیں اور ان سے ایسی حاجتیں طلب کرتے ہیں جن کے پورا کرنے پر اللہ کے سوا اور کوئی قادر نہیں ہے' وہ اس شرک سے آگاہ کیوں نہیں ہوتے جس میں وہ واقع ہو چکے ہیں اور لا الہ الا اللہ کے معنی کی مخالفت میں اتر چکے ہیں' اور زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ اہل علم ان کو منع نہیں کرتے اور ان کے اور جاہلیت اولیٰ کے درمیان حائل نہیں ہوتے' بلکہ ان کی حالت جاہلیت اولیٰ سے زیادہ شدید ہے کیونکہ وہ لوگ اپنے بتوں کو اللہ کے نزدیک شفاعت کرنے والے مانتے تھے اور ان کو اللہ کے تقرب کا سبب سمجھتے تھے' اور یہ لوگ ان وفات یافتہ بزرگوں کے لیے نفع اور ضرر پر قدرت مانتے ہیں اور کبھی ان کو بالاستقلال پکارتے ہیں اور کبھی اللہ کے ساتھ پکارتے ہیں' اللہ شیطان کو رسوا کرے اس کی اس ذریعہ سے آنکھیں ٹھنڈی ہو گئی ہیں اور اس امت مبارکہ کے اکثر لوگوں کو کافر بنا کر اس کا دل ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ (فتح القدیر ج ۲ ص ۶۳۱' مطبوعہ دار الوفاء بیروت' ۱۴۱۸ھ)

نواب صدیق بھوپالی متوفی ۱۳۰۷ھ نے قاضی شوکانی کا حوالہ دیئے بغیر بعینہ یہی لکھا ہے۔

(فتح البیان ج ٦ ص ٧٥ - ٧٤، مطبوعہ المطبعہ العصریہ، ۱۴۱۵ھ)

آپ سے ضرر اور نفع بالذات پہنچانے کی نفی کی گئی ہے نہ کہ مطلقاً

قاضی شوکانی اور نواب صدیق حسن خاں بھوپالی نے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے افکار کی اتباع کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے، پہلی بات یہ ہے کہ اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نفع اور ضرر کی مطلقاً نفی کرنا صحیح نہیں ہے، اس آیت میں آپ سے بالذات نفع اور ضرر کی نفی کی گئی ہے۔ یعنی آپ بالذات کسی کو نفع اور ضرر نہیں پہنچا سکتے لیکن اللہ کی دی ہوئی قدرت سے نفع اور ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ مفسرین نے اس معنی کی تقریر اس طرح کی ہے:

علامہ محی الدین شیخ زادہ متوفی ۹۵۱ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں استثناء متصل بھی ہو سکتا ہے اور منقطع بھی، اگر استثناء متصل ہو تو اس آیت کا معنی اس طرح ہوگا: میں کسی کو نقصان یا نفع پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا مگر اللہ تعالیٰ جس کو نفع یا نقصان پہنچانا چاہے میں اس پر قادر ہوں اور اس کا مالک ہوں اور اگر یہ استثناء منقطع ہو تو اس کا معنی یہ ہوگا: میں کسی کو نقصان یا نفع پہنچانے پر قادر نہیں ہوں لیکن اللہ جو نفع یا نقصان چاہے وہ ہو جاتا ہے یعنی وہ اس کی مشیت سے ہوگا۔

(حاشیۃ الشیخ زادہ علی البیضاوی ج ۴ ص ۵۷۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ)

علامہ قرطبی نے اس استثناء کا صرف بطور استثناء متصل معنی کیا ہے، قاضی بیضاوی، علامہ خفاجی اور علامہ ابو سعود نے لکھا ہے کہ یہ استثناء متصل اور منقطع دونوں ہو سکتے ہیں اور قاضی شوکانی اور نواب بھوپالی نے لکھا ہے کہ یہ استثناء صرف منقطع ہے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفع اور نقصان پہنچانے کی مطلقاً نفی کر دی۔

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

بعض متقدمین کا یہ نظریہ ہے کہ بندہ کے لیے قدرت ہوتی ہے جو اللہ کے اذن سے موثر ہوتی ہے اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ میں کسی ضرر یا نفع پہنچانے پر قادر نہیں ہوں مگر جس کو اللہ چاہے تو میں اس کی مشیت سے نفع اور ضرر پہنچانے پر قادر ہوتا ہوں۔ (روح المعانی ج ۷ ص ۱۹۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

استثناء متصل میں مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ کی جنس سے ہوتا ہے اور استثناء منقطع میں مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ سے مغائر ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک بھی یہ مستثنیٰ منقطع ہے اور آیت کا معنی اس طرح ہے: آپ کہئے میں ضرر یا نفع پہنچانے پر بالذات قدرت نہیں رکھتا مگر جس کو اللہ چاہے میں اس کو ضرر یا نفع پہنچانے پر بالعطا قدرت رکھتا ہوں اور میرا یہ نفع اور ضرر پہنچانا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔

اور بالذات کی قید اس لیے لگائی ہے کہ بکثرت آیات، احادیث اور آثار سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی دی ہوئی قدرت سے دشمنان اسلام کو نقصان پہنچایا ہے اور اسلام کے حامیوں اور ناصروں کو نفع پہنچایا، اگر اس آیت میں بالذات کی قید نہ لگائی جائے تو ان تمام آیات، احادیث اور آثار کا انکار لازم آئے گا، اب ہم ایک ایسی نظیر پیش کر رہے ہیں جس سے نقصان اور نفع پہنچانے میں بالذات کی قید لگانے کا برحق ہونا بالکل واضح ہو جائے گا۔

روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے فرماتے: میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے نہ کسی کو ضرر پہنچا سکتا ہے اور نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے اور اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ

دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا' اس حدیث کو صحاح ستہ کی جماعت نے روایت کیا ہے۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۵۹۷' صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۲۷۰' سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۸۷۳' سنن الترمذی رقم الحدیث: ۸۶۰' سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۹۳۷' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۹۴۳)

اس حدیث پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن یہ حجر اسود اس حال میں آئے گا کہ اس کی دو آنکھیں ہوں گی جن سے یہ دیکھ رہا ہوگا اور اس کی ایک زبان ہوگی جس سے یہ کلام کرے گا اور یہ ان لوگوں کے حق میں گواہی دے گا جو اس کی حق کے ساتھ تعظیم کریں گے۔
(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۹۶۱' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۹۴۴' مسند احمد ج ۱ ص ۲۴۷' سنن الدارمی رقم الحدیث: ۱۸۴۶' صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: ۲۷۳۵' مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۲۷۱۹' صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۳۷۱۱' المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۱۱۴۳۲' الکامل لابن عدی ج ۲ ص ۶۷۹' المستدرک ج ۱ ص ۴۵۷' حلیۃ الاولیاء ج ۶ ص ۲۴۳' سنن کبریٰ للبیہقی ج ۵ ص ۷۵)

قاضی محمد بن علی بن محمد شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث صحیح ہے' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ (تو ایک پتھر ہے نہ کسی کو ضرر پہنچا سکتا ہے اور نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے) اس لیے فرمایا تھا کہ لوگوں نے تازہ تازہ بتوں کی عبادت کو چھوڑا تھا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خدشہ ہوا کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ حجر اسود کی تعظیم کرنا بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں عرب بتوں کی تعظیم کرتے تھے پس انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ لوگوں کو یہ بتلائیں کہ ان کا حجر اسود کی تعظیم کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی اتباع کی وجہ سے تھا نہ اس لیے کہ حجر اسود ضرر اور نفع بالذات دیتا ہے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں بتوں کی عبادت کی جاتی تھی۔ (نیل الاوطار جز ۶ ص ۱۳۲' مطبوعہ مکتبہ الکلیات الازہریہ مصر' ۱۳۹۸ھ)

دیکھیے حضرت عمر نے فرمایا حجر اسود ضرر اور نفع نہیں پہنچا سکتا تو قاضی شوکانی نے ایک پتھر کی نفع رسانی ثابت کرنے کے لیے اس قول میں بالذات کی قید لگائی اور کہا کہ حضرت عمر کی مراد یہ تھی کہ حجر اسود بذاتہٖ ضرر اور نفع نہیں پہنچا سکتا' اور یہی قاضی شوکانی ہیں جنہوں نے بغیر کسی قید کے زیر تفسیر آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ضرر اور نفع پہنچانے کی مطلقاً نفی کر دی' انا للہ وانا الیہ راجعون!

اللہ تعالیٰ کی عطا سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نفع رسانی کے متعلق قرآن مجید کی آیات

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ۔ (التوبہ: ۷۴)

اور ان کو صرف یہ ناگوار ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول نے ان کو اپنے فضل سے غنی کر دیا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ۔ (التوبہ: ۵۹)

اور کیسا اچھا ہوتا اگر وہ اس چیز پر راضی ہو جاتے جو ان کو اللہ اور اس کے رسول نے عطا کی اور وہ یہ کہتے کہ ہمیں اللہ کافی ہے' عنقریب ہم کو اللہ اپنے فضل سے عطا کرے گا اور اس کا رسول۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ۔ (الاحزاب: ۳۷)

اور جب آپ اس شخص سے کہتے تھے جس پر اللہ نے انعام کیا اور آپ نے انعام کیا۔

اللہ تعالیٰ کی عطا سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نفع رسانی کے متعلق احادیث اور آثار

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ خیبر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کل میں جھنڈا اس شخص کے ہاتھوں میں دوں گا جس کے ہاتھوں پر اللہ خیبر کو فتح کرے گا، وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہو گا اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتا ہو گا، پھر مسلمانوں نے رات اس طرح گزاری کہ وہ ساری رات مضطرب رہے کہ کس کو آپ صبح جھنڈا عطا فرمائیں گے۔ صبح کو سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے، ان میں سے ہر شخص کو یہ امید تھی کہ آپ اس کو جھنڈا عطا فرمائیں گے۔ آپ نے فرمایا علی بن ابی طالب کہاں ہیں؟ عرض کیا یا رسول اللہ! ان کی آنکھوں میں تکلیف ہے۔ آپ نے فرمایا ان کو بلاؤ۔ ان کو لایا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھوں میں لعاب دہن ڈالا اور ان کے لیے دعا کی، وہ تندرست ہو گئے گویا کہ ان کی آنکھوں میں کبھی درد ہی نہ تھا۔ آپ نے ان کو جھنڈا عطا فرمایا۔ حضرت علی نے کہا یا رسول اللہ! میں ان سے قتال کرتا رہوں گا حتیٰ کہ وہ ہماری طرح (مسلمان) ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا تم اپنی مہم پر روانہ ہو حتیٰ کہ تم ان کے علاقے میں پہنچ جاؤ، پھر تم ان کو اسلام کی دعوت دو اور ان کو بتاؤ کہ ان پر اللہ کے کیا حقوق واجب ہیں، اللہ کی قسم! اگر اللہ تمہاری وجہ سے کسی ایک شخص کو ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہت بہتر ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۲۱۰، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۴۰۶، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۸۴۰۳)

حضرت قتادہ بن النعمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کمان ہدیہ کی گئی، جنگ احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کمان مجھے عطا فرما دی، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے آپ کے سامنے اس کمان سے تیر مارتا رہا حتیٰ کہ وہ کمان ٹوٹ گئی، پھر بھی میں آپ کے سامنے کھڑا رہا اور آپ کے چہرہ کی طرف آنے والے تیروں کے سامنے اپنا چہرہ کرتا رہا حتیٰ کہ ایک تیر میری آنکھ کے ڈھیلے پر لگا۔ وہ ڈھیلا میرے چہرے پر لٹک گیا۔ میں اس ڈھیلے کو اپنی ہتھیلی میں رکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آپ نے دعا کی: اے اللہ! قتادہ نے اپنے چہرے سے تیرے نبی کے چہرے کی حفاظت کی ہے، پس اس کی اس آنکھ کو اس کی دونوں آنکھوں میں سے سب سے حسین اور سب سے تیز نظر والی بنا دے تو حضرت قتادہ کی وہ آنکھ دونوں آنکھوں میں زیادہ حسین اور زیادہ تیز نظر والی تھی۔ (امام ابو یعلیٰ کی روایت میں یہ واقعہ جنگ بدر کا ہے، حافظ بیہقی کی دلائل النبوۃ میں یہ واقعہ جنگ احد کا ہے اور یہی قرین قیاس ہے)

(المعجم الکبیر ج ۱۹ ص ۸، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۱۵۴۹، دلائل النبوۃ لابی نعیم رقم الحدیث: ۴۱۷، المستدرک ج ۳ ص ۲۹۵، السیرۃ النبویہ لابن کثیر ج ۳ ص ۶۶، الاصابہ رقم: ۷۰۹۱، اسد الغابہ رقم: ۴۲۷۷، الاستیعاب رقم: ۲۱۳۱)

حارث بن عبید اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ جنگ احد میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی آنکھ زخمی ہو گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر لعاب دہن لگا دیا تو وہ دونوں آنکھوں میں زیادہ صحیح تھی۔

(مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۱۵۵۰، مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۹۸)

حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک نابینا شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا آپ اللہ سے دعا کیجئے کہ اللہ (میری آنکھوں کو) ٹھیک کر دے۔ آپ نے فرمایا اگر تم چاہو تو میں دعا کر دوں اور اگر تم چاہو تو میں اس کو موخر کر دوں وہ تمہارے لیے بہتر ہو گا۔ اس نے کہا نہیں، آپ اللہ سے دعا کیجئے۔ آپ نے اسے حکم دیا کہ وہ اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھے اور یہ دعا کرے: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے نبی رحمت (سیدنا) محمد صلی

اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں' اے محمد! میں آپ کے وسیلہ سے اپنے رب کی طرف اپنی اس حاجت میں متوجہ ہوتا ہوں تاکہ وہ پوری کی جائے' آپ اس حاجت میں میری شفاعت کیجئے' (اے اللہ) آپ کی میری حاجت میں شفاعت کو قبول فرما۔ وہ شخص شفاعت کے یہ کلمات بار بار کہتا رہا حتی کہ اس کی آنکھیں ٹھیک ہو گئیں۔

(مسند احمد ج ۴ ص ۱۳۸' طبع قدیم' مسند احمد رقم الحدیث: ۱۷۱۷۵' احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے' سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۵۷۸' امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے' صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: ۱۲۱۹' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۳۸۵' عمل الیوم واللیلہ للنسائی رقم الحدیث: ۶۵۸' مسند عبد بن حمید رقم الحدیث: ۳۷۹' المستدرک ج ۱ ص ۳۱۳' دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۶ ص ۱۶۶' مختصر تاریخ دمشق ج ۳ ص ۳۰۴' تحفۃ الذاکرین ص ۱۸۰' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' الاذکار للنووی رقم الحدیث: ۴۸۳' مکتبہ نزار مصطفیٰ' ریاض)

وصال کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے استمداد اور استغاثہ کے جواز کے متعلق احادیث اور آثار

امام ابن ابی شیبہ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ مالک الدار جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وزیر خوراک تھے' وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں (ایک بار) لوگوں پر قحط پڑ گیا' ایک شخص (حضرت بلال بن حارث مزنی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! اپنی امت کے لیے بارش کی دعا کیجئے کیونکہ وہ (قحط سے) ہلاک ہو رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کے خواب میں تشریف لائے اور فرمایا: عمر کے پاس جاؤ' ان کو سلام کہو اور یہ خوشخبری دو کہ تم پر یقیناً بارش ہو گی اور ان سے کہو کہ تم پر سوجھ بوجھ لازم ہے' تم پر سوجھ بوجھ لازم ہے۔ پھر وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان کو یہ بشارت دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے اور کہا: اے اللہ! میں صرف اسی چیز کو ترک کرتا ہوں جس سے میں عاجز ہوں۔

(المصنف ج ۱۲ ص ۳۲' مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی' المصنف ج ۶ ص ۳۵۹' رقم الحدیث: ۳۱۹۹۳' الاستیعاب ج ۳ ص ۲۳۸' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۵ھ' دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۷ ص ۴۷' الکامل فی التاریخ ج ۲ ص ۳۹۰-۳۸۹' فتح الباری ج ۲ ص ۴۹۶-۴۹۵' حافظ ابن کثیر نے اس حدیث کی سند کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے' البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۱۶۷' طبع جدید' دار الفکر بیروت' ۱۴۱۸ھ)

نیز حافظ ابن کثیر نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر کے زمانہ میں (۱۸ھ میں) جب عام قحط پڑا تو حضرت بلال بن حارث کے گھر والوں نے ان سے کہا کہ وہ بکری ذبح کریں' انہوں نے کہا اس میں کچھ نہیں ہے۔ گھر والوں کے اصرار پر جب بکری کو ذبح کیا تو اس کی ہڈیاں سرخ تھیں۔ انہوں نے پکارا یا محمداہ' خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی' آپ نے فرمایا: عمر کو میرا سلام کہو اور اس سے کہنا میرا عہد تمہارے ساتھ پورا ہونے والا ہے' اس کی گرہ سخت ہے اے عمر! تم سمجھ داری سے کام لو' اے عمر! تم سمجھ داری سے کام لو۔ پھر حضرت عمر نے نماز استسقاء پڑھی۔

(البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۱۶۷' طبع جدید دار الفکر' ۱۴۱۸ھ' الکامل فی التاریخ ج ۲ ص ۱۸۹ بیروت' ۱۴۰۰ھ' المنتظم لابن الجوزی ج ۳ ص ۱۵۷' دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

حضرت بلال بن حارث مزنی کی اس صحیح حدیث میں یہ تصریح ہے کہ قحط کے ایام میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر جا کر آپ کو پکارا اور آپ نے ان کو بارش کی خوش خبری دی۔ حضرت بلال بن حارث مزنی نے محضر صحابہ

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سنایا اور تمام صحابہ نے اس پر عمل کیا اور اس میں یہ دلیل ہے کہ وصال کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استمداد اور آپ سے استغاثہ پر تمام صحابہ کا اجماع تھا اور اس حدیث میں مصائب میں وفات یافتہ بزرگوں سے استمداد کے جواز کی قوی اصل ہے اور اس سلسلہ میں دوسری حدیث یہ ہے:

امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ٣٦٠ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص اپنے کسی کام سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس جاتا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے، اور نہ اس کے کام کی طرف دھیان دیتے تھے۔ ایک دن اس شخص کی حضرت عثمان بن حنیف سے ملاقات ہوئی، اس نے حضرت عثمان بن حنیف سے اس بات کی شکایت کی۔ حضرت عثمان نے اس سے کہا: تم وضو خانہ جا کر وضو کرو، پھر مسجد میں جاؤ اور وہاں دو رکعت نماز پڑھو، پھر یہ کہو اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور ہمارے نبی، نبی رحمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں، اے محمد! میں آپ کے واسطے سے آپ کے رب عزوجل کی طرف متوجہ ہوا ہوں تاکہ وہ میری حاجت روائی کرے اور اپنی حاجت کا ذکر کرنا پھر میرے پاس آنا حتیٰ کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں۔ وہ شخص گیا اور اس نے حضرت عثمان بن حنیف کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کیا، پھر وہ حضرت عثمان بن عفان کے پاس گیا، دربان نے ان کے لیے دروازہ کھولا اور ان کو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس لے گیا۔ حضرت عثمان نے اس کو اپنے ساتھ مسند پر بٹھایا اور پوچھا تمہارا کیا کام ہے؟ اس نے اپنا کام ذکر کیا، حضرت عثمان نے اس کا کام کر دیا اور فرمایا تم نے اس سے پہلے اب تک اپنے کام کا ذکر نہیں کیا تھا اور فرمایا جب بھی تمہیں کوئی کام ہو تو تم ہمارے پاس آ جانا، پھر وہ شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس سے چلا گیا اور جب اس کی حضرت عثمان بن حنیف سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میری طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے اور میرے معاملہ میں غور نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ آپ نے ان سے میری سفارش کی۔ حضرت عثمان بن حنیفؓ نے کہا بخدا میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کوئی بات نہیں کی، لیکن ایک مرتبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود تھا، آپ کے پاس ایک نابینا شخص آیا اور اس نے اپنی نابینائی کی آپ سے شکایت کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یا تم اس پر صبر کرو گے؟ اس نے کہا یا رسول اللہ! مجھے راستہ دکھانے والا کوئی نہیں ہے اور مجھے بڑی مشکل ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: تم وضو خانے جاؤ اور وضو کرو، پھر دو رکعت نماز پڑھو، پھر ان کلمات سے دعا کرو۔ حضرت عثمان بن حنیف نے کہا ابھی ہم الگ نہیں ہوئے تھے اور نہ ابھی زیادہ باتیں ہوئی تھیں کہ وہ نابینا شخص آیا درآں حالیکہ اس میں بالکل نابینائی نہیں تھی۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

(المعجم الصغیر ج ١ ص ١٨٤-١٨٣، مطبوعہ مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ، ١٣٨٨ھ، المعجم الصغیر رقم الحدیث: ٥٠٨، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ١٤٠٥ھ، المعجم الکبیر ج ٩ ص ٣٠، رقم الحدیث: ٨٣١١، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ٦ ص ١٦٨-١٦٧، فتاویٰ ابن تیمیہ ج ١ ص ٢٦٨، قاعدہ جلیلہ فی التوسل والوسیلہ لابن تیمیہ ص ٩٨، مصر ١٣٧٣ھ، حافظ منذری متوفی ٦٥٦ھ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، الترغیب والترہیب ج ١ ص ٤٧٦-٤٧٤، اور حافظ الہیثمی نے بھی لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، مجمع الزوائد ج ٢ ص ٢٧٩، شیخ مبارک پوری متوفی ١٣٥٣ھ نے بھی امام طبرانی اور امام منذری سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، تحفۃ الاحوذی ج ١٠ ص ٣٤، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ١٤١٩ھ)

اس حدیث میں بھی یہ تصریح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی آپ سے استمداد اور استغاثہ جائز ہے اور یہ

حدیث بھی وفات یافتہ بزرگوں سے استمداد اور استغاثہ کے جواز کی اصل ہے۔

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی متوفی ۶۷۶ھ لکھتے ہیں:

عتبی سے منقول ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بیٹھا ہوا تھا' ایک اعرابی آیا اور اس نے کہا: السلام علیک یارسول اللہ! میں نے اللہ تعالیٰ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: اور اگر بے شک وہ لوگ جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا' تیرے پاس آتے پس وہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے اور ان کے لیے رسول بھی اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرتے تو وہ ضرور اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پاتے۔ (النساء: ۶۴) پس میں آپ کے پاس اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتا ہوا اور آپ سے شفاعت طلب کرتا ہوا آپ کے پاس آیا ہوں۔ پھر اس نے آپ کی مدح سرائی میں دو شعر پڑھے' پھر وہ شخص چلا گیا۔ (عتبی کہتے ہیں) میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے' پھر میں نے خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی' آپ نے فرمایا: جا کر اس اعرابی سے ملو اور اس کو بشارت دو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی ہے۔

(الاذکار ص ۱۸۵' بیروت' شفاء السقام ص ۶۲' تفسیر الثعالبی ج ۲ ص ۲۵۷' تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۸۹' علامہ ابوالحیان اندلسی متوفی ۷۵۴ھ نے ابو عبداللہ رازی سے نقل کیا ہے کہ آپ کی قبر سے آواز آئی کہ تمہاری مغفرت کر دی گئی ہے' البحر المحیط ج ۳ ص ۶۹۴' علامہ نسفی متوفی ۷۱۰ھ اور مفتی محمد شفیع متوفی ۱۳۹۶ھ نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے' مدارک التنزیل علی ہامش الخازن ج ۱ ص ۳۹۹' معارف القرآن ج ۲ ص ۴۶۰)

الشیخ ظفر احمد عثمانی تھانوی متوفی ۱۳۹۴ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت ہے کہ جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر اپنا چہرہ رکھا تو کسی نے اس پر انکار کیا۔ انہوں نے کہا میں کسی اینٹ یا پتھر کے پاس نہیں آیا' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا ہوں جیسا کہ عنقریب آئے گا' اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت (النساء: ۶۴) کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی باقی ہے' لہٰذا جس شخص نے کوئی گناہ کر کے اپنی جان پر ظلم کر لیا ہو اس کو چاہیے کہ وہ آپ کی قبر مبارک کی زیارت کرے اور آپ کی قبر کے پاس اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے لیے استغفار فرمائیں گے۔ (اعلاء السنن ج ۵ ص ۵۴۴' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۸ھ)

عتبی کی اس نقل صحیح سے بھی یہ واضح ہو گیا کہ وفات کے بعد انبیاء علیہم السلام اور اسی طرح اولیاء کرام سے استمداد اور استغاثہ جائز ہے اور جہاں تک دور سے پکارنے کا تعلق ہے تو الشیخ رشید احمد گنگوہی لکھتے ہیں:

یہ خود معلوم آپ کو ہے کہ نداء غیر اللہ تعالیٰ کو دور سے شرک حقیقی جب ہوتا ہے کہ ان کو عالم سامع مستقل عقیدہ کرے ورنہ یہ شرک نہیں' مثلاً یہ جانے کہ حق تعالیٰ ان کو مطلع فرما دیوے گا یا باذنہ تعالیٰ انکشاف ان کو ہو جاوے گا یا باذنہ تعالیٰ ملائکہ پہنچا دیویں گے جیسا درود کی نسبت وارد ہے یا محض شوقیہ کہتا ہو محبت میں یا عرض حال محل تحسر و حرمان میں کہ ایسے مواقع میں اگرچہ کلمات خطابیہ بولتے ہیں لیکن ہرگز نہ مقصود اسماع ہوتا ہے نہ عقیدہ پس ان ہی اقسام سے کلمات مناجات و اشعار بزرگان کے ہوتے ہیں کہ فی حد ذاتہ نہ شرک نہ معصیت الخ۔ (فتاویٰ رشیدیہ کامل مبوب ص ۶۸' مطبوعہ کراچی)

وفات یافتہ بزرگوں سے استمداد کی تکفیر کا بطلان

قاضی شوکانی اور نواب بھوپالی نے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی اتباع میں وفات شدہ بزرگوں سے استمداد اور استغاثہ کو کفر اور شرک قرار دیا ہے' ظاہر ہے کہ ان نقول صحیحہ کے ہوتے ہوئے ان کی یہ تکفیر باطل ہے تاہم اس کے بطلان کو واضح

کرنے کے لیے ہم شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی متوفی ۱۲۰۶ھ کے بھائی شیخ سلیمان بن عبدالوہاب متوفی ۱۲۰۸ھ کی عبارت پیش کر رہے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

مسلمانوں کی تکفیر کے بارے میں تمہارا موقف اس لیے بھی صحیح نہیں ہے کہ غیر اللہ کو پکارنا اور نذر و نیاز قطعاً کفر نہیں، حتیٰ کہ اس کے مرتکب مسلمان کو ملت اسلامیہ سے خارج کر دیا جائے، کیونکہ حدیث صحیح میں ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شبہات کی بناء پر حدود ساقط کر دو اور حاکم نے اپنی صحیح میں اور ابو عوانہ اور بزار نے سند صحیح کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کسی شخص کی سواری کسی بے آب وگیاہ صحرا میں گم ہو جائے تو وہ تین بار کہے اے عباداللہ! (اے اللہ کے بندو) مجھ کو اپنی حفاظت میں لے لو، تو اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہیں جو اس کو اپنی حفاظت میں لے لیتے ہیں، اور طبرانی نے روایت کیا ہے کہ اگر وہ شخص مدد چاہتا ہو تو یوں کہے کہ اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو۔ اس حدیث کو فقہاء اسلام نے اپنی کتب جلیلہ میں ذکر کیا ہے اور اس کی اشاعت عام کی ہے اور معتمد فقہاء میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا، چنانچہ امام نووی نے "کتاب الاذکار" میں اس کا ذکر کیا ہے اور ابن القیم نے اپنی کتاب "الکلم الطیب" میں اس کا ذکر کیا ہے اور ابن مفلح نے "کتاب الآداب" میں اور ابن مفلح نے اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: حضرت امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد (یعنی امام احمد بن حنبل) سے سنا، وہ فرماتے تھے کہ میں نے پانچ بار حج کیے ہیں، ایک بار میں پیدل جا رہا تھا اور راستہ بھول گیا، میں نے کہا: اے عباداللہ! مجھے راستہ دکھاؤ، میں یونہی کہتا رہا، حتیٰ کہ میں صحیح راستہ پر آ گیا۔

اب میں یہ کہتا ہوں کہ جو شخص کسی غائب یا فوت شدہ بزرگ کو پکارتا ہے اور تم اس کی تکفیر کرتے ہو، بلکہ تم محض اپنے قیاس فاسد سے یہ کہتے ہو کہ اس شخص کا شرک ان مشرکین کے شرک سے بھی بڑھ کر ہے جو بحر و بر میں عبادت کی غرض سے غیر اللہ کو پکارتے تھے اور اس کے رسول کی علی الاعلان تکذیب کرتے تھے۔ کیا تم اس حدیث اور اس کے مقتضیٰ پر علماء اور ائمہ کے عمل کو اس شخص کے لیے اصل نہیں قرار دیتے جو بزرگوں کو پکارتا ہے اور محض اپنے فاسد قیاس سے اس کو شرک اکبر قرار دیتے ہو، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جبکہ شبہات سے حدود ساقط ہو جاتی ہیں، تو اس مضبوط اصل کی بناء پر ایسے شخص سے تکفیر کیونکر نہ ساقط ہوگی۔ نیز مختصر الروضہ میں کہا ہے: جو شخص توحید و رسالت کی گواہی دیتا ہو، اس کو کسی بدعت کی بنا پر کافر نہیں کہا جائے گا اور ابن تیمیہ نے بھی اسی بات کو ترجیح دی ہے۔ جبکہ جو شخص فوت شدہ بزرگوں کو پکارتا ہے، وہ کسی بدعت کا مرتکب بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کا یہ فعل ایک مضبوط اصل یعنی حدیث صحیح (جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے) اور سلف کے عمل پر مبنی ہے۔ (الصواعق الالٰہیہ ص ۴۰-۳۹، مطبوعہ مکتبہ ایشین، استنبول)

ہر چند کہ وفات یافتہ بزرگوں سے استمداد اور استغاثہ جائز ہے لیکن یہ مستحسن اور افضل نہیں ہے، افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ ہر بلا اور ہر مصیبت کو ٹالنے کے لیے اور ہر رنج اور ہر تکلیف کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کو پکارا جائے اور اس سے مدد طلب کی جائے، کیونکہ اس کی امداد اور اعانت مسلم ہے اور ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے اور ظنی سہاروں کے بجائے قطعی آسرے سے تمسک کرنا مستحسن ہے، باقی وفات یافتہ بزرگ اس کے اذن کے تابع ہیں وہ کسی کا تابع نہیں ہے، اس سے مدد طلب کرنا مصائب سے نجات کا ذریعہ بھی ہے، عبادت بھی ہے، کار ثواب بھی ہے، اور انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کی سنت اور ان کا اسوہ اور طریقہ بھی ہے۔ قل لا املک لنفسی ضرا ولا نفعا (الاعراف: ۱۸۸) میں بھی ہے، وہاں ہم نے ایک اور پہلو سے اس آیت پر مفصل گفتگو کی ہے، نیز یونس: ۲۳-۲۲ پر جو ہم نے گفتگو کی ہے اس کو بھی بغور پڑھ لیا جائے

اور ان تینوں آیتوں کی تفسیر میں ہم نے جو بحث کی ہے اس کو ایک ساتھ پڑھنے سے ان شاء اللہ اس موضوع پر کافی بصیرت افروز معلومات حاصل ہوں گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور وہ آپ سے معلوم کرتے ہیں کیا واقعی وہ عذاب برحق ہے؟ آپ کہئے کہ ہاں! میرے رب کی قسم وہ عذاب برحق ہے اور تم (میرے رب کو) عاجز کرنے والے نہیں ہو○ (یونس: ۵۳)

عذاب کی وعید کا برحق ہونا

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کفار کے اس قول کو نقل فرمایا تھا: اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب (پورا ہوگا) اگر تم سچے ہو؟ (یونس: ۴۸) پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا تھا جس کی تفصیل گزر چکی ہے، پھر انہوں نے دوبارہ سوال کیا جس کی اللہ تعالیٰ نے یہاں حکایت فرمائی ہے، اس سوال کا جواب بھی ان آیات کے سابقہ مضمون میں گزر چکا ہے جن میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر عقلی دلائل بیان کیے گئے تھے اور قرآن مجید کے معجزہ ہونے پر براہین قائم کیے گئے تھے، اور جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت ثابت ہوگئی، تو ہر جس چیز کے وقوع کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے اس کا قطعی اور یقینی ہونا ثابت ہوگیا۔

اس کے بعد فرمایا: اور تم عاجز کرنے والے نہیں ہو یعنی جس نے تم کو عذاب سے ڈرایا ہے تم اس کو عذاب نازل کرنے سے عاجز کرنے والے نہیں ہو اور اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کام کرنا چاہے تو نہ کوئی اس کام کو روک سکتا ہے نہ اس میں مزاحمت کر سکتا ہے اور نہ کوئی اس کے اذن اور اس کی رضا کے بغیر کسی کی شفاعت کر سکتا ہے اور نہ کوئی کسی کافر اور مشرک کو دائمی عذاب سے بچا سکتا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَ

اور اگر ہر ظالم کی ملکیت میں روئے زمین کی تمام چیزیں ہوتیں تو وہ (عذاب سے بچنے کے لیے) ان سب کو ضرور

اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ

دے ڈالتا، اور جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے۔ اور ان کے درمیان عدل سے فیصلہ کیا جائے گا

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

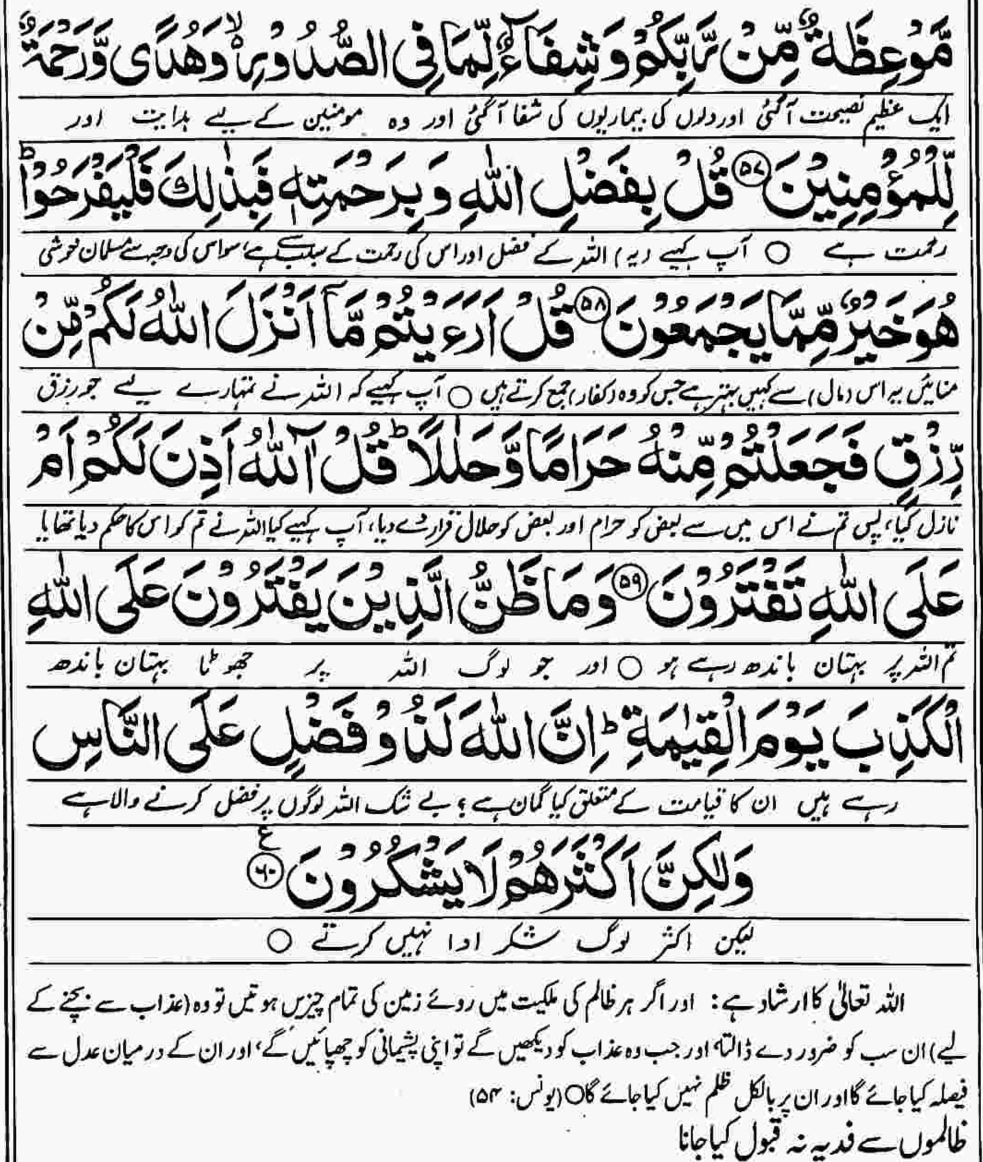
اور ان پر بالکل ظلم نہیں کیا جائے گا ○ سنو! بے شک آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ (سب) اللہ کی ملکیت

اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُوَ يُحْيٖ

ہے؛ سنو! بے شک اللہ کا وعدہ برحق ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے ○ وہی زندگی دیتا ہے

وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ

اور وہی زندگی لیتا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ○ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے


مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ
ایک عظیم نصیحت آگئی اور دلوں کی بیماریوں کی شفا آگئی اور وہ مومنین کے لیے ہدایت اور
لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ
رحمت ہے ○ آپ کہیے (یہ) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت کے سبب سے ہے، سو اس کی وجہ سے مسلمان خوشی
هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ
منائیں یہ اس (مال) سے کہیں بہتر ہے جس کو وہ (کفار) جمع کرتے ہیں ○ آپ کہیے کہ اللہ نے تمہارے لیے جو رزق
رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ۭ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ
نازل کیا، پس تم نے اس میں سے بعض کو حرام اور بعض کو حلال قرار دے دیا، آپ کہیے کیا اللہ نے تم کو اس کا حکم دیا تھا یا
عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ
تم اللہ پر بہتان باندھ رہے ہو ○ اور جو لوگ اللہ پر جھوٹا بہتان باندھ
الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ
رہے ہیں ان کا قیامت کے متعلق کیا گمان ہے؟ بے شک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے
ع ۷ ۱۱ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع
لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر ہر ظالم کی ملکیت میں روئے زمین کی تمام چیزیں ہوتیں تو وہ (عذاب سے بچنے کے لیے) ان سب کو ضرور دے ڈالتا اور جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے، اور ان کے درمیان عدل سے فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر بالکل ظلم نہیں کیا جائے گا ○ (یونس: ۵۴)

ظالموں سے فدیہ نہ قبول کیا جانا

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قیامت کے دن کی تین صفات بیان فرمائی ہیں: (۱) ظالم کے اگر بس میں ہوتا تو وہ دنیا کی پوری دولت دے کر بھی اپنے آپ کو عذاب سے چھڑا لیتا۔ (۲) ظالم عذاب کو دیکھ کر اپنی پشیمانی چھپائیں گے۔ (۳) ان کے درمیان عدل سے فیصلہ کیا جائے گا۔

ظالم تمام دنیا کی دولت دے کر بھی اپنے آپ کو عذاب سے نہیں چھڑا سکے گا اس کی وجہ اولاً تو یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن تنہا آئے گا اور کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا۔ (مریم: ٩٥) اور ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن اکیلا حاضر ہو گا۔

اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ قیامت کے دن ان سے کوئی فدیہ نہیں لیا جائے گا۔

وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○ (البقرہ: ٤٨) اور نہ کسی نفس سے کوئی فدیہ لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

ظالموں کے پشیمانی چھپانے کی توجیہ

قیامت کے دن کی دوسری صفت یہ بیان کی ہے: اور جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو اپنی پشیمانی اور پچھتاوے کو چھپائیں گے۔ اپنی پشیمانی کو چھپانے کی وجہ یہ ہو گی کہ وہ دنیا میں اس عذاب کا انکار کرتے رہے تھے اور جب ان پر اچانک سخت عذاب آ جائے گا تو وہ حیران اور ششدر رہ جائیں گے، دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کو اپنے متبعین سے حیاء آئے گی اور ان کو ان کی لعنت ملامت کا خوف ہو گا، اس وجہ سے وہ ان کے سامنے اپنی پشیمانی کا اظہار نہیں کریں گے، تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ بہت اخلاص کے ساتھ ندامت کا اظہار کریں گے اور جو شخص اخلاص کے ساتھ کوئی کام کرتا ہے وہ اس کو مخفی رکھتا ہے، اس آیت میں ان کی مذمت کی گئی ہے کہ اخلاص کے ساتھ توبہ کرنے کی جگہ دنیا تھی، اب یہ اخلاص بے محل ہے۔

ظالموں کے درمیان عدل سے فیصلہ کی توجیہ

قیامت کے دن کی تیسری صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ اس دن ان کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر بالکل ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ایک قول یہ ہے کہ مومنوں اور کافروں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا، دوسرا قول یہ ہے کہ صنادید کفار اور ان کے متبعین کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا اور ایک قول یہ ہے کہ کفار اور ان کے عذاب کے درمیان عدل سے معاملہ کیا جائے گا۔

ہرچند کہ تمام کفار دوزخ کے عذاب میں مشترک ہوں گے لیکن عذاب کی کیفیات میں ان کے درمیان فرق ہو گا، کیونکہ دنیا میں بعض کافروں نے بعض کافروں پر ظلم کیا ہو گا اور بعض کافروں نے بعض کافروں سے خیانت کی ہو گی، اس لیے بعض کافر ظالم اور بعض کافر مظلوم ہوں گے اور عدل اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ مظلوم کا عذاب ظالم سے کم ہو اور ظالم کا عذاب مظلوم کے عذاب سے زیادہ ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان کے درمیان عدل سے فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر بالکل ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سنو بے شک آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ (سب) اللہ کی ملکیت ہے، سنو بے شک اللہ کا وعدہ برحق ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے ○ وہی زندگی دیتا ہے اور وہی زندگی لیتا ہے، اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ○ (یونس: ٥٦-٥٥)

وعید عذاب کے برحق ہونے پر دلائل

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: اور اگر ہر ظالم کی ملکیت میں روئے زمین کی تمام چیزیں ہوتیں تو وہ (عذاب سے بچنے کے لیے) ان سب کو ضرور دے ڈالتا، اور اس آیت میں یہ بتا رہا ہے کہ ظالم کی ملکیت میں کوئی چیز نہیں ہے، کیونکہ آسمانوں اور زمینوں کی تمام چیزیں تو صرف اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہیں اور اس سے پہلے دلائل سے یہ بتایا جا چکا ہے کہ اس جہان میں جو جمادات، نباتات، حیوانات، انسان، ملائکہ اور جنات ہیں اور نور اور ظلمت اور دن اور رات کا جو سلسلہ ہے، ان سب کا اللہ تعالیٰ مالک ہے اور وہ تمام ممکنات پر قادر ہے اور تمام معلومات کا عالم ہے اور وہ تمام حاجات سے مستغنی ہے اور

تمام آفات اور نقائص سے منزہ ہے اور جب وہ تمام ممکنات پر قادر ہے اور تمام معلومات کا عالم ہے اور وہ تمام حاجات سے مستغنی ہے اور تمام آفات اور نقائص سے منزہ ہے اور جب وہ تمام ممکنات پر قادر ہے تو وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اپنے دشمنوں پر عذاب نازل فرمائے اور اپنے نیک بندوں اور اولیاء اللہ پر دنیا اور آخرت میں انعام اور اکرام فرمائے اور وہ اس پر بھی قادر ہے کہ قطعی دلائل اور قوی معجزات سے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید اور تقویت فرمائے اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت ظاہر فرمائے اور ان کے دین اور ان کی شریعت کو استحکام عطا فرمائے اور جب وہ ان تمام امور پر قادر ہے تو مشرکین کا استہزاء کرنا، آپ کے دین کا مذاق اڑانا اور نزول عذاب کی وعید پر تعجب کا اظہار کرنا باطل ہو گیا کیونکہ جب اللہ تعالیٰ ہر قسم کے عیب اور نقائص سے پاک ہے تو وہ اپنی وعید کو پورا نہ کرنے سے بھی پاک ہے اور بری ہے۔ سو اس نے مشرکین کو عذاب دینے کا جو وعدہ کیا ہے وہ برحق ہے لیکن ان میں سے اکثر اس کو نہیں جانتے۔

ظاہری ملکیت پر نازاں ہونے والوں کو متنبہ فرمانا

نیز یہ جو فرمایا ہے کہ تمام آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کی ملکیت ہے، اس میں یہ بھی بتلانا مقصود ہے کہ اس دنیا میں لوگ اسباب ظاہرہ کی طرف نظر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ فلاں کی بلڈنگ ہے، یہ فلاں کی فیکٹری ہے، یہ فلاں کی زمین ہے، یہ فلاں کا باغ ہے، سو وہ ہر چیز کی کسی اور مالک کی طرف نسبت کرتے ہیں کیونکہ وہ جہل اور غفلت کی وجہ سے امور ظاہرہ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور مجازات میں منہمک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس غفلت پر متنبہ کیا ہے کہ یہ سب چیزیں اللہ کی ملکیت ہیں، وہ زندگی دینے والا ہے وہی زندگی لینے والا ہے۔ جب وہ تمہاری یہ زندگی واپس لے لے گا تو تمہاری ملکیت میں کیا رہ جائے گا، تم نہ اپنے مالک ہو نہ اپنی چیزوں کے مالک ہو، سب کا وہی مالک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک عظیم نصیحت آ گئی اور دلوں کی بیماریوں کی شفا آ گئی، اور وہ مومنین کے لیے ہدایت اور رحمت ہے○ آپ کہیے (یہ) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت کے سبب سے ہے، سو اس کی وجہ سے مسلمان خوشی منائیں یہ اس (مال) سے کہیں بہتر ہے جس کو وہ (کفار) جمع کرتے ہیں○
(یونس: ۵۸-۵۷)

روحانی بیماریوں کے علاج کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا

اس سے پہلے یونس: ۳۸-۳۷ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل قرآن مجید ہے، اور اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی چار صفات بیان فرمائی ہیں: (۱) قرآن مجید اللہ کی جانب سے نصیحت ہے، (۲) قرآن مجید دلوں کی بیماریوں کے لیے شفا ہے، (۳) قرآن مجید ہدایت ہے، (۴) قرآن مجید مومنوں کے لیے رحمت ہے۔ اور قرآن مجید کی ان چاروں صفات کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت کے ساتھ بہت قوی ربط ہے، اس کی تفصیل اور تمہید یہ ہے کہ چٹورا انسان جس طرح زبان کی لذت اور چٹخارے حاصل کرنے کے لیے لذیذ، چٹ پٹی اور مسالے دار اشیاء اور مرغن اور میٹھی چیزیں بکثرت کھاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں ہائی بلڈ پریشر، شوگر اور معدہ کے السر کا مریض بن جاتا ہے اور شہوانی لذتوں کے ناجائز حصول کی کثرت کی وجہ سے آتشک، سوزاک اور ایڈز کا مریض بن جاتا ہے پھر جسمانی صحت کے حصول کے لیے اسے کھانے پینے کی ان مرغوب اشیاء اور تکمیل شہوت سے پرہیز کرایا جاتا ہے اور ایسی دوائیں استعمال کرائی جاتی ہیں جن سے اس کی زائل شدہ جسمانی صحت بحال ہو سکے، اسی طرح انسان کی نفسانی اور روحانی بیماریوں کا معاملہ ہے، جب انسان کا اللہ کے نبی سے رابطہ نہ ہو اور وہ صرف اپنی عقل سے اپنے عقائد وضع کرے اور اپنی زندگی گزارنے کے لیے خود ضابطہ حیات

مقرر کرے تو اس کے دل و دماغ پر شیطان کا تسلط ہو جاتا ہے اور اس کے عقائد گمراہ کن اور ملحدانہ ہوتے ہیں اور اس کے اعمال کفر، شرک اور زندیقی پر مبنی ہوتے ہیں اور اس کو حلال اور حرام کی بالکل تمیز نہیں ہوتی، سو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی نفسانی، روحانی اور قلبی امراض کے علاج اور اصلاح کے لیے نبی مبعوث فرماتا ہے اور ان کو بطور نسخہ شفاء کتاب عطا فرماتا ہے لہٰذا اسی سنت الٰہیہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور روحانی بیماریوں کے علاج اور ان کی اصلاح کے لیے قرآن مجید آپ پر نازل فرمایا۔

قرآن مجید سے قلبی اور روحانی امراض کے علاج کے چار مدارج

جو ماہر معالج ہو اس کے علاج کے حسب ذیل طریقے ہیں:

(۱) وہ مریض کو مضر اور مخرب اشیاء کے استعمال سے منع کرتا ہے جن سے اصل حیات خطرہ میں پڑ جاتی ہے، اس طرح قرآن مجید انسان کو شرک اور کفر سے روکتا ہے کیونکہ شرک اور کفر کے ارتکاب سے انسان سرمدی عذاب اور دائمی دوزخ کا مستحق ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید نے جگہ جگہ انسان کو کفر اور شرک سے منع کیا ہے تاکہ انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اخروی عذاب کا مستحق نہ ہو جائے اور اس کے عقائد کی اصلاح کی ہے۔

(۲) مریض کو ایسی دوائیں دی جائیں جن کی وجہ سے اس کے خون میں اعتدال پیدا ہو اور وہ خرابی دور ہو جائے جس کی وجہ سے مرض پیدا ہوا ہے مثلاً مریض کے جسم میں جگہ جگہ زخم ہیں جو ٹھیک نہیں ہو رہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ خون میں اس کی شکر کالیول بڑھا ہوا ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ خون میں اس کی شکر کو کنٹرول کیا جائے اور جب شکر اعتدال پر آجائے گی تو زخم ٹھیک ہو جائیں گے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام جب لوگوں کو ممنوع کاموں کے ارتکاب سے منع کرتے ہیں تو ان کا ظاہر گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے، پھر وہ ان کو باطن کی طہارت کا حکم دیتے ہیں جس کو تزکیہ نفس کہتے ہیں۔ نماز، روزے، زکوٰۃ اور حج کو ترک کرنے سے بچنا اور چوری، ڈاکہ، نشہ کرنے، قتل اور زنا سے بچنا اسی طرح جھوٹ، چغلی اور غیبت سے بچنا ان کاموں سے ظاہر بدن پاک ہوتا ہے اور کینہ، حسد، بخل، حرص اور بغض سے بچنے سے بدن کا باطن اور قلب پاک ہوتا ہے اور جب تک ظاہر پاک نہ ہو باطن صاف نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید میں ایسے احکام بھی ہیں جن سے ظاہر بدن پاک ہوتا ہے اور ایسے احکام بھی ہیں جن سے باطن صاف ہوتا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (آل عمران: ۱۶۴)

بے شک اللہ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا جب ان میں ان ہی میں سے ایک عظیم رسول بھیج دیا جو ان پر اس کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ (باطن صاف) کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، بے شک وہ اس سے پہلے ضرور کھلی گمراہی میں تھے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ (التوبہ: ۱۰۳)

ان کے اموال سے زکوٰۃ لیجیے جس سے ان کو پاک کیجیے اور اس سے ان کا تزکیہ (صفائے باطن) کیجیے۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ عقائد فاسدہ، اعمال خبیثہ اور اخلاق مذمومہ امراض کے قائم مقام ہیں اور جب یہ چیزیں زائل ہو جاتی ہیں تو قلب کو شفا حاصل ہو جاتی ہے اور اس کی روح ان تمام آلودگیوں سے پاک ہو جاتی ہے جو اس کو انوار الٰہیہ کے مطالعہ سے مانع ہوتی ہیں اور ان ہی دو مرتبوں کی طرف قرآن مجید کی ان صفات میں اشارہ ہے: موعظة من ربكم

وشفاء لما فی الصدور، یہ تمہارے رب کی جانب سے نصیحت ہے اور دل کی بیماریوں کے لیے شفا ہے۔

(۳) جب انسان عقائد فاسدہ، اعمال خبیثہ اور اخلاق رذیلہ سے منزہ، پاک اور صاف ہو جاتا ہے تو اس کا دل روشن ہو جاتا ہے اور اس میں انوار الٰہیہ منعکس ہونے لگتے ہیں اور اس کی روح تجلیات قدسیہ سے فیض یاب ہونے کے قابل ہو جاتی ہے اور اسی مرتبہ کو اس آیت میں ہدایت کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے، اس ہدایت کا پہلا مرتبہ یہ ہے:

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ ۝ (الفجر: ۲۸-۲۷) — اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کی طرف لوٹ جا۔

اور ہدایت کا متوسط مرتبہ یہ ہے:

فَفِرُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ۔ (الذاریات: ۵۰) — سو اللہ کی طرف بھاگو۔

اور آخری مرتبہ یہ ہے:

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ۔ (الانعام: ۹۱) — آپ کہیے: اللہ! پھر ان کو ان کی کج بحثی میں الجھا ہوا چھوڑ دیجئے۔

(۴) اور جب انسان درجات روحانیہ اور معارج ربانیہ کے اس درجہ پر پہنچ جائے کہ اس کے انوار سے دوسرے قلوب بھی روشن ہونے لگیں جس طرح چاند، سورج کے انوار سے مستفیض ہو کر ایک جہان کو منور کرتا ہے، وہ بھی انوار رسالت سے مستنیر ہو کر عام مسلمانوں کے دلوں کو منور کرنے لگے اور اس کے انوار سے بھی دوسرے ناقص مسلمان کامل ہونے لگیں تو یہی وہ مرتبہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ قرآن مومنین کے لیے رحمت ہے، اور مومنین کی تخصیص اس لیے فرمائی ہے کہ منبع فیوض تو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے اور مسلمان کا منتہاء کمال یہ ہے کہ وہ انوار رسالت میں جذب ہو جائے تبھی وہ معارف ربانیہ سے واصل ہوتا ہے، اور کفار تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب نہیں آتے اور آپ سے دور بھاگتے ہیں اور آپ کا انکار کرتے ہیں اور جس کو معرفت محمدی حاصل نہ ہو وہ معارف ربانیہ کا کب اہل ہو سکتا ہے سو یہ مرتبہ مومنین ہی کے ساتھ مختص ہے، اس لیے فرمایا ورحمۃ للمؤمنین۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص قرآن مجید سے اپنے نفس کے کمالات حاصل کرنا چاہے اس کے لیے چند مراتب ہیں، اس کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ وہ نامناسب کاموں کو چھوڑ کر اپنے ظاہر کو درست کرے اور اس کی طرف موعظت سے اشارہ فرمایا کیونکہ موعظہ کا معنی ہے گناہوں سے منع کرنا اور دوسرا مرتبہ ہے عقائد فاسدہ اور صفات ردیہ سے اپنے باطن کو صاف کرنا اور اس کی طرف شفاء لما فی الصدور سے اشارہ فرمایا اور تیسرا مرتبہ ہے نفس کو برحق عقائد اور عمدہ اخلاق سے مزین کرنا اور اس کی طرف ھدی سے اشارہ فرمایا اور چوتھا مرتبہ ہے اللہ کی رحمتوں کے انوار سے قلب کا روشن ہونا اور اس کی طرف ورحمۃ للمؤمنین سے اشارہ فرمایا۔

قرآن مجید سے جسمانی شفا حاصل کرنے کی تحقیق

علامہ جلال الدین سیوطی نے اس آیت میں شفاء لما فی الصدور کو عام قرار دیا ہے اور قرآن مجید کو روحانی امراض کے علاوہ جسمانی امراض کے لیے بھی شفاء قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں احادیث اور آثار کو بیان کیا ہے جن کو ہم ان شاء اللہ عنقریب نقل کریں گے، اور علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

اور یہ بات بعید نہیں ہے کہ بعض دل کی بیماریاں، جسمانی بیماریوں کا سبب ہو جاتی ہیں، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ حسد اور

کینہ دل کی بیماری ہے اور اس سے بعض جسمانی بیماریاں بھی ہو جاتی ہیں، اور ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید پڑھنے کی برکت سے جسمانی امراض دور فرما دیتا ہے۔ (روح المعانی ج ۷ ص ۲۰۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی ۱۳۹۶ھ لکھتے ہیں:

درحقیقت قرآن ہر بیماری کی شفاء ہے خواہ قلبی و روحانی ہو یا بدنی اور جسمانی (الی قولہ) علماء امت نے کچھ روایات و آثار سے اور کچھ اپنے تجربوں سے آیات قرآنی کے خواص و فوائد مستقل کتابوں میں جمع بھی کر دیئے ہیں، امام غزالی کی کتاب خواص قرآنی اس کے بیان میں مشہور و معروف ہے، جس کی تلخیص حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی نے اعمال قرآنی کے نام سے فرمائی ہے اور مشاہدات و تجربات اتنے ہیں کہ ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کریم کی مختلف آیتیں مختلف امراض جسمانی کے لیے بھی شفاء کلی ثابت ہوتی ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ نزول قرآن کا اصلی مقصد قلب و روح کی بیماریوں کو ہی دور کرنا ہے اور ضمنی طور پر جسمانی بیماریوں کا بھی بہترین علاج ہے۔

(معارف القرآن ج ۴ ص ۵۴۳، مطبوعہ ادارۃ المعارف القرآن ۱۴۱۴ھ)

ہم اس بحث میں پہلے تمیمہ اور تولہ کا معنی بیان کریں گے پھر قرآن مجید سے جسمانی شفا کے حصول کے متعلق احادیث اور آثار کا ذکر کریں گے، پھر دم اور تعویذات کی ممانعت کے متعلق بعض آثار کی توجیہ کریں گے، پھر تعویذ لٹکانے کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت مع حوالہ جات کے پیش کریں گے، اس کے بعد اس روایت کے صحیح یا حسن ہونے کی تحقیق کریں گے اور اس کے راویوں میں سے امام محمد بن اسحاق اور عمرو بن شعیب کی تعدیل پر اعتراضات کا جائزہ لیں گے اور تعویذات لٹکانے کے متعلق فتاویٰ تابعین کا ذکر کریں گے اور تعویذات کے جواز میں فقہاء احناف اور علماء دیوبند اور علماء غیر مقلدین کی تصریحات پیش کریں گے، اور آخر میں حافظ ابن قیم جوزی کے ذکر کردہ چند تعویذات کو پیش کریں گے۔

تمیمہ اور تِوَلَہ وغیرہ کے معنی اور ان کا شرعی حکم

علامہ مبارک بن محمد المعروف بابن الاثیر الجزری المتوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

تمائم کا معنی ہے تعاویذ اور خرز (ڈوری میں پروئی ہوئی سیپیاں اور کوڑیاں) اور ان کے عقد کا معنی ہے ان کو گلے میں لٹکانا۔ (جامع الاصول ج ۴ ص ۳۳۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ)

علامہ محمد طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ لکھتے ہیں:

عقد التمائم کا معنی ہے ڈوری میں پروئی ہوئی سیپیوں اور کوڑیوں کو اور تعویذوں کو گلے میں لٹکانا۔

(مجمع بحار الانوار ج ۱ ص ۲۷۴، مطبوعہ مکتبہ دار الایمان المدینۃ المنورہ، ۱۴۱۵ھ)

امام حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ لکھتے ہیں:

تمائم ان سیپیوں یا کوڑیوں کو کہتے ہیں جن کو عرب اپنے بچوں کے گلوں میں لٹکاتے تھے، ان کا اعتقاد تھا کہ اس سے نظر نہیں لگتی، شریعت نے اس کو باطل کر دیا۔ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فضل بن عباس کے گلے سے تمیمہ کو کاٹ دیا۔ (المستدرک ج ۴ ص ۴۱۷) حضرت عائشہ نے فرمایا: مصیبت نازل ہونے کے بعد جو تعویذ گلے میں لٹکایا جائے وہ تمیمہ نہیں ہے، لیکن تمیمہ وہ ہے جو مصیبت نازل ہونے سے پہلے لٹکایا جائے، تاکہ اس سے اللہ کی تقدیر کو رد کیا جائے۔ (اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تقدیر رد کرنے کا اعتقاد نہ ہو تو مصیبت نازل ہونے سے پہلے بھی تعویذ لٹکانا جائز ہے۔) عطاء نے کہا جو تعویذ قرآن مجید سے لکھے جائیں ان کو تمائم میں سے شمار نہیں کیا جائے گا۔ سعید بن مسیب سے سوال کیا گیا کہ

عورتوں اور چھوٹے بچوں کے گلوں میں ایسے تعویذ لٹکائے جائیں جن میں قرآن مجید لکھا ہوا ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا جب وہ تعویذ چمڑے میں منڈھا ہوا ہو یا لوہے کی ڈبیہ میں ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔
اور تِوَلَہ جادو کی ایک قسم ہے، اصمعی نے کہا یہ وہ چیز ہے جس کی وجہ سے خاوند کے دل میں عورت کی محبت ڈال دی جاتی ہے، اور حضرت جابر سے مروی ہے کہ نشرہ شیطان کا عمل ہے، (مسند احمد ج ۳ ص ۲۹۴، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۳۸۶۸) نشرہ ایک قسم کا دم ہے، جس شخص کے متعلق یہ گمان ہو کہ اس کو جن کا آسیب ہے اس سے اس کا علاج کیا جاتا ہے، متعدد فقہاء نے اس کو مکروہ کہا ہے۔ حسن نے کہا یہ جادو ہے، سعید بن مسیب نے کہا اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔
(شرح السنہ ج ۱۲ ص ۱۵۹-۱۵۸، ملخصاً، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۳ھ)

امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ لکھتے ہیں:

تمیمہ ان سیپیوں اور کوڑیوں کو کہتے ہیں جن کو (زمانہ جاہلیت میں عرب) گلوں میں لٹکاتے تھے، اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اس سے مصائب دور ہوتے ہیں اور جو تعویذ لٹکائے جاتے ہیں ان کو بھی تمیمہ کہتے ہیں (الی قولہ) ان کو لٹکانے کی اس وجہ سے ممانعت کی گئی ہے کہ اہل جاہلیت کا یہ اعتقاد تھا کہ یہ مصائب دور ہونے کی علت ہیں اور ان سے مکمل عافیت حاصل ہوتی ہے، اور اگر ان کو اللہ کے ذکر سے برکت حاصل کرنے کے لیے لٹکایا جائے اور اعتقاد یہ ہو کہ اللہ کے سوا کوئی مصیبت کو ٹالنے والا نہیں ہے تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔ (سنن کبریٰ ج ۹ ص ۳۵۰، ملخصاً، مطبوعہ نشر السنہ ملتان)

ملا علی بن سلطان محمد القاری متوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں:

حدیث میں جس تمیمہ کو شرک فرمایا ہے (سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۳۸۸۳) یہ وہ تعویذ ہے جس کو بچے کے گلے میں ڈالا جائے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء، قرآنی آیات اور ماثورہ (منقولہ) دعائیں نہ ہوں، اور ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ سیپیاں یا کوڑیاں ہیں جن کو عرب بچوں کے گلوں میں اس لیے ڈالتے تھے کہ ان کو نظر نہ لگے، اور یہ باطل ہے، اس کو شرک اس لیے فرمایا ہے کہ ان کا اعتقاد تھا کہ یہ سبب قوی ہیں یا ان کی (خود بہ خود) تاثیر ہے، یا ان میں ایسے کلمات ہوتے تھے جو شرک خفی یا شرک جلی کو متضمن ہوتے تھے۔ (مرقات ج ۸ ص ۳۵۹، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، ۱۳۹۰ھ)

نیز ملا علی قاری فرماتے ہیں: جو تعویذات آیات قرآنیہ، اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات اور منقولہ دعاؤں پر مشتمل ہوں ان میں کوئی حرج نہیں ہے، خواہ وہ تعویذ ہوں، دم ہو یا نشرہ ہو، البتہ غیر عربی میں جائز نہیں ہیں کیونکہ ان میں شرک کا احتمال ہے۔ (مرقات ج ۸ ص ۳۶۱-۳۶۰، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، ۱۳۹۰ھ)

علامہ سید احمد طحطاوی متوفی ۱۲۳۱ھ لکھتے ہیں: ہندیہ میں مذکور ہے کہ تعویذ لٹکانا جائز ہے لیکن بیت الخلاء جاتے وقت یا عمل زوجیت کے وقت تعویذ اتار لینا چاہیے۔ (حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ج ۴ ص ۱۸۳، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ۱۳۹۵ھ)

یہ اس صورت پر محمول ہے جب تعویذ کپڑے یا چمڑے میں سلا ہوا نہ ہو یا کسی دھات کی ڈبیا میں بند نہ ہو۔

قرآن مجید سے جسمانی شفا کے حصول کے متعلق احادیث اور آثار

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوتے تو اپنے اوپر قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ کر دم فرماتے اور اپنا ہاتھ اپنے جسم پر پھیرتے، پھر جب آپ اس مرض میں مبتلا ہوئے جس میں آپ کی وفات ہو گئی تو میں قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ کر آپ پر دم کرتی جن کو پڑھ کر آپ دم فرماتے تھے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ آپ کے جسم پر پھیرتی تھی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۳۴۳۹، صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۱۹۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۳۹۰۲، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۵۲۹، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۷۵۴۴، موطاامام مالک رقم الحدیث:۱۷۵۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل میں سے کوئی بیمار ہوتا تو آپ اس کے اوپر قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ کر دم فرماتے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۱۹۲، مشکوٰۃ رقم الحدیث:۱۵۳۲)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند اصحاب سفر میں تھے، ان کا عرب کے قبیلوں میں سے ایک قبیلہ کے پاس سے گزر ہوا، صحابہ نے ان سے مہمانی طلب کی، انہوں نے صحابہ کو مہمان نہیں بنایا۔ اس قبیلہ کے سردار کو بچھو نے ڈنک مارا ہوا تھا، انہوں نے اس کے لیے تمام جتن کیے لیکن کسی چیز سے اس کو فائدہ نہیں ہوا، پھر ان میں سے کسی نے کہا یہ جماعت جو یہاں ٹھہری ہوئی ہے ہوسکتا ہے ان کے پاس کوئی چیز ہو، وہ ان کے پاس گئے اور کہا اے لوگو! ہمارے سردار کو بچھو نے ڈنک مار دیا ہے اور ہم ہر قسم کی کوشش کر چکے ہیں اس کو کسی چیز سے فائدہ نہیں ہوا، کیا تم میں سے کسی کے پاس کوئی چیز ہے۔ بعض صحابہ نے کہا ہاں! اللہ کی قسم میں دم کرتا ہوں، لیکن اللہ کی قسم ہم نے تم سے مہمانی طلب کی تھی، تم نے ہماری مہمانی نہیں کی، اب میں تم پر بالکل دم نہیں کروں گا حتیٰ کہ تم مجھے کوئی انعام نہ دو۔ انہوں نے بکریوں کی ایک معین تعداد (سنن ابن ماجہ میں ہے تیس بکریاں) پر صلح کرلی، پھر وہ گئے اور الحمد للہ رب العالمین (مسلم میں ہے سورہ فاتحہ) پڑھ کر اس پر دم کیا، وہ بالکل تندرست ہوگیا اور اس طرح چلنے لگا، گویا اس کو کوئی بیماری نہیں تھی۔ سردار نے کہا ان سے جس انعام کا وعدہ کیا ہے وہ ان کو پورا پورا دو۔ بعض صحابہ نے کہا اس انعام کو پورا پورا تقسیم کرلو، بعض نے کہا نہیں یہ دم کی اجرت ہے اس کو اس وقت تک تقسیم نہ کرو حتیٰ کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائیں اور ہم آپ کے سامنے یہ تمام ماجرا بیان کریں پھر دیکھیں کہ آپ اس میں کیا حکم فرماتے ہیں۔ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپ سے اس کو بیان کیا۔ آپ نے فرمایا: تمہیں کس نے بتایا یہ (زمانہ جاہلیت کا) دم ہے، پھر آپ نے فرمایا: تم نے درست کیا اس کو تقسیم کرلو اور اس میں سے میرا حصہ بھی نکالو، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۲۲۷۶، صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۲۰۱، سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۳۹۰۲، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۰۶۴، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۲۱۵۶، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۱۰۸۶۸، مسند احمد ج ۳ ص ۱۰، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸ ص ۵۴۔۵۳، کراچی، صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۶۱۱۲، سنن دار قطنی ج ۳ ص ۶۴۔۶۳)

یہ حدیث صحیح ہے جس سے معلوم ہوا کہ دم کرنے کی اجرت لینا جائز ہے اور جن احادیث میں ممانعت ہے وہ تمام احادیث ضعیف ہیں۔

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ بیان فرماتے ہیں:

حضرت ابوالاحوص رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا میرے بھائی کے پیٹ میں تکلیف ہے۔ انہوں نے اس کو خمر (شراب) پینے کا مشورہ دیا، پھر کہا سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ نے نجس چیز میں شفا نہیں رکھی، شفا صرف دو چیزوں میں ہے: قرآن میں اور شہد میں۔ ان میں دل کی بیماریوں کے لیے شفا ہے اور لوگوں کے لیے شفا ہے۔ (المعجم الکبیر رقم الحدیث:۸۹۱۰)

امام ابن المنذر اور امام ابن مردویہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نبی صلی

اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا میرے سینہ میں تکلیف ہے۔ آپ نے فرمایا: قرآن پڑھو' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: شفاء لمافی الصدور۔

امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حلق میں درد کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا: تم قرآن پڑھنے کو لازم رکھو۔ (شعب الایمان رقم الحدیث:۲۵۸۰)

امام ابن ابی حاتم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قرآن میں دل کی بیماریوں کے لیے شفاء ہے اور شہد میں ہر بیماری کے لیے شفاء ہے۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث:۱۰۴۱۸)

امام بیہقی نے طلحہ بن مصرف سے روایت کیا ہے کہ مریض کے پاس جب قرآن پڑھا جائے تو وہ آرام محسوس کرتا ہے' حضرت خیثمہ جب بیمار ہوئے تو میں ان کے پاس گیا' میں نے کہا آج آپ تندرست لگ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا آج میرے پاس قرآن مجید پڑھا گیا تھا۔ (شعب الایمان رقم الحدیث:۲۵۷۹' الدر المنثور ج ۴ ص ۳۶۶' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۴ھ)

امام الحسین بن مسعود البغوی المتوفی ۵۱۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس بات میں کوئی حرج نہیں سمجھتی تھیں کہ تعوذ کے کلمات پڑھ کر پانی پر دم کیا جائے پھر اس کے ساتھ مریض کا علاج کیا جائے۔ مجاہد نے کہا اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ قرآن مجید کی آیات لکھ کر ان کو دھولیا جائے اور اس کا غسالہ (دھوون) مریض کو پلا دیا جائے' اسی کی مثل ابوقلابہ سے مروی ہے اور نخعی اور ابن سیرین نے اس کو مکروہ قرار دیا' اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک عورت کو وضع حمل میں مشکل پیش آ رہی تھی تو حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ قرآن مجید کی کچھ آیتیں اور کچھ کلمات طیبات لکھ کر انہیں دھو کر اس کا غسالہ (دھوون) اس عورت کو پلایا جائے۔ ایوب نے کہا میں نے ابوقلابہ کو دیکھا انہوں نے قرآن مجید کی کچھ آیتیں لکھیں پھر ان کو پانی سے دھویا اور اس شخص کو پلا دیا جس کو جنون تھا۔ (شرح السنہ ج ۱۲ ص ۱۶۶' مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت' ۱۴۰۳ھ)

امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے' آپ نے اپنا ہاتھ زمین پر رکھا' تو اس پر بچھو نے ڈنک مارا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جوتی سے اس بچھو کو مار دیا' پھر آپ نے واپس مڑتے ہوئے فرمایا: اللہ تعالیٰ بچھو پر لعنت فرمائے یہ نمازی کو چھوڑتا ہے نہ غیر نمازی کو' نبی کو نہ غیر نبی کو مگر اس کو ڈنک مار دیتا ہے' پھر آپ نے پانی اور نمک منگا کر اس کو ایک برتن میں ڈالا پھر جس انگلی پر بچھو نے ڈنک مارا تھا اس کو پانی میں ڈبویا اور اس پر پانی لگایا اور قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۲۳۵۴۲' بیروت' شعب الایمان رقم الحدیث:۲۵۷۵)

امام محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۵ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہترین دوا قرآن ہے۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۳۵۰۱' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

علامہ شمس الدین محمد بن ابوبکر ابن قیم جوزیہ متوفی ۷۵۱ھ لکھتے ہیں:

یہ بات معلوم ہے کہ بعض کلام کے خواص ہوتے ہیں اور اس کی تاثیرات ہوتی ہیں تو تمہارا رب العالمین کے کلام کے متعلق کیا گمان ہے جس کی ہر کلام پر فضیلت اس طرح ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کی فضیلت تمام مخلوق پر ہے' اس کا کلام مکمل شفاء ہے'

عصمت، نافعہ، نور، ہادی اور رحمت عامہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (بنواسرائیل: ۸۲) ہم قرآن مجید کی ان آیات کو نازل فرماتے ہیں جو مومنین کے لیے شفاء اور رحمت ہیں۔

اور قرآن مجید کی تمام آیات شفا ہیں اور سورہ فاتحہ کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے جس کی مثل قرآن میں ہے نہ تورات میں نہ انجیل میں اور نہ زبور میں۔ ایک مرتبہ میں مکہ میں بیمار ہوگیا، مجھے دوا اور طبیب میسر نہ آسکے، تو میں سورہ فاتحہ سے اپنا علاج کرتا تھا، میں ایک گھونٹ زمزم کا پانی پیتا اور اس پر کئی بار سورہ فاتحہ پڑھتا، پھر ایک گھونٹ زمزم کا پانی پیتا، میں نے کئی بار یہ عمل کیا حتیٰ کہ میرے تمام درد اور تکلیفیں دور ہوگئیں اور مجھے مکمل فائدہ ہوگیا۔

(زاد المعاد ج ۴ ص ۱۴۱-۱۴۰، ملخصاً، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۹ھ)

کلمات طیبہ سے دم کرنے کے جواز کے متعلق احادیث

الشفاء بنت عبداللہ بیان کرتی ہیں کہ میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: تم اس کو پھوڑے کا دم کیوں نہیں سکھاتیں جس طرح تم نے اس کو لکھنا سکھایا ہے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۸۸۷، مسند احمد رقم الحدیث: ۲۷۱۶۳)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دم صرف نظر بد یا سانپ یا بچھو کے ڈسنے میں (زیادہ موثر) ہے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۸۸۴، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۰۵۷)

سہیل بن حنیف سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دم صرف بیمار شخص یا سانپ یا بچھو کے ڈسے ہوئے میں ہے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۸۸۸ مختصراً)

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۸۸۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۵۳۰، شرح السنہ رقم الحدیث: ۳۲۴۰، مسند احمد رقم الحدیث: ۳۶۱۵، المستدرک ج ۴ ص ۴۱۸-۴۱۷، ج ۴ ص ۲۱۷-۲۱۶، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ۳۵۰)

امام الحسین بن مسعود البغوی المتوفی ۵۱۶ھ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں:

اس قسم کی جھاڑ پھونک اور دم کرنے کی ممانعت ہے جس میں کلمات شرک ہوں یا اس میں سرکش شیاطین کا ذکر ہو یا اس میں عربی کے علاوہ کسی اور زبان کے کلمات ہوں، یا ان کلمات کا کچھ پتا نہ ہو، ہوسکتا ہے کہ اس میں جادو کے کلمات ہوں یا کفریہ کلمات ہوں، لیکن جس میں قرآن مجید کے کلمات ہوں یا اس میں اللہ عزوجل کا ذکر ہو تو ان کلمات کے ساتھ دم کرنا جائز اور مستحب ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھ کر اپنے اوپر دم فرماتے تھے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۴۳۹، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۱۹۲) اور جن صحابہ نے بکریوں کے عوض سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کیا تھا، ان سے آپ نے فرمایا: تم کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ (زمانہ جاہلیت کا) دم ہے، اس کو تقسیم کرو، اور اس میں سے میرا حصہ بھی نکالو اور فرمایا: جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو ان میں اجرت کی سب سے زیادہ مستحق اللہ کی کتاب ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۷۳۷، ۲۲۷۶، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۲۰۱) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن اور حضرت حسین پر یہ کلمات پڑھ کر دم کرتے تھے: اعوذ بکلمات اللہ التامۃ من کل شیطان وھامۃ ومن کل عین لامۃ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۷۱) "میں ہر شیطان اور ہر زہریلے کیڑے اور ہر نظر بد کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔" اور حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو حضرت جبرئیل نے یہ پڑھ کر آپ پر دم کیا:

بسم اللہ ارقیک من کل شیٔ یؤذیک من شر کل نفس او عین حاسد اللہ یشفیک، بسم اللہ ارقیک۔

اللہ کے نام سے آپ پر دم کرتا ہوں، اللہ آپ کو شفا دے ہر اس چیز سے جو آپ کو ایذا دے اور ہر نفس کے شر سے اور ہر حاسد نظر سے، اللہ کے نام سے آپ کو دم کرتا ہوں۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۱۸۵، ۲۱۸۶، سنن الترمذی رقم الحدیث:۹۷۲، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۳۵۲۳، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۱۰۸۴۳) اور عوف بن مالک اشجعی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا ہم زمانہ جاہلیت میں دم کرتے تھے، یا رسول اللہ! آپ کی اس کے متعلق کیا رائے ہے۔ آپ نے فرمایا: اپنے دم کے کلمات مجھے پڑھ کر سناؤ، اس وقت تک دم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے جب تک کہ ان میں شرکیہ کلمات نہ ہوں۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۲۰۰، سنن ابو داؤد رقم الحدیث:۳۸۸۶)

(شرح السنہ ج ۱۲ ص ۱۶۰-۱۵۹، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۳ھ)

دم اور تعویذ کی ممانعت کے متعلق حضرت ابن مسعود کا ارشاد اور امام بغوی سے اس کی توجیہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ دم کرنا تمائم (تعویذ لٹکانا) اور تِوَلَہ (بیوی سے خاوند کی محبت کا جادو) شرک ہیں، حضرت عبداللہ کی بیوی نے کہا آپ اس طرح کیوں کہتے ہیں، خدا کی قسم! میری آنکھ میں کچھ پڑ گیا تھا میں فلاں یہودی کے پاس جایا کرتی تھی وہ میری آنکھ پر دم کرتا تھا اور جب وہ مجھ پر دم کرتا تھا تو مجھے آرام آجاتا تھا۔ حضرت عبداللہ نے کہا یہ شیطان کا عمل تھا، وہ اپنے ہاتھ سے آنکھ میں چبھوتا تھا اور جب وہ یہودی دم کرتا تھا تو وہ اپنے ہاتھ کو ہٹا لیتا تھا، تمہارے لیے یہ کافی ہے کہ تم اس طرح پڑھو جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے:

اذهب الباس رب الناس اشف انت الشافی لاشفاء الاشفاء ک لایغادر سقما۔

اے لوگوں کے رب! تکلیف کو دور کر دے، شفا دے تو ہی شفا دینے والا ہے، تیرے سوا کسی کی شفا نہیں ہے جو بیماری کو باقی رہنے نہیں دیتی۔

تعویذ اور دم کی ممانعت کے متعلق ابن حکیم اور حضرت عقبہ بن عامر کا ارشاد اور امام بیہقی، امام ابن الاثیر اور دیگر علماء سلف کی توجیہ

عیسیٰ بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ بیان کرتے ہیں کہ میں عبداللہ بن حکیم ابو معبد الجہنی کی عیادت کرنے کے لیے گیا ان پر ورم تھا۔ ہم نے کہا آپ کوئی چیز کیوں نہیں لٹکاتے؟ (ایک روایت میں ہے آپ تعویذ کیوں نہیں لٹکاتے، مشکوٰۃ رقم الحدیث:۴۵۵۶) انہوں نے کہا موت اس سے زیادہ قریب ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے کسی چیز کو لٹکایا وہ اسی کے سپرد کر دیا جائے گا۔

امام ترمذی نے کہا عبداللہ بن حکیم کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع ثابت نہیں اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا، اور اس باب میں حضرت عقبہ بن عامر سے بھی روایت ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۰۷۲، مسند احمد ج ۴ ص ۳۱۰، المستدرک ج ۴ ص ۲۱۶، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ۳۵۱، شرح السنہ ج ۱۲ ص ۱۶۰)

امام ترمذی نے حضرت عقبہ بن عامر کی جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے:

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے جس شخص نے تمیمہ (تعویذ) کو لٹکایا، اللہ اس کے مقصد کو پورا نہ کرے اور جس شخص نے کوڑی (سیپی) کو لٹکایا اللہ اس کی

حفاظت نہ کرے۔

(مسند احمد ج ۴ ص ۱۵۴، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث:۱۷۵۹، المعجم الکبیر ج ۱۷ ص ۲۹۷، ج ۴ ص ۴۱۷، مجمع الزوائد ج ۵ ص ۱۰۳)

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ اس قسم کی احادیث کے متعلق لکھتے ہیں:

اس قسم کی احادیث میں ان تمائم (تعویذات) کو شرک فرمایا، جن تعویذات کو لٹکانے والوں کا یہ اعتقاد ہو کہ مکمل عافیت اور بیماری کا مکمل زوال ان تعویذات کی وجہ سے ہوگا جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں مشرکین کا عقیدہ تھا، لیکن جس نے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے برکت حاصل کرنے کے لیے تعویذ کو لٹکایا اور اس کا یہ اعتقاد ہو کہ مصیبت کو ٹالنے والا اور مرض کو دور کرنے والا صرف اللہ عزوجل ہے تو پھر تعویذ لٹکانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ۳۵۰، مطبوعہ ملتان) نیز امام بیہقی فرماتے ہیں حضرت ابن مسعود سے مرفوعاً روایت ہے کہ دم، تولہ، اور تمائم شرک ہیں، اس سے ان کی یہ مراد ہے کہ وہ دم اور تعویذ وغیرہ شرک ہیں جو عربی زبان میں نہ ہوں اور ان کے معنی غیر معلوم ہوں۔

(سنن صغیر ج ۲ ص ۴۲۳، مطبوعہ دار الجیل بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ مجد الدین ابو السعادات المبارک بن محمد ابن الاثیر الجزری المتوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

تمائم (تعویذات) کو شرک اس لیے فرمایا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں وہ تمائم کے متعلق مکمل دوا اور شفا کا اعتقاد رکھتے تھے، اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ تمائم اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی تقدیر کو ٹال دیتے ہیں اور وہ اللہ کے غیر سے مصائب کو دور کرنا چاہتے تھے۔ (النہایہ ج ۱ ص ۱۹۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ)

علامہ شرف الدین حسین بن محمد الطیبی متوفی ۷۴۳ھ لکھتے ہیں:

تعویذ اور کوڑی لٹکانے پر آپ نے شرک کا اطلاق اس لیے فرمایا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ان کے لٹکانے کا جو طریقہ معروف اور مروج تھا وہ شرک کو متضمن تھا کیونکہ ان کے متعلق ان کا اعتقاد شرک کی طرف لے جاتا تھا، میں کہتا ہوں کہ شرک سے مراد یہ اعتقاد ہے کہ یہ تعویذات قوی سبب ہیں اور ان کی اصل تاثیر ہے اور یہ توکل کے منافی ہے۔

(شرح الطیبی ج ۸ ص ۳۰۱، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، ۱۴۱۳ھ)

علامہ محمد طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(مجمع بحار الانوار ج ۱ ص ۲۷۴، مطبوعہ دار الایمان مدینہ منورہ، ۱۴۱۵ھ)

تعویذ لٹکانے کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت اور اس کے حوالہ جات

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

علی بن حجر، اسماعیل بن عیاش، از محمد بن اسحاق از عمرو بن شعیب از والد خود از جد خود سے روایت ہے: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص نیند میں ڈر جائے تو وہ یہ دعا کرے: اعوذ بکلمات اللہ التامۃ من غضبہ وعقابہ وشر عبادہ ومن ھمزات الشیطان وان یحضرون، تو پھر شیاطین اس کو نقصان نہیں پہنچائیں گے، حضرت عبداللہ بن عمرو اپنے بالغ بچوں کو اس دعا کی تلقین کرتے تھے اور جو نابالغ بچے تھے ان کے گلے میں ایک کاغذ پر یہ دعا لکھ کر لٹکا دیتے تھے۔

امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۵۲۸، سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۳۸۹۳، مسند احمد ج ۲ ص ۱۸۱، طبع قدیم، مسند احمد رقم

الحدیث:۶۶۹۶، طبع دارالحدیث قاہرہ، اس کے حاشیہ میں شیخ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے، المستدرک ج ۱ ص ۵۴۸، حاکم نے کہا یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور ذہبی نے اس پر جرح نہیں کی، بلکہ حافظ ذہبی نے خود اس حدیث سے استدلال کیا ہے، الطب النبوی ص ۲۸۱، کتاب الآداب للبیہقی رقم الحدیث:۹۹۳، شیخ البانی نے اس حدیث کو اپنی صحیح ترمذی میں درج کیا ہے، رقم الحدیث:۴۷۹۳، مصابیح السنہ ج ۲ ص ۲۲۹، مشکوٰۃ المصابیح رقم الحدیث:۴۴۷۷، المصنف لابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۲۳۵۴۷، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، الترغیب والترہیب رقم الحدیث:۲۳۸۴، دار ابن کثیر بیروت، ۱۴۱۴ھ، الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۴۵۶-۴۵۵، مطبوعہ دارالحدیث قاہرہ، ۱۴۰۷ھ، حافظ منذری نے اس حدیث کو امام نسائی کے حوالے سے بھی ذکر کیا ہے، عمل الیوم واللیلۃ رقم الحدیث:۶۵۷، مختصر سنن ابوداؤد للمنذری رقم الحدیث:۳۷۴۴)

حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت کے صحیح اور حسن نہ ہونے اور مدرج ہونے کے جوابات

کیپٹن ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی نے "تعویذ گنڈا شرک ہے" کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا ہے، اور انہوں نے گلے میں تعویذ لٹکانے کو شرک کہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کی مذکور الصدر حدیث کے اوپر انہوں نے یہ عنوان قائم کیا ہے: "تعویذ کے بیوپاریوں کو اکلوتا سہارا" پھر انہوں نے اس حدیث کو رد کرنے کے لیے پانچ علتیں ذکر کی ہیں، ہم نمبروار ان پانچوں علتوں کا ذکر کرکے ان پر مفصل بحث کریں گے، فنقول وباللہ التوفیق۔

کیپٹن عثمانی لکھتے ہیں:

اس ایک روایت کے اندر متعدد علتیں ہیں: (۱) یہ پورے سرمایہ روایت میں اپنے طرز کی ایک منفرد روایت ہے اور صحیح ہونا تو دور رہا یہ حسن روایت بھی نہیں ہے۔ امام ترمذی جو تصحیح روایات کے بارے میں بہت ہی فراخ دل واقع ہوئے ہیں اس روایت کو حسن بھی شمار نہیں کرتے بلکہ حسن غریب کہتے ہیں۔ (تعویذ گنڈا شرک ہے ص ۵، مطبوعہ کراچی)

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب کہا ہے اس کے باوجود کیپٹن مسعود کا یہ کہنا کہ امام ترمذی اس روایت کو حسن بھی شمار نہیں کرتے بہت عجیب ہے۔ شاید انہوں نے یہ سمجھا ہو کہ غریب ہونا اس حدیث کے حسن ہونے کے منافی ہے تو اس کی وجہ اصطلاح محدثین سے ناواقفیت ہے۔

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ امام ترمذی نے یہ تصریح کی ہے کہ حدیث حسن کی شرط یہ ہے کہ وہ متعدد سندوں کے ساتھ مروی ہو، پھر وہ اپنی بعض احادیث کے متعلق یہ کیسے کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ ہم اس حدیث کو صرف اسی سند کے ذریعہ پہچانتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ امام ترمذی نے مطلقاً حدیث حسن کے لیے یہ شرط نہیں بیان کی، بلکہ یہ حدیث حسن کی ایک خاص قسم کی شرط ہے اور یہ وہ قسم ہے جس حدیث کے متعلق وہ اپنی کتاب میں صرف حسن لکھتے ہیں اور اس کے ساتھ صحیح یا غریب کی صفت نہیں لاتے، کیونکہ وہ بعض حدیث کے متعلق صرف حسن لکھتے ہیں اور بعض کے متعلق صرف صحیح لکھتے ہیں اور بعض کے متعلق صرف غریب لکھتے ہیں، اور بعض کے متعلق حسن صحیح لکھتے ہیں اور بعض کے متعلق حسن غریب لکھتے ہیں اور بعض کے متعلق صحیح غریب لکھتے ہیں اور بعض کے متعلق حسن صحیح غریب لکھتے ہیں اور انہوں نے جو متعدد اسانید کی شرط عائد کی ہے وہ اس حدیث کے متعلق ہے جس کو وہ صرف حسن لکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب کے آخر میں خود اس کی تصریح کی ہے اور جس حدیث کے متعلق وہ حسن غریب کہتے ہیں اس میں انہوں نے جمہور کی تعریف سے عدول نہیں کیا۔

(شرح نخبۃ الفکر ص ۳۸-۳۶، مطبوعہ قرآن محل کراچی)

خلاصہ یہ ہے کہ امام ترمذی کے نزدیک یہ حدیث حسن ہے اگرچہ ایک سند سے مروی ہے۔

نیز یہ حدیث امام ابوداؤد کے نزدیک بھی حسن ہے کیونکہ جس حدیث پر وہ کوئی حکم نہ لگائیں وہ ان کے نزدیک حسن اور عمل کی صلاحیت رکھتی ہے۔ امام ابو عمرو عثمان بن عبدالرحمن الشرزوری متوفی ۶۴۳ھ لکھتے ہیں:

امام ابوداؤد نے اپنے مکتوب میں لکھا ہے میں نے اپنی اس کتاب میں جس حدیث کو درج کیا اس حدیث میں جو شدید ضعف ہے اس کو میں نے بیان کر دیا ہے اور جس حدیث کے متعلق میں نے کوئی چیز ذکر نہیں کی، وہ صالح ہے اور بعض ایسی احادیث بعض دوسری احادیث سے زیادہ صحیح ہیں۔

(علوم الحدیث لابن الصلاح ص ۳۳، مطبوعہ المکتبۃ العلمیہ، المدینۃ المنورۃ، ۱۳۸۶ھ)

علامہ یحییٰ بن شرف نواوی متوفی ۶۷۶ھ امام ابوداؤد کی اس عبارت کے متعلق لکھتے ہیں:

امام ابوداؤد کی اس تحریر کی بناء پر ہم نے امام ابوداؤد کی سنن میں جس حدیث کو مطلقاً پایا اور معتمدین میں کسی ایک نے بھی اس حدیث کو صحیح کہا نہ ضعیف کہا تو وہ امام ابوداؤد کے نزدیک حسن ہے۔

(تقریب النواوی مع تدریب الراوی ج ا ص ۱۶۷، مطبوعہ المکتبۃ العلمیہ، المدینۃ المنورۃ، ۱۳۹۲ھ)

علامہ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ اس عبارت کی شرح میں لکھتے ہیں:

امام ابوداؤد کی ایسی حدیث استدلال کی صلاحیت رکھتی ہے اور معتمدین میں سے کسی کی تصریح کے بغیر اس حدیث کو صحیح نہیں کہا جائے گا اس لیے اس حدیث کو حسن کہنے میں زیادہ احتیاط ہے اور اس سے بھی زیادہ احتیاط اس کو صالح کہنے میں ہے۔

(تدریب الراوی ج ا ص ۱۶۷، مطبوعہ المکتبۃ العلمیہ، المدینۃ المنورۃ، ۱۳۹۲ھ)

واضح رہے کہ امام ابوداؤد نے اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد اس پر کسی قسم کے ضعف کا حکم نہیں لگایا، پس مذکور الصدر تصریحات کے مطابق یہ حدیث امام ابوداؤد کے نزدیک بھی حسن ہے۔

کیپٹن مسعود نے اس حدیث کے متعلق لکھا ہے: "اس حدیث کا صحیح ہونا تو درکنار رہا" گزارش یہ ہے کہ اس سند کے ساتھ امام احمد نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور شیخ احمد شاکر جو متاخرین میں کافی شہرت رکھتے ہیں انہوں نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے، حاکم نے بھی اس کو صحیح کہا ہے اور ذہبی نے ان کی مخالفت نہیں کی بلکہ خود اس حدیث سے استدلال کیا ہے اور شیخ البانی جو مخالفین کے نزدیک مسلم ہیں انہوں نے بھی امام ترمذی کی سند کو صحیح کہا ہے۔ ان سب کے حوالے ہم نے شروع میں ذکر کر دیئے ہیں۔

کیپٹن مسعود نے اس حدیث کی دوسری علت یہ بیان کی ہے:

(۲) دوسری علت اس روایت میں یہ ہے کہ: عبداللہ بن عمرو بن العاص کے متعلق یہ جملہ کہ وہ اس دعا کو نابالغ بچوں کے گلے میں لکھ کر لٹکا دیا کرتے تھے۔ حدیث کے الفاظ نہیں بلکہ راوی کی طرف سے ایک "مدرج" جملہ ہے۔

(تعویذ گنڈا شرک ہے ص ۵، مطبوعہ کراچی)

کیپٹن مسعود صاحب نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ جملہ حدیث کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ راوی کے الفاظ ہیں اور یہ حدیث مدرج ہے اس پر انہوں نے کوئی دلیل پیش نہیں کی اور بلادلیل حدیث کے کسی جملہ کو راوی کا کلام قرار دینا غیر مسموع اور غیر مقبول ہے۔ اگر وہ اس سلسلہ میں ناقدین اور ناقلین حدیث میں سے کسی کی شہادت پیش کرتے تو اس کی طرف التفات کیا جاتا محض ان کی ذہنی اختراع تو لائق جواب نہیں ہے۔

تعویذ کے جواز کی روایت کا ایک حدیث سے معارضہ اور اس کا جواب

کیپٹن مسعود صاحب نے اس حدیث کی تیسری علت یہ بیان کی ہے:

(۳) تیسری علت: عبداللہ بن عمرو بن العاص جن کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ وہ اپنے کمسن بچوں کے گلے میں دعا کا تعویذ لٹکاتے تھے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تعویذ لٹکانے کی برائی میں صحیح حدیث روایت کرتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک صحابی کسی چیز کی برائی کی حدیث بھی روایت کرے اور دوسری طرف اس چیز میں مبتلا بھی ہو۔ روایت یوں ہے: (رواہ ابوداؤد ص ۵۴۰ و مشکوٰۃ ص ۳۸۹) ترجمہ: عبداللہ بن عمرو بن العاص (علامہ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ یہ روایت عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے نہیں بلکہ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے ہے اور اسی طرح ابوداؤد کے نسخوں میں ہے۔ مشکوٰۃ میں غلطی سے عبداللہ بن عمر چھپ گیا ہے) روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اگر میں کہیں یہ تین باتیں کروں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب مجھے حق و ناحق کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ وہ تین باتیں یہ ہیں: (۱) تریاق استعمال کروں (اس میں شراب اور سانپوں کا گوشت ہوتا ہے)؛ (۲) تعویذ لٹکاؤں؛ (۳) شاعری کروں۔

(تعویذ گنڈا شرک ہے ص ۶-۵، مطبوعہ کراچی)

اس اعتراض کے جواب میں اولاً گزارش یہ ہے کہ جس حدیث پر امام ابوداؤد سکوت فرمائیں وہ اس وقت حسن ہوتی ہے جب معتمدین میں سے کسی نے اس کو ضعیف نہ قرار دیا ہو اور اس حدیث کو حافظ منذری اور امام بخاری نے ضعیف قرار دیا ہے اور وہ معتمدین میں سے ہیں، چنانچہ حافظ زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذری المتوفی ۶۵۶ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث کی سند میں عبدالرحمٰن بن رافع التنوخی ہے جو افریقیا کا قاضی تھا، امام بخاری نے کہا اس کی حدیث میں بعض مناکیر ہیں۔ (مختصر سنن ابوداؤد ج ۵ ص ۳۵۴، مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت)

ثانیاً اس حدیث کی شرح میں ابو سلیمان حمد بن محمد الخطابی الشافعی المتوفی ۳۸۸ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث میں تمیمہ (کوڑیاں یا تعویذ) لٹکانے کی ممانعت ہے، قرآن مجید سے تبرک حاصل کرنے یا شفا طلب کرنے کے لیے جو تعویذ لٹکائے جائیں وہ اس میں داخل نہیں ہیں، کیونکہ وہ اللہ سبحانہ کا کلام ہے اور اس سے استعاذہ کرنا (پناہ طلب کرنا) اللہ سے استعاذہ کرنے کے قائم مقام ہے اور یہ جواب بھی دیا گیا ہے کہ وہ تعویذ مکروہ ہیں جو غیر عربی میں ہوں اور ان کا معنی معلوم نہ ہو، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ جادو ہو یا اس میں اور کوئی چیز ممنوع ہو۔

(معالم السنن مع مختصر سنن ابوداؤد ج ۵ ص ۳۵۴، مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت)

ملا علی بن سلطان محمد القاری الحنفی المتوفی ۱۰۱۴ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث میں جو تمیمہ سے ممانعت کی گئی ہے اس سے مراد زمانہ جاہلیت کا تمیمہ ہے، کیونکہ تمیمہ (تعویذ) کی جو قسم اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کے کلمات کے ساتھ مختص ہے وہ اس ممانعت میں داخل نہیں ہے، بلکہ وہ تعویذ مستحب ہے اور اس میں برکت کی امید ہے اور اس کی اصل سنت سے معروف ہے۔

(مرقات ج ۸ ص ۳۶۱، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، ۱۳۹۰ھ)

روایت حدیث میں امام محمد بن اسحاق کا مقام

کیپٹن مسعود صاحب نے اس حدیث کی چوتھی علت یہ بیان کی ہے:

(۴) چوتھی علت اس روایت میں یہ ہے کہ اس کے دو راوی محمد بن اسحٰق اور عمرو بن شعیب ایسے راوی ہیں جن پر ائمہ

حدیث نے شدید جرح کی ہے۔ محمد بن اسحٰق بن یسار۔ امام مالک فرماتے ہیں "دجال من الدجاجلة" دجالوں میں سے ایک دجال ہے۔ (تہذیب جلد ۹ ص ۴۱، میزان جلد ۳ ص ۲۱) سلیمان تیمی کہتے ہیں کہ وہ کذاب ہے۔ ہشام بن عروہ کہتے ہیں کہ وہ کذاب ہے۔ یحییٰ قطان کہتے ہیں کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ وہ کذاب (بہت بڑا جھوٹا) ہے۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۱) وہیب بن خالد اس کو کاذب کہتے ہیں۔ (تہذیب ج ۹ ص ۴۵) جریر بن عبدالحمید کا بیان ہے کہ میرا یہ خیال نہ تھا کہ میں اس زمانہ تک زندہ رہوں گا جب لوگ محمد بن اسحاق سے حدیث کی سماعت کریں گے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۳۰۶) اب ذرا ایسے کاذب راوی کے بارے میں ائمہ حدیث کا نظریہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ واذا قالوا متروك الحديث او واهيا او كذاب فهو ساقط لا يكتب حديثه (تقریب النواوی ص ۲۳۳) جب محدثین کسی راوی کے بارے میں یہ کہیں کہ وہ متروک ہے یا واہی ہے یا کذاب ہے تو وہ راوی ساقط الاعتبار ہوتا ہے، اس کی روایت لکھی بھی نہیں جاسکتی۔ (تقریب النواوی ص ۲۳۳)

اس جرح کے جواب میں گزارش ہے کہ پہلے ہم امام محمد بن اسحاق کا ترجمہ (تعارف) پیش کریں گے اور روایت حدیث میں ماہرین اور ناقدین کے نزدیک جو ان کا مقام ہے وہ بیان کریں گے اور اس کے بعد کیپٹن مسعود کی نقل کردہ جرح کا جواب ذکر کریں گے۔

امام محمد بن اسحٰق بن یسار کے متعلق حافظ جمال الدین یوسف المزی المتوفی ۷۴۳ھ لکھتے ہیں:

محمد بن اسحٰق نے صحابہ میں سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی زیارت کی اور تابعین میں سے سالم بن عبداللہ بن عمر اور سعید بن المسیب کی زیارت کی، امام بخاری نے اپنی صحیح میں ان سے تعلیقاً روایت کی ہے اور امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے ان سے اصالتاً روایت کی ہے۔

زہری کہتے تھے کہ جب تک مدینہ میں محمد بن اسحٰق موجود ہیں ان کے علم کا خزانہ قائم رہے گا۔ امام شافعی فرماتے تھے کہ جو شخص مغازی میں تبحر حاصل کرنے کا ارادہ کرے گا وہ محمد بن اسحٰق کا پروردہ ہوگا۔ ابومعاویہ کہتے تھے کہ محمد بن اسحٰق کا حافظہ لوگوں میں سب سے زیادہ ہے۔ امام بخاری نے کہا علی بن عبداللہ، محمد بن اسحٰق کی احادیث سے استدلال کرتے تھے اور ابن عیینہ نے کہا میں نے کسی شخص کو محمد بن اسحٰق پر تہمت لگاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ابوزرعہ دمشقی نے کہا کہ محمد بن اسحٰق وہ شخص تھے کہ بڑے بڑے علماء ان سے علم حاصل کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے، ان میں سفیان، شعبہ، ابن عیینہ، حماد بن زید، حماد بن سلمہ، ابن المبارک، ابراہیم بن سعد تھے اور اکابر محدثین ان سے روایت کرتے تھے۔ محمد بن عبداللہ بن نمیر کہتے ہیں کہ محمد بن اسحٰق پر قدری ہونے کی تہمت لگائی جاتی تھی حالانکہ وہ قدریہ کے عقائد سے بہت دور تھے۔ یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں کہ میں نے علی بن مدینی سے سوال کیا، کیا آپ کے نزدیک محمد بن اسحٰق کی حدیث صحیح ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں میرے نزدیک محمد بن اسحٰق کی حدیث صحیح ہے۔ میں نے کہا پھر امام مالک نے جو ان پر اعتراض کیا ہے اس کی کیا توجیہ ہے؟ انہوں نے کہا امام مالک ان کے پاس بیٹھے نہ انہوں نے ان کو پہچانا۔ میں نے کہا کہ ہشام بن عروہ نے ان پر اعتراض کیا ہے (کہ محمد بن اسحٰق ہشام کی بیوی سے ایک حدیث روایت کرتے ہیں حالانکہ انہوں نے اس کو نہیں دیکھا) علی بن مدینی نے کہا کہ ہشام حجت نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ محمد بن اسحٰق نے بچپن میں ان کی بیوی سے حدیث کا سماع کیا ہو۔ ابوبکر مروزی کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل سے پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک موسیٰ بن عبیدہ اور محمد بن اسحٰق میں سے کون پسندیدہ ہے؟ انہوں نے کہا محمد بن اسحٰق۔ محمد بن عثمان بن ابی شیبہ کہتے ہیں کہ علی بن مدینی نے کہا کہ محمد بن اسحٰق صالح وسط ہیں۔ یعقوب بن شیبہ السدوسی کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن معین سے پوچھا کیا آپ کو محمد بن اسحٰق کے صدق کے متعلق کوئی تردد ہے؟ انہوں نے کہا نہیں، وہ صدوق (بہت زیادہ سچے) ہیں۔ عجلی نے

کہا وہ ثقہ ہیں۔ شعبہ کہتے تھے کہ محمد بن اسحٰق حدیث میں امیر المومنین ہیں۔ محمد بن سعد نے کہا کہ محمد بن اسحٰق ثقہ ہیں۔ بعض لوگوں نے ان پر اعتراض کیا ہے، ایک اور مقام پر کہا جس شخص نے سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی کو جمع کیا وہ محمد بن اسحٰق ہیں (واضح رہے کہ سیرت اور مغازی کی تمام روایات کی اصل محمد بن اسحٰق ہیں) ابو احمد بن عدی نے کہا کہ محمد بن اسحٰق کی فضیلت کے لیے یہ کافی ہے کہ انہوں نے سلاطین کو فضول کتابوں کے مطالعہ سے ہٹا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی کی طرف متوجہ کر دیا اور بعد کے تمام سیرت نگاروں نے ان ہی سے استفادہ کیا ہے۔ احمد بن خالد نے کہا کہ ۱۵۱ ہجری میں محمد بن اسحٰق کی وفات ہوئی۔

(تہذیب الکمال رقم: ۵۶۴۴، ج۱۶ ص ۸۳-۷۰، ملخصًا، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ، تہذیب التہذیب رقم: ۵۹۶۰، ج۹ ص ۳۸-۳۳، ملخصاً، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام محمد بن اسحٰق کو کاذب کہنے کا جواب

امام محمد بن اسحٰق کو جس وجہ سے کذاب اور مدلس کہا گیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے:

ابو احمد عبداللہ بن عدی الجرجانی المتوفی ۳۶۵ھ لکھتے ہیں:

سلیمان بن داؤد کہتے ہیں کہ مجھ سے یحییٰ بن سعید القطان نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد بن اسحٰق کذاب ہے۔ میں نے کہا آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ انہوں نے کہا کہ مجھ سے وہیب بن خالد نے کہا کہ وہ کذاب ہے۔ انہوں نے کہا میں نے وہیب سے پوچھا، آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ انہوں نے کہا مجھ سے مالک بن انس نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ کذاب ہے۔ میں نے مالک سے پوچھا آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ انہوں نے کہا مجھ سے ہشام بن عروہ نے کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ وہ کذاب ہے۔ میں نے ہشام سے پوچھا تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ انہوں نے کہا وہ میری بیوی فاطمہ بنت المنذر سے ایک حدیث روایت کرتا ہے، حالانکہ وہ نو سال کی عمر میں میرے پاس رخصتی کے بعد آئی تھی، اور اس کو تاحیات کسی مرد نے نہیں دیکھا۔

(الکامل فی ضعفاء الرجال ج۶ ص۲۱۱۷، الضعفاء الکبیر ج۴ ص۲۵، المنتظم ج۵ ص۲۰۹، تہذیب الکمال ج۱۶ ص۷۵، تہذیب التہذیب ج۹ ص۳۴، میزان الاعتدال ج۶ ص۵۸-۵۷، کتاب الجرح والتعدیل ج۷ ص۱۹۳-۱۹۲)

ان ہی کتابوں میں اس اعتراض کا جواب بھی مذکور ہے، امام ابن عدی لکھتے ہیں:

امام احمد نے فرمایا: امام محمد بن اسحٰق کے لیے یہ ممکن تھا کہ جس وقت ہشام کی بیوی فاطمہ مسجد میں جا رہی ہو، اس وقت انہوں نے اس سے اس حدیث کو سن لیا ہو یا کسی وقت وہ گھر سے جا رہی ہو تو ان سے سن لیا ہو۔ (الکامل فی ضعفاء الرجال ج۶ ص۲۱۲۰) علامہ ذہبی نے کہا کہ امام احمد نے فرمایا ممکن ہے کہ محمد بن اسحٰق نے ان سے مسجد میں یہ حدیث سنی ہو، یا انہوں نے بچپن میں ان سے یہ حدیث سنی ہو یا انہوں نے پردہ کی اوٹ سے یہ حدیث بیان کی ہو، اور اس میں کیا چیز مانع ہے حالانکہ وہ بوڑھی اور عمر رسیدہ ہو چکی تھیں۔ (میزان الاعتدال ج۶ ص۵۸) علامہ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ امام احمد نے فرمایا ہو سکتا ہے کہ امام محمد بن اسحٰق ہشام کی بیوی کے پاس گئے ہوں اور ہشام کو اس کی خبر نہ ہوئی ہو۔ (المنتظم ج۵ ص۲۰۹) حافظ مزی لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن احمد نے کہا میں نے اپنے والد کے سامنے ابن اسحٰق کی ایک حدیث بیان کی تو انہوں نے کہا ہشام نے اس کا انکار نہیں کیا، ہو سکتا ہے کہ محمد بن اسحٰق ہشام کی بیوی سے اجازت لے کر گئے ہوں اور انہوں نے اجازت دے دی ہو اور ہشام کو اس کا علم نہ ہوا ہو۔ (تہذیب الکمال ج۱۶ ص۷۵، ایضاً تہذیب التہذیب ج۹ ص۳۵) نیز حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: امام محمد بن اسحٰق کو سلیمان التیمی، یحییٰ قطان اور وہیب بن خالد نے کاذب کہا ہے، رہے وہیب اور قطان تو انہوں نے اس تکذیب میں ہشام بن

عروہ اور مالک کی تقلید کی ہے اور رہے سلیمان التیمی تو مجھے نہیں معلوم انہوں نے کس وجہ سے محمد بن اسحٰق پر اعتراض کیا ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ روایت حدیث کے علاوہ اس کا کوئی اور سبب ہے، کیونکہ سلیمان جرح اور تعدیل کے اہل نہیں ہیں، امام ابن حبان نے محمد بن اسحٰق کا ثقات میں ذکر کیا ہے، ہشام اور مالک نے ان پر جرح کی ہے، رہے ہشام تو ان کا قول لائق جرح نہیں ہے، کیونکہ تابعین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیکھے بغیران سے حدیث روایت کرتے تھے، اسی طرح محمد بن اسحٰق نے فاطمہ کو دیکھے بغیران سے حدیث روایت کی اور ان کے درمیان پردہ لٹکا ہوا تھا اور رہے مالک تو انہوں نے ایک مرتبہ یہ کہا اور پھر وہ ان کی طرف پلٹ گئے۔ وہ روایت حدیث کی وجہ سے ان پر اعتراض نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہودیوں کی جو اولاد مسلمان ہوگئی تھی اور ان کو غزوۂ خیبر وغیرہ کے واقعات یاد تھے، محمد بن اسحٰق ان کو بھی تلاش کرتے تھے ہرچند کہ ان سے وہ استدلال نہیں کرتے تھے اور امام مالک کے نزدیک ان ہی سے روایت حدیث جائز تھی جو بہت ثقہ ہوں، اور جب امام ابن المبارک سے ان کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے تین مرتبہ کہا وہ بہت سچے ہیں اور امام ابن حبان نے کہا مدینہ میں محمد بن اسحٰق کے پائے کا کوئی عالم نہیں تھا اور نہ روایات کو جمع کرنے میں کوئی شخص ان کی نکر کا تھا (الی قولہ) امام ذہبی نے ہشام کی تکذیب کا رد کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ہشام کا یہ کہنا بداہتاً غلط ہے کہ فاطمہ نو سال کی عمر میں اس کے نکاح میں آئی کیونکہ فاطمہ، ہشام سے تیرہ سال بڑی تھی، اور امام ابن اسحٰق نے فاطمہ سے اس وقت حدیث کی روایت کی ہے جب ان کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی اور فاطمہ سے امام محمد بن اسحٰق کے علاوہ دوسروں نے بھی حدیث روایت کی ہے، ان میں سے محمد بن سوقہ ہیں۔

(تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸ - ۳۷)

عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ پر جرح کا جواب

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی حدیث کے ایک اور راوی پر جرح کرتے ہوئے کیپٹن مسعود لکھتے ہیں:

دوسرے راوی عمرو بن شعیب جو محمد بن اسحٰق کے استاذ ہیں ان کا معاملہ بھی اپنے شاگرد سے مختلف نہیں۔ ابوداؤد کہتے ہیں کہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ لیس بحجۃ عمرو بن شعیب کی روایت اپنے باپ سے اور ان کی اپنے دادا سے حجت نہیں ہے اور اس روایت میں ایسا ہی ہے اور دوسری روایت میں یہ ہے کہ وہ آدھی حجت بھی نہیں ہے۔ یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ عمرو بن شعیب ہمارے نزدیک واہی ہے۔ امام احمد کہتے ہیں کہ عمرو بن شعیب کی روایت حجت نہیں ہے۔ (تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۵۰-۴۹) ابو زرعہ کہتے ہیں کہ عمرو نے اپنے باپ سے صرف چند روایتیں سنی ہیں لیکن وہ باپ اور دادا سے منسوب کر کے تمام غیر مسموع روایتیں بے تحاشا بیان کرتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۸۹) ابن حجر کہتے ہیں کہ انہوں نے عن ابیہ عن جدہ کے طریقہ سے کچھ بھی نہیں سنا وہ کتاب سے نقل کر کے محض تدلیس سے کام لیتے ہیں۔

(طبقات المدلسین ص ۱۱)

یہ درست ہے کہ بعض لوگوں نے عمرو بن شعیب پر جرح کی ہے، لیکن ماہرین حدیث نے عمرو بن شعیب کی تعدیل کی ہے۔

حافظ جمال الدین ابی الحجاج یوسف المزی المتوفی ۷۴۲ھ لکھتے ہیں:

عمرو بن شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو بن العاص القرشی، ان سے امام بخاری نے قراءت خلف الامام میں احادیث روایت کی ہیں، اور امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ان سے احادیث روایت کی ہیں۔ امام بخاری نے کہا امام احمد بن حنبل، علی بن المدینی، اسحٰق بن راہویہ، ابوعبید اور ہمارے عام اصحاب کو میں نے عمرو بن شعیب عن

ابیہ عن جدہ سے احادیث روایت کرتے ہوئے دیکھا ہے اور مسلمانوں میں سے کسی شخص نے بھی ان سے روایت حدیث کو ترک نہیں کیا۔ امام بخاری نے فرمایا ان کے بعد اور کون رہ جاتا ہے؟ اسحٰق بن منصور نے یحییٰ بن معین سے روایت کیا کہ ان کی احادیث لکھی جاتی ہیں، عبدالرحمن بن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میرے والد سے سوال کیا گیا کہ آپ کے نزدیک کون بہتر ہے، عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ یا ابو بہز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ؟ تو انہوں نے کہا میرے نزدیک عمرو زیادہ بہتر ہیں' احمد بن عبداللہ العجلی اور امام نسائی نے کہا وہ ثقہ ہیں' امام اوزاعی نے کہا میں نے عمرو بن شعیب سے افضل اور کامل کوئی شخص نہیں دیکھا' امام دار قطنی نے کہا میں نے ابو بکر النقاش سے یہ سنا ہے کہ عمرو بن شعیب تابعین میں سے نہیں ہیں' اور وہ بیس تابعین سے احادیث روایت کرتے ہیں۔ امام دار قطنی نے کہا جب میں نے تحقیق کی تو ان کی تعداد بیس سے زیادہ ہے۔ (حافظ مزی کہتے ہیں کہ:) امام دار قطنی کا بھی یہ گمان ہے کہ عمرو بن شعیب تابعی نہیں ہیں' لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ انہوں نے زینب بنت ابی سلمہ اور الربیع بنت معوذ بن عفراء سے حدیث کا سماع کیا ہے اور وہ صحابیہ ہیں۔ ان کی وفات ۱۱۸ھ میں ہوئی تھی۔

(تہذیب الکمال رقم: ۴۹۶۹' ج ۱۴ ص ۲۴۹۔ ۲۴۴' ملخصاً و ملتقطاً' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۴ھ)

حافظ شہاب الدین بن احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

ابن شاہین نے کہا عمرو بن شعیب ثقات میں سے ہیں۔ احمد بن صالح نے کہا عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند ثابت ہے۔ یعقوب بن ابی شیبہ نے کہا ہمارے اصحاب میں سے کوئی شخص عمرو بن شعیب کی احادیث پر تنقید نہیں کرتا' ان کے نزدیک عمرو بن شعیب ثقہ ہیں اور ان کی احادیث ثابت ہیں' اور عمرو بن شعیب کی جن احادیث کا لوگوں نے انکار کیا ہے اس کی وجہ ان کی احادیث کی اسانید میں بعد کے ضعیف راوی ہیں اور جن ثقہ راویوں نے ان سے احادیث کو روایت کیا ہے وہ احادیث صحیح ہیں۔ علی بن مدینی نے کہا شعیب کے والد نے ان کے دادا عبداللہ بن عمرو سے سماع کیا ہے اور علی بن مدینی نے کہا ہمارے نزدیک عمرو بن شعیب ثقہ ہیں اور ان کی کتاب صحیح ہے۔

(تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۵' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۵ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ عمرو بن شعیب کے متعلق اپنی رائے لکھتے ہیں کہ وہ صدوق ہیں یعنی بہت زیادہ سچے ہیں۔ (تقریب التہذیب ج ۱ ص ۷۳۷' دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۳ھ)

حافظ شمس الدین محمد بن احمد الذہبی المتوفی ۷۴۸ھ نے عمرو بن شعیب کی تعدیل کے متعلق بہت اقوال لکھے ہیں' ہم ان میں سے چند نقل کر رہے ہیں۔

ابو حاتم بیان کرتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن معین سے عمرو بن شعیب کے متعلق سوال کیا تو وہ بہت ناراض ہوئے اور کہا میں ان کے خلاف کچھ کہہ سکتا ہوں جن سے ائمہ نے حدیث کو روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے امام بخاری کی تاریخ کبیر (ج ۶ ص ۳۴۲) سے یہ نقل کیا ہے کہ امام احمد' علی بن مدینی' اسحٰق' اور حمیدی' میں نے ان سب کو عمرو بن شعیب سے احادیث روایت کرتے ہوئے دیکھا' پھر ان کے بعد کے لوگوں کی کیا حیثیت ہے۔ امام ابو زرعہ نے کہا ان کی روایات میں وہ احادیث منکر ہیں جو مثنی بن الصباح اور ابن لہیعہ سے مروی ہیں اور وہ فی نفسہ ثقہ ہیں۔ ابو حاتم بن حبان نے کہا کہ عمرو بن شعیب کے متعلق صحیح یہ ہے کہ ان کو تاریخ ثقات کی طرف راجع کیا جائے' کیونکہ ان کی عدالت (نیکی اور پرہیزگاری) کا بیان ہو چکا ہے' اور ان کی احادیث میں جو منکر روایات ہیں تو ان میں جو روایات عن ابیہ عن جدہ ہیں ان کا حکم ثقات کا ہے' جب وہ مقاطیع اور مراسیل روایات کریں تو ان کی احادیث میں سے مقطوع اور مرسل کو چھوڑ دیا جائے اور حدیث صحیح سے استدلال کیا جائے' (حافظ ذہبی

فرماتے ہیں:) میں کہتا ہوں کہ عمرو بن شعیب کی اپنے باپ اور دادا سے جو روایات ہیں ان میں کوئی روایت مرسل ہے نہ منقطع، رہا یہ کہ وہ بعض احادیث کتاب سے بیان کرتے ہیں اور بعض سن کر تو یہ محل نظر ہے اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ان کی احادیث، حدیث صحیح کی اعلیٰ اقسام میں سے ہیں بلکہ ان کی حدیث حسن کے قبیل سے ہے۔

(میزان الاعتدال ج ۵ ص ۳۲۳-۳۲۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۶ھ)

عمرو بن شعیب کی اس روایت سے استدلال کرنے والے علماء

عمرو بن شعیب کی اس روایت سے حسب ذیل علماء نے استدلال کیا ہے:

حافظ ابن قیم جوزی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: اس بیماری (خواب میں ڈرنے) کے لیے اس تعویذ کے علاج کی مناسبت مخفی نہیں ہے۔ (زاد المعاد ج ۴ ص ۱۶۸-۱۶۷، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۹ھ)

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ نے بھی اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۸۷، بیروت، ج ۱ ص ۷۵، مصر)

حافظ ذہبی متوفی ۷۴۸ھ نے بھی اس حدیث سے تعویذ لٹکانے پر استدلال کیا ہے۔

(الطب النبوی ص ۲۸۱، مطبوعہ بیروت، ۱۴۰۶ھ)

حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ، علامہ آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ، شیخ شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ اور نواب بھوپالی متوفی ۱۳۰۷ھ نے بھی اس حدیث سے شیطان سے پناہ مانگنے پر استدلال کیا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۸۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۹ھ، فتح القدیر ج ۳ ص ۶۷۷-۶۷۶، مطبوعہ دار الوفا بیروت، ۱۴۱۸ھ، فتح البیان ج ۹ ص ۱۴۸، المکتبۃ العصریہ بیروت، ۱۴۱۵ھ)

ان کے علاوہ اور بھی مفسرین نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جن کو ہم نے اختصار کی وجہ سے ترک کر دیا۔

محدثین میں سے ملا علی قاری متوفی ۱۰۱۴ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

جن تعویذات میں اللہ تعالیٰ کے اسماء ہوں ان کو لٹکانے کے لیے یہ حدیث اصل ہے۔

(مرقات ج ۵ ص ۲۳۶، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، ۱۳۹۰ھ)

شیخ عبد الحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

حدیث میں مذکور کلمات کو ایک کاغذ پر لکھ کر گردن میں لٹکالیا جائے، اس حدیث سے گردن میں تعویذات لٹکانے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ اس باب میں علماء کا اختلاف ہے، مختار یہ ہے کہ سیپیوں اور اس کی مثل چیزوں کا لٹکانا حرام یا مکروہ ہے، لیکن اگر تعویذات میں قرآن مجید یا اللہ تعالیٰ کے اسماء لکھے جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(اشعۃ اللمعات ج ۲ ص ۲۹۰، مطبوعہ مطبع تیج کمار لکھنؤ)

شیخ عبد الرحمٰن مبارک پوری متوفی ۱۳۵۲ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

شیخ عبد الحق دہلوی نے لمعات میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں بچوں کے گلوں میں تعویذات لٹکانے کی دلیل ہے، لیکن رسوم جاہلیت کے مطابق حرز اور کوڑیوں کو لٹکانا بالاتفاق حرام ہے۔

(تحفۃ الاحوذی ج ۴ ص ۴۷۵، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۹ھ)

ان تمام دلائل سے واضح ہوگیا کہ از محمد بن اسحٰق از عمرو بن شعیب از والد از جد یہ روایت صحیح یا حسن ہے اور اس سے اہل علم نے استدلال کیا ہے تاہم اس سند سے اس روایت کو پھر بھی کوئی تسلیم نہ کرے تو ہم اس روایت کو ایک اور سند سے

پیش کر رہے ہیں، جس میں امام محمد بن اسحٰق نہیں ہیں۔

امام ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

احمد بن خالد از محمد بن اسمٰعیل از عمرو بن شعیب از والد از جد خود وہ کہتے ہیں کہ ولید بن ولید ایسے شخص تھے جو خواب میں ڈر جاتے تھے، تو ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم سونے لگو تو یہ پڑھو: بسم اللہ اعوذ بکلمات اللہ التامة من غضبه وعقابه ومن شر عباده ومن همزات الشيطان وان يحضرون' جب انہوں نے یہ کلمات پڑھے تو ان کا ڈر جاتا رہا، اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما اپنے بالغ بچوں کو یہ کلمات سکھاتے تھے اور نابالغ بچوں کے گلوں میں یہ تعویذ لکھ کر لٹکا دیتے تھے۔ (خلق افعال العباد ص ۸۹، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۱۱ھ)

بعض تابعین کے اقوال کی توجیہ

نیز کیپٹن مسعود لکھتے ہیں: پانچویں علت یہ ہے کہ کسی صحابی، کسی تابعی نے تمیمہ کو جائز قرار نہیں دیا، یہ جو کہا جاتا ہے کہ بعض صحابہ بھی ان تعویذوں کو جائز سمجھتے تھے جن میں قرآن یا اسماء اللہ تعالیٰ یا اللہ کی صفات لکھی ہوئی ہوتی تھیں صحیح نہیں ہے۔ (الیٰ قولہ) وکیع، سعید بن جبیر سے روایت کرتے ہیں کہ جس شخص نے کسی انسان کی گردن سے تمیمہ کو کاٹ دیا اس کو ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ملے گا۔ (تعویذ گنڈا شرک ہے ص ۷)

سعید بن جبیر کے اس قول میں تمیمہ سے مراد رسم جاہلیت کے مطابق کوڑیاں ہیں یا وہ تعویذات جن میں قرآن مجید اور اسماء الٰہیہ کے علاوہ کچھ لکھا ہو یا غیر عربی میں لکھا ہو، باقی اسی صفحہ پر ابراہیم نخعی کا جو یہ قول نقل کیا ہے کہ ہر قسم کے تمائم مکروہ ہیں خواہ قرآن سے لکھے جائیں یا غیر قرآن سے، یہ بلا حوالہ لکھا ہے، سو یہ ہم پر حجت نہیں ہے خصوصاً جب کہ یہ احادیث صحیحہ اور بکثرت آثار تابعین اور متعدد مفسرین کی عبارات اور فقہاء کی تصریحات کے خلاف ہے۔

تعویذ لٹکانے کے جواز کے متعلق فقہاء تابعین کے فتاویٰ

ابو عصمہ کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن مسیب سے تعویذ کے متعلق پوچھا انہوں نے کہا جب اس کو گردن میں لٹکا لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۲۳۵۳۳)

عطا سے اس حائض عورت کے متعلق سوال کیا گیا جس پر تعویذ ہو، انہوں نے کہا اگر وہ چمڑے میں ہو تو وہ اس کو اتار لے اور اگر وہ چاندی کی نلکی (یا ڈبیا) میں ہو تو اگر چاہے تو وہ اس کو رکھ دے اور اگر چاہے تو نہ رکھے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۲۳۵۳۴)

یونس بن خباب بیان کرتے ہیں کہ بچوں کے گلوں میں جو تعویذ لٹکائے جاتے ہیں ان کے متعلق میں نے ابو جعفر سے پوچھا تو انہوں نے مجھے اس کی رخصت دی۔ (مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۲۳۵۴۱)

جو یبر بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کتاب اللہ سے لکھ کر تعویذ لٹکائے اور غسل کے وقت اور بیت الخلاء کے وقت اس کو اتار دے تو تعویذ لٹکانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۲۳۵۴۳) (اگر تعویذ چمڑے میں منڈھا ہوا ہو یا چاندی کی ڈبیا میں ہو تو پھر ان احوال اور اوقات میں اتارنا ضروری نہیں ہے۔)

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۵ ص ۴۳ ـ ۴۲، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۶ھ)

دم اور تعویذ کے جواز کے متعلق علامہ شامی حنفی کی تصریح

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

علامہ حصکفی نے کہا ہے کہ مجتبیٰ میں یہ مذکور ہے کہ وہ تمیمہ مکروہ ہے جو غیر عربی میں ہو، میں کہتا ہوں کہ میں نے مجتبیٰ میں یہ لکھا ہوا دیکھا ہے کہ وہ تمیمہ مکروہ ہے جو غیر قرآن ہو، اور ایک قول یہ ہے کہ تمیمہ وہ کوڑیاں ہیں جن کو زمانہ جاہلیت میں گلے میں لٹکاتے تھے، اور مغرب میں مذکور ہے کہ تعویذات ہی تمائم ہیں، اس طرح نہیں ہے، تمیمہ صرف کوڑیاں ہیں، اور تعویذات میں جب قرآن مجید یا اللہ تعالیٰ کے اسماء لکھے جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے الی قولہ، شلبی میں ابن اثیر سے منقول ہے کہ تمائم تمیمہ کی جمع ہے اور یہ وہ سیپیاں یا کوڑیاں ہیں جن کو عرب اپنے بچوں کے گلے میں ڈال دیتے تھے، اس سے وہ اپنے زعم میں ان کو نظر بد سے بچاتے تھے، اسلام نے اس کو باطل کر دیا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے: جس نے تمیمہ کو لٹکایا اللہ اس کے مقصود کو پورا نہ کرے، کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ یہی مکمل دوا اور شفا ہے، بلکہ انہوں نے اس کو اللہ کا شریک بنا دیا، کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ کی لکھی ہوئی تقدیر اس سے ٹل جاتی ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کے غیر سے مصائب کے دور کرنے کو طلب کرتے تھے حالانکہ اللہ کے سوا ان کا کوئی دور کرنے والا نہیں ہے۔ مجتبیٰ میں مذکور ہے کہ قرآن مجید سے شفا حاصل کرنے میں اختلاف ہے بایں طور کہ مریض پر یا سانپ سے ڈسے ہوئے پر قرآن مجید یا سورہ فاتحہ پڑھی جائے یا کسی کاغذ میں لکھ کر اس کے گلے میں لٹکا دیا جائے یا کسی طشت میں لکھ کر اس کو دھویا جائے اور اس کا غسالہ (دھوون) مریض کو پلا دیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ معوذات پڑھ کر اپنے اوپر دم کرتے تھے اور اس زمانہ میں مسلمانوں کا عمل اس کے جواز پر ہے، اسی کے مطابق احادیث اور آثار ہیں اور اگر جنبی یا حائض کے بازو پر تعویذ بندھا ہوا ہو اور وہ کسی چیز میں لپٹا ہوا ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

(ردالمحتار ج ۵ ص ۲۳۲، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۱۷ھ، و ردالمحتار ج ۵ ص ۲۵۷-۲۵۶، دار الکتب العربیہ مصر ۱۳۲۷ھ، مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ، ردالمحتار ج ۹ ص ۴۴۳، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۹ھ، طبع جدید)

شیخ محمد زکریا انصاری (دیوبندی) سہارنپوری نے بھی علامہ شامی کی اس عبارت کو نقل کر کے اس سے استشہاد کیا ہے۔

(اوجز المسالک ج ۶ ص ۳۰۳-۳۰۲، مطبوعہ المکتبۃ الیحیویہ، سہارنپور، یوپی۔ انڈیا)

دم اور تعویذ کے جواز کے متعلق مشہور دیوبندی عالم شیخ محمد زکریا سہارنپوری کی تصریح

مکتب فکر دیوبند کے مشہور عالم شیخ محمد زکریا سہارنپوری لکھتے ہیں:

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ جھاڑ پھونک، تمائم اور تولہ شرک ہیں۔ تمائم کا معنی سیپیاں، گھونگے اور کوڑیاں ہیں یا ان کا ہار۔ (دوسرے علماء اور فقہاء نے تعویذات کو بھی تمائم کا مصداق قرار دیا ہے، سعیدی غفرلہ) ان کو شرک اس لیے فرمایا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مشرکین ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی اعانت کے بغیر حصول نفع اور دفع ضرر کے سبب ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے، اس حکم میں وہ دم اور تعویذات داخل نہیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کے کلام پر مشتمل ہوں، اور کسی بلا اور مصیبت کے نازل ہونے سے پہلے بھی ان کا استعمال کرنا جائز ہے، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بستر پر لیٹتے تو تین مرتبہ معوذات (الاخلاص، الفلق، الناس) پڑھ کر اپنے اوپر دم فرماتے اور پھر اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرتے اور جسم پر جہاں تک آپ کے ہاتھ پہنچتے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۷۴۸) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما پر یہ کلمات پڑھ کر دم کرتے تھے: اعوذ بکلمات اللہ التامۃ من کل شیطان وھامۃ ومن کل عین لامۃ۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۷۱)

(اوجز المسالک ج ۶ ص ۳۰۲، مطبوعہ المکتبۃ الیحیویہ، سہارنپور، یوپی۔ انڈیا)

امام بغوی اور امام بیہقی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر مصیبت نازل ہونے کے بعد تعویذ لٹکایا جائے تو وہ تمیمہ نہیں ہے اور اگر بلا اور مصیبت نازل ہونے سے پہلے تعویذ لٹکایا جائے تو وہ تمیمہ ہے تاکہ اس تعویذ سے اللہ کی تقدیر کو دفع اور مسترد کیا جائے۔ (شرح السنہ ج ۱۲ ص ۱۵۸، سنن کبریٰ ج ۹ ص ۳۵۰) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول بلا سے پہلے دم فرمایا ہے، اور آپ کا یہ دم فرمانا اللہ کی تقدیر کو حاصل کرنے کے لیے تھا نہ کہ اللہ کی تقدیر کو دفع کرنے کے لیے، اس لیے یہ احادیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کے خلاف نہیں ہیں۔

دم اور تعویذ کے جواز کے متعلق مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن خاں بھوپالی کی تصریح

مشہور غیر مقلد عالم شیخ محمد عبدالرحمٰن مبارک پوری متوفی ۱۳۵۳ھ لکھتے ہیں:

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی نے اپنی کتاب "الدین الخالص" میں لکھا ہے کہ جن تعویذات میں قرآن مجید کی آیات یا اللہ تعالیٰ کے اسماء لکھے ہوں ان کو لٹکانے کے جواز میں صحابہ کرام، تابعین اور بعد کے علماء کا اختلاف رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ظاہر روایت میں اس کا جواز ہے، امام ابو جعفر باقر اور امام احمد وغیرہ نے حضرت ابن مسعود کی اس روایت میں توجیہ کی ہے کہ جھاڑ پھونک، تمائم، (تعویذات) اور تولہ (خاوند کے دل میں بیوی کی محبت کا عمل) شرک ہیں، انہوں نے کہا یہ ان تعویذات پر محمول ہے جس میں شرکیہ کلمات ہوں، اور حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت حذیفہ، حضرت عقبہ بن عامر اور ابن حکیم کے ظاہر اقوال میں عدم جواز ہے۔ (میں کہتا ہوں کہ ان اقوال میں بھی حسب سابق توجیہ کی جائے گی اور ممانعت کو ان تعویذات پر محمول کیا جائے گا جن میں شرکیہ کلمات ہوں، سعیدی غفرلہ) بعض علماء نے ممانعت کو تین وجوہ سے ترجیح دی ہے اول اس لیے کہ ممانعت میں عموم ہے اور ممانعت کا کوئی مخصص نہیں ہے۔ (میں کہتا ہوں کہ جن احادیث میں جواز کی تصریح ہے وہ مخصص ہیں، سعیدی غفرلہ) ثانیاً شرک کے ذرائع کا سدباب کرنے کے لیے۔ (میں کہتا ہوں کہ شرکیہ کلمات کا تمائم میں لکھنا صرف زمانہ جاہلیت میں تھا، کیا شرک کے ذرائع کا سدباب کرنے کے لیے دم کرنے اور دوا دارو کرنے کی بھی ممانعت کی جائے گی کیونکہ حضرت ابن مسعود کی روایت میں دم کرنے کو بھی شرک فرمایا ہے، سعیدی غفرلہ) اور تیسری وجہ یہ ہے کہ جو شخص تعویذ لٹکاتا ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ تعویذ کو قضاء حاجت اور استنجاء کرتے وقت نہ اتارے، نواب بھوپالی نے اس وجہ کا رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ وجہ بہت کمزور ہے کیونکہ اس سے کیا چیز مانع ہے کہ وہ شخص قضاء حاجت کے وقت تعویذ اتار لے اور فارغ ہو کر پھر پہن لے۔ پھر نواب بھوپالی نے لکھا ہے کہ اس باب میں راجح یہ ہے کہ تعویذ لٹکانا خلاف اولیٰ ہے کیونکہ جس طرح تقویٰ کے کئی مراتب ہیں اسی طرح اخلاص کے بھی کئی مراتب ہیں۔ (یوں کہنا چاہیے کہ توکل کے بھی کئی مراتب ہیں، سعیدی غفرلہ) حدیث میں ہے: ستر ہزار مسلمان جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے، یہ وہ ہیں جو نہ خود دم کرتے ہوں گے، نہ دم طلب کرتے ہوں گے۔ حالانکہ دم کرنا جائز ہے اور اس سلسلہ میں بہت احادیث اور آثار ہیں (لیکن یہ توکل کا اعلیٰ مرتبہ ہے، اسی طرح تعویذ نہ لٹکانا بھی توکل کا اعلیٰ مرتبہ ہے، سعیدی غفرلہ) واللہ اعلم بالصواب، یہاں پر نواب بھوپالی کی عبارت ختم ہو گئی۔

(تحفۃ الاحوذی ج ۶ ص ۲۳۲-۲۳۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۹ھ)

اس بحث کے اخیر میں ہم حافظ ذہبی اور حافظ ابن قیم کے ذکر کیے ہوئے چند تعویذات کا بیان کر رہے ہیں۔

تعویذ لٹکانے کے جواز کے متعلق علامہ ذہبی کی تصریح اور خواب میں ڈرنے کا تعویذ

حافظ ابو عبداللہ محمد بن احمد الذہبی المتوفی ۷۴۸ھ لکھتے ہیں:

تمائم (تعویذات) لٹکانے کے متعلق امام احمد نے یہ تصریح کی ہے کہ یہ مکروہ ہے اور کہا جس نے کسی چیز کو لٹکایا وہ اسی کے سپرد کر دیا جائے گا۔ حرب نے کہا میں نے امام احمد سے پوچھا جن تعاویذ میں قرآن مجید لکھا ہوا ہو یا اس کا غیر لکھا ہوا ہو آیا وہ مکروہ ہیں؟ انہوں نے کہا کہ حضرت ابن مسعود اس کو مکروہ کہتے تھے، امام احمد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر سے روایت کیا ہے کہ وہ اس میں نرمی کرتے تھے اور شدت نہیں کرتے تھے اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص خواب میں ڈر جائے تو وہ یہ پڑھے:

اعوذ بكلمات الله التامة من غضبه وعقابه وشر عباده ومن همزات الشيطن وان يحضرون۔

میں اللہ کے غضب سے اس کے عقاب سے اس کے بندوں کے شر سے اور شیطان کے وسوسوں اور ان کے حاضر ہونے سے اللہ کے کلمات تامہ کی پناہ میں آتا ہوں۔

تو پھر شیاطین اس کو ضرر نہیں پہنچا سکیں گے اور حضرت عبداللہ بن عمرو اپنے بالغ بچوں کو ان کلمات کی تعلیم دیتے تھے اور نابالغ بچوں کے گلے میں ایک کاغذ پر یہ کلمات لکھ کر لٹکا دیتے تھے، اس حدیث کو امام ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے اور امام النسائی نے اس حدیث کو عمل الیوم واللیلۃ میں روایت کیا ہے، اور اس کے مکروہ یا غیر مکروہ ہونے کا حکم اس وقت ہے جب کسی شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ تعویذ بنفسہ نفع یا ضرر پہنچاتا ہے، یا اس میں ایسے کلمات ہوں جن کا معنی معلوم نہ ہو۔ (الطب النبوی ص ۲۸۱، دار احیاء العلوم، بیروت، ۱۴۰٦ھ)

تعویذ لٹکانے کے متعلق علامہ ابن قیم جوزی کی تصریحات اور بخار کا تعویذ

علامہ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر المعروف بابن القیم جوزی المتوفی ۷۹۱ھ لکھتے ہیں:

ابو عبداللہ کو یہ خبر پہنچی کہ مجھے بخار چڑھ گیا تو انہوں نے مجھے بخار کے لیے ایک کاغذ لکھ کر بھیجا جس میں یہ لکھا ہوا تھا:

بسم الله الرحمن الرحيم، بسم الله وبالله، محمد رسول الله قلنا ينار كوني بردا وسلاما على ابراهيم ○ وارادوا به كيدا فجعلنا هم الاخسرين (الانبیاء: ۷۰-٦۹) اللهم رب جبرائيل وميكائيل، واسرافيل، اشف صاحب هذا الكتاب بحولك وقوتك وجبروتك اله الحق وامين۔

مروزی نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا کہ یونس بن حبان نے ابو جعفر محمد بن علی سے پوچھا کہ آیا میں تعویذ لٹکاؤں؟ انہوں نے کہا اگر وہ تعویذ اللہ کی کتاب سے ہو یا اللہ کے نبی کے کلام سے ہو تو اس کو لٹکا لو، اور حسب استطاعت اس سے شفا طلب کرو، میں نے کہا میں بخار کا تعویذ اس طرح لکھتا ہوں باسم الله وبالله ومحمد رسول الله الخ، انہوں نے کہا درست ہے۔ امام احمد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا او ر دیگر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اس معاملہ میں نرمی کی ہے۔

حرب نے کہا امام احمد بن حنبل نے اس معاملہ میں سختی نہیں کی، امام احمد نے کہا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس معاملہ میں بہت سختی کرتے تھے، اور ان سے ان تعویذات کے متعلق سوال کیا گیا جو مصائب نازل ہونے کے بعد لٹکائے جاتے ہیں تو انہوں نے کہا مجھے امید ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔

خلال نے کہا ہم سے عبداللہ بن (امام) احمد نے بیان کیا ہے کہ میں نے اپنے والد (امام احمد) کو مصائب نازل ہونے کے بعد ان لوگوں کے لیے تعویذ لکھتے ہوئے دیکھا ہے جو ڈر جاتے تھے اور جن کو بخار چڑھ جاتا تھا۔ (زاد المعاد ج ۴ ص ۲۹۱، دار الفکر بیروت)

وضع حمل میں تنگی اور مشکل کے متعلق تعویذ

شیخ ابن قیم جوزی متوفی ۷۵۱ھ لکھتے ہیں:

خلال بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے عبداللہ بن (امام) احمد نے بیان کیا ہے کہ میں نے اپنے والد (امام احمد) کو اس عورت کے لیے تعویذ لکھتے ہوئے دیکھا جس کو وضع حمل میں تنگی اور مشکل پیش آ رہی ہو' وہ یہ تعویذ سفید پیالے میں یا کسی صاف چیز پر لکھتے تھے' وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث لکھتے ہیں: لا الہ الا اللہ الحلیم الکریم سبحان اللہ رب العرش العظیم' الحمد للہ رب العلمین (کانھم یوم یرون ما یوعدون لم یلبثوا الا ساعۃ من نھار بلاغ) (الاحقاف: ۳۵) (کانھم یوم یرونھا لم یلبثوا الا عشیۃ او ضحاھا) (النازعات: ۴۶)

خلال نے کہا کہ ہم سے ابوبکر المروزی نے بیان کیا کہ ابو عبداللہ (امام احمد) کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا اے ابو عبداللہ! کیا آپ اس عورت کے لیے تعویذ لکھ دیں گے جس کو دو روز سے وضع حمل میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ فرمایا: اس سے کہو کہ وہ ایک بڑا پیالہ اور زعفران لے کر آئے اور میں نے دیکھا کہ وہ متعدد لوگوں کے لیے تعویذ لکھتے تھے۔

عکرمہ' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ صلی اللہ علی نبینا وعلیہ وسلم کا ایک گائے کے پاس سے گزر ہوا' اس کے پیٹ میں اس کا بچہ پھنسا ہوا تھا (وضع حمل میں مشکل ہو رہی تھی) اس گائے نے حضرت عیسیٰ سے کہا: اے کلمۃ اللہ! اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے اس مصیبت سے نجات دے جس میں' میں مبتلا ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعا کی: یا خالق النفس من النفس' ویا مخلص النفس من النفس ویا مخرج النفس من النفس خلصھا' تو اس گائے نے بچہ جن دیا' اور وہ کھڑی ہوئی اس بچے کو سونگھ رہی تھی۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا پس جب کسی عورت کو وضع حمل میں دشواری ہو تو اس کو یہ کلمات لکھ دو۔ خلال نے کہا اسی طرح اس سے پہلے جن کلمات کا ذکر کیا گیا ہے ان کا لکھنا بھی فائدہ مند ہے۔

متقدمین کی ایک جماعت نے قرآن مجید کی آیات کو لکھنے اور ان کے غسالہ (دھوون) کو پینے کی بھی اجازت دی ہے' اور اس کو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ شفا میں سے شمار کیا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ صاف برتن میں لکھا جائے۔ اذا السماء انشقت○ واذنت لربھا وحقت○ واذا الارض مدت○ والقت ما فیھا وتخلت۔ (الانشقاق: ۴-۱) حاملہ عورت کو اس برتن سے پانی پلایا جائے اور اس پانی کو اس کے پیٹ پر چھڑکا جائے۔ (زاد المعاد ج ۴ ص ۲۹۲' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۹ھ)

اسی طرح حافظ ذہبی متوفی ۷۴۸ھ لکھتے ہیں:

جب بعض کلام میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے اذن سے نفع دیتے ہیں تو تمہارا اللہ کے کلام کے متعلق کیا گمان ہے! اور امام احمد نے یہ تصریح کی ہے کہ جب قرآن مجید کو کسی چیز پر لکھا جائے پھر اس کو دھو کر اس کا غسالہ پی لیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے' اور ایک شخص کسی برتن میں قرآن مجید لکھے پھر اس کو دھو کر اس کا دھوون مریض کو پلا دے' اسی طرح کسی چیز پر قرآن مجید لکھ کر اس کو پی لے تو ان میں سے کسی چیز میں کوئی حرج نہیں ہے' اسی طرح پانی پر قرآن مجید پڑھ کر اسے مریض پر چھڑکا جائے' اور اسی طرح جب عورت کو وضع حمل میں دشواری ہو تو قرآن مجید لکھ کر اس کا دھوون اس حاملہ عورت کو پلا دیا جائے۔

حضرت ابن عباس سے یہ روایت ہے کہ جب کسی عورت کو وضع حمل میں دشواری ہو تو ایک صاف برتن لیکر اس میں یہ لکھا جائے' کانھم یوم یرون ما یوعدون○ (الاحقاف: ۳۵) کانھم یوم یرونھا لم یلبثوا الا عشیۃ او ضحھا○ (النازعات: ۴۶) لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب○ (یوسف: ۱۱۱) پھر اس کو دھو کر اس کا غسالہ عورت کو پلایا

جائے اور اس کا پانی عورت کے پیٹ پر چھڑکا جائے۔ (الطب النبوی ص ۲۷۹، مطبوعہ دار احیاء العلوم بیروت، ۱۴۰۶ھ)

نکسیر کے متعلق تعویذ

شیخ ابن قیم جوزی متوفی ۷۵۱ھ لکھتے ہیں:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) اپنی پیشانی پر لکھتے تھے، وقیل یا ارض ابلعی ماء ک ویاسماء اقلعی وغیض الماء وقضی الامر۔ (ھود: ۴۴) اور میں نے ابن تیمیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے میں نے متعدد لوگوں کو یہ آیت لکھ کر دی اور وہ تندرست ہوگئے اور انہوں نے کہا اس آیت کو نکسیر کی خون سے لکھنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ جہلاء کرتے ہیں کیونکہ خون نجس ہے پس اس سے اللہ کے کلام کو لکھنا جائز نہیں ہے۔ ان کا ایک اور تعویذ یہ ہے: یمحوا اللہ ما یشاء ویثبت وعندہ ام الکتاب۔ (الرعد: ۳۹) (زاد المعاد ج ۴ ص ۲۹۲، مطبوعہ دار الفکر، ۱۴۱۹ھ)

دل یا سینہ میں درد (انجائنا) کے لیے تعویذ

اس طرح لکھا جائے: فاصابھا اعصار فیہ نار فاحترقت (البقرہ: ۲۶۶) بحول اللہ وقوتہ۔

دوسرا تعویذ اس وقت لکھا جائے جب سورج زرد ہو جائے، اس میں یہ لکھا جائے: یایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وامنوا برسولہ یؤتکم کفلین من رحمتہ ویجعل لکم نورا تمشون بہ ویغفر لکم واللہ غفور رحیم O (الحدید: ۲۸)

میعادی بخار (ٹائیفائڈ) مثلاً تین دن کے بخار کے لیے تعویذ

تین باریک کاغذوں پر لکھا جائے: بسم اللہ فرت، بسم اللہ مرت، بسم اللہ قلت، اور ہر روز ایک کاغذ منہ میں رکھ کر نگل لے۔

عرق النساء کے لیے تعویذ

بسم اللہ الرحمن الرحیم، اللھم رب کل شیء وملیک کل شیء وخالق کل شیء، انت خلقتنی وانت خلقت النساء فلا تسلطہ علی باذی ولا تسلطنی علیہ بقطع واشفنی شفاء لا یغادر سقما ولا شافی الا انت۔

گٹھیا کے لیے تعویذ

امام ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بخار اور ہر قسم کے درد کے لیے یہ پڑھنے کی تعلیم دیتے تھے: بسم اللہ الکبیر اعوذ باللہ العظیم من شر کل عرق نعار ومن شر حر النار۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۰۷۲، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۵۲۶)

ڈاڑھ کے درد کے لیے تعویذ

جس جگہ درد ہے اس کے بالمقابل رخسار پر لکھے: بسم اللہ الرحمن الرحیم، قل ھو الذی انشاکم وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ قلیلا ما تشکرون۔ (الملک: ۲۳) اور اگر چاہے تو یہ لکھے: ولہ ما سکن فی اللیل والنھار وھو السمیع العلیم O (الانعام: ۱۳)

پھوڑے، پھنسیوں اور آبلوں اور ہر قسم کی انفیکشن کے لیے تعویذ

اس کے لیے یہ لکھا جائے گا: ویسئلونک عن الجبال فقل ینسفھا ربی نسفا فیذرھا قاعا

صفصفا لا تری فیہا عوجا ولا امتا۔ (الانعام: ۱۳) (زاد المعاد ج ۴ ص ۲۹۴-۲۹۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۹ھ)

تعویذات اور دم کے جواز کے متعلق ہم نے یہاں پر مفسرین کی تصریحات اور مذاہب اربعہ کے فقہاء کی عبارات کو طوالت کے خوف سے ذکر نہیں کیا، ان کو ہم ان شاء اللہ بنو اسرائیل: ۸۲ کی تفسیر میں ذکر کریں گے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کا مصداق

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ کہئے کہ یہ اللہ کی رحمت اور اس کے فضل کے سبب سے ہے سو اسی کی وجہ سے مسلمان خوشی منائیں۔ ہلال بن یساف، حسن بصری اور مجاہد وغیرہ نے کہا: اللہ کے فضل سے مراد اسلام ہے اور اس کی رحمت سے مراد قرآن ہے۔ (جامع البیان جز ۱۱ ص ۱۶۳-۱۶۲)

اس آیت میں فبذلک سے دوبارہ اشارہ کیا ہے کہ خوشی منانے کا محرک اور باعث صرف اللہ کی رحمت اور اس کا فضل ہونا چاہیے یعنی انسان صرف اللہ کی رحمت اور اس کے فضل کی وجہ سے مسرور ہو نہ کہ اور کسی مادی سبب کی وجہ سے، کیونکہ مادی لذتیں فانی ہیں ان کے زوال کا خطرہ انسان کو لاحق رہتا ہے اور روحانی لذتیں جب انسان کو حاصل ہوں تو وہ ان پر اس حیثیت سے خوش نہ ہو کہ یہ روحانی لذتیں ہیں بلکہ اس حیثیت سے خوش ہو کہ یہ اللہ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں اور اس حیثیت سے اس کا خوش ہونا بہت بڑا کمال اور بہت بڑی سعادت ہے۔ اس کے بعد فرمایا: اللہ کی رحمت اور اس کے فضل سے اس لیے خوش ہونا کہ وہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے اس دنیاوی مال و دولت سے بہت بہتر ہے جس کو کفار جمع کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی، آپ کی آمد اور آپ کی بعثت پر فرحت اور مسرت کا اظہار

اس آیت میں اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مراد لیا گیا ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں: خطیب اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قل بفضل اللہ میں فضل اللہ سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ (الدر المنثور ج ۴ ص ۳۶۸، دار الفکر بیروت، روح المعانی ج ۷ ص ۲۰۵، دار الفکر، ۱۴۱۷ھ) اور ابو الشیخ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وبرحمتہ میں رحمت سے مراد سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وما ارسلنک الا رحمۃ للعلمین۔ (الانبیاء: ۱۰۷) (الدر المنثور ج ۴ ص ۳۶۷، روح المعانی ج ۷ ص ۲۰۵) علامہ ابن جوزی متوفی ۵۹۷ھ نے لکھا ہے کہ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رحمت سے مراد سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

(زاد المسیر ج ۴ ص ۴۰، المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

اس تفسیر کے مطابق اس آیت کا معنی یہ ہوا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور آپ کی ولادت اور بعثت پر مسلمانوں کو خوشی منانا چاہیے اور اس کی اصل اس آیت میں ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ۔ (الرعد: ۳۶)

اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اور ان گروہوں میں بعض وہ ہیں جو اس کے بعض کا انکار کرتے ہیں۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول سے خوش ہوئے اور انہوں نے اس کی تصدیق

کی اور یہود اور نصاریٰ اس کا انکار کرتے ہیں۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔
(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۵۵۱۷، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۲۱ھ)

ابن زید نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: یہ وہ اہل کتاب ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے اور اس پر خوش ہوتے تھے، اور الاحزاب سے مراد یہود، نصاریٰ اور مجوس کے گروہ ہیں، ان میں سے بعض آپ پر ایمان لائے اور بعض نے انکار کیا۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۵۵۲۱)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور آپ کی ولادت اور آپ کی بعثت پر فرحت اور مسرت کا اظہار کرنا مطلوب اور محمود ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

اَلَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ کُفْرًا۔ (ابراہیم: ۲۸) جن لوگوں نے اللہ کی نعمت کو کفر سے تبدیل کر دیا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ کی قسم یہ لوگ کفار قریش ہیں اور عمرو نے کہا وہ قریش ہیں اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی نعمت ہیں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۹۷۷، مطبوعہ دار ارقم بیروت)

اس صحیح حدیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کی نعمت ہیں اور اللہ کی نعمت پر خوش ہونا اور فرحت اور مسرت کا اظہار کرنا مطلوب ہے۔

یَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَفَضْلٍ۔ وہ اللہ کی نعمت اور فضل پر خوشیاں مناتے ہیں۔
(آل عمران: ۱۷۱)

ان آیات، احادیث اور آثار سے واضح ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے فضل اور رحمت ہیں اور اللہ کے فضل اور رحمت پر خوشی منانے کا حکم ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور مومنین اہل کتاب آپ کی وجہ سے فرحت اور مسرت کا اظہار کرتے تھے، اور آپ اللہ کی نعمت ہیں اور مومنین کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ کی نعمت پر خوشی مناتے ہیں، سو جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی اس دن آپ کی ولادت پر خوشی کرنا اور عید میلاد منانا اور جشن آمد رسول کا اظہار کرنا یہ ان آیات، احادیث اور آثار کے مطابق ہے، اس کی مزید تفصیل اور تحقیق ہم نے شرح صحیح مسلم جلد ۳ ص ۱۹۰-۱۶۹ میں کر دی ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہئے کہ اللہ نے تمہارے لیے جو رزق نازل کیا پس تم نے اس میں سے بعض کو حرام اور بعض کو حلال قرار دے دیا، آپ کہئے کیا اللہ نے تم کو اس کا حکم دیا تھا یا تم اللہ پر جھوٹا بہتان باندھ رہے ہو○ اور جو لوگ اللہ پر جھوٹا بہتان باندھ رہے ہیں ان کا قیامت کے متعلق کیا گمان ہے؟ بے شک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے○ (یونس: ۶۰-۵۹)

مشرکین کی خود ساختہ شریعت کی مذمت

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر بہ کثرت دلائل قائم فرمائے تھے، ان کے سوالات کے جوابات دیئے اور ان کے شبہات کو زائل فرمایا، اس کے بعد ان کے خود ساختہ مذہب کا رد فرمایا کہ انہوں نے بعض چیزوں کو حلال قرار دیا ہے اور بعض چیزوں کو حرام کہا ہے، حالانکہ ان کی بنائی ہوئی اس حلت اور حرمت پر عقل شاہد ہے نہ نقل۔

انہوں نے جن چیزوں کو حلال اور حرام کیا ہوا تھا اس کا ذکر ان آیتوں میں ہے:

وَقَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۗ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ○ وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۗ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۗ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○ (الانعام: ۱۳۹-۱۳۸)

اور انہوں نے کہا یہ مویشی اور کھیت ممنوع ہیں، اس کو وہی کھا سکتا ہے جس کو ان کے زعم کے مطابق ہم چاہیں، اور کچھ مویشی ایسے ہیں جن کی پیٹھوں کو (سواری اور بوجھ کے لیے) حرام کیا گیا، اور کچھ مویشی ایسے ہیں جن پر وہ (ذبح کے وقت) اللہ کا نام نہیں لیتے، اللہ پر افتراء کرتے ہوئے، عنقریب اللہ ان کو ان کے افتراء کی سزا دے گا ○ اور انہوں نے کہا ان مویشیوں کے پیٹ میں جو (بچہ) ہے وہ ہمارے مردوں کے ساتھ خاص ہے اور ہماری بیویوں پر وہ حرام ہے، اور اگر وہ (بچہ) مردہ ہو تو وہ (مرد اور عورتیں) سب اس میں شریک ہیں، عنقریب اللہ ان کو ان احکام گھڑنے کی سزا دے گا، بے شک وہ بڑی حکمت والا بہت علم والا ہے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۖ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۔ (المائدہ: ۱۰۳)

اللہ نے کوئی بحیرہ مقرر نہیں کیا اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حامی لیکن کفار جھوٹ بول کر اللہ پر بہتان باندھتے ہیں اور ان کے اکثر لوگ عقل نہیں رکھتے۔

ابن المسیب نے کہا: بحیرہ وہ اونٹنی ہے جس کا دودھ دوہنا بتوں کی وجہ سے روک دیا جائے اور کوئی شخص اس کا دودھ نہیں دوہتا تھا اور سائبہ وہ اونٹنی ہے جس کو وہ بتوں کے لیے چھوڑ دیتے تھے اور کوئی شخص اس کا دودھ نہیں دوہتا تھا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جہنم میں عمرو بن عامر الخزاعی کو دیکھا وہ دوزخ میں اپنی آنتیں گھسیٹ رہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے سب سے پہلے سائبہ کو بتوں کے لیے چھوڑا، اور وصیلہ وہ اونٹنی ہے جو مسلسل اونٹنیاں جنے اور درمیان میں نر پیدا نہ ہو، اور حامی وہ اونٹ ہے جو معین مرتبہ جفتی کرے، اس کو بھی بتوں کے لیے چھوڑ دیتے تھے اور اس پر بوجھ نہیں لادا جاتا تھا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۶۲۳)

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ حلال اور حرام کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب ہے، اور کسی شخص کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنی طرف سے کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دے، اور جب کسی عالم یا مفتی سے کسی چیز کے متعلق سوال کیا جائے تو وہ سستی اور لاپرواہی سے کام نہ لے، اور بغیر کسی شرعی دلیل کے از خود کسی چیز کو حلال یا حرام قرار نہ دے، ہمارے زمانہ میں یہ وبا بہت عام ہے۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کے مدعی علماء سنن اور مستحبات کو اپنی طرف سے فرض اور واجب کہتے ہیں، اور مکروہات کو حرام کہتے ہیں۔ وہ اپنی رائے سے شریعت سازی کرتے ہیں اور انہیں کوئی خدا کا خوف نہیں ہوتا!

اس کے بعد فرمایا: اور جو لوگ اللہ پر بہتان باندھ رہے ہیں ان کا قیامت کے متعلق کیا گمان ہے؟

یعنی یہ لوگ کیا سمجھتے ہیں کیا قیامت کے دن ان کو بغیر سزا کے چھوڑ دیا جائے گا، اور یہ لوگ جو دنیا میں اللہ پر بہتان باندھتے رہے ہیں ان کو، کوئی سزا نہیں دی جائے گی!

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۔(الشوریٰ: ۲۱)

کیا ان کے لیے شرکاء ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین کے وہ احکام مقرر کر دیئے جن کی اللہ نے اجازت نہیں دی' اور اگر (قیامت کے دن) فیصلہ کی بات نہ ہو چکی ہوتی تو ضرور ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔

پھر فرمایا: بے شک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عقل عطا فرمائی اور اپنی رحمت سے ان کے درمیان ان ہی میں سے ایک عظیم نبی بھیجا جس نے لوگوں کو حلال اور حرام کی تعلیم دی اور دین کے احکام بیان فرمائے اور ان کو اپنے فضل سے رزق عطا فرمایا اور ان کے لیے منافع کو مباح کر دیا لیکن چیزوں کے حلال اور حرام کرنے کا اختیار صرف اپنے پاس رکھا تاکہ لوگ احکام شرعیہ میں تصرف نہ کرنے لگیں جیساکہ احبار اور رہبان تصرف کرتے تھے۔

تقشف اور بناوٹی زہد اللہ کی ناشکری ہے

پھر فرمایا : لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے' یعنی یہ لوگ اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کی ناقدری کرتے ہیں اور اس کے رسول کی پیروی نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں' ان میں سے بعض کو اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں اور بلاوجہ اپنے اوپر تنگی کرتے ہیں جیسے مشرکین نے بعض حلال جانوروں کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا اور جیسے بعض عیسائیوں نے رہبانیت کی بدعت نکالی اور اپنے اوپر دنیا کی نعمتوں کا دروازہ بند کر لیا' وہ تارک الدنیا ہو کر خانقاہوں میں گوشہ نشین ہو گئے' اسی طرح آج کل کے مسلمانوں نے دین میں بدعتیں نکالیں اور غاروں اور جنگلوں میں چلہ کشی اور نفس کشی شروع کر دی اور اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی لذیذ اور عمدہ کھانے پینے کی چیزوں اور اچھے کپڑوں اور آرام اور آرائش کی دیگر چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور اس کو زہد اور فقر کا نام دیا' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ حکم نہیں دیا' اللہ تعالیٰ کا حکم تو یہ ہے:

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۔(الطلاق: ۷)

اور فراخ دست کو چاہیے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے۔

اللہ تعالیٰ نے خرچ میں میانہ روی کا حکم دیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۔(الفرقان: ۶۷)

اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو بے جا خرچ نہیں کرتے اور نہ تنگی سے کام لیتے ہیں اور ان کا خرچ معتدل ہوتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بلاوجہ تنگ دستی تقشف اور بدحالی کی زندگی گزارنے کو ناپسند فرمایا ہے:

ابوالاحوص اپنے والد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا' اور اس وقت میں نے معمولی اور گھٹیا کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ آپ نے مجھ سے پوچھا کیا تمہارے پاس مال ہے؟ میں نے کہا ہاں! آپ نے پوچھا کس قسم کا مال ہے؟ میں نے عرض کیا ہر قسم کا مال ہے' اللہ تعالیٰ نے مجھے اونٹ' گائے' بکریاں' گھوڑے اور غلام سب کچھ عطا فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا: جب اللہ نے تمہیں مال دیا ہے تو تم پر اس کی نعمتوں اور کرامتوں کا اثر دکھائی دینا چاہیے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۴۰۶۳' سنن النسائی رقم الحدیث:۵۲۳۹' سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۰۰۶' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۳۶۰۶' صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۵۴۱۶' المستدرک ج ۴ ص ۱۸۱' شرح السنہ رقم الحدیث:۳۱۱۸' مسند احمد ج ۳ ص ۴۷۳)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملاقات کے لیے تشریف لائے، آپ نے دیکھا ایک شخص کے بال بکھرے ہوئے اور غبار آلود تھے۔ آپ نے فرمایا: کیا اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے یہ اپنے بالوں کو درست کر لے اور ایک شخص کو میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا' آپ نے فرمایا: کیا اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے یہ اپنے کپڑوں کو دھو لے!

(سنن النسائی رقم الحدیث: ۵۲۳۶، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۰۶۲، مسند احمد' ج ۳' ص ۳۵۷، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۴۳۵۱)

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ اس بات سے محبت کرتا ہے کہ اس کی نعمت کا اثر اس کے بندے پر دکھائی دے۔

(سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۸۱۹، مسند احمد ج ۲ ص ۲۱۳، المستدرک ج ۴ ص ۱۳۵، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۴۳۵۰)

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے' کھانے پینے' لباس' مکان اور دیگر سامان آرائش اور زینت کو حسب حیثیت استعمال کرنا چاہیے' بے جا خرچ سے بچنا چاہیے' اور اپنے مال میں ناداروں کے حق کو فراموش نہیں کرنا چاہیے اور آرام اور آسائش کے دنوں میں اللہ کی یاد اور اس کی عبادت سے غافل نہیں ہونا چاہیے اور ہر وقت ذکر و فکر اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے۔

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ

(اے رسول اکرم!) آپ جس حال میں بھی ہوتے ہیں اور آپ اللہ کی طرف سے جو کچھ بھی قرآن سے تلاوت کرتے ہیں اور (اے

مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا

مسلمانو!) تم جو کام بھی کرتے ہو تو ہم (اس وقت) تم سب پر گواہ ہوتے ہیں جس وقت تم ان کاموں میں مشغول ہوتے ہو' اور آپ کے

يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ

رب سے ایک ذرہ کی مقدار بھی پوشیدہ نہیں ہے نہ زمین میں نہ آسمان میں

وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٦١﴾ اَلَآ اِنَّ

اور نہ اس ذرہ سے کوئی چھوٹی چیز ہے اور نہ بڑی چیز مگر وہ روشن کتاب میں درج ہے ○ سنو اللہ کے

اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾ ۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

ولیوں پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ○ جو ایمان لائے

وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾ ؕ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ؕ

اور (ہمیشہ) متقی رہے ○ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں (بھی) بشارت ہے اور آخرت میں بھی'

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۴﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ

اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی یہی بہت بڑی کامیابی ہے ○ ان کی باتوں سے آپ

قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۵﴾ اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ

وقف لازم

رنجیدہ نہ ہوں، بے شک ہر قسم کا غلبہ اللہ ہی کے لیے ہے، وہ خوب سننے والا بہت جاننے والا ہے ○ سنو! جو لوگ

مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ

آسمانوں میں ہیں اور جو زمینوں میں ہیں سب اللہ ہی کے مملوک ہیں، یہ لوگ جو اللہ کو چھوڑ کر (خود ساختہ) شریکوں کو

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾

پکارتے ہیں یہ کس کی پیروی کر رہے ہیں؟ یہ صرف اپنے گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور یہ صرف غلط اندازے لگا رہے ہیں ○

هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ

وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دکھانے والا دن بنایا، بے شک

فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا

اس میں (غور سے) سننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں ○ انہوں نے کہا اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے

سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِىُّ ؕ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ اِنْ

وہ (اس سے) پاک ہے، وہی بے نیاز ہے، آسمانوں اور زمینوں میں سب اسی کے مملوک ہیں، تمہارے

عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

پاس اس (باطل قول) پر کوئی دلیل نہیں ہے، کیا تم اللہ کے متعلق ایسی بات کہتے ہو جس کو تم خود (بھی) نہیں جانتے ○

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ؕ ﴿۶۹﴾

آپ کہیے بیشک جو لوگ اللہ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں وہ (کبھی) کامیاب نہیں ہوں گے ○

مَتَاعٌ فِى الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ

(یہ) دنیا کا عارضی فائدہ ہے پھر ہماری ہی طرف انہوں نے لوٹنا ہے پھر ہم ان کے کفریہ کاموں کی بنا پر ان کو

بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ ع

سخت عذاب چکھائیں گے ○

ع ۷ / ۱۲ / الثالثة

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے رسولِ اکرم!) آپ جس حال میں بھی ہوتے ہیں اور آپ اللہ کی طرف سے جو کچھ بھی قرآن سے تلاوت کرتے ہیں اور (اے مسلمانو!) تم جو کام بھی کرتے ہو تو ہم (اس وقت) تم سب پر گواہ ہوتے ہیں جس وقت تم ان کاموں میں مشغول ہوتے ہو اور آپ کے رب سے ایک ذرہ کی مقدار بھی پوشیدہ نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمان میں، اور نہ اس ذرہ سے کوئی چھوٹی چیز ہے اور نہ بڑی چیز مگر وہ روشن کتاب میں درج ہے○ (یونس: ۶۱)

مشکل الفاظ کے معانی اور آیات سابقہ سے مناسبت

وماتكون فی شان: شان کے معنی ہیں کام، حال، کسی امر مہم کو بھی شان کہتے ہیں۔ (النہایہ ج ۲ ص ۳۹۲)

اذتفيضون فيه: جب تم کسی کام میں مشغول ہوتے ہو، کہا جاتا ہے' افضنا فی الحدیث: ہم باتوں میں لگ گئے۔

ومايعزب: نہیں دور ہوتا یا نہیں غائب ہوتا۔

من مثقال ذرة: چھوٹی چیونٹی کے برابر۔ (تفسیر غرائب القرآن للامام ابن قتیبہ ص ۱۷۱، مکتبہ الہلال بیروت، ۱۴۱۱ھ)

اس سے پہلی آیات میں یہ فرمایا تھا کہ ان میں سے اکثر شکر ادا نہیں کرتے، اب اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم بندوں کے تمام اعمال کو محیط ہے، خواہ وہ چھوٹا کام کریں یا بڑا کام کریں، یا وہ کسی کام کا ارادہ کریں اور اس کام کو نہ کریں، وہ ان کے دلوں کے احوال اور ظاہری افعال سب کو ہر حال میں اور ہر وقت میں جاننے والا ہے، اسے معلوم ہے کون اس کی اطاعت کرنے والا ہے اور کون اس کا شکر ادا کرنے والا ہے، کون گناہوں سے بچنے والا ہے اور کون گناہوں میں ڈوبنے والا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے، خواہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز ہو یا بڑی سے بڑی چیز ہو وہ سب لوح محفوظ میں مندرج ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کے لیے نوید ہے اور کفار کے لیے وعید ہے۔

زمین کے ذکر کو آسمان کے ذکر پر مقدم کرنے کی وجہ

اس آیت میں پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرمایا اور اس کے بعد تمام مکلفین سے خطاب فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دو چیزوں کا ذکر فرمایا: آپ جس حال میں بھی ہوتے ہیں، حضرت ابن عباس نے فرمایا: آپ جو بھی نیکی کا کام کرتے ہیں، حسن بصری نے کہا: آپ دنیا کا جو بھی کام کرتے ہیں یا اپنی حوائج اور ضروریات میں سے جس چیز میں بھی مشغول ہوتے ہیں یا آپ اللہ کی طرف سے قرآن مجید کی جس قدر بھی تلاوت کرتے ہیں، پھر تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا: تم لوگ جو کام بھی کرتے ہو ہم اس پر گواہ ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر شاہد ہے اور ہر چیز کا عالم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کا خالق ہے اور جو چیز بھی موجود ہے وہ اس کی ایجاد سے موجود ہے اور جو کسی چیز کا موجد ہوتا ہے وہ اس چیز کا عالم بھی ہوتا ہے، پس جب وہ تمام جہانوں کا موجد ہے تو پھر تمام جہانوں کا عالم بھی ہے۔

اس کے بعد فرمایا: اور آپ کے رب سے ایک ذرہ کی مقدار بھی پوشیدہ نہیں ہے نہ زمین میں نہ آسمان میں اور نہ اس ذرہ سے کوئی چھوٹی چیز ہے اور نہ بڑی چیز مگر وہ اس روشن کتاب میں درج ہے۔ اس آیت میں زمین کو آسمان پر مقدم کیا ہے اور اس مضمون کی ایک اور آیت میں آسمانوں کو زمینوں پر مقدم فرمایا ہے، ارشاد ہے:

عٰلِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي — عالم الغیب کی قسم! اس سے ذرہ کے برابر بھی کوئی چیز غائب

السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الۡاَرۡضِ وَلَاۤ اَصۡغَرُ مِنۡ ذٰلِکَ وَلَاۤ اَکۡبَرُ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ○ (سبا: ۳) نہیں ہے نہ آسمانوں میں نہ زمینوں میں اور نہ اس ذرہ سے کوئی چھوٹی چیز ہے نہ بڑی چیز مگر وہ روشن کتاب میں درج ہے۔

قرآن مجید میں بالعموم آسمانوں کا ذکر زمین پر مقدم ہی ہوتا ہے، لیکن اس آیت میں چونکہ پہلے زمین والوں کے احوال اور ان کے اعمال کا ذکر کیا گیا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان سب کے اعمال پر گواہ ہے اس لیے اس آیت میں زمین کے ذکر کو آسمان کے ذکر پر مقدم فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سنو اللہ کے ولیوں پر نہ کوئی خوف ہو گا نہ وہ غمگین ہوں گے ○ جو ایمان لائے اور (ہمیشہ) متقی رہے ○ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں (بھی) بشارت ہے، اور آخرت میں بھی، اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی یہی بہت بڑی کامیابی ہے ○ (یونس: ۶۴-۶۲)

ولی کا لغوی معنی

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

ولایت کا معنی قرب ہے خواہ یہ قرب جگہ کے اعتبار سے ہو یا نسبت کے اعتبار سے یا دین کے اعتبار سے یا دوستی کے اعتبار سے یا اعتقاد کے اعتبار سے یا نصرت کے اعتبار سے۔ ولایت کا معنی کسی چیز کا انتظام کرنا بھی ہے، اور ولی بہ معنی فاعل بھی ہے یعنی منتظم اور متصرف اور مفعول کے معنی میں بھی ہے یعنی جو کسی کے زیر انتظام اور زیر تصرف ہو، مومن کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ کا ولی ہے (جیسا کہ اس آیت میں ہے، یعنی وہ اللہ کی ذات کی معرفت اور اس کے جمال اور جلال کے نور میں مستغرق رہنے کی وجہ سے اس کے قریب اور مقرب ہو چکے ہیں، اور وہ اپنے قلب اور قالب میں اپنی خواہش سے تصرف نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشاء سے تصرف کرتے ہیں یا ان کے ہدایت پر قائم رہنے کا اللہ تعالیٰ متولی ہے، اور یا وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حق ادا کرنے کے لیے ہر وقت اپنے اعضاء میں متولی اور متصرف رہتے ہیں) اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اللہ مومنین کا ولی ہے، قرآن مجید میں ہے: اللہ ولی الذین امنوا۔ (البقرہ: ۲۵۷)

(المفردات ج ۲ ص ۶۹۴، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

امام ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اس آیت کے معنی میں لکھتے ہیں:

سنو! اللہ (کے دین) کے مددگاروں کو آخرت میں اللہ کے عتاب کا خوف نہیں ہو گا، کیونکہ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور اس نے ان کو اپنے عتاب سے محفوظ رکھا، اور نہ ان کو دنیا کے فوت ہو جانے کا کوئی غم ہو گا، اولیاء ولی کی جمع ہے اور ولی کا معنی ہے نصیر یعنی مدد کرنے والا۔ (جامع البیان جز ۱۱ ص ۱۷۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

ولی کا اصطلاحی معنی

علامہ مسعود بن عمر تفتازانی متوفی ۷۹۳ھ لکھتے ہیں:

ولی وہ مومن کامل ہے جو عارف باللہ ہوتا ہے دائمی عبادت کرتا ہے، ہر قسم کے گناہوں سے مجتنب رہتا ہے، لذات اور شہوات میں انہماک سے گریز کرتا ہے۔ (شرح المقاصد ج ۵ ص ۷۳-۷۲، مطبوعہ منشورات الرضی ایران، ۱۴۰۹ھ)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

ولی سے مراد وہ شخص ہے جو عالم باللہ ہو اور اخلاص کے ساتھ دائمی عبادات کرتا ہو۔

(فتح الباری ج ۱۱ ص ۳۴۲، مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۱ھ، ایضاً عمدۃ القاری جز ۲۳ ص ۸۹، مطبوعہ مصر)

ملا علی بن سلطان محمد القاری المتوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں:
ولی کا لفظ فعیل کے وزن پر بہ معنی مفعول ہے یعنی وہ شخص جس کے کاموں کی اللہ حفاظت کرتا ہو اور ایک لحظہ کے لیے بھی اسے اس کے نفس کے سپرد نہ کرتا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ۔ (الاعراف: ۱۹۶) اللہ نیک لوگوں کی حفاظت کرتا ہے۔
اس معنی کے اعتبار سے ولی کو مراد (مطلوب) اور مجذوب سالک کہتے ہیں، اور یا یہ لفظ فاعل کے معنی میں مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس کا معنی یہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی اطاعت کی مسلسل حفاظت کرتا ہو اور اس کی زندگی میں کبھی گناہ شامل نہ ہو، اس معنی کے اعتبار سے ولی مرید (طالب) اور سالک مجذوب ہے، اس میں اختلاف ہے کہ ان میں سے کون افضل ہے، اور حقیقت میں ہر مراد مرید ہے، اور ہر مرید مراد ہے اور ان میں فرق ابتداء اور انتہاء کے اعتبار سے ہے۔
(مرقاۃ ج ۵ ص ۵۴، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، ۱۳۹۰ھ)
علامہ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی المتوفی ۴۵۰ھ نے ولی کی تعریف میں حسب ذیل اقوال نقل کیے ہیں:
(۱) یہ وہ لوگ ہیں جو تقدیر پر راضی رہتے ہیں اور مصائب پر صبر کرتے ہیں اور نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں۔
(۲) یہ وہ لوگ ہیں جن کے کام ہمیشہ حق کی موافقت میں ہوتے ہیں۔
(۳) یہ وہ لوگ ہیں جو محض اللہ کے لیے لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔
(النکت والعیون ج ۲ ص ۴۴۱۔ ۴۴۰، مطبوعہ مؤسسۃ الکتب الثقافیہ، بیروت)

ولی کے مصداق اور ان کے فضائل کے متعلق احادیث اور آثار

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:
سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اولیاء اللہ کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں کہ جب یہ دکھائی دیں تو اللہ یاد آجائے۔
(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۷۲۵، جز ۱۱ ص ۱۷۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)
حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے بعض بندوں میں سے ایسے انسان ہیں جو نبی ہیں نہ شہید (لیکن) اللہ کے نزدیک ان کا مرتبہ دیکھ کر انبیاء اور شہداء بھی ان کی تحسین کریں گے۔ صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! ہمیں خبر دیں وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں سے محض اللہ کی وجہ سے محبت کرتے ہیں حالانکہ وہ لوگ ان کے رشتہ دار ہوتے ہیں نہ ان کو ان سے کوئی مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے، اللہ کی قسم ان کے چہرے منور ہوں گے، اور بے شک وہ نور پر فائز ہوں گے (بعض روایات میں ہے وہ نور کے منبر پر ہوں گے) اور جب لوگ خوف زدہ ہوں گے تو انہیں خوف نہیں ہوگا، اور جب لوگ غم زدہ ہوں گے تو انہیں غم نہیں ہوگا، پھر آپ نے اس آیت کو پڑھا: الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولاھم یحزنون۔
(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۵۲۸، حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۳۶، طبع جدید، ج ۱ ص ۵ طبع قدیم، شعب الایمان رقم الحدیث: ۸۹۹۸، الترغیب والترہیب ج ۴ ص ۲۱، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۵۰۱۲۔۳، اتحاف السادۃ المتقین ج ۶ ص ۱۷۵، سنن الترمذی مختصرا رقم الحدیث: ۲۳۹۰)
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے: جس شخص نے میرے ولی سے عداوت رکھی، میں اس سے اعلان جنگ کر دیتا ہوں، جس چیز سے بھی بندہ میرا تقرب

حاصل کرتا ہے اس میں سب سے زیادہ محبوب مجھے وہ عبادت ہے جو میں نے اس پر فرض کی ہے اور میرا بندہ ہمیشہ نوافل سے میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے، حتیٰ کہ میں اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں' اور جب میں اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے' میں اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پیر ہو جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اس کو ضرور عطا کرتا ہوں' اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اس کو ضرور پناہ دیتا ہوں' اور میں جس کام کو بھی کرنے والا ہوں کسی کام میں اتنا تردد (اتنی تاخیر) نہیں کرتا جتنا تردد (جتنی تاخیر) میں مومن کی روح قبض کرنے میں کرتا ہوں۔ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اسے رنجیدہ کرنے کو ناپسند کرتا ہوں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۵۰۲، حلیۃ الاولیاء ج۱ ص۱۵، طبع جدید' صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۳۴۷، السنن الکبریٰ للبیہقی ج۳ ص۳۴۶، ج۱۰ ص۲۱۹، کتاب الاسماء والصفات للبیہقی ص۴۹۱، صفوۃ الصفوۃ ج۱ ص۱۵، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۲۲۶۶، کنز العمال رقم الحدیث: ۲۱۳۲۷)

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ اور حافظ محمود بن احمد عینی متوفی ۸۵۵ھ نے لکھا ہے کہ عبدالواحد کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ میں اس کا دل ہو جاتا ہوں جس سے وہ سوچتا ہے اور میں اس کی زبان ہو جاتا ہوں جس سے وہ کلام کرتا ہے۔

(فتح الباری ج۱۱ ص۳۴۴، مطبوعہ لاہور، عمدۃ القاری جز ۲۳ ص۹۰، مطبوعہ مصر)

اللہ اپنے محبوب بندے کے کان اور آنکھیں ہو جاتا ہے' اس کی توجیہ

اللہ تعالیٰ بندہ کے کان اور آنکھیں ہو جاتا ہے' اس کی کیا توجیہ ہے؟ عام طور پر شارحین اور علماء نے یہ کہا ہے کہ بندہ اپنے کانوں سے وہی سنتا ہے جس کے سننے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور اپنی آنکھوں سے وہی دیکھتا ہے جس کے دیکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو بندہ کا سننا' اللہ کا سننا اور بندہ کا دیکھنا اللہ کا دیکھنا ہوتا ہے' اس لیے فرمایا: میں اس کے کان ہو جاتا ہوں اور اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں' لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ کوئی بندہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ کا محبوب نہیں بنے گا جب تک کہ اس کا سننا' اس کا دیکھنا' اس کا تصرف کرنا اور اس کا چلنا اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق نہ ہو اور جب اللہ اس کو اپنا محبوب بنا لے گا تو پھر اللہ اس کے کان ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھیں ہو جاتا ہے کا معنی یہ نہیں ہو سکتا۔ اس حدیث کی بہترین توجیہ امام رازی نے کی ہے' وہ فرماتے ہیں:

بندہ جب عبادات پر دوام کرتا ہے تو وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں اور اس کے کان ہو جاتا ہوں پس جب اللہ کا نور جلال اس کے کان ہو جاتا ہے تو وہ قریب اور دور سے سن لیتا ہے اور جب اس کا نور جلال اس کی آنکھ ہو جاتا ہے تو وہ قریب اور بعید کو دیکھ لیتا ہے اور جب اس کا نور اس کے ہاتھ ہو جاتا ہے تو وہ مشکل اور آسان چیزوں پر اور قریب اور بعید کی چیزوں کے تصرف پر قادر ہو جاتا ہے۔

(تفسیر کبیر ج۷ ص۴۳۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۵ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کا ولی فرائض پر دوام اور نوافل پر پابندی کرنے سے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہو جاتا ہے' لیکن بندہ' بندہ ہی رہتا ہے خدا نہیں ہو جاتا جیسے آئینہ میں کسی چیز کا عکس ہو تو آئینہ وہ چیز نہیں بن جاتا' اس کی صورت کا مظہر ہو جاتا ہے بلاتشبیہ تمثیل جب بندہ کامل کی اپنی صفات فنا ہو جاتی ہیں تو وہ اللہ کی صفات کا مظہر ہو جاتا ہے۔

شیخ انور شاہ کشمیری متوفی ۱۳۵۲ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوۡدِىَ مِنۡ شَاطِیِٔ الۡوَادِ الۡاَیۡمَنِ فِى الۡبُقۡعَةِ الۡمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنۡ یّٰمُوۡسٰٓى اِنِّىۡۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔ (القصص: ٣٠)

پھر جب موسیٰ آگ کے پاس آئے تو انہیں میدان کے داہنے کنارے سے برکت والے مقام میں ایک درخت سے ندا کی گئی کہ اے موسیٰ بے شک میں ہی اللہ ہوں تمام جہانوں کا پروردگار۔

دکھائی یہ دے رہا تھا کہ درخت کلام کر رہا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کلام کی اپنی طرف نسبت فرمائی، کیونکہ اللہ جل مجدہ نے اس درخت میں تجلی فرمائی تھی، اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کیلئے وہ درخت واسطہ بن گیا تھا، تو جس میں تجلی کی گئی تھی اس نے تجلی کرنے والے کا حکم لے لیا، اور ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ تجلی میں صرف صورت نظر آتی ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ضرورت کی وجہ سے آگ میں (یا درخت میں!) تجلی فرمائی تھی، اور جب تم نے تجلی کا معنی سمجھ لیا تو سنو جب درخت کیلئے یہ جائز ہے کہ اس میں یہ ندا کی جائے کہ بے شک میں اللہ ہوں، تو جو نوافل کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کرتا ہے وہ اللہ کی سمع اور بصر کیوں نہیں ہو سکتا! وہ ابن آدم جو صورت رحمٰن پر پیدا کیا گیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درخت سے کم تو نہیں ہے (یعنی جب شجر موسیٰ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا مظہر ہو سکتا ہے تو سیدنا محمد ﷺ کی امت کا ولی جو اللہ کا محبوب ہو جائے وہ اللہ کی صفت سمع اور بصر کا مظہر کیوں نہیں ہو سکتا!) (فیض الباری ج ۴ ص ۴۲۹، مطبوعہ مجلس علمی ہند، ١٣٥٧ھ)

اللہ تعالیٰ کے تردد کرنے کی توجیہ

اس حدیث کے آخر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: میں جس کام کو بھی کرنے والا ہوں کسی کام میں اتنا تردد (اتنی تاخیر) نہیں کرتا جتنا تردد (جتنی تاخیر) میں مومن کی روح قبض کرنے میں کرتا ہوں۔ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کے رنجیدہ ہونے کو ناپسند کرتا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولی کی روح اس وقت تک قبض نہیں کرتا جب تک کہ وہ اپنی موت پر راضی نہ ہو جائے۔

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کی صفت میں تردد جائز نہیں ہے اور نہ ہی بداء جائز ہے۔ (بداء کا معنی ہے اللہ کوئی کام کرے پھر اس کو اس کام میں کسی خرابی کا علم ہو تو وہ اس کام کو تبدیل کر دے، اس لیے ہم نے یہاں تردد کا معنی تاخیر کیا ہے) لہٰذا اس کی دو تاویلیں ہیں:

(١) انسان اپنی زندگی میں کسی بیماری یا کسی آفت کی وجہ سے کئی مرتبہ ہلاکت کے قریب پہنچ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے شفا کی اور اس مصیبت کو دور کرنے کی دعا کرتا ہے، تو اللہ عزوجل اس کو اس بیماری سے شفا عطا فرماتا ہے اور اس کی مصیبت کو دور کر دیتا ہے اور اس کا یہ فعل اس طرح ہوتا ہے جیسے ایک آدمی کو تردد ہوتا ہے، وہ پہلے ایک کام کرتا ہے پھر اسے اس کام میں کوئی خرابی نظر آتی ہے اور وہ اس کام کو ترک کر دیتا ہے لیکن بہرحال بندہ کے لیے موت سے چھٹکارا نہیں ہے، جب اس کی مدت حیات پوری ہو جاتی ہے تو اس پر لازماً موت آتی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے: دعا مصیبت کو ٹال دیتی ہے، اس کا بھی یہی معنی ہے۔[1]

[1] حضرت سلمان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تقدیر کو صرف دعا بدل دیتی ہے، اور عمر صرف نیکی سے زیادہ ہوتی ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ٢١٣٩، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ٦١٢٨) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر صرف خیر سے زیادہ ہوتی ہے۔ (مسند احمد ج ٣ ص ٣١٦)

(۲) اس کی دوسری تاویل یہ ہے کہ میں جس کام کو کرنے والا ہوں میں اس کام کے متعلق اپنے رسولوں (فرشتوں) کو کسی صورت میں واپس نہیں کرتا جیسا کہ میں بندۂ مومن کی روح قبض کرنے کے معاملہ میں اپنے رسولوں (فرشتوں) کو واپس کر لیتا ہوں جیسا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ملک الموت علیہما السلام کے واقعہ میں ہے اور حضرت موسیٰ نے تھپڑ مار کر ملک الموت کی آنکھ نکال دی تھی اور ملک الموت ایک بار واپس لوٹنے کے بعد دوبارہ ان کے پاس گیا تھا اور ان دونوں تاویلوں میں اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ پر لطف و کرم اور اس پر اس کی شفقت کا اظہار ہے۔

حضرت موسیٰ اور حضرت ملک الموت کے واقعہ کی تفصیل اس حدیث میں ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ملک الموت کو حضرت موسیٰ علیہما السلام کی طرف بھیجا گیا، جب ان کے پاس ملک الموت آیا تو حضرت موسیٰ نے ان کے تھپڑ مارا۔ (مسلم کی روایت میں ہے: پس ان کی آنکھ نکال دی) ملک الموت اپنے رب کے پاس لوٹ گئے اور کہا تو نے مجھے ایسے بندہ کی طرف بھیجا ہے جو مرنے کا ارادہ ہی نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھ لوٹا دی اور فرمایا: دوبارہ جاؤ اور ان سے کہو کہ اپنا ہاتھ بیل کی پشت پر رکھ دیں، آپ کے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آئیں گے ہر بال کے بدلہ میں آپ کی عمر میں ایک سال بڑھا دیا جائے گا۔ حضرت موسیٰ نے کہا: اے رب! پھر کیا ہوگا؟ فرمایا: پھر موت ہے۔ حضرت موسیٰ نے کہا: پھر اب ہی موت آجائے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ ان کو ارضِ مقدسہ کے اتنے قریب کر دے جتنے قریب ایک پتھر پھینکنے کا فاصلہ ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ نے کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں اس جگہ ہوتا تو تم کو حضرت موسیٰ کی قبر دکھاتا جو کثیب احمر (سرخ ریت کے ٹیلہ) کے پاس راستہ کے ایک جانب ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۳۳۹، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۷۲، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۰۸۹، مسند احمد ج ۲ ص ۳۱۵، کتاب الاسماء والصفات ص ۴۹۳، ۴۹۲، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

ولی کے فضائل کے متعلق مزید احادیث

زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں گئے، وہاں دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے ہوئے رو رہے تھے۔ انہوں نے کہا تم کس وجہ سے رو رہے ہو؟ حضرت معاذ نے کہا میں اس وجہ سے رو رہا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تھوڑا سا ریا بھی شرک ہے اور بے شک جس شخص نے بھی میرے ولی سے عداوت رکھی اس نے اللہ سے اعلان جنگ کر دیا، بے شک اللہ ان نیک متقی بندوں سے محبت کرتا ہے جو چھپے رہتے ہیں، اگر وہ غائب ہوں تو ان کو تلاش نہیں کیا جاتا، اور اگر وہ حاضر ہوں تو ان کو بلایا نہیں جاتا، نہ پہچانا جاتا ہے، ان کے دل ہدایت کے چراغ ہیں وہ ہر غبار آلود اندھیروں سے نکل آتے ہیں۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۹۸۹، المعجم الکبیر ج ۲۰ رقم الحدیث: ۳۲۱، ص ۱۵۴، حلیۃ الاولیاء رقم الحدیث: ۳، طبع جدید، اتحاف السادۃ المتقین ج ۸ ص ۲۶۴، ۲۶۳)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے میرے ولی کو ایذاء پہنچائی، اس سے میری جنگ حلال ہو گئی۔ (حلیۃ الاولیاء رقم الحدیث: ۲، ص ۳۵، اتحاف السادۃ المتقین ج ۸ ص ۴۷۷)

حضرت عمرو بن الجموح رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: میرے اولیاء میرے بندے اور میرے محبوب ہیں، یہ میری مخلوق میں سے وہ لوگ ہیں جو میرا ذکر کرتے ہیں اور میں ان کا ذکر

کرتا ہوں۔ (مسند احمد ج ۳ ص ۴۳۰، حلیۃ الاولیاء رقم الحدیث:۵)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ کتنے لوگ ہیں جن کے بال بکھرے ہوئے غبار آلود ہوتے ہیں، وہ دو بوسیدہ چادریں پہنے ہوئے ہوتے ہیں، ان کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ وہ اگر اللہ پر (کسی کام کے کرنے کی) قسم کھائیں تو اللہ ان کی قسم سچی کردے گا، ان میں سے براء بن مالک ہیں۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۸۵۴، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث:۳۹۸۷، مسند احمد ج ۳ ص ۱۴۵، المستدرک ج ۳ ص ۲۹۱، الجامع الصغیر رقم الحدیث:۴۴۰۱، حلیۃ الاولیاء رقم الحدیث:۱۰، کنز العمال رقم الحدیث:۲۹۲۵، الکامل لابن عدی ج ۳ ص ۷۵، مطبوعہ ۱۴۱۸ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرئیل کو بلا کر فرماتا ہے میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تم اس سے محبت کرو، پس اس سے جبرئیل محبت کرتا ہے، پھر وہ آسمان میں ندا کرتا ہے کہ اللہ فلاں سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو، پس آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں، پھر زمین میں اس کے لیے مقبولیت رکھ دی جاتی ہے، اور جب وہ کسی بندے سے بغض کرتا ہے تو جبرئیل کو بلا کر فرماتا ہے میں فلاں سے بغض رکھتا ہوں تم اس سے بغض رکھو۔ پھر جبرئیل اس سے بغض رکھتا ہے، پھر آسمان والوں میں ندا کرتا ہے اللہ فلاں سے بغض رکھتا ہے تم بھی اس سے بغض رکھو، تو آسمان والے اس سے بغض رکھتے ہیں پھر زمین میں اس کے لیے بغض رکھ دیا جاتا ہے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۶۳۷، صحیح البخاری رقم الحدیث:۷۴۸۵، مسند احمد ج ۲ ص ۴۱۳، مسند احمد رقم الحدیث:۹۳۲۳، دارالحدیث قاہرہ، رقم الحدیث:۷۶۱۴، عالم الکتب بیروت، سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۱۶۱، کنز العمال رقم الحدیث:۳۰۷۷۰، مشکوٰۃ رقم الحدیث:۵۰۰۵)

ابدال کے متعلق احادیث اور آثار اور ان کی فنی حیثیت

شریح بن عبید بیان کرتے ہیں کہ عراق میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے سامنے اہل شام کا ذکر کیا گیا۔ لوگوں نے کہا اے امیر المومنین! ان پر لعنت کیجئے، آپ نے کہا نہیں، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ابدال شام میں ہوں گے اور وہ چالیس مرد ہیں، جب بھی ان میں سے ایک شخص فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرے شخص کو اس کا بدل بنا دیتا ہے، ان کی وجہ سے بارش ہوتی ہے، ان کی وجہ سے دشمنوں کے خلاف مدد حاصل ہوتی ہے، ان کی وجہ سے اہل شام سے عذاب دور کیا جاتا ہے۔

(مسند احمد ج ۱ ص ۱۱۲، طبع قدیم، مسند احمد رقم الحدیث:۸۹۶، طبع دارالحدیث قاہرہ، اس کے حاشیہ میں شیخ احمد شاکر نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے، حافظ الہیثمی نے لکھا ہے کہ شریح بن عبید کے سوا اس حدیث کے تمام راوی صحیح ہیں اور شریح بھی ثقہ ہیں انہوں نے مقداد سے سماع کیا ہے، مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۶۲۔ حافظ سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے لکھا ہے کہ حضرت علی کی حدیث میں بھی ابدال کا ذکر وارد ہے، اس حدیث کو امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے اور اس حدیث کی اور بھی متعدد اسانید ہیں۔ اللآلی المصنوعہ ج ۲ ص ۲۸۰، دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ، علامہ علی بن محمد الکنانی المتوفی ۹۶۳ھ نے لکھا ہے: حضرت علی کی حدیث کو امام احمد، امام طبرانی اور حاکم نے دس سے زیادہ سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے اور بعض سندیں صحیح کی شرط پر ہیں، تنزیہ الشریعہ المرفوعہ ج ۲ ص ۳۰۷، شیخ شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ نے بھی حافظ سیوطی کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت علی کی حدیث حسن ہے، الفوائد المجموعہ ص ۲۴۷، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۶ھ، امام شمس الدین سخاوی متوفی ۹۰۲ھ نے لکھا ہے: حضرت علی کی حدیث

کے رجال حدیث صحیح کے راوی ہیں سوا شریح کے اور وہ ثقہ ہے، امام الضیاء المقدسی نے کہا حضرت علی کی حدیث کو بغیر رفع کے روایت کیا ہے، حضرت علی نے فرمایا: اہل شام کے جم غفیر کو لعنت نہ کرو، کیونکہ اس میں ابدال ہیں، کیونکہ اس میں ابدال ہیں، کیونکہ اس میں ابدال ہیں، مصنف عبدالرزاق ج ١١ ص ٢٤٩، رقم الحدیث: ٢٠٤٥٥؛ اسی سند کے ساتھ امام بیہقی نے اس کو دلائل النبوة میں روایت کیا ہے، اور ان کے علاوہ دیگر نے بھی روایت کیا ہے، بلکہ حاکم نے مستدرک میں حضرت علی کی اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے، اس حدیث کی تقویت اور ائمہ کے درمیان اس کے مشہور ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے امام شافعی نے ایک شخص کے متعلق فرمایا: ہم اس کو ابدال میں سے شمار کرتے ہیں، اور امام بخاری نے ایک اور شخص کے متعلق فرمایا: اس کے ابدال میں سے ہونے کے متعلق کوئی شک نہیں کرتا، ان کے علاوہ نقاد، حفاظ اور ائمہ نے متعدد لوگوں کے متعلق فرمایا کہ وہ ابدال میں سے ہیں، المقاصد الحسنہ ص ٣٣، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ١٤٠٧ھ، حدیث کی تقویت کے متعلق یہ تقریر علامہ سخاوی کے حوالے سے علامہ کنانی نے بھی نقل کی ہے، تنزیہ الشریعہ ج ٢ ص ٣٠٧، علامہ العجلونی متوفی ١١٦٢ھ نے بھی حضرت علی کی اس حدیث کی صحت کے متعلق وہی تقریر کی ہے جو علامہ سخاوی نے لکھی ہے، کشف الخفاء و مزیل الالباس ج ١ ص ٢٧، مطبوعہ مکتبہ الغزالی دمشق، علامہ زبیدی متوفی ١٢٠٥ھ نے بھی لکھا ہے کہ شریح بن عبید کے سوا اس حدیث کے تمام راوی صحیح ہیں اور شریح بھی ثقہ ہے، اور لکھا ہے کہ امام طبرانی اور حاکم نے اس حدیث کو دس سے زیادہ سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اتحاف السادة المتقین ج ٨ ص ٣٨٦، مطبوعہ مصر، ١٣١١ھ۔ شیخ احمد شاکر نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے، علامہ حمزہ احمد الزین نے مسند احمد رقم: ١٥٦١١ مطبوعہ قاہرہ کے حاشیہ پر لکھا ہے یہ حدیث حسن ہے اور احمد شاکر کا اس کو ضعیف کہنا اس کے تعصب پر مبنی ہے)

شریح بھی ثقہ ہیں انہوں نے مقداد سے سماع کیا ہے، (مجمع الزوائد، ج ١٠، ص ٦٢، مسند احمد رقم: ١٥٦١١) کے حاشیہ پر حمزہ احمد الزین نے لکھا ہے کہ حافظ عراقی، الہیثمی اور زبیدی نے لکھا ہے کہ تمام احادیث ابدال حسن ہیں، احمد شاکر کا اس کو ضعیف کہنا تعصب کی بنا پر ہے۔

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس امت میں تیس ابدال ایسے ہیں جو خلیل الرحمٰن کی مثل ہیں، جب بھی ان میں سے کوئی شخص فوت ہوتا ہے تو اللہ اس کی جگہ دوسرے شخص کو بدل بنا دیتا ہے۔

(مسند احمد ج ٥ ص ٣٢٢، مسند احمد رقم الحدیث: ٢٢٥٦٠، اس کے حاشیہ میں الزین نے کہا اس کی سند الہیثمی کے قول پر صحیح ہے، حافظ الہیثمی نے کہا عبدالواحد بن قیس کے سوا اس حدیث کے تمام راوی صحیح ہیں، العجلی اور ابوزرعہ نے اس کی توثیق کی ہے اور دیگر نے اس کی تضعیف کی ہے، مجمع الزوائد ج ١٠ ص ٦٢)

حافظ سیوطی نے لکھا ہے کہ امام احمد نے اپنی مسند میں حضرت عبادہ بن الصامت سے حدیث روایت کی ہے اور اس کی سند حسن ہے۔ (اللآلی المصنوعہ ج ٢ ص ٢٨٠) علامہ کنانی نے لکھا ہے کہ امام احمد نے حضرت عبادہ بن الصامت کی حدیث کو سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔ (تنزیہ الشریعہ ج ٢ ص ٣٠٧) علامہ زبیدی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی اسناد حسن ہے۔
(اتحاف السادة المتقین ج ٨ ص ٣٨٦)

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں ہمیشہ تیس ایسے شخص رہیں گے جن کی وجہ سے زمین قائم رہے گی، ان ہی کی وجہ سے بارش ہوتی ہے اور ان ہی کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی ہے۔ قتادہ نے کہا کہ مجھے امید ہے کہ حسن ان میں سے ہیں۔

(اتحاف السادۃ المتقین ج ۸ ص ۳۸۶، حافظ الہیثمی نے کہا ہے کہ اس حدیث کو امام طبرانی نے عمرو البزار از عنبسہ الخواص سے روایت کیا ہے اور ان دونوں کو میں پہچانتا ہوں اور اس کے بقیہ راوی صحیح ہیں، مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۶۳، یہ حدیث الجامع الصغیر رقم: ۳۰۳۳ میں بھی ہے اور لا یزال (ہمیشہ) کی جگہ الابدال کالفظ ہے)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زمین ہرگز چالیس ایسے آدمیوں سے خالی نہیں رہے گی جو خلیل الرحمٰن کی مثل ہیں، ان ہی کی وجہ سے تم پر بارش ہوتی ہے اور ان ہی کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی ہے، جب ان میں سے ایک شخص فوت ہوتا ہے تو اللہ اس کی جگہ دوسرا بدل پیدا فرمادیتا ہے۔

(المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۴۱۱۳، مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۶۳، اتحاف السادۃ المتقین ج ۸ ص ۳۸۵، کنزالعمال رقم الحدیث: ۳۴۶۰۳، حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کی سند حسن ہے۔ مجمع ج ۱۰ ص ۶۳، علامہ زبیدی نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے، اتحاف السادۃ المتقین ج ۸ ص ۳۸۵)

امام ابو نعیم احمد بن عبد اللہ الاصفہانی المتوفی ۴۳۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ عزوجل کی مخلوق میں تین سو شخص ایسے ہیں جن کے دل حضرت آدم علیہ السلام کے دل کے موافق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں چالیس ایسے شخص ہیں جن کے دل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے موافق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سات ایسے شخص ہیں جن کے دل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل کے موافق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں پانچ ایسے شخص ہیں جن کے دل حضرت جبرئیل علیہ السلام کے موافق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں تین ایسے شخص ہیں جن کے دل حضرت میکائیل علیہ السلام کے موافق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں ایک ایسا شخص ہے جس کا دل حضرت اسرافیل علیہ السلام کے موافق ہے۔ جب ایک شخص فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ تین میں سے اس کا بدل لے آتا ہے اور جب تین میں سے کوئی فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ پانچ میں سے اس کا بدل لے آتا ہے اور جب پانچ میں سے کوئی فوت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ سات میں سے اس کا بدل لے آتا ہے اور جب سات میں سے کوئی فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ چالیس میں سے اس کا بدل لے آتا ہے اور جب چالیس میں سے کوئی فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ تین سو میں سے اس کا بدل لے آتا ہے اور جب تین سو میں سے کوئی فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ عام لوگوں میں سے اس کا کوئی بدل لے آتا ہے، ان ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، بارش برساتا ہے اور فصل اگاتا ہے اور مصائب کو دور کرتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا ان کی وجہ سے کیسے زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تو حضرت عبد اللہ نے فرمایا: وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ امتوں میں کثرت ہو تو بہت لوگ پیدا ہوتے ہیں اور وہ ظالم اور جابر لوگوں کے خلاف دعا کرتے ہیں تو وہ ہلاک کر دیئے جاتے ہیں، وہ بارش کی دعا کرتے ہیں تو بارش ہوتی ہے، وہ اللہ سے دعا کرتے ہیں تو زمین فصل اگاتی ہے، وہ دعا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بلاؤں اور مصائب کو ٹال دیتا ہے۔

(حلیۃ الاولیاء رقم الحدیث: ۱۶، ج ۱ ص ۴۰، طبع جدید، دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ، کنزالعمال رقم الحدیث: ۳۴۵۹۱)

احادیث ابدال کا معناً متواتر ہونا

محدث ابن جوزی نے حضرت ابن مسعود کی اس حدیث کے متعلق کہا ہے کہ اس کی سند میں مجہول راوی ہیں۔

(الموضوعات ج ۳ ص ۱۵۱)

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ ابدال کی احادیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں کہتا ہوں کہ ابدال کی حدیث صحیح ہے چہ جائیکہ اس سے کم ہو اور اگر تم چاہو تو یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ حدیث متواتر ہے، میں نے حدیث ابدال کے متعلق مستقل ایک رسالہ لکھا ہے جس میں، میں نے اس حدیث کو تمام سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت عمر سے مروی ہے جس کو امام ابن عساکر نے دو سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے اور حضرت علی کی حدیث ہے جس کو امام احمد، امام طبرانی اور حاکم وغیرہم نے اس سے زیادہ سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے (ہم اس حدیث کو بیان کر چکے ہیں) اس حدیث کی بعض سندیں حدیث صحیح کی شرط پر ہیں، اور حضرت انس کی حدیث ہے جو چھ سندوں سے مروی ہے، ان میں سے امام طبرانی کی معجم اوسط میں ہے اور اس کو حافظ الہیثمی نے حسن قرار دیا ہے (اس حدیث کو بھی ہم ذکر کر چکے ہیں) اور حضرت عبادہ بن الصامت کی حدیث ہے جس کو امام احمد نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے (اس حدیث کو بھی ہم بیان کر چکے ہیں) اور حضرت ابن عباس کی حدیث ہے جس کو امام احمد نے کتاب الزھد میں سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے اور حضرت ابن عمر کی حدیث ہے جس کو امام طبرانی نے معجم کبیر میں تین سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے (وہ حدیث یہ ہے: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر صدی میں میری امت کے بہترین افراد پانچ سو ہوں گے اور ابدال چالیس ہوں گے، پانچ سو میں کمی ہوگی نہ چالیس میں، جب ان میں سے کوئی شخص فوت ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ پانچ سو میں سے بدل دے گا، اور اس کی جگہ چالیس میں سے داخل کردے گا، صحابہ نے کہا یارسول اللہ! ہمیں ان کے اعمال پر رہنمائی فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: جو ان پر ظلم کرے گا وہ اس کو معاف کر دیں گے، اور بدی کا جواب نیکی سے دیں گے، اور اللہ نے ان کو جو کچھ دیا ہے اس سے وہ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کریں گے۔ (حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۳۹ رقم الحدیث: ۱۵، اتحاف السادۃ المتقین ج ۸ ص ۳۸۶) یہ حدیث حلیہ میں بھی ہے اور حضرت ابن مسعود کی حدیث یہ المعجم الکبیر میں دو سندوں کے ساتھ ہے اور حلیہ میں ہے (اس حدیث کو ہم بیان کر چکے ہیں) اور حضرت عوف بن مالک کی حدیث اس کو امام طبرانی نے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے (وہ حدیث یہ ہے: ابدال اہل شام میں ہیں ان ہی کی وجہ سے لوگوں کی مدد کی جاتی ہے اور ان ہی کی وجہ سے لوگوں کو رزق دیا جاتا ہے۔ اتحاف السادۃ المتقین ج ۸ ص ۳۸۶) اور حضرت معاذ بن جبل کی حدیث اس کو دیلمی نے روایت کیا ہے (وہ حدیث یہ ہے: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص میں تین خصلتیں ہوں وہ ان ابدال میں سے ہے جن کی وجہ سے دنیا قائم ہے، وہ تقدیر پر راضی رہتے ہیں، اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں پر صبر کرتے ہیں اور اللہ کی وجہ سے غضب ناک ہوتے ہیں۔ (الفردوس بماثور الخطاب رقم الحدیث: ۲۴۵۷، اتحاف السادۃ المتقین ج ۸ ص ۳۸۷) اور حضرت ابو سعید خدری کی حدیث جس کو امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے: (وہ حدیث یہ ہے: میری امت کے ابدال جنت میں نماز اور روزے کی وجہ سے داخل نہیں ہوں گے بلکہ وہ جنت میں سخاوت، دلوں کی صفائی اور مسلمانوں کی خیر خواہی کرنے کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے۔ اتحاف السادۃ المتقین ج ۸ ص ۳۸۵) اور حضرت ابو ہریرہ کی حدیث (زمین ایسے تیس آدمیوں سے ہرگز خالی نہیں ہوگی جو حضرت ابراہیم خلیل الرحمن کی مثل ہیں، ان ہی کی وجہ سے لوگ عافیت میں رہتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے ان کو رزق دیا جاتا ہے اور ان ہی کی وجہ سے ان پر بارش ہوتی ہے، اس حدیث کی سند حسن ہے، اتحاف السادۃ المتقین ج ۸ ص ۳۸۷) اور حضرت ام سلمہ کی حدیث جس کو امام احمد اور امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے (وہ حدیث یہ ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک خلیفہ کی موت کے وقت اختلاف ہوگا پھر ایک شخص (مہدی) اہل مدینہ سے نکل کر مکہ کی طرف بھاگتا ہوا جائے گا، پھر اہل مکہ اس کو زبردستی امام بنائیں گے اور رکن اور مقام کے درمیان اس سے بیعت کریں گے، اس کی طرف شام سے ایک

لشکر بھیجا جائے گا، اس لشکر کو مکہ اور مدینہ کے درمیان مقام بیدا میں زمین میں دھنسا دیا جائے گا۔ جب لوگ یہ واقعہ دیکھ لیں گے تو اس شخص کے پاس شام کے ابدال آئیں گے اور اہل عراق کی جماعتیں آئیں گی اور وہ سب اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے۔ الحدیث، سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۴۲۸۶) نیز ابدال کے متعلق حسن بصری، قتادہ، خالد بن معدان، ابن الزاہریہ، ابن شوذب اور عطا وغیرہم تابعین اور تبع تابعین سے حد و شمار سے باہر آثار مروی ہیں اور اس کی مثل لامحالہ تواتر معنوی کو پہنچتی ہے جس سے ابدال کا وجود بداہتاً ثابت ہوتا ہے۔ (التعقبات علی الموضوعات، ج ۷ ۴، مطبوعہ المطبع العلوی لکھنؤ ہند، ۱۳۰۳ھ)

احادیث ابدال کی مزید توثیق

علامہ محمد بن محمد حسینی زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں:

حافظ ابن حجر نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ ابدال کے متعلق متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں، ان میں سے بعض صحیح ہیں اور بعض صحیح نہیں ہیں (یعنی حسن یا ضعیف ہیں) اور رہا قطب تو اس کے متعلق بعض آثار وارد ہیں اور رہا غوث تو صوفیاء کے نزدیک غوث کا جو وصف مشہور ہے وہ ثابت نہیں ہے، حافظ ابن حجر کی عبارت ختم ہوئی، اس سے ظاہر ہو گیا کہ ابن تیمیہ کا یہ زعم باطل ہے کہ ابدال کے متعلق کوئی حدیث صحیح ہے نہ ضعیف، اور یہ احادیث اگر بالفرض سب ضعیف بھی ہوں، تب بھی اگر حدیث ضعیف متعدد طرق اور متعدد صحابہ سے مروی ہو تو حدیث قوی ہو جاتی ہے، حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں یہ حدیث ذکر کی ہے کہ زمین نے اپنے رب سے نبوت منقطع ہونے کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں عنقریب تمہاری پشت پر چالیس صدیق رکھوں گا جب بھی ان میں سے کوئی شخص فوت ہو گا تو اس کی جگہ ایک شخص بدل دیا جائے گا، اسی وجہ سے اس کا نام ابدال ہے پس وہ زمین کی میخ ہیں ان ہی کی وجہ سے زمین قائم ہے اور ان ہی کی وجہ سے بارش ہوتی ہے۔

(اتحاف السادة المتقین ج ۸ ص ۳۸۷، مطبوعہ مصر)

نجباء اور نقباء وغیرہ کی تعداد

علامہ شمس الدین محمد بن عبد الرحمٰن السخاوی المتوفی ۹۰۲ھ لکھتے ہیں:

تاریخ بغداد میں الکتانی سے روایت ہے کہ نقباء تین سو ہیں، نجباء ستر ہیں، ابدال چالیس ہیں، اخیار سات ہیں اور عمد چار ہیں اور غوث ایک ہے، اگر ان کی دعا قبول ہو جائے تو فبہا ورنہ غوث دعا کرتا ہے اور وہ اس وقت تک سوال کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔ الاحیاء میں ہے کہ ہر روز غروب آفتاب سے پہلے ابدال میں سے ایک شخص بیت اللہ کا طواف کرتا ہے اور ہر رات اوتاد میں سے ایک بیت اللہ کا طواف کرتا ہے، میں نے ابدال سے متعلق احادیث کو ایک رسالہ میں جمع کیا ہے اور اس کا نام نظم اللآل فی الکلام علی الابدال رکھا ہے۔

(المقاصد الحسنہ ص ۳۴، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۷ھ)

ولی کی صفات

قرآن مجید نے ولی کی تعریف میں فرمایا ہے: "جو ایمان لائے، اور (ہمیشہ) متقی رہے" ایمان سے یہاں مراد ہے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پاس سے جو کچھ لے کر آئے اس کی تصدیق کرنا، اس کا اقرار کرنا، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل کرنا، اور ہمیشہ متقی رہنے سے مراد ہے کہ وہ تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے ہمیشہ مجتنب رہے اور مکروہ تنزیہی، خلاف سنت اور خلاف اولیٰ سے بچتا رہے، تمام فرائض اور واجبات پر دوام کرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام سنتوں پر پابندی سے عمل کرے، تمام سنتوں اور آداب پر عامل ہو اور نفلی عبادات کو دوام اور استمرار کے ساتھ ادا

کرے اور جب نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو تو اللہ تعالیٰ کی صفات جمال اور جلال میں ڈوبا ہوا ہو، کبھی خوف سے لرزہ براندام ہو اور گرد و پیش سے بیگانہ ہو اور کبھی شوق کی وارفتگی میں خود اپنا بھی ہوش نہ رہے، انہیں عام مسلمانوں کی بہ نسبت سب سے زیادہ اللہ عزوجل کی معرفت ہو اور ان کا دل نور معرفت سے اس طرح مستغرق ہو کہ جب وہ دیکھیں تو اللہ کی قدرت کے دلائل دیکھیں، اور جب وہ سنیں تو اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سنیں اور ان کی حمد و ثنا سنیں اور جب وہ گفتگو کریں تو وہ اللہ عزوجل اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق گفتگو کریں، ان کا عمل اللہ جل مجدہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں ہو اور ان کا ہدف اور نصب العین اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا ہو۔

وہ رات کے پچھلے پہر اٹھ کر اللہ کو یاد کرتے ہوں، قیامت کی ہولناکیوں اور دوزخ کے عذاب کو سامنے تصور کر کے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہوں اور آنسوؤں کے وضو سے خوفِ خدا میں ڈوب کر راتوں کو اٹھ کر نماز پڑھتے ہوں اور گڑگڑاتے ہوئے نالہ نیم شب میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوں، یہ مضمون قرآن مجید کی ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ○ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ○ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا۔ (الفرقان: ۶۶-۶۴)

اور جو لوگ اپنے رب کے سجدے اور قیام میں رات گزار دیتے ہیں○ اور جو یہ دعا کرتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم سے جہنم کا عذاب پھیر دے، بے شک اس کا عذاب چمٹنے والی مصیبت ہے○ بے شک وہ قیام اور سکونت کی بہت بری جگہ ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ○ (آل عمران: ۱۷-۱۶)

وہ متقی لوگ جو دعا کرتے ہیں اے ہمارے رب! بے شک ہم ایمان لائے تو ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا○ وہ صبر کرنے والے، سچ بولنے والے، اطاعت کرنے والے، (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے والے اور رات کے آخری حصوں میں بخشش طلب کرنے والے○

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۙ○ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ○ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ○ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ○ (الذریات: ۱۸-۱۵)

بے شک متقی لوگ جنتوں اور چشموں میں ہوں گے! اپنے رب کی عطا فرمائی ہوئی نعمتیں لے رہے ہوں گے، بے شک وہ اس سے پہلے (دنیا میں) نیک عمل کرنے والے تھے○ وہ رات کو کم سوتے تھے اور رات کے آخری حصوں میں بخشش طلب کرتے تھے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ۔ (الزمر: ۲۳)

اللہ نے بہترین کلام نازل کیا، جس کی سب باتیں آپس میں ایک جیسی ہیں بار بار دہرائی ہوئی جس سے ان لوگوں کے جسموں پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف نرم ہو جاتے ہیں۔

قرآن مجید کو سننے اور اس کے احکام پر عمل کرنے اور اس کی منع کردہ چیزوں سے باز رہنے میں ان کی یہ صفات ہیں:

اَلَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ۔ (الزمر: ۱۸)

جو بات کو غور سے سنتے ہیں پھر اس کی عمدہ طریقہ سے پیروی کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى ○ (النّٰزعٰت: ۴۱-۴۰)

اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس (امارہ) کو اس کی خواہش سے روکا○ تو بے شک جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰۗىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ (الشوریٰ: ۳۸-۳۷)

اور جو لوگ کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جب وہ غضب ناک ہوتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں○ اور جن لوگوں نے اپنے رب کے حکم پر لبیک کہی اور نماز قائم رکھی اور ان کے معاملات باہمی مشوروں سے ہوتے ہیں' اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے وہ اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں○

ہم نے ولی کی تعریف میں ذکر کیا ہے کہ ان کو بہت زیادہ خوفِ خدا ہوتا ہے اور وہ بہت زاہد اور متقی ہوتے ہیں' اب ہم خلفاء راشدین اور امام اعظم سے اس کی چند مثالیں پیش کر رہے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا زہد و تقویٰ اور خوفِ خدا

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک غلام تھا جو آپ کے لیے کما کر لاتا تھا۔ ایک رات وہ آپ کے لیے طعام لے کر آیا' آپ نے اس میں سے کچھ کھا لیا۔ غلام نے کہا کیا وجہ ہے کہ آپ ہر رات مجھ سے سوال کرتے تھے کہ یہ کہاں سے لائے ہو' آج آپ نے سوال نہیں کیا۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا: میں بھوک کی شدت کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا تم یہ کہاں سے لائے ہو۔ اس نے کہا میں زمانہ جاہلیت میں کچھ لوگوں کے پاس سے گزرا اور میں نے منتر پڑھ کر ان کا علاج کیا تھا' انہوں نے مجھ سے معاوضہ دینے کا وعدہ کیا تھا' آج جب میرا وہاں سے گزر ہوا تو وہاں شادی تھی تو انہوں نے اس میں سے مجھے یہ طعام دیا۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا: افسوس! تم نے مجھے ہلاک کر دیا۔ پھر حضرت ابوبکر اپنے حلق میں ہاتھ ڈال کر قے کرنے لگے' اور چونکہ خالی پیٹ میں وہ لقمہ کھایا گیا تھا' وہ نکل نہیں رہا تھا' ان سے کہا گیا کہ بغیر پانی پیے یہ لقمہ نہیں نکلے گا' پھر پانی کا پیالہ منگایا گیا' حضرت ابوبکر پانی پیتے رہے اور اس لقمہ کو نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان سے کہا گیا کہ اللہ آپ پر رحم کرے' آپ نے اس ایک لقمہ کی وجہ سے اتنی مشقت اٹھائی۔ حضرت ابوبکر نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جسم کا جو حصہ مال حرام سے بنا ہے وہ دوزخ کا زیادہ مستحق ہے' پس مجھے یہ خوف ہوا کہ میرے جسم کا کوئی حصہ اس لقمہ سے بن جائے گا۔

(صفوۃ الصفوۃ ج ۱ ص ۱۱۱' مکتبہ نزار مصطفیٰ ریاض' حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۶۵' بیروت' ۱۴۱۸ھ' اتحاف السادۃ المتقین ج ۵ ص ۲۲۶' الجامع الصغیر رقم الحدیث: ۶۲۹۶' کنز العمال رقم الحدیث: ۹۲۵۹)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے نئی قمیص پہنی' وہ مجھے بہت اچھی لگ رہی تھی اور میں اس کو دیکھ رہی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم کیا دیکھ رہی ہو کہ اللہ تعالیٰ تم پر نظر رحمت نہیں فرما رہا! پھر فرمایا:

کیا تم کو معلوم نہیں کہ جب بندہ دنیا کی زیب و زینت پر خوش ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس زینت کو چھوڑ دے۔ حضرت عائشہ نے کہا پھر میں نے اس قمیص کو اتار کر صدقہ کر دیا، تب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہو سکتا ہے کہ اب یہ صدقہ تمہارا کفارہ ہو جائے۔

(حلیتہ الاولیاء رقم الحدیث: ۸۵، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی عبادت، زہد اور خوفِ خدا

حسن بن ابی الحسن بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک زوجہ سے (ان کی وفات کے بعد) شادی کی اور ان سے کہا: میں نے مال اور اولاد کی رغبت کی وجہ سے تم سے شادی نہیں کی، میں نے تم سے صرف اس وجہ سے شادی کی ہے کہ تم مجھے بتاؤ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات کو نماز کس طرح پڑھتے تھے۔ انہوں نے کہا حضرت عمر عشاء کی نماز پڑھتے، پھر ہم سے فرماتے کہ میرے سرہانے پانی کا ایک برتن بھر کر رکھ دو، پھر رات کو بیدار ہوتے اور اس پانی سے وضو کرتے، پھر اللہ عزوجل کا ذکر کرتے رہتے حتیٰ کہ آپ کو اونگھ آجاتی پھر بیدار ہوتے حتیٰ کہ رات کی وہ ساعت آجاتی جس میں آپ قیام کرتے تھے۔ (کتاب الزہد للامام احمد ص ۱۴۸، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ)

عبداللہ بن عیسیٰ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے چہرے پر مسلسل رونے کی وجہ سے دو سیاہ لکیریں پڑ گئی تھیں۔ (کتاب الزہد لاحمد ص ۱۵۰، صفوۃ الصفوۃ ج ۱ ص ۱۴۸)

ابو عثمان بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا میں نے حضرت عمر کو دیکھا وہ رمی جمار (شیطان کو کنکریاں مارنا) کر رہے تھے اور انہوں نے جو چادر پہنی ہوئی تھی اس میں چمڑے کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ (کتاب الزہد لاحمد ص ۱۵۱)

حسن بیان کرتے ہیں کہ جس وقت حضرت عمر خلیفہ تھے وہ لوگوں کو خطبہ دے رہے تھے اور ان کے تہبند میں بارہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ (امام ابن جوزی نے چودہ پیوند کی روایت ذکر کی ہے) (کتاب الزہد لاحمد ص ۱۵۴، صفوۃ الصفوۃ ج ۱ ص ۱۴۷)

حسن بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بخدا! اگر میں چاہوں تو سب سے زیادہ ملائم لباس پہنوں اور سب سے لذیذ کھانا کھاؤں اور سب سے اچھی زندگی گزاروں لیکن میں نے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کو ان کے کاموں پر ملامت کی اور فرمایا:

اذھبتم طیبتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بھا۔	تم اپنی عمدہ لذیذ چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں لے چکے اور تم نے ان سے (خوب) فائدہ اٹھالیا۔

(حلیتہ الاولیاء رقم الحدیث: ۱۱۷، طبع جدید)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو تین صفوں تک ان کے رونے کی آواز پہنچتی تھی۔ (حلیتہ الاولیاء رقم الحدیث: ۱۳۴، طبع جدید)

داؤد بن علی کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب نے فرمایا: اگر فرات کے کنارے ایک بکری بھی ضائع ہو گئی تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ مجھ سے اس کے متعلق سوال کرے گا۔ (حلیتہ الاولیاء رقم الحدیث: ۱۴۱، صفوۃ الصفوۃ ج ص ۱۴۸)

یحییٰ بن ابی کثیر روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر آسمان سے ایک منادی یہ ندا کرے کہ: اے لوگو! تم سب کے سب جنت میں داخل ہو جاؤ، سوا ایک شخص کے، تو مجھے ڈر ہے کہ وہ ایک شخص میں ہوں گا اور اگر منادی یہ ندا کرے کہ: اے لوگو! تم سب کے سب دوزخ میں داخل ہو جاؤ سوا ایک شخص کے تو مجھے امید ہے کہ وہ ایک

شخص میں ہوں گا۔ (حلیۃ الاولیاء رقم الحدیث: ۱۴۲)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر تاحیات لگاتار روزے رکھتے رہے۔

سعید بن المسیب بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر آدھی رات کے وقت نماز پڑھنے کو پسند کرتے تھے۔

(صفوۃ الصفوۃ ج ۱ ص ۱۲۹)

عمرو بن میمون بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے عبداللہ بن عمر! ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ عمر بن الخطاب آپ کو سلام عرض کرتا ہے' اور ان سے یہ سوال کرو کہ میں اپنے صاحبوں (سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر) کے ساتھ دفن کر دیا جاؤں؟ حضرت عائشہ نے فرمایا: میں اپنے لیے اس جگہ دفن ہونے کا ارادہ رکھتی تھی' لیکن آج میں عمر کو اپنے اوپر ترجیح دیتی ہوں۔ جب حضرت ابن عمر واپس آئے تو حضرت عمر نے پوچھا کیا ہوا؟ انہوں نے کہا اے امیر المومنین! انہوں نے آپ کو اجازت دے دی۔ حضرت عمر نے کہا میرے نزدیک اس جگہ مدفون ہونے سے زیادہ اور کوئی اہم چیز نہیں تھی' جب میں فوت ہو جاؤں تو میرے جنازہ کو ام المومنین کے پاس لے جانا' ان کو سلام عرض کرنا پھر کہنا عمر بن الخطاب آپ سے اجازت طلب کرتا ہے' اگر وہ اجازت دے دیں تو مجھے دفن کر دینا ورنہ مجھے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دینا۔ پھر فرمایا میرے نزدیک اس خلافت کا ان مسلمانوں سے زیادہ کوئی اور مستحق نہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وصال کے وقت راضی تھے' پس میرے بعد جس کو بھی خلیفہ بنا دیا جائے تم سب اس کے احکام کو سننا اور اس کی اطاعت کرنا' پھر حضرت عمر نے یہ نام لیے: حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت طلحہ' حضرت زبیر' حضرت عبدالرحمن بن عوف اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم۔ اس وقت انصار کا ایک نوجوان آیا اور کہا اے امیر المومنین! آپ کو اللہ کی طرف سے خوشخبری ہو' آپ کو معلوم ہے کہ آپ اسلام لانے میں مقدم ہیں' پھر آپ کو خلیفہ بنایا گیا تو آپ نے عدل کیا' پھر ان تمام (خوبیوں) کے بعد آپ کو شہادت ملی۔ آپ نے فرمایا: اے میرے بھتیجے! کاش کہ یہ سب برابر سرابر ہو جائے' مجھے عذاب ہو نہ ثواب ہو' الحدیث۔ (صحیح البخاری' رقم الحدیث: ۱۳۹۲)

حضرت عبداللہ بن عامر بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن الخطاب کو دیکھا' انہوں نے زمین سے ایک تنکا اٹھا کر کہا: کاش! میں یہ تنکا ہوتا' کاش میں پیدا نہ کیا جاتا' کاش میری ماں مجھے نہ جنتی' کاش میں کچھ بھی نہ ہوتا' کاش میں بھولا بسرا ہوتا۔

(صفوۃ الصفوۃ ج ۱ ص ۱۲۸)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عبادت' زہد اور خوفِ خدا

حسن بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جن دنوں خلیفہ تھے وہ مسجد میں سوئے ہوئے تھے اور ان کی پشت پر کنکریوں کے نشان تھے' اور یہ کہا جاتا تھا یہ امیر المومنین ہیں' یہ امیر المومنین ہیں۔

(کتاب الزھد لاحمد ص ۱۵۸' حلیۃ الاولیاء رقم الحدیث: ۱۷۹' صفوۃ الصفوۃ ج ۱ ص ۱۳۷)

عبداللہ بن الرومی کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رات کو اٹھتے اور وضو کے لیے پانی لیتے۔ ان کی اہلیہ نے کہا آپ خادموں کو کیوں نہیں کہتے وہ آپ کے لیے پانی لے آئیں گے۔ حضرت عثمان نے فرمایا: نہیں ان کو نیند میں آرام کرنے دو۔

(کتاب الزھد لاحمد ص ۱۵۸)

زہیمہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دن کو روزہ رکھتے تھے اور رات کو قیام کرتے تھے اور رات کے اول حصہ میں صرف تھوڑی دیر سوتے تھے۔ (کتاب الزھد لاحمد ص ۱۶۱' صفوۃ الصفوۃ ج ۱ ص ۱۳۶)

شرحبیل بن مسلم بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ لوگوں کو امیروں والا کھانا کھلاتے تھے اور جب گھر میں داخل ہوتے تو سرکہ اور زیتون کے تیل سے روٹی کھاتے تھے۔ (کتاب الزہد لاحمد، ص ۱۶۰، صفوۃ الصفوۃ ج ۱ ص ۱۴۷)

حضرت عثمان کے آزاد شدہ غلام ہانی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب کسی قبر کے پاس کھڑے ہوتے تو اس قدر روتے کہ ان کی ڈاڑھی آنسوؤں سے بھیگ جاتی۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ جنت اور دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو نہیں روتے اور قبر کو دیکھ کر اس قدر روتے ہیں، تو انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: قبر آخرت کی منازل میں سے سب سے پہلی منزل ہے۔ جو اس منزل سے نجات پا گیا اس کے لیے اس کے بعد کی منازل زیادہ آسان ہیں اور اگر اس سے نجات نہیں ہوئی تو بعد کی منازل زیادہ دشوار ہیں۔ (کتاب الزہد لاحمد ص ۱۶۰، حلیۃ الاولیاء رقم الحدیث: ۱۸۶)

نافع بیان کرتے ہیں جس دن حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ شہید کیے گئے اس دن صبح کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اصحاب سے وہ خواب بیان کیا جو اس رات انہوں نے دیکھا تھا۔ انہوں نے کہا میں نے گزشتہ رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، آپ نے مجھ سے فرمایا: اے عثمان! آج روزہ ہمارے پاس افطار کرنا، پھر حضرت عثمان نے اس دن روزہ رکھ لیا اور اس دن وہ شہید ہو گئے۔ (الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۵۵)

کثیر بن الصلت الکندی بیان کرتے ہیں جس دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، اس دن وہ سو گئے اور وہ جمعہ کا دن تھا، جب وہ بیدار ہوئے تو انہوں نے کہا: اگر تم یہ نہ کہو کہ عثمان تمنائیں اور آرزوئیں کر رہے ہیں تو میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں، ان کے اصحاب نے کہا اللہ آپ کی حفاظت کرے ہم لوگوں کی طرح باتیں بنانے والے نہیں ہیں۔ حضرت عثمان نے کہا: میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، آپ نے فرمایا: تم اس جمعہ کو ہمارے پاس حاضر ہونے والے ہو۔ (الطبقات ج ۳ ص ۵۵)

حضرت عثمان کی زوجہ بنت الفرافصہ نے بیان کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اونگھ آ گئی، جب وہ بیدار ہوئے تو انہوں نے کہا: یہ لوگ مجھے شہید کر دیں گے۔ میں نے کہا: ہرگز نہیں! اے امیر المومنین۔ حضرت عثمان نے کہا: میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی زیارت کی ہے، انہوں نے فرمایا: آج رات ہمارے پاس روزہ افطار کرنا۔ (الطبقات ج ۳ ص ۵۵)

زبیر بن عبداللہ اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں، جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر چھریوں سے وار کیے گئے تو انہوں نے کہا بسم اللہ توکلت علی اللہ، خون ان کی ڈاڑھی پر بہہ رہا تھا، قرآن مجید ان کے سامنے رکھا تھا، وہ قرآن مجید پڑھ رہے تھے اور خون قرآن مجید پر بہہ رہا تھا حتیٰ کہ خون اس آیت پر ٹھہر گیا: فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم (البقرہ: ۱۳۷) (الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۵۵-۵۴، کتاب الزہد لاحمد ص ۱۵۹-۱۵۸)

ابن سیرین بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا تو ان کی اہلیہ نے کہا: تم نے ان کو شہید کر دیا، وہ ہر رات نماز میں قیام کرتے تھے اور ایک رکعت میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے۔

(الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۵۶، حلیۃ الاولیاء رقم الحدیث: ۱۶۵)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عبادت، زہد اور خوفِ خدا

جمیع بن عمر التیمی بیان کرتے ہیں کہ میں اپنی پھوپھی کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے پوچھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ کون محبوب تھا؟ انہوں نے فرمایا: (سیدتنا) فاطمہ (رضی اللہ عنہا) پوچھا

گیا اور مردوں میں؟ فرمایا: ان کے خاوند (حضرت علی رضی اللہ عنہ) بے شک جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ بہت زیادہ روزے رکھنے والے اور بہت زیادہ راتوں کو قیام کرنے والے تھے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۸۷۴، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۴۸۵۷، المستدرک ج ۳ ص ۱۵۴)

مجمع بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیت المال کا سارا مال تقسیم کرنے کا حکم دیتے، پھر اس میں جھاڑو دے کر اس کو دھوڈالتے پھر اس میں نماز پڑھتے اور یہ امید رکھتے کہ قیامت کے دن یہ بیت المال گواہی دے گا کہ انہوں نے بیت المال کے مال کو مسلمانوں سے روکا نہیں۔ (کتاب الزھد لاحمد ص ۱۶۳، صفوۃ الصفوۃ ج ۱ ص ۱۴۲)

حبہ بن جوین بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس فالودہ لایا گیا اور ان کے سامنے رکھا گیا تو حضرت علی نے فرمایا: تیری بہت اچھی خوشبو ہے اور بہت اچھا رنگ ہے اور بہت اچھا ذائقہ ہے لیکن مجھے یہ ناپسند ہے کہ مجھے تجھے کھانے کی عادت پڑ جائے۔ (کتاب الزھد لاحمد ص ۱۶۵)

حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے حضرت علی کی شہادت کے بعد خطبہ دیا کہ تمہارے پاس سے ایک امین شخص چلا گیا، پہلوں میں اس جیسا کوئی امین تھا اور نہ بعد میں کوئی ان جیسا ہوگا، بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جہاد کے لیے بھیجتے تھے اور ان کو جھنڈا عطا فرماتے اور وہ ہمیشہ فتح و کامرانی کے ساتھ لوٹتے تھے۔ انہوں نے اپنے ترکہ میں کوئی سونا، چاندی نہیں چھوڑا سوا سات سو درہم کے جو انہوں نے مستحقین میں تقسیم کرنے کے لیے رکھے ہوئے تھے اور ان کے اہل کے لیے کوئی خادم نہیں تھا۔ (کتاب الزھد لاحمد ص ۱۶۶)

یزید بن محجن بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، آپ نے اپنی تلوار منگا کر اس کو میان سے نکالا پھر فرمایا: اس تلوار کو کون خریدے گا، بخدا اگر میرے پاس لباس کو خریدنے کے لیے پیسے ہوتے تو میں اس کو نہ فروخت کرتا۔ (کتاب الزھد لاحمد ص ۱۶۴، حلیۃ الاولیاء رقم الحدیث: ۲۵۸، الریاض النضرۃ ج ۳ ص ۲۲۰)

ہارون بن عنزہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت علی بن ابی طالب کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ ایک چادر میں کپکپا رہے تھے۔ میں نے کہا اے امیرالمومنین! اللہ نے آپ کے لیے اور آپ کے اہل کے لیے بھی اس بیت المال میں حصہ رکھا ہے، اور آپ نے اپنا یہ حال بنا رکھا ہے! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمہارے مال میں سے کچھ کم نہیں کرنا چاہتا، میرے پاس صرف میری یہ چادر ہے جو میں مدینہ سے لایا تھا۔ (صفوۃ الصفوۃ ج ۱ ص ۱۴۳)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں ایک روایت پر علامہ قرطبی کا تبصرہ

ابو جعفر احمد المشہور بالمحب الطبری المتوفی ۶۹۴ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا۔ (الدھر: ۸) — اور وہ اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور اسیر (قیدی) کو کھانا کھلاتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو کی کچھ مقدار کے عوض ایک رات صبح تک ایک باغ میں پانی دیا۔ صبح کو انہوں نے جو وصول کیے اور گھر جا کر ان میں سے تہائی جو کو پیسا تاکہ اس سے کھانا کھائیں، جب حریرہ پک گیا تو ایک مسکین نے آ کر سوال کیا، انہوں نے وہ کھانا اس کو کھلا دیا۔ پھر دوسرے تہائی جو کا کھانا تیار کیا، تو ایک یتیم نے آ کر سوال کیا تو انہوں نے وہ کھانا اس کو کھلا دیا، پھر آخری تہائی حصہ کے جو سے کھانا تیار کیا تو ایک قیدی نے آ کر سوال کیا، اور خود تمام اہل و عیال سمیت بھوکے رہے تب یہ آیت نازل ہوئی۔ (بعض روایات میں ہے یہ معاملہ تین

دن تک ہوتا رہا اور حضرت علی اور ان کے اہل و عیال تین دن تک بھوکے رہے، علامہ قرطبی نے اسی طرح یہ روایت بیان کی ہے۔ (ریاض النضرۃ ج ۳ ص ۲۰۹-۲۰۸، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں اس روایت کو بالعموم بیان کیا جاتا ہے لیکن علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ نے اس روایت کو رد کر دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

حکیم ترمذی نے کہا ہے کہ کسی جاہل نے اس روایت کو گھڑ لیا ہے، حالانکہ یہ روایت احادیث متواترہ کے خلاف ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہترین صدقہ وہ ہے جو انسان اپنی خوش حالی اور تونگری کے وقت دے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث:۱۴۲۶) نیز آپ نے فرمایا: پہلے اپنے نفس سے ابتدا کرو، (صحیح البخاری رقم الحدیث:۶۷۱۶) اور آپ نے فرمایا: اپنے اہل و عیال کو کھلاؤ (صحیح البخاری رقم الحدیث:۱۴۲۶، صحیح مسلم رقم الحدیث:۱۰۳۴) اور اللہ تعالیٰ نے شوہروں پر ان کی بیویوں اور ان کے بچوں کو کھانا کھلانا فرض کر دیا ہے:

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (البقرہ: ۲۳۳)

اور جس کا بچہ ہے اس پر ان (دودھ پلانے والی ماؤں) کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق دینا فرض ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی شخص کے گناہ کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اس کو ضائع کر دے جس کو وہ روزی دیتا ہے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۱۶۹۲، سنن النسائی رقم الحدیث:۲۵۴۳، مسند احمد رقم الحدیث:۶۵۰۵، دار الفکر، مسند احمد رقم الحدیث:۶۴۹۵، دار الحدیث قاہرہ و عالم الکتب، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:۲۰۸۱۰، مسند حمیدی رقم الحدیث:۵۹۹، المستدرک ج ۱ ص ۴۱۵، اس حدیث کی سند صحیح ہے، احمد شاکر)

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جس کی روزی اس پر لازم ہے وہ اس کی روزی ضائع کر دے۔ کیا کوئی عاقل یہ گمان کر سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس حکم سے غافل تھے، حتیٰ کہ وہ اور ان کے اہل و عیال تین دن تک بھوکے رہے، اگر مان لیا جائے کہ انہوں نے اپنے نفس پر یہ ایثار کیا تھا تو تین دن تک اپنی اہلیہ کو بھوکا رکھنے کا کیا جواز تھا، اور اگر اہلیہ کا بھی ایثار مان لیا جائے تو تین دن تک پانچ اور چھ سال کے کمسن بچوں کو بھوکا رکھنے کا کیا جواز تھا اور اگر ایک دن کی روایت مان لی جائے تو جن کی روزی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لازم تھی ان کو بھی ایک دن بھوکا رکھنا حضرت علی ایسے کامل متقی سے کب متصور ہو سکتا ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۹ ص ۱۲۰-۱۱۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام اعظم کے اخلاق، زہد و تقویٰ، عبادت اور خوفِ خدا

امام ابن بزاز کردری متوفی ۸۲۷ھ لکھتے ہیں:

امام زعفرانی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہارون الرشید نے امام ابو یوسف سے کہا کہ امام ابو حنیفہ کے اوصاف بیان کیجئے۔ فرمایا: امام اعظم محارم سے شدید اجتناب کرتے تھے۔ بلا علم، دین میں کوئی بات کہنے سے سخت ڈرتے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں انتہائی مجاہدہ کرتے، اہلِ دنیا کے منہ پر کبھی ان کی تعریف نہیں کرتے تھے۔ اکثر خاموش رہتے اور مسائلِ دینیہ میں غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ اتنے عظیم علم کے باوجود بے حد سادہ اور منکسر المزاج تھے۔ جب ان سے کوئی سوال پوچھا جاتا تو کتاب و سُنّت کی طرف رجوع کرتے اور اگر اس کی نظیر قرآن و حدیث میں نہ ملتی تو پھر قیاس کرتے۔ نہ کسی شخص سے طمع کرتے اور نہ بھلائی کے سوا کبھی کسی کا تذکرہ کرتے۔ ہارون الرشید یہ سنتے ہی کہنے لگا: صالحین کے اخلاق ایسے ہی ہوتے ہیں، پھر اس نے

کاتب کو ان اوصاف کے لکھنے کا حکم دیا اور اپنے بیٹے سے کہا: ان اوصاف کو یاد کر لو۔ (مناقب کردری ج ا ص ۲۲۶)

علامہ ابن حجر ہیتمی مکی متوفی ۹۷۳ھ لکھتے ہیں:

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ امام اعظم اگر کسی کو کچھ عطا فرماتے اور وہ اس پر ان کا ممنون ہوتا تو آپ کو بے حد افسوس ہوتا۔ فرماتے: شکر کا مستحق تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جس کا دیا ہوا مال میں نے تم تک پہنچایا ہے۔ امام ابو یوسف نے کہا کہ امام اعظم بیس سال تک میری اور میرے اہل و عیال کی کفالت فرماتے رہے۔ ایک دن میں نے عرض کیا کہ میں نے آپ جیسا فیاض کوئی شخص نہیں دیکھا۔ فرمایا: تم نے حماد کو نہیں دیکھا ورنہ ایسا کبھی نہ کہتے۔

شفیق بیان کرتے ہیں کہ میں امام اعظم کے ساتھ بازار جا رہا تھا' راستہ میں ایک شخص آپ کو دیکھ کر چھپ گیا۔ آپ نے اس کو بلا کر چھپنے کی وجہ پوچھی۔ اس نے بتایا کہ میں نے آپ کے دس ہزار درہم دینے ہیں' کافی عرصہ گزر چکا لیکن میں تنگ دستی کی وجہ سے نہیں دے سکا اس لیے شرم کی وجہ سے آپ کو دیکھ کر چھپ گیا تھا۔ اس کی اس گفتگو کو سن کر آپ پر بڑا گہرا اثر ہوا اور فرمایا: جاؤ میں خدا کو گواہ کر کے تمہارا سارا قرضہ معاف کرتا ہوں۔ (الخیرات الحسان ص ۹۵)

امام رازی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام اعظم کسی جگہ جا رہے تھے۔ راستہ میں کیچڑ تھی۔ ایک جگہ آپ کے پیر کی ٹھوکر سے کیچڑ اڑ کر کسی شخص کے مکان کی دیوار سے جا لگی۔ آپ پریشان ہو گئے کہ اگر کیچڑ اکھاڑ کر دیوار صاف کی جائے تو دیوار کی مٹی بھی اتر آئے گی اور اگر یونہی چھوڑ دیا جائے تو ایک شخص کی دیوار خراب ہوتی ہے۔ اسی پریشانی میں تھے کہ صاحب خانہ باہر آیا' اتفاق سے وہ شخص یہودی تھا اور آپ کا مقروض تھا۔ آپ کو دیکھ کر سمجھا کہ قرض مانگنے آئے ہیں۔ پریشان ہو کر عذر پیش کرنے لگا۔ آپ نے فرمایا: قرض کو چھوڑو میں تو اس خلجان میں ہوں کہ تمہاری دیوار کو صاف کیسے کروں۔ کیچڑ کھرچوں تو خطرہ ہے دیوار سے کچھ مٹی بھی اتر آئے گی اور اگر یونہی رہنے دوں تو تمہاری دیوار گندی ہوتی ہے۔ یہ بات سن کر یہودی بے ساختہ کہنے لگا: حضور دیوار کو بعد میں صاف کیجئے گا پہلے کلمہ پڑھا کر میرا دل پاک کر دیں۔

امام اعظم عبادت و ریاضت میں قدم راسخ رکھتے تھے۔ ان کی عبادت و ریاضت کا جو حال غیر حنفی علماء نے بیان کیا ہے وہ عادت سے اس قدر بعید اور اتنا حیرت انگیز ہے کہ آج کی عیش کوش اور تن آسان دنیا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ حنفی شافعی بلکہ ملت اسلامیہ کے علماء کے درمیان یہ بات بے حد استفاضہ سے زیادہ معروف ہے کہ امام ابو حنیفہ چالیس سال تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھتے تھے لیکن زمانہ قریب کے مشہور مورخ جناب شبلی صاحب نے اس واقعہ سے سرا سر انکار اور اس کو عقل کے خلاف قرار دیا ہے۔ دراصل گمراہی کی سب سے پہلی بنیاد یہ ہے کہ ہم اپنی عقل و فراست اور اپنے اخلاق و کردار کے میزان سے صالحین امت کے کارناموں کو تولنا شروع کر دیں۔ غور کیجئے امام بخاری کو تین لاکھ احادیث زبانی یاد تھیں۔ کیا آج کی دنیا کے لوگوں کی قوتِ حافظہ کو سامنے رکھ کر یہ باور کرنا ممکن ہے۔ کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ امام شمس الدین سرخسی نے تیس ضخیم مجلدات پر مشتمل ''مبسوط'' جیسی عظیم کتاب بغیر کسی کتاب کے مطالعہ کے زبانی املا کرائی ور صرف ''مبسوط'' ہی نہیں' امام سرخسی نے ''مبسوط'' جیسی کئی ضخیم کتابیں قید خانہ میں بغیر مطالعہ کے زبانی املاء کرائیں۔ کیا آج کے لوگوں کی قوتِ علمیہ کو سامنے رکھ کر یہ باور کرنا ممکن ہے کہ کوئی شخص محض حافظہ کی بنیاد پر اتنا عظیم کام کر سکتا ہے' جس طرح سلف صالحین کا یہ گروہ اپنی قوتِ علمیہ کے اعتبار سے ہم سے آگے تھا اس طرح یہ نفوسِ قدسیہ اپنی قوتِ عملیہ کے لحاظ سے بھی ہمارے وہم و گمان سے بہت بلند تھے۔

علامہ ابن حجر ہیتمی مکی متوفی ۹۷۳ھ لکھتے ہیں:

امام ابویوسف رحمتہ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کی شب بیداری کا سبب یہ تھا کہ ایک بار ایک شخص نے آپ کو دیکھ کر کہا: یہ وہ شخص ہیں جو عبادت میں پوری رات جاگ کر گزارتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے یہ سنا تو فرمانے لگے: ہمیں لوگوں کے گمان کے مطابق بننا چاہیے۔ اس وقت سے آپ نے رات کو جاگ کر عبادت کرنی شروع کی یہاں تک کہ عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھا کرتے اور چالیس سال تک لگاتار اس معمول پر قائم رہے۔ (الخیرات الحسان ص ۸۲)

فضل بن دکین کہتے ہیں کہ میں نے تابعین میں امام ابوحنیفہ کی طرح کسی شخص کو شدتِ خشوع سے نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ دعا مانگتے وقت خوفِ خداوندی سے آپ کا چہرہ زرد ہو جاتا تھا اور کثرتِ عبادت کی وجہ سے آپ کا بدن کسی سال خوردہ مشک کی طرح مرجھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایک بار آپ نے رات کو نماز میں قرآن کریم کی آیتِ مبارکہ بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر کی تلاوت کی پھر اس کی قرأت سے آپ پر ایسا کیف طاری ہوا کہ بار بار اس آیت کو دہراتے رہے یہاں تک کہ موذن نے صبح کی اذان کہہ دی۔ (الخیرات الحسان ص ۸۳)

افعالِ خارقہ (خلافِ عادت کاموں) کی اقسام اور کرامت کی تعریف

دراصل اللہ کا ولی وہی شخص ہوتا ہے جو کامل مسلمان ہو۔ وہ خلوت و جلوت میں اللہ تعالیٰ کا عبادت گزار ہو اور ہر قسم کے گناہوں کی آلودگی سے اس کا دامن پاک ہو خواہ اس سے کسی کرامت کا ظہور ہوا ہو یا نہیں، تاہم بعض اوقات اولیاء اللہ سے کرامتوں کا ظہور بھی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ہم کرامت کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں، پہلے ہم خرقِ عادت کاموں کی اقسام بیان کریں گے جس کے ضمن میں کرامت کی تعریف آ جائے گی پھر ہم کرامت کے ثبوت میں قرآنِ مجید اور احادیثِ صحیحہ سے دلائل پیش کریں گے، فنقول وباللہ التوفیق۔

خلافِ عادت کاموں کی حسبِ ذیل اقسام ہیں:

(۱) **ارہاص:** اعلانِ نبوت سے پہلے نبی سے جو خلافِ عادت امور صادر ہوں، جیسے یہ حدیث ہے: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں مکہ میں ایک پتھر کو پہچانتا ہوں جو اعلانِ نبوت سے پہلے مجھ پر سلام عرض کرتا تھا، میں اس کو اب بھی پہچانتا ہوں۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۲۷۷)

(۲) **معجزہ:** اعلانِ نبوت کے بعد نبی سے جو خلافِ عادت امور صادر ہوں اور وہ اس کے دعویٰ نبوت کے موید ہوں جیسے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ کے کلام کو اس چیلنج کے ساتھ پیش کرنا کہ کوئی شخص اس کلام کی نظیر نہیں لا سکتا اور اس کے علاوہ آپ کے بکثرت معجزات ہیں۔

(۳) **کرامت:** وہ کامل مسلمان جو کسی نبی کی شریعت کا متبع اور مبلغ ہو اس سے ایسے خلافِ عادت امور ظاہر ہوں جن سے اس کے مرتبہ اور مقام کا علم ہو اور وہ امور اس کے نبی کے موید ہوں وہ از خود مدعی نبوت نہ ہو۔

(۴) **معونت:** کسی عام مسلمان سے کسی خلافِ عادت کام کا ظہور ہو۔

(۵) **استدراج:** کافر سے کسی خلافِ عادت کام کا ظہور ہو۔

(۶) **اہانت:** جھوٹے نبی سے خلافِ عادت کام کا ظہور ہو اور وہ اس کے دعویٰ کا مکذب ہو جیسے مسیلمہ کذاب سے کسی کانے نے کہا: آپ نبی ہیں تو دعا کریں میری کانی آنکھ ٹھیک ہو جائے۔ اس نے دعا کی تو اس کی دوسری آنکھ کی بینائی بھی جاتی رہی۔ اسی طرح اس نے ایک کنوئیں میں تھوکا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس کا پانی میٹھا ہو جائے گا تو اس کا پانی کڑوا ہو گیا، یا جیسے غلام احمد قادیانی نے دعویٰ کیا کہ محمدی بیگم سے اس کا نکاح ہو جائے گا لیکن اس کا نکاح مرزا سلطان محمد سے ہو گیا، پھر اس نے دوبارہ

دعویٰ کیا کہ شادی کے اڑھائی سال بعد مرزا سلطان محمد مرجائے گا اور محمدی بیگم اس کے نکاح میں آجائے گی لیکن خود مرزا غلام احمد مرگیا اور اس کی موت کے بعد دیر تک مرزا سلطان محمد زندہ رہا' اسی طرح مرزا قادیانی نے پیش گوئی کی کہ عیسائی پادری آتھم ۵ ستمبر ۱۸۹۴ء کو مرجائے گا' لیکن وہ زندہ رہا اور عیسائیوں نے بڑی شان و شوکت سے اس کا جلوس نکالا' مرزا قادیانی نے ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء کو ایک اشتہار شائع کیا' اس میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کو مخاطب کر کے لکھا: اگر میں ایسا ہی کذاب اور مفتری ہوں جیسا کہ آپ کہتے ہیں تو میں آپ کی زندگی میں ہی ہلاک ہو جاؤں گا۔ اگر وہ سزا جو انسان کے ہاتھوں نہیں بلکہ محض خدا کے ہاتھوں سے ہے جیسے طاعون' ہیضہ وغیرہ مہلک بیماریاں آپ پر میری زندگی میں وارد نہ ہو سکیں تو میں خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں۔ لیکن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری کی زندگی میں مرزا غلام احمد قادیانی ہیضہ میں مبتلا ہو کر مرگیا اور وہ اس کے بعد دیر تک زندہ رہے اور مرزا قادیانی کی تمام پیش گوئیاں الٹ گئیں اور اس کے دعویٰ کی مکذب ہوئیں اور اسی کو اہانت کہتے ہیں۔

اولیاء اللہ کی کرامات کے ثبوت میں قرآنِ مجید کی آیات

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ (الحجرات: ۱۳)

بے شک تم میں سب سے زیادہ صاحبِ کرامت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صاحبِ کرامت کا اطلاق اس شخص پر ہو گا جو متقی ہو' اور اصطلاح میں جو کرامت کا معنی ہے یعنی جس متقی شخص سے کسی خلافِ عادت فعل کا ظہور ہو اس کے ثبوت میں حسبِ ذیل آیات ہیں:

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ فَلَمَّا رَاٰہُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَہٗ قَالَ ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ۔ (النمل: ۴۰)

جس کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا: میں اس تخت کو آپ کے پاس پلک جھپکنے سے پہلے لے آتا ہوں تو جب سلیمان نے اس تخت کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو کہا: یہ میرے رب کا فضل ہے۔

علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ یہ تخت دو ماہ کی مسافت پر واقع تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی امت کے ایک ولی نے اسے پلک جھپکنے سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے حاضر کر دیا۔ علامہ قرطبی نے لکھا ہے: جمہور کے نزدیک اس شخص کا نام آصف بن برخیا تھا۔

حافظ اسمٰعیل بن عمر بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ لکھتے ہیں:

مجاہد' سعید بن جبیر' محمد بن اسحٰق' زہیر بن محمد وغیرہم نے کہا ہے کہ وہ تخت یمن میں تھا اور حضرت سلیمان شام میں تھے۔ جب آصف بن برخیا نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ وہ بلقیس کے تخت کو لے آئے تو وہ تخت زمین کے اندر سے گھسا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے نکل آیا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۴۰۰' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۹ھ)

نیز علامہ محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

شیخ اکبر قدس سرہ نے کہا ہے کہ آصف نے عین عرش (تخت) میں تصرف کیا' اس نے عرش کو اس کی جگہ پر معدوم کر دیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے موجود کر دیا اور آصف کا قول ہی ان کا فعل تھا کیونکہ کامل کا قول اللہ تعالیٰ کے کن فرمانے کے حکم میں ہے۔ شیخ اکبر نے جو ذکر کیا ہے وہ میرے نزدیک جائز ہے البتہ یہ ظاہر آیت کے خلاف ہے اور اس آیت

سے اولیاء اللہ کی کرامات کے ثبوت پر استدلال کیا گیا ہے۔ (روح المعانی ج ۱۱ ص ۳۰۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

شیخ اشرف علی تھانوی متوفی ۱۳۶۴ھ لکھتے ہیں:

سوال سلیمان کا بطور امتحان اور اظہار عجز جنات کے ہوگا (الی قولہ) کہ آپ کو معلوم ہو کہ اس صحابی سے یہ کرامت صادر ہوگی اور سوال کرنا جنات کو سنانا اور دکھلانا ہو کہ جو قوت میرے مستفیدین میں ہے وہ تم میں بھی نہیں۔

(بیان القرآن ج ۲ ص ۷۴۷، مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور)

شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ لکھتے ہیں:

راجح یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص حضرت سلیمان کا صحابی اور وزیر آصف بن برخیا ہے جو کتب سماویہ کا عالم اور اللہ کے اسماء اور کلام کی تاثیر سے واقف تھا، اس نے عرض کیا کہ میں چشم زدن میں تخت کو حاضر کر سکتا ہوں۔ آپ کسی طرف دیکھیے قبل اس کے آپ ادھر سے نگاہ ہٹائیں تخت آپ کے سامنے رکھا ہوگا۔ (حضرت سلیمان نے فرمایا: یہ میرے رب کا فضل ہے) اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: یعنی یہ ظاہر کے اسباب سے نہیں آیا، اللہ کا فضل ہے کہ میرے رفیق اس درجہ کو پہنچے جن سے ایسی کرامات ظاہر ہونے لگیں اور چونکہ ولی کی خصوصاً صحابی کی کرامت اس کے نبی کا معجزہ اور اس کے اتباع کا ثمرہ ہوتا ہے اس لیے حضرت سلیمان پر بھی اس کی شکر گزاری عائد ہوئی۔

(حاشیہ عثمانی بر ترجمہ محمود حسن ص ۵۰۶، مطبوعہ باہتمام مملکۃ السعودیہ)

اولیاء اللہ کی کرامت کے ثبوت میں دوسری آیت یہ ہے:

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○ (آل عمران: ۳۷)

جب بھی زکریا اس کے پاس اس کی عبادت کے حجرے میں داخل ہوتے تو اس کے پاس تازہ رزق (موجود) پاتے، انہوں نے کہا: اے مریم! تمہارے پاس یہ (رزق) کہاں سے آیا؟ مریم نے کہا: یہ (رزق) اللہ کے پاس سے آیا ہے، بے شک اللہ جسے چاہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔

حافظ اسمٰعیل بن عمر بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ لکھتے ہیں:

مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابو الشعثاء، ابراہیم نخعی، ضحاک، قتادہ اور ربیع بن انس وغیرہم نے کہا ہے کہ حضرت زکریا حضرت مریم کے پاس گرمیوں کے پھل سردیوں میں دیکھتے تھے اور سردیوں کے پھل گرمیوں میں دیکھتے تھے اور اس میں اولیاء اللہ کی کرامت پر دلیل ہے اور سنت میں اس کی بہت نظائر ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۴۰۷، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۹ھ)

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی متوفی ۱۳۰۷ھ لکھتے ہیں:

یہ اولیاء اللہ کی کرامت کے جواز پر دلیل ہے۔ (فتح البیان ج ۲ ص ۲۲۶، مطبوعہ المکتبۃ العصریہ، ۱۴۱۵ھ)

اس سلسلہ میں یہ آیات ہیں:

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ○ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ○ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى

کیا آپ نے سمجھا کہ اصحاب کہف (غار والے) اور کتبے والے، ہماری نشانیوں میں سے ایک عجیب نشانی تھے ○ جب ان نوجوانوں نے غار میں پناہ لی تو کہا: اے ہمارے رب! ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما، اور ہمارے کام میں ہماری کامیابی کے

اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا۝ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْۤا اَمَدًا۔(الکھف: ۱۲-۹)

اسباب مہیا فرما دے۝ پھر ہم نے انہیں غار میں کئی سال تک گہری نیند سلا دیا۝ پھر ہم نے انہیں (نیند سے) اٹھایا تاکہ ہم یہ ظاہر کر دیں کہ غار میں ان کے ٹھہرنے کی مدت کو دو جماعتوں میں سے کس نے زیادہ یاد رکھا ہے۝

ظاہر قرآن اور حضرت ابن عباس کی روایت کے مطابق اصحاب کہف سات نوجوان تھے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے دقیانوس بادشاہ کے زمانہ میں تھے۔ دقیانوس لوگوں کو بت پرستی پر مجبور کرتا تھا' ان نوجوانوں کی فطرت سلیمہ تھی' ان کا عقیدہ تھا کہ عبادت صرف اللہ کی ہونی چاہیے۔ یہ بادشاہ کے ظلم سے ڈر کر ایک غار میں چلے گئے وہاں اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند مسلط کر دی اور یہ تین سو' یا تین سو نو سال تک سوتے رہے' پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو نیند سے اٹھا دیا۔ یہ صبح کے وقت سوئے تھے اٹھے تو دن ڈھل رہا تھا' یہ سمجھے کہ یہ دن کا کچھ وقت سوئے ہیں۔ ان میں کا ایک جوان شہر میں کچھ کھانے پینے کی چیزیں لینے گیا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ ان کو تو کئی صدیاں گزر چکی ہیں' ان کا سکہ دیکھ کر لوگ بہت حیران ہوئے کہ یہ کس بادشاہ کا سکہ ہے' بالآخر معلوم ہوا کہ یہ وہی جوان ہیں جو کسی زمانہ میں غائب ہو گئے تھے' اس زمانہ میں مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے میں بہت اختلاف ہوتا تھا' ان کے واقعات سے حیات بعد الموت پر دلیل قائم ہو گئی۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

ہمارے اصحاب صوفیہ نے اس آیت سے کرامات کے قول کی صحت پر استدلال کیا ہے اور یہ استدلال بالکل ظاہر ہے۔
(تفسیر کبیر ج ۷ ص ۴۳۰' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

اولیاء اللہ کی کرامات کے ثبوت میں احادیث صحیحہ اور کرامت کے اختیاری ہونے پر علماء کی تصریحات

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخص سفر پر جا رہے تھے۔ راستہ میں انہیں بارش نے آلیا' انہوں نے ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی۔ اس غار کے منہ پر پہاڑ سے ایک بہت بڑا پتھر لوٹ کر گر پڑا اور غار کا منہ بند ہو گیا۔ تب انہوں نے ایک دوسرے سے کہا' سوچو تم نے اللہ کے لیے کوئی نیک عمل کیا ہو تو اس کے وسیلہ سے دعا کرو' شاید اللہ تمہاری نجات کی کوئی صورت پیدا کر دے۔ ان میں سے ایک نے یہ دعا کی: اے اللہ! میرے دو بوڑھے ماں باپ تھے اور میری بیوی تھی اور ایک چھوٹی بچی تھی' میں ان سب کی خور و نوش کا انتظام کرتا تھا۔ جب میں شام کو گھر آتا تو اپنے بچوں سے پہلے اپنے ماں باپ کو دودھ پلاتا' ایک دن مجھے دیر ہو گئی' میں شام سے پہلے نہ پہنچ سکا' میرے ماں باپ سو چکے تھے' میں حسب معمول دودھ لے کر ان کے سرہانے کھڑا رہا اور میں نے ان کو نیند سے بیدار کرنا' ناپسند کیا' اور میں نے یہ بھی ناپسند کیا کہ میں اپنی بچی کو ان سے پہلے دودھ پلا دوں' بچی میرے قدموں میں بھوک سے روتی رہی اور میں صبح تک اسی طرح کھڑا رہا۔ اے اللہ! تجھے خوب معلوم ہے کہ میرا یہ عمل محض تیری رضا کے لیے تھا' سو تو ہمارے لیے کچھ کشادگی کر دے تاکہ ہم آسمان کو دیکھ سکیں۔ تب اللہ نے کشادگی کر دی (وہ پتھر کچھ سرک گیا) اور انہوں نے اس کشادگی سے آسمان کو دیکھ لیا اور دوسرے نے دعا کی: اے اللہ! میری ایک عم زاد بہن تھی جس سے میں بہت محبت کرتا تھا' جیسا کہ مرد عورتوں سے محبت کرتے ہیں' میں اس سے اپنی خواہش پوری کرنے کا سوال کرتا تھا' اس نے کہا پہلے سو دینار لاؤ' میں نے محنت مشقت کر کے سو دینار جمع کیے اور وہ دینار اس کو دے دیئے' جب میں اس سے اپنی خواہش پوری کرنے لگا تو اس نے کہا اے اللہ کے بندے! اللہ سے

ڈر' اور ناحق مہر کو نہ توڑ' پس میں اس سے الگ ہو گیا' (اے اللہ!) تجھے خوب علم ہے کہ میرا یہ عمل تیری رضا جوئی کے لیے تھا' تو ہمارے لیے کچھ کشادگی کر دے! تو ان کے لیے کشادگی کر دی' اور تیسرے نے دعا کی: اے اللہ! میں نے چاولوں کے ایک ٹوکرے کے عوض ایک مزدور طلب کیا' جب اس نے اپنا کام پورا کر لیا تو اس نے کہا مجھے میرا حق دو' میں نے اس کو وہ ٹوکرا دیا' اس نے اس سے اعراض کیا' میں نے ان چاولوں سے کاشت کرنی شروع کر دی اور اس کی آمدنی سے میں نے بہت سی گائیں اور چرواہے جمع کر لیے۔ ایک دن وہ آیا اور اس نے کہا اللہ سے ڈر اور مجھے میرا حق دے' میں نے کہا یہ گائیں اور چرواہے لے جاؤ' اس نے کہا اللہ سے ڈرو اور مجھ سے مذاق نہ کرو۔ میں نے کہا میں تم سے مذاق نہیں کر رہا' یہ گائیں اور چرواہے لے جاؤ' وہ ان کو لے گیا: (اے اللہ!) تجھے خوب معلوم ہے کہ میں نے یہ عمل صرف تیری رضا جوئی کے لیے کیا تھا سو تو یہ باقی رکاوٹ بھی دور کر دے تو اللہ تعالیٰ نے بقیہ کشادگی بھی کر دی۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۳۳۳' صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۷۴۳)

اس حدیث میں اولیاء اللہ کی کرامت کا ثبوت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کی دعا قبول فرمائی اور بغیر کسی ظاہری سبب کے غار کے منہ سے پتھر ہٹا دیا اور ان کے لیے خرق عادت کا ظہور ہوا' نیز اس سے معلوم ہوا کہ مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے اور اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کی دعا قبول فرماتا ہے' اور یہ کہ نیک اعمال کے وسیلہ سے دعا کرنی چاہیے اور جب نیک اعمال کے وسیلہ سے دعا قبول ہوتی ہے تو نیک ذوات کے وسیلہ سے بھی دعا قبول ہو گی اور سب سے زیادہ نیک ذات سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے تو آپ کے وسیلہ سے بھی دعا کا قبول ہونا زیادہ متوقع ہے' اس حدیث میں ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے' ان کی خدمت کرنے اور ان کو اپنے بچوں پر ترجیح دینے کی فضیلت ہے اور محض اللہ کے لیے قدرت کے باوجود گناہ کو ترک کر دینا اور پاک دامنی کو اختیار کرنے کی فضیلت ہے اور مزدور کی اجرت کو اچھی طرح سے ادا کرنا اور امانت کی حفاظت کرنے پر ترغیب ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صرف تین (نوزائیدہ بچوں) نے پالنے میں کلام کیا ہے' حضرت عیسیٰ بن مریم' جریج کا صاحب (اور ایک اور بچہ) جریج ایک عبادت گزار شخص تھا' اس نے ایک عبادت گاہ بنائی' وہ اس میں عبادت کرتا تھا۔ اس کی ماں اس کے پاس اس وقت آئی جس وقت وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ اس نے کہا: اے جریج! اس نے (دل میں) کہا اے میرے رب! (ایک طرف) میری ماں ہے اور (ایک طرف) میری نماز ہے! پھر وہ نماز پڑھتا رہا' اس کی ماں لوٹ گئی۔ دوسرے دن وہ پھر اس وقت آئی جب وہ نماز پڑھ رہا تھا' اس نے کہا اے جریج! اس نے (دل میں) کہا اے میرے رب! (ایک طرف) میری ماں ہے! اور (ایک طرف) میری نماز ہے اور پھر وہ نماز پڑھتا رہا' اس کی ماں لوٹ گئی۔ تیسرے دن وہ پھر اس وقت آئی جب وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ اس نے آواز دی اے جریج! اس نے (دل میں) کہا اے میرے رب! (ایک طرف) میری ماں ہے اور (ایک طرف) میری نماز ہے' اور وہ نماز پڑھتا رہا۔ اس کی ماں لوٹ گئی اور اس نے یہ بددعا دی! اے اللہ اس کو اس وقت تک موت نہ دینا جب تک اس کا سابقہ بدکار عورتوں سے نہ پڑ جائے اور بنو اسرائیل میں جریج اور اس کی عبادت کا بہت چرچا تھا' اور ایک بدکار عورت تھی اس کے حسن و جمال کا بھی بہت ذکر کیا جاتا تھا' اس نے کہا اگر تم چاہو تو میں اس کو گناہ میں ملوث کر دوں' وہ اس کے پاس گئی اور اس کو بدکاری پر اکسایا۔ جریج نے اس کی طرف بالکل توجہ نہیں کی' ایک چرواہا اس عبادت گاہ میں رہتا تھا اس عورت نے اس سے خواہش پوری کر لی اور وہ اس سے حاملہ ہو گئی۔ جب بچہ پیدا ہو گیا تو اس نے کہا یہ جریج سے ہوا ہے۔ لوگ جریج کے پاس گئے' اس کو عبادت گاہ سے نکالا اور مارنا شروع کر دیا اور اس کی عبادت گاہ کو منہدم کر دیا۔ اس نے لوگوں سے پوچھا تم مجھے کیوں مار رہے ہو؟ انہوں نے کہا تم نے اس بدکار عورت سے زنا کیا

ہے اور اس سے تمہارا بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ جریج نے کہا وہ بچہ کہاں ہے؟ وہ اس بچہ کو لے کر آئے، اس نے کہا: اچھا مجھے نماز پڑھنے کی مہلت دو۔ اس نے نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ اس بچہ کے پاس گیا اور اس کے پیٹ میں انگلی چبھوئی اور کہا: اے بچے! تیرا باپ کون ہے؟ بچہ نے کہا: فلاں چرواہا! تب لوگ جریج کی طرف بڑھے، اس کو تعظیم سے چوم رہے تھے اور اس کو مس کر رہے تھے اور کہنے لگے: ہم آپ کے لیے سونے کی عبادت گاہ بنا دیتے ہیں۔ جریج نے کہا: نہیں، اس کو اسی طرح مٹی کی بنا دو جس طرح وہ تھی۔ سو انہوں نے ویسی ہی بنا دی۔

اور پچھلی امتوں میں ایک بچہ اپنی ماں کی گود میں دودھ پی رہا تھا، وہاں سے ایک قوی سواری پر خوب صورت پوشاک پہنے ایک سوار گزرا۔ اس کی ماں نے کہا: اے اللہ! میرے بیٹے کو اس کی مثل بنا دے! اس بچے نے دودھ چھوڑ کر اس آدمی کی طرف دیکھا اور کہا: اے اللہ! مجھے اس کی مثل نہ بنانا، اور پھر دودھ پینا شروع کر دیا۔ پھر ان کا گزر ایک باندی کے پاس سے ہوا جس کو لوگ مار رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ تو نے زنا کیا ہے اور تو نے چوری کی ہے۔ اس کی ماں نے کہا: اے اللہ! میرے بیٹے کو اس کی مثل نہ بنانا، اس بچے نے دودھ چھوڑ کر اس باندی کی طرف دیکھا اور کہا: اے اللہ! مجھے اس کی مثل بنا دینا۔ اس کی ماں نے کہا: تیرا سر مونڈا جائے، ایک آدمی خوب صورت پوشاک پہنے اچھی سواری پر گزرا تو میں نے دعا کی: اے اللہ! میرے بیٹے کو اس کی مثل بنا دینا تو تُو نے کہا: اے اللہ! مجھے اس کی مثل نہ بنانا، اور جس باندی کو لوگ مار رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تُو نے زنا کیا ہے، تُو نے چوری کی ہے اور میں نے دعا کی کہ اے اللہ! میرے بیٹے کو اس کی مثل نہ بنانا تو تُو نے کہا: اے اللہ! مجھے اس کی مثل بنانا۔ اس بچے نے کہا: وہ آدمی ایک ظالم شخص تھا، تو میں نے دعا کی: اے اللہ! مجھے اس کی مثل نہ بنانا اور وہ باندی جس کے متعلق لوگ کہہ رہے تھے کہ تُو نے زنا کیا ہے، تُو نے چوری کی ہے، اس نے زنا کیا تھا نہ چوری کی تھی اس لیے میں نے کہا: مجھے اس کی مثل بنانا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۴۳۶، ۲۴۸۲، ۱۲۰۶، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۵۵۰، مسند احمد ج ۲ ص ۳۰۷، دار الفکر طبع قدیم، مسند احمد رقم الحدیث: ۸۰۵۷، طبع جدید، دار الحدیث قاہرہ و عالم الکتب بیروت، جامع المسانید ج ۷ ص ۱۸۴)

اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب جریج نماز میں مشغول ہونے کی وجہ سے ماں کے بلانے پر نہیں جا سکا تو ماں نے اس کو بد دعا کیوں دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جریج پر لازم تھا وہ جلدی سے نماز ختم کر کے ماں کے بلانے پر ماں کے پاس چلا جاتا، لیکن وہ نماز ختم کرنے کے بعد بھی ماں کے پاس نہیں گیا حتیٰ کہ وہ دوسرے دن پھر بلانے گئی اور وہ دوسرے دن بھی نہیں گیا حتیٰ کہ وہ تیسرے دن پھر بلانے گئی اور جب اس کی طرف سے کوئی مثبت ردِ عمل ظاہر نہیں ہوا تو پھر تنگ آ کر ماں نے بد دعا دی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول فرمائی اور جریج ایک بدکار عورت کے فتنہ میں مبتلا ہو گیا۔ یہ اس کی ماں کی کرامت ہے اور اس میں جریج کی بھی کرامت ہے کیونکہ اس کے کہنے سے ایک نوزائیدہ بچے نے باتیں کیں۔ جریج کی یہ نماز نفل تھی لیکن ان کی شریعت میں نفلی نماز میں بھی ماں کے بلانے پر نماز توڑنا جائز نہ تھا، ہماری شریعت میں ماں کے بلانے پر نفل نماز کو توڑنا جائز ہے، اور باپ کے بلانے پر نفل نماز توڑنا جائز نہیں ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۷ ص ۲۸۳-۲۸۲) اور فرض نماز کو کسی کے بلانے پر توڑنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلائیں۔

اس حدیث کی شرح میں قاضی عیاض مالکی متوفی ۵۴۴ھ لکھتے ہیں:

حدیث جریج سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو اپنی نشانی ظاہر فرما کر ظالموں کے ہاتھوں سے چھڑا لیتا ہے اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ کی طلب اور ان کے اختیار سے کرامت واقع ہوتی ہے۔

(اکمال المعلم بفوائد مسلم ج ۸ ص ۱۲، مطبوعہ دار الوفا بیروت، ۱۴۱۹ھ)

علامہ یحییٰ بن شرف نووی اور علامہ بدر الدین عینی نے بھی لکھا ہے کہ بعض اوقات اولیاء اللہ کی طلب اور ان کے اختیار سے کرامات واقع ہوتی ہیں۔ (شرح مسلم ج ۲ ص ۳۱۴، مطبوعہ کراچی، عمدۃ القاری ج ۷ ص ۲۸۳، مطبوعہ مصر) علامہ احمد قسطلانی متوفی ۹۱۱ھ نے بھی لکھا ہے کہ اولیاء اللہ کی کرامات ان کی طلب اور ان کے اختیار سے واقع ہوتی ہیں۔

(ارشاد الساری ج ۵ ص ۴۱۳، مصر)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ نے اس کو ذرا تفصیل سے لکھا ہے:

اس حدیث میں یہ ثبوت ہے کہ جریج کا یقین بہت قوی تھا اور اس کی اُمید صحیح تھی، کیونکہ اس نے نوزائیدہ بچہ سے بولنے کے لیے کہا حالانکہ عادت یہ ہے کہ نوزائیدہ بچے کلام نہیں کرتے، اور اگر جریج کی اُمید صحیح نہ ہوتی تو وہ بچہ سے کلام کرنے کے لیے نہ کہتا، اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب اولیاء اللہ مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی نجات کی سبیل پیدا کر دیتا ہے اور بعض اوقات ان کی نجات کا معاملہ موخر کر دیا جاتا ہے، اس میں ان کی تہذیب کی جاتی ہے اور ان کے لیے زیادہ ثواب رکھا جاتا ہے اور اس حدیث میں اولیاء کی کرامات کا ثبوت ہے اور یہ ثبوت ہے کہ کرامت ان کی طلب اور ان کے اختیار سے واقع ہوتی ہے۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۴۸۳، مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۱ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس جاسوس بھیجے اور حضرت عاصم بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کو ان کا امیر بنایا۔ جس وقت وہ عسفان اور مکہ کے درمیان ایک مقام پر پہنچے تو ہذیل کے ایک قبیلہ بنو لحیان میں ان کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے سو تیر اندازوں کا ایک دستہ ان کے تعاقب میں روانہ کیا، وہ ان کے قدموں کے نشانات کا پیچھا کرتے ہوئے گئے، حتیٰ کہ جس منزل میں ٹھہر کر انہوں نے کھجوریں کھائیں تھیں وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا: یہ یثرب کی کھجوریں ہیں، پھر وہ ان نشانات پر چل پڑے حتیٰ کہ حضرت عاصم اور ان کے اصحاب کو ان کے آنے کا پتا چل گیا، ان کافروں نے ان کا محاصرہ کر لیا اور مسلمانوں سے کہا: تم اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو، ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تم میں سے کسی کو قتل نہیں کریں گے۔ حضرت عاصم بن ثابت نے کہا: میں کسی کافر کے وعدہ پر ہتھیار نہیں ڈالوں گا، پھر دعا کی: اے اللہ! ہمارے حال سے ہمارے نبی کو مطلع فرما دے۔ کافروں نے تیر مارنے شروع کیے اور حضرت عاصم کو شہید کر دیا اور تین صحابہ ان کی امان کے وعدہ پر ان کے پاس آ گئے۔ ان میں حضرت خبیب، حضرت زید بن دثنہ اور ایک اور صحابی تھے۔ جب کافروں نے ان کو باندھنا شروع کر دیا تو تیسرے صحابی نے کہا: یہ پہلی عہد شکنی ہے، اللہ کی قسم! میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میرے لیے ان شہداء میں نمونہ ہے۔ (حضرت عاصم کے ساتھ جو بقیہ سات شہید ہو گئے تھے) انہوں نے ان کو گھسیٹ کر لے جانا چاہا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ وہ حضرت خبیب اور حضرت زید بن دثنہ کو لے گئے حتیٰ کہ ان کو جنگ بدر کے بعد بیچ دیا۔ بنو الحارث بن عامر بن نوفل نے حضرت خبیب کو خرید لیا۔ حضرت خبیب نے حارث بن عامر کو جنگ بدر میں قتل کر دیا تھا، حضرت خبیب ان کے ہاں کئی دن قید رہے حتیٰ کہ ان لوگوں نے حضرت خبیب کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ حضرت خبیب نے حارث کی بعض بیٹیوں سے اُسترا مانگا تاکہ اس سے مُوئے زیر ناف صاف کریں، اس کا بچہ ان کے پاس چلا گیا۔ اور وہ اس سے غافل تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہ بچہ حضرت خبیب کی ران پر بیٹھا ہے اور اُسترا ان کے ہاتھ میں ہے، وہ بہت ڈری۔ حضرت خبیب اس کے ڈر کو جان گئے، انہوں نے کہا: کیا تم کو یہ ڈر ہے کہ میں اس کو قتل کر دوں گا، میں ایسا نہیں کروں گا۔ اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے خبیب سے بہتر کوئی قیدی نہیں دیکھا۔ اللہ کی قسم! میں نے ایک دن دیکھا ان کے ہاتھ میں انگوروں کا ایک خوشہ تھا جس سے وہ کھا رہے تھے، اور وہ زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے اور ان دنوں مکہ میں کوئی پھل نہیں تھا۔ وہ یہ کہتی

تھی کہ یہ وہ رزق تھا جو اللہ تعالیٰ نے خبیب کو دیا تھا، جب وہ لوگ حضرت خبیب کو قتل کرنے کے لیے حرم سے باہر لے گئے تو ان سے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے دو رکعت نماز پڑھنے دو۔ انہوں نے ان کو چھوڑ دیا۔ حضرت خبیب نے دو رکعت نماز پڑھی اور فرمایا: اللہ کی قسم! اگر تم یہ گمان نہ کرتے کہ میں موت سے ڈر رہا ہوں تو میں نماز میں زیادہ دیر لگاتا، پھر دعا کی: اے اللہ! ان سب کو قتل کر دے اور ان میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑ، پھر انہوں نے دو شعر پڑھے، ان کا ترجمہ یہ ہے: "جب میں حالتِ اسلام میں قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھے کیا پروا ہو سکتی ہے، میں جس پہلو پر گروں میرا گرنا اللہ ہی کے لیے ہوگا، اور یہ مرنا اللہ کی رضا کے لیے ہے اور مجھے اپنے اعضاء کے کٹنے کا غم نہیں اگر اللہ چاہے گا تو ان کٹے ہوئے اعضاء کو مبارک کر دے گا۔" پھر ابو سروعہ عقبہ بن الحارث نے کھڑے ہو کر ان کو قتل کر دیا اور حضرت خبیب وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ظلماً قتل کیے جانے سے پہلے نماز پڑھنے کی سُنّت قائم کی۔ جب کافروں کو پتا چلا کہ حضرت عاصم بن ثابت کو بھی قتل کر دیا ہے تو جن کافروں کے کسی بڑے آدمی کو حضرت عاصم نے قتل کیا تھا تو انہوں نے لوگوں کو بھیجا کہ وہ ان کی لاش سے کچھ حصہ کاٹ کر لے آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھیوں کو بھیج دیا، شہد کی مکھیاں ایک سائبان کی طرح ان کی لاش پر چھا گئیں، انہوں نے اس لاش کی حفاظت کی اور وہ کافر اس سے کچھ حصہ کاٹ کر لے جانے میں ناکام رہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۰۸۶، مطبوعہ دار ارقم، بیروت)

اس حدیث میں اولیاء اللہ کی کرامت کا ثبوت ہے کیونکہ اس حدیث میں یہ بیان ہے کہ حضرت خبیب زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور انگور کے خوشے سے انگور کھا رہے تھے حالانکہ اس وقت مکہ میں کوئی پھل موجود نہیں تھا نیز اس حدیث میں حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کی کرامت کا بھی ثبوت ہے، شہد کی مکھیاں ایک سائبان کی طرح ان کی لاش پر چھا گئیں اور کفار ان کی لاش کی بے حرمتی کرنے میں ناکام اور نامراد رہے۔

اس حدیث میں یہ ثبوت بھی ہے کہ مسلمانوں کو کفار کے وعدہ پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے اور ان کی امان میں خود کو ان کے حوالے کرنے سے بہتر ہے کہ ان کے خلاف لڑ کر شہید ہو جائے جیسا کہ حضرت عاصم اور ان کے ساتھیوں نے کیا۔

نیز اگر مسلمان کفار کے ہاتھوں قید ہو جائے تو دورانِ قید اس کو ایسے اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے کہ دشمن بھی اس کے اخلاق سے متاثر ہو، جیسا کہ حضرت خبیب کے اخلاق سے ان کے دشمن متاثر ہوئے۔

شہادت سے پہلے دو رکعت نماز پڑھنا اور یہ سُنّت حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے قائم کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو برقرار رکھا۔

اولیاء اللہ کے لیے دُنیا میں غم اور خوف کا ثبوت

اللہ تعالیٰ نے اولیاء اللہ کے متعلق ارشاد فرمایا ہے: ان کو، کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔ خوف کا تعلق مستقبل سے ہے اور غم کا تعلق ماضی سے ہے، یعنی ان کو ماضی میں کسی نعمت کے زوال کا ملال ہوگا نہ مستقبل میں کسی نعمت کے زوال کا خطرہ ہوگا۔ اس پر یہ اعتراض ہے کہ اگر اس سے مراد دنیا میں خوف اور غم کی نفی ہے تو یہ ثابت نہیں کیونکہ تمام اولیاء کے راس اور رئیس سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ کو دنیا میں خوف بھی لاحق ہوا اور غم بھی، خوف کی مثال ان حدیثوں میں ہے:

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما بیان کرتی ہیں کہ جس دن سورج کو گہن لگا اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوف زدہ ہو گئے اور آپ نے گھبراہٹ میں کسی عورت کی قمیص لے لی پھر آپ کو چادر لا کر دی گئی، پھر آپ نے اس قدر طویل قیام کیا کہ اگر کوئی شخص آتا تو اس کو بالکل پتا نہ چلتا کہ آپ نے رکوع کیا ہے اور آپ کے طول قیام کی وجہ سے (معمول سے

زیادہ) رکوع کی روایت کی گئی ہے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۹۰۶)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیز آندھی کو دیکھتے تو یہ دعا فرماتے: اے اللہ! میں تجھ سے اس کی خیر کا سوال کرتا ہوں اور جو کچھ اس کے ساتھ ہے اس کی خیر کا سوال کرتا ہوں اور میں اس کے شر سے اور جو شر اس میں ہے اور جو شر اس کے متعلق ہے تیری پناہ طلب کرتا ہوں اور جب آسمان پر ابر چھا جاتا تو آپ کا رنگ متغیر ہو جاتا اور آپ (خوف اور گھبراہٹ سے) کبھی حجرہ کے اندر جاتے اور کبھی حجرہ سے باہر جاتے اور جب بارش ہو جاتی تو آپ سے خوف دُور ہو جاتا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: میں نے اس کیفیت کو بھانپ کر آپ سے اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا: اے عائشہ! مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں یہ ابر قوم عاد کے ابر کی طرح نہ ہو' انہوں نے جب اپنی بستیوں میں ابر کو آتے ہوئے دیکھا تو کہا: یہ ہم پر برسنے والے بادل ہیں۔ (اور در حقیقت وہ اللہ تعالیٰ کا عذاب تھا۔)

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۲۰۶' صحیح مسلم رقم الحدیث: ۸۹۹)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! آپ پر بڑھاپا طاری ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: مجھے سورۃ ھود' سورۃ الواقعہ' سورۃ المرسلات' عم یتساءلون اور اذا الشمس کورت نے بوڑھا کر دیا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۲۹۷)

اور غم کی مثال اس حدیث میں ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابو سیف لوہار کے پاس گئے اور وہ (آپ کے صاحبزادے) حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے رضاعی والد تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کو اٹھایا' ان کو بوسہ دیا اور ان کو سونگھا۔ پھر اس کے بعد ہم ان کے پاس گئے' اس وقت حضرت ابراہیم اپنے نفس کی سخاوت کر رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے (تعجب سے) کہا: یا رسول اللہ! آپ بھی! (رو رہے ہیں) آپ نے فرمایا: اے ابن عوف! یہ (آنسو) رحمت ہیں۔ آپ کی آنکھوں سے پھر آنسو جاری ہوئے' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آنکھ رو رہی ہے اور دل غمزدہ ہے اور ہم وہی بات کہیں گے جس سے ہمارا رب راضی ہو! اور ہم آپ کے فراق سے اے ابراہیم البتہ غمگین ہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۳۰۳' صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۱۵' سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۱۲۶)

ان احادیث سے واضح ہو گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں خوف بھی ہوا اور غم بھی تو پھر اولیاء اللہ کے متعلق کیسے کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں ان کو' کوئی خوف ہو گا نہ غم!

اولیاء کے لیے دنیا کے غم اور خوف کی مصنف کی طرف سے توجیہ

اس کا جواب یہ ہے کہ اولیاء اللہ کو دنیا میں ایسا خوف نہیں ہو گا جو ان کے لیے باعث ضرر ہو (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لاخوف علیھم اور علی ضرر کے لیے آتا ہے) اور جن احادیث میں آپ کے خوف کا ذکر ہے وہ خوفِ خدا ہے اور خوفِ خدا باعثِ ضرر نہیں ہے بلکہ باعثِ نفع ہے اور جو شخص جتنا زیادہ اللہ کے قریب ہوتا ہے اس کو اللہ کا اتنا زیادہ خوف ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اتقاکم واعلمکم باللہ انا۔ بے شک تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تم سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والا میں ہوں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۰)

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اما واللہ انی لاتقاکم للہ واخشاکم لہ۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۱۰۸) سنو! اللہ کی قسم! بے شک میں ضرور تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تم سب سے زیادہ اللہ سے خشوع کرنے والا ہوں۔

نیز حدیث صحیح میں ہے: میں تم سب سے زیادہ اللہ کی معرفت رکھتا ہوں اور تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں' (کشف الخفا رقم الحدیث: ۶۰۷) اور آپ نے فرمایا: پس اللہ کی قسم میں ان سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوں اور ان سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۱۰۱' صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۵۶) نیز آپ نے فرمایا: میں تم سب سے زیادہ اللہ کی حدود کو جاننے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں۔ (فتح الباری ج ۴ ص ۱۵۱)

اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ (فاطر: ۳۵) اللہ کے بندوں میں سے اللہ سے وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

اور اولیاء اللہ سے غم کی نفی جو فرمائی ہے اس کا معنی یہ ہے کہ ان کو اپنے گناہوں کا غم نہیں ہوگا' اور اللہ کا ولی وہی ہوتا ہے جو اپنے آپ کو گناہوں سے باز رکھتا ہے اور اگر بالفرض بشری تقاضے سے اس سے کوئی گناہ ہو جائے تو وہ فوراً توبہ کر لیتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو سید المعصومین ہیں' آپ کے متعلق کسی معصیت پر غم کرنے کا کیا سوال ہے اور اس آیت میں جو غم کی نفی فرمائی ہے اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان کو دنیاوی نقصانات پر غم اور رنج نہیں ہوگا' دنیاوی نقصانات پر ان کو رنج اور غم ہوتا ہے اور وہ اس پر صبر کرتے ہیں اور اس میں ان کے لیے بہت اجر اور بڑے درجات ہوتے ہیں' قرآن مجید میں ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ (البقرہ: ۱۵۷-۱۵۵)

اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے' تھوڑے سے ڈر سے اور بھوک اور مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیجئے ۝ جن کو جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون ۝ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے ان کے رب کی طرف سے بہت تحسین ہے اور بہت رحمت ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن کو جو مصیبت بھی پہنچتی ہے' خواہ تھکاوٹ ہو یا (کسی چیز کا) غم ہو یا دائمی درد اور بیماری ہو یا کوئی سخت پریشانی تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ (بعض روایات میں ہے: اور اس کے درجات بلند فرما دیتا ہے)

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۹۶۶' مسند احمد ج ۳ ص ۴' طبع قدیم' مسند احمد رقم الحدیث: ۱۱۰۲۰' عالم الکتب بیروت' مسند احمد رقم الحدیث: ۱۰۹۴۹' مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ' صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۳۲۴' صحیح مسلم رقم الحدیث: ۹۶۵' مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۲۳۲' مطبوعہ کراچی' مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۱۲۵۶)

اولیاء اللہ کے لیے آخرت کے غم اور خوف کی مصنف کی طرف سے توجیہ

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اولیاء اللہ کو آخرت میں خوف اور غم نہیں ہوگا تو حشر کے دن انبیاء علیہم السلام خوف زدہ ہوں گے اور سب نفسی نفسی فرما رہے ہوں گے' اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو گناہوں پر عذاب اور

گرفت کا خوف نہیں ہو گا، ان کو اللہ تعالیٰ کی جلال ذات سے خوف ہو گا اور یہ خوف ان کے قرب الٰہی کی علامت ہے اور ان کے لیے باعث نفع ہے، حدیث میں ہے:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے متعلق پوچھا:

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ○ (المومنون: ۶۰) اور وہ لوگ جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل خوف سے لرز رہے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

کیا اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو شراب پیتے تھے اور چوری کرتے تھے؟ آپ نے فرمایا نہیں! اے صدیق کی بیٹی! لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے تھے، اور نماز پڑھتے تھے اور صدقہ دیتے تھے اور ان کو یہ خوف ہوتا تھا کہ (کہیں ایسا نہ ہو کہ) ان کے یہ اعمال مقبول نہ ہوں، یہ وہ لوگ ہیں جو نیکی کے کاموں میں بہت جلدی کرتے تھے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۷۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۱۹۸)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار جنت کی بشارت دی تھی، اس کے باوجود وہ قبر کو دیکھ کر اس قدر روتے تھے کہ ان کی ڈاڑھی مبارک آنسوؤں سے بھیگ جاتی تھی۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۰۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۲۶۷)

اور یہ وہ نفوس قدسیہ ہیں جو گناہ نہ کرنے اور نیکیوں کی بہتات کے باوجود اللہ کی جلال ذات سے ڈرتے تھے اور یہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام ہیں۔

اولیاء اللہ کے غم اور خوف کی امام رازی کی طرف سے توجیہ

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

بعض عارفین نے کہا ہے کہ ولایت کا معنی قرب ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کا ولی وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے بہت زیادہ قریب ہو، اور جو اللہ تعالیٰ کے بہت زیادہ قریب ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت میں اس طرح ڈوبا ہوا ہوتا ہے کہ ایک لحظہ کے لیے بھی اس کا دھیان غیر اللہ کی طرف نہیں جاتا، اور اسی کیفیت کا نام کامل ولایت ہے اور جب ولی کو یہ کیفیت حاصل ہو گی تو اس کو کسی چیز کا خوف ہو گا نہ کسی چیز کا غم ہو گا کیونکہ اس کا دل و دماغ اللہ کے سوا کسی اور چیز کی طرف متوجہ ہی نہیں ہو گا حتیٰ کہ اس کو کسی چیز کا خوف یا غم ہو، اور یہ بہت بڑا درجہ ہے جو شخص اس درجہ تک نہیں پہنچا وہ اس کا تصور نہیں کر سکتا، اور جو اس مرتبہ پر فائز ہوتا ہے کبھی اس سے معرفت الٰہی میں استغراق کی کیفیت زائل ہو جاتی ہے پھر اس کو خوف اور غم لاحق ہوتا ہے جیسا کہ دوسرے عام آدمیوں کا حال ہوتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ابراہیم خواص ایک جنگل میں تھے اور ان کے ساتھ ان کا مرید بھی تھا، ایک رات کو جب ان پر معرفت الٰہی میں استغراق کی کامل کیفیت طاری تھی کچھ درندے آگئے اور ان کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ ان کا مرید تو ڈر کے مارے درخت پر چڑھ گیا اور وہ درندوں سے بے پروا اسی طرح بیٹھے رہے، صبح کو جب یہ کیفیت زائل ہو گئی تو ان کے ہاتھ پر ایک مچھر نے کاٹا جس کی تکلیف سے وہ بے قرار ہو گئے۔ مرید نے کہا رات درندوں سے آپ کو کوئی خوف نہیں ہوا اور آج ایک مچھر سے آپ بے قرار ہو گئے۔ شیخ نے کہا رات مجھ پر غیبی واردات کی قوت طاری تھی، اور جب یہ قوت غائب ہو گئی تو میں اللہ کی مخلوق میں سب سے کمزور ہوں۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۲۷۷-۲۷۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ جب اولیاء اللہ، معرفت الٰہی میں مستغرق ہوتے ہیں اور ان کا غالب حال یہی ہوتا ہے تو ان کو، کوئی خوف اور غم نہیں ہوتا، اور جب یہ کیفیت نہیں ہوتی تو وہ عام لوگوں کی طرح ہیں، اور ان کو خوف اور غم ہوتا ہے، اس کی نظیر یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کنعان کے قریب جنگل کے کنوئیں میں تھے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کی ان کی طرف توجہ نہ ہوئی اور وہ ان کے فراق میں روتے رہے، اور ایک وہ وقت تھا کہ ان کے بیٹے مصر سے حضرت یوسف کی قمیص لے کر روانہ ہوئے تو آپ نے فرمایا: مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے، اور اس کی دوسری نظیر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی دن تک کھائے پیئے بغیر وصال کے (مسلسل) روزے رکھے اور آپ کی جسمانی حالت میں کوئی تغیر نہیں ہوا اور آپ نے فرمایا: میں اپنے رب کے پاس رات گزارتا ہوں، وہی مجھے کھلاتا ہے اور وہی مجھے پلاتا ہے اور صحابہ کو وصال کے روزے رکھنے سے منع فرما دیا اور فرمایا: تم اپنی طاقت کے مطابق عمل کرو۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث:۱۹۶۶، صحیح مسلم رقم الحدیث:۱۱۰۳) اور ایک وقت کی یہ کیفیت ہے کہ بھوک کی شدت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیٹ پر دو پتھر باندھے ہوئے تھے۔

(سنن ترمذی رقم الحدیث:۲۳۷۱)

امام رازی نے اس کی دوسری توجیہ اس طرح کی ہے کہ اولیاء اللہ کو قیامت کے دن خوف نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ (الانبیاء: ۱۰۳)

سب سے بڑی گھبراہٹ انہیں غمگین نہیں کرے گی، اور فرشتے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے (اور کہیں گے) یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

نیز فرماتے ہیں کہ بعض احادیث سے ثابت ہے کہ ان کو غم اور خوف ہوگا، لیکن یہ سب اخبار احاد ہیں اور جب قرآن مجید نے فرما دیا ہے کہ ان کو خوف اور غم نہیں ہوگا تو ظاہر قرآن ان احادیث پر مقدم ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۲۷۷، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

قارئین پر مخفی نہ رہے کہ ہم نے امام رازی کی تفسیر سے پہلے اس آیت کی جو توجیہ بیان کی ہے اس سے قرآن مجید اور احادیث میں تطبیق ہو جاتی ہے۔

اولیاء اللہ کے لیے دنیا اور آخرت میں بشارت

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ان کے لیے دنیا کی زندگی میں (بھی) بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔

اہل مصر میں سے ایک شخص نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے متعلق سوال کیا: لهم البشرى في الحيوة الدنيا وفي الاخرة۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے مجھ سے اس چیز کے متعلق سوال کیا کہ کسی اور شخص نے مجھ سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا، جب سے ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق سوال کیا تھا، آپ نے فرمایا: اس سے مراد نیک خواب ہیں جو مسلمان شخص دیکھتا ہے یا اس کے لیے وہ خواب دیکھے جاتے ہیں یہ اس کی دنیا کی زندگی میں بشارت ہیں اور آخرت میں اس کی بشارت جنت ہے۔

(مسند احمد ج ۶ ص ۴۵۲، مسند احمد رقم الحدیث:۲۸۱۰۷، مطبوعہ عالم الکتب بیروت، ۲۷۴۸۷، مطبوعہ دار الحدیث: قاہرہ، مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۱۰۵۰۱، مطبوعہ کراچی، سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۲۷۵، شعب الایمان رقم الحدیث:۴۷۵۲)

حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: یہ نیک خواب ہیں جن کے ساتھ مومن کو بشارت دی جاتی ہے، یہ نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جز ہیں، جو شخص یہ خواب دیکھے وہ

اس کی خبر دے اور جس نے اس کے سوا کوئی چیز دیکھی تو وہ شیطان کی طرف سے اس کو غم میں مبتلا کرنے کے لیے ہے' اس کو چاہیے کہ وہ بائیں جانب تھوک دے اور اس کی خبر کسی کو نہ دے۔

(مسند احمد ج ۲ ص ۲۲۰، دارالفکر، مسند احمد رقم الحدیث: ۷۰۴۴، عالم الکتب بیروت و دارالحدیث قاہرہ، شعب الایمان رقم الحدیث: ۴۷۶۴، مجمع الزوائد ج ۵ ص ۱۰۵)

اولیاء اللہ کے لیے دنیا میں بشارت کے متعلق یہ آیات ہیں:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ○ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ○ نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ ○ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۲-۳۰)

بے شک جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے' پھر وہ اس پر دائماً قائم رہے ان پر فرشتے (یہ کہتے ہوئے) نازل ہوتے ہیں کہ تم نہ خوف کرو اور نہ غمگین ہو' اور اس جنت کے ساتھ خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ○ ہم دنیا کی زندگی میں تمہارے مددگار ہیں اور آخرت میں (بھی) اور تمہارے لیے اس جنت میں ہر وہ چیز ہے جس کو تمہارا دل پسند کرے اور تمہارے لیے اس میں ہر وہ چیز ہے جس کو تم طلب کرو ○ بہت بخشنے والے بے حد رحم فرمانے والے کی طرف سے ضیافت ہے۔

اور اولیاء اللہ کے لیے آخرت میں بشارت کے متعلق یہ آیتیں ہیں:

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ (الانبیاء: ۱۰۳)

سب سے بڑی گھبراہٹ انہیں غمگین نہیں کرے گی' اور فرشتے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِم بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ○ (الحدید: ۱۲)

(اے رسول مکرم!) جس دن آپ مومنین اور مومنات کو اس حال میں دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کی دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا (اور ان سے کہا جائے گا کہ) آج تمہاری خوشی کی چیز یہ جنتیں ہیں جن کے نیچے سے دریا جاری ہیں اس میں تم ہمیشہ رہو گے یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔

اولیاء اللہ کے متعلق میں تفصیل سے لکھنا چاہتا تھا الحمد للہ علی احسانہ اللہ تعالیٰ نے یہ آرزو پوری کی' اولیاء اللہ کے متعلق مجھے بچپن سے ایک شعر یاد ہے۔ اس شعر پر اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔

احب الصالحین ولست منہم
لعل اللہ یرزقنی صلاحا

(میں نیک لوگوں سے محبت کرتا ہوں' حالانکہ میں خود ان میں سے نہیں ہوں'
اس امید پر کہ شاید اللہ مجھے بھی نیکی عطا فرمادے)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان کی باتوں سے آپ رنجیدہ نہ ہوں' بے شک ہر قسم کا غلبہ اللہ ہی کے لیے ہے' وہ خوب سننے والا بہت جاننے والا ہے ○ سنو! جو لوگ آسمانوں میں ہیں اور جو زمینوں میں ہیں سب اللہ ہی کے مملوک ہیں' یہ لوگ جو اللہ کو چھوڑ کر (خود ساختہ) شریکوں کو پکارتے ہیں یہ کس کی پیروی کر رہے ہیں؟ یہ صرف اپنے گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور یہ

صرف غلط اندازے لگا رہے ہیں○ وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو' اور دکھانے والا دن بنایا بے شک اس میں (غور سے) سننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں○ (یونس: ۶۵-۶۳)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہجرت فرمانا کفار کے خوف کی وجہ سے نہ تھا

اس سے پہلے کفار مکہ کے مختلف شبہات کے جوابات دیئے تھے' کفار مکہ جب دلائل سے عاجز آ گئے تو انہوں نے دھاندلی کا طریقہ اختیار کیا' انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دھمکایا اور خوف زدہ کیا' انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ مالدار ہیں اور ان کا جتھہ ہے اور وہ اپنی طاقت اور اپنے زور سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ناکام بنائیں گے' تو اللہ تعالیٰ نے ان کے رد کے لیے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء کو کوئی خوف ہو گا نہ وہ غمگین ہوں گے' پھر یہ آیت نازل فرمائی کہ ان کی باتیں آپ کو غم زدہ نہ کریں' اللہ تعالیٰ آپ کا مددگار ہے اور ہر قسم کا غلبہ اسی کے لیے ہے یعنی اللہ تعالیٰ آپ کے خلاف ان کو قدرت نہیں دے گا' بلکہ آپ کو ان کے خلاف قدرت عطا فرمائے گا' لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آپ کو کفار کے ضرر سے محفوظ رکھا اور وہ آپ کو قتل کرنے کے منصوبہ کو پورا کرنے پر قادر نہ ہو سکے۔

اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مامون کر دیا تھا تو پھر آپ خوف زدہ کیوں ہوئے اور مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کیوں گئے اور اس کے بعد بھی آپ وقتاً فوقتاً خوف زدہ رہے۔

امام فخرالدین رازی متوفی ۶۰۶ھ اس کے جواب میں لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے آپ سے کامیابی اور نصرت کا وعدہ مطلقاً کیا تھا' کسی خاص وقت کو کامیابی اور نصرت کے لیے معین نہیں فرمایا تھا' اس لیے آپ ہر وقت خوف زدہ رہتے تھے کہ کہیں اس وقت میں شکست کا سامنا نہ ہو جائے۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۲۷۹)

ہماری رائے میں یہ جواب درست نہیں ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے خوف سے ہجرت نہیں کی تھی' آپ ان سے خوف زدہ کیسے ہو سکتے تھے' وہ برہنہ تلواریں لیے آپ کے حجرہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور آپ سورۃ یٰسین پڑھتے ہوئے درانہ ان کے درمیان سے نکل آئے تھے' آپ کا ہجرت فرمانا اللہ تعالیٰ کی سُنت کے مطابق تھا کیونکہ ہر نبی ایک مرتبہ کفار کے علاقہ سے ہجرت کرتا ہے اور پھر دوبارہ فاتح کی حیثیت سے وہیں لوٹتا ہے۔ تین دن غار میں چھپنا بھی کفار کے ڈر اور خوف کی وجہ سے نہ تھا بلکہ ظاہری اسباب اختیار کرنے کی وجہ سے تھا' اسی غار میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اسی طرح جنگِ بدر میں فتح کے لیے گڑگڑا کر اللہ سے دُعا کرنا بھی اظہارِ عبودیت کے لیے تھا' کفار کے خوف کی وجہ سے نہ تھا' آپ کو کبھی بھی کفار کا خوف نہیں ہوا' آپ صرف اللہ سے ڈرتے تھے اور کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔

شرک کے ابطال پر دلائل

اس سے پہلے فرمایا تھا: الا ان للہ ما فی السمٰوٰت والارض۔ (یونس: ۵۵) یعنی آسمانوں اور زمینوں کی تمام غیر ذوی العقول چیزیں اللہ ہی کی ملکیت میں ہیں اور اس آیت میں فرمایا: الا ان للہ من فی السمٰوٰت والارض۔ (یونس: ۶۶) یعنی آسمانوں اور زمینوں کی تمام ذوی العقول چیزیں بھی اللہ کی ملکیت میں ہیں' اور ذوی العقول سے مراد جن' انس اور ملائکہ ہیں' ان دونوں آیتوں کا حاصل یہ ہے کہ عقل والے ہوں یا بے عقل' تمام جمادات' نباتات' حیوانات' جن' انسان اور فرشتے سب اللہ کے مملوک ہیں۔ اس میں مشرکین کا رد ہے جو بتوں کو پوجتے تھے' کیونکہ تمام پتھر اس کے مملوک ہیں' سو بت بھی اس کے مملوک ہیں اور جو مملوک ہو وہ معبود کیسے ہو سکتا ہے' اسی طرح اس میں یہود اور نصاریٰ کا بھی رد ہے جو حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ کو معبود مانتے تھے' کیونکہ حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ بھی اللہ کے مملوک ہیں اور جو مملوک ہو وہ معبود کیسے

ہو سکتا ہے' اس پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: یہ لوگ جو اللہ کو چھوڑ کر (خود ساختہ) شریکوں کی پیروی کر رہے ہیں یہ کس کی پیروی کر رہے ہیں؟ یعنی یہ جن شریکوں کی پیروی کر رہے ہیں وہ تو سب اللہ کے مملوک ہیں' وہ عبادت کے کیسے مستحق ہو گئے! یہ صرف اپنے گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور ان کا اندازہ غلط ہے۔

وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو' اور دکھانے والا دن بنایا الخ' اس سے پہلے فرمایا تھا: ان العزۃ للہ جمیعا۔ (یونس: ۶۵) یعنی ہر قسم کا غلبہ اللہ ہی کیلئے ہے' اس آیت میں اس پر دلیل قائم فرمائی ہے کہ اس نے رات اس لیے بنائی ہے کہ تمہاری تھکاوٹ دُور ہو' اور دن اس لیے بنایا ہے کہ اس کی روشنی میں اپنی ضروریاتِ زندگی کو فراہم کر سکو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انہوں نے کہا اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے' وہ (اس سے) پاک ہے' وہی بے نیاز ہے' آسمانوں اور زمینوں میں سب اسی کے مملوک ہیں' تمہارے پاس اس (باطل قول) پر کوئی دلیل نہیں ہے' کیا تم اللہ کے متعلق ایسی بات کہتے ہو جس کو تم خود (بھی) نہیں جانتے○ آپ کہیے بیشک جو لوگ اللہ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں وہ (کبھی) کامیاب نہیں ہوں گے○ (یہ) دنیا کا عارضی فائدہ ہے پھر ہماری ہی طرف انہوں نے لوٹنا ہے' پھر ہم ان کے کفریہ کاموں کی بناء پر ان کو سخت عذاب چکھائیں گے○ (یونس: ۷۰-۶۸)

اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کا محال ہونا

اس آیت میں بھی مشرکین کا رد ہے' عیسائی یہ کہتے تھے کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے اور یہود یہ کہتے تھے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور کفارِ مکہ یہ کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر ان کا رد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو ولد بنانے سے مستغنی ہے' کیونکہ ولد تب ہوتا ہے جب والد کا ایک جز اس سے منفصل ہو پھر اس جز سے ولد بنتا ہے اور اللہ تعالیٰ ذو اجزاء نہیں ہے کیونکہ جس کے اجزاء ہوں وہ اپنے قوام میں ان اجزاء کا محتاج ہوتا ہے اور وہ حادث ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا محتاج اور حادث ہونا محال ہے' اور دیگر دلائل حسبِ ذیل ہیں:

(۱) ولد اس لیے ہوتا ہے کہ والد کے فوت ہونے کے بعد وہ اس کا قائم مقام ہو اور اللہ تعالیٰ قدیم' ازلی' باقی اور سرمدی ہے' اس لیے وہ فوت نہیں ہو سکتا' اس کو کسی قائم مقام کی حاجت نہیں اس لیے وہ ولد سے مستغنی ہے۔

(۲) ولد کے لیے زوجہ اور شہوت کا ہونا ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے مستغنی ہے۔

(۳) ولد کی حاجت اس شخص کو ہوتی ہے جس کو اپنے ضعف کے وقت ولد کی اعانت کی ضرورت ہو اور اللہ تعالیٰ ضعف اور کسی کی اعانت سے مستغنی ہے۔

(۴) ولد جنس میں والد کے مماثل ہوتا ہے' اگر اللہ تعالیٰ کا ولد فرض کیا جائے تو وہ ممکن ہو گا یا واجب۔ اگر ممکن ہو تو اس کا مماثل نہیں اور اگر واجب ہو تو تعدد وجباء لازم آئے گا' نیز ولد والد سے موخر اور حادث ہوتا ہے اور واجب کا موخر اور حادث ہونا محال ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ واجب الوجود اور قدیم ہے اس لیے وہ والدین سے مستغنی ہے اور جب وہ والدین سے مستغنی ہے تو واجب ہوا کہ وہ اولاد سے بھی مستغنی ہو' سو اللہ تعالیٰ کا غنی مطلق ہونا اس بات کو واجب کرتا ہے کہ اس کے لیے ولد ہونا محال ہو۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دوسری دلیل دی کہ ولد والد کا مملوک نہیں ہوتا' اگر کوئی شخص کسی غلام کو خریدے جو اس کا بیٹا ہو تو وہ خریدتے ہی آزاد ہو جاتا ہے اور جب کہ آسمان اور زمین کی ہر چیز اللہ کی مملوک ہے تو پھر اس کا کوئی ولد کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ ولد مملوک نہیں ہوتا' اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بطور زجر و توبیخ فرمایا: کیا تمہارے پاس اس پر کوئی دلیل ہے؟ یا تم

بلا دلیل اللہ پر بہتان باندھ رہے ہو۔

جب اللہ تعالیٰ نے دلائل سے واضح فرما دیا کہ اس کے لیے اولاد کا ہونا محال ہے تو اس پر متفرع فرمایا: جو لوگ اس پر جھوٹا افتراء باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پائیں گے۔

کفار کے ناکام ہونے کی واضح دلیل

فلاح کا معنی ہے مقصود اور مطلوب تک پہنچنا اور فلاح نہ پانے کا مطلب ہے کہ وہ شخص اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو گا' بلکہ ناکام اور نامراد ہو گا۔ بعض لوگ گھٹیا مقاصد اور فوری نتائج کے طالب ہوتے ہیں تو جب انہیں اپنا ردی مطلوب جلد حاصل ہو جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ وہ کامیاب ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ یہ خسیس اور گھٹیا مطلوب دنیاوی زندگی میں متاعِ قلیل ہے' پھر بہرحال انہوں نے مرنا ہے اور مرنے کے بعد اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے اور پھر انہوں نے اپنے کفر اور تکذیب کی وجہ سے دائمی عذاب بھگتنا ہے تو یہ کامیابی نہیں ہے بلکہ واضح ناکامیابی ہے۔

وقف لازم

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ

اور ان کے سامنے نوح کا قصہ بیان کیجئے، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اگر تم کو میرا

مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا

(تمہارے درمیان) رہنا اور تمہیں اللہ کی آیتوں کے ساتھ نصیحت کرنا، ناگوار ہے، تو میں نے تو صرف اللہ پر توکل کیا ہے تم اپنے

اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا

(خود ساختہ) معبودوں کے ساتھ مل کر اپنی سازش کو پختہ کر لو، پھر تمہاری وہ سازش (تمہارے گروہ پر) مخفی نہ رہے پھر تم جو کچھ میرے

اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝ ۷۱ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ

خلاف کر سکتے ہو وہ کر گزرو اور مجھے مہلت نہ دو ○ پھر اگر تم اعراض کرو تو میں نے (تبلیغ دین کا) تم سے کوئی اجر طلب نہیں

اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ ۷۲

کیا، میرا اجر تو صرف اللہ پر ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے رہوں ○

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ

سو انہوں نے ان کی تکذیب کی، پس ہم نے ان کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں (سوار) تھے سب کو (طوفان سے) نجات دی، اور ہم نے

وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝ ۷۳

انہیں (ان کا) جانشین بنا دیا، اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی تھی ان کو ہم نے غرق کر دیا تو آپ دیکھیے کہ ان لوگوں کا کیسا انجام ہوا جن کو ڈرایا گیا تھا ○

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ

پھر نوح کے بعد ہم نے (اور) رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا سو وہ ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے تو

فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى

وہ اس پر ایمان لانے کے لیے تیار نہ تھے جس کی وہ پہلے تکذیب کر چکے تھے، ہم اسی طرح سرکشی

قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ

کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں ○ پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا

فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا تو انہوں نے تکبر کیا وہ مجرم

مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا

لوگ تھے ○ پس جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا تو کہنے لگے بے شک یہ تو ضرور

لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ

کھلا ہوا جادو ہے ○ موسیٰ نے کہا کیا تم حق کے متعلق یہ کہتے ہو، جب وہ تمہارے پاس آیا! کیا یہ جادو ہے؟

وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا

جادو کرنے والے تو کبھی کامیاب نہیں ہوتے ○ انہوں نے کہا کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ تم ہمیں اس (دین) سے پھیر دو جس پر ہم نے

وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

اپنے باپ دادا کو پایا ہے، اور زمین میں تم ہی دونوں کے لیے بڑائی ہو جائے اور ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں ○

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِىْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ

فرعون نے حکم دیا کہ ہر ماہر جادوگر کو ہمارے پاس لے آؤ ○ پس جب وہ جادوگر آ گئے

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى

موسیٰ نے ان سے کہا تم ڈالو جو کچھ تم ڈالنے والے ہو ○ پھر جب انہوں نے ڈال دیا تو موسیٰ نے کہا

مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ ۙ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ

تم جو کچھ لائے ہو وہ جادو ہے' بے شک عنقریب اللہ اس کو نیست و نابود کردے گا' بے شک اللہ فساد کرنے والوں کے کام

ع ٨ ١٣ ١٣

الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾

کی اصلاح نہیں فرماتا ○ اور اللہ اپنے کلمات سے حق کا حق ہونا ثابت فرمائے گا خواہ مجرموں کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو ○

حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان کے سامنے نوح کا قصہ بیان کیجئے' جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اگر تم کو میرا (تمہارے درمیان) رہنا اور تمہیں اللہ کی آیتوں کے ساتھ نصیحت کرنا ناگوار ہے تو میں نے تو صرف اللہ پر توکل کیا ہے' تم اپنے (خود ساختہ) معبودوں کے ساتھ مل کر اپنی سازش کو پختہ کرلو' پھر تمہاری وہ سازش (تمہارے گروہ پر) مخفی نہ رہے' پھر تم جو کچھ میرے خلاف کر سکتے ہو وہ کر گزرو اور مجھے مہلت نہ دو○ پھر اگر تم اعراض کرو تو میں نے (تبلیغ دین کا) تم سے کوئی اجر طلب نہیں کیا' میرا اجر تو صرف اللہ پر ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے رہوں○ (یونس: ۷۲-۷۱)

ربط آیات اور انبیاء سابقین کے قصص بیان کرنے کی حکمتیں

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کے شبہات کا ازالہ فرمایا تھا اور توحید اور رسالت پر دلائل قائم فرمائے تھے' اب اللہ تعالیٰ نے دوسرا عنوان شروع فرمایا اور انبیاء علیہم السلام کے قصص کا بیان شروع فرمایا اور خطاب کی ایک نوع سے دوسری نوع کی طرف منتقل ہونے میں حسب ذیل فوائد ہیں:

(۱) جب خطاب کی ایک نوع میں کلام طویل ہو جائے تو بعض اوقات مخاطب کو اس سے اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے اور اس پر غفلت یا اونگھ طاری ہونے لگتی ہے اور جب خطاب کا انداز بدل جائے اور کلام کی دوسری قسم سے تقریر شروع کر دی جائے تو اس کا اونگھتا ہوا ذہن بیدار ہو جاتا ہے اور اس کو اس نئے موضوع سے دلچسپی ہونے لگتی ہے اور اس کا ذوق و شوق تازہ ہو جاتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے انبیاء سابقین علیہم السلام کے قصص بیان فرمائے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے لیے انبیاء علیہم السلام میں نمونہ ہو' کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سنیں گے کہ تمام کافر تمام رسولوں کے ساتھ اسی طرح انکار اور مخالفت کے ساتھ پیش آتے رہے ہیں اور واضح دلائل اور معجزات دیکھنے کے باوجود ان کو جھٹلاتے رہے ہیں تو کفار مکہ کی مخالفت اور ان کی شقاوت کو برداشت کرنا آپ پر سہل اور آسان ہو جائے گا۔

(۳) کفار جب انبیاء سابقین علیہم السلام کے ان واقعات کو سنیں گے تو ان کو یہ علم ہو گا کہ انبیاء متقدمین کو ان کے زمانہ کے کافروں نے ایذاء پہنچانے میں اپنی انتہائی طاقت صرف کر دی' لیکن بالآخر وہ ناکام اور نامراد ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کی مدد فرمائی اور کافر ذلیل اور رسوا ہوئے' تو ہو سکتا ہے کہ ان واقعات کو سن کر کفار کے دل خوف زدہ ہوں اور وہ اپنی ایذاء رسانیوں سے باز آجائیں۔

(۴) ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے۔ آپ نے کسی معلم سے پڑھا تھا نہ کسی عالم کی صحبت میں بیٹھے تھے۔ پھر آپ نے انبیاء سابقین کے یہ واقعات اسی طرح بیان فرمائے جس طرح تورات' زبور اور انجیل میں لکھے ہوئے

تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے ان قصص کو اللہ تعالیٰ کی وحی سے جانا تھا اور یہ آپ کی نبوت کی صداقت اور قرآن مجید کی حقانیت کی واضح دلیل ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ کو مقدم کرنے کی وجہ

اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں تین قصص بیان فرمائے ہیں: پہلے حضرت نوح کا قصہ بیان فرمایا پھر حضرت موسیٰ کا اور اس کے بعد حضرت یونس کا قصہ بیان فرمایا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت موسیٰ اور حضرت یونس علیہما السلام پر مقدم ہیں، نیز اس لیے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے جب کفر اور انکار پر اصرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو طوفان میں غرق کر دیا، سو اللہ تعالیٰ نے یہ قصہ بیان فرمایا تاکہ اس کو سن کر کفار مکہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز آجائیں اور حضرت نوح کی قوم کے عذاب سے عبرت حاصل کریں، نیز اس لیے کہ کفار مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کرتے تھے کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو ہمارے انکار پر کوئی آسمانی عذاب لائیں اور کہتے تھے کہ ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا، تو ان کو بتایا کہ حضرت نوح کی قوم بھی ایسا ہی کہتی تھی، پھر بالآخر ان پر طوفان سے غرقابی کا عذاب آگیا۔

حضرت نوح علیہ السلام سے ان کی قوم کی ناگواری کی وجوہ

اس آیت میں فرمایا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو یہ ناگوار تھا کہ حضرت نوح ان کے درمیان رہیں، ان کی ناگواری کی وجہ یہ تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو سال تک ان کے درمیان رہے اور ان کے پاس اتنے لمبے قیام کی وجہ سے وہ بیزار ہو گئے تھے، دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ بت پرستی کے جس طریقہ پر کاربند تھے وہ طریقہ ان کو بہت مرغوب اور بہت محبوب تھا، وہ اس سے جذباتی وابستگی رکھتے تھے اور حضرت نوح علیہ السلام ان سے یہ فرماتے تھے کہ وہ اس طریقہ کو ترک کر دیں، اور یہ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی انسان کو اس کے پسندیدہ طریقہ سے ہٹانے کی کوشش کرے تو اس کو برا لگتا ہے، تیسری وجہ یہ ہے کہ انسان دنیاوی لذات سے محبت کرتا ہے، فحش کاموں میں اس کو مزہ آتا ہے اور ان کو چھوڑنا اس پر دشوار ہوتا ہے اور عبادت کی مشقتوں سے وہ متنفر ہوتا ہے، ایسے شخص کو وہ آدمی برا لگتا ہے جو اس کو برے کاموں سے منع کرے اور نیک کام کرنے کا حکم دے۔

حضرت نوح علیہ السلام کو تبلیغ دین میں کفار کا کوئی خوف تھا نہ ان سے کسی نفع کی توقع تھی

حضرت نوح علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ ان کی قوم کو ان کا قیام اور ان کا نصیحت کرنا ناگوار ہے تو انہوں نے ابتداء سے یہ فرمایا: فعلی اللہ توکلت "میں نے صرف اللہ پر توکل کیا ہے" کیونکہ مجھے اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر کامل بھروسہ ہے کیونکہ وہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا اور تم اس وہم میں نہ رہنا کہ تم جو مجھے قتل کرنے اور ایذاء پہنچانے کی دھمکیاں دیتے ہو تو میں اس سے ڈر کر اپنے مشن کو ترک کر دوں گا اور اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف دعوت دینے کو چھوڑ دوں گا، پھر دوسری بار تاکید کی: فاجمعوا امرکم گویا کہ یہ فرمایا کہ تم میری مخالفت میں اور مجھے ایذاء پہنچانے کے لیے جس قدر اسباب جمع کر سکتے ہو وہ جمع کر لو، اور نہ صرف تم بلکہ تم اپنے ساتھ اپنے مزعوم خداؤں کو بھی ملا لو، پھر تیسری بار فرمایا: پھر وہ تمہاری سازش (تمہارے گروہ پر) مخفی نہ رہے، یعنی تم نے میرے خلاف جو کچھ کرنا ہے وہ کھلم کھلا کرو، پھر چوتھی بار فرمایا: ثم اقضوا الی "پھر تم جو کچھ میرے خلاف کر سکتے ہو وہ کر گزرو" یعنی تم جو کچھ مجھے ضرر پہنچانا چاہتے ہو اور میرے خلاف جو بھی شر اور فساد کرنا چاہتے ہو وہ کر گزرو، اور پانچویں بار فرمایا: اور مجھے مہلت نہ دو یعنی تم جس قدر جلد میرے خلاف کارروائی کر سکتے ہو وہ کرو، اس سے ظاہر ہو گیا کہ حضرت نوح علیہ السلام کفار کی دھمکیوں سے بالکل نہیں ڈرتے تھے، اور انہیں اللہ تعالیٰ پر کامل

توکل تھا۔

اس کے بعد فرمایا: پھر اگر تم اعراض کرو تو میں نے (تبلیغ دین کا) تم سے کوئی اجر طلب نہیں کیا۔ اس قول میں بھی اس پر دلیل دی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو کفار سے بالکل ڈر نہ تھا، کیونکہ خوف یا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ دشمن کی طرف سے کوئی شر پہنچے گا تو حضرت نوح کے پہلے ارشادات سے ظاہر ہو گیا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو کفار کے شر اور فساد کی کوئی پرواہ نہیں تھی، یا خوف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ متوقع منافع اور فوائد منقطع ہو جائیں گے، تو حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا، آپ نے ان سے کوئی چیز نہیں لی تھی کہ ان کی ناگواری کی بناء پر اس کے چھن جانے کا خوف ہوتا۔

اس کے بعد فرمایا: میرا اجر تو صرف اللہ پر ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے رہوں۔ اس کا ایک معنی یہ ہے کہ تم دین اسلام قبول کرو یا نہ کرو مجھے دین اسلام پر برقرار رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ دین اسلام کی دعوت دینے کی وجہ سے مجھے خواہ کوئی ضرر پہنچے مجھے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری پر برقرار رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو انہوں نے ان کی تکذیب کی، پس ہم نے ان کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں (سوار) تھے سب کو (طوفان سے) نجات دی اور ہم نے انہیں (ان کا) جانشین بنا دیا اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی تھی ان کو ہم نے غرق کر دیا تو آپ دیکھیے کہ ان لوگوں کا کیسا انجام ہوا جن کو ڈرایا گیا تھا○ پھر نوح کے بعد ہم نے (اور) رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا سو وہ ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے تو وہ اس پر ایمان لانے کے لیے تیار نہ تھے، جس کی وہ پہلے تکذیب کر چکے تھے، ہم اسی طرح سرکشی کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں○ (یونس: ۷۴-۷۳)

حضرت نوح کی قوم کے کافروں کا انجام

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان کیا معاملہ ہوا، اور اب یہ بیان فرمایا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے اصحاب اور ان کی قوم کے کفار کے درمیان انجام کار کیا معاملہ ہوا، سو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے اصحاب مومنین کے متعلق یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کفار سے نجات دی، اور یہ کہ ان کو کفار کا جانشین بنا دیا بایں طور کہ کفار کو غرق کر دیا اور کفار کے متعلق یہ فرمایا کہ ان کو ہلاک کر دیا اور غرق کر دیا۔

اس آیت میں کفار کے لیے ترہیب اور عبرت کا سامان ہے کہ جو لوگ اللہ کے رسول کی تکذیب کریں گے ان پر ایسا عذاب آ سکتا ہے جیسا حضرت نوح علیہ السلام کے مکذبین پر آیا تھا، اور اس آیت میں مومنوں کے لیے ترغیب ہے اور ایمان پر ثابت قدم رہنے کی تحریص ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کے اصحاب کو مخالفین کے شر اور فساد سے نجات عطا کی تھی، اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کو بھی مخالفین کے ضرر سے بچائے گا۔ قوم نوح کے غرقاب ہونے کی تفصیل باقی سورتوں میں مذکور ہے۔

اس کے بعد فرمایا: پھر نوح کے بعد ہم نے (اور) رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بعد آنے والے رسولوں کا نام ذکر نہیں فرمایا، ان رسولوں میں سے حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہم ہیں، ان انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے بہت عظیم معجزات دے کر بھیجا، اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ ان انبیاء کی قوم کے لوگوں نے بھی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے کافروں کی طرح اپنے نبیوں کی

تکذیب کی اور ان پر ایمان لانے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

کافروں کے دلوں پر مہر لگانے کی توجیہ

اس کے بعد فرمایا: ہم اسی طرح سرکشی کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب اللہ نے خود ہی ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے تو ایمان نہ لانے میں ان کا کیا قصور ہے! اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے اس قسم کا سخت کفر کیا جس کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی' دوسرا جواب یہ ہے کہ مہر لگانے کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو سخت کردیا اور یہ ایمان لانے کے منافی نہیں ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (النساء: ١٥٥)

بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگائی ہے تو وہ بہت ہی کم ایمان لائیں گے۔

اس آیت کی زیادہ تفصیل ہم نے البقرہ: ٧ میں بیان کردی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا تو انہوں نے تکبر کیا وہ مجرم لوگ تھے ۝ پس جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا تو کہنے لگے بے شک یہ تو ضرور کھلا ہوا جادو ہے ۝ موسیٰ نے کہا کیا تم حق کے متعلق یہ کہتے ہو' جب وہ تمہارے پاس آیا کیا یہ جادو ہے؟ جادو کرنے والے تو کبھی کامیاب نہیں ہوتے ۝ (یونس: ٧٧-٧٥)

فرعون اور اس کے درباریوں کے قول میں تعارض کا جواب اور حضرت موسیٰ کے معجزہ کا جادو نہ ہونا

ان آیتوں کا معنی بالکل واضح ہے' صرف یہ بات وضاحت طلب ہے کہ آیت: ٧٦ میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کو دیکھ کر فرعون اور اس کے درباریوں نے کہا کہ بے شک یہ تو ضرور کھلا ہوا جادو ہے اور آیت: ٧٧ میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تم نے حق (معجزہ) کو دیکھ کر یہ کہا کیا یہ جادو ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کیا یہ جادو ہے؟ یہ فرعون اور اس کے درباریوں کا قول نہیں ہے بلکہ ان کا قول محذوف ہے اور وہ یہ ہے تم وہ کہتے ہو جو کہتے ہو' اور پورا مفہوم یوں ہے موسیٰ نے کہا کیا تم حق کے متعلق وہ کہتے ہو جو کہتے ہو؟ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بطور انکار فرمایا: کیا یہ جادو ہے؟ پھر اس معجزہ کو جادو قرار دینے کا بطلان فرمایا: یہ جادو کیسے ہوسکتا ہے' جادو کرنے والے تو کبھی کامیاب نہیں ہوتے اور اللہ نے مجھے کامیاب فرمایا ہے' جادو کرنے والے تو نظر بندی کرتے اور ملمع کاری کرتے ہیں اور لاٹھی کو سانپ بنا دینا اور ید بیضا نظر بندی یا ملمع کاری نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انہوں نے کہا کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ تم ہمیں اس (دین) سے پھیر دو' جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے' اور زمین میں تم ہی دونوں کے لیے بڑائی ہو جائے اور ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں ۝ فرعون نے حکم دیا کہ ہر ماہر جادوگر کو ہمارے پاس لے آؤ ۝ پس جب وہ جادوگر آگئے' موسیٰ نے ان سے کہا تم ڈالو جو کچھ تم ڈالنے والے ہو ۝ پھر جب انہوں نے ڈال دیا تو موسیٰ نے کہا تم جو کچھ لائے ہو وہ جادو ہے بے شک عنقریب اللہ اس کو نیست و نابود کردے گا' بے شک اللہ فساد کرنے والوں کے کام کی اصلاح نہیں فرماتا ۝ اور اللہ اپنے کلمات سے حق کا حق ہونا ثابت فرما دے گا خواہ مجرموں کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو ۝ (یونس: ٨٢-٧٨)

قومِ فرعون کے بیان کردہ دو عُذر

اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ فرعون اور اس کے درباریوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور پیغام کو قبول نہ کرنے کے دو سبب بیان کیے: ایک یہ کہ ہم اس دین کو ترک نہیں کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو عمل کرتے ہوئے پایا، انہوں نے دلائل ظاہرہ کے مقابلہ میں اندھی تقلید کو ترجیح دی اور اس پر اصرار کیا اور دوسرا سبب یہ بیان کیا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون ملک مصر میں اپنی بڑائی، اپنا تسلط اور اپنا اقتدار چاہتے ہیں کیونکہ جب مصر کے رہنے والے ان کے معجزات کو دیکھ کر ان پر ایمان لے آئیں گے تو پھر سب ان ہی کے مطیع اور فرماں بردار ہوں گے۔ انہوں نے پہلے اندھی تقلید سے استدلال کیا اور اس کے بعد اس سے کہ مصر کی حکومت کو وہ اپنے ہاتھوں سے کھونا نہیں چاہتے اور پھر صراحتاً کہہ دیا کہ ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اس کے بعد فرعون کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کا جادو کے زور سے معارضہ کرنے کا ارادہ کیا تاکہ لوگوں پر یہ ظاہر کردیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو معجزہ پیش کیا تھا وہ دراصل جادو کی قسم سے ہے، پھر فرعون نے جادوگروں کو جمع کیا تو ان سے موسیٰ علیہ السلام نے کہا تم پیش کرو جو کچھ تم پیش کرنا چاہتے ہو!

جادو کا حکم دینے کی توجیہ

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ معجزہ کا جادو سے مقابلہ کرنا کفر ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو کفر کا حکم کس طرح دیا؟ جبکہ کفر کا حکم دینا بھی کفر ہے!

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو لاٹھیاں اور رسیاں پھینکنے کا اس لیے حکم دیا تھا کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے جو کچھ جادوگروں نے پیش کیا ہے وہ عمل فاسد اور سعی باطل ہے، اور جادوگروں کا یہ عمل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کے اظہار کا ذریعہ بنا، خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فی نفسہٖ جادوگروں کا عمل مطلوب نہیں تھا بلکہ ان کا عمل اس لیے مطلوب تھا کہ وہ ان کے عمل کی ناکامی اور نامرادی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کے اظہار اور سرفرازی کا سبب بنے۔

جب جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں ڈال دیں تو موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا: تم نے جو بھی عمل کیا وہ محض باطل جادو ہے، اور یہ اس لیے فرمایا کہ جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا آپ نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ جادو ہے، اس لیے اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ جادو ہے اور وہ محض ملمع کاری ہے جس کا بطلان ابھی ظاہر ہو جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ وہ اپنے کلمات سے حق کا حق ہونا ثابت کر دے گا، اللہ تعالیٰ نے باقی سورتوں میں یہ بیان کر دیا ہے کہ اس نے جادو کو کس طرح باطل فرمایا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اژدہا بن کر ان تمام لاٹھیوں اور رسیوں کو کھا گیا تھا۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ

سو (ابتداءً) موسیٰ کی قوم کی بعض اولاد کے سوا ان پر کوئی ایمان نہیں لایا (اور وہ بھی) فرعون اور اس کے

وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ

درباریوں سے ڈرتے ہوئے کہ وہ ان کو فتنہ میں مبتلا کر دیں گے اور بے شک فرعون زمین میں متکبر تھا اور وہ یقیناً

لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ

حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا ○ اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم ! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو صرف اسی پر

تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿٨٤﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا

توکل کرو اگر تم (واقعی) مسلمان ہو ○ انہوں نے کہا ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا ہے، اے ہمارے رب! ہم کو ظالم لوگوں

فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٦﴾ وَ

کے ذریعہ آزمائش میں مبتلا نہ کر ○ اور ہم کو اپنی رحمت سے قوم کفار سے نجات عطا فرما ○ اور

اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا

ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف یہ وحی فرمائی کہ تم اپنی قوم کے لیے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو

بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨٧﴾ وَقَالَ مُوْسٰى

قبلہ (مساجد) قرار دو اور نماز پڑھو اور مومنین کو بشارت دو ○ اور موسیٰ نے کہا

رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ

اے ہمارے رب! تو نے فرعون اور اس کے درباریوں کو دنیا کی زندگی میں زینت کا سامان اور مال دیا ہے

رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ

اے ہمارے رب! "تاکہ وہ انجام کار لوگوں کو تیرے راستہ سے بھٹکا دیں"، اے ہمارے رب! ان کے مال و دولت کو برباد کر دے اور

عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٨٨﴾ قَالَ قَدْ

ان کے دلوں کو سخت کر دے تاکہ وہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک وہ دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں ○ فرمایا

اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٨٩﴾

تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی ہے، تم دونوں ثابت قدم رہنا اور جاہلوں کے راستہ کی ہرگز پیروی نہ کرنا ○

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار گزار دیا تو فرعون اور اس کے لشکر نے دشمنی اور سرکشی سے ان

وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰۗى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ

کا پیچھا کیا حتیٰ کہ جب وہ غرق ہونے لگا تو اس نے کہا میں ایمان لایا کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان

اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ ٩٠ اٰۗلْئٰنَ وَقَدْ

لائے ہیں اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے اور میں مسلمانوں میں سے ہوں ○ (فرمایا) اب لایا ایمان لایا ہے)

عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ ٩١ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ

حالانکہ اس سے پہلے تو نے نافرمانی کی اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا ○ سو آج ہم تیرے (بے جان) جسم کو

بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ

بچا لیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے عبرت کا نشان بن جائے، اور بے شک بہت سے لوگ

عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝ ٩٢ ع

ہماری نشانیوں سے غافل ہیں ○

ع ۹ ۱۴

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو (ابتداءً) موسیٰ کی قوم کی بعض اولاد کے سوا ان پر کوئی ایمان نہیں لایا (اور وہ بھی) فرعون اور اس کے درباریوں سے ڈرتے ہوئے کہ وہ ان کو فتنہ میں مبتلا کر دیں گے اور بے شک فرعون زمین میں متکبر تھا اور وہ یقیناً حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا ○ (یونس: ۸۳)

ربط آیات اور فرعون کے واقعہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عظیم معجزات پیش کیے اور ان کا عصا جادوگروں کی تمام لاٹھیوں اور رسیوں کو کھا گیا یہ ایسا عظیم حسی معجزہ تھا جس کو تمام لوگوں نے اپنی جاگتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا، اس کے باوجود حضرت موسیٰ کی قوم کی بعض اولاد کے سوا اور کوئی ایمان نہیں لایا' اس آیت میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آپ کفار مکہ کے اعراض کرنے اور کفر پر اصرار کرنے پر غم نہ کریں کیونکہ تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے کہ ان کی پیہم تبلیغ اور بکثرت معجزات دکھانے کے باوجود معدودے چند افراد ہی ایمان لاتے ہیں' سو اگر آپ کی مسلسل تبلیغ کے باوجود چند افراد نے ہی اسلام قبول کیا ہے تو اس پر غم نہ کریں' آپ اس معاملہ میں تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ منسلک ہیں۔

حضرت موسیٰ کی قوم کی بعض اولاد کا مصداق

اس آیت میں ذکر فرمایا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ان کی قوم کی بعض اولاد ایمان لائی۔ اس بعض اولاد کے تعین میں اختلاف ہے۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ جن لوگوں کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا' لمبے عرصہ کے بعد وہ لوگ مر گئے اور ان کی اولاد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئی۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: جن لوگوں کی اولاد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائی تھی وہ بنی اسرائیل نہیں تھے بلکہ وہ فرعون کی قوم کے چند لوگ تھے۔ ان میں فرعون کی بیوی' آل فرعون کا مومن' فرعون کا خازن اور فرعون کے خازن کی بیوی تھی۔

حضرت ابن عباس کی دوسری روایت یہ ہے کہ وہ لوگ بنی اسرائیل کی اولاد تھے۔

امام ابن جریر فرماتے ہیں: میرے نزدیک راجح مجاہد کی روایت ہے کہ جن لوگوں کی ذریت ایمان لائی اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا اور وہ بنو اسرائیل ہیں' لمبا عرصہ گزرنے کے بعد وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے سے پہلے مر گئے' پھر ان کی اولاد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پایا اور ان میں سے بعض لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ (جامع البیان جز ۱۱ ص ۱۹۴' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

بنی اسرائیل کی اولاد میں سے جو بعض ایمان لائے تھے ان کو بھی یہ ڈر تھا کہ فرعون اور اس کے سردار ان کو فتنہ میں مبتلا کر دیں گے کیونکہ وہ فرعون سے بہت ڈرتے تھے اور فرعون کی گرفت بہت سخت تھی اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بہت بڑا دشمن تھا' اور فتنہ کا معنی ہے آزمائش اور اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ان پر طرح طرح کے عذاب مسلط کر کے ان کو ان کے سابق دین کی طرف لوٹانے کی کوشش کرے گا اور فرعون زمین میں متکبر تھا کیونکہ وہ اپنے مخالفین کو سخت سزائیں دیتا تھا اور بہت قتل کرتا تھا' اور وہ حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا کیونکہ اس نے اللہ کا بندہ ہونے کے باوجود الوہیت کا دعویٰ کیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو صرف اسی پر توکل کرو اگر تم (واقعی) مسلمان ہو ○ انہوں نے کہا ہم نے اللہ پر ہی توکل کیا ہے' اے ہمارے رب! ہم کو ظالم لوگوں کے ذریعہ آزمائش میں مبتلا نہ کر ○ اور ہم کو اپنی رحمت سے قوم کفار سے نجات عطا فرما ○ (یونس: ۸۶-۸۴)

اسلام اور ایمان کا معنی اور اس معنی پر توکل کا متفرع ہونا

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ گویا کہ اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے فرما رہا ہے کہ اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو صرف اللہ پر توکل کرو' کیونکہ اسلام کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا' اور اس کے احکام کی اطاعت کرنا' اور ایمان کا معنی یہ ہے کہ بندہ یہ مان لے کہ اللہ تعالیٰ واحد ہے اور واجب الوجود ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ حادث ہے اور اس کی مخلوق ہے اور اس کے زیر تصرف اور اس کے زیر تدبیر ہے اور جب بندہ میں یہ دونوں کیفیتیں پیدا ہو جائیں گی تو وہ اپنے تمام معاملات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے گا اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ پر توکل کا نور پیدا ہو جائے گا اور توکل کا معنی یہ ہے کہ بندہ اپنے تمام معاملات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے اور تمام احوال میں صرف اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق فرمایا تھا کہ انہوں نے کہا: فعلی اللہ توکلت "میں نے صرف اللہ پر توکل کیا ہے" (یونس: ۷۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم صرف اللہ پر توکل کرو' (یونس: ۸۴) اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی ذات میں کامل تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی امت کو کامل بنانے والے تھے اور ان دونوں مرتبوں میں بڑا فرق ہے۔

حضرت موسیٰ پر ایمان لانے والوں کی دعا کے دو محمل

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں نے دعا کی تھی: اے ہمارے رب! ہم کو ظالم لوگوں کے لیے آزمائش نہ بنا'

اس کے دو محمل ہیں: ایک یہ ہے کہ قوم فرعون کو ہمارے ذریعہ آزمائش میں مبتلا نہ کر، کیونکہ اگر تو نے قوم فرعون کو ہم پر مسلط کر دیا تو ان کے دلوں میں یہ بات بیٹھ جائے گی کہ اگر ہم حق پر ہوتے تو وہ ہم پر مسلط نہ ہوتے اور یہ ان کے کفر پر اصرار کرنے کا قوی شبہ ہو جائے گا اور اس طرح ہم پر ان کا تسلط ان کے لیے آزمائش بن جائے گا یا اگر تو نے ان کو ہم پر مسلط کر دیا تو وہ آخرت میں عذاب شدید کے مستحق ہوں گے اور یہ ان کے لیے آزمائش ہے اور اس کا دوسرا محمل یہ ہے کہ ان ظالموں کے ذریعہ ہم کو آزمائش میں مبتلا نہ کر یعنی ان کو ہم پر قدرت نہ دے تاکہ وہ ہم پر ظلم اور قہر کریں اور یہ خطرہ ہو کہ ہم اس دین سے پھر جائیں جس کو ہم نے قبول کیا ہے۔

اور پھر انہوں نے یہ دعا کی کہ اے اللہ! ہم کو اپنی رحمت سے قوم کفار سے نجات عطا فرما۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف یہ وحی فرمائی کہ تم اپنی قوم کے لیے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ (مساجد) قرار دو اور نماز پڑھو اور مومنین کو بشارت دو○ (یونس: ۸۷)

بنی اسرائیل کے گھروں کو قبلہ بنانے کے محامل

اس آیت میں یہ حکم دیا ہے کہ تم اپنی قوم کے لیے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ (مساجد) قرار دو، اس کی تفسیر میں مفسرین کے حسب ذیل اقوال ہیں:

عکرمہ حضرت ابن عباس سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کرتے ہیں: بنو اسرائیل نماز پڑھنے میں فرعون اور اس کی قوم سے ڈرتے تھے تو ان کو حکم دیا کہ تم اپنے گھروں کو قبلہ بنالو، یعنی اپنے گھروں کو مسجد بنالو اور ان میں نماز پڑھو۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۷۷۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

ایک اور سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بنو اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم یہ طاقت نہیں رکھتے کہ فرعونیوں پر ظاہر کر کے نماز پڑھیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ اجازت دی کہ وہ اپنے گھروں میں نماز پڑھیں اور ان کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنے گھروں کو قبلہ رو بنائیں۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۷۸۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ قبلہ سے مراد کعبہ ہے۔ جب حضرت موسیٰ اور ان کے متبعین کو اپنے معابد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے سے فرعون کا خوف ہوا تو ان کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنے گھروں میں قبلہ رو مساجد بنائیں اور قبلہ کی طرف منہ کر کے خفیہ طریقہ سے نماز پڑھیں۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۷۸۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

امام ابن جریر نے کہا: بیوت کا غالب استعمال رہائشی گھروں کے لیے ہوتا ہے اور قبلہ کا غالب استعمال نماز کے قبلہ کے لیے ہوتا ہے اور قرآن مجید کے الفاظ کو ان ہی معانی پر محمول کرنا چاہیے جن کے لیے غالب استعمال ہو، اس لیے اس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اپنے گھروں میں قبلہ رو ہو کر نماز پڑھو اور اقیموا الصلوٰۃ کا معنی ہے فرض نماز کو اس کی شرائط کے ساتھ اس کے اوقات میں پڑھو، اور بشر المؤمنین کا معنی ہے اے محمد! (صلی اللہ علیک وسلم) مومنین کو عظیم ثواب کی بشارت دیجئے۔ (اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے فرمایا کہ آپ بنی اسرائیل کو یہ بشارت دیجئے کہ عنقریب اللہ ان کو فرعون اور اس کے سرداروں پر غلبہ عطا فرمائے گا) (جامع البیان جز ۱۱ ص ۲۰۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور موسیٰ نے کہا اے ہمارے رب! تو نے فرعون اور اس کے درباریوں کو دنیا کی زندگی میں زینت کا سامان اور مال دیا ہے، اے ہمارے رب! تاکہ وہ انجام کار لوگوں کو تیرے راستہ سے بھٹکا دیں، اے ہمارے رب! ان

کے مال و دولت کو برباد کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے تاکہ وہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک وہ دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں○ فرمایا تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی ہے، تم دونوں ثابت قدم رہنا اور جاہلوں کے راستہ کی ہرگز پیروی نہ کرنا○ (یونس: ۸۹-۸۸)

فرعون کے خلاف حضرت موسیٰ کی دعاء ضرر کی توجیہ

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑے بڑے معجزات کو ظاہر کرنے میں بہت مبالغہ کیا اور اس کے باوجود یہ دیکھا کہ فرعون اور اس کی قوم نے کفر پر اصرار کیا اور ایمان لانے سے انکار کیا تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے خلاف دعا کی اور اس کے ساتھ ان کے وہ جرائم بھی بیان کیے جن کی وجہ سے ان کے خلاف دعا کی تھی اور ان کے جرائم یہ تھے کہ انہوں نے دنیا کی محبت کی وجہ سے دین کو ترک کر دیا، اس وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا میں یہ ذکر کیا "تو نے فرعون اور اس کے درباریوں کو دنیا کی زندگی میں زینت کا سامان اور مال دیا ہے" اور یہاں زینت سے مراد ہے ان کی صحت اور ان کا حسن و جمال، عمدہ لباس، بکثرت سواریاں، گھر کا ساز و سامان اور سونے اور چاندی کا ڈھیروں مال۔

اللہ کے راستہ سے گمراہ کرنے کی دعا کی توجیہات

اس دعا میں فرمایا: اے ہمارے رب! تاکہ وہ لوگوں کو تیرے راستہ سے بھٹکا دیں۔ اور فرمایا: اور ان کے دلوں کو سخت کر دے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی ہے۔

اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے ان کو مال و دولت اس لیے عطا کی تھی کہ وہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے گمراہ کر دیں، اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو اس لیے مبعوث فرماتا ہے کہ وہ بندوں کو گمراہ کریں اور اس مفروضہ سے تو دین اور شریعت کا مقصود فوت ہو جائے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ لیضلوا میں لام "کے" نہیں ہے جس کا معنی ہے تاکہ وہ گمراہ کریں بلکہ یہ لام عاقبت ہے اور اس کا معنی ہے انجام کار وہ گمراہ کر دیں یا نتیجتاً وہ گمراہ کر دیں۔ قرآن مجید میں اس کی مثال یہ ہے:

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا۔ (القصص: ۸)

تو فرعون کے گھر والوں نے موسیٰ کو اٹھا لیا تاکہ انجام کار وہ ان کے دشمن اور ان کے لیے غم کا باعث ہو جائیں۔

اسی طرح جب کہ قوم فرعون کا انجام گمراہ ہونا تھا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اس کی خبر دے دی تھی اس لیے انہوں نے دعا میں کہا کہ تو نے ان کو دنیا کی زندگی میں زینت کا سامان اور مال دیا ہے تاکہ انجام کار یہ لوگوں کو تیرے راستہ سے گمراہ کر دیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس میں "لا" محذوف ہے، اصل عبارت یوں ہے: ربنا لئلا یضلوا عن سبیلک "اے ہمارے رب تاکہ یہ تیرے راستہ سے گمراہ نہ کر سکیں" اس کی مثال قرآن مجید میں یہ ہے:

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا۔ (النساء: ۱۷۶)

اللہ تمہارے لیے بیان فرماتا ہے تاکہ تم گمراہ ہو جاؤ۔

یہاں بھی عبارت میں لا محذوف ہے اور مراد ہے لا تضلوا تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ، اس کی ایک اور مثال یہ ہے:

قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ۔ (الاعراف: ۱۷۲)

سب نے کہا کیوں نہیں! (یقیناً تو ہمارا رب ہے) ہم نے گواہی دی (یہ اس لیے کہ) قیامت کے دن تم کہنے لگو ہم تو اس سے بے

خبر تھے۔

اصل میں لئلا تقولوا تھا "تاکہ قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔"

اس کا تیسرا جواب یہ ہے کہ یہاں ہمزہ استفہام محذوف ہے اور لام، لام "کے" ہے اور اس کا معنی یوں ہے: کیا تو نے ان کو دنیا کی زندگی میں زینت کا سامان اور مال اس لیے دیا تھا کہ یہ لوگوں کو گمراہ کردیں!

دعا کی قبولیت میں جلدی کی امید رکھنا جہالت ہے

حضرت موسیٰ نے اپنی دعا میں کہا: "ربنا اطمس علی اموالهم" طمس کا معنی ہے مسخ کرنا۔ ضحاک نے بیان کیا ہے کہ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ ان کے دراہم اور دنانیر منقوش پتھر بن گئے تھے۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۷۹۶)

اور انہوں نے اپنی دعا میں کہا: "اور ان کے دلوں کو سخت کردے تاکہ وہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک وہ دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں" اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دے اور ان کے دلوں کو سخت کردے تاکہ وہ ایمان نہ لا سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی ہے۔" اس کے دو محمل ہیں: ایک یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہتے تھے اور جو شخص کسی کی دعا پر آمین کہے وہ بھی دعا کرنے والا ہے اور اس کا دوسرا محمل یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ دونوں نے دعا کی ہو۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۸۱۳)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم دونوں ثابت قدم رہنا یعنی رسالت پر اور تبلیغ دین پر اور دلائل قائم کرنے پر ثابت قدم رہنا، ابن جریج نے کہا اس دعا کے بعد فرعون چالیس سال زندہ رہا۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۸۱۴)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "تم دونوں جاہلوں کے طریقہ کی ہرگز پیروی نہ کرنا۔" جاہل لوگ جب دعا کرتے ہیں تو یہ گمان کرتے ہیں کہ ان کی دعا فوراً قبول ہو جائے گی، حالانکہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات دعا کو فوراً قبول فرمالیتا ہے اور بعض اوقات اس کی دعا کا جو وقت مقدر ہوتا ہے اس وقت اس دعا کو قبول فرماتا ہے اور مقبولیت میں جلدی صرف جاہل لوگ کرتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے فرمایا تھا:

فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ○ (ھود: ۴۶)	اے نوح! آپ مجھ سے وہ چیز نہ مانگیں جس کا آپ کو علم نہیں، میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ جاہلوں میں سے نہ ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار گزار دیا تو فرعون اور اس کے لشکر نے دشمنی اور سرکشی سے ان کا پیچھا کیا حتیٰ کہ جب وہ غرق ہونے لگا تو اس نے کہا میں ایمان لایا کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے اور میں مسلمانوں میں سے ہوں○ (فرمایا:) اب! (ایمان لایا ہے) حالانکہ اس سے پہلے تو نے نافرمانی کی اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا○ سو آج ہم تیرے (بے جان) جسم کو بچالیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے عبرت کا نشان بن جائے، اور بے شک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں○ (یونس: ۹۲-۹۰)

بنی اسرائیل کی قوم فرعون سے نجات اور فرعون کا غرق ہونا

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی دعا قبول فرمالی، تو بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ ایک معین وقت میں مصر سے روانہ ہو جائیں اور اس کے لیے اپنا سامان تیار کرلیں۔ فرعون اس معاملہ سے غافل تھا، اس کو جب معلوم ہوا کہ بنو اسرائیل اس کے ملک سے نکل گئے تو وہ ان کے پیچھے روانہ ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کے

ساتھ روانہ ہوئے اور سمندر کے کنارے پہنچے اور ادھر فرعون بھی اپنے لشکر کے ساتھ ان کے سروں پر آپہنچا تو بنو اسرائیل بہت خوف زدہ ہوگئے، ان کے ایک طرف دشمن تھا اور دوسری طرف سمندر تھا، تب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی:

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۭ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۝ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ۝ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝ (الشعراء: ۶۶-۶۳)

تو ہم نے موسیٰ پر وحی فرمائی کہ آپ سمندر پر اپنا عصا ماریں، تو یکایک سمندر پھٹ گیا پس اس کا ہر حصہ بڑے پہاڑ کی طرح ہوگیا ۝ اور اس جگہ ہم دوسروں (فرعون اور اس لشکر) کو قریب لائے ۝ اور ہم نے موسیٰ اور ان کے سب ساتھیوں کو نجات دی ۝ پھر دوسروں کو غرق کر دیا ۝

فرعون نے جب دیکھا کہ سمندر میں خشک راستے بن گئے اور بنی اسرائیل اس سے گزر گئے تو اس نے اپنے لشکر سے کہا آگے بڑھو، بنی اسرائیل تم سے زیادہ اس راستے پر چلنے کے مستحق نہیں ہیں اور جب وہ راستے کے بیچ میں پہنچے تو وہ خشک راستے غائب ہوگئے اور سمندر کے اجزاء ایک دوسرے سے مل گئے اور فرعون غرق ہونے لگا اور اس وقت اس نے کہا: میں اس پر ایمان لایا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کیا تو اس نے کہا میں اس پر ایمان لایا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں۔ (یونس: ۹۰) تو جبرئیل نے کہا اے محمد! کاش آپ اس وقت مجھے دیکھتے جب میں سمندر کی کیچڑ اس کے منہ میں ڈال رہا تھا اس خوف سے کہ اس پر رحمت ہو جائے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۰۷، مسند احمد ج ۱ ص ۲۴۵، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۱۲۹۳۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر فرمایا کہ جبرئیل فرعون کے منہ میں کیچڑ ڈال رہا تھا اس خوف سے کہ وہ کہے گا لا الہ الا اللہ تو اللہ اس پر رحم فرمائے گا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۰۸، مسند احمد ج ۱ ص ۲۴۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۲۱۵، المستدرک ج ۲ ص ۳۴۰، شعب الایمان رقم الحدیث: ۹۳۹۱)

فرعون کے ایمان کو قبول نہ کرنے کی وجوہ

اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ جب فرعون نے یہ کہہ دیا کہ میں اس پر ایمان لے آیا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا ایمان کیوں قبول نہیں فرمایا، اس کے حسب ذیل جوابات ہیں:

(۱) فرعون نزول عذاب کے وقت ایمان لایا تھا، اور اس وقت ایمان لانا مقبول نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (المومن: ۸۵-۸۴)

پھر جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو کہا ہم اللہ پر ایمان لے آئے جو واحد ہے اور ہم نے ان کا انکار کیا جن کو ہم اس کا شریک ٹھہراتے تھے ۝ پس ان کے ایمان نے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا جب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھ لیا، یہ اللہ کا وہ دستور ہے جو اس سے پہلے اس کے بندوں میں گزر چکا ہے اور وہاں کافروں نے سخت نقصان اٹھایا۔

(۲) فرعون نے جب عذاب کو دیکھ لیا تو اس نے وقتی طور پر عذاب کو ٹالنے کے لیے ایمان کا اظہار کیا، اس کا مقصود اللہ کی عظمت و جلال کو ماننے کا نہ تھا اور نہ ہی اس نے اللہ کی ربوبیت کا اعتراف کیا تھا۔

(۳) ایمان اس وقت مکمل ہوتا ہے جب توحید کے ساتھ رسالت کا بھی اقرار کرے، فرعون نے اللہ پر ایمان لانے کا اظہار کیا تھا، لیکن حضرت موسیٰ کی نبوت پر ایمان لانے کا اقرار نہیں تھا اس لیے اس کا ایمان مقبول نہیں ہوا، اگر کوئی شخص ہزار مرتبہ بھی اشھدان لا الہ الا اللہ پڑھے اور اشھدان محمدا رسول اللہ نہ پڑھے تو وہ مومن نہیں ہوگا۔

فرعون کے منہ میں جبرئیل کا مٹی ڈالنا اور اس پر اشکال کا جواب

ہم نے متعدد حوالوں سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ جب فرعون غرق ہو رہا تھا تو حضرت جبرئیل نے اس کے منہ میں کیچڑ ڈال دی تاکہ وہ توبہ نہ کر سکے، اس حدیث پر امام فخرالدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ نے حسب ذیل اعتراضات کیے ہیں:

فرعون اللہ پر ایمان لانے کا مکلف تھا تو حضرت جبرئیل پر یہ لازم تھا کہ وہ توبہ کرنے میں فرعون کی معاونت کرتے، نہ کہ اس کی توبہ کو روکنے کی کوشش کرتے، نیز توبہ صرف زبان سے اعتراف اور ندامت کا نام نہیں ہے، بلکہ دل سے نادم ہونے کا نام ہے ورنہ گونگے کی توبہ متصور نہیں ہوگی اور جب دل سے نادم ہونے کا نام توبہ ہے تو پھر اس کے منہ میں مٹی ڈالنا بے سود ہے، نیز جب جبرئیل اس کو توبہ کرنے سے روک رہے تھے تو اس کا معنی یہ ہے کہ اس کو کفر پر قائم رکھنا چاہتے تھے، اور کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے فرمایا:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى۔　　تم دونوں فرعون سے نرمی سے بات کرنا شاید وہ نصیحت حاصل کرے یا اللہ سے ڈرے۔ (طٰہٰ: ۴۴)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا تھا کہ فرعون ایمان لے آئے، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ حضرت جبرئیل کو فرعون کے منہ میں مٹی ڈالنے کے لیے بھیجے تاکہ وہ اللہ پر ایمان نہ لا سکے۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۲۹۷، دار احیاء التراث العربی بیروت)

امام رازی کے یہ اعتراضات بہت قوی ہیں لیکن ہم احادیث کا خادم ہونے کی حیثیت سے ان احادیث کا تحفظ کریں گے، اور ان کے اعتراضات کا جواب یہ ہے کہ فرعون اللہ کی آیتوں کا انکار کرکے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان میں گستاخیاں کرکے اس درجہ پر پہنچ چکا تھا کہ اب اگر وہ ایمان لاتا پھر بھی اس کے ایمان کو قبول نہ کیا جاتا، اس لیے جبرئیل کو اس وقت اس کے منہ میں مٹی ڈالنے کے لیے بھیجا تاکہ اس پر یہ واضح کر دیا جائے کہ تو اب راندۂ درگاہ ہو چکا ہے اور اب تیرا ایمان لانا مقبول نہیں ہے۔

قرآن مجید کی صداقت

سو آج ہم تیرے (بے جان) جسم کو بچالیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے عبرت کا نشان بن جائے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ تیری قوم تو سمندر کی گہرائی میں غرق ہو چکی ہے لیکن ہم تیرے بے جان جسم کو سمندر کی گہرائی سے نکال لیں گے تاکہ دیکھنے والے دیکھیں کہ جو خدائی کا دعویٰ کرتا تھا آج وہ بے جان مردہ پڑا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے جسم کو بچا لینے کا اعلان فرمایا اور اس کا جسم آج تک محفوظ ہے، مصر پر غیر مسلموں کی حکومت بھی رہی لیکن کسی کو یہ جرات نہیں ہوئی کہ وہ اس کے جسم کو ضائع کر دیتا، یہ قرآن مجید کی صداقت اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی حقانیت کی بہت بڑی دلیل ہے۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ

اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل کو رہنے کے لیے عمدہ جگہ دی اور ہم نے ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا

فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِىْ بَيْنَهُمْ

سو انہوں نے اختلاف نہ کیا حتیٰ کہ ان کے پاس (بہ ذریعہ تورات) علم آگیا، بے شک آپ کا رب قیامت کے دن

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَاِنْ كُنْتَ فِىْ شَكٍّ مِّمَّاۤ

اس چیز میں فیصلہ فرمائے گا جس میں یہ اختلاف کرتے ہیں ○ پس (اے مخاطب!) اگر تم اس چیز کے متعلق شک میں ہو

اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ

جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لو جو تم سے پہلے کتاب کو پڑھتے ہیں۔ بے شک

جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَكُوْنَنَّ

تمہارے رب کی طرف سے حق آگیا ہے پس تم شک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ ہو جانا ○ اور ان لوگوں میں سے

مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ

ہرگز نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کی آیتوں کی تکذیب کی، ورنہ تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے ○ (اے رسول مکرم!)

حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ

بے شک جن لوگوں پر آپ کے رب کا حکم صادر ہو چکا ہے، وہ ایمان نہیں لائیں گے ○ خواہ ان کے پاس تمام نشانیاں آجائیں

حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۹۷﴾ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ

حتیٰ کہ وہ دردناک عذاب کو (بھی) دیکھ لیں ○ تو کوئی بستی ایسی کیوں نہ ہوئی کہ وہ (عذاب کی نشانی دیکھ کر) ایمان لے آتی تو اس کا

اِيْمَانُهَاۤ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْىِ

ایمان اس کو نفع دیتا سوا یونس کی قوم کے کہ جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے اس سے دنیا کی زندگی میں ذلت کا

فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۹۸﴾ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ

عذاب دور کر دیا، اور ہم نے ان کو ایک وقت مقرر تک فائدہ پہنچایا ○ اور اگر آپ کا رب چاہتا تو روئے زمین کے

مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا

تمام لوگ ایمان لے آتے، تو کیا آپ لوگوں پر جبر کریں گے حتیٰ کہ وہ

مُؤْمِنِيْنَ (٩٩) وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ط

ایمان لے آئیں ○ اور کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اللہ کی اجازت کے بغیر ایمان لے آئے،

وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (١٠٠) قُلِ انْظُرُوْا

اور جو لوگ بے عقل ہیں ان پر وہ (کفر کی) نجاست ڈال دیتا ہے ○ آپ کہیے تم غور سے دیکھو

مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ

آسمانوں اور زمینوں میں (اس کی وحدت کی) کیسی نشانیاں ہیں! اور یہ نشانیاں اور ڈرانے والے ان لوگوں کو کوئی

عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (١٠١) فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ

فائدہ نہیں پہنچا سکتے جو (ضد اور عناد سے) ایمان نہیں لاتے ○ پس یہ لوگ صرف اس طرح کے ایام کا انتظار کر رہے ہیں

الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ط قُلْ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ

جیسے (عذاب کے) ایام ان سے پہلی قوموں پر گزر چکے ہیں، آپ کہیے کہ تم (بھی) انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرنے

الْمُنْتَظِرِيْنَ (١٠٢) ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ج حَقًّا

والوں میں سے ہوں ○ پس ہم (عذاب آنے پر) اپنے رسولوں کو اور ایمان والوں کو (عذاب سے) بچاتے رہے ہیں، اسی طرح اللہ کی

ع ١١ ١٠ ١٥ عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ (١٠٣) ع قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ

سنت جاریہ ہے، مومنوں کو نجات دینا ہمارے ذمہ کرم پر ہے ○ آپ کہیے اے لوگو! اگر تم میرے دین کے متعلق کسی شک میں ہو

مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ

تو میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، لیکن میں اللہ کی عبادت

اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ج صلے وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (١٠٤) لا

کرتا ہوں جو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنوں میں سے رہوں ○

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ج وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (١٠٥)

اور آپ اپنا چہرہ دین کے لیے قائم رکھیں باطل سے منہ موڑتے ہوئے اور مشرکین میں سے ہرگز نہ ہو جائیں ○

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ

اور اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں جو آپ کو نہ نفع پہنچا سکے نہ نقصان پہنچا سکے، اگر (بالفرض) آپ نے ایسا کیا

فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل کو رہنے کے لیے عمدہ جگہ دی، اور ہم نے ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا، سو انہوں نے اختلاف نہ کیا حتیٰ کہ ان کے پاس (بذریعہ تورات) علم آگیا، بے شک آپ کا رب قیامت کے دن اس چیز میں فیصلہ فرمادے گا جس میں یہ اختلاف کرتے ہیں ○ پس (اے مخاطب!) اگر تم اس چیز کے متعلق شک میں ہو جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لو جو تم سے پہلے کتاب کو پڑھتے ہیں، بے شک تمہارے رب کی طرف سے حق آگیا ہے پس تم شک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ ہو جانا ○ اور ان لوگوں میں سے ہرگز نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کی آیتوں کی تکذیب کی، ورنہ تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے ○ (اے رسول مکرم!) بے شک جن لوگوں پر آپ کے رب کا حکم صادر ہو چکا ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے ○ خواہ ان کے پاس تمام نشانیاں آجائیں حتیٰ کہ وہ دردناک عذاب کو (بھی) دیکھ لیں ○ (یونس: ۹۷-۹۳)

بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قرآن میں شک کرنے کی نسبت اور اس سے عام لوگوں کا مراد ہونا

اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو مضبوط کرنے اور آپ کو تسلی دینے کے لیے یہ آیات نازل فرمائیں جن سے قرآن مجید کی صداقت اور آپ کی نبوت کی حقانیت کا علم ہوتا ہے:

اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ اس رکوع کی پہلی چار آیتوں میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے یا عام انسانوں سے خطاب ہے، اگر اس میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے تو یہ بظاہر آپ سے خطاب ہے اور اس سے مراد آپ کا غیر ہے یعنی عام انسان اور اس کی نظیر یہ آیتیں ہیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ - (الاحزاب: ۱)

اے نبی اللہ سے ڈریئے اور کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کیجئے۔

لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ - (الزمر: ۶۵)

اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کا عمل ضائع ہو جائے گا۔

اس خطاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد نہیں ہیں بلکہ آپ کا غیر عام انسان مراد ہے، اس پر دلیل یہ ہے کہ اس رکوع کی آیت ۱۰۴ میں فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ - (یونس: ۱۰۴)

اے لوگو! اگر تم میرے دین کے متعلق کسی شک میں ہو۔

اس آیت میں صراحتاً فرمادیا کہ شک کا تعلق لوگوں کے ساتھ ہے آپ کے ساتھ نہیں ہے، لہٰذا یہ آیت پہلی آیتوں کی تفسیر ہے کہ ان آیتوں میں شک کا تعلق لوگوں کے ساتھ ہے۔ پہلی آیتوں میں اشارتاً عام لوگ مراد ہیں اور اس آیت میں

صراحت کے ساتھ عام لوگوں کا ذکر فرمایا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نبوت میں شک ہو گا تو دوسرے لوگوں کو بطریق اولیٰ آپ کی نبوت میں شک ہو گا اور اس سے شریعت بالکلیہ ساقط ہو جائے گی۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نبوت میں شک ہو تو اہل کتاب کے خبر دینے سے یہ شک کس طرح زائل ہو گا، کیونکہ اکثر اہل کتاب تو کفار ہیں' اور اگر اہل کتاب میں سے کوئی مومن بھی آپ کی نبوت کی خبر دے تب بھی اس کی خبر حجت نہیں ہو گی خصوصاً اس لیے کہ ان کے پاس تورات اور انجیل کے جو نسخے ہیں وہ سب محرف ہیں، پس واضح ہو گیا کہ ان پہلی تین آیتوں میں ہرچند کہ بظاہر آپ سے خطاب ہے لیکن حقیقت میں اس سے مراد آپ کی امت ہے یا عام لوگ مراد ہیں۔

حسن بصری نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید میں شک کیا تھا نہ اہل کتاب سے سوال کیا تھا۔

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے ذکر کیا میں شک کرتا ہوں نہ میں نے سوال کیا۔

(جامع البیان جز ١١ ص ٢١٨، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ١٤١٥ھ)

شک کی نسبت کا عام لوگوں کی طرف ہونا

اور بعض مفسرین نے یہ کہا کہ ان آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب نہیں ہے بلکہ عام انسان سے خطاب ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تین قسم کے لوگ تھے: ایک وہ جو آپ کی تصدیق کرتے تھے' دوسرے وہ جو آپ کی تکذیب کرتے تھے اور تیسرے وہ لوگ جن کو آپ کے نبی ہونے کے متعلق شک اور تردد تھا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان تین قسم کے لوگوں سے خطاب فرمایا اور جن اہل کتاب سے سوال کرنے کا حکم دیا ہے اس سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام، عبداللہ بن صوریا، حضرت تمیم داری اور کعب احبار وغیرہ ہیں۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ مسلمانوں کے نزدیک تو اس وقت کی آسمانی کتابیں محرف ہیں تو پھر ان محرف کتابوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کا ذریعہ کیسے بنایا، اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی تحریف یہ تھی کہ جو آیات سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلالت کرتی تھیں وہ ان آیات کو چھپاتے تھے، تو اگر وہ خود ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کر دیتے تو یہ مسلمانوں کے لیے بہت قوی دلیل ہوتی۔

شک کی نسبت کے متعلق بعض تراجم

ہم نے شروع میں بیان کیا تھا کہ بعض مفسرین نے اس آیت میں شک کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی ہے اور بعض مفسرین نے عام مخاطب کی طرف شک کی نسبت کی ہے' اسی اعتبار سے مترجمین نے اس کے ترجے بھی دو طرح کے کیے ہیں، پہلے ہم ان مترجمین کا ذکر کر رہے ہیں جنہوں نے شک کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی ہے:

شیخ سعدی شیرازی متوفی ٦٧٦ھ لکھتے ہیں:

پس بہ پرس آنانکہ مے خوانند کتاب از پیش تو بدرستی کہ آمد بتو بیان راست از پروردگار تو پس مباش ہرگز از شک آرندگان۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی متوفی ١١٧٦ھ لکھتے ہیں:

پس بہ پرس آنانرا کہ ے خوانند کتاب از پیش تو ہر آئینہ آمدہ است پیش تو وحی درست از پروردگار تو پس مشواز شک آرندگان۔

شاہ رفیع الدین دہلوی متوفی ۱۲۳۳ھ لکھتے ہیں:

پس سوال کر ان لوگوں سے کہ پڑھتے ہیں کتاب پہلے تجھ سے، تحقیق آیا ہے تیرے پاس حق، پروردگار تیرے سے، پس مت ہو شک لانے والوں سے۔

شاہ عبدالقادر محدث دہلوی متوفی ۱۲۳۰ھ لکھتے ہیں:

تو پوچھ ان سے جو پڑھتے ہیں کتاب تجھ سے آگے بے شک آیا ہے تجھ کو حق تیرے رب سے سو تومت ہو شبہ لانے والا۔

سید محمد محدث کچھوچھوی لکھتے ہیں:

تو اگر تم شک میں ہوتے جسے اتارا ہم نے تمہاری طرف تو پوچھ لیتے ان سے جو پڑھتے ہیں کتاب تم سے پہلے۔

اور جن مترجمین نے شک کی نسبت عام لوگوں کی طرف کی ہے ان کے یہ تراجم ہیں:

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں:

اور اے سننے والے اگر تجھے کچھ شبہ ہو اس میں جو ہم نے تیری طرف اتارا تو ان سے پوچھ دیکھ جو تجھ سے پہلے کتاب پڑھنے والے ہیں۔

اور ہمارے شیخ علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ، متوفی ۱۴۰۶ھ لکھتے ہیں:

تو (اے سننے والے) اگر تو شک میں ہو اس چیز سے جو ہم نے (اپنے رسول کی وساطت سے) تیری طرف نازل فرمائی تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو تجھ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں۔

ہم نے بھی ان ہی تراجم کی اتباع کرتے ہوئے لکھا ہے:

پس (اے مخاطب!) اگر تم اس چیز کے متعلق شک میں ہو جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لو جو تم سے پہلے کتاب کو پڑھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے کلمات کا معنی

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور ان لوگوں میں سے ہرگز نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کی آیتوں کی تکذیب کی ورنہ تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ (یونس: ۹۵) ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تین قسم کے لوگ تھے: ایک وہ تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے تھے، دوسرے وہ تھے جو آپ کی تکذیب کرتے تھے اور تیسرے وہ تھے جن کو آپ کی نبوت میں شک تھا اور شک کرنے والوں کا معاملہ مکذبین سے کم ہے اس لیے پہلے فرمایا: تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا اور چونکہ تکذیب کرنے والوں کا معاملہ شک کرنے والوں سے زیادہ سخت ہے اس لیے ان کے بعد تکذیب کرنے والوں کا ذکر فرمایا اور بتایا کہ وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہیں اور اس کے بعد فرمایا: بے شک جن لوگوں کے متعلق آپ کے رب کے کلمات صادر ہو چکے ہیں وہ ایمان نہیں لائیں گے، یعنی اللہ تعالیٰ کو ازل سے جن لوگوں کے متعلق علم تھا کہ ان کو ایمان لانے یا نہ لانے کا اختیار دیا جائے گا لیکن وہ ضدی اور ہٹ دھرم لوگ ہوں گے، وہ کثیر معجزات اور دلائل دیکھنے کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق شقاوت کا فیصلہ کر دیا، سو جو لوگ اللہ کے علم میں ازل میں شقی تھے اور ان کے لیے ازل میں شقاوت لکھی جا چکی ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اس آیت میں کلمات کا ذکر ہے اور کلمہ سے مراد اللہ کا حکم اور اس کی خبر ہے اور بندہ میں قدرت اور داعیہ (فعل کا محرک اور باعث) کا مجموعہ پیدا کرنا ہے جو اس اثر کا موجب ہے، حکم، خبر اور علم تو ظاہر ہے اور قدرت اور داعی کا مجموع بھی ظاہر ہے، اللہ تعالیٰ بندہ میں کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کی قدرت پیدا کرتا ہے اور خیر اور شر میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کرنے کی طاقت دیتا ہے پھر خیر اور شر میں سے جس چیز کو بندہ اختیار کرتا ہے اس میں وہی چیز پیدا فرما دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم تھا کہ بندہ نے خیر اور شر میں سے کس کو اختیار کرنا ہے، سو جن کے متعلق اللہ کو ازل میں علم تھا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے ان کے متعلق فرمایا: بے شک جن لوگوں کے متعلق آپ کے رب کے کلمات صادر ہو چکے ہیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ امام رازی نے اس کی دوسری تقریر کی ہے کہ بندہ میں قدرت اور داعی (یعنی فعل کا محرک) دونوں اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے پس اللہ نے جس کو ازل میں شقی بنا دیا وہ ایمان نہیں لائے گا' لیکن یہ تقریر عام ذہنی سطح سے ماوراء ہے۔ امام رازی معتزلہ اور قدریہ کے رد میں شدت کرتے ہوئے جبر کی طرف چلے گئے ہیں' اور اہل سنت کا مسلک جبر اور قدر کے درمیان ہے یعنی فعل کو اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے اور اس کو اختیار بندہ کرتا ہے' اگر اختیار کی نفی کر دی جائے اور کہا جائے کہ یہ اختیار اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے تو یہ جبریہ کا مذہب ہے اور اگر کہا جائے کہ فعل کو بندہ پیدا کرتا ہے تو پھر یہ قدریہ اور معتزلہ کا مذہب ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تو کوئی بستی ایسی کیوں نہ ہوئی کہ وہ (عذاب کی نشانی دیکھ کر) ایمان لے آتی تو اس کا ایمان اس کو نفع دیتا سوا یونس کی قوم کے کہ جب وہ ایمان لے آئی تو ہم نے اس سے دنیا کی زندگی میں ذلت کا عذاب دور کر دیا' اور ہم نے ان کو ایک وقت مقرر تک فائدہ پہنچایا○ (یونس: ۹۸)

حضرت یونس علیہ السلام کا نام و نسب

امام ابوالقاسم علی بن الحسن المعروف بابن عساکر متوفی ۵۷۱ھ لکھتے ہیں:

حضرت یونس علیہ السلام لاوی بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہم السلام کے نواسے ہیں' شام کے رہنے والے تھے اور بعلبک کے عمال میں سے تھے' ایک قول یہ ہے کہ یہ بچپن میں فوت ہو گئے تھے' ان کی والدہ نے اللہ کے نبی حضرت الیاس علیہ السلام سے سوال کیا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر دیا' ان کے سوا ان کی والدہ کی اور کوئی اولاد نہیں تھی' چالیس سال کی عمر میں حضرت یونس علیہ السلام نے اعلان نبوت کیا' وہ بنی اسرائیل کے بہت عبادت گزاروں میں سے تھے' وہ اپنے دین کو بچانے کے لیے شام چلے گئے اور دجلہ کے کنارے پہنچ گئے' پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو اہل نینوا کی طرف بھیجا۔ (دریا دجلہ کے مشرقی کنارے جہاں موصل نامی شہر ہے وہاں ایک قدیم شہر تھا)

(مختصر تاریخ دمشق ج ۲۸ ص ۱۰۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۱ھ)

حضرت یونس علیہ السلام کی فضیلت میں قرآن مجید کی آیات

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُنْجِى الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (الانبیاء: ۸۸-۸۷)

اور ذوالنون کو یاد کیجئے جب وہ غضب ناک ہو کر نکلے سو انہوں نے یہ گمان کیا کہ ہم ہرگز ان پر تنگی نہیں کریں گے پھر تاریکیوں میں انہوں نے پکارا: (اے اللہ!) تیرے سوا عبادت کا کوئی مستحق نہیں' تو پاک ہے بے شک میں زیادتی کرنے والوں میں سے تھا○ تو ہم نے ان کی فریاد سن لی اور ان کو غم سے نجات

وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ○ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ○ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ○ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ○ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ○ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ○ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ○ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ○ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ○

(الصّٰفّٰت: ۱۴۸-۱۳۹)

دی اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح نجات دیتے ہیں ○

اور بے شک یونس ضرور رسولوں میں سے ہیں ○ جب وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگے ○ پھر قرعہ اندازی کرائی تو وہ مغلوبین میں سے ہوگئے ○ اور ان کو مچھلی نے نگل لیا در آنحالیکہ وہ خود کو ملامت کرنے والوں میں سے تھے ○ پس اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے ○ تو وہ ضرور یوم حشر تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے ○ تو ہم نے ان کو کھلے میدان میں ڈال دیا در آنحالیکہ وہ بیمار تھے ○ اور ہم نے ان پر زمین پر پھیلنے والا کدو کا درخت اگا دیا ○ اور ہم نے انہیں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف بھیجا ○

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ○ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ○ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○

(القلم: ۵۰-۴۸)

تو آپ اپنے رب کے حکم کا انتظار کیجئے اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیں جب انہوں نے غم کی کیفیت میں اپنے رب کو پکارا ○ اگر ان کے رب کی نعمت ان کی مدد نہ فرماتی تو وہ ضرور میدان میں ڈال دیئے جاتے در آنحالیکہ وہ ملامت زدہ ہوتے ○ پس ان کے رب نے انہیں عزت دی اور انہیں صالحین میں سے کرلیا۔

حضرت یونس علیہ السلام کی فضیلت میں احادیث

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی بندہ کو یہ کہنا نہیں چاہیے کہ میں یونس بن متّٰی سے بہتر ہوں۔ (مسند احمد رقم الحدیث: ۴۷۰۳، دارالفکر بیروت)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ کسی بندہ کو یہ کہنا نہیں چاہیے کہ میں یونس بن متّٰی سے بہتر ہوں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۴۱۳، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۷۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۶۶۹)

حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی شخص یونس بن متّٰی سے افضل ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۴۱۵)

حضرت یونس علیہ السلام کی سوانح

امام ابوالقاسم علی بن الحسن المعروف بابن عساکر متوفی ۵۷۱ھ لکھتے ہیں:

حسن بیان کرتے ہیں کہ حضرت یونس بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے ایک نبی کے ساتھ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ وہ حضرت یونس کو اہل نینوا کی طرف بھیجیں اور ان کو میرے عذاب سے ڈرائیں، ان لوگوں میں تورات کے احکام پر عمل کرانے کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا جاتا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تورات اور حضرت داؤد کی زبور کے بعد اور کسی کتاب کو نازل نہیں کیا تھا۔ حضرت یونس علیہ السلام بہت تیز مزاج اور سریع الغضب تھے، وہ اہل نینوا کے پاس گئے اور ان کو عذاب الٰہی سے ڈرایا۔ انہوں نے حضرت یونس کی تکذیب کی اور ان کی نصیحت کو مسترد کر دیا، اد

ان پر پتھراؤ کیا اور ان کو اپنی بستی سے نکال دیا۔ حضرت یونس وہاں سے لوٹ آئے، ان سے بنی اسرائیل کے نبی نے کہا: آپ وہاں پر پھر جائیں، حضرت یونس علیہ السلام پھر چلے گئے۔ اہل نینوا نے پھر وہی سلوک کیا، تین بار اسی طرح ہوا، حضرت یونس علیہ السلام ان کو عذاب سے ڈراتے اور وہ ان کی تکذیب کرتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب حضرت یونس علیہ السلام ان لوگوں کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے اپنے رب سے اپنی قوم کو ہلاک کرنے کی دعا کی، اور ان لوگوں کو خبر دی کہ تین دن بعد ان پر عذاب آ جائے گا، اور اپنی اہلیہ اور چھوٹے بچوں کو لے کر وہاں سے چلے گئے۔ وہ ایک پہاڑ پر چڑھ کر اہل نینوا کو دیکھنے لگے اور ان پر عذاب نازل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے عذاب نازل ہونے کا جو وقت مقرر کیا تھا ان کی قوم بھی اس وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ جب انہیں عذاب کے نزول کا یقین ہو گیا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور ان کو یقین ہو گیا کہ حضرت یونس علیہ السلام نے سچ فرمایا تھا، پھر اس وقت جو بنی اسرائیل کے انبیاء تھے انہوں نے ان کی طرف رجوع کیا اور ان سے اس مصیبت کا حل دریافت کیا جس میں وہ مبتلا ہو چکے تھے، انہوں نے کہا حضرت یونس علیہ السلام کو بلاؤ، وہ تمہارے لیے دعا کریں گے کیونکہ انہوں نے ہی تمہارے خلاف دعا کی تھی۔ انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام کو تلاش کیا لیکن وہ ناکام رہے، تب انہوں نے کہا آؤ ہم سب مل کر اللہ کے حضور توبہ کریں، پھر وہ اپنے تمام مردوں اور عورتوں اور مویشیوں کو لے کر نکلے، انہوں نے ٹاٹ کے کپڑے پہنے، اپنے سروں پر راکھ ڈالی، اپنے پیروں میں کانٹے بچھائے اور رو رو کر اور گڑگڑا گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور توبہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے صدق کو دیکھ کر ان کی توبہ قبول فرمالی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اہل نینوا نے یکم ذوالحجہ کو عذاب کی علامات دیکھی تھیں اور دس ذوالحجہ کو ان سے عذاب اٹھا لیا گیا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ ان کی قوم سے عذاب ٹل گیا ہے تو اللہ کا دشمن ابلیس ان کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ اگر اب آپ اپنی قوم کے پاس گئے تو وہ آپ کی تکذیب کریں گے اور کہیں گے کہ آپ نے جس عذاب کا وعدہ کیا تھا وہ ہمارے اوپر نہیں آیا، پس حضرت یونس اپنی قوم پر ناراض ہو کر (وحی الٰہی کا انتظار کیے بغیر) دجلہ کے کنارے پہنچ گئے، ان کے ہمراہ ان کے بال بچے بھی تھے۔ ایک کشتی آئی تو حضرت یونس نے کہا ہمیں لے چلو، کشتی والوں نے کہا کشتی میں جگہ کم ہے، آپ اس کشتی میں اپنی اہلیہ کو سوار کرا دیں، پھر حضرت یونس اور ان کے دو بیٹے رہ گئے۔ پھر ایک اور کشتی آئی حضرت یونس اس کی طرف بڑھے، ان کا ایک بیٹا دجلہ کے کنارے آیا، اس کا پیر پھسل گیا اور وہ دریا میں ڈوب گیا، اور بھیڑیا آیا وہ دوسرے بیٹے کو کھا گیا۔ تب حضرت یونس علیہ السلام نے جان لیا کہ یہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہے، وہ اس دوسری کشتی میں سوار ہو گئے۔ جب کشتی پانی کے درمیان میں پہنچی تو اللہ کے حکم سے کشتی چکر کھانے لگی، کشتی والوں نے آپس میں کہا اس کا کیا سبب ہے، لوگوں نے کہا ہمیں پتا نہیں۔ حضرت یونس نے فرمایا: مجھے معلوم ہے، ایک بندہ اپنے رب سے بھاگ نکلا ہے، یہ کشتی اس وقت چلے گی جب تم اس کو دریا میں پھینک دو گے۔ لوگوں نے پوچھا وہ کون ہے؟ حضرت یونس نے فرمایا: وہ میں ہوں۔ لوگوں نے کہا اگر وہ آپ ہیں تو ہم آپ کو ہرگز نہیں پھینکیں گے، بخدا ہم کو یقین ہے کہ آپ ہی کے وسیلہ سے ہم کو اس مصیبت سے نجات ملے گی، پھر انہوں نے قرعہ اندازی کی اور کہا جس کے نام کا قرعہ نکلے گا ہم اس کو دریا میں ڈال دیں گے۔ انہوں نے قرعہ اندازی کی تو حضرت یونس کا نام نکل آیا، لیکن انہوں نے حضرت یونس کو دریا میں ڈالنے سے انکار کیا، پھر دوبارہ قرعہ اندازی کی پھر حضرت یونس کا نام نکلا۔ حضرت یونس نے کہا: مجھ کو دریا میں ڈال دو، اور اللہ تعالیٰ نے ایک مچھلی کو حکم دیا کہ وہ حضرت یونس کو نگل لے، مگر حضرت یونس کو خراش آئے نہ ان کی ہڈی ٹوٹے، وہ میرے نبی اور میرے برگزیدہ بندے

ہیں- وہ مچھلی چالیس دن تک دریا میں تیرتی رہی، اور حضرت یونس مچھلی کے پیٹ میں جنات اور مچھلیوں کی تسبیح سنتے رہے، حضرت یونس تسبیح اور تہلیل کرتے رہے اور کہتے تھے: اے میرے مالک! تو نے مجھے پہاڑوں سے اتارا، شہروں میں پھرایا اور تین اندھیروں میں مجھے مقید کر دیا: رات کا اندھیرا، پانی کا اندھیرا اور مچھلی کے پیٹ کا اندھیرا، تو نے مجھے ایسی سزا دی ہے کہ مجھ سے پہلے کسی کو ایسی سزا نہیں دی تھی!

جب چالیس دن پورے ہو گئے تو:

فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (الانبیاء: ۸۷)

پھر تاریکیوں میں انہوں نے پکارا: (اے اللہ!) تیرے سوا عبادت کا کوئی مستحق نہیں، تو پاک ہے، بے شک میں زیادتی کرنے والوں میں سے تھا۔

پھر فرشتوں نے ان کے رونے کی آواز سنی اور ان کو آواز سے پہچان لیا، اور ان کے گریہ و زاری کی وجہ سے فرشتے بھی رونے لگے اور انہوں نے کہا: اے ہمارے رب! یہ ایک غمزدہ شخص کی کمزور آواز ہے جو کسی اجنبی جگہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ میرا بندہ یونس ہے، اس سے ایک (اجتہادی) خطا ہو گئی تو میں نے اس کو دریا میں مچھلی کے پیٹ میں قید کر لیا۔ فرشتوں نے کہا: اے رب! یہ نیک بندہ ہے، صبح اور شام اس کے بکثرت نیک اعمال آسمانوں کے اوپر جاتے ہیں۔ فرمایا: ہاں!

حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب اللہ اپنے اولیاء پر اس طرح گرفت فرماتا ہے تو غور کرو وہ اپنے دشمنوں پر کیسی گرفت فرمائے گا۔

حضرت یونس علیہ السلام کی فرشتوں نے شفاعت کی، تب اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اس مچھلی کے پاس بھیجا کہ جس جگہ سے اس نے حضرت یونس کو نگلا تھا وہیں ان کو اگل دے۔ وہ مچھلی دریا کے کنارے آئی اور حضرت جبرئیل مچھلی کے منہ کے قریب پہنچے اور کہا: السلام علیک یا یونس! رب العزت آپ پر سلام پڑھتا ہے! حضرت یونس نے فرمایا: اس آواز کے لیے مرحبا ہو جس آواز کے متعلق میرا یہ گمان تھا کہ وہ اب مجھے کبھی سنائی نہیں دے گی۔ پھر مچھلی سے کہا: تم اللہ کا نام لے کر حضرت یونس کو اگل دو، مچھلی نے حضرت یونس کو اگلا اور حضرت جبرئیل نے ان کو اپنی گود میں لے لیا۔ اس وقت حضرت یونس علیہ السلام کا جسم اس طرح ملائم تھا جیسے نوزائیدہ بچہ ہو۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں صرف تین دن اور تین راتیں رہے تھے۔ (حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت یونس کے مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی مدت میں اختلاف ہے، شعبی نے کہا ہے کہ چاشت کے وقت مچھلی نے ان کو نگلا تھا اور شام کے وقت اگل دیا، قتادہ نے کہا وہ اس میں تین دن رہے تھے، امام جعفر صادق نے کہا وہ اس میں سات دن رہے تھے اور سعید بن ابو الحسن اور ابو مالک نے کہا وہ اس میں چالیس دن رہے تھے، اور اللہ ہی کو علم ہے وہ اس میں کتنی مدت رہے تھے۔ البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۳۲۱، دار الفکر طبع جدید، ۱۴۱۸ھ)

ایک قول یہ ہے کہ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں تھے تو انہوں نے کہا: تیری عزت کی قسم! میں تیرے لیے ایسی جگہ مسجد بناؤں گا جہاں کسی نے تیرے لیے مسجد نہ بنائی ہوگی، اور وہ مچھلی کے پیٹ میں ہی اللہ کے لیے سجدہ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر وہ تسبیح کرنے والوں (نماز پڑھنے والوں) میں سے نہ ہوتے ○ تو وہ ضرور یوم حشر تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے ○ حسن نے کہا انہوں نے پہلے جو نمازیں پڑھی تھیں اللہ تعالیٰ نے ان کو قبول فرمایا اور ان کو مچھلی کے پیٹ سے نجات دی۔

میمون بن مہران نے کہا: تم اللہ تعالیٰ کو آسانی اور سہولت کے وقت یاد کیا کرو وہ تم کو شدت اور مصیبت کے وقت میں یاد

رکھے گا۔ فرعون نے اپنی ساری زندگی سرکشی اور نافرمانی میں گزاری اور جب سمندر میں ڈوبنے لگا تو کہا میں ایمان لے آیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو اب ایمان لایا ہے اور پہلے نافرمانی کرتا رہا تھا۔ (یونس: ۹۱-۹۰) اور حضرت یونس علیہ السلام ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہے اور جب مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کو پکارا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو مصیبت سے نجات دی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں جو دعا مانگی تھی (لا الہ الا انت سبحنک انی کنت من الظلمین۔ الانبیاء: ۸۷) جو مسلمان بھی کسی مصیبت کے وقت یہ دعا مانگے گا اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرمائے گا۔ (کنز العمال رقم الحدیث: ۳۴۱۸)

مجاہد نے کہا: جب مچھلی نے دریا دجلہ کے کنارے حضرت یونس کو اگلا تو اللہ تعالیٰ نے اسی وقت زمین پر پھیلنے والا کدو کا درخت اگا دیا اور ان کو ایک لاکھ یا اس سے زیادہ (ایک قول ہے ایک لاکھ ستر ہزار) لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا۔

حسن نے کہا کدو کی بیل کا بہت گھنا سایہ تھا، حضرت یونس اس کی شاخوں کو اس طرح چوستے تھے جس طرح بچہ دودھ چوستا ہے۔ نیز حسن نے بیان کیا کہ ایک چرواہے نے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے پاس جا کر یہ خبر دی کہ اس نے اللہ کے رسول حضرت یونس بن متی کو دیکھا ہے، لوگوں نے اس کو جھٹلایا تب اس نے کہا میرے پاس دلیل ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی بکری کو گویائی دی اور اس نے کہا ہاں انہوں نے میرا دودھ پیا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں ان کے حق میں گواہی دوں، پھر ان کی قوم اس وادی میں گئی تو دیکھا کہ حضرت یونس علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے، وہ لوگ رونے لگے اور اللہ تعالیٰ سے فریاد کرنے لگے، اور پھر ان کو اپنے ساتھ لے کر اپنے شہر میں آگئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آسمان سے برکتیں نازل کیں اور ان پر زمین کے خزانے کھول دیئے، حضرت یونس علیہ السلام وہاں اللہ تعالیٰ کے احکام کی تبلیغ کرتے رہے اور ان کے لیے سنتیں اور شریعتیں قائم کیں، پھر اللہ تعالیٰ سے اجازت طلب کی کہ وہ زمین میں گھوم پھر کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اجازت دے دی اور وہاں سے چلے گئے اور بادشاہ نے اس چرواہے کو بادشاہت دے دی جس نے حضرت یونس علیہ السلام کو دیکھا تھا، پھر بادشاہ بھی وہاں سے چلا گیا اور اس کے بعد پھر کسی نے حضرت یونس کو دیکھا نہ بادشاہ کو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وادی ازرق پر تشریف لے گئے، آپ نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بلند آواز سے تلبیہ کہتے ہوئے پہاڑی سے اتر رہے ہیں، پھر آپ ثنیہ پر آئے اور فرمایا: گویا کہ میں حضرت یونس بن متی کو دیکھ رہا ہوں، وہ تلبیہ کہہ رہے ہیں، ان پر دو سفید چادریں ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: لبیک یا یونس! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ (کنز العمال: ۳۲۳۸۲)

(مختصر تاریخ دمشق ج ۲۸ ص ۱۱۶-۱۰۷ ملخصاً، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۱ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تو کوئی بستی ایسی کیوں نہ ہوئی کہ وہ (عذاب کی نشانی دیکھ کر) ایمان لے آتی تو اس کا ایمان اس کو نفع دیتا سوا یونس کی قوم کے کہ جب وہ ایمان لے آئی تو ہم نے اس سے دنیا کی زندگی میں ذلت کا عذاب دور کر دیا، اور ہم نے ان کو ایک وقت مقرر تک فائدہ پہنچایا۔ (یونس: ۹۸)

ربط آیات

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: بے شک جن لوگوں پر آپ کے رب کا حکم صادر ہو چکا ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے ○ خواہ ان کے پاس تمام نشانیاں آجائیں حتیٰ کہ وہ دردناک عذاب کو (بھی) دیکھ لیں ○ (یونس: ۹۷-۹۶) اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کفر کے بعد ایمان لے آئی، اس طرح کافر قوموں کی اب دو

قسمیں ہو گئیں: ایک وہ جن کا خاتمہ کفر پر ہوا اور دوسری وہ جن کا خاتمہ ایمان پر ہوا۔

آثار عذاب دیکھ کر حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا توبہ کرنا

امام عبدالرحمن بن علی بن محمد جوزی المتوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

اصحاب سیر و تفسیر نے بیان کیا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم سرزمین موصل کے مقام نینوا میں رہتی تھی، اللہ عزوجل نے ان کی طرف حضرت یونس علیہ السلام کو بھیجا۔ حضرت یونس نے ان کو بت پرستی ترک کرنے کی اور اللہ تعالیٰ کی توحید کی دعوت دی، انہوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے ان کو خبر دی کہ تین دن کے بعد ان پر عذاب آجائے گا، جب ان پر آثار عذاب ظاہر ہوئے، حضرت ابن عباس اور حضرت انس رضی اللہ عنہم نے بیان کیا کہ حضرت یونس کی قوم اور عذاب کے درمیان صرف دو تہائی میل کا فاصلہ رہ گیا تھا، مقاتل نے کہا کہ ایک میل کا فاصلہ رہ گیا تھا، ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ انہوں نے عذاب کی تپش اپنے کندھوں پر محسوس کی، بعض نے کہا کہ آسمان پر سیاہ رنگ کے بادل نمودار ہو گئے اور بہت سخت دھواں ظاہر ہونے لگا جس نے ان کے شہر کو ڈھانپ لیا، اور ان کے مکانوں کی چھتیں سیاہ پڑ گئیں، جب ان کو ہلاکت کا یقین ہو گیا، تو انہوں نے ٹاٹ کے کپڑے پہنے اور اپنے سروں پر راکھ ڈال لی، اور تمام لوگ بڑے اور چھوٹے، والدین اور بچے، تمام جانوروں کو لے کر میدان میں جمع ہوئے اور سب نے با آواز بلند اللہ تعالیٰ سے توبہ کی اور صدق دل سے معافی مانگی اور یہ کہا کہ ہم حضرت یونس علیہ السلام کے لائے ہوئے دین پر ایمان لے آئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: ان کی توبہ یہاں تک تھی کہ انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ جو زیادتیاں کی تھیں ان کی بھی تلافی کرلی، حتیٰ کہ اگر کسی نے دوسرے کا پتھر اپنی دیوار میں لگایا تھا تو وہ پتھر دیوار سے نکال کر اس کو واپس کر دیا، اور ابوالجلد نے کہا: جب ان پر عذاب کے آثار نمودار ہوئے تو وہ اپنے بڑے بوڑھے عالم کے پاس گئے اور اس سے اس عذاب سے نجات کے متعلق سوال کیا، اس نے کہا یہ کہو:

یاحی حین لاحی یاحی محی الموتی یاحی لاالٰہ الاانت۔ اے زندہ! جب کوئی زندہ نہ ہو، اے زندہ! مردوں کو زندہ کرنے والے، اے زندہ! تیرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔

جب انہوں نے یہ کلمات کہے تو ان سے عذاب اٹھا لیا گیا۔ مقاتل نے کہا: وہ چالیس دن تک اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتے رہے، پھر ان سے عذاب دور کر دیا گیا۔ دس محرم جمعہ کے دن ان کی توبہ قبول ہوئی۔ حضرت یونس علیہ السلام ان کے پاس سے جا چکے تھے، ان سے کہا گیا کہ آپ اپنی قوم کے پاس چلے جائیں۔ حضرت یونس نے فرمایا: میں ان کے پاس کیسے جاؤں، وہ مجھ کو جھوٹا قرار دیں گے اور ان کے ہاں یہ دستور تھا کہ جو شخص جھوٹا ثابت ہو اور اس کے پاس اپنی سچائی پر کوئی دلیل نہ ہو اس کو قتل کر دیا جاتا تھا، تب حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم پر ناراضگی کے باعث دریا کی طرف چلے گئے اور مچھلی نے ان کو نگل لیا۔

(زاد المسیر ج ۴ ص ۹۹-۹۸، جامع البیان جز ۱۱ ص ۲۲۳-۲۲۲ ملخصاً، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۸۹-۱۹۸۸، تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۰۳، جامع البیان جز ۸ ص ۲۹۰-۲۸۹، تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۸۱، روح المعانی ج ۷ ص ۲۸۳-۲۸۲)

حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی توبہ قبول کرنے اور فرعون کی توبہ قبول نہ کرنے کی وجہ

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

علامہ طبری نے کہا ہے کہ تمام امتوں میں سے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی یہ خصوصیت ہے کہ عذاب کے معائنہ کے بعد ان کی توبہ قبول کرلی گئی اور مفسرین کی ایک جماعت سے اسی طرح منقول ہے۔ زجاج نے یہ کہا ہے کہ ان پر عذاب

واقع نہیں ہوا تھا' انہوں نے صرف وہ علامات دیکھی تھیں جو عذاب پر دلالت کرتی ہیں اور اگر وہ بعینہ عذاب کو دیکھ لیتے تو ان کو ایمان نفع نہ دیتا۔ (علامہ قرطبی فرماتے ہیں:) میں کہتا ہوں کہ زجاج کا قول بہت عمدہ ہے' کیونکہ جس عذاب کو دیکھنے کے بعد ایمان نفع نہیں دیتا' وہ عذاب میں مبتلا ہونا ہے' جیسا کہ فرعون کے قصہ سے ظاہر ہے' یہی وجہ ہے کہ حضرت یونس کی قوم کے قصہ کو فرعون کی قوم کے قصہ کے بعد ذکر فرمایا ہے' کیونکہ وہ اس وقت ایمان لایا تھا جب وہ عذاب کو دیکھ چکا تھا اس وجہ سے اس کے ایمان نے اس کو نفع نہیں پہنچایا' اور حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے اس سے پہلے توبہ کرلی تھی اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندہ کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک غرغرہ (موت) نہ ہو۔ (غرغرہ: موت کے وقت غرغر کی آواز نکالنا)

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۵۳۷' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۲۵۳' مسند احمد ج ۲ ص ۱۳۲' مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۵۶۰۹' صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۲۸' الکامل لابن عدی ج ۴ ص ۱۵۹۲' حلیۃ الاولیاء ج ۵ ص ۱۹۰' المستدرک ج ۴ ص ۲۵۷' شعب الایمان رقم الحدیث: ۷۰۶۴)

ہم نے جو ذکر کیا ہے اس کی تائید حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ جب حضرت یونس نے ان سے یہ وعدہ کیا کہ تین دن کے بعد ان پر عذاب آجائے گا' اور حضرت یونس ان کے درمیان سے چلے گئے اور اگلی صبح کو قوم نے حضرت یونس کو موجود نہ پایا تو انہوں نے توبہ کرلی' اور اللہ تعالیٰ نے ان سے عذاب روک لیا' حضرت یونس عذاب کا انتظار کررہے تھے' جب انہوں نے کوئی چیز نہیں دیکھی اور ان کا دستور یہ تھا کہ جو شخص جھوٹا قرار دیا جائے اور اس کے پاس دلیل نہ ہو تو وہ قتل کردیا جاتا تھا' تب حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم پر غم و غصہ کرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۸۵۳' تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۰۵۹۷)

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے عذاب کی علامت دیکھنے سے پہلے توبہ کرلی تھی' اور کشفنا عنھم عذاب الخزی کا معنی یہ ہے کہ جس عذاب کا حضرت یونس نے ان سے وعدہ کیا تھا وہ ان پر نازل ہوگا' وہ عذاب اللہ تعالیٰ نے ان سے دور کردیا' یہ معنی نہیں ہے کہ انہوں نے عذاب کو دیکھ لیا تھا' اور اس توجیہ کی بناء پر حضرت یونس کی قوم سے عذاب کو دور کرنے اور فرعون سے عذاب کو دور نہ کرنے میں کوئی تعارض نہیں ہے اور نہ یہ حضرت یونس کی قوم کی خصوصیت ہے' خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں اہل نینوا سعادت مند لوگوں میں سے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: احتیاط سے تقدیر نہیں بدلتی اور دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے' نیز حضرت علی نے فرمایا: ان سے عاشوراء کے دن عذاب دور ہوا تھا۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۸ ص ۲۹۰' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

ہرچند کہ علامہ قرطبی کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت یونس کی قوم نے عذاب کی علامات دیکھنے سے پہلے توبہ کرلی تھی لیکن ظاہر قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عذاب کی علامات اور نشانیاں دیکھ کر توبہ کی تھی' یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس کی قوم کا باقی اقوام سے استثناء کیا ہے اور باقی تمام مفسرین کا بھی یہی مختار ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام پر گرفت کی توجیہ اور نگاہ رسالت میں ان کا بلند مقام

حضرت یونس علیہ السلام پر سخت غم و غصہ اور پریشانی کی کیفیت طاری تھی' جب انہوں نے یہ دیکھ لیا کہ عذاب نہیں آیا تو ان کو خیال آیا کہ ان کی قوم اب ان کو جھوٹا کہے گی کہ جس وقت انہوں نے عذاب آنے کی پیش گوئی کی تھی اس وقت

عذاب نہیں آیا اور ان کے ہاں یہ دستور تھا کہ جو شخص جھوٹا ثابت ہو اور اس کے جھوٹ پر کوئی دلیل نہ ہو اس کو قتل کر دیا جاتا تھا' اس غم اور پریشانی کی کیفیت میں حضرت یونس نے اس علاقہ سے نکل جانا چاہا اور اس پریشانی میں وہ یہ بھول گئے کہ یہاں سے جانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے اجازت لینا ضروری ہے اور ہرچند کہ عام مسلمانوں سے بھول پر مواخذہ اور گرفت نہیں ہوتی لیکن انبیاء علیہم السلام کا مقام عام مسلمانوں سے بہت بلند ہوتا ہے اس لیے ان سے بھول پر بھی مواخذہ ہوتا ہے' ہرچند کہ بھول کوئی گناہ نہیں ہے' لیکن حضرت آدم نے بھولے سے شجر ممنوع سے کھالیا تو ان کا لباس اتر گیا اور انہیں جنت سے باہر جانے کا حکم دیا پھر وہ اس بھول پر بھی عرصہ دراز تک توبہ کرتے رہے پھر انہوں نے ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی' اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام بھی بھولے سے کشتی میں بیٹھ گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر گرفت فرمائی اور ان کو مچھلی کے پیٹ میں رہنا پڑا پھر ان کی تسبیح کی وجہ سے ان کو نجات عطا فرمائی' پھر ان کی ناز برداری فرمائی' جبرئیل ان کو مچھلی کے منہ سے نکال کر ایک چٹیل میدان میں لے گئے وہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو سائے میں رکھنے کے لیے کدو کی پھیلنے والی بیل پیدا فرمائی اور اس کی شاخوں میں دودھ اتارا جس سے حضرت یونس علیہ السلام کی نشوونما فرمائی' پھر حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں جو تسبیح کی تھی اس تسبیح کو یہ مرتبہ اور مقام عطا فرمایا کہ قیامت تک جو مسلمان بھی کسی رنج اور غم میں مبتلا ہو جب وہ اس تسبیح کو پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کے غم سے نجات عطا فرمائے گا' تسبیح اور استغفار کے کلمات تو بہت ہیں لیکن ان کلمات کو یہ مرتبہ اس لیے عطا فرمایا کہ یہ اس کے محبوب اور مکرم نبی کے منہ سے نکلے ہوئے کلمات تھے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کس قدر بلند تھا۔

حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقام کی رفعت اور عظمت کو ظاہر کرتے ہوئے ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اور میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی ایک شخص بھی حضرت یونس بن متی سے افضل ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۴۱۵) آپ نے یونہی تو نہیں فرمایا: کسی شخص کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ مجھے حضرت یونس بن متی پر فضیلت دے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۴۱۶) نگاہ رسالت سے یہ امر پوشیدہ نہ تھا کہ کچھ لوگ حضرت یونس علیہ السلام کی اس آزمائش کے واقعہ کو دیکھ کر ان پر زبان طعن دراز کریں گے' اس لیے اس کے سدباب کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش بندی کے طور پر پہلے ہی فرمادیا کہ کوئی شخص بھی حضرت یونس سے افضل نہیں ہے' مجھے بھی ان پر فضیلت مت دو' ہرچند کہ آپ کے یہ کلمات بطور تواضع ہیں لیکن ان کلمات سے حضرت یونس کے بلند مقام اور ان کی رفعت شان کا پتا چلتا ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کی آزمائش پر سید مودودی کی تنقید

سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ سورۂ یونس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

قرآن مجید میں خدائی دستور کے جو اصول و کلیات بیان کیے گئے ہیں ان میں ایک مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر اپنی حجت پوری نہیں کر لیتا پس جب نبی نے اس قوم کی مہلت کے آخری لمحے تک نصیحت کا سلسلہ جاری نہ رکھا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطور خود ہی وہ ہجرت کر گیا' تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس کی قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا کیونکہ اس پر اتمام حجت کی قانونی شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۳۱۳' مطبوعہ لاہور' ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء)

اور الصّٰفّٰت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

مفسرین کے ان بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تین قصور تھے جن کی وجہ سے حضرت یونس پر عتاب ہوا: ایک یہ

کہ انہوں نے عذاب کے دن کی خود ہی تعیین کر دی حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا کوئی اعلان نہ ہوا تھا، دوسرے یہ کہ وہ دن آنے سے پہلے ہجرت کر کے ملک سے نکل گئے حالانکہ نبی کو اس وقت تک اپنی جگہ نہ چھوڑنی چاہیے جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہ آجائے، تیسرے یہ کہ جب اس قوم پر سے عذاب ٹل گیا تو واپس نہ گئے۔
(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۳۱۱-۳۱۰، مطبوعہ لاہور، مارچ ۱۹۸۳ء)

اس سے چند صفحات پہلے لکھتے ہیں:

اس ابتلاء میں حضرت یونس اس لیے مبتلا ہوئے کہ وہ اپنے آقا (یعنی اللہ تعالیٰ) کی اجازت کے بغیر اپنے مقام ماموریت سے فرار ہو گئے تھے، اس معنی پر لفظ ابق بھی دلالت کرتا ہے جس کی تشریح حاشیہ نمبر ۷۸ میں گزر چکی ہے۔ (حاشیہ نمبر ۷۸ میں لکھا ہے اصل میں لفظ ابق استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں صرف اس وقت بولا جاتا ہے جبکہ غلام اپنے آقا کے ہاں سے بھاگ جائے) اور اسی معنی پر لفظ ملیم بھی دلالت کرتا ہے۔ مذیم ایسے قصوروار آدمی کو کہتے ہیں جو اپنے قصور کی وجہ سے آپ ہی ملامت کا مستحق ہو گیا ہو۔ (تفہیم القرآن ج ۴ ص ۳۰۷، مطبوعہ لاہور، ۱۹۸۳ء)

سید مودودی کی تنقید پر مصنف کا تبصرہ

یہ امر سب کے نزدیک مسلم ہے کہ قرآن مجید میں جب کسی لفظ کا لغوی معنی اللہ اور رسول کے شایان شان نہ ہو تو اس کو مجاز پر محمول کیا جاتا ہے جیسے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ استہزاء استعمال کیا ہے، اس کا معنی ہے مذاق اڑانا اور یہ معنی اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں ہے اس لیے اس کا معنی مذاق اڑانے کی سزا کیا جاتا ہے، اسی طرح جو الفاظ انبیاء علیہم السلام کی شایان شان نہ ہوں ان میں بھی تاویل کی جائے گی۔ تمام انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں اور تحقیق یہ ہے کہ ان سے صغیرہ یا کبیرہ کسی قسم کا بھی گناہ صادر نہیں ہوتا اور وہ قصد اور ارادے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے البتہ ان سے نسیان کے ساتھ کوئی ممنوع کام ہو جاتا ہے جیسے حضرت آدم علیہ السلام کا بھولے سے شجر ممنوع سے کھالینا یا حضرت یونس علیہ السلام کا بھولے سے بغیر اجازت لیے چلے جانا یہ کام گناہ نہیں ہیں، ان کاموں پر جو ان سے مواخذہ ہوا وہ ان کے مقام کی بلندی کی وجہ سے ہے کیونکہ ان کے بلند مقام کی وجہ سے ان سے بھول بھی قابل مواخذہ ہے اور ان کا اپنے آپ کو ظالم کہنا ان کی تواضع اور انکسار ہے، لیکن یہ ان کا اور ان کے رب کے درمیان معاملہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کا مالک اور مولیٰ ہے، وہ جو چاہے انہیں فرمائے اور وہ اس کے بندے ہیں، وہ اس کے سامنے جس طرح چاہیں تواضع اور انکسار کریں ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اپنی طرف سے ان پر کوئی حکم لگائیں، ان کے کسی کام پر تنقید کریں یا تبصرہ کریں، ہم صرف ان سے متعلق آیات اور احادیث کا ترجمہ کر سکتے ہیں اور ان آیات اور احادیث کے علاوہ ان پر کوئی حکم لگانے کے یا ان پر کوئی تبصرہ کرنے کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق جس طرح لکھا ہے اس سے یہ لگتا ہے جیسے عدالت ملزم پر فرد جرم عائد کر رہی ہو، ہم اس قسم کی عبارات سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے ہیں۔

علامہ ابن الحاج مالکی متوفی ۷۳۷ھ لکھتے ہیں:

جس شخص نے قرآن مجید کی تلاوت یا حدیث کے علاوہ کسی نبی کے متعلق یہ کہا کہ اس نے معصیت کی یا مخالفت کی تو وہ کافر ہو گیا، ہم اس سے اللہ کی پناہ طلب کرتے ہیں۔ (المدخل ج ۲ ص ۱۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

خاص طور پر حضرت یونس علیہ السلام کا مقام بہت عظیم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص بھی حضرت یونس سے افضل نہیں ہے اور فرمایا: مجھے بھی یونس بن متی پر فضیلت مت دو۔ ایسے عظیم الشان نبی کے متعلق یہ لکھنا

"ان کے تین قصور تھے" لائق صد افسوس ہے، ہم اس سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر آپ کا رب چاہتا تو روئے زمین کے تمام لوگ ایمان لے آتے، تو کیا آپ لوگوں پر جبر کریں گے حتیٰ کہ وہ ایمان لے آئیں O (یونس: ۹۹)

روئے زمین کے تمام لوگوں کو مومن بنانا، اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے لیکن اس کی حکمت میں نہیں

اس سورت کی ابتداء سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میں کفار کے شبہات بیان کیے گئے ہیں، ان کا ایک شبہ یہ تھا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ اگر آپ کی نبوت کو نہ مانا گیا تو اللہ تعالیٰ منکرین پر آسمان سے عذاب بھیجے گا، اور اپنے نبی اور مومنوں کی مدد فرمائے گا، وہ یہ کہتے تھے کہ ہم آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں تو ہم پر آسمانی عذاب کیوں نہیں آتا! اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کا قصہ بیان فرمایا: ان کی قومیں بھی جلد عذاب کے آنے کا مطالبہ کرتی تھیں، بالآخر ان پر عذاب آگیا، اور حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے آثار عذاب دیکھتے ہی توبہ کرلی، اس لیے ان سے عذاب ٹل گیا، اور چونکہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے ایمان لانے پر بہت حریص تھے اور اس کے لیے بہت جدوجہد کرتے تھے اور ان کے ایمان نہ لانے سے آپ سخت رنجیدہ ہوتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ آپ ان کے ایمان نہ لانے پر ملول خاطر نہ ہوں کیونکہ جس کے متعلق ازل میں اللہ عزوجل کو یہ علم تھا کہ وہ کفر کے مقابلہ میں ایمان کو اختیار کرے گا اسی کے لیے اللہ تعالیٰ ایمان پیدا کرے گا اور جس کے متعلق ازل میں اللہ تبارک وتعالیٰ کو یہ علم تھا کہ وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو اختیار کرے گا وہ اس کے لیے ایمان کو پیدا نہیں کرے گا بلکہ کفر کو پیدا کرے گا اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے کہ وہ لوگوں کے اختیار کے بجائے اضطراری طور پر ان کو ایمان والا بنادے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو ابتداءً مومن اور مطیع پیدا فرمایا اور ان میں ایمان لانے یا نہ لانے کا اختیار نہیں رکھا اور نہ ان کے لیے ثواب اور عذاب کو مقدر فرمایا، سو اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت میں ہوتا تو وہ روئے زمین کے تمام انسانوں کو مومن بنا دیتا لیکن یہ چیز اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو ہے اس کی حکمت میں نہیں ہے اور آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے صرف تبلیغ کے لیے بھیجا ہے اور اگر کوئی شخص آپ کی پیہم تبلیغ کے باوجود ایمان نہیں لاتا تو آپ غم نہ کریں کیونکہ آپ کو اس لیے تو نہیں بھیجا گیا کہ آپ ان پر جبر کرکے ان کو کلمہ پڑھادیں، اسی مفہوم میں قرآن مجید کی اور بھی آیات ہیں:

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ O (ق: ۴۵)

جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں ہم اس کو خوب جانتے ہیں، اور آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہیں، سو آپ اس کو قرآن سے نصیحت فرمائیں جو میرے عذاب کی وعید سے ڈرتا ہو۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا اِنْ عَلَیْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ۔ (الشوریٰ: ۴۸)

پس اگر وہ روگردانی کریں تو ہم نے آپ کو ان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا، آپ کے ذمہ تو (دین کو) صرف پہنچانا ہے۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ O (القصص: ۵۶)

بے شک آپ (اسے) ہدایت یافتہ نہیں بناتے جس کا ہدایت یافتہ ہونا آپ کو پسند ہو لیکن اللہ ہدایت یافتہ بناتا ہے جسے چاہے اور وہ ہدایت قبول کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اللہ کی اجازت کے بغیر ایمان لے آئے اور جو لوگ بے عقل ہیں ان پر وہ (کفر کی) نجاست ڈال دیتا ہے O (یونس: ۱۰۰)

انسان مجبور محض ہے نہ مختار مطلق

یعنی کسی نفس کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ، اس کی مشیت اور اس کی توفیق کے بغیر ایمان لے آئے، یا کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کی مشیت کے بغیر ایمان لے آئے، انسان کو ایمان لانے کا اختیار دیا ہے اور وہ ایمان یا کفر میں سے جس کو اختیار کرتا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ وہی پیدا کر دیتا ہے اور اس کو ازل میں اس کا علم تھا کہ وہ ایمان یا کفر میں سے کس چیز کو اختیار کرے گا، اور اسی چیز کو اس نے اس کے لیے لکھ دیا اور اسی کا نام تقدیر ہے، سو نہ تو انسان مجبور محض ہے، کیونکہ اس کو اختیار دیا گیا ہے اور نہ وہ اپنے افعال کا خالق ہے۔

اس کے بعد فرمایا: اور جو لوگ بے عقل ہیں ان پر وہ کفر کی نجاست ڈال دیتا ہے، یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدت کے دلائل پر غور نہیں کرتے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں اپنی ذات پر جو نشانیاں رکھی ہیں اور خود انسان کے اندر جو اس کی ذات پر نشانیاں ہیں ان میں غور و فکر نہیں کرتے اور وہ باپ دادا کی اندھی تقلید پر جمے رہتے ہیں ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کفر کی نجاست ڈال دیتا ہے یا ان کے لیے عذاب مخلد کو مقدر کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہئے کہ تم غور سے دیکھو آسمانوں اور زمینوں میں (اس کی وحدت کی) کیسی نشانیاں ہیں! اور یہ نشانیاں اور ڈرانے والے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے جو (ضد اور عناد سے) ایمان نہیں لاتے O (یونس: ۱۰۱)

اللہ تعالیٰ کے واحد ہونے پر دلیل

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور اس کی تقدیر اور مشیت کے بغیر ایمان نہیں حاصل ہو سکتا اور اس آیت میں زمین اور آسمانوں میں جو اس کی ذات اور اس کی قدرت پر نشانیاں ہیں ان میں تدبر اور تفکر کا حکم دیا ہے تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ انسان مجبور محض ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک گونہ مختار بنایا ہے سو اس پر لازم ہے کہ وہ آسمانوں اور زمینوں کی بناوٹ پر غور کرے اور ان میں جو کواکب اور سیارے ہیں ان میں تفکر کرے کہ وہ ایک مخصوص نظام کے تحت قائم ہیں اور گردش کر رہے ہیں، رات اور دن کے توارد اور ان کے اختلاف میں، بارشوں کے ہونے اور دریاؤں میں سیلاب اور سمندروں کے طوفانوں میں اور کھیتوں اور باغات میں غلہ اور پھلوں کی پیداوار میں یہ نشانی ہے کہ یہ تمام چیزیں نظام واحد کے تحت روبہ عمل ہیں۔ انسانوں، مویشیوں، چرندوں، درندوں اور پرندوں میں توالد اور تناسل کا نظام واحد ہے، موسموں کے بدلنے کا نظام واحد ہے، روئیدگی کا نظام واحد ہے، سورج اور چاند کے طلوع اور غروب کا نظام واحد ہے، خود انسان کے اندر نشو و نما کا نظام واحد ہے غذا کے انہضام کا نظام واحد ہے، فضلات کے اخراج کا نظام واحد ہے، انسان خواہ اپنے باہر کی دنیا کو دیکھے تو ہر چیز نظام واحد میں مربوط ہے اور اپنے اندر کی دنیا کو دیکھے تو ہر چیز نظام واحد میں منسلک ہے اور نظام کی وحدت یہ بتاتی ہے کہ اس نظام کا بنانے والا بھی واحد ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۔ (حٰم السجدۃ: ۵۳)

عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، اس جہان کے اطراف میں اور (خود) ان کے نفسوں میں، حتیٰ کہ ان پر منکشف ہو جائے گا کہ یہی (قرآن) حق ہے۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ O وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ O (الذاریٰت: ۲۱-۲۰)

اور یقین رکھنے والوں کے لیے زمین میں نشانیاں ہیں O اور خود ان کے نفسوں میں تو کیا تم (ان نشانیوں کو) نہیں دیکھتے O

یہ جہان عالم کبیر ہے اور خود انسان عالم صغیر ہے اور عالم کبیر کے نظام میں بھی یکسانیت اور وحدت ہے اور عالم صغیر کے

نظام میں بھی یکسانیت اور وحدت ہے اور نظام کی وحدت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس کا ناظم بھی واحد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس یہ لوگ صرف اس طرح کے ایام کا انتظار کر رہے ہیں' جیسے (عذاب کے) ایام ان سے پہلی قوموں پر گزر چکے ہیں' آپ کہئے کہ تم (بھی) انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرنے والوں میں سے ہوں○ (یونس: ۱۰۲)

اس کا معنی یہ ہے کہ یہ لوگ گزشتہ امتوں کی طرح انتظار کر رہے ہیں' اور اس سے مراد یہ ہے کہ انبیاء سابقین علیہم السلام اپنے زمانوں میں کفار کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتے تھے' اور وہ ان کی تکذیب کرتے تھے اور ان کا مذاق اڑاتے ہوئے یہ کہتے تھے یہ عذاب جلدی کیوں نہیں آتا' اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے کفار تھے وہ بھی اسی طرح کہتے تھے اس لیے فرمایا: تم بھی اس وعید کا انتظار کرو اور میں بھی اس وعید کے پورا ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔ پھر فرمایا:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس ہم (عذاب آنے پر) اپنے رسولوں کو اور ایمان والوں کو (عذاب سے) بچاتے رہے ہیں' اسی طرح اللہ کی سنت جاریہ ہے' مومنوں کو نجات دینا ہمارے ذمہ (کرم پر) ہے○ (یونس: ۱۰۳)

مومنوں کو ثواب عطا فرمانے کا وجوب اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی وجہ سے ہے

جب کہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی کفار کی طرح عذاب کا انتظار کریں تو اس آیت میں اس کی تفصیل فرمائی کہ عذاب صرف کفار پر نازل ہوگا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین اہل نجات میں سے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مومنوں کو نجات دینا ہمارے ذمہ ہے' اس سے معلوم ہوا کہ مومنوں کو نجات دینا اللہ پر واجب ہے' اور یہ معتزلہ کا مذہب ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ مومنوں کے نیک اعمال کے استحقاق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ وہ ان کو ثواب عطا فرمائے' جب کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل اور کرم کی وجہ سے مومنوں سے ثواب کا وعدہ فرمایا ہے اور کریم وعدہ کرکے اسے پورا کرتا ہے اس وجہ سے اس پر ثواب عطا فرمانا واجب ہے نہ اس وجہ سے کہ مومنوں کا اللہ پر کوئی حق ہے جیسے کام کرنے والے کا کام کرانے والے پر حق ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے اپنے اوپر مومنوں کی نجات کو واجب کرلیا ہے' قرآن مجید میں ہے:

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۔   تمہارے رب نے (محض اپنے کرم سے) اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے۔ (الانعام: ۵۴)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب میں لکھ دیا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے تو یہ اس کے پاس عرش پر لکھا ہوا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۵۵۴' ۳۱۹۴' صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۷۵۱' السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۷۷۵۰)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہئے اے لوگو! اگر تم میرے دین کے متعلق کسی شک میں ہو تو میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو' لیکن میں اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے' اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنوں میں سے رہوں○ اور آپ اپنا چہرہ دین کے لیے قائم رکھیں باطل سے منہ موڑتے ہوئے اور مشرکین میں سے ہرگز نہ ہو جائیں○ اور اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں جو آپ کو نہ نفع پہنچا سکے' نہ نقصان پہنچا سکے' اگر (بالفرض) آپ نے ایسا کیا تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے○ (یونس: ۱۰۶-۱۰۴)

اسلام کا فطرت کے مطابق ہونا اور کفر کا خلاف فطرت ہونا

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کی صحت پر دلائل قائم کیے تھے اور اپنی وحدانیت پر براہین قائم کیے تھے اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا صدق بیان فرمایا تھا' اور اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے دین کا اظہار کریں اور یہ اعلان کریں کہ وہ مشرکین سے الگ اور علیحدہ ہیں' کیونکہ وہ پتھروں سے تراشے ہوئے ان بتوں کی عبادت کرتے ہیں جو کسی قسم کا نقصان اور نفع پہنچانے پر قادر نہیں ہیں' اور دراصل نفع اور نقصان پہنچانے پر قادر وہی ذات ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے' اور میں اسی کی عبادت کرتا ہوں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ اہل مکہ سے بیان فرمائیں کہ اگر تم میرے دین کو نہیں پہچانتے تو میں تم کو تفصیل سے بیان کرتا ہوں کہ میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو' کیونکہ تم پتھروں کے جن تراشیدہ بتوں کی عبادت کرتے ہو وہ کسی کو نفع اور نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہیں بلکہ میں اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کرتا ہوں جو تم پر موت طاری کرے گا جس طرح اس نے تم کو زندگی دی ہے اور اس موت کے بعد پھر تم کو زندہ کرے گا' اور اس میں یہ تعریض ہے کہ دین برحق وہ ہوتا ہے جس میں کوئی صاحب عقل شک نہ کر سکے اور جس کی فطرت سلیم ہو وہ اس کی تحسین کرے اور مشرکین ان بتوں کی پرستش کرتے تھے جن کو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا سو جو بت اپنے وجود میں خود مشرکین کے محتاج تھے وہ ان کے خالق اور معبود کیسے ہو سکتے ہیں اور ان کی مشکلات کو کس طرح دور کر سکتے ہیں' یہ ایسا دین ہے جس کا ہر صاحب عقل انکار کرے گا۔

اس آیت میں پہلے غیر اللہ کی عبادت کی نفی کی پھر اللہ کی عبادت کا اثبات کیا' کیونکہ پہلے برائی کو دور کیا جاتا ہے' پھر اچھائی سے آراستہ کیا جاتا ہے' اس کے بعد ایمان اور معرفت کا ذکر فرمایا جو تمام اعمال صالحہ کی اساس ہے۔

ریاکاری کا شرک خفی ہونا

اس کے بعد فرمایا: آپ اپنا چہرہ دین کے لیے قائم رکھیں باطل سے منہ موڑتے ہوئے' یعنی مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں دین کے معاملہ میں مستقیم رہوں' جن چیزوں کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ان پر عمل کروں اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے مجتنب رہوں' اور اخلاص کے ساتھ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں' یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ عبادت کرنے میں اور دعا کرنے میں صرف اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنا واجب ہے اور جو شخص اپنی عبادت میں یا اپنی دعا میں غیر اللہ کی طرف متوجہ ہوا اس نے مشرکوں کا سا کام کیا۔ اس آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور مشرکین میں سے ہرگز نہ ہو جائیں' اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا: تو میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو' اس آیت میں بھی شرک کی نفی کی گئی ہے اور دوسری آیت میں جب فرمایا: اور مشرکین میں سے نہ ہو جائیں' تو اس میں بھی شرک کی نفی ہے اور یہ تکرار ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں شرک جلی کی نفی مراد ہے اور دوسری آیت میں شرک خفی کی نفی مراد ہے۔ اور شرک خفی سے مراد ریاکاری ہے یعنی کسی کو دکھانے یا سنانے کے لیے کوئی نیک کام کرنا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شرک سے منع کرنے میں امت کی طرف تعریض ہے

اس کے بعد فرمایا: اور اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں جو آپ کو نہ نفع پہنچا سکے نہ نقصان پہنچا سکے اور اگر (بالفرض) آپ نے ایسا کیا تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے' کیونکہ ظلم کہتے ہیں کسی چیز کو اس کے مقام اور محل کے غیر میں رکھنا' عبادت کا محل یہ ہے کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی' کی جائے پس جس شخص نے اللہ کے غیر کی عبادت کی اس نے عبادت کو غیر

محل میں رکھا سو یہی ظلم ہے۔

ان تینوں آیتوں میں تعریض ہے، ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا گیا ہے اور مراد آپ کی امت ہے، پہلی آیت میں فرمایا ہے: مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنوں سے رہوں، آپ پیدائشی اور دائمی مومن ہیں اس میں امت کو بتایا ہے کہ جب ہمارے نبی پر یہ حکم ہے تو تم پر بھی یہی حکم ہے، دوسری آیت میں فرمایا: آپ مشرکین میں سے ہرگز نہ ہو جائیں، ظاہر ہے کہ آپ معصوم ہیں آپ کا مشرک ہونا کیسے متصور ہو سکتا ہے، سو اس حکم سے بھی آپ کی امت مراد ہے اور تیسری آیت میں فرمایا: اور اگر (بالفرض) آپ نے ایسا کیا تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے اور اس میں تعریض بالکل ظاہر ہے۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ

اور اگر اللہ آپ کو کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اس تکلیف کو، کوئی دور کرنے والا نہیں ہے، اور اگر وہ آپ کے لیے کسی خیر کا ارادہ

فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ

کرے تو اس کے فضل کو کوئی رد کرنے والا نہیں ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنا فضل پہنچاتا ہے اور وہی بے حد بخشنے والا

الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ

بہت رحم فرمانے والا ہے ○ آپ کہیے اے لوگو! بے شک تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس حق آچکا ہے تو جس شخص نے

اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ

ہدایت کو اختیار کیا تو اس نے اپنے ہی فائدہ کے لیے ہدایت کو اختیار کیا اور جس شخص نے گمراہی کو اختیار کیا تو اس نے اپنے ہی ضرر کے لیے گمراہی کو اختیار

وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ؕ ﴿۱۰۸﴾ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى

کیا اور میں تم پر جبر کرنے والا نہیں ہوں ○ اور آپ اسی کی اتباع کیجیے جس کی آپ پر وحی کی جاتی ہے اور صبر کیجیے حتیٰ کہ

يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ ع ۱۱ ۱۶

اللہ فیصلہ فرمائے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر اللہ آپ کو کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اس تکلیف کو کوئی دور کرنے والا نہیں ہے، اور اگر وہ آپ کے لیے کسی خیر کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو کوئی رد کرنے والا نہیں ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنا فضل پہنچاتا ہے، اور وہی بے حد بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے ○ (یونس: ۱۰۷)

اللہ تعالیٰ کا اصل مقصود اپنے بندوں کو نفع پہنچانا ہے نہ کہ ضرر پہنچانا

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ ہر قسم کا نقصان اور ہر طرح کا نفع، اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی قضاء و قدر کے تحت واقع ہوتا ہے، اس میں کفر اور ایمان، اطاعت اور معصیت، راحت اور مصیبت، آلام اور لذات سب داخل ہیں، اور جس

شخص کے لیے اللہ تعالیٰ کسی مصیبت کو مقدر کردے، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں ہے، اور جس شخص کے لیے اللہ تعالیٰ کسی راحت کو مقدر کردے تو اس کو کوئی چھیننے والا نہیں ہے، آیت کے پہلے حصہ میں یہ فرمایا ہے کہ وہی تکلیفوں کو دور کرنے والا ہے اور دوسرے حصہ میں یہ فرمایا ہے کہ وہی خیر عطا کرنے والا اور فضل فرمانے والا ہے اور اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصل مقصود خیر پہنچانا ہے اور شر پہنچانا اس کا اصل مقصود نہیں ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے: اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب میں لکھ دیا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۵۵۴)

ان چاروں آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ خیر اور شر، اور نفع اور ضرر بالذات صرف اللہ عزوجل کی طرف راجع ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور وہی عبادت کا مستحق ہے اور استحقاق عبادت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر وقت اللہ تعالیٰ سے خیر طلب کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی خوشبودار ہواؤں کے پیچھے پڑے رہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کی خوشبودار ہوائیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہے پہنچاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کرو کہ وہ تمہارے عیوب کو چھپائے اور تم کو تمہارے خوف کی چیزوں سے محفوظ رکھے۔

(مختصر تاریخ دمشق ج ۱۱ ص ۹۵، تہذیب تاریخ دمشق ج ۶ ص ۴۳۵، کنز العمال رقم الحدیث: ۳۱۸۹، تمہید ج ۲ ص ۶۴۹، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ، فتح المالک ج ۹ ص ۶۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ، الجامع الصغیر رقم الحدیث: ۱۱۰۸)

اپنے گناہوں کو چھپانا واجب ہے اور ظاہر کرنا حرام ہے

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور وہی بے حد بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے۔ یعنی جو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے وہ اس کو بخش دیتا ہے خواہ اس نے کوئی گناہ کیا ہو حتیٰ کہ وہ توبہ کرنے سے شرک اور کفر کو بھی بخش دیتا ہے۔

انسان سے اگر کوئی گناہ ہو جائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ کسی پر اس گناہ کو ظاہر نہ کرے اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے۔

حافظ ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن عبدالبر المالکی القرطبی المتوفی ۴۶۳ھ لکھتے ہیں:

ہر مسلمان پر ستر کرنا (پردہ رکھنا) واجب ہے خصوصاً اپنے اوپر جب اس سے کوئی بے حیائی کا کام سرزد ہو جائے اور دوسرے پر بھی ستر کرے جب تک کہ حاکم نے اس پر حد جاری نہ کی ہو، اس سلسلہ میں بکثرت احادیث وارد ہیں، جن میں سے ہم بعض احادیث کا یہاں ذکر کریں گے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے اپنے (مسلمان) بھائی سے دنیا کی کوئی پریشانی دور کی اللہ اس کی آخرت کی پریشانیوں میں سے کوئی پریشانی دور کردے گا جو شخص کسی مسلمان کا پردہ رکھتا ہے اللہ اس کا دنیا اور آخرت میں پردہ رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ بندے کی اس وقت تک مدد کرتا رہتا ہے جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۴۲۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۲۵، مسند احمد ج ۲ ص ۵۰۰)

حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں: جب بندے کو دوسرے کی پردہ پوشی پر اجر ملتا ہے تو اپنی پردہ پوشی کرنے پر بھی اجر ملے گا، بلکہ اس میں زیادہ اجر ملے گا، اور بندے پر لازم ہے کہ وہ توبہ کرے اور اللہ سے رجوع کرے اور اپنے پچھلے کاموں پر نادم ہو، اور اس سے ان شاء اللہ اس کے گناہ مٹ جائیں گے۔ العلاء بن بدر نے روایت کیا ہے کہ جو امت اپنے گناہوں سے استغفار کر رہی ہو اللہ تعالیٰ اس کو ہلاک نہیں کرتا۔

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا: اللہ تعالیٰ بندہ کے گناہ پر اس وقت تک پردہ رکھتا ہے جب تک وہ اس کو پھاڑ تا نہیں ہے۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! وہ گناہ کو کیسے پھاڑے گا؟ آپ نے فرمایا: وہ لوگوں سے اپنا گناہ بیان کرے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجاہرین کے سوا میری امت کے ہر شخص کو معاف کر دیا جائے گا اور مجاہرہ یہ ہے کہ بندہ رات کو ایسا عمل کرے جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہو اور دن میں وہ عمل لوگوں کے سامنے بیان کر دے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۰۶۹، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۹۹۰، تاریخ اصبہان ج ۲ ص ۱۶۴، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۱۰۳۳۷، مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۹۲)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں چار سچی قسمیں کھاتا ہوں اور اگر میں پانچویں قسم کھاؤں تو وہ بھی سچی ہے، بندہ خواہ کتنا بڑا گناہ کیوں نہ کرے جب وہ توبہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالے گا اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے محبت رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ملاقات سے محبت رکھے گا اور جو بندہ جس قوم سے محبت رکھے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس بندہ کو اسی قوم کے ساتھ رکھے گا، اور اگر میں پانچویں قسم کھا کر کہوں تو میں اس میں سچا ہوں گا، اللہ تعالیٰ جس بندہ کا دنیا میں پردہ رکھتا ہے قیامت کے دن بھی اس کا پردہ رکھے گا۔

(امام مسلم اور امام طبرانی نے اس حدیث کے آخری جملہ کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۵۹۰، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۱۴۷، مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۹۲)

ابوادریس کہتے ہیں: جس بندہ کے دل میں رائی کے ایک دانہ کے برابر بھی نیکی ہو اللہ تعالیٰ اس کا پردہ فاش نہیں کرتا۔

(شعب الایمان رقم الحدیث: ۷۲۱۹)

حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں: ستر اور پردہ رکھنے کا حکم اس وقت تک ہے جب تک کہ بندہ کا معاملہ قاضی تک نہیں پہنچا اور جب بندہ کا معاملہ قاضی کے پاس پہنچ جائے تو پھر اس کی سفارش ہو سکتی ہے نہ اس کی سزا معاف ہو سکتی ہے۔

(التمہید ج ۲ ص ۶۵۱-۶۷۴، فتح المالک ج ۹ ص ۶۱-۵۹، الاستذکار ج ۲۴ ص ۸۸-۸۷، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ بیروت)

صفوان بن محرز بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت ابن عمر سے کہا: آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے النجوی (سرگوشی) کے متعلق کیا سنا ہے۔ انہوں نے کہا: میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے دن مومن اپنے رب عزوجل کے قریب ہو گا حتیٰ کہ اللہ اس کے اوپر (اپنی رحمت کا) بازو رکھ دے گا پھر اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا، پھر فرمائے گا تو (ان گناہوں کو) پہچانتا ہے؟ وہ کہے گا: اے رب میں پہچانتا ہوں! فرمائے گا: میں نے دنیا میں تجھ پر پردہ رکھا تھا اور آج میں تجھے بخش دیتا ہوں! پھر اسے اس کی نیکیوں کا اعمال نامہ دے دیا جائے گا اور رہے کفار اور منافقین تو لوگوں کے سامنے ان کو بلایا جائے گا اور کہا جائے گا: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا تھا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۴۴۱، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۷۶۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸۳)

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

اگر کسی شخص نے تنہائی میں شراب پی ہو یا زنا کیا ہو اور حاکم اس سے اس کے متعلق بازپرس کرے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ کہے کہ میں نے یہ کام نہیں کیا، کیونکہ ان کاموں کا اظہار بھی بے حیائی ہے اور اس کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ اس

سے اس کے بھائی کے راز کے متعلق پوچھا جائے تو وہ انکار کر دے۔

(ردالمحتار ج ۵ ص ۲۴۷، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہیے اے لوگو! بے شک تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس حق آ چکا ہے تو جس شخص نے ہدایت کو اختیار کیا تو اس نے اپنے ہی فائدہ کے لیے ہدایت کو اختیار کیا اور جس شخص نے گمراہی کو اختیار کیا تو اس نے اپنے ہی ضرر کے لیے گمراہی کو اختیار کیا اور میں تم پر جبر کرنے والا نہیں ہوں O (یونس: ۱۰۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی تبلیغ کر دی ہے

اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں توحید، رسالت اور قیامت پر دلائل قائم کیے اور منکرین کے شبہات کا ازالہ فرمایا اور کافروں پر حجت پوری کرنے کے بعد فرمایا: جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم تھا کہ وہ ہدایت کو اختیار کرے گا، وہی ہدایت کو اختیار کرے گا، اس لیے رسول اللہ سے فرمایا کہ آپ کہہ دیں کہ میں تم کو ہدایت پر مجبور کرنے والا نہیں ہوں تم تک ثواب عظیم کو پہنچانے کے لیے اور تم کو عذاب الیم سے چھڑانے کے لیے اس سے زیادہ کوشش کی ضرورت نہیں جتنی کوشش میں کر چکا ہوں۔

لفظ "وکیل" کے چند تراجم

اس آیت میں ہے وما انا علیکم بوکیل، ان سطور میں ہم وکیل کے چند تراجم پیش کر رہے ہیں:

شاہ رفیع الدین دہلوی متوفی ۱۲۳۳ھ لکھتے ہیں:

اور نہیں میں اوپر تمہارے داروغہ۔

شیخ محمود حسن متوفی ۱۳۳۹ھ لکھتے ہیں:

اور میں تم پر نہیں ہوں مختار۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں:

اور کچھ میں کڑوڑا نہیں۔

شیخ اشرف علی تھانوی متوفی ۱۳۶۴ھ لکھتے ہیں:

اور میں تم پر مسلط نہیں کیا گیا۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ لکھتے ہیں:

اور میں تمہارے اوپر کوئی حوالہ دار نہیں ہوں۔

اور ہم نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

اور میں تم پر جبر کرنے والا نہیں ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور آپ اسی کی اتباع کیجئے جس کی آپ پر وحی کی جاتی ہے اور صبر کیجئے حتیٰ کہ اللہ فیصلہ فرمائے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے O (یونس: ۱۰۹)

زیادتیوں پر صبر کرنے کا حکم

بظاہر اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف وحی کی اتباع کرنا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے لیے قیاس اور اجتہاد کرنا جائز نہیں ہے، اور احکام کو مشروع کرنے کا بھی آپ کو اختیار نہیں ہے، اس پر تفصیلی

بحث ہم الانعام: ۵۰ اور الاعراف: ۲۰۳ میں کر چکے ہیں۔

اس آیت میں آپ کو صبر کرنے کا حکم دیا ہے یعنی عبادت کی مشقت پر آپ صبر کیجئے' یہ مکی سورت ہے' اس وقت تک قتال اور جہاد فرض نہیں ہوا تھا اس لیے اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دشمنان اسلام کی ازیت رسانیوں پر آپ صبر کیجئے' آپ نے امت کو بھی زیادتیوں پر صبر کرنے کا حکم دیا ہے:

حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تنہائی میں عرض کیا: آپ مجھے عامل نہیں بناتے جس طرح آپ نے فلاں شخص کو عامل بنایا ہے۔ آپ نے فرمایا: عنقریب تم میرے بعد ترجیحات کو دیکھو گے سو تم صبر کرنا حتیٰ کہ تم مجھ سے ملاقات کرو۔

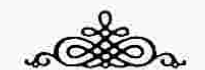
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۷۸۹' صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۸۴۵' سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۸۹' سنن النسائی رقم الحدیث: ۵۳۸۳' السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۸۳۴۴)

سورہ یونس کی اختتامی دعا

آج بروز بدھ بعد از نماز عصر مورخہ ۲۴ رجب ۱۴۲۰ھ / ۳ نومبر ۱۹۹۹ء سورہ یونس کا ترجمہ اور تفسیر ختم ہو گئی۔

الہ العالمین! جس طرح آپ نے سورہ یونس تک کی تفسیر اپنے فضل اور کرم سے مکمل کرا دی ہے' قرآن مجید کی باقی سورتوں کا ترجمہ اور تفسیر بھی مکمل کرا دیں۔ الہ العالمین! اس تفسیر کو مخالفین کے لیے ہدایت اور موافقین کے لیے استقامت کا ذریعہ بنا دے اور محض اپنے فضل اور اپنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے توسل اور آپ کی شفاعت سے مصنف' اس کے والدین' اساتذہ' تلامذہ' احباب اور اس کتاب کے معاونین' ناشرین اور قارئین کی مغفرت فرما' ہم سب کو دنیا اور آخرت کی ہر پریشانی اور بلا سے محفوظ رکھ اور دنیا اور آخرت کی ہر سعادت اور کامرانی عطا فرما۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سیدنا محمد وعلی الہ واصحابہ وازواجہ وعلماء ملتہ واولیاء امتہ اجمعین۔




سُورَةُ هُودٍ
(١١)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

سورۃ ھود

سورۃ کا نام

اس سورت کا نام سورۃ ھود ہے کیونکہ اس سورت میں حضرت ھود علیہ السلام اور ان کی قوم عاد کا ذکر کیا گیا ہے۔ (ھود: ٦٠-٥٠) ہر چند کہ اس سورت میں دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا بھی ذکر کیا گیا ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ وجہ تسمیہ جامع مانع نہیں ہوتی، وجہ تسمیہ کے لیے صرف اتنا کافی ہوتا ہے کہ اسم اور مسمیٰ میں مناسبت ہو، علاوہ ازیں اس سورت میں حضرت ھود علیہ السلام کا نام مبارک پانچ مرتبہ ذکر کیا گیا ہے اور کسی سورت میں ایسا نہیں ہے۔ نیز اس سورت میں یہ تصریح ہے کہ عاد، حضرت ھود علیہ السلام کی قوم ہے اور کسی سورت میں اس طرح یہ تصریح نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے:

اَلَا بُعۡدًا لِّعَادٍ قَوۡمِ هُوۡدٍ۔ (ھود: ٦٠)
سنو! ھود کی قوم عاد کے لیے اللہ کی رحمت سے دُوری ہے۔

حضرت ھود علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ عزوجل کی عبادت کی طرف دعوت دی اور ان کو بتوں کی پرستش سے منع فرمایا، اور جب انہوں نے اپنے کفر اور اپنی تکذیب پر اصرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر تیز اور سخت آندھیوں کا عذاب بھیجا، جو ان پر آٹھ دن اور سات راتوں تک مسلسل جاری رہا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّيۡنَا هُوۡدًا وَّالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَنَجَّيۡنٰهُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ غَلِيۡظٍO وَتِلۡكَ عَادٌ جَحَدُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ وَعَصَوۡا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيۡدٍO (ھود: ٥٩-٥٨)

اور جب ہمارا عذاب آ گیا تو ہم نے ھود اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت کے ساتھ نجات دی اور ہم نے ان کو سخت عذاب سے بچا لیاO اور یہ ہیں قوم عاد کے لوگ جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر ظالم ضدی کے حکم کو ماناO

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهۡلِكُوۡا بِرِيۡحٍ صَرۡصَرٍ عَاتِيَةٍO سَخَّرَهَا عَلَيۡهِمۡ سَبۡعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ

اور رہی قوم عاد تو وہ ایک سخت گرجتی ہوئی نہایت تیز آندھی سے ہلاک کی گئی تھیO اللہ تعالیٰ نے اس کو ان پر متواتر سات

حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْ بَاقِيَةٍ ۝ (الحاقہ: ۶-۸)

راتوں اور آٹھ دنوں تک مسلط کر دیا تھا اے مخاطب! تو ان کو کھجور کے گرے ہوئے درختوں کی جڑوں کی طرح پڑا ہوا دیکھتا ہے ۝ تو کیا تو ان میں سے کسی کو باقی دیکھتا ہے ۝

حضرت ھود علیہ السلام کی مفصل سوانح اور ان کی قوم کے ضروری احوال اور ان پر عذاب نازل کرنے کی مفصل کیفیت ہم نے الاعراف: ۶۵ میں بیان کر دی، اس کو وہاں دیکھ لیا جائے۔

سورہ ھود کی آیات، زمانہ نزول اور نزول کا مقام

سورہ ھود مکی ہے اور اس میں ایک سو تیئس آیتیں اور دس رکوع ہیں۔

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

جمہور کے نزدیک سورہ ھود کی تمام آیات مکی ہیں اور اس میں کوئی استثناء نہیں ہے، لیکن بعض علماء نے اس کی تین آیتوں کا استثناء کیا ہے، ھود: ۱۲، ھود: ۱۷ اور ھود: ۱۱۴ اس کی دلیل یہ ہے کہ حافظ جلال الدین سیوطی نے کہا ہے کہ یہ تین آیتیں ابوالیسر کے متعلق نازل ہوئی ہیں، علامہ الدانی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔ (روح المعانی ج ۷ ص ۲۹۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

سورہ ھود، سورہ یوسف سے پہلے اور سورہ یونس کے بعد نازل ہوئی ہے، ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا نمبر ۵۲ ہے۔ (التحریر والتنویر ج ۱ ص ۳۱۲، مطبوعہ تیونس)

سورہ ھود ہجرت سے کچھ پہلے مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، مفسرین نے لکھا ہے کہ سورہ ھود، سورہ یونس کے متصل بعد نازل ہوئی ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب مشرکین مکہ کی مسلمانوں پر زیادتیاں اور ان کا ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا تھا، یہ وہی حالات تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا پیش خیمہ تھے۔

سورہ ھود کی سورہ یونس کے ساتھ مناسبت

سورہ ھود کے مضامین سورہ یونس کی طرح ہیں، سورہ یونس کی طرح یہ سورت بھی الف لام را سے شروع ہوتی ہے اور اس کا اختتام، اللہ تعالیٰ کی توحید، قرآنِ کریم کی صداقت اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی حقانیت اور اسلام کے پیغام پر ہوتا ہے، جس میں تفصیل کے ساتھ قیامت، حساب و کتاب، جزاء و سزا کا ذکر ہے اور قرآنِ مجید کے اعجاز کا ذکر ہے اور اس کی آیات کے محکم ہونے کا بیان ہے جیسا کہ سورہ یونس کا اختتام بھی اسی نوع کی آیات پر ہوا ہے۔

جس طرح سورہ یونس میں انبیاء سابقین کا ذکر تھا اس سورت میں بھی انبیاء سابقین کا ذکر ہے۔ سورہ یونس میں حضرت نوح، حضرت موسیٰ اور حضرت یونس علیہم السلام کا ذکر تھا اس سورت میں ان کے علاوہ حضرت ابراہیم، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام کا بھی ذکر ہے۔

سورہ ھود کے متعلق احادیث

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! آپ بوڑھے ہوگئے! فرمایا: مجھے ھود، الواقعہ، المرسلات، عم یتساءلون اور اذا الشمس کورت نے بوڑھا کر دیا۔

(سنن ترمذی رقم الحدیث: ۳۲۹۷، الطبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۴۳۵، المصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۰ ص ۵۵۳، مطبوعہ کراچی، شمائل ترمذی رقم الحدیث: ۴۱، المستدرک ج ۲ ص ۴۷۶، ۳۴۳، حلیۃ الاولیاء ج ۴ ص ۳۵۰، طبع قدیم، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۱ ص ۳۵۷، شرح السنہ رقم الحدیث: ۴۱۷۵، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۱۰۸، ۱۰۷)

کعب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کے دن سورہ ھود پڑھو۔
(سنن دارمی رقم الحدیث: ۳۴۰۴، ۳۴۰۳، مطبوعہ دار الکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ)

ایمان نہ لانے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو قبول نہ کرنے پر سورہ یونس میں بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کی وعید کا ذکر ہے لیکن سورہ ھود میں اللہ تعالیٰ نے زیادہ قہر و غضب کا اظہار فرمایا ہے۔

امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابوعلی السری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر عرض کیا: یارسول اللہ! آپ سے روایت کیا گیا ہے کہ سورہ ھود نے آپ کو بوڑھا کر دیا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! میں نے عرض کیا: سورہ ھود کی کسی چیز نے آپ کو بوڑھا کر دیا؟ کیا انبیاء علیہم السلام کے قصص اور ان کی امتوں کی ہلاکت نے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نے: فاستقم کما امرت۔ (ھود: ۱۱۲) "سو آپ اسی طرح قائم رہیں جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے۔" (الدرالمنثور ج ۴ ص ۲۹۸، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۶ھ)

اللہ تعالیٰ کے خوف کی شدت سے انسان بوڑھا ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا۔ (المزمل: ۱۷) وہ دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کائنات میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا خوف تھا۔

سورہ ھود کے مضامین

سورہ یونس کی طرح اس سورت میں بھی دینِ اسلام کے اصول اور عقائد بیان کیے گئے ہیں، یعنی توحید، رسالت، بعثت، جزا اور سزا۔ اس سورت میں دلائل سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ۔ (ھود: ۱)

اور اس میں یہ بتایا ہے کہ انسان کی آزمائش کی جائے گی کہ کون اچھے عمل کرتا ہے:

لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (ھود: ۷)

مومن اور کافر میں یہ فرق بیان فرمایا ہے کہ مومن سختی اور تنگی کے دنوں میں صبر کرتا ہے اور آسانی اور فراخی کے وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے، اور کافر عیش اور راحت کے ایام میں تکبر کرتا ہے اور مصیبت اور سختی کے ایام میں مایوس ہو جاتا ہے۔ (ھود: ۱۱-۹)

دین کو قبول کرنے کے معاملہ میں انسانوں کی طبائع مختلف ہیں۔ (ھود: ۱۱۹-۱۱۸)

ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار اور مشرکین کی طرف سے اذیتیں پہنچتی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی تسلی کے لیے انبیاء سابقین کے قصص بیان فرمائے۔ (ھود: ۱۲۰)

اس طرح کے اور مضامین ہیں جیسے مضامین اس سے پہلی سورت میں بیان فرمائے تھے۔

یہ سورت دوسری سورتوں سے اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں جو طوفان آیا تھا اس کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اب ہم اللہ پر توکل کرتے ہوئے سورہ ھود کی تفسیر شروع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم پر حق اور صواب منکشف کرے اور وہی لکھوائے جو حق ہے اور باطل سے ہم کو مجتنب رکھے۔ آمین! یارب العلمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین۔

سُورَةُ هُودٍ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَثَلٰثٌ وَعِشْرُونَ اٰيَةً وَعَشْرُ رُكُوعَاتٍ

سورۃ ہود مکی ہے، اس میں ایک سو تیئیس آیتیں اور دس رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اللہ ہی کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے ○

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝١ لا

الف لام را، یہ (آسمانی) کتاب ہے جس کی آیتیں مستحکم کر دی گئی ہیں اور خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے (ان کی) تفصیل کر دی گئی ہے ○

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ ۝٢ لا وَّاَنِ

کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، بے شک میں تم کو اس کی طرف سے (عذاب سے) ڈرانے والا اور (ثواب کی) خوشخبری دینے والا ہوں ○ اور یہ کہ

اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى

تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو اور اس کے سامنے توبہ کرو، وہ تم کو ایک مقرر مدت تک بہت اچھا فائدہ

اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا

پہنچائے گا، اور ہر زیادہ نیکی کرنے والے کو زیادہ اجر عطا فرمائے گا اور اگر تم نے روگردانی کی تو میں

فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝٣ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ج

تم پر بہت بڑے دن کے عذاب کا خطرہ محسوس کرتا ہوں ○ تم نے اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٤ اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ

اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ○ سنو! وہ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ

لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا

وہ اس سے چھپائیں، سنو! جس وقت وہ اپنے کپڑے اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں (اس وقت بھی) وہ اس کو جانتا ہے

يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ج اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝٥

جس کو وہ چھپاتے ہیں اور جس کو وہ ظاہر کرتے ہیں بے شک وہ سینوں کی باتوں کو خوب جانتا ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الف، لام، را، یہ (آسمانی) کتاب ہے جس کی آیتیں مستحکم کر دی گئی ہیں، اور خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے (ان کی) تفصیل کر دی گئی ہے○ (ہود: ۱)

قرآنِ مجید کی آیات کے محکم ہونے کے معانی

آیتوں کو مستحکم کرنے کے چند معانی ہیں:

(۱) اس کتاب کی عبارت مستحکم ہے، اس میں کوئی نقص اور خلل نہیں ہے، جیسے کوئی بہت مضبوط اور پختہ عمارت ہو۔

(۲) جس طرح تورات اور انجیل کو قرآنِ مجید نے منسوخ کر دیا ہے اس طرح قرآنِ مجید کسی کتاب سے منسوخ نہیں ہے، یہ مستحکم کتاب ہے، ہرچند کہ اس کی بعض آیتوں کے احکام اس کی بعض دوسری آیتوں سے منسوخ ہیں مگر اس کی اکثر اور غالب آیات کے احکام منسوخ نہیں ہیں، اور وہ آیات بھی اس لحاظ سے مستحکم ہیں کہ ان آیات کی تلاوت باقی ہے اور ان کو پڑھنے سے اجر ملتا ہے۔

(۳) اس کتاب میں جو اصول اور عقائد بیان کیے گئے ہیں مثلاً توحید، رسالت، تقدیر، قیامت، حشر نشر اور جزا و سزا، یہ محکم ہیں اور یہ اصول نسخ کو قبول نہیں کرتے۔

(۴) اس کتاب کی آیتوں میں تناقض اور تضاد نہیں ہے، یہ سب مستحکم آیات ہیں۔

(۵) اس کتاب کی تمام آیتیں انتہائی فصیح اور بلیغ ہیں، تمام انسانوں اور جنات کو اس کی کسی ایک سورت کی نظیر لانے کا چیلنج کیا گیا لیکن آج تک کوئی اس کی نظیر نہیں لا سکا، حالانکہ اسلام اور قرآن کے مخالف بہت زیادہ ہیں اور علم اور تحقیق کے شعبہ جات بھی دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔

(۶) علومِ دینیہ کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم کا تعلق اصول اور اعتقاد کے ساتھ ہے مثلاً اللہ تعالیٰ پر، فرشتوں پر، نبیوں اور رسولوں پر اور آسمانی کتابوں پر، تقدیر پر، قیامت پر اور جزا اور سزا پر ایمان لانا اور ان کی تمام تفاصیل اور ان کے دلائل کو جاننا، اور علمِ دین کی دوسری قسم کا تعلق فروع اور اعمال سے ہے اور اس کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک قسم کا تعلق اعمالِ ظاہرہ کی تہذیب اور اصلاح سے ہے، اس کا نام فقہ ہے اور دوسری قسم کا تعلق احوالِ باطنہ کی تہذیب اور اس کی اصلاح سے ہے اور اس کا نام علمِ تصوف ہے اور جو کتاب ان تینوں علوم پر مشتمل ہے اور عقائد اور ظاہری اور باطنی اعمال کے اصول اور کلیات پر حاوی اور متکفل ہے، وہ صرف قرآنِ مجید ہے اور اس پائے کی کوئی اور کتاب نہیں ہے، آسمانی کتابوں میں نہ دنیاوی کتابوں میں۔

(۷) یہ کتاب تغیر اور تبدل سے محفوظ ہے، اس کتاب کی کوئی آیت اس سے کم ہو سکتی ہے نہ اس میں کسی اور آیت کا اضافہ ہو سکتا ہے، اس لحاظ سے اس کی تمام آیات مستحکم ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، بے شک میں تم کو اس کی طرف سے (عذاب سے) ڈرانے والا اور (ثواب کی) خوشخبری دینے والا ہوں○ (ہود: ۲)

اس کا ایک معنی یہ ہے کہ یہ کتاب ہے جس کی آیتیں مستحکم کر دی گئی ہیں پھر ان آیتوں کی تفصیل کر دی گئی ہے تاکہ تم صرف اللہ کی عبادت کرو، اس لحاظ سے اس کتاب کو نازل کرنے کا مقصدِ اصلی یہ ہے کہ بندے اللہ کی عبادت کریں اور جس نے اللہ کی عبادت نہیں کی وہ ناکام اور نامراد ہے۔

اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اس کتاب کی آیات مستحکم کی گئی ہیں تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو یہ حکم دیں کہ وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور لوگوں سے یہ کہیں کہ میں اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا اور اللہ کے اجر و ثواب کی

خوشخبری دینے والا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یہ کہ تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو اور اس کے سامنے توبہ کرو، وہ تم کو ایک مقرر مدت تک بہت اچھا فائدہ پہنچائے گا اور ہر زیادہ نیکی کرنے والے کو زیادہ اجر عطا فرمائے گا، اور اگر تم نے رُوگردانی کی تو میں تم پر بہت بڑے دن کے عذاب کا خطرہ محسوس کرتا ہوں○ تم نے اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے○ (ھود: ۴-۳)

استغفار کے حکم کے بعد توبہ کے حکم کی توجیہ

اللہ تعالیٰ نے مغفرت طلب کرنے اور توبہ کرنے کا حکم دیا ہے اور طلبِ مغفرت کو توبہ پر مقدم فرمایا ہے کیونکہ مغفرت مقصود بالذات ہے اور توبہ کرنا مغفرت کے حصول کا ذریعہ ہے، اس لیے وہ مقصود بالعرض ہے۔ اس ترتیب کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اپنے سابقہ گناہوں پر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرو اور آئندہ گناہ نہ کرنے کے لیے اس کے حضور توبہ کرو، تیسری وجہ یہ ہے کہ پہلے ہر قسم کے شرکِ جلی اور خفی سے استغفار کرو پھر اپنے گناہوں پر توبہ کرو، چوتھی وجہ یہ ہے کہ پہلے کبیرہ گناہوں پر استغفار کرو پھر صغیرہ گناہوں پر توبہ کرو، پانچویں وجہ یہ ہے کہ فرائض اور واجبات میں کمی پر استغفار کرو اور محرمات اور مکروہات کے ارتکاب پر توبہ کرو۔

دنیا میں کافروں کی خوش حالی اور مسلمانوں کی بدحالی کی توجیہ

اس آیت میں فرمایا ہے: وہ تم کو ایک مقرر مدت تک بہت اچھا فائدہ پہنچائے گا۔ جب کہ ایک اور آیت اور احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں کافروں کو خوش حالی میں رکھے گا اور مسلمانوں کو تنگ دستی میں رکھے گا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ○ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ○ وَزُخْرُفًا ؕ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ (الزخرف: ۳۵-۳۳)

اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ سب لوگ (کافروں کی) ایک جماعت بن جائیں گے تو ہم ضرور رحمٰن کے ساتھ کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتوں کو اور ان کی سیڑھیوں کو جن پر وہ چڑھتے ہیں چاندی کی بنا دیتے○ اور ان کے گھروں کے دروازوں کو اور ان کے تختوں کو جن پر وہ مسند آرائی کرتے ہیں (چاندی کا بنا دیتے)○ اور سونے کا، اور بے شک یہ دنیاوی زندگی کا سامان ہے، اور (اچھی) آخرت آپ کے رب کے پاس اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ہے○

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دُنیا مومن کا قید خانہ ہے اور کافر کی جنت ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۲۴، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۹۵۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۱۱۳، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۸۷، مسند احمد ج ۲ ص ۳۲۳، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۶۴۶۶، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۲۸۰۳، حلیۃ الاولیاء ج ۶ ص ۳۵۰، شرح السنہ رقم الحدیث: ۴۱۰۴، الکامل لابن عدی ج ۳ ص ۸۸۹، المستدرک ج ۳ ص ۶۰۴)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے زیادہ مصائب انبیاء پر آتے ہیں، پھر علماء پر، پھر جو ان کے زیادہ قریب ہوں اور پھر جو ان کے زیادہ قریب ہوں۔

(المستدرک ج ۳ ص ۳۴۲، کنز العمال رقم الحدیث: ۶۷۸)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! سب سے زیادہ مصیبت میں کون لوگ مبتلا ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: انبیاء، پھر جو ان کے زیادہ مثل ہوں، پھر جو ان کے زیادہ مثل ہوں، ہر شخص اپنی دین داری کے اعتبار سے مصائب میں مبتلا ہو گا، اگر وہ شدت سے دین پر قائم ہو تو اس پر مصائب بھی شدید ہوں گے، اگر وہ معمولی سا دین پر قائم ہو تو اس پر اس کی دین داری کے لحاظ سے مصائب آئیں گے۔ بندہ پر اسی طرح مصائب آتے رہیں گے حتیٰ کہ وہ اس حال میں زمین پر چلے گا کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہو گا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۹۸، سنن ابوداؤد الطیالسی رقم الحدیث: ۲۱۵، الطبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۲۰۹، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۲۳۳، مسند احمد ج ۱ ص ۱۷۲، سنن دارمی رقم الحدیث: ۲۷۸۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۲۳، مسند البزار رقم الحدیث: ۱۱۵۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۲۹۰۱، المستدرک ج ۱ ص ۴۱، حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۳۶۸، السنن الکبریٰ ج ۳ ص ۳۷۲، شعب الایمان رقم الحدیث: ۹۷۷۵، شرح السنہ رقم الحدیث: ۱۴۳۳)

قرآنِ مجید اور احادیث کی یہ تصریحات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتا ہے وہ مصائب اور آلام میں مبتلا رہتا ہے، اور سورہ ھود کی زیر تفسیر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو گا وہ راحت اور آرام میں رہے گا کیونکہ اس میں فرمایا ہے: وہ تم کو ایک مقرر مدت تک بہت اچھا فائدہ پہنچائے گا، پس اس آیت اور ان تصریحات میں کس طرح موافقت ہو گی؟ اس سوال کے حسبِ ذیل جوابات ہیں:

(۱) سورہ ھود کی اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر اس طرح عذاب نازل نہیں فرمائے گا جس طرح اس سے پہلے کافروں کی بستیوں پر اللہ تعالیٰ نے عذاب نازل فرمایا تھا۔

(۲) اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو بہرحال رزق عطا فرمائے گا اور ان کو بھوک پیاس، قحط اور خشک سالی کے عذاب میں مبتلا نہیں کرے گا۔

(۳) مسلمان کا مطمحِ نظر اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا ہوتی ہے اور اس پر جو مصائب اور آلام آتے ہیں وہ ان سے رنجیدہ اور کبیدہ خاطر نہیں ہوتا، اس کو یقین ہوتا ہے کہ یہ مصائب اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور محبوب کے پاس سے جو کچھ بھی آئے وہ محب کے لیے کبھی رنج اور الم کا باعث نہیں ہوتا بلکہ وہ ان پر مسرور اور خوش ہوتا ہے کہ یہ اس کے محبوب کے پاس سے آئے ہوئے آلام ہیں، اور اس کے محبوب کی طرف سے آزمائش اور امتحان ہے، یہ کاملین کا مقام ہے اور عام مسلمان بھی دنیاوی مصائب سے ملول خاطر نہیں ہوتے، ان کو یقین ہوتا ہے کہ یہ مصائب ان کے گناہوں کا کفارہ ہیں اور ان مصائب اور آلام کی وجہ سے جب وہ دنیا سے رخصت ہوں گے تو گناہوں سے پاک اور صاف ہو کر اللہ تعالیٰ سے آخرت میں ملاقات کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۗ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (النحل: ۹۶)

جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا، اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہے گا، البتہ جن لوگوں نے (عیش و آرام کی کمی یا مصائب پر) صبر کیا، ہم ان کو ضرور ان کے بہترین نیک کاموں پر اجر عطا فرمائیں گے۔

اور کفار اور مشرکین ہرچند کہ مادی اور دُنیاوی طور پر بہت عیش و آرام اور مال و دولت کی فراوانی میں رہتے ہیں، لیکن ان کو ہر وقت یہ فکر اور پریشانی لاحق رہتی ہے کہ کہیں یہ مال ان کے پاس سے جاتا نہ رہے، پھر جو شخص جتنا مالدار ہوتا ہے اس

کے اتنے زیادہ دشمن ہوتے ہیں لہٰذا وہ دشمنوں اور ڈاکوؤں کی وجہ سے ہر وقت خطرات میں گھرا رہتا ہے، پھر کافر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی دُنیا میں ہے اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے، اس لیے وہ موت سے ہر وقت گھبراتے رہتے ہیں، اس لیے وہ باوجود مال و دولت کی فراوانی کے طرح طرح کے تفکرات، اندیشوں اور پریشانیوں میں مبتلا رہتے ہیں اور مادی عیاشیوں کی بہتات کی وجہ سے وہ مہلک بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے وہ کینسر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جنسی بے اعتدالی میں زیادتی کی وجہ سے وہ ایڈز کے مریض بن جاتے ہیں، ہائی بلڈ پریشر اور شوگر کا مرض ان میں عام ہوتا ہے، ان پر دل کے دورے بکثرت پڑتے ہیں اور کتنے ہی لوگ فالج اور برین ہیمبرج کی وجہ سے مرجاتے ہیں۔ جنسی بے راہ روی اور آوارگی کی وجہ سے ان کا ذہنی سکون برباد ہو جاتا ہے، ان کی گھریلو زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ ہمارے زمانہ میں (۹۹-۱۹۹۸ء) امریکہ کے صدر بل کلنٹن اور مونیکا لیونسکی کا جو اسکینڈل بنا تھا، جس کی وجہ سے ساری دنیا میں امریکہ کے صدر کی جو رُسوائی ہوئی تھی، وہ اس کی واضح مثال ہے۔ ان لوگوں کی زندگی عدالتی طلاق کے مقدمات بھگتتے ہوئے گزر جاتی ہے، ان کا ذہنی سکون بالکل ختم ہو جاتا ہے، یہ طبعی نیند سے محروم ہو جاتے ہیں اور سکون آور دواؤں کی بھاری مقدار کھائے بغیر ان کو نیند نہیں آتی، غرض مال و دولت کی ریل پیل کے باوجود ان کی زندگی بڑے کرب اور اذیت میں گزرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔ (طٰہٰ: ۱۲۴)

اور جس نے میرے ذکر سے رُوگردانی کی تو یقیناً اس کی زندگی بڑی تنگی میں گزرے گی۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ (الانعام: ۸۲)

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک اور کبائر) کے ساتھ آلودہ نہیں کیا ان ہی کے لیے امن اور سکون ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔

زیادہ نیکی کرنے والے کو زیادہ اجر دینے کی تحقیق

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور وہ ہر زیادہ نیکی کرنے والے کو زیادہ فائدہ پہنچائے گا۔

زیادہ نیکی کرنے والے کو زیادہ فائدہ پہنچانے کی حسبِ ذیل وجوہات ہیں:

(۱) امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس شخص نے ایک گناہ کیا اس کا ایک گناہ لکھ دیا جاتا ہے، اور جس شخص نے ایک نیکی کی تو اس کی ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے، اس نے دنیا میں جو ایک گناہ کیا تھا اگر اس کے گناہ کی دنیا میں سزا دے دی گئی تو اس کے مقابلہ میں اس کی دس نیکیاں باقی رہیں گی، اور اگر دنیا میں اس کو اس کے ایک گناہ کی سزا نہیں دی گئی تو اس کی دس نیکیوں میں سے ایک نیکی کم کر دی جائے گی اور اس کی نو نیکیاں پھر بھی باقی رہیں گی، پھر فرمارہے تھے: اس شخص کی ہلاکت ہو جس کی اکائیاں اس کی دہائیوں پر غالب آجائیں۔

(جامع البیان ج۱۱ص ۲۳۵، رقم الحدیث: ۱۳۸۷۲، تفسیر ابن کثیر ج۲ص ۴۸۵، الدر المنثور ج۴ص ۳۹۹)

(۲) جب انسان غیر اللہ کے ساتھ بالکل مشغول نہ ہو اور معرفت الٰہی کے اسباب کو حاصل کرنے میں انتہائی راغب ہو تو اس کا قلب نقش ملکوت (اللہ تعالیٰ کی صفات) کے لیے نگینہ بن جاتا ہے اور اس کا دل لاہوت (اللہ تعالیٰ کی ذات) کی تجلیات کے لیے آئینہ ہو جاتا ہے، البتہ جسمانی عوارض سے یہ انوارِ الٰہیہ مکدر ہو جاتے ہیں اور جب یہ عوارض زائل ہو جاتے ہیں تو یہ انوار چمکنے لگتے ہیں پھر اس کی اُخروی سعادتوں کے اسباب بڑھنے لگتے ہیں، اور یہی اس آیت کا معنی ہے: اور وہ ہر زیادہ نیکی

کرنے والے کو زیادہ فائدہ پہنچائے گا۔

(۳) اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اُخروی سعادتوں کے درجات اور مراتب مختلف ہیں کیونکہ یہ درجات دنیا میں عبادت اور قُربِ الٰہی کے بالمقابل ہیں، اور جب دنیا کی طرف التفات نہ کرنے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف رغبت کے درجات غیر متناہی ہیں تو ان کے مقابلہ میں اُخروی سعادتوں کے درجات بھی غیر متناہی ہیں، اسی وجہ سے فرمایا: وہ ہر زیادہ نیکی کرنے والے کو زیادہ فائدہ پہنچائے گا۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتایا ہے کہ دنیا میں بھی ایک مقرر وقت تک وہی فائدہ پہنچائے گا اور آخرت میں بھی زیادہ نیکی کرنے والے کو وہی زیادہ اجر عطا فرمائے گا، یعنی دنیا اور آخرت میں ہر جگہ نفع پہنچانے والا وہی ہے، یہ اس لیے فرمایا کہ ظاہر بین فوائد اور ثمرات کی نسبت اسباب کی طرف کرتا ہے، مثلاً وہ کہتا ہے کہ سورج نے روشنی دی، اور بارش نے سبزہ اُگایا، لیکن جس کی نظر حقیقت پر ہوتی ہے وہ کہتا ہے: اللہ نے روشنی دی اور اللہ نے سبزہ اُگایا، اور اس کا ایمان ہوتا ہے کہ ہر چیز کا خالق دراصل اللہ تعالیٰ ہے۔

تہدید اور تبشیر کا امتزاج

دوسری آیت میں فرمایا: تم نے اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس آیت میں تہدید (دھمکی) بھی ہے اور بشارت بھی ہے۔ تہدید اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہماری کوئی جائے پناہ نہیں ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے، اس کے فیصلہ کو، کوئی ٹالنے والا نہیں ہے اور جو کام وہ کرنا چاہے اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے، اور جب ایسے زبردست حاکم کے سامنے پیش ہونا ہے اور ہمارے بہت عیوب ہیں اور بہت زیادہ گناہ ہیں تو پھر ہماری نجات بہت مشکل ہے، سو اس آیت سے بہت خوف پیدا ہوتا ہے اور اس آیت میں بشارت بھی ہے کیونکہ وہ بہت قاہر اور غالب حاکم ہے اور ہم بہت عاجز اور کمزور ہیں اور جب قاہر اور غالب حاکم کسی عاجز اور کمزور کو ہلاکت کے قریب دیکھے تو وہ اس پر رحم فرماتا ہے اور اس کو ہلاکت سے نجات دیتا ہے۔ تو اے رحم فرمانے والے اور عیوب کو چھپانے والے اور بے کسوں کی دعا کو قبول فرمانے والے! ہم پر رحم فرما اور ہم کو عذاب سے نجات عطا فرما!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سنو وہ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ وہ اس سے چھپائیں، سنو! جس وقت وہ اپنے کپڑے اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں، (اس وقت بھی) وہ اس کو جانتا ہے جس کو وہ چھپاتے ہیں، اور جس کو وہ ظاہر کرتے ہیں، بے شک وہ سینوں کی باتوں کو خوب جاننا ہےO (ھود: ۵)

منافقین کے سینہ موڑنے کے محامل

امام محمد بن جعفر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عبداللہ بن شداد بن الہاد بیان کرتے ہیں کہ منافقین جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرتے تو اپنا سینہ موڑ لیتے اور سر جھکا لیتے تاکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چھپ جائیں تب یہ آیت نازل فرمائی۔

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ منافقین حق میں شک کرتے تھے اور اپنی استطاعت کے مطابق اللہ سے چھپنے کی کوشش کرتے تھے۔

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنا سینہ اس لیے موڑتے تھے کہ اللہ کی کتاب کو نہ سن سکیں۔

بعض نے کہا: منافقین اپنے دلوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض اور عداوت کو چھپاتے تھے اور ظاہر یہ کرتے تھے کہ ان کو آپ سے محبت ہے اور وہ آپ پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ اللہ عزوجل نے فرمایا کہ وہ کفر کو اپنے سینوں میں لپیٹتے ہیں

تاکہ کفر کو اللہ سے چھپائیں حالانکہ اللہ تعالیٰ پر ان کا ظاہر اور باطن سب عیاں ہے۔
اور بعض نے کہا: جب وہ ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے تھے تو اپنا سینہ موڑتے تھے تاکہ ان کی سرگوشیاں ظاہر نہ ہوں۔ (جامع البیان ج ۱۱ ص ۲۳۸۔۲۳۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

الجزء ۱۲ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ
اور زمین پر چلنے والے (ہر جاندار) کا رزق اللہ کے ذمہ (کرم پر) ہے، وہ اس کے قیام کی
مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۞ ۶ وَهُوَ الَّذِي
جگہ کو (بھی) جانتا ہے اور اس کی سپردگی کی جگہ کو (بھی) جانتا ہے، سب کچھ روشن کتاب میں (مذکور) ہے ○ وہی جس نے
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى
آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا
الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۗ وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ
تاکہ وہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کس کا عمل نیک ہے، اور اگر آپ ان سے کہیں کہ تم یقیناً
مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ
موت کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو کافر ضرور یہ کہیں گے کہ یہ صرف کھلا ہوا
مُّبِيْنٌ ۞ ۷ وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلٰٓى أُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ
جادو ہے ○ اور اگر ہم ایک معین مدت تک ان سے عذاب مؤخر کر دیں تو وہ
لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ۗ أَلَا يَوْمَ يَأْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا
ضرور یہ کہیں گے کہ عذاب کو کس چیز نے روک لیا؟ سنو جس دن ان پر وہ عذاب واقع ہوگا تو پھر وہ ان سے دور نہیں
عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۞ ۸ ع ۱ ۸
کیا جائے گا اور جس (عذاب) کا وہ مذاق اڑاتے تھے وہ ان کا احاطہ کرے گا ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور زمین پر چلنے والے (ہر جاندار) کا رزق اللہ کے ذمہ (کرم) پر ہے، وہ اس کے قیام کی جگہ کو (بھی) جانتا ہے اور اس کی سپردگی کی جگہ کو (بھی) جانتا ہے، سب کچھ روشن کتاب میں (مذکور) ہے ○

(ھود: ۶)

ربط آیات

اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا: وہ اس کو جانتا ہے جس کو وہ چھپاتے ہیں' اور جس کو وہ ظاہر کرتے ہیں' اور اسی کے موافق اس آیت میں واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام معلومات کا عالم ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر ہر جان دار کو اس کا رزق پہنچاتا ہے پس اگر وہ ہر جان دار کو' اس کی موت و حیات کو' اس کے قیام اور اس کے سفر کی جگہ کو نہ جانتا ہو تا تو وہ ان کو رزق کیسے پہنچاتا۔

دآبۃ کا معنیٰ

دآبۃ عرف میں چوپایہ کو اور زمین پر چلنے والے کو کہتے ہیں اور یہاں اس سے مراد ہے جان دار خواہ وہ مذکر ہو یا مونث اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جان داروں کی بہت سی اقسام ہیں۔ یہ دریاؤں' سمندروں اور خشکی میں رہتے ہیں' اور اللہ تعالیٰ ان کی طبائع کی کیفیتوں کو' ان کے احوال کو اور ان کی غذاؤں کو اور ان کی موافق اور مخالف چیزوں کو اور ان کے مسکنوں کو جانتا ہے۔

مستقر اور مستودع کا معنیٰ

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ مستقر اور مستودع کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: منتہائے سیر (چل پھر کر جہاں رُک جائے) کو مستقر کہتے ہیں' اور جس کو ٹھکانا بنایا جائے وہ مستودع ہے' اور مجاہد نے کہا: مستقر سے مراد رحم مادر ہے اور مستودع سے مراد باپ کی پشت ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۸۵) امام ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ نے ان کے علاوہ اور بھی اقوال ذکر کیے ہیں۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۲۰۰۴-۲۰۰۱) مستودع سے مراد موت کی جگہ ہے' اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کسی شخص کی اجل (موت) کسی زمین میں ہو تو اس کی کوئی ضرورت اس کو وہاں پہنچا دیتی ہے' اور جب وہ اس جگہ کی منتہیٰ کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ سبحانہ اس کی رُوح کو قبض فرمالیتا ہے اور قیامت کے دن وہ زمین کہے گی: اے رب! یہ وہ ہے جس کو تُو نے میرے پاس ودیعت (امانت) رکھا تھا۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۲۶۳' المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۱۰۴۰۳' المستدرک ج ۱ ص ۳۶۷' شعب الایمان رقم الحدیث: ۹۸۸۹' اس حدیث کی سند صحیح ہے)

اللہ تعالیٰ کے رزق پہنچانے کی مثالیں

امام فخرالدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

روایت ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی تھی' ان کے دل میں اپنے گھر والوں کا خیال آیا (کہ انہوں نے کھانا کھایا ہے یا نہیں) اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ وہ ایک چٹان پر لاٹھی ماریں' اس سے ایک پتھر ٹوٹ کر نکلا' پھر انہوں نے اس دوسرے پتھر پر لاٹھی ماری' اس سے ایک اور پتھر ٹوٹ کر نکلا' انہوں نے اس پر بھی لاٹھی ماری اس سے پھر ایک اور پتھر نکلا' اس پتھر میں چیونٹی کے برابر ایک کیڑا تھا' اس کے مُنہ میں غذا کی قائم مقام کوئی چیز تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کیڑے کا کلام سنایا' وہ کہہ رہا تھا: پاک ہے وہ جو مجھے دیکھتا ہے اور میرا کلام سنتا ہے اور میری جگہ کو جانتا ہے اور مجھے یاد رکھتا ہے اور مجھے نہیں بھولتا۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۱۸' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۵ھ)

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں:

حکیم ترمذی نے زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اشعریوں کی ایک جماعت جو حضرت ابو موسیٰ' حضرت

ابو مالک اور حضرت ابو عامر رضی اللہ عنہم پر مشتمل تھی، جب انہوں نے ہجرت کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے ساتھ سفر میں جو کھانا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانے کا سوال کرنے کے لیے ایک شخص کو بھیجا۔ جب وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر پہنچا تو انہوں نے ایک شخص کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا: وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقہا۔ اس شخص نے کہا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک اشعریوں کی بہ نسبت چوپایوں کو رزق دینا زیادہ آسان تو نہیں ہے۔ وہ واپس آگیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں گیا اور اس نے اپنے اصحاب سے کہا: تم کو خوشخبری ہو تمہارے پاس مدد آنے والی ہے۔ اس کے اصحاب نے یہی سمجھا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا ہوگا اور آپ نے طعام بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہوگا، اسی دوران دو آدمی ان کے پاس برتنوں میں کھانا لے کر آگئے جن میں گوشت کا سالن اور روٹیاں تھیں۔ انہوں نے سیر ہو کر کھانا کھایا، پھر اس شخص نے اپنے بعض اصحاب سے کہا: تم یہ کھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جاؤ کیونکہ ہم پیٹ بھر کر کھا چکے ہیں، پھر جب وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ نے ہمارے لیے جو کھانا بھیجا تھا اس سے عمدہ اور لذیذ کھانا ہم نے کبھی نہیں کھایا۔ آپ نے فرمایا: میں نے تو تمہیں کوئی کھانا نہیں بھیجا۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو آپ کی خدمت میں بھیجا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ اس نے کیا کیا تھا اور اپنے اصحاب سے کیا کہا تھا، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم کو اللہ نے یہ رزق دیا تھا۔

(الدر المنثور ج ۴ ص ۴۰۲-۴۰۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ، الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۸)

حرام رزق ہوتا ہے یا نہیں، اس پر مفصل بحث ہم نے البقرہ: ۳ میں کر دی ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہی جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا، تاکہ وہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کس کا عمل نیک ہے، اور اگر آپ ان سے کہیں کہ تم یقیناً موت کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو کافر ضرور یہ کہیں گے کہ یہ صرف کھلا ہوا جادو ہے○ (ھود: ۷)

آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کرنا

دنوں کا تحقق افلاک کی حرکت اور سورج کے طلوع اور غروب سے ہوتا ہے اور جب آسمان اور زمین پیدا نہیں ہوئے تھے تو دنوں کا وجود بھی نہ تھا اس لیے چھ دنوں سے مراد چھ دورانیہ یا چھ اطوار ہیں، یا اس سے مراد تقدیراً چھ دن ہیں یعنی اگر اس دورانیہ میں دن ہوتے تو چھ دن لگتے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: اللہ عزوجل نے زمین کو ہفتہ کے دن پیدا کیا اور اتوار کے دن اس میں پہاڑ پیدا کیے اور درختوں کو پیر کے دن پیدا کیا اور ناپسندیدہ چیزیں منگل کے دن پیدا کیں اور نُور کو بدھ کے دن پیدا کیا اور جمعرات کے دن اس میں حیوانات پھیلائے، اور جمعہ کے دن عصر کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، جمعہ کی ساعات میں سے آخری ساعت میں رات آنے سے پہلے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۷۸۹، مسند احمد ج ۳ رقم الحدیث: ۸۳۴۹، جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۸۹۶)

آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کرنے کی تفصیل الاعراف: ۵۴ میں ملاحظہ فرمائیں۔

عرش کے پانی پر ہونے کے متعلق احادیث

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے

اپنی اونٹنی کو دروازہ پر باندھ دیا۔ آپ کے پاس بنو تمیم کے لوگ آئے، آپ نے فرمایا: اے بنو تمیم! بشارت کو قبول کرو۔ انہوں نے کہا: آپ ہمیں بشارت تو دے چکے ہیں اب ہم کو عطا فرمائیں۔ یہ مکالمہ دو بار ہوا، پھر آپ کے پاس اہل یمن آئے، آپ نے فرمایا: اے اہل یمن! بشارت کو قبول کرو اگرچہ بشارت کو بنو تمیم نے قبول نہیں کیا۔ انہوں نے کہا: یارسول اللہ! ہم نے قبول کر لیا، ہم آپ کے پاس اس امر (دنیا) کے متعلق پوچھنے کے لیے آئے تھے۔ آپ نے فرمایا: اللہ تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہیں تھی، اور اس کا عرش پانی پر تھا، اور اس نے ذکر میں ہر چیز لکھ دی، اور آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور ذکر (لوحِ محفوظ) میں ہر چیز لکھ دی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۱۹۱، ۷۴۱۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۹۵۱، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۲ ص ۲۰۳، مسند احمد ج ۴ ص ۴۲۶، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۱۴۲، ۷۲۹۲، المعجم الکبیر ج ۱۸ رقم الحدیث: ۴۹۶، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ۲، کتاب الاسماء والصفات ج ۱ ص ۳۶۴)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمینوں اور آسمانوں کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے مخلوقات کی تقدیر کو لکھا اور اس کا عرش پانی پر تھا۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۶۵۳، مسند احمد ج ۲ ص ۱۶۹، کتاب الاسماء والصفات ص ۳۷۵۔ ۳۷۴)

چونکہ دنوں کا تحقق افلاک کی حرکت اور سورج کے طلوع اور غروب سے ہوتا ہے اس لیے اس حدیث میں پچاس ہزار سال سے مراد ہے کافی عرصہ پہلے یا پچاس ہزار سال تقدیراً مراد ہیں یعنی اگر اس وقت دن موجود ہوتے تو جتنا عرصہ پچاس ہزار سال گزرنے میں لگتا زمینوں اور آسمانوں کے بنانے سے اتنا عرصہ پہلے اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی تقدیر کو لکھا۔

حضرت ابورزین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اپنی مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے ہمارا رب کہاں تھا؟ آپ نے فرمایا: وہ عماء میں تھا۔ (عماء کے معنی ہیں رقیق بادل۔ یزید بن ہارون نے کہا: یعنی اس کے ساتھ کوئی چیز نہیں تھی) اس کے نیچے ہوا تھی نہ اس کے اوپر ہوا تھی اور اس کا عرش پانی پر تھا۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۰۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸۲، مسند احمد ج ۴ ص ۱۱، سنن الدارمی رقم الحدیث: ۵۵، المعجم الکبیر ج ۱۹ رقم الحدیث: ۴۶۵، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۱۴۱، المستدرک ج ۴ ص ۵۶۰)

اس حدیث میں ما فوقہ ھواء میں ما نافیہ ہے اور اگر یہ ما موصولہ ہو تو اس کا معنی ہے اس بادل کے اوپر اور اس کے نیچے ہوا تھی اور ہوا سے مراد ہے فراغ متوھم یعنی خلا۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ اس بادل کے اوپر اور نیچے کچھ بھی نہ تھا۔

امام ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان سے سوال کیا گیا کہ قرآن مجید میں ہے کہ عرش پانی پر تھا تو پانی کس چیز پر تھا۔ انہوں نے کہا: وہ ہوا کی پشت پر تھا۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۹۰۵، تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۰۶۹۷، تفسیر امام عبدالرزاق رقم الحدیث: ۱۱۸۵، تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۸۷، المستدرک ج ۲ ص ۳۴۱، حافظ سیوطی نے اس حدیث کو امام ابن المنذر، امام ابوالشیخ اور امام بیہقی کے حوالے سے بھی ذکر کیا ہے۔ الدرالمنثور ج ۴ ص ۴۰۲۔ ۴۰۳)

عرش کے پانی کے اوپر ہونے کے متعلق علماء کی آراء و نظریات

علامہ نظام الدین حسن بن محمد نیشاپوری متوفی ۷۲۸ھ لکھتے ہیں: کعب احبار نے کہا اللہ تعالیٰ نے سبز یاقوت پیدا کیا پھر اس

کو نظر ہیبت سے دیکھا تو وہ لرزتا ہوا پانی بن گیا، پھر ہوا کو پیدا کیا اور اس کی پشت پر پانی رکھا، پھر عرش کو پانی پر رکھا۔ ابو بکر اصم نے کہا: اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عرش پانی کے ساتھ ملصق (ملا ہوا) ہے، اس لحاظ سے عرش اب بھی پانی پر ہے۔ زمخشری نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ اس وقت عرش کے نیچے پانی کے سوا اور کوئی مخلوق نہیں تھی اور اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ عرش اور پانی کو آسمانوں اور زمینوں سے پہلے پیدا فرمایا۔

(غرائب القرآن و رغائب الفرقان ج ۴ ص ۸ - ۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۶ھ)

شیخ تقی الدین احمد بن تیمیہ الحرانی متوفی ۷۲۸ھ لکھتے ہیں:

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تھا اور اس سے پہلے کوئی چیز نہ تھی، اور اس کا عرش پانی پر تھا اور اس نے ذکر (لوحِ محفوظ) میں ہر چیز کو لکھ دیا، پھر اس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۱۹۱) یہ حدیث اس وقت آسمانوں اور زمینوں، فرشتوں، انسانوں اور جنوں اور تمام مخلوقات کی نفی کرتی ہے، سوا عرش کے، اس وجہ سے اکثر متقدمین اور متاخرین کا یہ مسلک ہے کہ عرش، قلم اور لوح پر مقدم ہے اور جس حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور اس سے فرمایا: "لکھ!" اس نے پوچھا: میں کیا لکھوں؟ فرمایا: "قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے وہ سب لکھ دو۔" (امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے، رقم الحدیث: ۳۱۰۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸۲، مسند احمد ج ۴ ص ۱۲۱) اس کا معنی یہ ہے کہ قلم کو آسمانوں اور زمینوں سے پہلے پیدا کیا۔

(مجموعۃ الفتاویٰ ج ۲ ص ۱۶۸، مطبوعہ دار الجیل بیروت، ۱۴۱۸ھ)

حافظ ابو العباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی المالکی المتوفی ۶۵۶ھ لکھتے ہیں:

آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا، کعب احبار سے روایت ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے سبز یاقوت کو پیدا کیا، پھر اس کو نظرِ ہیبت سے دیکھا تو وہ پانی ہو گیا، پھر اس نے پانی پر اپنا عرش رکھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس وقت آسمان تھا نہ زمین تھی۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۹، بیروت)

میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ میں اقوالِ مفسرین بہت زیادہ ہیں اور احادیث مرفوعہ متصلہ بہت کم ہیں، ان میں سے ہر چیز ممکن ہے اور حقیقتِ حال کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے، اور جو چیز ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قدیم ہے اس سے پہلے کوئی چیز نہ تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے علمِ ازلی کے مطابق اپنے ارادہ اور اپنی قدرت سے جو چاہا پیدا کیا، اور ہم جانتے ہیں کہ عرش، کرسی، پانی، ہوا یا زمین یا آسمان، ان میں سے کوئی چیز بھی ازل میں نہیں تھی، کیونکہ ان میں سے ہر چیز ممکن ہے اور ہر ممکن حادث ہے اور حوادث کا ازل میں ہونا محال ہے، اور ہم کو یہ معلوم ہے کہ جس طرح تخت اجسام کو اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں اس طرح عرش کا اللہ کو اٹھانا محال ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کا جسم ہونا لازم آئے گا اور الرحمٰن علی العرش استوی (طٰہٰ: ۵) کے محامل واضح ہیں اور اس کی تاویلات صحیحہ ہیں، البتہ شریعت نے کسی تاویل یا کسی محمل کو معین نہیں فرمایا، اس لیے اس میں توقف کرنا چاہیے اور صرف اس پر ایمان رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے۔

(المفہم ج ۶ ص ۶۷۰، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اس کا عرش پانی پر تھا، اللہ تعالیٰ نے یہ اپنی عجیب و غریب قدرت کے اظہار کے لیے فرمایا ہے، کیونکہ کسی عمارت کو بنانے والا اپنی عمارت کو سخت زمین پر پانی سے دُور رکھ کر بناتا ہے، تاکہ اس کی عمارت منہدم نہ ہو جائے

اور اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پانی پر بنایا تاکہ عقل والے اس کی قدرت کے کمال کو جان لیں۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۹۲، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

نیز امام رازی فرماتے ہیں: اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت پر دلالت ہے کیونکہ عرش تمام آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ بڑا ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس کو پانی پر قائم کیا ہے پس اگر اللہ تعالیٰ بغیر کسی ستون کے کسی وزنی چیز کو رکھنے پر قادر نہ ہوتا تو عرش پانی پر نہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ نے پانی کو بھی بغیر کسی سہارے کے قائم کیا، نیز عرش کے پانی پر ہونے کا یہ معنی نہیں ہے کہ عرش پانی کے ساتھ ملتصق اور متصل ہے، یہ اس طرح ہے جیسے کہا جاتا ہے آسمان زمین کے اوپر ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۲۰-۳۱۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

قاضی عبداللہ بن عمر البیضاوی المتوفی ۶۸۵ھ لکھتے ہیں:

عرش اور پانی کے درمیان کوئی حائل نہیں تھا، ایسا نہیں ہے کہ عرش پانی کی پیٹھ پر رکھا ہوا تھا۔

(تفسیر البیضاوی مع عنایت القاضی ج ۵ ص ۱۲۵، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ)

علامہ ابوالسعود محمد بن محمد العمادی الحنفی المتوفی ۹۸۲ھ لکھتے ہیں:

عرش پانی پر تھا اور پانی کے نیچے کوئی اور چیز نہیں تھی خواہ عرش اور پانی کے درمیان کشادگی ہو یا عرش پانی کے اوپر رکھا ہوا ہو جیسا کہ حدیث میں ہے۔ (تفسیر ابوالسعود ج ۳ ص ۲۸۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ پانی سے مراد وہی پانی ہے جو عناصر اربعہ میں سے ایک عنصر ہے اور عرش سے مراد وہی عرش معروف ہے اور عرش کے پانی پر ہونے کا معنی عام ہے، خواہ عرش پانی سے متصل ہو یا منفصل۔

(روح المعانی ج ۷ ص ۱۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

ہمارے نزدیک یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ پانی سے مراد یہی معروف پانی ہے یا اس سے مراد مادے کی مائع حالت ہے جس پر بطور استعارہ پانی کا اطلاق کیا گیا ہے، اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ زمین و آسمان سے پہلے پانی کی تخلیق ہو چکی تھی اور ایک اور آیت سے یہ معلوم ہوا کہ پانی ہی اصل کائنات اور منبع حیات ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (الانبیاء: ۳۰)

کیا کافروں نے یہ نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین (پانی برسانے اور سبزہ اگانے سے) بند تھے تو ہم نے (پانی برسا کر اور سبزہ اگا کر) دونوں کو کھول دیا، اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا، تو کیا وہ ایمان نہیں لاتے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں: اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ اللہ کے ساتھ کوئی چیز نہیں تھی، پانی نہ عرش اور نہ ان کے علاوہ کوئی اور چیز، اور نافع بن زید کی روایت میں ہے: اللہ کا عرش پانی پر تھا، پھر اس نے قلم کو پیدا کیا اور اس سے فرمایا: "لکھ جو کچھ ہونے والا ہے" اور اس نے ذکر (لوح محفوظ) میں ہر چیز کو لکھ دیا۔ امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمینوں اور آسمانوں کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے مخلوقات کی تقدیر کو لکھا اور اس کا عرش پانی پر تھا۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۶۵۳، ترمذی رقم الحدیث: ۲۱۵۶)

علامہ طیبی نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پانی اور عرش اس عالم کا مبدء ہیں کیونکہ ان کو آسمانوں اور زمینوں

سے پہلے پیدا کیا گیا ہے' اور اس وقت عرش کے نیچے صرف پانی تھا' اور امام احمد اور امام ترمذی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا پھر اس سے فرمایا: "لکھ" تو اس نے قیامت تک کی تمام پیدا ہونے والی چیزوں کو لکھ دیا۔ اس حدیث کی توجیہ یہ ہے کہ سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا' پھر اس نے سب کچھ لکھا اور اس کے بعد پانی کو اور پھر عرش کو پیدا کیا' اور جس حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا وہ ثابت نہیں ہے۔

علامہ ابو العلاء الہمدانی نے لکھا ہے کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ پہلے عرش کو پیدا کیا یا پہلے قلم کو' اکثر کے نزدیک پہلے عرش کو پیدا کیا اور امام ابن جریر اور ان کے متبعین نے کہا کہ پہلے قلم کو پیدا کیا۔ امام ابن حازم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پانچ سو سال کی مسافت پر لوح کو پیدا کیا' اللہ تعالیٰ عرش پر تھا پھر اس نے مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے قلم سے فرمایا: "لکھ۔" اس نے پوچھا: "کیا لکھوں؟" فرمایا: قیامت تک مخلوق کے متعلق میرا علم لکھ دو' اور سبحان کی تفسیر میں انہوں نے کہا ہے کہ عرش کو قلم سے پہلے پیدا کیا ہے' اور امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا' اور اس سے فرمایا "لکھ۔" اس نے پوچھا: "میں کیا لکھوں؟" فرمایا: "تقدیر لکھو۔" تو اس نے قیامت تک ہونے والی تمام چیزیں لکھ دیں۔ اور امام سعید بن منصور نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی ابتداء عرش' پانی اور ہوا سے کی اور زمین کو پانی سے پیدا کیا' اور ان مختلف آثار میں جمع اور تطبیق واضح ہے۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۰-۲۸۹' مطبوعہ لاہور' ۱۴۰۱ھ)

علامہ بدر الدین عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ اس پوری بحث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نُور کو پیدا کیا اور ان تمام روایات میں تطبیق اس طرح ہے کہ ہر چیز کی اولیت اضافی ہے اور ہر وہ چیز جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کو سب سے پہلے پیدا کیا گیا ہے' اس کا معنی ہے کہ اس کو اپنی بعد والی چیزوں کے اعتبار سے پہلے پیدا کیا گیا ہے اور ہر چیز کو ذکر میں لکھ دیا' اس کا معنی ہے کل کائنات کی تقدیر کو لوحِ محفوظ میں ثابت کر دیا۔ (عمدۃ القاری ج ۱۵ ص ۱۰۹' مطبوعہ مصر' ۱۳۴۸ھ)

اس کے بعد فرمایا: تاکہ وہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کس کا عمل نیک ہے۔ یعنی یہ آسمان اور زمین عبث پیدا نہیں کیے گئے بلکہ اس سے مقصود انسانوں اور جنات کی آزمائش ہے کہ ان میں سے کون نیک عمل کرتا ہے' نیک عمل سے مراد یہ ہے کہ قرآن اور سُنّت کے مطابق اخلاص سے عمل کیے جائیں۔ فرائض' واجبات اور سنتوں پر عمل کیا جائے اور محرمات اور مکروہات کو ترک کیا جائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک سوئے ہوئے شخص کے پاس سے گزرے' فرمایا: اے سونے والے! اٹھ اور عبادت کر۔ اس نے کہا: اے روح اللہ! میں عبادت کر چکا ہوں۔ حضرت عیسیٰ نے پوچھا: تم نے کیا عبادت کی ہے؟ اس نے کہا: میں نے دنیا کو دنیا والوں کے لیے چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا: تم سو جاؤ' تم عابدین پر فائق ہو! (الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۱۰)

ضحاک نے کہا: اس آیت کا معنی ہے: تاکہ وہ آزمائے کہ تم میں سے کون زیادہ شکر کرنے والا ہے۔ مقاتل نے کہا: تم میں سے کون اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تم میں سے کون اللہ کی زیادہ اطاعت کرنے والا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو تلاوت کرنے کے بعد فرمایا: تم میں سے کون زیادہ اچھی عقل والا ہے اور اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے زیادہ بچنے والا ہے اور اللہ کی اطاعت میں زیادہ جلدی کرنے والا ہے۔ (جامع البیان جز ۱۲ ص ۹' رقم الحدیث: ۱۳۹۰۸) یہ حدیث تمام اقوال کو جامع ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر ہم ایک معین مدت تک ان سے عذاب موخر کر دیں تو وہ ضرور یہ کہیں گے کہ عذاب کو کس چیز نے روک لیا؟ سنو جس دن ان پر وہ عذاب واقع ہو گا تو پھر وہ ان سے دُور نہیں کیا جائے گا اور جس (عذاب) کا وہ مذاق اُڑاتے تھے وہ ان کا احاطہ کر لے گا○ (ھود: ۸)

ربط آیات

اس سے پہلی آیت کے اخیر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اور اگر آپ ان سے کہیں کہ تم یقیناً موت کے بعد اُٹھائے جاؤ گے تو کافر ضرور یہ کہیں گے کہ یہ صرف کھلا ہوا جادو ہے○ اب ان کی خرافات میں سے ایک اور باطل قول کو نقل فرماتا ہے کہ جب ان سے وہ عذاب موخر ہو گیا جس عذاب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ڈرایا تھا تو انہوں نے آپ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا: یہ عذاب کس وجہ سے ہم سے روک لیا گیا! اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس عذاب کا جو وقت معین کیا ہے، جب وہ وقت آ جائے گا تو پھر وہ عذاب آ جائے گا جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔

اس عذاب سے مراد یا تو دنیا کا عذاب ہے یا آخرت کا عذاب ہے، اگر دنیا کا عذاب مراد ہو تو یہ وہ عذاب ہے جو غزوۂ بدر میں ان کو ذلت آمیز شکست کی صورت میں حاصل ہوا تھا اور اگر اس سے آخرت کا عذاب مراد ہے تو وہ قیامت کے بعد ان پر نازل کیا جائے گا۔

قرآنِ مجید اور احادیث میں لفظ "امت" کے اطلاقات

اس آیت میں فرمایا ہے: اگر ہم امت معدودہ تک عذاب کو ان سے موخر کر دیں، اس آیت میں امت کا معنی مدت ہے، لغت عرب میں لفظ امت کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

امت ہر اس جماعت کو کہتے ہیں جو کسی ایک چیز میں مشترک ہو یا کوئی ایک امر ان کا جامع ہو، خواہ وہ امر دینِ واحد ہو یا زمانِ واحد ہو یا مکانِ واحد ہو، خواہ یہ امر جامع اختیار اً ہو یا اضطرار اً ہو، اس کی جمع امم ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ۔ (الانعام: ۳۸)

زمین پر ہر چلنے والا (چوپایہ) اور (فضا میں) اپنے بازوؤں سے اُڑنے والا ہر پرندہ تمہاری ہی مثل جماعتیں ہیں۔

جالا بننے والی مکڑی ہو یا گھن لگانے والا کیڑا ہو یا ذخیرہ اندوزی کرنے والی چیونٹی ہو یا چڑیا اور کبوتر ہوں، ان سب کو اللہ تعالیٰ نے مسخر کر کے اپنی اپنی نوع میں ایک مخصوص وصف کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ (البقرہ: ۲۱۳)

سب لوگ ایک امت تھے۔

یعنی سب لوگ کفر اور گمراہی کے ایک نظریہ پر مجتمع تھے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ (ھود: ۱۱۸)

اور اگر آپ کا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی امت کر دیتا۔

یعنی سب لوگوں کو ایمان میں مجتمع کر دیتا۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ۔ (آل عمران: ۱۰۴)

اور تم میں سے لوگوں کا ایک گروہ ہونا چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے۔

یعنی تم میں سے لوگوں کی ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جو علم اور اعمال صالحہ میں لوگوں کے لیے مقتدا ہو۔

اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ۔ (الزخرف: ۲۲)

ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا۔

یعنی وہ سب ایک دین پر مجتمع تھے۔

وَادَّكَرَ بَعۡدَ اُمَّةٍ۔ (یوسف: ۴۵) اسے ایک مدت کے بعد (یوسف) یاد آیا۔

یعنی جب ایک زمانہ میں مجتمع لوگ یا ایک دین پر مجتمع لوگ گزر گئے۔

اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ۔ (النحل: ۱۲۰) بے شک ابراہیم (اپنی اجتماعی عبادات کے اعتبار سے) ایک امت تھے، اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار۔

یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے میں ایک جماعت کے قائم مقام تھے، جیسے کہتے ہیں فلاں شخص فی نفسہٖ ایک قبیلہ ہے یا فلاں شخص اپنی ذات میں انجمن ہے۔ (المفردات ج ۱ ص ۲۹-۲۸، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

علامہ ابو السعادات المبارک بن محمد ابن الاثیر الجزری المتوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

حدیث میں ہے خمر (انگور کی شراب) سے بچو کیونکہ یہ ام الخبائث ہے۔ (سنن النسائی، الاشربہ: ۴۴) یعنی یہ شراب تمام خبائث اور خرابیوں کی جامع ہے۔ نیز حدیث میں ہے:

اگر کتے تسبیح کرنے والی امت نہ ہوتے تو میں ان کو قتل کرنے کا حکم دیتا۔ (سنن ابو داؤد، الاضاحی: ۲۲، سنن الترمذی، الصید: ۱۶، سنن النسائی، الصید: ۱۰، مسند احمد ج ۴ ص ۸۵) ایک اور حدیث میں ہے:

ہم امی امت ہیں، لکھتے ہیں نہ گنتی کرتے ہیں۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۰۸۰، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۲۳۱۹، مسند احمد ج ۲ ص ۴۳)

آپ کی مراد یہ تھی وہ اسی اصل پر ہیں جس پر اپنی ماں سے پیدا ہوئے تھے، انہوں نے لکھنا اور گنتی کرنا نہیں سیکھا پس وہ اپنی جبلت اولیٰ پر ہیں۔ امی کا ایک معنی ہے جو لکھتا نہ ہو۔ (النہایہ ج ۱ ص ۶۹-۶۸، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۸ھ)

وَلَئِنۡ اَذَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنَّا رَحۡمَةً ثُمَّ نَزَعۡنٰهَا مِنۡهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـئُوۡسٌ

اور اگر ہم اپنے پاس سے انسان کو رحمت (کی لذت) چکھائیں پھر اس سے اس رحمت کو واپس لے لیں (تو) یقیناً وہ ناامید اور

كَفُوۡرٌ ۝۹ وَلَئِنۡ اَذَقۡنٰهُ نَعۡمَآءَ بَعۡدَ ضَرَّآءَ مَسَّتۡهُ لَيَقُوۡلَنَّ

ناشکرا ہوگا ○ اور اگر ہم اس کو مصیبت پہنچنے کے بعد آسائش (کا ذائقہ) چکھائیں تو وہ ضرور (خوشی سے) کہے گا،

ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّىۡ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوۡرٌ ۝۱۰ اِلَّا الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡا وَ

میرے تمام مصائب دور ہوگئے بے شک وہ اترانے والا شیخی خورہ ہے ○ ماسوا ان لوگوں کے جنہوں نے صبر کیا اور

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓـئِكَ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّاَجۡرٌ كَبِيۡرٌ ۝۱۱ فَلَعَلَّكَ

نیک اعمال کیے، ان ہی کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے ○ کیا آپ وحی کے کسی حصہ

تَارِكٌۢ بَعۡضَ مَا يُوۡحٰۤى اِلَيۡكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدۡرُكَ اَنۡ

کو ترک کرنے والے ہیں اور آپ کا دل صرف اس بات سے تنگ ہونے والا ہے کہ وہ (کافر) یہ

يَقُولُوا لَوْلَآ أُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ إِنَّمَآ أَنْتَ

کہیں گے کہ آپ پر کوئی خزانہ کیوں نہ نازل کیا گیا یا آپ کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا؟ آپ تو صرف

نَذِيرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيلٌ ﴿١٢﴾ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرٰىهُ ؕ

ڈرانے والے ہیں! اور اللہ ہر چیز کا نگہبان ہے ○ کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کو از خود گھڑ لیا ہے

قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ

آپ کہیے کہ پھر تم اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں لے آؤ (اور اپنی مدد کے لیے) اللہ کے سوا جس کو

مِّنْ دُونِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ﴿١٣﴾ فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا

بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو ○ پھر اگر وہ (تمہارے چیلنج کو) قبول نہ کریں

لَكُمْ فَاعْلَمُوٓا أَنَّمَآ أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَأَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ

تو یقین رکھو کہ قرآن اللہ ہی کے علم کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، اور اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے تو اے

أَنْتُمْ مُّسْلِمُونَ ﴿١٤﴾ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا

کافرو! کیا تم اسلام لانے والے ہو؟ ○ جو لوگ (صرف) دنیا کی زندگی اور اس کی آسائش کو طلب کرتے ہیں

نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ﴿١٥﴾

تو ہم ان کے کل اعمال کا صلہ یہیں دے دیں گے اور یہاں ان کے صلہ میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی ○

أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں ہے اور انہوں نے دنیا میں جو کام کیے وہ

صَنَعُوا فِيهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾ أَفَمَنْ كَانَ عَلٰى

ضائع ہو گئے اور جو کچھ وہ کرتے تھے وہ برباد ہے ○ کیا جو شخص اللہ کی طرف سے

بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ

دلیل پر ہو اور اس کے پاس اللہ کی طرف سے گواہ (بھی) ہو اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب جو رہنما اور رحمت ہے (وہ بھی)

مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ

گواہ ہو) (وہ ان منکروں کے برابر ہو سکتا ہے؟) یہی لوگ ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور تمام فرقوں میں سے جس

بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِىْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ

نے (بھی) اس کے ساتھ کفر کیا اس کی وعید کی جگہ دوزخ ہے، (سو اے مخاطب) تم اس کے متعلق شک میں نہ پڑنا

اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾

بے شک وہ تمہارے رب کی طرف سے حق ہے، لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر ہم اپنے پاس سے انسان کو رحمت (کی لذت) چکھائیں پھر اس سے اس رحمت کو واپس لے لیں (تو) یقیناً وہ ناامید اور ناشکرا ہو گا○ اور اگر ہم اس کو مصیبت پہنچنے کے بعد آسائش (کا ذائقہ) چکھائیں تو وہ ضرور (خوشی سے) کہے گا، میرے تمام مصائب دور ہو گئے، بے شک وہ اترانے والا شیخی خورہ ہے○ ماسوا ان لوگوں کے جنہوں نے صبر کیا اور نیک اعمال کیے، ان ہی کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے○ (ھود: ۱۱-۹)

مصیبت میں کفار کا مایوس ہونا اور راحت میں ناشکری کرنا

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ کفار کو عذاب ضرور ہو گا خواہ تاخیر سے ہو، اور ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے وہ سبب بتایا جس سے ان کو عذاب ہو گا اور یہ کہ اس سبب کی وجہ سے وہ عذاب کے مستحق ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اس آیت میں الانسان سے مراد مطلق انسان ہے پھر آیت: ۱۱ میں اس سے نیک اور صبر کرنے والے مسلمانوں کا استثناء فرمایا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے:

وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِىْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ (العصر: ۳-۱)

زمانہ کی قسم○ بے شک انسان ضرور نقصان میں ہے○ ماسوا ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے۔

اور اس کی نظیر یہ آیت بھی ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۙ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۙ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ○ (المعارج: ۲۳-۱۹)

بے شک انسان بے صبرا پیدا ہوا ہے○ جب اسے کوئی مصیبت پہنچے تو گھبرا جاتا ہے○ اور جب اسے کوئی فائدہ پہنچے تو اس کو روکنے والا ہوتا ہے○ ماسوا نمازیوں کے○ جو اپنی نمازوں پر مداومت کرتے ہیں○

اور دوسرا قول یہ ہے کہ الانسان میں الف لام عہد کا ہے اور اس انسان سے کافر انسان مراد ہے اور اس کی نظیر یہ آیت ہے:

وَلَا تَايْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ (یوسف: ۸۷)

اور اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو، کیونکہ اللہ کی رحمت سے صرف کافر مایوس ہوتے ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آیت تمام کافروں کے متعلق نازل ہوئی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آیت کسی خاص کافر کے

متعلق نازل ہوئی ہو۔ علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ یہ آیت ولید بن مغیرہ کے متعلق نازل ہوئی ہے' اور ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن ابی امیہ مخزومی کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن ص ۱۱ مطبوعہ بیروت)

خلاصہ یہ ہے کہ مصیبت میں اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا اور راحت میں ناشکرا ہونا کفار کا شیوہ ہے۔

مومن کے لیے مصیبت اور راحت دونوں کا خیر ہونا

اس کے بعد فرمایا: ماسوا ان لوگوں کے جنہوں نے صبر کیا اور نیک اعمال کیے ان ہی کے لیے بڑا اجر ہے' حدیث میں ہے:

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان کے حال پر تعجب ہوتا ہے' اس کے ہر حال میں خیر ہے اور یہ مومن کے سوا اور کسی کا وصف نہیں ہے' اگر اس کو راحت پہنچے تو شکر کرتا ہے اور وہ اس کے لیے خیر ہے اور اگر اس کو مصیبت پہنچے تو صبر کرتا ہے' اور وہ (بھی) اس کے لیے خیر ہے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۹۹۹' مشکوۃ رقم الحدیث: ۵۲۹۷' الترغیب والترہیب ج ۴ ص ۲۷۸' کنز العمال رقم الحدیث: ۱۷۰)

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان کو کانٹا یا اس سے کم کوئی چیز چبھے تو اللہ تعالیٰ اس کے سبب سے اس کا ایک درجہ بلند کر دیتا ہے اور اس کا ایک گناہ مٹا دیتا ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۹۶۵' مسند احمد ج ۶ ص ۴۲' سنن کبریٰ ج ۳ ص ۳۷۳' موطا امام مالک رقم الحدیث: ۱۷۷۵' مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۲۰۳۱۲' صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۲۹۲۵)

حضرت ابوسعید اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مومن کو جو بھی درد ہو یا تھکاوٹ ہو یا بیماری ہو' یا غم ہو یا فکر اور پریشانی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۶۴۲' صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۵۷۳' سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۳۸)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بڑی مصیبت کا بڑا اجر ہوتا ہے' اور اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو ان کو کسی مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے' جو اس سے راضی ہو تو اللہ اس سے راضی ہوتا ہے اور جو اس سے ناراض ہو تو اللہ اس سے ناراض ہوتا ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۹۶' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۳۱' المستدرک ج ۴ ص ۶۰۸' شرح السنہ رقم الحدیث: ۱۴۳۵)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مومن اور مومنہ پر اس کی جان میں' اس کی اولاد میں اور اس کے مال میں مصائب نازل ہوتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ اس حال میں اللہ سے ملاقات کرتے ہیں کہ ان کے اوپر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۹۹' مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۲۳۱' مسند احمد ج ۲ ص ۲۸۷' صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۲۹۱۳)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن جب مصائب میں مبتلا ہونے والوں کو ثواب دیا جائے گا تو آرام اور آسائش میں رہنے والے یہ کہیں گے کہ کاش دنیا میں ان کی کھالوں کو قینچیوں سے کاٹ دیا جاتا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۴۰۲' المعجم الصغیر رقم الحدیث: ۲۴۱' سنن کبریٰ ج ۳ ص ۳۷۵)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا آپ وحی کے کسی حصہ کو ترک کرنے والے ہیں اور آپ کا دل صرف اس بات سے تنگ ہونے والا ہے کہ وہ (کافر) یہ کہیں گے کہ آپ پر کوئی خزانہ کیوں نہ نازل کیا گیا یا آپ کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا؟ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور اللہ ہر چیز کا نگہبان ہے○ (ھود: ۱۲)

کیا کفار کے طعن و تشنیع کے خوف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی کی تبلیغ میں کمی کرنے والے تھے؟

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کے مزید کفریہ اقوال نقل فرمائے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ ان کے ان کفریہ اقوال سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دل تنگ ہوتا تھا اور آپ کو رنج ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ نے آپ کی دل جوئی کی، آپ کو تسلی دی اور آپ کو اپنے الطاف و عنایات اور اپنے افضال اور اکرام سے نوازا۔

قاضی شہاب الدین احمد بن محمد بن عمر خفاجی متوفی ۱۰۶۸ھ لکھتے ہیں:

اس آیت کو لفظ لعلّ سے شروع فرمایا ہے اور لعلّ کلام عرب میں توقع کے لیے آتا ہے، اور اس آیت کا ظاہر معنی یہ ہے کہ کفار جو آپ پر اعتراض کرتے ہیں کہ آپ پر کوئی خزانہ کیوں نہ نازل کیا گیا یا آپ کی تصدیق کے لیے آپ کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ نازل ہوا، اس سے یہ توقع ہے کہ آپ وحی کے اس حصہ کو بیان کرنا ترک کر دیں گے جس میں کفار کے بتوں کی مذمت کی گئی ہے حالانکہ قرآن مجید کے کچھ حصہ کو بیان نہ کرنا خیانت اور کفر ہے اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت کے اعتبار سے ممکن نہیں ہے، اور جس طرح باقی انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں اور ان سے یہ متصور نہیں ہے کہ وہ تقیہ کر کے وحی کے بعض حصہ کو چھپالیں اور پوری تبلیغ نہ کریں اسی طرح آپ بھی معصوم ہیں بلکہ سید المعصومین ہیں، آپ سے بطریق اولیٰ یہ متصور نہیں ہے پھر آپ سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ آپ اپنا دل تنگ ہونے کی وجہ سے وحی کا کچھ حصہ چھپالیں گے! اس اعتراض کے حسب ذیل جوابات ہیں:

(۱) لعلّ کے لفظ سے جو بات کہی جاتی ہے کبھی اس بات کی متکلم کو توقع ہوتی ہے، کبھی مخاطب کو توقع ہوتی ہے اور کبھی ان کے علاوہ کسی اور کو توقع ہوتی ہے اور اس آیت میں یہی آخری صورت مراد ہے یعنی کفار مکہ کو یہ توقع تھی کہ ہرچند کہ آپ قرآن مجید کی تبلیغ کرنے میں اور پوری پوری وحی پہنچانے میں انتہائی کوشش فرمارہے ہیں، لیکن ان کے طعن و تشنیع اور دل آزار باتوں سے تنگ ہو کر آپ وحی کے کچھ حصہ کو بیان نہیں کریں گے۔

(۲) کلام عرب میں لعلّ کا لفظ توقع کے لیے بھی آتا ہے اور تبعید کے لیے بھی آتا ہے اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ کفار کی ان دل آزار باتوں سے ہرچند کہ آپ کا دل تنگ ہوتا ہے لیکن آپ اس وجہ سے وحی کی تبلیغ میں کمی نہ کریں۔

(۳) علامہ سمین وغیرہ نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت استفہام انکاری پر محمول ہے اور معنی یہ ہے کہ کیا آپ ان کی دل آزار باتوں سے تنگ ہو کر وحی کے بعض حصہ کی تبلیغ کو ترک کر دیں گے؟ یعنی آپ ایسا نہیں کریں گے، اس کی نظیر حدیث میں ہے:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری کو بلوایا، سو وہ اس حال میں آیا کہ اس کے سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لعلنا اعجلناک (کیا ہم نے تم کو عجلت میں ڈال دیا؟) اس نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا: جب تم عجلت میں ہو تو تم پر وضو کرنا لازم ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۱۸۰، صحیح مسلم رقم الحدیث:۳۴۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۶۰۶)

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمایا ہے کہ کفار آپ کی نبوت میں طعن و تشنیع کرتے ہیں اور اس سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے تو کیا آپ اس وجہ سے بعض وحی کو بیان کرنا ترک کر دیں گے؟ یعنی آپ ایسا نہیں کریں گے تو پھر آپ ان کی باتوں کی پرواہ نہ کریں اور بلا خوف و خطر اور بے دھڑک تبلیغ کرتے رہیں۔

(عنایت القاضی ج ۵ ص ۱۳۳، ملخصاً وموضحاً، بیروت ۱۴۱۷ھ، روح المعانی ج ۷ ص ۲۸-۲۷، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

(۴) امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی اور تنزیل میں خیانت کریں اور وحی کی بعض چیزوں کو ترک کر دیں، کیونکہ اس طرح پوری شریعت مشکوک ہو جائے گی اور نبوت میں طعن لازم آئے گا کیونکہ رسالت کا معنی ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام بندوں تک پہنچا دیئے جائیں۔ اس لیے اس آیت کا ظاہر معنی مراد نہیں ہے بلکہ اس آیت سے اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ دو خرابیوں میں سے ایک خرابی ضرور لازم آئے گی، اگر آپ پوری پوری وحی کی تبلیغ کریں تو کفار کی طعن تشنیع اور ان کے مذاق اڑانے کا خدشہ ہے اور اگر آپ بتوں کی مذمت والی آیتوں کو نہ بیان کریں تو کفار تو آپ کا مذاق نہیں اڑائیں گے لیکن وحی میں خیانت لازم آئے گی اور جب دو خرابیوں میں سے کوئی ایک خرابی ضرور لازم ہو تو بڑی خرابی کو ترک کر کے چھوٹی خرابی کو برداشت کر لینا چاہیے اور بڑی خرابی وحی میں خیانت ہے سو آپ اس خرابی کو ترک کر دیں اور کفار کے طعن اور تشنیع کی خرابی کو برداشت کر لیں۔

اور اس آیت میں لعلک کا جو لفظ ہے اس سے مراد تبعید ہے یعنی آپ کفار کے طعن و تشنیع کی وجہ سے وحی کے بعض حصہ کو ترک نہ کریں، ہر چند کہ آپ سے وحی کے کسی حصہ کی تبلیغ کو ترک کرنا ممکن نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے تاکید کے طور پر اس طرح فرمایا۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۲۴-۳۲۳، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ ملخصاً موضحاً)

اس آیت کی تفسیر کرنا بہت نازک مقام ہے، بہت سے مفسرین اس مقام پر پھسل گئے اور انہوں نے اس آیت کی تفسیر اس طرح کی کہ احترام نبوت ان کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔

شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

آپ ان بے ہودہ شبہات اور فرمائشوں سے سخت مغموم اور دل گیر ہوتے تھے، ممکن ہے کہ کبھی ایسا خیال بھی دل میں گزرتا ہو کہ ان کے معبودوں کے معاملہ میں اگر خدا کی جانب سے اس قدر سختی اختیار کرنے کا حکم نہ رہے، تردید کی جائے مگر فی الحال قدرے نرمی اور رواداری کے ساتھ تو شاید زیادہ موثر اور مفید ہو یا جو فرمائشیں یہ لوگ کرتے ہیں، ان کی یہ ضد بھی پوری کر دی جائے تو کیا عجب ہے مسلمان ہو جائیں۔ (حاشیہ عثمانی بر ترجمہ محمود الحسن ص ۲۹۴، مطبوعہ سعودیہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چاہنا اللہ تعالیٰ کے چاہنے کے تابع تھا اور اللہ تعالیٰ کی منشاء اور اس کی وحی کے خلاف آپ کے دل میں کبھی کوئی خیال نہیں آ سکتا تھا، اس لیے ہمارے نزدیک یہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔

(۵) اس اعتراض کا ایک اور جواب یہ ہے کہ یہ آیت باب تنزل سے ہے، یعنی ایک شخص میں کوئی وصف نہ ہو لیکن حال اور مقام کے اعتبار سے یہ وہم کیا جاتا ہو کہ اس شخص میں وہ وصف ہے تو اس شخص کو باوجود اس وصف کے نہ ہونے کے اس شخص کے منزلہ میں نازل کر کے کلام کیا جائے جس شخص میں وہ وصف ہو، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے کسی حصہ کی تبلیغ کو ترک نہیں کیا تھا لیکن اگر آپ کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو تنگ دلی اور دل آزاری سے بچنے کے لیے ان آیتوں کی تبلیغ کو ترک کر دیتا جن کی وجہ سے کفار طعن اور تشنیع کرتے تھے اس لیے آپ کو اس شخص کے منزلہ میں نازل کر کے فرمایا: شاید آپ وحی کے کسی حصہ کو ترک کرنے والے ہیں۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے:

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِىْ فِى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ○ (هود: ۳۷)	اور آپ ہماری وحی کے مطابق ہماری نگرانی میں کشتی بنائیے اور ظالموں کے متعلق ہم سے کچھ نہ کہیں وہ ضرور غرق کیے جائیں گے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے ظالم کافروں کی سفارش نہیں کی تھی لیکن اس مقام پر ان کی سفارش کرنے کا وہم ہو سکتا تھا،

اس لیے باوجود سفارش نہ کرنے کے ان کو اس شخص کے مرتبہ میں نازل کر کے خطاب کیا گیا جو ان کی سفارش کرتا، سو یہ بھی باب تنزیل سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کو از خود گھڑ لیا ہے، آپ کہئے کہ پھر تم اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں لے آؤ اور (اپنی مدد کے لیے) اللہ کے سوا جس کو بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو○ (ھود: ۱۳)

قرآن مجید کا معجز ہونا

مشرکین نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی نبوت پر معجزہ طلب کرتے تھے، آپ کو بتایا گیا کہ آپ یہ کہیں کہ میری نبوت پر معجزہ یہ قرآن مجید ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قرآن مجید کے ساتھ چیلنج کیا کہ اگر یہ کسی انسان کا بنایا ہوا کلام ہے تو تم بھی اس جیسا کلام بنا کر لے آؤ لیکن مخالفین کی کثرت اور علوم و فنون اور زبان و بیان کی روز افزوں ترقی کے باوجود کوئی شخص قرآن مجید کی مثل کلام بنا کر نہیں لا سکا، قرآن مجید نے کئی طرح سے یہ چیلنج پیش کیا ہے:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۔

آپ کہئے اگر تمام انسان اور جن مل کر اس قرآن کی مثل لانا چاہیں تو وہ اس کی مثل نہیں لا سکتے، خواہ وہ ایک دوسرے کی مدد (بھی) کریں۔

(بنواسرائیل: ۸۸)

اور زیر تفسیر آیت میں دس سورتوں کی مثل لانے کا چیلنج دیا گیا ہے، اور البقرہ: ۲۳ اور یونس: ۳۹ میں کسی ایک سورت کی مثل لانے کا چیلنج دیا ہے اور آخری چیلنج یہ دیا ہے:

فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ۔

اس جیسی ایک بات ہی بنا کر پیش کر دو اگر تم سچے ہو۔

(الطور: ۳۴)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر اگر وہ (تمہارے چیلنج کو) قبول نہ کریں تو یقین رکھو کہ قرآن اللہ ہی کے علم کے ساتھ نازل کیا گیا ہے اور اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، تو (اے کافرو!) کیا تم اسلام لانے والے ہو؟○ (ھود: ۱۴)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے محمد! (صلی اللہ علیک وسلم) ان مشرکین سے کہہ دیجئے اگر قرآن مجید کی دس سورتوں کی مثل لانے میں تمہارے خود ساختہ معبود تمہاری مدد نہ کر سکیں اور تم خود بھی اس کی مثل دس سورتیں نہ لا سکو تو یہ جان لو اور یقین رکھو کہ یہ قرآن آسمان سے (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کے اذن کے ساتھ نازل ہوا ہے اور (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنی طرف سے بنا کر ہم پر افتراء نہیں کیا اور یہ بھی یقین رکھو کہ مخلوق کی عبادت کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور وہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے سو اے مشرکو! تم بت پرستی کو ترک کر دو اور خدائے واحد کی عبادت کرو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو لوگ (صرف) دنیا کی زندگی اور اس کی آسائش کو طلب کرتے ہیں تو ہم ان کے کل اعمال کا صلہ یہیں دے دیں گے اور یہاں ان کے صلہ میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی○ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں ہے، اور انہوں نے دنیا میں جو کام کیے وہ ضائع ہو گئے اور جو کچھ وہ کرتے تھے وہ برباد ہے○ (ھود: ۱۶-۱۵)

ریاکاری کی مذمت اور اس پر وعید

اس مضمون کی قرآن مجید میں اور بھی آیات ہیں:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا○ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا○ (بنی اسرائیل: ۱۹-۱۸)

جو لوگ صرف دنیا کے خواہش مند ہیں، ہم ان کو اس دنیا سے جتنا ہم چاہیں اس دنیا میں دے دیتے ہیں، پھر ہم نے ان کے لیے دوزخ کو ٹھکانا بنا دیا ہے وہ اس دوزخ میں مذمت کیا ہوا اور دھتکارا ہوا داخل ہوگا○ اور جو شخص مومن ہو اور وہ آخرت کا ارادہ کرے اور اسی کے لیے کوشش کرے تو ان ہی لوگوں کی کوشش مقبول ہوگی○

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ- (الشوریٰ: ۲۰)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا ارادہ کرے، ہم اس کے لیے اس کی کھیتی کو زیادہ کریں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا ارادہ کرے ہم اس کو اس میں سے دیں گے اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

امام عبدالرحمٰن بن علی بن محمد جوزی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

اس آیت کے متعلق چار قول ہیں:

(۱) اکثر علماء کا یہ قول ہے کہ اس آیت کا حکم تمام مخلوق کے لیے عام ہے۔

(۲) ابوصالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ اہل قبلہ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

(۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ یہود اور نصاریٰ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

(۴) مجاہد نے یہ کہا کہ یہ ریاکاروں کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

(زادالمسیر ج ۴ ص ۸۴-۸۳، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

انسان جس کام کو جس نیت سے کرے گا اسی نیت کے اعتبار سے اس کو صلہ دیا جائے گا، اگر اللہ عزوجل کی رضا کے لیے کوئی عمل کرے گا تو آخرت میں اس پر اجر ملے گا اور اگر لوگوں کو دکھانے اور سنانے کے لیے عمل کرے گا تو وہ عمل اس کے لیے باعث وبال ہوگا۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعمال کا مدار نیت پر ہے، ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق ثمر ملتا ہے، سو جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہو تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ہی کی طرف شمار ہوگی، اور جس شخص کی ہجرت دنیا حاصل کرنے کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہو تو اس کی ہجرت اسی چیز کی طرف شمار کی جائے گی جس کی طرف اس نے ہجرت کی ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱، ۵۴، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۹۰۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۲۰۱، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۶۴۷، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۷۹۴، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۲۲۷، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۴۷۳۶، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۹۵۶۷، مسند احمد ج ۴ ص ۳۹۲، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ۱۶۸-۱۶۷، شرح السنہ رقم الحدیث: ۲۰۶)

سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس لوگوں کا ہجوم تھا، جب لوگ ان سے چھٹ گئے تو اہل شام میں سے ناتل نامی ایک شخص نے کہا: اے شیخ! آپ مجھے وہ حدیث سنائیے جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو۔ آپ نے فرمایا: ہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے: قیامت کے دن سب سے پہلے جس شخص کے

متعلق فیصلہ کیا جائے گا وہ شہید ہوگا' اس کو بلایا جائے گا اور اسے اس کی نعمتیں دکھائی جائیں گی' جب وہ ان نعمتوں کو پہچان لے گا تو (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا: تو نے ان نعمتوں سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا: میں نے تیری راہ میں جہاد کیا حتیٰ کہ شہید ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹ بولتا ہے' بلکہ تو نے اس لیے قتال کیا تھا تاکہ تو بہادر کہلائے سو تجھے بہادر کہا گیا' پھر اس کو منہ کے بل جہنم میں ڈالنے کا حکم دیا جائے گا' حتیٰ کہ اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اور ایک شخص نے علم حاصل کیا اور لوگوں کو تعلیم دی اور قرآن مجید پڑھا' اس کو بلایا جائے گا اور اس کو اس کی نعمتیں دکھائی جائیں گی' جب وہ ان نعمتوں کو پہچان لے گا تو (اللہ تعالیٰ) اس سے فرمائے گا: تو نے ان نعمتوں سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا: میں نے علم حاصل کیا اور اس علم کو سکھلایا اور تیرے لیے قرآن مجید پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹ بولتا ہے' تو نے اس لیے علم حاصل کیا تھا تاکہ تو عالم کہلائے اور تو نے قرآن پڑھا تاکہ تو قاری کہلائے سو تجھے (عالم اور قاری) کہا گیا' پھر اس کو منہ کے بل جہنم میں ڈالنے کا حکم دیا جائے گا' حتیٰ کہ اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اور ایک شخص پر اللہ نے وسعت کی اور اس کو ہر قسم کا مال عطا کیا' اس کو قیامت کے دن بلایا جائے گا اور وہ نعمتیں دکھائی جائیں گی اور جب وہ ان نعمتوں کو پہچان لے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے ان نعمتوں سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا: میں نے ہر اس راستہ میں خرچ کیا جس راستہ میں مال خرچ کرنا تجھ کو پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹ بولتا ہے' تو نے یہ کام اس لیے کیے تاکہ تجھ کو سخی کہا جائے سو تجھ کو سخی کہا گیا' پھر اس کو منہ کے بل جہنم میں ڈالنے کا حکم دیا جائے گا' اور پھر اس کو آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۹۰۵' سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۸۲' سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۱۳۷' صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۴۰۸' شرح السنہ رقم الحدیث: ۴۱۴۳' مسند احمد ج ۲ ص ۳۲۱' سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ۱۶۸)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا جو شخص اللہ کی طرف سے دلیل پر ہو اور اس کے پاس اللہ کی طرف سے گواہ (بھی) ہو اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب جو رہ نما اور رحمت ہے (وہ بھی گواہ ہو) (وہ ان منکروں کے برابر ہو سکتا ہے؟) یہی لوگ ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہیں' اور تمام فرقوں میں سے جس نے (بھی) اس کے ساتھ کفر کیا' اس کی وعید کی جگہ دوزخ ہے (سوائے مخاطب) تم اس کے متعلق شک میں نہ پڑنا بے شک وہ تمہارے رب کی طرف سے حق ہے' لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے ○ (ھود: ۱۷)

تمام اہلِ ملل پر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا وجوب

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی طرف سے دلیل پر ہو اور اس کے پاس اللہ کی طرف سے گواہ بھی ہو یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا مومنین اہل کتاب' کیا یہ لوگ ان لوگوں کی طرح ہو سکتے ہیں جو دنیا کی زندگی اور اس کی آسائش کو طلب کرتے ہیں؟ علامہ قرطبی نے کہا ہے کہ شاہد سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک ہے کیونکہ جس شخص میں ذرا بھی عقل ہو جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رخ انور کی طرف دیکھے گا تو فوراً یقین کر لے گا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ بینہ (دلیل) سے مراد اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے جس سے دل روشن ہیں اور شاھد سے مراد عقل اور فطرت سلیمہ ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پس اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں جیسے جانور سے ایک مکمل جانور پیدا ہوتا ہے' کیا تم اس میں کوئی نقص دیکھتے ہو۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۳۸۵' صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۶۵۹)

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت موسیٰ کی کتاب یعنی تورات نازل ہوئی تھی جو رہ نما اور رحمت ہے' اور جو لوگ اس نبی (سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان رکھتے ہیں وہ لوگ ان لوگوں کی طرح نہیں ہو سکتے جو دنیا کی زندگی اور اس کی آسائش کو طلب کرتے ہیں- اور فرمایا: اور تمام فرقوں میں سے جس نے (بھی) اس نبی کے ساتھ کفر کیا اس کی سزا دوزخ ہے-

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے' اس امت میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جو میری نبوت (کی خبر) سنے خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی' پھر وہ شخص اس حال میں مرے کہ وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان نہ لایا ہو تو وہ شخص دوزخی ہی ہو گا-

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۵۳' مسند احمد ج ۲ ص ۳۱۷' حلیۃ الاولیاء ج ۴ ص ۳۰۸' مسند ابو عوانہ ج ۱ ص ۱۰۴)

قرآن مجید کی اس آیت اور اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تمام دین داروں پر واجب ہے کہ وہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لائیں' یہود اور نصاریٰ کا خصوصیت سے اس حدیث میں اس لیے ذکر فرمایا ہے کہ وہ اہل کتاب ہیں اور جب اہل کتاب پر یہ واجب ہے کہ وہ آپ کی رسالت پر ایمان لائیں تو دوسروں پر بطریق اولیٰ واجب ہے کہ وہ آپ کی رسالت پر ایمان لائیں-

غیر متمدن دنیا میں رہنے والوں کے لیے توحید پر ایمان لانا ضروری ہے نہ کہ رسالت پر

قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ جو شخص زمین کے دور دراز علاقوں میں رہتا ہو یا سمندر کے جزیروں میں رہتا ہو جو آباد دنیا سے منقطع ہوں' اور اس کو اسلام کی دعوت نہ پہنچی ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور اور آپ کی بعثت کی خبر نہ پہنچی ہو تو اگر وہ آپ پر ایمان نہ لائے تو اس سے گرفت نہیں ہوگی کیونکہ آپ نے فرمایا ہے: جس نے میری نبوت کی خبر سنی اور مجھ پر ایمان لائے بغیر مر گیا تو وہ دوزخی ہو گا' لہٰذا آپ کی معرفت اور آپ پر ایمان لانا اس پر موقوف ہے کہ کوئی شخص آپ کے معجزہ کا مشاہدہ کرے اور آپ کے ایامِ حیات میں آپ کے صدق کو جانے اور جس نے مشاہدہ نہیں کیا اس تک آپ کے دعویٰ نبوت کی خبر پہنچی ہو' اس کے برخلاف اللہ پر ایمان اور اس کی توحید کو ماننا ہر شخص پر ضروری ہے خواہ متمدن دنیا میں نہ ہو اور غیر آباد علاقوں میں رہتا ہو' کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر انسان کو عقل عطا کی ہے اور غور فکر کر کے ہر شخص اللہ کی ذات اور اس کی توحید کی معرفت حاصل کر سکتا ہے- (اکمال المعلم بفوائد مسلم ج ۱ ص ۴۶۸' مطبوعہ دار الوفاء ۱۴۱۹ھ)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹا بہتان تراشے' یہ لوگ اپنے رب کے سامنے پیش

عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى

کیے جائیں گے اور تمام گواہ یہ کہیں گے یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا

رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ

تھا' سنو ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو ○ جو لوگ اللہ کی راہ سے

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾

روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں اور وہ آخرت کا کفر کرنے والے ہیں ○

اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ

یہ لوگ زمین میں (اللہ کو) عاجز کرنے والے نہ تھے، اور نہ اللہ کے سوا

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا

وقف لازم

ان کا کوئی مددگار تھا، ان کے لیے عذاب کو دگنا کیا جائے گا یہ (شدت کفر کی وجہ سے حق کو)

يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور نہ یہ (بغض کی وجہ سے حق کو) دیکھتے تھے ○ یہی وہ لوگ ہیں

خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَا جَرَمَ

جنہوں نے اپنے آپ کو خسارہ میں ڈال دیا اور جو کچھ یہ افترا کرتے تھے وہ ان سے جاتا رہا ○ بلاشبہ

اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

یقیناً یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہیں ○ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے

الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ

نیک عمل کیے اور انہوں نے اپنے رب کی طرف عاجزی کی وہ لوگ جنتی ہیں اور وہ

فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَ

اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ○ ان دونوں فریقوں (یعنی کافر اور مومن) کی مثال ایسے ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو

الْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ ع

ع ۲ ۱۶

اور دوسرا دیکھنے والا سننے والا ہو، کیا یہ دونوں مثال میں برابر ہیں؟ پس کیا تم نصیحت قبول نہیں کرتے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹا بہتان تراشے، یہ لوگ اپنے رب کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور تمام گواہ یہ کہیں گے یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا، سنو ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو○ جو لوگ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں اور وہ آخرت کا کفر کرنے والے ہیں○ (ھود: ۱۹-۱۸)

روز قیامت کفار کے خلاف گواہی دینے والوں کے مصادیق

کافروں میں متعدد بدعقیدگیاں اور بداعمالیاں تھیں، وہ دنیا اور اس کے عیش اور زیبائش پر بہت حریص تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ہود: ۱۵ میں رد فرمایا اور وہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے معجزات کے منکر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ہود: ۱۳ میں رد فرمایا، اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ بت اللہ تعالیٰ کے حضور ان کی شفاعت کریں گے سو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بدعقیدگی کا رد فرمایا۔

اس آیت میں فرمایا ہے: یہ لوگ اپنے رب کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو مکان اور جگہ سے پاک ہے، پھر یہ کفار اللہ تعالیٰ کے سامنے کیسے پیش ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو مقامات حساب اور سوال کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں ان کفار کو وہاں پیش کیا جائے گا، دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو نبیوں، فرشتوں اور مومنوں میں سے جن کے سامنے چاہے گا پیش فرمائے گا۔ نیز اس آیت میں فرمایا ہے: تمام گواہ یہ کہیں گے یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا۔

مجاہد، قتادہ، ابن جریج اور اعمش سے روایت ہے کہ ان گواہوں سے مراد فرشتے (کراماً کاتبین) ہیں۔
(جامع البیان جز ۱۲ ص ۲۹-۲۸)

ضحاک نے کہا: اس سے مراد انبیاء اور رسول ہیں۔ (جامع البیان جز ۱۲ ص ۲۹) اس کی تائید قرآن مجید کی اس آیت سے ہے:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا۔ (النساء: ۴۱)

پس اس وقت کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور ہم آپ کو ان سب پر گواہ (بنا کر) لائیں گے۔

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے مومنین بھی گواہی دیں گے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (البقرہ: ۱۴۳)

(اور اے مسلمانو!) اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور یہ رسول تمہارے حق میں گواہ ہو جائیں۔

کفار کے خود اپنے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے، قرآن مجید میں ہے:

يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (النور: ۲۴)

جس دن ان کی زبانیں، اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے اعمال کی ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

اور اس آیت میں فرمایا ہے: وہ گواہ یہ کہیں گے یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رہے کفار اور منافقین تو تمام لوگوں کے سامنے یہ اعلان کیا جائے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۷۶۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸۳، ۴۳۰۰، مسند احمد ج ۲ ص ۷۴)

اور فرمایا: جو لوگ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں یعنی لوگوں کو حق کی اتباع کرنے اور ہدایت کے راستہ پر چلنے سے روکتے ہیں، مسلمانوں کے دلوں میں دین اسلام کے خلاف شکوک اور شبہات پیدا کرتے ہیں اور

مختلف حیلوں اور ہتھکنڈوں سے ان کو اسلام سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کی سازشوں میں مشغول رہتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لایعنی اور بے ہودہ اعتراضات کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہ لوگ زمین میں (اللہ کو) عاجز کرنے والے نہ تھے، اور نہ اللہ کے سوا کوئی ان کا مددگار تھا، ان کے لیے عذاب کو دگنا کیا جائے گا یہ (شدت کفر کی وجہ سے حق کو) سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، اور نہ یہ (بغض کی وجہ سے حق کو) دیکھتے تھے○ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارہ میں ڈال دیا اور جو کچھ یہ افتراء کرتے تھے وہ ان سے جاتا رہا○ بلاشبہ یقیناً یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہیں○ (ھود: ۲۲-۲۱-۲۰)

کفار مکہ کی چودہ وجوہ سے مذمت

اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی دو آیتوں میں کفار مکہ کی سات وجوہ سے مذمت فرمائی تھی:

(۱) وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان تراشتے تھے: اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان تراشے۔

(۲) وہ ذلت اور رسوائی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیے جائیں گے، فرمایا: اور یہ لوگ اپنے رب کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔

(۳) تمام گواہ ان کے خلاف گواہی دیں گے کہ انہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا، فرمایا: اور تمام گواہ یہ کہیں گے کہ انہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا۔

(۴) وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ملعون ہیں، فرمایا: سنو! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔

(۵) وہ اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں، فرمایا: جو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں۔

(۶) وہ اسلام کے خلاف شکوک اور شبہات ڈالتے ہیں، فرمایا: اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں۔

(۷) وہ آخرت کے منکر ہیں، فرمایا: وہ آخرت کا کفر کرنے والے ہیں۔

اور ان آیتوں میں ان کی مزید سات وجوہ سے مذمت فرمائی ہے:

(۱) وہ اللہ کے عذاب سے بھاگ نہیں سکتے، فرمایا: یہ لوگ زمین میں (اللہ کو) عاجز کرنے والے نہ تھے۔

(۲) اللہ کے عذاب سے بچانے کے لیے ان کا کوئی مددگار نہیں، فرمایا: اور نہ اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار تھا۔

(۳) ان کا عذاب دگنا کیا جائے گا، فرمایا: ان کے لیے عذاب کو دگنا کیا جائے گا۔

(۴) ان میں حق کو سننے کی طاقت ہے نہ دیکھنے کی، فرمایا: یہ (شدت کفر کی وجہ سے حق کو) سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور نہ یہ (بغض کی وجہ سے حق کو) دیکھتے تھے۔

(۵) انہوں نے اللہ کی عبادت کے بدلہ میں بتوں کی عبادت کو خرید لیا اور یہ ان کے گھاٹے اور خسارے کا سبب ہے، فرمایا: یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارہ میں ڈال دیا۔

(۶) انہوں نے دین کو دنیا کے بدلہ میں فروخت کر دیا اور اس میں ان کو دنیا میں یہ گھاٹا ہوا کہ انہوں نے عزت والی چیز کو دے کر ذلت والی چیز کو لے لیا اور آخرت کا خسارہ یہ ہے کہ وہ ذلت والی چیز بھی ضائع اور ہلاک ہو گئی اور اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہا، فرمایا: اور جو کچھ یہ افتراء کرتے تھے وہ ان سے جاتا رہا۔

(۷) چونکہ انہوں نے نفیس چیز کو دے کر خسیس چیز کو لیا اس لیے ان کا خسارہ لازمی اور یقینی ہے، فرمایا: بلاشبہ یقیناً یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

کفار کو دگنا عذاب دینا ایک برائی پر ایک عذاب کے قاعدہ کے خلاف نہیں ہے

اس آیت میں یہ فرمایا ہے: ان کے لیے عذاب دگنا کیا جائے گا اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ - (الانعام: ۱۶۰)
اور جو شخص برا کام کرے تو اسے صرف اسی ایک برے کام کی سزا دی جائے گی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اور ان کے لیے عذاب کو دگنا کرنا اس آیت کے خلاف ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جس برائی کا انہوں نے ارتکاب کیا تھا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی سزا ہی دگنا عذاب ہے اور اگر انہوں نے ایک برائی کی تھی تو ان کو اس کی سزا میں اسی ایک برائی کا دگنا عذاب دیا جائے گا دو برائیوں کا عذاب نہیں دیا جائے گا جیسا کہ فرمایا ہے: اسے صرف اسی ایک برے کام کی سزا دی جائے گی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ظلم تب ہوتا جب ایک برائی کرنے والوں کو دو برے کام کرنے کی سزا دی جاتی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کفر کی سزا جہنم کا دائمی عذاب ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھنے، لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکنے اور کجی کو تلاش کرنے یعنی دین اسلام کی خلاف شکوک و شبہات ڈالنے اور آخرت کا انکار کرنے کی سزا اللہ تعالیٰ کے نزدیک دگنا عذاب ہے، اس کی نظیر یہ آیت ہے:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ - (الاحزاب: ۳۰)
اے نبی کی بیویو! اگر (بالفرض) تم میں سے کسی نے کھلی بے حیائی کا ارتکاب کیا تو اس کو دگنا عذاب دیا جائے گا۔

یہ آیت بھی سورۃ الانعام کی آیت کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ازواج مطہرات کی، کی ہوئی کھلی بے حیائی کا عذاب عام عورتوں کی بہ نسبت دگنا عذاب ہے، اور ایک مرتبہ کی ہوئی کھلی بے حیائی پر ایک مرتبہ ہی دگنا عذاب ہوگا دو مرتبہ دگنا عذاب نہیں ہوگا۔ سورۃ الانعام کی آیت کے خلاف تب ہوتا جب ایک مرتبہ کھلی ہوئی بے حیائی کے ارتکاب پر دو مرتبہ کھلی ہوئی بے حیائی کے ارتکاب کا عذاب دیا جاتا۔

جب کفار حق کو سننے اور دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے تو ان سے گرفت کیوں ہوئی؟

نیز اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: یہ (حق کو) سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور نہ (حق کو) دیکھتے تھے، اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب ان میں حق کو سننے اور دیکھنے کی طاقت ہی نہ تھی تو پھر ان کے ایمان نہ لانے اور کفر پر قائم رہنے میں ان کا کیا قصور ہے، اس سوال کے متعدد جوابات ہیں، پہلا جواب یہ ہے کہ وہ کفر اور عناد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض اور عداوت میں اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی توحید اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلائل پیش کیے جاتے ہیں تو ان پر کراہت اور ناگواری کی ایسی شدید کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ ان دلائل کو سن پاتے ہیں نہ دیکھ پاتے ہیں۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ سننے اور دیکھنے سے مقصود ہے حق کو قبول کرنا اور چونکہ وہ حق کو قبول نہیں کرتے تو گویا وہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں۔ اس کی تیسری توجیہ یہ ہے کہ سننے اور دیکھنے کی از خود طاقت اور قدرت تو کسی میں نہیں ہے، جب بندہ سننے اور دیکھنے کا قصد کرتا ہے تو اللہ اس میں وہ قدرت پیدا کر دیتا ہے، اور چونکہ کفار مکہ حق کو سننے اور دیکھنے کا قصد ہی نہیں کرتے تھے اس لیے ان کے متعلق خصوصیت سے فرمایا: ان میں سننے کی طاقت ہے نہ دیکھنے کی۔ اور اس کی چوتھی توجیہ یہ ہے کہ وہ سماعت اور بصارت سے نفع حاصل نہیں کرتے تھے، اور ہدایت یافتہ انسان کی طرح سنتے تھے نہ دیکھتے تھے۔ اس کی پانچویں توجیہ

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم تھا کہ وہ عناد کی بنا پر اپنے اختیار سے حق کو سنیں گے نہ دیکھیں گے اس لیے اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں اور ان کی تقدیر میں لکھ دیا کہ وہ حق کو سنیں گے نہ دیکھیں گے اس لیے اب وہ حق کو سننے اور دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ چھٹی توجیہ یہ ہے کہ چونکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض اور عداوت رکھتے تھے اس لیے وہ آپ کی باتوں کو سن سکتے تھے نہ سمجھ سکتے تھے۔ النحاس نے کہا: کلام عرب میں یہ معروف ہے کہ جب کوئی شخص کسی پر بہت ناگوار اور بہت گراں ہو تو کہا جاتا ہے وہ اس کی طرف دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا، نیز کہا جاتا ہے کہ محب مذمت کرنے والے کی بات نہیں سن سکتا، اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ مذمت کرنے والا محب کی بات نہیں سن سکتا، اور اس کی آٹھویں توجیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حق سننے اور دیکھنے کی صفت عطا کی تھی۔ انہوں نے ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے خود حق کی طرف سے اپنے کانوں اور آنکھوں کو بند کر لیا تھا، اس لیے فرمایا: وہ (حق کو) سننے اور دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور انہوں نے اپنے رب کی طرف عاجزی کی وہ لوگ جنتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں○ (ھود: ۲۳)

نیکیوں کے لازماً قبول ہونے کی توقع نہ رکھی جائے

اس آیت میں ہے واخبتوا الی ربھم۔ اخبت کا معنی ہے قوم کا پست اور فراخ زمین میں اترنا، اور مطمئن ہونا اور اخبت الی اللہ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنا اور اخبت کا معنی خضوع اور خشوع کرنا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ مسلمانوں کے اطمینان اور خضوع اور خشوع کرنے کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ مسلمان جب اللہ کی عبادت کریں تو عبادت کے وقت ان کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہوں اور اللہ تعالیٰ کے ماسوا کی طرف ملتفت نہ ہوں، اور ہر چیز سے خالی الذہن ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، یا اللہ تعالیٰ نے جو ثواب کا وعدہ فرمایا ہے اور عذاب کی وعید فرمائی ہے اس پر ان کے دل مطمئن ہوں، اور اگر ہم اخبات کو خشوع کے معنی میں لیں تو پھر اس میں یہ اشارہ ہے کہ جب مسلمان اعمال صالحہ کریں تو ان کو یہ ڈر اور خوف ہو کہ ان کی کسی کمی اور کوتاہی کی بنا پر ان کے نیک اعمال مسترد کر دیئے جائیں گے، اور اس کو اپنے نیک اعمال کے متعلق یہ اطمینان نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے یہ نیک اعمال لازماً قبول ہو جائیں گے۔

عمرو بن میمون بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس انصار کا ایک نوجوان آیا اور کہنے لگا: اے امیرالمومنین! آپ کو اللہ کی بشارت ہو، آپ اسلام لانے والوں میں مقدم ہیں، جیسا کہ آپ کو علم ہے، پھر آپ خلیفہ بنے تو آپ نے عدل کیا، پھر ان تمام (نیکیوں) کے بعد آپ کو شہادت حاصل ہوئی۔ حضرت عمر نے کہا: اے میرے بھتیجے! کاش یہ سب برابر سرابر ہو جائے، ان کی وجہ سے مجھے کوئی عذاب ہو نہ ثواب ہو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۳۹۲، مطبوعہ دار ارقم بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان دونوں فریقوں (یعنی کافر اور مومن) کی مثال ایسے ہے، جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو اور دوسرا دیکھنے والا اور سننے والا ہو، کیا یہ دونوں مثال میں برابر ہیں؟ پس کیا تم نصیحت قبول نہیں کرتے!○ (ھود: ۲۴)

سابقہ آیات میں مومنوں اور کافروں، نیک لوگوں اور بدکاروں، دو گروہوں کا ذکر فرمایا تھا، اب ان دونوں کی ایک مثال ذکر کر کے مزید وضاحت فرمائی ہے۔ کافر دنیا میں حق اور صداقت کے دلائل کو دیکھنے اور سننے سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے تو وہ اندھے اور بہرے کی طرح ہے اور مومن اس کائنات میں اور خود اپنے نفس میں اللہ تعالیٰ کی توحید کی نشانیوں کو دیکھتا ہے اور

سنتا ہے تو وہ دیکھنے اور سننے والے کی مثل ہے۔

امام رازی نے کہا: ان میں وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح انسان جسم اور روح سے مرکب ہے اور جس طرح جسم کے لیے آنکھیں اور کان ہیں اسی طرح روح کی بھی سماعت اور بصارت ہے' اسی طرح جب جسم اندھا اور بہرا ہو تو وہ حیران کھڑا رہتا ہے اور کسی نیکی کی راہ پر نہیں لگ سکتا' بلکہ وہ اندھیروں کی پستیوں میں پریشان ہوتا ہے' کسی روشنی کو دیکھتا ہے نہ کسی آواز کو سنتا ہے' اسی طرح جو شخص جاہل ہو وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے' اس کا دل اندھا اور بہرا ہوتا ہے اور وہ گمراہی کے اندھیروں میں حیران اور پریشان ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖۤ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲۵﴾

اور بے شک ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، (انہوں نے کہا) میں تم کو علی الاعلان ڈرانے آیا ہوں ○

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۶﴾

کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، مجھے تم پر دردناک دن کے عذاب کا خوف ہے ○

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا

پس ان کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا ہم تم کو اپنے جیسا ہی بشر سمجھتے ہیں

وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَمَا نَرٰی

اور ہم دیکھتے ہیں کہ تمہاری پیروی صرف ہمارے پس ماندہ اور کم عقل لوگ ہی کر رہے ہیں اور ہم اپنے اوپر

لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ

تمہاری کوئی فضیلت نہیں سمجھتے بلکہ ہمارے گمان میں تم جھوٹے ہو ○ (نوح نے) کہا اے میری قوم یہ بتاؤ اگر میں

اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ

اپنے رب کی طرف سے (واضح) دلیل رکھتا ہوں اور اس نے اپنے پاس سے مجھ کو رحمت عطا کی ہو جو تم

فَعُمِّیَتْ عَلَیْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَیٰقَوْمِ

سے مخفی رکھی گئی ہے تو کیا ہم اس کو زبردستی تم پر مسلط کر دیں گے جب کہ تم اس کو ناپسند کرنے والے ہو ○ اور اے میری قوم

لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ

میں اس (تبلیغ) پر کسی مال کو طلب نہیں کرتا میرا اجر صرف اللہ پر ہے اور میں ایمان والوں کو

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

دھتکارنے والا نہیں ہوں بے شک وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگ جاہل ہو ○

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾

اور اے میری قوم! اگر میں ان (مومنوں) کو دھتکار دوں تو اللہ سے مجھے کون بچائے گا؟ کیا تم غور نہیں کرتے ○

وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ

اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں (از خود) غیب جانتا ہوں اور نہ

اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ لَنْ

میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور جو لوگ تمہاری نظروں میں حقیر ہیں میں ان کے متعلق یہ

يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّيْۤ اِذًا لَّمِنَ

نہیں کہتا کہ اللہ ہرگز ان کو کوئی خیر نہیں عطا فرمائے گا، اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے (اگر بالفرض میں ایسا کہوں) تو

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا

بے شک اس صورت میں میں ظالموں میں سے ہو جاؤں گا ○ انہوں نے کہا اے نوح! تم نے ہم سے بحث کی اور بہت زیادہ بحث کی، اب اگر تم

بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ

سچے ہو تو وہ (عذاب) لے آؤ جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو ○ (نوح نے کہا) اگر اللہ نے چاہا تو تم پر وہ

اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْۤ

عذاب اللہ ہی لائے گا اور تم (اس کو) عاجز کرنے والے نہیں ہو ○ اگر میں تم کو نصیحت کروں تو میں

اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ

اپنی نصیحت سے تم کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا جب کہ اللہ تمہیں گمراہ کرنے کا ارادہ کر چکا ہو،

هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾ ؕ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ

وہی تمہارا رب ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ○ کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ اس (رسول) نے اس (قرآن) کو از خود

إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَيَّ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ ﴿۳۵﴾

گھڑ لیا ہے؟ آپ کہیے کہ اگر (بالفرض) میں نے اس کو گھڑ لیا ہے تو میرا گناہ میرے ذمہ ہے اور میں تمہارے گناہوں سے بری ہوں O

حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بے شک ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا (انہوں نے کہا) میں تم کو علی الاعلان ڈرانے آیا ہوں O کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، مجھے تم پر دردناک دن کے عذاب کا خوف ہے O (ھود: ۲۶-۲۵)

انبیاء سابقین علیہم السلام کے قصص بیان کرنے کی حکمت

اللہ تعالیٰ نے سورہ یونس میں بھی حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا تھا اور اس سورت میں اس قصہ کو پھر دہرایا ہے کیونکہ اس سورت میں حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ کی زیادہ تفصیل ہے، انبیاء سابقین علیہم السلام کے واقعات کو بار بار دہرانے میں یہ حکمت ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جاتی رہے، کفار مکہ آپ کی تکذیب کرتے رہتے تھے اور دل آزار باتیں کرتے رہتے تھے، ایسی باتیں سن کر آپ کو رنج ہوتا تھا تو اللہ تعالیٰ انبیاء سابقین علیہم السلام کے واقعات پر مشتمل وحی نازل فرماتا کہ اس قسم کے معاملات انبیاء سابقین علیہم السلام کو بھی پیش آتے رہے ہیں، وہ کفار کی ایسی باتوں پر صبر کرتے تھے سو آپ بھی صبر کریں۔

اس آیت میں دردناک دن فرمایا ہے اور دن کو دردناک سے متصف فرمایا ہے، حالانکہ دردناک عذاب کی صفت ہے نہ کہ دن کی، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ توصیف مجاز عقلی ہے جیسے عرب کہتے ہیں نھارک صائم ولیلک قائم چونکہ یہ دردناک عذاب اس دن میں نازل ہوگا اس لیے اس دن کو دردناک کے ساتھ متصف فرمایا۔

بظاہر اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عذاب سے مراد عام ہو خواہ دنیاوی عذاب ہو یا آخرت کا، حضرت نوح علیہ السلام کو علم تھا کہ اگر ان کی قوم ایمان نہ لائی تو اس پر طوفان کا عذاب آئے گا اور ان کی قوم بھی یہ سمجھتی تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام ان کو دنیاوی عذاب سے ڈرا رہے ہیں اسی بناء پر وہ یہ کہتے تھے کہ آپ جس عذاب سے ہم کو دھمکا رہے ہیں وہ عذاب لاکر دکھائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس ان کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا ہم تم کو اپنے جیسا بشر ہی سمجھتے ہیں، اور ہم دیکھتے ہیں کہ تمہاری پیروی صرف ہمارے پس ماندہ اور کم عقل لوگ ہی کر رہے ہیں اور ہم اپنے اوپر تمہاری کوئی فضیلت نہیں سمجھتے بلکہ ہمارے گمان میں تم جھوٹے ہو O (ھود: ۲۷)

حضرت نوح کی قوم کے کافر سرداروں کے شبہات

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے حضرت نوح کے دعویٰ نبوت کی تکذیب کی اور اس سلسلہ میں انہوں نے تین شبہات وارد کیے: ایک شبہ یہ تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام ان کی مثل بشر ہیں، دوسرا شبہ یہ تھا کہ ان کی پیروی کم حیثیت اور پس ماندہ لوگ کر رہے ہیں، تیسرا شبہ یہ تھا کہ ان کے نزدیک حضرت نوح علیہ السلام کی ان کے اوپر کوئی فضیلت نہیں تھی۔ اس شبہ کی بنیاد یہ تھی کہ ان کے نزدیک اسباب مادیہ سے فضیلت حاصل ہوتی تھی، یعنی کوئی شخص غیر معمولی جسیم اور قد آور ہو، یا وہ بہت امیر اور دولت مند ہو یا وہ کسی بہت بڑے جتھے اور قبیلہ کا سردار ہو، اور جب حضرت نوح علیہ السلام میں ایسی کوئی چیز نہ تھی تو انہوں نے کہا کہ آپ کی ہم پر کوئی فضیلت نہیں ہے، اب ہم ان کے ان تینوں شبہات کے تفصیل وار جواب پیش کر رہے ہیں۔

بشر کا معنیٰ اور نبی کے بشر ہونے کی حقیقت

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا: ہم تم کو اپنے جیسا بشر ہی سمجھتے ہیں۔

علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ بشر کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کھال کے ظاہر کو بشرہ کہتے ہیں اور کھال کے باطن کو ادمہ کہتے ہیں، واحد اور جمع دونوں کے لیے بشر آتا ہے البتہ تثنیہ بشرین آتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ بشر آیا ہے اس سے مراد انسان کا جثہ اور اس کا ظاہر ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ طِیۡنٍ ۔(ص: ۷۱) میں مٹی سے بشر بنانے والا ہوں۔

کفار انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ کم کرنے کے لیے ان کو بشر کہتے تھے۔ قرآن مجید میں ہے:

فَقَالُوۡۤا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُہٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّفِیۡ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ۔(القمر: ۲۴) پس وہ کہنے لگے کیا ہم اپنے ہی میں سے ایک بشر کی اتباع کریں پھر تو بے شک ہم ضرور گمراہی اور عذاب میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بتانے کے لیے کہ تمام لوگ نفس بشریت میں برابر ہیں لیکن وہ دوسروں سے علوم عالیہ اور اعمال صالحہ کی وجہ سے ممتاز ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ۔(الکہف: ۱۱۰) (اے رسول مکرم!) آپ کہئے میں بظاہر تم جیسا ہی بشر ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے۔

''میری طرف وحی کی جاتی ہے'' اس لیے فرمایا ہے کہ ہرچند کہ نفس بشریت میں، میں تمہاری مثل ہوں لیکن اس وصف میں، میں تم سے ممتاز ہوں کہ میری طرف وحی کی جاتی ہے۔

(المفردات ج ۱ ص ۶۰، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفی الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

جس طرح انسان حیوان ہونے میں تمام حیوانات کی مثل ہے لیکن نطق کی وجہ سے وہ باقی حیوانات سے ممتاز ہے اور نطق اس کے لیے فصل ممیز ہے اور نطق سے مراد وہ قوت ہے جس کی وجہ سے وہ معقولات کا ادراک کرتا ہے جس کو عقل کہتے ہیں اس طرح نبی، انسان اور ناطق ہونے میں تمام انسانوں کی مثل ہے لیکن حصول وحی کی صلاحیت اور ادراک مغیبات میں وہ باقی انسانوں سے ممتاز ہے، اور جس طرح انسان ادراک معقولات اور عقل کی وجہ سے باقی حیوانات سے ممتاز ہے اسی طرح نبی ادراک مغیبات اور حصول وحی کی وجہ سے باقی انسانوں سے ممتاز ہے اور جس قوت سے نبی غیب کا ادراک کرتا ہے اور وحی کو حاصل کرتا ہے وہ قوت اس کے حق میں بمنزلہ فصل ممیز ہے۔

امام محمد بن محمد غزالی متوفی ۵۰۵ھ نبوت کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

اور عقل کے ماوراء ایک اور عالم ہے جس میں ادراک کی ایک اور آنکھ کھلتی ہے جس سے انسان غیب کا ادراک کرتا ہے اور مستقبل میں ہونے والے امور غیبیہ اور بہت سے امور کو جان لیتا ہے، جن تک عقل کی رسائی نہیں ہے۔ جیسے قوت تمیز معقولات کا ادراک نہیں کر سکتی اور جس طرح حواس قوت تمیز کے مدرکات کو نہیں پا سکتے۔ (اسی طرح عقل یعنی قوت ادراک غیب کے مدرکات کو نہیں پا سکتی۔) اور جس طرح صاحب تمیز کے سامنے عقل کے مدرکات پیش کیے جائیں تو وہ ان کو بعید سمجھ کر ان کا انکار کرتا ہے اسی طرح بعض عقل والوں کے سامنے نبوت کے مدرکات پیش کیے گئے تو انہوں نے ان کا انکار کر دیا۔ اور یہ خالص جہالت ہے۔ (المنقذ من الضلال ص ۵۴، مطبوعہ ہیئت الاوقاف لاہور، ۱۹۷۱ء)

امام غزالی نے اس عبارت میں یہ واضح کر دیا ہے کہ جس طرح حواس کے بعد تمیز کا مرتبہ ہے اور تمیز کے بعد عقل کا مرتبہ

ہے، اسی طرح عقل کے بعد نبوت کا مرتبہ ہے اور جس طرح قوت عقلیہ سے معقولات کا ادراک ہوتا ہے اسی طرح نبوت کی قوت سے مغیبات کا ادراک ہوتا ہے، اور جس طرح عام حیوانات کو اللہ تعالیٰ نے حواس کی قوت عطا کی ہے اور انسان کو اس سے ایک زائد قوت عطا کی ہے اور وہ عقل اور تمیز ہے اسی طرح نبی کو اللہ تعالیٰ نے ان قوتوں سے زائد ایک قوت عطا کی ہے جس قوت سے وہ غیب کا ادراک کرتا ہے اور جس طرح انسان عالم محسوسات میں ظاہری چیزوں کو دیکھتا ہے اور ان کی آوازیں سنتا ہے، حیوانات اور انسانوں کو دیکھتا ہے اور ان کی آوازیں سنتا ہے اسی طرح نبی غیب کی مخفی چیزوں کو دیکھتا ہے، فرشتوں اور جنات کو دیکھتا ہے، ان کی آوازیں سنتا ہے اور ان سے ہم کلام ہوتا ہے اور اس سے یہ واضح ہو گیا کہ نبی اپنی حقیقت میں عام بشر اور انسان سے ممتاز ہوتا ہے اور جس طرح انسان عام حیوانوں سے ممتاز ہے نبی عام انسانوں سے ممتاز ہوتا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی خصائص نبوت بیان کرتے ہوئے "احیاء العلوم" سے امام غزالی کی عبارت نقل کرتے ہیں، ہم قارئین کے سامنے "احیاء العلوم" سے امام غزالی کی اصل عبارت کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں:

نبوت ان اوصاف کو کہتے ہیں جو نبی کے ساتھ خاص ہوں اور ان اوصاف کی وجہ سے نبی اپنے غیر سے ممتاز ہو، اور یہ کئی قسم کے خصائص ہیں، نبی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، فرشتوں اور آخرت کے حقائق کو اس طرح جانتا ہے جس طرح ان کو کوئی نہیں جانتا، کیونکہ نبی کو ان کی جتنی معلومات ہوتی ہیں اور ان پر جتنا یقین ہوتا ہے اور جتنی تحقیق ہوتی ہے کسی اور کو نہیں ہوتی۔ اور نبی کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جس طرح غیر نبی کو افعال اختیاریہ پر قدرت ہوتی ہے اسی طرح نبی کو افعال خارقہ للعادات (یعنی معجزات) پر قدرت ہوتی ہے، اور نبی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کو ایسی صفت حاصل ہوتی ہے جس سے وہ فرشتوں کو دیکھتا ہے اور عالم ملکوت کا مشاہدہ کرتا ہے جس طرح ہم میں بینا اور نابینا کا فرق ہے، اور نبی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کو ایسی صفت حاصل ہوتی ہے جس سے وہ مستقبل میں ہونے والے امور غیبیہ کا ادراک کر لیتا ہے اور لوح محفوظ کا مطالعہ کرتا ہے، جس طرح انسان میں ذہانت کی صفت ہوتی ہے اور اس صفت سے وہ بے وقوف شخص سے ممتاز ہوتا ہے۔

(احیاء علوم الدین ج ۴ ص ۱۹۰-۱۸۹، مطبوعہ دار الکتب العربیہ مصر، ج ۴ ص ۱۷۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ، فتح الباری ج ۱۲ ص ۳۶۷-۳۶۶)

نبی کی خصوصیات

امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں:

علامہ حلیمی نے کتاب المنہاج میں لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا دوسرے انسانوں سے جسمانی اور روحانی قوتوں میں مختلف ہونا ضروری ہے۔

پھر امام رازی اس کی تفصیل میں علامہ حلیمی سے نقل کرتے ہیں کہ قوت جسمانیہ کی دو قسمیں ہیں: مدرکہ اور محرکہ، اور مدرکہ کی دو قسمیں ہیں: حواس ظاہرہ اور حواس باطنہ اور حواس ظاہرہ پانچ ہیں:

قوت باصرہ

قوت باصرہ کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت کی یہ دلیل ہے کہ آپ نے فرمایا: میرے لیے تمام روئے زمین سمیٹ دی گئی اور میں نے اس کے تمام مشارق اور مغارب کو دیکھ لیا۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۹۰، سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۲۸، دلائل النبوۃ ج ۶ ص ۵۸۷) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی صفیں قائم کرو اور مل کر کھڑے ہو کیونکہ میں

تم کو پس پشت بھی دیکھتا ہوں۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۱۸، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۴۳۴، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۶۶۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۹۹۳، سنن نسائی رقم الحدیث: ۳۳۴)

اس قوت کی نظیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے فرمایا:

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (الانعام: ۷۵)
اور اسی طرح ہم (حضرت) ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی نشانیاں دکھاتے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی بصر کو قوی کر دیا حتیٰ کہ حضرت ابراہیم نے اعلیٰ سے لے کر اسفل تک تمام نشانیاں دیکھ لیں۔ (اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تجلی لی ما فی السموت والارض "میرے لیے تمام آسمان اور زمین منکشف ہوگئے۔" مسند احمد ج ۴ ص ۶۶ اور ایک روایت میں ہے: فعلمت ما فی السموت والارض "میں نے تمام آسمانوں اور زمین کو جان لیا۔" مسند احمد ج ۱ ص ۳۶۸)

قوت سامعہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سماعت تمام انسانوں سے زیادہ تھی کیونکہ آپ نے فرمایا: آسمان چرچراتا ہے اور اس کا چرچرانا بجا ہے، آسمان میں ایک قدم کی جگہ بھی نہیں ہے مگر اس میں کوئی نہ کوئی فرشتہ سجدہ ریز ہے۔
(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۱۲، ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۱۹۰)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کے چرچرانے کی آواز سنی۔ نیز آپ نے فرمایا: ایک پتھر جہنم میں گرایا جا رہا ہے جو ابھی تک جہنم کی تہہ تک نہیں پہنچا، آپ نے اس کی آواز سنی۔ اس قوت کی نظیر حضرت سلیمان کو بھی عطا کی گئی کیونکہ انہوں نے چیونٹی کی آواز سنی۔ قرآن مجید میں ہے:

قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ۔ (النمل: ۱۸)
ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! اپنے اپنے بلوں میں داخل ہو جاؤ۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کو چیونٹی کا کلام سنایا اور اس کے معنی پر مطلع کیا، اور یہ قوت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حاصل تھی کیونکہ آپ نے بھیڑیئے اور اونٹ سے کلام کیا۔ (مسند البزار رقم الحدیث: ۲۴۳۲، المستدرک ج ۲ ص ۱۰۰-۹۹)

قوت شامہ

نبی کی قوت شامہ کی خصوصیت پر حضرت یعقوب علیہ السلام کا واقعہ دلیل ہے، کیونکہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ حکم دیا کہ میری قمیص لے جاؤ اور حضرت یعقوب کے چہرے پر ڈال دو اور قافلہ وہ قمیص لے کر روانہ ہوا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا:

اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ۔ (یوسف: ۹۴)
مجھے (حضرت) یوسف کی خوشبو آ رہی ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کی خوشبو کئی دن کی مسافت کے فاصلہ سے سونگھ لی۔

قوت ذائقہ

نبی کے چکھنے کی قوت کی خصوصیت کی دلیل یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت کا ایک ٹکڑا چکھا تو فرمایا: اس میں زہر ملا ہوا ہے۔ (سنن الدارمی رقم الحدیث: ۶۸، مسند احمد ج ۲ ص ۴۵۱)

33

قوت لامسہ

نبی کی قوت لامسہ کی خصوصیت کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو وہ آگ ان پر ٹھنڈک اور سلامتی ہو گئی۔

اور حواس باطنہ میں قوت حافظہ ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰىٓ ۔ (الاعلیٰ: ۶) ہم عنقریب آپ کو پڑھائیں گے پس آپ نہیں بھولیں گے۔

اور قوت ذکاوت ہے' حضرت علی فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے علم کے ایک ہزار باب سکھائے اور میں نے ہر باب سے ہزار باب مستنبط کیے' اور جب ولی کی ذکاوت کا یہ حال ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذکاوت کا کیا عالم ہو گا! اور قوت محرکہ کی خصوصیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج پر جانا دلیل ہے' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ چوتھے آسمان پر جانا' اور حضرت ادریس اور الیاس علیہما السلام کا آسمانوں پر جانا اس کی دلیل ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی روحانی اور عقلی قوتیں بھی انتہائی کامل ہوتی ہیں' خلاصہ یہ ہے کہ نفس قدسیہ نبویہ اپنی ماہیت میں باقی نفوس سے مختلف ہوتا ہے اور نفس نبویہ کے لوازم سے یہ ہے کہ اس کی ذکاوت' ذہانت اور حریت انتہائی کامل ہو اور وہ جسمانیات اور شہوانیات سے منزہ ہو اور جب نبی کی روح غایت صفا اور شرف میں ہو گی تو اس کا بدن بھی انتہائی صاف اور پاکیزہ ہو گا اور اس کی قوت مدرکہ اور قوت محرکہ بھی انتہائی کامل ہو گی' کیونکہ یہ قوتیں ان انوار کے قائم مقام ہیں جو انوار جو ہر روح سے صادر ہوتے ہیں اور نبی کے بدن سے واصل ہوتے ہیں اور جب فاعل (روح) اور قابل (بدن) انتہائی کامل ہوں گے تو ان کے آثار بھی انتہائی کامل' مشرف اور صاف ہوں گے۔

(تفسیر کبیر ج ۳ ص ۲۰۰-۱۹۹' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۵ھ)

علامہ نظام الدین حسن بن محمد قمی نیشاپوری متوفی ۷۲۸ھ نے بھی علامہ حلیمی کی یہ عبارت اسی تفصیل سے نقل کی ہے۔

(غرائب القرآن ج ۲ ص ۱۵۴-۱۵۳' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' ۱۴۱۶ھ)

امام غزالی' امام رازی' علامہ حلیمی' علامہ نظام الدین نیشاپوری اور حافظ ابن حجر عسقلانی کی ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ نبی کی حقیقت عام انسانوں سے مختلف ہوتی ہے اور ہرچند کہ نبی انسان اور بشر ہوتا ہے لیکن اس کی حقیقت میں استعداد وحی کی صلاحیت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ عام انسانوں سے ممتاز ہوتا ہے اور نبی میں ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ دوسرے انسانوں سے اس طرح ممتاز ہوتا ہے جس طرح دیکھنے والا' اندھے سے اور ذکی' غبی سے متمیز ہوتا ہے۔

فرشتہ کو نبی نہ بنانے کی وجوہ

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے کافر سرداروں نے حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت میں پہلا شبہ یہ پیش کیا تھا کہ "ہم تم کو اپنے جیسا بشر ہی سمجھتے ہیں" اور یہ ایسا ہی شبہ ہے جیسا کہ مکہ کے کافروں نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میں پیش کیا تھا اور وہاں اللہ تعالیٰ نے اس کا ازالہ فرمایا تھا:

وَقَالُوۡا لَوۡلَآ اُنۡزِلَ عَلَيۡهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوۡ اَنۡزَلۡنَا مَلَـكًا لَّقُضِىَ الۡاَمۡرُ ثُمَّ لَا يُنۡظَرُوۡنَ ○ وَلَوۡ جَعَلۡنٰهُ مَلَـكًا لَّجَـعَلۡنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّا يَلۡبِسُوۡنَ ○ (الانعام: ۹-۸)

اور انہوں نے کہا کہ اس (رسول) پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں نازل کیا گیا' اور اگر ہم فرشتہ اتارتے تو (ان کا) کام تمام ہو چکا ہوتا پھر ان کو مہلت نہ دی جاتی ○ اور اگر ہم رسول کو فرشتہ بناتے تو اسے مرد ہی (کی صورت میں) بناتے اور ان پر پھر وہی شبہ ڈال

دیتے جو شبہ وہ اب کر رہے ہیں○

کفار کا یہ شبہ ان کی جہالت پر مبنی ہے، کیونکہ نبی اپنی نبوت کو دلائل اور براہین سے ثابت کرتا ہے اور معجزات پیش کرتا ہے، وہ اپنی شکل و صورت اور خلقت سے اپنی نبوت کو ثابت نہیں کرتا، بلکہ ہم کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ فرشتہ کو نبی بنا کر بھیجتا اور وہ خلافِ عادت کاموں کو اپنی نبوت پر دلیل بناتا تو اس کی نبوت میں طعن کرنے کا زیادہ موقع تھا کیونکہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ معجزات انسانوں کے اعتبار سے خلاف عادت ہیں فرشتہ کے لیے خلاف عادت نہیں ہیں لہٰذا یہ معجزات فرشتہ کی نبوت پر دلیل نہیں ہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ فرشتہ جو عبادات سرانجام دیتا اور دوسرے نیک اعمال انجام دیتا وہ انسانوں پر حجت نہ ہوتے کیونکہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ فرشتہ کی حقیقت میں ایسا عنصر ہو جس کی وجہ سے وہ ان مشکل اور کٹھن عبادات کو انجام دے سکتا ہو اور انسان کی حقیقت میں وہ عنصر نہ ہو، نیز فرشتہ بھوک پیاس، غم اور غصہ اور شہوت اور غضب سے منزہ اور مجرد ہوتا ہے لہٰذا فرشتہ کا برائیوں سے بچنا اور نیک اعمال کرنا انسانوں پر حجت نہیں ہو سکتا، ان وجوہ کی بنا پر اگر فرشتہ کو نبی بنا دیا جاتا تو بندوں پر اللہ کی حجت پوری نہ ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بشر اور انسانوں سے رسولوں کو بھیجا ہے نہ کہ فرشتوں سے۔

پس ماندہ اور کمزور لوگوں کا ایمان لانا نبوت میں طعن کا موجب نہیں

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے کافر سرداروں کا دوسرا شبہ یہ تھا کہ اور ہم دیکھتے ہیں کہ تمہاری پیروی صرف ہمارے پس ماندہ اور کم عقل لوگ ہی کر رہے ہیں، اسی طرح کا شبہ کفار قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی کیا تھا، اس کی تفصیل یہ ہے:

ابو سفیان بن حرب نے بیان کیا: جس مدت میں ابو سفیان اور کفار قریش کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (صلح حدیبیہ کی وجہ سے) معاہدہ ہوا تھا اس مدت میں وہ شام میں تجارت کے لیے گئے۔ روم کے بادشاہ ہرقل نے ان کو اپنے دربار میں بلایا، اس وقت وہ ایلیا میں تھے، اس نے ایک ترجمان کو بلا کر ابو سفیان سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق چند سوالات کیے، ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ کیا قوم کے معزز لوگ ان کی پیروی کر رہے ہیں یا پس ماندہ اور کمزور لوگ؟ ابو سفیان نے کہا: پس ماندہ اور کمزور لوگ پیروی کرتے ہیں۔ ہرقل نے کہا: ہمیشہ رسولوں کی پیروی پس ماندہ اور کمزور لوگ ہی کرتے ہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۵۱۳۶، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۱۰۶۴، ۱۱۷۹، مسند احمد ج ۳ ص ۱۳۳، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۲۹۵۴، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۵۵۳، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۱۵۶۳، حلیۃ الاولیاء ج ۹ ص ۴۵، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ۱۰۷)

پس ماندہ اور کمزور لوگوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو مالدار نہ ہوں، تنگ دست اور مفلس ہوں، اور جن لوگوں کا تعلق ایسے پیشے سے ہو جس کو معاشرہ میں نیچ، خسیس اور گھٹیا سمجھا جاتا ہو، اور یہ بھی ان کی جہالت ہے، کیونکہ اللہ کے نزدیک بلندی، برتری اور عظمت مال و دولت اور بلند مرتبوں سے نہیں ہوتی بلکہ اللہ کے نزدیک فقر اور افلاس مال و دولت سے زیادہ پسندیدہ ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو اسی تعلیم کے ساتھ بھیجا کہ وہ دنیا کو ترک کر کے آخرت کی طرف راغب ہوں، تو مال و دولت کی کمی نبوت اور رسالت میں طعن کی کس طرح موجب ہوگی!

اللہ تعالیٰ کے نزدیک اغنیاء کی بہ نسبت فقراء کا مقرب ہونا

اللہ تعالیٰ کے نزدیک اغنیاء کی بہ نسبت فقراء کے مقرب اور افضل ہونے کی دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت

میں زندہ رکھ اور مسکینی کی حالت میں میری روح قبض کرنا' اور قیامت کے دن مجھے مسکینوں کی جماعت میں اٹھانا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: یارسول اللہ! اس دعا کا کیا سبب ہے؟ آپ نے فرمایا: مسکین اغنیاء سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے' اے عائشہ! تم مسکین کو مسترد نہ کرو' خواہ ایک کھجور کا ایک ٹکڑا ہو' اے عائشہ! مسکینوں سے محبت کرو اور ان کو قریب رکھو تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمہیں اپنے قریب رکھے گا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۵۲' سنن کبریٰ للبیہقی ج ۷ ص ۱۲)

اس حدیث کی سند میں الحارث بن النعمان منکر الحدیث ہے اور یہ حدیث سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فقراء' اغنیاء سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے' یہ میدان حشر کا نصف دن ہو گا۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۵۳' مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۳ ص ۲۴۶' مسند احمد ج ۲ ص ۲۹۶' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۱۲۲' مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۶۰۱۸' صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۷۶' حلیۃ الاولیاء ج ۷ ص ۹۱)

امام ترمذی نے اس حدیث کو ایک اور سند سے بھی روایت کیا ہے اور اس کے متعلق بھی لکھا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۵۴)

طبقاتی فرق اور نام و نسب فضیلت کا موجب نہیں

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایام تشریق کے وسط میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حجۃ الوداع کا خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے! تمہارا باپ ایک ہے! سنو کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے' اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے' اور نہ کسی گورے کو کالے پر فضیلت ہے اور نہ کسی کالے کو گورے پر فضیلت ہے' مگر تقویٰ کے ساتھ' اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو' سنو! کیا میں نے تبلیغ کر دی ہے! مسلمانوں نے کہا: کیوں نہیں' یارسول اللہ! آپ نے فرمایا: پھر حاضر کو چاہیے کہ وہ غائب کو تبلیغ کر دے۔ (شعب الایمان ج ۴ ص ۲۸۹' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۰ھ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم سے زمانہ جاہلیت کی عیب جوئی اور باپ دادا پر فخر کرنے (کی خصلت) کو دور کر دیا ہے' سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے' مومن متقی ہے اور فاجر بدمزاج ہے۔ لوگ (اپنے) باپ دادا پر فخر کرنے سے باز آ جائیں ورنہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیڑے مکوڑوں سے بھی زیادہ ذلیل ہیں۔ (شعب الایمان ج ۴ ص ۲۸۶' مسند البزار ج ۲ ص ۴۳۵)

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے کافر سرداروں کا تیسرا شبہ یہ تھا کہ "اور ہم اپنے اوپر تمہاری کوئی فضیلت نہیں سمجھتے" ان کا یہ شبہ بھی ان کی جہالت پر مبنی ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک فضیلت کا معیار علم اور عمل ہے' اور علم اور عمل کے اعتبار سے حضرت نوح علیہ السلام کی فضیلت بالکل ظاہر تھی' انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے متبعین سے کہا: بلکہ ہم تم کو جھوٹا گمان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (نوح نے) کہا اے میری قوم! یہ بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے (واضح) دلیل رکھتا ہوں اور اس نے اپنے پاس سے مجھ کو رحمت عطا کی ہو جو تم سے مخفی رکھی گئی ہے تو کیا ہم اس کو زبردستی تم پر مسلط کر دیں گے جب کہ تم اس کو ناپسند کرنے والے ہو۔ (ھود: ۲۸)

بشر ہونا نبوت کے منافی نہیں ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے کافر سرداروں کے شبہات کا ذکر فرمایا تھا' ان کا پہلا شبہ یہ تھا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ تم ہماری ہی مثل بشر ہو' تو پھر نبی کس طرح ہو سکتے ہو؟ حضرت نوح علیہ السلام نے جو اس کا جواب دیا اس کی تقریر یہ ہے کہ: بشریت میں مساوی ہونا اس بات کو واجب نہیں کرتا کہ مجھے نبوت اور رسالت حاصل نہ ہو سکے کیونکہ نبوت اور رسالت اس کی عطا ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ وہ نبوت اور رسالت کس کو عطا کرے گا!

اے میری قوم! یہ بتاؤ کہ اگر مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کی معرفت حاصل ہو پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے پاس سے نبوت عطا فرمائی ہو اور اس نبوت کی دلیل پر معجزہ بھی عطا فرمایا ہو' اور میری نبوت تم پر مشتبہ ہو یا مخفی ہو تو کیا میں اس بات پر قادر ہوں کہ جبراً اپنی نبوت کو تمہاری عقل سے تسلیم کراؤں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (نوح نے کہا) اور اے میری قوم! میں اس (تبلیغ) پر کوئی مال طلب نہیں کرتا' میرا اجر صرف اللہ پر ہے' اور میں ایمان والوں کو دھتکارنے والا نہیں ہوں' بے شک وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگ جاہل ہو○ اور اے میری قوم! اگر میں ان (مومنوں) کو دھتکار دوں تو اللہ سے مجھے کون بچائے گا؟ کیا تم غور نہیں کرتے○ (هود: ۳۰-۲۹)

تبلیغ دین پر اجر طلب نہ کرنے سے حضرت نوح کا اپنی نبوت پر استدلال

هود: ۲۹ میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے کافر سرداروں کے دوسرے شبہ کا جواب دیا ہے' ان کا دوسرا شبہ یہ تھا کہ آپ کی پیروی تو ہماری قوم کے پس ماندہ لوگ ہی کر رہے ہیں' حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے اس شبہ کا کئی وجوہ سے جواب دیا:

(۱) میں اللہ کے پیغام پہنچانے اور دین کی تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں طلب کر رہا نہ کوئی مال و دولت مانگ رہا ہوں حتیٰ کہ یہ فرق کیا جائے کہ میری پیروی کرنے والا فقیر ہے یا غنی' اس مشکل اور کٹھن عبادت پر میرا اجر تو صرف اللہ تعالیٰ پر ہے تو اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میری پیروی امیر کرتے ہیں یا غریب۔

(۲) تم میرے ظاہری حالات کو دیکھ کر یہ سمجھ رہے ہو کہ میں غریب آدمی ہوں اور تمہارا گمان یہ ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے پیغام کو پہنچانے کا یہ کام اس لیے شروع کیا ہے کہ میں تم سے مال و دولت حاصل کر کے خوشحال ہو جاؤں' سو تمہاری یہ بدگمانی غلط اور فاسد ہے' کیونکہ میں تم سے دین کا پیغام پہنچانے پر کسی اجر اور معاوضہ کا طلب گار نہیں ہوں' میرا اجر تو صرف اللہ رب العالمین پر ہے تو تم اس بدگمانی کی وجہ سے اپنے آپ کو آخرت کی سعادتوں اور کامیابیوں سے محروم نہ کرو اور اپنے اجر آخرت کو ضائع نہ کرو۔

(۳) اور تم نے یہ کہا ہے کہ ہم تمہیں صرف اپنی مثل بشر سمجھتے ہیں اور ہم اپنے اوپر تمہاری کوئی فضیلت نہیں دیکھتے' اللہ تعالیٰ نے مجھے انواع و اقسام کی فضیلتیں عطا کی ہیں' یہی وجہ ہے کہ میں دنیا کے حصول کی کوئی کوشش نہیں کرتا' میری تمام کوشش اور جدوجہد کا محور صرف دین کی طلب ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ دنیا کو ترک کرنا اور اس سے اعراض کرنا تمام فضائل کی اصل ہے۔

مومنوں کو اپنی مجلس سے نہ نکالنے کی وجوہ

نیز حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: میں ایمان والوں کو دھتکارنے والا نہیں ہوں' اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی قوم کے کافر

سردار نادار مومنوں کے ساتھ بیٹھنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ امام ابن جریر نے ابن جریج سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت نوح سے کہا کہ اے نوح! اگر آپ کی یہ خواہش ہے کہ ہم آپ کی پیروی کریں تو آپ اپنی مجلس سے ان فقراء کو نکال دیں، کیونکہ ہم اس پر کبھی راضی نہیں ہوں گے کہ وہ اور ہم کسی معاملہ میں بھی برابر ہوں۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۳۹۸۹) حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: میں ان مومنوں کو اپنی مجلس سے نکالنے والا نہیں ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں، نیز وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ نفاق سے آپ کے ساتھ لگے ہوئے ہیں تو حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: یہ معاملہ اللہ سے ان کی ملاقات ہونے پر کھل جائے گا، حضرت نوح علیہ السلام نے ان کو اپنی مجلس سے نہ نکالنے کی یہ وجہ پیش کی کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں اور اس وقت ان کا رب ان کو وہ انعامات عطا فرمائے گا، جس کا اس نے ان مومنوں سے وعدہ فرمایا ہے، اب اگر میں نے ان کو اپنی مجلس سے نکال دیا تو وہ اللہ کے سامنے مجھ سے جھگڑا کریں گے، نیز انہوں نے یہ وجہ بیان فرمائی کہ میں ان مومنوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوں گا۔ اگر میں نے بالفرض ان کو اپنی مجلس سے نکال دیا تو اللہ تعالیٰ مجھ پر گرفت فرمائے گا اور اس کے مقابلہ میں میری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہوگا، اور یہ وہ تمام اسرار اور رموز ہیں اور مسلمانوں کو اپنی مجلس سے نہ نکالنے کی وجوہات ہیں جن کو میں جانتا ہوں اور تم نہیں جانتے۔

شریعت میں مومن کی تکریم اور کافر کی تذلیل مطلوب ہے

اس کے بعد (هود: ۳۰) میں فرمایا: اور اے میری قوم! اگر میں ان (مومنوں) کو دھتکار دوں تو اللہ سے مجھے کون بچائے گا؟
اس کی تفصیل یہ ہے کہ عقل اور شرع اس بات پر متفق ہیں کہ نیک اور متقی مسلمان کی تعظیم اور تکریم ضروری ہے اور کافر اور فاجر کی توہین کرنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (المنافقون: ۸)
عزت تو اللہ اور رسول اور ایمان والوں کے لیے ہے لیکن منافقین نہیں جانتے۔

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ۔ (الزمر: ۲۶)
سو اللہ نے انہیں دنیا کی زندگی میں ذلت کا مزہ چکھایا اور یقیناً آخرت کا عذاب سب عذابوں سے بڑا ہے۔

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ (البقرة: ۱۱۴)
ان (کافروں) کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

اسی طرح احادیث میں بھی مومنوں کی تکریم اور کفار کی تذلیل کا حکم ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے مسلمان شخص کی تکریم کی تو اللہ تعالیٰ اس کی تکریم کرے گا۔
(المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۸۶۴۰، مطبوعہ مکتبہ المعارف ریاض ۱۴۱۶ھ)

وضین بن عطا بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع بن نون کی طرف وحی کی کہ میں تمہاری قوم میں سے ایک لاکھ چالیس ہزار نیکوکاروں کو اور ساٹھ ہزار بدکاروں کو ہلاک کرنے والا ہوں۔ حضرت یوشع نے عرض کیا: اے میرے رب! تو بدکاروں کو تو ہلاک فرمائے گا، نیکوکاروں کو کیوں ہلاک فرمائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ بدکاروں کے پاس جاتے تھے، ان کے ساتھ کھاتے اور پیتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے غضب کی وجہ سے ان پر غضب ناک نہیں ہوتے تھے۔
(شعب الایمان ج ۷ ص ۵۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۰ھ)

حضرت نوح علیہ السلام کے جواب کا مفہوم یہ ہے کہ اگر میں بالفرض شریعت کے حکم کے برعکس کروں اور کافر اور فاجر کی تکریم کرکے اس کو اپنی مجلس میں مقرب بناؤں اور مومن متقی کی توہین کرکے اس کو اپنی مجلس سے نکال دوں تو یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی صریح خلاف ورزی ہوگی اور اس صورت میں، میں اللہ عزوجل کے عذاب کا مستحق ہوں گا تو پھر بتاؤ مجھے اللہ کے عذاب سے کون بچائے گا؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں (از خود) غیب جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور جو لوگ تمہاری نظروں میں حقیر ہیں میں ان کے متعلق یہ نہیں کہتا کہ اللہ ہرگز ان کو کوئی خیر نہیں عطا فرمائے گا، اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے (اگر بالفرض میں ایسا کہوں) تو بے شک اس صورت میں، میں ظالموں میں سے ہو جاؤں گا O (ھود: ۳۱)

حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی ذات سے اللہ کے خزانے اور علم غیب کی نفی کرنا اور اس کی توجیہ

دنیا میں فضائل حقیقیہ روحانیہ کا مدار تین چیزوں پر ہے: ان میں سے ایک استغناء مطلق ہے اور دنیا میں عادت جاریہ یہ ہے کہ جو شخص مال کثیر کا مالک ہو اس کو غنی کہا جاتا ہے، اس لیے حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ میں استغناء مطلق کا دعویٰ نہیں کرتا، اور دوسری چیز ہے علم میں کمال اور مکمل علم۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: میں از خود غیب کو نہیں جانتا، اور تیسری چیز ہے کامل اور مکمل قدرت، اور لوگوں کے دلوں میں یہ بات مقرر ہے کہ مخلوقات میں سب سے زیادہ طاقت اور قدرت فرشتوں کو ہوتی ہے اور حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: میں یہ نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں، اور ان تین چیزوں کی نفی کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ان تینوں مراتب سے مجھے وہی کچھ حاصل ہے جو طاقت بشریہ اور قوت انسانیہ کے موافق ہے، رہا کمال مطلق تو میں اس کا دعویٰ نہیں کرتا۔ حضرت نوح علیہ السلام کا یہ کلام بطور تواضع ہے ورنہ بشمول حضرت نوح علیہ السلام تمام انبیاء علیہم السلام فرشتوں سے افضل ہیں۔

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا:

اگر تم میری تکذیب اس وجہ سے کرتے ہو اور میری پیروی اس لیے نہیں کرتے کہ میرے پاس زیادہ مال اور بڑا مرتبہ نہیں ہے تو میں نے کب اس کا دعویٰ کیا ہے اور میں نے کب تم سے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رزق کے خزانے اور اس کا مال میرے پاس ہے حتیٰ کہ تم اس معاملہ میں مجھ سے بحث کرو اور میری نبوت کا انکار کرو، میں نے تو صرف رسالت اور اللہ عزوجل کے پیغام پہنچانے کا دعویٰ کیا ہے، اور نہ میں نے یہ کہا ہے کہ میں از خود غیب کو جانتا ہوں حتیٰ کہ تم اس کے مستبعد ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کرو، اور میں نے جو نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور اللہ کے عذاب سے ڈرایا ہے وہ وحی کے ذریعہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے خبر دینے کی وجہ سے ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام نے نبوت کا دعویٰ کیا تو انہوں نے آپ سے متعدد غیب کی چیزوں کے متعلق سوال کیا تو حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: میں نے اللہ تعالیٰ کی دلیل کی وجہ سے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے بتلائے بغیر غیب کو نہیں جانتا، اور فرمایا: میں یہ نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں، اس میں کفار کے اس قول کا رد ہے کہ ہم آپ کو اپنے جیسا بشر ہی سمجھتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی نبوت کو رواج دینے کے لیے یہ نہیں کہا کہ میں فرشتہ ہوں حتیٰ کہ تم یہ کہو کہ آپ تو ہماری طرح بشر ہیں اور فرشتے نہیں ہیں کیونکہ بشریت نبوت کے منافی نہیں ہے، تم نے ان تین چیزوں کے نہ ہونے کو میری تکذیب کا ذریعہ بنایا ہے، حالانکہ میں نے ان میں

سے کسی چیز کا دعویٰ نہیں کیا۔ (روح المعانی ج ۱۲ ص ۶۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ)
اور جو لوگ تمہاری نظروں میں حقیر ہیں ان کے متعلق میں یہ نہیں کہتا کہ تمہارے حقیر سمجھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے ثواب کو کم کر دے گا یا ان کے اجور کو باطل کر دے گا، اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے پس وہ اس کے موافق ان کو جزا دے گا، اور اگر بالفرض میں ایسا کہوں تو پھر میں ظالموں میں سے ہو جاؤں گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انہوں نے کہا اے نوح! تم نے ہم سے بحث کی اور بہت زیادہ بحث کی، اب اگر تم سچے ہو تو وہ (عذاب) لے آؤ جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو○ (نوح نے کہا) اگر اللہ نے چاہا تو تم پر وہ عذاب اللہ ہی لائے گا، اور تم (اس کو) عاجز کرنے والے نہیں ہو○ اگر میں تم کو نصیحت کروں تو میں اپنی نصیحت سے تم کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا جب کہ اللہ تمہیں گمراہ کرنے کا ارادہ کر چکا ہو، وہی تمہارا رب ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے○ کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ اس (رسول) نے اس (قرآن) کو از خود گھڑ لیا ہے؟ آپ کہئے کہ اگر (بالفرض) میں نے اس کو گھڑ لیا ہے تو میرا گناہ میرے ذمہ ہے اور میں تمہارے گناہوں سے بری ہوں○ (ھود: ۳۵-۳۲)

جدال کا معنی

علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں: جدال کا معنی ہے بحث اور مناقشہ میں فریق مخالف پر غالب آنے کی کوشش کرنا۔ جدلت الحبل کا معنی ہے میں نے رسی کو مضبوطی سے بنایا، بٹ دیا، اور اجدل طاقت ور شکرے کو کہتے ہیں، اور اسی سے جدال بنا ہے گویا بحث اور مناقشہ کرنے والوں میں سے ہر فریق دوسرے کو اس کی رائے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ جدال کا معنی پچھاڑنا ہے، اور اپنے مخالف کو سخت زمین پر گراتا ہے۔ (المفردات ج ۱ ص ۱۱۷)

علامہ ابو عبد اللہ مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں: دین میں جدال کرنا محمود ہے، اسی وجہ سے حضرت نوح اور دیگر انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوموں سے جدال کیا تاکہ حق کا غلبہ ہو اور جس نے ان کے موقف کو قبول کر لیا وہ کامیاب اور کامران ہو گیا اور جس نے ان کے موقف کو مسترد کر دیا وہ ناکام اور نامراد ہو گیا اور ناحق جدال کرنا تاکہ باطل کو غلبہ ہو مذموم ہے اور ایسا جدال کرنے والا دنیا اور آخرت میں ملامت اور مذمت کیا جاتا ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۲۶)

حضرت نوح علیہ السلام کے جوابات پر کفار کے اعتراضات

سابقہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے دیئے ہوئے وہ جوابات بیان فرمائے تھے جو انہوں نے کفار کے شبہات میں دیئے تھے، ان کے جوابات پر کفار نے دو اعتراض کیے:

(۱) کفار نے حضرت نوح علیہ السلام کے جوابات کو جدال سے تعبیر کیا اور کہا کہ آپ نے بہت زیادہ جدال کیا ہے، اور یہ اس کی دلیل ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے ان سے بہت زیادہ بحث فرمائی تھی اور حضرت نوح علیہ السلام کا جدال توحید، نبوت اور آخرت کو ثابت کرنے کے لیے تھا، اس سے معلوم ہوا کہ حق کو ثابت کرنے کے لیے دلائل پیش کرنا اور شبہات کا ازالہ کرنا یہ وہ جدال ہے جو انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور آباء و اجداد کی اندھی تقلید، جہل اور گمراہی پر اصرار کرنا اور اس پر جدال کرنا کفار کا طریقہ ہے۔

(۲) حضرت نوح علیہ السلام ان کو جس عذاب سے ڈراتے تھے کفار نے ان سے اس عذاب کو بہ عجلت طلب کیا اور کہا: اگر آپ سچے ہیں تو ہمارے پاس اس عذاب کو جلد لے کر آئیں جس سے آپ ہم کو ڈراتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا تھا: اگر اللہ نے چاہا تو وہ عذاب تم پر اللہ ہی لائے گا، اور تم (اس کو) عاجز کرنے والے نہیں ہو، اس کا معنی یہ

ہے کہ عذاب کو نازل کرنا میری طرف مفوض نہیں ہے' یہ اللہ کا کام ہے وہ جب چاہے گا اس کو کرے گا اور اس کو کوئی عاجز کرنے والا نہیں ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کفار کو گمراہ کرنے کا ارادہ فرمائے تو پھر گمراہ ہونے میں ان کا کیا قصور ہے؟

پھر نوح علیہ السلام نے فرمایا: اگر میں تم کو نصیحت کروں تو میں تم کو اپنی نصیحت سے فائدہ نہیں پہنچا سکتا' جب کہ اللہ تم کو گمراہ کرنے کا ارادہ کر چکا ہو۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو گمراہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو پھر ان کے گمراہ ہونے میں ان کا کیا قصور ہے؟ نیز جب اللہ تعالیٰ نے ان کو گمراہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا تو پھر حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی ہدایت کے لیے بھیجنے کا کیا فائدہ تھا؟

امام رازی نے اس کے جواب میں لکھا ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ بندے سے اس کے کفر کا ارادہ کرتا ہے' اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے کفر کا ارادہ کرے تو پھر اس کا ایمان لانا محال ہے اور حضرت نوح علیہ السلام نے جو فرمایا تھا وہ ہمارے مذہب کی صحت پر صراحتاً دلالت کرتا ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۴۲۔۳۴۱' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۵ھ)

میں نے دیکھا کہ مفسرین میں سے کوئی بھی اس اعتراض کا جواب دینے کے درپے نہیں ہوا' میرے نزدیک اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ازل میں اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کافروں کو ایمان لانے یا نہ لانے کا اختیار عطا فرمائے گا' لیکن وہ ہدایت کو قبول کرنے کی بجائے اپنے آباء و اجداد کی اندھی تقلید پر جمے رہنے کو اختیار کریں گے اور ہٹ دھرمی سے کام لیں گے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے سوء اختیار کی بناء پر ان کے حق میں کفر کو مقدر کر دیا' اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو گمراہی پر رکھنے کا ارادہ فرمایا' اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ فرمانا ان کے اپنے اختیار کی وجہ سے ہے' اس لیے قیامت کے دن وہ یہ عذر پیش نہیں کر سکتے کہ جب تو نے ہی ہمیں گمراہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا تو ہدایت کو قبول نہ کرنے میں ہمارا کیا قصور ہے' اور نہ ہی حضرت نوح علیہ السلام کو ہدایت کے لیے بھیجنے کا عبث ہونا لازم آیا' کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام کے مسلسل ہدایت دینے کے باوجود انہوں نے اپنے اختیار سے ہدایت کو قبول نہیں کیا۔

انسان کے افعال کی قدرت میں مذاہب متکلمین اور جبر اور قدر کی وضاحت

بندے کے افعال پر قادر ہونے یا نہ ہونے کے متعلق متکلمین اسلام کے نظریات مختلف ہیں۔ جبریہ کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کو اپنے افعال پر کوئی اختیار نہیں ہے اور وہ شجر و حجر کی طرح مجبور محض ہے' اور معتزلہ کا یہ نظریہ ہے کہ انسان اپنے افعال کا خود خالق ہے' اور اہلسنت کا یہ نظریہ ہے کہ انسان اپنے افعال کا کسب کرتا ہے اور اس کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے' اور کسب کا معنی اختیار اور ارادہ ہے' جب بندہ کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں وہ فعل پیدا کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم تھا کہ بندہ کفر یا ایمان میں سے کس کو اختیار کرے گا اور اس کے اختیار کی بناء پر اللہ تعالیٰ اس کے اندر کفر یا ایمان میں سے کسی ایک کو پیدا کرے گا اور اس کے اسی علم کا نام تقدیر ہے۔ عام لوگوں کو تقدیر پر یہ خدشہ ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ہمارے متعلق یہ لکھ دیا تھا کہ ہم نیک اور بد افعال میں سے کیا کریں گے تو ہم نیکی یا بدی کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جبر اس وقت ہوتا جب ہم کو اختیار نہ دیا جاتا' جبر کی واضح مثال یہ ہے کہ ایک بچہ اپنے اختیار اور ارادہ سے سٹیڈیم میں کرکٹ میچ دیکھنے جانا چاہتا ہے لیکن اس کا باپ اس کو جبراً گھسیٹتے ہوئے اسکول لے کر جاتا ہے اور اس کو ہیڈ ماسٹر کے سپرد کر کے آتا ہے کہ اس کو چھٹی سے پہلے اسکول سے نکلنے نہ دینا' اب جتنے وقت وہ بچہ اسکول میں رہتا ہے اس کا دل و دماغ میچ ہی میں رہتا ہے اور وہ بے دلی سے اسکول میں وقت گزارتا ہے' یہ جبر ہے۔ اگر ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا کہ ہم اپنے

اختیار اور ارادہ سے نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں جانا چاہتے لیکن کوئی غیبی طاقت ہم کو سینما ہاؤس میں فلم دیکھنے لے جاتی اور ہم بے دلی سے فلم دیکھتے اور ہمارا دل اور دماغ نماز اور مسجد میں ہوتا تب تو یقیناً یہ جبر ہوتا' لیکن جب کہ ایسا نہیں ہوتا' ہمارا دل نماز پڑھنے کو چاہتا ہے تو ہم نماز پڑھتے ہیں اور ہمارا دل فلم دیکھنے کو چاہتا ہے تو ہم فلم دیکھتے ہیں' ہمارے تمام نیک اور بد افعال ہماری خواہش کے مطابق اور ہمارے اختیار اور ارادہ کے موافق ہوتے ہیں تو واضح ہو گیا کہ ہم پر جبر نہیں ہے اور ہم مختار ہیں اور اسی اختیار کی بناء پر ہم کو جزا یا سزا ملتی ہے' ہاں ہم پیدائش اور موت میں مجبور ہیں' ہم اپنے اختیار سے پیدا ہو سکتے ہیں' نہ اپنے اختیار سے مر سکتے ہیں' نہ اجل آنے پر موت کو موخر کر سکتے ہیں' لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل کے تعلیم یافتہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر فلاں شخص خاندانی منصوبہ بندی کی دوائیں اپنی بیوی کو کھلا دیتا تو اس کے اتنے بچے نہ ہوتے یا اگر فلاں شخص کو بروقت طبی امداد مل جاتی تو وہ نہ مرتا' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے جن کی پیدائش مقدر کر دی ہے وہ ہر حال میں پیدا ہوں گے اور کوئی دوا یا کوئی طریقہ ان کو پیدا ہونے سے روک نہیں سکتا' اور جس شخص کی موت کا اللہ تعالیٰ نے وقت مقدر کر دیا ہے کسی دوا یا کسی طریقہ سے اس کو اس وقت کے بعد موت سے بچایا نہیں جا سکتا۔ ان تعلیم یافتہ لوگوں پر حیرت ہوتی ہے کہ جن کاموں میں وہ مختار ہیں مثلاً نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے میں' ان میں خود کو مجبور کہتے ہیں اور جن امور میں وہ مجبور ہیں مثلاً پیدائش اور موت میں' ان میں خود کو مختار کہتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ امور تکوینیہ میں ہم مجبور ہیں اور امورِ تشریعیہ میں ہم مختار ہیں۔ امورِ تکوینیہ سے مراد وہ امور ہیں جن میں ہمارے فعل کا دخل نہیں ہے' مثلاً پیدا ہونا اور پیدائش میں مذکر یا مونث ہونا' مرنا' بارشوں کا ہونا' دریاؤں اور سمندروں میں طوفانوں کا آنا' زلزلوں کا آنا' آندھیوں کا آنا' گرمی' سردی اور برسات کے موسموں کا آنا اور امورِ تشریعیہ سے مراد احکامِ شرعیہ ہیں' جن میں ہمارے فعل کا دخل ہے۔

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ

اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ آپ کی قوم میں سے صرف وہی لوگ ایمان لانے والے تھے جو پہلے ایمان لا

اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ

چکے ہیں پس آپ ان کی کارروائی سے مغموم نہ ہوں ○ اور آپ ہماری نگرانی میں ہماری وحی

بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾

کے موافق کشتی بنایئے' اور ظالموں کے متعلق ہم سے کوئی بات نہ کریں کیونکہ وہ ضرور غرق کیے جائیں گے ○

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۟ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا

اور نوح کشتی بنا رہے تھے اور جب بھی ان کی قوم کے (کافر) سردار ان کے پاس سے گزرتے تو ان کا مذاق اڑاتے'

مِنْهُ ۭ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

نوح نے کہا اگر تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو تو جس طرح تم (اب) ہمارا مذاق اڑا رہے ہو تو وقت آنے پر ہم بھی تمہارا مذاق اڑائیں گے ○

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ

پھر عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور کس پر دائمی

عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٣٩﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا

عذاب آئے گا ○ حتیٰ کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور تنور ابلنے لگا تو ہم نے (نوح سے)

احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ

فرمایا: اس کشتی میں ہر قسم کے (نر اور مادہ) جوڑوں کو سوار کر لو اور اپنے گھر والوں کو بھی سوا ان کے

سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا

جن (کو غرق کرنے) کا فیصلہ ہو چکا ہے، اور ایمان والوں کو بھی سوار کر لو، اور ان پر کم لوگ ہی

قَلِيْلٌ ﴿٤٠﴾ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ

ایمان لائے تھے ○ اور نوح نے کہا اس کشتی میں سوار ہو جاؤ، اس کا چلنا اور ٹھیرنا اللہ ہی کے نام سے ہے

اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٤١﴾ وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ قف

بے شک میرا رب ضرور بخشنے والا، بے حد رحم فرمانے والا ہے ○ اور وہ کشتی انہیں پہاڑ جیسی موجوں میں لے کر جا رہی تھی؛

وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا

اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا جب کہ وہ ان سے الگ تھا اے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور کافروں

تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٤٢﴾ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ

کے ساتھ نہ رہو ○ اس نے کہا میں عنقریب کسی پہاڑ کی پناہ میں آ جاؤں گا جو مجھے پانی سے بچا لے گا،

الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ

نوح نے کہا آج اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہے سوا اس کے جس پر (خود) اللہ رحم فرمائے، اور

حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿٤٣﴾

ان دونوں (باپ، بیٹے) کے درمیان موج حائل ہو گئی سو وہ ڈوبنے والوں میں سے ہو گیا ○

قرأ حفص بفتح الميم وامالة الراء ۱۲

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ آپ کی قوم میں سے صرف وہی لوگ ایمان لانے والے تھے جو پہلے ایمان لاچکے ہیں پس آپ ان کی کارروائی سے مغموم نہ ہوں O (ھود: ۳۶)

امتناعِ کذب اور مسئلہ تقدیر

امام ابن جریر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے کافروں کے خلاف یہ دُعا کی:

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا۔ (نوح: ۲۶)

اور نوح نے دعا کی: اے میرے رب! زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑ۔

(جامع البیان جز ۱۲ رقم الحدیث: ۱۳۹۹۷)

جب حضرت نوح علیہ السلام نے یہ دُعا کرلی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی فرمائی کہ آپ کی قوم میں سے صرف وہی لوگ ایمان لانے والے تھے جو پہلے ایمان لاچکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے جن کافروں کے متعلق یہ خبر دی کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے ان کا بعد میں حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ سے ایمان لانا ممکن تھا یا محال تھا' اگر ان کا ایمان لانا محال تھا تو یہ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ کسی شخص کو امر محال کے ساتھ مکلف کرنا درست نہیں ہے اور اگر ان کا ایمان لانا ممکن تھا تو یہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ اس سے لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کی خبر کا کذب ہونا ممکن ہو اور اس کے علم کا جہل ہونا ممکن ہو اور یہ محال ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا ایمان لانا ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے' اللہ تعالیٰ کی خبر دینے سے قطع نظر فی نفسہ ان کا ایمان لانا ممکن ہے اور اسی لحاظ سے ان کا ایمان لانا ممکن ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دے دی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے اس اعتبار سے ان کا ایمان لانا ممتنع بالغیر ہے کیونکہ ان کے ایمان لانے سے اللہ تعالیٰ کی خبر کا کذب ہونا اور اس کے علم کا جہل ہونا لازم آئے گا اور وہ محال بالذات ہے۔

اور یہاں سے مسئلہ تقدیر بھی واضح ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے یہ کفار اپنے اختیار سے ایمان نہیں لائیں گے اس لیے اس نے فرمادیا کہ آپ کی قوم میں سے صرف وہی لوگ ایمان لانے والے تھے جو پہلے ایمان لاچکے ہیں۔ اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے البقرہ: ۶ کا مطالعہ فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور آپ ہماری نگرانی میں ہماری وحی کے موافق کشتی بنایئے' اور ظالموں کے متعلق ہم سے کوئی بات نہ کریں کیونکہ وہ ضرور غرق کیے جائیں گے O (ھود: ۳۷)

جان بچانے کے وجوب پر بعض مسائل کی تفریع

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو یہ بتا دیا کہ ان کی قوم میں سے صرف وہی لوگ ایمان لانے والے تھے جو پہلے ایمان لاچکے ہیں' اس کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام یہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ ان کافروں کو عذاب دینے والا ہے اور چونکہ عذاب کئی طریقوں سے آسکتا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو یہ بتایا کہ وہ عذاب از قبیل غرقابی ہوگا اور غرقابی اور ڈوبنے سے نجات کی صورت صرف کشتی سے ہوسکتی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو کشتی بنانے کا حکم دیا۔ مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ امر اباحت کے لیے تھا یا وجوب کے لیے' صحیح یہ ہے کہ یہ امر وجوب کے لیے تھا' کیونکہ اس وقت جان بچانا صرف کشتی کے ذریعہ ممکن تھا' اور جان بچانا واجب ہے اور جس پر واجب موقوف ہو وہ بھی واجب ہوتا ہے اس لیے کشتی کا بنانا واجب ہے۔ اور اس قاعدہ پر کئی مسائل متفرع ہوتے ہیں مثلاً اگر کوئی مسلمان ماہر ڈاکٹر یہ کہے کہ اگر فلاں شخص

کے جسم میں خون نہ پہنچایا گیا تو وہ مرجائے گا تو اس کے جسم میں خون منتقل کرنا واجب ہے' اسی طرح اگر کسی عورت کا بغیر آپریشن کے بچہ پیدا نہ ہوتا ہو اور مسلمان ماہر ڈاکٹر یہ کہے کہ اب اس کے پیٹ میں مزید آپریشن کی گنجائش نہیں ہے تو اس کی نل بندی کرنا واجب ہے' اسی طرح اگر کسی شخص کے دونوں گردے ناکارہ ہو گئے ہوں اور اس کو صحیح گردہ فراہم کردیا جائے تو اس کی جان بچانے کے لیے اس پر واجب ہے کہ وہ اس گردہ سے پیوند لگوا لے' تاہم ہمارے نزدیک کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ پیوند کاری کے لیے اپنا گردہ نکلوا کر کسی کو ہبہ کرے۔ بعض علماء نے پیوند کاری کے لیے اپنے اعضاء نکلوانے پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے:

امام عبداللہ بن احمد اور امام طبرانی نے ان الفاظ سے یہ حدیث روایت کی ہے: حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے اپنے جسم سے کسی چیز کو صدقہ کیا اس کو بقدر صدقہ اجر دیا جائے گا۔ (مجمع الزوائد ج ۶ ص ۳۰۲' الجامع الصغیر رقم الحدیث: ۸۵۹۵)

البتہ امام احمد نے اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے جسم میں کوئی زخم لگے اور وہ اس کو صدقہ کردے تو جتنا وہ صدقہ کرے گا اللہ اتنا اس کے گناہوں کا کفارہ کردے گا۔ (اس حدیث کی سند صحیح ہے) (مسند احمد ج ۵ ص ۳۱۶' طبع قدیم' مسند احمد ج ۵ رقم الحدیث: ۲۲۷۰۷' مطبوعہ عالم الکتب بیروت' ۱۴۱۹ھ)

اس حدیث کا ظاہر معنی یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی شخص پر ظلم کیا اور اس کا کوئی عضو کاٹ کر اس کی منفعت زائل کردی اور اس مظلوم نے اس ظالم کو معاف کردیا تو اللہ تعالیٰ اس کو بقدر جنایت اجر عطا فرمائے گا' امام احمد کی سند صحیح ہے۔

ہمارے نزدیک کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے جسم کا کوئی عضو نکلوا کر کسی شخص کو ہبہ کردے' کیونکہ کوئی شخص اپنے جسم کا مالک نہیں ہے اور اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے جسم کو ہلاکت میں یا ہلاکت کے خطرہ میں ڈال دے۔ شرح صحیح مسلم جلد ثانی میں ہم نے اعضاء کی پیوند کاری پر تفصیل سے بحث کی ہے' البتہ اگر کسی شخص کو کوئی عضو دے دیا گیا ہو اور اس کو ہلاکت کا خطرہ ہو تو جان بچانے کے لیے اس پر واجب ہے کہ وہ اس عضو سے پیوند کاری کرائے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات متشابہات میں متاخرین کا مسلک

اس آیت میں فرمایا ہے: واصنع الفلک باعیننا "ہماری آنکھوں کے سامنے کشتی بنایئے۔" اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے لیے آنکھوں کے ثبوت کا ذکر ہے۔ امام فخرالدین رازی متوفی ۶۰۶ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

دلائل قطعیہ عقلیہ سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ اعضاء' جوارح' اجزاء اور حصوں سے منزہ ہے لہٰذا اس آیت کی تاویل کرنا واجب ہے اور اس کی حسبِ ذیل وجوہ ہیں:

(۱) اس سے مراد ہے کہ آپ فرشتوں کی آنکھوں کے سامنے کشتی بنایئے جن کو معلوم ہے کہ کشتی کس طرح بنائی جاتی ہے۔

(۲) کسی چیز پر آنکھ رکھنا اس کی حفاظت کرنے سے کنایہ ہے' اور اس آیت کا معنی ہے آپ ہماری حفاظت میں کشتی بنایئے۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۴۴' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

قرآنِ مجید اور احادیثِ صحیحہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے جسمانی اعضاء اور ان کے عوارض اور لوازم کا ذکر ہے' جیسے ید (ہاتھ)' ساق (پنڈلی)' عین (آنکھ) اور احادیث میں ہے: اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے' اس کی طرف پاک کلمے چڑھتے ہیں' وہ آسمانِ دنیا کی طرف نازل ہوتا ہے' ائمہ متقدمین کا مذہب یہ تھا کہ یہ سب اللہ کی صفات ہیں اور ان کی کیفیت کا اللہ ہی کو علم ہے لیکن اس

کی یہ صفات مخلوق کی صفات کے مشابہ نہیں ہیں مثلاً اس کا ہاتھ ہے لیکن وہ کیسا ہاتھ ہے؟ یہ اللہ ہی کو معلوم ہے تاہم اس کا ہاتھ مخلوق کے ہاتھوں کی طرح نہیں ہے اور متاخرین علماء نے یہ سمجھا کہ ان صفات کا ثبوت اللہ تعالیٰ کے لیے محال ہے اس لیے انہوں نے ان صفات میں تاویلات کیں اور کہا کہ مثلاً ید (ہاتھ) سے مراد قدرت اور غلبہ ہے اور عین (آنکھ) سے مراد حفاظت ہے، اور جہاں حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا کی طرف نازل ہوتا ہے، اس سے مراد ہے اس کی رحمت نازل ہوتی ہے، علی ھذا القیاس، اب ہم اس مسئلہ میں ائمہ متقدمین کے مذاہب بیان کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفات متشابہات میں متقدمین کا مسلک

امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت متوفی ۱۵۰ھ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کی نہ کوئی حد ہے، نہ کوئی ضد ہے، نہ کوئی اس کا شریک ہے اور نہ کوئی اس کی مثل ہے، اور اس کا ہاتھ ہے اور اس کا چہرہ ہے اور اس کا نفس ہے اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے چہرہ، ہاتھ اور نفس کا ذکر کیا ہے، پس وہ اس کی صفات بلا کیف ہیں، اور یہ نہ کہا جائے کہ اس کے ہاتھ سے مراد اس کی قدرت یا نعمت ہے کیونکہ اس قول سے اللہ تعالیٰ کی صفات کو باطل کرنا لازم آتا ہے۔ (فقہ اکبر مع شرحہ ص ۳۷-۳۶، مطبوعہ مصر، ۱۳۷۵ھ)

الامام الحسین بن مسعود البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ ثم استوی علی العرش کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

کلبی اور مقاتل نے کہا: استوی کا معنی استقر ہے (رحمٰن عرش پر برقرار ہے) ابو عبیدہ نے کہا: اس کا معنی ہے عرش پر چڑھا اور معتزلہ نے الاستواء کی تاویل استیلاء سے کی ہے (وہ عرش پر غالب ہے) اور رہے اہلسنت تو وہ کہتے ہیں کہ عرش پر استواء اللہ تعالیٰ کی صفت بلا کیف ہے، انسان پر واجب ہے کہ وہ استواء پر ایمان لائے اور اس کا علم اللہ عزوجل کے سپرد کر دے۔ ایک شخص نے امام مالک بن انس سے اس آیت کے متعلق سوال کیا: الرحمن علی العرش استوی کہ استواء کی کیا کیفیت ہے۔ امام مالک نے تھوڑی دیر سر جھکایا اور ان کو پسینہ آگیا پھر انہوں نے کہا: استواء کا معنی معلوم ہے (معتدل و مستقیم ہونا، جم کر بیٹھنا) اور اس کی کیفیت عقل میں نہیں آسکتی اور اس پر ایمان لانا واجب ہے، اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے اور میرے گمان میں تم محض گمراہ ہو، پھر امام مالک کے حکم سے اس کو نکال دیا گیا۔ اور سفیان ثوری، اوزاعی، لیث بن سعد، سفیان بن عیینہ، عبد اللہ بن مبارک اور ان کے علاوہ دیگر علماء اہلسنت سے صفات متشابہات کے متعلق مروی ہے کہ جس طرح یہ صفات وارد ہوئی ہیں ان کو اسی طرح بلا کیف ماننا چاہیے۔

(معالم التنزیل ج ۲ ص ۱۳۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ)

شیخ تقی الدین احمد بن تیمیہ الحرانی الحنبلی المتوفی ۷۲۸ھ نے اپنے فتاویٰ میں اس مسئلہ پر متعدد جگہ بحث کی ہے، اگر ان تمام ابحاث کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل اور مفصل کتاب بن سکتی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

امام احمد رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اسی صفت کے ساتھ موصوف کیا جائے جس صفت کے ساتھ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو متصف کیا ہے یا جس صفت کے ساتھ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موصوف کیا ہے، اور قرآن اور حدیث سے تجاوز نہ کیا جائے۔

اور سلف کا مذہب یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وہی صفت بیان کرتے تھے جو اللہ نے خود اپنی صفت بیان کی ہے یا جو صفت اس کے رسول نے بیان کی ہے، بغیر کسی تحریف اور تعطیل کے اور بغیر کسی تکییف اور تمثیل کے (تحریف سے مراد ہے مثلاً ہاتھ سے مراد قوت اور نعمت لینا، اور تعطیل سے مراد اللہ تعالیٰ کی ان صفات کی نفی کرنا اور کہنا اللہ تعالیٰ کا ہاتھ نہیں ہے، اور

تکییف سے مراد ہے یہ کہنا کہ اس کا ہاتھ اس کیفیت کا ہے یا وہ عرش پر اس طرح بیٹھا ہے یا وہ آسمانِ دنیا کی طرف اس طرح نازل ہوتا ہے اور تمثیل سے مراد ہے یہ کہنا کہ اس کا ہاتھ مخلوق کے ہاتھ کی مثل ہے، اور یوں ایمان رکھا جائے کہ اللہ کا ہاتھ ہے اور وہ کیسا ہے اور کس طرح ہے یہ ہم کو معلوم نہیں ہے، البتہ وہ مخلوق میں سے کسی کی مثل نہیں ہے، وہ ہاتھ اس طرح ہے جیسے اس کی شان کے لائق ہے) ہم کو یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جو صفت بیان کی ہے وہ برحق ہے، اس میں کوئی پہیلی یا بجھارت نہیں ہے اور اس کے باوجود اللہ سبحانہ کی کوئی مثل نہیں ہے، اس کی ذات کی کوئی مثل ہے نہ اس کے اسماء اور صفات کی اور نہ اس کے افعال کی، پس جس طرح ہم کو یہ یقین ہے کہ اس کی ذات اور اس کے افعال کی حقیقت ہے اسی طرح ہم کو یہ یقین ہے کہ اس کی صفات بھی حقیقی ہیں اور اس کی ذات، اور اس کی صفات کی اور اس کے افعال کی کوئی مثل نہیں ہے اور ہر وہ چیز جو کسی نقص یا حدوث کو واجب کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے حقیقتاً منزہ ہے اور اللہ سبحانہ اس کمال کا مستحق ہے جس سے بڑھ کر کمال متصور نہیں ہے۔

اور سلف کا مذہب تعطیل اور تمثیل کے درمیان ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے ساتھ تشبیہ نہیں دیتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو مخلوق کی ذات کے ساتھ تشبیہ نہیں دیتے، اور اللہ تعالیٰ سے ان صفات کی نفی نہیں کرتے جن صفات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو متصف کیا ہے اور اس کے رسول نے ان صفات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف کیا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ اور اس کی عالی صفات کو معطل نہیں کرتے اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلمات کو ان کے معانی سے موڑ کر تحریف کرتے ہیں اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی آیات میں الحاد کرتے ہیں۔

جو علماء اللہ تعالیٰ کی صفات کو معطل کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کا وہی معنی سمجھتے ہیں جو معنی مخلوق کی صفات کا ہے، پس جب کسی کہنے والے نے یہ کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہو تو لازم آئے گا یا تو وہ عرش سے اکبر ہو یا اصغر ہو یا مساوی ہو اور ان میں سے ہر صورت محال ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے عرش کے اوپر ہونے کا وہی معنی سمجھا ہے جس طرح ایک جسم دوسرے جسم کے اوپر ہوتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا وہ معنی لیا جائے جو اس کی شان کے لائق ہے اور اس کے ساتھ خاص ہے تو پھر یہ خرابی لازم نہیں آتی، اور ان کا یہ استدلال تو ایسا ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ اگر اس جہان کا کوئی بنانے والا ہے تو پھر وہ جوہر ہے یا عرض ہے کیونکہ ہر موجود جوہر ہے یا عرض ہے اور ان دونوں کا صانع اور خالق ہونا محال ہے تو پھر ثابت ہوا کہ اس جہان کے لیے کسی خالق کا ہونا محال ہے۔

اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا صحیح معنی یہ ہے کہ وہ عرش پر اس استواء کے ساتھ مستوی ہے جو اس کی شانِ جلال کے موافق ہے اور اس کے ساتھ مختص ہے، پس جس طرح اس کی یہ صفت ہے کہ وہ ہر چیز کا عالم ہے اور ہر چیز پر قادر ہے اور وہ سمیع اور بصیر ہے اسی طرح اس کی یہ صفت ہے کہ وہ عرش پر مستوی ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ کے لیے علم اور قدرت کے اثبات سے یہ لازم نہیں آتا کہ علم اور قدرت کے جو مخلوق کے عوارض ہیں ان کا ثبوت اللہ تعالیٰ کے لیے لازم آئے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لیے استواء کے ثبوت سے یہ لازم نہیں آتا کہ مخلوق کے استواء کے جو عوارض ہیں، ان کا ثبوت اللہ کے لیے لازم آئے، اور اللہ عزوجل عرش کے اوپر ہے، یہ اس طرح نہیں ہے جس طرح مخلوق میں سے کوئی چیز دوسرے کے اوپر ہوتی ہے اور یاد رکھو کہ سلف کے طریقہ کی مخالفت پر کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی۔

(مجموعۃ الفتاویٰ ج ۵ ص ۲۱-۲۰، مطبوعہ دار الجیل بیروت، ۱۴۱۸ھ)

اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ قرآن مجید کی وہ آیات اور وہ احادیث پیش کریں جن میں ان صفات کا ذکر ہے جن کو متقدمین بغیر

کسی تاویل کے مانتے ہیں اور متاخرین ان میں تاویل کرتے ہیں اور ان کی عقلی توجیہات کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفات متشابہات کے متعلق قرآنِ مجید کی آیات

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ۔ (الشوریٰ: ۱۱) اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں ہے اور وہ بہت سننے والا، بہت دیکھنے والا ہے۔

اللہ عزوجل سننے والا ہے اور دیکھنے والا ہے لیکن اس کا سننا اور دیکھنا اپنی شان کے مطابق ہے۔ وہ مخلوق کی طرح کانوں سے نہیں سنتا اور نہ آنکھوں سے دیکھتا ہے۔

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ (الحدید: ۳) اور وہ ہر چیز کا عالم ہے۔

اللہ عالم ہے، لیکن اس کا علم اس کی شان کے مطابق ہے، مخلوق کی طرح نہیں کہ ذہن میں کوئی چیز منکشف ہو یا قوت مدرکہ کے سامنے کوئی چیز حاضر ہو، یا مدرک کے سامنے حالت ادراکیہ یا حالت انجلائیہ ہو یا عقل میں کسی چیز کی صورت حاصل ہو۔

وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ۔ (یوسف: ۶۴) وہ تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ رحم فرماتا ہے لیکن اپنی شان کے مطابق رحم فرماتا ہے، اس کا رحم مخلوق کی طرح نہیں کہ دل میں رقت پیدا ہو۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ۔ (النساء: ۹۳) جس شخص نے کسی مومن کو عمداً قتل کیا، اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اللہ اس پر غضب فرماتا ہے اور اس پر لعنت فرماتا ہے۔

اللہ اپنی شان کے لائق غضب فرماتا ہے، مخلوق کے غضب کی طرح نہیں کہ خون جوش مارنے لگے اور بلڈ پریشر ہائی ہو جائے۔

وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا○ (الفجر: ۲۲) اور آپ کا رب آیا اور فرشتے صف بہ صف حاضر ہوئے۔

اللہ کا آنا بھی اس کی شان کے موافق ہے، مخلوق کے آنے کی طرح نہیں ہے کہ جہاں پہلے نہ ہو وہاں چل کر آ جائے۔

وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ۔ (الرحمٰن: ۲۷) اور آپ کے رب کا چہرہ باقی رہے گا۔

اللہ تعالیٰ کا چہرہ اس کی شان کے موافق ہے، مخلوق کے چہرے کی طرح نہیں جو جسمانی ساخت کو مستلزم ہے۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا۔ (الطور: ۴۸) آپ اپنے رب کے فیصلہ پر صبر کریں کیونکہ آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی آنکھیں اس کی شان کے لائق ہیں، مخلوق کی آنکھوں کی طرح نہیں جو جسمیت کو مستلزم ہیں۔

مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ۔ (ص: ۷۵) تجھ کو جس چیز نے اس کو سجدہ کرنے سے روکا جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔

اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اس کی شان کے لائق ہیں مخلوق کے ہاتھوں کی طرح نہیں جو جسم کے اجزاء اور اعضاء ہیں۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى۔ (طٰہٰ: ۵) رحمٰن عرش پر بیٹھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا عرش پر بیٹھنا اس کی شان کے لائق ہے، مخلوق کے بیٹھنے کی طرح نہیں ہے جو جسمانی وضع کو مستلزم ہے۔
وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ (النساء: ۱۶۴) اور اللہ نے موسیٰ سے بکثرت کلام فرمایا۔
اللہ کا کلام کرنا اس کی شان کے لائق ہے، مخلوق کے کلام کی طرح نہیں ہے جو زبان اور ہونٹوں کی حرکت اور آواز کو مستلزم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات متشابہات کے متعلق احادیث

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر رات کو جب آخری تہائی حصہ ہوتا ہے تو ہمارا رب تبارک و تعالیٰ آسمانِ دنیا کی طرف نازل ہوتا ہے اور فرماتا ہے: کوئی ہے جو مجھ سے دعا کرے تو میں اس کی دعا قبول کروں، کوئی ہے جو مجھ سے سوال کرے تو میں اس کو عطا کروں، کوئی ہے جو مجھ سے مغفرت طلب کرے تو میں اس کی مغفرت کروں!

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۱۴۵، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۷۵۸، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۳۱۴، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۴۹۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۳۶۶، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۷۷۶۸)

اللہ تعالیٰ کا آسمانِ دنیا پر اُترنا اس کی شان کے لائق ہے، مخلوق کے اُترنے کی مثل نہیں ہے جو جسم ہونے کو مستلزم ہے۔
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ دو آدمیوں کی طرف (دیکھ کر) ہنستا ہے، ان میں سے ایک دوسرے کو قتل کرتا ہے اور دونوں جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! یہ کیسے ہو گا؟ فرمایا: ایک شخص اللہ کی راہ میں قتال کرتا ہے اور شہید ہو جاتا ہے، پھر اللہ اس کے قاتل کو توبہ کی توفیق دیتا ہے، پس وہ مسلمان ہو جاتا ہے اور اللہ عزوجل کی راہ میں قتال کر کے شہید ہو جاتا ہے۔ (جیسے حضرت حمزہ اور حضرت وحشی رضی اللہ عنہما) (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۸۲۶، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۸۹۰، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۱۶۵)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا اس کا بھائی بیمار ہو وہ یہ دُعا کرے: اے ہمارے رب اللہ جو آسمان میں ہے، تیرا نام مقدس ہے، تیرا حکم آسمان اور زمین میں ہے، جس طرح تیری رحمت آسمان میں ہے تو اپنی رحمت زمین میں کر دے، ہمارے گناہوں اور خطاؤں کو بخش دے، تو پاک لوگوں کا رب ہے، اپنی رحمت میں سے رحمت نازل فرما اور اس تکلیف پر اپنی شفاء میں سے شفاء نازل فرما۔ پھر وہ شخص تندرست ہو جائے گا۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۸۹۲، مسند احمد ج ۶ ص ۲۱)

اللہ تعالیٰ کا آسمان میں ہونا اس کی شان کے موافق ہے، مخلوق کی طرح نہیں کہ آسمان اس کے لیے ظرف بن جائے۔
حضرت معاویہ بن حکم سلمی سے ایک طویل حدیث مروی ہے، انہوں نے غصہ میں اپنی ایک باندی کے تھپڑ مار دیا، پھر وہ اس پر سخت نادم ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا میں اس کو آزاد نہ کر دوں! آپ نے فرمایا: اس باندی کو میرے پاس لاؤ، میں اس کو لے کر آیا۔ آپ نے اس سے پوچھا: اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا: آسمان میں۔ پھر فرمایا: میں کون ہوں؟ اس نے کہا: آپ رسول اللہ ہیں۔ آپ نے فرمایا: اس کو آزاد کر دو، یہ مومن ہے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۵۳۵، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۹۳۰، سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۲۱۸، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۱۴۱)
اس حدیث کا بھی یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق آسمان میں ہے۔

حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک کشادہ ریتیلے نالہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت ایک بادل گزرا، آپ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا: تم اس کو کیا کہتے ہو؟ ہم نے کہا: سحاب۔ آپ نے فرمایا: اور مزن؟ ہم نے کہا: مزن۔ (ان تمام لفظوں کا معنی بادل ہے) آپ نے پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ آسمان اور زمین کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ ہم نے کہا: ہم نہیں جانتے۔ آپ نے فرمایا: ان کے درمیان اکہتر یا بہتر یا تہتر سال کی مسافت ہے۔ (ترمذی کی روایت میں ہے پانچ سو سال کی مسافت ہے) اسی طرح آپ نے سات آسمانوں کو گنا اور ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے، اس کی گہرائی کا اتنا فاصلہ ہے جتنا دو آسمانوں کے درمیان فاصلہ ہے، اور اس کے اوپر پہاڑی بکروں کی شکل میں آٹھ فرشتے ہیں ان کے کھروں اور گھٹنوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا دو آسمانوں کے درمیان فاصلہ ہے، پھر ان کی پشتوں کے اوپر عرش اور اس کے نچلے حصے اور اوپر کے حصے کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا دو آسمانوں کے درمیان فاصلہ ہے، پھر اس کے اوپر اللہ تعالیٰ ہے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۲۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۳۲۰، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۹۳، مسند احمد ج۱ ص۲۰۶،۲۰۷)

اللہ تعالیٰ کا عرش کے اُوپر ہونا اس کی شان کے موافق ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں کو جہنم میں ڈالا جائے گا اور جہنم یہ کہے گی: کیا کچھ اور زیادہ ہیں! پھر اللہ اس میں اپنا قدم رکھ دے گا، پھر وہ کہے گی: بس بس! (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۸۴۸)

اللہ تعالیٰ کا قدم اس کی شان کے موافق ہے اور قدم سے اللہ تعالیٰ کی کیا مراد ہے؟ یہ وہی جانتا ہے۔

متاخرین کے اختلاف کا منشاء

صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، فقہاء مجتہدین اور تمام متقدمین علماء کا یہی نظریہ تھا کہ قرآن اور حدیث میں اللہ تعالیٰ کی جن صفات متشابہات کا ذکر ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں اور اس کی کوئی صفت مخلوق کی کسی صفت کے مشابہ نہیں ہے اور اس صفت سے اس کی کیا مراد ہے، یہ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، لیکن متاخرین علماء نے جب یہ دیکھا کہ مخالفین اسلام ان صفات کی وجہ سے اسلام پر طعن و تشنیع کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے خدا کے ہاتھ اور پیر ہیں، اس کا چہرہ ہے اور اس کی آنکھیں ہیں، وہ ہنستا ہے، وہ چلتا ہے اور نیچے اُترتا ہے اور یہ تمام چیزیں جسم کے عوارض ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا خدا جسم ہے اور ہر جسم حادث اور ممکن ہوتا ہے تو مسلمان حادث اور ممکن کو خدا مانتے ہیں۔ پس متاخرین علماء نے ان اعتراضات کو دُور کرنے کے لیے ان صفات کی تاویلیں کیں اور ان کے محامل بیان کیے۔ انہوں نے کہا: ہاتھ سے مراد قوت اور نعمت ہے، آنکھوں سے مراد اس کی نگرانی اور حفاظت ہے، کشف ساق، (القلم: ۴۲) پنڈلی کھولنے سے مراد قیامت کی شدتیں اور ہولناکیاں ہیں، اسی طرح انہوں نے جہنم میں قدم رکھنے کی یہ تاویل کی کہ کسی چیز کو اپنے قدم کے نیچے رکھنے سے مراد اس چیز کو ذلیل کرنا ہوتا ہے اور یہاں یہ مراد ہے کہ جب جہنم تیزی اور طراری دکھائے گی اور کہے گی: کیا کچھ اور زیادہ ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کر دے گا، ہنسنے سے مراد اس کا راضی ہونا ہے اور اُترنے سے مراد اس کی رحمت کا متوجہ ہونا ہے، سو متاخرین علماء نے اسی قسم کی تاویلات کر کے اسلام سے اعتراضات دُور کرنے کی سعی کی، فجزاھم اللہ تعالی عنا وعن سائر المسلمین خیر الجزاء۔

علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی ۷۹۱ھ شرح عقائد میں لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے (جسم سے) منزہ ہونے پر

دلائل قطعیہ قائم ہیں اس لیے نصوص کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا واجب ہے جیسا کہ متقدمین کا طریقہ ہے، کیونکہ اسی میں سلامتی ہے یا ان کی صحیح تاویلات کی جائیں جیسا کہ متاخرین علماء نے جاہلوں کے اعتراضات دُور کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا تاکہ جو کم علم مسلمان ہیں وہ اسلام سے برگشتہ نہ ہوں۔ (شرح عقائد نسفی ص ۳۴، مطبوعہ کراچی)

علامہ عبدالعزیز پرہاروی اس عبارت کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ علماء اہلسنّت کا اس پر اجماع ہے کہ ان صفات متشابہات کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں، پھر ان میں علماء کے دو مذہب ہیں: متقدمین کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم اور جسم کی مشابہت سے منزہ ہے، ہم ان صفات پر ایمان لاتے ہیں اور ان صفات سے کیا مراد ہے اور یہ صفات کس کیفیت سے ہیں اس کو ہم اللہ پر چھوڑتے ہیں۔ انہوں نے کہا: پیروں پر قائم ہونا اور ہاتھ اور پیر اور باقی وہ تمام صفات جن کا قرآن اور حدیث میں ذکر ہے وہ سب اللہ سبحانہ کی صفات ہیں جن کی حقیقت کا ہم کو علم نہیں ہے، اور فقہ اکبر میں امام اعظم کی طرف یہ منسوب ہے کہ ان صفات کی تاویل کرنے سے ان صفات کو باطل کرنا لازم آتا ہے اور یہ معتزلہ کا قول ہے اور دوسرا مذہب متاخرین کا ہے جو ان صفات کی اللہ تعالیٰ کی شان کے موافق تاویل کرتے ہیں کیونکہ ان کے زمانہ میں بدمذہب اسلام پر اعتراض کرتے تھے اور عام مسلمانوں کو شکوک اور شبہات میں ڈالتے تھے۔ (نبراس ص ۱۸۶-۱۸۵، مطبوعہ شاہ عبدالحق اکیڈمی بندیال، ۱۳۹۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور نوح کشتی بنا رہے تھے اور جب بھی ان کی قوم کے (کافر) سردار ان کے پاس سے گزرتے تو ان کا مذاق اُڑاتے، نوح نے کہا اگر تم ہمارا مذاق اُڑا رہے ہو تو جس طرح تم (اب) ہمارا مذاق اُڑا رہے ہو تو (وقت آنے پر) ہم بھی تمہارا مذاق اُڑائیں گے○ پھر عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رُسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور کس پر دائمی عذاب آئے گا○ (ھود: ۳۹-۳۸)

کشتی بنانے کی کیفیت، اس کی مقدار اور اس کو بنانے کی مدت کی تفصیل

امام عبدالرحمن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! کشتی کی کیا تعریف ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ لکڑی کا ایک گھر ہے جو سطح آب پر چلتا ہے، میں اپنے عبادت گزاروں کو اس میں نجات دوں گا، اور اپنی نافرمانی کرنے والوں کو غرق کر دوں گا، اور بے شک میں جو چاہوں اس پر قادر ہوں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب! لکڑی کہاں ہے؟ فرمایا: تم درخت اگاؤ۔ حضرت نوح علیہ السلام نے بیس سال تک ساگوان کے درخت اگائے، اس عرصہ میں حضرت نوح علیہ السلام نے ان کو دعوت دینا ترک کر دیا اور انہوں نے بھی حضرت نوح علیہ السلام کو تنگ کرنا چھوڑ دیا، البتہ ان کا مذاق اُڑاتے رہے۔ جب درخت تیار ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ وہ درختوں کو کاٹیں اور سکھائیں، پھر حضرت نوح نے پوچھا: اے میرے رب! میں یہ گھر کیسے بناؤں؟ فرمایا: اس کا سر مور کی طرح بناؤ اور اس کے اگلے حصہ کو پرندے کے سینہ کی طرح بناؤ اور اس کا دھڑ مرغ کے دھڑ کی طرح بناؤ اور اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو انہیں کشتی بنانے کی تعلیم کے لیے بھیجا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ کشتی بنانے کا عمل جلد مکمل کریں، کیونکہ نافرمانی کرنے والوں پر میرا غضب بہت شدید ہے۔ پھر حضرت نوح نے اُجرت پر کچھ لوگوں کو کام پر لگایا اور ان کے بیٹوں میں سے سام، حام اور یافث بھی ان کے ساتھ کشتی بنا رہے تھے۔ انہوں نے وہ کشتی چھ سو ہاتھ لمبی بنائی اور اس کا عرض اور اس کا عمق تینتیس تینتیس ہاتھ تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے زمین سے تارکول نکالا جس کو انہوں نے کشتی پر ملا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس کشتی کی تین منزلیں تھیں، پہلی منزل میں وحشی جانور، درندے اور حشرات الارض تھے، دوسری منزل میں چوپائے اور

دوسرے حیوان تھے اور سب سے اوپر تیسری منزل میں حضرت نوح اور ان کے ساتھ ایمان والے تھے۔ حسن سے روایت ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کا طول بارہ سو ہاتھ اور عرض چھ سو ہاتھ تھا۔ قتادہ نے کہا: اس کا طول تین سو ہاتھ اور عرض پانچ سو ہاتھ تھا اور اس کا عمق پانچ سو ہاتھ تھا۔ ابن جریج نے کہا: اس کا طول تین سو ہاتھ، اس کا عرض ڈیڑھ سو ہاتھ اور اس کا عمق تیس ہاتھ تھا۔ اس کی بالائی منزل میں پرندے، درمیانی منزل میں حضرت نوح اور ایمان والے تھے اور اس کی نچلی منزل میں درندے تھے۔ (زاد المسیر ج ۴ ص ۱۰۳۔ ۱۰۲، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

کشتی بنانے میں کتنا عرصہ لگا؟ اس میں بھی کئی اقوال ہیں۔ عمرو بن الحارث سے روایت ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے چالیس سال میں کشتی بنائی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ دو سال میں کشتی بنائی اور کعب سے روایت ہے کہ چالیس سال میں کشتی بنائی۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۲۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

کشتی کے سائز میں جو مختلف اقوال نقل کیے گئے ہیں (اسی طرح اس کو بنانے کی مدت میں) ان کی معرفت کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ اس کی معرفت میں کوئی فائدہ ہے اور اس میں غور و فکر کرنا فضول ہے جبکہ ہمارے پاس کوئی قطعی دلیل نہیں ہے جس سے صحیح مقدار یا صحیح مدت معلوم ہو سکے، اور جس چیز کا ہمیں علم ہے وہ یہ ہے کہ کشتی میں اتنی گنجائش تھی کہ اس میں حضرت نوح علیہ السلام اور ایمان والے آ سکیں، اور جن جانوروں کو وہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے وہ بھی اس میں آ سکیں، کیونکہ یہ چیز ہمیں قرآن مجید سے معلوم ہے، رہا یہ کہ اس کا سائز کیا تھا اور اس کو بنانے میں کتنی مدت لگی؟ اس کا قرآنِ مجید میں ذکر نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۴۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

کشتی بنانے کا مذاق اُڑانے کی وجوہ

نوح علیہ السلام جب کشتی بنا رہے تھے تو ان کی قوم کے کافر سرداران کو کشتی بناتا دیکھ کر ان کا مذاق اُڑاتے تھے۔

امام فخر الدین رازی نے ان کے مذاق اُڑانے کی حسبِ ذیل وجوہ بیان کی ہیں:

(۱) وہ یہ کہتے تھے کہ اے نوح! تم رسالت کا دعویٰ کرتے تھے اور بن گئے بڑھئی۔ (درکھان)

(۲) اگر تم رسالت کے دعویٰ میں سچے ہوتے تو اللہ تعالیٰ تم کو کشتی بنانے کی مشقت میں نہ ڈالتا۔

(۳) اس سے پہلے انہوں نے کشتی نہیں دیکھی تھی نہ ان کو یہ معلوم تھا کہ کشتی کس کام آتی ہے اس لیے وہ اس پر تعجب کرتے تھے اور ہنستے تھے۔

(۴) وہ کشتی بہت بڑی تھی اور جس جگہ وہ کشتی بنا رہے تھے وہ جگہ پانی سے بہت دُور تھی اس لیے وہ کہتے تھے یہاں پر پانی نہیں ہے اور اس کشتی کو دریاؤں اور سمندر کی طرف لے جانا تمہارے بس میں نہیں ہے، اس لیے ان کے خیال میں اس جگہ کشتی بنانا محض بے عقلی کا کام تھا۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۴۵)

حضرت نوح علیہ السلام کے جواباً مذاق اُڑانے کا محمل

اس کے بعد فرمایا: نوح نے کہا: اگر تم ہمارا مذاق اُڑا رہے ہو تو (وقت آنے پر) ہم بھی تمہارا مذاق اُڑائیں گے، اس کی حسبِ ذیل وجوہ ہیں:

(۱) تم ہمارے کشتی بنانے کا مذاق اُڑا رہے ہو، ہم تمہارے غرق ہونے کا مذاق اُڑائیں گے۔

(۲) تم ہمارا دنیا میں مذاق اُڑا رہے ہو ہم تمہارا آخرت میں مذاق اُڑائیں گے۔

(۳) تم ہمیں جاہل کہتے ہو حالانکہ تم خود اپنے کفر سے' اللہ کی ناراضگی مول لینے سے اور دنیا اور آخرت کے عذاب سے جاہل ہو' تو تم مذاق اُڑائے جانے کے زیادہ لائق ہو۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ مذاق اُڑانا تو انبیاء علیہم السلام کی شان کے لائق نہیں ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا مذاق اُڑانا' دراصل ان کے مذاق اُڑانے کا بدلہ اور سزا تھی اور اس پر مذاق اُڑانے کا اطلاق صورتاً مماثلت کی وجہ سے کیا گیا ہے جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے:

جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ (الشوریٰ: ۴۰) بُرائی کا بدلہ اسی کی مثل بُرائی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حتیٰ کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور تنور اُبلنے لگا تو ہم نے (نوح سے) فرمایا: اس کشتی میں ہر قسم کے (نر اور مادہ) جوڑوں کو سوار کر لو اور اپنے گھر والوں کو بھی سوا ان کے جن (کو غرق کرنے) کا فیصلہ ہو چکا ہے' اور ایمان والوں کو بھی سوار کر لو' اور ان پر کم لوگ ہی ایمان لائے تھے ○ (هود: ۴۰)

تنور کے معنی اور اس کے مصداق کی تحقیق

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور تنور اُبلنے لگا۔ تنور کے متعلق کئی اقوال ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس' حسن اور مجاہد کا قول ہے: اس سے مراد روٹی پکانے کا تنور ہے' پھر ان کا اختلاف ہے' بعض نے کہا: یہ حضرت نوح علیہ السلام کا تنور تھا' بعض نے کہا: یہ حضرت آدم کا تنور تھا اور بعض نے کہا: یہ حضرت حواء کا تنور تھا' اور بعد میں حضرت نوح کا تنور ہو گیا۔ پھر اس تنور کی جگہ میں اختلاف ہے۔ شعبی نے کہا: یہ کوفہ کی ایک جانب تھا' حضرت علی نے کہا: یہ کوفہ کی ایک مسجد میں تھا' اور اس مسجد میں ستر نبیوں نے نماز پڑھی تھی۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ تنور شام میں ایک جگہ پر تھا جس کا نام عین الوردان ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ تنور ہند میں تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ ایک عورت تنور میں روٹیاں پکا رہی تھی' اس نے حضرت نوح کو تنور سے پانی نکلنے کی خبر دی تو حضرت نوح نے اسی وقت کشتی میں تمام چیزیں رکھنی شروع کر دیں۔

(۲) تنور سے مراد ہے سطح زمین اور عرب سطح زمین کو تنور کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ○ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ۔ (القمر: ۱۲-۱۱)

پس ہم نے موسلا دھار بارش سے آسمان کے دروازے کھول دیئے اور ہم نے زمین سے چشمے جاری کر دیئے تو وہ پانی اس امر کے ساتھ واصل ہو گیا جو (ان کی ہلاکت کے لیے) مقدر ہو چکا تھا۔

(۳) تنور سے مراد ہے زمین کی مکرم اور بلند جگہ اور زمین کی بلند جگہ سے پانی نکلا تو اس کی بلندی کی وجہ سے اس کو تنور کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔

ان اقوال میں راجح قول یہ ہے کہ تنور سے مراد روٹیوں کا تنور لیا جائے۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۴۷-۳۴۶' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

حضرت نوح کی کشتی میں سوار ہونے والوں کی تفصیل

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ ہر جاندار سے نر اور مادہ کا ایک جوڑا کشتی میں سوار کر لیا جائے' سو ایسا ہی کیا گیا اور فرمایا: اور ایمان والوں کو بھی' اور ایمان لانے والے کم تھے۔ امام ابن جوزی نے لکھا ہے کہ ایمان والوں کی تعداد میں آٹھ اقوال ہیں:

(۱) عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے اہل سمیت یہ اسی (۸۰) افراد تھے۔

(۲) یوسف بن مہران نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھ اسی(۸۰)انسانوں کو سوار کیا' تین ان کے بیٹے تھے اور تین ان کے بیٹوں کی بیویاں تھیں اور حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی تھی۔

(۳) ابو صالح نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا: یہ اسی (۸۰) انسان تھے۔ مقاتل نے کہا: چالیس مرد اور چالیس عورتیں تھیں۔

(۴) ابن جریج نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے: کل چالیس نفر تھے۔

(۵) ابو نہیک نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے: تیس مرد تھے۔

(۶) قرظی نے کہا: حضرت نوح اور ان کی بیوی' ان کے تین بیٹے اور ان کی بیویاں کل آٹھ نفر تھے۔

(۷) کل سات نفر تھے: حضرت نوح' تین بیٹے اور ان کی تین بیویاں' یہ اعمش کا قول ہے۔

(۸) ابن اسحٰق نے کہا: عورتوں کے علاوہ دس نفر تھے۔

(زاد المسیر ج ۴ ص ۱۰۷-۱۰۶' مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

حضرت نوح علیہ السلام کے ان تین بیٹوں کے نام سام' حام اور یافث تھے جو کشتی میں سوار ہوئے۔ ایک بیٹا کنعان تھا' وہ ایمان نہیں لایا اور کشتی میں سوار نہیں ہوا اور ڈوب گیا۔ اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی بھی ایمان نہیں لائی اور کشتی میں سوار نہیں ہوئی اور ڈوب گئی۔ زیادہ مشہور قول یہ ہے کہ کشتی میں سوار ہونے والے اسی (۸۰) نفر تھے' لیکن اس کی صحیح تعیین معلوم نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور نوح نے کہا: اس کشتی میں سوار ہو جاؤ' اس کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ ہی کے نام سے ہے' بے شک میرا رب ضرور بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہےO (ھود: ۴۱)

ہر کام کے شروع سے پہلے اللہ کا نام لینا

حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: اللہ کے نام کے ساتھ اس کشتی میں سوار ہو جاؤ' اس میں یہ اشارہ ہے کہ جب انسان کسی کام کو شروع کرے تو کام کو شروع کرتے وقت اللہ کے نام کا ذکر کرے حتیٰ کہ اس ذکر کی برکت سے اس کا مقصود پورا ہو جائے اور خصوصاً کسی سواری پر بیٹھتے وقت۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ الزخرف: ۱۴-۱۳ میں آئے گی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہروہ ذی شان کام جس کو بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ساتھ شروع نہ کیا جائے وہ ناتمام رہتا ہے۔

(تاریخ بغداد ج ۵ ص ۷۷' الجامع الصغیر رقم الحدیث: ۶۲۸۴' کنز العمال رقم الحدیث: ۲۴۹۱' حافظ سیوطی کی رمز کے مطابق یہ حدیث ضعیف ہے)

اللہ کے نام سے مراد اللہ کا ذکر ہے' اس طرح اس حدیث کی درج ذیل حدیث سے موافقت ہو جاتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر ذی شان کام جو اللہ کی حمد سے نہ شروع کیا گیا ہو وہ ناتمام رہتا ہے۔

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۴۸۴۰' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸۹۴' صحیح ابن حبان رقم الحدیث: (۱۲)' الجامع الصغیر رقم الحدیث: ۶۲۸۵)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہر وہ کلام یا ہر وہ کام جو اللہ کے ذکر سے نہ شروع کیا جائے وہ ناتمام رہتا ہے۔ (مسند احمد ج ۲ ص ۳۵۹)

نیز حضرت نوح علیہ السلام نے اس پر متنبہ فرمایا کہ اس کشتی کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ کے نام کی برکت اور اس کے حکم اور اس کی قدرت سے ہے اور یہ کہ جب وہ کشتی میں سوار ہوئے تو انہوں نے قوم کو یہ خبر دی کہ یہ کشتی نجات کے حصول کا سبب نہیں ہے، بلکہ نجات تو صرف اللہ کے فضل سے ہوگی، اور انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی قوت اور طاقت پر بھروسہ نہ کرے اور نہ ظاہری اسباب پر اعتماد کرے بلکہ تمام چیزوں سے صرفِ نظر کر کے مسبب الاسباب پر اعتماد اور توکل کرے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور وہ کشتی انہیں پہاڑ جیسی موجوں میں لے کر جا رہی تھی اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا جب کہ وہ ان سے الگ تھا اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور کافروں کے ساتھ نہ رہو○ اس نے کہا میں عنقریب کسی پہاڑ کی پناہ میں آ جاؤں گا جو مجھے بچا لے گا، نوح نے کہا: آج اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہے سوا اس کے جس پر (خود) اللہ رحم فرمائے اور ان دونوں (باپ، بیٹے) کے درمیان موج حائل ہو گئی سو وہ ڈوبنے والوں میں سے ہو گیا○ (ھود: ۴۳-۴۲)

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو کشتی پر کیوں بلایا جب کہ وہ کافر تھا؟

اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے خود یہ دعا فرمائی تھی:

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۔ اے میرے رب! کافروں میں سے کسی کو زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ۔ (نوح: ۲۶)

پھر انہوں نے اپنے بیٹے کو اس کے کفر کے باوجود کیوں پکارا؟ اس کے جوابات حسبِ ذیل ہیں:

(۱) ہو سکتا ہے ان کا بیٹا منافق ہو، حضرت نوح کے سامنے ایمان کا اظہار کرتا ہو اور در حقیقت کافر ہو۔

(۲) حضرت نوح علیہ السلام کو یہ علم تھا کہ وہ کافر ہے لیکن ان کو یہ گمان تھا کہ جب وہ طوفان کی ہولناکیوں اور اس میں غرق ہونے کے خطرہ کا مشاہدہ کرے گا تو ایمان لے آئے گا، لہٰذا انہوں نے جو کہا: اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ، ان کا یہ قول اس کو ایمان پر راغب کرنے کے لیے تھا۔

نیز فرمایا: جب کہ وہ ان سے الگ تھا، اس کا ایک محمل یہ ہے کہ وہ کشتی سے الگ تھا کیونکہ اس کا گمان یہ تھا کہ وہ پہاڑ کی پناہ کے سبب غرق ہونے سے بچ جائے گا، اس کا دوسرا محمل یہ ہے کہ وہ اپنے باپ، اپنے بھائیوں اور مسلمانوں سے الگ تھا، اس کا تیسرا محمل یہ ہے کہ وہ کفار کی جماعت سے الگ کھڑا ہوا تھا اس لیے حضرت نوح علیہ السلام نے یہ گمان کیا کہ شاید وہ ایمان لے آئے، کیونکہ وہ ان سے الگ کھڑا ہوا ہے، اسی لیے انہوں نے اس کو ندا کی تھی اور فرمایا تھا: اور کافروں کے ساتھ نہ رہو۔

جب حضرت نوح کے بیٹے نے کہا: پہاڑ مجھے بچا لے گا، تو حضرت نوح علیہ السلام نے متنبہ فرمایا: تم نے غلط کہا، آج اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہے سوا اس کے جس پر اللہ رحم فرمائے۔

وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ

اور حکم دیا گیا کہ اے زمین اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان تھم جا، اور پانی خشک کر دیا گیا

وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ

اور کام پورا کر دیا گیا اور کشتی جودی پہاڑ پر ٹھیر گئی اور کہہ دیا گیا کہ ظالم لوگوں کے لیے (رحمت سے)

الربع

الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٤﴾ وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ

دوری ہے ○ اور نوح نے اپنے رب کو پکارا سو کہا بے شک میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور یقیناً

وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿٤٥﴾ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ

تیرا وعدہ برحق ہے اور تو تمام حاکموں سے بڑا حاکم ہے ○ (اللہ نے) فرمایا اے نوح! وہ آپ کے

مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ

اہل سے نہیں ہے بےشک اس کے کام نیک نہیں ہیں تو آپ مجھ سے اس چیز کا سوال نہ کریں جس کا آپ کو

بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٤٦﴾ قَالَ رَبِّ

علم نہیں ہے، بے شک میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں (تاکہ) آپ نادانوں میں سے نہ ہو جائیں ○ (نوح نے) عرض کیا اے میرے رب! بےشک

اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ

میں (اس سے) تیری پناہ میں آتا ہوں کہ میں تجھ سے اس چیز کا سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے، اور اگر تو میری مغفرت نہ فرمائے

وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٤٧﴾ قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا

اور مجھ پر رحم نہ فرمائے تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گا ○ حکم دیا گیا کہ اے نوح کشتی سے اتر جاؤ ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ

وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓي اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۭ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ

اور ان برکتوں کے ساتھ جو تم پر ہیں اور ان جماعتوں پر ہیں جو تمہارے ساتھ ہیں، اور کچھ اور جماعتیں ہوں گی جنہیں ہم (عارضی) فائدہ

ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٤٨﴾ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ

پہنچائیں گے پھر انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا ○ یہ (واقعات) من جملہ غیب کی خبروں سے ہیں جن کی ہم آپ کی طرف

اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۭ

وحی کرتے ہیں، جن کو اس سے پہلے نہ آپ جانتے تھے نہ آپ کی قوم،

فَاصْبِرْ ڕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٩﴾ ع

پس صبر کیجئے بے شک نیک انجام متقین کے لیے ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور حکم دیا گیا کہ اے زمین اپنا پانی نگل لے، اور اے آسمان تھم جا، اور پانی خشک کر دیا گیا، اور کام پورا کر دیا گیا اور کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی اور کہہ دیا گیا کہ ظالم لوگوں کے لیے (رحمت سے) دوری ہے○ (ھود: ۴۴)

مشکل الفاظ کے معانی

ابلعی ماءک: تم سے جو پانی پھوٹ کر نکلا ہو اس کو پی لو یا نگل لو۔

اقلعی: بارش برسانا موقوف کر دو۔ غیض کا معنی ہے کم ہو گیا، یہاں مراد ہے پانی خشک ہو گیا۔

قضی الامر: تقدیر میں لکھا ہوا پورا ہو گیا یعنی حضرت نوح کی قوم کے کافروں کا ہلاک ہونا اور مومنوں کا نجات پانا۔

جودی: یہ ایک پہاڑ ہے جو کردستان کے علاقہ میں جزیرہ ابن عمر کے شمال مشرقی جانب واقع ہے، یہ علاقہ آرمینیا کی سطح مرتفع سے شروع ہو کر جنوب میں کردستان تک ہے اور جبل الجودی اسی سلسلہ کا ایک پہاڑ ہے، یہ پہاڑ آج بھی جودی ہی کے نام سے مشہور ہے۔ (تفہیم القرآن ملخصاً ج ۲ ص ۳۴۱)

اللہ اور اس کے رسول کا جمادات کو خطاب کرنا

اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ وہ اپنا پانی نگل لے اور آسمان کو حکم دیا کہ وہ بارش برسانا موقوف کر دے، اس سے معلوم ہوا کہ زمین اور آسمان اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں اور یہ اطاعت غیر اختیاری ہے، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کائنات میں جو بھی تغیرات اور حوادث وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ سب اللہ عزوجل کے احکام کے تحت ہوتے ہیں، زمین اور آسمان کو ندا کر کے جو اللہ تعالیٰ نے خطاب فرمایا ہے اس کے متعلق مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ خطاب مجازی ہے کیونکہ زمین اور آسمان جمادات میں سے ہیں اور ان میں سننے اور سمجھنے کی خاصیت نہیں ہے لیکن یہ ہماری سوچ اور ہماری فکر ہے، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سننے اور سمجھنے کی ایسی خاصیت رکھی ہو جس کا ہمیں ادراک نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک اعرابی آیا اور اس نے کہا میں کیسے پہچانوں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں؟ آپ نے فرمایا: اگر میں اس کھجور کے درخت کے خوشے کو بلاؤں اور وہ گواہی دے کہ میں اللہ کا رسول ہوں تو پھر! پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کھجور کے خوشہ کو بلایا، تب وہ خوشہ درخت سے اترا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گر گیا، پھر آپ نے فرمایا: لوٹ جا، تو وہ اسی طرح لوٹ گیا، تو وہ اعرابی مسلمان ہو گیا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۶۲۸، الطبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۱۸۲، مسند احمد ج ۱ ص ۲۲۳، سنن دارمی رقم الحدیث: ۲۴، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۱۲۶۲۲، المستدرک ج ۲ ص ۶۲۰، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ۵۳۰، دلائل النبوۃ لابی نعیم رقم الحدیث: ۲۹۷، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۶ ص ۱۷)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کے ایک راستہ میں جا رہا تھا، آپ کے سامنے جو بھی پہاڑ یا درخت آتا تھا وہ کہتا تھا: السلام علیک یا رسول اللہ۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۶۲۶، سنن الدارمی رقم الحدیث: ۲۱، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲ ص ۱۵۴-۱۵۳، شرح السنہ رقم الحدیث: ۳۷۱۰)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جمادات میں صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو سننے اور سمجھنے کی صلاحیت ہو، اور صرف وہی ان سے کلام کر سکتے ہوں، آخر الذکر حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تمام کائنات کے لیے تھی اور ہر چیز آپ کی رسالت کی گواہی دیتی تھی اور اول الذکر حدیث سے یہ معلوم ہوتا

ہے کہ درختوں پر لگے ہوئے خوشے بھی آپ کی اطاعت کرتے تھے تو اگر ہم آپ کی اطاعت نہ کریں تو ہم ان درختوں سے بھی گئے گزرے ہوئے۔

جودی پہاڑ پر کشتی ٹھہرنے کی تفصیل

امام ابن ابی حاتم اپنی سند کے ساتھ مجاہد سے روایت کرتے ہیں: جودی ایک جزیرہ میں پہاڑ ہے، سب پہاڑ غرق ہو گئے تھے یہ پہاڑ اپنی تواضع اور عجز کی وجہ سے غرق ہونے سے بچ رہا، حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی اسی جگہ لنگرانداز ہوئی تھی۔

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ ایک ماہ تک کشتی یہیں لگی رہی، کشتی سے سب اتر گئے اور لوگوں کی عبرت کے لیے کشتی ثابت و سالم یہیں رکی رہی، حتیٰ کہ اس امت کے اوائل میں سے لوگوں نے بھی اس کو دیکھ لیا، حالانکہ اس کے بعد کی بہترین اور مضبوط کشتیاں بنیں، بگڑیں اور راکھ ہو گئیں۔

عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ کشتی میں حضرت نوح علیہ السلام سمیت اسی (۸۰) انسان تھے۔ ایک سو پچاس دن تک وہ سب کشتی ہی میں رہے۔ اللہ تعالیٰ نے کشتی کا منہ مکہ مکرمہ کی طرف کر دیا۔ وہ کشتی چالیس دن تک بیت اللہ کا طواف کرتی رہی، پھر اللہ تعالیٰ نے اسے جودی کی طرف روانہ کر دیا، وہاں جا کر وہ ٹھہر گئی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کوے کو بھیجا کہ وہ خشکی کی خبر لائے، وہ ایک مردار کو کھانے میں لگ گیا اور دیر لگا دی۔ آپ نے ایک کبوتر کو بھیجا وہ اپنی چونچ میں زیتون کے درخت کا پتا اور پنجوں میں مٹی لے کر آیا، اس سے حضرت نوح علیہ السلام نے یہ اندازہ لگایا کہ پانی سوکھ گیا ہے اور زمین ظاہر ہو گئی ہے۔ آپ جودی کے نیچے اترے اور وہیں ایک بستی کی بنیاد رکھ دی۔ ایک دن صبح کو جب لوگ بیدار ہوئے تو ہر شخص کی زبان بدلی ہوئی تھی، وہ اسی (۸۰) قسم کی زبانیں بول رہے تھے، ان میں سب سے بہتر زبان عربی تھی، اور کوئی شخص دوسرے کا کلام سمجھ نہیں رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو وہ سب زبانیں سکھا دیں اور آپ ہر ایک کو دوسرے کا مطلب سمجھا رہے تھے۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۷ ۲۰۳-۲۰۳۸، جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۰۵۰، ۱۴۰۵۵، ۱۴۰۵۶، تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۹۶)

امام ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یکم رجب کو حضرت نوح علیہ السلام کشتی میں سوار ہوئے اور انہوں نے اور سب مسلمانوں نے روزہ رکھا اور چھ ماہ تک کشتی ان کو لے کر سفر کرتی رہی اور محرم تک سفر جاری رہا اور دس محرم کو وہ کشتی جودی پہاڑ پر لنگرانداز ہوئی۔ اس دن حضرت نوح علیہ السلام نے خود روزہ رکھا اور کشتی میں سوار سب لوگوں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا حتیٰ کہ وحشی جانوروں اور چوپایوں نے بھی اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے روزہ رکھا۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۰۴۲، الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۳۸، مختصر تاریخ دمشق ج ۲۶ ص ۲۰۷، تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۹۶)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کچھ یہودیوں کے پاس سے گزر ہوا جنہوں نے دس محرم کا روزہ رکھا ہوا تھا۔ آپ نے ان سے پوچھا: یہ کیسا روزہ ہے؟ انہوں نے کہا: یہ وہ دن ہے جس دن میں اللہ نے حضرت موسیٰ اور بنو اسرائیل کو غرق سے نجات دی تھی اور اسی دن میں فرعون غرق ہوا تھا اور اسی دن میں حضرت نوح کی کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہری تھی تو حضرت نوح اور حضرت موسیٰ نے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے اس دن روزہ رکھا تھا، تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں حضرت موسیٰ کی بہ نسبت زیادہ حق دار ہوں اور اس دن کا روزہ رکھنے کا (بھی) زیادہ حق دار

ہوں، پھر آپ نے اپنے اصحاب کو اس دن کا روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ (مسند احمد ج ۲ ص ۳۶۰-۳۵۹)

تکبر کی مذمت اور تواضع کی تعریف

جودی پہاڑ نے اللہ کی بارگاہ میں خضوع اور خشوع کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ عزت اور سرفرازی عطا فرمائی کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی اس پہاڑ پر لنگرانداز ہوئی اور مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی یہی سُنّت جاریہ ہے: جو اس کے سامنے تواضع اور عاجزی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو سرفراز اور سربلند کرتا ہے اور جو اکڑتا ہے، فخر کرتا ہے اور تکبر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل اور خوار کرتا ہے، نیز جو شخص ہمیشہ کامیاب اور سرفراز رہتا ہو اور کبھی ناکام نہ ہوتا ہو اور لوگ اس کو ناقابل شکست اور ناقابل تسخیر سمجھتے ہوں اللہ تعالیٰ اس کو ایک مرتبہ ناکام کر دیتا ہے اور یہ واضح فرمادیتا ہے کہ ہمیشہ سربلند رہنے والی صرف اللہ عزوجل کی ذات ہے۔ ہمارے زمانہ میں ۱۹۸۸ء تک روس بہت سربلند تھا، پھر ۱۹۹۱ء سے اس کا زوال شروع ہوا۔ وہ معاشی طور پر تباہ ہو کر ٹوٹ پھوٹ گیا اور اب ان شاء اللہ امریکہ کی باری ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کا نام عضباء تھا اور وہ تمام سواریوں میں ہمیشہ سب سے آگے رہتی تھی اور کوئی اس سے آگے نہیں نکل سکتا تھا، ایک مرتبہ ایک اعرابی ایک اونٹ پر سوار تھا وہ عضباء سے آگے نکل گیا تو مسلمانوں کو اس سے بہت رنج ہوا اور انہوں نے افسوس سے کہا: عضباء پیچھے رہ گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر یہ لازم کر لیا ہے کہ جس چیز کو دنیا میں سربلند کرتا ہے اس کو (ایک بار) سرنگوں بھی کرتا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۸۷۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۸۰۳، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۵۹۰، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۲۰۳۳، عالم الکتب، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۷۰۳)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقہ کسی مال میں کمی نہیں کرتا، اور معافی مانگنے سے اللہ بندے کی عزت زیادہ کرتا ہے، اور جو شخص بھی اللہ کی بارگاہ میں تواضع کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو سربلند کرتا ہے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۵۸۸، مسند احمد رقم الحدیث: ۹۰۱۸، طبع جدید، مطبوعہ دارالفکر)

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان قیام فرما ہوئے اور آپ نے خطبہ دیا اور فرمایا: اللہ نے میری طرف یہ وحی کی ہے کہ تم تواضع اور انکسار کرو حتیٰ کہ کوئی شخص دوسرے پر فخر نہ کرے اور کوئی شخص دوسرے پر ظلم نہ کرے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۸۶۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۱۷۹)

ان بچوں اور جانوروں کا کیا قصور تھا جن کو طوفان میں غرق کیا گیا؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور کام پورا کر دیا گیا، یعنی تقدیر کا لکھا ہوا پورا ہو گیا، کافر غرق کر دیئے گئے اور مسلمانوں کو نجات دے دی گئی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ازل میں اللہ تعالیٰ نے جس کے لیے جو مقدر کر دیا ہے وہ اپنے وقت میں ہو کر رہتا ہے، زمین و آسمان میں اس کے حکم کو نافذ ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا، اور اس کی قضاء کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس طوفان میں نابالغ بچے بھی ہلاک ہو گئے تھے تو کفار کے جرم کی وجہ سے ان کے بچوں کو ہلاک کرنا اللہ تعالیٰ کے اصول اور اس کی حکمت کے منافی ہے، اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ طوفان آنے سے چالیس سال پہلے کافر عورتوں کو اللہ تعالیٰ نے بانجھ کر دیا تھا، اور اس طوفان سے چالیس سال سے کم عمر کا کوئی آدمی ہلاک نہیں ہوا۔ (تہذیب تاریخ دمشق ج ۲۶ ص ۱۹۸) دوسرا جواب یہ ہے کہ طوفان میں بچوں کا ہلاک ہونا اسی طرح ہے جیسے اس طوفان میں پرندوں،

چرندوں اور درندوں کا ہلاک ہونا؛ اور ان کی ہلاکت ان کے حق میں عذاب نہیں تھی بلکہ ان سب کی مدت حیات پوری ہو گئی تھی، اور جس طرح حلال جانوروں کو اللہ تعالیٰ کے اذن سے ذبح کرنا ان کے حق میں عذاب نہیں ہے اسی طرح ان بچوں کا طوفان میں غرق ہونا بھی ان کے حق میں عذاب نہیں تھا، تیسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا مالک مطلق ہے وہ اپنی مخلوق میں جس طرح چاہے تصرف کرے، کسی کو اس پر اعتراض کا حق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ۔ (الانبیاء: ۲۳)

اللہ جو کچھ بھی کرتا ہے اس کے متعلق اس سے سوال نہیں کیا جائے گا اور لوگوں سے سوال کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کسی کافر پر رحم نہیں فرمائے گا

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور ظالم لوگوں کے لیے (رحمت سے) دُوری ہے۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ حضرت نوح علیہ السلام کی (کافر) قوم میں سے کسی ایک پر رحم فرماتا تو ایک بچے کی ماں پر رحم فرماتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت نوح علیہ السلام نو سو پچاس سال کی عمر تک اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف دعوت دیتے رہے، حتیٰ کہ جب ان کے زمانہ کا آخر آ پہنچا تو انہوں نے درخت اگائے اور جب وہ درخت پوری طرح بڑھ گئے تو ان کو کاٹا پھر وہ کشتی بنانے لگے۔ کفار ان کے پاس سے گزرتے ہوئے ان سے اس کے متعلق سوال کرتے۔ وہ کہتے کہ میں کشتی بنا رہا ہوں، وہ ان کا مذاق اڑاتے اور کہتے تم کشتی خشکی میں بنا رہے ہو، وہ کیسے چلے گی؟ حضرت نوح فرماتے: تم کو عنقریب پتا چل جائے گا۔ جب وہ کشتی بنا کر فارغ ہو گئے اور تنور ابلنے لگا اور گلیوں میں پانی بہنے لگا، تو ایک بچے کی ماں نے اپنے بچہ پر خطرہ محسوس کیا، وہ اپنے بچے سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی۔ وہ بچے کو لے کر ایک پہاڑ کی طرف روانہ ہوئی اور پہاڑ کے ایک تہائی حصہ تک پہنچ گئی۔ جب وہاں بھی پانی پہنچ گیا تو وہ دو تہائی حصہ تک پہاڑ پر چڑھ گئی، جب وہاں بھی پانی پہنچ گیا تو وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئی، جب پانی اس عورت کی گردن تک پہنچ گیا تو اس عورت نے اس بچے کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھالیا، حتیٰ کہ پانی اس کو بہا کر لے گیا، پس اگر اللہ کافروں پر رحم فرماتا تو اس بچہ کی ماں پر رحم فرماتا۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۰۰۵، المستدرک ج ۲ ص ۵۴۷، ۳۴۲، حاکم نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، الجامع لاحکام القرآن ج ۹ ص ۳۸، تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۹۷-۴۹۶، تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۰۸۴۸)

ابو طالب اور ابولہب کے عذاب میں جو تخفیف کی گئی اس کی وجہ فی نفسہ ان پر رحمت نہیں ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت، آپ کے ساتھ حسن سلوک اور آپ کی شفاعت کی وجہ سے ان کے عذاب میں تخفیف کی گئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور نوح نے اپنے رب کو پکارا سو کہا بے شک میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ برحق ہے اور تو تمام حاکموں سے بڑا حاکم ہے ○ (ھود: ۴۵)

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹوں کی تفصیل

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں:

امام محمد بن سعد اور امام ابن عساکر نے اپنی سندوں کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: جس زمانہ میں حضرت نوح علیہ السلام پیدا ہوئے تھے، اس زمانہ میں تمام لوگ شرک اور بت پرستی میں ملوث تھے، جب حضرت نوح

علیہ السلام کی عمر چار سو اسی (۴۸۰) سال ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اعلان نبوت کا حکم دیا، حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ایک سو بیس سال تک اللہ کے دین کی طرف دعوت دی، پھر ان کو کشتی بنانے کا حکم دیا، جس وقت انہوں نے کشتی بنائی اور اس میں سوار ہوئے اس وقت ان کی عمر چھ سو سال تھی، جن کافروں نے اس طوفان میں غرق ہونا تھا وہ غرق ہوگئے، کشتی سے اترنے کے بعد حضرت نوح علیہ السلام مزید ساڑھے تین سو سال زندہ رہے، ان کے ایک بیٹے کا نام سام تھا، اس کا رنگ سفید اور گندمی تھا، دوسرے بیٹے کا نام حام تھا، اس کا رنگ سیاہ اور سفید تھا اور تیسرے بیٹے کا نام یافث تھا، اس کا رنگ سرخ تھا اور چوتھے بیٹے کا نام کنعان تھا، یہ غرق ہوگیا تھا۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی: بے شک میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ برحق ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے یہ دعا اس لیے کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: ہم نے (نوح سے) فرمایا اس کشتی میں ہر قسم کے (نر اور مادہ) جوڑوں کو سوار کرلو اور اپنے اہل کو (بھی) سوار کرلو، سوا ان کے جن کو غرق کرنے کا فیصلہ ہوچکا ہے۔ (ھود: ۴۰)

حضرت نوح علیہ السلام نے گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اہل کو کشتی میں سوار کرنے کا حکم دیا ہے تو عرض کیا: میرا بیٹا (کنعان) بھی میرے اہل سے ہے، مطلب یہ تھا کہ اس کو بھی کشتی میں سوار کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے تاکہ وہ بھی نجات پانے والوں میں سے ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کے جواب میں فرمایا:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اللہ نے) اے نوح! فرمایا وہ آپ کے اہل سے نہیں ہے، بے شک اس کے کام نیک نہیں ہیں تو آپ مجھ سے اس چیز کا سوال نہ کریں جس کا آپ کو علم نہیں ہے، بے شک میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں (تاکہ) آپ نادانوں میں سے نہ ہو جائیں O (ھود: ۴۶)

منکرین عصمت کا حضرت نوح پر اعتراض اور اس کا جواب

عصمت انبیاء کے منکرین نے اس آیت کی بناء پر حضرت نوح علیہ السلام پر یہ طعن کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کنعان کافر تھا اور کافر کے لیے مغفرت کی دعا کرنا گناہ ہے۔ پس ثابت ہوگیا کہ حضرت نوح علیہ السلام سے گناہ سرزد ہوا تھا۔

امام رازی اور علامہ قرطبی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ کنعان منافق تھا اور وہ حضرت نوح علیہ السلام کے سامنے ایمان کا اظہار کرتا تھا، اسی بناء پر حضرت نوح علیہ السلام نے اس کے لیے مغفرت کی دعا کی اور کشتی میں سوار کرنے کی درخواست کی تھی۔ اگر ان کو یہ علم ہوتا کہ وہ کافر ہے تو وہ اس کی مغفرت کی کبھی دعا نہ کرتے، اور رہا یہ کہ اس پر کیا دلیل ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے بیٹے کے کفر کا علم نہیں تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب حضرت نوح نے خود اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ:

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِينَ دَيَّارًا۔ (نوح: ۲۶)	اور نوح نے دعا کی کہ اے میرے رب زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑ۔

تو جب حضرت نوح علیہ السلام نے خود تمام کافروں کی ہلاکت کی دعا کی تھی تو یہ کیونکر ممکن ہے وہ ایک کافر کی مغفرت کے لیے دعا کرتے!

اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے اس کو کنعان کے کفر کا علم تھا اس لیے فرمایا: وہ آپ کے اہل سے نہیں ہے، اس کے کام نیک نہیں ہیں تو آپ مجھ سے اس چیز کا سوال نہ کریں جس کا آپ کو علم نہیں ہے۔ یہ اس آیت کا واضح معنی ہے کیونکہ حضرت نوح کو اس کا تو یقیناً علم تھا کہ کافر اور مشرک کی مغفرت نہیں ہوسکتی اور وہ خود بھی تمام کافروں کی ہلاکت کی دعا کرچکے تھے، اس لیے اس آیت کی یہ تفسیر کرنا درست نہیں کہ حضرت نوح نے یہ جاننے کے باوجود کہ ان کا بیٹا کافر ہے محبت پدری سے مغلوب ہو کر

اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف بلکہ خود اپنی دعا کے بھی خلاف کنعان کی مغفرت کی دعا کی، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلا علم اور بلا تحقیق اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا، ایک خلاف اولیٰ کام تھا یا ان کی اجتہادی خطا تھی اور یہ ان کا کمال تواضع ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ادب اور عبدیت کا اظہار ہے کہ انہوں نے اجتہادی خطا پر بھی معافی مانگی اور کہا:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (نوح نے) عرض کیا: اے میرے رب! بے شک میں (اس سے) تیری پناہ میں آتا ہوں کہ میں تجھ سے اس چیز کا سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے، اور اگر تو میری مغفرت نہ فرمائے اور مجھ پر رحم نہ فرمائے تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گاO (ھود: ۴۷)

حضرت نوح علیہ السلام کے سوال کے متعلق امام رازی کی تقریر

حضرت نوح علیہ السلام کی گناہ سے براءت پر امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

جب کہ بکثرت دلائل سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو گناہوں سے منزہ کیا ہوا ہے تو حضرت نوح علیہ السلام کے اس سوال کو ترک افضل اور ترک اکمل پر محمول کرنا واجب ہے اور ابرار کی نیکیاں بھی مقربین کے نزدیک برائی کا حکم رکھتی ہیں، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ فرمائی اور حضرت نوح علیہ السلام نے استغفار کیا، اور ان کا استغفار کرنا اس پر نہیں دلالت کرتا کہ انہوں نے پہلے کوئی گناہ کیا ہو جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ O وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا O فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ۔ (النصر: ۳-۱)

جب اللہ کی مدد اور اس کی فتح آ جائےO اور آپ لوگوں کو دیکھ لیں کہ وہ اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہو رہے ہیںO تو آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح فرمائیں اور اس سے استغفار کریں۔

اور یہ بات واضح ہے کہ اللہ کی مدد کا آنا اور لوگوں کا دین میں داخل ہونا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گناہ نہیں تھا کہ اس پر استغفار کا حکم دیا جاتا، اس سے معلوم ہو گیا کہ استغفار کا حکم دینا یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار کرنا کسی گناہ پر دلالت نہیں کرتا۔

درحقیقت حضرت نوح علیہ السلام کی امت میں تین قسم کے لوگ تھے: (۱) کافر تھے اور اپنے کفر کا اظہار کرتے تھے۔ (۲) مومن تھے اور اپنے ایمان کا اظہار کرتے تھے۔ (۳) منافقین کی جماعت تھی۔ مومنوں کا حکم طوفان سے نجات تھا اور کافروں کا حکم ان کو غرق کرنا تھا، اور یہ حضرت نوح کو معلوم تھا اور منافقین کا حکم مخفی تھا۔ حضرت نوح کا بیٹا کنعان منافقین میں سے تھا اور بظاہر وہ مومن تھا۔ حضرت نوح نے اس کے اعمال اور افعال کو کفر پر محمول نہیں کیا، بلکہ وجوہ صحیحہ پر محمول کیا۔ جب آپ نے دیکھا کہ وہ مسلمانوں سے الگ کھڑا ہے تو اس سے کہا کہ وہ کشتی میں داخل ہو جائے۔ اس نے کہا میں عنقریب کسی پہاڑ کی پناہ میں چلا جاؤں گا، وہ مجھے پانی سے بچا لے گا۔ اور اس کا یہ کہنا اس کے کفر پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ ہو سکتا ہے اس نے یہ گمان کیا ہو کہ پہاڑ پر چڑھنا کشتی میں بیٹھنے کے قائم مقام ہے، جس طرح کشتی میں بیٹھنا غرق ہونے سے بچاتا ہے اسی طرح پہاڑ پر چڑھنا بھی غرق ہونے سے بچا لے گا اور حضرت نوح علیہ السلام نے جو فرمایا تھا: آج اللہ کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا سوا اس کے جس پر اللہ رحم فرمائے، اس قول سے وہ اپنے بیٹے کو یہ بتلا رہے تھے کہ ایمان اور اعمال صالحہ کے سوا کوئی چیز نفع آور نہیں ہے، اور یہ قول اس پر دلالت نہیں کرتا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو یہ علم تھا کہ ان کا بیٹا کافر ہے، ان کو یہی گمان تھا کہ ان کا بیٹا مومن ہے، تب انہوں نے اللہ سے یہ سوال کیا کہ ان کا بیٹا غرق ہونے سے بچ جائے خواہ کشتی میں بیٹھ کر خواہ پہاڑ پر چڑھ

کر، تب اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ خبر دی کہ وہ منافق ہے اور ان کے اہل دین سے نہیں ہے۔ اس معاملہ میں حضرت نوح علیہ السلام سے جو زلت صادر ہوئی وہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنے بیٹے کے متعلق پوری چھان بین نہیں کی کہ وہ کافر ہے یا منافق ہے بلکہ انہوں نے اجتہاد کیا اور اپنے اجتہاد سے انہوں نے یہ سمجھا کہ وہ مومن ہے اور ان کو اس اجتہاد میں خطاء ہوئی کیونکہ وہ کافر تھا' سو جس طرح حضرت آدم علیہ السلام سے جو زلت صادر ہوئی وہ اجتہادی خطا تھی اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی یہ زلت بھی اجتہادی خطا ہے اور ان کی عصمت کے منافی نہیں ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۵۹-۳۵۸، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حضرت نوح علیہ السلام کے سوال پر سید ابوالاعلیٰ مودودی کا تبصرہ

حضرت نوح علیہ السلام نے جو دعا کی تھی: "اے میرے رب! میرا بیٹا میرے اہل سے ہے" اس پر سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ نے حسب ذیل تبصرہ کیا ہے:

اس ارشاد کو دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ حضرت نوح کے اندر روح ایمان کی کمی تھی' یا ان کے ایمان میں جاہلیت کا کوئی شائبہ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ انبیاء بھی انسان ہی ہوتے ہیں' اور کوئی انسان بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتا کہ ہر وقت اس بلند ترین معیار کمال پر قائم رہے جو مومن کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ بسا اوقات کسی نازک نفسیاتی موقع پر نبی جیسا اعلیٰ و اشرف انسان بھی تھوڑی دیر کے لیے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہو جاتا ہے لیکن جونہی اسے یہ احساس ہوتا ہے' یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے احساس کرا دیا جاتا ہے کہ اس کا قدم معیار مطلوب سے نیچے جا رہا ہے' وہ فوراً توبہ کرتا ہے اور اپنی غلطی کی اصلاح کرنے میں اسے ایک لمحہ کے لیے بھی تامل نہیں ہوتا۔ حضرت نوح کی اخلاقی رفعت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ابھی جوان بیٹا آنکھوں کے سامنے غرق ہوا ہے اور اس نظارہ سے کلیجہ منہ کو آ رہا ہے' لیکن جب اللہ تعالیٰ انہیں متنبہ فرماتا ہے کہ جس بیٹے نے حق کو چھوڑ کر باطل کا ساتھ دیا اس کو محض اس لیے اپنا سمجھنا کہ وہ تمہاری صلب سے پیدا ہوا ہے محض ایک جاہلیت کا جذبہ ہے' تو وہ فوراً اپنے دل کے زخم سے بے پروا ہو کر اس طرز فکر کی طرف پلٹ آتے ہیں جو اسلام کا مقتضا ہے۔

پسر نوح کا یہ قصہ بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے نہایت موثر پیرایہ میں یہ بتایا ہے کہ اس کا انصاف کس قدر بے لاگ اور اس کا فیصلہ کیسا دو ٹوک ہوتا ہے۔ مشرکین مکہ یہ سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کیسے ہی کام کریں، مگر ہم پر خدا کا غضب نازل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم حضرت ابراہیم کی اولاد اور فلاں فلاں دیویوں اور دیوتاؤں کے متوسل ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے بھی ایسے ہی کچھ گمان تھے اور ہیں' اور بہت سے غلط کار مسلمان بھی اس قسم کے جھوٹے بھروسوں پر تکیہ کیے ہوئے ہیں کہ ہم فلاں حضرت کی اولاد اور فلاں حضرت کے دامن گرفتہ ہیں' ان کی سفارش ہم کو خدا کے انصاف سے بچا لے گی۔ لیکن یہاں یہ منظر دکھایا گیا ہے کہ ایک جلیل القدر پیغمبر اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے لخت جگر کو ڈوبتے ہوئے دیکھتا ہے اور تڑپ کر بیٹے کی معافی کے لیے درخواست کرتا ہے' لیکن دربار خداوندی سے الٹی اس پر ڈانٹ پڑ جاتی ہے اور باپ کی پیغمبری بھی ایک بد عمل بیٹے کو عذاب سے نہیں بچا سکتی۔ (تفہیم القرآن ج ۲ ص ۳۴۵-۳۴۳، مطبوعہ لاہور، سولھواں ایڈیشن، ۱۴۰۲ھ)

ان اقتباسات میں حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق جو قابل اعتراض الفاظ ہیں وہ یہ ہیں: وہ ہر وقت مومن کے بلند ترین معیار پر نہ ہوتے تھے، (اگر نبوت کا بلند ترین معیار لکھتے تو اس کی گنجائش تھی) وہ بشری کمزوری سے مغلوب ہو گئے تھے، ان میں جاہلیت کا جذبہ تھا' ان پر دربار خداوندی سے الٹی ڈانٹ پڑی۔

ہم ان الفاظ پر کیا تبصرہ کریں، ہم حضرت نوح علیہ السلام کی بارگاہ میں بے ادبی کے ان الفاظ سے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں تمام انبیاء علیہم السلام کے ادب اور ان کی تعظیم کے طریقہ پر قائم رکھے۔ (آمین!)

حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کے متعلق جمہور مفسرین کی توجیہ

علامہ خفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ نے لکھا ہے کہ امام ابو منصور ماتریدی نے کہا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا یہ گمان تھا کہ ان کا بیٹا ان کے دین پر ہے ورنہ وہ اس کی نجات کا سوال نہ کرتے۔ (حاشیۃ الشہاب ج ۵ ص ۱۷۵) علامہ قرطبی متوفی ۶۶۸ھ نے لکھا ہے کہ حضرت نوح کا بیٹا کفر کو چھپاتا تھا اور ایمان کا اظہار کرتا تھا، اللہ تعالیٰ جو علام الغیوب ہے اس نے حضرت نوح علیہ السلام کو خبر دی کہ میں تمہارے بیٹے کے اس حال کو جانتا ہوں جس کو تم نہیں جانتے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۴۲) علامہ آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کے اہل کو نجات دے گا ماسوا ان کے جن کا غرق ہونا مقدر ہو چکا ہے، اور حضرت نوح علیہ السلام پر ان کے بیٹے کا حال منکشف نہیں تھا، اور نہ وہ اس کے باطن پر مطلع تھے، بلکہ اس کے ظاہر حال کو دیکھ کر حضرت نوح کو یہ یقین تھا کہ وہ مومن ہے۔ (روح المعانی جز ۱۲ ص ۱۰۵) علامہ محی الدین شیخ زادہ متوفی ۹۵۱ھ نے لکھا ہے کہ حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے بیٹے کی نجات کا سوال اس لیے کیا تھا کہ ان کو اس کے کفر کا علم نہیں تھا، شیخ زادہ نے امام رازی کی پوری تقریر نقل کی ہے۔ (حاشیہ شیخ زادہ علی البیضاوی ج ۴ ص ۶۵۲) قاضی شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ نے لکھا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا گمان یہ تھا کہ وہ مومن ہے اور وہ دراصل منافق تھا۔ (فتح القدیر ج ۲ ص ۶۹۶) صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ۱۳۶۷ھ نے لکھا ہے: یہ لڑکا منافق تھا، اپنے والد پر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا تھا اور باطن میں کافروں کے ساتھ متفق تھا۔ (خزائن العرفان ص ۳۶۲) مفتی محمد شفیع متوفی ۱۳۹۶ھ نے لکھا ہے: حضرت نوح علیہ السلام کو اس بیٹے کے کفر کا پورا حال معلوم نہ تھا، اس کے نفاق کی وجہ سے اس کو مسلمان ہی جانتے تھے۔

(معارف القرآن ج ۴ ص ۶۳۰)

متقدمین اور متاخرین تمام مفسرین کی تصریحات سے یہ واضح ہو گیا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کنعان کی نجات کے لیے جو دعا کی تھی وہ اس وجہ سے نہ تھی کہ وہ اپنے بیٹے کے کفر پر مطلع ہونے کے باوجود شفقت پدری سے مغلوب ہو گئے تھے اور بقول سید مودودی وہ اس دعا کے وقت ایمان کے بلند ترین معیار پر نہ تھے، اور بشری کمزوری سے مغلوب ہو گئے تھے اور اس دعا کے وقت ان میں جاہلیت کا جذبہ تھا، اسی وجہ سے ان پر بارگاہ خداوندی سے الٹی ڈانٹ پڑی، نعوذ باللہ من تلک الخرافات، بلکہ انہوں نے یہ دعا اس لیے کی تھی کہ وہ ان کے گمان میں مومن تھا، اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ وہ مومن نہیں کافر ہے اور یہ تنبیہ فرمائی کہ جس چیز کا آپ کو مکمل علم نہ ہو اس کے متعلق آپ سوال نہ کریں۔

حرام اور امور مشتبہ کے متعلق دعا کرنے کا عدم جواز

اس آیت سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ کسی مشتبہ امر کے متعلق دعا نہیں کرنی چاہیے، حدیث صحیح میں ہم کو مشبہات سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے:

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا، آپ فرما رہے تھے: حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے، اور ان کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں، جن کا بہت سے لوگوں کو علم نہیں ہے، سو جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر لیا، اور جس شخص نے امور مشتبہ کو اختیار کر لیا وہ حرام میں مبتلا ہو گیا، جس طرح کوئی شخص کسی چراگاہ کے گرد جانور چرائے تو قریب ہے کہ وہ جانور اس چراگاہ میں بھی چر

لیں، سنو ہر بادشاہ کی چراگاہ کی ایک حد ہوتی ہے، اور یاد رکھو اللہ کی چراگاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں اور سنو! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ ٹھیک ہو تو پورا جسم ٹھیک رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے اور یاد رکھو وہ گوشت کا ٹکڑا قلب ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۳۲۹، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۲۰۵، سنن النسائی رقم الحدیث: ۴۴۵۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۹۸۴، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۸۵۵۸، عالم الکتب، مسند حمیدی رقم الحدیث: ۹۱۸، سنن دارمی رقم الحدیث: ۲۵۳۴)

اور جب کسی مشتبہ امر کے لیے دعا کرنی جائز نہیں ہے، تو کسی حرام کام کے لیے دعا کرنی بطریق اولیٰ ناجائز ہے اور جو حرام قطعی ہو جیسے سود، زنا، شراب، جوا وغیرہ ان کے حصول یا ان میں کامیابی کی دعا کرنا کفر صریح ہے اور جو اس دعا پر آمین کہے وہ بھی کافر ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے لوگ اپنے مقدمات، معاملات، ملازمتوں اور ملازمتوں میں انٹرویوز کی کامیابی کے لیے ائمہ، مشائخ اور بزرگوں سے دعا کراتے ہیں اور بعض لوگوں کے مقدمات کسی ناجائز امر پر مبنی ہوتے ہیں، بعض لوگوں کے معاملات مشتبہ ہوتے ہیں، بعض لوگ بینک یا انشورنس کمپنی کی ملازمت کرتے ہیں یا اس کے لیے انٹرویو دیتے ہیں اسی طرح پولیس اور کسٹم کی نوکری ہے تو ایسے امور میں کامیابی کی دعا کرنا اور کسی سے دعا کرانا جائز نہیں ہے، اگرچہ پولیس اور کسٹم کی نوکری فی نفسہ ناجائز نہیں ہے لیکن ان میں رشوت کا لین دین بہت غالب ہے اور عرف میں غالب احوال پر حکم لگایا جاتا ہے۔

ایمان اور تقویٰ کے بغیر نسلی امتیاز اور نسبی برتری کی کوئی وقعت نہیں

حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کنعان نبی زادہ تھا، لیکن چونکہ وہ ایمان اور اعمال صالحہ کی دولت سے محروم تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے اس کا رشتہ کاٹ دیا اور فرمایا: وہ تمہارے اہل سے نہیں ہے۔ بعض بزرگوں نے لکھا ہے کہ علم اور تقویٰ کی فضیلت عارضی ہے اور سادات کی فضیلت ذاتی ہے، یہ درست نہیں ہے۔ اگر معاذ اللہ کوئی سید مرتد ہو جائے یا کسی گمراہ فرقے سے متعلق ہو جائے تو کیا اس کی فضیلت زائل نہیں ہو جائے گی۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ نسب کی فضیلت اور برتری ایمان اور تقویٰ کے ساتھ مربوط ہے، اصل چیز ایمان اور تقویٰ ہے، نسب کی فضیلت ثانوی چیز ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (الحجرات: ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہاری شناخت کے لیے الگ خاندان اور قبیلے بنائے ہیں، بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن خطبہ میں فرمایا: اے لوگو! بے شک اللہ تعالیٰ نے تم سے زمانہ جاہلیت کی عیب جوئی اور اپنے باپ دادا پر فخر کرنے کو دور کر دیا ہے۔ لوگوں کی دو قسمیں ہیں: مومن، متقی، کریم اور فاجر، درشت خو اور ذلیل، سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ (شعب الایمان ج ۴ ص ۲۸۴، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۰ھ)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا: اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے، سنو کسی عربی کی کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے اور نہ عجمی کی عربی

پر کوئی فضیلت ہے، کسی گورے کی کالے پر کوئی فضیلت ہے نہ کسی کالے کی گورے پر کوئی فضیلت ہے مگر تقویٰ سے، بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ سنو کیا میں نے تبلیغ کر دی ہے؟ صحابہ نے کہا: کیوں نہیں، یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: پھر حاضر غائب کو تبلیغ کر دے۔ (شعب الایمان ج ۴ ص ۲۸۹، بیروت، ۱۴۱۰ھ)

آج دنیا میں کالے اور گورے کی تفریق پر نسلی امتیاز برتے جا رہے ہیں اور سفید فام اقوام سیاہ فاموں کو اپنے برابر کے حقوق دینے پر تیار نہیں ہیں، بھارت میں برہمن اونچی ذات کا سپوت ہے اور شودر نیچ ذات کا سمجھا جاتا ہے، گاؤں اور دیہاتوں میں زمیندار اور وڈیرے اپنے مزارعین کو بہت کم درجہ کی مخلوق سمجھتے ہیں، غریب پیشہ ور لوگوں کو کمّی کہہ کر حقارت سے بلایا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک زمانہ میں غلاموں کو آزاد لوگوں کا درجہ نہیں دیا جاتا تھا۔ آج بھی امیروں اور غریبوں میں تفریق رکھی جاتی ہے۔ آج بھی جولاہوں، حجاموں اور موچیوں کو نیچ سمجھا جاتا ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ جولاہے نہ ہوں تو ہم سرعام برہنہ نظر آئیں، موچی نہ ہوں تو ہم اپنے پیروں کو گندگی اور گرمی سے بچا نہ سکیں، حجام نہ ہوں تو ہم اپنے بالوں کی درستگی نہ کرا سکیں۔ سلام ہو اس نبی امی پر جس نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی جوتیوں کی مرمت کرلی کہ کہیں تم جوتی گانٹھنے والوں کو حقیر نہ سمجھ لینا۔ جس نے عرب کے معزز گھرانے میں ایک غلام کا رشتہ کرا کے انسانیت اور مساوات کا جھنڈا بلند کیا، جس نے خود اپنی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم یکے بعد دیگرے ایک غیر ہاشمی، اموی نوجوان کے نکاح میں دیں اور یہ کوئی ضرورت اور اضطرار کا مسئلہ نہ تھا کیونکہ آپ کے سامنے ہاشمی خاندان کے بھی رشتے تھے لیکن وہ انسان کامل اور محسن انسانیت خود اپنی صاحبزادیوں کا رشتہ غیر کفو میں کر کے یہ مثال اور نمونہ قائم کرنا چاہتا تھا کہ جب میں افضل خلق علی الاطلاق ہو کر رشتہ کے معاملہ میں نسب کے مقابلہ میں اسلام اور اعمال صالحہ کو دیکھتا ہوں تو تم بھی نسبی خصوصیات کی بجائے اسلام اور تقویٰ کو ترجیح دینا اور نسب، مال و دولت اور صنعت و حرفت کی بناء پر کسی مسلمان کو حقیر نہ سمجھنا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حکم دیا گیا کہ اے نوح! کشتی سے اُتر جاؤ، ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اور ان برکتوں کے ساتھ جو تم پر ہیں، اور ان جماعتوں پر ہیں جو تمہارے ساتھ ہیں اور کچھ اور جماعتیں ہوں گی جنہیں ہم (عارضی) فائدہ پہنچائیں گے پھر انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا○ (ھود: ۴۸)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی اور برکتوں کا معنی

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی، اور اس وقت حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم لامحالہ کشتی سے اتر گئی، اس آیت میں جو اترنے کا حکم دیا گیا ہے اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ کشتی سے اتر جاؤ اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ جودی پہاڑ سے زمین پر اتر جاؤ۔

اس سے متصل پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کا ذکر فرمایا تھا: اور اگر تو میری مغفرت نہ فرمائے اور مجھ پر رحم نہ فرمائے تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔ (ھود: ۴۷) اور یہ ایسی ہی دعا ہے جیسے حضرت آدم علیہ السلام نے مانگی تھی: اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اور اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے○ (الاعراف: ۲۳)

اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام سے بصورت عتاب فرمایا تھا: تو آپ مجھ سے اس چیز کا سوال نہ کریں جس کا آپ کو علم نہیں ہے، بے شک میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں (تاکہ) آپ نادانوں میں سے نہ ہو جائیں۔ (ھود: ۴۶) اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے توبہ کی اور اس سے رحم کی درخواست کی اور اب حضرت نوح علیہ السلام کو

اس کی ضرورت تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کو سلامتی کی بشارت دے، اس لیے فرمایا: اے نوح! سلامتی کے ساتھ کشتی سے اتر جاؤ، اس سلامتی سے دین اور دنیا دونوں کی سلامتی مراد ہے۔ دین کی سلامتی سے مراد یہ ہے کہ ان سے کوئی ایسا عمل نہیں ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہو اور دنیا کی سلامتی سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو دنیا کی آفات اور بلیات سے محفوظ رکھے گا، کیونکہ اس طوفان سے روئے زمین کی ہر چیز غرق ہوگئی تھی اور جب حضرت نوح کشتی سے اترے تو وہاں کوئی درخت تھا نہ سبزہ تھا نہ کوئی حیوان تھا اور زندگی بسر کرنے اور کھانے پینے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ان میں سے اس وقت زمین پر کوئی چیز موجود نہ تھی اس لیے اس وقت وہاں بھوک اور پیاس کا خوف تھا اور یہ تشویش تھی کہ ضروریات زندگی کس طرح فراہم ہوں گی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سلامتی کی بشارت دی جو ہر قسم کے خوف کے ازالہ کو شامل ہے، اور یہ اسی وقت ہوگا جب وسعت رزق بھی حاصل ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو سلامتی کے ساتھ برکت کی بھی بشارت دی اور برکت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نعمتوں کو دوام اور بقاعطا فرمائے گا۔

حضرت نوح علیہ السلام جب کشتی سے اترے تو ان کی اولاد کے علاوہ دوسرے مسلمان جو اس کشتی میں سوار تھے وہ سب کشتی میں ہی فوت ہو چکے تھے، اس لیے اس طوفان کے بعد جو نسل انسانی دنیا میں پھیلی وہ سب حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ○ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ○ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ○ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ○ (الصفت: ۷۹-۷۶)

اور ہم نے نوح اور ان کے اہل کو بڑی تکلیف (طوفان) سے نجات دی○ اور ہم نے صرف ان ہی کی اولاد کو باقی رکھا○ اور بعد میں آنے والوں میں ہم نے ان کا ذکر خیر چھوڑا○ سلام ہو نوح پر تمام جہانوں میں○

اس اعتبار سے برکات سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد میں برکتیں عطا فرمائیں اور حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام اس زمین پر آدم ثانی یا آدم اصغر تھے اور قیامت تک کی نسل انسانی ان کی ذریت ہے۔

وصول نعمت میں عوام اور خواص کا فرق

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور ان جماعتوں پر برکتیں ہیں جو تمہارے ساتھ ہیں، مختار قول یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کی نسل اور ان کی ذریت ہے، پھر یہ بتایا کہ آگے چل کر ان کی ذریت کی دو قسمیں ہو جائیں گی: بعض مومن ہوں گے اور بعض کافر، کافروں کو دنیا میں عارضی فائدہ ہوگا، پھر آخرت میں ان کو دردناک عذاب پہنچے گا۔

اللہ تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا: آپ سلامتی اور برکتوں کے ساتھ اتریئے، بلکہ یوں فرمایا ہے: آپ ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ اتریئے، کیونکہ صدیقین اور مقربین نعمت بحیثیت نعمت سے خوش نہیں ہوتے بلکہ ان کو اس سے خوشی ہوتی ہے کہ ان کو وہ نعمت اللہ کی جانب سے ملی ہے بلکہ اصل میں تو ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت اور اس کی طرف توجہ کرنے سے ہی خوشی ہوتی ہے، عام لوگ صرف نفس نعمت سے خوش ہو جاتے ہیں اور خواص کو نعمت کی اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت سے خوشی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہ (واقعات) من جملہ غیب کی خبروں سے ہیں، جن کی ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں جن کو اس سے پہلے نہ آپ جانتے تھے نہ آپ کی قوم، پس صبر کیجئے بے شک نیک انجام متقین کے لیے ہے○ (ہود: ۴۹)

غیب کی خبروں اور علم غیب کے اطلاق کی بحث

اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے مفصل حالات بیان فرمائے اور حالات بتانے کے بعد فرمایا: یہ غیب کی خبریں ہیں، اور آپ کو معلوم ہو جانے کے بعد بھی اس پر غیب کا اطلاق فرمایا، کیونکہ ماضی کے اعتبار سے وہ غیب ہے، جیسے کوئی ماسٹر پڑھانا چھوڑ دے پھر بھی اس کو ماسٹر صاحب کہتے ہیں کیونکہ ماضی میں وہ ماسٹر تھا اور اس کو اسی اعتبار سے ماسٹر کہا جاتا ہے۔ جو متقین، اللہ تعالیٰ پر، فرشتوں پر، قیامت پر اور جنت اور دوزخ پر ایمان لائے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلانے سے ہی ان چیزوں کو جانا اور مانا، ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یؤمنون بالغیب (البقرہ: ۳) "جو لوگ غیب پر ایمان لاتے ہیں۔" اس آیت میں جنت، دوزخ وغیرہ ان چیزوں پر غیب کا اطلاق فرمایا ہے جو متقین کو پہلے بتادی گئی تھیں، اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جو چیز بتادی جائے یا جس کی خبر دے دی جائے وہ غیب نہیں رہتی، ان کا یہ کہنا ان آیتوں کی روشنی میں غلط ہے، دراصل یہ اعتراض غیب کی تعریف سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ غیب کی تعریف یہ ہے جس چیز کو حواس خمسہ اور بداہت عقل سے نہ جانا جا سکے وہ غیب ہے، اس چیز کے جاننے کا ذریعہ یا عقل سے غور و فکر کرنا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، قیامت اور جنت اور دوزخ اور یا اس کے جاننے کا ذریعہ مخبر صادق کی خبر ہے، جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جنات اور فرشتوں کی خبر دی، اور غیب کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ غیب ہے جس کے جاننے کا کوئی ذریعہ ہو مثلاً عقل سے غور و فکر کرنا یا مخبر صادق کی خبر ہے، یہ غیب عطائی ہے اور ایک وہ غیب ہے جس کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہ ہو، یہ غیب ذاتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی معلومات غیر متناہیہ۔

اسی طرح یہ کہنا بھی علمی طور پر غلط ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی خبروں کا علم ہے علم غیب نہیں ہے، کیونکہ علم کے حصول کے تین ذرائع ہیں: حواس، عقل سلیم اور خبر صادق...... تو جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخبر صادق سے غیب کی خبروں کا علم ہو گیا تو آپ کو غیب کا علم ہو گیا، البتہ چونکہ غیب سے متبادر غیب ذاتی ہوتا ہے اس لیے یوں نہیں کہنا چاہیے کہ آپ کو علم غیب ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ آپ کو غیب کا علم دیا گیا ہے، اسی طرح آپ کو عالم الغیب کہنا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ عرف اور شرع میں عالم الغیب کا لفظ اللہ عزوجل کے ساتھ مختص ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ آپ مطلع علی الغیب ہیں۔ ہم نے البقرہ: ۳ میں اس مبحث کی زیادہ تفصیل کی ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کا قصہ ان آیات کے نازل ہونے سے پہلے بھی لوگوں کو معلوم تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ ان آیات کے نازل ہونے سے پہلے یہ قصہ لوگوں کو اجمالی طور پر معلوم تھا اور ان آیات سے اس قصہ کی تفصیل معلوم ہوئی۔

اس آیت میں آپ کو صبر کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ آپ اور آپ کے متبعین کفار کی اذیتوں پر صبر کریں، جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم نے کافروں کی اذیتوں پر صبر کیا تھا اور صبر کرنے سے آپ کو اور آپ کے متبعین کو اللہ تعالیٰ کی مدد اور کامیابی حاصل ہوگی جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کو اللہ کی مدد اور کامیابی حاصل ہوئی تھی۔

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ

اور قوم عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی (ہم قوم) ہود کو بھیجا، انہوں نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہاری

اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ

عبادت کا کوئی مستحق نہیں ہے، تم اللہ پر (شریک کا) محض بہتان باندھنے والے ہو ○ اے میری قوم! میں تم سے اس تبلیغ پر کسی اجرت کا

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَيٰقَوْمِ

سوال نہیں کرتا، میری اجرت صرف اس (رب) کے ذمہ کرم پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ ○ اے میری قوم!

اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ

تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، پھر اس کی طرف توبہ کرو وہ تم پر موسلا دھار بارش بھیجے گا، اور تمہاری

يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا

قوت میں مزید طاقت کا اضافہ کرے گا اور مجرموں کی طرح (حق سے) پیٹھ نہ پھیرو ○ انہوں نے کہا اے ہود! تم

جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ

ہمارے پاس کوئی دلیل لے کر نہیں آئے اور ہم (محض) تمہارے کہنے کی وجہ سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں اور نہ ہم

بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ

تم پر ایمان لانے والے ہیں ○ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ ہمارے بعض معبودوں نے تم کو مجنون بنا دیا ہے، ہود نے کہا

قَالَ اِنِّيْۤ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْۤا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾

میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم (بھی) گواہ رہنا میں ان سے بیزار ہوں جن کو تم (اللہ کا) شریک قرار دیتے ہو ○

مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى

اللہ کے سوا، تم سب مل کر میرے خلاف سازش کرو پھر تم مجھ کو (بالکل) مہلت نہ دو ○ بے شک میں نے اللہ پر

اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ

توکل کیا جو میرا اور تمہارا رب ہے، ہر جاندار کو اس نے اس کی پیشانی سے پکڑا ہوا ہے، بے شک میرا

رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ

رب سیدھے راستے پر (ملتا) ہے ○ اگر تم پیٹھ پھیرو (تو کوئی بات نہیں) میں تم کو وہ پیغام پہنچا چکا ہوں جو

بِهٖۤ اِلَيْكُمْؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْــًٔاؕ

مجھے دے کر بھیجا گیا تھا اور میرا رب تمہاری جگہ دوسری قوم کو لا کر آباد کر دے گا اور تم اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے،

اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝۵۷ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا

بے شک میرا رب ہر چیز کا نگہبان ہے ○ اور جب ہمارا عذاب آگیا تو ہم نے ہود کو اور ان کے

وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّاۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝۵۸

ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے نجات دے دی اور ہم نے ان کو سخت عذاب سے بچا لیا ○

وَتِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ

اور یہ ہیں قوم عاد کے لوگ جنہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر ظالم

جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝۵۹ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِؕ اَلَاۤ

ہٹ دھرم کا حکم مانا ○ اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگی رہی اور قیامت کے دن بھی (ان کے پیچھے لگی رہے گی)

۵ع ۱۱ ۵ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۝۶۰

سنو بے شک قوم عاد نے اپنے رب کا کفر کیا، سنو ہود کی قوم عاد کے لیے پھٹکار ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور قوم عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی (ہم قوم) ہود کو بھیجا۔ انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہاری عبادت کا کوئی مستحق نہیں ہے، تم اللہ پر (شریک کا) محض بہتان باندھنے والے ہو○ اے میری قوم! میں تم سے اس تبلیغ پر کسی اُجرت کا سوال نہیں کرتا، میری اُجرت صرف اس (کے ذمہ کرم) پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟○ (ھود: ۵۱-۵۰)

حضرت ہود علیہ السلام کو قوم عاد کا بھائی کہنے کی توجیہ

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد اس سورت میں یہ دوسرا حضرت ہود علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا ہے:

اس آیت میں فرمایا ہے: والی عاد اخاھم ھودا۔ اس کا لفظی ترجمہ ہے: "ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔" اس میں حضرت ہود علیہ السلام کو قوم عاد کا بھائی فرمایا ہے اور یہ بات معلوم تھی کہ حضرت ہود علیہ السلام ان کے دینی بھائی نہ تھے اور نہ ہی وہ ان کے نسبی بھائی تھے، ان کو قوم عاد کا بھائی صرف اس وجہ سے فرمایا کہ وہ ان کے قبیلہ کا ایک فرد تھے۔ ان کا قبیلہ عرب کا ایک قبیلہ تھا اور وہ لوگ یمن کی جانب رہتے تھے، قوم عاد اور حضرت ہود کے متعلق تمام تفاصیل ہم نے الاعراف: ۷۲-۶۵ میں بیان کر دی ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ اس سورت میں جو فرمایا ہے: ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے قبیلہ کے ایک فرد کو نبی بنا کر بھیجا، اسی طرح قوم ثمود کی طرف ان کے قبیلہ کے ایک فرد حضرت صالح علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا،

اس سے مکہ والوں پر یہ حجت قائم کرنا مقصود ہے کہ وہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی اور رسول بنانا بہت مستبعد سمجھتے تھے کیونکہ آپ انہی کے قبیلہ کے ایک فرد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا کہ اس میں حیرت اور تعجب کی کیا بات ہے، حضرت ہود علیہ السلام عاد کے قبیلہ کے ایک فرد تھے اور ان کو نبی بنایا گیا اور حضرت صالح علیہ السلام ثمود کے قبیلہ کے ایک فرد تھے اور ان کو نبی بنایا گیا تو (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی تمہارے قبیلہ کے ایک فرد ہیں اور ان کو نبی بنایا گیا ہے تو اس میں حیرت اور تعجب کی کیا بات ہے اور یہ کون سی نئی بات ہے! (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۶۳، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امتی کے لیے نبی کو اپنا بھائی کہنے کے جواز پر بعض علماء کے دلائل

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ امتی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ نبی کو اپنا بھائی کہے، چنانچہ شیخ اسماعیل دہلوی متوفی ۱۲۴۶ھ لکھتے ہیں:

مشکوٰۃ کے باب عشرۃ النساء میں لکھا ہے کہ امام احمد نے ذکر کیا کہ بی بی عائشہ نے نقل کیا کہ پیغمبر خدا مہاجرین اور انصار میں بیٹھے تھے کہ آیا ایک اونٹ پھر اس نے سجدہ کیا پیغمبر خدا کو سو ان کے اصحاب کہنے لگے: اے پیغمبر خدا تم کو سجدہ کرتے ہیں جانور اور درخت سو ہم کو ضرور چاہیے کہ تم کو سجدہ کریں، سو فرمایا: بندگی کرو اپنے رب کی اور تعظیم کرو اپنے بھائی کی۔ (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸۵۲، مسند احمد ج ۶ ص ۷۶، طبع قدیم، مسند احمد رقم الحدیث: ۲۴۹۷۵، ۲۵۴۵۷، عالم الکتب بیروت، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۳۲۷۰) شیخ اسماعیل دہلوی اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد ف کا عنوان قائم کر کے اس حدیث کا فائدہ لکھتے ہیں: یعنی انسان آپس میں سب بھائی ہیں جو بڑا بزرگ ہو وہ بڑا بھائی ہے سو اس کی بڑے بھائی کی سی تعظیم کیجئے اور مالک سب کا اللہ ہے بندگی اس کی چاہیے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اولیاء و انبیاء، امام و امام زادہ، پیر و شہید یعنی جتنے اللہ کے مقرب بندے ہیں وہ سب انسان ہی ہیں اور بندے عاجز اور ہمارے بھائی مگر ان کو اللہ نے بڑائی دی، وہ بڑے بھائی ہوئے، ہم کو ان کی فرماں برداری کا حکم ہے، ہم ان کے چھوٹے ہیں سو ان کی تعظیم انسانوں کی سی کرنی چاہیے نہ خدا کی سی۔

(تقویت الایمان کلاں ص ۴۲-۴۱، مطبوعہ مطبع علیمی لاہور)

شیخ اسماعیل دہلوی کے ایک وکیل شیخ سرفراز احمد صفدر نے اس حدیث کے علاوہ قرآن مجید کی آیات سے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھائی کہنے پر استدلال کیا ہے، لکھتے ہیں:

والی عاد اخاھم ھودا۔ الایہ، والی ثمود اخاھم صالحا۔ الایہ، والی مدین اخاھم شعیبا۔ الایہ، واخوان لوط۔ الایہ۔

قرآن کریم میں صریح طور پر یہ الفاظ موجود ہیں، کون مسلمان اپنی اپنی قوم کے لیے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی اس اخوت سے انکار کر سکتا ہے۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم کی اخوت بہ ارشاد خود اور بہ فرمان الٰہی ثابت ہے اور اس کا انکار قرآن اور حدیث کا انکار ہے۔ (عبارت اکابر ص ۶۹، ۱۴۰۵ھ، مطبوعہ گوجرانوالہ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھائی کہنے کے عدم جواز پر دلائل

اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کا مالک اور مولیٰ ہے اور انبیاء علیہم السلام اس کے بندے ہیں، وہ انبیاء علیہم السلام کو جو کچھ فرمائے وہ اس کو زیبا ہے، اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق فرماتا ہے:

وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی۔ (طٰہٰ: ۱۲۱) اور آدم نے اپنے رب کی معصیت کی پس وہ بے راہ ہوئے۔

کیا اس آیت کو دیکھ کر حضرت آدم علیہ السلام کو عاصی اور بے راہ یا گمراہ کہنا جائز ہے، علامہ ابن الحاج مالکی متوفی ۷۳۷ھ لکھتے ہیں: جس شخص نے اثناء تلاوت یا قراءت حدیث کے علاوہ حضرت آدم کے متعلق کہا کہ انہوں نے معصیت کی وہ کافر ہو گیا۔ (المدخل ج ۲ ص ۱۴، دار الفکر بیروت)

اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام تواضع اور انکسار سے اپنے متعلق جو کلمات فرمائیں اس سے یہ جواز نہیں نکلتا کہ امتی بھی ان کے متعلق وہ کلمات کہنے کی جرأت کرے، دیکھئے حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا۔ (الاعراف: ۲۳) (آدم اور حوا) دونوں نے عرض کیا اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ۔ (القصص: ۱۶) (موسیٰ نے) کہا: اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا۔

حضرت یونس علیہ السلام نے فرمایا:

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ (الانبیاء: ۸۷) تیرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں تو سبحان ہے، بے شک میں ظالموں میں سے ہوں۔

کیا ان آیتوں کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ظالم کہنا قرآن مجید سے ثابت ہے اور ان کو ظالم کہنے کا انکار کرنا قرآن مجید کا انکار کرنا ہے۔

نیز حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جب لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس شفاعت کی درخواست لے کر حاضر ہوں گے تو وہ فرمائیں گے کہ آج اللہ تعالیٰ اس قدر غضب میں ہے کہ پہلے کبھی اتنے غضب میں تھا اور نہ آئندہ کبھی اتنے غضب میں ہوگا، اس نے مجھ کو ایک درخت سے کھانے سے منع کیا تھا میں نے اس کی معصیت کی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۷۱۲، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۹۴، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۴۳۴، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۳۰۷ ملخصاً)

اب کیا ان آیات کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت آدم، حضرت موسیٰ اور حضرت یونس ظالم تھے اور اس حدیث کی وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت آدم عاصی تھے! اور یہ کہ ان نبیوں کا ظالم اور عاصی ہونا قرآن اور حدیث سے ثابت ہے اور ان کے ظالم ہونے کا انکار کرنا قرآن اور حدیث کا انکار کرنا ہے، العیاذ باللہ، ہم اس قسم کے استدلال سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے ہیں!

اللہ تعالیٰ نے اپنی شان کبریائی سے حضرت ھود علیہ السلام کو قوم عاد کا بھائی فرمایا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم بھی انبیاء علیہم السلام کو اپنا بھائی کہیں یا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تواضعاً خود کو صحابہ کرام کا بھائی فرمایا، یہ اس کو مستلزم نہیں ہے کہ ہم بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہیں کہ آپ ہمارے بھائی ہیں، استدلال اس وقت صحیح ہوتا جب شیخ اسماعیل دہلوی یا ان کے وکیل شیخ سرفراز احمد صاحب یہ ثابت کرتے کہ قرآن مجید کی فلاں آیت یا فلاں صحیح حدیث میں تصریح ہے کہ فلاں صالح امتی نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا بھائی کہا ہے اور یہ چیز ہرگز ثابت نہیں ہے لہٰذا امتی کے لیے اپنے نبی کو اپنا بھائی کہنا بھی ثابت نہیں ہے۔

بڑے بھائی جتنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کی تلقین کرنا غلط ہے

شیخ اسماعیل دہلوی نے اس سیاق میں یہ بھی لکھا ہے جو بڑا بزرگ ہو وہ بڑا بھائی ہے سو اس کی بڑے بھائی کی سی تعظیم کیجئے۔

ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ کہنا کہ ان کی تعظیم بڑے بھائی کی سی کی جائے نہ صرف یہ کہ صراحتاً غلط ہے بلکہ بارگاہ نبوت میں اہانت کے مترادف ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ (الحجرات: ۱)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول پر سبقت نہ کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے۔

حسن بیان کرتے ہیں کہ کچھ مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے قربانی کر دی تو ان کو دوبارہ قربانی کرنے کا حکم ہوا اور یہ آیت نازل ہوئی۔ (الدر المنثور ج ۷ ص ۵۴۷، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ)

ظاہر ہے کہ اگر بڑے بھائی سے پہلے قربانی کر دی تو اس قربانی کا نامقبول ہونا لازم نہیں آتا لیکن اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے قربانی کر دی تو وہ قربانی عبث اور رائیگاں ہو گئی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○ (الحجرات: ۲)

اے ایمان والو! اس نبی کی آواز پر اپنی آواز اونچی نہ کرنا اور نہ اس کے سامنے اس طرح بلند آواز سے باتیں کرنا جس طرح تم ایک دوسرے کے ساتھ بلند آواز سے باتیں کرتے ہو (ایسا نہ ہو) کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں پتا بھی نہ چلے۔

کیا بڑے بھائی کی آواز پر آواز اونچی ہونے سے بھی اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور ایمان جاتا رہتا ہے۔

بڑے بھائی کو مکان کے باہر سے آواز دے کر بلانا ممنوع نہیں ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکان کے باہر سے آواز دے کر بلانا ممنوع ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ (الحجرات: ۴)

بے شک جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں اکثر بے عقل ہیں۔

بڑے بھائی کے بلانے پر جانا فرض اور واجب نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے پر جانا فرض ہے اور جو شخص آپ کے بلانے پر نہ جائے اس پر اللہ تعالیٰ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے اور عذاب کی وعید سنائی ہے۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (النور: ۶۳)

رسول کے بلانے کو ایسا نہ بناؤ جیسا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو بے شک اللہ تم میں سے ان لوگوں کو جانتا ہے جو آڑ لے کر چپکے سے نکل جاتے ہیں، سو جو لوگ رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کو اس سے ڈرنا چاہیے کہ ان کو کوئی مصیبت پہنچے یا ان کو دردناک عذاب پہنچ جائے۔

شیخ خلیل احمد سہارنپوری متوفی ۱۳۴۶ھ لکھتے ہیں:

جو اس کا قائل ہو کہ نبی کریم علیہ السلام کو ہم پر بس اتنی فضیلت ہے جتنی بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی پر ہوتی ہے تو اس

کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ دائرۂ ایمان سے خارج ہے (الیٰ قولہ) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا افضل البشر اور تمام مخلوقات سے اشرف اور جمیع پیغمبروں کا سردار اور سارے نبیوں کا امام ہونا ایسا قطعی امر ہے جس میں ادنیٰ مسلمان بھی تردد نہیں کر سکتا۔ (عقائد علماء دیوبند ص ۲۸، مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی)

حضرت صالح علیہ السلام نے دلائل قائم کیے بغیر توحید کی دعوت کیوں دی تھی؟

حضرت ہود علیہ السلام نے قوم عاد کو توحید کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا: "اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہاری عبادت کا کوئی مستحق نہیں ہے۔" اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے وجود اور ثبوت پر دلائل قائم کیے بغیر اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف کیسے دعوت دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلائل بالکل ظاہر ہیں اور یہ دلائل اس خارجی کائنات میں بھی پھیلے ہوئے ہیں اور خود انسان کے اپنے اندر بھی موجود ہیں:

سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ (حٰم السجدۃ: ۵۳)

ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے اس خارجی کائنات میں اور خود ان کے اپنے نفسوں میں حتیٰ کہ ان پر منکشف ہو جائے گا کہ وہی حق ہے۔

کچھ لوگ اس کائنات کے نظم اور تسلسل کو دیکھ کر اور اس میں غور و فکر کر کے اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر ایمان لے آتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے جسم کے اعضاء کی منظم کارکردگی کو دیکھ کر اس کی قدرت پر ایمان لے آتے ہیں اور کچھ لوگ اس کی صفات اور اس کے ثمرات سے اس کو پہچان لیتے ہیں، بعض لوگ اللہ تعالیٰ کو اس کے فضل اور احسان اور اس کے جود و عطا سے پہچان لیتے ہیں، بعض لوگ اس کے عفو، اس کے حلم اور اس کے درگزر کرنے سے اس کو پہچان لیتے ہیں، بعض لوگ اس کی گرفت اور اس کے انتقام سے اس کو پہچان لیتے ہیں اور بعض لوگ مشکلوں اور مصیبتوں میں اس کی فریاد رسی سے اور اپنی ضرورتوں میں اس کی حاجت روائی سے اور اپنی دعاؤں کے قبول ہونے سے اس کو پہچان لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کرتے ہوں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى یُؤْفَكُوْنَ○ (العنکبوت: ۶۱)

اور اگر آپ ان سے (یہ) پوچھیں کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے کام میں لگایا ہوا ہے تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے! تو وہ کہاں بھٹک رہے ہیں!

حضرات انبیاء علیہم السلام ان کو بت پرستی سے روکتے تھے، کافروں نے ماضی میں گزرے ہوئے نیک لوگوں کے مجسمے بنا لیے تھے اور وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کی پرستش کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی ہو گا اور ان کے گناہوں کو معاف کر دے گا، حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں یہ بتایا کہ یہ محض تمہارا جھوٹ اور افتراء ہے، یہ مجسمے اور مورتیاں جمادات ہیں، ان میں حس ہے نہ قوت ادراک پھر یہ کس طرح درست ہو گا کہ تم اپنی پیشانی اپنی ہی بنائی ہوئی مورتیوں کے آگے جھکاؤ۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان کو بت پرستی سے منع کیا اور توحید کی دعوت دی پھر فرمایا: اے میری قوم! میں تم سے اس تبلیغ پر کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا، کیونکہ جو تبلیغ معاوضہ کی طمع سے خالی اور بے لوث اور بے غرض ہو وہ قلوب میں بہت زیادہ موثر ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (حضرت ہود نے کہا) اے میری قوم! تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، پھر اس کی طرف توبہ کرو، وہ تم پر موسلادھار بارش بھیجے گا اور تمہاری قوت میں مزید طاقت کا اضافہ کرے گا اور مجرموں کی طرح (حق سے) پیٹھ نہ پھیرو○ (ھود: ۵۲)

نعمتیں عطا کرنے کے بعد ان سے استفادہ کی توفیق عطا فرمانا

حضرت ھود علیہ السلام نے پہلے قوم عاد کو ایمان لانے کی دعوت دی پھر اس کے بعد انہیں توبہ اور استغفار کرنے کی ہدایت دی، ایمان کی پہلے دعوت دی کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا پھر اس کے بعد انہیں توبہ اور استغفار کرنے کا حکم دیا تاکہ پچھلے گناہوں کی آلودگیوں سے ان کا دل صاف ہو جائے۔ حضرت ھود علیہ السلام نے بتایا کہ جب تم گناہوں پر نادم ہو گے اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو بکثرت نعمتیں عطا فرمائے گا، اور ان نعمتوں سے استفادہ کرنے کی تم کو طاقت اور قوت عطا فرمائے گا، اور یہی سعادت اور کامیابی اور کامرانی کی انتہا ہے، کیونکہ اگر سرے سے نعمت حاصل نہ ہو پھر بھی انسان کو کچھ فائدہ نہیں ہو گا، اور اگر نعمت تو حاصل ہو لیکن اس میں اس نعمت سے فائدہ حاصل کرنے کی صلاحیت نہ ہو پھر بھی اس کو فائدہ حاصل نہیں ہو گا، مثلاً بھوکے انسان کو کھانا میسر نہ ہو تب بھی اس کی بھوک نہیں مٹ سکتی، لیکن کھانا تو میسر ہو لیکن اس کا اوپر کا جبڑا نچلے جبڑے پر بیٹھ گیا ہو اور دانت ایک دوسرے پر جم گئے اور وہ منہ کھول سکتا ہو نہ چبا سکتا ہو پھر بھی اس کی بھوک دور نہیں ہو سکتی اور اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ سبحان ہے وہ ذات جس نے نعمتیں بھی عطا کیں اور نعمتوں سے فائدہ حاصل کرنے کی قوت بھی عطا کی اس لیے حضرت ھود علیہ السلام نے فرمایا: وہ تم پر موسلادھار بارش بھیجے گا اور تمہاری قوت میں مزید طاقت کا اضافہ کرے گا۔ یہ اس لیے فرمایا کہ مادی نعمتوں کا حصول زراعت کی کثرت پر موقوف ہے اور زراعت میں زیادتی بارش کے زیادہ ہونے پر موقوف ہے، اس کے بعد فرمایا: اور تمہاری قوت میں مزید طاقت کا اضافہ کرے گا، یہ اس لیے فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ حاصل کر سکیں۔

قوم عاد کے لوگ بہت قوی ہیکل تھے، اور وہ اس زمانے کے لوگوں کے اوپر اپنی جسمانی قوت سے فخر کرتے تھے جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے:

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ (حم السجدۃ: ۱۵)

پس قوم عاد نے زمین میں ناحق سرکشی کی، اور انہوں نے کہا ہم سے زیادہ قوت والا کون ہے؟

حضرت ھود علیہ السلام نے ان سے یہ وعدہ کیا کہ اگر انہوں نے بُت پرستی ترک کر دی اور استغفار اور توبہ میں مشغول ہو گئے تو اللہ تعالیٰ ان کے کھیتوں اور باغوں میں مزید اضافہ فرمائے گا اور ان کی جسمانی قوت کو بھی زیادہ کرے گا۔ اور یہ بھی منقول ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ھود علیہ السلام کو بھیجا اور انہوں نے حضرت ھود علیہ السلام کی تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ نے کئی سالوں تک ان سے بارش روک لی، اور ان کی عورتوں کو بانجھ کر دیا، تب حضرت ھود علیہ السلام نے ان سے فرمایا: اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ تمہاری غیر آباد اور بنجر زمینوں کو سرسبز اور شاداب کر دے گا اور تم کو مال اور اولاد سے نوازے گا حتیٰ کہ تم بہت طاقت ور ہو جاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انہوں نے کہا: اے ھود! تم ہمارے پاس کوئی دلیل لے کر نہیں آئے اور ہم (محض) تمہارے کہنے کی وجہ سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں اور نہ ہم تم پر ایمان لانے والے ہیں O ہم تو یہی کہتے ہیں کہ ہمارے بعض معبودوں نے تم کو مجنون بنا دیا ہے، ھود نے کہا: میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم (بھی) گواہ رہنا میں ان سے بیزار ہوں جن کو تم (اللہ کا) شریک قرار دیتے ہو O اللہ کے سوا تم سب مل کر میرے خلاف سازش کرو، پھر تم مجھ کو (بالکل) مہلت نہ دو O بے شک میں نے اللہ پر توکل کیا جو میرا اور تمہارا رب ہے، ہر جاندار کو اس نے اس کی پیشانی سے پکڑا ہوا ہے، بے شک میرا رب سیدھے راستے پر (ملتا) ہے O (ھود: ۵۶-۵۳)

حضرت ہود علیہ السلام اور ان کی قوم کا مکالمہ

قوم عاد نے حضرت ہود علیہ السلام سے کہا کہ تم ہمارے پاس کوئی دلیل لے کر نہیں آئے، جب کہ یہ معلوم ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے ان کے سامنے معجزات پیش کیے تھے، لیکن ان کی قوم نے اپنی جہالت سے ان معجزات کا انکار کیا اور انہوں نے یہ زعم کیا کہ حضرت ہود علیہ السلام ان کے پاس قابل ذکر معجزات لے کر نہیں آئے۔

انہوں نے کہا: ہم محض تمہارے کہنے کی وجہ سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں، ان کا یہ قول بھی باطل تھا، کیونکہ وہ یہ اعتراف کرتے تھے کہ نفع اور نقصان پہنچانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اور بت کسی کو، کوئی نفع اور نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے، ایسی صورت میں بداہت عقل کا یہ تقاضا ہے کہ وہ بتوں کی عبادت کو ترک کر دیتے اور ان کا بتوں کی عبادت کرنے پر اصرار کرنا ان کی جہالت، حماقت اور ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں، اور ان کا یہ کہنا کہ ہم آپ پر ایمان لانے والے نہیں ہیں، محض اندھی تقلید کرنے کی ضد ہے۔

انہوں نے کہا: ہمارے بعض معبودوں نے آپ کو مجنون بنا دیا ہے، ان کا مطلب یہ تھا کہ آپ کا ہمارے بتوں کو برا کہنا، آپ کی عقل کے فساد اور آپ کے مجنون ہونے کی دلیل ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا: میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہنا میں ان سے بیزار ہوں جن کو تم اللہ کا شریک قرار دیتے ہو۔

پھر حضرت ہود نے فرمایا: تم سب مل کر میرے خلاف سازش کرو، یہ اسی طرح ہے جس طرح حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا تھا: تم سب مل کر اپنی تدبیر پکی کر لو اور اپنے معبودوں کو بھی ساتھ ملا لو پھر تمہاری تدبیر کسی طرح تم سے مخفی نہ رہے پھر تم جو کچھ میرے ساتھ کر سکتے ہو کر لو اور مجھے مہلت نہ دو۔ (یونس: ۷۱)

حضرت ہود علیہ السلام کا اپنی قوم کو یہ چیلنج دینا اور ان کو للکارنا ان کا بہت بڑا معجزہ ہے کیونکہ ایک تنہا شخص بہت بڑی قوم سے یہ کہے کہ تم میری دشمنی میں اور مجھے نقصان پہنچانے میں جو کچھ کر سکتے ہو وہ کر گزرو اور میرا جو کچھ بگاڑ سکتے ہو وہ بگاڑ لو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو، تو یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پر پورا پورا اعتماد ہو کہ وہ اس کی حفاظت کرے گا اور اس کو دشمنوں سے بچائے گا۔

فرمایا: ہر جاندار کو اس نے پیشانی سے پکڑا ہوا ہے۔ عرب یہ جملہ اس وقت کہتے ہیں جب یہ بتانا ہوتا ہے کہ فلاں شخص فلاں کا بالکل مطیع ہے اور اس کے قبضہ و قدرت میں ہے، کیونکہ جو شخص کسی کو اس کی پیشانی کے بالوں سے پکڑتا ہے تو اس کو بالکل مسخر اور مقہور کر لیتا ہے اور عرب جب کسی قیدی کو گرفتار کرتے اور پھر اس پر احسان کر کے اس کو آزاد کرنا چاہتے تو اس کو پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر چھوڑ دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے عرب کے محاورہ کے مطابق یہ کلام فرمایا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ہر جاندار اس کے قبضہ و قدرت میں ہے اور اس کی قضاء و قدر کے تابع ہے۔

اس کے بعد فرمایا: بے شک میرا رب سیدھے راستہ پر (ملتا) ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ ہرچند کہ ہر جاندار اللہ تعالیٰ کے قبضہ و قدرت میں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا، اور ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جو حق ہوتا ہے اور عدل اور صحیح ہوتا ہے، اس کا یہ معنی بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپ نہیں سکتی اور کوئی شخص اس سے بھاگ کر اس کی پہنچ سے باہر نہیں ہو سکتا۔

خلاصہ آیات

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کے دل و دماغ میں بت پرستی راسخ ہو چکی تھی اور وہ اپنے آباء و

اجداد کی اندھی تقلید پر جمے ہوئے تھے اور اس کے خلاف کوئی بات سننے کیلئے تیار نہ تھے اور نہ کسی دلیل کا کوئی اثر قبول کرتے تھے۔

حضرت ھود علیہ السلام نے ان کے سامنے معجزات پیش کیے اور سب سے بڑا معجزہ یہ تھا کہ انہوں نے تن تنہا پوری قوم کو للکارا، وہ ان کا جو بگاڑ سکتی ہو وہ بگاڑ لے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی تھے اور ان کو اس پر کامل اعتماد تھا کہ اللہ عزوجل کی مدد ان کے ساتھ ہے اور یہ کافر سب مل کر بھی ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

ان کو اللہ تعالیٰ پر کامل توکل تھا، اور اس پر ایمان تھا کہ ہر جاندار اللہ تعالیٰ کے قبضہ و قدرت میں ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا اور ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جو حق اور عدل ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اگر تم پیٹھ پھیرو تو (کوئی بات نہیں) میں تم کو وہ پیغام پہنچا چکا ہوں جو مجھے دے کر بھیجا گیا تھا، اور میرا رب تمہاری جگہ دوسری قوم کو لا کر آباد کر دے گا اور تم اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، بے شک میرا رب ہر چیز کا نگہبان ہے○ اور جب ہمارا عذاب آگیا تو ہم نے ھود کو اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے نجات دے دی اور ہم نے ان کو سخت عذاب سے بچا لیا○ اور یہ ہیں قوم عاد کے لوگ جنہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر ظالم ہٹ دھرم کا حکم مانا○ اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگی رہی اور قیامت کے دن بھی (ان کے پیچھے لگی رہے گی) سنو! بے شک قوم عاد نے اپنے رب کا کفر کیا، سنو ھود کی قوم عاد کے لیے پھٹکار ہے○ (ھود: ۶۰-۵۷)

قوم عاد پر نزول عذاب کا پس منظر اور پیش منظر

حضرت ھود علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: اگر تم پیٹھ پھیرو، اس کے بعد جزاء محذوف ہے یعنی اگر تم پیٹھ پھیرو تو مجھے پیغام پہنچانے میں کوتاہی پر کسی عتاب کا سامنا نہیں ہوگا، کیونکہ میں نے تم کو بار بار پیغام پہنچایا اور تم مسلسل میری تکذیب کرتے رہے، پھر فرمایا: اور میرا رب تمہاری جگہ دوسری قوم کو لا کر آباد کر دے گا، یعنی تمہارے بعد اللہ تعالیٰ ایسی قوم پیدا کرے گا جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے گی، اس میں یہ اشارہ ہے کہ حضرت ھود علیہ السلام کے منکروں پر ایسا عذاب آنے والا ہے جس سے پوری قوم کو ملیامیٹ کر دیا جائے گا اور پوری قوم عاد کو ہلاک کر دینے سے اللہ تعالیٰ کے ملک میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

پھر فرمایا: اور جب ہمارا عذاب آگیا، ان پر عذاب کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سات راتوں اور آٹھ دنوں تک ایک زبردست آندھی بھیجی، یہ سخت اور تیز ہوا ان کے نتھنوں میں گھستی اور ان کے پچھلے سوراخ (دبر) سے نکل کر ان کو منہ کے بل زمین پر گرا دیتی حتیٰ کہ وہ اس طرح ہو گئے جس طرح کھجور کے تنے زمین پر گرے ہوئے ہوں۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ ہوا نے ان کو کس طرح ہلاک کر دیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہوا سخت گرم ہو یا بہت یخ بستہ اور ٹھنڈی ہو یا وہ ہوا بہت تیز اور بہت سخت ہو اور اس نے ان کو زمین پر پچھاڑ دیا ہو، ان میں سے ہر چیز ممکن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے ھود اور ایمان والوں کو نجات دی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ آندھی مسلمانوں اور کافروں دونوں پر آئی لیکن مسلمانوں پر یہ آندھی رحمت بن گئی اور یہی آندھی کافروں پر عذاب بن گئی۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کرنے والوں پر جو عذاب نازل فرماتا ہے، مسلمانوں کو اس عذاب سے نجات عطا فرماتا ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کیسے معلوم ہوتا کہ کافروں پر ان کے کفر کی وجہ سے عذاب نازل ہوا ہے۔

نجات کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے ساتھ مربوط فرمایا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ایمان اور ان کے نیک اعمال کے باوجود وہ اس عذاب سے نجات نہیں پا سکتے تھے اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کے شامل حال نہ ہوتی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ ان کو نجات ان کے ایمان اور ان کے نیک اعمال کی وجہ سے ملی تھی لیکن ایمان اور نیک اعمال کی

ہدایت ان کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ملی تھی اور اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عین نزول عذاب کے وقت ان پر رحم فرمایا اور ان کو کافروں سے الگ کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے جب قوم عاد کا قصہ ذکر فرمایا تو ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کو مخاطب کر کے فرمایا: یہ ہیں عاد، اس قول میں ان کی قبروں اور ان کے آثار کی طرف اشارہ ہے، گویا یوں فرمایا ہے: زمین میں سفر کرو اور غور و فکر کر کے قوم عاد کے آثار دیکھو اور ان سے عبرت حاصل کرو، پھر اللہ تعالیٰ نے قوم عاد کی تین برائیوں کا ذکر فرمایا:

(۱) انہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا، اس سے مراد یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے اپنے دعویٰ نبوت کے صدق پر جو معجزات پیش کیے انہوں نے ان کا انکار کیا اور یا اس سے مراد یہ ہے کہ اس خارجی کائنات میں اور خود ان کے جسم کے داخل میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر جو نشانیاں ہیں ان نشانیوں سے اس صاحب نشان تک پہنچنے کے لیے انہوں نے غور و فکر نہیں کیا۔

(۲) انہوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی، ہرچند کہ انہوں نے صرف حضرت ہود علیہ السلام کی تکذیب کی تھی لیکن چونکہ تمام رسولوں کا ایک ہی پیغام ہے اور سب کا ایک ہی دین ہے اس لیے ایک رسول کی تکذیب کرنا تمام رسولوں کی تکذیب کے مترادف ہے۔

(۳) انہوں نے ہر ظالم ہٹ دھرم کا حکم مانا، اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے عوام اپنے بڑوں کی تقلید کرتے تھے اور ان کے بڑے یہی کہتے تھے کہ یہ جو شخص نبوت کا مدعی ہے وہ تمہاری ہی مثل بشر ہے اور یہ کہہ کر وہ اس نبی کی نبوت کا انکار کرتے تھے اور عوام آنکھیں بند کر کے ان کی تقلید کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے ان تین اوصاف کو بیان کرنے کے بعد فرمایا: اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگی رہی اور قیامت کے دن بھی ان کے پیچھے لعنت لگی رہے گی، اس سے مراد یہ ہے کہ اس دنیا اور آخرت میں ان کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دھتکار دیا ہے اور ان کو ہر خیر سے محروم کر دیا گیا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ قوم عاد پر اس عذاب اور لعنت کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے رب سے کفر کیا، اس کو واحد ماننے اور صرف اس کی عبادت کرنے سے انکار کیا اور اس کی نعمتوں کی ناشکری کی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عاد جو ہود کی قوم ہے، اس کے لیے پھٹکار ہے، عاد کو ہود کی قوم کے ساتھ اس لیے مقید فرمایا کہ عاد نام کی دو قومیں تھیں: ایک عاد قدیم تھی، یہ حضرت ہود علیہ السلام کی قوم تھی، اس کو عاد اولیٰ بھی کہتے ہیں اور عاد حدیث، اس کو عاد ثانیہ بھی کہتے ہیں، یہ بہت جسیم اور قد آور لوگ تھے۔ یہی ارم ذات العماد ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے بعد والی قوم عاد سے احتراز کے لیے فرمایا: عاد جو ہود کی قوم ہے۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم

اور قوم ثمود کی طرف ہم نے ان کے ہم قوم صالح کو بھیجا، صالح نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا

مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ

تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اس میں

وقف لازم



فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿٦١﴾

آباد کیا، سو تم اس سے مغفرت طلب کرو، پھر اس کی طرف توبہ کرو، پس میرا رب قریب ہے، دعا قبول کرنے والا ہے ○

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ

انہوں نے کہا اے صالح! اس سے پہلے آپ ہماری امیدوں کا مرکز تھے! کیا آپ ہمیں ان کی عبادت کرنے سے منع کرتے ہیں

نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿٦٢﴾

جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے، بے شک آپ ہمیں جس دین کی دعوت دے رہے ہیں اس نے ہمیں زبردست شک میں ڈال دیا ہے ○

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ

(صالح نے کہا) اے میری قوم! یہ بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے

مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۣ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ

اپنی طرف سے رحمت عطا فرمائی ہو، تو اللہ کے مقابلہ میں میری کون مدد کرے گا؟ اگر میں اس کی نافرمانی کروں، تو تم میرے لیے سوا نقصان کے

غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿٦٣﴾ وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ

کس چیز میں زیادتی کر رہے ہو ○ اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی ہے جو تمہارے لیے نشانی ہے، سو اس کو چھوڑ دو یہ اللہ کی

فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْۗءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿٦٤﴾

زمین میں کھاتی پھرے اور اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا ورنہ تم کو عنقریب عذاب پہنچے گا ○

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ

سو انہوں نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں، تب (صالح نے) کہا تم صرف تین دن مزے اٹھا لو (پھر تم پر عذاب آجائے گا) یہ اللہ کی وعید

مَكْذُوْبٍ ﴿٦٥﴾ فَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ

ہے جو ہرگز جھوٹی نہیں ہوگی ○ پس جب ہمارا عذاب آگیا تو ہم نے صالح کو اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے

بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِىِٕذٍ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿٦٦﴾

اس دن کی رسوائی سے نجات دے دی، بے شک آپ کا رب ہی زبردست قوت والا، سب پر غلبہ والا ہے ○

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾

اور ظلم کرنے والوں کو ہولناک چنگھاڑ نے آ دبوچا تو وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل (اوندھے) پڑے رہ گئے ○

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾ ع

گویا کہ وہ ان میں کبھی رہے ہی نہ تھے، سنو بے شک قوم ثمود نے اپنے رب کا کفر کیا سنو! قوم ثمود کے لیے پھٹکار ہے ○

ع ۶

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور قوم ثمود کی طرف ہم نے ان کے ہم قوم صالح کو بھیجا، صالح نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اس میں آباد کیا سو تم اس سے مغفرت طلب کرو، پھر اس کی طرف توبہ کرو، پس میرا رب قریب ہے دُعا قبول کرنے والا ہے ○ (ھود: ۶۱)

انسان کو زمین سے پیدا کرنے کے دو محمل

اس سورت میں انبیاء سابقین علیہم السلام کے جو قصص ذکر کیے گئے ہیں، ان میں یہ حضرت صالح علیہ السلام کا قصہ ہے اور یہ تیسرا قصہ ہے، اور اس قصہ میں وعظ اور استدلال کا وہی طریقہ ہے جو حضرت ھود علیہ السلام کے قصہ میں تھا، البتہ اس قصہ میں جب توحید کا ذکر کیا گیا تو اس پر دو دلیلیں قائم کی گئی ہیں۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے کہا: اللہ تعالیٰ نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے اور اس کی دو تقریریں ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کو حضرت آدم علیہ السلام کی صلب سے پیدا کیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو زمین سے یعنی زمین کی مٹی سے پیدا کیا تھا۔ (۲) انسان منی اور حیض کے خُون سے پیدا ہوتا ہے اور منی خُون سے بنتی ہے اور خُون غذا سے پیدا ہوتا ہے اور غذا گوشت، روٹی، سبزیوں اور پھلوں سے حاصل ہوتی ہے اور ان سب چیزوں کا مآل زرعی پیداوار ہے اور زرعی پیداوار کا رجوع زمین کی طرف ہوتا ہے پس واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین سے پیدا کیا ہے۔

انسان اور زمین کی پیدائش سے اللہ تعالیٰ کے وجود پر استدلال

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: واستعمرکم فیھا۔ قتادہ نے کہا اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ نے تم کو زمین میں آباد کیا، اور ضحاک نے کہا اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ نے تمہاری عمریں لمبی کیں اور قوم ثمود کی عمریں تین سو سال سے ایک ہزار سال تک ہوتی تھیں۔ زید بن اسلم نے کہا اس کا معنی ہے: زمین پر آباد ہونے کے لیے تمہیں جن چیزوں کی ضرورت تھی مثلاً مکان بنانے اور درخت اگانے کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کا سامان تمہیں مہیا کیا، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں نہریں کھودنے، درخت اگانے اور فصل تیار کرنے کا خیال ڈالا۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۵۱، مطبوعہ دار الفکر، ۱۴۱۵ھ)

زمین میں زرعی پیداوار کی استعداد اور صلاحیت رکھنا، اس میں سرسبز و شاداب جنگلوں کو پیدا کرنا اور اس میں بلند و بالا اور مستحکم عمارتوں کی قابلیت پیدا کرنا اور انسانی آبادی کی ضروریات کے لیے تمام امور فراہم کرنا اور انسان کو ان سے منافع کے

حصول پر قادر بنانا اس زبردست صناع مطلق اور اس قادر و قیوم کے وجود پر بہت بڑی دلیل ہے اور یہ ایسی ہی دلیل ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ○ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ○ وَالَّذِیْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی ○ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی ○ (الاعلیٰ: ۵-۲)	جس نے پیدا کیا، پھر درست کیا ○ اور جس نے اندازہ مقرر کیا پھر ہدایت دی ○ اور جس نے (سبز) چارہ اگایا ○ پھر اسے خشک سیاہی مائل کر دیا ○

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، پھر دُنیا اور آخرت کے کاموں میں اس کی رہنمائی کے لیے اس میں عقل پیدا کی، پھر تصرف اور کام کاج کرنے کے لیے اس کو قدرت عطا کی، پھر اس کی بقا کے لیے زمین سے اس کی خوراک کو پیدا کیا، کیا یہ سب چیزیں اس پر دلالت نہیں کرتیں کہ اس کو پیدا کرنے والا بہت مدبر اور حکیم ہے۔ اس نے زمین میں ایسی صفات رکھیں جن سے مطلوبہ فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں، اس نے زمین میں کوئی چیز عبث بنائی ہے نہ انسان کے جسم میں کوئی چیز بے کار بنائی ہے۔ انسان کے جسم کی پنڈلیوں میں اللہ تعالیٰ نے زائد رگیں پیدا کی ہوئی ہیں اور اس زمانہ میں یہ عقدہ حل ہوا ہے کہ دل کی شریانیں جب خون میں کولیسٹرول کی زیادتی سے بند ہو جائیں تو ان رگوں کو کاٹ کر پنڈلی سے وہ زائد رگیں نکال کر ان کو بلاک شدہ شریانوں کی جگہ پیوند کر دیا جاتا ہے اور انسان کو حیاتِ نو مل جاتی ہے۔ قدرت کا یہ راز میڈیکل سائنس کی ترقی کے ذریعہ اس زمانہ میں منکشف ہوا ہے، اور نہ جانے انسان کے جسم میں اور کتنے سربستہ راز ہیں جن کا عقدہ مستقبل میں کھلے گا، اس سے معلوم ہوا کہ انسان اور اسی طرح یہ ساری کائنات کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے، اس کا ہر ہر جز اور اس کی ہر ہر چیز ان گنت حکمتوں پر مشتمل ہے اور یہ سب امور اس پر گواہی دیتے ہیں کہ ان کو زبردست مدبر اور حکیم مطلق نے بنایا ہے۔

نیکو کاروں اور بدکاروں کے لیے دُنیا کا ظرف ہونا

اس آیت میں استعمر بہ معنی اعمر ہے یعنی اللہ تعالیٰ نیک مسلمان کو پوری زندگی نیک اعمال کے ساتھ آباد رکھتا ہے اور اس کی موت کے بعد اس کو نیک نامی اور اچھی شہرت کے ساتھ باقی رکھتا ہے اور اس کے برخلاف فاسق و فاجر تاحیات بُری شہرت کے ساتھ برقرار رہتا ہے اور موت کے بعد بھی لوگ اس کا ذکر بُرائی کے ساتھ کرتے ہیں اور یہ دُنیا نیک لوگوں اور بدکاروں دونوں کے لیے ظرف ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کی نیک نامی اس کی نسل کے قائم مقام ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی تھی:

وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ ○ (الشعراء: ۸۴)	اور میرے بعد آنے والوں میں میرا ذکر جمیل جاری رکھ۔
وَجَعَلْنَا ذُرِّیَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِیْنَ ○ وَتَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ○ (الصّٰفّٰت: ۷۸-۷۷)	اور ہم نے ان کی اولاد ہی کو باقی رکھا ○ اور بعد میں آنے والوں میں ہم نے ان کا ذکر چھوڑا ○
وَبٰرَكْنَا عَلَیْهِ وَعَلٰۤی اِسْحٰقَ ؕ وَمِنْ ذُرِّیَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِیْنٌ ○ (الصّٰفّٰت: ۱۱۳)	اور ہم نے ابراہیم اور اسحٰق پر بہت برکتیں فرمائیں اور ان کی اولاد میں سے بعض نیکوکار ہیں اور بعض اپنی جانوں پر کھلا ظلم کرنے والے ہیں ○

عمریٰ کا معنی

قرآن مجید کی اس آیت میں استعمر کا لفظ ہے، اور ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ استعمر، اعمر کے معنی میں ہے۔

اعمر کا معنی ہے عمر گزارنا اور اسی سے عمریٰ کا لفظ بنا ہے۔ علامہ زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ نے لکھا ہے کہ جو چیز تم کو تاحیات دی جائے وہ عمریٰ ہے۔ ثعلب نے کہا: عمریٰ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو مکان دے اور یہ کہے کہ یہ مکان تمہارے لیے تاحیات ہے اور جب وہ مرگیا تو وہ مکان، دینے والے کی طرف لوٹ جائے گا۔ عمریٰ اصل میں عمر سے ماخوذ ہے اور رقبیٰ مراقبہ (انتظار کرنا) سے بنا ہے، رقبیٰ یہ ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ اگر میں پہلے مرگیا تو تم اس کے مالک ہو اور اگر تم پہلے مرگئے تو میں اس کا مالک ہوں گا اور ہر ایک دوسرے کی موت کا انتظار کرتا ہے۔

(تاج العروس ج ۳ ص ۴۲۱، مطبوعہ مطبعہ خیریہ، مصر ۱۳۰۶ھ)

عمریٰ کے متعلق احادیث

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو اور اس کے وارثوں کو تاحیات کوئی چیز دی گئی سو یہ چیز اسی کے لیے ہے جس کو دی گئی ہے۔ وہ چیز دینے والے کی طرف نہیں لوٹے گی، کیونکہ اس نے ایسی چیز دی ہے جس میں وراثت جاری ہوگی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۶۲۵، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۵۵۰، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۱۳۵۰، سنن نسائی رقم الحدیث: ۳۷۴۵، صحیح مسلم کتاب الھبۃ رقم الحدیث: ۲۰، (۱۶۲۵) رقم مسلسل: ۴۱۱۰)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے کسی شخص کو اور اس کے وارثوں کو تاحیات کوئی چیز دی اور اس سے کہا کہ "میں نے تم کو اور تمہارے وارثوں کو اس وقت تک کے لیے یہ چیز دی ہے جب تک تم میں سے کوئی باقی رہے۔" سو یہ چیز اس کی ہو جائے گی جس کو دی گئی ہے اور اس چیز کے مالک کی طرف نہیں لوٹے گی کیونکہ اس نے ایسی چیز دی ہے جس میں وراثت جاری ہو جائے گی۔

(صحیح مسلم، کتاب الھبۃ رقم الحدیث: ۲۲ رقم بلا تکرار ۱۶۲۵، رقم مسلسل: ۴۱۱۲)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جس شخص کو اور اس کے وارثوں کو تاحیات کوئی چیز دی گئی وہ قطعی طور پر اس کی ہے، دینے والے کے لیے اس میں کوئی شرط لگانا جائز ہے نہ استثناء کرنا۔ ابو سلمہ نے کہا: کیونکہ اس نے ایسی چیز دی ہے جس میں وراثت جاری ہوتی ہے اور وراثت نے اس کا حق منقطع کر دیا۔

(صحیح مسلم، کتاب الھبۃ رقم الحدیث: ۲۴، رقم بلا تکرار: ۱۶۲۵، رقم مسلسل: ۴۱۱۴)

عمریٰ میں مذاہبِ ائمہ

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی متوفی ۶۷۶ھ نے لکھا ہے کہ ایک شخص یہ کہے کہ میں نے تمام عمر کے لیے یہ مکان تم کو دیا، جب تم فوت ہو جاؤ گے تو یہ مکان تمہارے وارثوں کا ہوگا، یہ عمریٰ بالاتفاق صحیح ہے اور وہ شخص اس مکان کا مالک ہو جائے گا اور اس کی موت کے بعد اس کے وارث مالک ہوں گے اور اگر اس کے وارث نہ ہوں تو اس کی ملکیت بیت المال کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ امام مالک کا اس میں اختلاف ہے۔ (شرح مسلم ج ۲ ص ۳۸، مطبوعہ مطبع نور محمد کراچی، ۱۳۷۵ھ)

قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴ھ نے لکھا ہے:

امام مالک کا مشہور قول یہ ہے کہ عمریٰ کرنے والا یوں کہے کہ میں نے تم کو یہ مکان مدت عمر کے لیے دیا، پھر یہ مکان تمہارے وارثوں کا ہے یا یوں کہے کہ میں نے تم کو یہ مکان مدت عمر کے لیے دیا اور قید نہ لگائے۔ ان صورتوں میں مکان لینے والے یا اس کے ورثاء کی موت کے بعد، مکان دینے والے یا اس کے وارثوں کی طرف لوٹ جائے گا، کیونکہ مسلمانوں کی لگائی

ہوئی شرائط کا اعتبار ہوتا ہے اور اس لفظ کا مدلول لغوی بھی یہی ہے۔
(اکمال المعلم بفوائد مسلم لقاضی عیاض ج ۵ ص ۳۵۷، مطبوعہ دارالوفاء بیروت، ۱۴۱۹ھ)

علامہ ابن قدامہ حنبلی نے لکھا ہے کہ جب عمریٰ کرنے والا اس کو مطلق رکھے تو جس کو وہ چیز دی گئی ہے وہ چیز اس کی اور اس کے ورثاء کی ملکیت ہے اور جب اس نے یہ شرط لگائی کہ جب تم مرگئے تو یہ چیز میری ہو جائے گی تو اس کے متعلق امام احمد سے دو روایتیں ہیں: ایک روایت یہ ہے کہ عقد اور شرط دونوں صحیح ہیں اور جب معمرلہ مرجائے گا تو وہ چیز دینے والے کی طرف لوٹ جائے گی اور دوسری روایت یہ ہے کہ عقد صحیح ہے اور شرط باطل ہے اور وہ چیز معمرلہ کے بعد اس کے وارثوں کی طرف لوٹ جائے گی۔ (المغنی ج ۵ ص ۱۴۰، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۰۵ھ)

شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی حنفی متوفی ۴۸۳ھ لکھتے ہیں: جب کسی شخص نے دوسرے شخص سے کہا: میں نے تم کو عمر بھر کے لیے یہ مکان دیا اور وہ مکان اس کے سپرد کر دیا تو یہ ہبہ صحیح ہے، اور جس کے لیے ہبہ کیا گیا ہے وہ اس کا فوراً مالک ہو جائے گا اور اس کی موت کے بعد اس کے ورثاء اس کے مالک ہوں گے، اس لیے اس کی موت کے بعد اس کی واپسی کی شرط باطل ہے اور ہبہ شروط فاسدہ سے باطل نہیں ہوتا۔ (المبسوط ج ۱۲ ص ۹۵-۹۴، ملخصاً، مطبوعہ دارالمعرفہ بیروت، ۱۳۹۸ھ)

اس کے بعد فرمایا: اللہ سے استغفار کرو، یعنی اپنی بُت پرستی پر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرو، پھر فرمایا: پھر اس کی طرف توبہ کرو یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف رجوع کرو، بے شک میرا رب دُعا کرنے والے کی دُعا کو قبول فرماتا ہے، اس آیت کے ان الفاظ کی تفسیر اور دُعا کے مقبول ہونے اور دُعا کے آداب اور شرائط کے متعلق مکمل بحث البقرہ: ۱۸۶ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انہوں نے کہا اے صالح! اس سے پہلے آپ ہماری امیدوں کا مرکز تھے! کیا آپ ہمیں ان کی عبادت کرنے سے منع کرتے ہیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے، بے شک آپ ہمیں جس دین کی دعوت دے رہے ہیں اس نے ہمیں زبردست شک میں ڈال دیا ہے○ (ھود: ۶۲)

حضرت صالح علیہ السلام سے ان کی قوم کی امیدوں کی وجوہات

صالح علیہ السلام کی قوم نے حضرت صالح سے جو اپنی امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں اس کی دو وجوہات تھیں: (۱) حضرت صالح علیہ السلام بہت ذکی اور فہیم تھے اور فراخ دل اور بہت حوصلہ والے شخص تھے، اس لیے ان کی قوم کو یہ امیدیں تھیں کہ وہ ان کے دین کی مدد کریں گے، ان کے مذہب کو قوت اور استحکام پہنچائیں گے اور ان کے طریقوں اور مذہبی رسومات کی تائید کریں گے، کیونکہ جب کسی قوم میں کوئی باصلاحیت نوجوان پیدا ہو تو اس سے اسی قسم کی امیدیں قائم کی جاتی ہیں۔ (۲) حضرت صالح علیہ السلام غریبوں کی مالی امداد کرتے تھے، مہمانوں کی خاطر مدارات کرتے تھے اور بیماروں کی عیادت اور خدمت کرتے تھے، اس وجہ سے ان کی قوم یہ سمجھتی تھی کہ وہ ان کے مددگاروں اور ان کے دوستوں سے ہیں۔ اور جب صالح علیہ السلام نے ان کو بُت پرستی سے منع کیا تو ان کو سخت تعجب ہوا کہ ان کو اچانک یہ کیا ہو گیا اس لیے انہوں نے کہا: آپ تو ہماری امیدوں کا مرکز تھے، کیا آپ ہم کو ان کی عبادت کرنے سے منع کرتے ہیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے!

شک اور مریب کا فرق

اس آیت میں شک اور مریب کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ شک یہ ہے کہ انسان نفی اور اثبات کے درمیان متردد ہو اور مریب وہ شخص ہے جو کسی کے ساتھ بدگمانی کر رہا ہو، جب انہوں نے یہ کہا کہ ہم شک میں ہیں تو اس کا معنی یہ تھا کہ ہم کو آپ

کے قول کے صحیح ہونے کے متعلق تردد ہے اور جب اس کے ساتھ مریب کا لفظ کہا تو اس کا معنی یہ تھا کہ ان کے اعتقاد میں حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت کا فاسد اور غلط ہونا راجح ہو چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (صالح نے کہا) اے میری قوم! یہ بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں' اور اس نے مجھے اپنی طرف سے رحمت عطا فرمائی ہو' تو اللہ کے مقابلہ میں میری کون مدد کرے گا' اگر میں اس کی نافرمانی کروں' تو تم میرے لیے سوا نقصان کے کس چیز میں زیادتی کر رہے ہو○ (هود: ۶۳)

اپنی نبوت پر یقین کے باوجود حضرت صالح نے بصورت شک کیوں بات کی؟

حضرت صالح علیہ السلام نے بصورت شک کہا: "اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں" حالانکہ حضرت صالح علیہ السلام کو اس پر مکمل یقین تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں' اور شک کی صورت کو اس لیے اختیار کیا' تاکہ ان کے مخالفین کے لیے ان کا کلام قبول ہونے کے زیادہ قریب ہو گویا کہ انہوں نے یوں کہا کہ فرض کرو میرے پاس میرے رب کی روشن اور پختہ دلیل ہو اور مجھے کامل یقین ہو کہ میں اللہ عزوجل کا نبی ہوں' اور یہ بتاؤ کہ اگر میں اپنے رب کے احکام کی نافرمانی کر کے تمہارے طریقہ پر چلوں تو مجھے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کون بچائے گا' تو اس صورت میں سوائے مجھے نقصان پہنچانے کے تم میرے حق میں کیا اضافہ کرو گے!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (حضرت صالح نے کہا) اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی ہے جو تمہارے لیے نشانی ہے' سو اس کو چھوڑ دو یہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرے' اور اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا ورنہ تم کو عنقریب عذاب پہنچے گا○ (هود: ۶۴)

انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ کی ترتیب

جو نبی بُت پرستوں کے سامنے دعویٰ نبوت کرتا ہے' وہ سب سے پہلے ان کو بُت پرستی ترک کرنے اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا حکم دیتا ہے' پھر اس کے بعد ان کے سامنے اپنی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے' اور جب وہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو پھر قوم اس سے اس کی نبوت پر دلیل اور معجزہ کو طلب کرتی ہے' سو حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ روایت ہے کہ ان کی قوم عید کے موقع پر گئی ہوئی تھی' اس وقت انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام سے یہ سوال کیا کہ وہ انہیں کوئی معجزہ دکھائیں' انہوں نے پہاڑ کی ایک چٹان کی طرف اشارہ کر کے کہا اس چٹان سے انہیں اونٹنی نکال کر دکھائیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تو ان کی فرمائش کے مطابق اس چٹان سے اونٹنی نکل آئی۔

حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کے معجزہ ہونے کی وجوہ

اس اونٹنی کا حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت پر معجزہ ہونا حسبِ ذیل وجوہ سے ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ نے اس چٹان سے اس اونٹنی کو پیدا کیا۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کے اندر اس اونٹنی کو پیدا کیا' پھر اس پہاڑ کو شق کر کے اس اونٹنی کو نکالا۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی نر کے اس اونٹنی کو حاملہ بنایا۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے بغیر ولادت کے مکمل جسامت اور شکل و صورت کے ساتھ اس اونٹنی کو پیدا کیا۔

(۵) روایت ہے کہ ایک دن وہ کنوئیں سے پانی پیتی تھی اور ایک دن پوری قوم پانی پیتی تھی۔

(۶) اس سے بہت زیادہ مقدار میں دودھ حاصل ہوتا تھا جو پوری قوم کے لیے کافی ہوتا تھا۔

یہ تمام وجوہات اس کے معجزہ ہونے پر بہت قوی دلیل ہیں' لیکن قرآنِ کریم میں صرف یہ مذکور ہے کہ وہ اونٹنی آیت

اور معجزہ تھی، باقی رہا یہ کہ وہ کس اعتبار سے معجزہ تھی، اس کا قرآنِ مجید میں ذکر نہیں ہے۔

اونٹنی سے قوم کی دشمنی کا سبب

پھر حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا: "سو اس کو چھوڑ دو یہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرے۔" اس قول سے حضرت صالح علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ قوم سے مشقت کو دُور کریں، وہ اونٹنی ان کے لیے معجزہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کو نفع پہنچاتی تھی اور ان کو نقصان نہیں دیتی تھی، کیونکہ وہ اس کے دودھ سے فائدہ اٹھاتے تھے جیسا کہ روایات میں ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ وہ کفر پر اصرار کر رہے ہیں تو ان کو اس اونٹنی کے لیے خطرہ محسوس ہوا، کیونکہ لوگ اپنے مخالف کی حجت اور دلیل کے غلبہ سے بغض رکھتے ہیں بلکہ وہ اپنے مخالف کی حجت کو کمزور اور باطل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے، اس وجہ سے حضرت صالح علیہ السلام کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ یہ لوگ اس اونٹنی کو قتل کر دیں گے، اس لیے انہوں نے پیش بندی کے طور پر فرمایا: اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا ورنہ عنقریب تم کو عذاب پہنچے گا، اور اس میں ان لوگوں کے لیے سخت وعید تھی جو اس اونٹنی کو قتل کرنے کا ارادہ کریں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ انہوں نے اس شدید وعید کے باوجود اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور اس کو قتل کر دیا، چنانچہ فرمایا:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو انہوں نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں، تب (صالح نے) کہا کہ تم صرف تین دن مزے اٹھا لو (پھر تم پر عذاب آ جائے گا) یہ اللہ کی وعید ہے جو (ہرگز) جھوٹی نہیں ہوگی ○ (ھود: ۶۵)

اونٹنی کو قتل کرنے کی وجوہ

انہوں نے اونٹنی کو جو قتل کر دیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ اونٹنی حضرت صالح علیہ السلام کے دعوئ نبوت پر دلیل تھی، تو انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کی مخالفت اور ان کی دشمنی میں اس اونٹنی کو قتل کر دیا اور یا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس بات سے تنگ آ گئے تھے کہ ایک دن وہ لوگ کنویں سے پانی پئیں اور ایک دن وہ اونٹنی کنویں سے پانی پئے اور وہ اونٹنی اس قدر غیر معمولی جسیم تھی کہ وہ اپنی باری کے دن جب پانی پیتی تو سارا کنواں خالی کر دیتی تب انہوں نے اس سے جان چھڑانے کے لیے اس کو قتل کر دیا اور یا انہوں نے اس کو اس لیے قتل کیا کہ وہ اس کا گوشت اور اس کی چربی کھانا چاہتے تھے، بہرحال انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔

اونٹنی کو قتل کرنے کی تفصیل

امام ابن ابی حاتم اپنی سند کے ساتھ امام محمد بن اسحٰق سے روایت کرتے ہیں: جب اونٹنی پانی پی کر لوٹ رہی تھی تو وہ اس کی گھات میں بیٹھے ہوئے تھے؛ اس کے راستہ میں ایک چٹان تھی اس کے نیچے قدار نامی ایک شخص چھپ کر بیٹھا ہوا تھا اور اس چٹان کے دوسرے نچلے حصہ میں مصدع نام کا ایک اور شخص چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ جب وہ اس کے پاس سے گزری تو مصدع نے اس کی پنڈلی کے گوشت پر تاک کر تیر مارا اور قدار تلوار کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا اور اس کی کونچوں (ایڑی کے اوپر کے پٹھوں) پر تلوار ماری۔ وہ چیخ مار کر گر پڑی، انہوں نے اس کی ٹانگوں کو باندھ دیا پھر اس کے لَبّہ (گردن کے نچلے حصہ) پر نیزہ مارا اور اس کو نحر (ذبح) کر دیا۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۰۹۸۸)

ابوالہذیل نے بیان کیا ہے کہ جب اس اونٹنی کی کونچیں کاٹی گئیں تو اس کا بچہ چیختا ہوا پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا، پھر دوبارہ اس کو نہیں دیکھا گیا۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۰۹۸۹)

قوم ثمود پر عذاب نازل ہونے کی تفصیل

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (صالح نے کہا) تم صرف تین دن مزے اٹھالو (پھر تم پر عذاب آ جائے گا) یہ اللہ کی وعید ہے جو (ہرگز) جھوٹی نہیں ہوگی۔

امام ابن ابی حاتم اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے سفر میں جب ہم مقام حجر پر پہنچے تو آپ نے ہم سے فرمایا: میں لوگوں کو معجزات طلب کرنے سے منع کرتا ہوں، یہ صالح علیہ السلام کی قوم ہے جس نے اپنے نبی سے معجزہ طلب کیا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک اونٹنی کو بھیج دیا، وہ اس راستہ سے آتی تھی اور اپنی باری کے دن اس کا سارا پانی پی جاتی تھی، اور جس دن وہ پانی پیتی تھی اس دن وہ قوم اس اونٹنی کا دودھ دوہ کر پیتی تھی اور پھر لوٹ جاتی تھی۔ اس قوم نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی اور اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں، تب اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ وعید سنائی کہ وہ صرف تین دن اپنے گھروں میں مزے اُڑا لیں (پھر اللہ کا عذاب آ جائے گا) یہ اللہ کی وعید ہے جو (ہرگز) جھوٹی نہیں ہوگی (پھر تین دن کے بعد) ایک زبردست چنگھاڑ کی آواز آئی جس نے اس زمین کے مشرق اور مغرب کے لوگوں کو ہلاک کر دیا، سوا اس شخص کے جو اللہ کے حرم میں تھا، وہ اللہ کے حرم میں ہونے کی وجہ سے بچ گیا۔ آپ سے پوچھا گیا: یا رسول اللہ! وہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ ابورغال ہے۔ پوچھا: وہ کون ہے؟ فرمایا: وہ ابو ثقیف ہے۔

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: اس عذاب کی علامت یہ ہے کہ پہلے دن تمہارے چہرے پیلے پڑ جائیں گے اور دوسرے دن تمہارے چہرے سُرخ ہو جائیں گے اور تیسرے دن تمہارے چہرے سیاہ ہو جائیں گے، پھر ان کے چہروں پر نشان پڑ گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے ایک ہولناک چیخ بھیجی جس نے ان کو ہلاک کر دیا۔

امام محمد بن اسحٰق بیان کرتے ہیں کہ حضرت صالح علیہ السلام ان کے پاس گئے تو دیکھا کہ اونٹنی کی کونچیں کٹی ہوئی ہیں تو وہ رونے لگے اور فرمایا: تم نے اللہ تعالیٰ کی نشانی کی بے حرمتی کی، اب تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی ناراضگی کی بشارت ہو۔ انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا: اچھا یہ عذاب کب آئے گا اور اس کی کیا علامت ہے؟ اور انہوں نے دنوں کے اس طرح نام رکھے تھے: وہ اتوار کو اول کہتے تھے، پیر کو اہون (آسان) کہتے تھے، منگل کو دبار (مصیبت) کہتے تھے، بدھ کو جبار (درست) کہتے تھے، جمعرات کو مونس کہتے تھے اور جمعہ کو عروبہ کہتے تھے، ہفتہ کو شبار (عمر) کہتے تھے۔ انہوں نے بدھ کے دن اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے کہا: جب مونس (جمعرات) کے دن اُٹھو گے تو تمہارے چہرے زرد ہوں گے اور جب تم عروبہ (جمعہ) کے دن اٹھو گے تو تمہارے چہرے سُرخ ہوں گے اور جب تم شبار (ہفتہ) کے دن اٹھو گے تو تمہارے چہرے سیاہ ہوں گے، پھر پہلے دن (اتوار) تم پر عذاب آ جائے گا۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۲۰۵۱-۲۰۵۰، رقم الحدیث: ۱۰۹۹۳، ۱۰۹۹۲، ۱۰۹۹۰، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ)

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب تین دن تک مسلسل حضرت صالح علیہ السلام کی بتائی ہوئی عذاب کی نشانیاں پوری ہو گئیں تو پھر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لوگ حضرت صالح علیہ السلام کی صداقت پر ایمان لے آتے، اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ضدی لوگ تھے، وہ اس وقت تک حضرت صالح علیہ السلام کی صداقت میں متردد رہے جب تک ان کے سر پر عذاب نہیں آ پہنچا اور عذاب آنے کے بعد ایمان لانا معتبر نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس جب ہمارا عذاب آ گیا تو ہم نے صالح کو اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے اس دن کی رُسوائی سے نجات دے دی، بے شک آپ کا رب ہی زبردست قوت والا اور بہت غلبہ والا ہے○ (ھود: ۶۶)

الخزی کا معنی

"خزی" کا معنی ہے رُسوائی، اللہ تعالیٰ نے اس عذاب کو خزی اس لیے فرمایا ہے کہ اس کی رُسوائی بعد میں بھی باقی رہنے والی تھی اور ان معذبین کو بعد میں عبرت کا نشان بنا دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے اس عذاب سے نجات دی اور ان کی قوم میں سے کافروں پر عذاب نازل ہوا اور ان کے لیے وہ عار کا سبب ہو گیا اور ان کی طرف اس عذاب کی ذلت منسوب ہو گئی کیونکہ الخزی اس عیب کو کہتے ہیں جس سے کسی شخص کی رُسوائی ظاہر ہوتی ہے اور اس قسم کے عیب کے لگنے سے حیا کی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ظلم کرنے والوں کو ہولناک چنگھاڑ نے آ دبوچا تو وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل (اوندھے) پڑے رہ گئے○ (ھود: ۶۷)

امام ابن ابی حاتم نے امام محمد بن اسحٰق سے روایت کیا ہے کہ اتوار کی صبح کو دن چڑھنے کے بعد ایک ہولناک چیخ آئی جس سے ہر چھوٹا اور بڑا ہلاک ہو گیا، ماسوا الذریعہ نامی ایک لڑکی کے، وہ حضرت صالح علیہ السلام سے سخت عداوت رکھتی تھی۔ اس نے تمام لوگوں کو عذاب میں گرفتار دیکھا، پھر وہ ایک کنویں پر گئی اور اس سے پانی پیتے ہی مر گئی۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۰۹۹۹)

علامہ قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ نے لکھا ہے کہ ایک قول یہ ہے کہ یہ جبرئیل کی چیخ تھی، اور ایک قول یہ ہے کہ یہ آسمان سے ایک چنگھاڑ آئی تھی جس میں ہر بجلی کی کڑک تھی، جس کی ہیبت اور ہولناکی سے ان کے دل پھٹ گئے۔ بعض تفاسیر میں ہے کہ جب ان کو عذاب آنے کا یقین ہو گیا تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا: اگر وہ عذاب آ گیا تو تم کیا کرو گے۔ پھر عذاب سے مقابلہ کے لیے انہوں نے اپنی تلواریں اور اپنے نیزے سنبھال لیے اور اپنے جتھوں کو تیار کر لیا، ان کے بارہ ہزار قبیلے تھے اور ہر قبیلہ میں بارہ ہزار جنگجو تھے، وہ تمام راستوں پر بیٹھ گئے اور وہ اپنے گمان میں عذاب سے لڑنے کے لیے تیار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فرشتے کو حکم دیا جو سورج کے ساتھ موکل ہے کہ ان کو گرمی کا عذاب پہنچائیں، پھر سورج کی گرمی سے ان کے ہاتھ جل گئے اور پیاس کی شدت سے ان کی زبانیں لٹک کر سینے تک پہنچ گئیں اور جن کے ساتھ جانور تھے وہ مر گئے اور چشموں کا پانی جوش سے اُبلنے لگا، پھر اللہ تعالیٰ نے موت کے فرشتے کو حکم دیا کہ غروبِ آفتاب تک ان کی رُوحیں قبض کر لی جائیں، پھر ایک گرج دار چنگھاڑ سنائی دی جس سے وہ سب مُنہ کے بل گر کر ہلاک ہو گئے۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۵۶-۵۵، مطبوعہ دار الفکر، ۱۴۱۵ھ)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ نے لکھا ہے کہ اس چیخ کے متعلق دو قول ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس سے مراد بجلی کی کڑک ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ یہ بہت زبردست اور ہولناک چیخ تھی جس کو سن کر وہ سب اپنے گھروں میں مُنہ کے بل اوندھے گر گئے اور اسی حال میں مر گئے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ وہ چیخ ماریں اور ان کی چیخ سے سب اسی وقت مر گئے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ وہ چیخ موت کا سبب کیسے بن گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس چیخ سے ہوا میں تموج پیدا ہو گیا اور جب وہ زبردست تموج ان کے کانوں تک پہنچا تو ان کے کانوں کے پردے پھٹ گئے اور اس کا اثر ان کے دماغ تک پہنچا اور وہ علی الفور مر گئے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بادلوں کے پھٹنے سے وہ چیخ پیدا ہوئی ہو اور اس سے بجلی گری ہو اور اس بجلی سے وہ سب جل کر مر گئے ہوں۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۷۱-۳۷۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

اس آیت میں فرمایا ہے کہ وہ چیخ سے ہلاک ہوگئے اور الاعراف: ۷۸ میں فرمایا ہے: وہ زلزلہ سے ہلاک ہوگئے، ان دونوں آیتوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ اس چیخ سے زلزلہ آیا اور اس سے وہ سب ہلاک ہوگئے۔ پھر فرمایا:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: گویا کہ وہ ان میں کبھی رہے ہی نہ تھے، سنو بے شک قوم ثمود نے اپنے رب کا کفر کیا، سنو! قوم ثمود کے لیے پھٹکار ہے۔ (ہود: ۶۸)

اس کی تفسیر کے لیے ہود: ۶۰ کو ملاحظہ فرمائیں۔ حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم ثمود کے مفصل احوال ہم نے الاعراف: ۷۹-۷۳ میں بیان کردیے ہیں، ان کی تفصیل پر مطلع ہونے کے لیے اس سورت کا مطالعہ فرمائیں۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ

اور بے شک ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے، انہوں نے کہا سلام (ابراہیم نے جواباً) کہا سلام،

فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۞۶۹ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ

پھر تھوڑی دیر بعد وہ گائے کا بھنا ہوا بچھڑا لے آئے ○ پھر جب ابراہیم نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے تک

اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى

نہیں بڑھ رہے تو ابراہیم نے ان کو اجنبی سمجھا اور اپنے دل میں ان سے ڈرنے لگے، فرشتوں نے کہا آپ مت ڈریں، بے شک ہمیں قوم

قَوْمِ لُوْطٍ ؕ ۞۷۰ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ

لوط کی طرف بھیجا گیا ہے ○ ابراہیم کی بیوی جو کھڑی ہوئی تھی وہ ہنس پڑی تو ہم نے اس کو اسحاق کی پیدائش کی خوش خبری سنائی اور

مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۞۷۱ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا

اسحاق کے بعد یعقوب کی ○ (سارہ نے) کہا ارے دیکھو! کیا میں بچہ جنوں گی حالانکہ میں بوڑھی ہوں اور میرے یہ

بَعْلِيْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۞۷۲ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ

شوہر بھی بوڑھے ہیں، بے شک یہ عجیب بات ہے ○ فرشتوں نے کہا کیا تم اللہ کی قدرت پر

اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۞۷۳

تعجب کر رہی ہو، اے اہل بیت تم پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں، بے شک اللہ حمد و ثنا کا مستحق بہت بزرگ ہے ○

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ

پھر جب ابراہیم کا خوف دور ہوگیا اور ان کے پاس بشارت پہنچ گئی تو وہ ہم سے قوم لوط کے متعلق

قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ

بحث کرنے لگے ○ بے شک ابراہیم بردبار اللہ سے آہ وزاری کرنے والے اور اس کی طرف رجوع کرنے والے تھے ○ اے ابراہیم

عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ

اس بات کو چھوڑ دیجئے بے شک آپ کے رب کا حکم آچکا ہے، بے شک ان پر ایسا عذاب آنے والا ہے جو

مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾

ٹلنے والا نہیں ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بے شک ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے، انہوں نے کہا سلام (ابراہیم نے جواباً) کہا سلام، پھر تھوڑی دیر بعد وہ گائے کا بھنا ہوا بچھڑا لے آئے ○ پھر جب ابراہیم نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے تک نہیں بڑھ رہے تو ابراہیم نے ان کو اجنبی سمجھا اور اپنے دل میں ان سے ڈرنے لگے، فرشتوں نے کہا: آپ مت ڈریں، بے شک ہمیں قوم لوط کی طرف بھیجا گیا ہے ○ (ھود: ۷۰-۶۹)

حضرت لوط علیہ السلام کا قصہ

اس سورت میں انبیاء علیہم السلام کے جو قصص بیان کیے گئے ہیں یہ ان میں سے چوتھا قصہ ہے۔ ان آیات میں حضرت لوط علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا ہے، حضرت لوط علیہ السلام کی سوانح اور ان کی قوم کے مفصل حالات ہم نے الاعراف: ۸۴-۸۰ میں بیان کر دیئے ہیں اس جگہ ہم آیات کے ضمن میں ضروری تفصیل بیان کریں گے۔

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عم زاد تھے، حضرت لوط علیہ السلام کی سکونت شام کی نواحی بستیوں میں تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین کے شہروں میں رہتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے لیے فرشتوں کو بھیجا تو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے گزرے اور ان کے مہمان ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جو بھی مہمان ہوتا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کی بہت اچھے طریقہ سے ضیافت کرتے تھے، جو فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تھے ان کی تعداد میں حسب ذیل اقوال ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنے والے فرشتوں کی تعداد اور ان کی بشارت میں مختلف اقوال

امام جمال الدین عبدالرحمن بن علی بن محمد الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سعید بن جبیر نے کہا: یہ حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل اور حضرت اسرافیل تھے۔

(۲) مقاتل نے کہا: یہ حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل اور حضرت عزرائیل تھے۔

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ یہ بارہ فرشتے تھے۔

(۴) محمد بن کعب نے کہا ہے کہ یہ آٹھ فرشتے تھے۔

(۵) ضحاک نے کہا: یہ نو فرشتے تھے۔

(۶) ماوردی نے کہا: یہ چار فرشتے تھے۔
یہ فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جو بشارت لے کر آئے تھے اس بشارت کے متعلق امام ابن الجوزی نے حسبِ ذیل اقوال لکھے ہیں:
(۱) حسن نے کہا: وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی بشارت دینے آئے تھے۔
(۲) قتادہ نے کہا: وہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی ہلاکت کی خوشخبری دینے آئے تھے۔
(۳) عکرمہ نے کہا: وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبوت کی خوشخبری دینے آئے تھے۔
(۴) الماوردی نے کہا: وہ یہ بشارت دینے آئے تھے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کی پشت سے خروج ہوگا۔
(زاد المسیر ج ۵ ص ۱۲۷، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

فرشتوں کے سلام کے الفاظ

فرشتوں نے آ کر کہا: سلاما۔ اس کی اصل عبارت اس طرح ہے: سلمنا علیک سلاما "ہم آپ کو سلام کرتے ہیں سلام کرنا۔" حضرت ابراہیم نے فرمایا: سلام۔ اس کی اصل عبارت یوں ہے: امری سلام "میرا امر بھی سلام ہے۔"

فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آ کر جو سلام کیا اس میں قرآنِ مجید کی اس آیت کی رعایت ہے:
یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝ (النور: ۲۷)
اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک اجازت نہ لے لو اور ان گھر والوں پر سلام نہ کرلو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے کہ تم نصیحت حاصل کرو۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا سلام اس طرح ذکر فرمایا ہے:
وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ۝ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ۔ (الرعد: ۲۴-۲۳)
اور فرشتے جنتیوں کے اوپر ہر دروازے سے یہ کہتے ہوئے داخل ہوں گے: "سلام علیکم۔"

سلام کے متعلق احادیث

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سوار، پیدل چلنے والے کو سلام کرے اور پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے شخص کو سلام کرے اور قلیل، کثیر کو سلام کریں۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۲۳۲، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۱۶۰، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۵۱۹۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک مسلمان پر اپنے بھائی کے لیے پانچ چیزیں واجب ہیں: سلام کا جواب دینا، چھینک لینے والے کو الحمدللہ کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا، دعوت کو قبول کرنا، مریض کی عیادت کرنا اور جنازہ کے ساتھ جانا۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۲۴۰، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۱۶۲، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۵۰۳۰)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اہل کتاب تم کو سلام کریں تو تم کہو: وعلیکم۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۳۵۸، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۱۶۳)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہود اور نصاریٰ کو تم سلام میں پہل نہ کرو اور جب تم میں سے کوئی شخص اس کو راستے میں ملے تو اس کو تنگ راستے پر چلنے کے لیے مجبور کرے۔
(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۱۶۷، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۶۰۲)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لڑکوں کے پاس سے گزر ہوا تو آپ نے ان کو سلام کیا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۲۴۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۱۶۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۶۹۶)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی جماعت گزرے تو ان کے لیے یہ کافی ہے کہ ان میں سے کوئی ایک شخص سلام کرلے اور جو لوگ بیٹھے ہوئے ہوں ان کے لیے یہ کافی ہے کہ ان میں سے کوئی ایک شخص سلام کا جواب دے۔
(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۵۲۱۰، الاستذکار رقم الحدیث: ۴۰۵۱۳، سنن کبریٰ ج۹ ص۴۹، تمہید ج۹ ص۴۹، تمہید ج۲ ص۶۱۸، فتح المالک رقم الحدیث: ۶۷۷۶، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۴۹۴۸)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے کسی جماعت پر سلام کرنے میں پہل کی اس کو اس جماعت پر دس نیکیوں کی فضیلت ہوگی، اور ایک اور حدیث میں ہے: جن دو شخصوں نے ترک تعلق کیا ہوا ہو ان میں سے بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔ (الاستذکار رقم الحدیث: ۴۰۵۲۷)

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کے پاس سے گزرے، وہاں عورتوں کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی تھی تو آپ نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔
(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۶۹۷، مسند حمیدی رقم الحدیث: ۳۶۶، مصنف ابن ابی شیبہ ج۸ ص۶۳۵، مسند احمد ج۶ ص۴۵۲، سنن دارمی رقم الحدیث: ۲۶۴۰، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۵۲۰۴، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۷۰۱، الاستذکار رقم الحدیث: ۴۰۵۴۰)

جن لوگوں کو سلام کرنا مکروہ ہے اور جن لوگوں کے سلام کا جواب دینا ضروری نہیں یا مکروہ ہے

حافظ یوسف بن عبداللہ بن عبدالبر مالکی متوفی ۴۶۳ھ لکھتے ہیں:

عورتوں کو سلام کرنے میں سلف اور خلف کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: جب عورتیں محرم نہ ہوں تو مرد ان کو سلام نہ کریں، یہ احناف کا قول ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب عورتوں سے اذان اور اقامت اور نماز میں بلند آواز سے پڑھنا ساقط ہوگیا تو ان سے سلام کا جواب دینا بھی ساقط ہوگیا؛ لہٰذا ان کو سلام نہ کیا جائے۔ دوسرے فقہاء نے یہ کہا کہ بوڑھی عورتوں کو سلام کیا جائے اور جوان عورتوں کو فتنہ کے خوف سے سلام نہ کیا جائے، امام مالک کا یہی قول ہے۔ (فقہاء احناف کا بھی یہی قول ہے جیسا کہ عنقریب آئے گا) (الاستذکار ج۲۷ ص۱۳۹، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

علامہ علاء الدین محمد بن علی بن محمد حصکفی حنفی متوفی ۱۰۸۸ھ لکھتے ہیں:

اگر مسلمان کو ذمی سے کوئی کام ہو تو وہ اس کو سلام کرلیں ورنہ ان کو سلام کرنا مکروہ ہے، جس طرح مسلمان کا ذمی سے مصافحہ کرنا مکروہ ہے، اور اگر یہودی یا نصرانی یا مجوسی مسلمان کو سلام کریں تو ان کو جواب دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن جواب میں صرف اتنا کہے وعلیکم۔ کسی ذمی کو تعظیماً سلام کرنا کفر ہے، مانگنے والے کے سلام کا جواب دینا واجب نہیں ہے، اسی طرح جمعہ کے خطبہ کے وقت جو سلام کرے، اس کے سلام کا جواب دینا بھی واجب نہیں ہے، جب انسان کسی کے گھر جائے تو پہلے اجازت طلب کرے، پھر سلام کرے پھر کلام کرے، سلام کے جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

وبرکاتہ پر اضافہ نہ کرے، سلام کا فوراً جواب دے، فاسق کو سلام کرنا مکروہ ہے بشرطیکہ فاسق معلن ہو ورنہ نہیں، اسی طرح جو شخص سلام کا جواب دینے سے حقیقتاً عاجز ہو مثلاً کھانا کھا رہا ہو اس کو سلام کرنا مکروہ ہے یا جو شخص سلام کا جواب دینے سے شرعاً عاجز ہو مثلاً نماز پڑھ رہا ہو یا قرآنِ مجید پڑھ رہا ہو، ان کو سلام کرنا مکروہ ہے، اور اگر کسی نے سلام کیا تو وہ جواب کا مستحق نہیں ہے۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۵ ص ۲۶۷۔ ۲۶۴ ملخصاً، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

نیز علامہ حصکفی نے لکھا ہے کہ ان لوگوں کو سلام کرنا مکروہ ہے: جو نماز پڑھ رہا ہو، قرآن مجید پڑھ رہا ہو، حدیث بیان کر رہا ہو، خطبہ دے رہا ہو، خطبہ سن رہا ہو، فقہ کا تکرار کر رہا ہو، مقدمہ کا فیصلہ کر رہا ہو، کسی فقہی مسئلہ میں بحث کر رہا ہو، اذان دے رہا ہو، اقامت (تکبیر) کہہ رہا ہو، دینی کتب کا درس دے رہا ہو، جوان اجنبی عورتوں کو سلام کرنا زیادہ مکروہ ہے (بوڑھی عورتوں کو سلام کرنا جائز ہے بلکہ اگر شہوت کا خوف نہ ہو تو ان سے مصافحہ کرنا بھی جائز ہے، شامی) جو شطرنج کھیل رہا ہو، یا جو فسق میں ان کے مشابہ ہو (ہر وہ شخص جو کسی گناہ میں مشغول ہو، مثلاً جوا کھیل رہا ہو، شراب پی رہا ہو، لوگوں کی غیبت کر رہا ہو، کبوتر اُڑا رہا ہو، یا گانا گا رہا ہو، مذاق کرنے والے بوڑھے کو سلام نہ کرے، نہ جھوٹ بولنے والے کو نہ لغو باتیں کرنے والے کو نہ گالیاں دینے والے کو نہ اس کو جو اجنبی عورتوں کو دیکھتا ہو، شامی) جو شخص اپنی بیوی کے ساتھ دل لگی کر رہا ہو، کافر کو اور جو شخص برہنہ ہو اور جو پیشاب، پاخانہ میں مشغول ہو اور جو کھانا کھا رہا ہو یعنی اس کے مُنہ میں لقمہ ہو، جو شخص استاذ سے سبق پڑھ رہا ہو، جو شخص تسبیح پڑھ رہا ہو، ذکر کر رہا ہو یا تلبیہ پڑھ رہا ہو یا اُونگھ رہا ہو یا نیند میں ہو یا نشہ میں ہو یا مجنون ہو، ان تمام لوگوں کو سلام کرنا مکروہ ہے اور اگر کوئی شخص ان حالتوں میں سلام کرے تو وہ جواب کا مستحق نہیں ہے۔

(الدر المختار مع رد المحتار ج ۱ ص ۴۱۵۔ ۴۱۴ ملخصاً، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

سلام کرنے کے شرعی الفاظ اور اس کے شرعی احکام اور مسائل

حفظ ابو عمر ابن عبد البر مالکی متوفی ۴۶۳ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عطاء بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ان کی مجلس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما آئے اور ان کو سلام کیا اور کہا: سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، میں نے جواب میں کہا: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ وعفوہ ومغفرتہ، حضرت ابن عباس نے پوچھا: یہ کون ہے؟ میں نے کہا: عطا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: سلام، وبرکاتہ کے لفظ پر ختم ہو جاتا ہے پھر یہ آیت پڑھی: رحمۃ اللہ وبرکاتہ علیکم اھل البیت انہ حمید مجید۔ (ھود: ۷۳) (اس سے معلوم ہوا کہ اذکار کے جو الفاظ منقول ہوں ان پر اضافہ کرنا درست نہیں ہے...... سعیدی غفرلہ) (الاستذکار ج ۲۷ ص ۱۳۸، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ بیروت، ۱۴۱۴ھ)

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی متوفی ۶۷۶ھ لکھتے ہیں:

سلام میں پہل کرنا سُنّت ہے اور اس کا جواب دینا واجب ہے، اگر سلام کرنے والی ایک جماعت ہو تو ان کے حق میں سلام کرنا سُنّت کفایہ ہے، اور اگر ان میں سے کوئی ایک شخص سلام کرے تو سب کی طرف سے سُنّت ادا ہو جائے گی، جس شخص پر سلام کیا گیا ہے اگر وہ ایک ہے تو اس پر جواب دینا متعین ہے، اور اگر ایک جماعت پر سلام کیا گیا ہو تو ان کا جواب دینا فرض کفایہ ہے، اگر ان میں سے کسی ایک شخص نے جواب دے دیا تو باقی لوگوں سے فرضیت ساقط ہو جائے گی، اور افضل یہ ہے کہ پوری جماعت سلام کرے اور پوری جماعت جواب دے۔ امام ابن عبد البر وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ سلام میں پہل کرنا سُنّت ہے اور اس کا جواب دینا واجب ہے۔

سلام کے کم از کم الفاظ یہ ہیں: السلام علیکم، جس کو سلام کیا ہے اگر وہ ایک ہے تو السلام علیک کہے، لیکن افضل یہ ہے کہ فرشتوں کو شامل کر کے السلام علیکم کہے اور کامل طریقہ یہ ہے کہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہے، ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کے اضافہ پر اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ فرشتوں نے سلام کے بعد کہا تھا ورحمۃ اللہ وبرکاتہ علیکم اھل البیت۔ (ھود: ٧٣) اور تشہد میں پڑھا جاتا ہے السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ اور ابتداء میں علیکم السلام کہنا مکروہ ہے۔ حدیث صحیح میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علیک السلام نہ کہو کیونکہ علیکم السلام مردوں کا سلام ہے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٤٠٨٤) اور جواب دینے کا افضل اور اکمل طریقہ یہ ہے کہ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہے اور اگر وعلیکم السلام پر اقتصار کر لیا تو یہ بھی جائز ہے، سلام کرنے والا اگر سلام علیکم یا السلام علیکم کہے اور جواب دینے والا بھی اس کی مثل سلام علیکم یا السلام علیکم کہے تو یہ بھی جائز ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے: قالوا سلما قال سلام۔ (الذاریات: ٢٥) لیکن الف، لام کے ساتھ کہنا افضل ہے۔ (امام رازی نے لکھا ہے بغیر الف لام کے سلام علیکم کہنا افضل ہے، کیونکہ سلام کی تنوین کمال، مبالغہ اور تمام پر دلالت کرتی ہے اور لفظ السلام صرف ماہیت پر دلالت کرتا ہے۔ اخفش نے کہا: عرب تنوین اور الف لام کے بغیر سلام علیکم کہتے ہیں، اس کا سبب کثرت استعمال ہے جو تخفیف کا مقتضی ہے۔ تفسیر کبیر ج٦ ص ٣٧٣-٣٧٢، مطبوعہ بیروت، ١٤١٥ھ)

سلام کا جواب فوراً دینا چاہیے، اگر کوئی شخص کسی کا سلام پہنچائے پھر بھی فوراً جواب دینا چاہیے۔ اگر خط میں سلام پہنچے تو اس کا بھی فوراً جواب لکھ دے۔ حدیث میں ہے کہ سوار پیدل کو سلام کرے اور کھڑا ہوا بیٹھے کو سلام کرے، کم زیادہ کو سلام کریں اور چھوٹا بڑے کو سلام کرے، یہ افضل اور مستحب ہے اگر اس کے برعکس کیا پھر بھی جائز ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ سلام اللہ تعالیٰ کا نام ہے اور السلام علیک کا معنی یہ ہے کہ تم پر اللہ کا نام ہو یعنی تم اس کی حفاظت میں رہو، اور ایک قول یہ ہے کہ سلام، سلامتی کے معنی میں ہے، یعنی یہ دعا ہے کہ تم پر سلامتی ہو۔

(شرح مسلم ج٩ ص ٥٨٣١-٥٨٢٩، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ١٤١٧ھ)

السلام علیکم کا جواب وعلیکم السلام ہے، اس میں نکتہ یہ ہے کہ کلام کی ابتداء بھی اللہ تعالیٰ کے نام سے ہو اور اس کی انتہا بھی اللہ کے نام پر ہو یا متکلم مخاطب کے لیے سلامتی کی دُعا کرے اور جواباً مخاطب بھی اس کے لیے سلامتی کی دُعا کرے، سلامتی کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اس کو دُنیا کی ہر بلا اور ہر عیب سے اور آخرت کے ہر عذاب سے سلامت رکھے۔

اسلام میں مہمان نوازی کی حیثیت

اس کے بعد فرمایا: پھر تھوڑی دیر بعد وہ (ابراہیم) گائے کا بھنا ہوا بچھڑا لے آئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے بیان کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام گائے کا بچھڑا اس لیے لائے تھے کہ ان کے اموال میں زیادہ تر گائیں تھیں۔

اس آیت سے یہ مستفاد ہوا کہ میزبانی کے آداب میں سے یہ ہے کہ مہمان کو جلدی کھانا پیش کیا جائے اور جو چیز فوراً دستیاب ہو اس کو پیش کر دیا جائے، اس کے بعد دیگر لوازمات تلاش کیے جائیں اگر اس کی دسترس میں ہوں، اور زیادہ تکلفات کر کے اپنے آپ کو ضرر اور مشقت میں نہ ڈالے اور یہ کہ مہمان نوازی کرنا مکارمِ اخلاق، آدابِ اسلام اور انبیاء اور صلحاء کی سنتوں اور ان کے طریقوں میں سے ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مہمان نوازی کی۔ جمہور علماء

کے نزدیک مہمان نوازی کرنا واجب نہیں اور اس کی دلیل درج ذیل احادیث ہیں:

مہمان نوازی کے متعلق احادیث اور ان کی تشریح

حضرت ابو شریح العدوی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میرے کانوں نے سنا اور میری آنکھوں نے دیکھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا: جو شخص اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ مہمان کی تکریم کرے اور اس کو جائزہ دے۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! جائزہ کیا ہے؟ فرمایا: ایک دن اور ایک رات اس کی زیادہ خاطر مدارات کرے اور تین دن اس کی ضیافت کرے (کھانا کھلائے) اور اس سے زیادہ دن اس کی طرف سے صدقہ ہیں اور جو شخص اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتا ہو وہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۰۱۹، صحیح مسلم، کتاب اللقطہ: ۱۴، رقم بلاتکرار: ۱۷۲۶، رقم مسلسل: ۴۴۳۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۷۴۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۹۶۸، ۱۹۶۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۶۷۵، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۲۰۵۶، الموطاء رقم الحدیث: ۱۷۲۸، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۵۲۸۷، مسند احمد ج ۶ ص ۳۸۵)

حضرت ابو شریح الخزاعی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مہمان نوازی تین دن ہے اور جائزہ (خاطر مدارات) ایک دن ہے اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کے پاس اتنے دن قیام کرے کہ اس کو گناہ میں مبتلا کرے۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! وہ اس کو گناہ میں کیسے مبتلا کرے گا؟ فرمایا: وہ اس کے پاس ایسی حالت میں قیام کرے کہ اس کے پاس اس کی مہمان نوازی کے لیے کچھ نہ ہو۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۵، ۱۷۲۶، ۴۴۳۵)

قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴ھ لکھتے ہیں:

جائزہ کا معنی ہے مہمان کو تحفہ وغیرہ پیش کرنا، ایک قول یہ ہے کہ تین دن مہمان کو کھانا کھلانے کے بعد اس کو روانہ کرے اور اس کے سفر کے لیے ایک دن ایک رات کا زادِ راہ پیش کرے، یہ جائزہ ہے۔

تین دن سے زیادہ مہمان کا ٹھہرنا اس لیے حرام ہے کہ میزبان اس کی ضیافت کے لیے کسی ناجائز ذریعہ کو تلاش نہ کرے، یا تنگ آکر مہمان سے کوئی ناجائز بات نہ کرے۔ ایک قول یہ ہے کہ مہمان کے لیے تین دن سے زیادہ قیام کرنا اس وقت حرام ہے جب اس کو یہ علم ہو کہ میزبان کے پاس تین دن سے زیادہ اس کو کھلانے کے جائز وسائل نہیں ہیں اور اس کی وجہ سے میزبان کسی حرام کام میں مبتلا ہو جائے گا۔

تین دن سے زیادہ کی مہمان نوازی ضرورت مند پر صدقہ ہے، اور جو غنی ہو اس کے لیے میزبان کی رضا اور خوشی کے بغیر مزید قیام کرنا حرام ہے۔ (اکمال المعلم بفوائد مسلم ج ۶ ص ۲۲-۲۱، مطبوعہ دار الوفاء بیروت، ۱۴۱۹ھ)

مہمان نوازی کے متعلق مذاہبِ فقہاء

علامہ یحییٰ بن شرف نواوی شافعی متوفی ۶۷۶ھ لکھتے ہیں:

ان احادیث میں یہ تصریح ہے کہ مہمان کی خاطر تواضع کرنی چاہیے اور اس کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے، تمام مسلمانوں کا مہمان نوازی کرنے پر اجماع ہے۔ امام شافعی، امام مالک، امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ اور جمہور علماء کے نزدیک مہمان نوازی سنت ہے، واجب نہیں ہے اور لیث اور امام احمد کے نزدیک ایک دن اور ایک رات کی مہمان نوازی کرنا واجب ہے۔ (ان کے دلائل اور ان کے جوابات عنقریب ذکر کیے جائیں گے)

ایک دن اور ایک رات مہمان کی خوب خاطر مدارات کرنی چاہیے اور حسبِ توفیق اس کو ہدیئے وغیرہ دیئے جائیں اور دوسرے اور تیسرے دن اس کو معمول کے مطابق کھانا کھلائے۔ مہمان تین دن سے زیادہ قیام نہ کرے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس کے زیادہ قیام کی وجہ سے میزبان اس کی غیبت کرے یا اس کی وجہ سے مہمان کے معمولات میں خلل ہو یا مہمان کی مصروفیات کی وجہ سے میزبان کو ضرر پہنچے یا وہ اس کے متعلق بدگمانی کرے اور گناہ میں مبتلا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔(الحجرات: ۱۲) زیادہ گمان کرنے سے بچو، بے شک بعض گمان گناہ ہیں۔

یہ اس صورت میں ہے جب مہمان، میزبان کے مطالبہ کے بغیر تین دن سے زیادہ قیام کرے لیکن اگر میزبان نے خود مہمان کو زیادہ قیام کے لیے کہا ہو یا اس کو علم ہو یا گمان ہو کہ اس کا زیادہ قیام میزبان پر بار نہیں ہے بلکہ وہ اس پر خوش ہے تو پھر اس کے زیادہ قیام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (شرح مسلم ج ۸ ص ۵۸۷۴، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ)

مہمان نوازی کے وجوب کے متعلق احادیث

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: آپ ہمیں (مختلف مہمات پر) روانہ کرتے ہیں، ہمیں (بعض اوقات) ایسے لوگوں کے پاس قیام کرنا پڑتا ہے جو ہماری ضیافت نہیں کرتے، (اس صورت میں) آپ کا کیا حکم ہے؟ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم لوگوں کے پاس جاؤ اور وہ تمہاری معمول کے مطابق مہمان نوازی کریں (تو فبہا) اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان سے اس قدر وصول کر لو جتنا مہمان کا میزبان پر حق ہوتا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۱۳۷، ۲۴۶۱، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۷۲۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۷۵۲، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۵۸۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۶۷۶)

حضرت ابوکریمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک رات تو مسلمان پر مہمان کا حق ہے، جو شخص کسی مسلمان کے گھر رہے تو وہ اس مسلمان پر قرض ہے، اب مہمان چاہے تو میزبان سے قرض وصول کرے اور چاہے چھوڑ دے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۷۵۰، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۶۷۷)

حضرت ابوکریمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی قوم کے ہاں مہمان ہو اور صبح تک وہ مہمان محروم رہے تو اس کی مدد کرنا ہر مسلمان پر حق ہے حتیٰ کہ اس مہمان کی ضیافت اس قوم کے مال اور ان کے کھیت سے وصول کر لی جائے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۷۵۱)

مہمان نوازی کے وجوب کے دلائل کے جوابات

یہ احادیث امام احمد اور لیث کی دلیل ہیں کہ ایک رات کی مہمان نوازی کرنا میزبان پر واجب ہے، قاضی عیاض مالکی متوفی ۵۴۴ھ اس کے جواب میں لکھتے ہیں: یہ احادیث ابتداء اسلام پر محمول ہیں جب بالعموم مسلمان تنگ دست تھے، اس وقت لوگوں پر یہ واجب تھا کہ وہ مسافروں اور مہمانوں کی ضیافت کریں اور اگر وہ ضیافت نہ کریں تو مہمان کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ بقدر ضیافت ان سے جبراً وصول کر لے، اور جب اللہ تعالیٰ نے فتوحات اور مالِ غنیمت کے ذریعہ مسلمانوں کو اس سے مستغنی کر دیا تو یہ حکم ساقط ہو گیا، خصوصاً اس آیت سے:

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ (البقرۃ: ۱۸۸) اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث اضطرار کی حالت پر محمول ہے، یعنی جب مہمان یا مسافر کو کھانے کے لیے کچھ نہ ملے اور نہ کھانے کی صورت میں اس کو موت کا خطرہ ہو تب وہ اتنی مقدار جبراً بھی لے سکتا ہے جس سے اس کی جان بچ جائے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ پہلے اہلِ ذمہ پر یہ شرط لگائی گئی تھی کہ جب مجاہدین ان کے علاقے سے گزریں تو ان پر واجب ہے کہ وہ مسلمانوں کی ضیافت کریں اور یہ ان علاقوں میں شرط تھی جن کو جنگ کے ذریعہ فتح کیا گیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جو علاقے فتح کیے گئے تھے ان میں یہ شرط تھی۔

(اکمال المعلم بفوائد مسلم ج ۶ ص ۲۳، مطبوعہ دارالوفاء بیروت، ۱۴۱۹ھ)

علامہ یحییٰ بن شرف نواوی شافعی متوفی ۶۷۶ھ نے ان احادیث کو استحباب کی تاکید پر محمول کیا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ہر بالغ پر غسلِ جمعہ واجب ہے۔ دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ جو لوگ مہمان کی ضیافت نہ کریں ان کی مذمت کرنا مباح ہے اور تیسرا جواب یہ دیا ہے کہ یہ احادیث اضطرار کی حالت پر محمول ہیں اور قاضی عیاض کے باقی جوابوں کا رد کیا ہے۔

(شرح مسلم ج ۸ ص ۴۷۵۹، ۴۷۵۸، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پھر جب ابراہیم نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے تک نہیں بڑھ رہے تو ابراہیم نے ان کو اجنبی سمجھا اور اپنے دل میں ان سے ڈرنے لگے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خوف زدہ ہونے کی وجوہ

قتادہ نے بیان کیا ہے کہ جب عربوں کے پاس کوئی مہمان جاتا اور وہ ان کے ساتھ کھانا نہ کھاتا تو وہ یہ گمان کرتے تھے کہ وہ شخص کسی نیک ارادہ سے نہیں آیا، اور وہ اپنے دل میں کوئی بُرا منصوبہ لے کر آیا ہے، اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے خوف زدہ ہوئے۔ جندب بن سفیان نے کہا: ان کے ہاتھوں میں تیر تھے اور وہ تیروں سے اس بھنے ہوئے بچھڑے کو کریدنے لگے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ بات بہت عجیب لگی اس وجہ سے وہ خوف زدہ ہوئے۔

(جامع البیان جز ۱۲ رقم الحدیث: ۱۴۱۳۶، ۱۴۱۳۵، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

ان مہمانوں نے کھانے کی طرف اس لیے ہاتھ نہیں بڑھائے تھے کہ وہ فرشتے تھے اور فرشتے کھانے پینے سے منزہ ہیں، وہ مہمانوں کی صورت میں اس لیے آئے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مہمانوں سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کی مہمان نوازی میں بہت کوشش کرتے تھے، اب رہا یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے کیوں خوف زدہ ہوئے تو اس کی دو تقریریں ہیں:

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ پتا نہیں تھا کہ یہ فرشتے ہیں، وہ ان کو عام انسان سمجھے تھے اور ان کے خوف زدہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگوں سے دُور ایک الگ تھلگ جگہ رہتے تھے اور جب انہوں نے ان کے ساتھ کھانا نہیں کھایا تو حضرت ابراہیم نے یہ گمان کیا کہ شاید وہ ان کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمانہ قدیم میں یہ معمول تھا کہ جو شخص کسی کا نمک کھا لیتا تھا وہ اس کو نقصان نہیں پہنچاتا تھا اور جب کوئی شخص کسی کے گھر کھانا نہیں کھاتا تھا تو اس سے نقصان کا خطرہ ہوتا تھا۔

(۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ علم تھا کہ یہ فرشتے ہیں اور وہ اس لیے خوف زدہ ہوئے کہ شاید اللہ تعالیٰ کو ان کی کوئی بات پسند نہیں آئی اور اس پر تنبیہ کرنے کے لیے فرشتوں کو بھیجا ہے یا اس لیے خوف زدہ ہوئے کہ ان کی قوم پر عذاب نازل کرنے کے لیے فرشتوں کو بھیجا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مہمانوں کے فرشتے ہونے کا علم تھا یا نہیں

جن مفسرین نے یہ کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ پتا نہیں تھا کہ یہ مہمان فرشتے ہیں' ان کے یہ دلائل ہیں:

(۱) حضرت ابراہیم مہمانوں کے آتے ہی فوراً ان کے لیے کھانا لے کر آ گئے' اگر ان کو علم ہوتا کہ یہ فرشتے ہیں تو وہ کھانا نہ لاتے۔

(۲) وہ ان کے کھانا نہ کھانے سے خوف زدہ ہو گئے اور کسی نقصان کا خطرہ محسوس کیا' اگر ان کو علم ہوتا کہ یہ فرشتے ہیں تو ان کو ان کے کھانا نہ کھانے سے کوئی خوف نہ ہوتا۔

جن مفسرین نے یہ کہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ معلوم تھا کہ وہ مہمان فرشتے ہیں' ان کی دلیل یہ ہے کہ فرشتوں نے حضرت ابراہیم سے کہا: آپ ہم سے خوف زدہ نہ ہوں' ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں' یہ بات اسی وقت کہی جا سکتی تھی جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ معلوم ہو کہ وہ کون ہیں اور انہیں کس سبب سے بھیجا گیا ہے تبھی انہوں نے کہا: آپ مت ڈریئے ہمیں قوم لوط کی طرف بھیجا گیا ہے اور ایک اور سورت میں فرشتوں نے کہا:

اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰی قَوۡمٍ مُّجۡرِمِیۡنَ ۝ لِنُرۡسِلَ عَلَیۡهِمۡ حِجَارَةً۔(الذاریات: ۳۳-۳۲) بے شک ہم مجرموں کی طرف بھیجے گئے ہیں ۝ تاکہ ہم ان پر پتھر برسائیں۔

پچھلی امتوں میں بھی کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا تھا

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

طبری نے ذکر کیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کے سامنے بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا تو انہوں نے کہا: ہم قیمت دیئے بغیر کوئی کھانا نہیں کھاتے۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا: اس کی قیمت یہ ہے کہ تم کھانے کے شروع میں اللہ کا ذکر کرو اور آخر میں اللہ کا شکر ادا کرو' تب حضرت جبرئیل نے اپنے ساتھی فرشتوں سے کہا: اسی وجہ سے ان کو اللہ نے اپنا خلیل بنایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا اور کھانے کے آخر میں الحمد للہ پڑھنا پہلی امتوں میں بھی مشروع تھا۔

بعض اسرائیلی روایات میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تنہا کھانا نہیں کھاتے تھے' جب ان کے سامنے کھانا پیش کیا جاتا تو وہ کسی کو اپنے ساتھ کھانے کے لیے بلا لیتے تھے۔ ایک دن ان کے ساتھ ایک شخص کھانے کے لیے بیٹھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے فرمایا: بسم اللہ پڑھو۔ اس شخص نے کہا: میں نہیں جانتا کہ اللہ کون ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے فرمایا: چلو میرے کھانے سے اٹھ جاؤ۔ جب وہ شخص چلا گیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اس کے کفر کے باوجود اس کو ساری عمر رزق دیتا رہا اور تم نے اس کو ایک لقمہ دینے میں بخل کیا! پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام گھبرا کر اس شخص کی تلاش میں نکلے اور اس سے فرمایا: واپس آ جاؤ۔ اس نے کہا: میں اس وقت تک نہیں آؤں گا جب تک کہ تم مجھے یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم مجھے کس وجہ سے بلا رہے ہو؟ حضرت ابراہیم نے اس کو پوری تفصیل بتائی۔ اس نے کہا: یہ تو رب کریم ہے' پھر وہ ایمان لے آیا' حضرت ابراہیم کے گھر گیا اور بسم اللہ پڑھ کر کھانا کھایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ابراہیم کی بیوی جو کھڑی ہوئی تھی وہ ہنس پڑی تو ہم نے اس کو اسحٰق کی پیدائش کی خوش خبری سنائی' اور اسحٰق کے بعد یعقوب کی ۝ (ھود: ۷۱)

حضرت سارہ کے ہنسنے کی وجوہ

امام رازی نے لکھا ہے کہ سارہ آزر بن باحوراء کی بیٹی تھیں، اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عم زاد تھیں، یہ پردے کے پیچھے کھڑی ہوئیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فرشتوں سے باتیں سن رہی تھیں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ مہمانوں کی خدمت کر رہی تھیں اور حضرت ابراہیم فرشتوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت سارہ کے ہنسنے کی متعدد وجوہ بیان کی گئی ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:

(۱) جب فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا: آپ مت ڈریں، ہمیں قوم لوط کے پاس بھیجا گیا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خوف زائل ہوگیا اور حضرت ابراہیم کے خوش ہونے سے سارہ بھی خوش ہوگئیں اور ایسے موقع پر آدمی ہنس پڑتا ہے۔

(۲) حضرت سارہ قوم لوط کے عمل سے سخت ناراض اور متنفر تھیں اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ فرشتے ان پر عذاب نازل کرنے کے لیے جا رہے ہیں تو وہ ہنس پڑیں۔

(۳) جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اس کھانے کی قیمت اس کے اوّل میں اللہ کا ذکر اور آخر میں اللہ کا شکر ادا کرنا ہے اور فرشتوں نے کہا کہ ایسے ہی شخص کا یہ حق ہے کہ اس کو اللہ کا خلیل بنایا جائے تو حضرت سارہ یہ سن کر خوشی سے ہنس پڑیں۔

(۴) حضرت سارہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا تھا کہ آپ اپنے بھانجے (حضرت لوط) کو اپنے پاس بلالیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسا کام کرنے والوں کو ضرور عذاب دیتا ہے اور جب فرشتوں نے یہ بتایا کہ وہ قوم لوط کو ہلاک کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں تو انہیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ان کا مشورہ فرشتوں کی خبر کے موافق تھا اس لیے وہ ہنس پڑیں۔

(۵) جب فرشتوں نے یہ کہا کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے اس پر دلیل طلب کی۔ فرشتوں نے دعا کی اور وہ بھنا ہوا بچھڑا زندہ ہوگیا اور اچھل کر کھڑا ہوگیا یہ دیکھ کر سارہ ہنس پڑیں۔

(۶) انہیں اس پر تعجب ہوا کہ ایک قوم پر عذاب آنے والا ہے اور وہ غفلت میں مبتلا ہے، اس لیے ان کو ہنسی آگئی۔

(۷) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتوں نے ان کو پہلے مطلقاً بچے کی بشارت دی ہو، اس پر ان کو بطور تعجب کے ہنسی آگئی کیونکہ اس وقت ان کی عمر نوے سال سے اوپر تھی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر سو سال تھی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کو خوشی سے ہنسی آئی ہو، اور جب وہ ہنس پڑیں تو اللہ تعالیٰ نے خوش خبری دی کہ وہ بیٹا اسحٰق ہے اور اس کے بعد یعقوب پیدا ہوگا۔

(۸) انہیں اس پر تعجب ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس قدر رُعب اور دبدبہ کے باوجود صرف تین آدمیوں سے کیسے ڈر گئے، اس لیے ان کو ہنسی آگئی۔

ان میں سے بعض وجوہ کا ذکر امام ابن جریر طبری نے کیا ہے۔ (جامع البیان جز۱۲ ص۹۶-۹۵)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (سارہ نے) کہا ارے دیکھو! کیا میں بچہ جنوں گی! حالانکہ میں بوڑھی ہوں، اور میرے یہ شوہر بھی بوڑھے ہیں، بے شک یہ عجیب بات ہےO (هود: ۷۲)

یاویلتٰی کا معنی اور ترجمہ

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ نے لکھا ہے: وی ایسا کلمہ ہے جس کو حسرت، ندامت اور تعجب کے

اظہار کے طور پر بولا جاتا ہے اور ویل برائی کے اظہار کے لیے بولا جاتا ہے، اور کبھی حسرت کے اظہار کے لیے بولا جاتا ہے، اور جہنم کی ایک وادی کا نام بھی ویل ہے۔ (المفردات ج ۲ ص ۶۹۵، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

امام خلیل بن احمد فراہیدی متوفی ۱۷۵ھ نے لکھا ہے: وی تعجب کے اظہار کے لیے بولا جاتا ہے، ویح کسی مصیبت زدہ پر اظہارِ ترحم کے لیے بولا جاتا ہے اور ویل کسی برائی یا خرابی کے نزول کے لیے بولا جاتا ہے۔

(کتاب العین ج ۳ ص ۱۹۹۰، مطبوعہ ایران، ۱۴۱۴ھ)

علامہ جار اللہ محمود بن عمر زمخشری متوفی ۵۸۳ھ نے لکھا ہے کہ ویل اظہارِ تعجب کے لیے آتا ہے۔

(الفائق ج ۳ ص ۳۸۴، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ)

علامہ المبارک بن محمد بن الاثیر الجزری المتوفی ۶۰۶ھ نے لکھا ہے: ویل غم، مصیبت، ہلاکت، عذاب اور ندامت کے اظہار کے لیے بولا جاتا ہے اور کبھی اظہارِ تعجب کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

(النہایہ ج ۵ ص ۲۰۴، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ)

شیخ سعدی متوفی ۶۹۱ھ نے یاویلتی کا ترجمہ کیا ہے: اے عجبا، شاہ ولی اللہ متوفی ۱۱۷۶ھ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: اے وائے، شاہ عبد القادر متوفی ۱۲۳۰ھ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: اے خرابی، شاہ رفیع الدین متوفی ۱۲۳۳ھ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: اے وائے، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ہائے خرابی، سید مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ہائے میری کم بختی، ہمارے شیخ علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ العزیز نے اس کا ترجمہ کیا ہے: اے افسوس، باقی مترجمین نے بھی اسی طرح کے ترجمے کیے ہیں۔

قرآنِ مجید کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی رنج اور مصیبت کے اظہار کا موقع نہیں تھا، بلکہ تعجب کے اظہار کا موقع تھا اور ہم نے کتب لغت کے حوالہ جات سے بھی بیان کیا ہے کہ ویل کا لفظ اظہارِ تعجب کے لیے بھی بولا جاتا ہے، اس لیے ہم نے اردو محاورہ کے مطابق اس کا ترجمہ ارے دیکھو! کیا ہے، اس موقع پر اے ہے بھی بولتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فرشتوں نے کہا: کیا تم اللہ کی قدرت پر تعجب کر رہی ہو! اے اہلِ بیت تم پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں، بے شک اللہ حمد و ثناء کا مستحق، بہت بزرگ ہے ○ (ھود: ۷۳)

حضرت سارہ نے جو تعجب کیا اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر تعجب ہے تو یہ کفر ہے اور اگر یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے جہل ہے تب بھی کفر ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تعجب عرف اور عادت کی بناء پر ہے، انہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ایمان تھا لیکن چونکہ یہ ولادت عرف اور عادت کے خلاف تھی اس لیے انہوں نے اس پر اظہارِ تعجب کیا۔

اہلِ بیت کے مصداق کی تحقیق

فرشتوں نے حضرت سارہ سے کہا: اے اہلِ بیت! اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج بھی اہلِ بیت سے ہیں، پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہا بھی اہلِ بیت سے ہیں اور اس آیت میں داخل ہیں:

اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَیُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا۔ (الاحزاب: ۳۳)

اے رسول کے اہلِ بیت! اللہ یہی ارادہ فرماتا ہے کہ تم سے ہر قسم کی ناپاکی دُور فرمادے اور تمہیں اچھی طرح پاک کر کے خوب پاکیزہ کردے۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۶۳، روح المعانی جز ۱۲ ص ۱۵۹)

شیعہ مفسرین میں سے شیخ ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسی المتوفی ۴۶۰ھ لکھتے ہیں:
فرشتوں نے حضرت سارہ کو اہلِ بیت کہا' اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی زوجہ بھی اس کے اہلِ بیت میں داخل ہے' یہ جبائی کا قول ہے اور دوسروں نے یہ کہا ہے کہ حضرت سارہ کو اہلِ بیت سے اس لیے شمار کیا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عم زاد تھیں۔ (التبیان ج ۶ ص ۳۴ ' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

شیخ فتح اللہ کاشانی لکھتے ہیں کہ مجمع میں بیان کیا ہے کہ حضرت سارہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اہلِ بیت سے شمار کرنا اس پر دلالت نہیں کرتا کہ کسی شخص کی بیویاں اس کے اہلِ بیت سے ہوتی ہیں' کیونکہ حضرت سارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عم زاد تھیں اسی وجہ سے ان کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اہلِ بیت سے شمار کیا گیا۔
(منہج الصادقین جز ۱۲ ص ۴۳۹ ' مطبوعہ کتاب فروشے علمیہ اسلامیہ ' ایران)

اس کے برخلاف محققین شیعہ کی ایک جماعت نے لکھا ہے:
بعض مفسرین نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ انسان کی بیوی بھی اس کے اہلِ بیت میں شامل ہوتی ہے' اور یہ عنوان بیٹوں اور ماں باپ کے ساتھ خاص نہیں ہے' اور یقیناً یہ استدلال صحیح ہے' حتیٰ کہ اگر یہ آیت نہ بھی ہوتی تب بھی اہل کا استعمال اس معنی میں صحیح تھا۔ (تفسیر نمونہ ج ۹ ص ۱۷۳ ' مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ ایران' ۱۳۷۵ھ)

اور یہی بات صحیح ہے کہ اہلِ بیت کا لفظ کسی شخص کی بیوی کو بھی شامل ہوتا ہے' کتب لغت میں بھی اسی طرح مذکور ہے۔
امام لغت خلیل بن احمد فراہیدی متوفی ۱۷۵ھ لکھتے ہیں:
کسی شخص کا اہل اس کی زوجہ ہے اور جو اس کے ساتھ مخصوص ہوں' اور اہلِ بیت سے مراد ہے اس کے گھر میں رہنے والے۔ (کتاب العین ج ۱ ص ۱۱۵ ' مطبوعہ مطبع باقری قم ایران' ۱۴۱۴ھ)

علامہ جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور افریقی متوفی ۷۱۱ھ لکھتے ہیں:
اہلِ بیت کا معنی ہے اس کے گھر میں رہنے والے' کسی شخص کا اہل وہ ہوتا ہے جو اس کے ساتھ مخصوص ہو' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل' آپ کی ازواج' آپ کی صاحب زادیاں اور آپ کے داماد حضرت علی علیہ السلام ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ آپ کی خواتین اور آپ کے مرد ہی آل ہیں۔ (لسان العرب ج ۱۱ ص ۲۹ ' مطبوعہ نشر ادب الحوزۃ قم' ایران' ۱۴۰۵ھ)

سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں:
کسی شخص کا اہل اس کی بیوی ہے' اور اس میں اولاد بھی داخل ہے' قرآنِ مجید میں ہے: وسار باھلہ یعنی وہ اپنی بیوی اور اولاد کو لے کر رات کو روانہ ہوئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل آپ کی ازواج' آپ کی صاحب زادیاں اور آپ کے داماد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں یا آپ کی ازواج ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ کے اہل وہ مرد ہیں جو آپ کی آل ہیں' اس میں آپ کے نواسے اور آپ کی ذریات بھی داخل ہیں' اسی معنی میں یہ آیات ہیں: وامر اھلک بالصلٰوۃ واصطبر علیھا۔ (طٰہٰ: ۱۳۲) انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت۔ (الاحزاب: ۳۳) رحمۃ اللہ وبرکاتہ علیکم اھل البیت۔ (ھود: ۷۳)
(تاج العروس ج ۷ ص ۳۱۷ ' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر جب ابراہیم کا خوف دُور ہوگیا اور ان کے پاس بشارت پہنچ گئی تو وہ ہم سے قوم لوط کے متعلق بحث کرنے لگےO (ھود: ۷۴)

فرشتوں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مباحثہ پر ایک اعتراض کا جواب

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ سے بحث کرنا اللہ تعالیٰ پر سخت جرأت کرنا ہے، اور اللہ تعالیٰ پر جرأت کرنا بہت بڑا گناہ ہے، کیونکہ اس بحث سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو تبدیل کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا اس بات کو مستلزم ہے کہ وہ اللہ کی تقدیر پر راضی نہیں تھے، اور اگر یہ بحث فرشتوں کے ساتھ تھی تو اس سے مقصود یہ تھا کہ وہ قوم لوط کو ہلاک نہ کریں، تو اگر حضرت ابراہیم کا گمان یہ تھا کہ فرشتے از خود قوم لوط کو ہلاک کر رہے ہیں تو یہ فرشتوں کے متعلق بدگمانی تھی اور اگر ان کا گمان یہ تھا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم سے قوم لوط کو عذاب دینے کے لیے جارہے ہیں تو یہ اس کو مستلزم ہے کہ حضرت ابراہیم یہ چاہتے تھے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کریں اور یہ اور بھی زیادہ قابلِ اعتراض ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا منشاء یہ نہیں تھا کہ قوم لوط پر عذاب نازل نہ کیا جائے بلکہ ان کا منشاء یہ تھا کہ اس عذاب کو موخر کر دیا جائے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تاخیر کی وجہ سے ان میں سے بعض ایمان لے آئیں اور اپنے گناہوں سے توبہ کر لیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی رائے یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کا حکم دیا ہے لیکن یہ تو نہیں فرمایا کہ ان پر فوراً عذاب نازل کر دیا جائے اور فرشتوں کی رائے یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کرنے کا جو حکم دیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان پر فوراً عذاب نازل کر دیا جائے۔

فرشتوں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مباحثہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور فرشتوں کے درمیان نزولِ عذاب کے متعلق جو بحث ہوئی اس کے بارہ میں حسبِ ذیل روایات ہیں:

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابراہیم نے فرشتوں سے پوچھا: تم کس کام سے آئے ہو؟ انہوں نے کہا: ہمیں قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: یہ بتاؤ اگر اس بستی میں ایک سو مسلمان ہوئے تو کیا تم اس بستی کو ہلاک کر دو گے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ حضرت ابراہیم نے کہا: اگر پچاس مسلمان ہوں؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ پھر کم کرتے کرتے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اگر دس مسلمان ہوں؟ انہوں نے کہا: اگر اس بستی میں دس مسلمان ہوں تب بھی ہم ان کو ہلاک نہیں کریں گے، پھر فرشتوں نے کہا: اے ابراہیم! اس بحث کو چھوڑیں، اس بستی میں مسلمانوں کا صرف ایک گھر ہے اور وہ حضرت لوط اور ان کے گھر والے ہیں، پھر کہا: اے ابراہیم! اس بات کو چھوڑیں، ان پر ایسا عذاب آنے والا ہے جو ٹلنے والا نہیں ہے اور یہ آپ کے رب کا حکم ہے۔

امام ابن اسحٰق نے بیان کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں سے کہا: یہ بتاؤ اگر سو مومن ہوں تو تم ان کو ہلاک کر دو گے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ پھر کہا: اگر نوے مومن ہوں تو تم ان کو ہلاک کر دو گے؟ انہوں نے کہا: نہیں! حضرت ابراہیم نے کہا: اگر اسّی ہوں؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ کہا: اگر ستر ہوں تو؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ کہا: اگر ساٹھ ہوں تو؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ کہا: اگر پچاس ہوں تو؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ کہا: اگر ان میں صرف ایک مسلمان ہو تو؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ جب انہوں نے حضرت ابراہیم کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ان میں صرف ایک مسلمان ہے، حضرت ابراہیم نے کہا: اس بستی میں لوط ہیں؟ فرشتوں نے کہا: ان سے عذاب دُور کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ○ (العنکبوت: ۳۲)

فرشتوں نے کہا: ہم ان لوگوں کو خوب جانتے ہیں جو ان میں ہیں، ہم لوط کو اور ان کے گھر والوں کو ضرور نجات دیں گے، ماسوا ان کی عورت کے وہ باقی رہ جانے والوں میں سے ہے۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۱۶۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرشتوں سے مباحثہ کے متعلق یہ آیات بھی ہیں:

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ○ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۙ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۙ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ○ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ○ (الذاریات: ۳۷-۳۱)

ابراہیم نے کہا: اے بھیجے ہوئے فرشتو! تمہارا مدعا کیا ہے؟○ انہوں نے کہا: ہم مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں○ تاکہ ہم ان پر مٹی کے پتھر برسائیں○ جن پر حد سے تجاوز کرنے والوں کے لیے آپ کے رب کے پاس سے نشان لگے ہوئے ہیں○ سو ہم نے اس بستی سے تمام ایمان والوں کو نکال لیا○ تو ہم نے اس بستی میں مسلمانوں کے ایک گھر کے سوا اور کوئی گھر نہ پایا○ اور جو لوگ دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں ہم نے ان کے لیے اس بستی میں ایک نشانی باقی رکھی○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک ابراہیم بُردبار، اللہ سے آہ و زاری کرنے والے اور اس کی طرف رجوع کرنے والے تھے○ (ھود: ۷۵)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مدح سرائی

حلیم کا معنی ہے: انہیں بہت دیر میں غصہ آتا ہے، اوّاہ کا معنی ہے: اللہ سے بہت زیادہ ڈرنے والے اور اس کے سامنے آہ و زاری کرنے والے ہیں اور منیب کا معنی ہے اس کی طرف رجوع کرنے والے اور اس کی اطاعت کرنے والے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بہت زیادہ مدح کی گئی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب یہ پتا چلا کہ فرشتے قوم لوط کو عذاب دینے کے لیے جا رہے ہیں تو ان کو بہت زیادہ رنج ہوا اور وہ اللہ تعالیٰ سے بہت ڈرے اس لیے فرمایا: وہ حلیم اور اوّاہ ہیں اور ان کو منیب اس لیے فرمایا کہ جو شخص دوسروں پر عذاب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ اپنے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے کتنا ڈرنے والا اور اس کی طرف کتنا زیادہ رجوع کرنے والا ہو گا۔

فرشتوں سے بحث کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مدح کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بحث کرنا اللہ تعالیٰ کو ناگوار اور ناپسندیدہ نہ تھا اور اس بحث میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابلِ اعتراض ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ابراہیم! اس بات کو چھوڑو، بے شک آپ کے رب کا حکم آ چکا ہے، بے شک ان پر ایسا عذاب آنے والا ہے جو ٹلنے والا نہیں ہے○ (ھود: ۷۶)

فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا: اے ابراہیم! اب اس بحث کو ختم کر دیں کیونکہ قوم لوط پر عذاب مقدر ہو چکا ہے اور یہ تقدیرِ مبرم ہے جو ٹلنے والی نہیں ہے۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ

اور جب ہمارے فرشتے (خوبصورت لڑکوں کی شکل میں) لوط کے پاس گئے تو وہ ان کی آمد سے غمگین ہوئے اور ان کا دل تنگ ہوا، اور انہوں نے کہا

هٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ﴿۷۷﴾ وَجَآءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ

آج کا دن بڑا سخت ہے ○ اور ان کی قوم کے لوگ ان کے پاس دوڑتے ہوئے آئے، اور وہ پہلے ہی

كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ أَطْهَرُ

برے کام کرتے تھے، لوط نے کہا اے میری قوم! یہ میری (قوم کی) بیٹیاں ہیں یہ تمہارے لیے بہت

لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُونِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ

پاکیزہ ہیں، اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے بارے میں مجھے شرمندہ نہ کرو، کیا تم میں کوئی نیک شخص

رَّشِيدٌ ﴿۷۸﴾ قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَإِنَّكَ

نہیں ہے؟ ○ انہوں نے کہا آپ خوب جانتے ہیں کہ آپ کی (قوم کی) بیٹیوں میں ہماری کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور آپ خوب

لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ ﴿۷۹﴾ قَالَ لَوْ أَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً أَوْ اٰوِيْٓ إِلٰى رُكْنٍ

جانتے ہیں کہ ہماری کیا خواہش ہے ○ لوط نے کہا کاش مجھ میں تم سے مقابلہ کی قوت ہوتی یا میں کسی مضبوط پناہ گاہ میں

شَدِيدٍ ﴿۸۰﴾ قَالُوا يٰلُوطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوٓا إِلَيْكَ فَأَسْرِ

پناہ لے لیتا ○ فرشتوں نے کہا اے لوط ہم آپ کے رب کے بھیجے ہوئے ہیں، یہ آپ تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے، آپ رات کے

بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا امْرَأَتَكَ ؕ

ایک حصہ میں اپنے گھر والوں کے ساتھ یہاں سے روانہ ہو جائیں، اور آپ میں سے کوئی شخص مڑ کر نہ دیکھے، البتہ اپنی بیوی کو ساتھ نہ لیں،

إِنَّهُ مُصِيبُهَا مَا أَصَابَهُمْ ؕ إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ أَلَيْسَ الصُّبْحُ

بے شک اس کو (بھی) وہی (عذاب) پہنچنے والا ہے جو انہیں پہنچے گا، بے شک صبح کو ان کی وعید کا وقت ہے، کیا صبح

بِقَرِيبٍ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا

قریب نہیں ○ سو جب ہمارا عذاب آ پہنچا تو ہم نے اس بستی کے اوپر کے حصہ کو اس کے نیچے کر دیا اور ہم نے

عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ

ان کے اوپر پتھر کے کنکر لگاتار برسائے ○ جو (کنکر) آپ کے رب کی طرف سے نشان زدہ تھے

وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾ ع

اور یہ سزا ان ظالموں سے کچھ دور نہ تھی ○

ربع
النصف

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب ہمارے فرشتے (خوب صورت لڑکوں کی شکل میں) لوط کے پاس گئے تو وہ ان کی آمد سے غمگین ہوئے اور ان کا دل تنگ ہوا اور انہوں نے کہا آج کا دن بڑا سخت ہے ○ (ھود: ۷۷)

مشکل الفاظ کے معانی

ذرعا: ذرع کا معنی ہے ہاتھ کا پھیلاؤ یعنی کہنی سے لے کر انگلی کے سرے تک کی لمبائی، یہ قدرت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، واسع الذرع کا معنی ہے وہ قدرت والا ہے اور دل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ھو خالی الذرع کا معنی ہے اس کا دل غموں سے خالی ہے۔ (المنجد)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں: اس آیت میں وضاق بہ ذرعا کا معنی ہے فرشتوں کے آنے سے حضرت لوط کا دل تنگ ہوگیا، اس کی اصل یہ ہے کہ اونٹ چلتے وقت اپنے اگلے پیروں سے اپنے قدموں کی گنجائش کی پیمائش کرے اور جب اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بار لادا جائے تو وہ تنگ ہوتا ہے، ذرع کا معنی غلبہ بھی ہے، ذرعہ القیء کا معنی ہے اس کو قے آگئی، یعنی وہ کسی ناموافق چیز کو اپنے اندر روکنے سے تنگ ہوگیا اور قے اس پر غالب آگئی۔ حضرت لوط علیہ السلام کا دل اس لیے تنگ ہوا تھا کہ فرشتے حسین لڑکوں کی شکل میں ان کے پاس آئے اور وہ جانتے تھے کہ ان کی قوم امرد پرست اور اغلام باز ہے تو ان کو یہ پریشانی ہوگئی کہ وہ ان خوبصورت لڑکوں کو اپنی بدکردار قوم سے کیسے بچائیں گے۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۹، ص ۶۶، مطبوعہ دار الفکر، ۱۴۱۵ھ)

عصیب، عصب کا معنی ہے لپیٹنا، موڑنا، باندھنا، اجتماع کرنا، احاطہ کرنا (المنجد) عصبۃ کا معنی ہے جماعت، کسی چیز کی کثرت ظاہر کرنے کو بھی عصب کہتے ہیں، ناگوار شر کے مجموعہ کو بھی عصیب کہتے ہیں اور کسی چیز کی شدت ظاہر کرنے کو بھی عصیب کہتے ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۹، ص ۶۷)

فرشتوں کا حضرت لوط کے پاس پہنچنا

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں، جب فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے تو وہ اپنی زمین میں کام کر رہے تھے، اور فرشتوں سے یہ کہا گیا کہ ان کی قوم کو اس وقت تک ہلاک نہ کرنا جب تک حضرت لوط ان کے خلاف گواہی نہ دیں۔ فرشتوں نے حضرت لوط سے کہا کہ ہم آج رات آپ کے پاس بطور مہمان رہنا چاہتے ہیں، کچھ دیر بعد حضرت لوط نے ان سے کہا: کیا تم کو معلوم ہے کہ اس بستی والے کیسے کام کرتے ہیں؟ بخدا میں روئے زمین پر ان سے زیادہ خبیث لوگوں کو نہیں جانتا، پھر ان کو لے کر گھر کی طرف چلے، پھر دوبارہ ان سے یہی کہا اور ان کو لے کر چل پڑے۔ جب حضرت لوط کی بیوی نے ان کو دیکھا تو وہاں کے لوگوں کو جا کر بتا دیا۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۱۶۷، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے اٹھ کر حضرت لوط علیہ السلام کی بستی میں گئے اور ان دونوں بستیوں کے درمیان چار فرسخ (بارہ شرعی میل) کا فاصلہ تھا' وہ حضرت لوط علیہ السلام کے پاس انتہائی خوبصورت بے ریش لڑکوں کی شکل میں گئے' حضرت لوط علیہ السلام یہ نہیں پہچان سکے کہ یہ فرشتے ہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام کی پریشانی کی وجوہ

حضرت لوط علیہ السلام کی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ انہیں اپنی قوم کی خباثت کی وجہ سے ان لڑکوں کی عزت کا خطرہ تھا اور وہ تن تنہا ان کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے' یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس رات ان کے پاس لڑکوں کی ضیافت کے لیے کوئی سامان نہیں تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی قوم نے ان سے کہا ہوا تھا کہ آپ اپنے ہاں کسی مہمان کو نہ ٹھہرائیں۔

(تفسیر کبیرج ۶' ص ۳۷۸-۳۷۷' غرائب القرآن ج ۴' ص ۳۹)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان کی قوم کے لوگ ان کے پاس دوڑتے ہوئے آئے' اور وہ پہلے ہی برے کام کرتے تھے' لوط نے کہا اے میری قوم! یہ میری (قوم کی) بیٹیاں ہیں' یہ تمہارے لیے بہت پاکیزہ ہیں' اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے بارے میں مجھے شرمندہ نہ کرو' کیا تم میں کوئی نیک شخص نہیں ہے؟○ (ھود: ۷۸)

حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی صلبی بیٹیوں کو نکاح کے لیے پیش کیا تھا یا قوم کی بیٹیوں کو؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور وہ پہلے ہی برے کام کرتے تھے۔ ابن جریج نے کہا یعنی مرد مردوں سے خواہش نفس پوری کرتے تھے۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۱۸۱' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لوط نے کہا: اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں ہیں' یہ تمہارے لیے بہت پاکیزہ ہیں۔

مجاہد نے کہا: وہ حضرت لوط علیہ السلام کی اپنی بیٹیاں نہیں تھیں' وہ ان کی امت کی بیٹیاں تھیں' اور ہر نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۱۸۳' تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۰۶۶)

قتادہ نے کہا: حضرت لوط نے فرمایا: ان عورتوں سے نکاح کر لو' (ان کی مراد یہ نہیں تھی کہ ان سے بدکاری کرو) اور اس سے اللہ تعالیٰ کے نبی کی مراد یہ تھی کہ ان بیٹیوں سے نکاح کے ذریعہ اپنے مہمانوں کی عزت بچائیں۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۱۸۶)

امام محمد بن اسحٰق نے کہا کہ جب فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے' اور ان کی قوم کو یہ خبر ملی کہ حضرت لوط علیہ السلام کے پاس حسین و جمیل بے ریش لڑکے آئے ہیں' ان کو یہ خبر حضرت لوط کی بیوی نے پہنچائی تھی' اس نے ان سے کہا: میں نے اس سے پہلے اتنے حسین اور جمیل لڑکے نہیں دیکھے اور وہ لوگ عورتوں کے بجائے مردوں سے اپنی شہوت پوری کرتے تھے' اور ان سے پہلے کسی نے یہ خلاف فطرت کام نہیں کیا تھا تو وہ دوڑتے ہوئے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا: کیا ہم نے آپ سے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ کے پاس کوئی شخص نہ آئے' اگر کوئی آیا تو ہم اس سے یہ بے حیائی کا کام کریں گے' تب حضرت لوط نے کہا: اے میری قوم! یہ میری (قوم کی) بیٹیاں ہیں' یہ تمہارے لیے بہت پاکیزہ ہیں' میں ان بیٹیوں سے نکاح کرنے کو اپنے مہمانوں کو فدیہ دیتا ہوں' اور حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو یہ دعوت دی تھی کہ وہ حرام کام کو ترک کر کے حلال نکاح کرلیں۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۱۹۰' مطبوعہ بیروت' ۱۴۱۵ھ)

سعید بن جبیر نے کہا: یعنی قوم کی عورتوں سے نکاح کر لو جو ان کی بیٹیاں ہیں اور وہ ان کے نبی ہیں' کیونکہ نبی امت کا بمنزلہ باپ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: وازواجہ امھتھم۔ (الاحزاب: ۶) اور نبی کی ازواج امت کی مائیں ہیں۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۱۸۸' تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۰۶۷)

قوم کی بیٹیوں کے ارادے پر دلائل

قتادہ کی تفسیر کے مطابق حضرت لوط نے اپنی صلبی بیٹیوں کو نکاح کے لیے پیش کیا تھا' اور مجاہد اور سعید بن جبیر کی تفسیر کے مطابق حضرت لوط نے اپنی قوم کی بیٹیوں کو نکاح کے لیے پیش کیا تھا' ہمارے نزدیک مجاہد اور سعید بن جبیر کی تفسیر راجح ہے اور اس پر حسب ذیل وجوہ سے استدلال کیا گیا ہے:

(۱) کوئی شریف انسان اپنی بیٹیوں کو اوباش اور بدمعاش قسم کے لوگوں کے ساتھ نکاح کے لیے پیش نہیں کرتا تو اتنے عظیم نبی کے متعلق یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو بے حیا اور بدفطرت لوگوں کے ساتھ نکاح کے لیے پیش کرے گا۔

(۲) حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا تھا: یہ میری بیٹیاں جو تمہارے لیے بہت پاکیزہ ہیں' اور ظاہر ہے کہ جتنے بدمعاش اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے ٹوٹ پڑے تھے' ان سب کے ساتھ نکاح کے لیے حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹیاں ناکافی تھیں۔ اسی لیے لازمی طور پر یہ مراد لینا پڑے گا کہ یہ میری قوم کی بیٹیاں ہیں' ان سے نکاح کرکے تم اپنی خواہش پوری کرلو۔

(۳) حضرت لوط علیہ السلام کی دو بیٹیاں تھیں۔ زنتا اور زعوراء اور حضرت لوط نے فرمایا تھا کہ یہ میری بنات ہیں اور جمع میں اصل یہ ہے کہ اس کا اطلاق کم از کم تین پر ہوتا ہے اور اگرچہ دو پر بھی مجازاً جمع کا اطلاق ہو سکتا ہے' لیکن کسی شرعی مانع کے بغیر مجاز کا ارتکاب درست نہیں ہے' اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہ لوگ کافر تھے تو قوم کی بعض بیٹیاں مسلمان تھیں تو حضرت لوط نے مسلمان لڑکیوں کو کافروں کے ساتھ نکاح کے لیے کیسے پیش کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی شریعت میں کافر کے ساتھ مسلمان کا نکاح جائز تھا اور ہمارے دین میں بھی ابتدائے اسلام میں یہ نکاح جائز تھا۔ جیسا کہ ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحب زادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح ابوالعاص بن ربیع سے کیا تھا اور وہ کافر تھا۔ (الاصابہ ج۸' ص۱۵۱) اور آپ نے اپنی دوسری صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ابولہب کے بیٹے عتبہ سے کیا تھا جو مشرک تھا' (الاصابہ ج۸' ص۱۳۸) اور آپ نے اپنی تیسری صاحبزادی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح بھی ابولہب کے دوسرے بیٹے سے کیا۔ اس کا نام بھی عتبہ تھا اور یہ بھی مشرک تھا' ابولہب کے کہنے سے اس کے دونوں بیٹوں نے آپ کی صاحبزادیوں کو طلاق دے دی تھی' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے حضرت سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان سے کردیا پھر ان کے وصال کے بعد حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کردیا۔ (الاصابہ ج۸' ص۴۶۰' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۵ھ) بعد میں مسلمان مردوں کا کافر عورتوں سے اور مسلمان عورتوں کا کافر مردوں سے نکاح منسوخ کردیا گیا اور اس کی دلیل یہ آیت ہے:

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۗ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۗ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۗ (البقرۃ: ۲۲۱)

اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو حتیٰ کہ وہ ایمان لے آئیں اور بے شک مسلمان باندی (آزاد) مشرکہ سے بہتر ہے خواہ وہ تم کو اچھی لگے' اور مشرک مردوں کو نکاح کا رشتہ نہ دو حتیٰ کہ وہ ایمان لے آئیں' اور بے شک مسلمان غلام (آزاد) مشرک سے بہتر ہے خواہ وہ تم کو پسند ہو۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (حضرت لوط نے کہا) اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے بارہ میں مجھے شرمندہ نہ کرو' کیا تم میں کوئی نیک شخص نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس بے حیائی کے ارتکاب سے باز رہو' اور اس کام کے نتیجہ میں جو عذاب آخرت ہوگا اس کا خوف کرو' اور میرے مہمانوں سے اپنی خواہش نفس پوری نہ کرو' اس اس آیت میں ضیف کا لفظ ہے

جس کا معنی ہے ایک مہمان لیکن بعض اوقات لفظ واحد سے جمع کا ارادہ بھی کیا جاتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کی درج ذیل آیت میں طفل کا لفظ ہے اور اس سے مراد اطفال ہیں:

اَوِالطِّفۡلِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يَظۡهَرُوۡا عَلٰى عَوۡرٰتِ النِّسَآءِ۔ (النور: ۳۱)

(عورتوں کا اپنی زیبائش کو ظاہر کرنا ان (مذکور مردوں) پر ممنوع نہیں ہے)... یا وہ لڑکے جو عورتوں کی شرم کی باتوں پر مطلع نہیں ہوئے۔

کیا تم میں کوئی نیک شخص نہیں ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ کیا تم میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے عفت اور پاکیزگی کی ہدایت دی کہ وہ اس خلاف فطرت فعل سے باز رہے' اور رشید بہ معنی مرشد اور فعیل بہ معنی مفعول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انہوں نے کہا آپ خوب جانتے ہیں کہ آپ کی (قوم کی) بیٹیوں میں ہماری کوئی دلچسپی نہیں ہے' اور آپ خوب جانتے ہیں کہ ہماری کیا خواہش ہےO لوط نے کہا کاش مجھ میں تم سے مقابلہ کی قوت ہوتی یا میں کسی مضبوط پناہ گاہ میں پناہ لے لیتاO (هود: ۸۰-۷۹)

حضرت لوط علیہ السلام کا مضبوط قبیلہ کی پناہ کو طلب کرنا

ان کا مطلب یہ تھا کہ آپ خوب جانتے ہیں کہ ہمیں بیویوں سے قضاء شہوت کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے اور ان سے نکاح کرنے کے لیے ہمیں آپ پر ایمان لانا پڑے گا اور وہ ہمیں منظور نہیں ہے' اور آپ یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ہم لڑکوں سے خواہش پوری کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت لوط نے کہا: کاش مجھ میں تم سے مقابلہ کی قوت ہوتی یعنی کاش میں تنہا تم کو اس بے حیائی کے کام سے روکنے پر قادر ہوتا اور کہا یا میں کسی مضبوط پناہ گاہ میں پناہ لے لیتا یعنی کاش میرے پاس ایک لشکر ہوتا جس کی مدد سے میں برائی کو روکتا۔

قتادہ نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ کاش میری حمایت میں کوئی قبیلہ ہوتا' ابن جریج نے کہا ہمیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کے بعد جو نبی بھی بھیجا گیا' اس کی پشت پر کوئی قبیلہ ہوتا تھا حتیٰ کہ ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر بھی بنو ہاشم کا قبیلہ تھا۔ (جامع البیان جز ۱۲' ص ۱۱۳' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت لوط کی مغفرت فرمائے' وہ بے شک رکن شدید کی پناہ کی خواہش کرتے تھے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۷۵' صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۵۱)

امام ترمذی کی روایت میں اس حدیث کے بعد یہ اضافہ بھی ہے: اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھی بھیجا' اس کو اس کی قوم کے مضبوط قبیلہ سے بھیجا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۱۶' مسند احمد ج ۲' ص ۳۳۲' السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۵۰۸۱' مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۵۹۳۲' صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۰۷۷' المستدرک ج ۲' ص ۳۴۶)

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

قوم لوط میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جس کا حضرت لوط کے نسب سے تعلق ہو' کیونکہ حضرت لوط شام کے علاقہ سدوم سے تعلق رکھتے تھے' اور حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کا خاندان عراق میں تھا' اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شام کی طرف ہجرت کی تو ان کے ساتھ حضرت لوط علیہ السلام نے بھی شام کی طرف ہجرت کی' پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام

کو اہل سدوم کی طرف بھیجا تو انہوں نے کہا کاش میرے ساتھ لشکر یا میرے رشتہ دار اور میرا قبیلہ ہوتا تو میں اپنے مہمانوں کی عزت بچانے کے لیے ان سے مدد حاصل کرتا۔ امام ابن مردویہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہا: اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے، رکن شدید سے ان کی مراد قبیلہ تھی، کیونکہ جس طرح رکن (ستون) سے سہارا لیتے ہیں اسی طرح قبیلہ سے بھی سہارا لیتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا تھا اللہ تعالیٰ حضرت لوط کی مغفرت فرمائے اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اللہ کی پناہ نہیں لی، علامہ نووی نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے باطن میں اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کی ہو اور ظاہر میں یہ کہا ہو کہ ان کی مدد کے لیے ان کے پاس کوئی قوت یا ان کی پشت پر کوئی قبیلہ نہیں ہے تاکہ مہمانوں پر ان کا عذر ظاہر ہو جائے۔ (فتح الباری ج ۶، ص ۴۱۶-۴۱۵، مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۱ھ)

اللہ تعالیٰ کی پناہ کی بجائے مضبوط قبیلہ کی پناہ کو طلب کرنے کی توجیہات

قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴ھ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

حضرت لوط علیہ السلام نے جو کہا: "کاش میں کسی مضبوط رکن کی پناہ لے لیتا۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس قول پر تنقید کی اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے رحمت اور مغفرت طلب کی کیونکہ رکن سے ان کی مراد قبیلہ تھی تاکہ وہ قبیلہ قوم سے ان کی حفاظت کرے اور ان کے مہمانوں کو قوم کی بے حیائی کی بھینٹ چڑھنے سے بچائے اور چونکہ قوم کی زبردستی اور زیادتی کی وجہ سے ان کا دل تنگ تھا اور ان کی بدسلوکی کی وجہ سے ان کا دل آزردہ تھا، اس وجہ سے وہ اس موقع پر اللہ کی پناہ طلب کرنا اور اس سے مدد چاہنا بھول گئے اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق میں طریقہ اور عادت یہ ہے کہ بعض لوگ بعض دوسرے لوگوں کی مدد کرتے ہیں، سو انہوں نے اس معاملہ کو بھی اسی پر محمول کیا اور سب سے زیادہ مضبوط، سب سے قوی اور سب سے زیادہ حفاظت کرنے والا رکن تو اللہ تعالیٰ ہے۔

(اکمال المعلم بفوائد مسلم ج ۱، ص ۴۶۶، مطبوعہ دار الوفاء بیروت، ۱۴۱۹ھ)

علامہ محمد بن خلیفہ الوشتانی الابی المالکی المتوفی ۸۲۸ھ قاضی عیاض کی اس شرح پر رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قاضی عیاض کی یہ عبارت مسلمانوں کے لیے غیر مانوس ہے، علاوہ ازیں یہ تقریر بھی غلط ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت لوط پر تنقید نہیں کی اور نہ حضرت لوط علیہ السلام اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنا بھولے تھے، انہوں نے جو کچھ کہا وہ مہمانوں کے دلوں کو مطمئن کرنے کے لیے تھا، اور ان کے سامنے اپنا عذر ظاہر کرنے کے لیے تھا، کیونکہ عرف اور عادت یہی ہے کہ لوگ اپنی طاقت اور اپنے قبیلہ کی بناء پر مدافعت کرتے ہیں اور یہ حقیقت میں حضرت لوط علیہ السلام کے عمدہ اخلاق تھے جن کی بناء پر وہ تعریف کے مستحق ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا: "اللہ لوط پر رحم فرمائے۔" یہ درحقیقت ان کی تعریف ہے، ان پر تنقید نہیں ہے، اور یہ خطاب میں عرب کے عرف کے مطابق ہے، وہ کہتے ہیں: "اللہ بادشاہ کی تائید کرے اور اللہ امیر کی اصلاح کرے۔" اور اس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ ۔ (التوبہ: ۴۳) اللہ آپ کو معاف کرے، آپ نے ان (منافقین) کو کیوں اجازت دی؟

کیونکہ آپ نے ان پر نرمی کرنے کے لیے اور ان کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے ان کو اجازت دی تھی اور یہ آپ کے مکارم اخلاق میں سے تھا، پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ آپ کو معاف کرے، یعنی آپ نے ان کو اجازت دے کر اپنے آپ کو مشقت اور تکلیف میں کیوں ڈالا اور یہ ایسا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ (طٰہٰ: ۲-۱)

ہم نے یہ قرآن آپ پر اس لیے نہیں نازل کیا کہ آپ مشقت اٹھائیں۔

(اکمال المعلم ج ۱، ص ۴۳۷-۴۳۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ ابی کے شاگرد علامہ سنوسی مالکی متوفی ۸۹۵ھ علامہ ابی کی عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ علامہ ابی کو جزائے خیر عطا فرمائے، انہوں نے اس حدیث کی شرح کا حق ادا کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا تھا: اللہ تعالیٰ حضرت لوط پر رحم فرمائے، اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کی تاکید کرنا چاہتے تھے کہ حضرت لوط اللہ تعالیٰ کی پناہ کے طالب تھے، اس لیے آپ نے حدیث کے شروع میں تاکید کا کلمہ فرمایا یعنی بے شک، پس یہ حدیث اس اعتراض کو دور کرنے کے لیے ہے کہ حضرت لوط غیر اللہ کی پناہ کے طالب تھے، جیسا کہ اس حدیث کے شروع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم کی تنزیہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: ہم حضرت ابراہیم کی بہ نسبت شک کرنے کے زیادہ حقدار ہیں اور اس سے مقصود یہ تھا کہ حضرت ابراہیم نے جو اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا تھا کہ "اے رب! تو مجھے دکھا کہ تو کیسے مردوں کو زندہ کرے گا۔" یہ سوال اس لیے نہیں تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی قدرت پر شک تھا بلکہ کسی اور وجہ سے تھا۔

(مکمل اکمال الاکمال ج ۱، ص ۴۳۵-۴۳۴، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فرشتوں نے کہا اے لوط! ہم آپ کے رب کے بھیجے ہوئے ہیں، یہ آپ تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے، آپ رات کے ایک حصہ میں اپنے گھر والوں کے ساتھ یہاں سے روانہ ہو جائیں اور آپ میں سے کوئی شخص مڑ کر نہ دیکھے، البتہ اپنی بیوی کو ساتھ نہ لیں، بے شک اس کو (بھی) وہی (عذاب) پہنچنے والا ہے جو انہیں پہنچے گا، بے شک صبح کو ان کی وعید کا وقت ہے، کیا صبح قریب نہیں ۝ (ھود: ۸۱)

حضرت لوط علیہ السلام کا نجات پانا اور بد معاش کافروں کا بھاگنا

جب لوط علیہ السلام نے یہ کہا تھا: کاش مجھ میں تم سے مقابلہ کی قوت ہوتی! یا میں کسی مضبوط قبیلہ کی پناہ میں ہوتا! تو اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان بد معاشوں اور اوباش لوگوں کی یورش کی وجہ سے حضرت لوط علیہ السلام کو بہت رنج اور افسوس تھا کہ انہیں اپنے مہمانوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا، جب فرشتوں نے ان کا یہ حال دیکھا تو ان کو متعدد بشارتیں دیں:

(۱) وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہیں۔

(۲) کفار اپنی خواہش پوری نہیں کر سکتے۔

(۳) اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کر دے گا۔

(۴) اللہ عزوجل حضرت لوط کو اور ان کے اہل کو اس عذاب سے نجات دے گا۔

علامہ ابو عبد اللہ قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں: حضرت لوط علیہ السلام پر ان کی قوم غالب آنے لگی، وہ لوگ دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے، اور حضرت لوط دروازہ کو بند رکھنے کی کوشش کر رہے تھے، اس وقت ان سے فرشتوں نے کہا: آپ دروازہ سے ہٹ جائیں، حضرت لوط ہٹ گئے اور دروازہ کھل گیا۔ پھر حضرت جبریل نے اپنا پر مارا تو وہ سب اندھے ہو گئے اور الٹے پاؤں بچاؤ بچاؤ چیختے ہوئے بھاگے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِىْ وَنُذُرِ - (القمر: ۳۷)

اور انہوں نے لوط کے مہمانوں کے ساتھ برے کام کا ارادہ کیا تو ہم نے ان کی آنکھوں کو مٹا دیا، سو اب میرے عذاب اور

میری وعید کا مزہ چکھو۔

(الجامع لاحکام القرآن جز۹، ص۷۰، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض دیگر صحابہ سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے اس کے آخر میں ہے جب حضرت لوط نے کہا: کاش مجھ میں تم سے مقابلہ کی قوت ہوتی! یا میں کسی مضبوط قبیلہ کی پناہ میں ہوتا تو حضرت جبریل نے اپنے پر پھیلائے اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا اور وہ بچاؤ بچاؤ کہتے ہوئے الٹے پیر بھاگے، انہوں نے کہا کہ لوط کے گھر میں روئے زمین کا سب سے بڑا جادوگر ہے۔ فرشتوں نے کہا اے لوط! ہم آپ کے رب کے فرستادہ ہیں، یہ لوگ ہرگز آپ تک نہیں پہنچ سکتے، آپ اپنے اہل کے ساتھ رات کے ایک حصہ میں روانہ ہو جائیں اور آپ میں سے کوئی شخص مڑ کر نہ دیکھے، البتہ اپنی بیوی کو اپنے ساتھ نہ لیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو شام کی طرف لے گیا۔ حضرت لوط نے کہا ان کو اسی وقت ہلاک کر دو۔ فرشتوں نے کہا، ہمیں صبح کے وقت انہیں ہلاک کرنے کا حکم دیا گیا ہے، کیا صبح قریب نہیں، پھر رات کے پچھلے پہر حضرت لوط اور ان کے اہل روانہ ہو چکے تھے اور ان کی قوم کو سنگسار کر کے ہلاک کر دیا گیا تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوۡطٍ ؕ نَجَّيۡنٰهُمۡ بِسَحَرٍ۔ (القمر: ۳۴)

بے شک ہم نے ان پر سنگ باری کا عذاب بھیجا ماسوا آل لوط کے، ہم نے رات کے پچھلے پہر ان کو نجات دی۔

یہ حدیث امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے اور امام بخاری اور امام مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔

(المستدرک ج۲، ص۵۶۳، مطبوعہ دارالباز مکہ مکرمہ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو جب ہمارا عذاب آپہنچا تو ہم نے اس بستی کے اوپر کے حصہ کو اس کے نیچے کر دیا، اور ہم نے ان کے اوپر پتھر کے کنکر لگاتار برسائے ○ جو (کنکر) آپ کے رب کی طرف سے نشان زدہ تھے، اور یہ سزا ان ظالموں سے کچھ دُور نہ تھی۔ (ھود: ۸۳-۸۲)

قوم لوط کی بستی الٹنے کے متعلق روایات

محمد بن کعب القرظی نے کہا جن بستیوں میں قوم لوط رہتی تھی، حضرت جبریل ان کے نیچے اپنا پر رکھ کر ان بستیوں کو آسمان کی طرف لے کر چڑھ گئے حتیٰ کہ آسمان والوں نے کتوں کے بھونکنے اور مرغوں کی آوازیں سنیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر لگاتار نشان زدہ پتھر برسائے اور حضرت جبریل نے اس زمین کو الٹ دیا اور نیچے کا حصہ اوپر اور اوپر کا حصہ نیچے کر دیا، اور جن بستیوں کو پلٹا گیا تھا وہ پانچ تھیں: صیغہ، صغرہ، عمرہ، دوما اور سدوم، اور یہ سب سے بڑی بستی تھی۔

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ بدکاری کی مجلسیں برپا کرنے والوں، ان کی دعوت دینے والوں اور ان میں جانے والوں سب پر کنکریاں برسائی گئیں اور ان میں سے کوئی نہیں بچ سکا۔ (تفسیر امام ابی حاتم ج۶ ص۲۰۶۸-۲۰۶۷، رقم الحدیث: ۱۱۰۰۰، ۱۱۰۹۸، ۱۱۰۹۷)

سجیل کا معنی

مجاہد نے کہا: سجیل فارسی کا لفظ ہے، سنگ و گل یعنی پتھر اور کیچڑ۔ ابن زید نے کہا: سجیل آسمان دنیا کا نام ہے یعنی قوم لوط پر آسمان دنیا سے پتھر برسائے گئے۔ زجاج نے کہا سجیل کا معنی ہے بھیجی ہوئی، نیز زجاج نے کہا: سجل کتاب کو کہتے ہیں، اور یہ کنکریاں کیونکہ کتاب کی طرح لکھی ہوئی تھیں، اس لیے ان کو سجیل فرمایا۔ فراء نے کہا اس کا معنی ہے پکی ہوئی مٹی۔

(جامع البیان جز۱۲، ص۱۲۴-۱۲۲، ملخصاً، مطبوعہ بیروت)

علامہ ابو عبد اللہ مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں: النحاس نے کہا ہے سجیل کا معنی ہے جو سخت اور زیادہ ہو۔ ابو عبیدہ نے کہا: اس کا معنی ہے سخت' ان کے علاوہ وہ معانی لکھے ہیں جو ہم نے امام ابن جریر سے نقل کیے ہیں:
(الجامع لاحکام القرآن جز ۹' ص ۷۳' مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

قوم لوط کو سنگسار کرنے کے متعلق روایات

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ سزا ظالموں سے کچھ دور نہ تھی۔ حسن نے کہا: اس کا معنی ہے سنگسار کرنے کی سزا' ظالموں سے یعنی قوم لوط سے کچھ دور نہ تھی۔ مجاہد نے کہا اس سے کفار قریش کو ڈرایا ہے یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کی قوم کے ظالموں سے بھی یہ سزا کچھ بعید نہیں ہے۔ قتادہ اور عکرمہ نے کہا: اس امت کے ظالموں سے یہ سزا کچھ بعید نہیں ہے۔

پتھر برسانے کے متعلق دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ جب حضرت جبریل نے اس بستی کو اوپر اٹھایا تو اس پر پتھر برسائے گئے' دوسرا قول یہ ہے کہ یہ پتھر ان لوگوں پر برسائے گئے جو اس وقت بستیوں میں نہ تھے' بلکہ بستیوں سے باہر تھے۔

اس امت کو سنگسار کرنے کے متعلق روایات

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عنقریب میری امت میں ایسے لوگ ہوں گے کہ مرد مردوں سے جنسی لذت حاصل کریں گے اور عورتیں عورتوں سے' اور جب ایسا ہو تو تم ان پر قوم لوط کے عذاب کا انتظار کرنا کہ اللہ ان پر سجیل کی کنکریاں برسائے گا' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی: وما ھی من الظلمین ببعید۔

دوسری روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دن اور رات کا سلسلہ چلتا رہے گا حتی کہ اس امت کے مرد' مردوں کی پشت کو حلال کرلیں گے جیسا کہ انہوں نے عورتوں کی پشت کو حلال کرلیا ہے پھر امت کے ان لوگوں پر سنگ باری ہوگی۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۹' ص ۷۴' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

علامہ قرطبی کی ذکر کردہ یہ حدیثیں کسی کتاب میں نہیں مل سکیں البتہ امام ابن عساکر نے اس حدیث کو روایت کیا ہے:

حسن بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قوم لوط دس کاموں کی وجہ سے ہلاک کی گئی اور میری امت ان سے ایک کام زیادہ کرے گی۔ (وہ دس کام یہ ہیں:) (۱) مردوں کا مردوں سے جنسی خواہش پوری کرنا۔ (۲) غلیل مارنا۔ (۳) کنکر مارنا۔ (۴) حمام میں کھیلنا۔ (۵) دف بجانا۔ (۶) خمر (شراب) پینا۔ (۷) داڑھی کاٹنا۔ (۸) مونچھیں لمبی رکھنا۔ (۹) سیٹی اور تالی بجانا۔ (۱۰) ریشم پہننا۔ اور میری امت ایک کام اور زیادہ کرے گی' وہ ہے عورتوں کا عورتوں سے جنسی خواہش پوری کرنا۔ (مختصر تاریخ دمشق ج ۲۱' ص ۲۴۰' کنز العمال رقم الحدیث: ۱۳۰۱۴)

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ۗ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ

اور (ہم نے) مدین والوں کی طرف ان کے ہم قبیلہ شعیب کو بھیجا' انہوں نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو' تمہارے

مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْیَالَ وَالْمِیْزَانَ اِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ

لیے اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے' اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو' بے شک میں تم کو خوش حال

بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾

دیکھتا ہوں اور مجھے تم پر احاطہ کرنے والے دن کے عذاب کا خوف ہے ○

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ

اے میری قوم! انصاف کے ساتھ پوری پوری ناپ تول کرو، اور لوگوں کی چیزوں میں کمی

اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾ بَقِيَّتُ اللّٰهِ

نہ کرو اور زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ پھرو ○ اللہ کا جائز کیا ہوا نفع جو

خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾

تمہارے پاس بچ رہے وہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو اور میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں ○

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ

انہوں نے کہا اے شعیب! کیا آپ کی نماز آپ کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہم ان کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے باپ

اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ

دادا پرستش کرتے تھے اور ہم اپنے مالوں کو اپنی خواہش کے مطابق صرف کرنا چھوڑ دیں بے شک آپ تو بہت

الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي

بردبار اور راست باز ہیں ○ شعیب نے کہا اے میری قوم! یہ بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن

بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ

دلیل پر ہوں اور اس نے مجھ کو اپنے پاس سے عمدہ رزق عطا کیا ہو (تو میں اس کا حکم کیسے نہ مانوں!) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ

اُخَالِفَكُمْ اِلٰي مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ

جن کاموں سے میں تم کو منع کرتا ہوں میں خود اس کے خلاف کروں، میں تو صرف اپنی طاقت کے مطابق

مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ

اصلاح کرنا چاہتا ہوں اور میری توفیق صرف اللہ کی مدد سے ہے، میں نے اسی پر توکل کیا ہے اور

اِلَيۡهِ اُنِيۡبُ ﴿۸۸﴾

میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (ہم نے) مدین والوں کی طرف ان کے ہم قبیلہ شعیب کو بھیجا' انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لیے اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو' بے شک میں تم کو خوش حال دیکھتا ہوں اور مجھے تم پر احاطہ کرنے والے دن کے عذاب کا خوف ہے۔ (ھود: ۸۴)

ناپ اور تول میں کمی کرنے کی ممانعت

اس سورت میں انبیاء علیہم السلام کے جو قصص ذکر کیے گئے ہیں یہ ان میں سے چھٹا قصہ ہے' جو حضرت شعیب علیہ السلام سے متعلق ہے' حضرت شعیب علیہ السلام کا سوانحی خاکہ ہم نے الاعراف: ۸۵ میں تفصیل سے ذکر کر دیا ہے۔

مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کا نام ہے' پھر یہ حضرت شعیب کے قبیلہ کا نام پڑ گیا' اور اکثر مفسرین نے یہ کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے مدین نے اس شہر کی بنیاد ڈالی تھی۔

ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو سب سے پہلے یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ توحید کی دعوت دیں' اس لیے حضرت شعیب علیہ السلام نے سب سے پہلے یہ حکم دیا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لیے اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے' توحید کی دعوت دینے کے بعد ان کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ جو کام زیادہ اہم ہو اس کی دعوت دیں' کفر کے علاوہ ان کی بری عادت یہ تھی کہ جب کوئی شخص ان کے پاس کچھ بیچنے کے لیے آتا تو وہ تول میں اس سے اس چیز کو جتنا زیادہ لے سکتے' اتنا لے لیتے اور جب وہ خود کوئی چیز فروخت کرتے تو ناپ اور تول میں کمی کرتے تھے۔ سو یوں وہ خرید و فروخت دونوں میں دوسرے لوگوں کو نقصان پہنچاتے تھے' پھر حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا: میں تم کو خوش حال دیکھتا ہوں' یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو بہت فراوانی سے مال و دولت کے ساتھ نوازا ہے پھر تم کو ان ناجائز طریقوں سے مال و دولت جمع کرنے کی کیا ضرورت ہے' اس کے بعد فرمایا: مجھے تم پر احاطہ کرنے والے دن کے عذاب کا خوف ہے۔ احاطہ کرنا یا تو عذاب کی صفت ہے یعنی جس عذاب سے کوئی عذاب کا مستحق بچ نہیں سکے گا یا محیط اس دن کی صفت ہے' پھر یہ کون سا عذاب ہے؟ اس میں بھی اختلاف ہے' بعض علماء نے کہا اس سے مراد قیامت کے دن کا عذاب ہے کیونکہ یہی وہ دن ہے جو تمام معذبین کے عذاب کو محیط ہو گا اور بعض علماء نے کہا اس سے مراد وہ عذاب ہے جو حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے کافروں کو دنیا میں ملیامیٹ کرنے کے لیے آنے والا تھا جیسا کہ تمام انبیاء سابقین علیہم السلام کی امتوں کے کافر لوگوں پر ایسا عذاب آتا رہا ہے اور بعض مفسرین نے کہا اس عذاب سے مراد عام ہے خواہ وہ دنیاوی عذاب ہو یا قیامت کے دن کا عذاب ہو۔

انبیاء علیہم السلام کی دعوت دو اہم چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے: حقوق اللہ کی ادائیگی اور حقوق العباد کی ادائیگی۔ اول الذکر کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنے اس قول میں اشارہ کیا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو' اور ثانی الذکر کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنے اس قول میں اشارہ کیا اور ناپ تول میں کمی نہ کرو' اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپ تول میں کمی کرنا بہت قبیح جرم ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سورت ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے عذاب کی وعید سے معنون فرمائی ہے:

وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ ○ۙ الَّذِيۡنَ اِذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے عذاب ہے ○ جو

الناس یستوفون ○ واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون ○ الا یظن اولئک انھم مبعوثون ○ لیوم عظیم ○ یوم یقوم الناس لرب العلمین ○ (المطففین: ۶-۱)

لوگ جب لوگوں سے ناپ کرلیں تو پورا لیں ○ اور جب انہیں ناپ کردیں یا تول کردیں تو گھٹا کردیں ○ کیا وہ لوگ یہ گمان نہیں کرتے کہ ان کو مرنے کے بعد اٹھایا جائے گا ○ عظیم دن میں ○ جس دن سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیچنے والے کو یہ حکم دیا ہے کہ جب وہ کوئی چیز تول کر فروخت کرے تو سودے کا پلڑا جھکتا ہوا رکھے۔

حضرت سوید بن مخرمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں اور مخرمہ ہجر سے ایک بزاز کے پاس آئے، ہم نے ایک شلوار کی قیمت لگائی، اور میرے پاس ایک شخص تھا جو اُجرت پر وزن کرتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: وزن کرو اور جھکتا ہوا دو۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۳۳۶، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۱۴۳۴۱، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۷، ص ۵۸۵، مسند احمد ج ۴، ص ۳۵۲، سنن دارمی رقم الحدیث: ۲۵۸۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۳۰۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۲۲۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۵۱۴۷، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۶۴۶۶، المستدرک ج ۱، ص ۳۰، سنن النسائی رقم الحدیث: ۴۶۰۶)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (شعیب علیہ السلام نے کہا) اے میری قوم انصاف کے ساتھ پوری پوری ناپ تول کرو، اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو اور زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ پھرو ○ (ھود: ۸۵)

لوگوں کو نقصان نہ پہنچانے اور فساد نہ کرنے کے محامل

اس مقام پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ان آیتوں میں تکرار ہے، کیونکہ پہلی آیت میں فرمایا: اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو اور دوسری آیت میں فرمایا: انصاف کے ساتھ پوری پوری ناپ اور تول کرو، اور پھر اس آیت کے آخر میں فرمایا: اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو اور ان تینوں احکام کا ایک ہی معنی ہے۔ اس اعتراض کے حسب ذیل جوابات ہیں:

(۱) ناپ اور تول میں کمی کے حکم کی تاکید کے لیے اس حکم کو تین بار ذکر فرمایا۔

(۲) تکرار اس وقت ہوتا جب یہ حکم ایک ہی عنوان اور ایک ہی اعتبار سے کئی بار ذکر کیا جاتا، پہلی بار نہی (ممانعت) کے صیغہ سے فرمایا اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو اور دوسری بار صراحتاً امر کے صیغہ سے فرمایا: انصاف کے ساتھ پوری پوری ناپ اور تول کرو، اور جب صیغہ اور عنوان بدل گئے تو تکرار نہ رہا، اس جواب پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ کسی چیز کی ضد سے منع کرنا اس چیز کا حکم دینا ہے تو امر اور نہی کے صیغوں کے فرق کے باوجود تکرار سے مفر ممکن نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک چیز کے حکم اور اس کی ضد سے ممانعت کو مبالغتاً جمع کیا جاتا ہے جیسے کہتے ہیں کہ اللہ کی توحید پر ایمان لاؤ اور اس کے ساتھ شرک نہ کرو اور کہا جاتا ہے رشتہ داروں کے ساتھ مل جل کر رہو اور ان سے قطع تعلق نہ کرو، اسی طرح یہاں فرمایا ہے ناپ تول میں کمی نہ کرو اور پوری پوری ناپ تول کرو اور اس کے بعد بر سبیل عموم فرمایا: اور لوگوں کو نقصان نہ پہنچاؤ، اور لوگوں کو نقصان پہنچانا صرف ناپ اور تول میں کمی کرنے میں منحصر نہیں ہے، بلکہ کسی کی چوری کرنے، لوٹ مار کرنے، کسی کا مال غصب کرنے اور کسی کے ہاں ڈاکہ ڈالنے سے بھی کسی کو نقصان پہنچایا جاتا ہے، کسی کو سود پر قرض دینے، کسی کو بلیک میل کرنے، نقلی اور ملاوٹ والی اشیاء فروخت کرنے سے بھی کسی کو نقصان میں مبتلا کیا جاتا ہے اور یہ تمام صورتیں شرعاً ممنوع ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ یہ تین حکم تین مختلف عنوانوں سے دیئے گئے ہیں، اس لیے ان آیتوں میں تکرار نہیں ہے۔

اس کے بعد فرمایا: "اور زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ پھرو۔" اس کے کئی محمل ہیں:
جو شخص کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا تو وہ دوسرا شخص بھی اس کو نقصان پہنچانے کی سعی کرے گا تو کسی شخص کو نقصان پہنچانا دراصل خود اپنے آپ کو نقصان پہنچانا ہے' اس کا دوسرا محمل یہ ہے کہ تم اپنی دنیا اور آخرت کی بھلائی' صلاح اور فلاح کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرو اور اس کا تیسرا محمل یہ ہے کہ تم اپنے دین کی مصلحتوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرو اور اس کا ایک واضح محمل یہ ہے کہ ناپ اور تول میں کمی کرنا زمین میں فساد پھیلانا ہے کیونکہ جب بیچنے والا ناپ اور تول میں کمی کرے گا تو خریدار جب اس کمی پر مطلع ہو گا تو وہ لازمی طور پر اس سے جھگڑا کرے گا اور بعض اوقات یہ جھگڑا فساد اور قتل و غارت پر منتج ہو گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ کا جائز کیا ہوا نفع جو تمہارے پاس بچ رہے' وہی تمہارے لیے بہتر ہے' اگر تم ایمان رکھتے ہو' اور میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں○ (ھود: ۸۶)

بقیۃ اللہ کا معنی

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:
مجاہد نے کہا بقیۃ اللہ سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی اطاعت' یعنی تم جو ناپ تول میں کمی کر کے مال جمع کر رہے ہو' اس سے یہ بہتر ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اس کا ثواب تمہارے پاس ہمیشہ باقی رہے گا۔

قتادہ نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جو حصہ مقدر کر دیا ہے' یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا میں تمہیں جو مال دیا ہے تم صرف اسی پر قناعت کرو' وہی تمہارے لیے بہتر ہے یا تمہارے لیے تمہاری عبادتوں کا جو ثواب مقدر کر دیا ہے وہی تمہارے لیے بہتر ہے' اس لیے ناپ تول میں کمی کر کے مال جمع کرنے کے بجائے اس مال پر قناعت کرو جو تمہاری تقدیر میں ہے' کیونکہ جب لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ فلاں شخص صادق اور امین ہے اور وہ خیانت کرتا ہے نہ ناپ تول میں کمی کرتا ہے تو لوگ اس پر اعتماد کریں گے اور تمام معاملات میں اس کی طرف رجوع کریں گے تو اس پر رزق کے دروازے کھل جائیں گے' اور جب کوئی شخص بددیانتی اور خیانت میں مشہور ہو گا تو لوگ اس سے معاملہ نہیں کریں گے اور اس پر رزق کے دروازے بند ہو جائیں گے اور اگر بقیۃ اللہ کو ثواب پر محمول کیا جائے تو مطلب بالکل واضح ہے کیونکہ یہ ساری دنیا فنا ہو جائے گی اور ختم ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ثواب باقی رہے گا اور اگر بقیۃ اللہ سے مراد' اللہ کی رضا لی جائے تو ظاہر ہے کہ اس کی رضا سے بڑھ کر دنیا اور آخرت کی کوئی نعمت نہیں ہے۔ (جامع البیان جز ۱۲' ص ۱۳۲' ۱۳۱' موضحاً' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

اس آیت کا واضح معنی یہ ہے کہ پوری پوری ناپ تول کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جو حلال نفع باقی رکھا ہے وہ اس مال سے بہتر ہے جو تم ناپ تول میں کمی کر کے حاصل کرتے ہو۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا: میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں' اس کا معنی یہ ہے کہ میں نے تم کو نیکی کی ہدایت دی ہے اور ایمان داری اور دیانت داری کی تلقین کی ہے اور تم سے اس بری عادت کو چھڑانے اور تم کو دیانت دار بنا دینے کی مجھ میں قدرت نہیں ہے' اور اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ ناپ اور تول میں کمی کرنے اور بے ایمانی کرنے سے' اللہ تعالیٰ کی نعمتیں زائل ہو جاتی ہیں تو اگر تم نے یہ بری عادتیں نہ چھوڑیں تو تمہارے پاس جو اللہ کی نعمتیں ہیں وہ زائل ہو جائیں گی اور اس صورت میں' میں تمہاری نعمتوں کی حفاظت پر قادر نہیں ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انہوں نے کہا اے شعیب! کیا آپ کی نماز آپ کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہم ان کو چھوڑ دیں جن

کی ہمارے باپ دادا پرستش کرتے تھے اور ہم اپنے مالوں کو اپنی خواہش کے مطابق صرف کرنا چھوڑ دیں، بے شک آپ تو بہت بُردبار اور راست باز ہیں ○ (ھود: ۸۷)

حضرت شعیب علیہ السلام کے وعظ کی تشریح

حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو دو چیزوں کا حکم دیا تھا: ایک حکم یہ دیا تھا کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں اور شرک نہ کریں اور دوسرا حکم یہ دیا تھا کہ وہ ناپ اور تول میں کمی نہ کریں۔ پہلے حکم کا انہوں نے یہ جواب دیا کہ کیا ہم ان کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے باپ دادا پرستش کرتے تھے اور اس سے ظاہر ہوا کہ ان کا بت پرستی کرنا باپ دادا کی اندھی تقلید پر مبنی تھا اور حضرت شعیب علیہ السلام کے دوسرے حکم کا انہوں نے یہ جواب دیا کہ کیا ہم اپنے مالوں کو اپنی خواہش کے مطابق خرچ نہ کریں۔

اس آیت میں ذکر فرمایا ہے کہ کیا آپ کی صلوٰۃ ہمیں یہ حکم دیتی ہے؟ صلوٰۃ سے اس آیت میں کیا مراد ہے، ایک قول یہ ہے کہ صلوٰۃ سے مراد دین اور ایمان ہے کیونکہ دین اور ایمان کا سب سے واضح اظہار نماز کے ذریعہ ہوتا ہے اس لیے صلوٰۃ دین اور ایمان سے کنایہ ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ صلوٰۃ سے مراد یہی معروف نماز ہے۔ روایت ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام بہت زیادہ نماز پڑھتے تھے اور ان کی قوم کے کفار جب ان کو نماز پڑھتے دیکھتے تو ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتے اور ہنستے اور حضرت شعیب علیہ السلام کا مذاق اڑاتے۔

انہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام سے کہا آپ بہت بردبار اور راست باز ہیں۔ یہ انہوں نے طنزاً کہا تھا کیونکہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام کو بے وقوف اور جاہل سمجھتے تھے، یہ ایسا ہے جیسے کوئی انتہائی بخیل اور خسیس شخص کو دیکھ کر کہے اگر حاتم بھی تم کو دیکھ لیتا تو تم کو سجدہ کرتا، سو اسی معنی میں انہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کو حلیم اور رشید کہا۔ اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ ان لوگوں میں پہلے یہ مشہور تھا کہ حضرت شعیب علیہ السلام حلیم اور رشید ہیں، اور جب حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو یہ حکم دیا کہ اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ عبادت کو ترک کر دیں تو وہ بہت حیران ہوئے اور انہوں نے کہا آپ تو بہت حلیم اور رشید ہیں، آپ ہمیں کیسے یہ حکم دیتے ہیں کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ کو ترک کر دیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: شعیب نے کہا: اے میری قوم! یہ بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھ کو اپنے پاس سے عمدہ رزق عطا کیا ہو (تو میں اس کا حکم کیسے نہ مانوں!) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جن کاموں سے میں تم کو منع کرتا ہوں، میں خود اس کے خلاف کروں، میں تو صرف اپنی طاقت کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہوں، اور میری توفیق صرف اللہ کی مدد سے ہے، میں نے اسی پر توکل کیا ہے اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں ○ (ھود: ۸۸)

قوم کے سامنے حضرت شعیب علیہ السلام کی تقریر

حضرت شعیب نے فرمایا: یہ بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو علم، ہدایت، دین اور نبوت سے سرفراز فرمایا تھا اور فرمایا: اس نے مجھ کو اپنے پاس سے عمدہ رزق عطا فرمایا ہو، اس میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت زیادہ حلال مال عطا فرمایا تھا۔ اس آیت میں شرط کا ذکر ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے اور اس کا معنی اس طرح ہے کہ یہ بتاؤ کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام روحانی اور جسمانی کمالات عطا کئے ہیں تو پھر کیا میرے لیے یہ جائز ہے کہ میں اس کی وحی میں خیانت کروں اور اس کا پیغام تم تک نہ پہنچاؤں اور مجھے یہ کس طرح زیبا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس قدر کثیر نعمتیں عطا فرمائے اور میں اس کے حکم کی خلاف ورزی کروں اور اس کا معنی یوں بھی ہو سکتا ہے کہ جب میرے

نزدیک یہ ثابت ہے کہ غیر اللہ کی عبادت میں مشغول ہونا اور ناپ و تول میں کمی کرنا ایک ناجائز کام ہے اور میں تمہاری اصلاح کا طالب ہوں اور میں تمہارے مال کا محتاج بھی نہیں ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بکثرت عمدہ رزق دے کر تم سے مستغنی کیا ہوا ہے تو ان حالات میں کیا میرے لیے جائز ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی وحی میں خیانت کروں اور اس کا حکم نہ مانوں! پھر فرمایا: اور میری توفیق صرف اللہ کی مدد سے ہے، میں نے صرف اسی پر توکل کیا ہے اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں! اس قول سے حضرت شعیب علیہ السلام نے یہ بتایا کہ تمام نیک اعمال میں حضرت شعیب علیہ السلام کا توکل اور اعتماد صرف اللہ عزوجل کی ذات پر ہے۔

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ

اور اے میری قوم! میری مخالفت تم کو ان کاموں پر نہ ابھارے جن کاموں کی وجہ سے تم پر ایسا عذاب آ جائے

قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ

جیسا عذاب قوم نوح پر یا قوم ہود پر یا قوم صالح پر آیا تھا اور قوم لوط تم سے

بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ

زیادہ دور تو نہیں ○ اور تم اپنے رب سے استغفار کرو پھر اس کی طرف توبہ کرو، بے شک میرا رب رحم فرمانے والا

وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ

محبت کرنے والا ہے ○ کافروں نے کہا اے شعیب تمہاری اکثر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، اور بلاشبہ ہم سمجھتے ہیں تم

فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۡ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا

ہم میں کمزور ہو، اور اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر چکے ہوتے اور تم ہم پر کوئی

بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَ

بھاری نہیں ہو ○ شعیب نے کہا اے میری قوم! کیا تمہارے نزدیک میرا قبیلہ اللہ سے زیادہ طاقت ور ہے، اور

اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاۗءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۹۲﴾

تم نے اللہ کو بالکل نظر انداز کیا ہوا ہے۔ بے شک میرا رب تمہارے تمام کاموں کا احاطہ کرنے والا ہے ○

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ

اور اے میری قوم! تم اپنی جگہ کام کرتے رہو اور میں اپنا کام کرنے والا ہوں، عنقریب تم جان لو گے

مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ

کس کے پاس ایسا عذاب آئے گا جو اس کو رسوا کر دے گا اور کون جھوٹا ہے تم (بھی) انتظار کرو اور میں بھی تمہارے

مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿٩٣﴾ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ

ساتھ انتظار کرنے والا ہوں ○ اور جب ہمارا عذاب آ گیا تو ہم نے شعیب کو اپنی رحمت سے بچا لیا اور ان لوگوں کو (بھی)

اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ

جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے، اور ظالموں کو ایک زبردست چنگھاڑ نے پکڑ لیا تو وہ

فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٩٤﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا

اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل اوندھے پڑے رہ گئے ○ گویا وہ ان گھروں میں کبھی آباد ہی نہ ہوئے تھے سنو

بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿٩٥﴾ ع

دھتکار ہو اہل مدین کے لیے جیسے پھٹکار تھی ثمود کے لیے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (حضرت شعیب نے کہا) اور اے میری قوم! میری مخالفت تم کو ان کاموں پر نہ ابھارے جن کاموں کی وجہ سے تم پر ایسا عذاب آ جائے جیسا عذاب قوم نوح پر یا قوم ہود پر یا قوم صالح پر آیا تھا اور قوم لوط تم سے زیادہ دور تو نہیں ○ اور تم اپنے رب سے استغفار کرو پھر اس کی طرف توبہ کرو، بے شک میرا رب رحم فرمانے والا محبت کرنے والا ہے ○

(ھود: ٩٠-٨٩)

حضرت شعیب علیہ السلام کے خطاب کا تتمہ اور قوم کو نصیحت

ان آیتوں کا معنی یہ ہے کہ حضرت شعیب نے فرمایا: اے میری قوم! میرا بغض اور مجھ سے عداوت اور میرے دین سے نفرت تمہیں اس پر نہ ابھارے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر اور بت پرستی اور ناپ تول میں کمی کرنے اور توبہ اور استغفار کو ترک کرنے پر جمے رہو اور ڈٹے رہو حتیٰ کہ تم پر بھی ایسا عذاب آ جائے جو تم کو جڑ سے اکھاڑ کر ملیامیٹ کر دے جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر طوفان سے غرق کرنے کا عذاب آیا اور حضرت ھود علیہ السلام کی قوم پر ایک سخت اور زبردست آندھی کا عذاب آیا اور حضرت صالح علیہ السلام کی قوم پر ایک چنگھاڑ اور زلزلہ کا عذاب آیا اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے اوپر ان کی زمین کو پلٹ دیا گیا۔

اور فرمایا: اور قوم لوط تم سے زیادہ دور تو نہیں۔ اس سے بُعد مکانی مراد ہے کیونکہ لوط علیہ السلام کی بستی مدین کے قریب تھی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے بُعد زمانی مراد ہو، کیونکہ حضرت شعیب علیہ السلام کے زمانہ میں لوگوں کو معلوم تھا کہ کچھ عرصہ پہلے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو ہلاک کر دیا گیا تھا، ہر صورت میں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب آنے کا واقعہ ان سے مخفی نہیں تھا، اس لیے حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: تم ان حالات سے عبرت پکڑو اور سبق سیکھو

اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ السلام کی مخالفت کرنے سے گریز کرو ورنہ تم پر بھی پچھلی قوموں کی طرح عذاب آ جائے گا۔

اس کے بعد فرمایا: تم اپنے رب سے استغفار کرو پھر اس کی طرف توبہ کرو یعنی پہلے اپنے کفر اور شرک، ناپ تول میں کمی اور دیگر گناہوں پر نادم ہو کر ان کو ترک کرو اور آئندہ ان کو نہ کرنے کا عہدِ صمیم کرو، پھر اپنے سابقہ کفر اور معاصی کی اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے سابقہ کفر کو اور معاصی کو معاف فرما دے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ بہت رحیم اور کریم ہے اور توبہ اور استغفار کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کا یہ خطاب بہت مرتب اور منظم ہے، انہوں نے سب سے پہلے یہ بیان کیا کہ ان کی نبوت کے دلائل بہت روشن اور واضح ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر قسم کی ظاہری اور باطنی نعمتیں بہت وافر تعداد میں عطا فرمائی ہیں، اور یہ چیز ان کو اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچانے میں تقصیر کرنے اور خیانت سے مانع ہے اور یہ بیان کیا کہ وہ مسلسل پابندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کر رہے ہیں اور تم کو بھی یہ اعتراف ہے کہ میں بہت بُردبار اور نیک ہوں سو اگر دین کی یہ دعوت باطل ہوتی تو میں ہرگز اس میں مشغول نہ ہوتا، پھر فرمایا: تم مجھ سے جو عداوت رکھتے ہو اور میرے طریقہ کی مخالفت کرتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری یہ عداوت اور مخالفت تم کو پچھلی قوموں کی طرح عذاب سے دوچار کر دے، آخر میں ان کو پھر عذاب سے ڈرایا اور توبہ اور استغفار کرنے اور ایمان لانے کی دعوت دی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کافروں نے کہا اے شعیب! تمہاری اکثر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، اور بلاشبہ ہم سمجھتے ہیں تم ہم میں کمزور ہو، اور اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر چکے ہوتے اور تم ہم پر کوئی بھاری نہیں ہو○ (ھود: ۹۱)

فقہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہا: مانفقہ کثیرا اور نفقہ فقہ سے بنا ہے اس لیے ہم یہاں فقہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی ذکر کر رہے ہیں:

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

حاضر کے علم سے غائب کے علم تک پہنچنا فقہ ہے اور فقہ علم سے اخص ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا۔ (النساء: ۷۸) اس قوم کو کیا ہوا کہ یہ لوگ بات سمجھنے کے قریب بھی نہیں آتے۔

اور اصطلاح میں احکامِ شرعیہ کا (دلائل کے ساتھ) علم فقہ ہے، اور فقہ کا معنی دین کی فہم ہے۔

(المفردات ج ۲ ص ۴۹۶، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

علامہ المبارک بن محمد الاثیر الجزری المتوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

فقہ کا اصل معنی ہے فہم۔ یہ لفظ شق کرنے اور (فتح) کھولنے سے ماخوذ ہے (یعنی کسی چیز کو شق کر کے اس کی گہرائی تک پہنچنا یا کسی گرہ کو کھولنا) عرف میں فقہ علمِ شریعت کو کہتے ہیں، اور یہ احکامِ شرعیہ فرعیہ کے ساتھ خاص ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے دعا فرمائی:

اللھم فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل۔ اے اللہ! اس کو دین کی سمجھ عطا فرما اور اس کو تاویل کا

علم عطا فرما۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۴۳، صحیح مسلم، فضائل الصحابہ: ۱۳۸، مسند احمد ج ۱ ص ۲۶۶)

(النہایہ ج ۳ ص ۴۱۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۸ھ)

علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں:

اصطلاح میں فقہ کا معنی ہے احکام شرعیہ فرعیہ کا وہ علم جو تفصیلی دلائل سے حاصل کیا گیا ہو۔ حسن بصری نے کہا: فقیہ وہ شخص ہے جو دُنیا میں رغبت نہ کرے اور آخرت میں رغبت کرے، دین پر بصیرت رکھتا ہو، اور دائماً اپنے رب کی عبادت کرتا ہو۔ (امام اعظم سے منقول ہے کہ نفس کا اپنے نفع اور ضرر کی چیزوں کو پہچان لینا فقہ ہے)

(عمدۃ القاری جز ۲ ص ۵۱، مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر، ۱۳۴۸ھ)

کفار حضرت شعیب علیہ السلام کی باتوں کو کیوں نہیں سمجھتے تھے

اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے ان کی زبان میں گفتگو کی تھی، پھر کیا وجہ ہے کہ انہوں نے کہا: تمہاری اکثر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، اس اعتراض کے حسبِ ذیل جوابات ذکر کیے گئے ہیں:

(۱) چونکہ وہ لوگ حضرت شعیب علیہ السلام سے بہت سخت متنفر تھے، اس لیے وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی باتوں کو غور سے نہیں سنتے تھے اسی وجہ سے وہ ان باتوں کو نہیں سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے کافروں کے متعلق بھی اسی طرح فرمایا ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ۔ (الانعام: ۲۵)

اور ان میں سے بعض آپ کی طرف کان لگاتے ہیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ (آپ کے کلام کو) نہ سمجھیں۔

(۲) وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی باتوں کو سمجھتے تھے لیکن وہ ان کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور توہین اور تحقیر کی نیت سے کہتے تھے ہم آپ کی باتوں کو نہیں سمجھتے۔

(۳) ان کا مقصود یہ تھا کہ آپ نے توحید، رسالت، بعثت، ناپ تول میں کمی کرنے اور دیگر گناہوں کو ترک کرنے کے متعلق جو دلائل ذکر کیے ہیں، وہ ان کے نزدیک ناکافی ہیں اور وہ ان سے مطمئن نہیں ہیں۔

سعید بن جبیر اور شریک نے کہا کہ ان کی قوم نے ان کو ضعیف اس لیے کہا کہ وہ نابینا تھے۔ سفیان نے کہا: ان کی نظر کمزور تھی اور ان کو خطیب الانبیاء کہا جاتا تھا۔

انہوں نے کہا: اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیتے، اس کی تفسیر میں بعض مفسرین نے کہا: یعنی تم کو قتل کر دیتے یا تم کو گالیاں دیتے۔ (جامع البیان جز ۱۲ ص ۱۳۸، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حضرت شعیب علیہ السلام کے دلائل کے جواب میں ان کی قوم کے کافروں نے جو کچھ کہا وہ حضرت شعیب علیہ السلام کے دلائل کا جواب نہ تھا، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص فریقِ مخالف کے دلائل کے جواب سے عاجز آ کر اس کو گالیاں دینا شروع کر دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: شعیب نے کہا: اے میری قوم! کیا تمہارے نزدیک میرا قبیلہ اللہ سے زیادہ طاقت ور ہے،

اور تم نے اللہ کو بالکل نظر انداز کیا ہوا ہے' بے شک میرا رب تمہارے تمام کاموں کا احاطہ کرنے والا ہے ○ (ھود: ۹۲)

جب کفار نے حضرت شعیب علیہ السلام کو ایذاء پہنچانے اور قتل کرنے کی دھمکی دی تو حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو یہ جواب دیا' اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تم نے میرے قبیلہ کی رعایت کر کے مجھے چھوڑ دیا اور مجھے قتل کرنے سے باز رہے' جب کہ میرے قبیلہ کی رعایت کے بجائے تمہیں اللہ کی رعایت کرنی چاہیے تھی اور تم نے اللہ تعالیٰ کو اس طرح نظر انداز کر دیا جس طرح کوئی شخص کسی بے کار چیز کو اپنے پسِ پشت ڈال دیتا ہے! پھر کہا:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اے میری قوم! تم اپنی جگہ کام کرتے رہو اور میں اپنا کام کرنے والا ہوں' عنقریب تم جان لو گے کس کے پاس ایسا عذاب آئے گا جو اس کو رُسوا کر دے گا اور کون جھوٹا ہے' تم (بھی) انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں ○ (ھود: ۹۳)

یعنی تم جو کچھ کر رہے ہو وہ کرتے رہو' تم اپنے کفر اور ظلم پر کاربند رہو اور میں تم کو ان کاموں سے حسبِ سابق منع کرتا رہوں گا اور میں نے تم کو جس عذاب کی خبر دی ہے' تم بھی اس کا انتظار کرو اور تمہارے ساتھ میں بھی اس کا انتظار کرتا رہوں گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب ہمارا عذاب آ گیا تو ہم نے شعیب کو اپنی رحمت سے بچا لیا اور ان لوگوں کو (بھی) جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے' اور ظالموں کو ایک زبردست چنگھاڑ نے پکڑ لیا تو وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل اوندھے پڑے رہ گئے ○ گویا وہ ان گھروں میں کبھی آباد ہی نہ ہوئے تھے' سنو دھتکار ہو اہلِ مدین کے لیے جیسے پھٹکار تھی ثمود کے لیے ○ (ھود: ۹۵-۹۴)

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر عذاب کی تفصیل

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے صرف دو قوموں پر ایک قسم کا عذاب نازل کیا ہے' قوم صالح پر اور قومِ شعیب پر' ان دونوں کو ایک زبردست چنگھاڑ نے ہلاک کر دیا' رہی قومِ صالح تو اس پر نیچے سے ایک چنگھاڑ کی آواز آئی اور رہی قومِ شعیب تو اس پر اس کے اوپر سے ایک چنگھاڑ کی آواز آئی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے عذاب سے نجات دی' اس سے معلوم ہوا کہ بندہ کو جو نعمت بھی پہنچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے پہنچتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مومنوں تک یہ رحمت ان کے ایمان اور ان کے نیک اعمال کے سبب سے پہنچی ہو لیکن ایمان اور نیک اعمال کی توفیق بھی اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ملتی ہے۔

جب جبرئیل علیہ السلام نے وہ گرج دار چیخ ماری تو ان میں سے ہر ایک کی رُوح اسی وقت نکل گئی اور ان میں سے ہر شخص اسی وقت اور اسی حال میں مر گیا اور یوں لگتا تھا جیسے ان مکانوں میں کبھی کوئی شخص رہا ہی نہ تھا۔

پھر فرمایا: ان پر دُھتکار ہو جیسے قومِ ثمود پر پھٹکار تھی' یعنی جس طرح وہ رحمت سے مطلقاً دُور کر دیئے گئے تھے اسی طرح ان کو بھی رحمت سے مطلقاً دُور کر دیا گیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ

اور بے شک ہم نے موسیٰ کو اپنی آیتوں اور روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا تھا ○ فرعون اور

وَمَلَاۡئِهٖ فَاتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ فِرۡعَوۡنَ ۚ وَمَاۤ اَمۡرُ فِرۡعَوۡنَ بِرَشِيۡدٍ ﴿۹۷﴾

اس کے سرداروں کی جانب تو انہوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی، اور فرعون کا کوئی کام صحیح نہ تھا ○

يَقۡدُمُ قَوۡمَهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَاَوۡرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئۡسَ

وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا اور ان کو دوزخ میں ٹھہرائے گا اور وہ کیسی بری

الۡوِرۡدُ الۡمَوۡرُوۡدُ ﴿۹۸﴾ وَاُتۡبِعُوۡا فِىۡ هٰذِهٖ لَعۡنَةً وَّيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ بِئۡسَ

پیاس بجھانے کی جگہ ہے ○ اس دنیا میں بھی لعنت ان کے پیچھے لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی ان کو کیسا

الرِّفۡدُ الۡمَرۡفُوۡدُ ﴿۹۹﴾ ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيۡكَ

برا انعام دیا گیا ○ یہ ان بستیوں کی بعض خبریں ہیں جن کا قصہ ہم آپ کو بیان کر رہے ہیں ان میں سے

مِنۡهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيۡدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمۡنٰهُمۡ وَلٰـكِنۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ

بعض تو موجود ہیں اور بعض نیست و نابود ہو گئیں ○ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن خود انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا،

فَمَاۤ اَغۡنَتۡ عَنۡهُمۡ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِىۡ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ

سو اللہ کے سوا وہ جن معبودوں کی پرستش کرتے تھے، جب اللہ کا عذاب آ گیا تو وہ ان کے

مِنۡ شَىۡءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمۡرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوۡهُمۡ غَيۡرَ تَتۡبِيۡبٍ ﴿۱۰۱﴾

کسی کام نہ آ سکے اور انہوں نے ان کی ہلاکت کے سوا کوئی اضافہ نہیں کیا ○

وَكَذٰلِكَ اَخۡذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الۡقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخۡذَهٗۤ

اور آپ کے رب کی گرفت اسی طرح ہوتی ہے، جب وہ بستیوں پر اس حال میں گرفت کرتا ہے کہ وہ ظلم کر رہی ہوتی ہیں، بے شک اس کی

اَلِيۡمٌ شَدِيۡدٌ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنۡ خَافَ عَذَابَ الۡاٰخِرَةِ ؕ

گرفت دردناک شدید ہے ○ جو شخص عذاب آخرت سے ڈرتا ہو اس کے لیے بے شک اس میں نشانی ہے،

ذٰلِكَ يَوۡمٌ مَّجۡمُوۡعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوۡمٌ مَّشۡهُوۡدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا

یہ وہ دن ہے جس میں سب لوگ جمع ہوں گے اور اسی دن سب حاضر ہوں گے ○ ہم

نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ یَوْمَ یَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا

اس دن کو مدت معین تک کے لیے مؤخر کر رہے ہیں ○ جب وہ دن آئے گا تو کوئی شخص اللہ کی اجازت کے بغیر بات

بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّ سَعِیْدٌ ﴿۱۰۵﴾ فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی

نہیں کر سکے گا، بعض ان میں سے بدبخت ہوں گے اور بعض نیک بخت ○ رہے بدبخت لوگ تو وہ دوزخ میں ہوں

النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ ﴿۱۰۶﴾ لا خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ

گے اور ان کے لیے اس میں چیخنا اور چلانا ہو گا ○ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے جب تک

السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا

آسمان اور زمین رہیں گے مگر جتنا آپ کا رب چاہے بے شک آپ کا رب جو بھی ارادہ کرتا ہے اس کو خوب پورا کرنے

یُرِیْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا

والا ہے ○ اور رہے وہ لوگ جو نیک بخت ہیں تو وہ جنت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، جب تک

دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾

آسمان اور زمین رہیں گے، مگر جتنا آپ کا رب چاہے: یہ غیر منقطع عطا ہے ○

فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّمَّا یَعْبُدُ هٰۤؤُلَآءِ ؕ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا یَعْبُدُ

اے مخاطب! جن معبودوں کی یہ لوگ عبادت کرتے ہیں تم ان کے متعلق کسی شک میں نہ پڑنا، یہ ان کی محض اسی طرح عبادت کرتے

اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ غَیْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾ ع ۹

جس طرح اس سے پہلے ان کے آباء و اجداد عبادت کرتے تھے اور بے شک ہم ان کو ان کا پورا پورا حصہ دیں گے جس میں کوئی کمی نہیں ہو گی ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بے شک ہم نے موسیٰ کو اپنی آیتوں اور روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا تھا ○ (هود: ۹۶)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے جو قصص بیان فرمائے ہیں ان میں سے یہ ساتواں اور آخری قصہ ہے۔

اس آیت میں آیات کا لفظ ذکر فرمایا ہے، اس سے مراد تورات کی آیتیں ہیں جو شرائع اور احکام پر مشتمل ہیں اور سلطان مبین کا لفظ ذکر فرمایا ہے، اس سے مراد کھلے ہوئے اور روشن معجزات ہیں مثلاً عصا اور ید بیضاء، کیونکہ یہ حضرت

موسیٰ علیہ السلام کے بہت مشہور معجزے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نو کھلے ہوئے معجزے عطا فرمائے تھے: (۱) عصا۔ (۲) یدِ بیضاء۔ (۳) طوفان۔ (۴) ٹڈیاں۔ (۵) جوئیں۔ (۶) مینڈک۔ (۷) خون۔ (۸) پیداوار میں کمی۔ (۹) جانوں میں کمی، بعض مفسرین نے پیداوار اور جانوں میں کمی کی جگہ پہاڑ کو سائبان کی طرح اوپر اٹھالینا اور سمندر کو چیرنا شمار کیا ہے، ان معجزات کو سلطان مبین اس لیے فرمایا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے صدق پر روشن دلیل تھے۔

سلطان کا معنی اور علماء کی سلطنت کا بادشاہوں کی سلطنت سے زیادہ قوی ہونا

علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ نے لکھا ہے: یہ لفظ تسلط سے بنا ہے، تسلط کا معنی ہے کسی چیز پر غالب آنا، قادر ہونا، قابض ہونا، اس لیے حجت اور قوی دلیل کو سلطان کہتے ہیں کیونکہ قوی اور مضبوط دلیل کا لوگوں پر غالب اثر ہوتا ہے۔

(المفردات ج ۱ ص ۳۱۴، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

اس میں اختلاف ہے کہ حجت کو سلطان کیوں کہا جاتا ہے، بعض محققین نے کہا: جس شخص کے پاس حجت ہوتی ہے وہ اس شخص پر غالب آجاتا ہے جس کے پاس حجت نہیں ہوتی، جیسا کہ سلطان (بادشاہ) اپنے عوام پر غالب اور قاہر ہوتا ہے، اس وجہ سے حجت کو سلطان کہتے ہیں۔ زجاج نے کہا: سلطان کا معنی حجت ہے اور سلطان (بادشاہ) کو سلطان اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ زمین پر اللہ کی حجت ہے اور ایک قول یہ ہے کہ سلطان کا معنی تسلط ہے، علماء اپنی قوتِ علمیہ کے اعتبار سے سلاطین ہیں اور بادشاہ اپنی قوتِ حاکمہ اور قدرتِ نافذہ کے اعتبار سے سلاطین ہیں، البتہ علماء کی سلطنت اور ان کا تسلط بادشاہوں اور حکام کی سلطنت اور ان کے تسلط سے زیادہ قوی اور زیادہ کامل ہے، کیونکہ بادشاہ ملک بدر اور معزول ہوتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں اس کی مثال افغانستان کے بادشاہ ظاہر شاہ اور ایران کا بادشاہ رضاشاہ پہلوی ہے، یہ بادشاہت پر قائم رہنے کے کچھ عرصہ بعد معزول کردیئے گئے پھر ان کی سلطنت ختم ہوگئی اور جمہوری ملکوں میں اس کی مثال بے نظیر بھٹو اور نواز شریف ہیں۔ تین، تین سال حکومت کرنے کے بعد ان کو معزول کردیا گیا پھر ان کا تسلط اور اقتدار ختم ہوگیا، اس کے برخلاف علماء کا تسلط اور اقتدار تاحیات برقرار رہتا ہے اور عوام ان کے احکام پر عمل کرتے رہتے ہیں، بلکہ میں کہتا ہوں کہ علماء کی سلطنت مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔ امام ابوحنیفہ متوفی ۱۵۰ھ، امام ابویوسف متوفی ۱۸۲ھ، امام محمد متوفی ۱۸۹ھ، علامہ سرخسی متوفی ۴۸۳ھ، علامہ کاسانی متوفی ۵۸۷ھ، علامہ مرغینانی متوفی ۵۹۳ھ، علامہ ابن ہمام متوفی ۸۶۱ھ، علامہ ابن نجیم متوفی ۹۷۰ھ، علامہ ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ، اعلیٰ حضرت بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ اور مولانا امجد علی متوفی ۱۳۷۶ھ کے فتاویٰ اور ان کے احکام پر مسلمان صدیوں سے عمل کررہے ہیں اور ہر دور میں جب بھی بادشاہوں کے احکام شریعت کے خلاف ہوئے تو مسلمانوں نے بادشاہوں کے احکام کے خلاف علماء کے احکام پر عمل کیا۔ جہانگیر نے حکم دیا تھا کہ اس کو سجدۂ تعظیم کیا جائے، حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے حکم دیا کہ یہ سجدہ نہ کیا جائے اور مسلمانوں نے حضرت مجدد کے حکم پر عمل کیا۔ آج جہانگیر کے لیے کلمہ خیر کہنے والا کوئی نہیں ہے اور حضرت مجدد کے جاں نثار لاکھوں کی تعداد میں تمام رُوئے زمین میں پھیلے ہوئے ہیں، اور ہمارے دور میں اس کی واضح مثال یہ ہے کہ حکومت نے عائلی قوانین کو نافذ کیا ہوا ہے جس کی اکثر دفعات کو علماء نے مسترد کردیا ہے مثلاً تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دینا، یتیم پوتے کو وارث بنانا اور ان احکام میں مسلمان حکومت کے قوانین پر عمل نہیں کرتے بلکہ علماء کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں اس وقت کے صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان کے عہدِ حکومت میں ۲۹ روزوں کے بعد عید کا اعلان کردیا گیا، علماء کے نزدیک یہ اعلان صحیح نہیں تھا کیونکہ پورے ملک میں کسی جگہ بھی چاند نہیں دیکھا گیا تھا اور مطلع صاف تھا، اس لیے علماء نے اگلے دن روزہ رکھنے کا حکم دیا اور عید منانے سے منع کردیا اور مسلمانوں کی اکثریت نے علماء کے

حکم پر عمل کیا' اس سے معلوم ہوا کہ علماء ہی حقیقی سلطان ہیں اور حیات اور بعد از حیات ان ہی کی حکومت ہے اور ان ہی کا تسلط ہے' اور علماء سے ہماری مراد وہ علماء ہیں جن کو شہر میں صاحب فتویٰ ہونے کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہو' اور جتنا بڑا عالم ہو گا اس کی سلطنت کا دائرہ اتنا وسیع ہو گا' مساجد کے عام ائمہ اور خطباء کو بھی بہرحال جزوی سلطنت حاصل ہوتی ہے اور مسلمان اپنے روز مرہ کے دینی اور دنیاوی معاملات میں ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں' البتہ کسی پیچیدہ اور مشکل مسئلہ میں کسی بڑے عالم اور مفتی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

آیت' سلطان اور سلطان مبین کا باہمی فرق

اس آیت میں آیات اور سلطان مبین کے الفاظ ہیں' ان میں باہمی فرق یہ ہے کہ آیات ان علامات کو کہتے ہیں جو غلبہ ظن اور یقین کی افادیت میں مشترک ہیں' مثلاً اولیاء اللہ سے کرامات کا صدور ہوتا ہے' وہ بھی آیات ہیں اور انبیاء علیہم السلام سے معجزات کا صدور ہوتا ہے وہ بھی آیات ہیں جب کہ اول الذکر کی اللہ کے ولی ہونے پر دلالت غلبہ ظن کی مفید ہے اور ثانی الذکر کی اللہ کے نبی ہونے پر دلالت قطعی اور یقینی ہے' اور سلطان اس دلیل کو کہتے ہیں جو قطعی اور یقینی ہو لیکن سلطان ان دلائل میں مشترک ہے جو حواس سے مؤکد ہوں اور ان دلائل میں جو محض عقل سے مؤکد ہوں' مثلاً ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ شق القمر حواس سے مؤکد تھا اور آپ کا معجزہ قرآن محض عقل سے مؤکد ہے اور جو معجزہ صرف حواس سے مؤکد ہو اس کو سلطان مبین کہتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو معجزات تھے وہ صرف حواس سے مؤکد تھے اس لیے ان کے معجزات کے متعلق فرمایا کہ وہ سلطان مبین ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فرعون اور اس کے سرداروں کی جانب تو انہوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی اور فرعون کا کوئی کام صحیح نہ تھا○ وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا اور ان کو دوزخ میں ٹھہرائے گا' اور وہ کیسی بُری پیاس بجھانے کی جگہ ہے○ اس دُنیا میں بھی لعنت ان کے پیچھے لگادی گئی اور قیامت کے دن بھی۔ ان کو کیسا بُرا انعام دیا گیا○

(ھود: ۹۹-۹۷)

فرعون کی گمراہی اور دوزخ میں اس کا اپنی قوم کا مقتدا ہونا

یعنی ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کھلے ہوئے اور واضح معجزات دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف بھیجا' اور فرعون کا کوئی کام صحیح نہ تھا یعنی وہ ہدایت یافتہ نہ تھا۔ امام رازی کی تحقیق یہ ہے کہ فرعون دہریہ تھا' وہ اس جہان کے لیے کسی پیدا کرنے والے کا منکر تھا اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کا بھی منکر تھا' وہ کہتا تھا کہ اس جہان کا کوئی خدا نہیں ہے اور ہر ملک کے باشندوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی اطاعت اور اس کی پرستش کریں اور وہ اس بات کا بھی انکار کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت' اس پر ایمان لانے اور اس کی عبادت کرنے میں رُشد اور ہدایت ہے اور چونکہ وہ ان چیزوں کا منکر تھا اس لیے وہ رُشد اور ہدایت سے بالکل خالی تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فرعون کا کوئی کام بھی رشید نہ تھا۔

پھر فرمایا کہ قیامت کے دن فرعون اپنی اس قوم کا مقتدا ہو گا جو دوزخ کی طرف جارہی ہو گی یعنی جس طرح فرعون دنیا میں گمراہی میں ان کا مقتدا تھا اسی طرح آخرت میں عذاب میں ان کا مقتدا ہو گا یا جس طرح دنیا میں سمندر میں غرق کیے جانے کے وقت وہ ان کا مقتدا تھا اسی طرح آخرت میں دوزخ میں دخول کے وقت وہ ان کا مقتدا ہو گا یعنی دنیاوی عذاب میں بھی وہ ان کا مقتدا تھا اور اُخروی عذاب میں بھی وہ ان کا مقتدا ہو گا۔

ورد کا معنی ہے پانی کا قصد کرنا' اور مورود کا معنی ہے پانی پینے کی جگہ جس کو اردو میں گھاٹ کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں

شخص نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے' فرمایا: وہ کیسی بُری پیاس بجھانے کی جگہ ہے' کیونکہ پانی کے گھاٹ پر جانے والا چاہتا ہے کہ اس کی پیاس بجھ جائے اور اس کا جگر ٹھنڈا ہو جائے اور دوزخ کی آگ تو اس کا بالکل اُلٹ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ۝ (مریم: ٧٢-٧١)

تم میں سے ہر شخص ضرور دوزخ کے اُوپر سے گزرے گا' آپ کے رب کے نزدیک یہ قطعی فیصلہ ہے' پھر ہم متقین کو نجات دے دیں گے اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنْتُمْ لَهَا وَارِدُونَ ۝ (الانبیاء: ٩٨)

تم اور اللہ کے سوا تم جن بُتوں کی عبادت کرتے ہو وہ سب دوزخ کا ایندھن ہیں' تم سب اس میں جانے والے ہو۔

اس کے بعد فرمایا: اس دنیا میں بھی لعنت ان کے پیچھے لگا دی گئی اور آخرت میں بھی' اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی لعنت اور فرشتوں کی اور نبیوں کی لعنت ان کے ساتھ چپکی ہوئی ہے اور وہ لعنت کسی حال میں ان سے الگ نہیں ہوتی۔ اس کے بعد فرمایا: یہ کیسا بُرا رفد مرفود (انعام) ہے' رفد کے معنی ہیں عطیہ' یہ اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے مطلوب میں معاون ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے پے در پے لعنت۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہ ان بستیوں کی بعض خبریں ہیں جن میں سے بعض تو موجود ہیں اور بعض نیست و نابود ہو گئیں ۝ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن خود انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا' سو اللہ کے سوا وہ جن معبودوں کی پرستش کرتے تھے' جب اللہ کا عذاب آ گیا تو وہ ان کے کسی کام نہ آ سکے' اور انہوں نے ان کی ہلاکت کے سوا کوئی اضافہ نہیں کیا ۝ (ھود: ١٠١-١٠٠)

انبیاء سابقین اور ان کی اقوام کے قصص اور واقعات بیان کرنے کے فوائد

اللہ تعالیٰ نے انبیاء سابقین علیہم الصلوات والتسلیمات کے واقعات اور قصص بیان فرمائے اور ارشاد فرمایا: یہ ان بستیوں کی بعض خبریں ہیں اور ان واقعات کے بیان کرنے میں حسبِ ذیل فوائد ہیں:

(١) توحید اور رسالت پر محض عقلی دلائل بیان کرنا صرف ان لوگوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے جو غیر معمولی ذکی اور ذہین ہوں اور ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں اور عام لوگوں کو تبلیغ سے اس وقت فائدہ ہوتا ہے جب دلائل کے ساتھ واقعات اور قصص بھی بیان کیے جائیں اس لیے اللہ تعالیٰ دلائل کے ساتھ ساتھ واقعات اور قصص بھی بیان فرماتا ہے۔

(٢) اللہ تعالیٰ نے انبیاء سابقین اور ان کی اقوام کے جو قصص بیان فرمائے' ان میں توحید اور رسالت پر انبیاء علیہم السلام کے پیش کیے ہوئے دلائل کا بھی ذکر فرمایا' پھر ان دلائل پر ان کی اقوام کے اعتراضات اور شبہات کا بھی ذکر فرمایا اور انبیاء علیہم السلام نے ان شبہات کے جو جوابات دیئے ان کو بھی بیان فرمایا' اور جب ان کی اقوام نے دلائل کے جواب میں آباء و اجداد کی تقلید پر ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیا جس کے نتیجہ میں ان پر دُنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان پر دُنیا میں ایسا عذاب نازل کیا گیا جس سے دُنیا میں ان کی زندگی کی فصل کٹ گئی' اس کا بھی اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا تو کفارِ مکہ کے لیے ان واقعات کا بیان توحید و رسالت کے دلائل کے پہنچانے کا ذریعہ بن گیا اور جو شبہات ان کے دماغوں میں تھے وہ سابقہ اقوام کے شبہات کی مثل تھے سو ان کے جوابات بھی ان واقعات کے ذکر میں آ گئے اور یہ واقعات ان کے دلوں کی شقاوت اور سختی کے ازالہ کا سبب

بن گئے اور یہ توحید و رسالت کی دعوت اور تبلیغ کا نہایت موثر طریقہ ہے۔

(۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے، آپ نے کسی کتاب کا مطالعہ کیا تھا نہ کسی عالم سے پہلے ان واقعات کو سنا تھا نہ کسی مکتب اور مدرسہ میں داخل ہوئے تھے اس کے باوجود آپ نے انبیاء سابقین کے واقعات بالکل درست بیان فرمائے اور یہ آپ کا معجزہ ہے۔

(۴) جو لوگ ان قصص اور واقعات کو سنیں گے ان کے دماغ میں یہ بات آجائے گی کہ صدیق ہو یا زندیق، موافق ہو یا منافق، اس کو بہرحال ایک دن اس دنیا سے جانا پڑے گا، اور جو نیک مومن ہوں گے ان کا مرنے کے بعد تعریف اور تحسین سے ذکر کیا جائے گا اور ان کا نام عزت اور احترام سے لیا جائے گا اور جو کافر اور منافق ہوں گے ان کا مرنے کے بعد اہانت اور رُسوائی سے ذکر کیا جائے گا اور ان کا نام بے توقیری اور بے عزتی سے لیا جائے گا جیسا کہ قرآن مجید میں سابقہ اقوام کے صالحین اور کافرین کا ذکر کیا گیا ہے اور جب بار بار یہ آیات پڑھی جائیں گی اور بار بار یہ چیز دماغوں میں جاگزین ہو گی تو سننے والوں کے دل نرم ہوں گے اور ان کے دماغ حق کو قبول کرنے کی طرف مائل ہوں گے، ان میں آخرت کا خوف پیدا ہو گا اور دینِ حق کو قبول کرنے کے لیے ان کے دل و دماغ آمادہ ہو جائیں گے، سو انبیاء سابقین اور ان کی اقوام کے قصص اور واقعات کے بیان کرنے سے یہ فوائد اور ثمرات حاصل ہوں گے۔

کفار کو عذاب دینا عدل اور حکمت کا تقاضا ہے

اس کے بعد فرمایا: ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن خود انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اس کے حسبِ ذیل محامل ہیں:

(۱) ہم نے ان کو دنیا میں ہلاک کر کے اور آخرت میں عذاب میں مبتلا کر کے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے کفر اور معصیت کر کے خود اپنے آپ کو اس ہلاکت اور عذاب کا مستحق بنایا۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے ان کو جو ہلاک کیا اور عذاب میں مبتلا کیا یہ اس کا عین عدل اور حکمت کا تقاضا ہے، اس نے ان کو ان کے جرائم کی سزا سے زیادہ سزا نہیں دی یعنی اس نے ایک کافر کو ایک کافر کی سزا دی ہے، ایک کافر کو دو کافروں کی سزا نہیں دی۔ یہ اس کا عدل ہے حالانکہ اگر وہ چاہتا تو وہ ایک کافر کو دو کافروں کی سزا بھی دے سکتا تھا، اور اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر وہ کافروں کو کفر کی سزا نہ دیتا تو لوگوں کو کفر سے دُور رکھنے کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے کافروں کو دنیا میں نعمتیں عطا کرنے اور رزق پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کی، تقصیر انہوں نے کی کہ ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کیا۔

اس کے بعد فرمایا: جب اللہ کا عذاب آگیا تو وہ (بُت) ان کے کسی کام نہ آسکے۔ یعنی ان کے بُتوں نے ان کو کوئی نفع نہیں پہنچایا، اور انہوں نے ان کی ہلاکت کے سوا کوئی اضافہ نہیں کیا، اس کا معنی یہ ہے کہ کفار یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ بُت ضرر اور مصیبت کو دُور کرنے اور نفع اور راحت کے پہنچانے میں ان کی مدد کریں گے اور جب ان کافروں کو مدد کی سخت ضرورت ہو گی اور وہ ہلاکت کے گڑھے میں گر رہے ہوں گے تو یہ بُت ان کے کسی کام نہ آسکیں گے اور اس وقت ان کا یہ اعتقاد زائل ہو جائے گا کہ یہ بُت ضرر دُور کرنے اور نفع پہنچانے کا سبب ہیں، لیکن اس وقت اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا اور یہ ان کا سراسر نقصان ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور آپ کے رب کی گرفت اسی طرح ہوتی ہے جب وہ بستیوں پر اس حال میں گرفت کرتا ہے کہ وہ ظلم کر رہی ہوتی ہیں، بے شک اس کی گرفت دردناک شدید ہے○ (ھود: ۱۰۲)

گزشتہ قوموں کی برائیوں کے مرتکبین پر آنے والے عذاب سے ڈرنا چاہیے

جب اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ پچھلی اقوام نے جب اپنے رسولوں کی تکذیب اور مخالفت کی تو ان پر ایسا ہمہ گیر عذاب آیا جس نے ان کو جڑ سے اکھاڑ دیا اور یہ بیان فرمایا کہ چونکہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا اس لیے ان پر دُنیا میں ہلاکت آفریں عذاب آیا، تو اب یہ فرمایا کہ یہ عذاب صرف ان قوموں کے ساتھ خاص نہیں ہے جن کا ذکر کیا گیا بلکہ جو قوم بھی اس طرح کا ظلم کرتی ہے اس پر ایسا عذاب آتا ہے۔ قرآنِ مجید کی اور آیتوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس قاعدہ کو بیان فرمایا ہے:

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ۔ (الانبیاء: ۱۱)

اور ہم نے کتنی ہی بستیاں ہلاک کر دیں جو ظلم کرنے والی تھیں، اور ان کے بعد ہم نے دوسری قومیں پیدا کر دیں۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْۤ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰۤى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ۔ (القصص: ۵۹)

اور آپ کا رب اس وقت تک بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں ہے جب تک ان بستیوں کے مرکز میں کسی رسول کو نہ بھیج دے اور ہم بستیوں کو اسی وقت ہلاک کرنے والے ہیں جب ان میں رہنے والے ظلم کر رہے ہوں۔

اس آیت کی تفسیر میں اس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتا رہتا ہے حتیٰ کہ جب اس کو پکڑ لیتا ہے تو پھر اس کو مہلت نہیں دیتا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۱۰، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۶۸۶، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۵۸۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۱۸، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۵۱۷۵، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۶ ص ۹۴، شرح السنہ رقم الحدیث: ۴۱۶۲)

اس آیت کو پڑھ کر یہ سوچنا چاہیے کہ جو شخص جہالت اور شامت نفس سے کوئی گناہ کر بیٹھے تو اس کو فوراً توبہ کر کے اس گناہ کا تدارک اور تلافی کرنی چاہیے تاکہ وہ اس آیت کی وعید میں داخل نہ ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ (آل عمران: ۱۳۵)

اور لوگ جب کسی بے حیائی کا ارتکاب کریں یا اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں تو اپنے گناہوں کی معافی طلب کریں اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو بخشتا ہے اور اپنے کیے ہوئے کاموں پر جان بوجھ کر اصرار نہ کریں۔

(گناہ پر توبہ نہ کی جائے اور دوبارہ وہی گناہ کیا جائے تو یہ اصرار ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ سابقہ اقوام کے عذاب کی آیتوں کو پڑھ کر یہ گمان نہیں کرنا چاہیے کہ یہ عذاب ان اقوام کے ساتھ مختص تھا، کیونکہ جو لوگ بھی اپنے آپ کو سابقہ اقوام کے ظلم میں شریک کریں گے تو پھر انہیں سابقہ اقوام کے عذاب کو بھگتنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی شدید پکڑ سے ڈرتے رہنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو شخص عذاب آخرت سے ڈرتا ہو اس کے لیے بے شک اس میں نشانی ہے، یہ وہ دن ہے جس میں سب لوگ جمع ہوں گے اور اسی دن سب حاضر ہوں گے ○ ہم اس دن کو معین مدت تک کے لیے موخر کر رہے ہیں ○ (ہود: ۱۰۳-۱۰۴)

وقوع قیامت کی دلیل

ان لوگوں کو دنیا میں اس لیے عذاب دیا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے تھے اور انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کرتے تھے اور جب اس جرم کی بناء پر ان کو دنیا میں عذاب دیا گیا جو دار العمل ہے تو آخرت میں ان کو عذاب دینا زیادہ لائق ہے جو دار الجزاء ہے۔

اس آیت میں قیامت کا ذکر ہے۔ قیامت کے وقوع کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جہان کو پیدا کیا ہے اور وہ فاعل مختار ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔ جب وہ اس کائنات کو پیدا کر سکتا ہے تو اس کو فنا بھی کر سکتا ہے اور فنا کرنے میں حکمت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں اس دنیا میں کئی لوگ ظلم کرتے رہتے ہیں اور ظلم کرتے کرتے مرجاتے ہیں اور انہیں اس پر کوئی سزا نہیں ملتی اور کئی لوگ ظلم سہتے رہتے ہیں اور انہیں اس پر کوئی جزا نہیں ملتی اور ظالم کا بغیر سزا کے رہ جانا اور مظلوم کا بغیر جزا کے رہ جانا اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے' اس لیے ضروری ہوا کہ اس جہان کے بعد کوئی اور جہان ہو جہاں ظالم کو اس کے ظلم کی سزا ملے اور مظلوم کو اس کی مظلومیت پر جزا ملے اور جزا اور سزا کے عمل سے پہلے ضروری ہے کہ اس جہان کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے اور جب تک یہ جہان باقی رہے گا عمل ختم نہیں ہوں گے کیونکہ انسان کے مرنے کے بعد بھی عمل کا سلسلہ جاری رہتا ہے مثلاً ایک انسان مسجد بنا دیتا ہے تو جب تک وہ مسجد زمین پر قائم رہے گی اور لوگ اس میں نمازیں پڑھتے رہیں گے اس شخص کی نیکیوں کا سلسلہ اس کے نامہ اعمال میں درج ہوتا رہے گا' اس طرح کوئی شخص فحاشی کا اڈہ قائم کرتا ہے یا کوئی جوئے کا اڈہ قائم کرتا ہے تو جب تک برائیوں کا وہ اڈہ قائم رہے گا اور اس میں برائیاں ہوتی رہیں گی اس کے نامہ اعمال میں برائیاں لکھی جاتی رہیں گی اور یوں لوگوں کے اعمال کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک یہ پوری دنیا ختم نہ کر دی جائے اس لیے جزا اور سزا کے نظام کو برپا کرنے سے پہلے قیامت کا آنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ وہ دن ہے جس میں سب لوگ جمع ہوں گے اور اس دن سب حاضر ہوں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس دن نیک اور بد سب حاضر ہوں گے۔ دوسرے مفسرین نے کہا: اس دن آسمان والے اور زمین والے سب حاضر ہوں گے۔

اور فرمایا: ہم اس دن کو معین مدت تک کے لیے موخر کر رہے ہیں، یعنی ہمارے علم میں اس کے لیے جو دن مقرر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جب وہ دن آئے گا تو کوئی شخص اللہ کی اجازت کے بغیر بات نہیں کر سکے گا' بعض ان میں سے بد بخت ہوں گے اور بعض نیک بخت ○ (هود: ۱۰۵)

کیا حشر کے دن لوگوں کا باتیں کرنا مطلقاً ممنوع ہے؟

یعنی جب وہ سخت مہیب اور ہولناک دن آئے گا جب سب خوف سے کانپ رہے ہوں گے اور سب پر دہشت طاری ہوگی اس وقت اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی شخص کسی سے بات نہیں کر سکے گا' لیکن اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ لوگ اس دن باتیں کریں گے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ۔ (الصفت: ۲۷)
اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر آپس میں سوال کریں گے۔

يَوْمَ تَاْتِىْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا۔ (النحل: ۱۱۱)
جس دن ہر شخص اپنی طرف سے بحث کرتا ہوا آئے گا۔

اس اعتراض کا ایک جواب یہ ہے کہ وہ ایسا کلام نہیں کر سکیں گے جس سے وہ اپنی تقصیرات اور معاصی کے ارتکاب کا جواز پیش کر سکیں یا اپنے کفر اور شرک کو برحق ثابت کر سکیں، دوسرا جواب یہ ہے کہ قیامت کا دن بہت طویل ہو گا اور اس کے بہت سے مراحل ہوں گے۔ بعض اوقات میں ان کو بالکل بولنے کی اجازت نہیں ہو گی، اور بعض اوقات میں ان کو بات کی اجازت دی جائے گی تو وہ بات کریں گے، بعض اوقات میں وہ اپنی طرف سے بحث کریں گے اور بعض اوقات میں ان کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی، ان کے ہاتھ بات کریں گے اور ان کے پیر گواہی دیں گے۔

آیا حشر کے دن لوگ سعید اور شقی میں منحصر ہوں گے یا نہیں؟

اس آیت میں فرمایا ہے کہ اہلِ محشر میں بعض لوگ نیک بخت ہوں گے اور بعض لوگ بدبخت ہوں گے، اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اہلِ محشر میں پاگل اور بچے بھی ہوں گے حالانکہ وہ نیک بخت اور بدبخت ان دونوں قسموں سے خارج ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اہلِ محشر سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا حساب لیا جائے گا اور جن کا حساب لیا جائے گا وہ بہرحال ان دو قسموں سے خارج نہیں ہیں۔

اس جگہ یہ سوال بھی ہوتا ہے کہ اہلِ اعراف کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جنت میں ہوں گے نہ دوزخ میں، آیا وہ ان دو قسموں میں داخل ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح پاگل اور بچے ان دو قسموں سے خارج ہیں اسی طرح اہلِ اعراف بھی ان قسموں سے خارج ہیں۔

اس جگہ ایک اور سوال یہ ہوتا ہے کہ سعید (نیک بخت) وہ ہے جس کا ثواب زیادہ ہو اور شقی (بدبخت) وہ ہے جس کا عذاب زیادہ ہو، ان کے علاوہ ایک اور قسم بھی ہے جس کا ثواب اور عذاب دونوں برابر ہیں، وہ کس قسم میں داخل ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دو قسموں کا ذکر اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ تیسری قسم کا وجود نہ ہو، جس طرح قرآنِ مجید کی اکثر آیات میں صرف مومن یا کافر کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ اس کو مستلزم نہیں ہے کہ منافقین کی قسم نہ ہو۔

لوگوں کے سعید اور شقی ہونے کے متعلق احادیث

اس آیت میں انسانوں کی دو قسمیں بیان کی ہیں: سعید اور شقی اور ان کے متعلق حسبِ ذیل احادیث ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ سچے ہیں اور آپ نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص کی تخلیق اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک جمع ہوتی رہتی ہے پھر وہ (نطفہ) چالیس دن بعد جما ہوا خُون ہو جاتا ہے، پھر چالیس دن بعد وہ جما ہوا خُون گوشت کا ٹکڑا بن جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتہ کو بھیجتا ہے، وہ اس میں رُوح پھونک دیتا ہے، اور اس کو چار چیزیں لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے: وہ اس کا رزق لکھ دیتا ہے اور اس کی مدتِ حیات لکھ دیتا ہے اور یہ لکھ دیتا ہے کہ وہ کیا عمل کرے گا اور یہ لکھ دیتا ہے کہ وہ شقی ہے یا سعید ہے، پس اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، تم میں سے ایک شخص اہلِ جنت کے عمل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر اس پر لکھا ہوا (مقدر) غالب آ جاتا ہے اور اس کا خاتمہ اہلِ دوزخ کے عمل پر ہوتا ہے، اور وہ دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے، اور تم میں سے ایک شخص اہلِ دوزخ کے عمل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے پھر اس پر لکھا ہوا غالب آ جاتا ہے اور اس کا خاتمہ اہلِ جنت کے عمل پر ہوتا ہے اور وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۳۲، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۶۴۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۰۸، سنن الترمذی رقم الحدیث:

۲۱۳۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۷۶، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۲۰۰۹۳، مسند حمیدی رقم الحدیث: ۱۲۶، مسند احمد ج ۱ ص ۳۸۲، سنن داری رقم الحدیث: ۷۰، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۵۱۵۷، المعجم الصغیر رقم الحدیث: ۲۰۰، حلیۃ الاولیاء ج ۷ ص ۳۶۵)

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص کا ٹھکانا لکھ دیا گیا ہے کہ وہ جنت میں ہے یا دوزخ میں۔ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا ہم اسی پر اعتماد نہ کر لیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں، تم عمل کرو، ہر شخص کے لیے اس کا عمل آسان کر دیا گیا ہے، پھر آپ نے یہ آیات پڑھیں:

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰىۙ ○ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰىۙ ○ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰىؕ ○ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰىۙ ○ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰىۙ ○ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰىؕ ○ (اللیل: ۱۰-۵)

سو جس نے (اللہ کی راہ میں) دیا اور اللہ سے ڈرا ○ اور نیک بات کی تصدیق کی ○ تو ہم عنقریب اس کے لیے نیک اعمال آسان کر دیں گے ○ اور جس نے بخل کیا اور اللہ سے بے پروا رہا ○ اور اس نے نیک بات کی تکذیب کی ○ تو ہم عنقریب اس کے لیے بُرے اعمال کو آسان کر دیں گے ○

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۹۴۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۶۴۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۶۹۴، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۳۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۷۸، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۲۰۰۷۴، مسند احمد ج ۱ ص ۸۲، مسند بزار رقم الحدیث: ۵۸۳، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۶۱۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۳۳۴، شرح السنہ رقم الحدیث: ۷۲)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ بتلائیے کہ ہم جو عمل کرتے ہیں، کیا یہ اعمال (اللہ تعالیٰ کے لکھنے سے پہلے) ابتداءً ہیں یا ان اعمال (کو لکھنے) سے فراغت ہو چکی ہے؟ آپ نے فرمایا: ان سے فراغت ہو چکی ہے، یا ابن الخطاب! اور ہر عمل آسان کیا جا چکا ہے! جو اہلِ سعادت ہیں وہ سعادت کے لیے عمل کرتے ہیں اور جو اہلِ شقاوت ہیں وہ شقاوت کے لیے عمل کرتے ہیں۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۳۵، مسند احمد ج ۲ ص ۵۲، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۵۴۶۳)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں ہمارے پاس تشریف لائے کہ آپ کے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں۔ آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ یہ کیسی دو کتابیں ہیں؟ ہم نے عرض کیا: نہیں یارسول اللہ! ہاں اگر آپ بتادیں! آپ نے اس کتاب کے متعلق فرمایا جو آپ کے دائیں ہاتھ میں تھی، یہ رب العالمین کی طرف سے کتاب ہے، اس میں تمام جنتیوں کے نام ہیں اور ان کے باپ دادا کے نام ہیں اور ان کے قبیلوں کے، پھر اس کے آخر میں کل تعداد لکھ دی گئی ہے اس میں کمی ہوگی نہ زیادتی، پھر اس کتاب کے متعلق فرمایا جو آپ کے بائیں ہاتھ میں تھی، یہ رب العالمین کی طرف سے کتاب ہے، اس میں دوزخیوں کے نام ہیں اور ان کے باپ دادا کے نام ہیں اور ان کے قبیلوں کے، پھر اس کے آخر میں کل تعداد لکھ دی گئی ہے، اس میں کمی ہوگی نہ زیادتی۔ آپ کے اصحاب نے کہا: یارسول اللہ! جب سب کچھ لکھ کر فراغت ہو چکی ہے تو پھر ہم عمل کس لیے کریں؟ آپ نے فرمایا: نیک عمل کرو اور نیکی کے قریب رہو کیونکہ جنتی کا خاتمہ اہلِ جنت کے اعمال پر کیا جاتا ہے خواہ اس نے (زندگی بھر) کیسے ہی عمل کیے ہوں، اور دوزخی کا خاتمہ اہلِ دوزخ کے اعمال پر کیا جاتا ہے خواہ اس نے (زندگی بھر) کیسے ہی عمل کیے ہوں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کتابوں کو ایک طرف ڈال دیا، پھر فرمایا: تمہارا رب بندوں (کے عمل لکھنے) سے فارغ ہو چکا ہے، ایک فریق جنت میں ہے اور ایک فریق دوزخ میں۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۴۱، مسند احمد ج ۲ ص ۱۶۷، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۸۸۲۵)

جب انسان کی پیدائش سے پہلے ہی اس کی تقدیر میں شقی ہونا لکھ دیا تو پھر معصیت میں اس کا کیا قصور ہے؟

اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی لکھ دیا ہے کہ وہ سعید ہے یا شقی ہے یا اہلِ جنت میں سے ہے یا اہلِ نار سے ہے تو اب انسان کے عمل کرنے کا کیا فائدہ ہے' ہوگا تو وہی جو پہلے سے تقدیر میں لکھا ہوا ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم تھا کہ انسان اپنے اختیار سے دنیا میں کیسے عمل کرے گا' وہ اہلِ جنت کے عمل کرے گا یا اہلِ نار کے عمل کرے گا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی تقدیر میں وہی کچھ لکھا ہے جو خود بندہ نے اپنے اختیار سے کرنا تھا' اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کی تقدیر انسان کے اعمال کے مطابق ہے' انسان کے اعمال اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی تقدیر کے مطابق نہیں ہیں۔

تقدیرِ معلق اور تقدیرِ مبرم کے متعلق احادیث

انسان پر جو راحتیں اور مصیبتیں آتی ہیں اور خوشیاں اور غم آتے ہیں' بیماریوں اور تندرستیوں کا توارد ہوتا ہے' رزق کی تنگی اور فراخی ہوتی ہے' حوادثِ روزگار' فتح اور شکست' کامیابی اور ناکامی اور زندگی اور موت آتی ہے' ان تمام امور میں انسان کا اختیار نہیں ہے' ان سب کا تعلق اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ہے' البتہ جن احکام شرعیہ کا اسے مکلف کیا گیا ہے ان میں اس کو اختیار دیا گیا ہے مثلاً اس کا نماز پڑھنا یا نہ پڑھنا' روزہ رکھنا یا نہ رکھنا' یہ اس کے اختیار میں ہے اور ان ہی کاموں پر اس کو جزا یا سزا ملتی ہے البتہ پہلے جن امور کا ذکر کیا گیا ہے' یعنی امورِ تکوینیہ' ان میں اس کا اختیار نہیں ہے لیکن ہر دو کا تعلق تقدیر کے ساتھ ہے اور تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہے اور تقدیر حقیقت میں تقدیرِ مبرم ہے جو اللہ تعالیٰ کا علم ہے اور اس میں کوئی تغیر اور تبدل محال ہے کیونکہ اس میں تغیر اللہ تعالیٰ کے جہل کو مستلزم ہے اور وہ محال ہے' البتہ علماء نے تقدیر کی ایک اور قسم بھی ذکر کی ہے' اس کو تقدیرِ معلق کہتے ہیں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تقدیر صرف دُعا سے بدل جاتی ہے اور عمر میں زیادتی صرف نیکی سے ہوتی ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ٢١٣٩' المعجم الکبیر رقم الحدیث: ٦١٢٨)

عمر بھی تقدیر سے ہے سو اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دُعا اور نیکی سے تقدیر بدل جاتی ہے حالانکہ تقدیر اللہ تعالیٰ کے علم کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم کا بدلنا محال ہے سو تقدیر کا بدلنا بھی محال ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس پر ایمان نہ لائے کہ ہر اچھی اور بری چیز تقدیر سے وابستہ ہے اور یہ یقین رکھے کہ جو مصیبت اس پر آئی ہے وہ اس سے ٹل نہیں سکتی تھی اور جو مصیبت اس سے ٹل گئی ہے وہ اس کو پہنچ نہیں سکتی تھی۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ٢١٤٤)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں سواری پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا' آپ نے فرمایا: اے بیٹے! میں تمہیں چند کلمات کی تعلیم دیتا ہوں' تم اللہ کے دین کی حفاظت کرو' اللہ تمہاری حفاظت کرے گا۔ تم اللہ کے احکام کی حفاظت کرو' تم اللہ کی رضا کو اپنے سامنے پاؤ گے۔ جب تم سوال کرو تو تم اللہ سے سوال کرو اور جب تم مدد طلب کرو تو اللہ سے مدد طلب کرو' اور یقین رکھو کہ اگر پوری امت تم کو کوئی فائدہ پہنچانے پر جمع ہو جائے تو جو چیز اللہ نے تمہارے لیے نہیں لکھی وہ تم کو اس کا فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور اگر سب لوگ تم کو ضرر پہنچانے پر متفق ہو جائیں تو جو

چیز اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے نہیں لکھی وہ تمہیں اس کا ضرر نہیں پہنچا سکتے، قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔
(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۵۱۶، مسند احمد ج ۱ ص ۲۹۳، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۱۲۹۸۸، شعب الایمان رقم الحدیث: ۱۷۴)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طاقت ور مسلمان اللہ تعالیٰ کو کمزور مسلمان کی بہ نسبت زیادہ محبوب ہے اور ہر مسلمان میں (قوی ہو یا ضعیف) خیر ہے، جو چیز تمہارے لیے فائدہ مند ہو اس کی حرص کرو اور اللہ سے مدد طلب کرو اور عاجز نہ ہو، اور اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچی ہو تو یہ نہ کہو کہ اگر میں فلاں فلاں کام کر لیتا تو مجھ کو یہ مصیبت نہ پہنچتی، لیکن یہ کہو کہ یہ اللہ کی تقدیر ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، کیونکہ "اگر" کا لفظ شیطان کے عمل کو کھولتا ہے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۶۶۴، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۷۹، مسند احمد رقم الحدیث: ۸۷۹۹، دارالفکر)

اوّل الذکر احادیث سے معلوم ہوا کہ دعا اور نیکی سے تقدیر بدل جاتی ہے اور ثانی الذکر احادیث سے معلوم ہوا کہ تقدیر کسی چیز سے نہیں بدل سکتی، علماء اسلام نے ان احادیث میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ تقدیر کی دو قسمیں ہیں: تقدیرِ معلق اور تقدیرِ مبرم۔ تقدیرِ مبرم ہی اصل تقدیر ہے اور وہ کسی چیز سے نہیں بدل سکتی اور تقدیرِ معلق یہ ہے کہ انسان اگر دُعا کرے گا یا نیکی کرے گا تو اس کی عمر بڑھ جائے گی ورنہ نہیں بڑھے گی مثلاً تقدیرِ معلق کے مرتبہ میں اس کی عمر چالیس سال لکھی ہوئی ہے، اس نے نیکی کی تو اس کی عمر چالیس سال کو مٹا کر ساٹھ سال لکھ دی گئی لیکن اللہ تعالیٰ کو بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیکی کرے گا اور اس کی عمر ساٹھ سال ہوگی اور یہ تقدیرِ مبرم ہے جس میں تغیر ہونا محال ہے۔ قرآنِ مجید میں بھی اس کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ۔ (الرعد: ۳۹)
اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔

قضاء مبرم کو کوئی ٹال نہیں سکتا

کتاب المحو والاثبات تقدیرِ معلق ہے اور ام الکتاب تقدیرِ مبرم ہے، اور تقدیرِ معلق میں نیکی اور دعا سے تبدیلی ہو جاتی ہے اور تقدیرِ مبرم کوئی نہیں بدل سکتا۔ مشہور ہے کہ غوث اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں قضاء مبرم کو ٹال دیتا ہوں، اس سے مراد حقیقی مبرم نہیں ہے، مبرم اضافی ہے۔ وہ حقیقت میں تقدیرِ معلق ہے لیکن حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ سے کم درجہ کے اولیاء کرام کی دعا سے وہ تقدیر نہیں بدل سکتی تھی اور ان کے اعتبار سے وہ تقدیرِ مبرم تھی اور غوث اعظم کی دعا سے وہ تقدیر بدل سکتی تھی اس لیے فرمایا کہ میں قضاء مبرم کو ٹال دیتا ہوں، یعنی اس تقدیر کو جو ان سے کم درجہ کے اولیاء کرام کے اعتبار سے قضاء مبرم ہے اور حقیقتاً قضاء مبرم کو بدل دینا کسی کی قدرت اور اختیار میں نہیں ہے۔ تقدیرِ معلق ہرچند کہ حقیقی تقدیر نہیں ہے لیکن اس کو اللہ کے نیک بندوں کی دُعا اور نیک اعمال کی فضیلت ظاہر کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔

تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہے

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر امت میں مجوسی ہوتے ہیں اور اس امت کے مجوسی وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ کوئی تقدیر نہیں ہے، ان میں سے جو شخص مرجائے تو اس کے جنازہ پر مت جاؤ اور اگر ان میں سے کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت نہ کرو، وہ دجال کی جماعت ہیں اور اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہے کہ ان کو دجال کے ساتھ لاحق کر دے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۶۹۲)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قدریہ (منکرینِ تقدیر) اس امت

کے مجوس (آتش پرست' یہ دو خدا مانتے ہیں: ایک یزداں جو نیکی پیدا کرتا ہے اور ایک اہرمن جو بدی پیدا کرتا ہے' اسی طرح منکرینِ تقدیر بھی دو خالق مانتے ہیں: ایک اللہ تعالیٰ' دوسرا انسان جو اپنے افعال کو پیدا کرتا ہے اس لیے منکرینِ تقدیر کو مجوس فرمایا) ہیں' اگر یہ بیمار ہوں تو ان کی عیادت مت کرو اور اگر یہ مرجائیں تو ان کے جنازہ میں مت جاؤ۔
(سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۴۶۹۱)

نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ایک دوست نے شام سے ان کو خط لکھا تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کو جواب لکھا کہ میں نے سنا ہے کہ تم تقدیر پر نکتہ چینی کرتے ہو' اب تم مجھے خط نہ لکھنا' کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ عنقریب میری امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو تقدیر کی تکذیب کریں گے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۶۱۳' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۴۰۶۱)

یحیٰی بن یعمر بیان کرتے ہیں کہ سب سے پہلے جس شخص نے تقدیر کا انکار کیا وہ بصرہ کا رہنے والا ایک شخص معبد جہنی تھا' میں اور حمید بن عبدالرحمٰن حج یا عمرہ کے لیے گئے' ہم نے کہا: کاش ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی صحابی مل جاتا تو ہم اس سے تقدیر کا مسئلہ معلوم کرتے تو حسنِ اتفاق سے مسجد میں ہماری ملاقات حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ہوگئی' میں نے اور میرے ساتھی نے دائیں بائیں سے ان کو گھیر لیا۔ میں نے کہا: اے ابو عبدالرحمٰن! ہمارے علاقہ میں کچھ لوگ قرآن مجید پڑھتے ہیں اور بڑے علم کا دعویٰ کرتے ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ تقدیر کوئی چیز نہیں ہے' جو کچھ ہوتا ہے وہ ابتداءً ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب تمہاری ان سے ملاقات ہو تو ان سے کہنا کہ میں ان سے بری (لاتعلق) ہوں اور وہ مجھ سے بری ہیں اور جس چیز پر عبداللہ بن عمر قسم کھاتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ان میں سے کسی شخص کے پاس احد پہاڑ جتنا سونا ہو اور وہ اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس وقت تک قبول نہیں کرے گا جب تک کہ وہ تقدیر پر ایمان نہ لائے۔ الحدیث۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۸' سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۵۹۵' سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۶۱۰' سنن النسائی رقم الحدیث: ۴۹۹۰' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۶۳' مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۴۴' مسند احمد ج ۱ ص ۲۷' صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۱۶۸)

تقدیر میں بحث کرنا ممنوع ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر قریش تقدیر کے متعلق بحث کرنے لگے تو یہ آیت نازل ہوئی:

یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ○ اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ○ (القمر: ۴۹-۴۸)

جس دن وہ آگ میں اوندھے منہ گھسیٹے جائیں گے' دوزخ کے عذاب کا مزہ چکھو○ بے شک ہم نے ہر چیز کو تقدیر کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۵۷' مسند احمد ج ۲ ص ۴۴۴' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۸۳' خلق افعال العباد رقم الحدیث: ۱۹)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے' اس وقت ہم تقدیر کے متعلق بحث کر رہے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غضب ناک ہوئے حتیٰ کہ آپ کا مبارک چہرہ سرخ ہوگیا' گویا کہ آپ کے رخساروں میں انار کے دانے کھل گئے ہوں' آپ نے فرمایا: کیا تم کو اس میں بحث کرنے کا حکم دیا گیا ہے یا میں اس میں بحث

کرنے کے لیے تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں، تم سے پہلی امتیں اس وقت ہلاک کر دی گئیں جب وہ اس میں بحث کر رہی تھیں، میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ تم اس میں بحث مت کرو۔ یہ حدیث حضرت عمر، حضرت عائشہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۳۳، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۶۰۴۵)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص نے تقدیر میں بحث کی اس سے قیامت کے دن اس کے متعلق سوال ہوگا اور جس نے بحث نہیں کی اس سے اس کے متعلق سوال نہیں ہوگا۔ (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۸۴)

ابن الدیلمی بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور کہا: میرے دل میں تقدیر کے متعلق ایک شبہ پیدا ہوا ہے، مجھے تقدیر کے متعلق کوئی حدیث بیان فرمائیے، شاید اللہ تعالیٰ میرے دل سے اس شبہ کو نکال دے۔ حضرت ابی بن کعب نے کہا: اگر اللہ تمام آسمان والوں کو اور تمام زمین والوں کو عذاب دے، تو وہ عذاب دے گا اور یہ اس کا ظلم نہیں ہے اور اگر وہ رحم فرمائے تو اس کا رحم لوگوں کے اعمال سے بہتر ہے اور اگر تم احد پہاڑ جتنا سونا اللہ کی راہ میں خیرات کرو تو اللہ تعالیٰ اس کو اس وقت تک تم سے قبول نہیں فرمائے گا جب تک تم تقدیر پر ایمان نہ لے آؤ اور جب تک تم یہ یقین نہ رکھو کہ تم پر جو مصیبت آئی ہے وہ تم سے ٹل نہیں سکتی تھی، اور جو مصیبت تم سے ٹل چکی ہے وہ تم کو پہنچ نہیں سکتی تھی اور اگر تم اس عقیدہ کے خلاف پر مرے تو تم دوزخ میں داخل ہو گے، پھر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو انہوں نے بھی اس طرح کہا، پھر میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو انہوں نے بھی اسی طرح کہا، پھر میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو انہوں نے مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنائی جو اس کی مثل تھی۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۶۹۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۷۷، مسند احمد رقم الحدیث: ۲۱۶۶۷، مطبوعہ دارالفکر)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت موسیٰ اور حضرت آدم علیہما السلام میں مباحثہ ہوا۔ حضرت موسیٰ نے حضرت آدم سے کہا: تم ہی وہ شخص ہو جس نے اپنے ذنب (اجتہادی خطا) کی وجہ سے لوگوں کو جنت سے نکالا اور ان کو بد نصیب بنایا۔ حضرت آدم نے کہا: اے موسیٰ! تم ہی وہ شخص ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت اور اپنے کلام سے سرفراز فرمایا، کیا تم مجھے اس چیز پر ملامت کر رہے ہو، جس کو اللہ نے مجھے پیدا کرنے سے پہلے مجھ پر لکھ دیا تھا یا کہا جس کو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو پیدا کرنے سے پہلے میرے لیے مقدر کر دیا تھا، پھر حضرت آدم نے حضرت موسیٰ پر غلبہ پالیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۷۳۸، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۶۵۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۰۱، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۳۴، موطا امام مالک رقم الحدیث: ۱۶۶۰، مسند احمد ج ۲ ص ۳۹۸، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۱۷۹، مسند حمیدی رقم الحدیث: ۱۱۱۵، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۴۰، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۶۲۴۵، الشریعہ للآجری رقم الحدیث: ۱۸۱، شرح السنہ رقم الحدیث: ۶۸)

حضرت آدم اور حضرت موسیٰ کے درمیان یہ مباحثہ عالم برزخ میں ہوا یا حضرت موسیٰ حضرت آدم کی قبر پر گئے اور وہاں ان سے یہ بحث کی، رہا یہ سوال کہ جس طرح حضرت آدم نے اپنی اجتہادی خطا پر تقدیر کا عذر پیش کیا، کیا اس طرح ہم بھی اپنے گناہوں پر تقدیر میں لکھے کا عذر پیش کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم نے یہ عذر برزخ میں پیش کیا تھا اور جب تک وہ دنیا میں رہے وہ اس خطاء پر توبہ اور استغفار کرتے رہے، اور رہا یہ سوال کہ جب تقدیر میں بحث کرنا ممنوع ہے تو حضرت موسیٰ نے حضرت آدم سے تقدیر کے مسئلہ پر کیوں مباحثہ کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بحث دنیا میں ممنوع ہے اور حضرت موسیٰ

نے یہ مباحثہ برزخ میں کیا تھا، نیز یہ ہماری شریعت میں ممنوع ہے، ہو سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں تقدیر پر بحث کرنا ممنوع نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رہے بدبخت لوگ تو وہ دوزخ میں ہوں گے اور ان کے لیے اس میں چیخنا اور چلانا ہوگا○ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین رہیں گے مگر جتنا آپ کا رب چاہے، بے شک آپ کا رب جو بھی ارادہ کرتا ہے اس کو خوب پورا کرنے والا ہے○ اور رہے وہ لوگ جو نیک بخت ہیں تو وہ جنت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین رہیں گے مگر جتنا آپ کا رب چاہے یہ غیر منقطع عطاء ہے○ (ھود: ۱۰۸-۱۰۶)

سعادت اور شقاوت کا معنی

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں: نیک کاموں کے حصول میں اللہ تعالیٰ کی مدد مل جانا سعادت ہے اور اس کا الٹ اور ضد شقاوت ہے۔ سعادت کی دو قسمیں ہیں: سعادت دنیوی اور سعادت اخروی۔ سعادت اخروی جنت ہے اور سعادت دنیوی کی تین قسمیں ہیں: رُوح کی سعادت، بدن کی سعادت اور خارجی سعادت۔ رُوح کی سعادت اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کے احکام پر عمل کرنے سے ہوتی ہے، اور بدن کی سعادت صحت اور قوت سے اور مفید غذاؤں اور دواؤں سے حاصل ہوتی ہے، اور خارجی سعادت انسان کے نیک مطلوب پر معاونت کرنے سے حاصل ہوتی ہے، اور اس کا الٹ اور ضد شقاوت ہے۔ (المفردات ج ۱ ص ۳۴۹، ۳۰۶، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

علامہ سید محمد مرتضیٰ زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ نے لکھا ہے: سعادت کا معنی نفع، معاونت، اللہ تعالیٰ کا نیک کاموں کی توفیق دینا یا ان کاموں کی توفیق دینا جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہو۔ (تاج العروس ج ۲ ص ۳۷۶، مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر، ۱۳۰۶ھ)

زفیر اور شھیق کا معنی

علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ نے لکھا ہے: اتنا لمبا اور گہرا سانس لینا جس سے سینہ پھول جائے زفیر ہے اور گہرے سانس کو باہر نکالنا شہیق ہے۔ (المفردات ج ۱ ص ۲۵۵، ۲۸۱، مطبوعہ مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے لکھا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: شدید اور سخت آواز زفیر ہے اور پست اور کمزور آواز شہیق ہے۔ امام ابو العالیہ نے کہا: جو آواز حلق سے نکلے وہ زفیر ہے اور جو آواز سینہ سے نکلے وہ شہیق ہے۔ قتادہ نے کہا: جہنم میں کافر کی ابتدائی آواز اور گدھے کی ابتدائی آواز زفیر ہے اور جہنم میں کافر کی آخری آواز اور گدھے کی آخری آواز شہیق ہے۔ (جامع البیان جز ۱۲ ص ۱۵۲-۱۵۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ نظام الدین حسن بن محمد قمی نیشاپوری متوفی ۷۲۸ھ نے امام ابن جریر کے ذکر کردہ معانی پر حسب ذیل معانی کا اضافہ کیا ہے:

حسن نے کہا: جہنم کے شعلے اپنی قوت سے کفار کو اٹھا کر جہنم کے سب سے بلند طبقہ میں پہنچا دیں گے اور اس وقت کفار یہ چاہیں گے کہ وہ جہنم سے نکل جائیں تو فرشتے لوہے کے گرز مار کر ان کو پھر جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں پہنچا دیں گے، سو ان کا دوزخ میں اوپر اٹھنا زفیر اور نیچے گرنا شہیق ہے۔ ابو مسلم نے کہا: جب انسان پر سخت گریہ و زاری طاری ہو تو سینہ میں جو سانس گھٹ جاتا ہے وہ زفیر ہے اور انتہائی غم اور اندوہ کے وقت رونے سے جو آواز نکلتی ہے وہ شہیق ہے۔ بعض اوقات اس کیفیت کے بعد غشی طاری ہو جاتی ہے اور بعض اوقات آدمی مر جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ جو رونا ختم نہ ہو وہ زفیر ہے اور غم کم نہ ہو وہ شہیق ہے اور اہل تحقیق نے کہا: کفار کا دنیا اور اس کی لذتوں کی طرف مائل ہونا

زفیر ہے اور کمالاتِ روحانیہ میں ان کی معاونت کا کمزور ہونا شہیق ہے۔

(غرائب القرآن و رغائب الفرقان ج ۴ ص ۵۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۶ھ)

اس اعتراض کا جواب کہ کفار کے عذاب کو آسمان و زمین کے قیام پر موقوف کرنا دوامِ عذاب کے منافی ہے

"وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین رہیں گے۔" آیت کے اس حصہ سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ آسمان اور زمینوں کا قائم رہنا تو دائمی اور ابدی نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ نے کفار کے دوزخ میں قیام کو آسمانوں اور زمینوں کے قیام پر معلق کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کفار کا دوزخ میں قیام بھی دائمی اور ابدی نہیں ہے بلکہ وقتی اور عارضی ہے۔

قرآنِ مجید کی دیگر نصوص قطعیہ اور بکثرت احادیث سے چونکہ یہ ثابت ہے کہ کفار ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اس لیے مفسرین نے اس آیت کی متعدد تاویلات کی ہیں، بعض ازاں یہ ہیں:

(۱) اس آیت میں آسمان اور زمین سے مراد دنیا کے آسمان اور زمین نہیں ہیں بلکہ جنت اور دوزخ کے آسمان اور زمین مراد ہیں کیونکہ جنت اور دوزخ فضا اور خلا میں تو نہیں ہیں، ان میں فرش ہوگا جس پر لوگ بیٹھے ہوئے یا ٹھہرے ہوئے ہوں گے، اور ان کے لیے کوئی سائبان بھی ہوگا جس کے سائے میں وہ لوگ ہوں گے اور عربی میں ہر سایہ کرنے والی چیز پر سماء کا اطلاق کیا جاتا ہے اور جنت میں زمین کے وجود پر یہ آیت دلیل ہے:

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ○ (الزمر: ۷۴)

اور (جنتی) کہیں گے اللہ ہی کے لیے سب تعریفیں ہیں جس نے ہم سے کیا ہوا وعدہ سچا کر دیا اور ہم کو (اس) زمین کا وارث بنایا تاکہ ہم جنت میں جہاں چاہیں رہیں، پس نیک عمل کرنے والوں کا ثواب کیسا اچھا ہے۔

آخرت کے زمین و آسمان دنیا کے زمین و آسمان سے مختلف ہیں، اس پر یہ آیت بھی دلیل ہے:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ۔ (ابراھیم: ۴۸)

جس دن زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی۔

اور جب یہ واضح ہوگیا کہ جنت اور دوزخ کے زمین و آسمان اس دنیا کے زمین و آسمان کے مغائر ہیں اور جب جنت اور دوزخ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گی تو ان کے زمین اور آسمان بھی ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور جنت اور دوزخ میں رہنے والے بھی ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔

(۲) اگر زمین و آسمان سے مراد اس دنیا کے زمین اور آسمان ہوں تب بھی یہ آیت جنت اور دوزخ میں جنتیوں اور دوزخیوں کے دوام کے منافی نہیں ہے، کیونکہ عربوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کا دوام بیان کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جب تک آسمان اور زمین قائم رہیں گے تو فلاں چیز رہے گی اور قرآنِ مجید چونکہ عربوں کے اسلوب کے موافق نازل ہوا ہے اس لیے جب تک آسمان اور زمین قائم رہیں گے اس سے مراد دوام اور خلود ہی ہے، اور معنی یہی ہے کہ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

(۳) مقدم کے ثبوت سے تالی کا ثبوت ہوتا ہے لیکن مقدم کی نفی سے تالی کی نفی نہیں ہوتی مثلاً ہم کہتے ہیں کہ اگر یہ

انسان ہے تو پھر یہ حیوان ہے' یہ درست ہے لیکن یہ درست نہیں ہے کہ اگر یہ انسان نہیں ہے تو پھر یہ حیوان نہیں ہے کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ انسان نہ ہو گھوڑا ہو اور حیوان ہو' اسی طرح جب تک آسمان اور زمین ہیں وہ دوزخ میں رہیں گے' اس سے یہ لازم نہیں ہو گا کہ جب آسمان اور زمین نہ ہوں تو وہ دوزخ میں نہ ہوں۔

دائمی عذاب پر امام رازی کے دو اعتراضوں کا جواب

امام رازی نے لوگوں کی طرف سے ایک اعتراض اس طرح نقل کیا ہے کہ کافر نے زمانہ متناہی میں جُرم کیا ہے اور اس کی سزا غیر متناہی زمانہ تک دینا ظلم ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عذاب کافر کی نیت کے اعتبار سے ہے' اس کی نیت دائماً کفر کرنے کی ہوتی ہے اگر بالفرض وہ غیر متناہی زمانہ تک زندہ رہتا تو غیر متناہی زمانہ تک کفر کرتا' اس وجہ سے اس کو غیر متناہی زمانہ تک عذاب دیا جائے گا۔

امام رازی نے دوسرا اعتراض یہ ذکر کیا ہے کہ یہ عذاب نفع سے خالی ہے اس لیے یہ قبیح ہے' یہ نفع سے اس لیے خالی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو اس کا نفع ہو نہیں سکتا' کیونکہ وہ نفع اور ضرر سے مستغنی اور بلند ہے' اور دوزخی کافر کو بھی اس عذاب سے نفع نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے حق میں یہ عذاب ضرر محض ہے' اور جنتی مسلمانوں کو بھی کافر کے عذاب سے کوئی نفع نہیں ہو گا' کیونکہ وہ اپنی لذتوں میں منہمک اور مشغول ہوں گے تو کسی کے دائمی عذاب میں مبتلا ہونے سے انہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ امام رازی کے اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اس دلیل کے اعتبار سے تو کافر کو مطلقاً عذاب ہونا ہی نہیں چاہیے اور اس دلیل کو دائمی عذاب کے ساتھ مخصوص کرنا باطل ہے' دوسرا جواب یہ ہے کہ کفار کو عذاب دینا ان کے جُرم کی سزا ہے اور اللہ تعالیٰ کا عدل ہے' اس میں یہ لحاظ نہیں کیا گیا کہ اس سے کسی کو نفع پہنچے گا یا نہیں۔ یہ دو اعتراض امام رازی نے تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۰۴ میں ذکر کیے ہیں۔

کفار کے دائمی عذاب پر قرآنِ مجید سے دلائل

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین رہیں گے مگر جتنا آپ کا رب چاہے۔

اس آیت میں جو استثناء کیا گیا ہے اس سے بعض لوگوں نے یہ مطلب نکالا ہے کہ کفار کو دوزخ میں لازمی طور سے دائمی عذاب نہیں ہو گا اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کو ایک محدود مدت تک عذاب دے گا۔ سید مودودی لکھتے ہیں:

یعنی کوئی اور طاقت تو ایسی ہے ہی نہیں جو ان لوگوں کو دائمی عذاب سے بچا سکے' البتہ اگر اللہ تعالیٰ خود ہی کسی کے انجام کو بدلنا چاہے یا کسی کو ہمیشگی کا عذاب دینے کے بجائے ایک مدت تک عذاب دے کر معاف کر دینے کا فیصلہ فرمائے تو اسے ایسا کرنے کا پورا اختیار ہے کیونکہ اپنے قانون کا وہ خود ہی واضع ہے' کوئی بالاتر قانون ایسا نہیں ہے جو اس کے اختیارات کو محدود کرتا ہو۔ (تفہیم القرآن ج ۲ ص ۳۶۹' مطبوعہ لاہور' سولھواں ایڈیشن' ۱۴۰۲ھ)

اللہ تعالیٰ کے اختیار میں کوئی کلام نہیں ہے' لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کی بکثرت آیات میں یہ خبر دی ہے کہ کافروں اور مشرکوں کو دائمی اور ابدی عذاب ہو گا' اب اگر اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دے تو خود اس کے کلام کا خلاف لازم آئے گا اور یہ کذب ہو گا اور کذب اللہ تعالیٰ کے کلام میں محال ہے اس لیے جب اس آیت میں دوزخیوں کے عذاب سے استثناء کا ذکر کیا گیا ہے اس میں تاویل کرنی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ (النساء: ۴۸)

بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس سے کم گناہ کو جس کے لیے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔

اب اگر اللہ تعالیٰ کسی کافر یا مشرک کی سزا معاف کر کے اس کو بخش دے تو اس کی اس خبر کے خلاف لازم آئے گا اور یہ محال ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ کسی کافر کے عذاب میں تخفیف نہیں فرمائے گا، اب اگر وہ کسی کافر کی سزا معاف کر دے تو اس آیت کے خلاف ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ۝ (البقرہ: ۱۶۲-۱۶۱)

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ کفر پر مر گئے، ان لوگوں پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے، جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، ان کے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ۝ (الاعراف: ۴۰)

بے شک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور ان (پر ایمان لانے) سے تکبر کیا ان کے لیے آسمانوں کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے حتیٰ کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے اور ہم اسی طرح مجرموں کو سزا دیتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک واضح مثال سے یہ بتایا ہے کہ جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا محال ہے اسی طرح کفار کا جنت میں داخل ہونا محال ہے، اب کفار کی مغفرت اور ان کے جنت میں داخل ہونے کے امکان کو ظاہر کرنا اس آیت کی تکذیب کے مترادف ہے، اور اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ۖ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۔ (النساء: ۵۶)

بے شک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا کفر کیا، ہم عنقریب ان کو آگ میں داخل کر دیں گے، جب بھی ان کی کھالیں جل کر پک جائیں گی ہم ان کی کھالوں کو دوسری کھالوں سے بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب کو چکھیں۔

اس آیت سے بھی یہ واضح ہو گیا کہ کافروں پر عذاب کا سلسلہ تا ابد جاری رہے گا، ان تمام آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی قید اور بغیر کسی استثناء کے یہ کلی حکم لگایا ہے کہ کافروں کو غیر متناہی زمانہ تک عذاب ہو گا اور اب یہ امکان پیدا کرنا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو کافروں کو ایک مدت تک عذاب دے کر ان کو معاف فرما دے گا ان تمام آیتوں کی تکذیب کے مترادف ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ان کو معاف نہیں کرے گا، ان کے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی، ان کو جنت میں داخل نہیں کیا جائے گا اور جب بھی ان کی کھال جل جائے گی اس کو دوسری کھال سے بدل دیا جائے گا اور ان کے علاوہ بکثرت آیات ہیں جن میں فرمایا ہے کہ کافروں کو دائمی اور ابدی عذاب ہو گا۔

زیرِ تفسیر آیت میں کفار کے دائمی عذاب سے استثناء کی توجیہات

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین رہیں گے مگر جتنا آپ کا رب چاہے۔

اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد دوزخیوں کو دوزخ سے نکال لیا جائے گا، یہ دوزخی کون ہیں؟ تحقیق یہ ہے کہ ان دوزخیوں سے مراد موحدین ہیں جن کو ان کے گناہوں کے سبب سے تطہیر کے لیے دوزخ میں ڈالا جائے گا پھر کچھ

عرصہ کے بعد ان کو دوزخ سے نکال لیا جائے گا۔

(۱) قتادہ اور ضحاک نے بیان کیا کہ یہ استثناء ان موحدین کی طرف راجع ہے جنہوں نے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا تھا' اللہ تعالیٰ جب تک چاہے گا ان کو دوزخ میں رکھے گا پھران کو دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کردے گا۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۳۱۴، ۱۴۳۱۳، ۱۴۳۱۲، ۱۴۳۱۱، تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۲۳۷، ۱۱۲۳۶)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو جنت میں داخل کردے گا' وہ اپنی رحمت سے جس کو چاہے گا جنت میں داخل فرمائے گا' اور اہلِ دوزخ کو دوزخ میں داخل کردے گا' پھر فرمائے گا: تم دیکھو جس کے دل میں ایک رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکال لو' پھر وہ دوزخ سے اس حال میں نکالے جائیں گے کہ وہ جل کر کوئلہ ہو چکے ہوں گے پھر ان کو حیات کے دریا میں ڈال دیا جائے گا تو وہ اس طرح نشوونما پانے لگیں گے جس طرح دریا کے کنارے اگا ہوا دانہ نشوونما پاتا ہے' کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح زرد رنگ کا لپٹا ہوا نکلتا ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۲، ۶۵۶۰، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۸۴)

(۲) اس آیت کی دوسری توجیہ یہ ہے کہ دوزخی ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے سوا ان اوقات کے جب وہ دنیا میں تھے یا برزخ میں تھے یا میدانِ حشر میں حساب کتاب کے لیے کھڑے ہوئے تھے' خلاصہ یہ ہے کہ دوزخیوں کا دوزخ کے عذاب سے استثناء ان تین اوقات اور احوال کی طرف راجع ہے۔

(۳) اس آیت کی تیسری توجیہ یہ ہے کہ یہ استثناء ان کے چیخنے اور چلانے کی طرف راجع ہے یعنی وہ دوزخ میں ہمیشہ چیختے اور چلاتے رہیں گے، لیکن جس وقت اللہ تعالیٰ چاہے گا ان کی چیخ وپکار نہیں ہوگی۔

(۴) اس آیت کی چوتھی توجیہ یہ ہے کہ دوزخ میں آگ کا عذاب بھی ہوگا اور زمہریر کا عذاب بھی ہوگا جس میں بہت سخت ٹھنڈک ہوگی اور یہ استثناء آگ کے عذاب کی طرف راجع ہے' یعنی وہ ہمیشہ ہمیشہ آگ کے عذاب میں رہیں گے مگر جس وقت اللہ تعالیٰ چاہے گا ان کو آگ کے عذاب سے نکال کر ٹھنڈک کے عذاب میں ڈال دے گا۔

(۵) اس آیت کی پانچویں توجیہ یہ ہے کہ یہ آیت سورۂ فتح کی اس آیت کی طرح ہے:

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ۔ (الفتح: ۲۷)

بے شک اللہ نے اپنے رسول کو حق کے ساتھ سچا خواب دکھایا اگر اللہ چاہے گا تو تم ضرور مسجد حرام میں امن وامان کے ساتھ داخل ہوگے (بعض) اپنے سروں کو منڈاتے ہوئے اور (بعض) اپنے سروں کو کترواتے ہوئے۔

بظاہر اس آیت کا یہ معنی ہے اگر اللہ چاہے گا تو تم امن کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہوگے اور اگر اللہ چاہے گا تو نہیں داخل ہوگے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کو یہ علم تھا کہ مسلمان مسجد حرام میں داخل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے علم کے موافق ہونا واجب ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کا علم معاذ اللہ جہل سے بدل جائے گا سو جس طرح اس آیت میں "اللہ چاہے گا" کا یہ معنی نہیں ہے کہ مسلمانوں کا مسجد حرام میں داخل نہ ہونا بھی ممکن ہے اسی طرح زیرِ تفسیر آیت میں بھی "مگر جتنا آپ کا رب چاہے" کا یہ معنی نہیں ہے کہ ایک محدود مدت کے بعد اللہ تعالیٰ یہ چاہے گا کہ دوزخیوں کو دوزخ سے نکال لیا جائے۔

اہلِ جنت کے جنت میں اور اہلِ نار کے نار میں دوام کے متعلق احادیث

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور رہے وہ لوگ جو نیک بخت ہیں تو وہ جنت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے

جب تک آسمان اور زمین رہیں گے مگر جتنا آپ کا رب چاہے۔

اس آیت میں جو استثناء ہے اس کی بھی وہی توجیہات ہیں جو اس سے پہلی آیت میں بیان کی جا چکی ہیں اور اولیٰ یہ ہے کہ اس کو ان اہلِ جنت پر محمول کیا جائے جو کچھ عرصہ دوزخ میں رہیں گے پھر ان کو دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا اور اب اس آیت کا معنی اس طرح ہو گا کہ نیک بخت لوگ جنت میں ہمیشہ رہیں گے، سوا اس وقت کے جب وہ دوزخ میں تھے، پھر ان کو دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا۔

اس کے بعد فرمایا: "یہ غیر منقطع عطاء ہے۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما' مجاہد اور ابوالعالیہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ اس لیے فرمایا کہ کسی شخص کو یہ وہم نہ ہو کہ اہلِ جنت کا جنت میں قیام منقطع ہو جائے گا بلکہ ان کا جنت میں قیام حتمی اور یقینی طور پر دائمی ہے اور غیر منقطع ہے اور حدیث صحیح میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: موت کو ایک سرمئی مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا اور اس کو جنت اور دوزخ کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا' پھر ایک منادی یہ ندا کرے گا: اے اہلِ جنت! پھر وہ سر اٹھا کر منادی کی طرف دیکھیں گے' منادی کہے گا: تم پہچانتے ہو یہ کیا ہے؟ وہ کہیں گے: ہاں! یہ موت ہے اور سب اس کو دیکھ لیں گے' پھر وہ منادی ندا کرے گا: اے اہلِ نار! وہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھیں گے' منادی کہے گا: تم پہچانتے ہو یہ کیا ہے؟ وہ کہیں گے: ہاں! یہ موت ہے اور وہ سب اس کو دیکھ لیں گے' پھر اس مینڈھے کو ذبح کر دیا جائے گا' پھر وہ منادی کہے گا: اے اہلِ جنت! اب ہمیشہ رہنا ہے' موت نہیں ہے اور اے اہلِ نار! اب ہمیشہ رہنا ہے اور موت نہیں ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۷۳۰' صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۸۴۹' سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۵۶' سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۱۳۱۶' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۳۲۷' سنن الدارمی رقم الحدیث: ۲۸۱۱' مسند احمد ج ۲ ص ۳۷۷)

قرآنِ مجید میں اہلِ جنت کے متعلق ہے:

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ۔ (الدخان: ۵۶)

وہ جنت میں موت کا مزہ نہیں چکھیں گے سوا اس پہلی موت کے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک منادی ندا کرے گا! (اے اہلِ جنت!) تم ہمیشہ تندرست رہو گے اور کبھی بیمار نہیں ہو گے' اور تم ہمیشہ زندہ رہو گے اور تمہیں کبھی موت نہیں آئے گی' اور تم ہمیشہ جوان رہو گے تم کبھی بوڑھے نہیں ہو گے' اور تم ہمیشہ نعمتوں میں رہو گے تم پر کبھی مصیبت نہیں آئے گی۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۸۳۷' سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۲۴۶' مسند احمد ج ۲ ص ۳۱۹' سنن الدارمی رقم الحدیث: ۲۸۲۷' السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۳۹۶۳)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے مخاطب! جن معبودوں کی یہ لوگ عبادت کرتے ہیں' تم ان کے متعلق کسی شک میں نہ پڑنا' یہ ان کی محض اسی طرح عبادت کرتے ہیں جس طرح اس سے پہلے ان کے آباء و اجداد عبادت کرتے تھے' اور بے شک ہم ان کو ان کا پورا پورا حصہ دیں گے جس میں کوئی کمی نہیں ہو گی ○ (ھود: ۱۰۹)

کفار کے حصوں کا بیان

پہلے اللہ تعالیٰ نے سابقہ قوموں کے بت پرستوں کے احوال تفصیل سے بیان فرمائے' پھر اس کے بعد بد بختوں اور نیک بختوں کے اُخروی انجام کا ذکر فرمایا اور اس کے بعد اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کی طرف سلسلہ کلام کو متوجہ فرمایا' اس

آیت میں بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے لیکن مراد عام مخاطب ہے' کیونکہ بت پرستوں کی عبادت کے باطل ہونے کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا شک کرنا تو کسی طرح متصور ہی نہیں ہے' اور اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ بت پرست جن بتوں کی عبادت کرتے ہیں ان کے پاس ان کی پرستش پر کوئی دلیل نہیں ہے' وہ صرف اپنے آباء و اجداد کی اندھی تقلید کرتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور بے شک ہم ان کو ان کا پورا پورا حصہ دیں گے جس میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔ اس ارشاد کے حسبِ ذیل محمل ہیں:

(۱) ان کی بت پرستی کی سزا میں ہم نے ان کے لیے جو عذاب تیار کر رکھا ہے ان کو وہ عذاب پورا پورا دیا جائے گا اور اس میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔

(۲) ہرچند کہ انہوں نے کفر کیا ہے اور حق سے روگردانی کی ہے لیکن دنیا میں ان کے رزق اور معیشت کا جو حصہ ہے ہم اس میں کوئی کمی نہیں کریں گے۔

(۳) ان کو ہدایت پر لانے کے لیے دلائل مہیا کرنے' رسول کو بھیجنے' کتاب نازل کرنے اور ان کے شبہات کا ازالہ کرنے میں جو ان کا حصہ ہے ہم اس میں کوئی کمی نہیں کریں گے' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تینوں محامل مراد ہوں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ

اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تو اس میں اختلاف کیا گیا' اور اگر آپ کے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک

سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ

بات طے نہ ہو گئی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا' اور یہ (لوگ) بے شک اس (قرآن) کی طرف سے زبردست شک

مُرِيْبٍ ۝۱۱۰ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا

میں ہیں ○ اور بے شک آپ کا رب ان میں سے ہر ایک کو (قیامت کے دن) ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا اور بے شک

يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۱۱ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَ

جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ اس کی خوب خبر رکھنے والا ہے ○ پس آپ اسی طرح قائم رہیں جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ (بھی) جنہوں نے

لَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۱۱۲ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ

آپ کے ساتھ (اللہ کی طرف) رجوع کیا ہے' اور (اے لوگو!) تم سرکشی نہ کرنا' بے شک تم جو کچھ کر رہے ہو وہ اس کو خوب دیکھنے والا ہے ○ اور تم ان لوگوں سے

ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ

میل جول نہ رکھو جنہوں نے ظلم کیا ہے ورنہ تمہیں بھی (دوزخ کی) آگ لگ جائے گی' اور اللہ کے سوا تمہارے کوئی مددگار نہیں ہوں گے'



ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿١١٣﴾ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ

پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی ○ اور دن کی دونوں طرفوں میں اور (ابتدائی) رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم رکھیے، بے شک

الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰی لِلذّٰكِرِیْنَ ۚ ﴿١١٤﴾

نیکیاں، گناہوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ ان لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو نصیحت قبول کرنے والے ہیں ○

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿١١٥﴾ فَلَوْلَا كَانَ

اور صبر کیجیے پس بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتا ○ پس تم سے پہلی

مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِیَّةٍ یَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ

امتوں میں ایسے نیک لوگ کیوں نہ ہوئے جو زمین میں فساد پھیلانے سے (لوگوں کو)

فِی الْاَرْضِ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّنْ اَنْجَیْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِیْنَ

روکتے ماسوا چند لوگوں کے جنہیں ہم نے ان سے نجات دی تھی، اور ظالموں نے اس

ظَلَمُوْا مَاۤ اُتْرِفُوْا فِیْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِیْنَ ﴿١١٦﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ

عیش ونشاط کی پیروی کی جس پر وہ جمے ہوئے تھے اور وہ لوگ مجرم تھے ○ اور آپ کے رب کا یہ طریقہ نہیں

لِیُهْلِكَ الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿١١٧﴾ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ

کہ وہ کسی ظلم کی وجہ سے بستیوں کو تباہ کردے جب کہ ان کے رہنے والے نیک ہوں ○ اور اگر آپ کا رب چاہتا

لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ ﴿١١٨﴾ اِلَّا

تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا (لیکن) وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے ○ مگر

مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ

جن پر آپ کے رب نے رحم فرمایا، اور ان کو اسی لیے پیدا فرمایا، اور آپ کے رب کی یہ بات پوری ہوگئی کہ میں ضرور

جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿١١٩﴾ وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَیْكَ

جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا ○ اور ہم آپ کو رسولوں کی تمام خبریں

مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِیْ هٰذِهِ

بیان فرماتے ہیں جن سے ہم آپ کے دل کو تسکین دیتے ہیں، اور ان قصوں میں آپ کے پاس حق آ گیا

الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝۱۲۰ وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ

اور مومنوں کے لیے نصیحت اور عبرت ○ اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے

لَا یُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۝۱۲۱ وَانْتَظِرُوْا ۚ

آپ ان سے کہیے تم اپنی جگہ کام کرتے رہو، ہم (اپنی جگہ) کام کر رہے ہیں ○ اور تم (بھی) انتظار کرو،

اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝۱۲۲ وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَیْهِ

بے شک ہم (بھی) انتظار کر رہے ہیں ○ اور آسمانوں اور زمینوں کے سب غیب اللہ ہی کے ساتھ مختص ہیں اور اسی کی طرف

یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَیْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ

ہر کام لوٹایا جاتا ہے، پس آپ اسی کی عبادت کیجیے اور اسی پر توکل کیجیے۔ اور جو کچھ تم لوگ کرتے ہو اس سے

عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۲۳ ع

آپ کا رب غافل نہیں ہے ○

ع ۱۰

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، تو اس میں اختلاف کیا گیا، اور اگر آپ کے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات طے نہ ہو گئی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا اور یہ (لوگ) بے شک اس (قرآن) کی طرف سے زبردست شک میں ہیں ○ اور بے شک آپ کا رب ان میں سے ہر ایک کو (قیامت کے دن) ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا اور بے شک جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ اس کی خوب خبر رکھنے والا ہے ○ (هود: ۱۱۱-۱۱۰)

توحید و رسالت کا انکار کفار کی پرانی روش ہے

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ کفار مکہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے انکار پر اصرار کر رہے ہیں اور قرآن مجید کی تکذیب پر اصرار کر رہے ہیں، اور اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ یہ کافروں کی کوئی نئی روش نہیں ہے بلکہ ہمیشہ سے کفار کا انبیاء علیہم السلام کے ساتھ یہی معاملہ رہا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی ایک مثال بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی تو ان کی قوم کے لوگوں نے اس میں اختلاف کیا، بعض اس پر ایمان لے آئے اور بعض اس کے انکار پر ڈٹے رہے، اور مخلوق کا ہمیشہ یہی وتیرہ رہا ہے۔

کفار مکہ پر فوراً عذاب نازل نہ کرنے کی وجوہ

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور اگر آپ کے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات طے نہ ہو گئی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ

ہو چکا ہوتا، اس ارشاد کے حسب ذیل محامل ہیں:

(۱) ہر چند کہ کفار مکہ اپنے عظیم جرم کی وجہ سے اس سزا کے اور ایسے عذاب کے مستحق تھے کہ ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ پہلے یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ان پر دنیا میں عذاب نازل نہیں فرمائے گا اور ان کے عذاب کو قیامت کے دن تک موخر فرمائے گا، سو اگر یہ فیصلہ نہ ہوا ہوتا تو ان کا کام تمام ہو چکا ہوتا۔

(۲) اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی فیصلہ نہ کر لیا ہوتا کہ اختلاف کرنے والوں کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ فرمائے گا تو اس دنیا میں ہی حق پرستوں اور باطل پرستوں کے درمیان امتیاز کر دیا جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ یہ امتیاز قیامت کے دن کرے گا، قرآن مجید میں ہے:

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ۔ (یٰسین: ۵۹) اے مجرمو! آج (نیک لوگوں سے) الگ ہو جاؤ۔

(۳) اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ فیصلہ نہ کر لیا ہوتا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے کفار مکہ پر عذاب نازل نہیں فرمائے گا تو ان کے جرائم کی وجہ سے اس پر عذاب آ چکا ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ یہ فرما چکا ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ۔ (الانفال: ۳۳) اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ ان کو اس حال میں عذاب دے کہ آپ ان میں موجود ہوں۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے یہ مقرر ہو چکا ہے کہ اس کی رحمت اس کے غضب پر سابق اور غالب رہے گی اور اس کا احسان اس کے انتقام پر غالب رہے گا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ان پر عذاب آ چکا ہوتا۔

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے رب تبارک و تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے اپنے ہاتھ سے اپنے نفس پر لکھ دیا ہے۔ (از راہ کرم اپنے اوپر لازم کر لیا ہے) کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی۔ (کتاب الاسماء والصفات ص ۳۱۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

وعد اور وعید کی جامع آیت

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور بے شک آپ کا رب ان میں سے ہر ایک کو (قیامت کے دن) پورا پورا بدلہ دے گا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ جس نے رسول کی تصدیق کی یا جس نے رسول کی تکذیب کی یا جس کو دنیا میں جلدی سزا مل گئی یا جس کی سزا موخر کی گئی، وہ سب اس امر میں برابر ہیں کہ ان کو پوری پوری جزا آخرت میں ملے گی، مصدقین کو ان کے ایمان اور اطاعت پر ثواب ہو گا اور مکذبین کو ان کے کفر اور معصیت پر عذاب ہو گا، سو یہ آیت وعد اور وعید کی جامع ہے، پھر اس کی دلیل یہ بیان فرمائی کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ ان کی خوب خبر رکھنے والا ہے، جب کہ وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے تو اس کو ہر ایک کی اطاعت اور معصیت کا علم ہے، اس لیے اس کو یہ علم ہے کہ کون شخص کس جزا کا مستحق ہے، اس لیے وہ کسی کا حق اور اس کی جزا کو ضائع ہونے نہیں دے گا، اور وہ ہر شخص کو اس کے کاموں کی پوری پوری جزا دے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس آپ اسی طرح قائم رہیں جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ (بھی) جنہوں نے آپ کے ساتھ (اللہ کی طرف) رجوع کیا ہے، اور (اے لوگو!) تم سرکشی نہ کرنا، بے شک تم جو کچھ کر رہے ہو، وہ اس کو خوب دیکھنے والا ہے ○ (ھود: ۱۱۲)

سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ نے ان آیتوں کا جو ترجمہ کیا ہے وہ آداب نبوت سے بہت بعید ہے اور کوئی امتی

اپنے نبی کے متعلق ایسی زبان استعمال نہیں کر سکتا، وہ لکھتے ہیں:

پس اے محمد! تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر اور بغاوت سے ایمان و طاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں، ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو جو کچھ تم کر رہے ہو، اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے۔ ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہیں ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔ (ھود: ۱۱۳-۱۱۲)، (تفہیم القرآن ج ۲، ص ۳۷۱)

اور ہم نے ان آیتوں کا اس طرح ترجمہ کیا ہے:

پس آپ اسی طرح قائم رہیں، جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ (بھی) جنہوں نے آپ کے ساتھ (اللہ کی طرف) رجوع کیا ہے، اور (اے لوگو!) تم سرکشی نہ کرنا بے شک تم جو کچھ کر رہے ہو وہ اس کو خوب دیکھنے والا ہے○ اور تم ان لوگوں سے میل جول نہ رکھو جنہوں نے ظلم کیا ہے، ورنہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ لگ جائے گی، اور اللہ کے سوا تمہارے کوئی مددگار نہیں ہوں گے، پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی○

سید مودودی نے ولا تطغوا (اور سرکشی نہ کرو) اور ولا ترکنوا (اور ظالموں سے میل جول نہ رکھو) کا مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو قرار دیا ہے اور امام ابن جریر نے ان دونوں کا مخاطب لوگوں کو قرار دیا ہے جیسا کہ ہم نے ترجمہ کیا ہے، اور باقی مفسرین نے ان دونوں کلموں کا مخاطب آپ کے اصحاب کو قرار دیا ہے اور یہ جسارت صرف سید مودودی نے کی ہے کہ اور سرکشی نہ کرو اور ظالموں سے میل جول نہ رکھو کے خطاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شامل کر لیا ہے۔

استقامت کا لغوی اور عرفی معنی

استقامت کا معنی ہے خط مستقیم جس میں دائیں بائیں بالکل التفات نہ ہو اور مطلقاً کجی نہ ہو، اور احکام شرعیہ پر ہو بہو عمل کرنا، اور ان میں کسی قسم کی کمی اور زیادتی نہ ہو، عقائد، اعمال اور اخلاق میں معتدل اور متوسط طریقہ پر ہمیشہ قائم رہنا، اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی ذات و صفات میں ذرا سی بھی کمی اور زیادتی عقائد میں استقامت سے خارج کر دیتی ہے، مثلاً معتزلہ اللہ تعالیٰ کا عدل ثابت کرنے میں افراط کا شکار ہوئے اور انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ وہ نیکوکاروں کو ثواب عطا فرمائے، حالانکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں، اور وہ استقامت سے نکل گئے، ہمارے دور میں علماء دیوبند اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عموم ثابت کرنے میں افراط اور غلو کا شکار ہوئے اور انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ جھوٹ بولنے پر اور ہر برے کام کرنے پر قادر ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ کامل ص ۸۴، جہد المقل ج ۱، ص ۴۴، ص ۴۱، تنقید متین ص ۱۸۴) حالانکہ اللہ تعالیٰ کے لیے جھوٹ بولنا اور کوئی بھی برا کام کرنا محال ہے، اس طرح وہ استقامت سے نکل گئے اور شیعہ جب اہل بیت میں افراط اور غلو کا شکار ہوئے اور انہوں نے صحابہ کرام پر تبرا کیا اور ناصبی اہل بیت میں تنقیص اور تفریط کے مرتکب ہوئے۔ خارجی اپنے خود ساختہ تقویٰ میں زیادتی کے مرتکب ہوئے، انہوں نے حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ دونوں پر لعنت کی، اور صغائر کے ارتکاب کو بھی کفر قرار دیا۔ اسلم جیراج پوری، عبداللہ چکڑالوی اور غلام احمد پرویز اطاعت اور اتباع قرآن میں افراط کے مرتکب ہوئے اور انہوں نے احادیث کے حجت ہونے کا انکار کر دیا بعض غالی واعظین جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف بیان کرنے پر آتے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا سے بڑھا دیتے ہیں اور جب اولیاء کرام کی تعریف کرنے پر آتے ہیں تو ان کو انبیاء علیہم السلام سے بڑھا دیتے ہیں، بعض اپنے پیروں اور علماء کی تعریف نبیوں سے بھی زیادہ کرتے ہیں، ایسے تمام عقائد اور نظریات استقامت سے خارج ہیں۔

اسی طرح اعمال میں بھی استقامت مطلوب ہے اور بہت مشکل ہے، اللہ کی راہ میں سب مال خرچ کر کے خود بھیک مانگنا

شروع کر دینا افراط ہے اور اللہ کی راہ میں بالکل مال خرچ نہ کرنا تفریط ہے' اور یہ دونوں استقامت سے خارج ہیں۔ نفلی نماز روزے میں انسان اس قدر مشغول رہے کہ بیوی بچوں کے حقوق ادا نہ کر سکے یہ عبادت میں افراط ہے اور بیوی بچوں کی محبت اور ان کے ساتھ مشغولیت میں عبادت کرنے کا' نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کا بالکل خیال نہ رہے یہ تفریط ہے اور یہ دونوں عمل استقامت سے خارج ہیں' اسی طرح جو شخص شہوت اور غضب کے تقاضے پورے کرنے میں افراط یا تفریط کرے وہ بھی استقامت سے خارج ہے' خلاصہ یہ ہے کہ ہر عمل میں اپنے آپ کو متوسط کیفیت اور اعتدال پر رکھنا استقامت ہے اور کسی ایک طرف میلان اور جھکاؤ اختیار کرنا استقامت کے خلاف ہے۔

استقامت کا شرعی معنی

حضرت سفیان بن عبداللہ الثقفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے اسلام کے متعلق کوئی ایسی بات ارشاد فرمایئے کہ میں آپ کے بعد کسی اور سے سوال نہ کروں' آپ نے فرمایا: کہو میں اللہ پر ایمان لایا' پھر اس پر مستقیم رہو۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۳۸' سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۴۱۰' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۹۷۲)

آپ کا یہ ارشاد تمام احکام شرعیہ کو شامل ہے کیونکہ جس شخص نے کسی حکم پر عمل نہیں کیا یا کسی ممنوع کام کا ارتکاب کیا' تو وہ استقامت سے خارج ہو گیا حتیٰ کہ وہ اس تقصیر پر توبہ کرے۔ قرآن مجید میں ہے:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا۔ جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے' پھر وہ اس پر مستقیم رہے۔ (الاحقاف: ۱۳)

یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان لائے پھر وہ اس پر ڈٹ گئے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کر لیا اور تا حیات اس پر کاربند رہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: فاستقم کما امرت۔ (ھود: ۱۱۲) سے زیادہ شدید اور زیادہ شاق تمام قرآن میں کوئی آیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل نہیں ہوئی' اس لیے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے آپ سے کہا کہ آپ پر بہت جلد بڑھاپا آگیا تو آپ نے فرمایا: مجھے سورہ ہود اور ان جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔

(المعجم الکبیر ج ۱۷' ص ۲۸۷' دلائل النبوۃ ج ۱' ص ۳۵۸' سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۲۹۷' حلیۃ الاولیاء ج ۴' ص ۳۵۰' المستدرک' ج ۲' ص ۳۴۳' مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۰' ص ۵۵۴' تاریخ بغداد ج ۳' ص ۱۵۵' المطالب العالیہ رقم الحدیث: ۳۶۵۰)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: استقامت پر رہو' اور ہرگز نہ رہ سکو گے' اور جان لو کہ تمہارے دین میں سب سے بہتر چیز نماز ہے اور وضو کی وہی شخص حفاظت کر سکے گا جو مومن ہو۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۷۷' ۲۷۸' مسند احمد ج ۵' ص ۲۷۷' ۱۲۷۶' المعجم الکبیر ج ۲' ص ۹۸' المستدرک ج ۱' ص ۳۰)

صوفیا کے نزدیک استقامت کا معنی

امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری المتوفی ۴۶۵ھ لکھتے ہیں:

استقامت وہ درجہ ہے جس کے سبب سے تمام امور کمال اور تمام کو پہنچتے ہیں' اور اسی کی وجہ سے تمام نیکیاں حاصل ہوتی ہیں اور جس شخص کو اپنے کسی حال میں استقامت حاصل نہ ہو اس کی کوشش رائیگاں اور اس کی جدوجہد بے سود ہوتی ہے اور جو شخص اپنی کسی صفت میں مستقیم نہ ہو' وہ اپنے مقام سے ترقی نہیں کر سکتا۔ مبتدی میں استقامت کی علامت یہ ہے کہ اس کے معاملات میں سستی نہ آئے اور متوسط میں استقامت کی علامت یہ ہے کہ اس کی منازل میں وقفہ نہ آئے اور منتہی

میں استقامت کی علامت یہ ہے کہ اس کے مشاہدات میں حجاب نہ آئے۔

استاذ ابو علی دقاق رحمہ اللہ نے کہا کہ استقامت کے تین مدارج ہیں: (۱) التقویم یعنی نفوس کی تادیب کرنا، (۲) الاقامت یعنی قلوب کی تہذیب کرنا۔ (۳) الاستقامت یعنی اسرار کو قریب لانا۔

ایک قول یہ ہے کہ صرف اکابر ہی استقامت کی طاقت رکھتے ہیں کیونکہ استقامت کا معنی ہے اپنے معروف کاموں سے باہر آنا رسموں اور عادتوں کو چھوڑنا اور انتہائی صدق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونا۔ واسطی نے کہا استقامت وہ وصف ہے جس کی وجہ سے محاسن مکمل ہوتے ہیں اور اس کے نہ ہونے کی وجہ سے بری باتیں اچھی لگتی ہیں۔ شبلی نے کہا استقامت یہ ہے کہ قیامت ہر وقت تمہارے پیش نظر رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اقوال میں استقامت یہ ہے کہ غیبت کرنے کو ترک کر دیا جائے اور افعال میں استقامت یہ ہے کہ بدعات کو ترک کر دیا جائے اور اعمال میں استقامت یہ ہے کہ سستی کو ترک کر دیا جائے اور احوال میں استقامت یہ ہے کہ مشاہدات میں حجاب نہ رہے۔ استاذ محمد بن حسین فورک کہتے تھے الاستقامت میں سین طلب ماخذ کے لیے ہے یعنی اقامت اور قیام کو طلب کرنا، اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ طلب کرو کہ وہ تم کو توحید پر برقرار رکھے پھر اللہ تعالیٰ سے یہ طلب کرو کہ وہ اس سے کیے ہوئے تمام عہود پر قائم رکھے اور اس کی تمام حدود کی حفاظت پر برقرار رکھے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے یہ توفیق مانگے کہ وہ اس کے تمام احکام اوامر و نواہی پر عمل کرے۔ (الرسالۃ القشیریہ ص ۲۴۱، ۲۴۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور تم ان لوگوں سے میل جول نہ رکھو جنہوں نے ظلم کیا ہے ورنہ تمہیں بھی (دوزخ کی) آگ لگ جائے گی، اور اللہ کے سوا تمہارے کوئی مددگار نہیں ہوں گے، پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔ (ھود: ۱۱۳)

رکون کا لغوی اور عرفی معنی

علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ نے لکھا ہے: رکن کسی چیز کی اس جانب کو کہتے ہیں جس پر ٹھہرا جاتا ہے۔ (المفردات ج ۱، ص ۲۶۸) امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ نے لکھا ہے: جس رکون سے منع فرمایا ہے اس کا معنی ہے ظالموں کے طریقہ اور ان کی روش پر راضی ہونا، اور ان کے طریقہ کی تحسین کرنا اور اس کو خوبصورت سمجھنا اور اس طریقہ کے کسی ایک باب میں شریک ہونا، لیکن اگر کوئی شخص دفع ضرر یا وقتی منفعت کے حصول کے لیے ناپسندیدگی کے ساتھ ان کے طریقہ میں داخل ہو تو وہ رکون نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۶، ص ۴۰۷)

رکون کا شرعی معنی

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس آیت کا معنی ہے مشرکین سے میل جول نہ رکھو۔ ابو العالیہ نے کہا: ان کے اعمال سے راضی نہ ہو ورنہ تمہیں بھی دوزخ کا عذاب ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دوسری روایت ہے: ظالموں سے میل جول نہ رکھو۔ ابن زید نے کہا: اس کا معنی ہے مداہنت نہ کرو، یعنی جو شخص ظالموں سے میل جول رکھے اور ان کے ظلم پر انکار نہ کرے وہ مداہن ہے، یہ آیت ان ظالموں کے متعلق ہے، جو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول، اور اس کی کتاب کے ساتھ کفر کرتے ہوں، اور جو گنہگار مسلمان ہیں تو اللہ تعالیٰ ہی ان کے گناہوں اور ان کے عملوں کو جاننے والا ہے، اور کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی معصیت کے ساتھ صلح کرے اور نہ کسی معصیت کرنے والے کے ساتھ میل جول رکھے۔ (جامع البیان جز ۱۲، ص ۱۶۵، تفسیر امام ابن ابی حاتم جز ۶، ص ۲۰۸۹، ۲۰۹۰)

کفار، بدمذہبوں اور فاسقوں سے میل جول کی ممانعت کے متعلق قرآن مجید کی آیات

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ - (آل عمران: ۲۸)

ایمان والے مومنوں کے سوا کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا، اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں، البتہ اگر تم کو جان کا خطرہ ہو تو پھر کوئی حرج نہیں اور اللہ تمہیں اپنے غضب سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ - (الممتحنہ: ۱)

اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان کو دوستی کا پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ انہوں نے اس حق کا انکار کیا ہے جو تمہارے پاس آیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ - (الممتحنہ: ۱۳)

اے ایمان والو! ایسے لوگوں سے دوستی نہ رکھو جن پر اللہ تعالیٰ نے غضب فرمایا ہے بے شک وہ آخرت سے مایوس ہو چکے، جیسے کفار قبر والوں سے مایوس ہو چکے ہیں۔

کفار، بدمذہبوں اور فاسقوں سے میل جول کی ممانعت کے متعلق احادیث

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے آخر میں کچھ ایسے لوگ ظاہر ہوں گے جو تمہارے سامنے ایسی حدیثیں بیان کریں گے جن کو تم نے سنا ہوگا نہ تمہارے باپ دادا نے، تم ان سے دور رہنا وہ تم سے دور رہیں گے۔ (مقدمہ صحیح مسلم ج ۱، ص ۹، مطبوعہ کراچی)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر امت کے مجوس ہیں اور اس امت کے مجوس وہ لوگ ہیں جو منکر تقدیر ہیں، وہ اگر مرجائیں تو ان کے جنازہ پر نہ جاؤ اور اگر وہ بیمار ہوں تو ان کی عیادت نہ کرو۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۶۹۱)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اے عائشہ! جن لوگوں نے دین میں تفریق کی وہ ایک گروہ تھا، وہ بدعتی اور اپنی خواہش کے پیروکار ہیں، ان کی کوئی توبہ نہیں ہے، میں ان سے بری ہوں اور وہ مجھ سے بری ہیں۔ (المعجم الصغیر رقم الحدیث: ۵۶۰، مجمع الزوائد ج ۱، ص ۱۸۸)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب بنو اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہو گئے تو ان کے علماء نے ان کو منع کیا، وہ باز نہ آئے، وہ علماء ان کی مجالس میں بیٹھتے رہے اور ان کے ساتھ مل کر کھاتے پیتے رہے، تب اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کے دل بعض سے مشابہ کر دیئے، اور ان پر (حضرت) داؤد اور (حضرت) عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی کیونکہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ (المائدہ: ۷۸) اور دوسری روایت (ترمذی: ۳۰۴۸) کے آخر میں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ پھر آپ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ پس فرمایا: نہیں، حتیٰ کہ تم ظالم کے ہاتھ پکڑ لو اور اس کو حق پر سختی کے ساتھ مجبور کرو (یعنی اس کے علاوہ کسی صورت میں معصیت کاروں کے ساتھ نہ بیٹھو)

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۴۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۳۳۷، ۴۳۳۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۰۶، مسند احمد ج ۱، ص ۳۹۱، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۵۰۳۵، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۱۰۲۶۶، ۱۰۲۶۵، ۱۰۲۶۴، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۵۳۳، جامع

البیان رقم الحدیث: ۹۶۰۴)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے منتخب فرمالیا اور میرے لیے اصحاب اور سسرال کو منتخب فرمالیا، عنقریب ایسے لوگ آئیں گے جو میرے اصحاب اور سسرال والوں کو برا کہیں گے اور ان کے عیب نکالیں گے، تم ان کی مجلس میں مت بیٹھنا، ان کے ساتھ پینا نہ ان کے ساتھ کھانا اور نہ ان کے ساتھ نکاح کرنا۔

(کتاب الضعفاء للعقیلی ج۱، ص۱۲۶، رقم الحدیث: ۲۶۴، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ)

یہ حدیث صحیح ہے، امام عقیلی نے اس حدیث کی مزید تین سندیں بیان کی ہیں۔

ہم روزانہ وتر کی دعاء قنوت میں یہ کہتے ہیں:

نخلع ونترک من یفجرک۔ جو تیری نافرمانی کرتا ہے ہم اس کو چھوڑ دیتے ہیں اور اس سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲، ص ۳۱۴، مطبوعہ کراچی، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۲، ص ۲۱۱، اعلاء السنن ج ۶، ص ۱۰۹)

اکابر صحابہ پر شیعہ کا سب و شتم اور زیر تفسیر آیت سے اس کا جواب

غالی شیعہ اور تبرائی رافضی چھ صحابہ کو چھوڑ کر تمام صحابہ کرام کو کافر اور منافق کہتے ہیں، خصوصاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت معاویہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کو بہت سب و شتم کرتے ہیں۔ ملا باقر مجلسی متوفی ۱۱۱۰ھ لکھتا ہے:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جہنم کے سات دروازے ہیں، ایک دروازے سے داخل ہونے والے فرعون، ہامان اور قارون ہیں، یہ ابوبکر، عمر اور عثمان سے کنایہ ہے اور دوسرے دروازے سے بنوامیہ داخل ہوں گے جو ان کے ساتھ مخصوص ہے۔ (حق الیقین ص ۵۰۰، مطبوعہ کتاب فروشے ایران، ۱۳۵۷ھ)

براءت میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ان چار بتوں سے بیزاری طلب کرتے ہیں، یعنی ابوبکر، عمر، عثمان اور معاویہ سے اور چار عورتوں سے یعنی عائشہ، حفصہ، ہند اور ام الحکم سے اور ان کے معتقدوں اور پیروکاروں سے اور یہ لوگ اللہ کی مخلوق میں سب سے بدتر ہیں، اور اللہ، رسول اور ائمہ سے کیا ہوا عہد اس وقت تک پورا نہیں ہوگا جب تک کہ ان کے دشمنوں سے بیزاری کا اظہار نہ کیا جائے۔ (حق الیقین ص ۵۱۹، مطبوعہ تہران ایران، ۱۳۵۷ھ)

علل الشرائع میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ جب امام مہدی کا ظہور ہوگا تو وہ عائشہ کو زندہ کر کے ان پر حد جاری کریں گے اور ان سے فاطمہ کا انتقام لیں گے۔ (حق الیقین ص ۳۴۷، مطبوعہ ایران، ۱۳۵۷ھ)

امام مہدی ہر دو (حضرت ابوبکر اور حضرت عمر) کو قبر سے باہر نکالیں گے، وہ اپنی اسی صورت پر تروتازہ قبر سے نکالے جائیں گے، پھر فرمائیں گے کہ ان کا کفن اتارو، سو ان کا کفن حلق سے اتارا جائے گا، وہ ان کو اللہ کی قدرت سے زندہ کریں گے، اور تمام مخلوق کو جمع ہونے کا حکم دیں گے، پھر ابتداء عالم سے لے کر اخیر عالم تک جتنے ظلم اور کفر ہوئے ہیں ان کا گناہ ان دونوں پر لازم کریں گے اور وہ یہ اعتراف کریں گے کہ اگر وہ روز اول خلیفہ کا حق غصب نہ کرتے تو یہ گناہ نہ ہوتے، پھر ان کو درخت پر چڑھانے کا حکم دیں گے، اور آگ کو حکم دیں گے کہ زمین سے باہر آئے اور ان کو درخت کے ساتھ جلا دے اور ہوا کو حکم دیں گے کہ ان کی راکھ کو اڑا کر دریا میں بہا دے۔ (حیات القلوب ج ۲ ص ۶۱۱-۶۱۰، مطبوعہ تہران)

عیاش نے سند معتبر کے ساتھ حضرت امام محمد باقر سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا

سے تشریف لے گئے تو چار کے سوا تمام لوگ مرتد ہو گئے: علی بن ابی طالب، مقداد، سلمان اور ابوذر۔
(حق الیقین ص ۳۶۲-۳۶۱، مطبوعہ تہران، ۱۳۵۷ھ)

اور یہ بشمول شیعہ سب مسلمانوں کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب صحابہ کے ساتھ میل جول رکھا، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی صاحبزادیوں کو اپنے حبالۂ عقد میں داخل فرمایا اور اپنی دو صاحبزادیوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عقد میں داخل کیا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن کو اپنے نکاح میں داخل فرمایا اور اپنی وفات تک ان تمام صحابہ کے ساتھ رشتہ محبت قائم رکھا اور ان کے بہت فضائل اور مناقب بیان فرمائے، اگر بالفرض بقول شیعہ یہ صحابہ کافر، ظالم اور فاسق تھے تو لازم آئے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظالموں سے میل جول رکھا اور ظالموں سے میل جول رکھنے والے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اس آیت (ھود: ۱۱۳) میں فرمایا ہے کہ اس کو دوزخ کی آگ جلائے گی تو سوچئے کہ عداوتِ صحابہ کے جنون میں یہ لوگ کہاں تک پہنچ گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور دن کی دونوں طرفوں میں اور (ابتدائی) رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم رکھئے، بے شک نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ ان لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو نصیحت قبول کرنے والے ہیںO اور صبر کیجئے پس بے شک اللہ، نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتاO (ھود: ۱۱۵-۱۱۴)

نماز کی اہمیت

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے استقامت کا حکم دیا تھا اور اس کے متصل بعد اس آیت میں نماز پڑھنے کا حکم دیا اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد سب سے بڑی عبادت نماز پڑھنا ہے، اور جب کبھی کسی شخص کو مصیبت یا پریشانی لاحق ہو تو اس کو نماز پڑھنی چاہیے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی چیز سے غم زدہ یا فکر مند ہوتے تو نماز پڑھتے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۳۱۹)

دن کی دو طرفوں میں فقہاء صحابہ و تابعین کے اقوال

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

مجاہد اور محمد بن کعب القرظی نے کہا: دن کے دو طرفوں سے مراد فجر، اور ظہر اور عصر ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن اور ابن زید نے کہا: دن کی دو طرفوں سے مراد فجر اور مغرب ہیں۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد فجر اور عصر ہیں۔ قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام ابن جریر نے کہا: ان اقوال میں اولیٰ یہ ہے کہ دن کی دو طرفوں سے مراد فجر اور مغرب کو لیا جائے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر سب کا اجماع ہے کہ دن کی دو طرفوں میں سے ایک فجر ہے اور یہ نماز طلوع آفتاب سے پہلے پڑھی جاتی ہے تو پھر دن کی دوسری طرف مغرب ہونی چاہیے کیونکہ مغرب کی نماز غروب آفتاب کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ (جامع البیان جز ۱۲ ص ۱۶۷، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

نماز فجر کو سفید اور روشن وقت میں پڑھنے، عصر کو دو مثل سایہ کے بعد پڑھنے اور وتر کے وجوب میں امام ابوحنیفہ کی تائید

امام فخرالدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

دن کی دو طرفوں کے متعلق متعدد اقوال ہیں اور ان میں صحت کے زیادہ قریب قول یہ ہے کہ اس سے مراد فجر اور عصر

کی نمازیں ہیں کیونکہ دن کی دو طرفوں میں سے ایک طرف طلوع شمس ہے اور دوسری طرف غروب شمس ہے' پس طرف اول فجر کی نماز ہے' اور طرف ثانی سے مغرب کی نماز مرادلینا جائز نہیں کیونکہ وہ زلفا من اللیل (ابتدائی رات کے کچھ حصے) میں داخل ہے۔ پس واجب ہے کہ طرف ثانی سے مراد عصر کی نماز ہو اور جب یہ بات واضح ہو گئی تو یہ آیت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اس قول پر دلیل ہے کہ فجر کو روشن کر کے نماز پڑھنا افضل ہے۔ (فجر کے ابتدائی وقت میں اندھیرا ہوتا ہے اور اس کو موخر کیا جائے حتیٰ کہ سفیدی اور روشنی پھیل جائے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس وقت میں نماز پڑھنا افضل ہے جبکہ امام شافعی کے نزدیک فجر کے ابتدائی وقت میں جب اندھیرا ہوتا ہے نماز پڑھنا افضل ہے۔) اور یہ آیت اس پر بھی دلیل ہے کہ عصر کی نماز کو موخر کر کے پڑھنا افضل ہے' کیونکہ اس آیت کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کہ نماز کو دن کی دو طرفوں میں پڑھنا واجب ہے اور دن کی دو طرفیں طلوع شمس کا اوّل وقت ہے اور اسی طرح غروب شمس کا اوّل وقت ہے' اور اس پر امت کا اجماع ہے کہ ان وقتوں میں بغیر ضرورت شرعیہ کے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے' لہٰذا اس آیت کے ظاہر پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا اس آیت کو مجاز پر محمول کرنا واجب ہے' اس لیے اب اس آیت کا معنی اس طرح ہوا کہ نماز کو اس وقت قائم کیجئے جو دن کی دو طرفوں کے قریب ہے کیونکہ کسی چیز کے قریب پر بھی اس چیز کا اطلاق کر دیا جاتا ہے' لہٰذا صبح کی نماز اس وقت پڑھی جائے جو طلوع شمس کے قریب ہے اور یہ وہ وقت ہے جب سفیدی اور روشنی ہوتی ہے کیونکہ اندھیرے وقت کی بہ نسبت سفیدی کا وقت طلوع شمس کے زیادہ قریب ہے۔ اور عصر کی نماز اس وقت پڑھی جائے جو غروب شمس کے قریب ہے۔ اور یہ وہ وقت ہے جب ہر چیز کا سایہ دو مثل ہو چکا ہوتا ہے اور ایک مثل سایہ کی بہ نسبت دو مثل سایہ کا وقت غروب شمس کے زیادہ قریب ہے اور مجاز حقیقت کے جتنا زیادہ قریب ہو اس پر لفظ کو محمول کرنا زیادہ اولیٰ ہے' پس ثابت ہو گیا کہ اس آیت کا ظاہر ان دونوں مسئلوں میں امام ابوحنیفہ کے مذہب کی تقویت اور تائید کرتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وزلفا من اللیل اور زلف جمع کا صیغہ ہے سو اس کا معنی ہے رات کے تین قریبی اوقات' کیونکہ کم از کم جمع کا اطلاق تین پر ہوتا ہے اور ایک وقت مغرب کے لیے ہے اور دوسرا وقت عشاء کے لیے ہے تو پھر تیسرا وقت وتر کے لیے ہونا چاہیے اور اس سے یہ ماننا پڑے گا کہ وتر کی نماز واجب ہے' اور یہ بھی امام ابوحنیفہ کے قول کی تائید کرتا ہے' کیونکہ امام ابوحنیفہ نے یہ کہا ہے کہ وتر کی نماز واجب ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۴۰۸' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

پانچ وقت کی نمازوں سے گناہوں کے معاف ہونے کے متعلق احادیث

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں۔

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما' محمد بن کعب قرظی' مجاہد' حسن' ضحاک' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ' حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور مسروق نے کہا: ان نیکیوں سے مراد پانچ نمازیں ہیں' یہ پانچ نمازیں گناہوں کو اس طرح مٹا دیتی ہیں جس طرح سے پانی میل کو مٹا دیتا ہے اور دھوڈالتا ہے۔

(جامع البیان جز ۱۲' ص ۱۷۲-۱۷۱' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: بتاؤ کہ اگر تم میں سے کسی شخص کے دروازے پر ایک دریا ہو' جس میں وہ ہر روز دن میں پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو تو تم کیا کہتے ہو'

کیا اس کے بدن پر میل باقی رہے گا؟ صحابہ نے کہا: اس کے بدن پر میل باقی نہیں رہے گا۔ آپ نے فرمایا: پانچ نمازوں کی ایسی ہی مثال ہے، اللہ تعالیٰ ان کی وجہ سے اس کے گناہوں کو مٹا دے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۲۸، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۶۶۷، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۸۶۸، سنن النسائی رقم الحدیث: ۴۶۱، مسند احمد ج ۲ ص ۳۷۹، سنن الدارمی رقم الحدیث: ۱۱۸۷، مسند ابوعوانہ ج ۲ ص ۲۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۱۷۲۶، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۱ ص ۳۶۱، ج ۳ ص ۶۲، شرح السنہ رقم الحدیث: ۳۴۲، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۳۸۹)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غلام حمران بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عثمان کو دیکھا، انہوں نے پانی کا ایک برتن منگایا پھر اس میں سے تین مرتبہ پانی انڈیل کر اپنے ہاتھوں کو دھویا، پھر اپنا دایاں ہاتھ برتن میں ڈال کر پانی لیا اور کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا، پھر تین مرتبہ اپنے چہرے کو دھویا، پھر تین مرتبہ اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھویا، پھر اپنے سر کا مسح کیا، پھر تین مرتبہ اپنے پیروں کو ٹخنوں سمیت دھویا، پھر کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے میرے اس وضو کی مثل وضو کیا، پھر اس نے دو رکعت نماز پڑھی کہ اس نماز میں اس نے اپنے آپ سے باتیں نہیں کیں (دل میں از خود خیال آنا ممنوع نہیں ہے، ممنوع یہ ہے کہ انسان خود دنیاوی باتوں کو سوچنا اور ان میں غور و فکر کرنا شروع کر دے) تو اس کے تمام پچھلے گناہوں کو معاف کر دیا جائے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۵۹، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۲۶، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۰۶، سنن النسائی رقم الحدیث: ۸۴، مسند احمد رقم الحدیث: ۴۱۸، عالم الکتب ۱۴۱۹ھ، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۱۳۹، سنن الدارمی رقم الحدیث: ۶۹۹، مسند البزار رقم الحدیث: ۴۲۹، ۴۳۰، صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: ۳، ۱۵۸)

ابوعثمان بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا، حضرت سلمان نے ایک خشک شاخ کو پکڑ کر زور زور سے ہلانا شروع کیا، حتیٰ کہ اس کے پتے جھڑنے لگے، پھر کہا اے ابوعثمان تم مجھ سے پوچھتے نہیں کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں؟ میں نے کہا: آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ انہوں نے کہا: جب مسلمان وضو کرتا ہے اور اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر پانچ نمازیں پڑھتا ہے تو اس کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جس طرح یہ پتے جھڑ رہے ہیں اور پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِیْنَ ○ (ھود: ۱۱۴)

اور دن کی دونوں طرفوں میں اور (ابتدائی) رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم رکھئے، بے شک نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں۔ یہ ان لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو نصیحت قبول کرنے والے ہیں ○

(مسند احمد رقم الحدیث: ۲۴۱۰۸، سنن ابو داؤد طیالسی رقم الحدیث ۶۵۲، سنن الدارمی رقم الحدیث: ۷۲۵)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے کہا میں نے مدینہ کے ایک سرے پر ایک عورت کو گرا لیا اور میں نے جماع کے سوا اس سے سب کچھ کر لیا، اور اب میں حاضر ہوں آپ میرے متعلق فیصلہ فرمائیں۔ حضرت عمر نے کہا اللہ تعالیٰ نے تجھ پر پردہ رکھ لیا تھا، کاش تو بھی اپنا پردہ رکھتا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوئی جواب نہیں دیا، وہ شخص چلا گیا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو بھیج کر اسے بلوایا اور اس پر یہ آیت پڑھی۔ واقم الصلٰوة طرفی النهار وزلفا من الیل ان الحسنات یذهبن السیئات

ذلک ذکری للذاکرین O (ھود: ۱۱۴) قوم میں سے ایک شخص نے کہا کیا یہ حکم اس کے ساتھ خاص ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، یہ حکم تمام لوگوں کے لیے ہے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۷۶۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۴۶۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۱۲، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۷۳۲۴، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۱۳۸۲۹، مسند احمد ج ۱، ص ۴۴۵، صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: ۳۱۳، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۵۳۴۳، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۱۷۳۰، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۸، ص ۲۴۱)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا، پس ایک شخص آیا اور اس نے کہا یارسول اللہ! میں نے حد کا ارتکاب کرلیا ہے، آپ مجھ پر حد جاری فرمائیں۔ آپ نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا، پھر نماز کا وقت آگیا تو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوگئے تو وہ شخص آپ کے سامنے جا کھڑا ہوا اور کہنے لگا یارسول اللہ! میں نے ایک حد کا ارتکاب کیا ہے، آپ مجھ پر کتاب اللہ کا حکم نافذ کیجئے، آپ نے پوچھا کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟ اس نے کہا: جی پڑھی ہے، آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہارے گناہ کو یا فرمایا تمہاری حد کو معاف فرمادیا ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۸۲۳، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۷۶۴)

یہ وہی شخص ہے جس کا اس سے پہلی حدیث میں ذکر تھا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک عورت کا بوسہ لے لیا، اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر اس واقعہ کی خبر دی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اقم الصلوٰۃ طرفی النھار وزلفا من الیل ان الحسنات یذھبن السیئات۔ (ھود: ۱۱۴) اس شخص نے پوچھا یارسول اللہ! کیا یہ حکم صرف میرے لیے ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ حکم میری تمام امت کے لیے ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۲۶، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۷۶۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۳۹۸، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۷۳۲۴)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، اور اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ بتایئے کہ ایک آدمی ایک عورت سے ملا، ان کے درمیان جان پہچان نہیں تھی اور ایک مرد ایک عورت کے ساتھ جماع کے علاوہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ اس نے کرلیا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: واقم الصلوٰۃ طرفی النھار۔ الایہ۔ (ھود: ۱۴) آپ نے اس کو یہ حکم دیا کہ وہ وضو کرکے نماز پڑھے، حضرت معاذ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا یارسول اللہ! یہ حکم اس کے ساتھ خاص ہے یا تمام مومنین کے لیے ہے؟ آپ نے فرمایا بلکہ یہ حکم تمام مومنین کے لیے ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۱۳، مسند احمد، ج ۵، ص ۲۴۴، المعجم الکبیر ج ۲۰، رقم الحدیث: ۲۷۸، ۲۷۷، سنن الدار قطنی ج ۱، ص ۱۳۴، المستدرک ج ۱، ص ۱۳۵، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۱، ص ۱۲۵)

حضرت ابوالیسر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میرے پاس ایک عورت کھجوریں خریدنے کے لیے آئی، میں نے اس سے کہا اس سے زیادہ اچھی کھجوریں میرے گھر میں ہیں، پھر میں نے اس سے نفسانی خواہش کا قصد کیا اور اس کا بوسہ لے لیا، پھر میں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس واقعہ کا ذکر کیا، انہوں نے فرمایا تم اپنے اوپر پردہ رکھو، اللہ سے توبہ کرو، اور کسی سے یہ واقعہ بیان نہ کرنا، لیکن مجھ سے صبر نہ ہوسکا، میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس واقعہ کا ذکر کیا، انہوں نے (بھی)

کہا اپنا پردہ رکھو، توبہ کرو اور کسی کو نہ بتاؤ، مجھ سے پھر صبر نہ ہو سکا، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو اس واقعہ کی خبر دی۔ آپ نے پوچھا کیا تم نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کسی غازی کے گھر والوں کی اس کی غیر موجودگی میں خبر گیری کی ہے؟ میں نے کہا نہیں! (امام ابن جریر کی روایت میں ہے پھر پوچھا کیا تم نے کسی غازی کو جہاد کا سامان مہیا کیا ہے؟ میں نے کہا نہیں!) حتیٰ کہ میں نے یہ تمنا کی کہ کاش میں اس وقت اسلام لایا ہوتا اور میں نے یہ گمان کیا کہ میں دوزخیوں میں سے ہوں۔ راوی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر اس آیت کی وحی نازل فرمائی: واقم الصلوة طرفی النهار- الایہ- (هود: ۱۱۴) حضرت ابو الیسر نے کہا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ پر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ آپ کے اصحاب نے پوچھا یا رسول اللہ! یہ آیت اس کے ساتھ خاص ہے یا تمام لوگوں کے لیے عام ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تمام لوگوں کے لیے عام ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۱۵، المعجم الکبیر ج ۹، رقم الحدیث: ۱۷۳، جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۳۸۰)

اس جگہ یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ صحابہ کرام بھی اس قسم کے فحش کام کرتے تھے، کیونکہ صحابہ کرام کی خطائیں تکمیل دین کا ذریعہ تھیں، جن بعض صحابہ سے یہ لغزش ہو گئی، ان کی یہ لغزش سورۂ ہود کی اس آیت کے نزول کا سبب بنی اور قیامت تک کی امت کے لیے یہ رحمت عام ہوئی کہ نیکیاں گناہوں کے مٹنے کا ذریعہ بن گئیں۔

پانچ وقت کی نمازوں کے علاوہ دیگر عبادات سے گناہوں کے معاف ہونے کے متعلق احادیث

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں یہ لکھا ہے کہ پانچ وقت کی نمازیں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں لیکن احادیث میں دیگر عبادات کے متعلق بھی تصریح ہے کہ وہ گناہوں کو مٹا دیتی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ایمان کی حالت میں ثواب کی نیت سے لیلۃ القدر میں قیام کیا، اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۵، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۷۶۰، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۲۰۶، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۳۴۱۳، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۰۵۴۴، عالم الکتب، مسند الحمیدی رقم الحدیث: ۹۵۰، سنن الدارمی رقم الحدیث: ۱۷۲۳، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۱۳۷۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۳۲۶، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۶۸۳، صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: ۱۸۹۴)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ایمان کی حالت میں ثواب کی نیت سے رمضان میں قیام کیا، اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۷۵۹، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۲۰۶، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۳۴۱۳، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۰۵۴۴، عالم الکتب، ۱۴۱۹ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ایمان کی حالت میں ثواب کی نیت سے روزہ رکھا اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۸، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۷۶، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۲۰۶، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۳۴۱۳، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۰۵۴۴، عالم الکتب، ۱۴۱۹ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص نے اللہ کے لیے حج کیا، اس نے دوران حج جماع کیا نہ جماع کی باتیں کیں، نہ کوئی گناہ کیا تو وہ حج کر کے اس طرح لوٹے گا جس

طرح اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۵۲۱، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۳۵۰، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۶۲۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۸۸۹، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۸۱۱، مسند احمد رقم الحدیث: ۷۱۳۶، عالم الکتب، مسند حمیدی رقم الحدیث: ۱۰۰۴، سنن الدارمی رقم الحدیث: ۱۸۰۳، صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: ۲۵۱۴)

ابن شماسہ بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس گئے، اس وقت وہ موت کے قریب تھے اور رو رہے تھے، انہوں نے کہا جب اللہ نے میرے دل میں اسلام ڈالا تو میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اپنا ہاتھ بڑھایئے تاکہ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کروں، آپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، آپ نے فرمایا: اے عمرو! کیا ہوا؟ میں نے کہا میرا ارادہ ہے کہ میں کچھ شرط لگاؤں، آپ نے پوچھا تم کیا شرط عائد کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا میری مغفرت کر دی جائے، آپ نے فرمایا: کیا تم کو معلوم نہیں، اے عمرو! اسلام پہلے گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور ہجرت پہلے گناہوں کو مٹا دیتی ہے، اور حج پہلے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۲۱، صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: ۲۵۱۵، الترغیب والترہیب رقم الحدیث: ۱۶۴۲)

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان کھڑے ہو کر فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور اللہ پر ایمان لانا سب سے افضل عمل ہیں، ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا یا رسول اللہ! یہ بتلایئے اگر میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں تو کیا اس سے میرے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! اگر تم اس حال میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے جاؤ کہ تم صبر کرنے والے ہو، ثواب کی نیت کرنے والے ہو، آگے بڑھ کر حملہ کرنے والے ہو اور دشمن سے پیٹھ پھیرنے والے نہ ہو، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے کیا کہا تھا؟ انہوں نے کہا یہ بتایئے اگر میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں تو کیا اس سے میرے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! بشرطیکہ تم صبر کرنے والے ہو، ثواب کی نیت کرنے والے ہو، آگے بڑھ کر حملہ کرنے والے ہو اور دشمن سے پیٹھ پھیرنے والے نہ ہو (تو سب گناہ معاف کر دیئے جائیں گے) ماسوا قرض کے، یہ حضرت جبریل نے مجھ سے ابھی کہا ہے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۸۸۵، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۷۱۲، موطا امام مالک رقم الحدیث: ۹۳۳، مسند حمیدی رقم الحدیث: ۴۲۵، سنن سعید بن منصور رقم الحدیث: ۲۵۵۳، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۵ ص ۳۱۰، مسند احمد ج ۵ ص ۲۹۷، سنن الدارمی رقم الحدیث: ۲۴۱۷، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۴۶۵۴، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۱۵۷، ۳۱۵۶)

نیکیوں سے صغیرہ گناہ مٹتے ہیں یا کبیرہ؟

گناہ دو قسم کے ہیں: گناہ صغیرہ اور گناہ کبیرہ۔ فرض کا ترک اور حرام کا ارتکاب گناہ کبیرہ ہے اور واجب کا ترک اور مکروہ تحریمی کا ارتکاب گناہ صغیرہ ہے۔ فقہاء اسلام نے یہ کہا ہے کہ نیکیوں سے صرف گناہ صغیرہ معاف ہوتے ہیں اور گناہ کبیرہ توبہ سے معاف ہوتے ہیں یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے یا اللہ تعالیٰ کے فضل محض سے، نیکیوں سے گناہ کبیرہ معاف نہیں ہوتے، صرف گناہ صغیرہ معاف ہوتے ہیں اس پر دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: پانچ نمازیں، ایک جمعہ سے دوسرا جمعہ اور ایک رمضان سے دوسرا رمضان ان کے درمیان گناہوں کا کفارہ ہیں جب کہ کبائر سے اجتناب کرے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۴، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۰۸۶، صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: ۳۱۴، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۱۷۳۳، مسند احمد ج ۲، ص ۴۸۴، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۲، ص ۴۶۷، شرح السنہ رقم الحدیث: ۳۴۵)

علامہ نووی نے کہا ہے: اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ نیکیوں سے کبائر کے سوا تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں، کبائر نیکیوں سے معاف نہیں ہوتے۔ قاضی عیاض نے کہا: جو حدیث میں مذکور ہے یہی اہل سنت کا مذہب ہے، کبائر کی معافی توبہ سے ہوتی ہے یا اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل سے۔ ملا علی قاری نے مرقات میں لکھا ہے کہ نماز، روزہ اور حج کبائر کا کفارہ نہیں ہوتے، کبائر کا کفارہ صرف توبہ ہے۔ امام ابن عبدالبر نے لکھا ہے اس پر اجماع ہے (میں کہتا ہوں کہ حج میں انسان میدان عرفات میں توبہ کرتا ہے اور اس توبہ سے کبائر سمیت تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں) علامہ طاہر پٹنی نے لکھا ہے کہ حقوق العباد میں قصاص ضرور لیا جائے گا خواہ صغیرہ ہوں، اور کبائر توبہ سے معاف ہوں گے۔ جب صغائر معاف ہونے کے بعد نیکیاں بچ جائیں تو ان نیکیوں سے کبائر میں تخفیف ہو جائے گی اور اگر کسی انسان کی صرف نیکیاں ہوں اور اس کا کوئی گناہ نہ ہو، صغیرہ نہ کبیرہ تو پھر نیکیوں سے اس کے درجات بلند ہو جائیں گے۔

(تحفۃ الاحوذی ج ۱، ص ۶۵۴، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۹ھ)

مرجئہ کے استدلال کا جواب

امام رازی نے لکھا ہے: مرجئہ کا مذہب ہے کہ ایمان لانے کے بعد انسان کو کسی معصیت پر عذاب نہیں ہوگا، وہ اپنے مذہب پر اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ سب سے بڑی نیکی ایمان ہے اور سب سے بڑا گناہ کفر ہے تو جب ایمان لانے سے کفر مٹ جاتا ہے تو کفر سے چھوٹے درجے کے جو گناہ ہیں وہ ایمان لانے سے بطریق اولیٰ مٹ جائیں گے پس ثابت ہوگیا کہ مومن کو کسی معصیت پر کوئی عذاب نہیں ہوگا، امام رازی نے ان کی اس دلیل کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کا جواب بہت واضح ہے کہ یہ نصوص صریحہ کے مقابلہ میں قیاس ہے۔ قرآن مجید میں بکثرت صریح آیات ہیں کہ نماز نہ پڑھنے، زکوٰۃ نہ دینے، قتل کرنے، سود کھانے اور مال یتیم کھانے سے سخت عذاب ہوگا اور اس باب میں احادیث بہت زیادہ ہیں۔

اس کے بعد فرمایا: اور صبر کیجئے، اس کا ایک معنی ہے نماز کی مشقت پر صبر کیجئے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔ (طٰہٰ: ۱۳۲)

اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیں اور (خود بھی) اس کی مشقت پر صبر کریں۔

اور اس کا دوسرا معنی ہے کفر کی ایذاؤں پر صبر کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس تم سے پہلی امتوں میں ایسے نیک لوگ کیوں نہ ہوئے جو زمین میں فساد پھیلانے سے (لوگوں کو) روکتے ماسوا چند لوگوں کے جنہیں ہم نے ان سے نجات دی تھی اور ظالموں نے اس عیش و نشاط کی پیروی کی جس پر وہ جمے ہوئے تھے اور وہ لوگ مجرم تھے۔ (ھود: ۱۱۶)

سابقہ امتوں پر عذاب نازل ہونے کے دو سبب

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ اس نے پچھلی امتوں پر ایسا ہمہ گیر عذاب نازل فرمایا تھا جس نے ان قوموں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا ماسوا حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے کیونکہ ان کی قوم نے عذاب کے آثار دیکھتے ہی اللہ تعالیٰ سے توبہ کرلی تھی، اور اس آیت میں ان پر عذاب نازل کرنے کے دو سبب بیان فرمائے ہیں: پہلا سبب یہ بیان فرمایا ان میں نیک

لوگوں کی ایسی جماعت نہ تھی جو برے لوگوں کو برائیوں سے اور فساد پھیلانے سے روکتی اور دوسرا سبب یہ ہے کہ وہ لوگ فانی لذات، شہوات اور طاقت اور اقتدار کے نشہ میں ڈوبے ہوئے تھے، اس آیت سے یہ سبق حاصل کرنا چاہیے کہ اگر لوگ نیکی کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا چھوڑ دیں اور فانی لذتوں اور باطل شہوتوں کی تکمیل میں ڈوب جائیں تو ان پر عذاب الٰہی کے نازل ہونے کا خطرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور آپ کے رب کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ کسی ظلم کی وجہ سے بستیوں کو تباہ کردے جب کہ ان کے رہنے والے نیک ہوں۔ (ھود: ۱۱۷)

دنیا میں شرک قابل درگزر ہے ظلم لائق درگزر نہیں

اس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے، جیسا کہ ایک اور آیت میں شرک کو ظلم عظیم فرمایا ہے:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ (لقمان: ۱۳) بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی کا حق دوسرے کو دینا ظلم ہے، اور عبادت اللہ کا حق ہے اور یہ حق دوسروں کو دینا ظلم ہے، اور جب مخلوق میں کسی کا حق دوسرے کو دینا ظلم ہے تو خالق کا حق دوسرے کو دینا سب سے بڑا ظلم ہے۔ اور اب اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف اس وجہ سے کسی بستی کو تباہ نہیں کرتا کہ اس کے رہنے والے شرک کرتے ہوں اور وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کرتے ہوں، خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف اس وجہ سے کسی قوم پر ہمہ گیر عذاب نازل نہیں فرماتا کہ وہ قوم شرک اور کفر کا اعتقاد رکھتی ہو بلکہ وہ اس قوم پر اس لیے عذاب نازل فرماتا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر ظلم اور زیادتی کرتے ہیں، اسی وجہ سے فقہاء نے کہا ہے کہ حقوق اللہ میں وسعت اور درگزر کی گنجائش ہے اور حقوق العباد میں تنگی اور سختی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے حقوق معاف فرمادیتا ہے اور حقوق العباد اس وقت تک معاف نہیں کرتا جب تک کہ بندے خود معاف نہ کردیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کفر کے ساتھ حکومت باقی رہتی ہے اور ظلم کے ساتھ حکومت باقی نہیں رہتی اور اس پر دلیل یہ ہے کہ حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام کی قوموں پر اس وقت عذاب آیا جب انہوں نے لوگوں کو ایذاء پہنچائی اور مخلوق پر ظلم کیا۔ حدیث میں ہے:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: لوگ جب کسی ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھوں کو نہ پکڑیں تو قریب ہے اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنی طرف سے عذاب نازل فرمائے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۶۸، مسند الحمیدی رقم الحدیث: ۳، مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۱۷۵-۱۷۴، مسند احمد ج ۱ ص ۵، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۳۳۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۰۵، مسند البزار رقم الحدیث: ۶۵، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۱۱۵۷، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۱۲۸، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۳۰۴، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۲۵۳۲)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا (لیکن) وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے○ مگر جن پر آپ کے رب نے رحم فرمایا، اور ان کو اسی لیے پیدا فرمایا، اور آپ کے رب کی یہ بات پوری ہوگئی کہ میں ضرور جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے بھردوں گا○ (ھود: ۱۱۹-۱۱۸)

دنیا کے مشہور فرقے

ان دو آیتوں میں یہ بتایا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو سب کو جبراً مومن اور ایک امت بنادیتا لیکن اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ اس کی

مخلوق میں کچھ ایسے لوگ ہوں جو اپنے اختیار سے اس پر ایمان لائیں، اس لیے اس نے انسانوں اور جنات کو اختیار دیا، پھر یہ عقائد اور اصول میں اختلاف کرتے رہے، کچھ لوگ تو سرے سے خدا کے منکر ہیں اور اس کائنات کو ایک اتفاقی حادثہ مانتے ہیں یا ارتقائی عمل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ بے دین اور دہریہ ہیں اور کچھ لوگ خدا کے وجود کے قائل ہیں لیکن توحید کے قائل نہیں ہیں، نہ رسولوں کو اور آسمانی کتابوں کو مانتے ہیں۔ یہ لوگ بت پرست، بدھ، ہندو اور سکھ ہیں اور کچھ لوگ خدا، رسول اور آسمانی کتابوں کو مانتے ہیں ان میں سے بعض تورات کو مانتے ہیں اور اس کو غیر منسوخ مانتے ہیں اور عزیر کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں، یہ یہودی ہیں اور بعض انجیل کو مانتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور ان کو تین میں سے ایک مانتے ہیں، یہ عیسائی ہیں اور بعض کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی بنا کر بھیجا اور آپ پر قرآن مجید نازل کیا اور قرآن مجید نے سابقہ آسمانی کتابوں کے احکام منسوخ کر دیئے اور اب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے سوا اور کسی شریعت پر عمل کرنے سے نجات نہیں ہوگی اور اللہ تعالیٰ اسلام کے سوا اور کسی دین کو قبول نہیں فرمائے گا، یہ لوگ مسلمان ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے مگر "جن پر آپ کے رب نے رحم فرمایا" اس سے مسلمان ہی مراد ہیں۔

اختلاف مذموم ہونے کے باوجود مجتہدین کا اختلاف کیوں محمود ہے؟

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اختلاف کی مذمت فرمائی ہے اور اختلاف کرنے والوں کو غیر مرحوم قرار دیا ہے، اسی طرح حدیث میں بھی اختلاف کی مذمت کی گئی ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہود اکہتر یا بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے، اسی طرح نصاریٰ بھی، اور میری امت تہتر فرقوں میں منقسم ہوگی۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۶۴۰، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۵۹۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث ۳۹۹۱، مسند احمد ج ۲، ص ۳۳۲، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۵۹۱۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۲۴۷، المستدرک ج ۱، ص ۱۲۸)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے لوگ ضرور وہ کام کریں گے جو بنو اسرائیل کرتے تھے، برابر، برابر، حتیٰ کہ اگر ان میں سے کسی نے اپنی ماں کے ساتھ کھلم کھلا بدکاری کی ہو تو میری امت میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو یہ عمل کریں گے اور بے شک بنو اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے اور ایک فرقے کے سوا وہ سب دوزخ میں جائیں گے۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہوں گے، فرمایا: جس طریقہ پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۶۴۱، المستدرک ج ۱، ص ۱۲۹، مسند احمد ج ۳، ص ۱۲۰، ۱۴۵)

اب یہ سوال ہوتا ہے کہ جب قرآن مجید اور مستند احادیث میں اختلاف کی مذمت کی گئی ہے تو فقہاء مجتہدین کا ایک دوسرے سے اختلاف کرنا کس طرح درست ہوگا اور یہ کہنا کس طرح درست ہوگا کہ تمام ائمہ مجتہدین برحق ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید اور احادیث میں جس اختلاف کی مذمت کی گئی ہے وہ عقائد کا اختلاف ہے اور ائمہ مجتہدین کے درمیان عقائد میں اختلاف نہیں ہے بلکہ مسائل فرعیہ میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف باعث رحمت ہے کیونکہ اس سے امت کے لیے عمل میں آسانیاں فراہم ہوتی ہیں۔ اور مسائل فرعیہ میں اختلاف کے جواز کی اصل یہ حدیث ہے:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ احزاب سے واپس ہوئے تو

آپ نے ہم سے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے نماز نہ پڑھے۔ بعض مسلمانوں نے راستہ میں عصر کی نماز کا وقت پالیا، ان میں سے بعض نے کہا ہم بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے نماز نہیں پڑھیں گے اور بعض نے یہ کہا بلکہ ہم نماز پڑھیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے یہ ارادہ نہیں فرمایا تھا، پھر انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے ان میں سے کسی کو ملامت نہیں فرمائی۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۹۴۶، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۷۷۰)

اللہ، رسول اور کتاب ایک ہے پھر اسلام میں فرقے کیوں ہیں؟

بعض لوگ علماء پر یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ اللہ بھی ایک ہے، رسول بھی ایک ہے، قرآن بھی ایک ہے، پھر مسلمانوں میں اتنے فرقے کیوں ہیں، کوئی سنی ہے، کوئی شیعہ ہے، کوئی دیوبندی ہے، کوئی بریلوی ہے، کوئی اہل حدیث ہے؟ اور یہ مسائل فرعیہ کا اختلاف نہیں ہے عقائد کا اختلاف ہے اور یہ سب ایک دوسرے کو کافر یا گمراہ کہتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نظریات میں اختلاف انسان کی فطرت کا تقاضا ہے جیسا کہ زبان رسالت کے مطابق یہود اور نصاریٰ کے بہتر فرقے ہوئے اور آپ نے اس امت میں بھی تہتر فرقوں کی پیش گوئی فرمائی، دنیاوی امور میں دیکھ لیں، فلسفیوں اور سائنس دانوں میں اختلاف ہوتا ہے، ڈاکٹروں کی تشخیص میں اختلاف ہوتا ہے، وکلاء میں اختلاف ہوتا ہے، ججوں میں اختلاف ہوتا ہے حتیٰ کہ ایک جج کسی مجرم کو پھانسی دینے کا فیصلہ کرتا ہے اور دوسرا جج اس کی مخالفت کرتا ہے۔ ۱۹۷۸ء میں سپریم کورٹ کے ججوں کی اکثریت نے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کا فیصلہ کیا اور ایک جج صفدر علی شاہ نے بھٹو کو بے قصور قرار دیا، اسی طرح سیاست دانوں میں اختلاف ہوتا ہے۔ ایک مسلم لیگ تھی جس نے پاکستان بنایا تھا، پھر جنرل ایوب کے دور میں تین مسلم لیگ بن گئیں۔ ایک کونسل مسلم لیگ اور ایک کنونشن مسلم لیگ اور ایک قیوم لیگ اور اب ہمارے دور (۲۰۰۰-۱۹۹۹ء) میں بھی تین مسلم لیگ ہیں: ایک نواز لیگ، ایک جونیجو لیگ اور ایک پیر پگارا لیگ، اسی طرح ایک پیپلز پارٹی تھی۔ پھر ایک پروگریسو پیپلز پارٹی بنی، ایک نیشنل پیپلز پارٹی ہے۔ ایک پیپلز پارٹی شہید بھٹو گروپ ہے اور ایک پاکستان پیپلز پارٹی ہے، اسی طرح اور بھی بہت سی سیاسی جماعتیں مختلف دھڑوں میں بٹ گئیں اور یہ لوگ اپنے مخالفین کو غدار کہتے ہیں اور ڈاکٹرز، وکلاء، جج، فلاسفر، اور سیاست دان، یہ سب ایک دوسرے سے اختلاف کریں تو کوئی بری بات نہیں ہے اور علماء کا ایک دوسرے سے اختلاف ہو تو اس کو طعن اور تشنیع کا سبب بنایا جائے، یہ کوئی انصاف کی بات تو نہیں ہے۔

ابتداءً اسلام قبول کرنے والا کس فرقے میں جائے

ایک سوال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اسلام میں اتنے فرقے ہیں اگر کوئی شخص ابتداءً اسلام قبول کرنا چاہے تو اس کے لیے یہ مشکل ہوگی کہ وہ کس فرقے کے اسلام کو قبول کرے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ صرف اسلام کے بنیادی احکام پر عمل کرے۔ نماز پڑھے، روزہ رکھے، صاحب نصاب ہو تو سال کے بعد زکوٰۃ ادا کرے اور استطاعت ہو تو حج کرے اور تمام حرام کاموں سے بچے اور مختلف فرقوں کی باریکیوں اور ان کے نظری مسائل میں نہ پڑے، باقی رہا یہ کہ وہ کس فقہ کے مطابق نماز پڑھے تو جس ملک میں جس فقہ کی اکثریت ہو، اس کے مطابق اپنی عبادت انجام دے اور تلاش حق کے لیے مختلف فرقوں کے دینی لٹریچر کا مطالعہ جاری رکھے اور مطالعہ کے بعد جو مسلک اس کو قرآن مجید اور احادیث کے قریب تر دکھائی دے اس کو قبول کرلے اور یہ کوئی ایسا مشکل اور لاینحل مسئلہ نہیں ہے۔

جہنم کا جنوں اور انسانوں سے بھرنا

اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور آپ کے رب کی یہ بات پوری ہوگئی کہ میں ضرور جہنم کو جنوں اور انسانوں

سے بھر دوں گا۔" اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ چیز پہلے سے تھی کہ اللہ تعالیٰ جنات اور انسانوں کو اختیار دے گا تو ان میں سے بعض اپنے اختیار سے دین حق کو قبول کریں گے، ایمان لائیں گے اور نیک کام کریں گے اور بعض دلائل اور شواہد دیکھنے کے باوجود دین حق کو مسترد کردیں گے اور اپنے آباء واجداد کی تقلید کی وجہ سے کفریہ عقائد پر جمے رہیں گے، سو کچھ لوگ جنت کے مستحق ہوں گے اور کچھ لوگ دوزخ کے مستحق ہوں گے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ میں ضرور جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا اور جب جنوں اور انسانوں کی اکثریت نے کفر کو اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ کی یہ بات پوری ہو گئی۔

حدیث میں ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت اور دوزخ نے اپنے رب کے سامنے ایک دوسرے سے بحث کی، جنت نے کہا: کیا وجہ ہے کہ جنت میں صرف کمزور اور پسماندہ لوگ ہی داخل ہوتے ہیں۔ دوزخ نے کہا: مجھے یہ فضیلت ہے کہ مجھ میں متکبرین داخل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جنت سے فرمایا: تم میری رحمت ہو، اور دوزخ سے فرمایا: تم میرا عذاب ہو، میں جس کو چاہوں گا، تم میں داخل کرکے سزا دوں گا، تم میں سے ہر ایک کے لیے (لوگوں سے) بھرنا ہے، رہی جنت تو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی پر ظلم نہیں فرمائے گا، اور وہ جس کو چاہے گا دوزخ کے لیے پیدا فرمائے گا اور ان کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا، پھر دوزخ تین مرتبہ کہے گی کیا کچھ اور بھی ہیں، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ دوزخ میں (اپنی شان کے مطابق) اپنا قدم رکھ دے گا، پھر دوزخ بھر جائے گی اور اس کا بعض حصہ بعض میں مدغم ہو جائے گا پھر دوزخ کہے گی، بس بس بس!

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۴۴۹، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۸۴۶، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۲۰۸۹۳، مسند احمد رقم الحدیث: ۸۱۴۹، عالم الکتب، ۱۴۱۹ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم آپ کو رسولوں کی تمام خبریں بیان فرماتے ہیں جن سے ہم آپ کے دل کو تسکین دیتے ہیں اور ان قصوں میں آپ کے پاس حق آگیا اور مومنوں کے لیے نصیحت اور عبرت○ (ھود: ۱۲۰)

انبیاء سابقین کے قصص بیان کرنے کی حکمت

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے متعدد انبیاء سابقین علیہم السلام کے قصص بیان فرمائے اور اس آیت میں ان قصص کو نازل کرنے کا فائدہ بیان فرمایا، اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو فرائض رسالت کی ادائیگی پر اور کفار کی پہنچائی ہوئی اذیتوں اور سختیوں پر ثابت قدم رکھا جائے، کیونکہ انسان جب کسی مشکل اور مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے، پھر دیکھتا ہے کہ اور لوگ بھی اس مشکل اور مصیبت میں مبتلا ہیں تو اس پر وہ مشکل اور مصیبت آسان ہو جاتی ہے، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جب کوئی سختی عام ہو تو وہ آسان ہو جاتی ہے تو جب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے انبیاء سابقین علیہم السلام کے واقعات اور قصص بیان کیے گئے اور آپ نے یہ جان لیا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان کی قوموں نے اسی طرح کا ظالمانہ اور اذیت ناک سلوک کیا تھا تو پھر آپ پر کفار مکہ کی پہنچائی ہوئی اذیتیں آسان ہو گئیں اور آپ کے لیے ان تکلیفوں پر صبر کرنا مشکل نہ رہا۔

اس آیت میں فرمایا ہے: اور ہم آپ کو رسولوں کی تمام خبریں بیان فرماتے ہیں اور ایک اور آیت میں اس کے خلاف ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ۔ (المومن: ۷۸)

اور بے شک ہم نے آپ سے پہلے (بھی) رسول بھیجے، ان میں سے بعض کے قصے ہم نے آپ سے بیان فرمائے اور ان میں سے بعض کے قصے ہم نے آپ سے نہیں بیان فرمائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ مومن کی اس آیت میں ماضی میں بعض انبیاء کے قصص بیان کرنے کی نفی ہے اور سورۂ ھود کی اس آیت میں زمانہ حال میں تمام انبیاء کی خبریں بیان کرنے کا ثبوت ہے اس لیے ان آیتوں میں کوئی مخالفت اور تعارض نہیں ہے۔

حق، نصیحت اور عبرت کا فرق

اس آیت میں فرمایا ہے کہ ہم نے اس سورت میں انبیاء سابقین کی خبریں بیان فرمائی ہیں حالانکہ دوسری سورتوں میں بھی انبیاء سابقین کی خبریں بیان فرمائی ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ اس سورت میں زیادہ تفصیل کے ساتھ انبیاء سابقین کی خبریں بیان فرمائی ہیں۔

پھر فرمایا: "ان قصوں میں آپ کے پاس حق آگیا اور مومنوں کے لیے نصیحت اور عبرت۔" حق سے مراد توحید، رسالت اور قیامت کے وہ دلائل ہیں جن کو اس سورت میں بیان کیا گیا ہے اور نصیحت سے مراد نیک اعمال کی تلقین اور ہدایت ہے اور عبرت سے مراد ہے وہ عذاب جو کفار کی بداعمالیوں پر دیا گیا اس عبرت کو ذکریٰ سے تعبیر فرمایا، ذکریٰ کے معنی ہیں یاد دلانا، کیونکہ انسان نے عالم میثاق میں اللہ تعالیٰ کو رب ماننے کا وعدہ کیا تھا اور جب وہ اس عالم دنیا میں آیا تو اپنا کیا ہوا وہ وعدہ بھول گیا تو اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بھیج کر اس کو وہ وعدہ یاد دلایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے، آپ ان سے کہئے کہ تم اپنی جگہ کام کرتے رہو، ہم (اپنی جگہ) کام کر رہے ہیں○ اور تم (بھی) انتظار کرو، بے شک ہم (بھی) انتظار کر رہے ہیں○ اور آسمانوں اور زمینوں کے سب غیب اللہ ہی کے ساتھ مختص ہیں اور اسی کی طرف ہر کام لوٹایا جاتا ہے○ پس آپ اسی کی عبادت کیجئے اور اسی پر توکل کیجئے، اور جو کچھ تم لوگ کرتے ہو، اس سے آپ کا رب غافل نہیں ہے○ (ھود: ۱۲۳-۱۲۱)

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت موثر انداز میں تبلیغ فرمادی اور اللہ تعالیٰ کی حجت پوری کردی اس کے باوجود کفار مکہ ایمان نہیں لائے اور آپ کو اذیتیں پہنچانے کے درپے رہے تو فرمایا: اچھا تم مجھے ضرر پہنچانے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہو وہ کرو، اور ہم اسی طرح دین کی تبلیغ کرتے رہیں گے، اور یہ جو فرمایا ہے کہ تم جو کچھ ہمارے خلاف کر سکتے ہو وہ کرو یہ تہدید اور وعید کے طور پر فرمایا ہے، ان کو کسی شرعی حکم کا مکلف نہیں کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے فرمایا تھا:

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُم بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِم بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ۔ (بنی اسرائیل: ۶۴)

اور تو اپنی آواز کے ساتھ ان میں سے جن کو ڈگمگا سکتا ہے، ان کو ڈگمگا دے اور اپنے سواروں اور پیادوں کے ساتھ ان پر حملہ کر دے اور ان کے اموال اور اولاد میں ان کا شریک بن جا اور ان سے جھوٹے وعدے کر۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بطور تہدید فرمایا:

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (الکہف: ۲۹)

آپ کہئے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، سو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔

اور اس کے بعد دوسری آیت میں فرمایا: اور تم (بھی) انتظار کرو اور بے شک ہم (بھی) انتظار کر رہے ہیں' یعنی شیطان نے تم کو جو فقر و فاقہ سے ڈرایا ہے' تم اس کا انتظار کرو اور ہم اس رحمت اور مغفرت کا انتظار کر رہے ہیں' جس کا اللہ تعالیٰ نے ہم سے وعدہ کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا: تم اپنی ہلاکت کا انتظار کرو اور ہم تم پر عذاب کا انتظار کر رہے ہیں۔

اور اس کے بعد فرمایا: اور آسمانوں اور زمینوں کے سب غیب اللہ ہی کے ساتھ مختص ہیں۔ آیت کے اس حصہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کا اظہار فرمایا ہے اور اس کے بعد فرمایا: اور اسی کی طرف ہر کام لوٹایا جاتا ہے' اس حصہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا اظہار فرمایا ہے' اللہ تعالیٰ کی متعدد صفات ہیں' یہاں خصوصیت کے ساتھ علم اور قدرت کا ذکر فرمایا کیونکہ علم اور قدرت ہی دو ایسی صفات ہیں جن پر مدار الوہیت ہے' کیونکہ اگر اس کو علم نہ ہو تو اس کو کیسے پتا چلے گا کہ اس کی مخلوق اس کے احکام پر عمل کر رہی ہے یا نہیں اور اگر قدرت نہ ہو تو وہ اپنے اطاعت گزاروں کو جزا کیسے دے گا اور اپنے نافرمانوں کو سزا کیسے دے گا۔

اس کے بعد فرمایا: پس آپ اسی کی عبادت کیجئے اور اسی پر توکل کیجئے' کیونکہ انسان کی سعادت کا پہلا درجہ اللہ کی عبادت ہے اور آخری درجہ اللہ پر توکل ہے۔

اور آخر میں فرمایا: اور جو کچھ تم لوگ کرتے ہو' اس سے آپ کا رب غافل نہیں ہے' اس سے مقصود یہ ہے کہ وہ اطاعت گزاروں کی اطاعت کو ضائع نہیں فرمائے گا اور منکروں اور سرکشوں کو مزید ڈھیل نہیں دے گا' وہ قیامت کے دن سب کو میدان حشر میں زندہ کر کے جمع کرے گا اور ہر شخص سے ذرہ ذرہ کا حساب لے گا اور انجام کار نیکوکاروں کو جنت عطا فرمائے گا اور بدکاروں کو دوزخ میں دھکیل دے گا۔ اے اللہ! ہم کو اپنے فضل سے جنت عطا فرمانا اور دوزخ سے محفوظ رکھنا۔

حرفِ آخر

آج ۲۴ رمضان ۱۴۲۰ھ / ۲ جنوری ۲۰۰۰ء بروز اتوار ظہر سے قبل سورۂ ہود کی تفسیر ختم ہوگئی' الہ العالمین! جس طرح آپ نے اس سورت کی تفسیر مکمل کرائی ہے' باقی قرآن مجید کی تفسیر بھی مکمل کرادے' اور اس تفسیر کے قارئین سے التماس ہے کہ وہ میرے لیے اسلام پر استقامت' ایمان پر خاتمہ' اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کتاب کی مقبولیت' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت کے حصول کی دعا کریں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین' افضل الانبیاء والمرسلین وعلی الہ واصحابہ وازواجہ واولیاء امتہ وعلماء ملتہ اجمعین۔




سُورَةُ يُوسُفَ
(١٢)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

سورۃ یوسف

سورۃ یوسف کا نام، اس کا مقام نزول اور زمانہ نزول

اس سورت کا نام واحد ہے اور وہ سورہ یوسف ہے، اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس سورت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں اس کے علاوہ اور کسی سورت میں آپ کا مفصل تذکرہ نہیں ہے، بلکہ سورۃ الانعام اور سورۃ مومن کے علاوہ اور کسی سورت میں آپ کا اسم مبارک بھی مذکور نہیں ہے، یہ سورت مکی ہے۔

حافظ سیوطی نے امام النحاس، امام ابوالشیخ اور امام ابن مردویہ کے حوالوں سے ذکر کیا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورہ یوسف مکہ میں نازل ہوئی ہے اور امام ابن مردویہ نے حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سورۃ یوسف مکہ میں نازل ہوئی۔ (الدر المنثور ج ۴ ص ۴۹۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ)

بعض روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ یوسف مکہ مکرمہ میں ہجرت سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔

امام حاکم سند صحیح کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ حضرت رفاعہ بن رافع زرقی اور ان کے خالہ زاد بھائی مکہ مکرمہ گئے، یہ چھ انصار کے روانہ ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے، وہ دونوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے عرض کیا ہم پر اسلام پیش کیجئے، آپ نے ان پر اسلام پیش کیا اور پوچھا آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں کو کس نے پیدا کیا ہے؟ ہم نے کہا اللہ نے، آپ نے پوچھا تم کو کس نے پیدا کیا ہے؟ ہم نے کہا اللہ نے، پھر پوچھا جن بتوں کی تم عبادت کرتے ہو، ان کو کس نے بنایا ہے؟ انہوں نے کہا ہم نے، پھر پوچھا خالق عبادت کا مستحق ہے یا مخلوق، کیا بت اس بات کے مستحق ہیں کہ تم ان بتوں کی عبادت کرو حالانکہ تم نے خود ان کو بنایا ہے، جبکہ اللہ ہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے بہ نسبت ان چیزوں کے جن کو تم نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اور میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اس کی دعوت دیتا ہوں کہ تم یہ گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے اور میں اللہ کا رسول ہوں، اور رشتے جوڑنے اور دشمنی ترک کرنے اور لوگوں سے بغض نہ رکھنے کی دعوت دیتا ہوں۔ ہم نے کہا جس دین کی طرف آپ دعوت دے رہے ہیں وہ کیسے باطل ہو سکتا ہے، یہ دین تو بہت بلند باتوں اور محاسن اخلاق سے ہے، آپ ہماری سواریوں کو ٹھہرائیں حتیٰ کہ ہم بیت اللہ

ہو آئیں، پھر معاذ بن عفراء آپ کے پاس بیٹھے اور میں نے کعبہ کا طواف کیا، اور میں نے سات تیر نکالے اور میں نے دعا کی کہ اگر (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین برحق ہے تو اس کا تیر نکال دے، اور سات مرتبہ اسی کی تائید میں تیر نکلا تو میں نے چلا کر کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، لوگ میرے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے کہا یہ دیوانہ ہے، کسی نے کہا یہ شخص اپنے آبائی دین سے نکل گیا، میں نے کہا بلکہ یہ مومن ہے، پھر میں مکہ کی بالائی طرف گیا جب مجھے معاذ نے دیکھا تو کہا رافع کا چہرہ تو ایسا ہو گیا ہے کہ پہلے ایسا کبھی نہ تھا، پھر میں آیا اور ایمان لے آیا، اور ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ یوسف اور اقرء باسم ربک سکھائی، پھر ہم مدینہ لوٹ آئے۔

امام ابن سعد عکرمہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جب مدینہ آئے تو وہ لوگوں کو قرآن مجید کی تعلیم دینے لگے، عمرو بن الجموح نے ان کے پاس ایک آدمی بھیج کر پوچھا تم ہمارے پاس یہ کیا چیز لے کر آئے ہو۔ انہوں نے کہا اگر تم چاہو تو ہم تمہارے پاس آکر تم کو قرآن مجید سنائیں، انہوں نے کہا ہاں! پھر انہوں نے ان سے ایک دن مقرر کیا اور ان کے سامنے سورہ یوسف کی یہ آیات تلاوت کیں: الٓرٰ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ۔

امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک یہودی عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اس وقت آپ سورہ یوسف کی تلاوت فرما رہے تھے۔ اس نے کہا یا محمد! آپ کو اس کی کس نے تعلیم دی ہے؟ آپ نے فرمایا مجھے اللہ نے اس کی تعلیم دی ہے، وہ یہودی عالم یہ سن کر متعجب ہوا، اس نے واپس جا کر یہود سے کہا اللہ کی قسم! (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اسی طرح قرآن مجید پڑھتے ہیں جس طرح تورات نازل ہوئی ہے، پھر وہ یہودیوں کی ایک جماعت کے ساتھ حضور کے پاس آیا، انہوں نے آپ کو تورات میں مذکور صفت سے پہچان لیا اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھوں کے درمیان مہر نبوت کو دیکھا، انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۂ یوسف کی تلاوت کو سننا شروع کر دیا اور وہ اسی وقت مسلمان ہو گئے۔ امام ابن ابی شیبہ نے عبداللہ بن عامر بن ربیعہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فجر کی نماز میں سورہ یوسف پڑھتے ہوئے سنا ہے۔

(الدر المنثور ج ۴ ص ۴۹۵ - ۴۹۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ)

حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام کا تذکرہ

امام عبدالرحمن بن علی الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور ان ہی کے زمانہ میں نبوت سے سرفراز کیے گئے۔ حضرت اسحق علیہ السلام حضرت یعقوب کی طرف مائل تھے اور ان ہی کے حق میں دعا کرتے تھے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے عیص سے کہا تم میرے لیے شکار کا گوشت لاؤ میں تمہارے لیے دعا کروں گا۔ حضرت یعقوب نے یہ بات سن لی، وہ حضرت اسحق کے لیے گوشت لے کر آئے۔ حضرت اسحق نے ان کو عیص سمجھ کر ان کے حق میں دعا کر دی، عیص کو جب پتا چلا تو انہوں نے حضرت یعقوب کو دھمکی دی کہ میں تم کو قتل کر دوں گا، حضرت یعقوب بھاگ کر اپنے ماموں لابان کے پاس چلے گئے۔ ان کے ماموں نے اپنی بیٹی لیّا سے ان کا نکاح کر دیا، اس کے بطن سے ان کے ہاں چھ بیٹے پیدا ہوئے: روبیل، شمعون، یہوذا، لاوی، یساخر اور زیالون یا زبلون، پھر لیّا فوت ہو گئیں تو حضرت یعقوب نے ان کی بہن راحیل سے نکاح کر لیا، ان کے بطن سے حضرت یوسف اور بن یامین پیدا ہوئے، اس لفظ کا معنی ہے درد کا بیٹا کیونکہ راحیل نفاس میں فوت ہو گئیں تھیں۔

امام طبری نے ذکر کیا ہے کہ عربی میں بن یامین کا معنی شداد (بہت سخت) ہے' ان دو بیویوں کے علاوہ حضرت یعقوب کے ہاں ایک اور بیوی سے چار بیٹے مزید پیدا ہوئے اور ان کے کل بارہ بیٹے تھے۔ حضرت یعقوب کو تمام مخلوق میں سب سے زیادہ محبت حضرت یوسف علیہ السلام سے تھی۔

اہل کتاب یہ کہتے ہیں کہ یہ سب نبی تھے' ان کے ناموں میں اختلاف ہے' ان کے سب سے بڑے بیٹے کا نام روبیل ہے' پھر شمعون ہیں ان کو سمعان بھی کہتے ہیں۔ ان کے بعد یہوذا ہیں' ان کا ریاست میں سب سے بڑا مرتبہ تھا۔ حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام یہوذا کی اولاد سے ہیں' اس کے بعد لاوی ہیں اور حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام ان کی اولاد سے ہیں' پھر یساخر ہیں اس کے بعد زبلون یا زیالون ہیں' پھر جادر ہیں' پھر اشیرز ہیں' پھر ودان ہیں پھر نفشالی یا نفشال ہیں' پھر بنیامین اور حضرت یوسف ہیں۔ روبیل' شمعون' یہوذا' لاوی' یساخر اور زبلون کی ماں کا نام لیا بنت لابان ہے' ان کی ایک بہن بھی تھی جس کا نام دنیا تھا' وہ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی بنی۔

جب حضرت یوسف راحیل سے پیدا ہوئے تو حضرت یعقوب نے ان کو اپنی بہن کی گود میں دے دیا' ان ہی نے حضرت یوسف کی پرورش کی' سب سے پہلی مصیبت جو حضرت یوسف علیہ السلام پر نازل ہوئی وہ یہ تھی کہ حضرت اسحٰق کی پہلی بیٹی اور حضرت یعقوب کی بڑی بہن اور حضرت یوسف کی پھوپھی کے پاس حضرت اسحٰق کا منطقہ (کمر پر باندھنے کا پٹکا یا پیٹی) تھا' جو وراثت سے ان کے پاس آیا تھا' جب انہوں نے حضرت یوسف کو گود میں لیا تو وہ ان سے بہت زیادہ محبت کرنے لگیں' حتیٰ کہ انہوں نے حضرت یعقوب سے حضرت یوسف کو مانگا اور کہا میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی' حضرت یعقوب نے کہا میں بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا' ان کی بہن نے کہا اس کو چند دن میرے پاس رہنے دو' جب حضرت یعقوب ان کے پاس سے چلے گئے تو ان کی بہن نے وہ منطقہ حضرت یوسف کے کپڑوں کے نیچے ان کی کمر سے باندھ دیا' پھر انہوں نے کہا حضرت اسحٰق کا منطقہ گم ہو گیا اس کو تلاش کرو وہ کہاں ہے' پھر وہ منطقہ حضرت یوسف سے برآمد ہوا' ان کی شریعت میں یہ مقرر تھا کہ جس کے پاس سے چوری کی چیز برآمد ہو اس کو مالک کی تحویل میں دے دیا جاتا تھا' لہٰذا حضرت یوسف' ان کی تحویل میں دے دیئے گئے اور حضرت یعقوب کی بہن کے پاس ہی رہے حتیٰ کہ وہ فوت ہو گئیں' اسی وجہ سے حضرت یوسف کے بھائیوں نے کہا تھا کہ:

اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ (یوسف: ۷۷) اگر اس (بن یامین) نے چوری کی ہے تو اس سے پہلے اس کا بھائی چوری کر چکا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا باقی قصہ سورۂ یوسف میں تفصیل سے آ رہا ہے۔ وہاں ان شاء اللہ ہم اس پر مفصل گفتگو کریں گے۔ (المنتظم ج ۱ ص ۱۹۷-۱۹۶' تاریخ الطبری ج ۱ ص ۲۳۲-۲۳۱' الکامل فی التاریخ لابن اثیر ج ۱ ص ۷۸)

سورۂ یوسف کے مقاصد اور اہداف

یہ سورت ہود کے بعد اور الحجر سے پہلے نازل ہوئی ہے' اور جمہور کے قول کے مطابق ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا نمبر ترپن ہے اور جس قدر تفصیل سے حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا گیا ہے' قرآن مجید میں کسی اور نبی کا قصہ اس قدر تفصیل کے ساتھ نہیں ذکر کیا گیا۔

اس سورت کی اہم غرض حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو بیان کرنا ہے کہ ان کے بھائیوں نے ان سے کیسا ظالمانہ سلوک کیا' حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے ظلم پر صبر کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے صبر کی ان کو بہترین جزا عطا فرمائی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان پر غلبہ پانے کے بعد ان کو کسی قسم کی ملامت نہیں کی اور ان کو معاف کر دیا' اسی طرح سیدنا محمد صلی

اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی قوم کے کافروں نے ظالمانہ سلوک کیا' وہ آپ کے راستے میں کانٹے بچھا دیتے' کبھی نماز کی حالت قیام میں آپ کے گلے میں چادر کا پھندا ڈال کر آپ کا گلا گھونٹنے لگتے' کبھی حالت سجدہ میں آپ کی مبارک پشت پر اوجھڑی رکھ دیتے' طائف میں تبلیغ کرنے گئے تو پتھر مار مار کر آپ کو لہولہان کر دیا' آپ انہیں نیکی اور دائمی نعمتوں کی طرف بلاتے تو وہ طعن تشنیع کے تیروں اور سب و شتم سے آپ کو جواب دیتے' وہ آپ کے قتل کے درپے ہوئے اور آپ کو وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا لیکن ایک وقت آیا کہ ان تمام ظالموں اور جفاکاروں کے سر آپ کی تلوار کے نیچے تھے' آپ ان پر ہر طرح غالب اور حاکم تھے اور یہ محکوم اور مغلوب تھے' آپ ان سے ہر ظلم کا بدلہ لینے پر قادر تھے لیکن آپ نے ان کو معاف کر دیا اور صرف یہی فرمایا: آج کے دن میں تم کو کوئی ملامت نہیں کرتا۔

اس سورت سے معلوم ہوا کہ خواب کی تعبیر بھی ایک علم ہے اور یہ علم اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے' اور یہ کہ رشتہ دار ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں' اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے لطف سے نوازتا ہے اور یہ کہ وفا' امانت' عفت' صدق' صبر اور توبہ سے بندہ اللہ کی بارگاہ میں قرب اور مقبولیت حاصل کرتا ہے اور تمام اعمال کا مدار خاتمہ پر ہوتا ہے' اور یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام عفت اور پارسائی کے سب سے بلند مقام پر تھے' ان کو حسین اور جوان عورت نے گناہ کی دعوت دی اور وہ ذی اقتدار بھی تھی' کوئی رکاوٹ نہ تھی' کوئی دیکھنے والا نہ تھا لیکن حضرت یوسف علیہ السلام صرف خوف خدا سے اس سے دور بھاگے' اس نے کہا اگر اس نے میری خواہش پوری نہ کی تو میں اس کو قید کرا دوں گی' حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانہ کی سختیوں کو گلے لگا لیا اور اپنی پاک بازی کے دامن کو معصیت سے آلودہ ہونے نہ دیا' نبی کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ قید خانہ میں بھی تبلیغ دین کرتا رہتا ہے' آپ نے وہاں بھی قیدیوں کو توحید کی طرف بلایا اور لوگوں کو بت پرستی سے متنفر کیا' یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی شان کریمی تھی کہ جس سے آپ نے فرمایا تھا میرا بادشاہ کے سامنے ذکر کرنا' اور اس نے ایک عرصہ تک ذکر نہیں کیا' پھر جب وہ اپنے کام سے آپ کو بلانے آیا تو آپ نے اس کو ملامت نہیں کی' اور حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت سے یہ معلوم ہوا کہ انسان کو کوئی نعمت حاصل کرنے سے پہلے اپنے اوپر لگی ہوئی تہمت اور بدنامی کو دور کرنا چاہیے' جب آپ کو قید خانہ سے آزادی کی نوید سنائی گئی تو آپ نے اس وقت تک قید خانہ سے نکلنے سے انکار کر دیا جب تک عزیز مصر کی بیوی کی لگائی ہوئی تہمت آپ سے دور نہ کر دی جائے۔

اس سورت میں گزشتہ امتوں کی تاریخ ہے' ان کے قوانین اور ان کے نظام حکومت کا بیان ہے' ان کی تجارت کے طریقوں اور ان کی سزاؤں کا ذکر ہے' اس سورت میں انتہائی فصیح و بلیغ اور دلچسپ اور سنسنی خیز قصہ کا بیان ہے جس کی دلکشی اور شیرینی میں انسان مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ نضر بن حارث کفار مکہ کو رستم اور سہراب کی عجیب و غریب داستانیں سنایا کرتا تھا لیکن جب انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ قصہ سنا تو انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ اس سے زیادہ حسین قصہ انہوں نے آج تک نہیں سنا تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق احادیث

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا گیا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ مکرم کون ہے؟ آپ نے فرمایا: جو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہو۔ صحابہ نے کہا: ہم نے آپ سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا تھا۔ آپ نے فرمایا: پھر لوگوں میں سب سے زیادہ مکرم اللہ کے نبی حضرت یوسف ہیں جو ابن نبی اللہ ابن نبی اللہ ابن خلیل اللہ ہیں۔ انہوں نے کہا: ہم آپ سے اس کے متعلق سوال نہیں کر رہے۔ آپ نے فرمایا: پھر تم معادن عرب

کے متعلق مجھ سے سوال کر رہے ہو؟ لوگ معادن ہیں جو زمانہ جاہلیت میں سب سے بہتر تھا وہ زمانہ اسلام میں بھی سب سے بہتر ہے بشرطیکہ وہ فقیہ ہو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۸۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۲۹۴، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۷۶۵۸)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت لوط پر رحم فرمائے وہ مضبوط قبیلہ کی پناہ میں آنا چاہتے تھے اور اگر میں حضرت یوسف جتنی مدت قید میں ٹھہرتا تو میں ضرور بلانے والے کے بلانے پر چلا جاتا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۸۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۵۱، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۲۶، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۲۰۸، مسند احمد ج ۲ ص ۳۲۶، شرح السنہ رقم الحدیث: ۶۳)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: اے اللہ عیاش بن ابی ربیعہ کو نجات دے، اے اللہ سلمہ بن ہشام کو نجات دے، اے اللہ ولید بن ولید کو نجات دے، اے اللہ کمزور مسلمانوں کو نجات دے، اے اللہ! مضر پر اپنی گرفت کو سخت کر، اے اللہ! ان پر حضرت یوسف کے قحط کی سالوں کی طرح قحط کے سال مسلط کر دے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۸۶، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۴۴۰، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۶۷۶، سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۰۷۵)

اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ یوسف کی تفسیر کی ابتداء کرتے ہیں، لاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم، وما توفیقی الا باللہ العلیم الکریم، اللھم ارنی الحق حقا وارزقنی اتباعہ وارنی الباطل باطلا وارزقنی اجتنابہ۔ (۲۸ رمضان ۱۴۲۰ھ / ۶ جنوری ۲۰۰۰ء)

سُوْرَةُ يُوسُفَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّاحْدَى عَشَرَ اٰيَةً وَّاثْنَا عَشَرَ رُكُوْعًا

سورہ یوسف مکی ہے اور اس میں ایک سو گیارہ آیتیں اور بارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اللہ ہی کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے ○

الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۱﴾ قف اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ

الف لام را، یہ روشن کتاب کی آیتیں ہیں ○ بے شک ہم نے اس قرآن کو عربی (زبان) میں نازل کیا ہے تاکہ

تَعْقِلُوْنَ ﴿۲﴾ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ

تم اس کو سمجھ سکو ○ ہم آپ کو اس قرآن کی وحی کے ذریعہ سب سے حسین

اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۳﴾

قصہ سناتے ہیں، اور بے شک آپ اس سے پہلے بے خبر تھے ○

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَٰٓأَبَتِ إِنِّى رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ

جب یوسف نے اپنے والد سے کہا: اے میرے ابا! بے شک میں نے گیارہ ستاروں، اور

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِى سَٰجِدِينَ ﴿٤﴾ قَالَ يَٰبُنَىَّ لَا تَقْصُصْ

سورج اور چاند کو دیکھا، میں نے دیکھا وہ مجھ کو سجدہ کررہے ہیں ○ (باپ نے) کہا اے میرے پیارے بیٹے! اپنا خواب اپنے

رُءْيَاكَ عَلَىٰٓ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا ۖ إِنَّ الشَّيْطَٰنَ لِلْإِنسَٰنِ

بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا ورنہ وہ تمہارے خلاف کوئی سازش کریں گے، بے شک شیطان انسان کا

عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٥﴾ وَكَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِن تَأْوِيلِ

کھلا ہوا دشمن ہے ○ اور اسی طرح تمہارا رب تمہیں منتخب فرمائے گا اور تمہیں خوابوں کی تعبیروں کا علم

الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُۥ عَلَيْكَ وَعَلَىٰٓ ءَالِ يَعْقُوبَ كَمَآ أَتَمَّهَا

عطا فرمائے گا اور تم پر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت کو مکمل فرمائے گا جس طرح اس سے پہلے اس

عَلَىٰٓ أَبَوَيْكَ مِن قَبْلُ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْحَٰقَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٦﴾ ع ۱۱

نے اس نعمت کو تمہارے باپ دادا ابراہیم اور اسحٰق پر مکمل فرمایا تھا، بے شک تمہارا رب خوب جاننے والا نہایت حکمت والا ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الف لام را، یہ روشن کتاب کی آیتیں ہیں ○ (یوسف: ۱)

قرآن مجید کے مبین ہونے کی وجوہ

اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کی یہ صفت ذکر کی ہے کہ وہ مبین ہے، اس کے تین سبب ہیں: (۱) یہ قرآن زبردست معجزہ ہے، اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر بہت واضح اور روشن دلیل ہے۔ (۲) اللہ تعالیٰ نے اس میں ہدایت کے بہت واضح طریقے اور بہت روشن راستے بیان فرمائے ہیں اور حلال اور حرام کے صاف احکام اور حدود و تعزیرات کو بیان فرمایا ہے۔ (۳) اور اس میں پہلی امتوں اور ان کے نبیوں اور رسولوں کے قصص اور احوال بیان فرمائے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک ہم نے اس قرآن کو عربی (زبان) میں نازل کیا ہے تاکہ تم اس کو سمجھ سکو ○ ہم آپ کو اس قرآن کی وحی کے ذریعہ سب سے حسین قصہ سناتے ہیں، اور بے شک آپ اس سے پہلے بے خبر تھے ○ (یوسف: ۳-۲)

اللہ کے لیے لَعَلَّ کا معنی

کلام عرب میں "لَعَلَّ" کا لفظ کسی چیز کی امید کے لیے آتا ہے اور بظاہر اس کا یہ معنی ہوگا کہ اللہ کو امید ہے کہ تم سمجھ لوگے اور یہ معنی اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں ہے اور اس کے حق میں محال ہے، اس لیے مفسرین نے کہا ہے کہ امید کا یہ معنی قرآن پڑھنے والوں اور سننے والوں کی طرف راجع ہے، یعنی جو لوگ قرآن مجید کو تدبر کے ساتھ پڑھیں ان کو یہ امید رکھنی

چاہیے کہ وہ اس قصہ کو سمجھ لیں گے، اسی طرح قرآن مجید میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے لعلّ کا لفظ وارد ہوا اس کا یہی معنی ہے۔

قصہ کا لغوی معنی

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہمیں کوئی قصہ سنائیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "ہم آپ کو اس قرآن کی وحی کے ذریعہ سب سے حسین قصہ سناتے ہیں"۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۴۳۵، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

قصص کا معنی ہے کسی چیز کے نشانات کو تلاش کرنا اور ان کی پیروی کرنا، قرآن مجید میں ہے:

فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا - (الکہف: ٦٤) سو وہ اپنے قدموں کے نشانات تلاش کرتے ہوئے لوٹے۔

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ - (القصص: ۱۱) اور ان کی ماں نے ان کی بہن سے کہا تم موسیٰ کو تلاش کرو۔

اسی طرح جو خبریں تتبع اور تلاش سے حاصل کی گئی ہوں ان کو بھی قصص کہتے ہیں، قرآن مجید میں ہے:

لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ - (آل عمران: ٦٢) یہ برحق خبریں ہیں۔

(المفردات ج ۲ ص ۵۲۳-۵۲۲، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

سورۂ یوسف کو احسن القصص فرمانے کی وجوہات

سورۂ یوسف کو احسن القصص فرمانے کی متعدد وجوہات بیان کی گئی ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جس قدر حکمتیں ہیں اور جس قدر عبرت انگیز واقعات ہیں اتنے عبرت انگیز واقعات اور کسی سورت میں نہیں ہیں، قرآن مجید میں ہے:

لَقَدْ كَانَ فِىْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ - (یوسف: ۱۱۱) بے شک ان کے قصوں میں عقل والوں کے لیے نصیحت ہے۔

یہ بھی کہا گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو احسن القصص اس لیے فرمایا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ساتھ نہایت احسن سلوک فرمایا، ان کی دی ہوئی اذیتوں پر صبر کیا، اور جب ان کو اقتدار ملا اور وہ ان سے بدلہ لینے پر ہر طرح قادر ہوئے تو ان کو معاف کر دیا، حتیٰ کہ فرمایا:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ - (یوسف: ۹۲) آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سورت میں انبیاء، صالحین، ملائکہ، شیاطین، جن، انسان، جانوروں اور پرندوں کا ذکر ہے، اور اس میں بادشاہوں، تاجروں، علماء، جاہلوں اور مردوں اور عورتوں کی سیرت اور ان کی طرز زندگی کا بیان ہے، اور عورتوں کے حیلوں اور ان کے مکر کا بیان ہے، اور اس میں توحید، رسالت، فقہی احکام، خوابوں کی تعبیر، سیاست، معاشرت اور تدبیر معاش کا بیان ہے اور ان تمام فوائد کا بیان ہے جن سے دین اور دنیا کی اصلاح ہو سکتی ہے، اور اس میں حسن اور عشق کی داستان ہے اور محب اور محبوب کا ذکر ہے۔

اہل معانی نے کہا: اس سورت کو احسن القصص اس لیے فرمایا ہے کہ اس سورت میں جتنے لوگوں کا ذکر فرمایا ہے ان سب کا مآل سعادت ہے اور سب کا انجام نیک اور عاقبت بہ خیر ہے، دیکھیے حضرت یوسف علیہ السلام، ان کے والدین، ان کے بھائی اور عزیز مصر کی بیوی سب کا مآل نیک ہوا، وہ بادشاہ بھی حضرت یوسف علیہ السلام پر ایمان لے آیا اور اس نے اسلام لا کر اچھے

عمل کیے، اسی طرح جس ساقی نے خواب کی تعبیر پوچھی تھی اور جو حضرت یوسف کے واقعہ میں شاہد تھا سب کا نیک انجام ہوا۔
(الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۱۰۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جب یوسف نے اپنے والد سے کہا اے میرے ابا! بے شک میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا، میں نے دیکھا وہ مجھ کو سجدہ کر رہے ہیں ○ (یوسف: ۴)

حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب میں ستاروں، سورج اور چاند کو دیکھنا

زمخشری نے کہا لفظ یوسف عبرانی زبان کا لفظ ہے کیونکہ اگر یہ عربی زبان کا لفظ ہوتا تو یہ منصرف ہوتا، کیونکہ یہ صرف علم ہے اور اس میں تنوین سے مانع کوئی چیز نہیں ہے، سو اس پر تنوین نہ آنا اور اس کا غیر منصرف ہونا اس کے عبرانی ہونے کی دلیل ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب میں یہ دیکھا کہ گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند نے ان کو سجدہ کیا ہے، اور حضرت یوسف کے گیارہ بھائی تھے اس لیے گیارہ ستاروں کی گیارہ بھائیوں کے ساتھ تعبیر کی گئی اور سورج اور چاند کی باپ اور ماں کے ساتھ تعبیر کی گئی اور سجدہ سے مراد یہ ہے کہ وہ حضرت یوسف کے سامنے تواضع سے جھک جائیں گے اور ان کے احکام کی پیروی کریں گے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جو کہا تھا کہ میں نے گیارہ ستاروں کو دیکھا اس دیکھنے کو خواب میں دیکھنے پر محمول کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت میں ستارے سجدہ نہیں کرتے اس وجہ سے اس کلام کو خواب پر محمول کرنا واجب ہے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام سے فرمایا تھا: "اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے نہ بیان کرنا"۔

ان ستاروں کے اسماء

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بستانہ نام کا ایک یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے ان ستاروں کے نام بتائیے جن کو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے اور آپ نے کوئی جواب نہیں دیا، اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے اور آپ کو ان ستاروں کے نام بتائے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی کو بلوایا اور فرمایا: اگر میں تم کو ان ستاروں کے نام بتادوں تو تم مان لو گے؟ اس نے کہا: ہاں! پھر آپ نے یہ نام بتائے: جربان، الطارق، الذیال، ذوالکتفین، قابس، وثاب، عمودان، الفلیق، المصبح، الضروح، وذوالفرغ، الضیاء اور النور۔ اس یہودی نے کہا: اللہ کی قسم! ان ستاروں کے یہی نام ہیں۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۴۴۱، تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۳۳۲، تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۵۱۹، دلائل النبوۃ ج ۶ ص ۲۷۷، کتاب الضعفاء للعقیلی ج ۱ ص ۲۵۹، الکشاف ج ۲ ص ۴۱۷، تفسیر کبیر ج ۶ ص ۴۱۹، امام حاکم نے لکھا ہے کہ یہ حدیث امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے اور علامہ ذہبی نے اس پر سکوت کیا ہے، المستدرک ج ۴ ص ۳۹۶، امام عقیلی نے لکھا ہے کہ یہ سند صحیح کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے، ان کے نزدیک یہ ضعیف ہے، امام ابن جوزی کی نزدیک یہ حدیث موضوع ہے، کتاب الموضوعات ج ۱ ص ۱۴۶، حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے ائمہ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور یہ حدیث کئی سندوں سے مروی ہے)

خواب دیکھنے کے وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر

امام فخرالدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بچپن میں یہ خواب دیکھا تھا، لیکن وہ کون سا معین زمانہ تھا، اس کا علم سوائے خبر کے نہیں ہو سکتا۔ وہب بن منبہ نے کہا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے سات سال کی عمر میں خواب دیکھا کہ گیارہ لاٹھیاں ایک دائرہ کی شکل میں زمین میں مرکوز ہیں اور ایک چھوٹی لاٹھی نے ان گیارہ بڑی لاٹھیوں کو نگل لیا، حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد سے اس خواب کو بیان کیا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: خبردار یہ خواب اپنے بھائیوں سے ہرگز نہ بیان کرنا، پھر بارہ سال کی عمر میں حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کر رہے ہیں، انہوں نے پھر حضرت یعقوب علیہ السلام سے یہ خواب بیان کیا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: تم اپنے بھائیوں سے یہ خواب بیان نہ کرنا ورنہ وہ تمہارے خلاف کوئی سازش کریں گے، ایک قول یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب اور اس کی تعبیر مکمل ہونے میں چالیس سال کا عرصہ لگا اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس میں اسّی سال کا عرصہ لگا۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۴۱۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

نیند کی تعریف

جب موثرات خارجیہ منقطع ہو جاتے ہیں اور حواس ظاہرہ سے اتصال نہیں رہتا، انسان آنکھیں بند کر لیتا ہے اور اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور حواس ظاہرہ کے ادراکات بتدریج منقطع ہو جاتے ہیں تو یہ وہ حالت ہے جس کو نیند سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

خواب کی تعریف

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

اہل سنت کے نزدیک خواب کی صحیح تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سوئے ہوئے شخص کے دل میں ادراکات پیدا کرتا ہے، جیسا کہ بیدار شخص کے دل میں ادراکات پیدا کرتا ہے۔ خواب کی نظیر یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بادلوں کو بارش کی علامت بنا دیا ہے لیکن کبھی بادل گھر کر آتے ہیں اور بارش نہیں ہوتی، خواب میں جو ادراکات حاصل ہوتے ہیں کبھی ان میں فرشتہ کا دخل ہوتا ہے اور کبھی شیطان کا، فرشتے کے دخل سے جو ادراکات حاصل ہوتے ہیں ان کے بعد انسان خوش ہوتا ہے اور شیطان کے دخل کے بعد جو ادراکات حاصل ہوتے ہیں ان کے بعد انسان غمگین ہوتا ہے۔

علامہ قرطبی نے بعض اہل علم سے یہ نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہے جو اشیاء کو سونے والے کے محل ادراک (ذہن) پر پیش کرتا ہے، اور ان اشیاء کو مختلف صورتوں میں متمثل کرتا ہے، بعض اوقات وہ صورتیں بعد میں واقع ہونے والی تعبیر کے موافق ہوتی ہیں، اور بعض اوقات وہ صورتیں معانی معقولہ کی مثالیں ہوتی ہیں اور ہر دو صورتیں خوش خبری دینے والی بھی ہوتی ہیں اور ڈرانے والی بھی ہوتی ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خواب: خیال میں چند منضبط مثالوں کا ادراک ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے مستقبل میں پیش آنے والے امور کے لیے علامت بنا دیا ہے۔ (فتح الباری ج ۱۲ ص ۳۵۳، مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۱ھ)

خواب کی اقسام

علماء اسلام نے خواب کی حسب ذیل اقسام بیان کی ہیں:

(۱) بعض اوقات انسان کو نیند میں ایسی بے ربط اور خلاف واقع چیزیں نظر آتی ہیں جو لائق توجہ نہیں ہوتیں، مثلاً انسان

خواب میں یہ دیکھے کہ آسمان میں ایک درخت اگا ہوا ہے، یا دیکھے کہ زمین میں ستارے طلوع ہو رہے ہیں یا دیکھے کہ ہاتھی چیونٹی پر سوار ہو رہا ہے۔ ایسے خوابوں کو عربی میں اضغاث احلام کہتے ہیں' اردو میں ان کو خواب پریشان کہتے ہیں۔ علماء کہتے ہیں کہ اس قسم کے خواب شیطانی عمل کی وجہ سے نظر آتے ہیں' اور اطباء کہتے ہیں کہ ہاضمے کی خرابی یا بلڈ پریشر ہائی ہونے کی وجہ سے اس قسم کے خواب نظر آتے ہیں۔

(۲) انسان جو کچھ سوچتا رہتا ہے وہ اس کو خواب میں نظر آتا ہے، بعض اوقات وہ اپنی ناتمام خواہشوں کو خواب میں پورا ہوتے ہوئے دیکھ لیتا ہے، مثلاً بھوکا شخص خواب میں اپنی پسندیدہ چیزوں کو کھاتے ہوئے دیکھتا ہے اور پیاسا شخص لذیذ اور خوش ذائقہ مشروبات پیتے ہوئے خود کو دیکھتا ہے اور محبوب کے فراق میں غم زدہ عاشق خود کو محبوب کے قرب میں دیکھتا ہے' اس قسم کے خواب نفس کے وسوسے اور نفس کے خیالات کہلاتے ہیں۔

(۳) کبھی سونے والے شخص کے منہ پر لحاف کا دباؤ ہوتا ہے جس سے اس کا سانس گھٹ رہا ہوتا ہے' اور وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہے، کبھی بارش کے چھینٹے کھڑکی کے شیشے سے ٹکراتے ہیں یا ہوا کے زور سے کوئی چیز کھڑکھڑاتی ہے اور وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ میدان کارزار میں ہے اور گولیاں چل رہی ہیں اور کبھی سونے والے کے چہرے پر دھوپ پڑنے سے اس کا چہرہ تمتمانے لگتا ہے اور وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ آگ میں جل رہا ہے' اس قسم کے خواب دیکھ کر بعض اوقات وہ ڈر جاتا ہے' اس قسم کے خوابوں کو محسوسات کا اثر کہا جاتا ہے۔

(۴) بعض اوقات انسان کے ذہن میں غیر شعوری خواہشیں ہوتی ہیں جن کو وہ کسی کے احترام یا کسی اور مانع کی وجہ سے پورا کرنا نہیں چاہتا پھر اس کو خواب میں ایسی مثالیں نظر آتی ہیں جن کی تعبیر بعینہٖ واقع نہیں ہو سکتی لیکن ان مثالوں میں کسی اور چیز کی طرف رمز اور اشارہ ہوتا ہے مثلاً باپ اپنے جوان بیٹے کو مارے تو غیر شعوری طور پر اس کے دل میں باپ سے انتقام لینے کا خیال آتا ہے لیکن باپ کا احترام اس خواہش کو پورا کرنے سے مانع ہوتا ہے، پھر بیٹا خواب میں دیکھتا ہے کہ اس نے کسی شیر کو مار دیا ہے یا کسی اژدہے کو مار دیا یا کسی ظالم بادشاہ کو قتل کر دیا اور ظالم بادشاہ یا اژدہا غیر شعوری طور پر اس کے باپ سے کنایہ ہوتا ہے۔

خواب میں صرف اشارے اور رمز کی مثال سورۂ یوسف کی یہ آیت ہے:

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّىْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِىْ سٰجِدِيْنَ ○ (یوسف: ۴)	جب یوسف نے اپنے والد سے کہا: اے میرے ابا! بے شک میں نے گیارہ ستاروں اور چاند کو دیکھا وہ مجھ کو سجدہ کر رہے ہیں۔

سورج اور چاند سے ان کے باپ اور ماں کی طرف اشارہ ہے اور گیارہ ستاروں سے ان کے گیارہ بھائیوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایسے خواب کو رمزی خواب کہتے ہیں۔

(۵) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیک شخص کا اچھا خواب نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٦٩٨٣' موطا امام مالک رقم الحدیث: ٥٩٣' مسند احمد رقم الحدیث: ١٢٢٩٧ عالم الکتب' مسند احمد ج ٣ ص ١٢٦ قدیم' صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ٦٠٤٣' شرح السنۃ رقم الحدیث: ٣٢٧٣' مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ٣٣٣٠' ٣٧٥٤' صحیح مسلم رقم الحدیث: ٢٢٦٤' سنن الترمذی رقم الحدیث: ٢٢٧٢)

ان خوابوں میں مشکل حقائق منکشف ہو جاتے ہیں، مثلاً مشہور صوفی شاعر حضرت شرف الدین بوصیری کو فالج ہو گیا اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ایک قصیدہ کہنا شروع کیا، اثناء قصیدہ میں انہوں نے ایک مصرع کہا: "ومبلغ العلم فیہ انہ بشر" اور ان میں اس کے دوسرے مصرع کو مکمل کرنے کی طاقت نہ رہی، انہوں نے بہت کوشش کی لیکن دوسرا مصرع ان کی زبان پر نہیں آیا، وہ بستر پر سو گئے، انہوں نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو زیارت سے مشرف فرمایا، ان کا حال پوچھا۔ حضرت بوصیری نے شکایت کی کہ وہ دوسرا مصرع نہیں بنا سکے، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دوسرا مصرع اس طرح بنا دو: "وانہ خیر خلق اللہ کلھم" پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چادر پہنائی اور جس جگہ ان کے جسم پر فالج تھا اس جگہ پر اپنا شفا آفریں دست مبارک پھیرا۔ حضرت بوصیری خوشی سے مدہوشی کی حالت میں نیند سے بیدار ہوئے اور وہ اپنے مرض سے مکمل شفایاب ہو چکے تھے اور انہوں نے اس قصیدہ کا نام "البردۃ" رکھا۔ اس قسم کے خوابوں کا ابن سینا، ابن رشد اور ابن خلدون نے بھی اعتراف کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ بہت سے خواب ایسے ہوتے ہیں جن میں لاینحل مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ (شاہ ولی اللہ نے "انفاس العارفین" میں اپنے والد شاہ عبدالرحیم کا ایک ایسا ہی خواب ذکر کیا ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شفا عطا فرمائی اور اپنے تین موہائے مبارک (بال) عطا فرمائے تھے) یہ وہ خواب ہیں جن کو حدیث میں رویا المومن (مومن کا خواب) فرمایا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۹۸۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۲۶۴، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۸۳۰۷ عالم الکتب، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۸۹۴، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۲۷۲)

(۶) چھٹی قسم ہے الرؤیاء الصادقہ (سچے خواب) قرآن مجید میں چھ سچے خوابوں کا ذکر ہے، چار خوابوں کا ذکر سورۂ یوسف میں ہے، ایک خواب حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا تھا، جس میں گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا، (یوسف: ۴) دو خواب قید خانہ میں دو قیدیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سنائے تھے۔ ایک نے کہا تھا کہ میں خواب میں شراب (انگور) نچوڑ رہا ہوں، اور دوسرے نے کہا تھا کہ میں سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں جن کو پرندے کھا رہے ہیں۔ (یوسف: ۳۶) اور ایک خواب مصر کے بادشاہ نے دیکھا تھا کہ سات فربہ گائیں سات لاغر گایوں کو کھا رہی ہیں اور سات ہرے بھرے خوشے ہیں اور سات سوکھے ہوئے خوشے ہیں۔ (یوسف: ۴۳) موخر الذکر تینوں خوابوں کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام نے بیان فرمائی جیسا کہ ان شاء اللہ عنقریب تفسیر میں آئے گا، اور ایک خواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے، انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے (حضرت اسمٰعیل علیہ السلام) کو ذبح کر رہے ہیں۔ (الصّٰفّٰت: ۱۰۲) اور ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خواب کا ذکر ہے کہ مسلمان امن کے ساتھ عمرہ کرنے کے لیے مکہ مکرمہ میں داخل ہوں گے۔ (الفتح: ۲۷)

(۷) بعض خواب ایسے ہوتے ہیں جن میں مستقبل میں ہونے والے کسی واقعہ کی طرف اشارے ہوتے ہیں۔ سورۂ یوسف میں جو چار خواب ذکر کیے گئے ہیں ان چاروں میں اس کی مثالیں ہیں اور حدیث میں بھی اس کا ذکر ہے:

حضرت عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتداء کی گئی تو سب سے پہلے آپ کو سچے خواب دکھائے گئے، آپ جو خواب بھی دیکھتے اس کی تعبیر سپیدۂ سحر کی طرح آجاتی، الحدیث۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۶۰، مسند احمد رقم الحدیث: ۲۵۷۱۷ عالم الکتب، مسند احمد ج ۶ ص ۱۵۳ قدیم، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۹۷۱۹، مسند ابو عوانہ ج ۱ ص ۱۱۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۳۳، الشریعہ للآجری ص ۴۳۹، دلائل النبوۃ لابی نعیم ج ۱ ص ۲۷۵، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲ ص ۱۳۵، شرح السنہ رقم الحدیث: ۳۷۳۵، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۶۳۲)

اچھے اور برے خوابوں کا شرعی حکم

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص ایسا خواب دیکھے جو اس کو پسند ہو تو وہ اللہ کی جانب سے ہے' وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرے اور وہ اس خواب کو بیان کرے اور جب وہ کوئی ناپسندیدہ خواب دیکھے تو وہ شیطان کی طرف سے ہے وہ اس کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کرے اور وہ خواب کسی کے سامنے نہ بیان کرے پھر وہ خواب اس کو ضرر نہیں دے گا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث:۶۹۸۴)

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیک خواب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اور برے خواب شیطان کی طرف سے ہیں پس جب کوئی شخص ناپسندیدہ خواب دیکھے تو اپنی بائیں جانب تین مرتبہ تھوک دے اور شیطان سے پناہ طلب کرے' تو پھر وہ خواب اس کو ضرر نہیں دے گا اور شیطان میری صورت میں نہیں آ سکتا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۶۹۹۵' سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۲۷۷' سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۵۰۲۱' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۲۲۶۱' السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۱۰۷۳۵' مسند احمد رقم الحدیث:۲۲۹۳۲' عالم الکتب' مسند احمد ج۵' ص۲۹۶' قدیم' موطا امام مالک رقم الحدیث:۲۰۱۳' مسند حمیدی رقم الحدیث:۴۱۸' مصنف ابن ابی شیبہ ج۱۰ص۳۳۶' سنن الدارمی رقم الحدیث:۲۱۴۸' صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۶۰۵۹' المعجم الاوسط رقم الحدیث:۴۹۷۲' شرح السنہ رقم الحدیث:۳۲۷۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب اور بیداری میں زیارت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: جس شخص نے مجھ کو نیند میں دیکھا وہ عنقریب مجھ کو بیداری میں دیکھے گا' شیطان میری مثل نہیں بن سکتا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۶۹۹۳' صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۲۶۶' مسند احمد رقم الحدیث:۷۴۷۱' ۱۳۸۸۵' شمائل ترمذی رقم الحدیث:۴۱۳)

حافظ ابو العباس احمد بن عمر المالکی القرطبی المتوفی ۶۵۶ھ لکھتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اس حدیث سے مقصود یہ ہے کہ انسان خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی حال میں بھی دیکھے آپ کو دیکھنا برحق ہے' وہ کوئی پریشان خواب نہیں ہے جیسا کہ آپ نے خود فرمایا ہے: جس نے مجھ کو دیکھا اس نے یقیناً مجھ ہی کو دیکھا ہے۔ اور آپ نے جو فرمایا ہے: جس نے مجھ کو نیند میں دیکھا وہ عنقریب مجھ کو بیداری میں بھی دیکھے گا' اس کے متعلق علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

یہ نعمت مجھ کو کئی مرتبہ مل چکی ہے' ایک مرتبہ جب میں حج کے ارادہ سے تونس پہنچا تو میں نے وہاں سنا کہ دشمن مصر پر حملہ کر رہا ہے حتیٰ کہ دمیاط پر قابض ہو گیا ہے تو میں نے ارادہ کیا کہ جب تک امن نہیں ہو جاتا تو میں تونس میں رہوں گا۔ وہاں مجھے خواب دکھایا گیا کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں ہوں' اور میں آپ کے منبر شریف کے قریب بیٹھا ہوا ہوں' اور لوگ آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کر رہے ہیں' پس جو لوگ سلام عرض کر رہے تھے ان میں سے کسی نے مجھ کو ڈانٹا اور کہا کھڑے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کرو' میں نے کھڑے ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کیا' ابھی میں آپ کو سلام عرض کر رہا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی' اللہ تعالیٰ نے میرے حج کے ارادہ کو پھر تازہ کر دیا' اور حج کی روانگی کے جو اسباب میرے لیے مشکل تھے وہ آسان کر دیئے اور میرے دل میں دشمن کے حملہ کا جو خوف تھا وہ زائل کر دیا۔ میں نے سفر شروع کیا اور تقریباً ایک ماہ بعد اسکندریہ پہنچ گیا' میں نے دیکھا کہ مصر کے لوگ بہت خوفزدہ تھے' اور دشمن کا بہت غلبہ تھا'

ابھی مجھے اسکندریہ میں پہنچے ہوئے دس دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے دشمن کی شوکت توڑ دی اور محض ارحم الراحمین اور اکرم الاکرمین کے رحم اور کرم سے وہاں امن اور سلامتی ہو گئی' پھر اللہ نے مجھ پر اپنا احسان اور انعام مکمل کیا اور بیت اللہ کے حج کے بعد مجھے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک اور مسجد شریف میں پہنچا دیا' اللہ کی قسم! پھر میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بعینہٖ بغیر کسی کمی اور زیادتی کے بیداری میں اسی حال میں دیکھا جس طرح میں نے آپ کو تونس میں خواب میں دیکھا تھا۔

اور اگر کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا پھر بیداری میں آپ کی زیارت نہیں ہوئی تو جاننا چاہیے کہ اس صورت سے اس کا معنی مقصود ہے بعینہٖ صورت مقصود نہیں ہے' اسی طرح خواب میں اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس صورت میں دیکھا وہ آپ کی اصل صورت کے مطابق نہیں تھی اس میں کوئی زیادتی تھی یا کوئی کمی تھی یا رنگ متغیر تھا یا اس میں کوئی عیب تھا یا کوئی عضو زیادہ تھا یا کوئی اور تغیر تھا تو اس صورت سے اس کا معنی مراد ہے' اور ہو سکتا ہے اس صورت سے مراد آپ کا دین اور آپ کی شریعت ہو اور دیکھنے والے نے آپ کی صورت میں جو زیادتی یا کمی یا اچھائی یا برائی دیکھی ہے اس کو اس کے دین سے تعبیر کیا جائے گا یعنی اس کے دین میں زیادتی یا کمی یا اچھائی یا برائی ہے' اسی طرح اگر کسی شخص نے آپ کو آپ کی معروف صورت کے علاوہ کسی اور شکل میں دیکھا تو وہ صورت بھی اس کے دین اور شریعت سے عبارت ہو گی۔

(المفہم ج ۶ ص ۲۶-۲۴' مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت' ۱۴۱۷ھ)

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے مجھ کو نیند میں دیکھا وہ عنقریب مجھ کو بیداری میں بھی دیکھے گا' اس کے حسب ذیل محامل ہیں:

(۱) اس سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے لوگ ہیں' اور اس کا معنی یہ ہے کہ جس نے آپ کو نیند میں دیکھا اور اس نے ہجرت نہیں کی' اللہ تعالیٰ اس کو ہجرت کی توفیق دے گا اور وہ آپ کو بیداری میں بھی دیکھ لے گا۔

(۲) جس نے آپ کو نیند میں دیکھا وہ عنقریب بیداری میں آپ کی رویت کی تصدیق اور صحت کو دیکھ لے گا۔

(۳) جس نے آپ کو نیند میں دیکھا وہ آپ کو آخرت میں خصوصیت کے ساتھ دیکھے گا اور اس کو آپ کا قرب حاصل ہو گا۔

(۴) ابن ابی جمرہ اور ایک جماعت نے اس حدیث کو اس پر محمول کیا ہے کہ جس نے آپ کو نیند میں دیکھا وہ دنیا میں آپ کو حقیقتاً دیکھ لے گا اور آپ سے کلام کرے گا اور اس کو اولیاء اللہ کی کرامات سے ایک کرامت شمار کیا گیا ہے۔ صالحین کی ایک جماعت سے منقول ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند میں دیکھا' پھر اس کے بعد انہوں نے آپ کو بیداری میں دیکھا' پھر جن چیزوں میں وہ خوف زدہ تھے ان کے متعلق آپ سے سوال کیے اور آپ نے ان کا خوف دور کرنے کی طرف رہنمائی کی۔

علامہ ابن حجر نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ پھر لازم آئے گا کہ بعد کے یہ اولیاء اللہ صحابہ ہو جائیں اور صحابی ہونے کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے (علامہ سیوطی فرماتے ہیں:) میں کہتا ہوں کہ صحابی ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عالم دنیا میں وفات سے پہلے دیکھے اور جس نے آپ کی وفات کے بعد آپ کو عالم برزخ میں دیکھا اس دیکھنے سے اس کا صحابی ہونا ثابت نہیں ہو گا' علامہ ابن حجر کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کئی لوگوں نے نیند میں آپ کو دیکھا اور پھر بیداری میں انہوں نے آپ کو نہیں دیکھا اور اگر اس حدیث کا یہ معنی ہو تو ہر خواب میں آپ کی زیارت کرنے والے کو بیداری میں آپ کی

زیارت ہونی چاہیے' اس کا جواب یہ ہے کہ خواص کو تو زندگی میں کئی بار آپ کی زیارت ہوتی ہے اور عوام کو اس وقت آپ کی زیارت ہوگی جب ان کی روح ان کے جسم سے نکل رہی ہوگی۔

بیداری میں آپ کی زیارت کے امکان اور اس کے وقوع کی علماء کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے' ان میں سے حجۃ الاسلام امام غزالی ہیں' اور قاضی ابوبکر بن العربی ہیں اور شیخ عزالدین بن عبدالسلام ہیں اور ابن ابی جمرہ ہیں اور ابن الحاج ہیں اور الیافعی ہیں اور میں نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے۔

(الدیباج' ج ۲' ص ۸۷۴۔ ۸۷۳' مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی' ۱۴۱۲ھ)

علامہ عبدالوہاب بن احمد بن علی حنفی المصری الشعرانی المتوفی ۹۷۳ھ لکھتے ہیں:

ائمہ اور مجتہدین بیداری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرتے ہیں اور کتاب وسنت سے انہوں نے جو کچھ سمجھا ہوتا ہے اس کو لکھنے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے ہیں کہ یارسول اللہ! ہم نے فلاں حدیث کا یہ معنی سمجھا ہے آیا آپ اس پر راضی ہیں' اور بہت سے اولیاء جو مجتہدین سے کم درجہ کے ہیں ان کو آپ سے بیداری میں ملاقات کا شرف حاصل ہے جیسے شیخ عبدالرحیم القناوی اور شیخ ابو مدین المغربی' شیخ ابوالحسن الشاذلی' شیخ ابوالعباس المرسی اور بہت ہیں' اور میں نے شیخ جلال الدین سیوطی کے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک خط پڑھا ہے' انہوں نے اس شخص کو جواب لکھا جو سلطان کے پاس ان سے سفارش کرانا چاہتا تھا' انہوں نے لکھا اے میرے بھائی! میں اس وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیداری میں پچھتر مرتبہ بالمشافہ ملاقات کر چکا ہوں' اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ حکام کے پاس جانے سے میں اس نعمت سے محروم ہو جاؤں گا تو میں سلطان سے تمہاری شفاعت کر دیتا اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا خادم ہوں اور جن احادیث کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے ان کی صحت معلوم کرنے کے لیے مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے کی حاجت ہوتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے میرے بھائی کہ یہ نفع تمہارے نفع پر مقدم ہے' اور علامہ سیوطی کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ سیدی محمد بن زین جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ثناگو تھے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیداری میں بالمشافہ زیارت کرتے تھے اور جب وہ حج کے لیے جاتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے اندر سے ان سے ہم کلام ہوتے' ایک مرتبہ کسی شیخ کے کہنے سے انہوں نے حاکم شہر سے ان کی سفارش کی تو پھر وہ اس نعمت سے محروم ہو گئے اور ہم کو شیخ ابوالحسن شاذلی اور شیخ ابوالعباس المرسی اور دوسرے اولیاء اللہ سے یہ خبر پہنچی ہے کہ یہ بزرگ یہ کہتے تھے کہ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی ہم کو رسول اللہ کی زیارت نہ ہو تو ہم اپنے آپ کو مسلمان شمار نہیں کرتے۔

(المیزان الکبریٰ ج ۱ ص ۵۵۔ ۵۴' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۸ھ)

شیخ محمد انور کشمیری متوفی ۱۳۵۲ھ لکھتے ہیں:

علامہ شعرانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے اور آٹھ ساتھیوں کے ساتھ آپ کے سامنے صحیح بخاری پڑھی ہے۔ ان میں سے ایک حنفی تھا' جب صحیح البخاری ختم ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا فرمائی لہٰذا بیداری میں زیارت متحقق ہے اور اس کا انکار کرنا جہالت ہے۔

(فیض الباری ج ۱ ص ۲۰۴' مطبوعہ مطبع حجازی القاہرہ' ۱۳۵۷ھ)

چند خوابوں کی تعبیروں کے متعلق احادیث

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب میں سویا ہوا تھا تو

مجھے (خواب میں) دودھ کا پیالہ دیا گیا' میں نے اس سے دودھ پی لیا حتیٰ کہ میں نے دیکھا کہ میرے ناخنوں سے سیرابی نکل رہی ہے' اور میں نے اپنا بچا ہوا دودھ عمر بن الخطاب کو دے دیا' آپ کے گرد بیٹھے ہوئے صحابہ نے پوچھا آپ نے اس (دودھ) سے کیا تعبیر لی ہے یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: علم۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۷۰۰۷' سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۲۸۴' مصنف ابن ابی شیبہ ج۱۱ ص۷۰' مسند احمد ج۲' ص۸۳' سنن الدارمی رقم الحدیث:۲۱۶۰' صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۳۹۱' صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۶۸۷۸' سنن کبریٰ للبیہقی ج۷' ص۴۹' سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۸۱۲۳' شرح السنہ رقم الحدیث:۳۸۸۰)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس وقت میں سویا ہوا تھا میں نے خواب میں دیکھا کہ لوگ قمیص پہنے ہوئے میرے سامنے پیش ہو رہے ہیں' بعض کی قمیص پستانوں تک تھی اور بعض کی قمیص اس سے بھی کم تھی' پھر عمر بن الخطاب آئے اور ان کی قمیص پیروں کے نیچے گھسٹ رہی تھی۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! آپ نے قمیص سے کیا تعبیر لی ہے؟ فرمایا: دین۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۷۰۰۸' صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۳۹۰' سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۲۸۵' مصنف عبدالرزاق ۲۰۳۸۵' مسند احمد ج۵' ص۳۷۳' قدیم' مسند احمد رقم الحدیث:۱۱۸۳۶' السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۸۱۲۱)

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خواب دیکھا کہ میں ایک باغ میں ہوں اور باغ کے وسط میں ایک ستون ہے' اور ستون کے اوپر ایک دستہ ہے' مجھ سے کہا گیا اس درخت پر چڑھو۔ میں نے کہا: میں اس کی طاقت نہیں رکھتا' پھر ایک لڑکا آیا۔ اس نے میرے کپڑے اوپر اٹھائے' میں اس درخت پر چڑھا اور میں نے اس دستہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا' اور میں اس حال میں بیدار ہوا کہ میں اس دستہ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا' میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ خواب بیان کیا' آپ نے فرمایا: یہ باغ اسلام کا باغ ہے' اور دستہ سے مراد مضبوط دستہ ہے' تم تادم مرگ اسلام پر مضبوطی سے قائم رہو گے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث:۷۰۱۴' مسند احمد رقم الحدیث:۲۴۸۴' مطبوعہ عالم الکتب بیروت' ۱۴۱۹ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب زمانہ قریب ہو جائے گا تو زیادہ تر مسلمان کا خواب جھوٹا نہیں ہوگا' اور مومن (کامل) کا خواب نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے۔ محمد بن سیرین نے کہا میں بھی یہی کہتا ہوں' انہوں نے کہا اور یہ کہا جاتا تھا کہ خواب کی تین قسمیں ہیں: انسان جو کچھ سوچتا ہے وہ خواب میں دیکھتا ہے اور شیطان ڈراؤنے خواب دکھاتا ہے اور اللہ کی طرف سے خواب میں بشارتیں ملتی ہیں' سو جو شخص خواب میں کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے' وہ اس خواب کو کسی کے سامنے بیان نہ کرے اور اٹھ کر نماز پڑھے' اور وہ خواب میں (گلے میں) طوق دیکھنا ناپسند کرتے تھے اور خواب میں بیڑیاں دیکھنا پسند کرتے تھے اور یہ کہا جاتا تھا کہ بیڑی سے مراد دین میں ثابت قدم رہنا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۷۰۱۷' مسند احمد رقم الحدیث:۱۷۸۳' عالم الکتب' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۳۸۹۴' مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:۲۰۳۵۵' مصنف ابن ابی شیبہ ج۱۱ ص۵۱-۵۰)

حضرت ام العلاء انصاریہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی' جب مہاجرین کی رہائش کے لیے انصار نے قرعہ اندازی کی تو رہائش کے لیے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ ہمارے حصہ میں آ گئے۔ وہ بیمار پڑ گئے' ہم نے ان کی تیمار داری کی' وہ فوت ہو گئے۔ ہم نے ان کو کفن میں لپیٹ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں نے کہا: اے ابو السائب! تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو' میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ تمہاری تکریم فرمائے

گا۔ آپ نے پوچھا: تم کو یہ کیسے پتا چلا؟ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قسم! میں نہیں جانتی۔ آپ نے فرمایا: رہے عثمان بن مظعون تو ان پر موت آچکی ہے' اور میں اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے خیر کی توقع کرتا ہوں اور اللہ کی قسم! میں از خود نہیں جانتا حالانکہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ حضرت ام العلاء نے کہا: پس اللہ کی قسم! اس کے بعد میں نے کسی کی ستائش نہیں کی۔ انہوں نے کہا: میں نے خواب دیکھا کہ حضرت عثمان کے لیے ایک چشمہ بہہ رہا ہے' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس خواب کا ذکر کیا' آپ نے فرمایا: اس سے مراد اس کا جاری رہنے والا عمل ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث:۷۰۱۸' مسند احمد رقم الحدیث:۲۸۰۰۴' مطبوعہ عالم الکتب بیروت)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں مکہ سے ایسی زمین کی طرف ہجرت کر رہا ہوں' جس میں کھجور کے درخت ہیں' مجھے یہ گمان ہوا کہ یہ جگہ یمامہ یا ہجر ہے لیکن وہ مدینہ یثرب تھی' اور میں نے اس میں گائے کو دیکھا اور اللہ کی قسم خیر کو دیکھا۔ گائے سے مراد وہ ہے کہ جنگ احد میں جب مسلمانوں نے کفار کی یورش سے بھاگنے کا ارادہ کیا تھا اور خیر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ جنگ بدر میں خیر (فتح) لایا تھا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۷۰۳۵' السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۷۶۵' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۳۹۲۱' مسند احمد رقم الحدیث ۲۲۷۲۲' عالم الکتب)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے خواب میں ایک سیاہ فام عورت کو دیکھا جس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ مدینہ سے باہر نکلی اور جحفہ میں جا کر ٹھہر گئی' میں نے اس کی یہ تعبیر نکالی کہ مدینہ کی وبا جحفہ کی طرف منتقل کر دی جائے گی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۷۰۳۸' سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۲۹۰' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۳۹۲۴' مصنف ابن ابی شیبہ ج۱۱' ص۶۱' مسند احمد رقم الحدیث:۵۸۴۹' سنن دارمی رقم الحدیث:۲۱۶۷' مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث:۵۵۲۵' السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۷۶۵۱' المعجم الکبیر رقم الحدیث:۱۳۱۴۷' دلائل النبوۃ للبیہقی ج۲' ص۵۶۸' شرح السنہ رقم الحدیث:۳۲۹۳)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے خواب میں یہ دیکھا کہ میں نے تلوار کو لہرایا تو اس کا اگلا حصہ ٹوٹ گیا اور اس کی تعبیر وہ تھی جو جنگ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی پھر میں نے دوبارہ تلوار کو لہرایا وہ پہلے سے اچھی حالت میں ہو گئی اور اس کی تعبیر وہ تھی جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا کی تھی اور مسلمان مجتمع ہو گئے تھے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۷۰۴۱' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۳۹۲۱' السنن الکبریٰ رقم الحدیث ۷۶۵۰' مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث:۷۲۹۸' صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۶۲۷۵' شرح السنہ رقم الحدیث:۳۲۹۶' مسند احمد رقم الحدیث:۲۲۷۲۲ عالم الکتب)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے ایک خواب بیان کیا جس کو اس نے نہیں دیکھا اس کو (قیامت کے دن) دو جو کے درمیان گرہ لگانے کا حکم دیا جائے گا اور وہ ان میں ہرگز گرہ نہیں لگا سکے گا' اور جس شخص نے کچھ لوگوں کی باتیں کان لگا کر سننے کی کوشش کی جب کہ وہ اس کو ناپسند کرتے ہوں یا اس سے بھاگتے ہوں' قیامت کے دن اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جائے گا' اور جس شخص نے تصویر بنائی اس کو عذاب دیا جائے گا اور اس کو اس بات کا مکلف کیا جائے گا کہ وہ اس میں روح پھونکے اور وہ اس میں ہرگز روح نہیں پھونک سکے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۷۰۴۲' مسند احمد رقم الحدیث:۲۲۱۳' صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۱۱۰' السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:

۹۷۸۵، سنن النسائی رقم الحدیث: ۵۳۵۸)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ میں نے آج رات یہ خواب دیکھا ہے کہ ایک سائبان سے گھی اور شہد ٹپک رہا ہے، میں نے دیکھا کہ لوگ اس کو ہتھیلیوں میں جمع کر رہے ہیں، بعض لوگ زیادہ جمع کر رہے ہیں اور بعض کم، اور میں نے دیکھا کہ آسمان سے زمین تک ایک رسی پہنچ رہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ آپ اس رسی کو پکڑ کر اوپر چڑھنے لگے، پھر ایک شخص نے اس رسی کو پکڑا اور اس کو پکڑ کر اوپر چڑھنے لگا، پھر دوسرا شخص اس رسی کو پکڑ کر اوپر چڑھا، پھر تیسرے شخص نے رسی کو پکڑا، تو وہ رسی ٹوٹ گئی، پھر رسی جڑ گئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ! آپ پر میرا باپ فدا ہو، اللہ کی قسم! اس خواب کی تعبیر بتانے کی آپ مجھے اجازت دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم تعبیر بیان کرو۔ حضرت ابوبکر نے عرض کیا: اس سائبان سے مراد اسلام ہے، اور جو شہد اور گھی سائبان سے ٹپک رہا تھا وہ قرآن مجید اور اس کی حلاوت ہے، پس بعض لوگ زیادہ قرآن مجید حاصل کرتے ہیں اور بعض کم، اور وہ رسی جو آسمان سے زمین تک پہنچ رہی ہے اس سے مراد وہ حق ہے جس پر آپ قائم ہیں، آپ اس حق سے عمل کرتے رہیں گے پھر اللہ آپ کو اپنے پاس بلا لے گا، پھر آپ کے بعد ایک اور شخص اس پر عمل کرے گا، حتیٰ کہ اس کو بھی اللہ اپنے پاس بلا لے گا، پھر دوسرا شخص اس پر عمل کرے گا، پھر تیسرا شخص اس پر عمل کرے گا پھر وہ حق منقطع ہو جائے گا پھر اس شخص کے لیے جوڑ دیا جائے گا اور وہ اس پر عمل کرے گا، یا رسول اللہ! آپ پر میرا باپ فدا ہو، مجھے یہ بتائیے کہ میں نے صحیح تعبیر کی ہے یا غلط۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہاری بعض تعبیر صحیح ہے اور بعض غلط۔ حضرت ابوبکر نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ کی قسم! آپ مجھے ضرور بتائیے کہ میں نے کیا غلطی کی ہے، آپ نے فرمایا: قسم مت کھاؤ۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۰۴۶، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۲۶۹، مسند احمد رقم الحدیث: ۲۱۱۳، عالم الکتب، سنن دارمی رقم الحدیث: ۲۱۶۲، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۱ ص ۵۹، مسند حمیدی رقم الحدیث: ۵۳۶)

خواب کی تعبیر بتانے کی اہلیت

خواب کی تعبیر بتانا ہر شخص کا کام نہیں ہے اور نہ ہر عالم خواب کی تعبیر بتا سکتا ہے، خواب کی تعبیر بتانے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں خواب کی جو تعبیریں بیان کی گئی ہیں، ان پر عبور ہو۔ الفاظ کے معانی، ان کے کنایات اور مجازات پر نظر ہو اور خواب دیکھنے والے کے احوال اور اس کے معمولات سے واقفیت ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ شخص متقی اور پرہیزگار ہو اور عبادت گزار اور شب زندہ دار ہو کیونکہ یہ وہبی علم ہے اور جب تک کسی شخص کا دل گناہوں کی کثافت کی آلودگی سے پاک اور صاف نہ ہو، اس وقت تک اس کا دل محرم اسرار الٰہیہ نہیں ہوگا، اس علم کے ماہرین نے اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں، ان میں امام ابن سیرین کی تعبیر الرویاء اور علامہ عبدالغنی نابلسی کی تعبیر المنام بہت مشہور ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ علماء کرام ان کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد خواب کی تعبیر بتائیں اور محض انکل پچو سے خواب کی تعبیر بتانے سے گریز کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (باپ نے) کہا اے میرے پیارے بیٹے! اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا ورنہ وہ تمہارے خلاف کوئی سازش کریں گے، بے شک شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے ○ (یوسف: ۵)

بھائیوں کو خواب سنانے سے منع کرنے کا سبب

امام ابن جریر نے سدی سے روایت کیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام جب شام آئے تو ان کی زیادہ توجہ حضرت

یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی بن یامین کی طرف تھی، اور جب ان کے بھائیوں نے حضرت یعقوب کی حضرت یوسف کی طرف زیادہ محبت دیکھی تو وہ حضرت یوسف سے حسد کرنے لگے اور جب حضرت یوسف نے یہ خواب بیان کیا کہ انہوں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو انہیں سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے تو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو منع کیا کہ وہ اپنے بھائیوں کے سامنے یہ خواب بیان نہ کریں مبادا وہ ان کے خلاف کوئی سازش کریں۔ (جامع البیان رقم الحدیث:۱۴۴۴۸)

کفار اور فساق کے خواب سچے ہونے کی توجیہہ

ہم نے خواب کے سلسلہ میں جو احادیث ذکر کی ہیں، ان میں یہ تصریح گزر چکی ہے کہ سچے اور نیک خواب نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جز ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سچے خوابوں میں مستقبل میں ہونے والے کسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور سچے خوابوں کے ذریعہ غیب پر مطلع کیا جاتا ہے اور غیب پر مطلع ہونا وظائف نبوت میں سے ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رویاء صادقہ اجزاء نبوت میں سے ہیں اور ان سے مومن کا ایمان مضبوط ہوتا ہے۔

ایک اعتراض یہ ہوتا ہے کہ جب سچے خواب اجزاء نبوت سے ہیں اور اللہ کی جانب سے ہوتے ہیں تو پھر سچے خواب کافروں اور جھوٹوں کو نہیں دکھائی دینے چاہئیں حالانکہ بعض کافروں اور بدکاروں کو بھی سچے خواب دکھائی دے جاتے ہیں، جیسے عزیز مصر نے سات گایوں کو دیکھا تھا، اور حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جو دو شخص قید میں تھے، انہوں نے بھی سچے خواب دیکھے تھے اور بخت نصر نے خواب دیکھا تھا جس کی حضرت دانیال نے یہ تعبیر بتائی تھی کہ اس کے ہاتھ سے ملک جاتا رہے گا اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے متعلق کسریٰ نے خواب دیکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی عاتکہ نے کفر کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبہ کے متعلق خواب دیکھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کفار، فساق اور جھوٹوں کے خواب بعض اوقات صادق ہوئے ہیں مگر یہ وحی سے نہ تھے، نہ آثار نبوت سے ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ ہر وہ شخص جس کی کوئی بات سچی نکل آئے تو وہ اطلاع علی الغیب پر مبنی ہو اور بعض اوقات کاہن وغیرہ بھی سچی پیش گوئیاں کر دیتے ہیں لیکن ایسا بہت قلیل اور نادراً ہوتا ہے۔ اس طرح کفار اور فساق کے خواب بھی بعض اوقات سچے نکل آتے ہیں اور کسی چیز کی کثرت پر حکم لگایا جاتا ہے، قلت پر حکم نہیں لگایا جاتا۔

صرف ہمدرد اور خیر خواہ کے سامنے خواب بیان کیا جائے

حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو نصیحت کی کہ وہ اپنے بھائیوں کے سامنے یہ خواب نہ بیان کریں، اس سے یہ قاعدہ معلوم ہوا کہ اس شخص کے سامنے خواب نہ بیان کیا جائے جو شفیق اور خیر خواہ نہ ہو، اور نہ اس شخص کے سامنے خواب بیان کیا جائے جس کو خواب کی تعبیر بیان کرنے کا علم نہ ہو، صحیح حدیث میں ہے:

حضرت ابو رزین عقیلی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن کا خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے اور جب تک اس خواب کو بیان نہ کیا جائے، یہ پرندے کی ٹانگ پر معلق ہوتا ہے اور جب اس کو بیان کر دیا جائے تو پھر یہ ساقط ہو جاتا ہے اور خواب صرف عقل مند شخص اور دوست کو بیان کیا جائے۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۲۷۸،۲۲۷۹، سنن ابو داؤد الطیالسی رقم الحدیث:۱۰۸۸، مصنف ابن ابی شیبہ ج۱۱ ص۵۰، مسند احمد ج۴، ص ۱۰، ۱۲، ۱۳، سنن الدارمی رقم الحدیث:۲۱۵۴، صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۶۰۴۹، المعجم الکبیر ج۱۹ رقم الحدیث:۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، المستدرک ج۴، ص۳۹۰، شرح السنہ رقم الحدیث:۳۲۸۲،۳۲۸۱)

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ خواب کو قرار نہیں ہوتا جیسے کوئی چیز پرندے کی ٹانگ پر باندھی ہوئی ہو، یعنی جب تک اس کی تعبیر بیان نہ کر دی جائے اس کو قرار نہیں ہوتا۔ جیسا کہ پرندہ کو اکثر حالات میں قرار نہیں ہوتا تو جو چیز اس کی ٹانگ پر معلق ہو اس کو کس طرح قرار ہوگا، اور جب اس کی تعبیر بیان کر دی جائے تو وہ ساقط ہو جاتا ہے یعنی خواب دیکھنے والے کو اس کا حکم لاحق ہو جاتا ہے اور آپ نے فرمایا: اس کی تعبیر صرف صاحب عقل سے معلوم کی جائے کیونکہ وہ اس کی اچھی اور پسندیدہ تعبیر بیان کرے گا اور اگر اس کے نزدیک اس کی تعبیر ناپسندیدہ ہوگی تو خاموش رہے گا، اور فرمایا: یا یہ خواب صرف دوست یعنی خیر خواہ سے بیان کیا جائے کیونکہ وہ اس خواب کی وہی تعبیر بیان کرے گا جو باعث مسرت ہو۔

عمداً خواب کی غلط تعبیر بیان نہ کرے

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں: امام مالک سے پوچھا گیا کیا ہر شخص خواب کی تعبیر بیان کر سکتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: کیا نبوت کو کھیل بنایا جائے گا، اور امام مالک نے فرمایا: وہی شخص خواب کی تعبیر بیان کرے جس کو خواب کی تعبیر بیان کرنے کا علم ہو، اگر اس کے نزدیک خواب کی تعبیر اچھی ہو تو اس کو بیان کر دے اور اگر اس کے نزدیک خواب کی تعبیر بری ہو تو اس کو اچھی نصیحت کرے (مثلاً اس سے کہے کہ دعا کرو، اے اللہ! میرے خواب کی بری تعبیر کو اچھی تعبیر سے بدل دے) اور یا خاموش رہے۔ امام مالک سے پوچھا گیا کہ بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ خواب کی جو تعبیر بیان کی جائے خواب اسی تعبیر پر واقع ہوتا ہے تو کیا تعبیر بتانے والے کے لیے یہ جائز ہے کہ اس کے نزدیک خواب کی تعبیر بری ہو، لیکن وہ خواب کی اچھی تعبیر بتادے۔ امام مالک نے فرمایا: نہیں، خواب نبوت کا ایک جز ہے پس نبوت کو کھیل نہ بنایا جائے۔

(الجامع لاحکام القرآن، جز ۹، ص ۱۱۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

کسی کو ضرر سے بچانے کے لیے دوسرے کے عیب بیان کرنے کا جواز

اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ مسلمان شخص اپنے مسلمان بھائی کے لیے جس چیز سے خطرہ محسوس کرے، اس سے اس کو آگاہ کر دے اور یہ غیبت نہیں ہے کیونکہ غیبت وہ ہوتی ہے کہ کسی مسلمان شخص کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے اس کے پس پشت اس کا وہ عیب بیان کرے جس کو وہ مخفی رکھتا ہو اور یہاں مقصود کسی کو ذلیل اور رسوا کرنا نہیں بلکہ ایک مسلمان شخص کو دوسرے کے ضرر سے بچانا مقصود ہے کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے سامنے یہ خواب بیان کرنے سے منع کیا تاکہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خلاف کوئی سازش نہ کریں اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ابو جہم سے رشتہ کا پیغام قبول نہ کرو کیونکہ وہ کندھے سے لاٹھی نہیں اتارتا اور معاویہ کا پیغام قبول نہ کرو کیونکہ وہ مفلس ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۱۳۵، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۴۸۰، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۲۸۴، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۵۴۶)

حسد کے خطرہ سے نعمتوں کے چھپانے کا جواز

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ۔ (الضحیٰ: ۱۱) — اور اپنے رب کی نعمت کا خوب بیان کریں۔

اور سورۂ یوسف کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ نعمت کے بیان اور اظہار کا یہ حکم علی الاطلاق نہیں ہے، جس شخص کو یہ خطرہ ہو کہ اگر حاسدوں کو اس نعمت کا پتا چل گیا تو وہ اس سے حسد کریں گے اور اس کے خلاف سازشیں کریں گے تو اس کو چاہیے کہ وہ نعمت کو چھپالے اور کسی کے سامنے اس کا اظہار نہ کرے اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے:

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی ضروریات کی تکمیل پر مخفی رکھنے سے مدد طلب کرو کیونکہ ہر صاحب نعمت سے حسد کیا جاتا ہے۔

(المعجم الصغیر رقم الحدیث:۱۱۸۶، المعجم الاوسط رقم الحدیث:۲۴۷۶، المعجم الکبیر ج ۲۰، ص ۹۴، حلیۃ الاولیاء ج ۵، ص ۲۱۶، تنزیہ الشریعہ ج ۲، ص ۱۳۵، الکامل فی ضعفاء الرجال ج ۳، ص ۲۳۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ، شعب الایمان رقم الحدیث:۶۶۵۵، کتاب الضعفاء للعقیلی ج ۲، ص ۱۰۹، تاریخ بغداد ج ۸، ص ۵۷، مجمع الزوائد ج ۸، ص ۱۹۴، الجامع الصغیر رقم الحدیث:۹۸۵، الفوائد المجموعہ رقم الحدیث:۷۰، ۲۶۱ تذکرۃ الموضوعات ص ۲۰۵، اللآلی المصنوعہ ج ۲، ص ۲۴۳، الاحادیث الصحیحہ للالبانی رقم الحدیث:۴۵۳، صحیح الجامع للالبانی ج ۱، ص ۹۴۳)

حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کی سربلندی اور ان کے بھائیوں کے حسد کا پیشگی علم ہونا

اس آیت میں یہ دلیل بھی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو خواب کی تعبیر کا علم تھا کیونکہ ان کو اس علم کے ذریعہ یہ معلوم تھا کہ عنقریب حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں پر غلبہ حاصل کرلیں گے اور انہوں نے اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو خود ان پر بھی تفوق حاصل ہو جائے گا کیونکہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا اس سے بہتر منصب پر فائز ہو، البتہ کوئی شخص یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کا بھائی اس سے مرتبہ اور منصب میں بڑھ جائے۔

اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی ان سے حسد کرتے ہیں اور ان سے بغض رکھتے ہیں، اس لیے انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو منع کیا کہ وہ یہ خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کریں کیونکہ ان کو خطرہ تھا کہ اس خواب کو سن کر ان کے دلوں میں کینہ اور بغض پیدا ہوگا اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ہلاک کرنے کے لیے سازشیں کریں گے۔

سچے خوابوں کے بشارت ہونے کی تفصیل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: نبوت سے اب صرف بشارتیں باقی رہ گئی ہیں: صحابہ نے پوچھا: بشارتوں سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: سچے خواب! امام ابن ماجہ کی روایت میں ہے: وہ خواب مسلمان خود دیکھتا ہے یا کوئی شخص اس کے لیے دیکھتا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۶۹۹۰، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۳۸۹۹، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:۲۰۹۳۹، مسند حمیدی رقم الحدیث:۴۸۹، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۱، ص ۴۹، ۲۴۸، مسند احمد ج ۱، ص ۲۱۹، سنن الدارمی رقم الحدیث:۱۳۳۱، ۱۳۳۲، سنن ابو داؤد رقم الحدیث:۸۷۶، المنتقی رقم الحدیث:۲۰۳، صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث:۵۴۸، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث:۲۳۸۷، مسند ابو عوانہ ج ۲، ص ۱۷۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۱۸۹۶، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۲، ص ۸۷، شرح السنہ رقم الحدیث:۶۲۶)

اس حدیث کا ظاہر معنی یہ ہے کہ سچے خواب نبوت کا جز ہیں اور اس سے یہ لازم آئے گا کہ سچے خواب دیکھنے والے میں نبوت کا ایک جز پایا جائے، اور اس کو نبی کہا جائے، اس کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کا جز اس چیز کے وصف کو مستلزم نہیں ہوتا، مثلاً بلند آواز سے اشہد ان لا الہ الا اللہ پڑھنا اذان کا جز ہے لیکن جو آدمی صرف یہ کلمہ بلند آواز سے پڑھے، اس کو موذن نہیں کہا جائے گا اسی طرح کھڑے ہو کر قرآن کریم پڑھنا نماز کا جز ہے لیکن جو شخص صرف کھڑے ہو کر قرآن مجید پڑھے اس کو نمازی نہیں کہا جائے گا، اسی طرح اگرچہ سچے خواب نبوت کا جز ہے لیکن سچے خواب دیکھنے والے کو نبی نہیں کہا جائے گا۔

اس حدیث پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سچے خواب ہمیشہ بشارت ہوتے ہیں لیکن سچے خواب بعض اوقات ڈرانے والے بھی ہوتے ہیں جن سے خواب دیکھنے والا خوش نہیں ہوتا' اور ایسے خواب دکھانا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومن پر شفقت اور رحمت ہے تاکہ کسی مصیبت کے نازل ہونے سے پہلے وہ اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرلے اور وہ اس کا جو تدارک کر سکتا ہے' وہ کرلے' اس کا جواب یہ ہے کہ سچے خواب مطلقاً بشارت نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات بشارت ہوتے ہیں' اور چونکہ اکثر اور اغلب طور پر سچے خواب بشارت ہوتے ہیں اس لیے آپ نے مطلقاً فرمایا: سچے خواب مبشرات ہیں۔

اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جس مرض میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تھا اس مرض میں صحابہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی' آپ نے حجرہ کا پردہ اٹھا کر فرمایا: اے لوگو! نبوت کی بشارتوں سے صرف سچے خواب باقی بچے ہیں جو مسلمان خود دیکھتا ہے یا کوئی اس کے لیے دیکھتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ: ۳۸۹۹) اب اس کی توجیہ یہ ہے کہ میری وفات کے بعد وحی منقطع ہو جائے گی اور پھر مستقبل کی باتوں کا علم صرف سچے خوابوں سے ہوگا' اگر اس پر یہ اعتراض ہو کہ وحی تو منقطع ہو جائے گی لیکن الہام منقطع نہیں ہوگا جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کے متعلق فرمایا وہ محدث ہیں یعنی ان پر الہام ہوتا ہے اور بکثرت اولیاء کرام نے غیب کی خبریں دیں اور ان کی دی ہوئی خبروں کے مطابق مستقبل میں واقعات ہوئے' اس کا جواب یہ ہے کہ خواب کا ذکر اس لیے فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو کہ عام مسلمانوں کو بھی مستقبل کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں اور الہام تو صرف خواص مومنین کو ہوتا ہے اور وہ ہے بھی نادر اور خواب بکثرت واقع ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں الہام بہت نادر تھا کیونکہ وحی کا غلبہ تھا' اور جب آپ کے وصال کے بعد وحی منقطع ہوگئی تو جن مومنین کو اللہ تعالیٰ نے خاص کرلیا تھا' ان پر الہام بکثرت ہونے لگا کیونکہ اب اس کا وحی سے اشتباہ نہیں ہو سکتا تھا' اور جو شخص الہام کا انکار کرتا ہے' یہ اس کی ہٹ دھرمی ہے کیونکہ اس کا وقوع بہت زیادہ ہے اور بہت مشہور ہے۔

(فتح الباری جلد ۱۲' ص ۳۷۶-۳۷۵' مطبوعہ لاہور' ۱۴۰۱ھ)

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی بھی منصب نبوت پر فائز ہوئے تھے یا نہیں' اس میں علماء کا اختلاف ہے' ہم پہلے فریقین کے دلائل کا ذکر کریں گے اور آخر میں اپنا نظریہ بیان کریں گے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے انبیاء ہونے کے دلائل

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اور امام ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ اپنی سندوں کے ساتھ لکھتے ہیں۔

عبدالرحمن بن زید بن اسلام نے احد عشر کوکبا کی تفسیر میں کہا ہے: گیارہ ستارے اور سورج اور چاند' حضرت یوسف کے ماں باپ اور ان کے بھائی ہیں اور ان کے بھائی انبیاء تھے اور انہوں نے کہا کہ وہ اس وقت تک حضرت یوسف کو سجدہ کرنے پر راضی نہیں ہوں گے حتیٰ کہ ان کے ماں باپ ان کو سجدہ کرلیں۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۴۴۷' تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۳۳۰)

علامہ ابواللیث نصر بن محمد السمرقندی المتوفی ۳۷۵ھ لکھتے ہیں: زجاج نے کہا حضرت یعقوب علیہ السلام نے گیارہ ستاروں کی یہ تعبیر کی کہ ان سے ایسے اصحاب فضیلت لوگ مراد ہیں جن سے روشنی حاصل ہوگی کیونکہ ستارے سے زیادہ روشن اور کوئی چیز نہیں ہے' اور سورج اور چاند سے ان کے ماں باپ کو مراد لیا پس سورج سے مراد ماں ہے اور چاند سے مراد باپ ہے

اور تاروں سے مراد ان کے بھائی ہیں اور اس کی یہ تعبیر کی کہ حضرت یوسف بھی نبی ہوں گے اور ان کے بھائی بھی نبی ہوں گے کیونکہ ان کو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ ان پر اور ان کے بھائیوں پر اپنی نعمت اس طرح پوری کرے گا جس طرح ان کے باپ دادا ابراہیم اور اسحٰق پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت پوری کی تھی۔

(تفسیر السمرقندی ج ۲، ص ۱۵۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۳ھ)

امام ابو محمد الحسین بن مسعود بغوی الشافعی متوفی ۵۱۶ھ لکھتے ہیں: امام محمد بن اسحٰق نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا فعل متعدد جرائم پر مشتمل ہے، انہوں نے قطع رحم کیا، ماں باپ کی نافرمانی کی، بے قصور چھوٹے بھائی پر رحم نہیں کیا، امانت میں خیانت کی، اور اپنے باپ سے جھوٹ بولا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام گناہوں کو معاف کر دیا تاکہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بعض اہل علم نے یہ کہا ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل کرنے کا عزم کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کو بچا لیا اور اگر وہ یہ قتل کر دیتے تو وہ سب ہلاک ہو جاتے، اور یہ تمام گناہ ان کو نبی بنانے سے پہلے ہوئے تھے، ابو عمر بن العلاء سے سوال کیا گیا، انہوں نے یہ کیسے کہا:

أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ۔ (یوسف: ۱۲)   کل یوسف کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے کہ وہ پھل کھائے اور کھیلے۔

حالانکہ وہ انبیاء تھے اور کھیلنا انبیاء کی شان کے منافی ہے، اور انہوں نے اس کے جواب میں کہا: یہ واقعہ ان کو نبی بنانے سے پہلے کا ہے۔ (معالم التنزیل ج ۲، ص ۳۴۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَىٰ أَبَوَيْكَ مِن قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ۔ (یوسف: ۶)   اور تم پر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت مکمل فرمائے گا، جس طرح اس سے پہلے اس نے اس نعمت کو تمہارے باپ دادا ابراہیم اور اسحٰق پر مکمل فرمایا تھا۔

امام رازی فرماتے ہیں: یہ بات سب کو معلوم ہے کہ وہ نعمت تامہ جس کی وجہ سے حضرت ابراہیم اور حضرت اسحٰق تمام انسانوں سے ممتاز ہوئے وہ نعمت صرف نبوت ہے اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: وہ نعمت اللہ تعالیٰ آل یعقوب کو عطا فرمائے گا اور یہ اس بات کو مستلزم ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے تمام بیٹے انبیاء ہوں، نیز حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: میں نے خواب میں گیارہ ستارے دیکھے اور ان گیارہ ستاروں سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کے گیارہ بھائی ہیں، اور ان بھائیوں کا ستارے ہونا اس بات کو مستلزم ہے کہ ان کو فضیلت اور کمال حاصل ہو اور ان کے علم اور دین سے زمین والوں کو روشنی اور ہدایت حاصل ہو کیونکہ سورج اور چاند کے بعد ستاروں سے زیادہ کوئی چیز قدرتی طور پر روشن نہیں ہے اور ان سے ہدایت اور روشنی حاصل ہوتی ہے اور اس سے یہ لازم آیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی تمام اولاد انبیاء اور رسل ہو، لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام کے تمام بھائی انبیاء قرار پائے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا انبیاء ہونا کس طرح جائز ہو گا جب کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ بہت ظالمانہ سلوک کیا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے یہ گناہ نبوت سے پہلے صادر ہوئے اور ہمارے نزدیک عصمت کا اعتبار نبوت کے وقت ہوتا ہے نبوت سے پہلے نہیں ہوتا۔

(تفسیر کبیر ج ۶، ص ۴۲۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

قاضی ناصر الدین عبداللہ بن عمر بیضاوی متوفی ۶۸۶ھ لکھتے ہیں: حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: اللہ تعالیٰ تم پر اپنی نعمت پوری کرے گا، یعنی تم کو نبوت سے سرفراز فرمائے گا، یا تم کو دنیا کی نعمت کے ساتھ آخرت کی نعمت بھی عطا فرمائے گا، اور آل یعقوب پر بھی نعمت پوری فرمائے گا، اس سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی مراد ان کے سارے بیٹے تھے، اور شاید کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے تمام بیٹوں کی نبوت پر اس سے استدلال کیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جو گیارہ ستارے دیکھے تھے اس سے مراد گیارہ بھائی تھے، اور ستاروں کے ضیاء سے مراد ان کی ہدایت کی روشنی تھی۔

(انوار التنزیل مع حاشیۃ الشہاب ج ۵، ص ۲۶۸، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ)

علامہ ابوالحیان محمد بن یوسف اندلسی غرناطی متوفی ۷۵۴ھ نے لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو کہا کہ وہ تم پر اپنی نعمت کو مکمل کرے گا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ انہیں دنیا میں اپنی نعمت پہنچائے گا یا اس طور کہ ان کو دنیا میں انبیاء اور بادشاہ بنائے گا اور ان کو آخرت کی نعمت پہنچائے گا، بایں طور پر ان کو جنت کے بلند درجات تک پہنچائے گا، ظاہر یہ ہے کہ آل یعقوب سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد اور ان کی نسل ہے یعنی ہم ان کو نبی بنائیں گے۔

(البحر المحیط ج ۶، ص ۲۴۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۲ھ)

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے انبیاء نہ ہونے کے دلائل

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ نے لکھا ہے کہ کتاب الطبری میں یہ لکھا ہوا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی انبیاء تھے اور ان کو نبی ماننا اس بات کو رد کرتا ہے کہ نبی حسد کرنے، ماں باپ کی نافرمانی کرنے، جھوٹ بولنے، مومن کو ہلاک کرنے کے درپے ہونے، اس کو قتل کرنے کے درپے ہونے اور آزاد انسان کو فروخت کرنے ایسے کبیرہ گناہوں سے معصوم ہوتا ہے، اس لیے ان لوگوں کے قول کی طرف توجہ نہ کی جائے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی نبی تھے، ہرچند کہ نبی کی لغزش عقلاً محال نہیں ہے، مگر یہ ایسی لغزش ہے جو متعدد کبیرہ گناہوں پر مشتمل ہے، اہلسنّت کا اس میں تو اختلاف ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے صغائر کا صدور ہوتا ہے یا نہیں لیکن اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ انبیاء علیہ السلام سے کبائر کا صدور نہیں ہوتا۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۹، ص ۱۱۳، مطبوعہ دار الفکر، ۱۴۱۵ھ)

حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ لکھتے ہیں:

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی نبوت پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے اور انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے خلاف جو سازش کی تھی وہ اس دعویٰ کے خلاف ہے، بعض لوگوں کا یہ گمان ہے کہ ان کے ان گناہوں کے بعد ان کو نبوت دی گئی اور یہ دعویٰ دلیل کا محتاج ہے، اور اس آیت کے سوا ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے:

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ۔ (آل عمران: ۸۴)

کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر جو ہم پر نازل کی گئی ہے اور اس چیز پر جو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل کی گئی ہے۔

اسباط کے لفظ میں کئی احتمال ہیں کیونکہ بنو اسرائیل کے گروہوں کو اسباط کہا جاتا ہے، جیسا کہ عرب کے گروہوں کو قبائل کہا جاتا ہے اور عجم کے گروہوں کو شعوب کہا جاتا ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس نے انبیاء کی طرف وحی نازل فرمائی جو بنو اسرائیل کے اسباط (گروہوں) سے ہیں اور ان کا اجمالاً ذکر فرمایا کیونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی، لیکن ہر سبط (گروہ) حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی نسل سے تھا۔ اور اس پر دلیل قائم نہیں ہو سکی کہ بعینہٖ حضرت یوسف علیہ

السلام کے بھائیوں کی طرف وحی کی گئی تھی۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲، ص ۵۲۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۹ھ)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ (یوسف: ۵)

(باپ نے) کہا اے میرے پیارے بیٹے! اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے نہ بیان کرنا ورنہ وہ تمہارے خلاف کوئی سازش کریں گے، بے شک شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے○

اس آیت سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی انبیاء نہیں تھے اور یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، اور اکثر متقدمین اور متاخرین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی نبی ہرگز نہیں تھے، متقدمین میں حضرات صحابہ کرام ہیں اور ان میں سے کسی سے بھی یہ منقول نہیں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی نبی تھے اور نہ ہی تابعین میں سے کسی سے منقول ہے کہ وہ نبی تھے اور اتباع تابعین میں سے صرف ابن زید سے منقول ہے کہ وہ نبی تھے اور بہت کم لوگوں نے ان کی پیروی کی ہے، اور متاخرین مفسرین میں سے بعض نے ابن زید کے قول کی پیروی کی ہے جیسے امام بغوی، اور بعض نے اس قول کے رد میں بہت شدت کی ہے جیسے علامہ قرطبی اور ابن کثیر، اور بعض مفسرین نے ان دونوں قولوں کو بلا ترجیح نقل کر دیا ہے جیسے ابن الجوزی، اور بعض مفسرین نے اس مسئلہ کو بالکل نہیں چھیڑا، البتہ انہوں نے ایسی تفسیر کی ہے جس سے اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ وہ نبی نہیں تھے، کیونکہ انہوں نے اسباط کی یہ تفسیر کی ہے: وہ لوگ جو بنو اسرائیل میں سے نبی بنائے گئے اور ان پر احکام شرعیہ نازل کیے گئے، مثلاً ابو اللیث السمرقندی اور واحدی (ابو اللیث السمرقندی کا حوالہ صحیح نہیں ہے کیونکہ انہوں نے یہ تصریح کی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی نبی تھے اور اس پر دلائل قائم کیے ہیں البتہ واحدی کا حوالہ درست ہے جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے تفسیر سمرقندی سے نقل کیا ہے) اور بعض مفسرین نے کچھ ذکر نہیں کیا لیکن اسباط کی تفسیر حضرت یعقوب کی اولاد کے ساتھ کی ہے، جس سے لوگوں نے یہ گمان کیا کہ وہ حضرت یعقوب کی تمام اولاد کے نبی ہونے کے قائل ہیں حالانکہ یہ اس کی تصریح نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اولاد سے مراد حضرت یعقوب کی ذریت ہو نہ کہ ان کے صلبی بیٹے۔

شیخ ابن تیمیہ نے اس موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید، لغت اور قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی انبیاء نہیں تھے، یہ چیز قرآن مجید میں مذکور ہے نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے اور نہ آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے کسی کا قول ہے، جن لوگوں نے بھی حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے انبیاء ہونے کا قول کیا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ البقرہ: ۱۴۰، النساء: ۱۶۳ میں اسباط کا لفظ ہے اور انہوں نے اس کی تفسیر حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے کی، اور صحیح یہ ہے کہ الاسباط سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کی صلبی اولاد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کی ذریت ہے جیسا کہ انہیں بنی اسرائیل کہا جاتا ہے، اور جیسا کہ تمام انسانوں کو بنو آدم کہا جاتا ہے، نیز قرآن مجید میں ہے:

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ○ وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا۔ (الاعراف: ۱۶۰-۱۵۹)

اور موسیٰ کی امت سے ایک گروہ ہے وہ لوگ حق کے ساتھ ہدایت کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں○ اور ہم نے بنو اسرائیل کو بارہ قبیلوں میں گروہ در گروہ کر کے تقسیم کر دیا۔

یہ آیت اس معنی میں صریح ہے کہ اسباط بنی اسرائیل کے متعدد گروہ ہیں اور ہر سبط ایک گروہ ہے' اور انہوں نے یہ تصریح کی ہے کہ بنی اسرائیل کے اسباط ایسے ہیں جیسے بنی اسماعیل کے قبائل ہیں اور سبط لغت میں ایسے درخت کو کہتے ہیں جس کے بہت گھنے پتے ہوں' تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کو ان کی اولاد پھیلنے سے پہلے اسباط کہنے کی کوئی مناسبت نہیں ہے' اس لیے البقرہ: ۱۴۰ اور النساء: ۱۶۳' میں اسباط کے لفظ کو حضرت یعقوب کے بارہ بیٹوں کے ساتھ مخصوص کرنا غلط ہے' اس پر لفظ دلالت کرتا ہے نہ اس کا معنی ثابت ہے' اور صحیح یہ ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ کے عہد سے اسباط کا نام رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جن میں نبوت معروف تھی' ان میں حضرت یوسف علیہ السلام سے پہلے کوئی نبی نہیں تھا' اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اللہ سبحانہ نے جب حضرت ابراہیم کی ذریت سے انبیاء کا ذکر کیا تو صرف حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کیا اور ان کے ساتھ اسباط کا ذکر نہیں کیا' اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی بھی نبی بنائے گئے ہوتے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو نبی بنایا گیا تھا تو اللہ تعالیٰ ان کا ذکر بھی فرماتا' وہ آیت یہ ہے:

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝

(الانعام: ۸۶ - ۸۴)

اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب عطا کیے' ہم نے سب کو ہدایت دی اور اس سے پہلے نوح کو ہدایت دی' اور ان کی اولاد سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف' اور موسیٰ اور ہارون کو ہدایت دی' اور ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں ۝ اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس (سب کو ہدایت دی) یہ سب صالحین میں سے ہیں ۝ اور اسمٰعیل اور الیسع اور یونس اور لوط' اور ہم نے سب کو سارے جہان والوں پر فضیلت دی۔

اور نیز اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی وہ تعریف و توصیف فرمائی جو نبوت کے مناسب ہے' اگرچہ وہ اس آیت سے پہلے ہے اور حدیث میں ہے لوگوں میں سب سے کریم یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم ہیں جو نبی ہیں اور نبی کے بیٹے ہیں' پس اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی بھی انبیاء ہوتے تو وہ بھی کرم کی اس صفت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے شریک ہوتے اور جب اللہ سبحانہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا قصہ ذکر فرمایا اور اس سلوک کا ذکر کیا جو انہوں نے اپنے بھائی کے ساتھ کیا تھا اور ان کی خطاء کے اعتراف کا ذکر کیا اور انہوں نے اپنے والد سے جو استغفار طلب کیا تھا' اس کا ذکر کیا تو اس مقام پر ان کی کسی ایسی فضیلت کا ذکر نہیں کیا جو مقام نبوت کے مناسب ہوتی' بلکہ ان کی توبہ کا ذکر بھی نہیں کیا' جیسا کہ ان سے کم گناہ کرنے والوں کی توبہ کا ذکر فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کے ایسے کاموں کا ذکر نہیں کیا' نبوت سے پہلے نہ نبوت کے بعد کہ انہوں نے باپ کی نافرمانی کی ہو' قطع رحم کیا ہو' مسلمان کو غلام بنا کر کافروں کے شہر میں بیچا ہو اور صاف جھوٹ بولا ہو' بلکہ اگر ان کے نبی نہ ہونے پر اور کوئی دلیل نہ بھی ہوتی تو ان کے نبی نہ ہونے کے لیے یہ جرائم ہی کافی تھے' کیونکہ جمہور کے نزدیک انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد اس قسم کے جرائم سے معصوم ہوتے ہیں' نیز مورخین نے بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے تمام بھائی مصر میں فوت ہو گئے تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام بھی مصر میں وفات پا گئے تھے' لیکن انہوں نے یہ وصیت کی تھی کہ ان کے جسم کو شام منتقل کر دیا جائے' تو موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جسم کو شام میں منتقل کر دیا' اور قرآن مجید میں یہ ذکر نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے مصر میں حضرت یوسف

علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور نبی آیا ہو اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی نبی نہیں تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ دعویٰ کرنا غلط ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی نبی تھے اور یہ غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو اسباط سمجھ لیا گیا' حالانکہ اس طرح نہیں ہے' اسباط کے معنی بہت بڑا گروہ ہے اور اگر اسباط سے مراد حضرت یعقوب کے بیٹے ہوتے تو اللہ تعالیٰ یوں فرماتا یعقوب اور ان کے بیٹے اور یہ بہت واضح اور مختصر ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اسباط کے لفظ سے تعبیر فرما کر یہ اشارہ کیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی ذریت میں نبوت اس وقت آئی جب وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں گروہ در گروہ ہو کر منقسم ہو چکے تھے۔

(روح المعانی جز ۲ ص' ص ۲۷۷-۲۷۵' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۷ھ)

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی نبوت کے متعلق مصنف کا موقف

ہم نے شرح صحیح مسلم کی ساتویں جلد میں ذکر کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اعلان نبوت سے پہلے اور اعلان نبوت کے بعد تمام صغائر اور کبائر سے مجتنب ہوتے ہیں البتہ تبلیغی اور تشریعی ضرورت کی وجہ سے ان سے مکروہ تنزیہی کا ارتکاب ہو سکتا ہے اور خلاف اولیٰ کا ارتکاب بھی ہو سکتا ہے لیکن مکروہ تنزیہی اور خلاف اولیٰ گناہ نہیں ہیں اور ان سے اجتہادی خطاء بھی سرزد ہو سکتی ہے اور اجتہادی خطا بھی نہ صرف یہ کہ گناہ نہیں ہے بلکہ اجتہادی خطاء پر ایک اجر بھی ملتا ہے' اور انبیاء سابقین علیہم السلام سے جس قدر زلات صادر ہوئیں وہ سب اسی نوع کی ہیں' ان میں سے کوئی کام گناہ صغیرہ ہے نہ کبیرہ' اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے متعدد گناہ کبیرہ کیے اس لیے صحیح قول یہی ہے کہ وہ انبیاء نہیں ہیں' اور ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مکروہ تنزیہی یا خلاف اولیٰ صادر ہوا وہ بظاہر مکروہ تنزیہی یا خلاف اولیٰ ہے' حقیقت میں وہ فرض کے درجہ میں ہے کیونکہ آپ نے امت کی تعلیم کے لیے اور شریعت سازی کے لیے وہ کام کیے' اور تعلیم اور تبلیغ آپ پر فرض ہے اس لیے آپ نے جو ایسے کام کیے جو بظاہر مکروہ تنزیہی یا خلاف اولیٰ تھے' ان کا کرنا آپ پر فرض تھا کیونکہ تبلیغ کرنا وظائف نبوت اور فرائض رسالت سے ہے اور آپ کو ان کے ارتکاب پر فرائض کی ادائیگی کا اجر و ثواب ملے گا اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے اجتہادی خطاء سے بھی محفوظ رکھا۔ آپ نے جس وقت اپنے اجتہاد سے جو کام کیا اس وقت اسی کام کو کرنا حق' صحیح اور صواب تھا۔ انبیاء سابقین علیہم السلام حشر کے دن اس وجہ سے پریشان ہوں گے کہ دنیا میں ان کی زلات کی مغفرت کا اعلان نہیں کیا گیا اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے حشر کے دن شفاعت کبریٰ کے مقام پر فائز کرنا تھا' اس لیے وہ بظاہر خلافِ اولیٰ کام جو فی نفسہٖ معصیت اور گناہ نہ تھے لیکن آپ اپنے بلند مقام کی وجہ سے ان کو بھی موجب استغفار قرار دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے لیغفرلک اللہ ماتقدم من ذنبک وماتاخر نازل فرما کر آپ کی مغفرت کلی اور مغفرت قطعی کا اعلان فرما دیا تاکہ آپ حشر کے دن مطمئن ہوں اور تسلی کے ساتھ سب کی شفاعت کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اسی طرح تمہارا رب تمہیں منتخب فرمائے گا اور تمہیں خوابوں کی تعبیروں کا علم عطا فرمائے گا اور تم پر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت کو مکمل فرمائے گا۔ جس طرح اس سے پہلے اس نے اس نعمت کو تمہارے باپ دادا ابراہیم اور اسحٰق پر مکمل فرمایا تھا' بے شک تمہارا رب خوب جاننے والا' نہایت حکمت والا ہے۔ (یوسف: ٦)

حضرت یوسف علیہ السلام کی مدح

یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم کو یہ عظیم خواب دکھا کر تم کو شرف بخشا ہے اور عزت اور فضیلت سے نوازا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اور بڑے بڑے اور عظیم کاموں کے لیے تم کو منتخب فرمائے گا۔ حسن نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو

نبوت کے لیے منتخب فرمائے گا اور دوسرے مفسرین نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارا درجہ بلند کرنے کے لیے اور تم کو عظیم مرتبہ دینے کے لیے منتخب فرمائے گا۔ النحاس نے کہا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی مدح فرمائی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو زمین کے خزانوں پر اقتدار اور خواب کی تعبیروں کا جو علم عطا فرمایا ہے۔ ان نعمتوں کی اجمالی بشارت دی ہے۔

تاویل الاحادیث کے محامل

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تم کو تاویل احادیث کی تعلیم دے گا' آیت کے اس حصہ کی کئی تفسیریں کی گئی ہیں' ایک یہ ہے کہ تاویل احادیث سے مراد ہے خوابوں کی تعبیر اور اس کو تاویل احادیث اس لیے فرمایا کہ تاویل کا لفظ اَول سے بنا ہے اور اَول کا معنی ہے لوٹنا اور رجوع کرنا اور انسان خواب میں جو باتیں سنتا ہے' بعد میں اس کے تحقق اور ثبوت کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس لیے تاویل احادیث کی تفسیر خوابوں کی تعبیر سے کی گئی ہے' اور تاویل احادیث کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں جو باتیں لکھی ہوئی تھیں اور انبیاء متقدمین کی جو احادیث اور ان کے جو ارشادات تھے' اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان احادیث کی تعلیم دی' اور اس کی تیسری تفسیر یہ ہے کہ احادیث حدیث کی جمع ہے اور حدیث' قدیم کا مقابل ہے یعنی حادث اور تاویل کا معنی ہے مآل اور حوادث کا مآل اللہ تعالیٰ کی قدرت' اس کی تکوین اور اس کی حکمت ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی جسمانی اور روحانی مخلوقات کی اصناف اور اقسام سے اللہ تعالیٰ کی قدرت' اس کی حکمت اور اس کی جلالت پر استدلال کرنا۔

تکمیل نعمت کا معنی

اس کے بعد فرمایا: اور تم پر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت کو مکمل فرمائے گا' نعمت کی تکمیل کی بھی دو تفسیریں کی گئی ہیں' ایک یہ ہے کہ نعمت کو اس طرح کامل کر دینا کہ وہ ہر قسم کے نقصان سے محفوظ ہو اور ایسی نعمت انسان کے حق میں صرف نبوت ہے' کیونکہ مخلوق کے تمام مناصب' منصب نبوت کے مقابلہ میں ناقص ہیں اور انسان کے حق میں تمام مطلق اور کمال مطلق صرف نبوت ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: جس طرح اس سے پہلے اس نے نعمت کو تمہارے باپ دادا ابراہیم اور اسحٰق پر مکمل فرمایا تھا اور وہ نعمت جو حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے باپ دادا میں مشترک ہے' وہ صرف نبوت ہے' کیونکہ اسی نعمت کی وجہ سے حضرت ابراہیم اور اسحٰق کو باقی انسانوں سے امتیاز حاصل ہوا' لہٰذا اس آیت میں تکمیل نعمت سے مراد نبوت ہے۔

نیز اس آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام سے فرمایا ہے: اور تم پر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت مکمل فرمائے گا۔ اس آیت میں آل یعقوب سے مراد ان کے صلبی بیٹے نہیں ہیں بلکہ ان کی ذریت ہے جیسا کہ ہم نے پہلے دلائل سے واضح کر دیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے صلبی بیٹوں کو نبوت نہیں دی گئی تھی۔

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب کی تعبیر کا علم چالیس سال کے بعد دیا گیا تھا اور ان کی تعبیر میں کبھی خطا واقع نہیں ہوئی اور یہ ان کا معجزہ تھا۔ ان کو خواب کی تعبیر کا علم سب سے زیادہ تھا اسی طرح ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سب سے زیادہ خواب کی تعبیر کا علم تھا اور امت میں یہ علم سب سے زیادہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تھا' اور امام ابن سیرین کو بھی اس کا علم بہت زیادہ تھا اور اس کے قریب سعید بن مسیب کو اس کا علم تھا۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۹' ص ۱۱۵' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِۦٓ ءَايَٰتٌ لِّلسَّآئِلِينَ ﴿۷﴾ إِذْ قَالُوا۟

بے شک یوسف اور ان کے بھائیوں کے قصہ میں پوچھنے والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں ○ جب یوسف کے

لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰٓ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ۚ إِنَّ أَبَانَا

بھائیوں نے مشورہ کیا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کے نزدیک ہم سے زیادہ محبوب ہیں حالانکہ ہم پوری جماعت ہیں بیشک

لَفِي ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ ﴿۸﴾ ٱقْتُلُوا۟ يُوسُفَ أَوِ ٱطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ

ہمارے باپ کی رائے درست نہیں ہے ○ یوسف کو قتل کر دو یا اس کو کسی ملک میں چھوڑ آؤ پھر تمہارے

لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا۟ مِنۢ بَعْدِهِۦ قَوْمًا صَٰلِحِينَ ﴿۹﴾ قَالَ

باپ کی توجہ صرف تمہاری طرف رہے گی، اس کے بعد تم اچھی حالت میں ہو جاؤ گے ○ ان میں سے

قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا۟ يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِي غَيَٰبَتِ ٱلْجُبِّ

ایک کہنے والے نے کہا یوسف کو قتل نہ کرو اور اس کو کسی اندھے کنویں کی گہرائی میں ڈال دو، اس

يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ ٱلسَّيَّارَةِ إِن كُنتُمْ فَٰعِلِينَ ﴿۱۰﴾ قَالُوا۟ يَٰٓأَبَانَا

اس کو کوئی قافلہ والا اٹھا لے گا، اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو (تو اس طرح کرو) ○ انہوں نے (یعقوب سے) کہا اے ہمارے ابا!

مَا لَكَ لَا تَأْمَ۫نَّا عَلَىٰ يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُۥ لَنَٰصِحُونَ ﴿۱۱﴾ أَرْسِلْهُ

کیا بات ہے آپ یوسف کے معاملہ میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کی خیر خواہی کرنے والے ہیں ○ اسے کل

مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَإِنَّا لَهُۥ لَحَٰفِظُونَ ﴿۱۲﴾ قَالَ إِنِّي لَيَحْزُنُنِيٓ

ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ وہ پھل کھائے اور کھیلے کودے اور بے شک ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں ○ (یعقوب نے) کہا

أَن تَذْهَبُوا۟ بِهِۦ وَأَخَافُ أَن يَأْكُلَهُ ٱلذِّئْبُ وَأَنتُمْ عَنْهُ

تمہارے اس کو لے جانے سے میں (اس کی جدائی میں) ضرور غمگین ہوں گا اور مجھے اندیشہ ہے کہ تم اس سے غافل ہو گے اور بھیڑیا اس کو

غَٰفِلُونَ ﴿۱۳﴾ قَالُوا۟ لَئِنْ أَكَلَهُ ٱلذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّآ إِذًا لَّخَٰسِرُونَ ﴿۱۴﴾

کھا جائے گا ○ انہوں نے کہا ہماری پوری جماعت کے ہوتے ہوئے اگر اس کو بھیڑیا کھا گیا تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والے ہوں گے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک یوسف اور ان کے بھائیوں کے قصہ میں پوچھنے والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں O
(یوسف: ۷)

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں نشانیاں

علامہ قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں کہ یہود نے مدینہ میں سے کچھ لوگوں کو مکہ بھیجا کہ وہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کریں کہ شام میں ایک نبی تھے، ان کا بیٹا مصر چلا گیا، وہ اس کے فراق میں روتے رہے حتیٰ کہ نابینا ہو گئے۔ اس وقت مکہ میں اہل کتاب میں سے کوئی شخص نہیں تھا اور نہ کوئی ایسا شخص تھا جو انبیاء علیہم السلام کی خبریں جانتا تھا، جب لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے پوری سورۂ یوسف نازل فرما دی، اس میں تورات میں مذکور واقعات کا بھی ذکر ہے اور اس سے زیادہ خبریں بھی ہیں اور سورۂ یوسف کا نزول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا معجزہ تھا۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۹، ص ۱۱۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

اہل مکہ میں سے اکثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار تھے اور وہ آپ کی نبوت کا انکار کرتے تھے، اور حسد کی وجہ سے آپ سے شدید عداوت کا اظہار کرتے تھے، تب اللہ تعالیٰ نے یہ قصہ بیان فرمایا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی ان سے حسد کی وجہ سے ان کو بہت زیادہ ایذاء پہنچاتے تھے، انجام کار اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی مدد کی اور ان کو قوت دی اور ان کے بھائیوں کو ان کا محتاج کر دیا اور جب کوئی عقل والا اس قسم کا واقعہ سنے گا تو وہ حسد کرنے سے باز آ جائے گا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب کی تعبیر بتائی تو اس تعبیر کو پورا ہونے میں اسی سال لگے، اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد اور دشمنوں کے خلاف ان کی کامیابی کا وعدہ کیا اور اس وعدہ کے پورا ہونے میں کافی تاخیر ہوگئی تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ معاذ اللہ جھوٹے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اسی طرح تھی سو اس اعتبار سے اس قصہ کا نازل کرنا آپ کے حالات کے موافق ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو نقصان پہنچانے کی پوری کوشش کی لیکن جب اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کی مدد اور ان کی کامیابی کا وعدہ فرمایا تھا تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو مقدر فرمایا تھا وہ اسی طرح پورا ہوا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے دشمنوں کی کاوشیں کارگر نہ ہوئیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے نام ہم اس سورت کے تعارف میں ذکر کر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جب یوسف کے بھائیوں نے مشورہ کیا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کے نزدیک ہم سے زیادہ محبوب ہیں، حالانکہ ہم پوری جماعت ہیں، بے شک ہمارے باپ کی رائے درست نہیں ہے O (یوسف: ۸)

حضرت یوسف کے بھائیوں کی حضرت یوسف سے نفرت کا سبب

اس آیت سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ کیا سبب تھا جس کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف کو ایذاء پہنچانے کا قصد کیا اور اس کا سبب یہ تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف اور بنیامین کو محبت میں باقی دس بیٹوں پر فوقیت دیتے تھے، اور ان کو اس سے تکلیف ہوتی تھی، ایک تو اس لیے کہ وہ عمر میں ان دونوں سے بڑے تھے، دوسرے اس وجہ سے کہ وہ ان دونوں کی بہ نسبت باپ کو زیادہ آرام اور فائدہ پہنچاتے تھے اور تیسرے اس وجہ سے کہ مصائب اور آفات کو وہی دور کرتے تھے اور منافع اور فوائد کو وہی حاصل کرتے تھے، ان وجوہ کے اعتبار سے چاہیے یہ تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ان دس بیٹوں کو حضرت یوسف اور بنیامین پر ترجیح دیتے لیکن جب اس کے برعکس حضرت یعقوب

علیہ السلام ان دونوں کو فضیلت دیتے تھے تو انہوں نے کہا ہمارا باپ ضلال مبین میں ہے' ان کی مراد یہ نہ تھی کہ ان کا باپ دین میں گمراہ ہے اور خطاء پر ہے کیونکہ اگر وہ یہ ارادہ کرتے تو وہ کافر ہو جاتے بلکہ ان کی مراد یہ تھی کہ دو کو دس پر ترجیح دینے میں اور چھوٹوں کو بڑوں پر ترجیح دینے میں اور غیر مفید کو مفید پر ترجیح دینے میں ہمارے باپ کی رائے درست نہیں ہے۔

حضرت یعقوب کو حضرت یوسف سے زیادہ محبت کیوں تھی؟

اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ بات بدیہی ہے کہ بعض اولاد کو بعض پر ترجیح دینا کینہ اور حسد کو پیدا کرتا ہے اور جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس کا علم تھا تو انہوں نے حضرت یوسف اور بنیامین کو باقی دس بیٹوں پر کیوں ترجیح دی' جبکہ جو عمر' علم اور نفع رسانی میں بڑے اور زیادہ ہوں وہ اس بات کے زیادہ لائق ہیں کہ ان کو فضیلت دی جائے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کے برعکس معاملہ کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان دونوں کو باقی بیٹوں پر صرف محبت میں ترجیح دی تھی' اور محبت غیر اختیاری چیز ہے لہٰذا اس معاملہ میں وہ معذور تھے اور وہ ملامت کے مستحق نہیں ہیں' علاوہ ازیں حضرت یوسف اور بنیامین کی ماں بچپن میں فوت ہو چکی تھیں اس وجہ سے وہ زیادہ شفقت اور عنایت کے مستحق تھے نیز حضرت یعقوب کو ان دونوں میں رشد و ہدایت اور سعادت اور شرافت کے وہ آثار نظر آتے تھے جو باقی اولاد میں نہیں تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام ہرچند کہ کمسن تھے اس کے باوجود وہ اپنے والد کی بہت زیادہ خدمت کرتے تھے' اور یہ مسئلہ اجتہادی ہے اور اس کی وجہ سے کسی کو دوسرے پر اعتراض کا حق نہیں پہنچتا۔

حضرت یوسف کے بھائیوں کا حسد ہی ان کے تمام گناہوں کی جڑ تھا

حضرت یوسف کے بھائیوں نے کہا یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کے نزدیک ہم سے زیادہ محبوب ہیں اور یہ محض حسد ہے اور حسد تمام برائیوں کی جڑ ہے' اس حسد کی وجہ سے انہوں نے جھوٹ بولا' اور اپنے بے قصور اور نیک بھائی کو ضائع کیا' اسے کنوئیں میں ڈالا' پھر اس کو غلامی میں مبتلا کیا' اور اس کو اس کے والد سے دور کیا' اور اپنے باپ کو دائمی غم میں مبتلا کیا اور بہت سے گناہ کیے اور یہ تمام کام عصمت اور نبوت کے منافی ہیں اور جمہور کے نزدیک نبی اعلانِ نبوت سے پہلے اور اعلان نبوت کے بعد ہر قسم کے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے معصوم ہوتا ہے اس لیے ان کے نبی ہونے کا قول کرنا صحیح نہیں ہے۔

حسد' رشک اور منافست کی تعریفیں

دل کی بیماریوں میں سے ایک بیماری حسد ہے جیسا کہ بعض علماء نے حسد کی تعریف میں کہا ہے: اغنیاء کو اچھے حال میں دیکھنے سے دل کو جو اذیت اور تکلیف پہنچتی ہے وہ حسد ہے اور بعض علماء نے کہا: کسی شخص کے پاس نعمت دیکھ کر یہ تمنا کرنا کہ اس کو بھی یہ نعمت مل جائے اس کو رشک کہتے ہیں اور کسی کے پاس نعمت دیکھ کر یہ تمنا کرنا کہ اس سے یہ نعمت زائل ہو جائے خواہ اس کو یہ نعمت نہ ملے اس کو حسد کہتے ہیں۔ اور تحقیق یہ ہے کہ کسی شخص کو اچھے حال میں دیکھ کر اس سے بغض رکھنا حسد ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) کسی شخص پر نعمت کو مطلقاً ناپسند کرنا اور یہ حسد مذموم ہے اور جب حاسد اس شخص سے بغض رکھے گا تو صاحب نعمت کو دیکھ کر اس کو اذیت پہنچتی رہے گی اور اس سے اس کے دل میں مرض ہوگا' اور اس کے پاس سے اس نعمت کے زوال سے اس کو لذت حاصل ہوگی خواہ اسے وہ نعمت حاصل نہ ہو۔

(۲) حاسد کسی شخص کے پاس نعمت دیکھ کر اس شخص کی اپنے اوپر فضیلت کو ناپسند کرے اور وہ یہ چاہے کہ یا تو وہ اس شخص جیسا ہو جائے یا اس سے بڑھ کر ہو جائے حسد کی اس قسم کا نام علماء نے رشک رکھا ہے' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس

کو بھی حسد فرمایا ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حسد کرنا صرف دو صورتوں میں جائز ہے: ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن (کا علم) عطا کیا ہو اور وہ دن اور رات کے اوقات میں قرآن کے ساتھ قیام کرے اور ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو اور وہ دن اور رات کے اوقات میں اس مال کو حق کے راستوں میں خرچ کرے، یہ الفاظ حضرت ابن عمر کی روایت میں ہیں اور حضرت ابن مسعود کی روایت میں ہے: ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے حکمت عطا کی ہو اور وہ اس کے مطابق فیصلے کرے اور اس کی تعلیم دے اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور اس کو حق کے راستہ میں خرچ کرنے پر مسلط کر دیا ہو۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث:۷۳، صحیح مسلم رقم الحدیث:۸۱۶) حسد کی اس دوسری قسم کو منافست (رغبت) بھی کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ایک اچھی چیز کے حصول میں دو شخص رغبت کریں اور اس کے حصول میں ہر ایک دوسرے پر سبقت کرنا چاہتا ہو اور اپنے اوپر دوسرے کی سبقت کو ناپسند کرتا ہو، منافست اچھی چیزوں میں لائق تعریف ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍۙ○ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَۙ○ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ○ یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍۙ○ خِتٰمُهٗ مِسْكٌؕ وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ○ (المطففین: ۲۶-۲۲)

بے شک نیک لوگ ضرور راحت میں ہوں گے○ تختوں پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے○ آپ ان کے چہروں سے نعمتوں کی تروتازگی پہچان لیں گے○ ان کو مہر شدہ صاف شراب پلائی جائے گی○ اس کی مہر مشک ہوگی، اور رغبت کرنے والوں کو اسی میں رغبت کرنی چاہیے۔

حسد عموماً اس نعمت پر کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے کسی کے متبعین زیادہ ہوں ورنہ اگر کوئی شخص زیادہ کھاتا پیتا ہو یا اس کی بیویاں زیادہ ہوں تو اس پر کوئی حسد نہیں کرتا، اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علم اور مال کا ذکر فرمایا کیونکہ جو شخص بڑا عالم ہوتا ہے اس کے پیروکار بھی بہت ہوتے ہیں اور جو شخص بڑا مال دار ہوتا ہے اس کے بھی بہت محبین اور مصاحبین ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنی ضرورتوں میں اس کے محتاج ہوتے ہیں، اسی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معراج کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر منافست اور رشک ہوا حتیٰ کہ جب ان کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم گزرے تو وہ رونے لگے، ان سے پوچھا گیا آپ کیوں رو رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ میرے بعد ایک نوجوان کو رسول بنایا گیا اور اس کی امت کے پیروکار میری امت کے پیروکاروں سے زیادہ جنت میں داخل ہوں گے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث:۳۸۸۷، صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۶۴)

حسد نہ کرنے کی فضیلت

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے فرمایا: ابھی تمہارے پاس اس راستے سے ایک شخص آئے گا وہ اہل جنت میں سے ہے۔ پھر انصار میں سے ایک شخص آیا، وضو کی وجہ سے اس کی ڈاڑھی سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے، اس نے اپنے بائیں ہاتھ میں اپنی جوتیاں اٹھائی ہوئی تھیں، اس نے آکر سلام کیا۔ دوسرے دن پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح فرمایا، پھر وہی شخص اسی کیفیت سے آیا۔ تیسرے دن پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح فرمایا اور پھر وہی شخص اسی طرح آیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ گئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اس شخص کے پیچھے گئے، انہوں نے اس سے کہا میرا اپنے والد سے جھگڑا ہو گیا ہے اور میں نے قسم کھائی ہے کہ میں تین دن تک ان کے پاس نہیں رہوں گا، اگر تم اجازت دو تو میں تین دن تمہارے ساتھ گزاروں۔ اس شخص نے کہا ٹھیک ہے۔ حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ تین راتیں اس کے پاس رہے، انہوں نے اسے تہجد پڑھتے ہوئے نہیں

دیکھا البتہ جب وہ نیند سے بیدار ہوتا تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا' اور اللہ اکبر کہہ کر صبح کی نماز پڑھنے کے لیے چلا جاتا۔ حضرت عبداللہ نے کہا البتہ میں نے اس کے منہ سے سوا نیکی کے اور کوئی بات نہیں سنی' جب ہم تین دن گزار کر فارغ ہو گئے اور اس وقت میں اس کے اعمال کو بہت کم سمجھ رہا تھا' میں نے کہا اے اللہ کے بندے! میرے اور میرے والد کے درمیان کوئی جھگڑا ہوا تھا اور نہ میں نے ان کو چھوڑا تھا' لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین مرتبہ یہ سنا کہ تمہارے پاس اہل جنت میں سے ایک شخص آئے گا' پھر تین مرتبہ تم آئے تو میں نے ارادہ کیا کہ میں تمہارے پاس ٹھہروں تاکہ میں تمہارے اعمال کو دیکھوں اور ان اعمال کی پیروی کروں' لیکن میں نے تم کو کوئی بہت عمل کرتے ہوئے نہیں دیکھا' تو وہ کون سا عمل ہے جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے متعلق بشارت دی۔ اس شخص نے کہا بس وہی عمل ہے جو تم نے دیکھا البتہ میں اپنے دل میں کسی مسلمان کے خلاف کینہ نہیں رکھتا' اور نہ کسی مسلمان کے پاس اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت دیکھ کر اس پر حسد کرتا ہوں۔ حضرت عبداللہ نے کہا تم میں یہی خوبی ہے جس سے تم کو یہ بشارت ملی اور اسی کی ہم طاقت نہیں رکھتے (یعنی وہ شخص حسد کی تمام اقسام سے سلامت اور محفوظ تھا)

(مسند احمد ج ۳ ص ۱۶۶' طبع قدیم' مسند احمد رقم الحدیث: ۱۲۶۷۶ طبع عالم الکتب' مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۲۰۵۵۹' مسند عبد بن حمید رقم الحدیث: ۱۱۶۰' عمل الیوم واللیلۃ للنسائی رقم الحدیث: ۸۶۳)

حسد مذموم

اور جو حسد مذموم ہے اس کا اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے حق میں ذکر فرمایا ہے:

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ (البقرہ: ۱۰۹)

بہت سے اہل کتاب نے اپنے دلی حسد کی وجہ سے یہ چاہا کہ کاش وہ تمہیں تمہارے ایمان کے بعد کفر کی طرف لوٹا دیں اور یہ خواہش انہوں نے اس وقت کی جب ان پر حق واضح ہو چکا تھا۔

غیر اختیاری صبر کی بہ نسبت اختیاری صبر کی فضیلت

یعنی جب انہوں نے یہ دیکھا کہ تم کو ایمان کی نعمت حاصل ہو چکی ہے اور ان کو وہ نعمت حاصل نہیں ہوئی تو انہوں نے یہ چاہا کہ تم سے وہ نعمت زائل ہو جائے خواہ ان کو ایمان کی وہ نعمت حاصل نہ ہو بلکہ وہ اس نعمت کو حاصل کرنا بھی نہیں چاہتے تھے' وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ تم سے وہ نعمت زائل ہو جائے اور اس حسد کی وجہ سے لبید بن اعصم یہودی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں کے حسد کی وجہ سے اپنے بھائیوں کے مظالم کا شکار ہوئے' انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل کرنے کا مشورہ کیا' اور آپ کو اندھے کنوئیں میں ڈالا' اور جو قافلہ کافروں کے ملک میں جا رہا تھا اس کے ہاتھ آپ کو غلام بنا کر بیچ ڈالا' پھر ان کے ظلم کے بعد حضرت یوسف اس مصیبت میں مبتلا ہوئے کہ عزیز مصر کی حسین بیوی نے آپ کو بدکاری کی دعوت دی' اور اس کا کہنا نہ ماننے کی صورت میں آپ کو قید کرنے کی دھمکی دی' آپ نے بدکاری کے اوپر قید کو ترجیح دی اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے مقابلہ میں دنیا کی تکلیف اور مشقت برداشت کرنے کو اختیار کر لیا' بھائیوں کی طرف سے آپ پر جو مصائب آئے وہ غیر اختیاری تھے اور قید کی یہ مصیبت آپ کی اختیار کردہ تھی' یہ آپ کا اختیاری صبر تھا اور یہی صبر تقویٰ کو متضمن تھا' اور بھائیوں کے مظالم پر جو صبر تھا وہ غیر اختیاری تھا اور دوسرا صبر افضل تھا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے

فرمایا:

اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَیَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ - (یوسف: ۹۰)

بے شک جو اللہ سے ڈرے اور صبر کرے تو یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

اور اس آیت کے حکم میں وہ مسلمان ہیں جن کو ان کے ایمان کی وجہ سے ایذاء پہنچائی جائے جیسے اس دور میں بھارت، مقبوضہ کشمیر، چیچنیا، کوسوو اور بوسنیا کے مسلمانوں کو ان کے اسلام اور ایمان کی وجہ سے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے یا کسی شخص سے فسق اور معصیت کو طلب کیا جائے اور ان کی موافقت نہ کرنے کی صورت میں اس کو قید کرنے اور سزا دینے کی دھمکی دی جائے جیسے الجزائر اور مصر میں اسلامی نظام کا مطالبہ کرنے والوں کو قتل کیا جا رہا ہے اور ایذائیں پہنچائی جا رہی ہیں اور ترکی میں اسلامی اقدار اپنانے والوں پر اور سعودی عرب میں میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم منانے والوں پر قید و بند کی سختیاں کی جا رہی ہیں۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر حضرت یوسف کے صبر سے بہت عظیم ہے

سب سے زیادہ ایذائیں ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچائی گئیں اور آپ نے ان پر اپنے اختیار سے صبر کیا اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے مقابلہ میں بہت عظیم صبر کیا، کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام سے بدکاری کو طلب کیا گیا اور جب انہوں نے اس کی موافقت نہیں کی تو ان کو قید کیا گیا، اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب سے کفر کو طلب کیا گیا اور جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو بعض اصحاب کو قتل کیا گیا اور بعض پر اور سختیاں کی گئیں، اور مشرکین نے آپ کو اور بنو ہاشم کو ایک مدت تک شعب ابی طالب میں مقید رکھا اور کھانے پینے کی چیزیں آپ تک پہنچنے نہیں دی گئیں، اور ابو طالب کے انتقال کے بعد انہوں نے آپ پر زیادہ شدت کی، اور جب انصار نے آپ سے بیعت کر لی تو وہ آپ کے اصحاب کو مکہ سے نکلنے نہیں دیتے تھے اور آپ کے اصحاب صرف چھپ کر ہجرت کر سکتے تھے، اور صرف طائف کے ایک دن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ دین کی بناء پر جو اذیتیں پہنچائی گئیں وہ تمام نبیوں کو پہنچائی گئی تکلیفوں کے مجموعے سے زیادہ تھیں لہٰذا آپ کا اختیاری صبر تمام رسولوں اور نبیوں کے اختیاری صبر سے زیادہ ہے۔

مسلمانوں کو دین کی راہ میں جو اذیتیں پہنچیں اور جو مصائب آئے وہ صرف اس وجہ سے تھے کہ انہوں نے اپنے اختیار سے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی تھی اور یہ آسمانی مصائب نہ تھے جن میں انسان کا اختیار نہیں ہوتا جیسے حضرت یوسف علیہ السلام پر ان کے بھائیوں کی وجہ سے مصائب نازل ہوئے۔

حسد ایک نفسانی بیماری ہے

خلاصہ یہ ہے کہ حسد نفسانی امراض میں سے ایک مرض ہے اور یہ غالب مرض ہے جس سے کم لوگ ہی محفوظ رہتے ہیں۔ لوگ مال اور اقتدار میں کسی کی فضیلت کی بناء پر حسد کرتے ہیں اور اگر دو برابر کے درجہ کے لوگوں میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہو جائے تو اس سے حسد کرتے ہیں۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف سے حسد کیا اور جیسے حضرت آدم کے دو بیٹوں میں سے ایک نے دوسرے سے حسد کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہابیل کی قربانی قبول کر لی تھی اور قابیل کی قربانی قبول نہیں کی تھی، اور جیسے یہود نے مسلمانوں سے حسد کیا اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ دنیا میں پہلی لغزش اور پہلا گناہ تین چیزوں سے ہوا: حرص، تکبر اور حسد۔ حضرت آدم نے حرص کی وجہ سے لغزش کی اور اجتہادی خطاء سے شجر ممنوع کو کھا لیا اور شیطان تکبر کر کے حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے منکر ہوا، اور قابیل نے حسد کی وجہ سے ہابیل کو قتل کر دیا۔

حسد کے متعلق احادیث

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزوں میں سے کوئی شخص نہیں بچ سکے گا: حسد' بدگمانی اور بدفالی- اور میں تم سے عنقریب بیان کروں گا کہ ان سے نکلنے کی کیا صورت ہے' جب تم کسی سے حسد کرو تو اس سے بغض نہ رکھو' اور جب تم بدگمانی کرو تو اس کے پیچھے نہ پڑو' اور جب تم بدشگونی نکالو تو اپنے کام پر روانہ ہو جاؤ- (کنز العمال رقم الحدیث:۴۳۷۸۹)

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سے پہلی امتوں کی (نفسانی) بیماریاں تم میں سرایت کر جائیں گی' حسد اور بغض اور یہ مونڈنے والی بیماری ہے- میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بالوں کو مونڈتی ہے لیکن یہ دین کو مونڈتی ہے' اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے' تم اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو گے جب تک کہ ایمان نہ لے آؤ' اور تم اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہو گے جب تک کہ تم ایک دوسرے سے محبت نہ کرو' اور کیا میں تم کو یہ خبر نہ دوں کہ کیا چیز محبت کو ثابت کر سکتی ہے' آپس میں ایک دوسرے کو سلام کیا کرو-

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۵۱۰' سنن ابوداؤد الطیالسی رقم الحدیث:۱۹۳' مسند احمد ج۱ ص۱۶۷' مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث:۶۶۹' شعب الایمان رقم الحدیث:۸۷۴۷)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک دوسرے سے بغض نہ کرو' ایک دوسرے سے حسد نہ کرو' ایک دوسرے سے دشمنی نہ کرو' اور اللہ کے بندے بھائی بھائی ہو جاؤ اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے رکھے-

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۶۰۶۵' صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۵۵۹' سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۴۹۱۰' مسند احمد رقم الحدیث:۷۸۳۵' موطا امام مالک رقم الحدیث:۵۶۶' مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:۲۰۲۲۲' مسند حمیدی رقم الحدیث:۱۱۸۳' سنن الترمذی رقم الحدیث:۱۹۳۵' صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۵۶۶۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم حسد سے بچو' کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے-

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۴۹۰۳' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۴ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (بھائیوں نے کہا) یوسف کو قتل کر دو یا اس کو کسی ملک میں چھوڑ آؤ پھر تمہارے باپ کی توجہ صرف تمہاری طرف رہے گی' اس کے بعد تم اچھی حالت میں ہو جاؤ گے○ (یوسف: ۹)

حضرت یوسف کے بھائیوں کا انہیں قتل کرنے یا شہر بدر کرنے کا منصوبہ بنانا

جب حضرت یوسف کے بھائیوں کا حسد انتہا کو پہنچ گیا تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ یوسف کو اس کے باپ سے الگ کرنا ضروری ہے' اور اس کی دو صورتیں ہیں یا تو اس کو قتل کر دیا جائے یا اس کو دور دراز کسی ملک میں چھوڑ دیا جائے حتیٰ کہ اس کا باپ اس سے ملاقات سے مایوس ہو جائے- انہوں نے جو یہ مشورہ کیا تھا کسی حاسد کا شر اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا' پھر انہوں نے اس شر کی یہ توجیہ کی کہ یوسف کی وجہ سے ہمارے باپ کی توجہ ہماری طرف نہیں ہوتی اور جب یوسف ان کے پاس نہیں رہے گا تو پھر وہ ہماری طرف توجہ' التفات اور محبت سے پیش آئیں گے' انہوں نے کہا اس کے بعد تم لوگ صالحین ہو جاؤ گے' ان کے اس قول کے تین محمل ہیں: (۱) ان کو علم تھا کہ جو کچھ وہ کرنے جا رہے ہیں وہ تمام کام گناہ کبیرہ ہیں' انہوں نے

کہاہم یہ کام کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے توبہ کرلیں گے پھر ہم لوگ صالح ہو جائیں گے۔ (۲) ان کی مراد دین کی صلاح نہیں تھی بلکہ ان کی مراد دنیا کی صلاح تھی، یعنی اس منصوبہ پر عمل کرنے کے بعد ان کی اچھی حالت ہو جائے گی اور ان کا باپ ان سے محبت کرنے لگے گا اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنے لگے گا۔ (۳) ان کا مطلب یہ تھا کہ یوسف کے یہاں ہونے کی وجہ سے ہم ہروقت غم اور غصہ میں مبتلا رہتے ہیں اور ہروقت یہی سوچتے رہتے ہیں کہ اس سے نجات کی کیا تدبیر ہوگی اور اس تشویش میں رہنے کی وجہ سے ہم اپنی اصلاح اور اپنی خوش حالی کے منصوبوں پر عمل نہیں کرپاتے اور جب یہ کانٹا نکل جائے گا تو ہم اطمینان سے اپنی مہمات میں مشغول ہو سکیں گے، پھر اس میں اختلاف ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل کرنے کا حکم کس نے دیا تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ حکم کسی اجنبی نے دیا تھا، وہ ان کے بھائیوں میں سے نہیں تھا اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ حکم ان کے بھائیوں میں سے ہی کسی نے دیا تھا۔ وہب بن منبہ نے کہا: یہ حکم دینے والا شمعون تھا اور مقاتل نے کہا: یہ حکم دینے والا روبیل تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جو منصوبہ بنا رہے تھے اس سے وہ اپنے باپ کو ایذاء پہنچا رہے تھے جو نبی معصوم تھے اور جھوٹ بولنے اور اپنے بے قصور چھوٹے بھائی کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے اور یہ تمام کام گناہ کبیرہ ہیں اور یہ اس کی واضح دلیل ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی نبی نہیں تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا یوسف کو قتل نہ کرو اور اس کو کسی اندھے کنوئیں کی گہرائی میں ڈال دو، اس کو کوئی قافلہ والا اٹھالے گا، اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو (تو اس طرح کرو) (یوسف: ۱۰)

مشکل الفاظ کے معانی

غیابۃ: اس کا معنی ہے گہرا گڑھا، یہاں مراد ہے کنوئیں کی گہرائی۔ یہ گہرائی نظر سے غائب ہوتی ہے اس لیے اس کو غیابۃ فرمایا۔

الجب: جب کا معنی ہے کاٹنا، اور اس سے مراد ہے بہت گہرا کنواں جس کو اندھا کنواں کہتے ہیں کیونکہ اس میں جھانک کر دیکھو تو کچھ نظر نہیں آتا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ کنواں بیت المقدس میں تھا، وہب بن منبہ نے کہا: یہ کنواں اردن میں تھا، مقاتل نے کہا: یہ کنواں حضرت یعقوب علیہ السلام کے گھر سے تین فرسخ دور تھا۔

السیارۃ: جو لوگ راستہ میں سفر کرتے ہیں، اس سے مراد ہے قافلہ، انہوں نے یہ اس لیے کہا تھا کہ حضرت یوسف کو اٹھا کر خود انہیں کسی دور دراز علاقہ میں نہ لے جانا پڑے، کیونکہ اگر وہ خود کہیں جاتے تو ہو سکتا ہے ان کو حضرت یعقوب اجازت نہ دیتے، اور اگر بغیر اجازت جاتے تو ہو سکتا ہے حضرت یعقوب علیہ السلام کو پتا چل جاتا۔

یلتقطہ: التقاط کا معنی ہے راستہ سے کسی چیز کو اٹھانا، جو بچہ راستہ میں پڑا ہوا مل جائے اس کو لقیط کہتے ہیں اور جو چیز راستہ میں گری پڑی مل جائے اس کو لُقطہ کہتے ہیں۔ لُقطہ اور لقیط کے متعلق احادیث اور شرعی احکام اور مذاہب فقہاء کی تفصیل ہم ان شاء اللہ عنقریب بیان کریں گے۔

لقیط کا لغوی اور اصطلاحی معنی

جو چیز زمین سے اٹھائی جائے اس کو لقیط کہتے ہیں اور اس کا غالب استعمال اس بچہ کے لیے ہوتا ہے جس کو پھینک دیا جائے۔ (الصحاح ج ۲ ص ۱۱۵۷، المصباح المنیر ج ۲ ص ۸۵۸، المغرب ج ۲ ص ۲۴۷)

علامہ علاء الدین محمد بن علی بن محمد الحصکفی الحنفی المتوفی ۱۰۸۸ھ لکھتے ہیں:

جس زندہ بچے کو اس کے گھر والے فقر و فاقہ کے خوف سے یا زنا کی تہمت سے بچنے کے لیے گھر سے باہر راستہ میں ڈال دیں اس کو لقیط کہتے ہیں، اس بچہ کو ضائع کرنے والا گناہ گار ہوگا، اگر کسی شخص کو یہ ظن غالب ہو کہ اگر اس بچہ کو نہ اٹھایا گیا تو یہ ہلاک ہو جائے گا تو پھر اس کا اٹھانا فرض کفایہ ہے، اگر اس کے علاوہ کسی اور کو اس بچہ کا علم نہ ہو تو پھر اس کا اٹھانا فرض عین ہے، اسی طرح اگر وہ دیکھے کہ کوئی نابینا کنوئیں میں گرنے والا ہے تو اس کا بچانا بھی فرض عین ہے۔

(در مختار مع رد المحتار ج ۶ ص ۳۲۶-۳۲۵، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۹ھ)

فقہاء شافعیہ کے نزدیک لقیط کی یہ تعریف ہے کہ جو بچہ عام راستہ پر پڑا ہوا ہو اور اس کا کوئی دعویدار نہ ہو، عام طور پر یہ بچہ ہوتا ہے لیکن کبھی سمجھ دار لڑکا بھی ہوتا ہے۔ (مغنی المحتاج، ج ۲ ص ۴۱۸، نہایۃ المحتاج، ج ۵ ص ۴۴۲) اور فقہاء حنبلیہ کے نزدیک لقیط کی یہ تعریف ہے کہ جس بچہ کا نسب معلوم نہ ہو، نہ اس کا غلام ہونا معلوم ہو یا وہ اپنی پیدائش سے لے کر سن شعور کے زمانہ تک اپنے گھر کا راستہ گم کر چکا ہو۔ (کشاف القناع ج ۴ ص ۲۲۶) فقہاء مالکیہ کے نزدیک لقیط وہ چھوٹا بچہ ہے جو نابالغ ہو خواہ سمجھ دار ہو، اور کافر، کافر کو اٹھائے مسلمان کو نہ اٹھائے کیونکہ کافر کی مسلمان پر ولایت نہیں ہے اور مسلمان کافر اور مسلمان دونوں کو اٹھا سکتا ہے۔ (بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۲۳۲)

لقیط کے شرعی احکام

ملک العلماء علامہ علاء الدین ابو بکر بن مسعود الکاسانی الحنفی المتوفی ۵۸۷ھ لکھتے ہیں:

غلام اور آزاد ہونے کے اعتبار سے لقیط کا حکم یہ ہے کہ وہ آزاد ہے، کیونکہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے لقیط کے متعلق یہ فیصلہ کیا کہ وہ آزاد ہے اور اس لیے بھی کہ اولاد آدم میں اصل یہ ہے کہ وہ آزاد ہیں کیونکہ غلامی تو ان کو کافروں کی حمایت میں لڑنے اور پھر جنگی قیدی ہونے کی وجہ سے عارضی ہوتی ہے، اس لیے اصل پر عمل کرنا واجب ہے اور اس پر وہ تمام احکام لاگو ہوں گے جو آزاد انسانوں پر لاگو ہوتے ہیں۔ اور اسلام اور کفر کے اعتبار سے لقیط کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ مسلمانوں کے شہروں یا ان کے مضافات میں ملا ہے تو وہ مسلمان قرار دیا جائے گا، حتیٰ کہ اگر وہ مر گیا تو اس کو غسل دیا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا اور اگر اس کو ذمی نے یہودیوں یا عیسائیوں کی کسی عبادت گاہ میں پڑا ہوا پایا یا وہ ذمیوں کی کسی بستی میں ملا جس میں کوئی مسلمان نہیں تھا تو اس کو ظاہر حال کے اعتبار سے ذمی قرار دیا جائے گا، اسی طرح اگر اس کو مسلمان نے کسی یہودیوں یا عیسائیوں کے معبد میں پایا یا اہل ذمہ کی بستی میں پایا تو اس کو ذمی قرار دیا جائے گا۔

اور اس کے نسب کے اعتبار سے حکم یہ ہے کہ وہ مجہول النسب ہے حتیٰ کہ اگر کسی انسان نے دعویٰ کیا کہ وہ اس کے نسب سے ہے تو اس کا دعویٰ صحیح قرار دیا جائے گا اور اس کا اس سے نسب ثابت ہو جائے گا۔

اس کو زمین سے اٹھانے کا حکم یہ ہے کہ اس کا اٹھانا مستحب ہے، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لقیط کے اٹھانے کو نیک کام قرار دیا، بلکہ اس کو بہت افضل نیکی قرار دیا، کیونکہ لقیط ایک نفس انسان ہے اور اس کا کوئی محافظ نہیں بلکہ وہ ضائع ہونے کے خطرہ میں ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس شخص نے ایک انسان کی زندگی بچائی گویا اس نے تمام انسانوں کی زندگی بچائی۔ (المائدہ: ۳۲)

لقیط کو رکھنے کے اعتبار سے حکم یہ ہے کہ جس شخص نے اس کو اٹھایا ہے وہ اس کو رکھنے کا زیادہ حق دار ہے اور کسی دوسرے کے لیے لقیط کو اس سے لینا جائز نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس شخص نے کسی مردہ

زمین کو آباد کیا وہ اس کی ہے۔
اور اس کے خرچ کے اعتبار سے حکم یہ ہے کہ اس کا خرچ بیت المال کے ذمہ ہے اور اگر لقیط کے ساتھ کچھ مال بندھا ہوا ملے تو وہ لقیط کا ہے جیسے اس کے جسم کے کپڑے اس کی ملکیت ہیں اور اگر وہ کسی سواری پر بندھا ہوا ملے تو سواری بھی اس کی ملکیت ہے اور پھر سواری کو بیچ کر اس کا خرچ پورا کیا جائے گا' کیونکہ بیت المال سے ضرورت کی بناء پر خرچ لیا جاتا ہے اور اب ضرورت نہیں ہے اور اس کی جان اور اس کے مال میں اس کا ولی سلطان ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جس کا کوئی ولی نہ ہو' اس کا ولی سلطان ہے۔
(بدائع الصنائع ج ۸ ص ۳۲۳-۳۱۸' ملخصاً' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۸ھ)

لُقطہ کا لغوی معنی

علامہ سید محمد مرتضیٰ زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں:
لُقطہ اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی شخص کو راستہ میں گری پڑی مل جائے اور معرف اس شخص کو کہتے ہیں جو گری پڑی چیز کو اٹھانے والا ہو اور اگر راستہ میں کوئی بچہ پڑا ہوا مل جائے تو اس کو لقیط کہتے ہیں۔
(تاج العروس ج ۵ ص ۲۱۷-۲۱۶' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۰۵ھ)

لُقطہ کے متعلق احادیث

حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے لُقطہ کے متعلق سوال کیا' آپ نے فرمایا: اس (تھیلی) کے باندھنے کی ڈوری اور اس تھیلی کو پہچان کر یاد رکھو' پھر ایک سال تک اس کا اعلان کرو' اگر اس کا مالک آ جائے تو فبہا ورنہ اس کو تم رکھ لو۔ اس شخص نے پوچھا: اور گم شدہ بکری کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ تمہاری یا تمہارے بھائی کی ہے یا بھیڑیے کی۔ اس نے پوچھا: اور گم شدہ اونٹ کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: تمہیں اس سے کیا مطلب؟ اس کے ساتھ اس کی مشک (پیٹ میں پانی) ہے اور اس کا جوتا بھی اس کے ساتھ ہے' وہ پانی کے گھاٹ پر جائے گا اور درختوں کے پتے کھائے گا حتیٰ کہ اس کا مالک آ کر اس کو پکڑ لے گا۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۴۲۹' صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۷۲۲' سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۷۰۴' سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۳۷۲' السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۵۸۱۴' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۵۰۴' موطا امام مالک رقم الحدیث: ۲۹۷۵' مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۱۸۶۰۲' مصنف ابن ابی شیبہ ج ۶ ص ۴۵۶' مسند الحمیدی رقم الحدیث: ۸۱۶' مسند احمد ج ۴ ص ۱۱۶' مسند ابو عوانہ ج ۴ ص ۳۹' صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۴۸۹۳' المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۵۲۵۱' سنن الدار قطنی ج ۴ ص ۲۳۵' سنن بیہقی ج ۶ ص ۱۸۵' شرح السنہ رقم الحدیث: ۲۲۰۷)

حضرت سوید بن غفلہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں اور حضرت زید بن صوحان اور حضرت سلمان بن ربیعہ جہاد کے لیے گئے۔ مجھے ایک چابک پڑا ہوا ملا' میں نے اس کو اٹھا لیا' ان دونوں نے مجھ سے کہا: اس کو چھوڑ دو' میں نے کہا نہیں' میں اس کا اعلان کروں گا' اگر اس کا مالک آ گیا تو فبہا ورنہ میں خود اس سے فائدہ اٹھاؤں گا' اور میں نے ان دونوں کی بات نہیں مانی۔ جب ہم جہاد سے واپس لوٹے تو میں خوش قسمتی سے حج کے لیے چلا گیا اور پھر میں مدینہ آیا تو میری ملاقات حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ہوئی۔ میں نے ان کو چابک اٹھانے اور ان دونوں کے منع کرنے کا قصہ سنایا' انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مجھے ایک تھیلی ملی تھی جس میں سو دینار تھے' میں اس کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا: اس کا ایک سال تک اعلان کرو' انہوں نے کہا پھر میں نے اس کا اعلان کیا' لیکن اس کی شناخت کے لیے کوئی نہیں آیا۔ میں دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ نے فرمایا: اس کا ایک سال تک (مزید) اعلان کرو' انہوں نے کہا میں نے پھر اس کا اعلان کیا اور کوئی اس کی شناخت کے لیے نہیں آیا' میں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ نے فرمایا: اس کا ایک سال تک (اور) اعلان کرو' انہوں نے کہا میں نے اس کا اعلان کیا اور کوئی اس کی شناخت کے لیے نہیں آیا پھر آپ نے فرمایا ان کے عدد' ان کی تھیلی' اور اس کی ڈوری کی پہچان کو یاد رکھو' اگر اس کا کوئی مالک آ جائے تو فبہا ورنہ تم اس سے فائدہ اٹھالینا' پھر میں نے ان سے فائدہ اٹھایا۔ سوید بن غفلہ کہتے ہیں اس کے بعد میری حضرت ابی بن کعب سے مکہ میں ملاقات ہوئی' انہوں نے کہا مجھے یاد نہیں تین سال تھے یا ایک سال۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۲۴۲۶' صحیح مسلم رقم الحدیث:۱۷۲۳' سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۱۷۰۱' سنن الترمذی رقم الحدیث:۱۳۷۴' السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۵۸۲۲' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۲۵۰۶' مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:۱۸۶۱۵' مصنف ابن ابی شیبہ ج ۶ ص ۴۵۴' مسند احمد ج ۵ ص ۱۲۶' مسند عبد بن حمید رقم الحدیث:۱۶۲' المنتقٰی رقم الحدیث:۶۶۸' صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۴۸۹۲' المعجم الاوسط رقم الحدیث:۴۸۹۴' السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۶ ص ۱۹۷' ۱۹۲)

لُقطہ کو اٹھانے کے حکم میں مذاہب فقہاء

علامہ موفق الدین ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں: امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ لقطہ کا نہ اٹھانا افضل ہے۔ حضرت ابن عباس' حضرت ابن عمر' حضرت جابر' ابن زید' ربیع بن خیثم اور عطاء کا بھی یہی نظریہ ہے۔ قاضی شریح نے ایک درہم گرا ہوا دیکھا اور اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ امام شافعی اور ابوالخطاب کا قول یہ ہے کہ اگر کوئی چیز ایسی جگہ پڑی ہے جہاں اس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو اور اس شخص کو اپنے اوپر یہ اطمینان حاصل ہو کہ وہ اس چیز میں خیانت نہیں کرے گا تو اس شخص کے لیے اس چیز کو اٹھانا افضل ہے۔ امام شافعی کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس شخص پر اٹھانا واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ۔ (توبہ: ۷۱) مسلمان مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے ولی ہیں۔

اور جب مسلمان ایک دوسرے کے ولی ہیں تو ان پر ایک دوسرے کی چیزوں کی حفاظت واجب ہے۔ سعید بن مسیب' حسن بن صالح اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی لقطہ کو اٹھانا واجب ہے۔ (امام ابوحنیفہ کے نزدیک لقطہ کو اٹھانا واجب نہیں' مستحب ہے... سعیدی غفرلہ) حضرت ابی بن کعب اور حضرت سوید بن غفلہ رضی اللہ عنہما نے لقطہ کو اٹھایا تھا۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اگر کوئی اہم اور قیمتی چیز ہو تو اس کو اٹھانا مستحب ہے اور وہ اٹھا کر اس کا اعلان کرے' کیونکہ اس میں مسلمان کے مال کی حفاظت ہے اور یہ اس کو ضائع کرنے سے بہتر ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں: ہماری دلیل حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور صحابہ میں سے کسی نے ان کے قول کی مخالفت نہیں کی' نیز لقطہ کو اٹھا کر اپنے آپ کو حرام کھانے اور اعلان نہ کر کے ترک واجب کے خطرہ میں ڈالنا ہے۔ اس لیے زیادہ محفوظ اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ لقطہ کو نہ اٹھایا جائے' جس طرح یتیم کے مال کا ولی نہ بننا بہتر ہے' اور یہ خیال کہ لقطہ نہ اٹھانے سے ایک مسلمان کے مال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے اس لیے سود مند نہیں ہے کہ بھولے بھٹکے اونٹ وغیرہ کو بھی لے جانا جائز نہیں ہے' حالانکہ مال ضائع ہونے کا خطرہ اس میں بھی ہے۔

(المغنی ج ۵ ص ۲۱۷-۲۱۶' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۰۵ھ)

لُقطہ کو اٹھانے کے حکم میں فقہاء احناف کا موقف

شمس الائمہ سرخسی حنفی لکھتے ہیں: لقطہ کو اٹھانے کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض فلفی علماء یہ کہتے ہیں کہ لقطہ کو اٹھانا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ بلا اجازت غیر کے مال کو اٹھانا ہے' اس لیے اس پر ہاتھ بڑھانا جائز نہیں ہے اور بعض متقدمین ائمہ تابعین نے یہ کہا ہے کہ ہر چند کہ لقطہ کو اٹھانا جائز ہے لیکن اس کو نہ اٹھانا افضل ہے' کیونکہ جس شخص کی چیز گری ہے وہ اس کو اسی جگہ ڈھونڈے گا جس جگہ وہ چیز گری تھی اور جب اس چیز کو اٹھایا نہیں جائے گا تو اس کا مالک اسی جگہ سے آ کر اپنی چیز اٹھا لے گا' دوسری وجہ یہ ہے کہ چیز اٹھانے کے بعد یہ خطرہ موجود ہے کہ اٹھانے والے کی نیت بدل جائے اس لیے لقطہ کو اٹھانا اپنے آپ کو فتنہ میں ڈالنے کے مترادف ہے اس لیے لقطہ کو نہ اٹھانا افضل ہے۔

شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں: ہمارے فقہاء رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ لقطہ کو اٹھانا اس کے نہ اٹھانے سے افضل ہے' کیونکہ اگر وہ اس کو نہیں اٹھائے گا تو اس کا خدشہ ہے کہ کوئی شخص اس کو اٹھا کر مالک سے چھپا لے گا اور جب وہ اس کو اٹھائے گا تو اس کا اعلان کر کے اس چیز کو اس کے مالک تک پہنچا دے گا' نیز وہ اس لقطہ کو اٹھا کر امانت کی طرح اس کی حفاظت کرے گا اور امانت کی ادائیگی کا التزام کرنا فرض ہے اور اس کو اس میں وہی ثواب ملے گا جو امانت کو ادا کرنے کا ملتا ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا۔ — بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں یہ حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچا دو۔ (النساء: ۵۸)

اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرنا ثواب کا موجب ہے۔ (المبسوط ج ۱۱ ص ۲' مطبوعہ دار المعرفہ بیروت' ۱۳۹۸ھ)

لُقطہ کی اقسام اور ان کے احکام

شمس الائمہ سرخسی حنفی لکھتے ہیں: لقطہ کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم وہ ہے جس کے بارے میں یہ علم ہوتا ہے کہ اس چیز کا مالک اس چیز کو طلب نہیں کرے گا' جیسے گٹھلیاں' انار کے چھلکے (ردی کاغذ' خالی ڈبے' خالی بوتلیں اور ردی کپڑے وغیرہ) دوسری قسم وہ ہے جس کے بارے میں علم ہوتا ہے کہ اس کا مالک اس کو طلب کرے گا۔ (جیسے قیمتی اشیاء)

قسم اول کا حکم یہ ہے کہ اس کا اٹھانا اور اس سے نفع حاصل کرنا جائز ہے۔ البتہ اگر اس چیز کے مالک نے اس چیز کو اٹھانے والے کے ہاتھ میں دیکھ لیا تو وہ اس سے لے سکتا ہے کیونکہ مالک کا اس چیز کو پھینک دینا اٹھانے والے کے لیے نفع حاصل کرنے کی اباحت کا سبب تھا اس کی طرف سے تملیک نہیں تھی' کیونکہ مجہول کو مالک بنانا صحیح نہیں ہوتا۔ اور اباحت کے بعد بھی مالک کی ملکیت اس چیز سے منقطع نہیں ہوتی' البتہ جس شخص کو مباح چیز ملی ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن مالک کی ملکیت اس چیز کے ساتھ قائم رہتی ہے اور وہ جب چاہے اس چیز کو لے سکتا ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے اپنے مال کو بعینہٖ پالیا وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔ امام ابو یوسف سے یہ روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک مردار بکری پھینک دی اور کسی شخص نے اس کا اون اتار لیا تو وہ اس سے نفع حاصل کر سکتا ہے اور اگر بکری کے مالک نے اس کے ہاتھ میں اون دیکھ لیا تو وہ اس کو لے سکتا ہے۔ اور اگر کسی شخص نے اس بکری کی کھال اتار کر اس کو رنگ لیا تو اب بھی اس کا مالک اس کھال کو لے سکتا ہے لیکن اس کو رنگنے کے پیسے دینے پڑیں گے۔

لُقطہ کی دوسری قسم جس کے بارے میں یہ علم ہو کہ اس کا مالک اس کو طلب کرے گا' اس کا حکم یہ ہے کہ جو شخص اس چیز کو اٹھائے اس پر اس کی حفاظت کرنا واجب ہے اور اس پر اس کا اعلان کرنا لازم ہے تاکہ وہ اس چیز کو اس کے مالک تک

پہنچا سکے۔ امام محمد نے ابراہیم سے روایت کیا کہ لقطہ کا ایک سال تک اعلان کرے، اگر اس کا مالک آ جائے تو فبہا ورنہ اس چیز کو صدقہ کر دے، صدقہ کے بعد اگر اس کا مالک آ گیا تو اس کو اختیار ہے، اگر وہ چاہے تو اس صدقہ کو برقرار رکھے اور اگر چاہے تو وہ لقطہ اٹھانے والے کو اس صدقہ کا ضامن کر دے۔ امام محمد نے ابراہیم نخعی کے اس قول کو بطور دلیل کے ذکر نہیں کیا، کیونکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تابعین کی تقلید نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے ھم رجال ونحن رجال "وہ بھی انسان ہیں اور ہم بھی انسان ہیں" لیکن اصل سبب یہ ہے کہ ابراہیم نخعی اپنے فتاوی میں حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے اقوال پر اعتماد کرتے تھے اور اہل کوفہ کی فقہ کا مدار انہی حضرات پر تھا، ابراہیم نخعی باقی فقہاء کی بہ نسبت حضرت علی اور حضرت ابن مسعود کے اقوال کو زیادہ جاننے والے تھے، یہی وجہ ہے کہ امام محمد کی کتاب ابراہیم نخعی کے اقوال سے بھری ہوئی ہے۔ بہرحال اس حدیث میں ہے کہ اٹھانے والا لقطہ کا اعلان کرے اور ہر چیز میں ایک سال کی مدت لازم نہیں ہے، چیز کا اٹھانے والا خود اندازہ کرے کہ اس کا مالک کتنی مدت تک اس چیز کو ڈھونڈتا رہے گا، اتنی مدت تک وہ اس چیز کا اعلان کرتا رہے اور اس کا اندازہ اس چیز کی قیمت اور حیثیت سے ہو گا حتیٰ کہ فقہاء کہتے ہیں کہ دس درہم بھی اہم اور قیمتی ہیں کیونکہ دس درہم کی چوری کے عوض چور کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے اور اگر لقطہ دس درہم سے کم ہو تو تین درہم تک ایک ماہ اعلان کرے اور اگر تین درہم سے کم ہو تو ایک درہم تک ایک ہفتہ اعلان کرے اور ایک درہم سے کم میں ایک دن اعلان کرے اور اگر ایک پیسہ کی چیز ہو تو دائیں بائیں مالک کو دیکھے اور پھر وہ چیز کسی فقیر کے ہاتھ پر رکھ دے۔ ان مدتوں میں سے کوئی مدت بھی لازم نہیں ہے کیونکہ رائے سے کسی مدت کو معین نہیں کیا جا سکتا، لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ اعلان اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ اس چیز کا مالک اس چیز کو طلب کرے گا اور ہمارے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ اس چیز کا مالک اس کو کب تک طلب کرتا رہے گا؟ اس لیے کسی چیز کے بارے میں ملتقط اپنی غالب رائے سے فیصلہ کرے، یعنی وہ یہ سوچے کہ اگر ایسی چیز گم ہو جائے تو اس کا مالک کتنی مدت تک اس چیز کو تلاش کرتا رہے گا اور جتنی مدت پر اس کا غلبہ ظن ہو اتنی مدت تک اعلان کرتا رہے۔

(المبسوط ج ۱۱ص ۲۰۳، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ۱۳۹۸ھ)

لُقطہ کا اعلان کرنے کے مقامات اور طریقہ کار

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں کہ لقطہ کا اعلان بازاروں میں، عام مساجد کے دروازوں اور جامع مسجدوں کے دروازوں پر ان اوقات میں کیا جائے جن اوقات میں لوگ بکثرت جمع ہوتے ہیں، اسی طرح جن مجالس میں لوگ جمع ہوتے ہیں وہاں بھی اعلان کیا جائے، کیونکہ مقصود اس چیز کا اظہار ہے کہ فلاں چیز گم ہو گئی ہے تاکہ اس کے مالک کو پتا چل جائے اس لیے لوگوں کے جمع ہونے کی مجالس کو تلاش کرنا چاہیے۔ یہ اعلان مساجد میں نہ کیا جائے کیونکہ مساجد اس لیے نہیں بنائی گئی ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے کسی آدمی کو مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنا اس کو چاہیے کہ یوں کہے کہ اللہ تمہاری اس چیز کو واپس نہ کرے، کیونکہ مساجد اس لیے نہیں بنائی گئیں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لقطہ اٹھانے والے شخص سے فرمایا: اس کا مسجد کے دروازہ پر اعلان کرو۔

لُقطہ اٹھانے والا خود بھی لقطہ کا اعلان کر سکتا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس کے لیے کسی اور شخص کو مقرر کر دے، اگر کوئی شخص از خود ملتقط کی طرف سے اعلان کرے تو فبہا ورنہ ملتقط خود اعلان کرے، کیونکہ اصل میں اعلان کرنا لُقطہ اٹھانے والے پر واجب ہے۔ اور اگر وہ اجرت دے کر کسی سے اعلان کرائے تو یہ بھی جائز ہے۔ اس میں امام احمد، امام شافعی، امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اعلان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ صرف لقطہ کی جنس کا ذکر کرے مثلاً یوں کہے کہ کسی شخص کا سونا گم ہو گیا ہے؟ یا چاندی یا درہم یا دینار علیٰ ہذا القیاس۔ اس چیز کی صفات اور علامات نہ بتلائے تاکہ کوئی غیر شخص اس کو حاصل کرنے کی جرأت نہ کرے۔
(المغنی ج ۶ ص ۵-۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۵ھ)

لُقطہ کے اعلان کی مدت میں مذاہب فقہاء

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں کہ لقطہ کے اعلان کی مدت ایک سال ہے۔ حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے یہی روایت ہے۔ ابن مسیب، شعبی، امام مالک، امام شافعی اور اصحاب رائے کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت عمر سے دوسری روایت ہے کہ تین ماہ تک اعلان کرے اور ایک اور روایت ہے کہ تین سال تک اعلان کرے، کیونکہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تین سال تک ایک سو دینار کے اعلان کرنے کا حکم دیا تھا۔

علامہ ابن قدامہ کہتے ہیں کہ ہماری دلیل یہ ہے کہ حدیث صحیح میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن خالد کو ایک سال تک اعلان کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور حضرت ابی بن کعب کی روایت کا جواب یہ ہے کہ راوی نے کہا مجھے پتا نہیں کہ تین سال کہا تھا یا ایک سال، امام ابوداؤد نے کہا کہ راوی کو اس میں شک ہے۔ (المغنی ج ۶ ص ۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۵ھ)

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی لکھتے ہیں: لقطہ کا بازاروں میں اور مساجد کے دروازوں وغیرہ پر ایک سال تک اعلان کرے، پہلے ہفتہ ہر دن صبح و شام اعلان کرے، پھر ہر دن میں ایک مرتبہ، پھر ہر ہفتہ میں، پھر ہر مہینہ میں اور صحیح یہ ہے کہ جو چیز حقیر ہو اس کا اعلان ایک سال نہ کیا جائے بلکہ اتنی مدت تک اعلان کیا جائے جتنی مدت میں یہ گمان ہو جائے کہ اب مالک نے اس سے اعراض کر لیا ہو گا۔ (مغنی المحتاج ج ۲ ص ۴۱۳-۴۱۲، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

قاضی ابوالولید مالکی لکھتے ہیں کہ جو چیز قیمتی ہو اس کا اعلان ایک سال تک کیا جائے بشرطیکہ وہ مال غنیمت سے نہ ہو۔
(بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۲۲۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

علامہ ابن ہمام حنفی لکھتے ہیں: امام ابوحنیفہ سے یہ روایت ہے کہ اگر لقطہ دو سو درہم (۶۱۲ء۳۶ گرام چاندی) یا اس سے زیادہ کی مالیت ہو تو ایک سال اعلان کیا جائے اور اگر دو سو درہم سے کم مالیت ہو تو دس درہم (۳۰ء۶۱۸ گرام چاندی) تک ایک ماہ اعلان کیا جائے اور اگر دس درہم سے کم مالیت کی چیز ہو تو جتنی مدت مناسب سمجھے اعلان کرے، اور ایک روایت یہ ہے کہ تین درہم (۹ء۱۸۵۴ گرام چاندی) سے لے کر دس درہم (۳۰ء۶۱۸ گرام چاندی) تک دس دن اعلان کرے اور ایک درہم (۳ء۰۶۱۸ گرام چاندی) سے لے کر تین درہم (۹ء۱۸۵۴ گرام چاندی) تک تین دن اعلان کرے، اور اگر ایک دانق یعنی درہم کا چھٹا حصہ (۰ء۵۱۰۳ گرام چاندی) یا اس سے زیادہ ہو تو ایک درہم تک ایک دن اعلان کرے اور اگر ایک دانق سے کم ہو تو دائیں بائیں دیکھ کر کسی فقیر کے ہاتھ پر رکھ دے۔ علامہ سرخسی نے کہا ہے کہ یہ نصاب لازم نہیں ہے بلکہ قلیل میں اپنی صوابدید کے مطابق اعلان کرے۔ علامہ سرخسی نے گویا امام اعظم کی پہلی روایت کو لیا ہے اور ظاہر الروایہ جس کو امام محمد نے کتاب الاصل میں ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ قلیل اور کثیر میں فرق کے بغیر ایک سال اعلان کرے اور یہی امام مالک، امام شافعی (اور امام احمد) کا قول ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کسی تفصیل اور فرق کے بیان فرمایا:

من التقط شیئا فلیعرف سنۃ۔ جس کو کوئی چیز ملی ہو وہ اس کا ایک سال اعلان کرے۔

اور حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابن عباس سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اور امام ابوحنیفہ سے جو پہلی روایت

ہے کہ دو سو درہم یا زیادہ سے لے کر دس درہم تک ایک سال اعلان کرے اور دس درہم سے کم میں جتنی مدت تک مناسب سمجھے اعلان کرے اس کی دلیل یہ ہے کہ جن روایات میں ایک سال اعلان کرنے کا ذکر ہے وہ اس لقطہ کے بارے میں ہیں جو ایک سو دینار تھا جو ایک ہزار درہم کے مساوی ہے اور دس درہم یا اس سے زیادہ کی مالیت کی وجہ یہ ہے کہ مہر کی کم از کم مقدار نصاب سرقہ یعنی دس درہم ہے، یعنی دس درہم شرعاً قیمتی مال ہے، کیونکہ اس کے عوض چور کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے اور فرج حلال ہو جاتی ہے اس لیے دس درہم کی مالیت کے حکم کو بھی ایک ہزار درہم کے حکم کے ساتھ لاحق کر دیا اور دس درہم سے کم کا چونکہ یہ مرتبہ نہیں ہے اس لیے اس کے اعلان کی مدت ایک سال نہیں رکھی بلکہ اس کو اعلان کرنے والے کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ (فتح القدیر ج ۵ ص ۳۵۱-۳۵۰، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)

آج کل کے دور میں لُقطہ کے اعلان کا طریقہ کار

ہر چند کہ ائمہ ثلاثہ اور امام ابو حنیفہ سے ظاہر الروایہ یہی ہے کہ دس درہم یا اس سے زیادہ کی مالیت کا ایک سال اعلان کرنا چاہیے لیکن چونکہ اس پر عمل کرنا دشوار ہے اس لیے امام ابو حنیفہ کی اس روایت پر عمل کرنا چاہیے جس کو علامہ ابن ہمام نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ ایک دانق سے ایک درہم تک ایک دن اور ایک درہم سے تین درہم تک تین دن اور تین درہم سے لے کر دس درہم تک دس دن اعلان کرے اور دس درہم سے دو سو درہم تک ایک ماہ اعلان کرے اور دو سو درہم یا اس سے زائد ہو تو ایک سال اعلان کرے، اور اس روایت کی دلیل یہ ہے کہ حدیث میں ایک ہزار درہم کی مالیت کے لقطہ کے بارے میں ایک سال اعلان کا حکم ہے اور دو سو درہم چونکہ نصاب زکوٰۃ ہے اس لیے دو سو درہم کی مالیت کو بھی اس کے ساتھ لاحق کیا ہے اور دو سو درہم سے کم مالیت کو اس کے ساتھ لاحق نہیں کیا اور اس کی اپنے اجتہاد سے مدت مقرر کی ہے نیز طبرانی میں کم چیز کے لیے تین دن اور چھ دن تک اعلان کا بھی ذکر ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۴ ص ۱۶۹)

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں وہاں اعلان کیا جائے اور آج کل لوگ بازاروں میں، مارکیٹوں میں اور تفریح گاہوں میں زیادہ جمع ہوتے ہیں، جب فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا تھا اس وقت بہت چھوٹے چھوٹے شہر تھے اور زندگی اس قدر مصروف نہیں تھی اور اب کراچی ایسے شہر میں جو کئی ہزار مربع کلومیٹر رقبہ پر محیط ہے اور تقریباً ایک کروڑ انسانوں کی آبادی پر مشتمل ہے، ایک آدمی کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ ایک سال یا ایک ماہ یا ایک ہفتہ تک روزانہ مارکیٹوں اور بازاروں میں جا کر کسی گم شدہ چیز کا اعلان کرتا پھرے۔

آج کل کے دور میں لُقطہ کے اعلان اور تشہیر کی آسان اور قابل عمل صورت یہ ہے کہ جس شخص کو کوئی چیز ملی ہو وہ اس کا اعلان اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی میں کرا دے اور یہ ابلاغ عام کا بہت موثر ذریعہ ہیں۔ مثلاً کسی شخص کو کسی راستہ میں کوئی قیمتی پین یا گھڑی پڑی ملی ہے تو وہ یہ اعلان کرا دے کہ مجھے فلاں دن فلاں جگہ اتنے وقت پر ایک پارکر، شیفر یا کروس کا پین پڑا ہوا ملا ہے، جس شخص کا وہ پین ہو وہ اس کی علامات اور نشانیاں بتا کر مجھ سے لے جائے۔ جب میں لاہور میں تھا تو ہمارے مدرسہ کے ایک طالب علم کو مسجد کے پاس ایک پارکر پین پڑا ہوا ملا، مجھے علم ہوا تو میں نے فوراً ایک طالب علم کے ذریعہ "جنگ" اخبار میں اس کا اعلان بھجوا دیا۔ دوسرے دن اس کا مالک آیا اور نشانیاں بتلا کر اپنا پین لے گیا۔ اگر ایک بار اعلان کے بعد لقطہ کا مالک نہ آئے تو سال میں کئی بار وقفہ وقفہ سے اعلان کرایا جا سکتا ہے یا یوں کرے کہ پہلے شہر میں شائع ہونے والے تمام اخبارات میں ایک ایک کر کے اعلان بھیجے مثلاً پہلے "جنگ" اخبار میں اعلان بھیجے، پھر "نوائے وقت" میں پھر "مشرق" میں، علیٰ ھذا القیاس۔ اگر اس کا نتیجہ نہ نکلے تو پھر ریڈیو کی نیوز سروس میں اعلان کرائے اور اس کا نتیجہ نہ نکلے تو پھر ٹی وی کی

سروس سے اعلان کرائے۔ اور یہ بہت بعید ہے کہ ان تمام ذرائع ابلاغ سے اعلان کے بعد بھی مالک لقطہ کو وصول کرنے کے لیے نہ آئے، اور اعلان کرنے والے کو چاہیے کہ ایک سال میں وقفہ وقفہ کے ساتھ ان تمام ذرائع سے اعلان کرائے تاکہ منشاء حدیث صوری اور معنوی دونوں طرح سے پورا ہو جائے اور اس کی حجت تمام ہو جائے اور ایک سال کے بعد بھی اگر مالک نہ آئے تو پھر وہ اس کو صدقہ کر دے۔

اعلان کی مدت پوری ہونے کے بعد لُقطہ کے مصرف میں فقہاء احناف کا نظریہ

شمس الائمہ علامہ سرخسی حنفی لکھتے ہیں: اعلان کے بعد مالک آ جائے تو ملتقط لقطہ کو اس کے حوالے کر دے کیونکہ اعلان سے جو مقصود تھا وہ حاصل ہو گیا، اور اگر مالک نہ آئے تو اس کو اختیار ہے خواہ لقطہ کو مالک کے انتظار میں محفوظ رکھے، خواہ اس کو صدقہ کر دے، کیونکہ اس کو محفوظ رکھنا عزیمت ہے اور ایک سال کے اعلان کے بعد اس کو صدقہ کر دینا رخصت ہے اور ملتقط کو رخصت اور عزیمت میں سے کسی ایک پر عمل کرنے میں اختیار ہے، صدقہ کرنے کے بعد اگر مالک آ گیا تو پھر مالک کو اختیار ہے اگر وہ چاہے تو صدقہ کو برقرار رکھے اور اس کا ثواب مالک کو ہو گا اور اگر چاہے تو صدقہ کے تاوان میں لقطہ کا بدل لے لے۔ اور یہ تاوان چاہے ملتقط سے وصول کرے اور چاہے تو اس مسکین سے وصول کرے جس کو صدقہ دیا گیا ہے۔ اور جو بھی ضامن ہو گا وہ دوسرے سے اس کا تاوان وصول نہیں کرے گا۔ (یہ حکم اس وقت ہے جب ملتقط غنی ہو) اور اگر ملتقط غریب ہو تو وہ ایک سال کے اعلان کے بعد اس کو خود خرچ کر سکتا ہے کیونکہ اس کو یہ اختیار تھا کہ وہ اس لقطہ کو کسی غریب پر صدقہ کر دے اور جب کہ وہ خود غریب ہے تو وہ لقطہ کو اپنے نفس پر بھی صدقہ کر سکتا ہے۔ لیکن اگر ملتقط غنی ہو تو ہمارے نزدیک وہ اس لقطہ کو اپنے نفس پر خرچ نہیں کر سکتا اور امام شافعی کہتے ہیں کہ امیر بھی مدت گزرنے کے بعد اس کو اپنے اوپر خرچ کر سکتا ہے لیکن یہ اس کے اوپر قرض ہے، اگر مالک آ گیا تو اس کو وہ چیز دینا ہو گی۔

(المبسوط ج ۱۱ ص ۷، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ۱۳۹۸ھ)

امام شافعی کے دلائل کے جوابات

امام شافعی کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابی بن کعب غنی تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا کہ اگر ایک سال اعلان کے بعد مالک نہ آئے تو لقطہ کو خرچ کر لینا اور ان کے غنی پر دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لقطہ کو اپنے مال کے ساتھ ملا لو، اس سے ثابت ہوا کہ وہ مالدار تھے۔ ہم اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے ان پر لوگوں کے اس قدر قرض ہوں کہ مالدار ہونے کے باوجود حکماً فقیر ہوں، اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ حکم دیا کہ وہ لقطہ کو اپنے مال کے ساتھ ملا لیں۔ امام طحاوی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ حضرت ابی بن کعب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد غنی ہوئے تھے اور اس سے پہلے وہ فقیر (غریب) تھے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ اپنی زمین صدقہ کرنے لگے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: یہ زمین اپنے غریب رشتہ داروں کو دو۔ سو انہوں نے وہ زمین حضرت حسان اور حضرت ابی بن کعب کو دے دی۔ علامہ ماردینی لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو امام بیہقی نے باب الوصیۃ للقرابۃ میں ذکر کیا ہے اور امام بخاری نے اس حدیث کو تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ (الجواہر النقی ج ۶ ص ۱۸۶) اس سے واضح ہو گیا کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ حکم دیا کہ وہ لقطہ کو اپنے مال کے ساتھ ملا لیں اس وقت وہ غریب تھے اور ان پر صدقہ جائز تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ لقطہ کسی حربی کافر کا مال ہو جس کی حفاظت کی مسلمانوں پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور چونکہ اس مال پر حضرت ابی کے ہاتھ نے سبقت کی تھی س لیے آپ نے ان کو اس

کا زیادہ حقدار قرار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کیونکہ آپ نے فرمایا:

رزق ساقہ اللہ الیک۔ یہ وہ رزق ہے جو اللہ نے تمہاری طرف بھیجا ہے۔

اور اس کے باوجود آپ نے ایک سال تک اس کے عدد اور تھیلی کے سربند کی پہچان کو یاد رکھنے کا احتیاطاً حکم دیا تاکہ اگر یہ مال محترم ہو تو وہ اس کو ادا کر سکیں۔

علامہ سرخسی لکھتے ہیں: اس مسئلہ میں ہماری دلیل یہ ہے کہ بکثرت احادیث اور آثار میں یہ وارد ہے کہ ایک سال اعلان کے بعد لقطہ کو صدقہ کر دیا جائے۔ (ہم عنقریب ان احادیث اور آثار کو بیان کریں گے...... سعیدی غفرلہ) نیز اصل مقصود یہ ہے کہ لقطہ کا ثواب اس کے مالک کو پہنچا دیا جائے۔ اگر غنی نے اس مال کو اپنے اوپر خرچ کر لیا تو یہ مقصود حاصل نہیں ہوگا بلکہ جب غنی اس مال کو اپنے اوپر خرچ کرے گا تو اس سے یہ ظاہر ہوگا کہ وہ اس لقطہ کو اپنے لیے اٹھانے والا تھا اور اپنے لیے لقطہ کو اٹھانا اس کے لیے شرعاً ناجائز ہے۔ پس جیسا کہ ابتداءً اس پر لازم تھا کہ وہ اس لقطہ میں اپنے تصرف کی نیت نہ کرے اس طرح انتہاءً بھی اس پر لازم ہے کہ اس میں اپنے تصرف کی نیت نہ کرے۔

اس مسئلہ میں امام شافعی نے اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے کہ حضرت علی کو ایک دینار پڑا ہوا ملا، انہوں نے اعلان کے بعد اس کا طعام خرید لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم سب نے اس طعام کو کھایا۔ اگر لقطہ کو صدقہ کرنا ضروری ہوتا تو ملتقط اس کو اپنے اوپر خرچ نہ کر سکتا تو یہ حضرات اس طعام کو نہ کھاتے کیونکہ ان پر صدقہ حلال نہیں تھا۔ اس روایت کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی کو جو دینار پڑا ہوا ملا تھا وہ لقطہ نہیں تھا۔ اس دینار کو ایک فرشتہ نے اس لیے گرایا تھا کہ حضرت علی اس کو اٹھالیں، کیونکہ ان حضرات کو کئی دنوں سے کھانا نہیں ملا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کو وحی سے جان لیا تھا، اسی وجہ سے ان سب نے اس کھانے کو کھا لیا تھا ورنہ صدقہ واجبہ تو ان پر حلال نہیں تھا، اسی وجہ سے حضرت علی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دینار سے طعام خریدنے کی اجازت لی تھی۔ (المبسوط ج ۱۱ ص ۸-۶، مطبوعہ دارالمعرفہ بیروت، ۱۳۹۸ھ)

لُقطہ کو صدقہ کرنے کے وجوب کے متعلق احادیث اور آثار

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لقطہ کے متعلق سوال کیا گیا، آپ نے فرمایا: اس کا اعلان کرو، اس کو غائب کرو نہ چھپاؤ، اگر اس کا مالک آ جائے تو اس کو دے دو ورنہ یہ اللہ کا مال ہے وہ جس کو چاہے عطا فرمائے۔ (مسند البزار رقم الحدیث: ۱۳۶۷، علامہ الہیثمی نے کہا اس حدیث کے تمام راوی صحیح ہیں، مجمع الزوائد ج ۴ ص ۱۶۷)

فقہاء احناف نے "اللہ کے مال" سے استدلال کیا ہے کیونکہ اصل اور قاعدہ یہ ہے کہ اللہ کا مال اس مال کو کہتے ہیں جو فقراء کو دیا جاتا ہے اور صدقہ کیا جاتا ہے اور اگر کسی جگہ مجازاً اس قاعدہ کے خلاف ہو جیسے واتوھم من مال اللہ الذی اتکم۔ (النور: ۳۳) تو یہ اس قاعدہ کے خلاف نہیں ہے اس لیے اسی قاعدہ پر علامہ ابن قدامہ کا اعتراض صحیح نہیں ہے۔

حضرت جارود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک سفر میں سواریوں کی قلت تھی۔ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سواریوں کا ذکر کیا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم کو سواریوں کی قلت کا سامنا ہے، آپ نے فرمایا: اس کا کیا حل ہو سکتا ہے؟ میں نے کہا: ہم جنگل میں پھرنے والے مویشیوں سے کچھ اونٹ لے لیں اور ان سے فائدہ اٹھائیں۔ آپ نے فرمایا: نہیں! مسلمان کی گم شدہ چیز جہنم کی آگ ہے، اس کے ہرگز قریب نہ ہو۔

(مصنف عبد الرزاق ج ۱۰ ص ۱۳۱، مجمع الزوائد ج ۴ ص ۱۶۷)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لقطہ کے متعلق فرمایا: اس کا ایک سال اعلان کرے اگر اس کا مالک آ جائے تو فبہا ورنہ اس کو صدقہ کر دے۔ (پھر اگر اس کا مالک آ جائے) تو اس کو اختیار ہے چاہے وہ ملتقط سے اس کا تاوان لے اور چاہے تو چھوڑ دے۔ امام محمد نے کہا: ہم اسی پر عمل کرتے ہیں اور یہی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔

(کتاب الآثار ص ۱۹۷، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، ۱۴۰۷ھ)

امام عبد الرزاق نے ایک طویل حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد روایت کیا ہے، حضرت علی نے فرمایا: اس کا اعلان کرو اگر اس کے مالک نے اس کو پہچان لیا تو اس کو دے دو، ورنہ اس کو صدقہ کر دو، پھر اگر اس کا مالک آیا اور اس نے صدقہ کے اجر کو پسند کیا تو اس کی مرضی ورنہ تم اس کو تاوان دو اور تم کو اجر ملے گا۔

(المصنف ج ۱۰ ص ۱۳۹-۱۳۸، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۹۰ھ)

حضرت سوید بن غفلہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے لقطہ کے متعلق فرمایا کہ اس کا ایک سال تک اعلان کرے، اگر اس کا مالک آ جائے تو فبہا ورنہ اس کو صدقہ کر دے، اور اگر صدقہ کرنے کے بعد اس کا مالک آ جائے تو اس کو اختیار دیا؟ اگر وہ اجر کو اختیار کرے تو اس کی مرضی اور اگر وہ مال کو اختیار کرے تو اس کی مرضی۔

(مصنف عبد الرزاق ج ۱۰ ص ۱۳۹، بیروت، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۶ ص ۴۵۲، مطبوعہ کراچی)

امام عبد الرزاق اور امام ابن ابی شیبہ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بھی یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر ایک سال تک اعلان کے بعد بھی مالک نہ آئے تو لقطہ کو صدقہ کر دیا جائے۔

(مصنف عبد الرزاق ج ۱۰ ص ۱۳۹، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۶ ص ۴۵۰-۴۴۹)

امام ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول روایت کیا ہے کہ اگر ایک سال تک اعلان کے باوجود مالک کا پتا نہ چلے تو لقطہ کو صدقہ کر دیا جائے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۶ ص ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱)

حضرت ابی کی حدیث کی وضاحت اور فقہاء احناف کے جوابات کی تفصیل اور تنقیح

ان تمام احادیث اور آثار سے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نظریہ کی تائید اور تقویت ہوتی ہے کہ اعلان کے بعد لقطہ کا صدقہ کرنا واجب ہے اور غنی کے لیے اسے اپنے نفس پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ نے حضرت ابی بن کعب کی جن روایات سے استدلال کیا ہے وہ موؤل ہیں اور تاویل یہ ہے کہ حضرت ابی اس وقت خود صدقہ کے مستحق تھے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں لقطہ کو خرچ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ علامہ بدر الدین عینی حنفی نے اس حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ اگر بالفرض حضرت ابی اس وقت امیر ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انہیں خرچ کی اجازت دینا اس پر محمول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وہ لقطہ بطور قرض دیا تھا۔ اور امام کا لقطہ کو بطور قرض دینا جائز ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہو یا حضرت ابی کی خصوصیت ہو، اور خصوصیت پر محمول کرنے کی دلیل یہ ہے کہ دوسری احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملتقط کے لیے لقطہ کے خرچ کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے اور حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبد اللہ ابن مسعود، حضرت عبد اللہ بن عمرو اور حضرت عبد اللہ ابن عباس ایسے فقہاء صحابہ نے لقطہ کے صدقہ کرنے کو واجب کہا ہے اور ظاہر یہی ہے کہ انہوں نے یہ اپنی رائے سے نہیں کہا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور آپ کی حدیث کی بناء پر کہا ہے۔

اسی طرح حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل سے فرمایا: ایک سال کے بعد اگر مالک نہ آئے تو تم اس کو خرچ کر لینا' اس حدیث سے ائمہ ثلاثہ کا مطلوب اس وقت ثابت ہو گا جب یہ ثابت ہو جائے کہ وہ سائل غنی تھا اور یہ ثابت نہیں ہے' اس لیے اس حدیث سے ان کا استدلال ثابت نہیں ہے۔ حضرت ابی بن کعب کی روایت سے استدلال کرتے ہوئے ائمہ ثلاثہ نے حضرت ابی کے غنا کو ثابت کرنے کے لیے اس سے استدلال کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا: "اس کو اپنے مال کے ساتھ ملا لو۔" اس کے جو جوابات ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ان کے علاوہ ایک جواب یہ ہے کہ مان لیا کہ حضرت ابی کے پاس مال تھا لیکن اس سے یہ کب لازم آیا کہ وہ مال بقدر نصاب تھا جس سے ان کا غنی ہونا ثابت ہو جائے' اس لیے حضرت ابی کی روایت سے بھی ان کا غنی ہونا ثابت نہیں ہوتا اور جب تک ان کا غنی ہونا ثابت نہ ہو ائمہ ثلاثہ کا مدلول ثابت نہیں ہو گا۔

ائمہ ثلاثہ نے حضرت ابی کو لقطہ کے خرچ کرنے کی اجازت سے جو استدلال کیا ہے اس کے جوابات کا خلاصہ یہ ہے کہ اولاً تو حضرت ابی کا غنا ثابت نہیں' کیونکہ ان کے پاس مال ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مال بقدر نصاب ہو' ثانیاً حضرت ابی زمانہ نبوی میں غریب اور صدقہ کے مستحق تھے' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو طلحہ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ حضرت ابی پر بھی زمین صدقہ کریں' جیسا کہ صحیح بخاری اور سنن بیہقی میں ہے' ثالثاً اگر بالفرض وہ مالدار اور غنی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ وہ اتنے مقروض ہوں کہ خود صدقہ کے مستحق ہوں' رابعاً ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وہ لقطہ بطور قرض دیا ہو' خامساً ہو سکتا ہے کہ وہ لقطہ کسی کافر حربی کا مال ہو اس لیے ان کو خرچ کی اجازت دی ہو' سادساً یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ان کی خصوصیت ہو یا بحیثیت امام آپ کی خصوصیت ہو' سابعاً دوسری احادیث اور آثار صحابہ میں غنی پر لقطہ کے خرچ کی ممانعت ہے اور حضرت ابی کی روایت میں اس کی اباحت ہے اور جب تحریم اور اباحت میں تعارض ہو تو تحریم کو ترجیح ہوتی ہے۔

اس حدیث کی اس طرز سے جو تشریح کی گئی ہے اور ائمہ ثلاثہ کی دلیل کے جو جوابات ذکر کیے گئے ہیں اس سے فقہ حنفی کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ فقہ حنفی کو زیادہ سے زیادہ فروغ عطا فرمائے۔ والحمد للہ رب العالمین۔

اونٹ پکڑنے کے متعلق سوال کرنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناراض ہونے کی وجہ

حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ جب سائل نے گم شدہ چیز کا حکم معلوم کر لیا تو پھر سوال کیا: اگر بھولا بھٹکا اونٹ مل جائے تو؟ اس سوال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غضب ناک ہوئے حتیٰ کہ آپ کے دونوں رخسار مبارک سرخ ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غصہ میں آنے کی علماء نے مختلف وجوہات بیان کی ہیں۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ چونکہ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے لینے سے منع فرما دیا تھا اور اب اس نے اونٹ کا سوال کیا اس لیے آپ ناراض ہوئے' یا اس لیے کہ سائل نے صحیح قیاس نہیں کیا اور جس لقطہ کا لینا معین ہے اس پر اس کو قیاس کیا جس کا لینا معین نہیں ہے۔

علامہ خطابی نے کہا ہے کہ آپ کو سائل کی کم فہمی پر غصہ آیا کیونکہ وہ لقطہ اٹھانے کی اصل وجہ کو نہیں سمجھا اور ایک چیز کو اس پر قیاس کیا جو اس کی نظیر نہیں تھی' کیونکہ لقطہ اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی شخص سے گر جائے اور یہ پتا نہ چلے

کہ اس کا مالک کہاں ہے۔ اور اونٹ اس طرح نہیں ہے کیونکہ وہ اسم اور صفت کے اعتبار سے لقطہ کا مغایر ہے۔ کیونکہ اس میں ایسی صلاحیت ہے کہ وہ از خود مالک تک پہنچ سکتا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بکثرت سوال کرنے کی وجہ سے ناراض ہوئے ہوں، کیونکہ سائل کسی حقیقی پیش آمدہ مسئلہ کا حل نہیں پوچھ رہا تھا بلکہ محض فرضی صورتوں کا سوال کر رہا تھا۔

ائمہ حجاز نے یہ کہا ہے کہ اونٹ، گائے اور گھوڑے میں افضل یہ ہے کہ ان کو چھوڑ دیا جائے حتیٰ کہ وہ اپنے مالک کے پاس پہنچ جائیں۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ اس زمانے میں ان جانوروں کو لے جانا افضل ہے کیونکہ اب ایسا زمانہ ہے کہ اگر کوئی نیک آدمی ان کو مالک کے پاس پہنچانے کے لیے لے کر نہیں گیا تو کوئی چور اُچکا ان کو لے کر چلا جائے گا۔ علامہ سرخسی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کو لے جانے کے لیے جو منع فرمایا تھا یہ حکم اس زمانے میں تھا جب عام طور پر لوگ نیک اور امانت دار تھے لیکن اس زمانہ میں یہ اطمینان نہیں ہے کہ وہ اونٹ محفوظ رہے گا اور کوئی خائن شخص اس کو لے کر چلا نہیں جائے گا اس لیے اب اونٹ کو لے جانے میں اس کی حفاظت ہے اور اس کے مالک کے حق کو محفوظ رکھنا ہے۔

اس مسئلہ کی مزید تفصیل اور تحقیق کے لیے شرح صحیح مسلم جلد خامس کا مطالعہ فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انہوں نے (یعقوب سے) کہا: اے ہمارے ابا! کیا بات ہے آپ یوسف کے معاملہ میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کی خیر خواہی کرنے والے ہیں○ اسے کل ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ وہ پھل کھائے اور کھیلے کودے اور بے شک ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں○ (یعقوب نے) کہا: تمہارے اس کو لے جانے سے میں (اس کی جُدائی میں) ضرور غمگین ہوں گا اور مجھے اندیشہ ہے کہ تم اس سے غافل ہو گے اور بھیڑیا اس کو کھا جائے گا○ انہوں نے کہا: ہماری پوری جماعت کے ہوتے ہوئے اگر اس کو بھیڑیا کھا گیا تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والے ہوں گے○ (یوسف: ۱۴-۱۱)

حضرت یعقوب علیہ السلام کو بھیڑیئے کے کھانے کا خطرہ کیوں ہوا؟

جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے یہ فرمائش کی کہ وہ حضرت یوسف کو ان کے ساتھ بھیج دیں تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے دو عُذر پیش کیے: ایک یہ کہ حضرت یوسف کی جُدائی ان کو غمگین کرے گی کیونکہ وہ ایک پل بھی ان کے بغیر نہیں گزار سکتے، دوسرا یہ کہ وہ اپنی بکریوں کو چرانے میں مصروف ہوں گے یا اپنے کھیل کود میں مشغول ہوں گے اور بھیڑیا ان کو کھا جائے گا، کیونکہ حضرت یوسف کے بھائیوں کے نزدیک حضرت یوسف کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کو بھیڑیئے کا خطرہ اس لیے تھا کہ انہوں نے خواب میں یہ دیکھا تھا کہ بھیڑیئے نے حضرت یوسف علیہ السلام پر حملہ کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے خواب دیکھا تھا کہ وہ پہاڑ کی بلندی پر ہیں اور حضرت یوسف وادی کے نیچے ہیں، اچانک دس بھیڑیوں نے حضرت یوسف کو گھیر لیا، وہ ان کو پھاڑ کھانا چاہتے تھے، پھر ایک نے ان کو ہٹایا، پھر زمین پھٹ گئی اور حضرت یوسف علیہ السلام اس میں تین دن تک چھپے رہے۔ ان دس بھیڑیوں سے مراد ان کے دس بھائی تھے، جب وہ حضرت یوسف کو قتل کرنے کے درپے ہوئے اور جس نے ان کو ہٹایا وہ ان کا بڑا بھائی یہوذا تھا اور زمین میں چھپنے سے مراد حضرت یوسف کا تین دن کنوئیں میں قیام کرنا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ اس لیے کہا تھا کہ ان کو ان بھائیوں سے خطرہ تھا اور آپ کی بھیڑیئے سے مراد یہی لوگ تھے۔ حضرت یعقوب کو ان لوگوں سے یہ خطرہ تھا کہ وہ حضرت یوسف کو قتل کر دیں گے اور آپ نے کنایۃً ان ہی کو بھیڑیا فرمایا تھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا:

حضرت یعقوب نے ان کو بھیڑیا فرمایا تھا؛ ایک اور قول یہ ہے کہ حضرت یعقوب کو ان بھائیوں سے خطرہ نہیں تھا؛ اگر آپ کو ان سے خطرہ ہوتا تو آپ حضرت یوسف کو ان کے ساتھ نہ بھیجتے؛ آپ کو دراصل بھیڑیے ہی کا خطرہ تھا کیونکہ اس علاقہ کے صحاریٰ میں بھیڑیے بہت زیادہ تھے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۱۳۴)

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا: اگر اس کو بھیڑیا کھا گیا تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اگر ایسا ہو گیا کہ ہمارے ہوتے ہوئے یوسف کو بھیڑیا کھا گیا تو لوگ ہمیں نقصان زدہ کہیں گے، اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اگر ہم اپنے بھائی کی حفاظت نہ کر سکے تو پھر اپنی بکریوں اور بھیڑوں کی حفاظت بھی نہ کر سکیں گے اور ہمارے مویشی ہلاک ہو جائیں گے اور ہم نقصان اٹھائیں گے، اس کا تیسرا محمل یہ ہے کہ ہم دن رات محنت مشقت کر کے اپنے باپ کی خدمت کرتے ہیں تاکہ اس کی دعا اور ثنا حاصل کریں، اب اگر یوسف کو ہمارے ہوتے ہوئے بھیڑیا کھا گیا تو ہم اپنے باپ کی ناراضگی مول لیں گے اور اس کی دعا اور ثناء سے محروم ہوں گے اور ہماری پچھلی تمام خدمات ضائع ہو جائیں گی۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَنْ يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ ۚ وَ

الغرض جب وہ اس کو لے گئے اور انہوں نے اس کو اندھے کنویں کی گہرائی میں ڈالنے پر اتفاق کر لیا، اور

أَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿١٥﴾

ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ (گھبراؤ نہیں) عنقریب تم ان کو ان کے اس سلوک سے آگاہ کرو گے اور ان کو اس کی خبر بھی نہ ہوگی ○

وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ ﴿١٦﴾ قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ

اور وہ رات کے وقت اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے ○ انہوں نے کہا اے ابا! ہم ایک دوسرے کے ساتھ دوڑ کا مقابلہ کر

وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ ۖ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ

رہے تھے، اور ہم نے یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا، پس اس کو بھیڑیے نے کھا لیا اور آپ ہماری بات ماننے

لَنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ ﴿١٧﴾ وَجَاءُوا عَلَىٰ قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ ۚ

والے نہیں ہیں خواہ ہم سچے ہوں ○ اور وہ اس کی قمیص پر جھوٹا خون لگا لائے،

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ

(یعقوب نے) کہا (بھیڑیے نے تو خیر نہیں کھایا) بلکہ تمہارے دل نے ایک بات گھڑلی ہے، پس اب صبر جمیل کرنا ہی بہتر ہے اور جو

الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿١٨﴾ وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا

کچھ تم بیان کرتے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مطلوب ہے ○ اور ایک قافلہ آیا تو انہوں نے ایک پانی لانے

وَاَرْدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ۭ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ۭ وَاَسَرُّوْهُ

والے کو بھیجا پس اس نے اپنا ڈول ڈالا، اس نے کہا مبارک ہو یہ ایک لڑکا ہے اور انہوں نے یوسف کو مال تجارت بنا کر

بِضَاعَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۹ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ

چھپا لیا، اور اللہ ان کے کاموں کو خوب جاننے والا ہے ○ اور بھائیوں نے یوسف کو (قافلہ سے لے کر) چند درہموں کے بدلے

دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ۝۲۰

(ان ہی کے ہاتھ) بیچ دیا، اور وہ یوسف میں (ویسے ہی) رغبت کرنے والے نہ تھے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: - الغرض جب وہ اس کو لے گئے اور انہوں نے اس کو اندھے کنوئیں کی گہرائی میں ڈالنے پر اتفاق کر لیا، اور ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ (گھبراؤ نہیں) عنقریب تم ان کو ان کے اس سلوک سے آگاہ کرو گے اور ان کو اس کی خبر بھی نہ ہوگی ○ (یوسف: ۱۵)

حضرت یوسف کو ان کے بھائیوں کا راستہ میں زدو کوب کرنا

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے اصرار پر حضرت یعقوب علیہ السلام نے انہیں حضرت یوسف کو ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی۔ جب حضرت یوسف اپنے بھائیوں کے ساتھ روانہ ہوئے تو انہوں نے راستہ میں ان کے ساتھ شدید عداوت کا اظہار کیا، ایک بھائی حضرت یوسف کو مارتا تو وہ دوسرے بھائی سے فریاد کرتے تو وہ بھی ان کو مارتا پیٹتا اور انہوں نے ان میں سے کسی کو رحم دل نہ پایا۔ قریب تھا کہ وہ حضرت یوسف کو قتل کر دیتے اس وقت حضرت یوسف کہہ رہے تھے: اے یعقوب! کاش آپ جانتے کہ آپ کے بیٹے کے ساتھ کیا ہو رہا ہے! تب یہوذا نے کہا: کیا تم لوگوں نے مجھ سے یہ پکا عہد نہیں کیا تھا کہ تم لوگ اس کو قتل نہیں کرو گے، تب وہ حضرت یوسف کو کنوئیں پر لے گئے اور ان کو کنوئیں کی منڈیر پر کھڑا کر کے ان کی قمیص اُتاری جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس قمیص پر خون لگا کر حضرت یعقوب علیہ السلام کو دیں گے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے کہا: میری قمیص واپس کر دو تاکہ میں اس سے اپنے بدن کو چھپاؤں۔ بھائیوں نے کہا: اب تم سورج، چاند اور گیارہ ستاروں کو بلاؤ تاکہ وہ اس کنوئیں میں تمہاری غمگساری کریں، پھر انہوں نے حضرت یوسف کو کنوئیں میں پھینک دیا تاکہ وہ پانی میں ڈوب کر مر جائیں۔ حضرت یوسف پانی میں گر گئے، پھر انہوں نے کنوئیں کے ایک پتھر کی پناہ لی اور اس پتھر پر کھڑے ہو گئے۔ وہ اس پر کھڑے ہوئے رو رہے تھے کہ ان کے بھائیوں نے ان کو آواز دی، حضرت یوسف یہ سمجھے کہ شاید ان کو رحم آ گیا ہے، انہوں نے کہا: لبیک۔ انہوں نے ایک بھاری پتھر اٹھا کر حضرت یوسف کا نشانہ لیا، اب یہوذا نے ان کو منع کیا، اور یہوذا ہی ان کو کنوئیں میں کھانا پہنچاتا رہا تھا۔ یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو پکارا: اے وہ جو حاضر ہے غائب نہیں! اے وہ جو قریب ہے بعید نہیں! اے وہ جو غالب ہے مغلوب نہیں! میری اس مشکل کو آسان کر دے اور مجھے اس کنوئیں سے نجات عطا فرما، اور یہ بھی روایت ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا اور ان کے کپڑے اُتار لیے گئے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ان کو جنت کی ایک ریشمی قمیص پہنائی، پھر حضرت ابراہیم نے وہ قمیص حضرت اسحٰق کو دی اور حضرت اسحٰق نے وہ قمیص حضرت یعقوب کو دی اور حضرت یعقوب نے اس قمیص کو ایک غلاف میں ڈال کر وہ غلاف

حضرت یوسف کے گلے میں ڈال دیا، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام کنوئیں میں آئے اور غلاف سے وہ قمیص نکال کر حضرت یوسف کو پہنا دی۔ (جامع البیان جز ۱۲ ص ۲۰۹، تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۳۷۶، زاد المسیر ج ۴ ص ۱۹۰۔۱۸۹)

حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف وحی سے مراد وحی نبوت یا الہام؟

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور ہم نے اس کی طرف وحی کی۔ اس میں اختلاف ہے کہ اس وحی سے مراد وحی نبوت اور رسالت ہے یا اس وحی سے مراد الہام ہے۔ محققین کی ایک بڑی جماعت کا یہ نظریہ ہے کہ یہ وحی نبوت تھی، پھر اس میں اختلاف ہے کہ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام بچے تھے یا بالغ تھے، بعض نے کہا: حضرت یوسف اس وقت بالغ تھے اور اس وقت آپ کی عمر سترہ سال تھی۔ اور بعض نے کہا: اس وقت آپ بچے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کی عقل کو کامل کر دیا، اور آپ میں وحی اور نبوت کی اس طرح صلاحیت رکھ دی جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں صلاحیت رکھی تھی۔ وحی کے متعلق دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اس سے مراد الہام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى۔ (القصص: ۷) اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی۔

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ۔ (النحل: ۶۸) اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی۔

اور زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ اس وحی سے مراد وحی نبوت ہے، اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو نبی قرار دینا کس طرح صحیح ہوگا، حالانکہ اس وقت وہاں ایسے لوگ نہیں تھے جن کو حضرت یوسف علیہ السلام اللہ کا پیغام پہنچاتے، اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت ان پر وحی نازل کرنے سے مقصود یہ تھا کہ ان کو حامل وحی الٰہی ہونے کے مرتبہ پر فائز کیا جائے اور ان کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ وقت آنے پر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچائیں اور وحی کو وقت سے پہلے اس لیے نازل کیا تھا کہ ان کے دل سے گھبراہٹ اور پریشانی اور رنج اور غم کو دُور کیا جائے اور ان کو مطمئن اور پُرسکون کیا جائے۔

حضرت یوسف کے بھائیوں کو خبر نہ ہونے کے محامل

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور ان کو اس کی خبر بھی نہ ہوگی۔ اس کی تفسیر میں بھی دو قول ہیں:

(۱) اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف کی طرف وحی کی کہ تم آج کے بعد کسی دن اپنے بھائیوں کو ان کے اس سلوک سے آگاہ کرو گے اور ان کو اس وقت یہ پتا نہیں چلے گا کہ تم یوسف ہو، اور اس سے مقصود یہ تھا کہ ان کو یہ اطمینان دلایا جائے کہ ان کو عنقریب اس مصیبت سے نجات مل جائے گی اور وہ اپنے بھائیوں پر غالب ہوں گے اور وہ ان کے سامنے مغلوب اور سرنگوں اور ان کی قدرت اور اختیار میں ہوں گے، اور ایک روایت میں ہے کہ جس وقت وہ گندم طلب کرنے کے لیے ان کے شہر میں داخل ہوئے تو حضرت یوسف نے ان کو پہچان لیا، اور وہ حضرت یوسف کو نہ پہچان سکے، حضرت یوسف نے ان کے ہاتھ پر صاع رکھ دیا اور کہا: مجھے اس نے خبر دی ہے کہ تمہارے باپ کی طرف سے تمہارا ایک بھائی تھا، تم نے اس کو کنوئیں میں ڈال دیا تھا اور تم نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ اس کو بھیڑیئے نے کھالیا۔

(۲) ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف کنوئیں میں یہ وحی کی کہ عنقریب تم اپنے بھائیوں کو ان اعمال کی خبر دو گے اور ان کے بھائیوں کو یہ خبر نہیں تھی کہ ان پر وحی نازل ہو رہی ہے، اور اس وحی کو ان سے مخفی رکھنے میں یہ حکمت تھی کہ اگر ان کو پتا چل جاتا کہ حضرت یوسف پر وحی نازل ہوئی ہے تو ان کا حسد اور زیادہ ہو جاتا اور وہ پھر ان کو قتل کر دیتے۔

والد سے اپنے حالات کو مخفی رکھنے میں حضرت یوسف کی حکمت

پہلی تفسیر کے مطابق جب حضرت یوسف علیہ السلام پر یہ وحی کی گئی کہ جب تم اپنے بھائیوں کو ان کے اس سلوک سے

آگاہ کرو گے تو اس وقت ان کو یہ پتا نہیں ہو گا کہ تم یوسف ہو' اور یہ وحی اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو متضمن ہے کہ حضرت یوسف اس وقت تک اپنے احوال سے اپنے والد کو بھی مطلع نہ کریں اور یہی وجہ ہے کہ اتنی مدت تک حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے حالات سے اپنے والد کو مطلع نہیں کیا حالانکہ ان کو علم تھا کہ ان کے والد ان کے فراق میں سخت رنج اور غم میں مبتلا ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی لازم نہ آئے اور وہ ان سختیوں پر صبر کریں اور اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ تھی کہ اس شدید رنج اور غم کی وجہ سے حضرت یعقوب اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے رہیں گے اور اس سے دُعا کرتے رہیں گے اور دُنیا سے ان کی فکر منقطع رہے گی اور وہ عبادت کے درجہ عالیہ پر فائز ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے عظیم قُرب کے حصول کی خاطر مصائب اور شدائد کی گھاٹی سے گزرنا پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور وہ رات کے وقت اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے○ انہوں نے کہا: اے ابا! ہم ایک دوسرے کے ساتھ دوڑ کا مقابلہ کر رہے تھے' اور ہم نے یوسف کو اپنے سامان کے ساتھ چھوڑ دیا تھا' پس اس کو بھیڑیے نے کھا لیا' اور آپ ہماری بات ماننے والے نہیں ہیں خواہ ہم سچے ہوں○ اور وہ اس کی قمیص پر جھوٹا خُون لگا لائے (یعقوب نے) کہا: (بھیڑیے نے تو خیر نہیں کھایا) بلکہ تمہارے دل نے ایک بات گھڑ لی ہے' پس اب صبرِ جمیل کرنا ہی بہتر ہے' اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مطلوب ہے○ (یوسف: ۱۸-۱۶)

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا حضرت یعقوب کو حضرت یوسف کی خبر دینا

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی رات کے وقت اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے' رات کے وقت کا انتخاب انہوں نے اس لیے کیا تھا کہ یہ وقت ان کے عذر پیش کرنے کے لیے زیادہ مناسب تھا۔ روایت ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے رونے کی آواز سنی تو پوچھا: کیا ہوا؟ کیا تمہاری بکریوں کو کوئی حادثہ پیش آ گیا؟ انہوں نے کہا: نہیں! پوچھا: یوسف کہاں ہے؟ انہوں نے کہا: ہم آپس میں دوڑنے کا مقابلہ کر رہے تھے تو اس اثناء میں اس کو بھیڑیا کھا گیا! حضرت یعقوب نے ایک چیخ ماری اور رونے لگے' ایک روایت میں ہے کہ جب انہوں نے کہا: اس کو بھیڑیا کھا گیا تو حضرت یعقوب بے ہوش ہو کر گر گئے' انہوں نے ان کو ہوش میں لانے کے لیے پانی کے چھینٹے مارے لیکن انہوں نے حرکت نہ کی' پھر انہوں نے ان کو پُکارا تو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا' پھر یہوذا نے ان کے سانس نکلنے کے مواضع پر ہاتھ رکھا تو اس کو ان کے سانس لینے کا پتا نہیں چلا' تب یہوذا نے کہا: قیامت کے دن ہمیں سخت عذاب ہو گا! ہم نے اپنے بھائی کو ضائع کر دیا اور اپنے باپ کو قتل کر دیا' پھر سحری کے وقت سے پہلے حضرت یعقوب کو ہوش نہیں آیا' اس وقت حضرت یعقوب کا سر روبیل کی گود میں تھا' حضرت یعقوب نے اس سے کہا: کیا میں نے اپنے بیٹے کو تمہارے پاس امانت نہیں رکھا تھا؟ اور کیا میں نے تم سے پختہ عہد نہیں لیا تھا؟ اس نے کہا: اے ابا! اپنا رونا بند کریں تو میں آپ کو اس کا سبب بتاؤں' پھر کہا: ہم آپس میں دوڑنے کا مقابلہ کر رہے تھے اور یوسف کو ہم نے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا' اس اثناء میں اس کو بھیڑیا کھا گیا' پھر حضرت یعقوب نے پوچھا: اس کی قمیص کہاں ہے؟ تو انہوں نے حضرت یعقوب کے چہرے پر وہ قمیص پھینک دی' حتیٰ کہ حضرت یعقوب کے چہرے پر بھی قمیص کا رنگ لگ گیا۔ (جامع البیان جز ۱۲ ص ۲۱۱' الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۱۲۸)

دوڑ میں مسابقت کے متعلق احادیث اور ان کی شرح

نستبق کا مادہ سبقت ہے یعنی مقابلہ میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا' یہ مقابلے تیراندازی میں' گھوڑے کی سواری میں اور دوڑنے میں ہوتے ہیں اور دوڑ میں مقابلہ سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ دشمن سے مقابلہ کی مشق ہو اور ہاتھ پیر

مضبوط ہوں اور بھیڑیوں کو بکریوں کے پاس سے بھگانے میں مہارت ہو' نستبق کا معنی ہے ہم دیکھیں کہ ہم میں سے کون آگے نکلتا ہے۔ علامہ ابن العربی نے کہا: مسابقت سابقہ شریعتوں میں بھی تھی' یہ عمدہ خصلت ہے اور اس سے جنگ میں مشق اور مہارت حاصل ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی دوڑ میں مقابلہ کیا ہے اور گھوڑوں کی دوڑ کا مقابلہ بھی کرایا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھیں' آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ میں مقابلہ کیا' حضرت عائشہ آپ سے آگے نکل گئیں' (حضرت عائشہ فرماتی ہیں) پھر جب میرا بدن بھاری ہو گیا تھا تو میں نے ایک بار پھر مقابلہ کیا' اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے آگے نکل گئے' آپ نے فرمایا: یہ پچھلی بار کا بدلہ ہے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث:٢٥٧٨' مسند احمد ج ٦ ص ٣٩' ٢٦٤' قدیم' ٢٦٣٣٧ جدید دار الفکر' صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ٤٦٩١' السنن الکبریٰ للبیہقی ج ١٠ ص ١٨)

امام مسلم نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ ذی قرد سے مدینہ کی طرف واپس جا رہے تھے' انصار میں ایک شخص تھا جو دوڑ میں کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہا تھا' اس نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کو للکارا کہ دیکھیں پہلے کون مدینہ پہنچتا ہے۔ حضرت سلمہ بن اکوع نے اس چیلنج کو قبول کر لیا اور اس سے پہلے مدینہ پہنچ گئے۔ (صحیح مسلم الجہاد: ١٣٢' (١٨٠٧) الرقم المسلسل: ٤٥٩٧)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑوں کے درمیان بھی مقابلہ کرایا' اس کا ذکر اس حدیث میں ہے:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جن گھوڑوں کو اضمار کیا گیا تھا ان کا مقابلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حفیاء سے لے کر ثنیۃ الوداع تک کرایا اور جن گھوڑوں کو اضمار نہیں کیا گیا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مقابلہ ثنیۃ الوداع سے مسجد بنو زریق تک کرایا۔ حضرت ابن عمر بھی ان لوگوں میں سے تھے جن کے درمیان مقابلہ کرایا گیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:٤٢٠' سنن ابوداؤد رقم الحدیث:٢٥٧٥' السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:٤٤٢٤' صحیح مسلم رقم الحدیث:١٨٧٠' سنن الترمذی رقم الحدیث:١٦٩٩' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:٢٨٧٧' صحیح ابن حبان رقم الحدیث:٤٦٨٦' مسند احمد ج ٢ ص ٥٦)

اضمار کا معنی یہ ہے کہ ایک مدت تک گھوڑے کو کھانے کے لیے معمول سے کم چارہ ڈالا جائے اور اس کو ایک کوٹھڑی میں بند کر کے رکھا جائے حتیٰ کہ اس کو خوب پسینہ آئے' پھر اس کے بعد اس کو معمول کے مطابق چارہ ڈالا جائے' اس حدیث سے معلوم ہوا کہ گھوڑوں کے درمیان مقابلہ کرانے کی تین شرطیں ہیں: ایک یہ ہے کہ مقابلہ کی مسافت معین ہونی چاہیے' دوسری یہ کہ دونوں فریقوں کے گھوڑے مساوی صفت کے ہونے چاہئیں یا دونوں مضمر ہوں یا دونوں غیر مضمر ہوں' علیٰ ھذا القیاس اور تیسری شرط یہ ہے کہ یہ مشق ان گھوڑوں میں کرائی جائے جن کو جہاد کے لیے تیار کیا جا رہا ہو یا مسلمانوں کے مصالح اور ان کے کام آنے کے لیے گھوڑوں کو رکھا گیا ہو نہ کہ مسلمانوں میں باہمی قتال کے لیے۔

اور نیزہ بازی اور اونٹوں میں دوڑ کا مقابلہ کرانے کے متعلق یہ حدیث ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیزہ بازی اور اونٹوں اور گھوڑوں میں مقابلہ پر اول آنے والے کے لیے انعام کے سوا اور کسی چیز میں سبقت کرنے والے کے لیے انعام لینا جائز نہیں

ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۱۷۰۰، سنن ابو داؤد رقم الحدیث:۲۵۷۴، سنن نسائی رقم الحدیث:۳۵۸۹، مسند احمد ج ۲ ص ۲۵۶، ۳۸۵، صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۴۶۹۰، مسند شافعی ج ۲ ص ۱۲۹-۱۲۸)

نیزہ بازی کے مقابلہ میں تیراندازی کا مقابلہ بھی داخل ہے اور اونٹ اور گھوڑوں کے مقابلہ میں ہاتھی، خچر اور گدھا بھی داخل ہے اور بعض علماء نے آدمیوں کی دوڑ کو بھی اس میں شامل کیا ہے اور اس حدیث کا محمل یہ ہے کہ کوئی تیسرا فریق مقابلہ کرنے والے دو فریقوں میں سے اوّل آنے والے فریق کو انعام دے، اس طرح کا انعام دینا جائز ہے اور اگر مقابلہ کرنے والے دو فریق آپس میں شرط لگائیں کہ ہارنے والا جیتنے والے کو اتنی رقم دے گا تو یہ قمار اور جُوا ہے، البتہ پرندوں کے درمیان پیسوں کے عوض مقابلہ کرانے کو علماء نے ناجائز کہا ہے کیونکہ ان کا جہاد سے کوئی تعلق نہیں ہے، ویسے اس دور میں تو اونٹوں، گھوڑوں، ہاتھیوں، گدھوں اور خچروں کا بھی جہاد سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جو لوگ گھوڑوں یا اونٹوں کا دوڑ میں مقابلہ کراتے ہیں وہ ان پر شرط رکھ کر جوا کھیلتے ہیں اس لیے آج کل کے دور میں اس قسم کے مقابلے جائز نہیں ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اونٹنی تھی جس کا نام عضباء تھا، وہ کبھی مقابلہ میں کسی سے پیچھے نہیں رہتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک اعرابی ایک اونٹ پر آیا اور وہ اس سے آگے نکل گیا، مسلمانوں کو اس بات سے بہت رنج ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہے کہ جو چیز بھی دنیا میں سربلند ہو وہ اس کو سرنگوں کر دے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۲۸۷۲، سنن النسائی رقم الحدیث:۳۵۹۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۷۰۳، مسند احمد رقم الحدیث:۱۲۰۳۳)

دوڑ میں مسابقت کی شرط کے متعلق مذاہب فقہاء

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے اپنا گھوڑا دو گھوڑوں کے درمیان داخل کیا اور اس کو اپنے مسبوق (مغلوب) ہونے کا خطرہ ہو تو یہ قمار (جُوا) نہیں ہے اور جس شخص نے اپنا گھوڑا دو گھوڑوں کے درمیان داخل کیا اور اس کو اپنے مسبوق ہونے کا خطرہ نہ ہو (یعنی ہدف پر پہلے پہنچنے اور جیت جانے کا یقین ہو) تو پھر یہ قمار (جُوا) ہے۔

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث:۲۵۷۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۲۸۷۶، سنن دار قطنی ج ۵ ص ۱۱۱، المستدرک ج ۲ ص ۱۱۴، حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے اور ذہبی نے اس کی موافقت کی ہے، مسند احمد ج ۲ ص ۵۰۵، المعجم الصغیر رقم الحدیث: ۴۰۷، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۱۰ ص ۲۰، تلخیص الحبیر رقم الحدیث:۲۰۲۵)

اور دو گھوڑ سوار، دوڑ کا مقابلہ کریں اور ہر ایک مثلاً ایک ہزار روپیہ رکھ دے اور یہ شرط لگائیں کہ جو شخص ہدف پر پہلے پہنچ جائے گا وہ دونوں کا ہزار روپیہ لے لے گا تو یہ قمار اور جُوا ہے اور اگر تیسرا شخص بھی ان کے ساتھ شریک ہو جائے اور اس نے بالکل پیسے نہ لگائے ہوں اور اس کے لیے بھی ان دونوں کی طرح ہدف پر پہلے پہنچ جانا غیر یقینی ہو اور یہ طے کیا جائے کہ ان میں سے جو بھی پہلے پہنچ جائے وہ دو ہزار روپے لے لے گا اگر وہ تیسرا شخص پہلے پہنچ گیا تو وہ دو ہزار روپے لے لے گا اور اگر وہ پہلے نہ پہنچ سکا تو اس کو کچھ نہیں ملے گا اور اس کو کچھ دینا بھی نہیں ہوگا اور اگر ان دونوں میں سے کوئی پہلے پہنچ گیا تو وہ دو ہزار روپے لے لے گا تو یہ صورت جائز ہے اور ان میں سے ہر ایک کا دو ہزار روپے لینا جائز ہے۔

علامہ ابو سلیمان حمد بن محمد الخطابی الشافعی المتوفی ۳۸۸ھ لکھتے ہیں:

جو تیسرا گھوڑا ان دو گھوڑوں کے درمیان داخل ہو اس کو محلل کہتے ہیں اور اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ وہ تیسرا گھوڑا سبقت کرنے والے کے لیے سبقت کا انعام حلال کر دے' اور ان دونوں سواروں کے درمیان جو شرط لگائی گئی تھی کہ جو سوار پہلے پہنچے گا وہ اپنا اور دوسرے کا لگایا ہوا مال لے لے گا اور ان میں سے ایک فریق نقصان اٹھانے والا اور دوسرا فائدہ حاصل کرنے والا ہوگا تو وہ شرط ختم ہو جائے گی اور اس شرط کی وجہ سے وہ عقد جو جُوا قرار پایا تھا اب اس تیسرے گھوڑے کے داخل ہونے کی وجہ سے حلال اور جائز ہو جائے گا اور اس محلل کے داخل ہونے کا یہ مقصد ہوگا کہ ان دونوں کے گھوڑا دوڑانے سے یہ قصد ہو کہ ان کو گھوڑا دوڑانے کی مشق ہو نہ کہ مال کے حصول کی اور جبکہ محلل کا گھوڑا بھی ان دونوں کے گھوڑوں کی مثل تیز رفتار ہوگا تو ان دونوں کو اس کے ہدف پر پہلے پہنچ جانے کا خطرہ رہے گا اور وہ زیادہ سے زیادہ تیز گھوڑا دوڑانے کی کوشش کریں گے اور اگر محلل کا گھوڑا ان کے گھوڑے کی طرح تیز رفتار نہ ہو بلکہ مریل اور سست رفتار ہو تو ان کو اس کے پہلے پہنچنے کا خطرہ نہیں ہوگا اور پھر تحلیل کا معنی حاصل نہیں ہوگا اور اس کا درمیان میں گھوڑا داخل کرنا لغو قرار پائے گا' اور پھر ان دونوں کی لگائی ہوئی شرط اپنے حال پر رہے گی اور ان میں سے جو فریق بھی دونوں کا مال حاصل کرے گا وہ جوئے کے ذریعے کمایا ہوا مال ہوگا اور حرام ہوگا۔

گھوڑوں میں مسابقت اور شرط لگانے کی صورت یہ ہے کہ دو گھڑ سوار ہدف پر پہلے پہنچنے کی شرط لگائیں اور ان میں سے ہر فریق ایک معین رقم (مثلاً ہزار روپے) نکالے کہ جو پہلے ہدف پر پہنچے گا وہ دونوں کی رقم (یعنی دو ہزار روپے) لے لے گا' پھر وہ دونوں کسی تیسرے گھڑ سوار کو جس کا گھوڑا ان کے گھوڑے کی مثل ہو اپنے درمیان داخل کر دیں اور یہ طے کریں کہ جو ہدف پر پہلے پہنچے گا وہ اس مال کو لے لے گا' اور محلل کو کوئی چیز دینی لازم نہیں آئے گی پس اگر محلل پہلے پہنچ گیا تو وہ ان دونوں کا مال لے لے گا' اور محلل کی ضرورت اس وقت ہوگی جب دو فریقوں کے درمیان شرط ہو' لیکن اگر امیر یا سربراہ دو گھوڑ سواروں کے درمیان مقابلہ کرائے اور یہ کہے کہ مثلاً تم میں سے جو پہلے ہدف پر پہنچ گیا اس کو دس درہم انعام ملے گا' یا ایک شخص اپنے ساتھی سے کہے: اگر تو فلاں سے پہلے پہنچ گیا تو تجھے دس درہم ملیں گے تو یہ صورتیں بغیر محلل کے جائز ہیں اور اس حدیث میں یہ دلیل ہے کسی مباح چیز تک ذرائع سے پہنچنا جائز ہے اور یہ حیلہ مکروہ نہیں ہے۔

(معالم السنن مع مختصر سنن ابو داؤد ج ۳ ص ۴۰۱۔۴۰۰' مطبوعہ دار المعرفہ بیروت)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

دوڑ میں سبقت کی تین صورتیں ہیں: (۱) حاکم یا حاکم کے علاوہ کوئی اور شخص یہ کہے کہ جو شخص دوڑ میں اول نمبر آئے گا میں اس کو اپنے مال سے اتنا انعام دوں گا' پس جو شخص دوڑ میں اول آئے وہ اس انعام کو حاصل کرے گا۔ (۲) دو شخص دوڑنے کا مقابلہ کریں اور ان میں سے ایک شخص اپنے مال میں سے مثلاً ایک ہزار روپے نکالے اور کہے کہ ہم میں سے جو شخص سبقت کرے گا یعنی ہدف پر پہلے پہنچے گا وہ یہ ایک ہزار روپے حاصل کر لے گا اور دوسرا شخص کچھ نہ کہے' پھر اگر رقم رکھنے والا شخص پہلے پہنچا تو وہ ایک ہزار روپے حاصل کرے گا اور اگر اس کا ساتھی پہلے پہنچ گیا تو وہ اس ہزار روپے کو حاصل کر لے گا۔ ان دونوں صورتوں کے جائز ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ (۳) تیسری صورت مختلف فیہ ہے اور وہ یہ ہے کہ دو مقابلہ کرنے والوں میں سے ہر شخص ایک معین رقم (مثلاً ایک ہزار روپے نکالے) اور پھر وہ یہ طے کریں کہ ان میں سے جو شخص بھی ہدف پر پہلے پہنچ گیا وہ دونوں کی رقم (یعنی دو ہزار روپے) لے لے گا' یہ صورت جائز نہیں ہے حتیٰ کہ وہ دونوں اپنے درمیان ایک

ایسے محلل کو داخل کرلیں جس سے ان دونوں کو یہ خطرہ ہو کہ وہ ان سے پہلے پہنچ سکتا ہے پس اگر محلل پہلے پہنچ گیا تو وہ ان دونوں کی رقم حاصل کرے گا اور اگر ان دونوں میں سے کسی نے سبقت کی تو جس نے بھی سبقت کی وہ دونوں کی رقم لے لے گا، اور محلل کو کچھ نہیں ملے گا اور نہ اسے کوئی چیز دینی ہوگی اور اگر ان میں سے دوسرے نے صرف تیسرے پر سبقت کی تو گویا اس نے کسی پر سبقت نہیں کی اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر ان دونوں کے درمیان محلل نہ ہو اور دو مقابلہ کرنے والوں نے یہ شرط لگائی ہو کہ جس نے بھی سبقت کی وہ اپنی رقم اور دوسرے کی رقم لے لے گا تو یہ صراحتاً جُوا ہے اور جائز نہیں ہے۔
(الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۱۳۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ علاء الدین محمد بن علی حصکفی حنفی متوفی ۱۰۸۸ھ اور علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

اگر مسابقت میں ایک جانب سے مال کی شرط لگائی گئی تو یہ عقد لازم ہے، اور اگر مسابقت میں دونوں جانب سے شرط لگائی گئی تو یہ حرام ہے کیونکہ اب یہ قمار ہے (جُوئے کو قمار اس لیے کہتے ہیں کہ قمار کا معنی کبھی گھٹنا اور کبھی بڑھنا ہوتا ہے اور جُوا کھیلنے والوں میں سے ہر فریق کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ دوسرے فریق کا مال لے لے اور دوسرے کا مال بلاعوض لینا قرآنِ مجید کی نص قطعی سے حرام ہے اور جب صرف ایک جانب سے شرط ہو تو وہ اس طرح نہیں ہے) ہاں اگر وہ دونوں اپنے درمیان ایسے محلل کو داخل کرلیں جس کا گھوڑا ان کے گھوڑے کی مثل ہو تو پھر یہ جائز ہے جبکہ اس سے یہ خطرہ ہو کہ وہ ان دونوں سے پہلے ہدف پر پہنچ سکتا ہو ورنہ اس کا محلل ہونا جائز نہیں ہے۔ پھر اگر محلل ان دونوں سے پہلے پہنچ گیا تو وہ ان دونوں کی رقم حاصل کرلے گا اور اگر وہ دونوں اس پر سبقت کر گئے تو وہ اس کو کچھ نہیں دیں گے، اور ان دونوں میں سے دونوں کی رقم وہ لے گا جو پہلے ہدف پر پہنچے گا۔ (الدر المختار و رد المحتار، ج ۵ ص ۲۵۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما میں گھوڑا دوڑانے کا مقابلہ ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے پہنچے اور حضرت ابوبکر کا گھوڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھوڑے کے دھڑ کے قریب تھا اور حضرت عمر کا گھوڑا تیسرے نمبر پر تھا۔

انعامی بانڈز کے جواز کی بحث

ہم نے اس بحث میں مسابقت کی شرط لگانے کے احکام بیان کیے ہیں اور یہ بیان کیا ہے کہ ایک جانب سے شرط لگانا جائز ہے اور دونوں جانب سے شرط لگانا حرام ہے اور ناجائز ہے اور یہ جُوا ہے، اس بنا پر لاٹری اور معمہ اور گھوڑوں یا اونٹوں کی مروجہ ریس جائز نہیں ہے البتہ انعامی بانڈز جائز ہیں، کیونکہ ان کی باقاعدہ خرید و فروخت ہوتی ہے اور انسان جتنے کا بانڈ خریدتا ہے۔ وہ جب چاہے اس بانڈ کو اتنے میں فروخت کرسکتا ہے، اس پر خواہ کتنی مدت گزر جائے اس کی رقم میں اضافہ ہوتا ہے نہ کمی ہوتی ہے، اس میں قمار ہے نہ سود ہے اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ ان بانڈز کی مجموعی رقم پر جو سود بنتا ہے حکومت اس سود میں سے انعامات تقسیم کرتی ہے یہ محض ایک مفروضہ ہے، حکومت نے ایسا کوئی اعلان نہیں کیا اور نہ ہی اسٹیٹ بینک میں الگ الگ خانے بنے ہوئے ہیں کہ فلاں خانہ میں بانڈز کے سود کی رقم پڑی ہوئی ہے اور اس میں سے انعامات تقسیم کیے جاتے ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ اسٹیٹ بینک کے ڈپازٹ میں جو رقم ہے اس میں سود کی آمیزش ہے اور اسی رقم سے انعامات تقسیم کیے جاتے ہیں تو پھر سرکاری ملازمین کی تنخواہیں بھی اسی رقم سے دی جاتی ہیں، وہ بھی ناجائز ہونی چاہئیں بلکہ اسٹیٹ بینک یا کسی بھی بینک سے جو بھی رقم نکالی جائے گی وہ ناجائز ہوگی کیونکہ ہر بینک سودی کاروبار کرتا ہے اور اس کے ڈپازٹ میں جو بھی رقم ہوتی ہے اس میں سود سے حاصل کردہ رقم بھی ہوتی ہے اور اگر اس سودی آمیزش کے باوجود سرکاری ملازمین کی تنخواہیں اور باقی

مدات میں نکالی ہوئی رقمیں جائز ہیں تو انعامات تقسیم کرنے کے لیے جو رقومات نکالی جائیں گی وہ کیونکر ناجائز ہوں گی۔

ہم نے شرح صحیح مسلم جلد رابع میں انعامی بانڈز کے جواز پر دلائل دیئے تھے بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ فیڈرل شریعت کورٹ نے انعامی بانڈز کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے پھر بعد میں مشتاق علی ایڈووکیٹ نے اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں رٹ دائر کی تو سپریم کورٹ نے اکثریتی فیصلہ کی بنیاد پر فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلہ کو مسترد کر دیا اور انعامی بانڈز کے کاروبار کو جائز قرار دیا، ہم اس مسئلہ کی وضاحت سے پہلے لاٹری اور قمار سے متعلق تعزیراتِ پاکستان سے اقتباس پیش کریں گے پھر سپریم کورٹ کے دو ججوں جسٹس پیر محمد کرم شاہ اور جسٹس شفیع الرحمٰن کے فیصلہ کی نقول پیش کریں گے۔

لاٹری اور قمار بازی کے متعلق تعزیراتِ پاکستان کی دفعات کی تشریح

(۱) مقصد: لاٹری اور قمار بازی دونوں کا تعلق کیونکہ اتفاق اور قسمت آزمائی سے ہوتا ہے اس لیے لاٹری کا دفتر کھولنا یا لاٹری نکالنا اس کی بابت اشتہار دینا یا اشاعت کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ البتہ حکومت کی قائم کردہ یا منظور شدہ لاٹری اس ممانعت سے مستثنیٰ کر دی گئی ہے۔ دفعہ ۲۹۴ الف کا اطلاق ہر اس طریقہ کار پر ہوتا ہے جو سراسر اتفاق پر مبنی ہو چاہے عملی طور پر قرعہ نکالا گیا ہو یا نہ نکالا گیا ہو۔ (پی ایل ڈی ۱۹۵۸ء لاہور ۸۸۷)

(۲) لاٹری: لاٹری ایک ایسا طریقہ کار (سکیم) ہے جس سے قرعہ سے یا اتفاق پر مبنی طریقہ سے انعامات کی تقسیم کی جائے، یہ ایک اتفاق کا کھیل ہوتا ہے جس میں ٹکٹ خریدنے والے کے نفع یا نقصان کا انحصار قرعہ ڈالنے یا نکالنے پر ہوتا ہے۔ ٹکٹ محض اتفاق کے خرید کی نشانی ہوتی ہے اور ٹکٹوں کی یہی خرید لاٹری کی رُوح ہوتی ہے۔ اگر کسی انعام کے مواقع یا اتفاق بلاقیمت فراہم کیے جائیں تو یہ لاٹری نہ ہوگی۔ لاٹری کا اصول یہ ہے کہ انعامات کی تقسیم محض اتفاق کی بنیاد پر کی جائے۔ اگر لاٹری کا نتیجہ یہ ہو کہ لاٹری کا منتظم انعامات تقسیم کیے بغیر ٹکٹوں کی ساری آمدنی خود رکھ لے تو بھی ایسی کارروائی لاٹری ہی تصور ہوگی۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں ہے کہ روپیہ لگانے والوں کی رقم یا انعامات تقسیم کیے گئے ہوں۔ لاٹری کا ضروری عنصر یہ ہے کہ انعام یا انعامات تقسیم کرنے کی کوئی سکیم ہو جس کا دارومدار اتفاق پر ہو اور یہ کہ اگر اتفاق کے مطابق یہ فیصلہ کیا جائے کہ کسی شخص کو کوئی انعام نہ دیا جائے اور جو رقم داؤ پر لگائی گئی ہو وہ منتظم کو مل جائے گی تو بھی سکیم لاٹری ہی سمجھی جائے گی۔

(پی ایل ڈی ۱۹۵۸ء لاہور ۸۸۷)

لاٹری نکالنا کسی قرعہ یا اتفاق پر مبنی طریقہ سے انعام کا تقسیم کرنا ہے۔ اس میں متعلقہ شخص کی کسی مہارت، فن، ہنر یا مشق کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ [(۱۹۱۷ء) پی آر نمبر ۳۵]

ایک مقدمہ میں قرار دیا گیا کہ اس امر سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لاٹری کسی حقیقی تجارتی کاروبار کا حصہ اور جزو ہے۔ [(۱۹۱۵ء) ۹۔ بی ایل ٹی ۱۳۴] جُرم کے ثبوت کے لیے فی الواقع قرعہ اندازی ضروری ہے۔ لفظ "نکالنا" اس کے لغوی معنی میں لیا جائے گا اس لفظ سے "اہتمام یا انتظام" کے معنی نہیں لیے جاسکتے۔ [(۱۹۴۲ء) مدراس ۸۰۲]

"شائع کرنا" کے الفاظ میں شائع کرانے والا اور شائع کرنے والا دونوں شامل ہیں یعنی اشتہار دینے والا اور شائع کرنے والا (اخبار کا مالک) دونوں شامل ہوتے ہیں۔ [(۱۵۸۵) ۱۰ بمبئی ۹۷ء]

قانون کا منشاء یہ ہے کہ لوگ اتفاق اور نصیب آزمائی پر اپنا پیسہ برباد نہ کریں۔ اس کا انسداد اس طریقہ سے بھی کیا گیا ہے کہ لوگوں کو علم ہی نہ ہوسکے کہ کہاں یہ لاٹری ڈالی جاتی ہے اور وہ ٹکٹ کہاں سے حاصل کرسکتے ہیں۔ اخبارات جو نشرواشاعت کا بہترین ذریعہ ہیں دفعہ ہذا کے تحت لاٹری کے اشتہار کی اشاعت سے روک دیئے گئے ہیں تاکہ عوام کو معلوم نہ ہوسکے کہ

اتفاق یا قسمت کے نام پر روپیہ بٹورنے کا دھندا کہاں ہو رہا ہے۔ [(۱۷۹۱) ۹۴ ئی آر ۴۱۴]

"مال" میں منقولہ یا غیر منقولہ دونوں شامل ہیں۔ ایک فیکٹری نے اشتہار دیا کہ فیکٹری کا مال قرعہ اندازی سے بہت سستی قیمت پر خوش قسمت نمبر والے (لکی نمبر) کو دیا جائے گا تو ایسا امر دفعہ ہذا کے تحت جرم قرار دیا گیا۔ [(۱۹۳۶) ۵۰ مدراس ۹۷۴] اگر بہت سے لوگ مل کر کمیٹی ڈالیں اور مساوی طور پر رقم ڈال کر اس رقم سے قرعہ اندازی کر کے کسی ایک کو ساری رقم ادا کر دیں اور وہ بقایا قرعہ اندازیوں میں اپنی قسط ادا کرتا رہے تو یہ لاٹری کی تعریف میں نہیں آئے گا۔ [(۱۸۹۸) ۲۲ مدراس ۲۱۲]

ایک مقدمہ میں ملزم سگریٹ کمپنی کا مالک تھا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے لاٹری نکالنے کی تجویز کی اشاعت کی تھی۔ ملزم نے ۲۲ ہزار اشتہارات چھپوا کر تقسیم کرائے۔ اشتہار کا مضمون یہ تھا کہ سگریٹ کی کسی ڈبیہ میں خریدار کو کوئی پانچ روپے کا نوٹ رکھا ہوا ملے گا۔ اس سکیم کا مقصد سگریٹ کی فروخت کو بڑھانا تھا۔ سگریٹ ساز کو پانچ پانچ روپے کے دس نوٹ بھیجے گئے کہ سگریٹ بناتے ہوئے ایک ایک نوٹ ڈبیہ میں رکھ دیا جائے اور ڈبیوں کو دوسری ڈبیوں میں خلط ملط کر دیا جائے اور پھر ڈبیوں کو بڑے پیکٹوں میں پیک کر دیں۔ یہ قرار دیا گیا کہ یہ صورت لاٹری بنتی ہے۔ دفعہ میں چونکہ لفظ "نکالنا" استعمال کیا گیا ہے جس کے مطابق مخصوص رقم کی ادائیگی کا انحصار کسی واقعہ کے رُونما ہونے یا حالت کے ظاہر ہونے پر مشروط ہوتا ہے جو صورت یہاں موجود نہیں ہے لہٰذا ملزم دفعہ ۲۹۴ الف کے تحت قصوروار نہ تھا۔ (اے آئی آر ۱۹۲۸ بمبئی ۵۵۰)

(۳) شہادت ثابت کریں:

۱۔ ملزم کے پاس جگہ یا دفتر تھا۔

۲۔ جگہ یا دفتر لاٹری نکالنے کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔

۳۔ ایسی لاٹری کی حکومت کی طرف سے اجازت نہ تھی۔

دفعہ کی دوسری شق کے لیے ثابت کریں:

۱۔ ملزم نے تجویز زیرِ بحث شائع کی تھی۔

۲۔ ایسی تجویز کی نوعیت دفعہ ہذا میں بیان کردہ کسی صورت یا شرط پر ادائیگی وغیرہ تھی۔

(۴) مقدمہ کی اجازت: دفعہ ہذا کے تحت کسی جرم میں کوئی عدالت دست اندازی نہیں کرے گی جب تک کہ حکومت کے اختیار یا حکم سے کوئی استغاثہ نہ کیا جائے۔ (مجموعہ ضابطہ فوجداری دفعہ ۱۹۶)

(۵) ضابطہ: ناقابلِ دست اندازی سمن، قابلِ ضمانت، ناقابلِ راضی نامہ، قابلِ سماعت ہر مجسٹریٹ، قابلِ سماعت سرسری۔

دفعہ ۲۹۴ (ب) تجارت وغیرہ کے لیے انعام کی پیشکش کرنا

جو کوئی کسی تجارت یا کاروبار یا کسی شے کی فروخت کے سلسلہ میں کسی کوپن، ٹکٹ، نمبر یا عدد یا کسی دیگر طریقہ سے، تجارت، کاروبار یا کسی مال کی خریداری کی تحریک یا حوصلہ افزائی کے لیے یا اشتہاری غرض سے یا کسی شے کو مقبولِ عام بنانے کے لیے، کوئی انعام، صلہ یا ہمچو قسم کا کوئی دیگر معاوضہ چاہے اسے کوئی نام دیا گیا ہو، چاہے نقدی میں یا جنس میں، پیش کرے گا یا پیش کرنے کا ذمہ لے گا اور جو کوئی ایسی پیشکش کی اشاعت کرے گا اسے دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی قید کی سزا دی جائے گی جس کی میعاد چھ ماہ تک ہو سکتی ہے یا جرمانہ یا دونوں سزائیں۔

(مجموعہ تعزیراتِ پاکستان ص ۳۳۰۔۳۲۸، مطبوعہ منصور بک ہاؤس، لاہور)

انعامی بانڈز کے متعلق جسٹس پیر محمد کرم شاہ کا فیصلہ

جسٹس پیر محمد کرم شاہ رکن --- فاضل وفاقی شرعی عدالت نے شیخ مشتاق علی ایڈووکیٹ کی طرف سے دائر کردہ پٹیشن کا فیصلہ کرتے ہوئے P.P.C کی دفعہ ۲۹۴-اے کو ہی شریعت اسلامیہ کے خلاف قرار نہیں دیا بلکہ فاضل عدالت نے SUO MOTO اختیارات استعمال کرتے ہوئے P.P.C کی دفعہ ۲۹۴-بی کو زیرِ بحث لاکر حکومت کی طرف سے جاری کردہ انعامی بانڈز سکیم کو بھی خلافِ شریعت قرار دیا۔

اس فیصلہ کے خلاف وفاقی حکومت نے سپریم کورٹ کے شریعت اپیلیٹ بنچ میں اپیل دائر کی۔ جناب جسٹس شفیع الرحمن صاحب نے اپنے فیصلہ میں اس اپیل کو مسترد کرتے ہوئے وفاقی حکومت کو حکم دیا کہ وہ فاضل وفاقی شرعی عدالت کے فیصلہ کے مطابق ان دونوں دفعات میں مناسب ترمیم کرے۔ نیز انہوں نے اس ترمیم کے لیے ۳۱-۱۲-۱۹۹۱ء کی تاریخ متعین کی۔

فاضل جسٹس صاحب نے اپنے اس فیصلہ میں کئی دیگر امور پر بھی فاضلانہ بحث کی ہے لیکن مجھے ان کے اس فیصلہ کے صرف اس حصہ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنا ہے جس میں انہوں نے انعامی بانڈز سکیم کو شریعت کے خلاف ثابت کیا ہے۔

اس فیصلہ میں دو امور زیرِ بحث آئے ہیں: (۱) لاٹری، (۲) انعامی بانڈ سکیم۔ ان دونوں کو شریعتِ اسلامیہ کے خلاف قرار دیا گیا ہے۔

لیکن میری تحقیق کے مطابق لاٹری اور انعامی بانڈ سکیم دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ ان میں سے لاٹری واضح طور پر قمار بازی اور جوا کی ایک قسم ہے اس لیے شریعت اسلامیہ میں اس کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ لیکن انعامی بانڈ سکیم کا قمار سے کوئی تعلق نہیں اس لیے اس کو شریعت اسلامیہ کے خلاف کہنا درست نہیں۔

اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے چند امور پر غور کرنا ضروری ہے:

(۱) کیا یہ انعامی بانڈ قمار کی قسم میں سے ہیں یا نہیں؟

(۲) کیا ایسے انعامات کا ثبوت فقہ اسلامی میں موجود ہے؟

(۳) کیا قرعہ اندازی کے ذریعہ تقسیم انعامات جائز ہے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ سکیم از قسم قمار نہیں کیونکہ اس پر قمار کی تعریف صادق نہیں آتی۔ علماء اعلام نے قمار کی جو تشریحات اور وضاحتیں کی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) صاحب "تحفۃ الاحوذی" لکھتے ہیں:

لان القمار، یکون الرجل مترددا بین الغنم والغرم۔ (تحفۃ الاحوذی ص ۳۰ ج ۳)

قمار میں مقامر کو یا نفع ہی نفع ہوتا ہے یا نقصان ہی نقصان۔

جب وہ بازی لگاتا ہے تو ہارنے کی صورت میں اس کی اپنی پونجی بھی اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور اگر وہ بازی جیت لیتا ہے تو دوسرے بازی لگانے والوں کا سرمایہ بھی اس کو مل جاتا ہے، اس میں سراسر نقصان ہے یا سراسر فائدہ۔

(۲) امام فخر الدین رازی، میسر (جوا) کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ما یوجب دفع المال واخذ المال۔ (تفسیر کبیر ج ۲ ص ۲۲۰)

قمار اس کو کہتے ہیں جس میں سارا مال ہاتھ سے نکل جاتا ہے یا سارا اس کی جھولی میں آگرتا ہے۔

(۳) علامہ ابن نجیم، کنز الدقائق کی شرح البحر الرائق میں "قمار" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سمی القمار قمارا لان کل واحد من المقامرین ممن یجوزان یذھب مالہ الی صاحبہ ویجوزان یستفید مال صاحبہ وھو حرام بالنص۔ (البحرالرائق ص ۵۵۴ ج ۸)

قمار کو قمار اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں ایک کا مال دوسرے کو یا دوسرے کا مال پہلے کو مل جاتا ہے اور یہ چیز نصاً حرام ہے۔

(۴) علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں:

لان القمار من القمر الذی یزداد تارۃ وینقص اخری وسمی القمار قمارا لان کل واحد من المقامرین ممن یجوزان یذھب مالہ الی صاحبہ ویجوزان یستفید مال صاحبہ وھو حرام بالنص۔ (ص ۲۸۵ ج ۵)

قمار، قمر سے ماخوذ ہے اور قمر کبھی بڑھتا رہتا ہے کبھی گھٹتا رہتا ہے اور قمار کو قمار کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جو جُوا کی بازی لگاتے ہیں تو کسی کا سارا مال اس کے ساتھی کو مل جاتا ہے اور کبھی اس کے ساتھی کا مال اسے مل جاتا ہے۔

جب ایک کا مال بغیر کسی استحقاق کے دوسرے کو مل جاتا ہے تو اس سے حسد و عناد کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں اور باہمی محبت و ایثار کے جذبات کا نام و نشان نہیں رہتا کیونکہ یہ اکل بالباطل اور عداوت کے جذبات کو فروغ دینے کا باعث ہے اس لیے شریعت اسلامیہ نے قمار کو حرام کر دیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ (النساء: ۲۹)

تم آپس میں اپنے اموال باطل اور ناجائز ذریعہ سے مت کھاؤ۔

دوسری جگہ ارشادِ خداوندی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ○ (المائدہ: ۹۰)

اے ایمان والو! یہ شراب اور جُوا اور بُت اور جُوئے کے تیر، سب ناپاک ہیں شیطان کی کارستانیاں ہیں سو بچو ان سے تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے قمار اور جُوا کو حرام قرار دینے کی حکمت ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۔ (المائدہ: ۹۱)

یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض، شراب اور جُوئے کے ذریعہ اور روک دے تمہیں یادِ الٰہی سے اور نماز سے، تو کیا تم باز آنے والے ہو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب و جُوا کی حرمت کی حکمتیں بیان فرمائی ہیں اور بتایا کہ شراب خوری اور قمار بازی سے باہمی محبت و پیار کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں اور حسد و عداوت کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں کیونکہ جب کسی جسمانی کاوش اور ذہنی ریاضت کے بغیر کسی کی دولت کسی کو مل جاتی ہے تو باہمی خیر سگالی کے جذبات دم توڑ دیتے ہیں اور ہارنے والے کے سینہ میں حسد و عناد کے انگارے دہکنے لگتے ہیں۔ نیز یہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے انسان کو غافل کر دیتا ہے اور نماز پڑھنے کی مہلت بھی نہیں دیتا۔

لیکن انعامی بانڈز میں ان چیزوں سے کوئی چیز موجود نہیں۔ یہاں نہ کسی کا مال ناحق ہڑپ کیا جاتا ہے نہ ان سے کسی کی دل شکنی ہوتی ہے، اگر کسی کو انعام نہ ملے تو جو رقم اس نے بانڈ خریدنے میں صرف کی ہے وہ جُوں کی تُوں برقرار رہتی ہے۔ وہ جب چاہے اس کو فروخت کر کے اپنی قیمت واپس لے سکتا ہے۔ یہاں مال کے اکل بالباطل کی صورت بھی موجود نہیں ہوتی اس لیے صورتاً و معناً کسی لحاظ سے بھی یہ قمار نہیں تاکہ حرام ہو۔

دوسرے سوال کے متعلق گزارش ہے کہ ایسے انعامات کا ثبوت فقہ اسلامی میں موجود ہے۔ خلیفہ وقت اگر مسلمانوں کو جہاد میں شرکت پر برانگیختہ کرنے کے لیے انعام کا اعلان کرے تو یہ جائز ہے اور خلیفہ ان انعامات کو بیت المال سے دینے کا مجاز ہے۔ فقہی اصطلاح میں اسے "جعل" کہتے ہیں۔ اگر کفار سے جہاد کے وقت لوگوں کو اس طرح ترغیب دینا درست ہے تو حکومت اگر غربت و افلاس، جہالت، بیماری، مہنگائی، بے روزگاری کے خلاف جہاد کرنے کے لیے کارخانے، ڈیم، تعلیمی ادارے اور ہسپتال تعمیر کرنے کے لیے قرض کی ضرورت محسوس کرے اور ان انعامات کے ذریعہ لوگوں کو قرضہ دینے کا شوق دلائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں بلکہ جعل کے مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے اس کے جواز کا فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرعہ اندازی شریعت میں جائز ہے اور قرعہ کی اس وقت ضرورت پڑتی ہے جب ایک چیز کے سب یکساں طور پر مستحق ہوں اور ان میں سے کسی ایک کو یا چند کو دینا ہو تو قرعہ اندازی سے فیصلہ کرنے کا طریقہ اپنایا جاتا ہے تاکہ کسی کی دل شکنی نہ ہو اور کسی کو مجال شکایت نہ رہے۔

یہی صورت یہاں بھی ہے۔ سب بانڈ خریدنے والے ان انعامات کے برابر طور پر حقدار ہیں، ان میں سے بعض کو ہی انعام دیا جا سکتا ہے۔ اگر یُوں ہی بعض کو انعامات دے دیئے جائیں اور دوسروں کو محروم رکھا جائے تو اس طرح دل شکنی کا اندیشہ ہے اس لیے ایسے حالات میں قرعہ اندازی سے ہی بہترین تصفیہ کیا جا سکتا ہے۔ اور جن افراد کو انعام نہیں ملتا ان کا اصل سرمایہ ضائع نہیں ہوتا بلکہ وہ محفوظ رہتا ہے اور جس وقت چاہیں قواعد کے مطابق وہ اپنی رقم واپس لے سکتے ہیں۔ اس تفصیلی تجزیہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انعامی بانڈز شرعاً جائز ہیں، ان کی مشروعیت میں کسی قسم کا شک نہیں۔

انعامی بانڈز کے جواز کے متعلق جسٹس شفیع الرحمٰن کا فیصلہ

لاٹری اور انعامی بانڈ سکیم دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ لاٹری واضح طور پر قمار بازی اور جُوا کی ایک قسم ہے، اس لیے شریعت اسلامیہ میں اس کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ انعامی بانڈ سکیم کا قمار سے کوئی تعلق نہیں اس لیے یہ شریعت اسلامیہ کے خلاف نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا یہ قول نقل فرمایا: اے ابا! ہم ایک دوسرے کے ساتھ دوڑ کا مقابلہ کر رہے تھے اور ہم نے یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا پس اس کو بھیڑیئے نے کھالیا اور آپ ہماری بات ماننے والے نہیں ہیں خواہ ہم سچے ہوں○ (یوسف: ۱۷)

ان کے اس قول کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ کسی سچے آدمی کی تصدیق نہیں کرتے بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر ہم آپ کے نزدیک نہایت معتبر اور سچے بھی ہوتے پھر بھی آپ ہم پر جھوٹ کی تہمت لگاتے کیونکہ آپ کو یوسف سے بہت شدید محبت ہے اور آپ یہی گمان کرتے کہ ہم جھوٹے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ ہرچند کہ ہم سچے ہیں لیکن آپ ہم پر جھوٹ کی تہمت لگائیں گے اور ہماری تصدیق نہیں کریں گے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور وہ اس کی قمیص پر جھوٹا خُون لگالائے۔ (یعقوب نے) کہا: (بھیڑیئے نے تو خیر نہیں

کھایا) بلکہ تمہارے دل نے ایک بات گھڑلی ہے۔

حضرت یوسف کے بھائیوں کی خبر کے من گھڑت ہونے کی وجوہ

یہ سن کر حضرت یعقوب علیہ السلام رونے لگے اور انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا: مجھے اس کی قمیص دکھاؤ، انہوں نے اس قمیص کو سونگھا اور چوما پھر وہ اس کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے تو وہ ان کو کہیں سے بھی پھٹی ہوئی نہیں دکھائی دی۔ انہوں نے کہا: اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، میں نے آج سے پہلے اتنا عقلمند بھیڑیا کوئی نہیں دیکھا، اس نے میرے بیٹے کو کھالیا اور اس کو قمیص کے اندر سے نکال لیا اور قمیص بالکل نہیں پھٹی۔ حضرت یوسف کے بھائیوں کو معلوم تھا کہ واقعہ اس طرح نہیں ہوا جس طرح انہوں نے بیان کیا ہے، انہوں نے پھر اپنا بیان بدلا اور کہا: اس کو بھیڑیئے نے نہیں کھایا۔ حضرت یعقوب نے غصہ میں ان سے مُنہ موڑ لیا اور وہ غم زدہ ہو کر رو رہے تھے۔ انہوں نے کہا: اے میرے بیٹو! بتاؤ میرا بیٹا کہاں ہے؟ اگر وہ زندہ ہے تو وہ مجھے لا کر دو اور اگر وہ مرچکا ہے تو اس کو کفن پہناؤں اور دفن کروں۔ ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے آپس میں کہا: کیا تم ہمارے باپ کا حال نہیں دیکھ رہے وہ کس طرح ہمیں جھٹلا رہے ہیں، آؤ ہم اس کو کنوئیں سے نکال کر اس کے اعضاء کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کردیں اور پھر اپنے باپ کے پاس اس کے کٹے ہوئے اعضاء لے کر آئیں تب وہ ہماری بات کی تصدیق کریں گے اور ان کی امید منقطع ہوگی، تب یہوذا نے کہا: اللہ کی قسم! اگر تم نے ایسا کیا تو میں ساری عمر تمہارا دشمن رہوں گا، اور میں تمہارے باپ کو تمہارے سارے کرتوت بتا دوں گا۔ انہوں نے کہا: اب جب کہ تم ہم کو اس تجویز پر عمل کرنے سے روک رہے ہو تو آؤ چلو ایک بھیڑیئے کا شکار کرتے ہیں، پھر انہوں نے ایک بھیڑیئے کا شکار کیا اور اس کو خون آلود کردیا اور اس کو رسیوں سے باندھ کر حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس لے کر آئے اور کہا: اے ابا! یہ ہے وہ بھیڑیا جو ہماری بکریوں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتا تھا اور ہمیں اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمارے بھائی کو بھی اسی نے پھاڑ کھایا ہے اور یہ دیکھیں اس کے اوپر خون بھی لگا ہوا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: اس کو کھول دو۔ انہوں نے اس کو کھول دیا۔ بھیڑیئے نے ایک جھرجھری لی اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے قریب آنے لگا، حضرت یعقوب نے اس سے کہا: قریب آ، قریب آ، حتیٰ کہ حضرت یعقوب نے اپنا رُخسار اس کے چہرے پر رکھا اور کہا: اے بھیڑیئے! تُو نے میرے بیٹے کو کیوں کھایا اور کیوں مجھے اتنے غم میں مبتلا کیا، پھر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی: اے اللہ! اس کو گویائی عطا فرما! اللہ تعالیٰ نے اس بھیڑیئے کو گویائی عطا کردی تو اس نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو منتخب کرکے نبی بنایا ہے، میں نے آپ کے بیٹے کا گوشت نہیں کھایا نہ اس کی کھال کو پھاڑا ہے نہ اس کے بالوں کو نوچا ہے اور اللہ کی قسم! میں نے آپ کے بیٹے کو نہیں دیکھا، میں تو ایک مسافر بھیڑیا ہوں، میں مصر کے مضافات سے آرہا ہوں، میرا بھائی گم ہوگیا تھا میں اس کی تلاش میں نکلا تھا، مجھے معلوم نہیں کہ وہ زندہ ہے یا مرگیا، اسی اثناء میں آپ کے بیٹوں نے مجھے شکار کرلیا اور مجھے باندھ کر یہاں لے آئے، اور بے شک انبیاء کا گوشت ہم پر اور تمام وحشی جانوروں پر حرام کردیا گیا ہے، اور اللہ کی قسم! اب میں ایسے شہر میں نہیں ٹھہروں گا جس میں نبیوں کی اولاد وحشی جانوروں پر جھوٹ باندھتی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کو چھوڑ دیا، اور کہا: اللہ کی قسم! تم اپنے خلاف حجت کو پکڑ کر لائے ہو، یہ وحشی جانور اپنے بھائی کو تلاش کرنے کی مہم پر نکلا ہے اور تم نے انسان ہو کر اپنے بھائی کو ضائع کردیا۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۱۳۴۔ ۱۳۳، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں تین بار حضرت یوسف کی قمیص کا ذکر آیا ہے، ایک بار حضرت یوسف کے بھائیوں نے اس پر جھوٹا خُون لگا کر اس قمیص کو حضرت یعقوب کے سامنے پیش کیا، اور دوسری مرتبہ حضرت یوسف زلیخا سے

بھاگ رہے تھے اور عزیز مصر کا سامنا ہوا تو اس کے اہل سے کسی نے گواہی دی کہ یوسف کی قمیص دیکھو' اگر وہ سامنے سے پھٹی ہوئی ہے تو یوسف مجرم ہے اور اگر وہ پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو زلیخا مجرم ہے اور قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی' اور تیسری بار جب حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں کو اپنی قمیص دی اور کہا: یہ قمیص لے جا کر میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو تو ان کی بینائی لوٹ آئے گی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کی بات کا اعتبار نہیں کیا تھا اور کہا تھا کہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے' اس کی کئی وجوہات تھیں: اول اس لیے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف کے خواب کی تعبیر پر یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو فضیلت اور نبوت سے سرفراز فرمائے گا اور ان کے والدین اور ان کے گیارہ بھائی ان کی تعظیم کے لیے ان کو سجدہ کریں گے اور اس تعبیر کے پورے ہونے سے پہلے ان پر موت نہیں آسکتی تھی' دوسرے اس وجہ سے کہ ان کے بھائیوں کے بیان میں تعارض تھا' کبھی وہ کہتے تھے کہ یوسف کو بھیڑیئے نے کھالیا اور کبھی وہ کہتے تھے کہ اس کو کسی نے قتل کر دیا' تیسرے اس وجہ سے کہ جس کو وہ باندھ کر لائے تھے اس نے بتا دیا کہ یہ جھوٹے ہیں اور اس نے حضرت یوسف کو نہیں کھایا اور چوتھے اس وجہ سے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نُورِ نبوت سے جانتے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام زندہ ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے صبر کرنے کے بجائے اپنے بیٹوں کے جُرم کے خلاف تفتیش کیوں نہیں کی؟

حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: پس اب صبرِ جمیل کرنا ہی بہتر ہے۔ امام رازی نے اس مقام پر ایک اعتراض کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر پر تو صبر کرنا واجب ہے' لیکن ظالموں کے ظلم اور سازش کرنے والوں کی سازش پر صبر کرنا واجب نہیں ہے بلکہ ان کے ظلم اور سازش کا ازالہ کرنا واجب ہے' خاص طور پر اس وقت جبکہ کوئی دوسرا ان کے ظلم کا شکار ہو رہا ہو' اور یہاں پر جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا جھوٹ کھل گیا اور ان کی خیانت ظاہر ہو گئی تو اس پر حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیوں صبر کیا اور انہوں نے اس معاملہ کا کھوج لگانے اور اس کی تفتیش کرنے کی پوری کوشش کیوں نہیں کی تاکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں کی طرف سے نازل کردہ مصیبت سے نجات دلائی جاتی اور ان کے بھائیوں سے ان کے ظلم کا بدلہ لیا جاتا' یہ اعتراض اس وجہ سے اور قوی ہو جاتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر کے علم کی وجہ سے یقین تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام زندہ ہیں اور ان کو وحی کے ذریعہ بھی یہ معلوم تھا کہ حضرت یوسف زندہ سلامت ہیں' نیز حضرت یعقوب علیہ السلام اس علاقہ میں ایک معزز اور شریف انسان کی حیثیت سے مشہور تھے' اگر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کا سراغ لانے کی کوشش کرتے تو لوگ بھی آپ کی مدد کرتے' اس سے معلوم ہوا کہ ان حالات میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا حضرت یوسف کے معاملہ میں صبر کرنا عقلاً اور شرعاً درست نہ تھا' اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو علم تھا کہ اللہ تعالیٰ حضرت یوسف کے معاملہ میں ان کو آزمائش میں مبتلا کرنا چاہتا ہے' نیز ان کو قرائن سے معلوم تھا کہ ان کے بیٹے بہت قوی اور زور آور اور خودسر ہیں' ان کو یہ خدشہ تھا کہ اگر انہوں نے ان کے خلاف تفتیش کرنی شروع کی تو اپنے دفاع میں ان کا پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل کر ڈالیں گے' پس حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی اور سلامتی کی خاطر حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان بیٹوں کے خلاف کارروائی نہیں کی اور بڑی مصیبت کے مقابلہ میں چھوٹی مصیبت کو برداشت کر لیا اور ان کے فراق کو ان کی موت پر ترجیح دی' دوسری وجہ یہ تھی کہ اگر حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں کے خلاف تفتیش اور کارروائی کرتے تو لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ حضرت یعقوب

علیہ السلام کے بیٹوں نے اغوا کی واردات کی ہے اور اس میں بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کی سبکی اور بدنامی تھی نیز جب باپ کو یہ معلوم ہوا کہ اس کے ایک بیٹے نے دوسرے بیٹے پر ظلم کیا ہے تو یہ باپ کے لیے سخت عذاب اور تکلیف کا باعث ہے، اگر وہ ظالم بیٹے کو یونہی چھوڑ دے اور اس کو کوئی سزا نہ دے تو مظلوم بیٹے کے لیے اس کا دل جلتا رہے گا اور اگر وہ اس کو قرار واقعی سزا دے تو اس سے بھی اس کو تکلیف ہوگی کیونکہ وہ بھی بہرحال اس کا بیٹا ہے اور جب حضرت یعقوب علیہ السلام اس آزمائش میں مبتلا ہوئے تو انہوں نے اس معاملہ میں صبر اور سکوت کرنا اور اس معاملہ کو اللہ کے حوالے کر دینا ہی بہتر جانا۔

صبرِ جمیل کی تعریف

مجاہد نے کہا: صبرِ جمیل وہ ہے جس میں گھبراہٹ، بے قراری اور بے چینی نہ ہو۔ حبان بن جبلہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صبرِ جمیل کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: یہ وہ صبر ہے جس میں کسی سے شکایت نہ کی جائے۔ ثوری کے بعض اصحاب نے بیان کیا کہ صبر میں تین چیزیں ہیں: اپنا درد کسی سے نہ کہو اور نہ اپنی مصیبت کسی سے بیان کرو اور نہ اپنی تعریف کرو۔ حبیب بن ابی ثابت بیان کرتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بھنویں جھک گئی تھیں، وہ ان کو کپڑے کی ایک دھجی سے اوپر کر رہے تھے، ان سے پوچھا گیا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: میرے غم کو بہت لمبا عرصہ گزر چکا ہے، تب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ اے یعقوب! کیا تم مجھ سے شکایت کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا: اے میرے رب! مجھ سے قصور ہو گیا، تو اس کو معاف فرما دے۔ (جامع البیان جز ۱۲ ص ۲۱۷۔۲۱۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

صبرِ جمیل کے حصول کے اسباب

امام رازی فرماتے ہیں، صبر کی دو قسمیں ہیں: کبھی صبرِ جمیل ہوتا ہے اور کبھی غیر جمیل ہوتا ہے۔ صبرِ جمیل وہ ہے جس میں بندہ کو یہ علم ہو کہ اس مصیبت کو نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، پھر اس کا یہ ایمان ہو کہ اللہ سبحانہ مالک الملک ہے اور مالک اپنی ملک میں جو چاہے تصرف کرے اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے، اور جب اس کے دل میں یہ یقین جاگزین رہے گا پھر وہ اپنی مصیبت کی کسی سے شکایت کرنے سے باز رہے گا۔ شکایت نہ کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کو یہ علم ہوگا کہ اس مصیبت کو نازل کرنے والا حکیم ہے اور عالم ہے اور رحیم ہے اور جب وہ ان صفات سے موصوف ہے تو اس سے جو فعل بھی صادر ہوگا وہ حکمت کے مطابق اور درست ہوگا، پس اس وقت وہ مصیبت پر صبر و سکون سے رہے گا اور اس مصیبت پر اعتراض نہیں کرے گا۔

اور تیسری وجہ یہ ہے کہ جب اس پر یہ منکشف ہوگا کہ اس مصیبت کا نازل کرنے والا حق تعالیٰ ہے تو وہ اس کے نُور کے مشاہدہ میں مستغرق ہو جائے گا اور اس مشاہدہ میں اشتغال اس کو اس مصیبت کی شکایت کرنے سے باز رکھے گا اور ایسا صبر ہی صبرِ جمیل ہے۔

اور جب مصیبت پر صبر اللہ سبحانہ کی تقدیر اور اس کی قضا پر راضی رہنے کی وجہ سے نہ ہو بلکہ کسی اور غرض کی وجہ سے ہو تو پھر یہ صبرِ جمیل نہیں ہوگا۔

اور اس سلسلہ میں ضابطہ یہ ہے کہ انسان کے تمام افعال، اقوال اور اعتقادات اگر اللہ تعالیٰ کی رضا کے طلب کے لیے ہوں تو وہ اچھے اور نیک ہیں ورنہ نہیں، اسی وجہ سے حدیث میں ہے:

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ مجھے ایک کام کے متعلق فتویٰ دیجیے، آپ کے بعد میں اور کسی سے سوال نہیں کروں گا۔ آپ نے فرمایا: تم اپنے دل سے فتویٰ لو خواہ تمہیں مفتی فتویٰ

دیتے رہیں۔

(حلیۃ الاولیاء ج۹ ص ۴۴، تہذیب تاریخ دمشق ج ۳ ص ۲۱۲، اتحاف السادۃ المتقین ج ا ص ۱۶۰، کنز العمال رقم الحدیث: ۲۹۳۴۹)

اور حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے وابصہ! تم نیکی اور گناہ کے متعلق سوال کرنے کے لیے آئے ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں! آپ نے اپنی انگلیاں جمع کر کے ان کو اپنے سینہ پر مارا اور تین بار فرمایا: اپنے نفس سے فتویٰ لو، اپنے دل سے فتویٰ لو، نیکی وہ ہے جس پر تمہارا دل مطمئن ہو اور گناہ وہ کام ہے جو تمہارے دل میں کھٹک رہا ہو اور تمہارے سینہ میں تردد ہو خواہ تمہیں لوگ فتویٰ دیتے رہیں۔

(مسند احمد ج ۴ ص ۲۲۸، سنن دارمی رقم الحدیث: ۲۵۳۳، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۲۷۷۴)

پس اگر کسی کام کو کرنے کے بعد تمہارا دل یہ گواہی دے کہ یہ کام تم نے اللہ کی رضا کے لیے کیا ہے تو وہ نیکی ہے ورنہ نہیں، تاہم یہ ضروری ہے کہ اس انسان کو احکام شرعیہ اور حلال اور حرام کاموں کا علم ہو اور ایسا نہ ہو کہ وہ کسی غیر شرعی کام کو اللہ کی رضا سمجھ کر کرتا رہے، جیسا کہ ہمارے زمانہ میں جاہل صوفیاء کا حال ہے، وہ چیخ چیخ کر اور رو رو کر خضوع اور خشوع سے دُعائیں کرتے ہیں اور وہ اپنی دُعاؤں میں جعلی اور موضوع حدیثیں پڑھتے ہیں اور انہوں نے بہت سی بدعات وضع کرلی ہیں اور ان کو نیک کام سمجھ کر کرتے ہیں اور اپنے خیال میں وہ یہ کام اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں۔

صبرِ جمیل کی اقسام

جس طرح مصائب اور شدائد پر صبرِ جمیل کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی مصیبت کی مخلوق میں سے کسی سے شکایت نہ کرے، اسی طرح غیظ و غضب اور انتقام لینے پر قادر ہونے کے باوجود صبر کرنا اور اپنے دشمن اور مجرم سے بالکل تعرض نہ کرنا اور اس کو معاف کر دینا یہ بھی صبرِ جمیل ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے انتقام لینے پر قادر ہونے کے باوجود ان کو معاف کر دیا، اسی طرح اپنی شہوت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی قدرت کے باوجود خوفِ خدا سے شہوت کے تقاضوں کو ترک کر دینا بھی صبرِ جمیل ہے اور اس میدان کے امام بھی سیدنا حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔

جو شخص شہوت یا غضب کے دواعی اور محرکات میں ڈوبا ہوا ہو اس کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ دنیا میں شہوت کے تقاضوں کو ترک کر دینا بہت آسان ہے اور اس کی بہ نسبت آخرت میں اس کی سزا اور اس کے عذاب کو برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ایک قافلہ آیا تو انہوں نے ایک پانی لانے والے کو بھیجا پس اس نے اپنا ڈول ڈالا، اس نے کہا مبارک ہو، یہ ایک لڑکا ہے، اور انہوں نے یوسف کو مالِ تجارت بنا کر چھپا لیا، اور اللہ ان کے کاموں کو خُوب جاننے والا ہے ○ اور بھائیوں نے یوسف کو (قافلہ والوں سے لے کر) چند درہموں کے بدلہ (ان ہی کے ہاتھ) بیچ دیا، اور وہ یوسف میں (ویسے ہی) رغبت کرنے والے نہ تھے ○ (یوسف: ۲۰-۱۹)

قافلہ والوں کے ہاتھ حضرت یوسف علیہ السلام کو فروخت کرنا

حضرت ابن عباس نے بیان کیا: ایک قافلہ مدین سے مصر کی طرف جا رہا تھا، وہ راستہ بھٹک کر اس علاقہ میں جا پہنچا جہاں وہ کنواں تھا جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کو ڈالا گیا تھا، وہ کنواں آبادی سے کافی دُور تھا، اور اس کا پانی کڑوا تھا۔ جب حضرت یوسف کو اس کنویں میں ڈالا گیا تو اس کا پانی میٹھا ہو گیا، جب وہ قافلہ کنویں کے قریب پہنچا تو انہوں نے ایک شخص کو اس کنویں سے پانی لانے کے لیے بھیجا، اس نے جب کنویں میں ڈول ڈالا تو حضرت یوسف علیہ السلام اس ڈول کی رسی کے ساتھ

لٹک گئے اور جب ڈول ڈالنے والے نے حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے حسن و جمال کو دیکھا تو وہ خوشی سے چلایا: مبارک ہو، یہ ایک حسین و جمیل لڑکا ہے۔ ان کی خوشی کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے انتہائی حسین لڑکا دیکھا تو انہوں نے کہا: ہم اس کو بڑی بھاری قیمت لے کر فروخت کردیں گے اور اس سے ہم کو بہت نفع ہوگا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب حضرت یوسف کو کنویں میں ڈالا تو تین دن کے بعد وہ یہ معلوم کرنے کے لیے اس کنویں پر واپس آئے کہ دیکھیں اب یوسف کا کیا حال ہے؟ اور جب انہوں نے قافلہ کے آثار اور نشانات دیکھے تو اس قافلہ کے پاس گئے اور جب انہوں نے وہاں حضرت یوسف کو دیکھا تو قافلہ والوں سے کہا: یہ ہمارا غلام ہے اور یہ ہمارے پاس سے بھاگ گیا تھا۔ قافلہ والوں نے ان سے کہا: اس غلام کو ہمارے ہاتھ فروخت کردو۔ انہوں نے اس بات کو چھپایا کہ وہ ان کا بھائی ہے اور انہوں نے حضرت یوسف سے عبرانی زبان میں کہا: اگر تم نے ہمارا راز فاش کردیا تو ہم تم کو قتل کردیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ ان کے کاموں کو خوب جاننے والا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب میں ستاروں کو اور سورج اور چاند کو دیکھا کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا اور اس خواب کو بیان کر دیا تو ان کے بھائیوں نے ان پر حسد کیا اور اس خواب کی تعبیر کو باطل کرنے کی سازش کی اور حضرت یوسف علیہ السلام کو سخت مصیبت میں ڈال دیا تاکہ یہ تعبیر پوری نہ ہوسکے اور انہوں نے خواب کی تعبیر کو باطل کرنے کے لیے حضرت یوسف کو جس مصیبت میں ڈالا تھا اللہ تعالیٰ نے اسی مصیبت کو حضرت یوسف کے خواب کے سچا ہونے کا ذریعہ بنادیا، کیونکہ اس واقعہ کے بعد حضرت یوسف مصر پہنچے اور بالآخر مصر کے بادشاہ بن گئے اور ان کے بھائی ان کے محتاج ہو کر ان کے سامنے پیش ہوئے اور ان سب نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا اور یوں ان کے خواب کی تعبیر پوری ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور بھائیوں نے یوسف کو (قافلہ سے لے کر) چند درہموں کے بدلہ (ان ہی کے ہاتھ) بیچ دیا، اور وہ یوسف میں (ویسے ہی) رغبت کرنے والے نہ تھے۔

اس کا معنی یہ ہے کہ قافلے والوں نے حضرت یوسف کو ان سے خرید لیا اور وہ حضرت یوسف میں رغبت کرنے والے نہ تھے، کیونکہ ان کو قرائن سے معلوم ہوگیا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جھوٹے ہیں اور وہ ان کے غلام نہیں ہیں اور ان کو یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے فرزند ہیں اور انہیں حضرت یوسف کے خریدنے سے اللہ تعالیٰ کا خوف دامن گیر تھا اور اس آیت کا معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف کو چند درہموں کے عوض بیچ ڈالا کیونکہ ان کو حضرت یوسف کی قیمت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح حضرت یوسف اس علاقہ سے نکل جائیں، عربی میں شراء کا لفظ لغت اضداد سے ہے، یہ خریدنے اور بیچنے دونوں معنی میں مستعمل ہے، اس لیے اس آیت میں حضرت یوسف کو خریدنے اور حضرت یوسف کو بیچنے کے دونوں معنی ہوسکتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى

اور مصر کے جس شخص نے یوسف کو (قافلہ سے) خریدا تھا، اس نے اپنی بیوی سے کہا اس کو تعظیم و تکریم سے ٹھیراؤ، شاید

اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ۚ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي

یہ ہمیں فائدہ پہنچائے، یا ہم اس کو بیٹا بنالیں گے، اور اسی طرح ہم نے سرزمین (مصر) میں یوسف کے پاؤں

الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ وَاللَّهُ غَالِبٌ

جما دیے، تاکہ ہم ان کو خواب کی تعبیروں کا علم عطا کریں اور اللہ اپنے کام پر

عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٢١﴾ وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ

غالب ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ○ . اور جب وہ پختگی کی عمر کو پہنچے

آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٢﴾ وَرَاوَدَتْهُ

تو ہم نے ان کو فیصلہ کی قوت اور علم عطا کیا۔ اور ہم اسی طرح نیکو کاروں کو جزا دیتے ہیں ○ اور وہ جس

الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ

عورت کے گھر میں تھے اس نے ان کو اپنی طرف راغب کیا اور اس نے دروازے بند کر کے کہا

هَيْتَ لَكَ ۚ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ ۖ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ ۖ إِنَّهُ لَا

جلدی آؤ! یوسف نے کہا اللہ کی پناہ! وہ میری پرورش کرنے والا ہے، اس نے مجھے عزت سے جگہ دی ہے، بے شک

يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٣﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَأَىٰ

ظالم فلاح نہیں پاتے ○ اس عورت نے ان (سے گناہ) کا قصد کر لیا اور انہوں نے (اس سے بچنے کا) قصد کیا، اگر وہ اپنے رب

بُرْهَانَ رَبِّهِ ۚ كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ ۚ إِنَّهُ

کی دلیل نہ دیکھتے (تو گناہ میں مبتلا ہو جاتے) یہ ہم نے اس لیے کیا کہ ہم ان سے بدکاری اور بے حیائی کو دور رکھیں، بے شک وہ

مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ ﴿٢٤﴾ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ

ہمارے مخلص بندوں میں سے ہیں ○ وہ دونوں دروازے کی طرف دوڑے، اس عورت نے ان کی قمیص پیچھے

مِنْ دُبُرٍ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ ۚ قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ

سے پھاڑ ڈالی اور ان دونوں نے اس عورت کے خاوند کو دروازے کے قریب پایا، اس عورت نے کہا اس شخص کی کیا سزا ہونی چاہیے

بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢٥﴾ قَالَ هِيَ

جو آپ کی اہلیہ کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے، سوائے اس کے کہ اس کو قید کیا جائے یا اس کو دردناک عذاب دیا جائے ○ یوسف نے کہا

رَاوَدَتۡنِيۡ عَنۡ نَّفۡسِيۡ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۡ اَهۡلِهَا ۚ اِنۡ كَانَ

اسی نے مجھے اپنی طرف راغب کیا تھا ، اس عورت کے خاندان میں سے ہی ایک شخص نے گواہی دی اگر یوسف کی

قَمِيۡصُهٗ قُدَّ مِنۡ قُبُلٍ فَصَدَقَتۡ وَهُوَ مِنَ الۡكٰذِبِيۡنَ ﴿۲۶﴾ وَ

قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو وہ عورت سچی ہے اور یوسف جھوٹوں میں سے ہے ○ اور

اِنۡ كَانَ قَمِيۡصُهٗ قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ فَكَذَبَتۡ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۲۷﴾

اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو وہ عورت جھوٹی ہے اور یوسف سچوں میں سے ہے ○

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيۡصَهٗ قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنۡ كَيۡدِكُنَّ ؕ اِنَّ

پھر جب اس نے یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی دیکھی تو اس نے کہا یہ تم عورتوں کی سازش ہے ، بے شک

كَيۡدَكُنَّ عَظِيۡمٌ ﴿۲۸﴾ يُوۡسُفُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا ٚ وَاسۡتَغۡفِرِيۡ

تمہاری سازش بہت سنگین ہے ○ یوسف اس سے درگزر کرو اور اے عورت! تم اپنے گناہ کی

لِذَنۡۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنۡتِ مِنَ الۡخٰطِـئِيۡنَ ﴿۲۹﴾ ع

معافی مانگو ، بے شک تم گناہ گاروں میں سے تھیں ○

ع ۳
۹
۱۳

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور مصر کے جس شخص نے یوسف کو (قافلہ سے) خریدا تھا اس نے اپنی بیوی سے کہا اس کو تعظیم و تکریم سے ٹھہراؤ، شاید یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا بنالیں گے، اور اس طرح ہم نے سرزمین (مصر) میں یوسف کے پاؤں جما دیئے تاکہ ہم ان کو خواب کی تعبیروں کا علم عطا کریں، اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (یوسف: ۲۱)

حضرت یوسف علیہ السلام کے خریدار کے متعلق متعدد روایات

مصر کے جس شخص نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدا تھا وہ مصر کا بادشاہ تھا، اس کا لقب عزیز تھا اور اس کا نام قطفیر تھا، یہ سہیلی کا قول ہے اور امام ابن اسحٰق نے کہا اس کا نام اطفیر بن رویحب تھا، اس نے اپنی بیوی کے لیے حضرت یوسف کو خریدا تھا جس کا نام راعیل تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام زلیخا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے عزیز کے دل میں حضرت یوسف کی محبت ڈال دی تھی تو اس نے اپنی اہلیہ کو یہ وصیت کی کہ اس کو تعظیم و تکریم سے ٹھہراؤ، حضرت ابن عباس نے کہا جس شخص نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدا تھا وہ مصر کے بادشاہ کا وزیر قطفیر تھا اور مصر کا بادشاہ الریان بن ولید تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام الولید بن ریان تھا اور یہی راجح قول ہے، وہ عمالقہ کی قوم سے تھا اور ایک قول یہ ہے کہ وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون تھا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے ایک شخص نے فرعون کے دربار میں کہا تھا:

وَلَقَدۡ جَآءَكُمۡ يُوسُفُ مِن قَبۡلُ بِالۡبَيِّنٰتِ۔ اور اس سے پہلے تمہارے پاس یوسف دلائل کے ساتھ آ چکے ہیں۔ (المومن: ۳۴)

اور فرعون چار سو سال تک زندہ رہا تھا' اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون' حضرت یوسف علیہ السلام کے فرعون کی اولاد میں سے تھا اور یہ عزیز جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدا تھا بادشاہ کے خزانوں پر مامور تھا' اس نے حضرت یوسف کو مالک بن دعر سے بیس دینار میں خریدا تھا اور ایک حلہ اور نعلین زائد دی تھیں' اور ایک قول یہ ہے کہ اس نے حضرت یوسف کو قافلہ والوں سے خریدا تھا اور ایک قول یہ ہے کہ قافلہ والوں نے حضرت یوسف کی قیمت بڑھا دی تھی۔ ان کی قیمت میں مشک' عنبر' ریشم' چاندی' سونا' موتی اور جواہر تھے جن کی مالیت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ قطفیر نے مالک بن دعر کو یہ قیمت دے کر حضرت یوسف کو خریدا تھا۔

کنعان سے مصر تک حضرت یوسف علیہ السلام کے پہنچنے کی تفصیل

وہب بن منبہ اور دیگر نے کہا: جب مالک بن دعر نے حضرت یوسف کو ان کے بھائیوں سے خریدا تو انہوں نے ایک دوسرے کو یہ دستاویز لکھ کر دی: مالک بن دعر نے یعقوب کے فلاں فلاں بیٹوں سے یہ غلام بیس درہم کے عوض خرید لیا ہے اور ان کے بھائیوں نے یہ شرط عائد کی تھی کہ یہ بھاگا ہوا غلام ہے اور اس کو زنجیروں اور بیڑیوں میں باندھ کر رکھا جائے' اور انہوں نے اس پر اللہ کو گواہ بنایا تھا' رخصتی کے وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے کہا: اللہ تمہاری حفاظت کرے' ہرچند کہ تم نے مجھے ضائع کر دیا ہے' اللہ تمہاری مدد کرے ہرچند کہ تم نے مجھے رسوا کیا ہے' اور اللہ تم پر رحم کرے اگرچہ تم نے مجھ پر رحم نہیں کیا' انہوں نے حضرت یوسف کو زنجیروں اور بیڑیوں سے باندھ کر ننگے پالان پر بٹھایا یعنی پالان پر کوئی فرش یا بچھونا نہیں تھا' جب وہ قافلہ آل کنعان کی قبروں کے پاس سے گزرا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی والدہ کی قبر کو دیکھا' اور ایک سیاہ فام حبشی ان کے پہرے پر مامور تھا' اس لمحہ وہ غافل ہو گیا تو حضرت یوسف نے اپنے آپ کو اپنی والدہ کی قبر پر گرا دیا اور ان کی قبر پر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ اور ان کی قبر سے گلے لگ گئے اور اضطراب سے کہنے لگے: اے میری ماں! سر اٹھا کر اپنے بیٹے کو دیکھئے' وہ کس طرح زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ گلے میں غلامی کا طوق پڑا ہوا ہے۔ اس کو اس کے بھائیوں نے اس کے والد سے جدا کر دیا' آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہم کو اپنی رحمت کے مستقر میں جمع کر دے' بے شک وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے' ادھر جب اس حبشی نے حضرت یوسف کو پالان پر نہیں دیکھا تو وہ پیچھے دوڑا' اس نے دیکھا کہ وہ ایک قبر کے پاس ہیں' اس نے اپنے پیر سے خاک پر ٹھوکر ماری اور حضرت یوسف کو خاک پر لوٹ پوٹ کر دیا۔ اور آپ کو دردناک مار لگائی۔ حضرت یوسف نے کہا: مجھے مت مارو' اللہ کی قسم میں بھاگا نہیں تھا' میں جب اپنی ماں کی قبر کے پاس سے گزرا تو میں نے چاہا کہ میں اپنی ماں کو الوداع کہوں اور میں دوبارہ ایسا کام نہیں کروں گا جو تم کو ناپسند ہو۔ اس حبشی نے کہا: اللہ کی قسم تو بہت برا غلام ہے' تو کبھی اپنے باپ کو پکارتا ہے اور کبھی اپنی ماں کو پکارتا ہے' تو نے اپنے مالکوں کے سامنے ایسا کیوں نہیں کیا؟ تب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر دعا کی: اے اللہ! اگر تیرے نزدیک میرے یہ کام خطا ہیں تو میں اپنے دادا حضرت ابراہیم' حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے وسیلہ سے دعا کرتا ہوں کہ تو مجھے معاف کر دے اور مجھ پر رحم فرما' تب آسمان کے فرشتوں نے چیخ و پکار کی اور حضرت جبریل نازل ہوئے اور کہا: اے یوسف! اپنی آواز کو پست رکھیں' آپ نے تو آسمان کے فرشتوں کو رلا دیا ہے' کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں زمین کا اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر کر کے اس زمین کو الٹ پلٹ کر دوں! حضرت یوسف نے کہا: اے جبریل ٹھہرو! بے شک اللہ تعالیٰ حلیم ہے جلدی نہیں کرتا' تو جبریل نے زمین پر اپنا پر مارا تو

زمین پر اندھیرا چھا گیا اور گرد و غبار اڑنے لگا، اور سورج کو گہن لگ گیا اور قافلہ اس حال میں تھا کہ کوئی شخص دوسرے کو نہیں پہچان رہا تھا، قافلہ کے سردار نے کہا: تم میں سے کسی نے ضرور کوئی ایسا کام کیا ہے جو پہلے نہیں کیا گیا تھا، میں اتنے طویل عرصہ سے اس علاقہ میں سفر کر رہا ہوں، اور میرے ساتھ کبھی اس قسم کا معاملہ پیش نہیں آیا، تب اس حبشی غلام نے کہا میں نے اس عبرانی غلام کو ایک تھپڑ مارا تھا، تب، اس نے آسمان کی طرف اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور کچھ دعا کی، پتا نہیں اس نے کیا دعا کی، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے ہمارے خلاف دعا کی تھی۔ سردار نے کہا تو نے ہمیں ہلاک کرنے کا سامان کر دیا، اس غلام کو ہمارے پاس لے کر آؤ، وہ حضرت یوسف کو لے کر آیا، سردار نے ان سے کہا اے لڑکے! اس نے تم کو تھپڑ مارا جس کے نتیجہ میں ہم پر وہ عذاب آیا جس کو تم دیکھ رہے ہو، اگر تم بدلہ لینا چاہتے ہو تو تم جس سے چاہو بدلہ لے لو اور اگر تم معاف کر دو تو تم سے یہی توقع ہے۔ حضرت یوسف نے کہا میں اس امید پر اس کو معاف کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمادے گا، تو اسی وقت وہ گرد و غبار چھٹ گیا اور سورج ظاہر ہو گیا اور مشرق اور مغرب میں روشنی پھیل گئی اور وہ سردار صبح و شام حضرت یوسف کی زیارت کرتا تھا اور آپ کی تعظیم و تکریم کرتا تھا حتیٰ کہ حضرت یوسف مصر پہنچ گئے اور آپ نے دریائے نیل میں غسل کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان سے سفر کی تھکاوٹ دور کر دی اور ان کا حسن و جمال لوٹا دیا۔ وہ سردار حضرت یوسف کو لے کر دن میں شہر میں داخل ہوا اور ان کے چہرے کا نور شہر کی دیواروں پر پڑ رہا تھا، انہوں نے حضرت یوسف کو خریدنے کے لیے پیش کیا تو بادشاہ کے وزیر قطفیر نے حضرت یوسف کو خرید لیا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور ایک قول یہ ہے کہ وہ بادشاہ مرنے سے پہلے حضرت یوسف پر ایمان لے آیا تھا اور اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے دین کی اتباع کی، پھر جن دنوں میں حضرت یوسف مصر کے خزانوں پر مامور تھے وہ بادشاہ مر گیا اور اس کے بعد قابوس بادشاہ ہوا، وہ کافر تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کو اسلام کی دعوت دی تو اس نے انکار کر دیا۔

عزیز مصر کی فراست

عزیز مصر نے اپنی اہلیہ سے کہا: یوسف کو تعظیم و تکریم سے ٹھہراؤ، یعنی ان کی رہائش کا عمدہ انتظام کرو، ان کو اچھے کھانے کھلاؤ اور خوبصورت کپڑے پہناؤ، پھر کہا شاید یہ ہم کو فائدہ پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا بنالیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا وہ نامرد تھا اور اس کی اولاد نہیں تھی، اسی طرح امام ابن اسحٰق نے کہا کہ وہ عورتوں سے مقاربت نہیں کرتا تھا اور اس کی اولاد نہیں تھی، اور اس نے جو کہا تھا کہ ہم اس کو بیٹا بنالیں گے تو اس سے اس کی مراد یہ تھی کہ وہ اس کو منہ بولا بیٹا بنالیں گے، اور پچھلی امتوں میں منہ بولے بیٹے بنانے کا عام رواج تھا اور اس طرح اول اسلام میں بھی یہ رواج تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا لوگوں میں سب سے اچھی فراست کا ظہور تین آدمیوں سے ہوا، ایک عزیز مصر تھا جس نے حضرت یوسف کے چہرے سے سعادت کے آثار بھانپ کر کہا شاید یہ ہم کو فائدہ پہنچائے یا ہم اس کو اپنا بیٹا بنالیں گے۔ دوسری حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی تھیں جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام میں شرافت کے آثار دیکھ کر اپنے والد سے کہا:

يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ۔ (القصص: ۲۶)

اے ابا جان! آپ انہیں اجرت پر رکھ لیں، بے شک جن کو آپ اجرت پر رکھیں ان میں بہترین شخص وہ ہے جو طاقت ور اور ایمان دار ہو۔

اور تیسرے شخص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، جنہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں حکمرانی اور جہاں بانی

کی استعداد اور صلاحیت دیکھ کر ان کو اپنے بعد اپنا خلیفہ نامزد کر دیا۔

(جامع البیان جز ۱۲، ص ۲۳۰، معالم التنزیل ج ۲، ص ۳۵۱ الجامع لاحکام القرآن، جز ۹، ص ۱۴۱-۱۳۹، تفسیر ابن کثیر ج ۲، ص ۵۲۴، روح المعانی جز ۲، ص ۳۱۴-۳۱۰)

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ نے لکھا ہے کہ ان میں سے کسی روایت پر قرآن مجید دلالت نہیں کرتا اور نہ کسی صحیح حدیث میں ذکر ہے اور نہ کتاب اللہ کی تفسیر ان میں سے کسی روایت پر موقوف ہے پس صاحب عقل کے لیے ان روایات سے احتراز کرنا زیادہ لائق ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۶، ص ۴۳۵، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

اللہ کے امر کے غالب ہونے کے محامل

اس آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ آیت کے اس حصہ کے متعدد محمل ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ اپنے حکم کو نافذ کرنے پر غالب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جس چیز کا ارادہ فرماتا ہے اس کو کر گزرتا ہے، آسمان اور زمین میں کوئی اس کی قضاء کو ٹال نہیں سکتا اور نہ اس کے حکم کو روک سکتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ حضرت یوسف کے امور اور ان کے معاملات پر غالب ہے، ان کے امور اور ان کے معاملات کا انتظام اللہ کی طرف سے ہے اس میں ان کی اپنی سعی اور کوشش کا دخل نہیں ہے، ان کے بھائیوں نے ان کو ہر قسم کی برائی اور ضرر پہنچانے کی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ نیکی اور بھلائی پہنچانے کا ارادہ کیا پس جو کچھ ہوا وہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اس کی تدبیر کے مطابق تھا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے کہ تمام امور اور معاملات اللہ تعالیٰ کے قبضہ و قدرت میں ہیں اور جو شخص بھی دنیا کے احوال اور عجائب میں غور کرے گا اس کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے اور اللہ تعالیٰ کی قضا غالب ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز غالب نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز پر غالب ہے، وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے متعلق فرماتا ہے: ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔

اور اکثر لوگ نہیں جانتے اس کا معنی یہ ہے کہ اکثر لوگ اس کے غیب پر مطلع نہیں ہیں، بلکہ کوئی شخص بھی از خود غیب کو نہیں جانتا، سوا ان کے جن کو وہ خود کسی غیب پر مطلع فرما دے۔

قصۂ یوسف میں تقدیر کے غالب آنے کی مثالیں

(۴) حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کے سامنے اس خواب کو نہ بیان کریں، پھر اللہ تعالیٰ کا امر اور اس کی تقدیر غالب آ گئی حتیٰ کہ یوسف علیہ السلام نے یہ خواب بیان کر دیا، پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ارادہ کیا تھا کہ وہ حضرت یوسف کو قتل کریں گے، پھر اللہ تعالیٰ کی تقدیر غالب آ گئی حتیٰ کہ حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ بن گئے اور ان سب نے حضرت یوسف کو سجدہ کیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ارادہ کیا تھا کہ وہ اپنے والد کی پوری توجہ اور ان کی محبت کو صرف اپنے لیے حاصل کر لیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کی قضا غالب آ گئی حتیٰ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا دل ان سے بیزار ہو گیا، بھائیوں کا ارادہ یہ تھا کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کر کے نیک اور صالح بن جائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ کی تقدیر غالب آ گئی، وہ اپنے گناہوں کو بھول گئے اور ان پر ڈٹے رہے حتیٰ کہ تقریباً ستر سال کے بعد انہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا اور اپنے والد سے کہا انا کنا خاطئین بے شک ہم خطا

کرنے والے تھے، اور انہوں نے ارادہ کیا تھا کہ جب وہ اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے جائیں گے اور ان کو خون آلود قمیص دکھائیں گے تو وہ اپنے باپ کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کی قضا غالب آ گئی اور ان کے باپ نے ان کی باتوں سے دھوکا نہیں کھایا، اور انہوں نے کہا: بل سولت لکم انفسکم امرا بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات گھڑلی ہے، اور انہوں نے یہ تدبیر کی تھی کہ ان کے باپ کے دل سے حضرت یوسف کی محبت زائل ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ کا امر غالب آ گیا اور ان کے باپ کے دل میں حضرت یوسف کی محبت اور الفت اور زیادہ ہو گئی، اور عزیز مصر کی اہلیہ نے یہ ارادہ کیا تھا کہ وہ عزیز مصر سے شکایت کرنے میں پہل کرے گی تو اس کو حضرت یوسف کے خلاف بدگمان کر دے گی لیکن اللہ کی تقدیر غالب آ گئی اور عزیز مصر نے اپنی اہلیہ کو قصوروار قرار دے دیا اور کہا: استغفری لذنبک انک کنت من الخاطئین اپنے گناہ سے توبہ کرو بے شک تم خطاکاروں میں سے ہو، اور حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانہ سے چھٹکارا پانے کی تدبیر کی اور جس شخص نے قید سے رہا ہو کر بادشاہ کو شراب پلائی تھی اس سے کہا بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا لیکن اللہ کا امر غالب آ گیا اور وہ شراب پلانے والا بادشاہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کرنا بھول گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام مزید کئی سال تک قید خانہ میں رہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب وہ پختگی کی عمر کو پہنچے تو ہم نے ان کو فیصلہ کی قوت اور علم عطا کیا، اور ہم اسی طرح نیکوکاروں کو جزا دیتے ہیں O (یوسف: ۲۲)

پختگی کی عمر میں متعدد اقوال

مجاہد نے کہا: اَشُدَّہٗ (پختگی کی عمر) سے مراد ہے تینتیس (۳۳) سال کی عمر، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تیس اور کچھ سال، ضحاک نے کہا: بیس سال، ایک اور سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اٹھارہ اور تیس سال کے درمیان۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ لکھتے ہیں: اشد کا معنی ہے قوت اور شباب کا اپنی انتہاء کو پہنچ جانا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر بیس سال یا تینتیس سال ہو، اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث میں اس وقت ان کی عمر کی تعیین کی تصریح نہیں ہے اور نہ ہی عمر کی کسی تعیین پر اجماع امت ہے، اس لیے اس لفظ سے وہی مراد لینا چاہیے، جس طرح اللہ عزوجل نے فرمایا ہے یعنی جب وہ اپنی قوت اور شباب کی انتہاء کو پہنچ گئے۔ (جامع البیان جز ۱۲، ص ۲۳۲-۲۳۱)

حکم اور علم کی تفسیر میں متعدد اقوال

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے ان کو حکم اور علم عطا فرمایا، مجاہد نے کہا یعنی نبوت سے پہلے عقل اور علم عطا فرمایا۔

(جامع البیان جز ۱۲، ص ۲۳۲-۲۳۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام عبد الرحمٰن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں: حکم کی تفسیر میں چار قول ہیں:

(۱) مجاہد نے کہا حکم سے مراد فقہ اور عقل ہے۔ (۲) ابن السائب نے کہا حکم سے مراد نبوت ہے (۳) زجاج نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کو حکیم بنا دیا گیا اور زجاج نے کہا ہر عالم حکیم نہیں ہوتا، حکیم وہ عالم ہوتا ہے جو اپنے علم کو استعمال کرے اور اس سے جہل کا استعمال کرنا ممتنع ہو۔ (۴) ثعلبی نے کہا حکم سے مراد ہے صحیح اور درست بات کہنا، ارباب لغت نے کہا عرب کے نزدیک حکم وہ قول ہے جس میں جہل اور خطاء نہ ہو اور نفس جس چیز کی خواہش کرے اور اس میں ضرر ہو تو وہ

اس خواہش کو رد کردے اور اسی وجہ سے حاکم کو حاکم کہتے ہیں کیونکہ وہ ظلم اور کج روی سے روکتا ہے۔
اور علم کی تفسیر میں دو قول ہیں: (۱) فقہ (۲) خواب کی تعبیر کا علم۔
(زاد المسیر ج ۴، ص ۲۰۱ - ۲۰۰، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں حکم اور علم کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں:

(۱) حکم اور حکمت کا اصل میں معنی ہے نفس کو اس کی خواہش سے روکنا اور جو کام انسان کے لیے نقصان دہ ہو اس سے منع کرنا، اور حکم سے مراد حکمت عملیہ ہے اور علم سے مراد حکمت نظریہ ہے اور حکمت عملیہ کو حکمت علمیہ پر اس لیے مقدم فرمایا ہے کہ ریاضت کرنے والے پہلے حکمت عملیہ میں مشغول ہوتے ہیں پھر اس سے ترقی کر کے حکمت علمیہ تک پہنچتے ہیں، اور مفکرین پہلے حکمت نظریہ کو حاصل کرتے ہیں اس کے بعد حکمت عملیہ کو حاصل کرتے ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کا طریقہ پہلا تھا، کیونکہ پہلے انہوں نے مصائب اور مشکلات پر صبر کیا پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر مکاشفات کے دروازے کھول دیئے اور فرمایا: ہم نے ان کو حکم اور علم عطا فرمایا۔ (حکمت عملیہ سے مراد ہے نفس کو برائیوں سے بچانا اور نیکیوں سے آراستہ کرنا اور حکمت علمیہ سے مراد ہے نفس الامر اور واقع کے حقائق کا علم اور ادراک)

(۲) حکم سے مراد ہے نبوت کیونکہ نبی مخلوق پر حاکم ہوتا ہے اور علم سے مراد ہے دین اور شریعت کا علم۔

(۳) حکم سے مراد ہے نفس مطمئنہ کا نفس امارہ پر حاکم ہونا، حتیٰ کہ قوت شہوانیہ اور قوت غضبیہ مغلوب اور مقہور ہو جائیں، اور عالم قدس سے انوار الٰہیہ کا جو ہر نفس پر فیضان ہو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے ان کو حکم اور علم عطا فرمایا، اس میں یہ اشارہ ہے کہ ان کی قوت عملی اور قوت علمی دونوں کامل ہو چکی تھیں۔
(تفسیر کبیر ج ۶، ص ۴۳۷، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ قرطبی نے کہا اگر ان کو بچپن میں نبوت دی گئی تھی تو اس سے مراد ہے ان کے علم اور فہم میں زیادتی فرمائی۔
(الجامع لاحکام القرآن جز ۹، ص ۱۴۲)

محسنین کی تفسیر میں متعدد اقوال

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم اسی طرح محسنین (نیکو کاروں) کو جزا دیتے ہیں۔ امام ابن جوزی نے کہا محسنین کی تفسیر میں تین قول ہیں: (۱) مصائب اور مشکلات پر صبر کرنے والے۔ (۲) ہدایت یافتہ لوگ (۳) مومنین۔

امام محمد بن جریر طبری نے کہا اگرچہ اس آیت کا ظاہر معنی یہ ہے کہ ہم ہر محسن کو جزا دیتے ہیں لیکن اس سے مراد سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، یعنی جس طرح حضرت یوسف کو مصائب اور مشکلات میں مبتلا کرنے کے بعد ہم نے ان کو زمین میں اقتدار دیا اور علم عطا فرمایا اسی طرح ہم آپ کے ساتھ معاملہ کریں گے اور آپ کو آپ کی قوم کے مشرکین سے نجات عطا فرمائیں گے اور آپ کو زمین پر اقتدار عطا فرمائیں گے اور آپ کے علوم میں اضافہ فرمائیں گے۔ (زاد المسیر ج ۴، ص ۲۰۱)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور وہ جس عورت کے گھر میں تھے اس نے ان کو اپنی طرف راغب کیا اور اس نے دروازے بند کر کے کہا جلدی آؤ۔ یوسف نے کہا اللہ کی پناہ! وہ میری پرورش کرنے والا ہے اس نے مجھے عزت سے جگہ دی ہے، بے شک ظالم فلاح نہیں پاتے O (یوسف: ۲۳)

حضرت یوسف علیہ السلام کی عفت اور پارسائی کا کمال

راودت، رود سے ماخوذ ہے، اس کا معنی ہے نرمی اور حیلے سے کسی چیز کو بار بار طلب کرنا، اس کا معنی یہ ہے کہ عزیز مصر کی

بیوی نرمی اور لوچ دار باتوں سے کافی عرصہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اس معنی کو یوں بھی تعبیر کیا جا سکتا تھا کہ عزیز مصر کی بیوی نے ان کو اپنی طرف راغب کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو اس طرح تعبیر فرمایا کہ وہ جس عورت کے گھر میں تھے، اس نے ان کو اپنی طرف راغب کیا، اس میں نکتہ یہ ہے کہ جو شخص کسی کے گھر میں رہتا ہو، اس کے زیر احسان ہو وہ اس کا ماتحت ہوتا ہے اور گھر والے کا اس پر مکمل تسلط اور اقتدار ہوتا ہے سو حضرت یوسف علیہ السلام اس کی مکمل دسترس میں تھے اور ان کے لیے اس کی فرمائش سے انکار کرنا بہت مشکل تھا لیکن ان پر خوف خدا کا اس قدر غلبہ تھا کہ باوجود اس بات کے کہ وہ عزیز مصر کی بیوی کے زیر احسان تھے، اور اس کے زیر اقتدار اور زیر تسلط تھے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کی معصیت میں اس کی فرمائش پوری کرنے سے صاف انکار کر دیا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جب اس معنی کو اس طرح تعبیر فرمایا اور وہ جس عورت کے گھر میں تھے اس نے ان کو اپنی طرف راغب کیا تو اس پیرائے میں تعبیر کرنے سے حضرت یوسف علیہ السلام کی کمال نزاہت ظاہر ہوئی جو اس طرز سے واضح نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر یوں کہا جاتا کہ عزیز مصر کی بیوی نے ان کو اپنی طرف راغب کیا اور اس سے اللہ تعالیٰ کے کلام کی معجز نظام بلاغت کا اظہار ہوتا ہے۔

عزیز مصر کی بیوی کا حضرت یوسف کو ورغلانا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام مصر میں جس عورت کے گھر میں تھے، اس کے خاوند نے اس کو یہ تاکید کی تھی کہ وہ حضرت یوسف کو بہت تعظیم اور تکریم کے ساتھ رکھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام بہت حسین اور جمیل تھے اور وہ جوانی کی عمر کو پہنچ چکے تھے، جب وہ عورت حضرت یوسف علیہ السلام کو سات کمروں کے پیچھے ایک کوٹھڑی میں لے گئی اور ہر کمرہ کا دروازہ بند کر کے تالا لگاتی چلی گئی پھر حضرت یوسف کو اپنے نفس کی طرف راغب کرنے کے لیے کہنے لگی: اے یوسف! تمہارے بال کتنے حسین ہیں۔ حضرت یوسف نے فرمایا: سب سے پہلے میرے جسم سے یہ بال الگ ہوں گے۔ اس نے کہا: تمہاری آنکھیں کتنی حسین ہے، آپ نے فرمایا: سب سے پہلے میرے جسم سے یہ آنکھیں بہہ جائیں گی۔ اس نے کہا: تمہارا چہرہ کتنا حسین ہے، آپ نے فرمایا: اس کو مٹی کھا جائے گی۔ اس نے کہا: تمہاری صورت کتنی اچھی ہے، آپ نے فرمایا: میرے رب نے یہ صورت رحم میں بنائی تھی۔ اس نے کہا: اے یوسف! تمہاری صورت میرے جسم میں حلول کر چکی ہے، آپ نے فرمایا: اس میں شیطان تمہاری معاونت کر رہا ہے۔ اس نے کہا: میں نے تمہارے لیے ریشم کا بستر بچھا دیا ہے، اٹھو اور میری خواہش پوری کرو۔ آپ نے فرمایا: پھر جنت سے میرا حصہ جاتا رہے گا۔ اس نے کہا: میرے ساتھ چھپ جاؤ، آپ نے فرمایا: میرے رب سے کوئی چیز نہیں چھپ سکتی۔ وہ اسی طرح آپ کو مائل کرتی رہی اور آپ اس سے گریز فرماتے رہے۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۴۷۵، الوسیط ج ۲، ص ۶۰۷، معالم التنزیل ج ۲، ص ۳۵۲، الجامع لاحکام القرآن جز ۹، ص ۱۴۵)

امام ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ، امام واحدی متوفی ۴۶۸ھ، امام بغوی متوفی ۵۱۶ھ اور علامہ قرطبی متوفی ۶۶۸ھ نے حضرت یوسف علیہ السلام اور عزیز مصر کی بیوی کے درمیان یہ مکالمہ اسی طرح بیان کیا ہے، اگرچہ اس مکالمہ کے بعض اجزا ہمارے لیے ناقابل فہم ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے جسم کے کھانے کو زمین پر حرام کر دیا ہے اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ ان کی آنکھیں زمین میں بہہ جائیں گی اور ان کے چہرے کو مٹی کھا جائے گی، موجب اشکال ہے، اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس کی یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی ذات سے عام انسان کا ارادہ کیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب!

مخلوق کی بہ نسبت خالق سے حیا کرنا لائق ستائش ہے

جب عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: اللہ کی پناہ! وہ میری پرورش کرنے والا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے حضرت یوسف کی مراد یہ تھی کہ وہ عزیز مصر میری پرورش کرنے والا ہے' اس نے مجھ پر بہت احسان کیے ہیں اور میری تعظیم و تکریم کرنے کا حکم دیا پھر یہ کس قدر احسان ناشناسی' ناشکری اور حیا سوز بات ہو گی کہ میں ایسے بے لوث محسن کی بیوی کے ساتھ بدکاری کروں اور اس کی عزت پر ہاتھ ڈالوں اور دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت یوسف کی مراد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ میری پرورش کرنے والا ہے' اس نے مجھے بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں تو میں اپنے رب کی نافرمانی کروں اور گناہ کا ارتکاب کروں' میں اس چیز سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتا ہوں! ہمارے نزدیک یہ دوسری تفسیر راجح ہے کیونکہ مخلوق سے حیا کر کے گناہ سے باز رہنے کی بہ نسبت یہ زیادہ قابل ستائش بات ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے ڈر اور اس کے خوف اور اس سے حیا کر کے گناہ سے باز رہے اور پیغمبر کی شان کے لائق یہی دوسری چیز ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے جوابات کی وضاحت

حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی بیوی کے جواب میں تین باتیں ذکر کیں' پہلے فرمایا: معاذ اللہ! میں اس گناہ کے ارتکاب سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں' اور میں اللہ کے احکام کی اطاعت کرتا ہوں' اگرچہ تم نے مجھ پر بہت احسان کیے ہیں اور مجھے بہت تعظیم اور تکریم کے ساتھ رکھا ہے لیکن تم سے کہیں زیادہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کے احسان ہیں اور مجھ پر تمہارے حکم کو ماننے کی بہ نسبت اللہ تعالیٰ کے حکم کو ماننے کا زیادہ حق ہے' پھر فرمایا: وہ میری پرورش کرنے والا ہے۔ مشہور تفسیر کے مطابق اس سے عزیز مصر کو مراد لیا جائے تو معنی اس طرح ہو گا کہ مخلوق کے حق کی رعایت کرنا بھی واجب ہے اور عزیز مصر نے مجھ پر بہت احسان کیے ہیں۔ اب ان احسانات کا بدلہ میں میں اس کی عزت کو پامال کروں تو یہ کس قدر بری بات ہو گی' پھر فرمایا: بے شک ظالم فلاح نہیں پاتے' اس کا معنی یہ ہے کہ انسان پر واجب ہے کہ وہ اپنے آپ کو ضرر سے بچائے' تم جس گناہ کی دعوت دے رہی ہو' اس کی لذت بہت کم ہے اور بہت کم وقت کے لیے ہے اور اس کے نتیجہ میں دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت کا عذاب ہے اور جب قلیل لذت کے مقابلہ میں ضرر شدید ہو تو پھر اس لذت کو ترک کرنا واجب ہے' اور اگر اس لذت کو ترک نہ کیا تو آخرت میں فلاح حاصل نہیں ہو گی۔ اس کی دوسری تقریر یہ ہے کہ ظلم کا معنی ہے کسی چیز کو اس جگہ رکھنا جو اس کا صحیح اور جائز محل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مرد میں جو شہوت رکھی ہے' اس کو خرچ کرنے کا جائز اور صحیح محل اس کی منکوحہ ہے' اگر کوئی شخص اپنی شہوت کو اپنی منکوحہ کے بجائے کسی اور عورت میں خرچ کرے تو یہ ظلم ہے اور ایسا کرنے والا ظالم ہو گا اور ظالم فلاح نہیں پاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ظالموں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے' سو اس حسین ترتیب کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی بیوی کو یہ حکیمانہ اور ناصحانہ جوابات دیئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اس عورت نے ان (سے گناہ) کا قصد کر لیا' اور انہوں نے (اس سے بچنے کا) قصد کیا' اگر وہ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے (تو گناہ میں مبتلا ہو جاتے) یہ ہم نے اس لیے کیا تاکہ ہم اس سے بدکاری اور بے حیائی کو دُور رکھیں' بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہیں ○ (یوسف: ۲۴)

"ھم" کا لغوی اور اصطلاحی معنی اور اس کے متعلق حدیث

علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں: ھم اس فکر کو کہتے ہیں جس سے انسان گھل جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے ھممت الشحم میں نے چربی کو پگھلا دیا ہے اور ھم کا معنی ہے دل میں کسی چیز کا قصد کرنا' قرآن مجید میں ہے:

اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ۔ جب ایک قوم نے یہ قصد کیا کہ وہ (لڑنے کے لیے) تمہاری طرف ہاتھ بڑھائیں۔ (المائدہ: ۱۱)

(المفردات ج ۲، ص ۷۰۹، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

دل میں اچانک کسی چیز کا خیال آ جائے تو اس کو ھاجس کہتے ہیں اور اگر بار بار کسی چیز کا خیال آئے تو اس کو خاطر کہتے ہیں اور جب دل اس چیز کے متعلق سوچنا شروع کر دے اور اس کے حصول کا منصوبہ بنانے لگے تو اس کو حدیث نفس کہتے ہیں اور جب اس کام کو کرنے کا راجح اور غالب قصد ہو اور مرجوح اور مغلوب قصد نہ کرنے کا ہو کہ مبادا اس میں کوئی خطرہ ہو اس کو ھم کہتے ہیں اور جب کام نہ کرنے کی مغلوب اور مرجوح جانب بھی ختم ہو جائے اور انسان یہ پکا قصد کر لے کہ میں نے یہ کام کرنا ہے، خواہ فائدہ ہو یا نقصان تو اس کو عزم اور نیت کہتے ہیں، اور انسان اسی عزم کا مکلف ہے۔ اگر گناہ کا ھم کیا جائے تو اس پر مواخذہ نہیں ہوتا لیکن اگر گناہ کا عزم اور اس کی نیت کی جائے تو اس پر مواخذہ ہوتا ہے۔

(جمل ج ۱، ص ۲۳۶، مرقات ج ۱، ص ۲۴۳)

ھم کے متعلق یہ حدیث ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے: جب میرا بندہ نیکی کا ھم (قصد) کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو میں اس کی ایک نیکی لکھ دیتا ہوں اور جب وہ اس نیکی پر عمل کرے تو میں اس کی دس سے لے کر سات سو تک نیکیاں لکھ دیتا ہوں اور اس کی دگنی تک اور اگر میرا بندہ معصیت کا ھم (قصد) کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو میں اس کی وہ معصیت نہیں لکھتا اور اگر وہ اس معصیت پر عمل کرے تو میں اس کی صرف ایک معصیت لکھتا ہوں۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۲۸، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۵۰۱، مسند احمد ج ۲، ص ۲۴۲، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۱۷۹، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۶۲۸۲، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۳۸۰، شرح السنہ رقم الحدیث: ۴۱۴۸)

وھم بھا کے ترجمہ کے دو محمل

عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف کے ساتھ گناہ کا قصد کر لیا تھا اور وھم بھا کا ہمارے نزدیک مختار معنی یہ ہے کہ حضرت یوسف نے اس گناہ سے اپنا دامن بچانے کا قصد کیا اور اگر وہ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے تو گناہ میں مبتلا ہو جاتے اور جمہور مفسرین کے نزدیک اس آیت کا معنی اس طرح ہے کہ حضرت یوسف بھی گناہ کا ارادہ کر لیتے اگر وہ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے بہرحال اگر یہ معنی بھی ہو تو اپنے رب کی دلیل نہ دیکھنے کی تقدیر پر حضرت یوسف علیہ السلام سے جو قصد صادر ہوتا وہ ھم کے درجہ میں ہوتا اور گناہ کا عزم نہ ہوتا اور جو چیز ممنوع اور معصیت ہے وہ گناہ کا عزم ہے نہ کہ گناہ کا ھم۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنی عصمت میں اس قدر راسخ تھے اور اپنی ذات میں اس قدر کامل اور مکمل تھے کہ ایک حسین اور صاحب اقتدار عورت نے ان کو اپنی طرف راغب کرنے کی پوری کوشش کی اور ان کو حصول لذت کی دعوت دی لیکن انہوں نے خوف خدا کے غلبہ سے اس کی دعوت کو مسترد کر دیا اور ایسے ہی پاکبازوں کے متعلق حدیث میں یہ نوید ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس دن کسی کا سایہ نہیں ہوگا اس دن سات آدمی اللہ کے سائے میں ہوں گے: امام عادل، وہ شخص جو اپنے رب کی عبادت میں جوان ہوا، وہ شخص جس کا دل مسجد میں معلق رہتا ہے، وہ دو آدمی جو اللہ کی محبت میں ملیں اور اللہ کی محبت میں الگ ہوں، اور وہ آدمی جس کو کسی صاحب منصب اور

صاحب جمال عورت نے گناہ کی دعوت دی ہو اور وہ کہے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور وہ شخص جو چھپا کر صدقہ دے حتیٰ کہ بائیں ہاتھ کو پتا نہ چلے کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے اور وہ آدمی جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٦٦٠، صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٠٣١، موطا امام مالک رقم الحدیث: ٢٠٠٥، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ٧٣٣٨، سنن کبریٰ للبیہقی ج١٠ ص٨٧، کتاب الاسماء والصفات ص١٧٠-٣٧٣، شرح السنہ رقم الحدیث: ٤٧٠، سنن ترمذی رقم الحدیث: ٢٣٩١، مسند احمد ج٢، ص٤٣٩، صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: ٣٥٨، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ٦٣٢٠، شعب الایمان رقم الحدیث: ٧٤٩٤، تاریخ بغداد ج١٢، ص٢٣٩، ج٩، ص٢٥٤-٢٥٣)

آیا حضرت یوسف علیہ السلام سے گناہ صادر ہوا تھا یا نہیں؟

بعض متقدمین مفسرین نے ایسی روایات لکھی ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے زنا کا ارتکاب تو نہیں کیا تھا لیکن زنا کے تمام مقدمات میں ملوث ہو گئے تھے (ہم ایسی روایات اور خرافات سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں) اور انہوں نے دلائل سے اپنے اس مکروہ موقف کو ثابت کیا ہے، ہم پہلے ان روایات کو رمز اور کنایہ سے درج کریں گے کیونکہ ان کو بعینہٖ درج کرنے سے ہمارا دل لرزتا ہے اور ہم میں ان کو اسی طرح درج کرنے کی ہمت نہیں ہے، پھر ان روایات کے ثبوت میں ان کے دلائل کا ذکر کریں گے اور پھر ان کا رد کریں گے۔

وھم بھا کی باطل تفسیریں

امام ابوالحسن علی بن احمد الواحدی نیشاپوری متوفی ٤٦٨ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ھم (قصد) کی کیا کیفیت تھی؟ انہوں نے کہا وہ عورت چت لیٹ گئی اور حضرت یوسف بیٹھ گئے۔ (اس کے آگے حیا سوز عبارت ہے) اور یہ سعید بن جبیر، ضحاک، سدی، مجاہد، ابن ابی بزہ، اعمش اور حسن بصری کا قول ہے اور یہی متقدمین کا قول ہے اور متاخرین نے دونوں قصدوں میں فرق کیا ہے۔ ابوالعباس احمد بن یحییٰ نے کہا اس عورت نے گناہ کا قصد کیا اور وہ اپنے قصد پر ڈٹی رہی، اور حضرت یوسف نے بھی معصیت کا قصد کر لیا تھا، لیکن انہوں نے معصیت کا ارتکاب نہیں کیا اور نہ اس پر اصرار کیا پس دونوں کے ھم (قصد) میں فرق ہے، اور ابن الانباری نے اس کی شرح میں کہا اس عورت نے زنا کا عزم کیا اور حضرت یوسف کے قلب میں معصیت کا خطرہ ہوا اور حدیث نفس بھی عارض ہوئی لیکن ان کے اس ھم (قصد) پر گناہ لازم نہیں آیا، جیسے کسی نیک شخص نے سخت گرمی کے دنوں میں روزہ رکھا ہوا ہو اور اس کو ٹھنڈا اور میٹھا پانی دکھائی دے اور اس کے دل میں پانی پینے کا خیال آئے اور وہ اس کا منصوبہ بھی بنائے لیکن وہ خوف خدا کی وجہ سے پانی نہ پیئے تو اس سے اس بات پر مواخذہ نہیں ہوگا کہ اس کے دل میں پانی پینے کا خیال کیوں آیا تھا۔

زجاج نے کہا: مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت یوسف نے گناہ کا ھم (قصد) کر لیا تھا اور جس طرح مرد عورت کے ساتھ اس کام کو کرنے کے لیے بیٹھتا ہے وہ اس طرح بیٹھ گئے تھے، کیونکہ انہوں نے کہا تھا:

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O (یوسف: ٥٣)	اور میں اپنے نفس کو بے قصور نہیں کہتا بیشک نفس تو برائی کا بہت حکم دینے والا ہے سوا اس کے جس پر میرا رب رحم فرمائے، بیشک میرا رب بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

ابن الانباری نے کہا: اس آیت کی تفسیر میں صحابہ اور تابعین سے جو روایات ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ حضرت یوسف نے گناہ کا قصد کر لیا تھا اور وہ اس کو ان کا عیب نہیں شمار کرتے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے گناہ کا قصد کرنے کے باوجود اپنے آپ کو نفس کی خواہش پوری کرنے سے روکا، اور ان کا یہ اقدام محض اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کے احکام کی تعظیم کی وجہ سے تھا' اور جن لوگوں نے حضرت یوسف کے لیے گناہ کا قصد ثابت کیا ہے' وہ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں اور تابعین میں سے وہب بن منبہ اور ابن سیرین وغیرہم ہیں اور یہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے حقوق اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے بلند درجات کو ان لوگوں کی بہ نسبت بہت زیادہ جاننے والے تھے، جنہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے گناہ کے قصد کی نفی کی ہے۔

حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کے گناہوں کا اس لیے ذکر نہیں فرمایا کہ اس سے ان کا عیب بیان کیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کا اس لیے ذکر فرمایا ہے تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو اور ابو عبید نے کہا: جب اللہ تعالیٰ گناہوں سے انبیاء علیہم السلام کی توبہ قبول فرمالیتا ہے تو وہ تمہاری توبہ تو بہت جلد قبول فرمالے گا، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور وہ بھی اس کا قصد کر لیتے اگر وہ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے۔

لولا ان رابرھان ربہ کی باطل تفسیریں

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عامۃ المفسرین نے یہ کہا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت کی مثال دکھائی گئی کہ وہ اپنی انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں: کیا تم بدمعاشوں کا سا عمل کر رہے ہو حالانکہ تمہارا نام انبیاء علیہم السلام میں لکھا ہوا ہے، پس حضرت یوسف کو یہ سن کر حیا آ گئی۔ حسن بصری نے کہا: حضرت جبریل علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت میں متمثل ہو کر آ گئے تھے اور سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان کے لیے حضرت یعقوب مثالی جسم میں آئے اور ان کے سینہ پر ہاتھ مارا تو ان کی انگلیوں کی پوروں سے شہوت نکل گئی۔ سدی نے کہا کہ حضرت یوسف نے دیکھا کہ حضرت یعقوب اپنے گھر میں کھڑے ہوئے کہہ رہے ہیں: اے یوسف! اس سے بدکاری نہ کرو، تم ایسا شخص جب تک بدکاری نہ کرے وہ اس پرندہ کی طرح ہے جو فضا میں اڑ رہا ہو اور اس کو کوئی پکڑ نہ سکتا ہو اور جب وہ بدکاری کرلے تو وہ اس پرندہ کی مثل ہوگا جو مرنے کے بعد زمین پر گر جائے اور اپنے نفس سے کسی چیز کو دور نہ کر سکے اور مجاہد نے حضرت ابن عباس سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ حضرت یوسف جب اس عورت کے پاس بیٹھ گئے تو ان کے سامنے ایک ہاتھ ظاہر ہوا، جس پر لکھا ہوا تھا:

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (الانفطار: ۱۱) — اور بے شک تم پر نگہبان مقرر ہیں ○ معزز لکھنے والے ○ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔

یہ دیکھ کر حضرت یوسف اٹھ کر بھاگے اور جب ان دونوں کے دلوں سے دہشت دور ہو گئی تو پھر لوٹ آئے وہ لیٹ گئی اور حضرت یوسف بیٹھ گئے، ان کے سامنے پھر بازو اور بغیر جوڑ کے ایک ہاتھ ظاہر ہوا جس پر لکھا ہوا تھا:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۗ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۳۲) — اور زنا کے قریب نہ جاؤ بے شک وہ بے حیائی ہے اور بہت برا راستہ ہے۔

حضرت یوسف پھر اٹھ کر بھاگے اور وہ عورت بھی بھاگی اور جب ان کے دلوں سے دہشت دور ہو گئی تو پھر پہلی حالت پر لوٹ گئے، تب پھر اسی طرح ایک ہاتھ ظاہر ہوا، جس پر لکھا ہوا تھا:

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ○ (البقرہ: ۲۸۱)

اور اس دن سے ڈرو جس دن میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کے کیے ہوئے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

وہ دونوں پھر اٹھ کر بھاگے اور جب ان سے خوف دور ہو گیا تو پھر وہ سابقہ حالت کی طرف لوٹ گئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے جبریل سے کہا: اس سے پہلے کہ میرا بندہ گناہ میں مبتلا ہو جائے اس کو جا کر سنبھال لو، تب حضرت جبریل اپنی انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے آئے اور کہا: اے یوسف! تم جاہلوں کا عمل کر رہے ہو حالانکہ تمہارا نام انبیاء میں لکھا ہوا ہے۔

(الوسیط ج ۲، ص ۶۰۹-۶۰۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ)

وهم بها اور لولا ان رابرهان ربه کی تفسیر میں ان روایات کو درج ذیل مفسرین نے بھی اپنی تصانیف میں درج کیا ہے:

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ (جامع البیان جز ۱۲، ص ۲۵۰-۲۳۹)، امام ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۷، ص ۲۱۲۶-۲۱۲۳)، امام ابو اللیث نصر بن محمد السمرقندی المتوفی ۳۷۵ھ (تفسیر السمرقندی ج ۲، ص ۱۵۷)، امام الحسین بن مسعود البغوی المتوفی ۵۱۶ھ (معالم التنزیل ج ۲، ص ۳۵۴-۳۵۳)، علامہ عبدالرحمن بن علی بن محمد جوزی متوفی ۵۹۷ھ (زاد المسیر ج ۴، ص ۲۰۹-۲۰۳)، علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ، (الجامع لاحکام القرآن جز ۹، ص ۱۴۷-۱۴۶) قاضی بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ نے لولا ان رابرهان ربه کی تفسیر میں ان روایات کو درج کیا ہے (انوار التنزیل مع عنایت القاضی ج ۵، ص ۲۹۰) علامہ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے (الدر المنثور ج ۴، ص ۵۲۵-۵۲۱) میں ان سب روایات کو درج کیا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تمام روایات باطل اور مردود ہیں اور وضاعین نے جعلی سند بنا کر ان روایات کو حضرت ابن عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہم ایسے صحابہ اور اخیار تابعین کی طرف منسوب کر دیا ورنہ ان نفوس قدسیہ کا مرتبہ اس سے بہت بلند ہے کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام ایسے عفت مآب اور مقدس نبی کے متعلق ایسی عریاں اور فحش روایات بیان کرتے۔ غور کیجئے کہ قرآن کریم تو یہ کہتا ہے کہ جب عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دعوت گناہ دی تو انہوں نے فرمایا: اللہ کی پناہ! وہ میری پرورش کرنے والا ہے، اس نے مجھے عزت سے جگہ دی ہے بے شک ظالم فلاح نہیں پاتے۔ (یوسف: ۲۳) اور ان وضاعین نے ایسی ننگی خرافات کو حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا، ہمارے نزدیک قرآن مجید کی یہ ایک آیت ہی ان روایات کے رد اور حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی اور گناہوں سے برأت کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔

ہمارے مفسرین چونکہ روایات جمع کرنے کے دلدادہ ہوتے ہیں اس وجہ سے انہوں نے اپنی تفاسیر میں ان روایات کو درج کر دیا ورنہ ان کے دلوں میں انبیاء علیہم السلام کی عظمت ہم سے بہت زیادہ تھی۔

وهم بها کے اکثر صحیح اور بعض غلط محامل

علامہ ابو الحسن علی بن محمد الماوردی المتوفی ۴۵۰ھ نے لولا ان رابرهان ربه کی تفسیر میں تو یہی وضعی روایات درج کی ہیں لیکن وهم بها کی تفسیر میں بعض صحیح محامل بیان کیے ہیں اور بعض محامل غلط ہیں، ہم اس بحث کو مکمل کرنے کی خاطر ان محامل کا بھی ذکر کر رہے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

حضرت یوسف علیہ السلام کے ہم (قصد) کے متعلق چھ قول ہیں:

(۱) بعض متاخرین نے کہا ہے کہ جب عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش

کی تو حضرت یوسف نے اس کو مارنے کا قصد کیا۔

(۲) قطرب نے کہا: اس عورت نے حضرت یوسف سے اس کام کا قصد کیا' یہ مکمل کلام ہے اس کے بعد نیا جملہ ہے جس میں جزا مقدم ہے اور شرط موخر ہے اور معنی اس طرح ہے: اگر انہوں نے اپنے رب کی برہان نہ دیکھی ہوتی تو وہ بھی اس عورت کا قصد کر لیتے۔

(۳) اس عورت نے قضاء شہوت کا قصد کیا اور حضرت یوسف نے اپنی عفت پر قائم رہنے کا قصد کیا۔

(۴) حضرت یوسف نے جو اس عورت کا ھم کیا تھا وہ عزم اور ارادہ نہ تھا بلکہ وہ فعل اور ترک کا میلان تھا اور حدیث نفس (دل کے خیالات) میں اس وقت کوئی حرج نہیں ہے جب اس کے ساتھ عزم نہ ہو اور نہ اس کے بعد فعل کا ارتکاب ہو۔

(۵) حضرت یوسف کے ھم سے مراد یہ ہے کہ مردوں کے دلوں میں عورتوں کی شہوت سے جو طبعی تحریک ہوتی ہے وہ تحریک ہوئی اگرچہ وہ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھتے ہوں۔

(۶) انہوں نے اس عورت سے بدکاری کا ھم کیا اور اس کا عزم کر لیا' حضرت ابن عباس نے کہا انہوں نے..........

انبیاء علیہم السلام کو گناہ گار قرار دینے کی توجیہات اور ان کا ابطال

علامہ ماوردی نے وھم بھا کا یہ چھٹا محمل جو بیان کیا ہے' یہ قطعاً باطل اور مردود ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کی شان میں گستاخی ہے اور اس روایت کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف نسبت وضعی اور جعلی ہے' ان کا دامن اس جھوٹ اور تہمت سے پاک ہے۔ علامہ ماوردی نے اس باطل قول کو صحیح ثابت کرنے کے لیے حسب ذیل تاویلات کی ہیں:

کہا گیا ہے یہ ھم (قصد) تو معصیت ہے اور انبیاء علیہم السلام کے معاصی کی تین توجیہات ہیں:

(۱) ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے کسی گناہ میں مبتلا کیا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ سے خوفزدہ رہے اور جب بھی اس گناہ کو یاد کرے تو خوب عبادت کرنے کی کوشش کرے اور اللہ تعالیٰ کے عفو اور رحمت کی وسعت پر اعتماد نہ کرے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے ان کو گناہوں میں مبتلا کیا تاکہ جب اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں سے درگزر کرے اور آخرت میں انہیں ان کے گناہوں کی سزا نہ دے تو وہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمت کو پہچانیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو گناہوں میں اس لیے مبتلا کیا تاکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھنے میں اور گناہوں پر توبہ کرنے کے بعد اس معافی کی توقع اور مایوسی کو ترک کرنے میں گناہ گار لوگ ان کو اپنا مقتدا قرار دیں۔

(النکت والعیون ج ۳' ص ۲۵۔ ۲۴' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

تمام انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں' اعلان نبوت سے پہلے اور اعلان نبوت کے بعد ان سے کوئی گناہ صادر نہیں ہوتا' نہ صغیرہ نہ کبیرہ' نہ سہواً' نہ عمداً' نہ صورتاً' نہ حقیقتاً۔ علامہ ماوردی نے انبیاء علیہم السلام کے گناہوں کو ثابت کرنے کی جو تین توجیہات ذکر کی ہیں یہ بھی باطل اور مردود ہیں اور اب ہم حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت پر دلائل پیش کریں گے۔

فنقول وباللہ التوفیق۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف گناہ کی تہمت کا رد اور ابطال

ان روایات میں ہرچند کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف صراحتاً زنا کی نسبت نہیں کی ہے لیکن یہ صراحت کی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس حرام کام کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گئے (معاذ اللہ) اور جو چیز حرام ہو' اس کا مقدمہ بھی حرام ہوتا ہے اور حرام کا ارتکاب گناہ کبیرہ ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام کبائر اور صغائر سے معصوم ہوتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی

عصمت پر ہم نے مفصل دلائل تبیان القرآن ج ۱، ص ۳۶۷-۳۶۵ اور شرح صحیح مسلم ج ۷، ص ۶۹۷-۶۹۵ میں ذکر کیے ہیں۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ان روایات میں جن برے کاموں کی حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف نسبت کی گئی ہے' ان کے رد اور ابطال کے لیے یہ آیت کافی ہے:

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۚ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (یوسف: ۲۳)

اور وہ جس عورت کے گھر میں تھے' اس نے انہیں اپنی طرف راغب کیا اور اس نے دروازے بند کر کے کہا جلدی آؤ! یوسف نے کہا اللہ کی پناہ! وہ میری پرورش کرنے والا ہے اس نے مجھے عزت سے جگہ دی ہے' بیشک ظالم فلاح نہیں پاتے ○

کس قدر رنج اور افسوس کی بات ہے کہ جب عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دعوت گناہ دی تو انہوں نے اس کو سختی سے رد کر دیا اور اپنے رب کے انعام و اکرام کا ذکر کیا اور اس کام کو ظلم قرار دیا' ایسے پاکباز' مقدس اور اللہ سے ڈرنے والے نبی کے متعلق ایسی حیاسوز اور بے ہودہ روایات ذکر کی جائیں۔

حضرت یوسف کی گناہوں سے برأت کے متعلق دوسری آیت یہ ہے:

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۭ (یوسف: ۲۴)

یہ ہم نے اس لیے کیا تاکہ ہم ان کو بے حیائی اور بدکاری سے دور رکھیں۔

ان روایات میں جو فحش افعال حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب کیے گئے ہیں کیا وہ بے حیائی اور بدکاری کے کام نہیں ہیں' کیا اجنبی اور نامحرم عورت کے سامنے ایک مرد کا برہنہ ہونا فحاشی اور بے حیائی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے: ہم نے یوسف کو بے حیائی اور بدکاری سے دور رکھا اور ان وضاعین نے عین بے حیائی اور بدکاری کو اپنی جعلی روایات میں حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب کیا' اور حیرت ان مفسرین پر ہے جنہوں نے ان روایات کو تقویت پہنچانے کے لیے انبیاء علیہم السلام کے لیے پہلے گناہوں کو مانا پھر گناہوں کی توجیہات کیں۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۔ (یوسف: ۲۴)

بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہیں۔

اور جو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے ہیں ان کے متعلق شیطان نے بھی اعتراف اور اقرار کیا ہے کہ وہ ان کو گمراہ نہیں کر سکے گا۔

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ○ (ص: ۸۳'۸۲)

شیطان نے کہا تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو ضرور گمراہ کر دوں گا ماسوا ان کے جو تیرے مخلص بندے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے پاک دامن ہونے پر متعدد شہادتیں

اللہ تعالیٰ کی گواہی سے حضرت یوسف علیہ السلام سے ان گناہوں کی تہمت دور ہو گئی' علاوہ ازیں مخلوق نے بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت پر گواہی دی' کیونکہ اس واقعہ میں جو لوگ مبتلا ہیں ان میں خود حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام اور عزیز مصر کی بیوی ہے' اس کا خاوند ہے' اور عزیز مصر کی بیوی کے خاندان کا گواہ ہے اور سب نے حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی اور پارسائی کو بیان کیا' حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ ۔ (یوسف: ۲۶)

یہ عورت خود مجھے بہکا رہی تھی۔

رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۔ (یوسف: ۳۳)

اے میرے رب! جس کام کی طرف یہ عورتیں مجھے دعوت دے رہی ہیں' اس کی بہ نسبت مجھے قید میں رہنا پسند ہے۔

اور عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کی تہمت سے براءت اس طرح بیان کی:

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ۔ (یوسف: ۳۲)	بے شک میں نے اس کو بہکایا اور اس نے اپنے آپ کو (گناہ سے) بچائے رکھا۔
قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ (یوسف: ۵۱)	عزیز مصر کی بیوی نے کہا اب تو حق بات ظاہر ہو ہی گئی ہے میں نے ہی ان کو بہکایا تھا اور بے شک وہ سچوں میں سے ہیں۔

اور عزیز مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت اس طرح بیان کی:

قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ○ يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ۔ (یوسف: ۲۹-۲۸)	اس نے کہا بے شک یہ تم عورتوں کی گہری سازش ہے، اور یقیناً تمہاری سازش بہت بڑی ہے○ اے یوسف! تم اس بات سے درگزر کرو اور اے عورت! تو اپنے جرم کی معافی طلب کر، بے شک تو ہی خطا کاروں میں سے ہے ○

اور گواہوں نے اس طرح برأت بیان کی:

وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔ (یوسف: ۲۷-۲۶)	اور اس عورت کے خاندان میں سے ایک گواہ نے گواہی دی، اگر ان کا کرتا آگے سے پھٹا ہوا ہے تو عورت سچی ہے اور وہ جھوٹ بولنے والوں میں سے ہیں○ اور اگر ان کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو اس عورت نے جھوٹ بولا اور وہ سچوں میں سے ہیں○

لولا ان را برھان ربہ کو ذکر کرنے کا فائدہ

ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے گناہ کا قصد نہیں کیا تھا بلکہ گناہ سے بچنے کا قصد کیا تھا تو پھر اس کے بعد یہ ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے کہ "اگر وہ اپنے رب کی برہان نہ دیکھتے تو" ہم کہتے ہیں کہ اس کی جزا محذوف ہے اور وہ یہ ہے کہ پھر وہ معصیت میں مبتلا ہو جاتے اور اس کے ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ انہوں نے جو گناہ کا قصد نہیں کیا تھا اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان میں عورتوں کی طرف رغبت کرنے کا مادہ نہیں تھا، یا وہ عورتوں کے ساتھ اس فطری فعل پر قادر نہیں تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں اپنے رب کے دین اور اس کی شریعت کے براہین اور دلائل کا علم تھا اور وہ یہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے نامحرم اور اجنبی عورتوں سے خواہش نفس پوری کرنے کو حرام کر دیا ہے، اور وہ اللہ کے نبی تھے اور نبی کو مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ کا خوف ہوتا ہے پس انہوں نے جو بدکاری اور گناہ سے بچنے کا قصد کیا اس کی یہ وجہ نہیں تھی کہ وہ بدکاری پر قادر نہیں تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اللہ کی شریعت کی برہان سے واقف تھے اور انہیں معلوم تھا کہ اجنبی عورت سے خواہش نفس پوری کرنا حرام ہے۔ امام رازی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصد کا دوسرا محمل یہ ہے کہ عزیز مصر کی بیوی نے آپ سے حصول لذت کا قصد کیا اور آپ نے اس کو اس کام سے منع کرنے اور ڈانٹنے کا قصد کیا، اگر یہ کہا جائے کہ اس صورت میں اس قول کا کیا فائدہ ہو گا کہ "اگر وہ اپنے رب کی برہان نہ دیکھتے تو" اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس پر مطلع کیا کہ اگر آپ نے اس عورت کو حصول لذت سے منع کیا اور ڈانٹا تو یہ آپ کو بدنام کرنے کی کوشش

کرے گی اور آپ کو قید کرادے گی سو آپ کا بدنامی اور قید میں مبتلا ہونا اس فحش کام میں مبتلا ہونے سے بہتر ہے کیونکہ انجام کار آپ کی برأت اور نیک نامی بھی ظاہر ہو جائے گی اور آپ کو قید سے رہائی بھی مل جائے گی اور اگر حضرت یوسف علیہ السلام کو اس چیز کا علم نہ ہوتا تو آپ معصیت میں مبتلا ہو جاتے۔

لولا ان رابرھان ربہ کے مزید محامل

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے رب کی جو برہان دیکھی تھی اس کے دو محمل تو وہ ہیں جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ بھی اس کے کئی صحیح محمل ہیں:

(۱) رب کی برہان سے مراد نبوت ہے جو بے حیائی اور گناہ کے کاموں سے مانع ہوتی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو اس لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ مخلوق کو برے کاموں اور گناہوں سے منع کریں، اگر وہ لوگوں کو برے کاموں سے منع کریں اور وہ خود سب سے بڑی برائی میں ملوث ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کی اس وعید میں داخل ہو جائیں گے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ (الصف: ۳-۲)

اے ایمان والو! ایسی بات تم کیوں کہتے ہو جس پر تم خود عمل نہیں کرتے ○ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناراضگی کا موجب ہے کہ تم ایسی بات کہو جس پر تم خود عمل نہیں کرتے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے یہود کی اس بات پر مذمت کی ہے کہ وہ جو کچھ کہتے تھے اس کے موافق عمل نہیں کرتے تھے، فرمایا:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ۔ (البقرۃ: ۴۴)

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔

اور جو چیز یہود کے حق میں باعث مذمت ہو وہ اس رسول کی طرف کیسے منسوب ہو سکتی ہے جس کی تائید معجزات سے کی گئی ہو۔

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ بتایا گیا تھا کہ شریعت میں زنا حرام ہے اور ان کو اس کے دلائل پر مطلع کیا گیا تھا اور زانی کے لیے دنیا میں جو سزا مقرر کی گئی ہے اور آخرت میں اس پر جو عذاب دیا گیا حضرت یوسف علیہ السلام کو ان تمام امور پر مطلع کیا گیا تھا۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو برے اخلاق سے پاک اور صاف رکھا ہے، بلکہ جو نفوس قدسیہ انبیاء علیہم السلام سے متصل ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو بھی بری عادتوں اور برے کاموں سے محفوظ رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔ (الاحزاب: ۳۳)

اللہ یہی ارادہ فرماتا ہے کہ اے رسول کے گھر والو! وہ تم سے ہر قسم کی ناپاکی کو دور فرمادے اور وہ تمہیں اچھی طرح پاک اور صاف رکھے۔

السوء، الفحشاء اور المخلصین کے معنی

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ ہم نے اس لیے کیا تاکہ ہم ان سے السوء اور الفحشاء کو دور رکھیں، بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہیں۔

السوء اور الفحشاء میں کئی وجہ سے فرق ہے، السوء کا معنی ہے: ہاتھ کا جرم اور الفحشاء کا معنی ہے زنا۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ السوء کا معنی ہے زنا کے مبادی اور مقدمات مثلاً بوس و کنار اور شہوت سے دیکھنا اور الفحشاء کا معنی ہے زنا۔ (تفسیر کبیر) اور تیسرا فرق یہ ہے کہ السوء کا معنی ہے شہوت اور الفحشاء کا معنی ہے بغل گیر ہونا، چوتھا فرق یہ ہے کہ السوء کا معنی ہے بری باتوں کا ذکر اور الفحشاء کا معنی ہے زنا، پانچوں فرق یہ ہے کہ السوء کا معنی ہے اپنے ساتھی کی خیانت کرنا اور الفحشاء کا معنی ہے بے حیائی کا مرتکب ہونا۔ (الجامع لاحکام القرآن)

مخلصین کی قرأت لام کی زیر کے ساتھ بھی ہے اور لام کی زبر کے ساتھ بھی ہے، اگر لام کی زیر کے ساتھ قرأت ہو تو اس سے مراد ہے جن لوگوں نے اخلاص کے ساتھ اللہ عزوجل کی اطاعت کی اور اگر لام پر زبر کے ساتھ قرأت ہو تو اس سے مراد ہے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت کے لیے چن لیا۔ (انوار التنزیل)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہ دونوں دروازے کی طرف دوڑے، اس عورت نے ان کی قمیص پیچھے سے پھاڑ ڈالی اور ان دونوں نے اس عورت کے خاوند کو دروازے کے قریب پایا، اس عورت نے کہا: اس شخص کی سزا کیا ہونی چاہیے جو آپ کی اہلیہ کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے، سوائے اس کے کہ اس کو قید کیا جائے یا اس کو دردناک عذاب دیا جائے○ (یوسف: ۲۵)

عزیز مصر کی بیوی کا حضرت یوسف علیہ السلام پر الزام لگانا

یعنی حضرت یوسف علیہ السلام اور وہ عورت ہر دو شخص ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لیے دروازے کی طرف دوڑے، حضرت یوسف کا ارادہ تھا کہ وہ جلدی سے آگے نکل جائیں تاکہ دروازوں سے باہر جا کر اس عورت کے بچھائے ہوئے بدکاری کے جال سے نکل جائیں اور اس عورت کا ارادہ تھا کہ حضرت یوسف کو نکلنے نہ دے، اس نے حضرت یوسف کو پالیا اور پیچھے سے ان کی قمیص پکڑ کر کھینچی اور زور سے کھینچنے سے وہ قمیص پھٹ گئی، کیونکہ حضرت یوسف بھاگ رہے تھے اور وہ پیچھے سے کھینچ رہی تھی اور اس زورا زوری میں وہ قمیص پیچھے سے پھٹ گئی، اور جب وہ دونوں دروازے سے باہر نکلے تو دروازے کے قریب اس کا شوہر کھڑا تھا، اس عورت نے اپنا جرم چھپانے کے لیے اور حضرت یوسف پر جھوٹا الزام لگانے کے لیے بولنے میں پہل کی اور کہنے لگی اس شخص کی کیا سزا ہونی چاہیے جو آپ کی اہلیہ کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے؟ سوائے اس کے کہ اس کو قید کیا جائے یا اس کو دردناک عذاب دیا جائے یعنی اس کو کوڑے لگائے جائیں۔

عزیز مصر کی بیوی کو حضرت یوسف سے جو شدید محبت تھی اس وجہ سے اس نے پہلے ان کو قید میں ڈالنے کا ذکر کیا پھر اس کے بعد ان کو سزا دینے کا ذکر کیا کیونکہ محب یہ نہیں چاہتا کہ اس کے محبوب کو اذیت پہنچائی جائے، اس عورت نے صراحتاً یہ نہیں کہا کہ یوسف کا میرے ساتھ زنا کا ارادہ تھا بلکہ یوں کہا کہ اس نے میرے ساتھ برائی کا ارادہ کیا تھا، کیونکہ جب اس نے یہ دیکھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی نوجوانی کی عمر، قوت اور زور کے کمال اور شہوت کی انتہاء کے باوجود اپنے آپ کو گناہ میں ملوث ہونے نہیں دیا تو اس کو حیا آئی کہ وہ ان کی طرف صراحتاً زنا کی نسبت کرے اس لیے اس نے کنایہ اور تعریض کے ساتھ کہا کہ اس نے میرے ساتھ برائی کا ارادہ کیا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ کی ترغیب دی اور اپنی طرف مائل کرنا اور رجھانا چاہا اور اس کے جواب میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کو سختی سے منع کیا، ڈانٹا اور مارا تو اس کو اس نے برائی کے ساتھ تعبیر کیا ہو اور اپنے خاوند کے ذہن میں یہ ڈالا ہو کہ حضرت یوسف اس سے بدکاری کرنا چاہتے تھے۔ (زاد المسیر و تفسیر کبیر)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یوسف نے کہا اسی نے مجھے اپنی طرف راغب کیا تھا، اس عورت کے خاندان میں سے ہی ایک شخص نے گواہی دی کہ اگر یوسف کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو وہ عورت سچی ہے اور یوسف جھوٹوں میں سے ہے○

اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو وہ عورت جھوٹی ہے اور یوسف سچوں میں سے ہےO (یوسف: ۲۷-۲۶)

حضرت یوسف علیہ السلام کی تہمت سے برأت اور ان کے صدق کے شواہد

حضرت یوسف علیہ السلام نے ابتداءً اس عورت کا پردہ فاش نہیں کیا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی اپنی عزت اور پاک دامنی پر حرف آ رہا ہے تو پھر انہوں نے حقیقت حال واضح کی، حضرت یوسف علیہ السلام کے صدق اور آپ کی پاک دامنی پر متعدد شواہد تھے' ان میں سے بعض شواہد درج ذیل ہیں:

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام بظاہر عزیز مصر کے پروردہ اور غلام تھے اور جو شخص پروردہ اور غلام ہو' اس کا اپنے مالک پر اس حد تک تسلط اور تصرف نہیں ہوتا اور وہ اس کی عزت اور ناموس پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔

(۲) عزیز مصر اور اس عورت کے چچازاد بھائی نے یہ دیکھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام بہت تیزی سے دروازے کی طرف نکلنے کے لیے بھاگ رہے تھے اور عورت ان کے پیچھے بھاگ رہی تھی' اس سے واضح طور پر پتہ چلتا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس سے جان چھڑانا چاہ رہے تھے اور وہ عورت ان کے درپے تھی' اگر حضرت یوسف علیہ السلام اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والے ہوتے تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا' وہ عورت بھاگ رہی ہوتی اور حضرت یوسف اس کے پیچھے ہوتے۔

میرے استاذ حضرت مفتی محمد حسین نعیمی رحمہ اللہ نے فرمایا: اس عورت نے تو ساتوں کمروں میں تالے لگادیئے تھے اور دروازے بند کردیئے تھے، پھر حضرت یوسف کو اس سے بھاگنے کا موقع کیسے ملا؟ انہوں نے فرمایا: حضرت یوسف علیہ السلام نے دل میں اللہ سے دعا کی: اے اللہ مجھے اس عورت سے بچا! اور اس گناہ سے بچنے کے لیے جو کچھ میں کر سکتا ہوں اور جو کچھ میری قدرت میں ہے' وہ میں کرتا ہوں اور جو میں نہیں کر سکتا وہ تو کردے' سو انہوں نے بھاگنا شروع کیا اور بند کمروں کے دروازے کھلتے چلے گئے اور اللہ تعالیٰ کا ہر معاملہ میں یہی طریقہ ہے' جو کچھ بندہ کر سکتا ہے وہ بندہ کرے اور جو بندہ نہیں کر سکتا' وہ اللہ تعالیٰ کر دیتا ہے۔ دیکھیے غلہ کی پیداوار کے لیے زمین میں ہل چلانا ہوتا ہے' بیج بونا ہوتا ہے' کھیت میں پانی دینا ہوتا ہے' پھر اس کے پکنے کے لیے سورج کی حرارت' ذائقہ کے لیے چاند کی کرنیں' پانی کے حصول کے لیے بارش اور دانے کو بھوسے سے الگ کرنے کے لیے ہواؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ سورج' چاند' بارش اور ہوائیں انسان کی قدرت میں نہیں ہیں' تو جو کام اس کی قدرت میں نہیں ہیں' ان کو اللہ تعالیٰ کر دیتا ہے' بھاگنا حضرت یوسف علیہ السلام کی قدرت میں تھا' انہوں نے بھاگنا شروع کیا اور اللہ تعالیٰ نے بند دروازے کھولنے شروع کیے۔

(۳) عزیز مصر اور اس عورت کے عم زاد نے دیکھا کہ اس عورت نے مکمل طور پر بناؤ سنگھار کیا ہوا تھا اور خود کو بنایا اور سنوارا ہوا تھا جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام پر زینت کا کوئی اثر نہیں تھا' وہ اسی طرح معمول کے مطابق حالت میں تھے' اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کام کی دعوت دینے والی وہ عورت ہی تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام اس سے اپنا دامن بچانے والے تھے۔

(۴) عزیز مصر نے مشاہدہ کیا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام ایک طویل مدت تک ان کے پاس رہے اور انہوں نے ہمیشہ حضرت یوسف علیہ السلام کو صداقت اور شرافت کا پیکر پایا اور کبھی ان میں غیر شائستہ اور غیر متوازن کام نہیں دیکھا اور یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکیزگی کی واضح شہادت ہے۔

(۵) حضرت یوسف علیہ السلام نے نہایت بے باکی سے بے دھڑک اور دو ٹوک الفاظ میں کہا: یہ مجھے اپنی طرف راغب کر رہی تھی جبکہ اس عورت نے مبہم اور مجمل کلام کیا اور کہا: اس شخص کی کیا سزا ہونی چاہیے جو آپ کی اہلیہ کے ساتھ برائی کا

ارادہ کرے، کیونکہ جو مجرم ہوتا ہے وہ بہرحال دل میں ڈرتا ہے۔

(۶) یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس عورت کا خاوند عاجز تھا یعنی نامرد تھا اور اس عورت میں طلب شہوت کے آثار بھرپور تھے لہٰذا اس فتنہ کی اس عورت کی طرف نسبت کرنا ہی زیادہ مناسب تھا، اور چونکہ یہ تمام قرائن حضرت یوسف علیہ السلام کی صداقت پر دلالت کرتے تھے اور اس عورت کو مجرم ثابت کرتے تھے اس لیے عزیز مصر نے توقف اور سکوت کیا کیونکہ اس نے جان لیا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام سچے ہیں اور یہ عورت جھوٹی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی صداقت پر ایک اور دلیل ظاہر فرمائی جس سے یہ قرائن اور قوی ہو گئے اور یہ ظاہر ہو گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس الزام سے بری ہیں اور یہ عورت ہی مجرم ہے اور وہ خارجی شہادت یہ ہے: اس عورت کے خاندان میں سے ہی ایک شخص نے گواہی دی اگر یوسف کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو وہ عورت سچی ہے اور یوسف جھوٹوں میں سے ہے○ اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو وہ عورت جھوٹی ہے اور یوسف سچوں میں سے ہے○ (یوسف: ۲۷-۲۶) اس شاہد کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) ایک نوزائیدہ بچہ جو پالنے میں تھا اس نے یہ گواہی دی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: چار بچوں نے پالنے میں کلام کیا: حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام، صاحب جریج، شاہد یوسف اور فرعون کی بیٹی ماشطہ کا بیٹا۔

(مسند احمد رقم الحدیث: ۲۸۲۲، عالم الکتب و دار الفکر، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۲۵۱۷، جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۶۳۱، تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۵۰۳، حسن، سعید بن جبیر، ضحاک وغیرہم سے بھی اسی طرح مروی ہے، جامع البیان جز ۱۲ ص ۲۵۵-۲۵۳، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۷ ص ۲۱۲۸)

(۲) وہ شاہد اس عورت کا عمزاد تھا اور وہ بہت دانا شخص تھا، اتفاق سے وہ اس وقت عزیز مصر کے ساتھ اس عورت کے پاس جا رہا تھا، اس نے کہا ہم نے دروازے کے پیچھے کچھ آہٹ اور قمیص پھٹنے کی آواز سنی ہے، مگر ہم کو یہ معلوم نہیں کہ کون کس کے آگے تھا، اگر قمیص آگے سے پھٹی ہے تو اے عورت تم سچی ہو اور اگر قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو مرد سچا ہے اور اے عورت تم جھوٹی ہو، پھر جب انہوں نے قمیص کو دیکھا تو وہ پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی۔ (زاد المسیر ج ۴، ص ۲۱۱)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر جب اس نے یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی دیکھی تو اس نے کہا یہ تم عورتوں کی سازش ہے، بے شک تمہاری سازش بہت سنگین ہے○ یوسف اس سے درگزر کرو اور اے عورت! تم اپنے گناہ کی معافی مانگو، بے شک تم گناہ گاروں میں سے تھیں○ (یوسف: ۲۹-۲۸)

عزیز مصر کی بیوی کو معافی مانگنے کی تلقین

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اس گواہ کا قول ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اس عورت کے خاوند یعنی عزیز مصر کا قول ہو، عزیز مصر نے جو حضرت یوسف علیہ السلام سے یہ کہا کہ اے یوسف! تم اس سے درگزر کرو، اس سے اس کی مراد یہ تھی کہ اس بات کو مخفی رکھو اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا، کیونکہ اگر یہ بات پھیل جاتی تو اس سے عزیز مصر کی بدنامی ہوتی، کیونکہ اگر کسی شخص کی بیوی بدچلن ہو تو یہ اس شخص کے لیے موجب عار ہوتا ہے اور جب حضرت یوسف علیہ السلام کا بے قصور ہونا اور اس عورت کا مجرم ہونا ظاہر ہو گیا تو اس گواہ نے کہا کہ تم اپنے خاوند سے معافی مانگو کیونکہ تم نے اس کی امانت میں خیانت کرنے کی جسارت کی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے خاوند نے کہا ہو کہ تم اپنے گناہ کی اللہ سے معافی مانگو، کیونکہ اگرچہ وہ لوگ کافر اور بت پرست تھے لیکن اللہ تعالیٰ کو ماننے والے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانہ میں فرمایا تھا:

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ — کیا الگ الگ کئی معبود بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب

الْقَهَّارُ ۝ (یوسف: ۳۹)

-۴-

عزیز مصر نے اپنی بیوی سے کہا: بے شک تم گناہ گاروں میں سے تھیں، اس کے خاوند نے اپنی بیوی کی طرف گناہ کی نسبت کی اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خاوند کو ابتداء ہی سے یہ معلوم تھا کہ قصوروار اور خطاکار اس کی بیوی ہے نہ کہ حضرت یوسف علیہ الصلوۃ والسلام، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی غلط حرکتیں کرتی رہتی ہے۔ بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کے خاوند میں غیرت کا مادہ بہت کم تھا ورنہ اگر اس میں غیرت اور حمیت ہوتی تو وہ ایسی بدچلن اور بدقماش عورت کو قتل کر دیتا یا اس کو بہت سخت اور عبرت ناک سزا دیتا پھر طلاق دے کر گھر سے نکال دیتا لیکن اس نے صرف اس پر اکتفا کیا کہ بیوی سے یہ کہا کہ تم اپنے گناہ کی معافی مانگو۔ علامہ قرطبی نے کہا ہے کہ مصریوں میں غیرت کا مادہ کم ہوتا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے غیرت کا مادہ سلب کر لیا ہو۔

عورتوں کے مکر کا عظیم ہونا

عزیز مصر یا اس عورت کے عم زاد نے کہا: تم عورتوں کی سازش بہت عظیم ہوتی ہے، اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے:

وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا۔ (النساء: ۲۸) — اور انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

پس جب انسان فی نفسہٖ ضعیف ہے تو انسان کی ایک صنف یعنی عورت کا مکر اور ان کی سازش عظیم کیسے ہو گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کی خلقت فرشتوں، جنات، آسمانوں، سیاروں اور پہاڑوں کی بہ نسبت ضعیف ہے اور عورتوں کا مکر اور ان کی سازش مردوں کے مکر اور ان کی سازش کے مقابلہ میں عظیم ہوتی ہے، اس کی تائید اس حدیث میں ہے:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر یا عید الاضحیٰ کی نماز پڑھانے کے لیے عید گاہ میں تشریف لے گئے، جب آپ عورتوں کے پاس سے گزرے تو آپ نے عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا: اے خواتین! تم صدقہ کیا کرو، کیونکہ مجھے یہ دکھایا گیا ہے کہ اہل دوزخ میں تمہاری تعداد بہت زیادہ ہے۔ عورتوں نے پوچھا: یارسول اللہ! وہ کس وجہ سے؟ آپ نے فرمایا: تم لعن طعن بہت زیادہ کرتی ہو اور خاوند کی ناشکری کرتی ہو، اور عورتیں جو ناقص العقل اور ناقص الدین ہیں ان میں سے میں نے کوئی ایسی نہیں دیکھی جو تم سے زیادہ کسی ہوشیار اور دانا مرد کی عقل کو زائل کرنے والی ہو۔ انہوں نے پوچھا: یارسول اللہ! ہمارے دین میں کیا کمی ہے اور ہماری عقل میں کیا کمی ہے؟ آپ نے فرمایا: کیا یہ بات نہیں ہے کہ عورت کی شہادت مرد کی شہادت کا نصف ہوتی ہے؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! آپ نے فرمایا: یہ عورتوں کی عقل کی کمی ہے، آپ نے فرمایا: کیا یہ بات نہیں ہے کہ جب عورتوں کو حیض آتا ہے تو وہ نماز پڑھتی ہیں نہ روزہ رکھتی ہیں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! آپ نے فرمایا: یہ ان کے دین کی کمی ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۰۴، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۷۹، ۸۰، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۶۷۹، سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۵۷۶ السنن الکبریٰ رقم الحدیث: ۹۴۳۴ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۰۳، مسند احمد ج ۲، ص ۶۶ طبع قدیم، مسند احمد رقم الحدیث: ۵۳۴۳، عالم الکتب و دار الفکر)

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِی الْمَدِیْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ

اور عورتیں شہر میں یہ باتیں کرنے لگیں کہ عزیز مصر کی بیوی اپنے نوجوان (غلام) کو اپنی طرف راغب

نَفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾

کر رہی ہے، اس کی محبت اس کے دل پر چھا چکی ہے، بے شک ہم اس کو صریح بے راہ روی میں دیکھ رہی ہیں ○

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً

جب اس عورت نے ان عورتوں کی نکتہ چینی سنی تو اس نے ان کو بلوایا اور اس نے ان کے لیے تکیے سجا کر ایک محفل منعقد کی

وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا

اور ان میں سے ہر ایک کو ایک چھری دے دی اور (یوسف سے) کہا ان کے سامنے باہر آؤ، ان عورتوں نے

رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۫ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا

جب یوسف کو دیکھا تو بہت عظیم جانا اور انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے، اور کہا سبحان اللہ! یہ

بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِىْ لُمْتُنَّنِىْ

بشر نہیں ہے یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے ○ اس نے کہا یہی ہے وہ جس کی وجہ سے تم مجھ کو ملامت کرتی

فِيْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ

تھیں، میں نے اس کو اپنی طرف راغب کیا تھا یہ بچا رہا، اور اگر اس نے وہ کام نہیں کیا جو میں

مَاۤ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ

نے اس سے کہا ہے، تو یہ ضرور قید کر دیا جائے گا اور یہ بے عزت لوگوں میں سے ہو جائے گا ○ یوسف نے کہا اے میرے رب!

السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَىَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِىْۤ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّىْ

مجھے قید ہونا اس گناہ سے پسند ہے جس کی طرف مجھے یہ دعوت دیتی ہیں اور اگر تو نے ان کی سازش

كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۳﴾ فَاسْتَجَابَ

مجھ سے دور نہ کی تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور میں جاہلوں سے ہو جاؤں گا ○ پس ان کے رب نے

لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۴﴾

ان کی دعا قبول کی اور ان کو عورتوں کی سازش سے محفوظ کر دیا، بے شک وہ بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے ○

ثُمَّ بَدَا لَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا رَاَوُا الۡاٰيٰتِ لَيَسۡجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيۡنٍ ﴿۳۵﴾ ع ۱۴

پھر (یوسف کی پاکبازی کی) علامات دیکھنے کے باوجود ان کی یہی رائے ہوئی کہ وہ کچھ عرصہ کے لیے یوسف کو ضرور قید کر دیں ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور عورتیں شہر میں یہ باتیں کرنے لگیں کہ عزیز مصر کی بیوی اپنے نوجوان (غلام) کو اپنی طرف راغب کر رہی ہے، اس کی محبت اس کے دل پر چھا چکی ہے، بے شک ہم اس کو صریح بے راہ روی میں دیکھ رہی ہیں ○ (یوسف: ۳۰)

مصر کی عورتوں کی نکتہ چینی

ان عورتوں کے متعلق دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ وہ چار عورتیں تھیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ پانچ عورتیں تھیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان میں سے ایک بادشاہ کے ساقی کی بیوی تھی، دوسری بادشاہ کے وزیر کی بیوی تھی، تیسری جیل کے داروغہ کی بیوی تھی، اور چوتھی باورچی کی بیوی تھی۔ مقاتل نے ان چار کے علاوہ نقیب کی بیوی کا بھی اضافہ کیا ہے۔ (زاد المسیر ج ۴ ص ۲۱۴، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

قد شغفها حبا: اس کے دو معنی ہیں: شغاف اس کھال کو کہتے ہیں جو دل پر محیط ہوتی ہے، اس کو قلب کا غلاف کہتے ہیں، یعنی حضرت یوسف کی محبت اس کھال تک پہنچ کر اس کے دل میں سرایت کر گئی تھی اور اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ حضرت یوسف کی محبت اس کے دل کا اس طرح احاطہ کر چکی تھی جس طرح غلاف کسی چیز کا احاطہ کرتا ہے۔ (لسان العرب، الصحاح) ان عورتوں نے کہا: بے شک ہم اس کو صریح بے راہ روی میں دیکھ رہی ہیں کیونکہ حضرت یوسف ان کے نزدیک غلام کے حکم میں تھے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف کو عزیز مصر سے مانگ لیا تھا۔ عزیز مصر نے حضرت یوسف کو اسے بخش دیا، اور پوچھا: تم اس کا کیا کرو گی؟ اس نے کہا: میں اس کو بیٹا بناؤں گی۔ اس نے کہا: یہ تمہارا ہے۔ اس عورت نے حضرت یوسف کی پرورش کی اور اس کے دل میں حضرت یوسف کی محبت تھی، وہ حضرت یوسف کے سامنے بن سنور کے رہتی تھی اور مختلف حیلوں سے حضرت یوسف کو اپنی طرف مائل اور راغب کرنے کی کوشش کرتی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس کے شر سے محفوظ رکھا۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۱۵۵)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جب اس عورت نے ان عورتوں کی نکتہ چینی سنی تو اس نے ان کو بلوایا اور اس نے ان کے لیے تکیے سجا کر ایک محفل منعقد کی، اور ان میں سے ہر ایک کو ایک چھری دے دی، اور (یوسف سے) کہا ان کے سامنے باہر آؤ، ان عورتوں نے جب یوسف کو دیکھا تو بہت عظیم جانا اور انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور کہا: سبحان اللہ! یہ بشر نہیں ہے یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے ○ (یوسف: ۳۱)

مصر کی عورتوں کی نکتہ چینی کا منشاء

اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کی نکتہ چینی کو مکر سے تعبیر فرمایا ہے، اس کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(۱) ان عورتوں نے یہ نکتہ چینی اس لیے کی تھی تاکہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے رُخِ زیبا کو دیکھ سکیں کیونکہ ان کو اندازہ تھا کہ جب عزیز مصر کی بیوی ان کی اس تنقید کو سنے گی تو وہ ان کو حضرت یوسف علیہ السلام کا چہرۂ مبارک دکھائے گی تاکہ ان عورتوں کو معلوم ہو جائے کہ اگر وہ حضرت یوسف پر فریفتہ ہو گئی ہے تو وہ اس میں معذور ہے۔

(۲) عزیز مصر کی بیوی نے ان عورتوں کو اپنا رازدار بنایا تھا اور یہ بتا دیا تھا کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام سے محبت کرتی

ہے، لیکن جب ان عورتوں نے اس کا راز فاش کر دیا تو یہ ان کی بدعہدی اور مکر تھا۔
(۳) ان عورتوں نے اس کی غیبت کی تھی اور یہ غیبت مکر کے مشابہ تھی۔
یہ عورتیں بظاہر عزیز مصر کی بیوی پر نکتہ چینی کر رہی تھیں کہ وہ اپنے غلام پر فریفتہ ہوگئی ہے لیکن حقیقت میں وہ یہ چاہتی تھیں کہ عزیز مصر کی بیوی اپنا عُذر ظاہر کرنے کے لیے انہیں حضرت یوسف کا حسین و جمیل چہرہ دکھائے، اسی طرح جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مرضِ وفات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امام بنانے کا حکم دیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ آپ حضرت عمر کو نماز پڑھانے کا حکم دے دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم حضرت یوسف کے زمانہ کی عورتوں کی طرح ہو۔

حضرت عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیماری کے ایام میں فرمایا: ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے کہا کہ ابوبکر جب آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو ان پر رونے کا غلبہ ہوگا اور وہ لوگوں کو اپنی قرأت نہیں سنا سکیں گے، آپ حضرت عمر کو نماز پڑھانے کا حکم دیں۔ پھر حضرت عائشہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہیں کہ حضرت ابوبکر جب آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو ان پر رونے کا غلبہ ہوگا اور وہ لوگوں کو اپنی قرأت نہیں سنا سکیں گے۔ حضرت حفصہ نے اسی طرح کہا، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چھوڑو، تم تو حضرت یوسف کے زمانہ کی عورتوں کی طرح ہو، ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں اور حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ سے کہا: میں تمہارے مقابلہ میں کبھی خیر کو حاصل نہیں کر سکتی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۷۹، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۴۱۸، سنن النسائی رقم الحدیث: ۸۳۴، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۷۰۸۴)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا منشاء یہ تھا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ایک مرتبہ حکم دینے سے حضرت ابوبکر کو امام بنا دیا جاتا تو ہو سکتا ہے کہ بعد میں کوئی کہنے والا یہ کہتا کہ رسول اللہ ﷺ نے بیماری کے کسی حال میں یہ حکم دیا تھا یا سہو یا غفلت میں یہ حکم دیا تھا یا اتفاقاً یہ حکم دیا تھا، اگر آپ کی توجہ کسی اور کی طرف دلائی جاتی تو آپ اس کو حکم دے دیتے، لیکن جب رسول اللہ ﷺ کو دو بار حضرت عمر کی طرف توجہ دلائی گئی اور آپ نے ہر بار حضرت ابوبکر ہی کو امام بنانے کا حکم دیا تو واضح ہوگیا کہ رسول اللہ ﷺ نے غفلت سے یا بیماری کے کسی حال میں یہ حکم نہیں دیا تھا بلکہ پوری توجہ، حاضر دماغی اور بیداری ذہن کے ساتھ یہ حکم دیا تھا اور حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کا بار بار کسی اور کا سوال کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر بار بالاصرار حضرت ابوبکر ہی کا حکم دینا حضرت ابوبکر کی امامت کو پختہ اور موکد کر دیتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا: تم حضرت یوسف کے زمانہ کی عورتوں کی طرح ہو یعنی جس طرح وہ بظاہر عزیز مصر کی بیوی پر نکتہ چینی کر رہی تھیں اور حقیقت میں حضرت یوسف علیہ السلام کا جمال دیکھنا چاہتی تھیں اسی طرح تم بھی بظاہر یہ کہہ رہی ہو کہ کسی اور کو امام بنایا جائے اور درحقیقت تم یہ چاہتی ہو کہ حضرت ابوبکر کی امامت کو اور پختہ اور موکد کر دیا جائے تاکہ کوئی کہنے والا یہ نہ کہہ سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماری کے کسی حال میں حضرت ابوبکر کو امام بنایا تھا۔

مصری خواتین کی دعوت کا اہتمام

عزیز مصر کی بیوی نے جب یہ سنا کہ یہ عورتیں اس کی حضرت یوسف سے بے حد زیادہ محبت کی وجہ سے اس کو ملامت کر رہی ہیں تو اس نے اپنے عُذر کو ظاہر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے ان عورتوں کو بلایا اور ان کے لیے ایک مجلس منعقد کی۔ قرآن مجید میں متکئا کا لفظ ہے، اس کا معنی ہے چھوٹے تکیے اور گدے، اس کا دوسرا معنی ہے طعام۔ عتبی نے کہا: اصل محاورہ

یہ ہے کہ تم جس شخص کو کھانے کی دعوت دو پھر تم اس کے بیٹھنے کے لیے گدے بچھاؤ تو اس طعام کو بطور استعارہ متکأ کہا جاتا ہے' اس کا تیسرا معنی ہے اترج یا اترنجہ- یہ ایک خوش رنگ اور خوش ذائقہ پھل ہے' اس کا حجم بڑا ہوتا ہے اور اس کا ذائقہ کھٹا اور میٹھا ہوتا ہے' اس کی تاثیر گرم تر ہے اور اس کے طبی فوائد بہت زیادہ ہیں- اس کا اصل معنی یہی ہے لیکن اس جگہ یہ انواع و اقسام کے پھلوں پر محمول ہے جو اس مجلس میں ان کے کھانے کے لیے رکھے گئے تھے- اس کا چوتھا معنی ہے ایسے پھل جو کاٹ کر کھائے جاتے ہیں- (زاد المسیر' الجامع لاحکام القرآن' تفسیر کبیر) خلاصہ یہ ہے کہ عزیز مصر کی بیوی نے ان عورتوں کی دعوت کی اور ان میں سے ہر عورت کو ایک معین جگہ بٹھادیا اور پھل یا گوشت کاٹنے کے لیے ہر ایک کے ہاتھ میں چھری دے دی' پھر اس نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا کہ وہ ان عورتوں کے سامنے آئیں اور ان عورتوں کے سامنے سے گزریں-

جب ان عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اچانک دیکھا تو انہوں نے آپ کو بہت عظیم جانا' اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے جلوۂ حُسن کو دیکھنے میں اس قدر منہمک اور مستغرق ہوئیں کہ انہوں نے پھلوں کے بجائے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور ان کو بالکل پتا نہیں چلا-

حضرت یوسف کے غیر معمولی حُسن کے متعلق احادیث اور آثار

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے معراج کے سلسلہ میں ایک طویل حدیث روایت کی ہے' اس میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر مجھے تیسرے آسمان کی طرف لے جایا گیا- جبرئیل علیہ السلام نے دروازہ کھلوایا' ان سے پوچھا گیا: تم کون ہو؟ انہوں نے کہا: جبرئیل! ان سے پوچھا گیا: تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پوچھا گیا: کیا انہیں بلایا گیا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں انہیں بلایا گیا ہے! پھر ہمارے لیے دروازہ کھول دیا گیا تو وہاں حضرت یوسف علیہ السلام تھے اور (لوگوں کا) نصف حُسن ان کو عطا کیا گیا تھا' الحدیث- (صحیح مسلم الایمان: ۲۵۹ (۱۶۲) الرقم المسلسل: ۴۰۴)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کی والدہ کو نصف حُسن عطا کیا گیا تھا-

(مسند احمد رقم الحدیث: ۱۴۰۵۲ دار الفکر طبع جدید' جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۷۱۲' المستدرک ج ۲ ص ۵۷۰)

ربیعہ الجرشی نے کہا: حُسن کے دو حصے کیے گئے' ایک حصہ حضرت یوسف اور ان کی والدہ کو دیا گیا اور باقی ایک حصہ تمام لوگوں کو دیا گیا- (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۷۱۵' تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۵۵۹)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت یوسف کا چہرہ بجلی کی طرح چمکتا تھا-

(تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۵۵۹)

امام ابن المنذر' امام ابو الشیخ اور امام طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا چہرہ بجلی کی طرح چمکتا تھا اور جب کوئی عورت ان کے پاس کسی کام سے آتی تو حضرت یوسف اپنے چہرے پر نقاب ڈال لیتے تھے اس خوف سے کہ کہیں وہ عورت کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائے- (الدر المنثور ج ۴ ص ۵۳۲)

امام ابو الشیخ نے اسحٰق بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب مصر کی گلیوں میں جاتے تھے تو ان کا چہرہ دیواروں پر اس طرح چمکتا تھا جس طرح سورج دیواروں پر چمکتا ہے- (الدر المنثور ج ۴ ص ۵۳۲)

امام عبد بن حمید' امام ابن المنذر اور امام ابو الشیخ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حُسن کی لوگوں پر اس طرح فضیلت تھی جس طرح چودھویں رات کے چاند کی ستاروں پر فضیلت ہوتی ہے-

(الدر المنثور ج ۴ ص ۵۳۲' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۴ھ)

ان عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس لیے عظیم جانا کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے چہرے پر انوارِ نبوت اور آثارِ رسالت دیکھے اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ ان میں فرشتوں کے خواص ہیں کیونکہ وہ کھانے پینے کی چیزوں کی طرف اور عورتوں کی طرف التفات نہیں کرتے تھے اور ان کے دلوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کا رُعب طاری ہو گیا اس لیے انہوں نے بے ساختہ کہا: یہ بشر نہیں ہے، یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے۔

مصری خواتین کا پھلوں کی بجائے اپنے ہاتھوں کو کاٹ لینا

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سندوں کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

ابن زید نے کہا: وہ عورتیں چھریوں کے ساتھ اپنے ہاتھوں کو کاٹ رہی تھیں اور ان کا یہی گمان تھا کہ وہ پھلوں کو کاٹ رہی ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے حُسن کو دیکھ کر ان کی عقلیں جاتی رہی تھیں۔ قتادہ نے کہا: انہوں نے اپنے ہاتھوں کو کاٹ ڈالا اور ان کو بالکل پتا نہیں چلا۔ ابن اسحٰق نے کہا کہ عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا: آپ ان کے سامنے آئیں، حضرت یوسف ان کے سامنے آئے، جب انہوں نے حضرت یوسف کے حُسن کو دیکھا تو ان کی عقلیں مغلوب ہو گئیں، انہوں نے چھریوں سے اپنے ہاتھوں کو کاٹ ڈالا اور ان کو بالکل پتا نہیں چلا کہ وہ کیا کر رہی ہیں۔

(جامع البیان جز ۱۲ ص ۲۰۷، مطبوعہ دار الفکر، ۱۴۱۲ھ)

امام ابن ابی حاتم نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا کہ اس عورت نے منتظم سے کہا کہ یوسف کو سفید لباس پہناؤ، کیونکہ سفید لباس میں انسان زیادہ حسین معلوم ہوتا ہے، اور جس وقت وہ عورتیں پھل کاٹ رہی ہوں اس وقت یوسف کو ان کے سامنے لے جانا۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام ان کے سامنے آئے تو وہ حضرت یوسف کو دیکھنے میں ایسی مدہوش ہوئیں کہ انہوں نے پھلوں کی بجائے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور ان کو درد کا بالکل احساس نہیں ہوا، اور جب حضرت یوسف ان کے سامنے سے چلے گئے تو پھر انہیں درد کا احساس ہوا اور پھر عزیز مصر کی بیوی نے کہا: تم نے تو ایک لمحہ کے لیے یوسف کو دیکھا ہے تو تمہارا یہ حال ہو گیا تو سوچو کہ جو دن رات یوسف کے ساتھ رہتی ہو اس کا کیا حال ہوا ہو گا! تو وہ عورتیں بے ساختہ بولیں کہ سبحان اللہ! یہ بشر نہیں ہے، یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے۔

امام ابن ابی حاتم کی ایک اور روایت میں ہے کہ جب حضرت یوسف ان عورتوں کے سامنے سے چلے گئے تو عزیز مصر کی بیوی نے کہا: یہ ہے وہ شخص جس سے محبت کی وجہ سے تم مجھ کو ملامت کر رہی تھیں، تم نے دیکھ لیا کہ تم اس کو ایک نظر دیکھ کر اس قدر مدہوش ہوئیں کہ تم نے پھلوں کی بجائے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور تم کو بالکل درد نہیں ہوا۔ جب ان عورتوں نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں اور بہتے ہوئے خُون کو دیکھا تو وہ درد کی شدت سے کراہنے اور رونے لگیں اور انہوں نے کہا: یہ بشر نہیں ہے، یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے اور ہم آج کے بعد اس کی محبت کی وجہ سے تم کو ملامت نہیں کریں گی۔

(الدر المنثور ج ۴ ص ۵۳۲-۵۳۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ)

حضرت یوسف علیہ السلام کو فرشتہ کہنے کی توجیہ

ان عورتوں نے حضرت یوسف کو دیکھ کر جو یہ کہا تھا کہ یہ بشر نہیں ہے یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے، اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ یہ بہت غیر معمولی حُسن کے مالک ہیں، اس لیے کہ عام لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات مرکوز ہے کہ فرشتوں سے زیادہ کوئی حسین نہیں ہوتا اور شیطان سے زیادہ کوئی بدشکل نہیں ہوتا، لہٰذا ان کا حضرت یوسف کو فرشتہ کہنا ان کے غیر معمولی حُسن کی وجہ سے تھا، دوسری وجہ یہ ہے کہ فرشتوں میں شہوت اور غضب کا مادہ نہیں ہوتا، ان کی غذا تو صرف اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء ہے،

پھر جب ان عورتوں نے یہ دیکھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان عورتوں میں سے کسی عورت کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا حالانکہ جب کوئی عام آدمی عورتوں کے پاس سے گزرے تو ان کی طرف ضرور نظر ڈالتا ہے تو انہوں نے کہا: یہ بشر نہیں ہے' یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے ان میں کوئی شہوت کا اثر نہیں دیکھا' نہ ان میں بشریت یا انسانیت کا کوئی تقاضا دیکھا' یہ انسان اور بشر کی تمام سفلی صفات سے منزہ ہیں اور انہیں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے انسانیت کے پیکر میں کوئی عظیم فرشتہ ہو۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ ان عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر کہا: حاشاللہ! یعنی عزیز مصر کی بیوی نے ان پر جو تہمت لگائی ہے یہ اس تہمت سے بہت دُور ہیں اور یہ تو گناہوں سے بری ہونے میں فرشتوں کی طرح معصوم ہیں' یہ کوئی عام بشر نہیں ہیں جن کے متعلق ایسی بدگمانی کی جاسکے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اس نے کہا یہی ہے وہ جس کی وجہ سے تم مجھ کو ملامت کرتی تھیں' میں نے اس کو اپنی طرف راغب کیا تھا یہ بچا رہا' اور اگر اس نے وہ کام نہیں کیا جو میں نے اس سے کہا ہے' تو یہ ضرور قید کر دیا جائے گا اور یہ بے عزت لوگوں میں سے ہو جائے گا O (یوسف: ۳۲)

حضرت یوسف علیہ السلام کی سخت آزمائش

جب مصر کی عورتوں نے عزیز مصر کی بیوی کے متعلق کہا کہ وہ اپنے غلام پر فریفتہ ہوگئی ہے اور ہم اس کو صریح بے راہ روی میں دیکھتی ہیں تو اس نے ایک محفل میں ان کو بلایا اور ان کے ہاتھوں میں پھل کاٹنے کے لیے چھریاں دے دیں اور خادم سے کہا: یوسف کو بلا کر لاؤ' جب اچانک حضرت یوسف ان کے سامنے آئے تو وہ جلوۂ یوسف کو دیکھ کر ایسی مدہوش ہوئیں کہ بے خودی میں انہوں نے پھلوں کی بجائے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور ان کو احساس تک نہیں ہوا' تب عزیز مصر کی بیوی نے کہا: یہی ہے وہ جس کی وجہ سے تم مجھ کو ملامت کرتی تھیں' تم نے تو اس کو ایک لمحہ کے لیے دیکھا ہے تو سوچو جو اس کے ساتھ دن رات رہتی ہو اس کی بے خودی کا کیا حال ہوگا!

اس آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی اور گناہ میں ملوث نہ ہونے کی صاف تصریح ہے کیونکہ اس عورت نے اعتراف کیا میں نے اس کو اپنی طرف راغب کیا تھا یہ بچا رہا' پھر اس نے یوسف علیہ السلام کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے اس کی خواہش پوری نہ کی تو وہ ان کو جیل میں ڈلوا دے گی اور ان کو بے عزت کرا دے گی اور یہ بہت بڑی اور خطرناک دھمکی تھی' کیونکہ جو شخص لوگوں کی نگاہوں میں عزت دار ہو' جو منصب نبوت اور مرتبہ رسالت پر فائز ہو اگر اس کی عزت و ناموس کو خطرہ ہو اور لوگوں کی نگاہوں میں اس کے بے توقیر ہونے کا کھٹکا ہو تو یہ اس کے لیے سخت آزمائش ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یوسف نے کہا: اے میرے رب! مجھے قید ہونا اس گناہ سے پسند ہے جس کی طرف مجھے یہ دعوت دیتی ہیں اور اگر تو نے ان کی سازش مجھ سے دُور نہ کی تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور میں جاہلوں سے ہو جاؤں گا O پس ان کے رب نے ان کی دُعا قبول کی اور ان کو عورتوں کی سازش سے محفوظ کر دیا' بے شک وہ بہت سننے والا' خوب جاننے والا ہے O (یوسف: ۳۴-۳۳)

اللہ تعالیٰ کی عنایت کے بغیر گناہ سے بچنا ممکن نہیں

اس آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کی جس دُعا کا ذکر ہے اس میں حضرت یوسف علیہ السلام نے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے یعنی یہ جب عورتیں ان کو گناہ کی طرف بلا رہی تھیں' اس کا ایک محمل تو یہ ہے کہ یہ سب عورتیں حضرت یوسف سے

اپنی اپنی خواہش کا اظہار کر رہی تھیں اور محفل میں شریک ہر عورت یہ چاہتی تھی کہ حضرت یوسف اس کی خواہش کو پورا کریں' اس کا دوسرا محمل یہ ہے کہ وہ عورتیں مل کر عزیز مصر کی بیوی کی سفارش کر رہی تھیں کہ تم نے اس عورت کی خواہش پوری نہ کر کے اس کے اوپر ظلم کیا ہے' تمہیں اپنی عزت کو قائم رکھنے کے لیے اور مال و دولت اور سہولتوں کی فراوانی حاصل کرنے کے لیے یہ چاہیے کہ تم اس کی خواہش کو پورا کرو۔

امام فخرالدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام کے ذہن میں انواع واقسام کے وسوسے تھے: (۱) عزیز مصر کی بیوی بہت خوب صورت ہے۔ (۲) وہ بہت مال دار اور بڑے مرتبہ کی ہے اور وہ یہ کہتی ہے کہ اگر تم نے میری خواہش پوری کر دی تو میں سب کچھ تم پر نچھاور کر دوں گی۔ (۳) محفل میں شریک ہر عورت ان سے اپنی خواہش کا اظہار کر رہی تھی اور خواہش پوری نہ کرنے کی صورت میں ان کو دھمکیاں دے رہی تھی اور اس معاملہ میں عورتوں کی سازشیں بہت سنگین ہوتی ہیں۔ (۴) حضرت یوسف ان عورتوں کے شر سے بہت خوف زدہ تھے' ان کو یہ خطرہ تھا کہ اگر ان عورتوں کی بات نہ مانی تو وہ ان کو قتل کروا دیں گی۔ اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے ذہن میں اس کام کی طرف ترغیب کی بھی وجوہات تھیں اور کام نہ کرنے کی صورت میں ڈر اور خوف کی بھی وجوہات تھیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو ڈر تھا کہ گناہ کی تحریک کے یہ اسباب بہت قوی ہیں کہیں یہ ان کے پائے استقامت کو ڈگمگا نہ دیں اور بشری قوت اور انسانی طاقت ایسی قوی ترغیبات اور تحریکات کے مقابلہ میں پاک دامنی پر برقرار رہنے کے لیے ناکافی ہے الایہ کہ اللہ تعالیٰ دستگیری فرمائے اور وہ بندے کو گناہ کے تاریک گڑھے میں گرنے سے بچالے' اس لیے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دُعا کی: اے میرے رب! مجھے قید ہونا اس گناہ سے پسند ہے جس کی طرف مجھے یہ دعوت دیتی ہیں اور اگر تُو نے ان کی سازش مجھ سے دُور نہ کی تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔

قید میں گرفتار ہونا مشقت اور مصیبت ہے اور جو ان کا مطلوب تھا وہ سراسر لذت اور عیش تھا' لیکن حضرت یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ اس عارضی لذت کا انجام دنیا کی رُسوائی اور آخرت کا عذاب ہے اور انہوں نے دُنیا کی رُسوائی اور آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں قید کی مشقت اور مصیبت کو اختیار کر لیا اس لیے فرمایا: مجھے قید ہونا اس گناہ سے پسند ہے جس کی طرف مجھے یہ دعوت دیتی ہیں (ہم نے اس کا ترجمہ زیادہ پسند نہیں کیا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہو گا ان کی دعوت بھی کسی درجہ میں پسند تھی' لیکن زیادہ پسند قید ہونا تھا...... سعیدی غفرلہ) اور اس سے یہ قاعدہ معلوم ہوا کہ جب انسان دو مصیبتوں میں سے کسی ایک مصیبت میں لازماً گرفتار ہو تو آسان مصیبت کو اختیار کر لے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں دُنیا کی مصیبت اختیار کر لینی چاہیے۔ اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی عنایت شامل حال نہ ہو انسان کسی گناہ سے بچ سکتا ہے نہ کسی نیکی کو اختیار کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی دُعا کو قبول کر لیا اور ان عورتوں کی سازش سے حضرت یوسف علیہ السلام کو محفوظ کر دیا' بے شک وہ بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر (یوسف کی پاکبازی کی) علامات دیکھنے کے باوجود ان کی یہی رائے ہوئی کہ وہ کچھ عرصہ کے لیے یوسف کو ضرور قید کر دیں ○ (یوسف: ۳۵)

حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کرنے کا سبب

جب عزیز مصر پر حضرت یوسف علیہ السلام کی تہمت سے برأت ظاہر ہو گئی تو واضح طور پر اس نے حضرت یوسف سے

کوئی تعرض نہیں کیا، ادھر وہ عورت اپنی تمام حیلہ سازیوں اور مکر و فریب کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی موافقت پر ابھارتی رہی، اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، پھر جب وہ حضرت یوسف علیہ السلام سے مایوس ہو گئی تو اس نے اپنا انتقام لینے کے لیے اپنے خاوند سے کہا: اس عبرانی غلام نے مجھے لوگوں کے درمیان رُسوا کر دیا ہے، یہ لوگوں سے کہتا پھرتا ہے کہ اس عورت نے اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے مجھے بہکایا اور ورغلایا تھا، اور میں ہر شخص کے سامنے جا کر اپنا عذر نہیں بیان کر سکتی اس لیے اس فحش بات کا چرچا روکنے کے لیے اس غلام کو قید کر دیا جائے۔ عزیز مصر نے سوچا اس طرح اس کی بھی بدنامی ہو رہی ہے، اس لیے مصلحت اسی میں ہے کہ لوگوں کی زبانیں بند کرنے کے لیے اس کو قید کر دیا جائے۔ (جامع البیان جز ۱۲ ص ۲۷۹، ملخصاً)

حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکبازی کی علامات

اس آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکبازی کی علامات کا ذکر ہے، وہ علامات یہ تھیں: حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کا پیچھے سے پھٹا ہوا ہونا، حضرت یوسف کا اس عورت سے بھاگنا اور اس عورت کا حضرت یوسف کا پیچھا کرنا، اس عورت کے خاندان کے ایک شخص کا اس عورت کو قصوروار قرار دینا اور حضرت یوسف کی برأت کو بیان کرنا، اس دعوت میں حضرت یوسف کو دیکھ کر ان عورتوں کا ہاتھ کاٹ لینا اور حضرت یوسف کی برأت کے لیے سبحان اللہ کہنا، اور ان کی پارسائی کی وجہ سے ان کو فرشتہ قرار دینا۔

قید کی مدت

عکرمہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام سات سال قید خانے میں رہے۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۷۳۰)

طارق اور سعید بن جبیر نے کہا: یہ مدت چھ ماہ تھی۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۵۹۱)

ابوصالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ مدت پانچ سال تھی۔ حضرت ابن عباس سے ایک اور روایت ہے کہ یہ مدت ایک سال تھی۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے سات سال کی روایت کی ہے۔ عطا نے کہا: یہ قید اس وقت تک کے لیے تھی حتیٰ کہ لوگوں کی زبانیں اس واقعہ کے ذکر سے بند ہو جائیں۔ الماوردی نے کہا: اس قید کی کوئی مدت معین نہیں کی گئی تھی اور ان کو غیر محدود مدت کے لیے قید کیا گیا تھا اور یہی قول صحیح ہے۔

(زاد المسیر ج ۴ ص ۲۲۲، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّىْٓ اَرٰىنِىْٓ اَعْصِرُ

اور یوسف کے ساتھ دو جوان (بھی) قید خانے میں داخل ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں

خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّىْٓ اَرٰىنِىْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِىْ خُبْزًا

شراب (کے لیے انگور) نچوڑ رہا ہوں، اور دوسرے نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اُٹھائے ہوئے

تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۶﴾

ہوں جن سے پرندے کھا رہے ہیں، آپ ہمیں اس کی تعبیر بتائیے ہمارا گمان ہے کہ آپ نیک لوگوں میں سے ہیں ○

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِۦٓ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِۦ قَبْلَ

یوسف نے کہا تم کو جو کھانا دیا جاتا ہے تم تک اس کے پہنچنے سے پہلے میں تم کو اس کی حقیقت بتا

أَن يَأْتِيَكُمَا ۚ ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِى رَبِّىٓ ۚ إِنِّى تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ

دوں گا، یہ ان علوم میں سے ہے جن کو میرے رب نے مجھے سکھایا ہے، جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے

لَّا يُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَهُم بِٱلْءَاخِرَةِ هُمْ كَٰفِرُونَ ﴿٣٧﴾ وَٱتَّبَعْتُ مِلَّةَ

اور جو لوگ آخرت کے ساتھ کفر کرنے والے ہیں میں نے ان کے دین کو ترک کر دیا ہے ○ اور میں نے اپنے باپ

ءَابَآءِىٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ ۚ مَا كَانَ لَنَآ أَن نُّشْرِكَ بِٱللَّهِ

دادا، ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے دین کی اتباع کی ہے۔ ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی

مِن شَىْءٍ ۚ ذَٰلِكَ مِن فَضْلِ ٱللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى ٱلنَّاسِ وَلَٰكِنَّ

چیز کو بھی شریک قرار دیں، یہ ہم پر اور لوگوں پر اللہ کا فضل ہے لیکن اکثر لوگ

أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٣٨﴾ يَٰصَٰحِبَىِ ٱلسِّجْنِ ءَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ

شکر ادا نہیں کرتے ○ اے قید کے دونوں ساتھیو! آیا متعدد خدا بہتر ہیں

خَيْرٌ أَمِ ٱللَّهُ ٱلْوَٰحِدُ ٱلْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾ مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِۦٓ إِلَّآ أَسْمَآءً

یا ایک اللہ جو غالب ہے؟ ○ تم اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہو وہ صرف

سَمَّيْتُمُوهَآ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُم مَّآ أَنزَلَ ٱللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَٰنٍ ۚ إِنِ

چند اسماء ہیں جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیا ہے، اللہ نے ان کے ساتھ کوئی سند نہیں نازل کی،

ٱلْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا۟ إِلَّآ إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ

حکم صرف اللہ کا ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرو، یہی صحیح دین ہے،

وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٠﴾ يَٰصَٰحِبَىِ ٱلسِّجْنِ أَمَّآ أَحَدُكُمَا

لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ○ اے قید کے دونوں ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو

فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ

شراب پلایا کرے گا اور رہا دوسرا تو اس کو سولی دی جائے گی، پھر پرندے اس کے سر سے (گوشت نوچ نوچ کر)

رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۝۴۱ وَقَالَ لِلَّذِيْ

کھائیں گے، تم جس کے متعلق سوال کرتے تھے اس کا (اسی طرح) فیصلہ ہو چکا ہے ○ اور جس کے متعلق یوسف کا گمان تھا

ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ

کہ وہ ان دونوں میں سے نجات پانے والا ہے، اس سے انہوں نے کہا اپنے آقا کے سامنے میرا ذکر کرنا، پس شیطان نے ان کو

ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ۝۴۲ ع ۵ ۱۵

اپنے رب سے ذکر کرنا بھلا دیا پس وہ قید خانے میں (مزید) کئی سال ٹھہرے رہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یوسف کے ساتھ دو جوان (بھی) قید خانہ میں داخل ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب (کے لیے انگور) نچوڑ رہا ہوں، اور دوسرے نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں جن سے پرندے کھا رہے ہیں آپ ہمیں اس کی تعبیر بتائیے ہمارا گمان ہے کہ آپ نیک لوگوں میں سے ہیں ○ (یوسف: ۳۶)

حضرت یوسف کی قید خانہ میں ساقی اور نانبائی سے ملاقات

وہب بن منبہ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دراز گوش پر سوار کرا کے قید خانہ میں لے جایا گیا اور ایک آدمی ان کے ساتھ یہ کہتا ہوا جا رہا تھا جو شخص اپنی مالکہ کا کہنا نہ مانے اس کی یہی سزا ہوتی ہے، اور حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے تھے: دوزخ کی آگ، تارکول کی قمیص پہننے، گرم کھولتے ہوئے پانی کو پینے اور تھور کو کھانے کے مقابلہ میں یہ سزا بہت کم ہے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام قید خانہ میں پہنچے تو وہاں کئی ایسے لوگ دیکھے جو رہائی سے ناامید ہو چکے تھے، اور ان کی سزا بہت سخت تھی، حضرت یوسف علیہ السلام ان سے فرماتے تم صبر کرو اور بشارت قبول کرو تم کو اجر ملے گا۔ انہوں نے کہا اے نوجوان! آپ کس قدر نیک باتیں کرتے ہیں، آپ کے قرب میں ہم کو برکت ملے گی! آخر آپ کون ہیں؟ حضرت یوسف نے فرمایا: میں اللہ کے پسندیدہ بندے یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم خلیل اللہ کا بیٹا یوسف ہوں!

حضرت یوسف علیہ السلام غمزدہ لوگوں کو قید خانے میں تسلی دیتے تھے، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے تھے، ساری رات نماز پڑھتے تھے اور خوف خدا سے اس قدر روتے تھے کہ کوٹھڑی کی چھت، دیواریں اور دروازوں پر بھی گریہ طاری ہو جاتا تھا، تمام قیدی آپ سے مانوس ہو گئے تھے، اور جب کوئی قیدی، قید سے رہائی پاتا تو جانے سے پہلے آپ کے پاس بیٹھ جاتا، قید خانہ کا داروغہ بھی آپ سے محبت کرتا تھا اور آپ کو بہت آرام پہنچاتا تھا، ایک دن اس نے کہا اے یوسف! میں آپ سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ کسی اور سے اتنی محبت نہیں کرتا۔ حضرت یوسف نے فرمایا: میں تمہاری محبت سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتا ہوں! اس نے پوچھا اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے بتایا: میرے باپ نے مجھ سے محبت کی تو میرے بھائیوں نے میرے ساتھ ظالمانہ

سلوک کیا' میری مالکہ نے مجھ سے محبت کی اس کے نتیجہ میں' میں آج اس قید میں ہوں۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام قید خانہ میں تھے تو مصر کا سب سے بڑا بادشاہ جس کا نام ریان بن الولید تھا وہ بوڑھا ہو چکا تھا' اس کو اپنے نان بائی اور ساقی پر شک ہوا کہ وہ اس کو زہر دینے والے ہیں' اس نے ان دونوں کو قید میں ڈلوا دیا۔ ثعلبی نے کعب سے روایت کیا ہے کہ ساقی کا نام منجا تھا اور نانبائی کا نام مجلث تھا۔ قرآن مجید نے ان دونوں کے لیے فتیان کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ عربی میں فتی غلام کو بھی کہتے ہیں اور یہ دونوں بادشاہ کے غلام تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے قیدیوں سے کہا تھا کہ وہ خواب کی تعبیر بتاتے ہیں' تو نانبائی اور ساقی نے ایک دوسرے سے کہا: آؤ ہم اس عبرانی غلام کا تجربہ کریں پھر ان دونوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھی' ساقی نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں بادشاہ کے لیے انگور نچوڑ رہا ہوں اور نانبائی نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے جا رہا ہوں اور پرندے اس سے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں' ہمارا گمان ہے کہ آپ نیک لوگوں میں سے ہیں۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۱۶۵-۱۶۴' تفسیر امام ابن ابی حاتم' ج ۷ ص ۲۱۴۳-۲۱۴۱' النکت والعیون ج ۳ ص ۳۶-۳۵' تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۵۲۹' الدر المنثور ج ۴ ص ۵۳۷-۵۳۵)

ساقی اور نانبائی کے بیان کیے ہوئے خواب آیا سچے تھے یا جھوٹے؟

ساقی اور نانبائی نے حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے جو خواب بیان کیا تھا وہ سچا تھا یا جھوٹا؟ اس کے متعلق تین قول ہیں:

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انہوں نے جھوٹا خواب بیان کیا تھا' انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے صرف تجربہ کے طور پر سوال کیا تھا۔

(۲) مجاہد اور امام ابن اسحاق نے کہا: انہوں نے سچا خواب بیان کیا تھا اور انہوں نے واقعی خواب دیکھا تھا۔

(۳) ابو مجلز نے کہا: نانبائی نے جھوٹا خواب بیان کیا تھا اور ساقی نے سچا خواب بیان کیا تھا۔

(زاد المسیر ج ۴ ص ۲۲۳-۲۲۲' مطبوعہ مکتبہ اسلامی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یوسف نے کہا تم کو جو کھانا دیا جاتا ہے تم تک اس کے پہنچنے سے پہلے میں تم کو اس کی حقیقت بتا دوں گا' یہ ان علوم میں سے ہے جن کو میرے رب نے مجھے سکھایا ہے' جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور جو لوگ آخرت کے ساتھ کفر کرنے والے ہیں' میں نے ان کے دین کو ترک کر دیا ہے ○ (یوسف: ۳۷)

قید خانہ میں کھانا آنے سے پہلے حضرت یوسف کا کھانے کی خبر دینا

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ لکھتے ہیں: امام ابن اسحاق نے کہا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تم کو خواب میں جو کھانا بھی دیا جائے گا میں تم کو بیداری میں اس کی حقیقت بتا دوں گا' اور امام ابن جریج نے کہا: تم کو بیداری میں جو کھانا دیا جائے گا میں تم کو (پہلے سے) اس کی حقیقت بتا دوں گا۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۷۵۲' ۱۴۷۵۸' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ' تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۶۰۸' مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ' ۱۴۱۷ھ)

امام عبد الرحمٰن بن علی بن محمد الجوزی المتوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں: اس آیت کے دو معنی ہیں' حسن بصری نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ تمہیں جب بھی بیداری میں کھانا دیا جائے گا میں تم تک کھانا پہنچنے سے پہلے بتا دوں گا کہ تمہارے پاس کیا کھانا آئے گا

کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح غائب شدہ چیزوں کی خبر دیتے تھے اور سدی نے بیان کیا کہ تم کو خواب میں جو کھانا دیا جائے گا بیداری میں اس کھانے کے پہنچنے سے پہلے میں تم کو اس کی حقیقت بتا دوں گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ساقی اور نانبائی نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا کھانا پہنچنے سے پہلے آپ کو اس کی حقیقت کا کیسے پتا چل جاتا ہے حالانکہ آپ جادوگر ہیں نہ نجومی ہیں تو انہوں نے اس کے جواب میں فرمایا: مجھے میرے رب نے اس کی تعلیم دی ہے۔ (زاد المسیر ج ۴ ص ۲۲۴، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں: حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے فرمایا: کل تمہارے پاس تمہارے گھروں سے کھانا پہنچنے سے پہلے میں تمہیں اس کھانے کی خبر دے دوں گا تاکہ تم کو یقین آ جائے کہ میں خواب کی تعبیر کا علم بھی رکھتا ہوں، انہوں نے کہا آپ اسی طرح کریں، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: تمہارے پاس فلاں فلاں کھانے کی چیز آئے گی، سو ایسا ہی ہوا اور یہ علم الغیب تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ مختص تھا، اور حضرت یوسف علیہ السلام نے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس علم کے ساتھ اس لیے مخصوص فرمایا ہے کہ انہوں نے اس قوم کے دین کو ترک کر دیا جو اللہ پر ایمان نہیں لاتی، یعنی بادشاہ کے دین کو۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۱۶۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حافظ ابن کثیر نے بھی اس آیت کا معنی اسی طرح بیان کیا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۵۲۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۹ھ)

ہم نے اس معنی کے ثبوت میں بکثرت حوالے اس لیے پیش کیے ہیں کہ بعض اردو کے مفسرین نے اس آیت کا معنی اس کے خلاف کیا ہے۔

شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

خوابوں کی تعبیر تمہیں بہت جلد معلوم ہوا چاہتی ہے روز مرہ تم کو جو کھانا ملتا ہے اس کے آنے سے پیشتر میں تم کو تعبیر بتلا کر فارغ ہو جاؤں گا۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۴۰۱، مطبوعہ لاہور، ۱۹۸۲ء)

اس کے برخلاف شیخ اشرف علی تھانوی متوفی ۱۳۶۴ھ نے متقدمین مفسرین کے مطابق ہی لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:

فرمایا کہ (دیکھو) جو کھانا تمہارے پاس آتا ہے جو کہ تم کو کھانے کے لیے (جیل خانہ میں) ملتا ہے میں اس کے آنے سے پہلے اس کی حقیقت تم کو بتلا دیا کرتا ہوں، (کہ فلاں چیز آوے گی اور ایسی ایسی ہوگی) اور یہ بتلا دینا اس علم کی بدولت ہے جو مجھ کو میرے رب نے تعلیم فرمایا ہے (یعنی مجھ کو وحی سے معلوم ہو جاتا ہے پس یہ معجزہ ہوا جو کہ دلیل نبوت ہے)

(بیان القرآن ج ۱ ص ۴۸۲، مطبوعہ تاج کمپنی لیٹڈ لاہور)

صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ۱۳۶۷ھ اور مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی ۱۳۹۶ھ نے بھی اس آیت کا اسی طرح معنی کیا ہے جو کہ تمام متقدمین مفسرین کے مطابق ہے اور ہم نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

خواب کی تعبیر بتانے سے پہلے کھانے کے متعلق پیش گوئی کی توجیہ

اس مقام پر یہ سوال ہوتا ہے کہ ساقی اور نانبائی نے تو حضرت یوسف علیہ السلام سے اپنے خوابوں کی تعبیر کے متعلق

سوال کیا تھا اور حضرت یوسف نے ان کو یہ بتانا شروع کر دیا کہ تمہارے پاس کس قسم کا کھانا آئے گا اور کتنا آئے گا اور کس وقت آئے گا تو ان کا یہ جواب ان دونوں کے سوال کے مطابق تو نہیں ہے۔ امام فخرالدین رازی متوفی ۶۰۶ھ نے اس کے حسب ذیل جوابات ذکر کیے ہیں:

(۱) حضرت یوسف کو علم تھا کہ ان میں سے ایک کے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ اس کو سولی پر چڑھا دیا جائے گا اور جب وہ اس جواب کو سنے گا تو بہت غمزدہ ہو گا اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے وعظ و نصیحت اور ان کی دیگر باتوں کے سننے سے متنفر ہو جائے گا، اس لیے حضرت یوسف نے اس میں مصلحت دیکھی پہلے ایسی باتیں کریں جن سے حضرت یوسف کا علم اور ان کا کلام ان کے دلوں میں موثر ہو حتیٰ کہ جب آپ ان کو خواب کی تعبیر بیان کریں تو اس کو عداوت اور تہمت پر نہ محمول کیا جائے۔

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ ارادہ کیا کہ ان کو یہ بیان کریں کہ ان کے علم کا مرتبہ ان کے اندازہ سے بہت بلند اور بہت فائق ہے، کیونکہ انہوں نے حضرت یوسف سے خواب کی تعبیر پوچھی تھی اور خواب کی تعبیر ظن اور تخمین پر مبنی ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام نے ان پر یہ ظاہر کیا کہ وہ غیب کی خبریں دیتے ہیں کیونکہ وہ کھانا آنے سے پہلے بتا دیتے تھے کہ آج ان کے گھروں سے کیا کھانا آئے گا اور حضرت یوسف غیب کی خبریں قطعی اور یقینی علم کی بناء پر بتاتے تھے جس سے باقی مخلوق عاجز تھی اور اس سے یہ واضح ہو گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام خواب کی جو تعبیر بتائیں گے وہ بھی محض ظن اور تخمین پر مبنی نہیں ہو گی بلکہ قطعی اور یقینی ہو گی، اور اس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام خواب کی تعبیر بتانے کے جس مرتبہ پر فائز ہیں اس درجہ تک کوئی اور نہیں پہنچا۔

(۳) جب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ دیکھ لیا کہ وہ دونوں آپ کے معتقد ہو چکے ہیں تو آپ نے ان کو بت پرستی ترک کرنے اور اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف دعوت دی کیونکہ دین کی اصلاح کرنا دنیا کی باتیں بتانے سے اولیٰ ہے۔

(۴) نانبائی کے متعلق حضرت یوسف علیہ السلام کو علم تھا کہ اس کو سولی دی جائے گی تو آپ نے یہ چاہا کہ اس کو مرنے سے پہلے مسلمان کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ کفر پر نہ مرے اور عذاب شدید کا مستحق نہ ہو، جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ۔ (الانفال: ۴۲)

تاکہ جس نے ہلاک ہونا ہے وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جس نے زندہ رہنا ہے وہ دلیل سے زندہ رہے۔

(۵) اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تمہارے پاس بیداری میں جو کھانا بھی آئے گا میں اس کے پہنچنے سے پہلے بتا دوں گا کہ وہ کس قسم کا کھانا ہے، اس کا رنگ کیسا ہے اور اس کی مقدار کتنی ہے اور اس کے کھانے کا انجام کیا ہو گا یعنی اس کے کھانے کے بعد انسان کی صحت قائم رہے گی یا وہ بیمار ہو جائے گا اور اس آیت کا ایک اور محمل یہ ہے کہ بادشاہ جب کسی قیدی کو مارنا چاہتا تھا تو اس کے کھانے میں زہر ملوا کر بھیجتا تھا، اور جب قید خانہ میں کھانا آتا تو حضرت یوسف بتا دیتے کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے یا نہیں، اور یہ جو حضرت یوسف نے فرمایا تھا: میں کھانا پہنچنے سے پہلے اس کی حقیقت بتا دوں گا اس سے یہی مراد ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام غیب کی خبر بتانے کا دعویٰ کرتے تھے اور یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کے قائم مقام ہے:

وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ۔ (آل عمران: ۴۹)

اور میں تمہیں اس چیز کی خبر دیتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور اس چیز کی خبر دیتا ہوں جو تم اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو۔

پس پہلی دو وجوہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام خواب کی تعبیر بتانے میں تمام لوگوں پر فائق تھے اور آخری تین وجوہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام اللہ کی طرف سے سچے نبی تھے اور غیب کی خبر دینا آپ کا معجزہ تھا۔

حضرت یوسف کے دعویٰ نبوت کے اشارات

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس آیت کو معجزہ پر محمول کرنا کس طرح درست ہوگا جبکہ اس سے پہلے ان کے دعویٰ نبوت کا ذکر نہیں ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ ان آیتوں میں ہرچند کہ صراحتاً دعویٰ نبوت کا ذکر نہیں ہے' لیکن ان آیتوں میں ایسے اشارے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے نبوت کا دعویٰ فرمایا تھا' مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

ذٰلِکُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ۔　　یہ (غیب کی خبریں دینا) میرے رب کی تعلیم (وحی) کی وجہ سے ہے۔

یعنی میں تم کو جو یہ غیب کی خبریں دے رہا ہوں یہ کوئی علم نجوم یا کہانت یا سحر کی وجہ سے نہیں ہے' یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کی میری طرف وحی فرمائی ہے' نیز فرمایا: میں نے اپنے باپ دادا کے دین کی پیروی کی ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۴۵۵' زاد المسیر ج ۴ ص ۲۲۵' ۲۲۴' الجامع لاحکام القرآن جز ۹' ص ۱۶۷-۱۶۶' النکت والعیون ج ۳ ص ۳۷' روح المعانی جز ۱۲ ص ۳۶۳' ۳۶۱' البحر المحیط ج ۶ ص ۲۷۷-۲۷۶)

مفسرین کی ان عبارات میں نبی کے علم پر علم غیب کے اطلاق کا ثبوت ہے۔

کافروں کے دین کو ترک کرنے کی توجیہ

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: "میں نے ان کے دین کو ترک کر دیا ہے۔" اس قول سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے پہلے ان کے دین کو اختیار کیا پھر اس کو ناپسند کر کے ترک کر دیا حالانکہ نبی کے لیے یہ محال ہے کہ وہ ایک آن کے لیے بھی کفار کے دین کو اختیار کرے۔ امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ نے اس کا یہ جواب دیا ہے:

ترک کا معنی یہ ہے کہ انسان کسی چیز کے ساتھ تعرض نہ کرے اور اس کی یہ شرط نہیں ہے کہ پہلے انسان نے اس کو اختیار کیا ہو' اور اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ان کے زعم کے اعتبار سے ان کے غلام تھے اور شاید وہ ان کے خوف کی وجہ سے بر سبیل تقیہ ان کے سامنے توحید اور ایمان کو ظاہر نہیں کرتے تھے' پھر اس وقت انہوں نے توحید اور ایمان کو ظاہر فرمایا اور اس وقت میں ان کا توحید اور ایمان کو ظاہر فرمانا ان کافروں کے دین کو ترک کرنے کے قائم مقام تھا اور یہ جواب زیادہ صحیح ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۴۵۶' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۵ھ)

امام رازی کا اس جواب کو زیادہ صحیح فرمانا صحیح نہیں بلکہ یہ جواب اصلاً درست نہیں ہے کیونکہ تقیہ کرنا نبی کی شان نہیں ہے' جان کے خوف سے باطل کی موافقت کرنا نبی کی شان نہیں ہے' نبی ہر وقت اور ہر حال میں حق کا اظہار کرتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کے ساتھ بھی تقیہ نہیں کیا اور صاف فرما دیا کہ یہ عورت ہی مجھے گناہ کی طرف راغب کر رہی تھی' اور اس عورت سے بھی موافقت نہیں کی بلکہ اس کو ملامت کی اور اس سے دامن چھڑا کر بھاگے۔

علامہ ابو الحیان محمد بن یوسف اندلسی متوفی ۷۵۴ھ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

چونکہ ساقی اور نانبائی حضرت یوسف کے حسن اخلاق اور ان کے علم کی وجہ سے ان سے محبت کرنے لگے تھے تو حضرت

یوسف نے چاہا کہ ان کے سامنے اپنے دین کا اظہار کریں تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ حضرت یوسف دین میں ان کی قوم کے مخالف ہیں تاکہ وہ بھی حضرت یوسف کے دین کی اتباع کریں۔ حدیث میں ہے کہ اگر اللہ تمہاری وجہ سے ایک شخص کو ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہت بہتر ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث:۳۰۰۹، صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۴۰۶)
حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کافروں کے دین کو بالکل بھی نہیں اپنایا تھا اس کے باوجود فرمایا: میں نے ان کے دین کو ترک کر دیا، یہاں ترک کا معنی یہ ہے کہ وہ ابتداء سے اس دین سے مجتنب رہے ہیں اور اس کو ترک سے اس لیے تعبیر فرمایا تاکہ وہ دونوں اس دین کو ترک کردیں اور حضرت یوسف کی محبت میں اس دین کے ترک کی طرف راغب ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ قول حضرت یوسف کے پہلے قول کی دلیل ہو، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے غیب کا علم دیا اور میری طرف وحی فرمائی کیونکہ میں نے ابتداء سے کافروں کے دین کو ترک کر دیا تھا اور انبیاء علیہم السلام کے دین کی پیروی کی تھی۔
(البحر المحیط ج ۶ ص ۲۷۷-۲۷۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۲ھ)

علامہ شہاب الدین احمد بن محمد بن عمر خفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ لکھتے ہیں:
حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: میں نے ان کے دین کو ترک کر دیا ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ میں نے تمہارے سامنے اپنے ترک کرنے کو ظاہر کیا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام اس دین کے ساتھ متصف تھے۔ (عنایت القاضی ج ۵ ص ۳۰۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ)
علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ نے بھی البحر المحیط اور خفاجی کا خلاصہ اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔
(روح المعانی ج ۱۲ ص ۳۶۴-۳۶۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

اور میرے نزدیک اس آیت کا محمل یہ ہے کہ ابتداء میں میرے سامنے میرے آباء کا دین تھا جو انبیاء ہیں اور دوسری طرف ان لوگوں کا دین تھا جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے تو میں نے کافروں کے دین کو ترک کر دیا اور انبیاء علیہم السلام کے دین کو اختیار کر لیا۔

مبدء اور معاد کے اقرار کی اہمیت

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور جو لوگ آخرت کے ساتھ کفر کرنے والے ہیں، میں نے ان کے دین کو ترک کر دیا ہے۔
اس آیت کا لفظ ھم ضمیر کا تکرار ہے کیونکہ فرمایا: ھم بالاخرۃ ھم کافرون۔ اور ھم ضمیر کو مکرر لانا تاکید اور حصر پر دلالت کرتا ہے، یعنی آخرت کا انکار کرنے میں یہ قوم منحصر اور مخصوص تھی، اور مبدء کے انکار کرنے کی بہ نسبت معاد کا انکار کرنا زیادہ شدید ہے اس لیے ھم ضمیر کو مکرر لا کر اس کی تاکید فرمائی ہے۔
جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے اس میں مبدء کے علم کی طرف اشارہ ہے اور جو لوگ آخرت کے ساتھ کفر کرنے والے ہیں اس میں معاد کے علم کی طرف اشارہ ہے، اور جو شخص قرآن مجید کے مضامین میں، اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں غور و فکر کرے گا اس پر یہ منکشف ہو گا کہ رسولوں کو بھیجنے اور کتابوں کو نازل کرنے سے اصل مقصود یہ ہے کہ مخلوق سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور مبدء اور معاد کا اقرار کرایا جائے اور اس کے علاوہ جو عقائد اور اعمال ہیں ان کی حیثیت ثانوی ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (یوسف علیہ السلام نے فرمایا) اور میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے دین کی اتباع کی ہے، ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک قرار دیں، یہ ہم پر اور لوگوں پر اللہ

کا فضل ہے لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ (یوسف: ۳۸)

اللہ کی نعمتوں کے اظہار کا جواز

امام رازی فرماتے ہیں کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اس معجزہ کا اظہار فرمایا جو علم الغیب ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی ذکر فرمایا کہ وہ اہل بیت نبوت سے ہیں اور ان کے باپ' دادا اور پردادا سب اللہ کے نبی اور رسول ہیں' اور جب انسان اپنے باپ دادا کے طریقہ اور پیشہ کا ذکر کرے تو یہ بعید نہیں ہے کہ اس کا بھی وہی پیشہ اور طریقہ ہو اور حضرت ابراہیم' حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی نبوت دنیا میں مشہور تھی اور جب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ ظاہر کیا کہ وہ بھی ان کے بیٹے ہیں تو ساقی اور نانبائی نے ان کی طرف بہت عزت اور احترام کے ساتھ دیکھا اور اب یہ قوی امید ہو گئی کہ وہ ان کی اطاعت کریں گے اور ان کے دلوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کے وعظ و نصیحت کا بہت قوی اثر ہو گا' اس آیت میں یہ دلیل بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں اور فضیلتوں کا اظہار کرنا جائز ہے۔

دین کا معنی

اس مقام پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نبی تھے تو انہوں نے یہ کیوں فرمایا کہ میں نے اپنے باپ دادا کی ملت کی اتباع کی ہے' کیونکہ نبی کی تو خود اپنی شریعت ہوتی ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ ملت سے حضرت یوسف علیہ السلام کی مراد دین ہے اور حضرت آدم سے لے کر سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء علیہم السلام کا دین واحد ہے' کیونکہ دین ان اصول اور عقائد کو کہتے ہیں جو سب نبیوں میں مشترک ہیں' مثلاً اللہ تعالیٰ کی توحید' انبیاء' رسولوں' فرشتوں' تقدیر اور قیامت کو ماننا۔ اس کی زیادہ وضاحت کے لیے الفاتحہ: ۳ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

شرک سے اجتناب کے اختصاص کی توجیہ

اس مقام پر دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: اور ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک قرار دیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک کرنا نہ صرف یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے جائز نہیں بلکہ یہ تو کسی کے لیے بھی جائز نہیں' پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے خصوصیت کے ساتھ یہ کس طرح فرمایا کہ ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے' اس کے دو جواب ہیں: ایک جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دینا ہر چند کہ کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے' لیکن انبیاء علیہم السلام کا مقام چونکہ عام لوگوں سے بہت بلند ہوتا ہے "اور جن کا رتبہ ہے سوا اس کو سوا مشکل ہے" کے مصداق ان پر گرفت بھی بہت سخت ہوتی ہے' اس لیے اللہ کے شریک بنانے کا عدم جواز ان کے لیے زیادہ شدید اور زیادہ موکد ہے۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان کے لیے اللہ کو شریک بنانا جائز نہیں ہے بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کفر اور شرک کی آلودگی سے پاک رکھا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ۔ (مریم: ۳۵) اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔

ایک سوال یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بالعموم شرک کی نفی کیوں کی اور یہ فرمایا: ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی چیز کو بھی شریک بنائیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے جو بر سبیل عموم نفی کی ہے کہ ہم کسی چیز کو بھی اللہ کا شریک نہیں بنائیں گے اس عموم کی یہ وجہ ہے کہ شرک کی بہت سی اصناف اور اقسام ہیں' بعض لوگ بتوں کی پرستش کرتے ہیں' اور بعض لوگ آگ کی پرستش کرتے ہیں اور بعض ستاروں کی پرستش کرتے ہیں' بعض فرشتوں کی پرستش

کرتے ہیں، اور بعض نبیوں کی پرستش کرتے ہیں مثلاً حضرت عیسیٰ اور عزیر کی، بعض جانوروں کی مثلاً گائے کی پرستش کرتے ہیں اور بعض درختوں کی مثلاً پیپل کی پرستش کرتے ہیں اور بعض لوگ گزرے ہوئے نیک بندوں کی پرستش کرتے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے ان تمام فرقوں کا رد فرمایا اور دین حق کی طرف رہنمائی فرمائی کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، وہی خالق ہے اور وہی رازق ہے۔

ایمان پر شکر ادا کرنے کا وجوب

اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: یہ ہم پر اور لوگوں پر اللہ کا فضل ہے لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔

اس آیت میں یہ بیان فرمایا کہ ہمارا شرک نہ کرنا اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق سے ہے۔ اس کے بعد فرمایا: لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ اس قول میں شکر ادا نہ کرنے والوں کی مذمت کی ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ شرک نہ کرنے اور ایمان لانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا واجب ہے، اس لیے ہر مومن پر واجب ہے کہ ایمان کی نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اللہ پر ایمان لانا، سب سے بڑی نعمت ہے اس لیے مسلمانوں پر واجب ہے کہ سب سے زیادہ اس نعمت کا شکر ادا کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے میری قید کے دونوں ساتھیو! آیا متعدد خدا بہتر ہیں یا ایک اللہ جو غالب ہے؟O (یوسف: ۳۹)

حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام میں توحید باری کی تقاریر

اس سے پہلی آیت کے ضمن میں حضرت یوسف علیہ السلام نے نبوت کا دعویٰ فرمایا تھا، اور نبوت کا اثبات الوہیت کے اثبات پر موقوف ہے، اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے الوہیت کے اثبات پر دلائل دینے شروع کیے۔

مخلوق کی اکثریت یہ تو مانتی تھی کہ ایک الٰہ ہے جو مستحق عبادت ہے، وہ عالم اور قادر ہے اور ساری کائنات کا خالق ہے، لیکن ان کا طریقہ یہ تھا کہ گزشتہ زمانہ میں جو نیک لوگ گزرے تھے وہ ان کی صورتوں کے بت تراش لیتے تھے یا ستاروں کے نام پر بت بنا لیتے تھے اور اس اعتقاد سے ان کی عبادت کرتے تھے کہ وہ نفع پہنچانے اور ضرر کو دور کرنے پر قادر ہیں، اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسے دلائل قائم کیے کہ بتوں کی عبادت کرنا جائز نہیں ہے اور ان دلائل کی تقاریر حسب ذیل ہیں:

(ا) اللہ تعالیٰ یہ بیان فرمایا ہے کہ اگر ایک سے زیادہ خدا ہوں تو جہان میں خلل اور فساد پیدا ہو گا۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔ اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا اور مستحق عبادت ہوتے تو آسمان اور زمین تباہ ہو جاتے۔ (الانبیاء: ۲۲)

کیونکہ اگر دو خدا ہوتے اور دونوں کی مساوی قوت ہوتی اور دونوں میں سے ہر ایک اپنی مرضی کے مطابق کائنات کا نظام چلانا چاہتا مثلاً ایک خدا سورج کو ایک جانب سے نکالنا چاہتا اور دوسرا خدا مخالف جانب سے نکالنا چاہتا اور دونوں کی مساوی قوت ہوتی اور وہ دونوں سورج کو اپنی اپنی جانب سے نکالنے کے لیے زور آزمائی کرتے تو اس کے نتیجہ میں سورج ٹوٹ کر بکھر جاتا، اسی طرح ایک خدا ایک درخت سے صرف سیب اگانا چاہتا اور دوسرا خدا اس درخت سے صرف آم اگانا چاہتا اور دونوں کی قوت مساوی ہوتی اور وہ دونوں اس درخت پر زور آزمائی کرتے تو وہ درخت پاش پاش ہو جاتا، علی ھذا القیاس، جب دو

مساوی طاقت کے خدا ہوتے اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے منصوبہ کے خلاف اس نظام کائنات کو چلانے کے لیے اس کائنات میں زور آزمائی کرتے تو یہ کائنات بکھر کر ریزہ ریزہ ہو جاتی، اس سے معلوم ہوا کہ خداؤں کی کثرت خلل اور فساد کو واجب کرتی ہے اور جب خدا صرف ایک ہو گا تو وہ صرف ایک قسم کے نظام کو جاری کرے گا اور چونکہ اس کائنات کا نظام ایک طرز پر جاری ہے، زمین میں روئیدگی ہو یا آسمان سے بارش کا نزول ہو، سورج، چاند اور ستاروں کا طلوع اور غروب ہو یا انسانوں اور حیوانوں میں پیدائش کا طریقہ ہو، ہم صدیوں سے دیکھتے چل آ رہے ہیں کہ کائنات کے اس نظام میں وحدت ہے، ہر چیز ایک ہی نظام کے تحت چل رہی ہے اور اس نظام کی وحدت زبان حال سے پکار کر یہ کہتی ہے کہ اس نظام کا ناظم بھی واحد ہے تو جب یہ ثابت ہو گیا کہ خداؤں کی کثرت اس جہان کے فساد کو واجب کرتی ہے اور خدا کا واحد ہونا ہی اس جہان کی سلامتی کا ضامن ہے اور اس نظام کی بقا اور اس کی حسن ترتیب کا موجب ہے تو پھر اے میرے ساتھیو! یہ بتاؤ کہ متعدد خداؤں کا ماننا بہتر ہے یا ایک اللہ کو ماننا بہتر ہے جو غالب ہے۔

(۲) یہ بت مصنوع ہیں، صانع نہیں ہیں، اور یہ مغلوب اور مقہور ہیں غالب اور قاہر نہیں ہیں، کیونکہ اگر کوئی انسان ان کو توڑنا یا خراب کرنا چاہے تو یہ اس کو کسی طرح روک نہیں سکتے اور جب یہ اپنے آپ کو کسی ضرر یا ہلاکت سے نہیں بچا سکتے تو دوسروں کو بھی کسی ضرر اور مصیبت سے نہیں بچا سکتے اور نہ کسی قسم کا کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں، اور یہ جو فرمایا تھا ان متعدد اور مختلف خداؤں کا پوجنا بہتر ہے! اس سے مراد یہ ہے کہ بنانے والے نے مختلف مقدار اور سائز کے بت بنائے تھے اور ان کے رنگ اور ان کی شکلیں بھی مختلف تھیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان بتوں کے بنانے والے جس رنگ، جس سائز اور جس شکل کے بت چاہتے تھے بنا لیتے تھے تو اے میرے بھائیو! یہ بتاؤ کہ ان متعدد اور مختلف اور مجبور اور مقہور بتوں کی پرستش کرنا بہتر ہے جو کسی سے ضرر دور کرنے اور نفع پہنچانے پر قادر نہیں ہیں یا اللہ کی عبادت کرنا بہتر ہے جو واحد ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور ہر خیر اور شر پر غالب ہے وہ جس سے چاہے ضرر دور کر دے اور جس کو چاہے نفع پہنچا دے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کا ایک ہونا ہی اس کی عبادت کو واجب کرتا ہے، کیونکہ فرض کرو اگر دو خدا ہوتے تو ہم کو یہ علم نہیں ہے کہ ان دو میں سے ہم کو کس خدا نے پیدا کیا ہے، اور کس نے ہم کو رزق دیا ہے اور کس نے ہم سے آفتوں اور مصیبتوں کو دور کیا ہے، اور کس نے ہم کو نفع پہنچایا ہے تو ہم شک میں پڑ جاتے کہ ہم اس خدا کی عبادت کریں یا اس خدا کی عبادت کریں، اسی طرح جب متعدد اور مختلف بت خدا ہوں گے اور بالفرض وہ ضرر دور کرنے والے اور نفع پہنچانے والے ہوں تو ہم کو کیسے علم ہو گا کہ ہم کو جو نفع حاصل ہوا ہے یا ہم سے جو ضرر دور ہوتا ہے وہ اس بت کا کارنامہ ہے یا کسی دوسرے بت کا کارنامہ ہے، یا ان دونوں کی یا سب کی مشارکت اور معاونت سے یہ اثر ظاہر ہوا ہے، پھر ہم شک میں پڑ جاتے کہ ہم ان متعدد اور مختلف بتوں میں سے کس کی عبادت کریں اور ان میں سے جس کی بھی عبادت کرتے تو ترجیح بلا مرجح لازم آتی یا ترجیح المرجوح لازم آتی، اور اس وقت ہم شک میں مبتلا ہو جاتے کہ ہماری عبادت کا مستحق یہ بت ہے یا دوسرا بت ہے، لیکن جب خدا ایک ہو گا تو پھر یہ شک نہیں ہو گا اور ہم کو یقین ہو گا کہ صرف یہی ہماری عبادت کا مستحق ہے اور اس پوری کائنات میں عبادت کا اس کے سوا اور کوئی مستحق نہیں ہے تو اے میرے بھائیو! اب بتاؤ کہ متعدد اور مختلف خداؤں کا ماننا بہتر ہے یا اللہ کو ماننا بہتر ہے جو غالب اور قہار ہے۔

(۴) قہار کی شرط یہ ہے کہ اس کے سوا اور کوئی قہر کرنے والا نہ ہو، اور وہ اپنے سوا ہر ایک کے لیے قاہر ہو، اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ معبود واجب الوجود لذاتہ ہو کیونکہ اگر وہ ممکن ہو گا تو وہ اپنے وجود میں کسی موجد کا محتاج ہو گا پھر وہ مقہور ہو گا قاہر

نہیں ہوگا اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ معبود واحد ہو کیونکہ اگر مثلاً دو معبود ہوں گے تو ان میں سے ہر ایک دوسرے پر قاہر ہوگا کیونکہ قہار وہ ہوتا ہے جو اپنے سوا ہر ایک کے لیے قاہر ہو، اور جب ہر ایک دوسرے پر قاہر ہوگا تو ان میں سے ہر ایک مقہور ہوگا' اس لیے ضروری ہے کہ جو معبود قہار ہو وہ واجب الوجود لذاتہ ہو اور واحد ہو اور جب معبود واحد ہے تو افلاک معبود نہیں ہوسکتے کیونکہ وہ متعدد ہیں، نہ کواکب اور سیارے، نہ نور اور ظلمت، نہ عقل نہ نفس، نہ حیوان نہ جمادات نہ نباتات، کیونکہ یہ سب متعدد ہیں سو جس نے ستاروں کو رب مانا تو وہ بھی ارباب متفرقین ہیں وہ قہار نہیں ہوسکتے، اسی طرح ارواح اور اجسام میں سے کوئی بھی معبود نہیں ہوسکتے کیونکہ وہ متعدد ہیں اور متعدد چیزیں قہار نہیں ہوسکتیں، قہار تو صرف واحد ہوتا ہے تو اے میرے بھائیو! یہ بتاؤ کہ ان متعدد اور مختلف چیزوں کو رب ماننا بہتر ہے یا اللہ کو رب ماننا بہتر ہے جو واحد اور قہار ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ واحد ہے' اس نے اپنی پہچان کرانے کے لیے اور اپنی عبادت کا حکم دینے کے لیے ایک لاکھ سے زیادہ انبیاء اور رسل بھیجے اور آسمانی کتابیں اور صحائف نازل کیے' اس نے یہ دعویٰ کیا کہ اس تمام کائنات کو اس نے پیدا کیا ہے اور وہ اکیلا اس نظام کو چلا رہا ہے، فرض کیجئے کہ اس کے علاوہ اور خدا بھی ہے جس نے اس دنیا کو بنانے اور چلانے میں اپنا رول ادا کیا ہے اور وہ بھی عبادت کا مستحق ہے تو کیا اس نے اپنی پہچان اور شناخت کرانے کے لیے اور اپنی عبادت کا حکم دینے کے لیے کوئی نبی اور رسول اس دنیا میں بھیجا کہ صرف وہی ایک نہیں ہے اس دنیا کو بنانے اور چلانے میں ہم دو خدا ہیں اس کا کوئی نبی بھی اس کے شریک ہونے پر کوئی معجزہ اور دلیل لے کر آیا' اللہ تعالیٰ کے نبی نے کہا میرا خدا سورج کو مشرق سے نکال کر مغرب میں غروب کرتا ہے، تو کیوں نہ اس دوسرے خدا نے اس دعویٰ کو باطل کیا اور اپنی ہستی کا احساس دلانے کے لیے کسی دن سورج کو اس کی مخالف جانب سے طلوع کر کے دکھایا' اللہ تعالیٰ نے کہا وہ زمین سے غلہ پیدا کرتا ہے تو اس دوسرے خدا نے کبھی آسمان سے رزق برسا کر دکھایا ہوتا کہ یہ میری پہچان ہے اور میری شناخت ہے' اس نے بھی اپنی شراکت کو ثابت کرنے کے لیے کوئی آسمانی کتاب نازل کی ہوتی' اس کے بھی کسی نبی نے کوئی معجزہ پیش کیا ہوتا' اپنی شراکت پر مبنی کوئی نظام دیا ہوتا' کسی طرح تو اپنے شریک ہونے کا احساس دلایا ہوتا تو اے میرے بھائیو! ان متعدد گونگے اور بے ثبوت خداؤں کو ماننا بہتر ہے یا اللہ تعالیٰ کو ماننا بہتر ہے جو واحد اور قہار ہے' جس نے اپنی پہچان اور شناخت کے لیے معجزات دے کر ایک لاکھ سے زائد انبیاء اور رسول بھیجے' آسمانی کتابیں نازل کیں' اپنی وحدانیت پر مبنی عبادات کا نظام دیا' اپنی توحید پر اس نظام کائنات کو دلیل بنایا جس دلیل کو آج تک کوئی توڑ نہیں سکا۔ فرض کیجئے کوئی دوسرا خدا بھی ہے اور قیامت کے دن اس نے ہم سے پوچھا کہ تم نے میری عبادت کیوں نہیں کی تو ہم کہہ دیں گے کہ تو نے اپنی پہچان اور شناخت کے لیے اپنا کون سا نمائندہ بھیجا' اپنی عبادت کا کون سا طریقہ بتایا تھا تو ہم ایسے گونگے اور بے ثبوت خدا کی عبادت کیسے کرتے!

حضرت یوسف علیہ السلام نے ان بتوں کو ارباب کیسے فرمایا جبکہ ان میں سے کوئی بھی رب نہیں ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کلام ان کے اعتقاد کے اعتبار سے ہے اور معنی یہ ہے کہ اگر بالفرض وہ رب ہوں تو متعدد رب ماننا بہتر ہے یا واحد۔

(۶) حضرت یوسف علیہ السلام کے اس کلام میں توحید پر ایک اور دلیل ہے اور وہ یہ ہے کہ متعدد آقاؤں کے مقابلہ میں ایک آقا کو راضی کرنا اور اس کی اطاعت کرنا آسان ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص کے دو آقا ہیں' ایک کہتا ہے اس وقت سو جاؤ اور دوسرا کہتا ہے اس وقت جاگتے رہو' ایک کہتا ہے اس وقت کھانا کھاؤ دوسرا کہتا ہے اس وقت کھانا مت کھاؤ تو وہ شخص دونوں کی اطاعت کیسے کر سکتا ہے اور جب ایک شخص دو کی اطاعت نہیں کر سکتا تو متعدد اور مختلف آقاؤں کی اطاعت کیسے کر سکتا ہے' پس اے میرے بھائیو! یہ بتاؤ کہ متعدد اور مختلف ارباب کو ماننا بہتر ہے یا صرف اللہ کو ماننا بہتر ہے جو واحد اور قہار ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تم اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہو وہ صرف چند اسماء ہیں جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیا ہے، اللہ نے ان کے ساتھ کوئی سند نہیں نازل کی، حکم صرف اللہ کا ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرو یہی صحیح دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے○ (یوسف: ۴۰)

بتوں کے صرف اسماء ہونے پر ایک اعتراض کا جواب

اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا: کیا متعدد اور متفرق رب ماننا بہتر ہے یا ایک اللہ کو جو قہار ہے! اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان متفرق ارباب کے مسمیات اور ان کے مصادیق موجود ہیں، اور اس آیت میں فرمایا ہے کہ ان کے صرف اسماء ہیں یعنی مسمیات اور مصادیق نہیں ہیں، اور یہ ان دو آیتوں میں کھلا ہوا تعارض ہے، اس کے دو جواب ہیں:

(۱) وہ ان بتوں کو الٰہ اور معبود کہتے تھے حالانکہ ان بتوں میں الوہی صفات موجود نہیں تھیں پس یہ بت نام کے الٰہ اور معبود تھے، الٰہ اور معبود کے مصداق اور مسمّٰی نہ تھے اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ صرف اسماء ہیں اور اس سے پہلی آیت میں یہ فرمایا: وہ ان کے خود ساختہ رب ہیں نہ کہ وہ فی الواقع رب ہیں۔

(۲) روایت ہے کہ وہ بت پرست مشبہ تھے، ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اصل الٰہ تو نور اعظم ہے اور ملائکہ انوار صغیرہ ہیں اور انہوں نے ان انوار کی صورتوں پر یہ بت تراش لیے تھے اور حقیقت میں ان کے معبود انوار سماویہ تھے اور یہی مشبہ کا قول ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ایک بہت بڑا جسم عرش پر مستقر ہے اور وہ اس کی عبادت کرتے ہیں اور حقیقت میں ان کا تصور شدہ جسم موجود نہیں ہے پس وہ ایسے اسماء کی عبادت کرتے تھے۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۴۵۹)

کفار کے اس قول کا رد کہ اللہ نے بتوں کی تعظیم کا حکم دیا ہے

بت پرستوں کی ایک جماعت یہ کہتی تھی کہ ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ یہ بت اس معنیٰ میں خدا ہیں کہ انہوں نے اس جہان کو پیدا کیا ہے، لیکن ہم ان بتوں پر معبود کا اس لیے اطلاق کرتے ہیں اور ان کی اس لیے عبادت کرتے ہیں کہ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کی عبادت کرنے اور ان کی تعظیم بجالانے کا حکم دیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعویٰ کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ ان بتوں کو الٰہ اور معبود کہنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا اور نہ اللہ تعالیٰ نے اس نام کو رکھنے کی کوئی دلیل نازل کی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور نے یہ حکم دیا ہے تو اس کا حکم لائق التفات اور قابل توجہ نہیں ہے چہ جائیکہ وہ حکم واجب القبول ہو اور اس کی اطاعت ضروری ہو، کیونکہ حکم دینے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔

اللہ کے مستحق عبادت ہونے کی دلیل

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرو کیونکہ عبادت انتہائی تعظیم اور اجلال بجالانے کا نام ہے اور انتہائی تعظیم اسی کی جائز ہے جس نے انتہائی انعام و اکرام کیا ہو، اور اللہ تعالیٰ نے ہی انسان کو پیدا کیا، اسی نے اس کو زندگی دی اور اسی نے اس کو عقل، رزق اور ہدایت عطا کی اور اللہ تعالیٰ کی انسان پر حد و شمار سے باہر نعمتیں ہیں ور اس کے احسان کی وجوہات غیر متناہی ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کا انسان پر انتہائی انعام و اکرام ہے، اور جب انتہائی انعام و اکرام اللہ تعالیٰ نے کیا ہے تو انتہائی تعظیم اور اجلال کا بھی وہی مستحق ہے اس لیے اس کے سوا اور کسی کی عبادت کرنا جائز نہیں ہے۔

اس بات کی توجیہ کہ اکثر لوگ اللہ کے استحقاق عبادت کو نہیں جانتے

اس کے بعد فرمایا: لیکن اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے کہ عبادت کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے لہٰذا وہ زمین میں رونما ہونے والے واقعات کا استناد افلاک اور ستاروں کی طرف کرتے ہیں، کیونکہ ان کو یہ علم ہے کہ کوئی چیز بھی کسی سبب کے بغیر رونما

نہیں ہوتی، وہ دیکھتے ہیں کہ گرمیوں اور سردیوں کے موسم میں جو زمینی پیداوار حاصل ہوتی ہیں ان میں سورج کی حرکت اور اس کے تغیر کا دخل ہوتا ہے اس لیے ان کے دماغوں میں یہ بات مرکوز ہو گئی کہ اس جہان میں جو حوادث رونما ہوتے ہیں ان کا سبب سورج، چاند اور باقی ستارے ہیں، پھر اللہ نے جب انسان کو توفیق دی تو اس نے یہ جان لیا کہ بالفرض ان حوادث کا سبب یہ افلاک اور کواکب ہیں لیکن یہ افلاک اور کواکب بھی تو ممکن اور حادث ہیں، انہیں بھی تو کسی موجد اور خالق کی ضرورت ہے اور ضروری ہے کہ وہ موجد اور خالق واجب الوجود ہو اور اس کا واحد ہونا ضروری ہے اور جب ان افلاک اور کواکب کا خالق وہ ذات واحد ہے تو کیوں نہ تمام حوادث کا خالق اسی کو مان لیا جائے لیکن ایسے عقل والے بہت کم ہیں اس لیے فرمایا: لیکن اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (حضرت یوسف نے فرمایا) اے میری قید کے دونوں ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلایا کرے گا اور رہا دوسرا تو اس کو سولی دی جائے گی، پھر پرندے اس کے سر سے (گوشت نوچ کر) کھائیں گے تم جس کے متعلق سوال کرتے تھے اس کا (اسی طرح) فیصلہ ہو چکا ہے O (یوسف: ۴۱)

ساقی اور نانبائی کے خواب کی تعبیر

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے سامنے معجزہ پیش کر کے اپنی رسالت کو ثابت کر دیا اور ان کو توحید کا پیغام پہنچا کر بت پرستی سے منع کر دیا تو پھر ان کے سوال کے جواب میں خواب کی تعبیر بیان کی۔

ابن السائب نے بیان کیا جب ساقی نے حضرت یوسف علیہ السلام سے اپنا خواب بیان کیا اور کہا میں نے خواب دیکھا کہ میں انگور کے تین خوشوں سے شراب نچوڑ رہا ہوں تو آپ نے فرمایا: تم نے بہت اچھا خواب دیکھا ہے، تین خوشوں سے مراد تین دن ہیں، تین دن گزرنے کے بعد بادشاہ تم کو بلوائے گا اور تم کو دوبارہ تمہارے منصب پر بحال کر دے گا، اور نانبائی سے فرمایا: تم نے برا خواب دیکھا ہے، تم نے خواب دیکھا ہے کہ تم روٹی کی تین زنجیریں اٹھائے ہوئے ہو، تین زنجیروں سے مراد تین دن ہیں، تین دن گزرنے کے بعد بادشاہ تم کو بلائے گا اور تم کو قتل کر کے سولی پر چڑھا دے گا اور تمہارے سر سے گوشت نوچ کر پرندے کھائیں گے۔ ان دونوں نے کہا: ہم نے تو کوئی خواب نہیں دیکھا تھا! حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: جس چیز کے متعلق تم نے سوال کیا ہے اس کا اسی طرح فیصلہ ہو چکا ہے۔ یعنی اس معاملہ سے فراغت ہو چکی ہے خواہ تم نے سچ بولا ہو یا جھوٹ بولا ہو، عنقریب اسی طرح واقع ہو گا۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے تاویل کے واقع ہونے کو حتمی اور یقینی طور پر کیوں فرمایا جبکہ خواب کی تعبیر ظنی ہوتی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آ چکی تھی اور انہوں نے وحی کے ذریعہ جان کر یہ تعبیر بتائی تھی۔ (زاد المسیر ج ۴ ص ۵۹۷، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جس کے متعلق یوسف کا گمان تھا کہ وہ ان دونوں میں سے نجات پانے والا ہے اس سے انہوں نے کہا تم اپنے آقا کے سامنے میرا ذکر کرنا، پس شیطان نے ان کو اپنے رب سے ذکر کرنا بھلا دیا، پس وہ قید خانہ میں (مزید) کئی سال ٹھہرے رہے O (یوسف: ۴۲)

خواب کی تعبیر کے متعلق حضرت یوسف علیہ السلام کے ظن کی توجیہ

اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو وحی کے ذریعہ معلوم تھا کہ ساقی کی نجات ہوگی تو اللہ تعالیٰ نے یہ کس طرح فرمایا کہ جس کے متعلق یوسف کو ظن تھا کہ اس کی نجات ہوگی، اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کی

بکثرت آیات میں ظن بہ معنی یقین بھی مستعمل ہے جیسا کہ ان آیتوں میں ہے:

اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ۔ (البقرہ: ۴۶) جو لوگ یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں۔

اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ۔ (الحاقہ: ۲۰) مجھے یہ یقین تھا کہ میں اپنے حساب سے ضرور ملاقات کرنے والا ہوں۔

شیطان کے بھلانے کے متعلق دو تفسیریں

حضرت یوسف علیہ السلام نے ساقی سے کہا جس کے متعلق حضرت یوسف علیہ السلام کو یقین تھا کہ وہ قید خانہ سے نکل کر بادشاہ کی خدمت میں پہنچنے والا ہے کہ تم اپنے آقا کے سامنے میرا ذکر کرنا' اس کا معنی یہ ہے کہ تم بادشاہ کو یہ بتانا کہ میں اپنے بھائیوں کی طرف سے پہلے ہی مظلوم تھا' انہوں نے مجھے گھر سے نکال کر فروخت کر دیا' پھر مجھ پر اس واقعہ کی وجہ سے ظلم ہوا اور مجھ پر تہمت لگا کر مجھے قید کر دیا گیا۔

اس کے بعد فرمایا: پس شیطان نے ان کو اپنے رب سے ذکر کرنا بھلا دیا۔

اس آیت کی دو تفسیریں ہیں۔ امام ابن اسحاق نے کہا: بادشاہ کے سامنے ذکر کرنا شیطان نے ساقی کو بھلا دیا۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۷۸۲) لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ اس تفسیر کی موافقت نہیں کرتے۔ اس صورت میں آیت یوں ہونا چاہیے تھی: فانسہ الشیطان ذکرہ لربہ "پس ساقی کو شیطان نے اس کے آقا سے یوسف کا ذکر کرنا بھلا دیا" جبکہ آیت کے الفاظ اس طرح ہیں فانسہ الشیطان ذکر ربہ "پس یوسف کو شیطان نے اپنے رب سے ذکر کرنا بھلا دیا"۔ اس پر یہ اعتراض ہے کہ شیطان کے لیے وسوسہ ڈالنا تو ممکن ہے لیکن نسیان طاری کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ نسیان کا معنی ہے دل سے علم کو زائل کر دینا اور اس پر شیطان کو قدرت نہیں ہے ورنہ وہ تمام بنو آدم کے دلوں سے اللہ تعالیٰ کی معرفت کو زائل کر دیتا' اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان انسان کے دل میں مختلف چیزوں کے وسوسے ڈالتا ہے اور کسی چیز کے وسوسے ڈال کر کسی اور چیز سے اس کا دھیان ہٹا دیتا ہے' شیطان نے کئی چیزوں کی طرف حضرت یوسف کو متوجہ کیا حتیٰ کہ ان میں الجھ کر حضرت یوسف اللہ تعالیٰ سے عرض اور التجا کرنا بھول گئے اور انہوں نے ساقی سے کہا: تم بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا کہ مجھے ظلماً قید کیا گیا ہے تاکہ میری رہائی کا سبب ہو جائے' اس معنی کی تائید میں حسب ذیل روایات ہیں:

حضرت یوسف علیہ السلام کو بھلانے کے متعلق روایات

امام محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو بات حضرت یوسف نے کہی تھی اگر وہ نہ کہتے تو اتنی مدت تک قید میں نہ رہتے۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۷۷۷)

حسن بصری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت یوسف پر رحم فرمائے اگر ان کی وہ بات نہ ہوتی تو وہ اتنی مدت تک قید میں نہ رہتے۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۷۷۸' تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۶۳۵)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یوسف وہ بات نہ کہتے تو اتنی مدت تک قید میں نہ رہتے یعنی انہوں نے غیر اللہ سے رہائی کو طلب کیا تھا۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۷۷۹)

قتادہ کہتے ہیں کہ ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یوسف بادشاہ کے پاس شفاعت کو طلب نہ کرتے تو اتنی مدت تک قید میں نہ رہتے یعنی انہوں نے غیر اللہ سے رہائی کو طلب کیا تھا۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۷۷۹)

قتادہ کہتے ہیں کہ ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یوسف بادشاہ کے پاس شفاعت کو طلب نہ کرتے تو اتنی مدت تک قید میں نہ رہتے لیکن ان پر اس لیے عتاب کیا گیا کہ انہوں بادشاہ کے پاس شفاعت کو طلب کیا تھا۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۷۸۰)

مجاہد اور ابوحذیفہ سے بھی اسی طرح کی روایات ہیں۔

(جامع البیان جز ۱۲ ص ۲۹۳۔ ۲۹۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۶۳۶)

شیطان کے بھلانے کے متعلق اختلاف مفسرین

حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ کا مختار یہ ہے کہ شیطان نے ساقی کو بادشاہ کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کرنا بھلا دیا تھا اور اس سلسلہ میں عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو حدیث روایت کی ہے اس کو انہوں نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۵۳۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۹ھ)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ نے بھی یہ لکھا ہے کہ شیطان نے ساقی کو بادشاہ کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کرنا بھلا دیا تھا۔ (روح المعانی جز ۱۲ ص ۳۷۲ مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

علامہ ابو الحسن علی بن محمد الماوردی المتوفی ۴۵۰ھ، علامہ ابو محمد بغوی شافعی متوفی ۵۱۶ھ، امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ اور علامہ ابو عبد اللہ القرطبی المالکی المتوفی ۶۶۸ھ کا مختار یہ ہے کہ شیطان نے حضرت یوسف کو اللہ تعالیٰ سے دعا اور التجا کرنا بھلا دیا۔

نبی کو بھلانے کی توجیہ

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد المالکی القرطبی المتوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے نسیان کی شیطان کی طرف نسبت کرنا کس طرح درست ہوگا حالانکہ انبیاء علیہم السلام پر شیطان کا بالکل تسلط نہیں ہوتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا نسیان صرف اس صورت میں محال ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کا پیغام بندوں تک پہنچاتے ہیں یعنی وحی الٰہی کی تبلیغ میں، وہ اس میں معصوم ہوتے ہیں، اور جن صورتوں میں ان سے نسیان ہونا جائز ہے ان صورتوں میں ان کے نسیان کو شیطان کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اور یہ نسبت وہیں کی جا سکتی ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے نسیان کی خبر دی ہو اور ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم ان کی طرف نسیان کی نسبت کریں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ (طٰہٰ: ۱۱۵)	اور بے شک ہم نے اس سے پہلے آدم سے عہد لیا تھا تو وہ بھول گئے اور ہم نے ان (کی معصیت) کا کوئی قصد نہیں پایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت آدم بھول گئے تو ان کی اولاد بھی بھول گئی۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۷۶، اس حدیث کی سند صحیح ہے) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں محض بشر ہوں، میں اس طرح بھول جاتا ہوں جس طرح تم بھول جاتے ہو۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۰۱، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۵۷۲)

(الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۱۷۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ نظام الدین الحسن بن محمد القمی النیشاپوری المتوفی ۷۲۸ھ لکھتے ہیں:
شیطان کی طرف بھلا دینے کی نسبت مجاز ہے کیونکہ بھلانے کا معنی ہے دل سے علم کو زائل کر دینا اور شیطان کو اس پر بالکل قدرت نہیں ہے ورنہ وہ بنو آدم کے دلوں سے اللہ تعالیٰ کی معرفت کو زائل کر دیتا' اس نے صرف دل میں وسوسے ڈالے' اور دل میں ایسے خیالات ڈالے اور ایسے کاموں کی طرف دل کو متوجہ کیا جو نسیان کا سبب بن گئے۔
(غرائب القرآن و رغائب الفرقان ج ۴ ص ۹۰' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۶ھ)

علامہ شہاب الدین احمد بن محمد خفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ لکھتے ہیں:
شیطان کا بھلانا اس کے اغوا اور گمراہ کرنے کے قبیل سے نہیں تھا بلکہ بلند مرتبہ خواص کے ترک اولیٰ کے قبیل سے تھا۔
(عنایت القاضی ج ۵ ص ۳۰۹' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۷ھ)

اس آیت میں چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھولنے کی بحث آگئی ہے' اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نمازوں میں سہو ہوا اور آپ سے جو نمازیں قضا ہوئیں اور آپ کے سہو اور نسیان کے متعلق یہاں پر تفصیلی گفتگو کر لیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نسیان کی تحقیق

امام مالک کہتے ہیں کہ ہمیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک میں بھولتا ہوں یا بھلا دیا جاتا ہوں تاکہ میری سنت قائم کی جائے۔
(موطا امام مالک رقم الحدیث: ۲۲۵' التمہید ج ۴ ص ۳۵۹' ج ۱۰ ص ۵۵۹' الشفاء ج ۲ ص ۱۳۳)

حافظ ابو عمرو یوسف بن عبداللہ بن عبد البر مالکی متوفی ۴۶۳ھ لکھتے ہیں:
آپ کی مراد یہ ہے کہ میں اپنی امت کے لیے اس چیز کو سنت قرار دوں کہ جب ان کو سہو ہو جائے تو وہ کس طرح عمل کریں' تاکہ وہ میری اقتداء کریں اور میرے فعل کی اتباع کریں۔
(الاستذکار ج ۲ ص ۴۰۲' مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ بیروت' ۱۴۱۳ھ)

سہو اور نسیان کا فرق

حافظ شہاب الدین احمد بن محمد خفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ لکھتے ہیں:
علامہ راغب اصفہانی نے کہا: غفلت کی وجہ سے کسی خطا کا سرزد ہو جانا سہو ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ سہو ہے جس میں انسان کی کوتاہی نہیں ہوتی جس میں غفلت کا سبب اس کا اختیاری فعل نہیں ہوتا' دوسری وہ قسم ہے جس میں غفلت کا سبب اس کا اختیاری فعل ہوتا ہے مثلاً کوئی شخص نشہ آور چیز کھائے پھر بلا قصد کوئی برا کام یا گناہ کرے اور یہ سہو مذموم ہے۔
قرآن مجید میں ہے:

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ۔ — وہ لوگ جو اپنی نمازوں سے غفلت کرتے ہیں۔

(الماعون: ۵)

یہاں سہو سے وہی سہو مراد ہے جس میں غفلت کا سبب اختیاری ہو مثلاً کوئی شخص نماز کے وقت سے تھوڑی دیر پہلے سو جائے' نماز کا وقت گزر جائے اور اس کی آنکھ نہ کھلے اور سہو کی پہلی قسم کی مثال وہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نمازوں میں اکثر واقع ہوا' علامہ خفاجی کہتے ہیں کہ میں یہ کہتا ہوں کہ سہو اور نسیان میں فرق یہ ہے کہ جو چیز قوت حافظہ میں ہو اس سے

معمولی غفلت ہو اور ادنیٰ تنبیہہ سے اس کا ذہن اس چیز کی طرف متوجہ ہو جائے تو یہ سہو ہے اور جو چیز حافظہ سے بالکلیہ زائل ہو جائے تو یہ نسیان ہے' اسی وجہ سے اطباء نسیان کو بیماری قرار دیتے ہیں نہ کہ سہو کو۔

(نسیم الریاض ج ۴ ص ۱۶۱' مطبوعہ دار الفکر بیروت)

افعال تبلیغیہ میں سہو اور نسیان کا جواز اور اقوال تبلیغیہ میں سہو اور نسیان کا عدم جواز

قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴ھ لکھتے ہیں:

اکثر فقہاء اور متکلمین کا یہ مذہب ہے کہ افعال تبلیغیہ اور اعمال شرعیہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا قصد اور سہوا مخالفت کا واقع ہونا جائز ہے' جیسا کہ نماز میں آپ کے سہو سے متعلق احادیث ہیں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۰۱' صحیح مسلم رقم الحدیث: ۵۷۲) اور اقوال تبلیغیہ میں آپ سے سہو کا واقع ہونا جائز نہیں ہے' کیونکہ اقوال میں آپ کے صدق پر معجزہ قائم ہے اور اس میں مخالفت کا واقع ہونا معجزہ کے خلاف ہے' اور افعال میں سہو کا واقع ہونا معجزہ کے خلاف نہیں ہے اور نہ نبوت میں طعن اور اعتراض کا موجب ہے' بلکہ یہ دل پر غفلت طاری ہونے اور فعل میں غلطی واقع ہونے کے قبیل سے ہے' جو کہ بشری تقاضا ہے اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں صرف بشر ہوں (یعنی خدا نہیں ہوں) اور جس طرح تم بھولتے ہو اسی طرح میں بھی بھول جاتا ہوں پس جب میں بھول جاؤں تو تم مجھے یاد دلایا کرو۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۵۷۲) بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں سہو اور نسیان کا طاری ہونا علم کا فیضان کرنے اور شریعت کو مقرر کرنے کا سبب ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا: میں اس لیے بھولتا ہوں یا بھلا دیا جاتا ہوں کہ میں کسی فعل کو سنت کروں بلکہ یہ بھی مروی ہے کہ میں بھولتا نہیں ہوں لیکن میں بھلا دیا جاتا ہوں۔

بلکہ سہو اور نسیان کی حالت' تبلیغ میں اضافہ ہے اور نعمت کو مکمل کرنا ہے اور نقص اور اعتراض سے بہت دور ہے' کیونکہ جو علماء نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سہو کے قائل ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ رسولوں کو سہو اور غلطی پر برقرار نہیں رکھا جاتا بلکہ ان کو فوراً تنبیہہ کر دی جاتی ہے اور وہ فی الفور صحیح حکم کو پہچان لیتے ہیں اور صوفیہ کی ایک جماعت کا یہ مسلک ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سہو' نسیان اور غفلت کا طاری ہونا بالکل جائز نہیں ہے اور جن احادیث میں نماز میں سہو واقع ہونے کا ذکر ہے ان کی انہوں نے اپنے طور پر تشریح کی ہے۔ (الشفاء ج ۲ ص ۱۳۲-۱۳۱' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

بھولنے اور بھلائے جانے کے دو محمل

علامہ ابوالولید سلیمان بن خلف باجی مالکی متوفی ۴۹۴ھ لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں بھولتا ہوں یا بھلا دیا جاتا ہوں تاکہ اس فعل کو میں سنت بنا دوں۔ اس حدیث میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ میں بیداری میں بھولتا ہوں اور نیند میں بھلا دیا جاتا ہوں' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دل نہیں سوتا تھا اگرچہ نماز یا کسی اور کام کے وقت آپ کو نیند ہوتی تھی' آپ نے بیداری میں بھولنے کی نسبت اپنی طرف کی کیونکہ اس وقت میں آپ لوگوں کے ساتھ معاملات میں مشغول ہوتے تھے' اور نیند کی حالت میں آپ نے اپنے بھولنے کی نسبت اپنے غیر کی طرف کی کیونکہ اس حال میں آپ کی لوگوں کے ساتھ مشغولیت نہیں ہوتی تھی اور اس میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ میں اس طرح بھولتا ہوں جس طرح نسیان میں کسی چیز سے سہو اور ذہول ہوتا ہے اور اس سے توجہ ہٹ جاتی ہے یا کسی چیز کو یاد ہونے اور اس کی طرف متوجہ ہونے کے باوجود میں اس کو بھول جاتا ہوں' پس آپ نے بھولنے کی ایک صورت کو اپنی طرف منسوب کیا اور دوسری صورت کو اپنے غیر کی طرف منسوب کیا' کیونکہ ایک صورت میں کسی سبب سے بھولنا ہے اور دوسری صورت

میں بغیر کسی سبب کے اضطراری طور پر بھولنا ہے۔

(المستقیٰ ج ۱ص ۱۸۲، دار الکتاب العربی بیروت، تنویر الحوالک ص ۱۱۹، مطبوعہ دار الکتاب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ)

لیلۃ التعریس میں نماز فجر قضا ہونے کی تحقیق

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم (خیبر سے واپسی کے موقع پر) ایک رات کو سفر کر رہے تھے۔ بعض صحابہ نے کہا یا رسول اللہ! اگر ہم رات کے آخری حصہ میں یہاں قیام کر لیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے یہ خطرہ ہے کہ تم سوتے رہو گے اور فجر کی نماز کے لیے نہیں اٹھ سکو گے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا: میں آپ سب کو بیدار کر دوں گا، پس وہ سب لیٹ گئے اور حضرت بلال نے اپنی سواری سے ٹیک لگالی، ان پر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ سو گئے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو سورج کی بھوں طلوع ہو چکی تھی، آپ نے فرمایا: اے بلال! تم نے جو کہا تھا اس کا کیا ہوا؟ حضرت بلال نے کہا: آج سے پہلے مجھے کبھی اتنی گہری نیند نہیں آئی تھی۔ آپ نے فرمایا: اللہ جب چاہتا ہے تمہاری روحوں کو قبض کر لیتا ہے اور جب چاہتا ہے تمہیں وہ روحیں لوٹا دیتا ہے، آپ نے فرمایا: اے بلال! تم لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر اذان دو، پھر آپ نے وضو کیا اور جب سورج بلند ہو کر سفید ہو گیا تو آپ نے کھڑے ہو کر نماز پڑھائی۔ امام مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھانے کے بعد فرمایا: جو شخص نماز کو بھول جائے تو اس کو جب یاد آ جائے تو وہ نماز پڑھ لے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: مجھے یاد کرنے کے لیے نماز پڑھو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۹۵، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۶۸۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اے عائشہ! میری آنکھیں سو جاتی ہیں اور میرا دل نہیں سوتا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۱۴۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۷۳۸) اس حدیث کی بنیاد پر یہ سوال قائم ہوتا ہے کہ جب آپ کا دل بیدار تھا تو غزوۂ خیبر سے واپسی کے موقع پر رات کے آخری حصہ میں سونے کے بعد آپ کی آنکھ کیوں نہیں کھلی، حتیٰ کہ آپ کی آنکھ اس وقت کھلی جب فجر کی نماز قضا ہو چکی تھی اور سورج طلوع ہو چکا تھا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۹۵، صحیح مسلم رقم الحدیث ۶۸۰، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۴۳۵، سنن النسائی رقم الحدیث: ۶۲۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۶۹۷، موطا امام مالک رقم الحدیث: ۲۶،۲۵)

علامہ نووی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ آپ کا دل یاد الٰہی میں بیدار تھا لیکن فجر کے وقت کو دیکھنے کا تعلق آنکھوں سے ہے اور آنکھیں نیند میں تھیں، یعنی قلب جو معقولات اور انوار و تجلیات کا منبع اور مرکز ہے وہ بیدار تھا اور محسوسات اور مبصرات کے ادراک کا تعلق آنکھوں سے ہے وہ محو خواب تھیں، اور علامہ عینی اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ غالب احوال میں دل جاگتا رہتا تھا، لیکن کبھی کبھی آپ پر عام انسانوں کی طرح ایسی نیند وارد ہوتی تھی جس میں دل بھی محو خواب ہو تا تھا اور یہ واقعہ ایسے ہی احوال میں سے ہے کیونکہ اس موقع پر آپ نے فرمایا تھا: اللہ نے ہمارے روحیں قبض کر لی تھیں، ایک اور حدیث میں فرمایا: اگر اللہ چاہتا تو ہمیں بیدار کر دیتا۔ (موطا امام مالک رقم الحدیث: ۲۶) تیسرا جواب یہ ہے کہ دل جاگنے کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ کی آنکھیں سوتی تھیں تو نیند قلب پر مستغرق نہیں ہوتی تھی حتیٰ کہ وضو ٹوٹ جائے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ آپ سو جاتے تھے لوگ آپ کے خراٹے سنتے تھے، اس کے بعد آپ حضرت بلال کی اذان سن کر بغیر وضو کے نماز پڑھانے چلے جاتے تھے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۱۷، ۶۳۱۶، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۷۶۳) چوتھا جواب یہ ہے کہ دل اس لیے جاگتا رہتا ہے کہ نیند میں بھی آپ پر وحی نازل ہوتی ہے اور انبیاء کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں، لہٰذا دل کی

بیداری کا معاملہ صرف وحی ربانی سے رابطہ ہے، فجر کے طلوع اور عدم طلوع سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موقع پر جو نماز قضا ہوئی، وہ ظاہر کے اعتبار سے ادا ہے، کیونکہ آپ کا کوئی فعل اتباع وحی کے بغیر نہیں ہوتا اور اس موقع پر آپ کو اسی وقت میں فجر کی نماز پڑھنے کا حکم تھا، تاکہ امت کے لیے آپ کی زندگی میں قضا نماز پڑھنے کا اسوہ اور نمونہ قائم ہو، لطف کی بات یہ ہے کہ جب ہم ادا نماز پڑھتے ہیں تو عام طور پر ہمارا دل دنیا میں مشغول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر نہیں ہوتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس حال میں نماز بظاہر قضا تھی اس وقت بھی آپ کا دل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر اور مستغرق تھا سو جن کی قضا کی یہ کیفیت ہے ان کی ادا کا کیا عالم ہوگا۔

غزوۂ خندق میں نمازیں قضا ہونے کی تحقیق

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ خندق کے دن حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ غروب آفتاب کے بعد آئے اور انہوں نے کفار قریش کو برا کہنا شروع کر دیا، انہوں نے کہا یا رسول اللہ! سورج غروب ہو گیا اور میں عصر کی نماز نہیں پڑھ سکا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی قسم! میں نے بھی عصر کی نماز نہیں پڑھی پھر ہم وادی بطحان میں کھڑے ہوئے، آپ نے نماز کے لیے وضو کیا اور ہم نے بھی نماز کے لیے وضو کیا، پھر آپ نے غروب آفتاب کے بعد پہلے عصر کی نماز پڑھی پھر اس کے بعد آپ نے مغرب کی نماز پڑھی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۵۹۶، صحیح مسلم رقم الحدیث:۶۳۱، سنن الترمذی رقم الحدیث:۱۸۰، سنن النسائی رقم الحدیث:۱۳۶۵، صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث:۹۹۵، صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۲۸۸۹، شرح السنہ رقم الحدیث:۳۹۶)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

موطا امام مالک میں سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ آپ سے اس دن ظہر اور عصر کی نماز قضا ہو گئی تھی۔ (موطا امام مالک رقم الحدیث:۴۴۳) اور حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ آپ سے اس دن ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں قضا ہو گئی تھیں جو انہوں نے رات شروع ہو جانے کے بعد پڑھیں۔ (سنن نسائی رقم الحدیث:۶۶۰) اور سنن ترمذی اور سنن نسائی میں یہ روایت ہے کہ ان کی چار نمازیں قضا ہو گئی تھیں۔ قاضی ابوبکر ابن العربی نے کہا کہ ان کی صرف عصر کی نماز قضا ہوئی تھی جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے اور بعض علماء نے ان روایات میں تطبیق دی ہے کہ خندق کی جنگ کئی دنوں تک ہوتی رہی ہے اور نمازوں کے قضا ہونے کے واقعات کئی دنوں کے ہیں، کسی دن صرف عصر کی نماز قضا ہوئی جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے۔ (صحیح البخاری:۵۹۶، مسلم:۶۳۱) اور کسی دن ظہر اور عصر کی دو نمازیں قضا ہوئیں جیسا کہ موطا میں ہے۔ (موطا:۴۴۳) اور کسی دن ظہر، عصر اور مغرب کی تین نمازیں قضا ہوئیں جیسا کہ سنن نسائی میں ہے۔ (نسائی:۶۶۰) اس کو ہم عنقریب ذکر کریں گے اور کسی دن چار نمازیں قضا ہوئیں جیسا کہ درج ذیل روایت میں ہے:

(فتح الباری ج ۲ ص ۷۰-۶۹، مطبوعہ لاہور)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ خندق کے دن چار نمازیں پڑھنے سے مشغول رکھا، حتیٰ کہ رات کا جتنا حصہ اللہ تعالیٰ نے چاہا گزر گیا، پھر آپ نے حضرت بلال کو اذان دینے کا حکم دیا تو انہوں نے اذان دی پھر اقامت کہی پھر آپ نے ظہر پڑھی پھر اقامت کہی تو آپ نے عصر پڑھی پھر اقامت کہی تو آپ نے مغرب پڑھی پھر اقامت کہی تو آپ نے عشاء پڑھی۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۱۷۹، سنن النسائی رقم الحدیث:۶۶۲، سنن ابوداؤد الطیالسی رقم الحدیث:۳۳۳، مصنف ابن ابی شیبہ

ج ۲ ص ۷۰، مسند احمد ج ا ص ۷۵، ۴۳ سنن کبریٰ للبیہقی ج ا ص ۴۰۳، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۲۶۲۸، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۱۲۳۰)

غزوۂ خندق میں نماز قضا ہونے کا سبب

علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خندق کے دن جو نمازوں کو موخر فرمایا تھا آیا یہ نسیاناً موخر فرمایا تھا یا عمداً۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ نے ان نمازوں کو نسیاناً موخر فرمایا تھا اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ احزاب کے دن مغرب کی نماز پڑھی، پھر نماز سے فارغ ہو کر فرمایا: کیا تم میں سے کسی کو علم ہے کہ میں نے عصر کی نماز پڑھی ہے؟ صحابہ نے کہا نہیں یا رسول اللہ! آپ نے عصر کی نماز نہیں پڑھی، تب آپ نے موذن کو حکم دیا اس نے اقامت کہی تو آپ نے عصر کی نماز پڑھی اور مغرب کی نماز دہرائی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آپ نے یہ نمازیں عمداً ترک کی تھیں، لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین نے مسلمانوں کو لڑائی میں مسلسل مشغول رکھا اور انہوں نے مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی مہلت نہیں دی۔

جہاد میں مشغول ہونے کی وجہ سے آیا اب نماز قضا کی جاسکتی ہے

اگر یہ سوال کیا جائے کہ آیا اب دشمن کے ساتھ لڑائی میں مشغول ہونے کی وجہ سے نماز کو موخر کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اب نماز کو اس کے وقت سے موخر کر کے پڑھنا جائز نہیں ہے، بلکہ اب صلوٰۃ خوف پڑھی جائے یعنی ایک جماعت دشمن کے سامنے کھڑی رہے اور دوسری جماعت نماز پڑھے، اور غزوۂ خندق میں اشتغال کی وجہ سے تاخیر کا عذر تھا کیونکہ اس وقت تک صلوٰۃ خوف نازل نہیں ہوئی تھی۔ (عمدۃ القاری ج ۵ ص ۹۱، مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر، ۱۳۴۸ھ)

علامہ بدر الدین عینی نے جو کہا ہے کہ غزوۂ خندق کے وقت تک صلوٰۃ خوف نازل نہیں ہوئی تھی اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مشرکین نے جنگ خندق کے دن ہمیں نمازوں سے مشغول رکھا۔ نماز ظہر سے غروب آفتاب تک، اس وقت نماز خوف کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے، جس میں اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: وکفی اللہ المؤمنین القتال۔ (الاحزاب: ۲۵) "اور اللہ نے مومنین کو قتال سے کفایت فرمادی" پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو حکم دیا تو انہوں نے ظہر کی اقامت کہی اور آپ نے اس طرح ظہر کی نماز پڑھی جس طرح اپنے وقت میں ظہر پڑھتے تھے، پھر انہوں نے عصر کی اقامت کی اور آپ نے اس طرح عصر کی نماز پڑھی جس طرح اپنے وقت میں عصر پڑھتے تھے، پھر انہوں نے مغرب کی اذان دی تو آپ نے اس طرح مغرب کی نماز پڑھی جس طرح اپنے وقت میں مغرب پڑھتے تھے۔ (سنن النسائی رقم الحدیث: ۶۶۰، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ۱۴۱۲ھ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خندق کے موقع پر چار نمازیں موخر کیں تھیں اس میں یہ حکمت بھی تھی کہ امت کو یہ مسئلہ بتایا جائے کہ جو شخص صاحب ترتیب ہو (یعنی جس شخص کی بلوغت کے بعد پانچ یا اس سے زائد نمازیں چھوٹی ہوئی نہ ہوں) وہ اس وقت تک ادا نماز نہیں پڑھے گا جب تک کہ اپنی قضا نماز نہ پڑھ لے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں پڑھیں، پھر عشاء کی نماز پڑھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازوں میں سہو کی تحقیق

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نمازوں میں سہو لاحق ہوا اس کے متعلق تین حدیثیں ہیں: ایک حضرت ذوالیدین کی حدیث ہے کہ ظہر یا عصر کی نماز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت کے بعد سلام پھیر دیا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۸۲، صحیح مسلم

رقم الحدیث:۵۷۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۱۰۰۸) دوسری حدیث حضرت ابن بحینہ رضی اللہ عنہ کی ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز میں دو رکعت کے بعد قعدہ اولیٰ نہیں کیا اور کھڑے ہوگئے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث:۸۲۹، صحیح مسلم رقم الحدیث:۵۷۴، سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۱۰۳۴) تیسری حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز میں پانچ رکعات پڑھا دیں۔ (صحیح مسلم کتاب المساجد رقم الحدیث:۹۲، الرقم الغیر المکرر:۵۷۲، الرقم المسلسل:۱۲۶۰) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام صورتوں میں سجدہ سہو کیا، اگر آپ کو یہ سہو واقع نہ ہوتا تو آپ کی نمازیں تو ہو جاتیں لیکن جب ہماری نمازوں میں سہو ہوتا تو ہماری نمازیں کس کے دامن میں پناہ لیتیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس طرح تم بھول جاتے ہو اسی طرح میں بھی بھول جاتا ہوں، یہ تشبیہ نفس نسیان میں ہے، ورنہ نسیان کی کیفیت میں بہت فرق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو نماز میں بھول گئے تھے اس کی تحقیق یہ ہے کہ نماز پڑھتے وقت آپ یادالٰہی میں اس قدر مستغرق ہوئے کہ افعال نماز سے آپ کی توجہ ہٹ گئی اور چار رکعات کے بجائے پانچ رکعات نماز پڑھادی، جبکہ ہمارا بھولنا عموماً اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ہم دنیاوی معاملات میں مستغرق ہو جاتے ہیں اور افعال نماز کی طرف توجہ نہیں رہتی، خلاصہ یہ ہے کہ ہم دنیا کی محبت میں بھولتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی محبت میں بھولتے ہیں، ہمارا بھولنا نقص ہے اور آپ کا بھولنا کمال ہے۔ حضرت ابوبکر نے یونہی تو نہیں کہا تھا: یالیتنی کنت سھو محمد۔ کاش میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سہو ہی ہو جاتا۔ (مکتوبات دفتر اول حصہ پنجم ص ۲۱)

اولیٰ اور افضل یہ ہے کہ مصائب اور مشکلات میں صرف اللہ سے مدد طلب کی جائے

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اس آیت کے دو محمل ہیں: ایک یہ کہ شیطان نے ساقی کو بادشاہ کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کرنا بھلا دیا اور دوسرا یہ کہ شیطان نے حضرت یوسف کو اللہ کا ذکر کرنا بھلا دیا اور یہ اسناد مجازی ہے، بھلانے والا تو اللہ تعالیٰ ہے لیکن شیطان اس کا سبب بنا اس نے آپ کا ذہن اپنی پریشانیوں اور دوسرے عوارض کی طرف متوجہ کر دیا اور آپ اللہ تعالیٰ سے دعا اور التجا کرنا بھول گئے اور آپ نے ساقی سے کہا کہ تم بادشاہ کے سامنے میری مظلومیت کا ذکر کرنا۔ امام فخرالدین رازی اور بعض دوسرے مفسرین نے اسی تقریر کو اختیار کیا ہے اور قرآن مجید کے ظاہر الفاظ اور احادیث اور آثار بھی اسی تقریر کے موید ہیں۔

امام فخرالدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اچھا یہ تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنی مظلومیت میں مخلوق میں سے کسی شخص کی طرف رجوع نہ کرتے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے سامنے اپنی حاجت پیش نہ کرتے اور اپنے جد کریم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اقتداء کرتے کیونکہ جب ان کو منجنیق میں رکھ کر آگ میں ڈالنے لگے تو آپ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا: کیا آپ کو کوئی حاجت ہے؟ آپ نے کہا: تمہاری طرف کوئی حاجت نہیں ہے! اور چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی حاجت اس ساقی کے سامنے پیش کی اور اس سے کہا کہ تم بادشاہ سے میرا ذکر کرنا، اور مخلوق سے مدد مانگنا ہرچند کہ ناجائز نہیں ہے لیکن یہ چیز حضرت یوسف کی پیغمبرانہ شان کے خلاف تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جس توحید کے وارث تھے اس کے مناسب نہ تھی اس لیے ان پر عتاب کیا گیا اور وہ مزید دو سال قید میں رکھے گئے۔

امام رازی فرماتے ہیں: میری عمر اب ستاون سال کی ہوگئی اور میری پوری زندگی کا یہ تجربہ ہے کہ انسان جب بھی اپنے کسی معاملہ کو غیر اللہ کے سپرد کرتا ہے اور اپنے کسی کام میں غیر اللہ پر اعتماد کرتا ہے تو وہ کسی آزمائش اور امتحان میں مبتلا ہو جاتا

ہے اور کسی مصیبت اور بلا میں گرفتار ہو جاتا ہے اور انسان جب اللہ پر اعتماد کرتا ہے اور مخلوق میں سے کسی کی طرف رجوع نہیں کرتا تو اس کا مطلوب اور مقصود نہایت عمدہ طریقہ سے پورا ہو جاتا ہے اور اب میرے دل میں یہ بات جاگزیں ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور احسان کے سوا کسی اور پر اعتماد کرنا اور اپنی حاجات اور مہمات میں اللہ تعالیٰ کے غیر کی طرف رجوع کرنا کوئی اچھا کام نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۴۶۲۔۴۶۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا: جب تم سوال کرو تو اللہ سے سوال کرو اور جب تم مدد طلب کرو تو اللہ سے مدد طلب کرو۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۵۱۶، مسند احمد ج ۱ ص ۹۳، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۱۲۹۸۸، شعب الایمان رقم الحدیث: ۱۰۷۴، المستدرک ج ۳ ص ۵۴۱، حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۳۱۴)

غیر اللہ سے استمداد کا جواز

علامہ محمود بن عمر زمخشری خوارزمی متوفی ۵۳۸ھ لکھتے ہیں:

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے غیر اللہ سے جو مدد لی تھی اس پر کیوں عتاب کیا گیا جبکہ قرآن اور حدیث کی روشنی میں غیر اللہ سے مدد لینا جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى۔ (المائدہ: ۲) نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔

اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کی حکایت کی ہے:

مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ۔ (آل عمران: ۵۲) اللہ کی طرف میرے کون مددگار ہیں؟

اور اس سلسلہ میں حسب ذیل احادیث ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی آخرت کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کر دے گا اور جو شخص کسی مسلمان کا پردہ رکھے اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کا پردہ رکھے گا اور اللہ اس وقت تک اپنے بندہ کی مدد کرتا رہتا ہے جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۶۹۹، سنن ابوداود رقم الحدیث: ۴۹۴۶، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۴۲۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۲۵، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۹ ص ۸۵، مسند احمد ج ۲ ص ۲۵۲، سنن الدارمی رقم الحدیث ۲۵۱، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۵۳۴، حلیۃ الاولیاء ج ۸ ص ۱۱۹، مسند الشہاب رقم الحدیث: ۴۵۸، شرح السنہ رقم الحدیث: ۱۲۷)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس پر ظلم کرے نہ اس کو ہلاکت میں ڈالے، اور جو شخص اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد میں رہتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان کی سختی کو دور کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کی سختیوں میں سے کوئی سختی دور کر دیتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان کا پردہ رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۴۴۲، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۵۸۰، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۸۹۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۴۲۶، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۷۲۹۱، مسند احمد ج ۲ ص ۹۱، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۱۳۱۳۷، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۶ ص ۹۴، شعب الایمان رقم الحدیث: ۷۶۱۴، شرح السنہ رقم الحدیث: ۳۵۱۸)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ مدینہ آنے کے ابتدائی ایام میں ایک رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہوئے تو آپ نے فرمایا: کاش میرے اصحاب میں سے کوئی نیک شخص آج رات میری حفاظت کرتا! پھر ہم نے ہتھیاروں کی آواز سنی، آپ نے فرمایا: یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا: میں سعد بن ابی وقاص ہوں اور آپ کی حفاظت کے لیے آیا ہوں! اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۲۸۸۵، صحیح مسلم رقم الحدیث:۲۴۱۰، سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۷۵۶، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۲ ص ۸۸، مسند احمد ج ۶ ص ۱۴۰، الادب المفرد رقم الحدیث:۸۷۸، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۸۲۲۵، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۴۸۵۶، صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۶۹۸۶، المستدرک ج ۳ ص ۵۰۱)

پھر علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ مخلوق میں سے کسی کام میں مدد حاصل کرنا ایسا ہی ہے جیسے مرض کے ازالہ کے لیے دواؤں کو تناول کرنا اور طاقت حاصل کرنے کے لیے کھانا پینا (یا مقویات کھانا) خواہ کافر سے مدد لی جائے کیونکہ وہ بادشاہ کافر تھا کیونکہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ ظلم سے بچنے کے لیے یا دریا میں ڈوبنے اور آگ میں جلنے سے بچنے کے لیے اور اسی طرح کی دوسری مصیبتوں میں کفار سے مدد لینا جائز ہے۔

مخلوق سے استمداد کی بنا پر حضرت یوسف سے مواخذہ کی توجیہ

اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ خلوق سے مدد لینا جائز ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اگر اس بادشاہ سے مدد طلب کی تھی تو ان پر عتاب کیوں کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انبیاء علیہم السلام کو تمام مخلوق سے بلند مرتبہ عطا کیا ہے، اسی طرح ان کے تمام احوال اور افعال کو بھی عام لوگوں کے احوال اور افعال سے بلند رکھا ہے اور نبی کے لیے احسن اور اولیٰ یہ ہے کہ جب وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو وہ اپنے معاملہ کو اللہ کے سوا اور کسی کے سپرد نہ کرے اور اللہ کے سوا کسی سے مدد طلب نہ کرے، خصوصاً کسی کافر سے مدد طلب نہ کرے تاکہ کفار اس سے خوش نہ ہوں اور یہ نہ کہیں کہ اگر یہ نبی حق پر ہوتا اور واقعی اس کا رب واحد ہوتا تو یہ اسی سے مدد طلب کرتا اور ہم سے مدد طلب نہ کرتا۔ حسن بصری سے روایت ہے کہ جب وہ اس آیت کو پڑھتے تو بہت روتے اور یہ دعا کرتے کہ اے اللہ! اگر ہم کسی مصیبت میں مبتلا ہوں تو ہم کو مخلوق کے سپرد نہ کرنا۔ (الکشاف ج ۲ ص ۴۴۶۔۴۴۵، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۷ھ)

قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ لکھتے ہیں:

مصائب سے نجات حاصل کرنے کے لیے مخلوق سے استمداد اور استعانت کرنا ہر چند کہ لائق تحسین ہے لیکن انبیاء علیہم السلام کے شایان شان نہیں ہے۔ (انوار التنزیل مع عنایت القاضی ج ۵ ص ۳۱۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ)

علامہ شہاب الدین احمد بن محمد خفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس میں یہ اشارہ ہے کہ بادشاہ سے مدد طلب کرنے پر حضرت یوسف پر کیوں عتاب کیا گیا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وتعاونوا علی البر والتقوی۔ (المائدہ:۲) اور اس کی تائید میں احادیث بھی ہیں، اس کا یہ جواب دیا کہ ہر چند کہ مخلوق سے استعانت قابل تعریف ہے لیکن خصوصاً انبیاء علیہم السلام کی شان کے لائق اس کو ترک کر دینا ہے۔

(عنایت القاضی ج ۵ ص ۳۱۰)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

ظلم کو دور کرنے کے لیے غیر اللہ سے مدد حاصل کرنا شریعت میں جائز ہے اور اس پر اعتراض نہیں ہے لیکن جو حضرات

عبودیت کے سمندر میں غرق ہوتے ہیں جیسے حضرت یوسف علیہ السلام وہ اگر ایسا کریں تو ان پر عتاب ہوتا ہے، اور جب اتنی سی بات پر حضرت یوسف علیہ السلام پر عتاب کیا گیا اور ان کی قید کی مدت میں سات سال اضافہ کر دیا گیا کیونکہ ساقی کو سات سال بعد بادشاہ سے حضرت یوسف کے ذکر کرنے کا خیال آیا تو اگر عزیز مصر کی بیوی کے ساتھ انہوں نے وہ کچھ کیا ہوتا جس کا بعض من گھڑت روایات میں ذکر ہے تو ان پر سخت گرفت ہوتی لیکن جب اس سلسلہ میں ان کے ساتھ کوئی تعرض نہیں کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان روایات میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بلند کردار پر محض اتہام لگایا گیا ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۴۶۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ ابوالحیان محمد بن یوسف اندلسی متوفی ۷۵۴ھ لکھتے ہیں:

حضرت یوسف علیہ السلام نے ساقی سے کہا: بادشاہ سے میری مظلومیت کا ذکر کرنا، یہ بتانا کہ مجھے ناحق امتحان میں ڈالا گیا ہے اور اسے میرا مرتبہ اور مقام بتانا اور مجھے جو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے اس کا ذکر کرنا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بطور استعانت تنگی میں کشادگی کو طلب کرنے کے لیے کہا تھا، اور ان کے نزدیک یہ ان کی قید سے رہائی کا سبب تھا، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: من انصاری الی اللہ۔

(البحر المحیط ج ۶ ص ۲۷۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۲ھ)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

حضرت یوسف علیہ السلام کے مخلوق سے مدد طلب کرنے پر جو گرفت کی گئی اس پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ مصائب کو دور کرنے کے لیے بندوں سے جو مدد طلب کی جاتی ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ حکم اشخاص کے اختلاف سے مختلف ہو جاتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے مناصب کے یہ لائق ہے کہ وہ مخلوق سے استعانت کو ترک کر دیں اور عزیمت پر عمل کریں۔

(روح المعانی جز ۱۲ ص ۳۷۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

حضرت یوسف علیہ السلام کی قید کی مدت

امام ابو جعفر محمد بن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

قتادہ، وہب بن منبہ اور ابن جریج نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام سات سال قید خانے میں رہے۔

(جامع البیان جز ۱۲ ص ۲۹۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام عبدالرحمٰن بن علی بن محمد جوزی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

حضرت یوسف علیہ السلام کی قید کی مدت میں تین قول ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ کہا یہ مدت بارہ سال ہے، ضحاک نے کہا یہ مدت چودہ سال ہے، قتادہ نے کہا یہ مدت سات سال ہے۔

(زاد المسیر ج ۴ ص ۲۲۸، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف پر جو گرفت کی تھی اس کی وجہ سے جو قید میں اضافہ ہوا اس کی مدت سات سال یا نو سال تھی اور اس سے پہلے وہ پانچ سال قید میں رہے تھے، اور قرآن مجید میں جو فرمایا ہے: پس وہ قید خانہ میں مزید چند سال رہے، یہ اس عتاب کے نتیجہ میں قید کی مدت ہے نہ کہ کل قید کی مدت، اس لحاظ سے ان کی قید کی کل مدت بارہ سال یا نو سال ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۷۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ

اور بادشاہ نے کہا میں نے خواب میں دیکھا کہ سات فربہ گائیں ہیں جن کو سات دُبلی گائیں

عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِىْ

کھا رہی ہیں اور میں نے سات سرسبز خوشے دیکھے اور (سات) سوکھے ہوئے (خوشے دیکھے) اے میرے درباریو!

فِىْ رُءْيَاىَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ

میرے اس خواب کی تعبیر بتاؤ اگر تم خواب کی تعبیر بتا سکتے ہو! ○ انہوں نے کہا یہ تو پریشان خواب ہیں،

وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَقَالَ الَّذِىْ نَجَا مِنْهُمَا

اور ہم پریشان خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے ○ ان دو قیدیوں میں سے جو نجات یافتہ تھا

وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾ يُوْسُفُ

اس نے ایک مدت کے بعد یوسف کو یاد کیا اس نے کہا میں تم کو اس خواب کی تعبیر بتا سکتا ہوں مجھے (یوسف کے پاس) بھیج دو ○

اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِىْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ

(اس نے یوسف کے پاس جا کر کہا) اے یوسف! اے بہت سچ بولنے والے! ہمیں اس خواب کی تعبیر بتائیے کہ سات فربہ گائیں ہیں جن کو سات دُبلی

عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّىْۤ اَرْجِعُ اِلَى

گائیں کھا رہی ہیں اور سات سرسبز خوشے ہیں، اور سات سوکھے ہوئے (خوشے ہیں) تاکہ میں لوگوں کے پاس یہ تعبیر

النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ

لے کر جاؤں شاید وہ آپ کا مرتبہ جان لیں ○ یوسف نے کہا تم حسب معمول سات سال تک کاشت کاری کرو گے،

فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِىْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ

پھر تم جو کھیت کاٹو تو تمام غلے کو ان کے خوشوں میں چھوڑ دینا ماسوا ان قلیل غلے کے جن کو تم کھاؤ ○ پھر

يَاْتِىْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ

اس کے بعد سات خشک سالی کے سخت سال آئیں گے وہ اس غلے کو کھا جائیں گے جو تم نے پہلے جمع کر کے رکھا تھا

إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تُحْصِنُونَ ﴿۴۸﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ

ماسوا تھوڑے سے غلے کے جن کو تم محفوظ رکھو گے ○ پھر اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا جس میں

فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ﴿۴۹﴾ ع ۶ ۷ ۱۶

لوگوں پر بارش ہو گی اور اس میں لوگ پھلوں کو نچوڑیں گے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بادشاہ نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ سات فربہ گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں' اور میں نے سات سرسبز خوشے دیکھے اور (سات) سوکھے ہوئے (خوشے دیکھے) اے میرے درباریو! میرے اس خواب کی تعبیر بتاؤ' اگر تم خواب کی تعبیر بتا سکتے ہو○ (یوسف: ۴۳)

مصر کے بادشاہ کا خواب دیکھنا

جب اللہ تعالیٰ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کے اسباب مہیا فرما دیتا ہے' جب حضرت یوسف علیہ السلام کی رہائی اور کشادگی کے دن قریب آ گئے' تو مصر کے بادشاہ نے یہ خواب دیکھا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام حضرت یوسف کے پاس آئے ان کو سلام کیا اور ان کو کشادگی کی بشارت دی' اور کہا کہ اللہ عزوجل آپ کو قید خانہ سے نکالنے والا ہے اور آپ کو اس زمین کا اقتدار عطا کرنے والا ہے' اس زمین کے بادشاہ آپ کے تابع ہو جائیں گے اور سردار آپ کی اطاعت کریں گے اور اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے بھائیوں پر غلبہ عطا فرمائے گا' اور اس کا سبب یہ ہو گا کہ بادشاہ ایسا خواب دیکھے گا اور اس کی ایسی ایسی تعبیر ہو گی' پھر کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ بادشاہ نے وہ خواب دیکھا جس کے نتیجہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کو رہائی مل گئی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے جو پہلا خواب دیکھا تھا وہ ان کے لیے سختی اور مصیبت کا سبب بن گیا تھا' اور بادشاہ کا یہ خواب ان کے لیے کشادگی اور رحمت کا سبب بن گیا۔

مصر کے بادشاہ الریان بن الولید نے خواب دیکھا کہ دریا سے سات موٹی تازی گائیں نکلیں اور ان کے پیچھے سات دبلی گائیں نکلیں' انہوں نے ان موٹی تازی گایوں کو کان سے پکڑا اور کھا گئیں اور اس نے سات سرسبز خوشے دیکھے اور سات سوکھے ہوئے خوشے دیکھے' ان سوکھے ہوئے خوشوں نے ان سرسبز خوشوں کو کھا لیا اور ان میں سے کچھ باقی نہیں بچا اور سوکھے ہوئے خوشے اسی طرح سوکھے رہے' اسی طرح دبلی گایوں نے موٹی گایوں کو کھا لیا تھا اور وہ اسی طرح دبلی کی دبلی رہیں۔ یہ خواب دیکھ کر بادشاہ گھبرا گیا' اس نے لوگوں کو' اہل علم کو' کاہنوں کو' نجومیوں کو' جادوگروں کو اور سرداروں کو بلایا اور ان کے سامنے یہ خواب بیان کر کے کہا: اگر تم خواب کی تعبیر بتا سکتے ہو تو مجھے اس خواب کی تعبیر بتاؤ۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۹' ص ۱۷۴' زاد المسیر ج ۴' ص ۲۲۹)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انہوں نے کہا یہ تو پریشان خواب ہیں اور ہم پریشان خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے○

(یوسف: ۴۴)

اضغاث احلام کا لغوی اور اصطلاحی معنی

ضغث کا معنی ہے بے ربط اور خلط ملط باتیں' گھاس پھونس کا مٹھی بھر مجموعہ۔ ابو عبیدہ نے کہا: جس خواب کو بہت لوگ دیکھیں اور ان کو جمع کر کے ایسا مجموعہ یا گٹھا بنا لیا جائے جیسے سوکھی ہوئی گھاس کا گٹھا ہوتا ہے' اس سے مراد وہ خواب ہے جس

کی تعبیر نہ بیان کی جا سکے۔ الکسائی نے کہا: اضغاث احلام کا معنی ہے ملے جلے اور خلط ملط خواب۔ ابن قتیبہ نے کہا: اضغاث احلام کا معنی ہے جس طرح آدمی مختلف گھاسوں کو ملا کر ایک گٹھا بناتا ہے اور اس میں طرح طرح کی گھاس ہوتی ہے، اسی طرح جس خواب میں مختلف النوع باتیں دکھائی دیں۔ الزجاج نے کہا: الضغث کا معنی ہے کسی چیز کا گٹھا، مثلاً سبزیوں یا ان جیسی چیزوں کا، ان کی مراد یہ تھی کہ تم نے خواب میں چند ملی جلی چیزیں دیکھی ہیں، یہ کوئی واضح خواب نہیں ہے اور ایسے ملے جلے خواب کی تعبیر کا ہمیں علم نہیں ہے۔

الاحلام، حلم کی جمع ہے، انسان نیند میں جو خواب دیکھتا ہے اس کو حلم کہتے ہیں، بعض خواب صحیح ہوتے ہیں اور بعض باطل ہوتے ہیں۔ (زاد المسیر ج ۴، ص ۲۳۰، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

علامہ نظام الدین حسن بن محمد القمی النیشاپوری المتوفی ۷۲۸ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے نفس ناطقہ کو اس صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا ہے کہ وہ عالم افلاک تک پہنچ سکتا ہے اور لوح محفوظ کا مطالعہ کر سکتا ہے، لیکن بیداری میں نفس ناطقہ بدن کی تدبیر اور حواس میں تصرف کرنے میں مشغول ہوتا ہے، اس مانع کی وجہ سے وہ بیداری میں لوح محفوظ کا مطالعہ نہیں کر سکتا اور نیند کے وقت یہ مشغولیات کم ہو جاتی ہیں تو نفس اس مطالعہ پر قوی ہو جاتا ہے، اور جب روح ان احوال میں سے کسی حال پر واقف ہو جاتی ہے تو اگر وہ احوال اس مشاہدہ کے مطابق خیال میں منقش ہو جاتے ہیں تو ان کی تعبیر میں کسی تاویل کی احتیاج نہیں ہوتی اور اگر ان احوال کی رموز یا ان کے اشارات خیال میں مرتسم ہوں تو پھر ان کی تعبیر میں تاویل کی احتیاج ہوتی ہے، پھر اگر وہ رموز اور اشارات مربوط، مرتب اور منظم ہوں تو ان متخیلات سے حقائق روحانیہ کی طرف منتقل ہونا اور ان کی تاویل کرنا تعبیر کرنے والے کے لیے سہل اور آسان ہوتا ہے، اور بعض اوقات وہ رموز اور اشارات مختلط، مضطرب اور غیر منضبط ہوتے ہیں اور ان کی تحلیل اور ان کا تجزیہ کرنا دشوار ہوتا ہے اور ان کی ترتیب اور تالیف میں تشویش ہوتی ہے اور ان سے کسی چیز کی تصویر کشی کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور ایسے ہی خوابوں کو اضغاث احلام کہا جاتا ہے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ بدن کی قوتوں میں کسی فساد کی وجہ سے قوت متخیلہ میں تشویش پیدا ہوتی ہے یا خارج میں کسی غیر مانوس چیز سے سابقہ پڑتا ہے اور اس کو اضغاث اس لیے کہتے ہیں کہ یہ تعبیر بیان کرنے والوں کو تھکا دیتی ہے۔ (غرائب القرآن و رغائب الفرقان ج ۴، ص ۹۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۶ھ)

سوکھی ہوئی گھاس کے مختلف اور منتشر تنکوں کے گٹھے کو ضغث کہتے ہیں، انسان جو خواب دیکھتا ہے کبھی تو اس کا معنی بالکل واضح ہوتا ہے جیسے انسان بیداری میں سوچ بچار کرتا ہے اور کبھی اس کا معنی غیر مربوط، غیر منضبط اور غیر واضح ہوتا ہے، جیسے غیر متناسب اور غیر مربوط اور غیر مرتب گھاس کے تنکوں کا گٹھا ہو اس کو اضغاث احلام کہتے ہیں، اس میں غیر مربوط خیالات کو غیر متناسب اور مختلف قسم کے گھاس کے تنکوں کے مجموعہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ ہم نے یوسف: ۴ میں اضغاث احلام کی زیادہ وضاحت کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان دو قیدیوں میں سے جو نجات یافتہ تھا اس نے ایک مدت کے بعد یوسف کو یاد کیا، اس نے کہا میں تم کو اس خواب کی تعبیر بتا سکتا ہوں، مجھے (یوسف کے پاس) بھیج دو○ (یوسف: ۴۵)

مدت گزرنے کے بعد حضرت یوسف کا ذکر کرنے کی توجیہ

بادشاہ نے جب درباریوں سے خواب کے متعلق پوچھا اور وہ اس کی تعبیر نہ بتا سکے اس وقت اس ساقی نے کہا کہ قید خانے میں ایک شخص بہت عالم فاضل ہے اور بہت نیک ہے اور بہت عبادت گزار ہے، میں نے اور باورچی نے جو خواب دیکھے

تھے ہم نے اس سے ان خوابوں کی تعبیر پوچھی تھی اور اس کی بتائی ہوئی تعبیر بالکل صحیح اور درست واقع ہوئی، اگر آپ بھی اپنے خواب کی صحیح تعبیر جاننا چاہتے ہیں تو مجھے اس کے پاس قید خانے میں بھیج دیں، میں اس سے صحیح تعبیر معلوم کر کے آپ کو بتادوں گا۔ (تفسیر کبیر ج ۶، ص ۴۶۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

بعض علماء نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: اسے ایک مدت کے بعد یوسف یاد آیا' یہ ترجمہ اس نظریہ پر مبنی ہے کہ شیطان نے ساقی کو بادشاہ کے سامنے حضرت یوسف کا ذکر کرنا بھلا دیا تھا' لیکن احادیث' آثار اور قرآن مجید کے ظاہر الفاظ کا تقاضا یہ ہے کہ شیطان نے حضرت یوسف کو اللہ تعالیٰ سے اس معاملہ میں التجا اور ذکر کرنا بھلا دیا تھا اور انہوں نے ساقی سے کہا کہ وہ بادشاہ کے سامنے ان کی مظلومیت کا ذکر کرے' اس پر مفصل بحث گزر چکی ہے اس لیے ہم نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ اس نے ایک مدت کے بعد یوسف کو یاد کیا۔

ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ساقی نے اس وقت تک بادشاہ کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا جب تک بادشاہ کو خواب کی تعبیر بتانے کے لیے کسی ماہر کی ضرورت نہیں پڑی' اس وقت اس نے بادشاہ کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کیا' کیونکہ اس کو ڈر تھا کہ اگر اس نے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کیا اور حضرت یوسف کے بے قصور قید ہونے کا بتایا تو بادشاہ کے ذہن میں خود اس ساقی کا جرم پھر سے تازہ ہو جائے گا جس وجہ سے اس کو قید کیا گیا تھا اور اس کو خطرہ تھا کہ یہ امر اس کے لیے کسی مصیبت کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔

(زاد المسیر ج ۴، ص ۲۳۱، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اس نے یوسف کے پاس جا کر کہا) اے یوسف! اے بہت سچ بولنے والے! ہمیں اس خواب کی تعبیر بتائیے کہ سات فربہ گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سرسبز خوشے ہیں اور سات سوکھے ہوئے (خوشے ہیں) تاکہ میں لوگوں کے پاس یہ تعبیر لے کر جاؤں شاید وہ آپ کا مرتبہ جان لیں ○ (یوسف: ۴۶)

جس سے علم حاصل کیا جائے اس کی تعظیم اور تکریم لازم ہے

ساقی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو صدیق کہا جس کا معنی ہے: بہت زیادہ سچ بولنے والے' اور اس نے آپ کی یہ صفت اس لیے بیان کی کہ اس نے آپ کو ہمیشہ سچ بولنے والا پایا اور اس لیے کہ آپ نے اس کو جو تعبیر بتائی تھی وہ صادق ہوئی' اور اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ جو شخص کسی سے علم حاصل کرنا چاہے اس پر لازم ہے کہ وہ اس کی تعظیم کرے اور اس کو ایسے الفاظ سے مخاطب کرے جو احترام اور تکریم پر دلالت کرتے ہوں۔ ساقی نے حضرت یوسف علیہ السلام کی سامنے خواب میں وہی الفاظ ذکر کیے جو الفاظ بادشاہ نے ذکر کیے تھے اور یہ اس وجہ سے کیا کہ اگر خواب کے الفاظ میں تبدیلی کر دی جائے تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی تعبیر بھی بدل جائے' اس لیے ساقی نے احتیاط کی اور خواب کے بعینہٖ وہی الفاظ بیان کیے جو بادشاہ نے ذکر کیے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یوسف نے کہا تم حسب معمول سات سال تک کاشت کاری کرو گے' پھر تم جو کھیت کاٹو تو تمام غلے کو ان کے خوشوں میں چھوڑ دینا ماسوا اس قلیل غلے کے جن کو تم کھاؤ ○ پھر اس کے بعد سات خشک سالی کے سخت سال آئیں گے وہ اس غلے کو کھا جائیں گے جو تم نے پہلے جمع کر کے رکھا تھا ماسوا تھوڑے سے غلے کے جن کو تم محفوظ رکھو گے ○ پھر اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا جس میں لوگوں پر بارش ہو گی اور اس میں لوگ پھلوں کو نچوڑیں گے ○ (یوسف: ۴۹-۴۷)

حضرت یوسف علیہ السلام کے مکارم اخلاق

ان آیات سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بلند ظرف اور مکارم اخلاق کا پتا چلتا ہے' آپ نے ساقی کو تاکید سے کہا تھا

کہ وہ بادشاہ کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کرے، ساقی نے سات سال تک بادشاہ کے سامنے حضرت یوسف کا ذکر نہیں کیا، پھر وہ اپنی ضرورت سے حضرت یوسف سے خواب کی تعبیر پوچھنے گیا تو حضرت یوسف نے اس کو کوئی سرزنش یا ملامت نہیں کی بلکہ شرح صدر کے ساتھ اس کو خواب کی تعبیر بتادی۔ ساقی کے ذکر نہ کرنے کی وجہ سے حضرت یوسف کو مزید سات یا نو سال قید میں رہنا پڑا، یہ ایک تقدیری امر تھا لیکن اس میں اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت تھی کہ اگر ساقی جاتے ہی حضرت یوسف کی مظلومیت اور ان کے بلاقصور قید میں گرفتار ہونے کا ذکر کر دیتا اور بادشاہ حضرت یوسف پر رحم کھا کر ان کو قید سے رہائی دلا دیتا تو یہ بادشاہ کا حضرت یوسف پر احسان ہوتا، اور جب بادشاہ کو خود ان کی ضرورت پڑی اور حضرت یوسف نے خواب کی تعبیر بتلا کر بادشاہ کی الجھن کو دور کیا تو اب بادشاہ حضرت یوسف کا زیر احسان تھا، گویا اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک کافر کا اس کے نبی پر احسان ہو بلکہ وہ چاہتا تھا کہ وہ کافر بادشاہ حضرت یوسف کے زیر احسان رہے بلکہ حضرت یوسف نے بعد میں آنے والے سات قحط کے سالوں سے نجات کا جو طریقہ بتایا اس سے تو مصر کی پوری قوم حضرت یوسف کے زیر احسان تھی۔

مستقبل کے لیے پس انداز کرنے اور قومی ضرورت کے لیے ذخیرہ اندوزی کرنے کا جواز

خواب کی تعبیر میں حضرت یوسف نے گایوں کو سالوں سے تعبیر کیا اور فربہ گایوں کو خوش حالی اور غلہ کی فراوانی کے سالوں سے تعبیر کیا اور دبلی گایوں کو خشک سالی اور قحط کے سالوں سے تعبیر کیا، پھر ان کو معیشت کی اصلاح کا طریقہ بتایا کہ وہ خوش حالی اور غلہ کی فراوانی کے سالوں میں ضرورت سے زیادہ غلہ کو خرچ نہ کریں اور بے تحاشا خرچ کر کے ضائع نہ کریں بلکہ مستقبل میں آنے والے قحط کے سات سالوں کے لیے غلہ کو بچا کر رکھیں اور اس میں یہ دلیل ہے کہ مستقبل کے لیے مال کو پس انداز کرنا مصلحت کے اعتبار سے ضروری ہے اور بناوٹی صوفیوں کا یہ کہنا باطل ہے کہ صبح کھالو تو شام کے لیے بچا کر نہ رکھا کرو، جس نے صبح کھانے کو دیا ہے شام کو بھی وہی دے گا، نیز اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ قومی ضرورت کے وقت ذخیرہ اندوزی جائز ہے منع اس صورت میں ہے جب لوگ بھوکے مر رہے ہوں اور تاجر اپنا نفع بڑھانے کے لیے غلہ کو گوداموں میں چھپا کر رکھیں اور مارکیٹ میں فروخت کے لیے نہ لائیں۔

خواب کا پہلی تعبیر پر واقع ہونا ضروری نہیں

بادشاہ کے درباریوں نے بادشاہ کے خواب کو اضغاث احلام قرار دیا تھا، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے خواب کو بامعنی قرار دیا اور اس کی تعبیر بتائی، اس سے معلوم ہوا کہ جو دوسرا شخص خواب کی تعبیر بتائے خواب اس پر بھی واقع ہو جاتا ہے اور ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ درج ذیل حدیث ضعیف ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خواب کا ایک باطن ہوتا ہے پس خواب کی تعبیر کنایہ سے اس کے نام سے بیان کرو۔ خواب کی جو پہلی تعبیر بتائی جائے خواب اس پر واقع ہوتا ہے۔

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ اگر خواب میں مثلاً سالم نام کے شخص کو دیکھو تو اس کی تعبیر سلامتی بیان کرو، اگر کوے کو دیکھے تو اس کی تعبیر فاسق ہے کیونکہ حدیث میں کوے کو فاسق فرمایا ہے اور اگر پسلی دیکھے تو اس کی تعبیر عورت ہے اور کنایہ سے مراد مثال ہے مثلاً کھجور کا درخت دیکھے تو اس کی تعبیر نیکی کرنے والا ہے۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۹۱۵، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۴۱۳۱، کنز العمال رقم الحدیث: ۴۱۸۰۲)

علامہ بوصیری نے کہا: اس حدیث کی سند میں یزید بن ابان رقاشی ہے اور وہ ضعیف ہے، حافظ ابن عسقلانی نے بھی اس حدیث کو یزید رقاشی کی وجہ سے ضعیف کہا ہے۔ (فتح الباری ج ۱۲، ص ۴۳۲، طبع لاہور، ۱۴۰۱ھ)

تمام مقاصد حیات کے لیے شریعت کا متکفل ہونا

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام تمام لوگوں کے لیے رحمت ہوتے ہیں خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر، وہ عقائد کی اصلاح کرتے ہیں، مکارم اخلاق کی ہدایت دیتے ہیں، تزکیہ نفوس کرتے ہیں اور معیشت اور اقتصادیات کی اصلاح کے لیے بھی رہنمائی کرتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بتایا کہ غلہ کی فراوانی کے سات سالوں میں وہ کس طرح آئندہ کے سات سالوں کے لیے غلہ کو محفوظ رکھیں اور اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کا کام صرف دین کی حفاظت اور عبادت کا نظام قائم کرنا نہیں ہے بلکہ شریعت جان کی حفاظت کا بھی نظام قائم کرتی ہے اسی لیے قصاص اور دیت کا نظام قائم کیا اور مال کی حفاظت کے لیے چوری اور ڈاکہ کی حدود مقرر کیں، عقل کی حفاظت کے لیے شراب کی حد مقرر کی، نسب کی حفاظت کے لیے نکاح کا نظام قائم کیا اور زنا کی حد مقرر کی اور عزت کی حفاظت کے لیے حد قذف مقرر کی اور معیشت کی حفاظت اور اقتصادی حالت کو توازن پر رکھنے کے لیے زکوٰۃ اور عشر کا نظام قائم کیا اور احتکار کو ممنوع قرار دیا اور اس آیت میں قحط کے زمانہ میں غلہ کو برقرار رکھنے کے طریقہ کی رہنمائی کی، غرض شریعت انسان کی اصلاح کے تمام پہلوؤں اور اس کے تمام مقاصد کی حفاظت کو محیط ہے اور اس پر عمل کرنے ہی میں دین اور دنیا کی فلاح ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا غیب کی خبریں دینا

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات کافر کا خواب بھی صحیح ہوتا ہے اور اس کی تعبیر بھی سچی ہوتی ہے تو پھر مومن کے خواب اور پھر نبی کے خواب کی صحت اور صداقت کا کیا عالم ہوگا۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر میں بتایا کہ ان پر سات سال غلہ کی فراوانی کے ہوں گے اور سات سال قحط کے ہوں گے پھر اس کے بعد ایک سال میں بہت بارش ہوگی اور زمین بہت پھل اگائے گی اور لوگ پھلوں سے رس نچوڑیں گے اور اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے آنے والے پندرہ سالوں کی پیشگی خبریں بیان کردیں اور یہ سب خبریں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحی سے بیان کیں اور یہ غیب کی خبریں تھیں۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ

اور بادشاہ نے کہا یوسف کو میرے پاس لے کر آؤ، جب ان کے پاس قاصد آیا تو انہوں نے کہا اپنے

رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي

آقا کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، بے شک میرا رب

بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ﴿٥٠﴾ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدْتُنَّ يُوسُفَ عَنْ نَفْسِهِ ۚ

ان کی سازش کو خوب جاننے والا ہے ○ بادشاہ نے ان عورتوں کو بلا کر پوچھا: اس وقت کیا ہوا تھا جب تم نے یوسف کو اپنی طرف راغب کرنے

قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ ۚ قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ الْآنَ

کی کوشش کی تھی؟ انہوں نے کہا حاش للہ! ہم نے اس میں کوئی برائی نہیں جانی، عزیز مصر کی بیوی نے کہا اب تو حق بات

حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۵۱﴾

ظاہر ہو ہی گئی ہے میں خود اس کو اپنے نفس کی طرف راغب کرتی تھی اور بے شک وہ سچوں میں سے تھے ○

ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ كَیْدَ

اس نے کہا میں نے یہ اس لیے کیا تاکہ وہ جان لے کہ میں نے اس کے پس پشت اس کی خیانت نہیں کی اور یہ بھی جان لے کہ بے شک اللہ

الْخَآئِنِیْنَ ﴿۵۲﴾

خیانت کرنے والوں کی سازش کو کامیاب ہونے نہیں دیتا ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بادشاہ نے کہا یوسف کو میرے پاس لے کر آؤ، جب ان کے پاس قاصد آیا تو انہوں نے کہا اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے بے شک میرا رب ان کی سازش کو خوب جاننے والا ہے ○ (یوسف: ۵۰)

علم دین کی وجہ سے روز قیامت علماء کی مغفرت

جب وہ ساقی حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر معلوم کر کے بادشاہ کے پاس گیا اور بادشاہ کو وہ تعبیر بتائی تو بادشاہ نے اس تعبیر کو بہت پسند کیا اور کہا کہ یوسف کو میرے پاس لے کر آؤ، اور یہ واقعہ علم کی فضیلت پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے علم کو ان کی دنیاوی مصیبت سے نجات کا سبب بنا دیا اور جب علم دنیاوی مصیبت سے نجات کا سبب ہے تو آخرت اور قیامت کے مصائب سے نجات کا سبب کیوں نہیں ہو گا!

حضرت ثعلبہ بن الحکم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ عزوجل جب بندوں پر اپنا فضل کرنے کے لیے اپنی کرسی پر بیٹھا ہو گا تو وہ علماء سے فرمائے گا میں نے اپنا علم اور اپنا حکم (نظام، قانون) تم کو صرف اس لیے عطا کیا تھا کہ میں تمہاری مغفرت کرنا چاہتا تھا اور میں بے نیاز ہوں۔

(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۱۳۸۱، حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کے راویوں کی توثیق کی گئی ہے: مجمع الزوائد ج ۱، ص ۱۲۶، تاہم اس حدیث کا ایک راوی العلاء بن مسلمہ وضع فی الحدیث کے ساتھ متہم ہے اور البانی نے اس حدیث کا ذکر السلسلۃ الضعیفہ میں کیا ہے رقم: ۸۶۷، خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے لیکن فضائل میں ضعاف کا اعتبار کیا جاتا ہے اور اس حدیث کے شواہد بھی ہیں)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ قیامت کے دن علماء کو اٹھائے گا اور فرمائے گا: میں نے اپنا علم تم میں اس لیے نہیں رکھا تھا کہ تم کو عذاب دوں، جاؤ میں نے تم کو بخش دیا ہے۔

(المعجم الصغیر رقم الحدیث: ۵۹۱، حافظ الہیثمی نے اس حدیث کو المعجم الکبیر کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور کہا ہے اس کی سند بہت ضعیف ہے، مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۲۶)

حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب قیامت کا دن ہو گا تو اللہ علماء کو جمع کر کے فرمائے گا: میں نے تمہارے دلوں میں حکمت اس لیے نہیں رکھی تھی کہ میں تمہیں عذاب دینا چاہتا ہوں، جنت میں داخل ہو جاؤ۔

(الکامل فی ضعفاء الرجال ج ۶، ص ۲۷۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ، کنز العمال رقم الحدیث: ۲۸۸۹۴)

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت یوسف کی تحسین کرنا

جب بادشاہ کا قاصد حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس ان کو بلانے کے لیے پہنچا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اس وقت تک قید خانے سے نکلنے سے انکار کر دیا جب تک ان کی اس تہمت سے براءت نہ ثابت ہو جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے اس عمل کی تعریف فرمائی ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الکریم بن الکریم بن الکریم بن الکریم یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم ہیں' آپ نے فرمایا: اگر میں قید خانہ میں اتنی مدت رہتا جتنی مدت حضرت یوسف رہے تھے، پھر مجھے قاصد بلانے آتا تو میں اس کے بلانے پر چلا جاتا' پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: فلما جاءہ الرسول قال ارجع الی ربک فسئلہ مابال النسوۃ التی قطعن ایدیھن- (یوسف: ۵۰)

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۱۶' المعجم الکبیر ج ۹' رقم الحدیث: ۳۱۷)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر مجھے بلایا جاتا تو میں فوراً چلا جاتا اور اپنے بے قصور ہونے کی حجت کو تلاش نہ کرتا۔ (جامع البیان جز ۱۲ ص ۳۰۷)

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے حضرت یوسف کے صبر اور ان کے کرم پر تعجب ہوتا ہے' اللہ ان کی مغفرت فرمائے جب ان سے موٹی اور دبلی گایوں کے متعلق سوال کیا گیا' اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو ان کو بالکل جواب نہ دیتا اور یہ شرط رکھتا کہ پہلے وہ مجھے قید خانے سے نکالیں' اور مجھے حضرت یوسف کے صبر اور ان کے کرم پر تعجب ہوتا ہے اور اللہ ان کی مغفرت فرمائے جب ان کے پاس قاصد آیا تو اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو میں دروازے سے نکلنے کی طرف جلدی کرتا لیکن حضرت یوسف نے یہ ارادہ کیا کہ ان کے بے قصور ہونے کی حجت ظاہر ہو جائے۔

(مسند احمد ج ۳' رقم الحدیث: ۷۸۳۳' طبع جدید دار الفکر' جامع البیان رقم الحدیث: ۱۴۸۳۴)

رہائی میں حضرت یوسف علیہ السلام کے توقف کرنے کی وجوہات

حضرت یوسف علیہ السلام نے اس وقت تک قید خانے سے نکلنے سے توقف کیا جب تک کہ ان بے قصور ہونا واضح نہ ہو جائے اس میں حضرت یوسف علیہ السلام نے احتیاط اور دانش مندی کو جو ملحوظ رکھا اس کی حسب ذیل وجوہات ہیں:

(۱) اگر حضرت یوسف بادشاہ کے بلانے پر فوراً چلے جاتے تو بادشاہ کے دل میں حضرت یوسف پر لگائی ہوئی تہمت کا اثر باقی رہتا اور جب خود بادشاہ نے حضرت یوسف پر لگائی ہوئی تہمت کی تفتیش اور تحقیق کی اور حضرت یوسف علیہ السلام کا بے قصور ہونا واضح ہو گیا تو اب کسی کے لیے یہ گنجائش نہ رہی کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کردار پر انگلی اٹھاتا۔

(۲) جو شخص بارہ یا چودہ سال قید خانہ میں رہا ہو پھر اس کو قید خانہ سے نکلنے کا موقع ملے تو وہ رہائی کی طرف جھپٹ پڑتا ہے' اور جب حضرت یوسف نے قید خانے سے نکلنے میں توقف کیا تو معلوم ہو گیا کہ حضرت یوسف انتہائی دانش مند' محتاط اور بہت صابر ہیں' اور ایسے شخص کے متعلق یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہر قسم کی تہمت سے بری ہو گا' اور ایسے شخص کے متعلق یہ یقین کیا جا سکے گا کہ اس پر جو اتہام لگایا جائے گا وہ جھوٹا ہو گا۔

(۳) حضرت یوسف علیہ السلام کا بادشاہ سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ ان کے بے قصور ہونے کو ان عورتوں سے معلوم کرے' ان کے بہت زیادہ پارسا اور پاک دامن ہونے کو ظاہر کرتا ہے' کیونکہ اگر وہ ذرا بھی اس برائی میں ملوث ہوتے تو انہیں یہ خطرہ ہوتا کہ وہ عورتیں پہلے کی طرح پھر ان پر الزام لگا دیں گی۔

(۴) جب حضرت یوسف نے ساقی سے یہ کہا تھا کہ بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا تو اس کہنے ہی کی وجہ سے ان کو سات سال یا نو سال مزید قید میں رہنا پڑا؛ اور جب بادشاہ نے ان کو بلایا تو انہوں نے اس کے بلانے کو کوئی اہمیت نہیں دی اور اس کے بلانے پر نہیں گئے، بلکہ اپنے بے قصور ہونے اور اس تہمت سے بری ہونے کی کوشش کی، اور ہو سکتا ہے اس سے حضرت یوسف کی مراد یہ ہو کہ ان کے دل میں اب بادشاہ کے بلانے کی کوئی اہمیت نہیں اور یہ اس بات کی تلافی ہو کہ پہلے انہوں نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کی بجائے ساقی کے توسل سے بادشاہ کے پاس پیش کرایا تھا۔

جیل بھرو تحریک کا عدم جواز

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا تھا کہ جتنی مدت حضرت یوسف قید میں رہے ہیں اگر اتنی مدت میں قید میں رہتا تو بادشاہ کے بلانے پر چلا جاتا، اس کا ایک معنی تو حضرت یوسف علیہ السلام کی تحسین ہے اور ان کے صبر اور ضبط کی تعریف ہے اور اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ مومن اور خصوصاً نبی کے لیے قید میں رہنا کوئی اچھی بات نہیں ہے کیونکہ آزاد فضا میں اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے، حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے اور تبلیغ کرنے کے جتنے مواقع ہوتے ہیں وہ قید خانے میں میسر نہیں ہوتے، اور آپ کا مطلب یہ تھا کہ اگر میں حضرت یوسف کی جگہ ہوتا تو قید خانے سے باہر آکر اپنے بے قصور ہونے کو واضح کرتا اور اس ارشاد سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں یہ بتانا چاہتے تھے کہ از خود بلا اور مصیبت میں گرفتار ہونا اور اپنے آپ کو قید کے لیے پیش کرنا جائز نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آج کل بعض سیاسی لیڈر جو خود گرفتاریاں پیش کرتے ہیں اور جیل بھرو تحریک چلاتے ہیں یہ جائز نہیں ہے۔

حضرت یوسف کا تہمت لگانے والیوں کی تعیین نہ کرنا

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: بادشاہ سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، اس میں حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ تصریح نہیں کی عزیز مصر کی بیوی سے پوچھو حالانکہ اس معاملہ میں سب سے زیادہ وہ پیش پیش تھی، اور آپ کو قید کرانے میں اسی کا ہاتھ تھا؛ یہ آپ کا خلق کریم تھا کہ آپ نے اس کا صراحتاً نام نہیں لیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول سے پتا چلتا ہے کہ ان عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام پر الزام لگایا اور آپ پر اس برے کام کی تہمت لگائی تھی، لیکن آپ نے معین کر کے کسی عورت کا نام نہیں لیا اور خصوصیت کے ساتھ کسی عورت کی شکایت نہیں کی۔

مصر کی عورتوں کی سازش کی وجوہ

حضرت یوسف نے فرمایا: میرا رب ان کی سازش کو خوب جاننے والا ہے، ان کی سازش کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(۱) ان عورتوں میں سے ہر ایک عورت حضرت یوسف سے اپنی خواہش پوری کرنی چاہتی تھی اور جب وہ اپنے مقصد میں ناکام ہو گئی تو اس نے انتقاماً حضرت یوسف علیہ السلام پر برائی کی تہمت لگائی۔

(۲) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ہر عورت یوسف کو اس پر آمادہ اور تیار کرتی رہی ہو کہ وہ ان کی مالکہ یعنی عزیز مصر کی بیوی کی خواہش پوری کریں اور حضرت یوسف علیہ السلام اس کو نہیں مانتے تھے اولاً اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی تھی، ثانیاً اس لیے کہ ہر شریف انسان اور نیک فطرت شخص اس قسم کی برائی اور بے حیائی سے دور رہتا ہے اور ثالثاً اس لیے کہ عزیز مصر کے حضرت یوسف علیہ السلام پر بہت دنیاوی احسان تھے، اس نے آپ کی بہت اچھی طرح پرورش کی تھی، رابعاً اس لیے کہ عزیز مصر کی بیوی نے عزیز مصر سے یہ کہہ کر آپ کو اپنے پاس رکھا تھا کہ میں اس کو بیٹا بناؤں گی تو جس عورت کو کوئی شخص

بچپن سے ماں کا قائم مقام سمجھتا رہا ہو وہ جوان ہونے کے بعد اس کے متعلق ایسا کب سوچ سکتا ہے' یہ تو عام آدمی سے بھی متصور نہیں ہے چہ جائیکہ اللہ کے نبی سے' ان وجوہات کی بناء پر حضرت یوسف علیہ السلام' عزیز مصر کی بیوی کے متعلق ان عورتوں کی سفارش کو سختی کے ساتھ رد کرتے رہے۔

(۳) وہ سب عورتیں جب اپنے مقصد میں ناکام اور نامراد ہو گئیں تو ان سب عورتوں نے مل کر عزیز مصر کے سامنے حضرت یوسف کی کردار کشی کی' آپ پر الزام لگایا اور بری تہمت لگائی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بادشاہ نے (ان عورتوں کو بلا کر) پوچھا اس وقت کیا ہوا تھا جب تم نے یوسف کو اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کی تھی؟ انہوں نے کہا حاش للہ! ہم نے اس میں کوئی برائی نہیں جانی' عزیز مصر کی بیوی نے کہا اب تو حق بات ظاہر ہو گئی ہے' میں خود اس کو اپنے نفس کی طرف راغب کرتی تھی اور بے شک وہ سچوں میں سے ہے○ (یوسف: ۵۱)

عزیز مصر کی بیوی کا اعتراف اور حصحص کا معنی

بادشاہ نے ان عورتوں سے یہ کہا کہ اس وقت کیا ہوا تھا جب تم نے یوسف کو اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کی تھی؟ اس کے بھی حسب سابق دو محمل ہیں: ایک یہ کہ ان میں سے ہر عورت خود اپنے لیے حضرت یوسف میں طمع رکھتی تھی اور دوسرا یہ کہ سب عورتیں مل کر حضرت یوسف کو عزیز مصر کی بیوی کی خواہش پوری کرنے کے لیے تیار کرتی تھیں۔

اس مجلس میں عزیز مصر کی بیوی بھی حاضر تھی' اور اس کو علم تھا کہ یہ تمام تحقیق اور تفتیش اس کی وجہ سے ہو رہی ہے' اس لیے اس نے حقیقت سے پردہ اٹھایا اور کہا اب تو حق بات ظاہر ہو ہی گئی ہے میں خود اس کو اپنے نفس کی طرف راغب کرتی تھی' ممکن ہے اس کے اعتراف کی وجہ یہ ہو کہ اس نے جب یہ دیکھا کہ حضرت یوسف نے عورتوں کا ذکر کیا اور اس کا نام نہیں لیا اور اس کی پرورش کے جو حقوق تھے ان کی رعایت کرتے ہوئے اس کا پردہ رکھا تو اس نے بھی حضرت یوسف کے اس حسن اخلاق کے بدلہ میں یہ ظاہر کیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام ہر قسم کے گناہ اور تہمت سے بری ہیں اور یہ اقرار کیا کہ گناہ اس کی جانب سے تھا' اس نے حضرت یوسف کو گناہ کی دعوت دی تھی لیکن انہوں نے اپنا دامن بچا لیا۔

اس آیت میں یہ الفاظ: حصحص الحق' اس کا معنی ہے حق واضح اور منکشف ہو گیا اور دلوں میں جاگزین ہو گیا۔ جب اونٹ زمین پر بیٹھ جائے اور قرار پکڑ لے تو عرب کہتے ہیں حصحص البعیر فی برکہ' زجاج نے کہا یہ حصہ سے ماخوذ ہے' عرب کہتے ہیں بانت حصۃ الحق من حصۃ الباطل' حق کا حصہ باطل کے حصہ سے الگ ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اس نے کہا میں نے یہ اس لیے کیا تاکہ وہ جان لے کہ میں نے اس کے پس پشت اس کی خیانت نہیں کی اور یہ بھی جان لے کہ بیشک اللہ خیانت کرنے والوں کی سازش کو کامیاب نہیں ہونے دیتا○ (یوسف: ۵۲)

پس پشت خیانت نہ کرنے کے دو محمل

اس آیت کے دو محمل ہیں: ایک یہ کہ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قول ہے اور دوسرا یہ کہ یہ عزیز مصر کی بیوی کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما' مجاہد' قتادہ اور ابو صالح نے یہ کہا ہے کہ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قول ہے۔

(جامع البیان جز ۱۲' ص ۳۱۱' تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۷' ص ۲۱۵۷' النکت والعیون ج ۳' ص ۴۸' زاد المسیر ج ۴' ص ۲۳۸)

اگر اس کلام کا قائل حضرت یوسف علیہ السلام کو قرار دیا جائے تو اس پر یہ اعتراض ہو گا کہ اس سے متصل پہلی آیت میں عزیز مصر کی بیوی کا کلام تھا کہ اب تو حق بات ظاہر ہو ہی گئی ہے' میں خود اس کو اپنے نفس کی طرف راغب کرتی تھی اور پھر

اس آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کا کلام ہو تو یہ بے ربط ہوگا، اس کا جواب یہ ہے کہ اس کلام کے بے ربط ہونے کی کیا وجہ ہے جب کہ یہ الگ الگ آیتیں ہیں اور قرآن مجید میں اس کی کئی نظائر ہیں:

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ○ (الاعراف: ۱۰۹)
فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا بے شک یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے۔

اور اس کے متصل بعد دوسری آیت میں فرعون کا کلام ہے:

يُرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ۔ (الاعراف: ۱۱۰)
(فرعون نے کہا:) یہ تم کو تمہاری زمین سے نکال دینا چاہتا ہے سو اب تم کیا مشورہ دیتے ہو۔

بلکہ قرآن مجید میں اس کی بھی مثال ہے کہ ایک آیت میں دو قائلین کا کلام ہے:

قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜهٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ○ (یٰسین: ۵۲)
(کفار) کہیں گے ہائے ہماری ہلاکت! ہماری خواب گاہ سے ہمیں کس نے اٹھا دیا، (فرشتے کہیں گے) یہ وہ ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ فرمایا تھا اور رسولوں نے سچ فرمایا۔

دوسرا محمل یہ ہے کہ یہ عزیز مصر کی بیوی کا قول ہے اور اب یہ قول، سابق قول سے متصل ہوگا کہ اس نے یہ کہا کہ میں نے یہ اعتراف اس لیے کیا ہے تاکہ یوسف یہ جان لے کہ میں نے اس کے پس پشت اس کے خلاف جھوٹ بول کر اور اس پر بہتان لگا کر خیانت نہیں کی۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے پس پشت کسی کی خیانت نہیں کی

حضرت یوسف علیہ السلام نے کس موقع پر یہ کلام فرمایا تھا؟ اس کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) جب ساقی حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس لوٹ کر قید خانہ میں آیا تو اس وقت انہوں نے فرمایا: میں نے یہ تفتیش اس لیے کرائی ہے کہ اس کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پس پشت خیانت نہیں کی۔ یہ حضرت ابن عباس اور ابن جریج کا قول ہے۔

(۲) حضرت ابن عباس کا دوسرا قول یہ ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ کے دربار میں پیش ہوئے اس وقت انہوں نے فرمایا: میں نے یہ تفتیش اس لیے کرائی ہے.....

حضرت یوسف علیہ السلام نے جو یہ فرمایا تھا: تاکہ اس کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پس پشت خیانت نہیں کی، حضرت ابن عباس، حسن، مجاہد، قتادہ اور جمہور نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ عزیز مصر کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پس پشت اس کی خیانت نہیں کی، اور ضحاک نے حضرت ابن عباس کا دوسرا قول روایت کیا ہے کہ بادشاہ کو معلوم ہو جائے کہ میں نے عزیز مصر کے پس پشت اس کی خیانت نہیں کی، اور تیسرا قول یہ ہے کہ بادشاہ کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پس پشت اس کی خیانت نہیں کی اور بادشاہ کی خیانت کی توجیہ یہ ہے کہ بادشاہ کے وزیر کی خیانت کرنا بھی بادشاہ کی خیانت ہے۔ (اس کے علاوہ ایک اور قول بھی ہے لیکن وہ اتنا واضح نہیں ہے اس لیے ہم نے اس کو ترک کر دیا۔)

(زاد المسیر ج ۴، ص ۲۳۴، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

حضرت یوسف کی پاکیزگی پر دلائل

یہ آیتیں حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت اور پاکیزگی پر حسب ذیل وجوہ سے دلالت کرتی ہیں:

(۱) عزیز مصر کی بیوی نے اعتراف کیا کہ میں خود اس کو اپنے نفس کی طرف راغب کرتی تھی۔
(۲) اور مزید یہ کہا کہ بے شک وہ سچوں میں سے تھے۔ (یوسف: ۵۱)
(۳) اس کا معنی یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام اپنے اس قول میں سچے تھے: اس عورت نے خود مجھے اپنے نفس کی طرف راغب کیا تھا۔ (یوسف: ۲۶)
(۴) بے شک اللہ مجرموں کی سازشوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ (یوسف: ۵۲)
یعنی جو شخص خائن اور سازشی ہوتا ہے وہ ضرور رسوا ہو جاتا ہے سو اگر میں خائن اور سازشی ہوتا تو ضرور رسوا ہو جاتا اور جب کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے رسوا ہونے نہیں دیا اور مجھے اس الزام اور تہمت سے بری کرا دیا تو اس سے ظاہر ہو گیا کہ میں خیانت کرنے والا نہ تھا۔
(۵) اگر حضرت یوسف نے معاذ اللہ کوئی جرم کیا ہوتا تو آپ اس بات کی ہرگز جرأت نہ کرتے کہ اپنے اوپر لگی ہوئی تہمت کی تفتیش اور تحقیق کرانے کے لیے بادشاہ کے پاس پیغام بھیجتے' ایسا اقدام وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اپنی پاکیزگی اور پارسائی پر یقینِ واثق اور کامل اعتماد ہو۔
(۶) وہ عورتیں یوسف علیہ السلام کی پاکیزگی اور طہارت پر پہلے بھی یہ کہہ کر شہادت دے چکی تھیں سبحان اللہ یہ بشر نہیں ہیں یہ تو معزز فرشتے ہیں۔ (یوسف: ۳۱)
اور اب دوسری بار بھی انہوں نے کہا: سبحان اللہ! ہم نے اس میں کوئی برائی نہیں جانی۔ (یوسف: ۵۱)
اسی طرح عزیز مصر کی بیوی نے پہلی بار بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی یہ کہہ کر بیان کی: میں نے اس کو اپنی طرف راغب کیا تھا سو یہ بچ گیا۔ (یوسف: ۳۲)
اور دوسری بار بھی اس نے اعتراف کیا کہ اب تو حق بات ظاہر ہو ہی گئی ہے میں خود اس کو اپنے نفس کی طرف راغب کرتی تھی۔ (یوسف: ۵۱)

الجزء ۱۳

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا
اور میں اپنے نفس کو بے قصور نہیں قرار دیتا، بے شک نفس تو برائی کا بہت حکم دینے والا ہے، سوا اس کے
رَحِمَ رَبِّیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۵۳﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ
جس پر میرا رب رحم فرمائے، بے شک میرا رب بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے ○ اور بادشاہ نے کہا اس کو میرے پاس لے
بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا
کر آؤ میں اس کو اپنے لیے مخصوص رکھوں گا، پھر جب بادشاہ نے اس سے گفتگو کی تو کہا اے یوسف! آپ آج سے ہمارے نزدیک
مَكِیْنٌ اَمِیْنٌ ﴿۵۴﴾ قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ
مقتدر اور امانت دار ہیں ○ (یوسف نے) کہا مجھے اس ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیں۔ بے شک میں

حَفِيۡظٌ عَلِيۡمٌ ﴿۵۵﴾ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوۡسُفَ فِى الۡاَرۡضِ‌ۚ يَتَبَوَّاُ

حفاظت کرنے والا علم والا ہوں ○ اور اسی طرح ہم نے یوسف کو اس ملک میں اقتدار عطا کیا، وہ اس ملک میں

مِنۡهَا حَيۡثُ يَشَآءُ‌ ؕ نُصِيۡبُ بِرَحۡمَتِنَا مَنۡ نَّشَآءُ‌ وَلَا نُضِيۡعُ

جہاں رہنا چاہتے تھے رہتے تھے، ہم جس کو چاہتے ہیں اپنی رحمت پہنچاتے ہیں اور ہم نیکی کرنے والوں کے اجر کو

اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۵۶﴾ وَلَاَجۡرُ الۡاٰخِرَةِ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَكَانُوۡا

ضائع نہیں کرتے ○ اور جو لوگ ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے ان کے لیے آخرت کا

يَتَّقُوۡنَ ﴿۵۷﴾ ع

اجر بہت بہتر ہے ○

۷ع۸-۱

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (یوسف نے کہا) اور میں اپنے نفس کو بے قصور نہیں قرار دیتا' بے شک نفس تو بُرائی کا بہت حکم دینے والا ہے' سوا اس کے جس پر میرا رب رحم فرمائے' بے شک میرا رب بہت بخشنے والا' بے حد رحم فرمانے والا ہے○ (یوسف: ۵۳)

حضرت یوسف کے اس قول کی توجیہ کہ میں اپنے نفس کو بے قصور نہیں کہتا

مفسرین کا اس اختلاف ہے کہ اس قول کے قائل حضرت یوسف ہیں یا عزیز مصر کی بیوی' صحیح قول یہ ہے کہ اس قول کے قائل حضرت یوسف علیہ السلام ہیں اور اس آیت کا معنی یہ ہے: میں اپنے نفس کو خطاؤں اور لغزشوں سے پاک قرار نہیں دیتا کیونکہ انسانوں کے نفوس ان کو اپنی خواہش پر چلنے کا حکم دیتے رہتے ہیں' خواہ نفسانی خواہشیں اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی رضا کے خلاف کیوں نہ ہوں' ہاں مخلوق میں سے جس پر میرا رب رحم فرمائے تو وہ اس کو خواہش کی پیروی کرنے اور بری باتوں میں نفس کے احکام کی اطاعت کرنے سے نجات عطا فرماتا ہے اور بے شک جو شخص اپنے گناہوں پر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ دنیا میں اس کو سزا دینے اور اس کو رسوا کرنے سے درگزر فرماتا ہے' اور اسی طرح آخرت میں بھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ کیوں فرمایا تھا؟ اس کی مفسرین نے متعدد وجوہ بیان کی ہیں جن میں سے بعض وجوہ ناگفتنی ہیں۔ صحیح وجہ یہ ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے یہ فرمایا: میں نے یہ اس لیے کیا تاکہ وہ جان لے کہ میں نے اس کے پس پشت اس کی خیانت نہیں کی' اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ خیال آیا کہ میں نے جو یہ کہا ہے ہو سکتا ہے یہ اپنی تعریف اور خود سرائی اور خود ستائی کے زمرہ میں آتا ہو اور اللہ تعالیٰ نے خود ستائی سے منع فرمایا ہے اس لیے اس کے ازالہ اور تلافی کے طور پر فوراً فرمایا: اور میں اپنے نفس کو بے قصور نہیں قرار دیتا' بے شک نفس تو برائی کا بہت حکم دینے والا ہے سوا اس کے جس پر میرا رب رحم فرمائے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ عزیز مصر کی بیوی کا قول ہے جب اس نے اپنی خطا کا اعتراف کر لیا اور یہ اقرار کر لیا کہ اسی نے حضرت یوسف کو ورغلایا تھا اور حضرت یوسف نے گناہ سے اپنا دامن بچا لیا تھا تو بطور اعتذار کے کہا کہ میں اپنے آپ کو بے

قصور نہیں کہتی بے شک نفس تو برائی کا بہت حکم دینے والا ہے سوا اس کے جس پر میرا رب رحم فرمائے، بے شک میرا رب بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔ (یوسف: ۵۳)

یہ قول اس لیے صحیح نہیں ہے کہ عزیز مصر کی بیوی بت پرست تھی، اس کا یہ کہنا متصور نہیں ہے کہ سوا اس کے جس پر میرا رب رحم فرمائے، بے شک میرا رب بہت بخشنے والا بے حد مہربان ہے، یہ کہنا حضرت یوسف علیہ السلام ہی کے لائق ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جو فرمایا تھا: اور میں اپنے نفس کو بے قصور نہیں قرار دیتا، اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جب حضرت یوسف نے فرمایا تھا "میں نے اس کے پس پشت اس کی خیانت نہیں کی" تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ان کو اس فعل کی طرف رغبت نہیں تھی یا ان کا نفس اور ان کی طبیعت اس فعل کی طرف مائل نہیں تھی کیونکہ نفس تو برائی کا حکم دینے والا ہے اور طبیعت لذات کی شائق ہوتی ہے اور اس کلام سے حضرت یوسف نے یہ ظاہر فرمایا کہ ان کا اس گناہ کو ترک کرنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ ان کو اس فعل کی طرف رغبت نہیں تھی یا اس کی طاقت نہیں تھی بلکہ ان کا اس گناہ کو ترک کرنا محض اللہ تعالیٰ کے ڈر اور اس کے خوف کی وجہ سے تھا، بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں گناہوں کی طاقت اور قدرت نہیں ہوتی اور وہ اپنے اختیار سے گناہوں کو ترک نہیں کرتے بلکہ ان کا گناہوں کا ترک کرنا فرشتوں کی طرح اضطراری ہوتا ہے سو ان کا یہ قول عصمت کی تعریف سے عدم واقفیت پر مبنی ہے۔

عصمت کی تعریف

علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی ۷۹۱ھ لکھتے ہیں:

عصمت کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ میں اس کی قدرت اور اختیار کے باوجود گناہ نہ پیدا کرے، اسی کے قریب یہ تعریف ہے: عصمت اللہ تعالیٰ کا لطف ہے جو بندہ کو اچھے کاموں پر ابھارتا ہے اور برے کاموں سے روکتا ہے باوجود اس کے کہ بندہ کو گناہ پر اختیار ہوتا ہے تاکہ بندہ کا مکلف ہونا صحیح رہے، اس لیے شیخ ابو منصور ماتریدی نے فرمایا: عصمت مکلف ہونے کو زائل نہیں کرتی، ان تعریفوں سے ان لوگوں (بعض شیعہ اور بعض معتزلہ) کے قول کا فساد ظاہر ہو گیا جو یہ کہتے ہیں کہ عصمت نفس انسان یا اس کے بدن میں ایسی خاصیت ہے جس کی وجہ سے گناہ کا صدور محال ہو جاتا ہے کیونکہ اگر کسی انسان سے گناہ کا صدور محال ہو تو اس کا مکلف کرنا صحیح ہو گا نہ اس کو اجر و ثواب دینا صحیح ہو گا۔ (شرح عقائد نسفی ص ۱۰۹، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی)

علامہ شمس الدین احمد بن موسیٰ خیالی متوفی ۸۷۰ھ لکھتے ہیں:

گناہوں پر قدرت کے باوجود گناہوں سے بچنے کے ملکہ (مہارت) کو عصمت کہتے ہیں۔

(حاشیۃ الخیالی ص ۱۴۶، مطبوعہ مطبع یوسفی لکھنؤ)

قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴ھ لکھتے ہیں:

جمہور اس نظریہ کے قائل ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اپنے کسب اور اختیار سے اللہ کی طرف سے معصوم ہوتے ہیں، اس کے برخلاف حسین النجار (معتزلی) نے یہ کہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو گناہوں پر بالکل قدرت نہیں ہوتی۔

(الشفاء ج ۲، ص ۱۲۵، مطبوعہ ملتان)

علامہ قاسم بن قطلوبغا حنفی متوفی ۸۸۱ھ لکھتے ہیں:

عصمت کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے میں گناہ کی قدرت اور اختیار کے باوجود گناہ کو پیدا نہ کرے۔

(شرح المسامرۃ، ص ۲۹۰، مطبوعہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ بلوچستان)

نفس امارہ اور نفس مطمئنہ

حکماء کا اس میں اختلاف ہے کہ نفس امارہ کیا چیز ہے جو برائی کا بہت حکم دیتا ہے۔ محققین نے یہ کہا ہے کہ نفس انسان ایک چیز ہے اور اس کی صفات بہت ہیں، جب یہ اللہ عزوجل کی معرفت میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے تو پھر یہ نفس مطمئنہ ہوتا ہے اور جب یہ شہوت اور غضب کی طرف مائل ہو تو پھر یہ نفس امارہ ہوتا ہے، اور نفس جو بُرائی کا بہت حکم دیتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ نفس ابتدا سے ہی دنیا کی رنگینیوں اور پرکشش چیزوں سے دلچسپی رکھتا ہے، محسوسات کا عالم اس کے مشاہدہ میں ہوتا ہے اور آخرت کا عالم اور آخرت کی پُرکشش چیزیں اس کی نظر سے غائب ہوتی ہیں اور بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو حسن ظاہر کو چھوڑ کر حسن غائب کی طرف متوجہ ہوں، اس لیے اس ظاہر عالم کی پُرکشش چیزیں اس کو اپنی طرف کھینچتی ہیں اور بہت قلیل لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ان جسمانی لذات کو چھوڑ کر روحانی لذتوں کی طرف راغب ہوں اس لیے بالعموم انسان کا نفس برائی کا حکم کرتا ہے، البتہ وہ نفوس قدسیہ جو اللہ تعالیٰ کی ذات کی معرفت میں مستغرق رہتے ہیں، اس کی صفات کا مطالعہ کرتے ہیں، ان کی طبیعت شریعت کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے، ان پر یہ حاضر اور ظاہری رنگینیاں اور پرکشش چیزیں اثرانداز نہیں ہوتیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے خوف کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں کبھی گناہ کا خطرہ نہیں ہوتا اور انہی لوگوں کا نفس مطمئن ہوتا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے انسان اس وقت گناہ سے بچ سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے شامل حال ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بادشاہ نے کہا اس کو میرے پاس لے کر آؤ، میں اس کو اپنے لیے مخصوص رکھوں گا، پھر جب بادشاہ نے اس سے گفتگو کی تو کہا (اے یوسف!) آپ آج سے ہمارے نزدیک مقتدر اور امانت دار ہیں○ (یوسف: ۵۴)

بادشاہ کا حضرت یوسف کو اپنے پاس بلانا

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری نے لکھا ہے: بادشاہ سے مراد ہے مصر کا بادشاہ۔ امام ابن اسحاق نے کہا: وہ الولید بن الریان ہے۔ (جامع البیان جز ۱۳، ص ۶، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام رازی نے کہا: اس میں اختلاف ہے کہ اس بادشاہ سے مراد کون ہے، بعض نے کہا اس سے مراد عزیز مصر ہے۔ یعنی بادشاہ کا وزیر اور بعض نے کہا اس سے مراد بادشاہ ہے یعنی الولید بن الریان۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ بادشاہ نے کہا میں اس کو اپنے لیے مخصوص رکھوں گا اور اس سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام عزیز مصر کے لیے مخصوص تھے، اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں الملک سے مراد بادشاہ ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام جب قید میں تھے تو ان کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور کہا: دعا کیجئے: اے اللہ! میرے لیے کشادگی اور قید سے نکلنے کی راہ پیدا کر دے اور مجھے وہاں سے رزق عطا فرما جہاں سے مجھے گمان بھی نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کے لیے قید سے رہائی کا سبب پیدا فرما دیا، قرآن مجید میں ہے:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ○ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۚ (الطلاق: ۳-۲)

اور جو اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے لیے نجات کی راہ پیدا کر دیتا ہے، اور اس کو وہاں سے رزق عطا فرماتا ہے جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہوتا، اور جو اللہ پر توکل کرتا ہے تو اللہ اس کے لیے کافی ہے۔

حضرت یوسف سے بادشاہ کے متاثر ہونے کی وجوہات

بادشاہ جو حضرت یوسف علیہ السلام کا بہت زیادہ معتقد ہو گیا تھا اور ان کو اپنے لیے مخصوص کرنا چاہتا تھا اس کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(۱) بادشاہ حضرت یوسف علیہ السلام کے علم سے بہت متاثر ہوا تھا، کیونکہ جب بادشاہ کے خواب کی تعبیر سے اس کے تمام ارکان دولت عاجز ہو گئے تھے، اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے برجستہ اس خواب کی تعبیر بتائی اور اس کو جو پریشانی لاحق ہونے والی تھی، اور اس قوم پر جو مصیبت آنے والی تھی اس کو دور کرنے کا طریقہ بھی بتادیا۔

(۲) وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر اور ضبط سے بھی بہت متاثر ہوا کیونکہ جب اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی رہائی کا حکم بھیجا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اس وقت تک قید خانے سے نکلنے سے انکار کر دیا جب تک کہ تمام الزاموں اور تہمتوں سے حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت ظاہر نہ ہو جائے۔

(۳) وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ادب اور احترام اور ان کی پردہ پوشی کی صفت سے بھی بہت متاثر ہوا کیونکہ انہوں نے صرف یہ فرمایا کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ (یوسف: ۵۰) حالانکہ آپ کی غرض عزیز مصر کی بیوی کا حال معلوم کرنا تھا جس نے آپ پر تہمت لگائی تھی لیکن آپ نے اس کا پردہ رکھا اور باقی عورتوں کا ذکر کیا جب کہ باقی عورتوں سے بھی آپ کا واسطہ عزیز مصر کی بیوی کی وجہ سے ہی پڑا تھا اور آپ اسی کی تہمت اور الزام کی وجہ سے اس قید میں گرفتار ہوئے تھے اور یہ آپ کا نہایت درجہ کا ظرف اور حوصلہ تھا۔

(۴) وہ آپ کی پاکیزگی اور پارسائی اور آپ کے ٹھوس اور پختہ کردار کی وجہ سے بھی متاثر ہوا، کیونکہ جو آپ پر تہمت لگانے والے تھے ان سب نے آپ کی ان تہمتوں سے براءت کا اعتراف اور اقرار کر لیا۔

(۵) آپ کے ساتھ قید میں جو ساقی رہا تھا اس نے آپ کی بہت تعریف کی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بہت زیادہ عبادت کرتے ہیں اور دوسرے قیدیوں کے ساتھ بہت نیک سلوک کرتے ہیں، بیماروں کی عیادت کرتے ہیں اور ہر کسی کے کام آنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ ایسی وجوہ ہیں کہ ان میں سے ایک وجہ بھی کسی شخص میں پائی جائے تو اس شخص سے لوگ متاثر ہوں گے تو جس شخص میں یہ تمام وجوہات پائی جائیں تو لوگ اس سے کس قدر زیادہ متاثر ہوں گے اور کتنے زیادہ اس کے عقیدت مند ہوں گے۔

جب بادشاہ حضرت یوسف علیہ السلام کی ان صفات اور ان کے ان شمائل اور خصائل پر مطلع ہوا تو وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ رکھنے کا خواہش مند ہوا اور وہ اس پر راغب ہوا کہ ان کو اپنے لیے مخصوص کر لے۔

حضرت یوسف کا رہا ہو کر بادشاہ کے دربار میں جانا

حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس جب بادشاہ کا قاصد ان کو بلانے کے لیے پہنچا تو اس نے کہا: آپ نہا دھو کر، قید کے کپڑے اتار کر عمدہ لباس پہنیں اور میرے ساتھ بادشاہ کے پاس چلیں، حضرت یوسف نے قید خانہ سے نکلنے سے پہلے قید خانہ کے دروازہ پر لکھ دیا: "یہ آزمائش اور امتحان کی جگہ، یہ زندہ لوگوں کا قبرستان ہے، یہ دشمنوں کے ہنسنے کا موقع ہے اور سچوں کی تجربہ گاہ ہے۔" جب حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ کے دربار میں پہنچے تو یہ دعا کی: اے اللہ! میں اس کی خیر سے تیری خیر کا سوال کرتا ہوں، اور اس کے شر سے تیری قدرت اور تیری عزت کی پناہ میں آتا ہوں، اور جب اس کے پاس داخل ہوئے تو عبرانی زبان میں اس کے حق میں دعائیہ کلمات کہے۔

بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس لیے اپنے ساتھ مخصوص کرنا چاہا تھا کہ بادشاہوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب ان کو کسی عمدہ اور نفیس چیز کا پتا چلتا ہے تو وہ چاہتے ہیں کہ وہ بلا شرکت غیرے اس چیز کے مالک ہو جائیں۔

جب بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام سے گفتگو کی تو کہا: میں اپنی اہلیہ اور طعام کے سوا تم کو اپنی ہر چیز میں شریک کرنا چاہتا ہوں، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: کیا تمہارا یہ خیال تھا کہ میں تمہارے ساتھ کھانا کھاؤں گا! حالانکہ میں یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم خلیل اللہ علیہم السلام ہوں۔ جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ کے دربار میں پہنچے تھے اس وقت آپ کی عمر تیس سال تھی اور اس وقت آپ جوان رعنا تھے، بادشاہ نے حضرت یوسف کو دیکھ کر ساقی سے کہا یہ وہ شخص ہے جس نے میرے خواب کی تعبیر بتائی تھی حالانکہ بڑے بڑے جادوگر اور کاہن اس کی تعبیر بتانے سے عاجز رہے تھے، پھر بادشاہ نے یہ فرمائش کی کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس کے سامنے بالمشافہ خواب کی تعبیر بیان کریں، پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے تفصیل کے ساتھ پہلے اس کا دیکھا ہوا خواب بیان کیا، پھر اس کی تعبیر بیان فرمائی۔

حضرت یوسف کا بادشاہ کے سامنے خواب اور اس کی تعبیر بیان کرنا

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: اے بادشاہ تم نے خواب میں دیکھا کہ سات بہت حسین و جمیل اور موٹی تازی گائیں ہیں جو بہت خوش نما اور بھلی معلوم ہوتی ہیں، ان کے بچے ان کا دودھ پی رہے تھے، وہ دریائے نیل سے نکل کر کنارے پر آئیں، جس وقت آپ یہ حسین منظر دیکھ کر خوش ہو رہے تھے، اچانک دریا کا پانی زمین میں دھنس گیا اور اس کی کیچڑ میں سے سات دبلی پتلی گائیں نمودار ہوئیں، ان کے بال بکھرے ہوئے اور غبار آلود تھے، ان کے پیٹ سکڑے ہوئے تھے، ان کے ساتھ ان کے دودھ پینے والے بچے نہ تھے۔ ان کے لمبے لمبے دانت اور داڑھیں تھیں۔ کتے کی طرح ان کے پنجے تھے، اور درندوں کی طرح ان کی سونڈ تھی، وہ ان فربہ گایوں پر حملہ آور ہوئیں اور دیکھتے دیکھتے انہوں نے درندوں کی طرح ان کو چیر پھاڑ ڈالا، اور ان کا گوشت کھا گئیں اور ان کی کھال کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور ان کی ہڈیوں کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ آپ یہ منظر دیکھ کر اس پر تعجب کر رہے تھے کہ یہ دبلی پتلی گائیں کس طرح ان فربہ گایوں پر غالب آ گئیں، اور ان گایوں کو کھانے کے باوجود ان دبلی گایوں کی جسامت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، پھر اچانک آپ نے سات تر و تازہ اور سرسبز خوشے دیکھے جو دانوں اور پانی سے بھرے ہوئے تھے، اور اسی کھیت میں دوسری جانب سات خشک خوشے تھے، وہ نہ سرسبز تھے، نہ ان میں دانہ اور پانی تھا، ان کی جڑیں کیچڑ اور پانی میں تھیں۔ جس وقت آپ دل میں یہ سوچ رہے تھے کہ یہ کیسا منظر ہے ایک طرف یہ سرسبز اور پھل دار خوشے ہیں اور دوسری طرف یہ سیاہ اور خشک خوشے ہیں اور دونوں ایک ہی کھیت میں ہیں اور ان کی جڑیں پانی میں ہیں، جب تیز ہوا چلتی تو سیاہ اور خشک پودوں کے پتے اڑ کر سرسبز پودوں پر جا کر گر جاتے تو پھر ان میں آگ لگ جاتی اور وہ جل کر سیاہ ہو جاتے پھر اے بادشاہ! آپ خوفزدگی کے عالم میں بیدار ہو گئے۔ پھر بادشاہ نے کہا: اللہ کی قسم یہ بہت عجیب و غریب خواب تھا اور جس طرح آپ نے اس کی منظر کشی کی ہے وہ بہت ہی دل فریب ہے! تو اے صدیق آپ کے نزدیک اس خواب کی کیا تعبیر ہے؟ حضرت یوسف نے کہا: میری رائے یہ ہے کہ خوش حالی کے ان سرسبز سالوں میں آپ غلے کو جمع کر لیں اور ان سالوں میں زیادہ سے زیادہ گندم کاشت کریں کیونکہ ان سالوں میں اگر آپ نے پتھر اور بجری میں بھی گندم بوئی تو اس سے بھی گندم اگ آئے گی۔ اور اللہ تعالیٰ ان میں بہت روئیدگی اور برکت فرمائے گا، پھر آپ گندم کو ان کے خوشوں میں رہنے دیں اور ان کو گوداموں میں ذخیرہ کرائیں، پس اس گندم کا بھوسا جانوروں کے چارے میں استعمال ہو گا اور گندم لوگوں کی خوراک بنے گی، پھر جس گندم کا آپ ذخیرہ کریں گے وہ مصر اور اس کے مضافات کے لیے کافی ہو گی اور دور دراز سے سفر کر کے لوگ آپ کے پاس گندم لینے

کے لیے آئیں گے اور اس کو فروخت کرنے سے آپ کے پاس مال و زر کا اتنا بڑا خزانہ جمع ہو جائے گا جو آپ سے پہلے کسی کے پاس نہیں تھا، پھر بادشاہ نے کہا کہ میرے اس کام کی نگرانی اور اس کا انتظام کون کرے گا؟ اگر میں شہر کے تمام لوگوں کو بھی اکٹھا کر لوں تو وہ اس کام کو خوش اسلوبی سے نہیں کر سکیں گے! اور ان سے ایمانداری اور دیانت داری کی بھی توقع نہیں ہے! تب حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: آپ مجھے اپنے ملک کے خزانوں کا امیر مقرر کر دیں۔

بادشاہ کا حضرت یوسف کو صاحب اقتدار اور امانت دار قرار دینا

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کو خواب کی تعبیر اور قحط کے مشکل حالات کا حل بتایا تو بادشاہ نے کہا (اے یوسف!) "آپ آج سے ہمارے نزدیک مقتدر اور امانت دار ہیں" اور یہ ایک جامع کلمہ ہے جو تمام فضائل اور مناقب کو شامل ہے کیونکہ مکین وہ شخص ہو سکتا ہے جس کے پاس قدرت اور علم ہو، کیونکہ قدرت سے وہ حسب منشاء تصرف کر سکے گا، اور علم کے ذریعہ ہی اس کو معلوم ہو گا کہ کون سا کام کرنا چاہیے اور کون سا کام نہیں کرنا چاہیے۔ اور جو شخص امانت دار ہو گا وہ اسی کام کو کرے گا جس کا کرنا حکمت اور مصلحت کے مطابق ہو گا نہ کہ وہ کام جو صرف اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے ہو، خواہ اس میں کوئی حکمت اور مصلحت ہو یا نہ ہو، خلاصہ یہ ہے کہ بادشاہ نے کہا آپ ہمارے نزدیک ایسے شخص ہیں جو ہمارے ملک میں اپنے علم اور قدرت سے حکمت اور مصلحت کے مطابق تصرف کریں۔

(تفسیر کبیر ج ۶، ص ۴۷۲-۴۷۰، الجامع لاحکام القرآن جز ۹، ص ۱۸۵-۱۸۴، روح المعانی جز ۱۳، ص ۹-۸)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (یوسف نے) کہا مجھے اس ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیں بے شک میں حفاظت کرنے والا، علم والا ہوں O (یوسف: ۵۵)

طلب منصب کا عدم جواز اور حضرت یوسف کے طلب منصب کی توجیہ

حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے منصب طلب کیا، ہو سکتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی شریعت میں منصب کو طلب کرنا جائز ہو، لیکن ہماری شریعت میں منصب کو طلب کرنا جائز نہیں ہے۔

حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عبدالرحمن بن سمرہ! امارت کا سوال نہ کرنا، کیونکہ اگر تم کو سوال کی وجہ سے امارت دی گئی تو تم کو اس کے سپرد کر دیا جائے گا اور اگر تم کو بغیر سوال کے امارت دی گئی تو اس میں تمہاری مدد کی جائے گی، اور اگر تم کسی چیز کی قسم کھاؤ پھر تم یہ دیکھو کہ اس کا خلاف بہتر ہے تو تم اپنی قسم کا کفارہ کر دو اور اس بہتر کام کو کر لو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۶۲۲، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۶۵۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۹۲۹، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۵۲۹، سنن النسائی رقم الحدیث: ۵۳۸۴، السنن الکبریٰ للنسائی قم الحدیث: ۸۷۴۵، سنن ابوداؤد الطیالسی رقم الحدیث: ۱۳۵۱، مسند احمد ج ۵، ص ۶۱-۶۲، سنن الدارمی رقم الحدیث: ۲۳۵۱، المنتقیٰ لابن الجارود رقم الحدیث: ۹۹۸-۹۲۹، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۱۵۱۶، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۴۳۴۸، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۱۰، ص ۵۳، تہذیب الکمال ج ۱۷، ص ۱۶۰)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میرے ساتھ اشعریین کے دو آدمی تھے، ایک میری دائیں جانب اور دوسرا میری بائیں جانب تھا۔ ان دونوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی منصب کا سوال کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مسواک کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: اے ابوموسیٰ! تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے عرض کیا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، انہوں نے مجھے اپنے دل کی بات پر

مطلع نہیں کیا تھا، اور مجھے یہ پتا نہیں چلا تھا کہ یہ کسی منصب کو طلب کریں گے، حضرت ابو موسیٰ نے کہا: گویا کہ میں دیکھ رہا تھا کہ آپ کی مسواک آپ کے ہونٹ کے نیچے تھی اور وہ سکڑ چکی تھی، آپ نے فرمایا: جو شخص کسی منصب کا ارادہ کرے گا، ہم اس کو ہرگز اس منصب پر مقرر نہیں کریں گے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۱۵۶، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۷۳۳، رقم حدیث الباب: ۱۵، الرقم المسلسل: ۴۶۳۴، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۳۵۴، سنن النسائی رقم الحدیث: ۴، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۵۹۳۵)

اور اگر بالفرض حضرت یوسف علیہ السلام کی شریعت میں بھی منصب کو طلب کرنا ممنوع ہو تو پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے عہدہ طلب کرنے کی توجیہ یہ ہے کہ حضرت یوسف نے یہ عہدہ اس لیے طلب کیا تھا کہ ان کے علاوہ کوئی اور شخص اس منصب کا اہل نہیں تھا اور نہ کوئی اتنا نیک اور دیانت دار تھا جو مستحق لوگوں کو ان کے حقوق پہنچا سکے۔ اس لیے ان کے نزدیک اس عہدہ کی صلاحیت اور اہلیت کے لحاظ سے وہ اس عہدہ کے لیے متعین تھے اور ان پر اس عہدہ کا طلب کرنا فرض تھا، اور آج کل بھی یہی حکم ہے، اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہو کہ قضا، امارت یا کسی اور عہدہ کے لیے اس کے علاوہ اور کسی شخص میں اس عہدہ کی اہلیت اور صلاحیت نہیں اور نہ کسی اور میں تقویٰ اور پرہیزگاری ہے تو اس پر واجب ہے کہ وہ اس عہدہ کا سوال کرے اور اس عہدہ کے حصول کے لیے جدوجہد کرے اور وہ عہدہ دینے والوں کو اپنی ان صفات کی خبر دے جن صفات کی وجہ سے وہ اس عہدہ کا اہل اور مستحق ہے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی صفات بتائیں اور فرمایا: میں بہت حفاظت کرنے والا اور بہت جاننے والا ہوں، اور اگر اس کو یہ علم ہو کہ اس کے علاوہ اور بہت لوگ ہیں جو اس عہدہ کی صلاحیت اور اہلیت رکھتے ہیں تو پھر اس کے لیے اس عہدہ کو طلب کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم امارت کا سوال نہ کرو، کیونکہ جب اس کو علم ہو کہ اس منصب کی وجہ سے بہت آفتیں اور مصیبتیں آتی ہیں اور ان سے چھٹکارا پانا بہت مشکل ہوتا ہے اس کے باوجود وہ اس منصب کو طلب کرے اور اس پر حریص ہو تو یہ اس کی دلیل ہے کہ وہ اپنی ذات کی منفعت اور اپنی اغراض کو پورا کرنے کے لیے اس عہدہ کو طلب کر رہا ہے اور جو شخص ایسا ہو گا وہ عنقریب اپنی نفسانی خواہشوں کا شکار ہو کر ہلاک ہو جائے گا، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اس منصب کو طلب کرے گا اس کو اس کے سپرد کر دیا جائے گا، اور جس شخص کو اس منصب پر آنے والی آفتوں اور مصیبتوں کا علم ہو اور اس کو یہ خدشہ ہو کہ وہ اس منصب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے گا اور اس سے اس کے حقوق میں کوتاہیاں ہوں گی۔ اس وجہ سے وہ اس منصب کو قبول کرنے سے انکار کرے اور اس سے دور بھاگے پھر اس کو زبردستی اس منصب پر فائز کر دیا جائے تو اس کے حق میں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کو ان متوقع آفات اور مصائب اور خطرات سے نجات مل جائے گی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے فرمایا: جس کو اس کی طلب کے بغیر منصب دے دیا گیا اس کی (غیب سے) مدد کی جائے گی۔

موجودہ طریق انتخاب کے جواز پر حضرت یوسف کے طلب منصب سے استدلال اور اس کے جوابات

ہمارے زمانہ میں قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کی نشستوں کے جو انتخابات ہوتے ہیں، ان نشستوں کے حصول کے لیے مختلف سیاسی جماعتوں کے امیدوار ازخود کھڑے ہوتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اسلام میں منصب کو طلب کرنا جائز نہیں ہے تو پھر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے طلب منصب سے استدلال کرتے ہیں، اس کے حسب ذیل جوابات ہیں:

یہ استدلال اس لیے صحیح نہیں ہے کہ یہ شریعت سابقہ ہے، اور شریعت سابقہ کے جو احکام ہماری شریعت کے خلاف ہوں، وہ ہم پر حجت نہیں ہوتے، ہمارے لیے یہ حکم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بخدا! ہم اس شخص کو عامل

نہیں بنائیں گے جو اس کو طلب کرے گا اور نہ اس شخص کو عامل بنائیں گے جو اس کی حرص کرے گا' جیسا کہ اس بحث کے شروع میں ہم نے احادیث بیان کر دی ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نبی تھے اور نبی کا تقویٰ قطعی اور یقینی ہوتا ہے' نبی کو وحی کی تائید حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنے افعال کے متعلق اللہ کی رضا سے مطلع رہتے ہیں جبکہ عام آدمی کا تقویٰ قطعی اور یقینی نہیں ہوتا اور غیر قطعی کو قطعی پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا عہدہ طلب کرنا اللہ تعالیٰ کی اجازت سے تھا جو ان کو وحی کے ذریعے سے حاصل ہوئی تھی اور عام آدمی کے حق میں یہ متصور نہیں۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب کوئی منصب کا اہل نہ ہو تو جو شخص اہل ہو' اس کا محض خدمت کے لیے منصب کو طلب کرنا ضرورت کی بناء پر جائز ہے۔ ہمیں اس قاعدہ کی صحت سے انکار نہیں ہے' لیکن جو چیز ضرورت کی بناء پر جائز کی گئی ہو' اس کو صرف ضرورت کی حد تک محدود رکھنا صحیح ہے' اس کو عام رواج اور معمول بنالینا صحیح نہیں ہے۔ مثلاً جب کوئی حلال چیز کھانے کے لیے دستیاب نہ ہو تو ضرورت کی بناء پر شراب اور خنزیر کی حرمت ساقط ہو جاتی ہے' لیکن اگر کوئی شخص ضرورت کے حوالے سے خنزیر اور شراب کو کھانے پینے کا عام معمول بنالے تو یہ صحیح نہیں ہے۔

موجودہ طریقہ انتخاب کا غیر اسلامی ہونا

پاکستان میں انتخاب کے موقع پر ہر حلقہ انتخاب سے بکثرت امیدوار از خود کھڑے ہوتے ہیں اور زر کثیر خرچ کر کے اپنے لیے کنویسنگ کرتے ہیں اور مخالف امیدواروں کی کردار کشی کرتے ہیں' اور اس سلسلے میں غیبت' افتراء اور تہمت کی تمام حدود کو پھلانگ جاتے ہیں اور یہ طریقہ اسلام میں بالکل ناجائز ہے۔ اور ہر امیدوار کے متعلق یہ کہنا کہ یہ ضرورت کی بناء پر کھڑا ہوا ہے بداہتًا باطل ہے' کیونکہ ہر حلقہ انتخاب سے بکثرت امیدوار کھڑے ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ چونکہ اور کوئی اہل نہیں تھا اس لیے یہ سب امیدوار کھڑے ہوگئے ہیں!

امیدوار کے لیے شرائط اہلیت نہ ہونے کے غلط نتائج

در حقیقت پاکستان کے آئین میں طلب منصب کی اجازت دینا ہی غیر اسلامی دفعہ ہے' جو امیدوار انتخاب کے لیے کھڑے ہوتے ہیں' انہیں امیدواروں میں سے صدر مملکت' وزیر اعظم' وزیر اعلیٰ اور دیگر وزراء کا انتخاب ہوتا ہے اور یہی امیدوار اسمبلی میں جا کر کسی قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں' ملک کے سربر آوردہ علماء اور دانشوروں پر مشتمل اسلامی نظریاتی کونسل اتفاق رائے سے کسی قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کرتی ہے لیکن وہ اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک کہ قومی اسمبلی اس کو منظور نہ کرے اور قومی اسمبلی کے ممبروں کے لیے' اسلامی علوم یا مروجہ علوم میں سے کسی علم کی کوئی شرط نہیں ہے' نیکی اور تقویٰ کی' سیاسی تجربہ اور تدبر کی' حتیٰ کہ مرد ہونے کی بھی کوئی شرط نہیں ہے' ہر فاسق و فاجر' جاہل اور ناتجربہ کار شخص خواہ مرد ہو یا عورت' انتخاب کے لیے کھڑا ہو سکتا ہے اور پیسہ اور اثر و رسوخ کے زور پر اسمبلی میں پہنچ کر صدر مملکت' وزیر اعظم' وزیر اعلیٰ یا کسی بھی محکمہ کا وزیر بن سکتا ہے اور وہ علم' تجربہ اور اچھے کردار کے بغیر بھی اسلامی نظریاتی کونسل کی پیش کردہ سفارشات کو مسترد کر سکتا ہے اور کسی بھی قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

موجودہ طریق انتخاب کی اصلاح کی ایک صورت

میں نے اسلامی نظریاتی کونسل کے اجلاس میں جب یہ اعتراض کیا کہ پاکستان کے آئین میں امیدوار کے لیے کوئی معیار

مقرر نہیں کیا گیا تو اس وقت کے امور مذہبیہ کے وفاقی وزیر راجہ ظفر الحق نے آئین پاکستان سے امیدوار کے لیے حسب ذیل شرط پڑھ کر سنائی:

آرٹیکل ۶۲: کوئی شخص مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کا رکن منتخب ہونے یا چنے جانے کا اہل نہیں ہوگا اگر.....

(ہ) وہ اسلامی تعلیمات کا خاطر خواہ علم نہ رکھتا ہو اور اسلام کے مقرر کردہ فرائض کا پابند نیز کبیرہ گناہوں سے مجتنب نہ ہو۔ (آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان ص ۸۶، مطبوعہ منصور بک ہاؤس لاہور)

اہل فہم پر مخفی نہیں ہے کہ وزیر موصوف کا یہ جواب صحیح نہیں ہے اس لیے کہ آئین پاکستان کی اس دفعہ میں اسلامی تعلیمات کے علم کی یہ شرط مبہم اور غیر واضح ہے، اس میں اسلامی علوم کا کوئی معیار مقرر نہیں کیا گیا نہ کسی منضبط سند کی شرط لگائی گئی ہے جسے دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ آیا اس کو اسلامی علوم پر دسترس ہے یا نہیں اور کسی دینی یا دنیاوی سند کی شرط نہ ہونے کے نتیجہ میں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کئی انگوٹھے لگانے والے اسمبلی کے ممبر منتخب ہو جاتے ہیں اور کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ انگوٹھے چھاپ وزیر تعلیم بن جاتے ہیں۔ ہماری رائے میں قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے ممبر کے لیے یہ شرط ہونی چاہیے کہ وہ ایم۔اے عربی یا ایم۔اے اسلامیات ہو یا کسی مسلم اور وقیع دینی دار العلوم کا فارغ التحصیل ہو۔

اور چونکہ اسلام میں ازخود منصب کا طلب کرنا جائز نہیں ہے، اس کی اصلاح کے لیے یہ طریقہ مقرر کیا جائے کہ کوئی امیدوار ازخود کسی نشست کے لیے کھڑا نہ ہو بلکہ وہ جس سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے وہ جماعت اس کو نامزد کرے اور وہ جماعت ہی اس کے الیکشن کی کمپین چلائے اور اس کی کنویسنگ کرے اور یہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے اخراجات اس امیدوار سے وصول کر لیے جائیں، بہر حال ہمیں اپنے طریق انتخاب کو اسلامی حدود میں رکھنے کے لیے اس کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کرنا چاہیے۔

کافر یا فاسق فاجر کی طرف سے عہدہ یا منصب قبول کرنے کی تحقیق

اس آیت سے بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ کسی مسلمان عالم فاضل شخص کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کسی فاسق فاجر یا کسی کافر حکمران کے ماتحت کام کرے یا کسی منصب کی ذمہ داریاں بجالائے البتہ اس میں یہ شرط ہے کہ اس کو یہ معلوم ہو کہ اس کے فرائض اور اس کی ذمہ داریوں میں کوئی ایسا کام شامل نہ ہو جو اس کے دین یا شریعت کے کسی حکم کے منافی ہو، لیکن جب اس کے فرائض کی باگ ڈور کافر یا فاسق کے ہاتھ میں ہو اور اس کے لیے لازم ہو کہ وہ ان کی خواہشات پر عمل کرے تو پھر اس کے لیے یہ عہدہ قبول کرنا جائز نہیں ہے، بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ صرف حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے جائز تھا اور ان کی خصوصیت تھی اور آج کل کے دور میں یہ جائز نہیں ہے، لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے، صحیح یہ ہے کہ کافر یا فاسق کی ملازمت کرنا جائز ہے، جب کہ ان کو یہ معلوم ہو کہ ان کو اپنے دین اور اپنی شریعت کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا پڑے گا۔

علامہ ماوردی شافعی متوفی ۴۵۰ھ نے کہا ہے کہ اگر منصب پر فائز کرنے والا ظالم ہو تو اس کی طرف سے منصب کو قبول کرنے کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) اس کو جس منصب پر فائز کیا گیا ہے، وہ اس منصب کو قبول کرے اور اس منصب کے تقاضوں کے مطابق حق اور انصاف پر مبنی امور انجام دے، کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کے فرعون (مصر کا کافر بادشاہ الولید بن الریان) کی طرف سے منصب سونپا گیا اور انہوں نے اس کو قبول فرمایا اور اعتبار منصب قبول کرنے والے کے افعال کا ہوتا ہے نہ کہ منصب دینے والے کے افعال کا۔

(۲) کافر یا فاسق کی طرف سے منصب قبول کرنا جائز نہیں ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام نے فرعون کا جو منصب قبول کیا تھا اس کے دو جواب ہیں: پہلا جواب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون نیک اور عادل شخص تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا فرعون باغی اور سرکش تھا' لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے فرعون سے عہدہ قبول کرنا محل اعتراض نہیں ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی نظر اپنے دائرہ کار میں تھی' انہوں نے اس طرف نظر نہیں کی کہ اس کو اس کام کی ذمہ داری کون سونپ رہا ہے۔ علامہ ماوردی نے کہا: زیادہ صحیح یہ ہے کہ کافر کی طرف سے منصب قبول کرنے کو مطلقاً جائز کہا جائے نہ مطلقاً ناجائز کہا جائے بلکہ اس کی تین قسمیں بیان کی جائیں:

(۱) جن فرائض کی انجام دہی میں کسی شخص کے اجتہاد کا دخل نہیں ہے اور شریعت نے ان فرائض کی تعیین کی تصریح کر دی ہے مثلاً زکوٰۃ اور صدقات کی وصول یابی کہ اموال ظاہرہ میں ہر چیز کا نصاب مقرر ہے کہ جب مال تجارت دو سو درہم (چھ سو بارہ اعشاریہ تین چھ گرام چاندی) کی مقدار یا اس سے زائد ہو تو اس میں سے اڑھائی فی صد زکوٰۃ وصول کی جائے گی' یا چالیس سے ایک سو انیس جنگل کی گھاس چرنے والی بکریوں پر ایک بکری وصول کی جائے گی اور زرعی پیداوار سے اگر بارانی زمین ہو تو عشر وصول کیا جائے گا یعنی پیداوار کا دسواں حصہ' ورنہ نصف عشر وصول کیا جائے گا یعنی پیداوار کا بیسواں حصہ' سو ان فرائض کی انجام دہی کسی عامل کے اجتہاد پر موقوف نہیں ہے اس لیے کسی ظالم اور فاسق فاجر حکمران سے اس قسم کا عہدہ قبول کرنا جائز ہے۔

(۲) جن فرائض کی انجام دہی میں اجتہاد کرنا پڑتا ہے جیسے اموال فے کے مصرف' ان میں ظالم کی طرف سے عہدہ قبول کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ اس میں ناحق تصرف کرنے کے لیے کہے گا اور اموال فے غیر مستحق کو دینے کے لیے کہے گا۔

(۳) جو شخص اہل ہو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ ظالم کی طرف سے عہدہ قبول کرلے' مثلاً ظالم کی طرف سے کسی کو قاضی بنایا جائے اور وہ یہ سمجھے کہ وہ مقدمات کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہو گا تو اس کے لیے یہ عہدہ قبول کرنا جائز ہے۔

(النکت والعیون ج ۳' ص ۵۱-۵۰' الجامع لاحکام القرآن جز ۹' ص ۱۸۸-۱۸۷' مطبوعہ دار الفکر بیروت)

حضرت یوسف علیہ السلام کے حفیظ اور علیم ہونے کے محامل

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: میں بہت حفاظت کرنے والا' بہت علم والا ہوں' حضرت یوسف کے اس قول کے چار محمل ہیں:

(۱) ابن زید نے کہا: میرے پاس جو چیز امانت رکھی جائے' میں اس کی بہت حفاظت کرنے والا ہوں اور مجھ کو جو عہدہ دیا جائے میں اس کو بہت جاننے والا ہوں۔

(۲) ابن سراقہ نے کہا: میں لکھائی کی بہت حفاظت کرنے والا ہوں اور حساب کو بہت جاننے والا ہوں' کیونکہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے کاغذ پر لکھا۔

(۳) اشجع نے سفیان سے روایت کیا کہ وہ حساب کی بہت حفاظت کرنے والے تھے اور زبانوں کو بہت جاننے والے تھے۔

(۴) قتادہ نے کہا: تم نے جو منصب دیا ہے میں اس کی حفاظت کرنے والا ہوں۔ شیبہ الضبی نے کہا میں ایام قحط کی بھوک کو بہت جاننے والا ہوں۔

اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو علم و فضل دیا ہو' اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اس علم و فضل کے ساتھ اپنے آپ کو موصوف کرے البتہ عام حالات میں اپنی صفات اور خوبیوں کا اظہار نہ کرنا اولیٰ ہے' حضرت یوسف علیہ

السلام نے بوقت ضرورت اپنی ان صفات کا اظہار کیا تھا۔ (النکت والعیون ج ۳، ص ۵۲-۵۱، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

خود ستائی کے ممنوع ہونے کے محامل اور حضرت یوسف کی اپنی تعریف کا جواز

حضرت یوسف علیہ السلام نے اس قول میں اپنی تعریف کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف کرنے سے منع فرمایا ہے:

فَلَا تُزَكُّوٓا اَنۡفُسَكُمۡ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى۔ (النجم: ۳۲)
سو تم اپنی تعریفیں نہ کرو، پرہیزگاروں کو وہ خوب جانتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فخر اور تکبر کی وجہ سے اپنی تعریف کرنا منع ہے، یا کسی ناجائز مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی تعریف کرنا منع ہے یا جو اوصاف انسان میں نہ ہوں، ان اوصاف کے ساتھ اپنی تعریف کرنا منع ہے، لیکن کسی ضرورت کی بناء پر ان اوصاف کے ساتھ اپنی تعریف کرنا جائز ہے جو اوصاف انسان میں موجود ہوں اور بعض دفعہ یہ تعریف کرنا ضروری ہوتی ہے اور حضرت یوسف کے معاملہ میں ایسا ہی تھا۔ اس تعریف کے ضروری ہونے کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(۱) حضرت یوسف کو وحی کے ذریعہ علم تھا کہ چند سالوں کے بعد قحط پڑنے والا ہے سو اگر غلہ کی فراوانی کے سالوں میں حسن تدبیر اور دیانت داری سے غلہ کا ذخیرہ نہ کیا گیا تو لوگ بھوک سے مرجائیں گے اور آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ آپ کے علاوہ اس ملک میں اور کوئی شخص نہیں ہے جو دیانت دار بھی ہو اور حسن تدبیر کا مالک بھی ہو، اس لیے مصر کے لوگوں کو ہلاکت سے بچانے کے لیے ضروری تھا کہ اس ملک کے خزانوں پر آپ کو مقرر کیا جاتا اور اس ملک کے خزانوں پر آپ کا مقرر کیا جانا اس پر موقوف تھا کہ بادشاہ کو آپ کی صفات سے روشناس کرایا جاتا اور واجب کا مقدمہ واجب ہوتا ہے اس لیے آپ پر واجب تھا کہ آپ بادشاہ کو اپنی قابلیت اور صلاحیت سے روشناس کراتے اس لیے آپ نے فرمایا: مجھے اس ملک کے خزانوں پر مقرر کردیں، میں بہت زیادہ حفاظت کرنے والا، بہت زیادہ علم والا ہوں۔

(۲) آپ اللہ عزوجل کی طرف سے مخلوق کی طرف رسول بنا کر مبعوث کیے گئے تھے اور رسول پر اپنی امت کی مصلحتوں کی رعایت بقدر امکان کرنا واجب ہے اور یہاں یہ رعایت اسی صورت میں ہوسکتی تھی کہ بادشاہ آپ کو یہ منصب سونپ دیتا اور بادشاہ اس وقت آپ کو یہ منصب سپرد کرتا جب وہ آپ کی اہلیت سے واقف ہوتا اور وہ اس وقت واقف ہوتا جب آپ بتاتے۔

(۳) مستحقین تک نفع پہنچانے کی کوشش کرنا اور ان سے ضرر کو دور کرنا جب انسان کے اختیار میں ہو تو پھر اس پر ایسا کرنا واجب ہوتا ہے۔

ان وجوہ کی بناء پر حضرت یوسف علیہ السلام پر واجب تھا کہ وہ اپنی ان صفات کا اظہار فرماتے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنی مدح فرمانا تواضع اور انکسار کے خلاف نہیں ہے

علامہ عبد الرحمن بن علی الجوزی حنبلی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی مدح کیسے فرمائی حالانکہ انبیاء علیہم السلام اور صالحین کا طریقہ تواضع و انکسار ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جب اپنی مدح فخر اور تکبر سے خالی ہو اور اس سے مراد اس حق تک پہنچنا ہو جس کو اس نے قائم کرنا ہو اور عدل کو زندہ کرنا ہو اور ظلم کو مٹانا ہو تو پھر اپنی مدح کرنا جائز اور مستحسن ہے، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب لوگوں کو اٹھایا جائے گا تو میں سب سے پہلے قبر سے نکلوں گا اور جب لوگ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے تو میں کلام کروں گا اور جب لوگ مایوس ہوجائیں گے تو میں ان کو خوشخبری سناؤں گا، حمد کا جھنڈا اس دن میرے ہاتھ میں ہوگا اور آدم کی اولاد میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا میں ہوں گا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۶۱۰، سنن دارمی رقم

الحدیث: ۴۹، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۵، ص ۳۸۴، شرح السنہ رقم الحدیث: ۳۶۲۴) اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: میں ہر آیت کے متعلق جانتا ہوں کہ وہ رات میں نازل ہوئی ہے یا دن میں، اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ کوئی ایک شخص بھی مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا علم رکھتا ہے اور اس تک پہنچنے کے لیے اونٹ پر بیٹھ کر سفر کرنا پڑتا ہے تو میں اس تک پہنچتا، پس ان نفوس قدسیہ نے اپنی مدح میں جو کلمات طیبات فرمائے وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے قائم مقام ہیں اور قاضی ابویعلیٰ نے کہا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں یہ دلیل ہے کہ اگر کسی صاحب فضیلت شخص کو لوگ جانتے نہ ہوں تو انہیں اپنا تعارف کرانے کے لیے اپنے فضائل کو بیان کرنا جائز ہے۔

(زاد المسیر ج ۴، ص ۲۴۵۔۲۴۴، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اس طرح ہم نے یوسف کو اس ملک میں اقتدار عطا کیا، وہ اس ملک میں جہاں رہنا چاہتے تھے رہتے تھے، ہم جس کو چاہتے ہیں اپنی رحمت پہنچاتے ہیں اور ہم نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے ○ اور جو لوگ ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے، ان کے لیے آخرت کا اجر بہت بہتر ہے ○ (یوسف: ۵۷-۵۶)

ایام قحط میں حضرت یوسف کا حسن انتظام

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے یہ طلب کیا کہ وہ ان کو اس ملک کے خزانوں پر مقرر کردے تو اللہ تعالیٰ نے بادشاہ کا یہ قول نقل نہیں کیا کہ میں نے ایسا کردیا بلکہ اللہ سبحانہ نے یہ فرمایا: اور اس طرح ہم نے یوسف کو اس ملک میں اقتدار عطا کیا، اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے کہ بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کا مطالبہ پورا کردیا تھا۔ امام رازی نے یہاں پر یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ بادشاہ اسی وقت حضرت یوسف کا مطالبہ پورا کرسکتا تھا جب اللہ تعالیٰ بادشاہ کے دل میں اس بات کا داعیہ اور باعث اور محرک پیدا کرتا، نیز بادشاہ اس کام کا ظاہری سبب تھا اور اللہ تعالیٰ موثر حقیقی ہے تو اللہ تعالیٰ نے ظاہری سبب ذکر کرنے کے بجائے موثر حقیقی کا ذکر فرمایا۔

علامہ عبدالرحمن بن علی الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر والوں کے مال، ان کے زیورات، ان کے مویشی، ان کی زمینوں اور ان کے غلاموں کے عوض ان کے ہاتھ غلہ فروخت کیا، پھر ان کی اولاد اور پھر ان کی جانوں کے عوض ان کے ہاتھ ان کو غلہ فروخت کیا، حتیٰ کہ تمام مصر والے حضرت یوسف کے غلام بن گئے، پھر حضرت یوسف نے بادشاہ سے کہا تم نے دیکھا اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کیسا کرم کیا! بادشاہ نے کہا: ہم بھی تمہارے تابع ہیں، پھر حضرت یوسف نے فرمایا: میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اہل مصر کو آزاد کردیا اور میں نے ان کی املاک ان کو لوٹا دیں، حضرت یوسف علیہ السلام ان ایام میں کبھی سیر ہو کر نہیں کھاتے تھے اور فرماتے تھے: میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ میں کسی بھوکے کو بھول جاؤں۔

(زاد المسیر ج ۴، ص ۲۴۶۔۲۴۵، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

امام ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ لکھتے ہیں:

جب حضرت یوسف علیہ السلام مطمئن ہو کر ملک کا انتظام چلانے لگے اور انہوں نے بڑے بڑے گودام بنوا کر ان میں غلہ جمع کرلیا، حتیٰ کہ غلہ کی فراوانی کے سات سال گزر گئے اور قحط کے ایام شروع ہوگئے اور وہ ایسا زبردست قحط تھا کہ لوگوں نے اس سے پہلے ایسا قحط نہیں دیکھا تھا، حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ اور اس کے متعلقین کو ہر روز دوپہر کے وقت کھانا بھجواتے تھے، ایک دن آدھی رات کو بادشاہ نے آواز دی: اے یوسف! بھوک لگ رہی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا اب

قحط کا وقت آپہنچا ہے۔ پس قحط کے پہلے سال میں لوگوں نے اپنے پاس جو طعام اور غلہ جمع کر کے رکھا تھا' وہ سب ختم ہو گیا' پھر مصر کے لوگ حضرت یوسف علیہ السلام سے طعام خریدنے لگے' پہلے سال حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے نقد مال لے کر غلہ فروخت کیا حتیٰ کہ مصر میں کسی شخص کے پاس کوئی درہم اور دینار باقی نہیں رہا' اور تمام نقد مال حضرت یوسف کے قبضہ میں آچکا تھا' دوسرے سال اہل مصر نے اپنے تمام زیورات اور جواہر کے بدلہ میں حضرت یوسف سے غلہ خریدا' تیسرے سال انہوں نے اپنے تمام مویشیوں اور جانوروں کے بدلہ میں غلہ خریدا' چوتھے سال انہوں نے اپنے تمام غلاموں اور باندیوں کے بدلہ میں غلہ خریدا' حتیٰ کہ ان کے پاس کوئی باندی اور غلام نہیں رہا' پانچویں سال انہوں نے اپنی زمینوں' کھیتوں اور گھروں کے بدلہ میں غلہ خریدا اور چھٹے سال انہوں نے اپنی اولاد کے بدلہ میں غلہ خریدا حتیٰ کہ انہوں نے اپنی تمام اولاد کو حضرت یوسف علیہ السلام کا غلام بنادیا اور ساتویں سال انہوں نے اپنی جانوں اور اپنی گردنوں کے بدلہ میں غلہ خریدا حتیٰ کہ مصر میں کوئی انسان باقی نہیں رہا مگر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کا غلام تھا اور کوئی چیز باقی نہیں بچی' مگر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی ملکیت میں آ چکی تھی' اور لوگ کہنے لگے کہ ہمارے علم میں حضرت یوسف سے پہلے کوئی بڑا اور جلیل بادشاہ نہیں تھا' پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے کہا: آپ نے دیکھا اللہ تعالیٰ نے مجھے کیا کچھ عطا فرمایا ہے! اب آپ کی کیا رائے ہے؟ بادشاہ نے کہا: میری وہی رائے ہے جو آپ کی رائے ہے' تمام معاملات آپ کے سپرد ہیں' میں تو محض آپ کے تابع ہوں۔ حضرت یوسف نے فرمایا: میں آپ کو اور اللہ تعالیٰ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے تمام اہل مصر کو آزاد کر دیا' اور ان کی تمام املاک ان کو واپس کر دیں۔

روایت ہے کہ حضرت یوسف ان ایام میں سیر ہو کر کھانا نہیں کھاتے تھے' ان سے کہا گیا کہ آپ مصر کے تمام خزانوں کے مالک ہیں اس کے باوجود آپ بھوکے رہتے ہیں! آپ نے فرمایا: مجھے یہ خدشہ ہے کہ اگر میں نے سیر ہو کر کھا لیا تو میں بھوکوں کا حق بھول جاؤں گا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے باورچی کو حکم دیا کہ وہ بادشاہ کا صبح کا کھانا اسے دوپہر کو دیا کرے اور اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کا منشاء یہ تھا کہ بادشاہ بھی بھوک کا مزہ چکھے اور بھوکوں کو یاد رکھے۔

(معالم التنزیل ج ۲' ص ۳۶۴' الجامع لاحکام القرآن جز ۹' ص ۱۹۱-۱۹۰' روح المعانی جز ۱۳' ص ۹-۸)

عزیز مصر کی بیوی سے حضرت یوسف کا نکاح

امام ابو محمد الحسین بن مسعود البغوی المتوفی ۵۱۶ھ اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ میرے بھائی حضرت یوسف پر رحم فرمائے اگر وہ یہ نہ کہتے کہ مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دو تو بادشاہ ان کو اسی وقت مقرر کر دیتا' لیکن اس کہنے کی وجہ سے بادشاہ نے اس کام کو ایک سال مؤخر کر دیا' اور وہ ایک سال بادشاہ کے ساتھ اس کے گھر میں رہے' اور اسی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ایک سال گزرنے کے بعد بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلایا' ان کے سر پر تاج رکھا' ان کی میان میں تلوار لٹکائی اور ان کے لیے سونے کا تخت رکھا جس پر یاقوت اور موتیوں سے کام کیا ہوا تھا' اور ان کو ریشمی حلے پہنائے (ایک قسم کے کپڑے کی دو چادروں کو حلہ کہتے ہیں' ایک چادر تہمند کے طور پر باندھی اور دوسری چادر اوپر اوڑھی جائے) پھر بادشاہ نے کہا: آپ تاج پہن کر تخت پر رونق افروز ہوں۔ حضرت یوسف علیہ السلام تخت پر بیٹھ گئے اور دربار کے تمام سردار حضرت یوسف علیہ السلام کے اطاعت گزار ہو گئے' بادشاہ گھر جا کر بیٹھ گیا اور مصر کے تمام معاملات حضرت یوسف علیہ السلام کے سپرد کر دیئے اور مصر کے سابق وزیر قطفیر (عزیز مصر) کو اس نے اس کے عہدے سے معزول کر دیا' اور اس کے عہدہ پر حضرت یوسف علیہ السلام کو مقرر کر دیا۔ امام ابن اسحاق نے بیان کیا کہ ابن زید نے کہا مصر کے بادشاہ کے بہت کثیر خزانے تھے' اس نے وہ تمام خزانے

حضرت یوسف علیہ السلام کے سپرد کر دیئے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے فرامین اور آپ کے تمام فیصلوں کو پورے ملک میں نافذ العمل قرار دیا، پھر انہی ایام میں قطفیر (عزیز مصر) مرگیا، پھر بادشاہ نے قطفیر کی بیوی راعیل (یا زلیخا) کا حضرت یوسف علیہ السلام سے نکاح کر دیا، جب حضرت یوسف علیہ السلام اس کے پاس خلوت میں گئے تو آپ نے اس سے فرمایا: کیا یہ اس سے بہتر نہیں جس کا تم مجھ سے پہلے ارادہ کرتی تھیں۔ اس نے کہا: اے بہت سچے انسان! مجھے ملامت نہ کرو میں ایک حسین جوان عورت تھی، اور میرا شوہر عورت کی خواہش پوری کرنے پر قادر نہ تھا اور تم غیر معمولی حسن اور جمال کے مالک تھے، پس مجھ پر میرا نفس غالب آگیا اور تم پر میری شہوت قوی ہوگئی اور تمہارے ساتھ جو میری محبت تھی وہ میری عقل کو کنٹرول نہ کر سکی، حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کو کنواری پایا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے اس سے دو بیٹے ہوئے: افراثیم بن یوسف اور میثا بن یوسف۔ حضرت یوسف نے مصر کے لوگوں میں عدل اور انصاف قائم کیا اور مصر کے تمام مرد اور عورتیں آپ سے محبت کرنے لگے۔ (معالم التنزیل ج ۲، ص ۳۶۴-۳۶۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ)

علامہ زمخشری متوفی ۵۳۸ھ، امام ابن جوزی متوفی ۵۹۳ھ، امام رازی المتوفی ۶۰۶ھ، علامہ قرطبی متوفی ۶۶۸ھ، علامہ ابوالحیان اندلسی المتوفی ۷۵۴ھ، حافظ ابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ، علامہ آلوسی المتوفی ۱۲۷۰ھ، امام ابن جریر المتوفی ۳۱۰ھ اور امام ابن ابی حاتم المتوفی ۳۲۷ھ نے بھی عزیز مصر کے مرنے کے بعد اس کی بیوی کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام کے نکاح کا ذکر کیا ہے۔

(الکشاف ج ۲، ص ۴۵۶، ۴۵۵، زاد المسیر ج ۴، ص ۲۴۴، تفسیر کبیر ج ۶، ص ۴۷۴، الجامع لاحکام القرآن، جز ۹، ص ۱۸۶، البحر المحیط، ج ۶، ص ۲۹۱، تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۵۳۴، روح المعانی جز ۱۳، ص ۷، جامع البیان جز ۱۳، ص ۹، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۷، ص ۲۱۶۱، رقم الحدیث: ۱۱۷۴۳)

علامہ ابوالحسین علی بن محمد ماوردی متوفی ۴۵۰ھ نے بھی امام ابن جریر طبری کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ زلیخا سے حضرت یوسف کا نکاح ہوگیا تھا، پھر لکھا ہے کہ جن مورخین نے یہ گمان کیا ہے کہ وہ عورت زلیخا تھی انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس سے نکاح نہیں کیا تھا اور جب زلیخا نے حضرت یوسف کو اقتدار کے زمانہ میں دیکھا تو اس نے کہا: اللہ کے لیے حمد ہے جس نے بادشاہوں کو معصیت کی وجہ سے غلام بنا دیا اور غلاموں کو اطاعت کی وجہ سے بادشاہ بنا دیا، تو حضرت یوسف نے اس کو اپنے گھر میں رکھ لیا اور اس کی کفالت کی حتیٰ کہ وہ مرگئی اور اس سے نکاح نہیں کیا۔

(النکت والعیون ج ۳، ص ۵۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

حافظ ابن کثیر نے زلیخا سے نکاح نہ کرنے کا تو نہیں لکھا لیکن نکاح کی روایت ذکر کے بعد لکھا ہے کہ فضیل بن عیاض نے کہا کہ ایک دن حضرت یوسف علیہ السلام کو راستہ میں عزیز مصر کی بیوی ملی اور اس نے یہ کہا: اللہ کی حمد ہے جس نے اطاعت کی وجہ سے غلاموں کو بادشاہ بنا دیا اور معصیت کی وجہ سے بادشاہوں کو غلام بنا دیا۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۲، ص ۵۳۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۹ھ)

علامہ قرطبی متوفی ۶۶۸ھ نے اس سلسلہ میں یہ روایت بھی ذکر کی ہے:

زلیخا بوڑھی ہو چکی تھی اور حضرت یوسف کے فراق میں رو رو کر نابینا ہو چکی تھی اور اپنے شوہر کے مرنے کے بعد بھیک مانگتی پھرتی تھی۔ حضرت یوسف نے اس سے نکاح کر لیا، حضرت یوسف نے نماز پڑھی اور اللہ سے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس کا شباب، اس کا حسن اور اس کی بینائی لوٹا دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا شباب، اس کا حسن اور اس کی بینائی لوٹا دی بلکہ وہ پہلے سے

بھی زیادہ حسین ہو گئی اور اس دعا کا قبول کرنا حضرت یوسف علیہ السلام کے اکرام کی وجہ سے تھا' کیونکہ وہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے دور رہے تھے' پھر حضرت یوسف نے اس کو اس حال میں پایا کہ وہ کنواری تھی۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۹' ص ۱۸۷' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ نے حکیم ترمذی کے حوالہ سے وہب بن منبہ کی نکاح کی روایت بیان کی ہے' اس کے بعد لکھا ہے کہ قصہ گو لوگوں کے درمیان یہ مشہور ہے کہ اس کا حسن اور شباب حضرت یوسف کی دعا اور ان کے اکرام کی وجہ سے لوٹ آیا تھا لیکن اس قصہ کی کوئی اصل نہیں ہے اور حضرت یوسف کی اس کے ساتھ شادی کی جو خبر ہے' وہ بھی محدثین کے نزدیک ثابت اور معتمد نہیں ہے۔ (روح المعانی جز ۱۳' ص ۷' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۷ھ)

حضرت یوسف علیہ السلام کی طہارت اور نزاہت پر دلائل

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور اس طرح ہم نے یوسف کو اس ملک میں اقتدار عطا کیا' وہ اس ملک میں جہاں رہنا چاہتے تھے رہتے تھے۔

یعنی جس طرح ہم نے یوسف پر یہ انعام کیا تھا کہ بادشاہ کے دل میں ان کی محبت ڈال دی تھی اور ان کو قید و بند کی مصیبت سے نجات عطا کی تھی' اسی طرح ہم نے ان پر یہ انعام کیا کہ ہم نے ان کو اس ملک میں اقتدار عطا فرمایا' وہ اس ملک میں بلا روک ٹوک جہاں جانا چاہتے تھے چلے جاتے تھے' اس سے معلوم ہوا کہ ہر نعمت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا: ہم نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شہادت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نزدیک نیکی کرنے والوں میں سے تھے' اس سے معلوم ہوا کہ جن روایات میں یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی بیوی کے ساتھ گناہ کے ابتدائی مراحل طے کر لیے تھے' صرف آخری مرحلہ رہ گیا تھا وہ قطعاً باطل ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو حضرت یوسف علیہ السلام محسنین میں سے نہ ہوتے' اس سے معلوم ہوا کہ یہ تمام روایات باطل اور کاذب ہیں۔

اس کے بعد فرمایا: اور جو لوگ ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے' ان کے لیے آخرت کا اجر بہت بہتر ہے۔

اس آیت کا محمل یہ ہے کہ ہرچند کہ حضرت یوسف علیہ السلام دنیا میں بلند مراتب اور عالی درجات پر واصل ہو چکے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آخرت میں جو اجر و ثواب تیار کر رکھا ہے وہ اس سے بہت اعلیٰ اور بہت افضل ہے۔

نیز اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت یوسف علیہ السلام مومنین اور متقین میں سے ہیں۔ اس آیت میں یہ تصریح ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام گزرے ہوئے زمانے میں بھی متقی تھے' اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا تھا: ولقد همت به وهم بها اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ اس عورت نے ان کے ساتھ گناہ کا ارادہ کیا اور انہوں نے بھی اس کے ساتھ گناہ کا ارادہ کیا' کیونکہ اگر یہ معنی ہوتا تو وہ اس زمانہ میں متقی نہ ہوتے اس لیے لازماً اس کا یہی معنی ہے کہ اس عورت نے ان کے ساتھ گناہ کا ارادہ کیا اور انہوں نے اس سے بچنے کا ارادہ کیا' سو یہ آیت بھی حضرت یوسف کی نزاہت اور طہارت پر دلیل ہے نیز اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق فرمایا: انه من عبادنا المخلصين۔ (یوسف: ۲۴) اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ وہ مخلص ہیں' محسن ہیں اور متقی ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوی شہادت ہے کہ کسی دور میں بھی حضرت یوسف علیہ السلام کا دامن کسی قسم کی بھی معصیت کی آلودگی میں ملوث نہیں رہا۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ

اور یوسف کے بھائی (غلہ خریدنے مصر) آئے تو ان کے پاس گئے، پس یوسف نے ان کو پہچان لیا اور وہ اس کو

مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ

نہ پہچان سکے ○ اور جب یوسف نے ان کا سامان تیار کر دیا تو کہا تم اپنے باپ شریک بھائی کو میرے پاس

اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۵۹﴾

لے کر آنا کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں پورا پورا ناپ کر دیتا ہوں اور میں بہترین مہمان نواز ہوں ○

فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ﴿۶۰﴾

پس اگر تم اس کو میرے پاس نہیں لائے تو میرے پاس تمہارے لیے بالکل غلہ نہیں ہوگا اور نہ ہی تم میرے قریب آسکو گے

قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ

انہوں نے کہا ہم اس کے متعلق اس کے باپ کو راضی کریں گے اور ہم یہ ضرور کرنے والے ہیں ○ یوسف نے اپنے کارندوں سے کہا ان کی

اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا

پیسوں کی تھیلی ان کے سامان میں رکھ دو تاکہ جب یہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹیں تو اس کو پہچان لیں

اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾ فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا

شاید وہ (پھر) واپس آجائیں ○ پس جب وہ اپنے باپ کی طرف لوٹے تو انہوں نے

يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا

کہا، اے ہمارے باپ! ہمیں (آئندہ) غلہ لینے سے منع کر دیا گیا ہے آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیجئے تاکہ ہم غلہ

لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى

لاسکیں، اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے ○ (ان کے باپ نے) کہا کیا اس کے متعلق میں تم پر اس طرح اعتبار کروں جس طرح میں اس سے پہلے

اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾

اس کے بھائی کے متعلق تم پر اعتبار کر چکا ہوں؟ پس اللہ ہی سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور وہی سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے ○

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا

اور جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو اس میں انہوں نے اپنے پیسوں کی تھیلی دیکھی جو ان کی طرف لوٹا دی گئی تھی، انہوں نے کہا

يٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا

اے ہمارے باپ! ہمیں اور کیا چاہیے! یہ ہماری رقم کی تھیلی ہمیں لوٹا دی گئی ہے، ہم اپنے گھر والوں کے لیے غلہ لائیں گے

وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿۶۵﴾ قَالَ

اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ پر لدا ہوا غلہ زیادہ لائیں گے اور (بادشاہ کے لیے) یہ تو معمولی مقدار ہے ○ (ان کے باپ

لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ

نے کہا میں اس کو تمہارے ساتھ ہرگز نہیں بھیجوں گا حتیٰ کہ تم اللہ کو گواہ کر کے مجھ سے یہ عہد نہ کرو کہ تم اس کو ضرور میرے پاس لے کر

بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا

آؤ گے، ماسوا اس کے کہ تم کسی مصیبت میں گھر جاؤ، جب انہوں نے اپنے باپ سے یہ عہد کر لیا تو اس نے کہا ہم جو عہد کر

نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۶۶﴾ وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ

رہے ہیں اس پر اللہ گواہ ہے ○ اور اس نے کہا اے میرے بیٹو! (شہر میں) تم سب ایک دروازہ سے نہ داخل ہونا،

وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ

اور الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا، اور میں تم کو اللہ کی تقدیر سے بالکل بچا نہیں سکتا

مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

حکم تو صرف اللہ کا چلتا ہے، میں نے اسی پر توکل کیا ہے، اور توکل کرنے والوں کو اسی

الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا

پر توکل کرنا چاہیے ○ اور جب وہ وہاں سے داخل ہوئے جہاں سے داخل ہونے کا ان کے باپ نے حکم دیا تھا، اور وہ

كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ

اللہ کی تقدیر سے بالکل بچا نہیں سکتا تھا مگر وہ یعقوب کے دل کی ایک خواہش تھی جو

يَعْقُوْبَ قَضٰهَا ؕ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ

اس نے پوری کر لی، بے شک وہ صاحب علم تھے کیونکہ ہم نے ان کو علم عطا کیا تھا لیکن اکثر

النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ ع

لوگ نہیں جانتے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یوسف کے بھائی (غلہ خریدنے مصر) آئے تو ان کے پاس گئے، پس یوسف نے ان کو پہچان لیا، اور وہ اس کو نہ پہچان سکے ○ اور جب یوسف نے ان کا سامان تیار کر دیا تو کہا تم اپنے باپ شریک بھائی کو میرے پاس لے کر آنا، کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں پورا پورا ناپ کر دیتا ہوں، اور میں بہترین مہمان نواز ہوں ○ پس اگر تم اس کو میرے پاس نہیں لائے تو میرے پاس تمہارے لیے بالکل غلہ نہیں ہوگا اور نہ ہی تم میرے قریب آسکو گے ○ انہوں نے کہا ہم اس کے متعلق اس کے باپ کو راضی کریں گے اور ہم یہ ضرور کرنے والے ہیں ○ (یوسف: ۶۱-۵۸)

مشکل الفاظ کے معانی

وھم له منکرون: انکار معرفت کی ضد ہے، حضرت یوسف کے بھائیوں نے حضرت یوسف کو نہیں پہچانا کیونکہ انہوں نے حضرت یوسف کو بچپن میں دیکھا تھا اور اب بہت لمبا عرصہ گزر چکا تھا، انہوں نے خیال کیا کہ ان کی وفات ہو چکی ہوگی۔

ولما جھزھم بجھازھم ہر باب میں جس چیز کی ضرورت اور احتیاج ہو اس کو جہاز کہتے ہیں، جھاز المیت کا معنی ہے مردہ کی تکفین وغیرہ کا سامان کرنا، جھاز العروس کا معنی ہے دلہن کی ضرورت کی اشیاء اور جھاز السفر کا معنی ہے سفر کی ضرورت کی چیزیں، یہاں مراد ہے ان کی ضروریات کی گندم ماپ کر ان کی بوریوں میں بھر کر ان کے اونٹوں پر لاد دیں۔

المنزلین مہمان نوازی کرنے والے، حضرت یوسف نے بہت اچھی طرح ان کی مہمان نوازی کی تھی۔

سنراود: مراودة کا معنی ہے کسی چیز پر مائل اور راغب کرنا، یعنی ہم کسی طرح کوشش کر کے اس کے باپ کو اس کے بھیجنے پر آمادہ کریں گے۔ (غرائب القرآن و رغائب الفرقان ج ۴، ص ۱۰۳-۱۰۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۶ھ)

حضرت یوسف کے بھائیوں کا غلہ لینے مصر پہنچنا اور حضرت یوسف کا انہیں پہچان لینا

جب تمام شہروں میں قحط پھیل گیا اور جس شہر میں حضرت یعقوب علیہ السلام رہتے تھے اس میں بھی قحط پہنچ گیا اور ان کے لیے روح اور بدن کا رشتہ برقرار رکھنا مشکل ہو گیا، اور ہر طرف یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ مصر کا بادشاہ غلہ فروخت کر رہا ہے، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ مصر میں ایک نیک بادشاہ ہے جو لوگوں کو گندم فروخت کر رہا ہے، تم اپنی رقم لے کر جاؤ اور ان سے غلہ خریدو، سو حضرت یعقوب کے دس بیٹے سوا بن یامین کے، حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے، اور یہ واقعہ حضرت یوسف علیہ السلام کی اپنے بھائیوں کے ساتھ ملاقات کا سبب بنا اور اللہ تعالیٰ نے کنوئیں میں جو حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف وحی کی تھی اس کی تصدیق کا سبب بنا، وہ وحی یہ تھی:

لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۔ (یوسف: ۱۵)

(ایک وقت ایسا آئے گا) کہ تم ضرور ان کو ان کی اس کارروائی سے آگاہ کرو گے اور اس وقت ان کو (تمہاری شان کا) پتا بھی نہ ہوگا۔

اور اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ حضرت یوسف نے ان کو پہچان لیا اور وہ ان کو بالکل نہ پہچان سکے، حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو اس لیے پہچان لیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی تھی کہ تم ضرور ان کو ان کی اس کارروائی سے آگاہ کرو گے، نیز حضرت یوسف علیہ السلام نے جو خواب دیکھا تھا اس میں بھی یہ دلیل تھی کہ ان کے بھائی ان تک پہنچیں گے، اس وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام اس واقعہ کے منتظر تھے اور جو لوگ بھی دور دراز سے غلہ لینے کے لیے مصر آتے تھے، حضرت یوسف علیہ السلام ان کے متعلق تفتیش کرتے تھے اور معلومات حاصل کرتے تھے کہ آیا یہ ان کے بھائی ہیں یا نہیں، رہا یہ کہ ان کے بھائیوں نے ان کو کیوں نہیں پہچانا تو اس کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

بھائیوں کا حضرت یوسف کو نہ پہچاننا اور اس کی وجوہ

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے دربانوں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ غلہ خریدنے کے لیے باہر سے آنے والوں کو ان سے فاصلہ پر رکھیں اور حضرت یوسف علیہ السلام ان سے بالواسطہ گفتگو کرتے تھے، اس طرح وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو نہیں پہچان سکے خصوصاً اس لیے کہ ان پر بادشاہ کا رعب طاری تھا اور جو ضرورت مند ہو وہ کچھ زیادہ ہی مرعوب اور خوف زدہ ہوتا ہے۔

(۲) جب انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈالا تھا اس وقت وہ کم سن اور بچے تھے، اور اب انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو ان کو ڈاڑھی آچکی تھی، اور ان کی شکل و صورت میں کافی تغیر ہو چکا تھا، انہوں نے دیکھا کہ وہ ریشم کا لباس پہنے ہوئے تخت پر بیٹھے ہوئے تھے، ان کے گلے میں سونے کا طوق تھا اور ان کے سر پر سونے کا تاج تھا، اور اتنا عرصہ گزرنے کی وجہ سے وہ لوگ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو بھول چکے تھے، جس وقت انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈالا تھا اس وقت سے لے کر اب تک چالیس سال گزر چکے تھے، ان اسباب میں سے ہر سبب ایسا ہے جس کی وجہ سے اتنے عرصہ پہلے کے شخص کو انسان بھول سکتا ہے، اور جب یہ تمام اسباب مجتمع ہوں تو اس کو نہ پہچاننا اور بھول جانا زیادہ متوقع ہے۔

(۳) کسی چیز کو پہچان لینا اور یاد رکھنا، اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں یہ معرفت پیدا نہ کی ہو تاکہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول محقق ہو! آپ ضرور ان کو ان کی اس کارروائی سے آگاہ کریں گے اور ان کو پتا بھی نہ ہو گا۔ (یوسف: ۱۵)

بن یامین کو بلوانے کی وجوہ

حضرت یوسف علیہ السلام نے جو اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ وہ آئندہ اپنے دوسرے بھائی کو لے کر آئیں اس کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(۱) غلہ فروخت کرنے میں حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ اصول تھا کہ وہ ہر شخص کو ایک بار شتر دیتے تھے یعنی صرف ایک اونٹ پر غلہ لاد کر دیتے تھے، اس سے زیادہ دیتے تھے نہ کم، اور حضرت یوسف کے پاس ان کے دس بھائی آئے تھے، تو آپ نے ان کو دس بار شتر دیئے۔ انہوں نے کہا: ہمارا ایک بوڑھا باپ بھی ہے اور ایک اور بھائی بھی ہے، انہوں نے بتایا کہ ان کا باپ اپنے بڑھاپے اور شدت غم کی بناء پر نہیں آسکا، اور ان کا ایک اور بھائی جو ہے وہ اپنے باپ کی خدمت میں رہنے کی وجہ سے نہیں آسکا اور ان دونوں کو بھی زندہ رہنے کے لیے طعام کی ضرورت ہو گی، اس لیے براہ کرم دو بار شتر غلہ اور مرحمت فرمائیں۔ حضرت یوسف نے فرمایا: باپ تو خیر بوڑھا اور معذور ہے لیکن اس بھائی کو تمہیں اگلی بار لانا ہو گا ورنہ تم کو غلہ بالکل نہیں ملے گا۔

(۲) جب وہ لوگ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آئے تو حضرت یوسف نے ان سے پوچھا: تم لوگ کون ہو؟ انہوں نے کہا: ہم لوگ شام کے رہنے والے ہیں اور بکریاں چراتے ہیں، ہم پر قحط آپڑا تو ہم غلہ خریدنے آئے ہیں۔ آپ نے پوچھا: تم لوگ جاسوسی کرنے تو نہیں آئے؟ انہوں نے کہا: معاذ اللہ! ہمارا باپ سچا نبی ہے اور ہم اس کے بیٹے ہیں، ان کا نام یعقوب ہے۔ حضرت یوسف نے پوچھا: تم کتنے بھائی ہو؟ انہوں نے کہا: ہم بارہ بھائی ہیں، ہم میں سے ایک فوت ہو گیا اور ایک باپ کے پاس ہے اس کو دیکھ کر اسے فوت شدہ بھائی کے غم سے تسکین ہوتی ہے اور ہم دس بھائی ہیں جو آپ کے پاس ہیں۔ حضرت یوسف نے کہا: تم ایک کو یہاں بطور ضمانت چھوڑ کر جاؤ، اور اگلی بار اس بھائی کو لے کر آنا، پھر انہوں نے قرعہ اندازی کر کے شمعون کو بطور رہن حضرت یوسف کے پاس چھوڑ دیا۔

(۳) جب انہوں نے اپنے باپ کا ذکر کیا تو حضرت یوسف نے پوچھا: تم اپنے باپ کو اکیلا کیسے چھوڑ آئے ہو؟ انہوں نے کہا: ہم اس کو اکیلا چھوڑ کر نہیں آئے بلکہ ہمارا ایک بھائی ان کے پاس ہے۔ حضرت یوسف نے پوچھا: تمہارے باپ نے خصوصیت کے ساتھ اس کو ہی کیوں اپنے ساتھ رکھا ہے؟ انہوں نے کہا: تمام اولاد میں وہ سب سے زیادہ اس سے محبت کرتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: تمہارا باپ عالم اور حکیم ہے وہ بلاوجہ اس سے اتنی محبت نہیں کر سکتا ضرور اس میں کوئی خصوصیت ہوگی، اس کو میرے پاس لے کر آؤ، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس میں کیا ایسی خاص بات ہے۔

حضرت یوسف نے بن یامین کو لانے کے لیے انہیں ترغیب بھی دی اور دھمکی بھی دی، ترغیب کے طور پر یہ فرمایا: کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ میں پورا پورا ناپ کر دیتا ہوں اور میں بہترین مہمان نواز ہوں اور مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ آپ نے فرمایا: اگر تم اپنے بھائی کو لے آئے تو میں تم کو بطور انعام غلہ سے لدا ہوا ایک اونٹ دوں گا، اور دھمکی یہ دی کہ اگر تم اس کو میرے پاس نہیں لائے تو میرے پاس تمہارے لیے بالکل غلہ نہیں ہوگا اور نہ ہی تم میرے قریب آسکو گے۔

حضرت یوسف نے بن یامین کو بلوا کر حضرت یعقوب کو مزید رنج میں کیوں مبتلا کیا؟

اس مقام پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو معلوم تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام بن یامین سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں اور اس کی جدائی میں ان کو بہت رنج اور قلق ہوگا تو انہوں نے بن یامین کو اپنے باپ کے پاس سے بلوانے کے لیے کیوں اقدام کیا اور اپنے باپ کو رنج اور قلق میں ڈالنے کا کیوں انتظام کیا! اس اعتراض کے حسب ذیل جوابات ہیں:

(۱) ہو سکتا ہے کہ حضرت یوسف کو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہو کہ وہ بن یامین کو بلوائیں اور انہوں نے اتباع وحی میں یہ اقدام کیا تاکہ حضرت یعقوب علیہ السلام مزید رنج اور غم میں مبتلا ہوں اور اس طرح ان کا ثواب اور زیادہ ہو۔

(۲) ہو سکتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ ارادہ ہو کہ اس کارروائی سے حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کے زندہ ہونے پر متنبہ ہو جائیں، کیونکہ خصوصیت سے بن یامین کو بلوانے والے حضرت یوسف ہی ہو سکتے تھے، وہ دونوں سگے بھائی تھے۔

(۳) حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ ارادہ ہو کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو اچانک دونوں بیٹے ملیں گے تو ان کو بہت زیادہ خوشی ہوگی۔

(۴) حضرت یوسف نے بن یامین کو صرف ملاقات کے لیے بلایا تھا، اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس کو مستقل اپنے ساتھ رکھ لیں گے اور جانے نہیں دیں گے، لیکن جب بنیامین کی حضرت یوسف سے ملاقات ہوئی اور دونوں نے اپنا اپنا حال سنایا تو بن

یامین نے واپس جانے سے انکار کر دیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس رہنے پر اصرار کیا، تب حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: تم کو روکنے کی یہی صورت ہے کہ تم پر چوری کا الزام لگوا دیا جائے۔ بن یامین نے کہا: مجھے منظور ہے۔

(زاد المسیر ج ۴، ص ۲۴۹-۲۴۶، تفسیر کبیر ج ۶، ص ۴۷۸-۴۷۷، الجامع لاحکام القرآن جز ۹، ص ۱۹۳-۱۹۲)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یوسف نے اپنے کارندوں سے کہا ان کے پیسوں کی تھیلی ان کے سامان میں رکھ دو تاکہ جب یہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹیں تو اس کو پہچان لیں، شاید وہ (پھر) واپس آجائیں ○ پس جب وہ اپنے باپ کی طرف لوٹے تو انہوں نے کہا: اے ہمارے باپ! ہمیں (آئندہ) غلہ لینے سے منع کر دیا گیا ہے، آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیجئے تاکہ ہم غلہ لا سکیں، اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے ○ (ان کے باپ نے) کہا کیا اس کے متعلق میں تم پر اس طرح اعتبار کروں جس طرح میں اس سے پہلے اس کے بھائی کے متعلق تم پر اعتبار کر چکا ہوں؟ پس اللہ ہی سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے، اور وہی سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے ○ (یوسف: ۶۴-۶۲)

مشکل الفاظ کے معنی

وقال لفتیانہ: فتیان جمع قلت ہے یہ فتی کی جمع ہے، فتی کے معنی نوکر اور خادم ہیں، اس سے مراد غلہ کو ماپ کر بوریوں میں بھرنے والے ہیں، جمع کثرت کی وجہ یہ ہے کہ غلہ خریدنے کے لیے بکثرت لوگ آتے تھے اس لیے اس کی پیمائش کرنے والے بھی زیادہ ہونے چاہئیں تھے۔

بضاعتھم: اس سے مراد غلہ کی قیمت ہے، یہ چاندی کے درہم تھے، رحال سے مراد ان کے غلہ کی بوریاں ہیں۔

منع منا الکیل: کیل کے معنی پیمائش ہے اور یہاں اس سے مراد مکیل ہے یعنی ہم کو غلہ لینے سے منع کر دیا گیا ہے۔

نکتل: یعنی جب مانع اٹھ جائے گا اور ہم بھائی کو لے جائیں گے تو ہم اپنی ضرورت کے مطابق غلہ لے آئیں گے۔

(غرائب القرآن و رغائب الفرقان ج ۴، ص ۱۰۴-۱۰۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۶ھ)

بھائیوں کی بوریوں میں رقم کی تھیلی رکھنے کی وجوہ

امام ابن اسحاق نے کہا: حضرت یوسف نے اپنے کارندوں سے کہا کہ انہوں نے غلہ کی جو قیمت دی ہے وہ ان کی بوریوں میں رکھ دو اور اس طرح رکھو کہ ان کو بالکل پتا نہیں چلے، تاکہ جب یہ گھر لوٹیں تو اس رقم کو دیکھ کر دوبارہ آجائیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے کس حکمت کی وجہ سے وہ تھیلی ان کی بوریوں میں رکھوائی تھی، اس کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(۱) جب وہ گھر جا کر بوریاں کھولیں گے اور ان کو اپنی قیمت واپس مل جائے گی تو وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کرم اور آپ کی سخاوت سے متاثر ہوں گے اور دوبارہ جانے کے لیے راغب ہوں گے جب کہ انہیں غلہ کی طلب بھی تھی۔

(۲) حضرت یوسف کو یہ خطرہ تھا کہ شاید ان کے باپ کے پاس مزید غلہ خریدنے کے لیے رقم نہ ہو اس لیے انہوں نے وہ قیمت بوریوں میں رکھ دی۔

(۳) حضرت یوسف نے یہ ارادہ کیا کہ وہ قحط کا زمانہ ہے، ہو سکتا ہے ان کے باپ کا ہاتھ تنگ ہو تو وہ اس طرح باپ کی کچھ خدمت کر دیں۔

(۴) ایام قحط میں جب کہ ان کے بھائیوں اور باپ کو غلہ کی سخت ضرورت تھی تو ایسے حالات میں انہوں نے ان کو قیمتاً غلہ دینا صلہ رحم کے خلاف اور برا جانا، اس لیے چپکے سے وہ رقم واپس کر دی۔

(۵) حضرت یوسف کا گمان تھا کہ جب ان کے بھائی سامان میں رقم کی تھیلی دیکھیں گے تو یہ خیال کریں گے کہ شاید سہو اور نسیان سے ان کی یہ رقم ہماری بوریوں میں آ گئی ہے اور وہ انبیاء کی اولاد ہیں، وہ ضرور اس رقم کو واپس کرنے آئیں گے یا یہ معلوم کرنے آئیں گے کہ آخر کس سبب سے ہماری بوریوں میں یہ رقم کی تھیلی آ گئی۔

(۶) حضرت یوسف نے اس طریقہ سے ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہا اور ایسے طریقہ سے کہ ان پر حضرت یوسف کا احسان ظاہر ہو اور نہ ان کو عار محسوس ہو۔

(۷) حضرت یوسف یہ چاہتے تھے کہ وہ یہ جان لیں کہ میں جو ان کے بھائی کو بلوا رہا ہوں تو اس پر ظلم کرنے کے لیے نہیں بلا رہا اور نہ غلہ کے دام چڑھانے کے لیے بلا رہا ہوں۔

(۸) حضرت یوسف یہ چاہتے تھے کہ ان کے والد کو یہ معلوم ہو جائے کہ حضرت یوسف ان کے بیٹوں پر کریم ہیں تاکہ وہ اپنے بیٹے کو ان کے پاس بھیجنے میں خطرہ محسوس نہ کریں۔

(۹) چونکہ یہ تنگی کا زمانہ تھا اس لیے حضرت یوسف یہ چاہتے تھے کہ ان کی کچھ مدد ہو جائے اور چونکہ چوروں اور ڈاکوؤں کا خطرہ تھا اس لیے اس رقم کو بوریوں میں چھپا کر رکھ دیا۔

(۱۰) حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے ساتھ انتہائی ظالمانہ اور بے رحمانہ سلوک کیا تھا، جواب میں حضرت یوسف یہ چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ انتہائی کریمانہ اور فیاضانہ سلوک کریں۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے سب سے افضل عمل بتایئے! آپ نے فرمایا: اے عقبہ! جو شخص تم سے تعلق توڑے تم اس سے تعلق جوڑو، جو تم کو محروم کرے، اس کو عطا کرو اور جو تم پر ظلم کرے اس سے درگزر کرو۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۴۰۶، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۷۴۶۷، عالم الکتب، اتحاف السادۃ المتقین ج ۹، ص ۲۵)

امام ابن النجار نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص تم سے تعلق توڑے تو اس سے تعلق جوڑو اور جو تم سے برا سلوک کرے، تم اس سے اچھا سلوک کرو اور حق بات کہو، خواہ وہ تمہارے خلاف ہو۔ (کنز العمال رقم الحدیث: ۶۹۲۹)

بدی را بدی سہل باشد جزا
اگر مردی احسن الی من اسا
(سعدی شیرازی)

(بُرائی کا جواب بُرائی سے دینا بہت آسان ہے، مردانگی تو یہ ہے کہ بُرا سلوک کرنے والے سے اچھا سلوک کرو)

بُرائی کا جواب اچھائی سے دینے میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ

بے شک حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی بدسلوکی کے جواب میں نیک سلوک کیا لیکن ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں ایسی بکثرت مثالیں ہیں جب آپ نے لوگوں کی بدسلوکی کے مقابلہ میں ان کے ساتھ حسن سلوک کیا۔

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طبعاً بدزبانی کرتے تھے نہ تکلفاً نہ بازار میں

شور کرتے تھے اور نہ برائی کا جواب برائی سے دیتے تھے، لیکن آپ معاف کر دیتے تھے اور درگزر فرماتے تھے۔

(شمائل ترمذی رقم الحدیث: ۳۴۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۰۱۶، مسند احمد ج ۶، ص ۱۷۴، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸، ص ۳۳۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۴۰۹، موارد الظمان رقم الحدیث: ۲۱۳۱، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۷ ص ۴۵)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کسی شخص سے اس کی زیادتی کا بدلہ نہیں لیتے تھے، جب تک اللہ تعالیٰ کی حدود کو نہ توڑا جائے اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی حدود کو توڑتا تو آپ سب سے زیادہ غضب ناک ہوتے تھے، اور آپ کو کبھی دو چیزوں میں سے کسی چیز کا اختیار نہیں دیا گیا مگر آپ اس چیز کو اختیار فرماتے جو زیادہ آسان ہوتی بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔

(شمائل ترمذی رقم الحدیث: ۳۵۰، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۵۶۰، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۲۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۸۵، مسند احمد ج ۶ ص ۸۵، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۱۷۹۴۲، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۴۳۷۵، مسند حمیدی رقم الحدیث: ۲۵۸، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۴۱۰)

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم حلم یہ ہے کہ جنگ احد میں کافر آپ کے خلاف جنگ کرنے آئے تھے، انہوں نے آپ کا نچلا سامنے کا دانت شہید کر دیا، آپ کا نچلا ہونٹ زخمی کر دیا، آپ کا چہرہ خون سے رنگین ہو گیا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۰۷۵) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ گویا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ دیکھ رہا تھا، آپ انبیاء سابقین میں سے کسی نبی کا ذکر فرما رہے تھے، ان کا چہرہ ان کی قوم نے خون سے رنگین کر دیا۔ وہ اپنے چہرے سے خون پونچھ رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ اے اللہ! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۴۷۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۷۹۲، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۵۷۶) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ آپ مشرکین کے خلاف دعاء ضرر کیجئے، آپ نے فرمایا: مجھے لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا، مجھے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۵۹۹)

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جنگ خندق کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ مشرکین کے گھروں اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے، انہوں نے ہمیں عصر کی نماز پڑھنے سے (اپنے خلاف لڑائی میں) مشغول رکھا حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۹۳۱، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۶۲۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۰۹، سنن النسائی رقم الحدیث: ۴۷۲)

اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے خلاف دعاء ضرر فرمائی ہے اور حدیث سابق میں آپ نے دعاء ضرر سے منع فرمایا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی ذات کو جو اذیت پہنچائی جاتی، آپ اس کو معاف فرما دیتے اور دعاء ضرر نہیں فرماتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی عبادات میں جو خلل ڈالا جاتا، آپ اس کو معاف نہ کرتے اور خلل ڈالنے والوں کے خلاف دعاء ضرر فرماتے تھے۔

برائی کا جواب بھلائی سے دینے اور آپ کے خلق کریم پر یہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے۔

حضرت زید بن سعنہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ یہودی علماء میں سے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے قرض کا تقاضا کرنے کے لیے آیا، اس نے آپ کے دائیں کندھے سے چادر پکڑ کر کھینچی اور کہا: اے عبدالمطلب کی اولاد! تم لوگ بہت دیر سے قرض کی ادائیگی کرتے ہو اور میں تم لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

اس کو ڈانٹا، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اور اس شخص کو کسی اور چیز کی تلقین کی ضرورت ہے، تم مجھے اچھی طرح سے ادائیگی کی تلقین کرتے اور اس شخص کو احسن طریقہ سے تقاضا کرنے کی تلقین کرتے۔ اے عمر! جاؤ، اس کا قرض ادا کرو، ابھی اس کی مدت ختم ہونے میں تین دن باقی تھے، تم اس کو تیس صاع (تقریباً تین من) غلہ زیادہ دینا، کیونکہ تم نے اس پر سختی کی تھی۔ امام حاکم نے کہا: اس حدیث کی سند صحیح ہے لیکن امام بخاری اور امام مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔

(المستدرک ج ۲، ص ۳۲، سنن کبریٰ للبیہقی ج ٦، ص ۵٦، کنز العمال رقم الحدیث: ۱۵۰۵۰)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نجرانی سخت چادر اوڑھی ہوئی تھی، ایک دیہاتی نے اس چادر کو پکڑ کر زور سے کھینچا حتیٰ کہ میں نے دیکھا کہ اس کے زور سے کھینچنے کی وجہ سے آپ کے کندھے کے اوپر نشان پڑ گئے تھے، پھر اس نے کہا: آپ کو جو اللہ نے مال دیا ہے اس میں سے میرے لیے حکم کیجئے، آپ نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا پھر آپ ہنسے اور آپ نے اس کو دینے کا حکم دیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۱۴۹، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۰۵۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۵۵۳)

اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم عفو اور درگزر کا بیان ہے اور یہ کہ آپ کی جان پر جو اذیت ہوتی تھی، آپ اس کو برداشت کرتے تھے اور سخت طبیعت دیہاتیوں کو آپ حسن تدبر سے درگزر فرماتے تھے، حالانکہ وہ وحشی جانوروں کی طرح غیر مانوس اور بہت جلد متنفر ہونے والے تھے، آپ خلق عظیم کے حامل تھے اور اس آیت کے مصداق اتم تھے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ الْاٰيَةَ۔ (آل عمران: ۱۵۹)	پس آپ اللہ کی رحمت سے ان کے لیے نرم دل ہوئے اور اگر آپ بد مزاج اور سخت دل ہوتے تو وہ ضرور آپ کے پاس سے بھاگ جاتے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بن یامین کو بھیجنے کی وجوہ

ایک سوال یہ ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام یہ تجربہ کر چکے تھے کہ انہوں نے بھائیوں کے کہنے پر حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے ساتھ بھیج دیا تھا اور پھر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ساتھ لے کر نہیں آئے اور کہہ دیا کہ ان کو بھیڑیا کھا گیا اور بالآخر ان کا جھوٹ ثابت ہو گیا تو دوبارہ ان کے کہنے کی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام بن یامین کو بھیجنے پر کیسے تیار ہو گئے؟ اس کے حسب ذیل جوابات ہیں:

(۱) وہ بھائی اب کافی بڑے ہو چکے تھے اور نیکی اور تقویٰ کی طرف مائل ہو چکے تھے اور اب ان سے سابقہ کارروائی کی توقع نہیں تھی۔

(۲) حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ مشاہدہ کر لیا تھا کہ یہ لوگ بن یامین سے اس طرح حسد اور بغض نہیں رکھتے، جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام سے حسد اور بغض رکھتے تھے۔

(۳) ہرچند کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں پر پہلے اعتماد کرنے کا تجربہ تلخ تھا لیکن قحط کی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہو گئے۔

(۴) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف وحی کی ہو اور اس وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام تیار ہو گئے ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو اس میں انہوں نے اپنے پیسوں کی تھیلی دیکھی جو ان کی

طرف لوٹادی گئی تھی، انہوں نے کہا: اے ہمارے باپ ہمیں اور کیا چاہیے! یہ ہماری رقم کی تھیلی ہمیں لوٹادی گئی ہے، ہم اپنے گھر والوں کے لیے غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ پر لدا ہوا غلہ زیادہ لائیں گے، اور (بادشاہ کے لیے) یہ تو معمولی مقدار ہے○ (ان کے باپ نے) کہا میں اس کو تمہارے ساتھ ہرگز نہیں بھیجوں گا حتیٰ کہ تم اللہ کو گواہ کر کے مجھ سے یہ عہد نہ کرو کہ تم اس کو ضرور میرے پاس لے کر آؤ گے، ماسوا اس کے کہ تم کسی مصیبت میں گھر جاؤ، جب انہوں نے اپنے باپ سے یہ عہد کرلیا تو اس نے کہا ہم جو عہد کر رہے ہیں، اس پر اللہ گواہ ہے۔○ (یوسف: ۶۶-۶۵)

بن یامین کو ساتھ بھیجنے کے لیے باپ کو تیار کرنا

اس آیت میں مانبغی کے دو محمل ہیں: یہ ما نفی کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور استفہام کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔

اگر یہ ما نفی کے لیے ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے بادشاہ یعنی حضرت یوسف کے متعلق جو بتایا تھا کہ وہ بہت فیاض اور جواد ہے تو ہم اس تعریف اور توصیف سے جھوٹ بولنا نہیں چاہتے تھے۔ دیکھئے اس بادشاہ نے ہمیں رقم کی تھیلی بھی واپس کردی ہے، اور اس صورت میں دوسرا معنی یہ ہے کہ ہم آپ سے دوبارہ جانے کے لیے مزید رقم نہیں چاہتے کیونکہ بادشاہ نے ہماری پہلی رقم ہمیں واپس کردی ہے۔

اگر یہ ما استفہام کے لیے ہو تو اس صورت میں معنی یہ ہے کہ ہمیں اور کیا چاہیے، ہماری رقم بھی ہمیں واپس کردی گئی ہے۔

میرہ کا معنی ہے: طعام، اور نمیر اھلنا کا معنی ہے: ہم اپنے گھر والوں کے لیے طعام لے کر آئیں گے، اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ پر لدا ہوا غلہ زیادہ لائیں گے کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر آئے تو ان کو غلہ سے لدا ہوا ایک اونٹ، زیادہ دیا جائے گا۔

اس کے بعد انہوں نے کہا: یہ تو معمولی مقدار ہے، اس کے حسب ذیل محمل ہیں:

(۱) مقاتل نے کہا: اتنے فیاض اور جواد کے لیے ایک بار شتر دینا تو بہت معمولی بات ہے، زجاج کا بھی یہی مختار ہے۔

(۲) جتنی طویل مدت ہم نے ایام قحط میں گزاری ہے، اس کے مقابلہ میں یہ بہت کم مقدار ہے۔

(۳) ہمارے بھائی کے بغیر جو ہمیں غلہ دیا گیا ہے یہ بہت کم ہے، آپ بھائی کو ہمارے ساتھ بھیجیں تاکہ ہم کو زیادہ غلہ مل سکے۔

مصیبت میں گھر جانے کا معنی

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا تھا: تم یہ پختہ عہد کرو، اس کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ تم اللہ کو گواہ کر کے یہ عہد کرو اور دوسرا معنی یہ ہے کہ تم اللہ کی قسم کھاؤ۔

مصیبت میں گھرنے کے بھی دو معنی ہیں: ایک یہ کہ تم سب ہلاک ہو جاؤ اور دوسرا یہ کہ تم سب مقہور اور مغلوب ہو جاؤ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اس نے کہا اے میرے بیٹو! (شہر میں) تم سب ایک دروازہ سے نہ داخل ہونا، اور الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا، اور میں تم کو اللہ کی تقدیر سے بالکل بچا نہیں سکتا حکم تو صرف اللہ کا چلتا ہے، میں نے اسی پر توکل کیا ہے، اور توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا چاہیے○ اور جب وہ وہاں سے داخل ہوئے جہاں سے داخل ہونے کا ان کے باپ نے حکم دیا تھا اور وہ اللہ کی تقدیر سے بالکل بچا نہیں سکتا تھا، مگر وہ یعقوب کے دل کی ایک خواہش تھی، جو اس نے پوری کر

لی، بے شک وہ صاحب علم تھے، کیونکہ ہم نے ان کو علم عطا کیا تھا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے○ (یوسف: ۶۸-۶۷)

نظر لگنے کے متعلق احادیث

حضرت یعقوب علیہ السلام کے یہ دس بیٹے بہت خوب صورت اور بہت باکمال تھے، مصر کے چار دروازے تھے، جب دس بیٹے مصر روانہ ہونے لگے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ خدشہ ہوا کہ اگر دس کے دس ایک دروازے سے داخل ہوئے تو ان پر دیکھنے والوں کی نظر لگ جائے گی اس لیے انہوں نے فرمایا: اے میرے بیٹو! تم سب ایک دروازے سے مت داخل ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا، نظر لگنے کے متعلق حسب ذیل احادیث ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نظر برحق ہے اور آپ نے گھورنے سے منع فرمایا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۷۴۰، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۱۸۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۸۷۹، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۰۶۱، مسند احمد رقم الحدیث: ۸۲۷۰، مسند البزار رقم الحدیث: ۷۳۰۴، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۱۱۵۸۴، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۳۵۶۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نظر بد کے دم کرانے کا حکم دیا تھا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۷۳۸، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۱۹۵، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۷۵۳۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۵۱۲، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸، ص ۷۳، ۶۳، مسند احمد ج ۶ ص ۱۳۸، ۶۳، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۱۰۳، المستدرک ج ۴، ص ۴۱۲، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹، ص ۳۴۷، شرح السنہ رقم الحدیث: ۳۲۴۲)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر میں ایک بچی کو دیکھا جس کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا (اس کا رنگ سرخی مائل سیاہ تھا یا زرد تھا، بہرحال اس کے چہرے کا رنگ اصل رنگ کے خلاف تھا) آپ نے فرمایا: اس پر دم کراؤ کیونکہ اس پر نظر لگی ہوئی ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۷۳۹، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۱۹۷)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو دم کرتے ہوئے فرماتے تھے، تمہارے باپ حضرت اسماعیل اور حضرت اسحٰق بھی دم کرتے ہوئے فرماتے تھے: میں (تم کو) شیطان، ہر زہریلے کیڑے اور نظر لگانے والی آنکھ سے اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۷۱، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۰۶۰، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۷، ص ۴۹، ۴۸، ج ۱۰، ص ۳۱۵، مسند احمد ج ۱، ص ۲۷۰، ۲۳۶، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۳۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۵۲۵)

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! جعفر کی اولاد پر نظر بہت جلد لگتی ہے، کیا میں اس پر دم کرایا کروں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اگر کوئی چیز تقدیر پر سبقت کر سکتی ہے تو نظر تقدیر پر سبقت کر سکتی ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۰۵۹، مسند الحمیدی رقم الحدیث: ۳۳۰، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸، ص ۵۶، مسند احمد ج ۶، ص ۴۳۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۵۱۰، شرح السنہ رقم الحدیث: ۳۲۴۳)

ابو امامہ بن سہل بن حنیف بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا کہ سہل بن حنیف نے خرار (مدینہ کی ایک وادی) میں غسل کیا اور انہوں نے اپنا جبہ اتارا اور عامر بن ربیعہ ان کو دیکھ رہے تھے، اور سہل گورے رنگ کے بہت خوبصورت شخص تھے۔ عامر بن ربیعہ نے انہیں دیکھ کر کہا: اتنے گورے رنگ کا اتنا خوبصورت شخص میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا۔ سہل کو اسی وقت بخار چڑھ گیا۔ پھر ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر بتایا کہ سہل کو

بہت تیز بخار چڑھ گیا ہے اور وہ آپ کے ساتھ جا نہیں سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سہل کے پاس تشریف لے گئے اور سہل نے بتایا کہ اس طرح مجھے عامر نے نظر بھر کر دیکھا تھا' پھر مجھے بخار چڑھ گیا۔ آپ نے عامر سے فرمایا: تم کیوں اپنے بھائی کو قتل کرتے ہو اور تم نے یہ کیوں نہیں کہا: تبارک اللہ احسن الخالقین اللھم بارک فیہ۔ (جب دیکھنے والا کسی اچھی چیز کو دیکھ کر یہ کہے گا تو اس کی نظر نہیں لگے گی) بے شک نظر کا لگنا برحق ہے' تم اس کے لیے وضو کرو۔ عامر نے ان کے لیے وضو کیا' پھر وہ بالکل تندرست ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے گئے۔ سنن ابن ماجہ میں ہے: آپ نے اس کو حکم دیا کہ اپنے چہرے کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھوئے اور گھٹنوں کو اور ازار کے اندر جسم کا حصہ دھوئے' پھر آپ نے حکم دیا کہ اس کے غسالہ کو سہل کے اوپر بہایا جائے۔

(موطا امام مالک رقم الحدیث: ۱۷۴۷' ۱۷۴۶' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۵۰۹' سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹' ص ۳۵۱' مسند احمد ج ۳' ص ۴۸۶' عمل الیوم واللیلۃ للنسائی رقم الحدیث: ۲۰۹)

نظر بد میں مذاہب اور اس سے متعلق شرعی احکام

ان احادیث میں یہ تصریح ہے کہ نظر کا لگنا برحق ہے اور نظر کبھی انسان کو قتل بھی کر دیتی ہے جیسا کہ موطا کی اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تم اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتے ہو' اس پر تمام امت کے علماء کا اجماع ہے اور یہی اہل سنت کا مذہب ہے۔ بعض بدعتی فرقوں نے نظر لگنے کا انکار کیا ہے' لیکن احادیث صحیحہ' امت کا اجماع اور مشاہدہ ان کے انکار کو رد کرتا ہے۔ کتنے لوگ ایسے ہیں جو نظر لگنے کی وجہ سے اپنی جان کھو بیٹھے' تاہم نظر کا لگنا یا نہ لگنا اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے اذن پر موقوف ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (البقرہ: ۱۰۲)

اور وہ اللہ کے اذن کے بغیر اس جادو سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتے تھے۔

اصمعی نے کہا: میں نے ایک شخص کو دیکھا' اس کی نظر بہت لگتی تھی' اس نے سنا کہ ایک گائے بہت زیادہ دودھ دیتی ہے' اس کو یہ بہت اچھا لگا' اس نے پوچھا: وہ کون سی گائے ہے؟ لوگوں نے کوئی اور گائے بتائی اور اس کو مخفی رکھا' لیکن وہ دونوں گائیں مر گئیں۔ اصمعی نے کہا: میں نے اس شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جب مجھے کوئی چیز اچھی لگتی ہے اور میں اس کو دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں سے ایک قسم کی حرارت خارج ہوتی ہے۔

ہر مسلمان پر واجب ہے کہ جب اس کو کوئی چیز اچھی لگے تو وہ یہ کہے:

تبارک اللہ احسن الخالقین اللھم بارک فیہ۔

اللہ برکت والا ہے جو سب سے حسین پیدا کرنے والا ہے' اے اللہ! اس چیز میں برکت دے۔

جب کوئی شخص کسی اچھی چیز کو دیکھ کر یہ کہے گا تو پھر اس کی نظر نہیں لگے گی جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عامر بن ربیعہ کو ارشاد فرمایا تھا۔

جس شخص نے یہ کلمات نہیں کہے اور اس کی نظر لگ گئی تو اس کو غسل کرنے کا حکم دیا جائے اور اگر وہ غسل نہ کرے تو اس کو غسل کرنے پر مجبور کیا جائے' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر وجوب کے لیے ہے' خصوصاً اس صورت میں کہ جب اس شخص کی ہلاکت کا خطرہ ہو جس پر اس کی نظر لگی ہے' اور کسی شخص کے لیے اپنے بھائی کو نفع سے روکنا اور اس کو ضرر پہنچانا جائز نہیں ہے اور غسل کے بعد اس شخص کا غسالہ اس پر بہایا جائے جس پر نظر لگی ہے۔

جس شخص کی نظر کا لگنا مشہور ہو' اس کو لوگوں کے پاس جانے سے روک دیا جائے تاکہ لوگوں کا ضرر نہ ہو۔ بعض علماء نے کہا کہ قاضی یا حاکم کو چاہیے کہ اسے اس کے گھر میں بند کردے اور اگر وہ تنگ دست ہو تو اس کو سرکاری طور پر رزق بھی مہیا کرے اور لوگوں کو اس کی اذیت سے بچائے اور ایک قول یہ ہے کہ اس کو شہربدر کر دیا جائے' لیکن موطا امام مالک کے حوالے سے جو حدیث ہم نے ذکر کی ہے وہ ان اقوال کو مسترد کرتی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عامر بن ربیعہ کو گھر میں بند کیا تھا نہ شہربدر کیا تھا' بلکہ کبھی کسی نیک آدمی کی بھی نظر لگ جاتی ہے' اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں اور نہ ہی اس کی وجہ سے کسی کو فاسق کہا جا سکتا ہے۔

بعض احادیث میں نظر لگ جانے کے بعد دم کرانے کا ارشاد ہے اور بعض احادیث میں جس کی نظر لگی ہے' اس کو غسل کرا کر اس کے غسالہ کو اس پر ڈالنے کا حکم ہے جس پر نظر لگی ہے۔ ان میں تطبیق اس طرح ہے کہ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ کس کی نظر لگی ہے تو دم کرایا جائے (دم کے کلمات حدیث میں مذکور ہیں) اور اگر یہ معلوم ہو کہ فلاں شخص کی نظر لگی ہے تو اس کو غسل کرنے کا حکم دیا جائے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۱۹۹-۱۹۷)

نظر بد کی تاثیرات کی تحقیق

بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ کسی شخص کے دیکھنے سے دوسرے شخص کو ضرر کیوں کر پہنچ جاتا ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ لوگوں کی طبائع اور ان کے بدنوں کی کیفیات مختلف ہوتی ہیں' کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کی آنکھ سے زہر نکل کر دوسرے کے بدن میں پہنچ جاتا ہے' اس کی نظیر یہ ہے کہ جس شخص کو آشوب چشم ہو اور تندرست آدمی اس کو دیکھے تو اس کو بھی بیماری لگ جاتی ہے' اس طرح بعض بیماریوں میں تندرست آدمی بیماروں کے پاس بیٹھے تو اس کو وہ بیماری لگ جاتی ہے۔ اگر کسی آدمی کو جماہیاں آ رہی ہوں تو اس کے پاس بیٹھے ہوئے شخص کو بھی جماہیاں آنے لگتی ہیں' اسی طرح افعیٰ (سانپ) کے ساتھ نظر ملانے سے بھی اس کا زہر سرایت کر جاتا ہے' لیکن اہلسنّت کا مذہب یہ ہے کہ کسی شخص کی نظر سے ضرر کا پہنچنا اس وجہ سے ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ ہے اور اس کے اذن اور اس کی مشیت پر موقوف ہے' حدیث میں ہے:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر دوران خطبہ فرمایا: سفید دھاری دار سانپ اور دم بریدہ سانپ کو قتل کر دو کیونکہ یہ دونوں بصارت کو زائل کر دیتے ہیں اور حمل کو ساقط کر دیتے ہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۲۹۷' مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۱۹۶۱۶' مسند حمیدی رقم الحدیث: ۶۱۲' سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۵۲۵۲' سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۴۸۳' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۵۳۵)

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ سفید دھاریوں والے سانپ کے دیکھنے سے بصارت چلی جاتی ہے اور حمل ساقط ہو جاتا ہے' اس طرح بعض افاعی (سانپ) ایسے ہیں کہ ان کی نظر سے انسان ہلاک ہو جاتا ہے' اور یہ عام مشاہدہ ہے کہ اسی طرح انسان کا بعض لوگوں سے اس نوع کا تعلق ہوتا ہے کہ ان کے دیکھنے سے انسان کا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہو جاتا ہے اور بعض لوگوں سے انسان اس قدر خوف زدہ ہو جاتا ہے کہ ان کے دیکھنے سے اس کا چہرہ زرد پڑ جاتا ہے اور یہ سب نظر کی تاثیرات ہیں۔ اسی طرح بعض لوگوں کے دیکھنے سے انسان بیمار پڑ جاتا ہے اور بعض کو دیکھنے سے انسان ہلاک ہو جاتا ہے اور یہ روح کی تاثیرات ہیں اور ارواح مختلف ہوتی ہیں۔ بعض روحوں کی طبائع' کیفیات' قوتیں اور خواص بہت جلد تاثیر کرتی ہیں کیونکہ وہ روح بہت خبیث ہوتی ہے' اور محض کسی شخص کو دیکھتے ہی اس میں تاثیر کرتی ہے اور بعض روحیں دوسرے شخص کے بدن کے ساتھ اتصال کے بعد تاثیر کرتی ہیں' اور اس کی آنکھوں سے ایک معنوی تیر نکل کر دوسرے کے جسم میں پیوست ہو جاتا ہے' بہرحال

اللہ تعالیٰ کے اذن اور اس کی مشیت کے بغیر یہ تاثیر نہیں ہوتی اور اس کا علاج یہ ہے کہ اگر معلوم ہو کہ فلاں شخص کی نظر لگی ہے تو اس کو غسل کرا کر اس کا غسالہ نظر لگنے والے شخص پر ڈالا جائے ورنہ یہ دعا کر کے اس پر دم کیا جائے:

اعوذ بکلمات اللہ التامۃ من کل شیطان وھامۃ ومن کل عین لامۃ۔ میں ہر شیطان اور ہر زہریلے کیڑے اور ہر نظر بد سے اللہ کے کلمات تامہ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۷۱)

(فتح الباری ج ۳، ص ۲۰۱۔ ۲۰۰، ملخصاً مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۱ھ)

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّىْٓ اَنَا

جب وہ یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس ٹھیرایا، اور بتایا کہ میں تمہارا

اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِ

بھائی ہوں، سو تم اس بدسلوکی پر غمگین نہ ہونا جو یہ کرتے رہے تھے ○ پھر جب یوسف نے ان کا سامان تیار کیا

هِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِىْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا

تو اس نے (شاہی) پیالہ اپنے بھائی کی بوری میں رکھ دیا، پھر منادی نے اعلان کیا کہ اے قافلے والو!

الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾

بے شک تم ضرور چور ہو ○ انہوں نے ان کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے؟ ○

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا

کارندوں نے کہا بادشاہ کا پیالہ گم ہو گیا ہے اور جو اس کو لے کر آئے گا اس کو غلہ سے لدا ہوا ایک اونٹ ملے گا اور میں

بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِى

اس کا ضامن ہوں ○ انہوں نے کہا اللہ کی قسم! تم کو خوب معلوم ہے کہ ہم زمین میں فساد کرنے نہیں

الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ

آئے اور نہ ہم چور ہیں ○ کارندوں نے کہا اگر تم جھوٹے نکلے تو تمہاری کیا سزا

كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِىْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ط

ہونی چاہیے؟ ○ انہوں نے کہا جس کی بوری سے وہ برآمد ہو سو اس کی سزا یہ ہے کہ اسی کو رکھ لیا جائے



كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿٧٥﴾ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاۗءِ اَخِيْهِ

ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں ○ تو یوسف نے اپنے بھائی کی بوری سے پہلے ان کی بوریوں کی تلاشی لینی شروع کردی

ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَاۗءِ اَخِيْهِ ۭ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ۭ

پھر اس پیالے کو اپنے بھائی کی بوری سے برآمد کر لیا، ہم نے اسی طرح یوسف کو خفیہ تدبیر بتائی تھی ،

مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۭ

وہ بادشاہ کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو نہیں رکھ سکتے تھے مگر یہ کہ اللہ چاہے،

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿٧٦﴾

ہم جس کو چاہتے ہیں درجات کی بلندی عطا کرتے ہیں اور ہر (تناہی) علم والے سے بڑھ کر ایک عظیم علم والا ہے ○

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا

انہوں نے کہا اگر اس نے چوری کی ہے تو (کوئی نئی بات نہیں) اس سے پہلے اس کا بھائی بھی چوری کر چکا ہے، سو یوسف نے

يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ

اس بات کو دل میں چھپایا اور ان پر ظاہر نہیں کیا، اس نے (دل میں) کہا تم خود بدتر خصلت کے ہو

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿٧٧﴾ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا

اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو اسے اللہ خوب جانتا ہے ○ انہوں نے کہا اے عزیز! اس کا باپ

شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٧٨﴾

بہت بوڑھا ہے، آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیں، ہماری رائے میں آپ بہت نیک لوگوں میں سے ہیں ○

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ

یوسف نے کہا اللہ کی پناہ! کہ ہم نے جس کی بوری میں اپنا سامان پایا ہے اس کے علاوہ ہم کسی اور کو رکھ لیں ،

اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿٧٩﴾ ع ع ٩ ١١ ٣

پھر تو ہم ظالم قرار پائیں گے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جب وہ یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس ٹھہرایا، اور بتایا کہ میں تمہارا بھائی ہوں، سو تم اس بدسلوکی پر غمگین نہ ہونا جو یہ کرتے رہے تھےO پھر جب یوسف نے ان کا سامان تیار کیا تو اس نے (شاہی) پیالہ اپنے بھائی کی بوری میں رکھ دیا، پھر منادی نے اعلان کیا کہ اے قافلے والو! بے شک تم ضرور چور ہوO انہوں نے ان کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا: تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے؟O کارندوں نے کہا: بادشاہ کا پیالہ گم ہو گیا ہے اور جو اس کو لے کر آئے گا، اس کو غلہ سے لدا ہوا ایک اونٹ ملے گا اور میں اس کا ضامن ہوں۔ (یوسف: ۷۲-۶۹)

حضرت یوسف کا بن یامین کو یہ بتانا کہ میں تمہارا بھائی ہوں

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

امام ابن اسحاق نے کہا جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے، حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا یہ ہمارا وہ بھائی ہے جس کے متعلق آپ نے کہا تھا کہ اس کو لے کر آنا، اب ہم ان کو لے کر آئے ہیں۔ حضرت یوسف نے فرمایا: تم نے اچھا کیا اور درست کیا، اور تم کو عنقریب اس پر انعام ملے گا، پھر فرمایا: میں تمہاری ضیافت اور تکریم کرنا چاہتا ہوں، پھر آپ نے دو، دو کو کھانے پر بٹھایا، اور ان کو عمدہ کھانے پیش کیے، پھر بن یامین کے متعلق فرمایا: یہ اکیلا رہ گیا! اس کو میں اپنے ساتھ بٹھالیتا ہوں اور دو، دو کو ایک ایک کمرہ میں ٹھہرایا اور فرمایا: بن یامین کو میں اپنے کمرہ میں ٹھہرالیتا ہوں، پھر تنہائی میں بن یامین کو بتایا کہ میں تمہارا سگا بھائی یوسف ہوں، تمہارے یہ بھائی جو کچھ بدسلوکی کرتے رہے ہیں، تم اس پر غم نہ کرنا۔

(جامع البیان جز ۱۳، ص ۲۱-۲۰، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۷، ص ۲۱۷۰)

امام عبدالرحمن بن علی بن محمد جوزی متوفی ۵۹۷ھ روایت کرتے ہیں:

وہب بن منبہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف نے دو، دو کو ایک ساتھ دسترخوان پر بٹھایا اور بن یامین کو اکیلا بٹھایا۔ وہ رونے لگے اور کہنے لگے اگر میرا بھی بھائی ہوتا تو آپ مجھے اس کے ساتھ بٹھاتے۔ حضرت یوسف نے کہا: میں اس کو اکیلا دیکھ رہا ہوں سو میں اس کو اپنے ساتھ بٹھالیتا ہوں۔ پھر جب رات ہوئی تو دو، دو کو ایک کمرا دیا، بن یامین اکیلے رہ گئے تو کہا اس کو میں اپنے ساتھ کمرے میں رکھ لیتا ہوں، تنہائی میں حضرت یوسف نے کہا: کیا تمہارا کوئی ماں شریک بھائی ہے۔ اس نے کہا: ہاں میرا ایک ماں شریک بھائی تھا، وہ ہلاک ہو گیا۔ حضرت یوسف نے کہا: کیا تم یہ پسند کرو گے کہ تمہارے اس ہلاک شدہ بھائی کے قائم مقام میں تمہارا بھائی ہو جاؤں؟ بن یامین نے کہا: اے بادشاہ! آپ جیسا بھائی کس خوش نصیب کا ہو گا؟ لیکن آپ یعقوب سے پیدا نہ ہوئے نہ راحیل سے؟ پھر حضرت یوسف رونے لگے اور اس کو گلے لگالیا اور فرمایا: میں تمہارا بھائی یوسف ہوں اور تم اب غم نہ کرنا یعنی وہ جو ہم پر حسد کرتے رہے تھے اور ہمارے باپ کی توجہ اپنی طرف پھیرنے کی جو کوشش کرتے رہے تھے، اس پر اب تم غم نہ کرنا۔ (زاد المسیر ج ۴، ص ۲۵۶-۲۵۵، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

اس اعتراض کا جواب کہ حضرت یوسف نے بن یامین کو روک کر باپ کی مزید دل آزاری کی

جب بن یامین نے حضرت یوسف کو پہچان لیا تو حضرت یوسف سے کہا: مجھے ان کی طرف نہ لوٹائیں۔ حضرت یوسف نے کہا: تمہیں معلوم ہے کہ حضرت یعقوب کو پہلے ہی میری وجہ سے کتنا غم اٹھانا پڑا تھا، پھر ان کا غم اور زیادہ ہو جائے گا۔ بن یامین نے واپس جانے سے انکار کیا، حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: تمہیں روکنا صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ تم پر چوری کا الزام لگا دیا جائے۔ بن یامین نے کہا کوئی پروا نہیں، پھر حضرت یوسف نے چپکے سے شاہی پیالہ بن یامین کی بوری میں رکھ دیا، انہوں نے خود وہ پیالہ اس طرح رکھا تھا کہ کسی کو پتا نہیں چل سکا، یا اپنے بعض خاص خدام کا اس کو حکم دیا تھا۔

قرآن مجید میں اس پیالے کے لیے دو لفظ ہیں السقایہ اور صواع' السقایہ کا معنی پانی پینے کا پیالہ ہے اور صواع کا معنی پیمانہ ہے' یہ سونے اور چاندی کا ایک برتن تھا' اس سے پانی بھی پیا جاتا تھا اور اس سے ماپ کر غلہ بھی دیا جاتا تھا۔

حسن بصری' مجاہد اور قتادہ سے روایت ہے کہ یہ پانی پینے کا برتن تھا۔

(جامع البیان جز ۱۳' ص ۲۲' الجامع لاحکام القرآن جز ۹' ص ۲۰۰)

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت یوسف کو یہ علم تھا کہ بن یامین کے واپس نہ پہنچنے سے حضرت یعقوب علیہ السلام کو مزید غم ہو گا تو پھر انہوں نے بن یامین کی بات کیوں مان لی اور ایسا کام کیوں کیا جس کے نتیجے میں ان کے باپ کو صدمہ پہنچا' اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے وحی کے ذریعہ جان لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی یہی مشیت ہے' اور ان کے اقدام کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ بن یامین کے نہ پہنچنے کے بعد بھی حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف کو یاد کرتے رہے تھے اور وہ کہتے تھے یاسفی علی یوسف۔

بے قصور قافلہ والوں کو چور کہنے کی توجیہ

پھر منادی نے اعلان کیا کہ اے قافلے والو! تم ضرور چور ہو!

اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ منادی نے یہ اعلان اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے حکم سے کیا تھا تو ایک رسول برحق کے لیے یہ کیسے جائز تھا کہ وہ بے قصور لوگوں پر بہتان باندھیں اور ان پر چوری کی جھوٹی تہمت لگائیں' اور اگر انہوں نے یہ حکم نہیں دیا تھا تو انہوں نے بعد میں منادی کا رد کیوں نہیں کیا کہ تم ان کو چور کیوں کہہ رہے ہو' یہ تو بے قصور ہیں! اس اعتراض کے حسب ذیل جوابات ہیں:

(۱) حضرت یوسف بن یامین سے پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ تمہیں روکنے کا صرف یہی طریقہ ہے تو گویا ان کی رضامندی سے ان کو چور کہا جا رہا تھا۔

(۲) حضرت یوسف کی مراد یہ تھی کہ تم نے یوسف کو اس کے باپ سے چرایا تھا اور چرا کر پہلے کنوئیں میں ڈالا پھر قافلہ والوں کے ہاتھ غلام بنا کر بیچ دیا' تو یہ کلام بطور توریہ تھا' اس کلام سے حضرت یوسف کی مراد یہ تھی کہ تم یوسف کو چرانے والے ہو اور اس کلام کا ظاہر یہ تھا کہ تم شاہی پیمانہ چرانے والے ہو۔

(۳) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ منادی کا یہ کلام بطور استفہام ہو' یعنی اس نے پوچھا ہو کہ آیا تم چور ہو؟

(۴) قرآن مجید میں یہ مذکور نہیں ہے کہ منادی نے حضرت یوسف علیہ السلام کے حکم سے یہ اعلان کیا تھا یا ان کو اس اعلان کا علم تھا اور ظاہر یہ ہے کہ کارندوں نے اپنے طور پر اس پیالہ کو تلاش کیا اور جب ان کو وہ نہیں ملا تو ان کو شبہ ہوا کہ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے اس پیالہ کو اپنی بوریوں میں رکھ لیا ہو۔

انہوں نے ان کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا: تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے؟ کارندوں نے کہا: بادشاہ کا پیالہ گم ہو گیا ہے اور جو اس کو لے کر آئے گا اس کو غلہ سے لدا ہوا ایک اونٹ ملے گا اور میں اس کا ضامن ہوں۔

جُعل (کسی چیز کو ڈھونڈنے کی اُجرت) کی تحقیق

اس آیت میں یہ ذکر ہے: جو شخص شاہی پیالے کو ڈھونڈ کر لائے گا اس کو میں ایک بار شتر دوں گا۔ اس میں جُعل کا ثبوت دوں گا۔ جُعل کا لغوی معنی ہے کہ کسی کام کی اجرت' مجاہدین کو جو رقم دی جاتی ہے تاکہ وہ اس سے سامان جہاد خریدیں' اس کو بھی جُعل کہتے ہیں۔ اصطلاح شرع میں اس کا معنی ہے کسی معین کام پر معین عوض عطا کرنا۔ فقہاء مالکیہ کے

نزدیک اس کا معنی ہے ظنی منفعت کے حصول کے لیے کسی کو اجرت دینا، جیسے صحت اور شفا کے حصول کے لیے طبیب کو اجرت دینا، یا تعلیم میں مہارت کے حصول کے لیے معلم کو اجرت دینا یا بھاگے ہوئے غلام کو ڈھونڈنے کے لیے کسی کو اجرت دینا۔

عمرو بن دینار بیان کرتے ہیں کہ جو بھاگا ہوا غلام حرم میں مل جائے، اس (کو ڈھونڈنے) کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دس درہم کا فیصلہ فرمایا۔ (مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۱۴۹۰۷، مطبوعہ بیروت)

شریح نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ شہر میں مل جائے تو اس کے لیے دس درہم ہیں اور اگر شہر سے باہر ملے تو اس کے لیے چالیس درہم ہیں۔ (مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۱۴۹۰۸، مطبوعہ بیروت)

اس پر یہ اعتراض ہے کہ اونٹ پر لدا ہوا مال مجہول ہے، کیونکہ اونٹ پر لدے ہوئے مال کی اجرت کم بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ بھی اور اجرت کا مجہول ہونا جائز نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے یہ ان کی شریعت میں جائز ہو، دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ اجرت تو چور کو دی جائے گی اور وہ جائز نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے۔ یہ ان کی شریعت میں جائز ہو اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ جُعل ہے اور کسی چیز یا شخص کو ڈھونڈ کر لانے والے کو جو مال دیا جاتا ہے، اس کو جعل کہتے ہیں۔

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

بعض علماء نے کہا اس آیت میں دو دلیلیں ہیں: ایک دلیل یہ ہے کہ جُعل جائز ہے اور اس کو ضرورت کی بناء پر جائز قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اس میں جتنی جہالت کو جائز کہا گیا ہے، کسی اور چیز میں نہیں کہا گیا اور جُعل میں ایک طرف معلوم ہوتی ہے اور دوسری طرف ضرورت کی بناء پر مجہول ہوتی ہے اور اجارہ (مزدوری) میں کام اور اس کی اجرت دونوں کا معلوم اور معین ہونا ضروری ہے، ورنہ اجارہ صحیح نہیں ہو گا۔

جب کسی شخص نے کہا جو شخص میرے بھاگے ہوئے غلام کو لے آیا تو اس کو ایک دینار ملے گا، پس اگر وہ اس غلام کو لے کر آیا تو اس کو ایک دینار دینا ہو گا۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۹، ص ۲۰۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

مال اور شخص کی ضمانت کے متعلق احادیث

اس آیت میں کفالت (ضمانت) کا بھی ثبوت ہے کیونکہ منادی نے کہا: جو پیالہ لائے گا، اس کو ایک بار شتر ملے گا اور اس کا میں ضامن ہوں۔ یعنی پیالہ لانے والے کو حکومت سے میں لے کر دوں گا۔ یہ آیت ضامن ہونے کی اصل ہے اور اس کی اصل یہ حدیث بھی ہے:

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک شخص کو لایا گیا تاکہ آپ اس کی نماز جنازہ پڑھائیں، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اس کی نماز جنازہ خود پڑھ لو، کیونکہ اس پر قرض ہے۔ حضرت ابو قتادہ نے کہا: وہ قرض مجھ پر ہے، تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تم وہ قرض ادا کرو گے؟ انہوں نے کہا، ہاں! میں پورا قرض ادا کروں گا، تب آپ نے اس شخص کی نماز جنازہ پڑھا دی۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۰۶۹، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۱۵۲۵۸، مسند احمد ج ۵، ص ۲۹۷، سنن دارمی رقم الحدیث: ۲۵۹۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۴۰۷، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۲۹۵)

اس حدیث سے تو صرف مال کا ضامن ہونا ثابت ہوتا ہے اور درج ذیل حدیث سے مال اور نفس (شخص) دونوں کا

ضامن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الزعیم غارم یعنی کفیل ضامن ہوتا ہے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۵۶۵، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۲۶۵، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۲۳۹۸، مسند احمد ج ۵، ص ۲۶۷، سنن کبریٰ للبیہقی، ج ۶، ص ۸۸، شرح السنہ رقم الحدیث: ۲۱۶۲)

یہ حدیث اپنے اطلاق کی وجہ سے مال اور نفس دونوں کی ضمانت کے جواز پر دلیل ہے اور بالخصوص نفس کی ضمانت پر یہ احادیث ہیں:

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک تہمت زدہ شخص سے کفیل کو طلب کیا۔ حارثہ بن مضرب بیان کرتے ہیں کہ ابن النواحہ اور اس کے اصحاب نے مسیلمہ کذاب کی رسالت کی شہادت دی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ابن النواحہ کے قتل کا حکم دیا، پھر اس کے اصحاب کے متعلق مسلمانوں سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت جریر اور حضرت اشعث نے کھڑے ہو کر کہا کہ ہم ان سے توبہ طلب کریں گے اور ان کے خاندان والوں کو ان کا کفیل (ضامن) بنایا، انہوں نے ان سے توبہ طلب کی، انہوں نے توبہ کرلی، اور ان کے خاندان والوں نے ان کی ضمانت دی۔ امام بخاری نے اس حدیث کو تعلیقاً ذکر کیا ہے۔

امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر نے ایک شخص کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا، ایک شخص نے اس کی بیوی کی باندی کے ساتھ زنا کیا۔ حمزہ نے اس شخص کے کفیل (ضامن) لیے حتیٰ کہ حضرت عمر کے پاس آئے اور حضرت عمر نے اس شخص کو سو کوڑے مارے اور اس کو جہالت کی وجہ سے معذور قرار دیا کیونکہ حد میں کسی کو کفیل نہیں بنایا جاتا۔ حماد نے کہا اگر کوئی آدمی کسی شخص کی ضمانت دے اور وہ مرجائے تو اس پر کوئی تاوان نہیں ہے اور حکم نے کہا وہ ضامن ہوگا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۲۹۰)

(سنن کبریٰ للبیہقی ج ۶، ص ۷۷، مطبوعہ ملتان)

ضمانت کی تعریف اور اس کے شرعی احکام

علامہ مرغینانی حنفی متوفی ۵۹۳ھ لکھتے ہیں:

کفالت (ضمانت) کی دو قسمیں ہیں: کسی شخص کا ضامن ہونا اور مال کی ضمانت دینا، کسی شخص کا ضامن ہونا جائز ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ جس شخص کی اس نے ضمانت دی اس کو حاضر کرنا اس پر لازم ہے اور مال کے ضامن ہونے کا یہ معنی ہے کہ ایک شخص قرض خواہ سے کہے اگر اس مقروض نے قرض ادا نہیں کیا تو میں تمہارا قرض ادا کروں گا، وہ میرے ذمہ ہے یا میں اس کا ضامن ہوں۔

جب ضامن یہ کہے کہ میں فلاں تاریخ پر اس شخص کو حاضر کردوں گا تو اگر اس سے صاحب حق مطالبہ کرے تو اسے اس تاریخ پر اس شخص کو حاضر کرنا ہوگا، اگر ضامن اس کو حاضر کردے تو فبہا ورنہ حاکم اس کو قید کردے، کیونکہ وہ اپنے حق کو ادا نہیں کرسکا، اگر وہ شخص کہیں غائب ہوجائے تو حاکم ضامن کو آنے جانے اور لانے کی مدت کی مہلت دے، اگر مدت گزرنے کے بعد بھی وہ اس شخص کو نہ لاسکے تو حاکم اس کو قید کرے اور اگر وہ شخص مرگیا تو پھر ضامن بری ہوجائے گا کیونکہ اب وہ اس کو حاضر کرنے سے عاجز ہوچکا ہے۔

(ہدایہ مع فتح القدیر ج ۷، ص ۱۶۱-۱۵۵ ملخصاً، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! تم کو خوب معلوم ہے کہ ہم زمین میں فساد کرنے نہیں آئے اور نہ ہم چور ہیں○ کارندوں نے کہا اگر تم جھوٹے نکلے تو تمہاری کیا سزا ہونی چاہیے ؟○ انہوں نے کہا جس کی بوری سے وہ برآمد ہو سو اس کی سزا یہ ہے کہ اسی کو رکھ لیا جائے، ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں○ (یوسف: ۷۵-۷۳)

حضرت یوسف کے بھائیوں کے چور نہ ہونے پر دلائل

مفسرین نے کہا: انہوں نے دو چیزوں پر قسم کھائی تھی: ایک یہ کہ وہ زمین میں فساد کرنے کے لیے نہیں آئے، کیونکہ ان کے کردار اور ان کے چال چلن سے یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ دوبار آئے اور انہوں نے خود کسی کا مال کھایا نہ لوگوں کی چراگاہوں میں اپنے جانوروں کو چرانے کے لیے چھوڑا، اور وہ مختلف قسم کی عبادات میں مشغول رہتے تھے اور جن کے یہ طور طریقے ہوں ان کے متعلق زمین میں فساد پھیلانا متصور نہیں ہو سکتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس پر دلیل قائم ہو چکی تھی کہ وہ چور نہیں ہو سکتے، کیونکہ جب ان کی بوریوں میں ان کی رقم کی تھیلی رکھ دی گئی تھی تو انہوں نے اس کو لینا جائز نہیں سمجھا اور اس کو جوں کی توں واپس لائے اور چور اس طرح نہیں کرتے۔

جب انہوں نے دلائل کے ساتھ چوری سے اپنا بے قصور ہونا واضح کر دیا تو حضرت یوسف کے کارندوں نے پوچھا: اگر تم میں سے کسی کی بوری میں وہ پیالہ نکل آئے تو پھر؟ انہوں نے کہا: اس کی سزا یہ ہے کہ اس جرم میں اسی کو غلام بنا کر رکھ لیا جائے۔

حضرت ابن عباس نے کہا: اس زمانہ میں ہر چور کو اس کی چوری کے جرم میں غلام بنا لیا جاتا تھا، اور ان کی شریعت میں چور کو غلام بنانا اس کے ہاتھ کاٹنے کے قائم مقام تھا۔ (جامع البیان جز ۹، ص ۲۸-۲۷، تفسیر کبیر ج ۶، ص ۴۷۷)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تو یوسف نے اپنے بھائی کی بوری سے پہلے ان کی بوریوں کی تلاشی لینی شروع کر دی، پھر اس پیالے کو اپنے بھائی کی بوری سے برآمد کر لیا؛ ہم نے اسی طرح یوسف کو خفیہ تدبیر بتائی تھی، وہ بادشاہ کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو نہیں رکھ سکتے تھے، مگر یہ کہ اللہ چاہے، ہم جس کو چاہتے ہیں درجات کی بلندی عطا کرتے ہیں اور ہر (متناہی) علم والے سے بڑھ کر ایک عظیم علم والا ہے○ (یوسف: ۷۶)

حضرت یوسف کا بھائیوں کے سامان کی تلاشی لینا

جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے یہ کہہ دیا کہ جس کی بوری سے وہ پیالہ نکل آئے، اس کو غلام بنا کر رکھ لیا جائے تو کارندوں نے کہا: اب تمہاری تلاشی لینی ضروری ہو گئی اور تمہارے سامان کی تلاشی خود بادشاہ لے گا، اور حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے سامان کی تلاشی لینی شروع کر دی اور پہلے بن یامین کے دوسرے بھائیوں کی تلاشی لی تاکہ ان پر تہمت نہ لگے۔ قتادہ سے مروی ہے کہ وہ جب بھی کسی بوری کو کھولتے تو استغفار کرتے، حتیٰ کہ جب آخر میں صرف ان کے بھائی کی بوری رہ گئی تو انہوں نے خیال کیا: میرا خیال ہے کہ اس نے کوئی چیز نہیں اٹھائی ہو گی اس کی تلاشی نہ لی جائے، ان کے بھائیوں نے کہا ہم اس وقت تک نہیں جائیں گے جب تک کہ مکمل تلاشی نہ لے لی جائے، پھر جب بنیامین کی بوری کھولی تو اس سے پیالہ نکل آیا، اور ان کے اپنے اقرار کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام بن یامین کو پکڑ کر لے گئے۔

بھائیوں سے چور کی سزا معلوم کرنے کی وجہ

بادشاہ کا قانون یہ تھا کہ چور کو پکڑ کر مارا جائے اور اس سے تاوان وصول کیا جائے۔ اس قانون کے اعتبار سے حضرت یوسف علیہ السلام بن یامین کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں یہ قانون تھا کہ چور کو

غلام بنا کر رکھ لیا جائے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس تدبیر کی طرف متوجہ کیا کہ وہ بھائیوں سے پوچھیں کہ جس کے سامان سے وہ پیالہ نکل آئے، اس کی کیا سزا ہوگی اور جب انہوں نے یہ اقرار کر لیا کہ اس کو غلام بنا کر رکھ لیا جائے گا تو وہ اپنے اقرار کی بنا پر ماخوذ ہو گئے۔

بھائی کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے اس پر چوری کے الزام کی تحقیق

اس مقام پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام ایک عظیم اور جلیل القدر نبی ہیں اور انہوں نے ایک حیلہ کر کے اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھ لیا اور اس حیلہ کے نتیجے میں ان کے بے قصور بھائی پر چوری کا الزام آیا، اور یہ اس کی لیے ذلت اور رسوائی کا باعث ہوا اور ان کے دوسرے بھائیوں کو اس پر طعن کا موقع ملا اور انہوں نے کہا اگر اس نے چوری کی ہے تو کوئی نئی بات نہیں ہے اس سے پہلے اس کا بھائی بھی چوری کر چکا ہے، تو ایک نبی کی شان کے یہ کس طرح لائق ہے کہ وہ محض اپنی محبت کی تسکین کی خاطر اپنے بے قصور بھائی پر چوری کا الزام لگوانے کا سامان مہیا کریں، جس کے نتیجہ میں وہ بھی رسوا ہوا اور اس کے فراق میں اس کا باپ بھی زیادہ غم زدہ ہوا، اس سوال کے متعدد جوابات ہیں:

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ اقدام اللہ تعالیٰ کی وحی کی اتباع میں تھا، اور اللہ تعالیٰ مالک ہے وہ اپنی مخلوق میں جیسا چاہے تصرف کرے، اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ۔ (الانبیاء: ۲۳)

اللہ جو کام کرتا ہے، اس کے متعلق اس سے سوال نہیں کیا جا سکتا اور ان سب (بندوں) سے سوال کیا جائے گا۔

البتہ اللہ تعالیٰ کے کاموں کی حکمتیں ہوتی ہیں، وہ ان شاء اللہ عنقریب واضح ہو جائیں گی۔

(۲) رہا یہ سوال کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے دل کی تسکین کے لیے بے قصور بھائی پر چوری کا الزام لگوا دیا اور باپ کو الگ غمزدہ کیا، اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی اپنی یہ خواہش نہیں تھی کہ بن یامین ان کے پاس رہے، بلکہ خود بن یامین حضرت یوسف کے پاس رہنا چاہتے تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے مسلسل منع کرنے کے باوجود نہیں مانے، اس کے ثبوت میں یہ روایت ہے:

امام ابو محمد حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ روایت کرتے ہیں:

کعب نے بیان کیا ہے کہ جب حضرت یوسف نے بن یامین سے کہا: میں تمہارا بھائی ہوں تو بن یامین نے کہا: میں اب آپ سے جدا نہیں ہوں گا۔ حضرت یوسف نے فرمایا: تم کو معلوم ہے کہ والد میری وجہ سے پہلے ہی کتنے غمگین ہیں، اگر اب تم بھی یہاں رہ گئے تو ان کا غم اور زیادہ ہو گا اور تمہارا یہاں رہنا اس وقت تک ممکن نہیں ہو گا جب تک کہ میں تم کو ایک برے کام سے منسوب نہ کروں، اور تمہاری طرف ایسی چیز منسوب نہ کروں جو لائق شرم ہے۔ بن یامین نے کہا: مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے آپ جو مناسب جانیں وہ کریں، میں آپ سے بالکل جدا نہیں ہوں گا۔ حضرت یوسف نے کہا: میں اپنا پیمانہ تمہارے سامان میں چھپا دوں گا، پھر میں تمہارے خلاف چوری کا اعلان کروں گا تاکہ تمہاری روانگی کے بعد میرے لیے تم کو واپس لانا ممکن ہو۔ بن یامین نے کہا: آپ جس طرح کرنا چاہتے ہیں کریں۔

(معالم التنزیل ج ۲، ص ۳۶۸، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ)

امام ابو الحسن الواحدی المتوفی ۴۶۸ھ، علامہ محمود بن عمر الزمخشری متوفی ۵۳۸ھ، امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ، علامہ ابو عبد اللہ قرطبی متوفی ۶۶۸ھ، علامہ عبد اللہ بن عمر بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ، علامہ نظام الدین نیشاپوری متوفی ۷۲۸ھ اور علامہ

سید محمود آلوسی متوفی ١٢٧٠ھ نے بھی اس روایت کا ذکر کیا ہے۔

(الوسیط ج ٢، ص ٢٦٣، الکشاف ج ٢، ص ٤٦١، تفسیر کبیر ج ٦، ص ٤٨٦، الجامع لاحکام القرآن جز ٩، ص ٢٠٠، انوار التنزیل مع عنایت القاضی ج ٥، ص ٣٣٥، غرائب القرآن و رغائب الفرقان ج ٤، ص ١٠٩، روح المعانی جز ١٣، ص ٣٤)

(٣) اس میں حکمت یہ تھی کہ یہ بیان کیا جائے کہ جو کام فی نفسہ حرام یا ممنوع نہ ہو، مگر اس کا حصول کسی خفیہ تدبیر پر موقوف ہو تو اس خفیہ تدبیر سے اس کو حاصل کرنا جائز ہے، جیسے ایک بھائی کا دوسرے بھائی کے پاس رہنا حرام یا ممنوع نہیں ہے، مگر یہ رہائش اس خفیہ تدبیر کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی تھی اس لیے اس کا ارتکاب کیا گیا، اس میں دوسری حکمت یہ تھی کہ اس وجہ سے حضرت یعقوب کو دو بیٹوں کی جدائی کا غم اٹھانا پڑا اور اس پر انہوں نے صبر کیا تو وہ زیادہ اجر کے امیدوار ہوئے۔ تیسری حکمت یہ تھی کہ بعد میں ان کو زیادہ خوشی حاصل ہوئی کیونکہ دو بیٹوں سے بیک وقت ملنا نصیب ہوا، چوتھی حکمت یہ تھی کہ یہ بتایا جائے کہ بعض اوقات انسان کو اپنا مطلوب حاصل کرنے کے لیے کچھ قربانی بھی دینی پڑتی ہے، بن یامین حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس رہنا چاہتے تھے تو ان کو عارضی طور پر اپنی طرف چور کی نسبت کی بدنامی برداشت کرنا پڑی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے اسی طرح یوسف کو خفیہ تدبیر بتائی تھی، وہ بادشاہ کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس آیت میں یہ تصریح ہے کہ اپنے بھائی کو رکھنے کے سلسلے میں حضرت یوسف نے جو اقدام کیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے بتانے اور اس کی وحی سے کیا تھا، اس میں حضرت یوسف کی اپنی رائے اور اجتہاد کا کوئی دخل نہیں تھا اور بعض مفسرین کو اس معاملہ میں شدید لغزش ہوئی ہے۔

بھائی کی طرف چوری کی نسبت کو علامہ ماوردی کا گناہ قرار دینا

علامہ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی المتوفی ٤٥٠ھ لکھتے ہیں:

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے یہ کیسے جائز تھا کہ وہ اپنے بھائی کے سامان میں پیالہ رکھیں، پھر ان کو چور قرار دیں، حالانکہ وہ بے قصور تھے اور یہ گناہ ہے۔ پھر علامہ ماوردی نے اس اعتراض کے چار جواب دیئے ہیں اور چوتھا جواب یہ ہے: حضرت یوسف کا یہ اقدام گناہ تھا، اس کی اللہ نے ان کو یہ سزا دی کہ قوم نے یہ کہا: اگر اس نے چوری کی ہے تو کون سی نئی بات ہے، اس کا بھائی بھی پہلے چوری کر چکا ہے، بھائی سے ان کی مراد حضرت یوسف تھے۔

(النکت والعیون ج ٣، ص ٦٢-٦١، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

علامہ ماوردی انبیاء علیہم السلام سے گناہوں کے صدور کے قائل ہیں، ہم اس سے پہلے بھی اسی سورت میں ان کی عبارت ذکر کر کے ان کا رد کر چکے ہیں۔

حیلہ کے جواز کی تحقیق

خلاصہ یہ ہے کہ بھائی کو اپنے پاس رکھنے کے لیے حضرت یوسف کو اللہ تعالیٰ نے جو خفیہ تدبیر بتائی تھی، وہ بہت خوبصورت تدبیر تھی جو اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب اور پسندیدہ تھی، کیونکہ اس میں بہت حکمتیں تھیں اور مطلوبہ مصلحت تھی اور اس میں یہ دلیل ہے کہ صحیح اور جائز غرض کو پورا کرنے کے لیے کسی خفیہ تدبیر پر عمل کرنا جائز ہے، جب کہ اس سے کسی شرعی حکم کی مخالفت نہ ہوتی ہو۔ یہ وہ حیلہ ہے جو جائز اور مشروع ہے کیونکہ اس پر خیر اور مصلحت مرتب ہوتی ہے اور اس میں کسی فریق کو نقصان نہیں پہنچا، کیونکہ بن یامین کو اطمینان تھا کہ وہ بے قصور ہیں اور جو کچھ باتیں ہوئی ہیں، وہ عارضی ہیں اور ان کی یہی مرضی تھی۔

حیلہ کو جائز کہنے کی وجہ سے علامہ قرطبی کے امام ابوحنیفہ پر اعتراضات

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں حیلوں کے ساتھ اغراض کو پورا کرنے کی دلیل ہے جب کہ وہ حیلے شریعت کے مخالف نہ ہوں اور نہ کسی شرعی قاعدہ کو منہدم کرتے ہوں، اس میں امام ابو حنیفہ کا اختلاف ہے، وہ حیلوں کو جائز قرار دیتے ہیں، خواہ حیلے اصول شرعیہ کے مخالف ہوں اور حرام کو حلال کرتے ہوں۔

علماء کا اس پر اجماع ہے کہ کسی شخص کے لیے جائز ہے کہ وہ سال پورا ہونے سے پہلے اپنے مال کو فروخت کردے یا کسی کو ہبہ کردے، جب کہ اس کی یہ نیت نہ ہو کہ وہ ایسا کرکے زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچ جائے گا اور اس پر بھی علماء کا اجماع ہے کہ جب سال پورا ہو جائے اور اس کے پاس زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے عامل آجائے تو اس کے لیے بقدر نصاب مال میں تصرف کرنا یا کمی کرنا جائز نہیں ہے اور نہ اس کے لیے یہ جائز ہے کہ اگر اس کی ملک میں مثلاً بکریاں جمع ہوں تو ان کو متفرق کردے (مثلاً اس کے پاس چالیس بکریاں ہوں اور اس نے ایک بکری زکوٰۃ میں دینی ہو تو وہ اپنی بکریوں کو متفرق کردے اور کہے کہ یہ بیس بکریاں میری ہیں اور بیس بکریاں فلاں کی ہیں اور فلاں کو وہ بکریاں ہبہ کردے تاکہ زکوٰۃ سے بچ جائے) اسی طرح متفرق کو جمع کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ (کیونکہ ۴۰ سے ۱۱۹ تک ایک بکری زکوٰۃ میں دینی ہے اور ۱۲۰ پر دو بکریاں ہیں، اب فرض کریں کہ دو بھائیوں کی چالیس چالیس بکریاں ہیں اور ہر ایک پر ایک ایک بکری زکوٰۃ دینا واجب ہے اور جب عامل آئے تو ان میں سے کوئی ایک بھائی دوسرے کو اپنی بکریاں ہبہ کردے اور وہ دوسرا بھائی کہے، یہ میری اسی بکریاں ہیں اس طرح ایک بکری زکوٰۃ میں دی جائے گی اور ایک بکری بچ جائے گی، اور بعد میں پھر دونوں بھائی حسب سابق معاملہ کرلیں)

امام مالک نے یہ کہا ہے کہ جب کوئی شخص زکوٰۃ سے بچنے کے لیے مثلاً ایک ماہ پہلے اپنے نصاب میں کمی کرے گا، تب بھی سال پورا ہونے کے بعد اس کو زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: زکوٰۃ کے ڈر سے مجتمع کو متفرق نہ کیا جائے اور متفرق کو مجتمع نہ کیا جائے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۹۵۵) اور امام ابو حنیفہ نے یہ کہا ہے کہ اگر کسی شخص نے سال پورا ہونے سے پہلے مجتمع کو متفرق کیا ہے یا متفرق کو مجتمع کیا ہے تاکہ وہ زکوٰۃ ادا کرنے سے بچ جائے تو اس کو کوئی ضرر نہیں ہوگا اور زکوٰۃ سال پورا ہونے کے بعد لازم ہوتی ہے اور حدیث میں جو فرمایا ہے کہ زکوٰۃ کے ڈر سے ایسا نہ کرے، اس کا مصداق تو وہ شخص اسی صورت میں بنتا ہے۔ (یہ امام ابو حنیفہ پر اعتراض ہے)

قاضی ابوبکر ابن العربی نے کہا ہے کہ میں نے ابوبکر محمد بن الولید الفہری وغیرہ سے سنا ہے کہ ہمارے شیخ ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الدامغانی کے پاس ہزاروں دینار مال تھا، جب سال پورا ہونے کو آتا تو وہ اپنے بیٹوں کو بلا کر کہتے، اب میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں اور میرے قویٰ بہت ضعیف ہو گئے ہیں، اور اب مجھے اس مال کی ضرورت نہیں ہے، اب یہ مال تمہارا ہے، پھر وہ اس مال کو گھر سے نکال دیتے اور لوگ اپنے کندھوں پر مال اٹھا کر ان کے بیٹوں کے گھروں میں پہنچا دیتے، پھر جب دوسرا سال پورا ہونے کو آتا تو وہ بیٹوں کو کسی کام سے بلاتے اور بیٹے ان سے کہتے، اے ابا جان! ہمیں ابھی آپ کی زندگی کی بہت توقع ہے اور جب تک آپ زندہ ہیں، ہمیں اس مال کی ضرورت نہیں ہے، آپ اور آپ کا مال ہمارے ہی لیے تو ہے سو آپ یہ مال لے لیجئے، پھر وہ لوگ سارا مال اپنے کندھوں پر اٹھا کر شیخ کے گھر لوٹا دیتے اور ملک کی تبدیلی سے شیخ یہ ارادہ کرتا تھا کہ اس سے زکوٰۃ ساقط ہوگئی، اور یہ اقدام امام ابو حنیفہ کی رائے کے موافق ہے کیونکہ متفرق کو مجتمع کرنے اور مجتمع کو متفرق کرنے میں ان کے نزدیک زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی اور یہ بہت عظیم مبحث ہے۔ امام بخاری نے اپنی الجامع الصحیح میں اس پر ایک مبسوط کتاب لکھی

ہے، اس کا نام کتاب الحیل رکھا ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۹ ص ۲۰۶-۲۰۵ مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حیلہ کو جائز کہنے کی وجہ سے امام بخاری کے امام ابو حنیفہ پر اعتراضات

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ نے بھی امام ابو حنیفہ پر اسی طرح کے اعتراض کیے ہیں، ہم اس کی دو تین مثالیں پیش کر رہے ہیں:

حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ایک منتشر بالوں والا اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا: یارسول اللہ! مجھے یہ بتائیے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کتنی نمازیں فرض کی ہیں؟ آپ نے فرمایا: پانچ نمازیں، ان کے سوا تم جو نفل پڑھو، اس نے پوچھا یارسول اللہ! یہ بتائیے کہ مجھ پر کتنے روزے فرض ہیں؟ آپ نے فرمایا: رمضان کے روزے، ماسوا نفلی روزوں کے، اس نے پوچھا یارسول اللہ! مجھ پر کتنی زکوٰۃ فرض ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو اسلام کے شرعی احکام بیان فرمائے۔ اس نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو مکرم بنایا ہے، مجھ پر اللہ نے جو فرض کیا ہے، میں اس میں کوئی چیز زیادہ کروں گا نہ کم کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر اس نے سچ کہا تو یہ کامیاب ہو گیا، یا فرمایا اگر اس نے سچ کہا تو یہ جنت میں داخل ہو گیا اور بعض لوگوں (امام بخاری کی مراد ہے امام ابو حنیفہ) نے یہ کہا ہے کہ ایک سو بیس اونٹوں کی زکوٰۃ میں دو حقہ (تین سال کی دو اونٹنیاں) دی جاتی ہیں، اگر اس نے ان اونٹوں کو جان بوجھ کر ہلاک کر دیا یا کسی کو ہبہ کر دیا یا زکوٰۃ سے بھاگنے کا کوئی حیلہ کیا تو اس پر کوئی تاوان نہیں ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۹۵۶، مطبوعہ دار ارقم بیروت)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت سعد بن عبادہ انصاری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: میری ماں نے نذر مانی تھی اور وہ نذر پوری کرنے سے پہلے فوت ہو گئی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اس کی نذر پوری کر دو اور بعض لوگ (یعنی امام ابو حنیفہ) یہ کہتے ہیں کہ جب کسی شخص کے پاس بیس اونٹ ہوں تو اس کے اوپر چار بکریاں زکوٰۃ ہے۔ پس اگر وہ سال پورا ہونے سے پہلے کسی کو بکریاں بخش دے یا زکوٰۃ سے بچنے کے لیے ان کو فروخت کر دے یا زکوٰۃ ساقط کرنے کے لیے کوئی حیلہ کرے تو اس پر کوئی تاوان نہیں ہے، اسی طرح اگر اس نے ان بکریوں کو ضائع کر دیا اور پھر وہ مر گیا تو اس کے مال سے کوئی تاوان نہیں لیا جائے گا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۹۵۹، مطبوعہ دار ارقم بیروت)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح شغار سے منع فرمایا: عبید اللہ کہتے ہیں، میں نے نافع سے پوچھا: شغار کسے کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا: ایک شخص کسی کی بیٹی سے نکاح کرے اور وہ شخص اس کی بیٹی سے نکاح کرے اور ہر ایک اپنے رشتہ کے عوض دوسرے کو رشتہ دے اور مہر نہ رکھیں، اور بعض لوگوں نے یہ کہا کہ اگر وہ حیلہ کر کے نکاح شغار کریں تو یہ جائز ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۹۶۰، مطبوعہ دار ارقم بیروت)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ کہا گیا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما عورتوں سے متعہ کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے، حضرت علی نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے سے اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا تھا اور بعض لوگوں نے یہ کہا کہ اگر کوئی شخص حیلہ کر کے متعہ کرے تو وہ نکاح فاسد ہے اور بعض نے کہا نکاح جائز ہے اور شرط باطل ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۹۶۱، مطبوعہ دار ارقم بیروت)

حیلہ کے جواز پر علامہ قرطبی کے اعتراضات کے جوابات

فقہاء احناف کے نزدیک حیلہ کی کیا تعریف ہے اور قرآن اور سنت سے اس پر کیا دلائل ہیں اس پر ہم بعد میں گفتگو

کہیں گے پہلے ہم علامہ قرطبی اور امام بخاری کے اعتراضات کے جوابات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ علامہ قرطبی کے اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص بقدر نصاب مال کا مالک ہے اور سال پورا ہونے سے ایک ماہ پہلے اس نے اپنا مال کسی کو فروخت کر دیا یا کسی کو ہبہ کر دیا اور یہ اس نے زکوۃ سے بچنے کے لیے حیلہ کیا تو اس پر امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک زکوۃ واجب نہیں ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ نیت کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، اگر واقعی اس نے یہ عمل زکوۃ سے بچنے کے لیے کیا تو وہ یقیناً سخت گناہ گار ہو گا لیکن اگر اس نے کسی صحیح نیت سے کسی جائز ضرورت کی بناء پر مال فروخت کیا یا ہبہ کیا تو وہ گناہ گار نہیں ہو گا، تاہم شرعی احکام کا نفاذ تو ظاہر پر ہوتا ہے اور جب اس کے پاس بقدر نصاب مال ایک سال تک نہیں رہا، بلکہ گیارہ مہینے رہا ہے تو اس کے اس مال پر زکوۃ واجب نہیں ہو گی اور امام مالک اور دوسرے جن ائمہ نے گیارہ ماہ گزرنے کے بعد اس کے مال پر زکوۃ واجب کر دی ہے، انہوں نے احکام شرعیہ میں ترمیم کی ہے اور یہ فرض کر کے کہ اس نے زکوۃ سے بچنے کے لیے ایسا کیا ہے، اس کی نیت پر اور غیب پر حکم لگایا ہے اور مسلمان کے متعلق بدگمانی کی ہے اور ہم ان تمام امور سے اللہ کی پناہ طلب کرتے ہیں۔

حیلہ کے جواز پر امام بخاری کے اعتراضات کے جوابات

اسی طرح امام بخاری نے کہا ہے کہ ایک سو بیس اونٹوں پر زکوۃ میں دو حقہ ہیں یا بیس اونٹوں پر چار بکریاں ہیں۔ جس نے زکوۃ سے بچنے کے لیے ان میں سال پورا ہونے سے پہلے کمی کر دی تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس پر زکوۃ نہیں ہے، اس کا بھی یہی جواب ہے کہ اس کی نیت کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اگر اس نے واقعی زکوۃ سے بچنے کے لیے ایسا کیا ہے، تو وہ سخت گناہ گار ہو گا لیکن شرعی احکام تو ظاہر حال کے اعتبار سے نافذ ہوتے ہیں، اور اگر سال پورا ہونے سے ایک ماہ پندرہ دن پہلے اس کے پاس بقدر نصاب مال موجود نہیں ہے تو زکوۃ واجب نہیں ہو گی اور اگر امام مالک کی طرح امام بخاری بھی یہ کہتے ہیں کہ جس کے پاس گیارہ ماہ بھی بقدر نصاب مال رہا اس پر بھی زکوۃ واجب ہو گی تو اس کا مطلب ہو گا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی ہوئی مدت میں ترمیم کر دی اور دوسری بھی وہ تمام خرابیاں لازم آئیں گی جن کو ہم نے امام مالک کے قول پر لازم کیا ہے۔

امام بخاری نے جو یہ کہا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر حیلہ سے نکاح شغار کیا جائے تو نکاح جائز ہے اور شرط باطل ہے، یہ انہوں نے صحیح نہیں کہا۔ امام ابو حنیفہ یا کسی بھی حنفی فقیہ نے یہ نہیں کہا کہ حیلہ کے ساتھ نکاح شغار کیا جائے، اگر لوگ آپس میں مہر مقرر کیے بغیر نکاح کریں گے اور اس رشتہ کے تبادلہ کو مہر قرار دیں گے تو ان کا اس رشتہ کے تبادلہ کو مہر قرار دینا باطل ہے، ان کا نکاح ہو جائے گا اور فریقین کو مہر مثل ادا کرنا لازم ہو گا، بہر حال نکاح شغار میں حیلہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اسی طرح امام بخاری نے جو یہ کہا ہے کہ بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ جس نے متعہ کیا تو وہ نکاح فاسد ہے اور بعض نے کہا نکاح جائز ہے اور شرط باطل ہے۔ اس کا بھی حیلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، امام ابو حنیفہ اور صاحبین کے نزدیک متعہ باطل ہے یعنی جو نکاح مدت معینہ کے لیے کیا جائے، نیز متعہ کا بھی حیلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۲۴، ص ۱۱۳-۱۱۲)

ہم نے امام بخاری، امام مالک اور علامہ قرطبی کی زکوۃ سے متعلق عبارات پر جو کلام کیا ہے کہ جس شخص کے پاس سال پورا ہونے کے بعد بقدر نصاب مال موجود نہیں ہے اس پر ظاہر حال کے اعتبار سے زکوۃ واجب نہیں ہو گی، ہم صرف ... سخت ہیں اور اس کے باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، ہم اس پر التوبہ: ۷۳ میں دلائل ذکر کر چکے ہیں اور اختصار ...

بھی دلائل پیش کر رہے ہیں:

دنیاوی احکام ظاہر پر مبنی ہیں اور باطنی معاملات اللہ کے سپرد ہیں

علامہ محمد بن طولون الصالحی المتوفی ۹۵۳ھ لکھتے ہیں:

حدیث میں ہے: مجھے ظاہر کے مطابق حکم دینے کا امر کیا گیا ہے اور باطنی امور اللہ کے سپرد ہیں۔ صحیح مسلم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ میں لوگوں کے دلوں کی تفتیش کروں اور نہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے پیٹ چاک کروں۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۰۶۴، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۳۵۱، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۶۴)

علامہ نووی لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ مجھے ظاہر کے مطابق حکم دینے کا امر کیا گیا ہے اور باطنی امور اللہ کے سپرد ہیں۔ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث ثابت نہیں ہے لیکن اس کے معنی کی تائید میں احادیث ہیں:

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجرہ کے دروازے پر کچھ لوگوں کے جھگڑے کی آواز سنی، آپ باہر تشریف لے گئے اور فرمایا: میں محض ایک بشر ہوں، اور میرے پاس جھگڑے والے آتے ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض دوسروں سے زیادہ چرب زبان ہوں اور میں اس کو سچا گمان کر کے اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ پس (بالفرض) میں اگر کسی کو دوسرے مسلمان کا حق دے دوں تو وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے خواہ وہ اس کو لے یا اس کو ترک کر دے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۴۵۸، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۷۱۱، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۵۸۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۳۳۹)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم تمہارا مواخذہ ان اعمال پر کریں گے جو ہم پر ظاہر ہوں گے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۶۴۱)

امام نسائی نے اپنی سنن میں یہ باب قائم کیا ہے حکم میں ظاہر کا اعتبار ہے، اور امام شافعی نے کتاب الام میں یہ لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی ہے کہ وہ ظاہر کے اعتبار سے فیصلہ کرتے ہیں اور باطنی امور اللہ کے سپرد ہیں اور اس کے بعد امام شافعی نے کتاب الام میں لکھا ہے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باطنی معاملات کا اللہ والی ہے اور اس نے شہادت کی بناء پر تم سے سزا کو ساقط کر دیا۔

امام عبدالبر نے تمہید میں لکھا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ دنیا کے احکام ظاہر پر مبنی ہیں اور باطنی معاملات اللہ کے سپرد ہیں۔ (الشذرة فی الاحادیث المشتہرۃ ج ۱ ص ۱۲۴-۱۲۳، رقم: ۱۶۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۳ھ)

امام محمد بن عبدالرحمن سخاوی متوفی ۹۰۲ھ اور علامہ اسماعیل بن محمد العجلونی المتوفی ۱۱۶۲ھ نے بھی اس حدیث کی اسی طرح تحقیق کی ہے۔ (المقاصد الحسنہ ص ۱۱۰-۱۰۹، رقم: ۱۷۸، کشف الخفاء ومزیل الالباس ج ۱ ص ۱۹۴-۱۹۳، رقم: ۵۸۵)

اب ہم حیلہ کے جواز پر فقہاء احناف کے دلائل پیش کر رہے ہیں۔

حیلہ کے جواز پر قرآن اور سنت سے دلائل

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ — تو یوسف نے اپنے بھائی کی بوری سے پہلے ان کی بوریوں کی

اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِىْ دِيْنِ الْمَلِكِ -الآیہ- (یوسف: ۷۶)

تلاشی لینی شروع کر دی، پھر اس پیالے کو اپنے بھائی کی بوری سے برآمد کرلیا، ہم نے اسی طرح یوسف کو خفیہ تدبیر بتائی تھی، وہ بادشاہ کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو نہیں رکھ سکتے تھے۔

اس کی مکمل تفسیر سابقہ صفحات میں گزر چکی ہے۔

وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ؕ (ص: ۴۴)

اور (اے ایوب!) آپ اپنے ہاتھ میں تنکوں کی ایک جھاڑو لے کر اس سے ماریں اور اپنی قسم نہ توڑیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب کو اپنی قسم سے نکلنے کا حیلہ تعلیم فرمایا ہے، کیونکہ جب شیطان نے ان کی بیوی سے کہا کہ وہ شیطان کے نام پر ایک بکری کا بچہ ذبح کر دیں تو حضرت ایوب علیہ السلام نے قسم کھائی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو سو کوڑے ماریں گے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس قسم سے نکلنے کا یہ حیلہ تعلیم فرمایا کہ وہ اپنی بیوی کو سو تنکوں کی ایک جھاڑو مار دیں۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِى النُّجُوْمِ ۝ فَقَالَ اِنِّىْ سَقِيْمٌ ۝ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ۝ (الصّٰفّٰت: ۹۰-۸۸)

پھر ابراہیم نے ایک نظر ستاروں کو دیکھا ۝ تو کہا میں بے شک بیمار ہونے والا ہوں ۝ تو وہ ان سے پیٹھ پھیر کر چلے گئے۔

حضرت ابراہیم کے پاس بادشاہ نے پیغام بھیجا کہ کل ہماری عید ہے، آپ اس موقع پر حاضر ہوں۔ آپ ان کے پاس نہیں جانا چاہتے تھے۔ اس لیے آپ نے حیلہ کیا اور فرمایا: میں بیمار ہوں حالانکہ آپ بیمار نہ تھے، آپ کا یہ کلام بطور توریہ تھا، آپ کی مراد یہ تھی کہ تمہاری بت پرستی کی وجہ سے میری رُوح بیمار ہے اور انہوں نے یہ سمجھا کہ آپ کا جسم بیمار ہے۔

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ -(الانبیاء: ۶۳-۶۲)

انہوں نے کہا: اے ابراہیم! کیا آپ نے ہمارے بتوں کے ساتھ یہ کارروائی کی ہے ۝ ابراہیم نے کہا: بلکہ اسی نے کیا ہے، ان کا بڑا یہ ہے، سو ان سے پوچھ لو! اگر یہ بولتے ہیں۔

حضرت ابراہیم نے یہاں بھی حیلہ اور توریہ کیا ہے۔ بتوں کو حقیقتاً آپ نے توڑا تھا لیکن آپ نے بظاہر اس کی نسبت اس بڑے بت کی طرف کر دی، کیونکہ ان بتوں کو توڑنے کا سبب یہی بڑا بت تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سارہ کو لے کر اردن کے علاقہ میں گئے، وہاں صادوق یا ضحاک نام کا ایک ظالم بادشاہ حکمران تھا، اس کا یہ معمول تھا کہ جو شخص اپنی بیوی کو لے کر اس کے علاقہ میں حاضر ہوتا وہ شوہر کو قتل کر دیتا اور اس کی بیوی کو چھین لیتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے جان بچانے کا یہ حیلہ کیا کہ حضرت سارہ سے کہا کہ تم کہنا کہ تم میری بہن ہو کیونکہ تم میری ایمانی بہن ہو۔ (فتح الباری جلد ۶، ص ۳۹۳، طبع لاہور، عمدۃ القاری جز ۱۲، ص ۳۱، مطبوعہ مصر)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سارہ کے ساتھ ہجرت کی اور ان کے ساتھ ایک شہر میں داخل ہوئے، جس میں ایک ظالم بادشاہ حکمران تھا، اس کو بتایا گیا کہ (حضرت) ابراہیم ایک عورت کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے اور وہ عورت دنیا کی سب سے حسین عورت ہے۔ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے معلوم کرایا کہ اے ابراہیم! تمہارے ساتھ جو عورت ہے وہ تمہاری کون ہے؟ حضرت ابراہیم نے فرمایا: وہ میری بہن ہے، پھر سارہ سے کہا: میری بات کو جھٹلانا مت، میں نے ان کو یہ بتایا ہے کہ تم میری بہن ہو اور اللہ کی قسم! اس وقت روئے زمین پر میرے اور تمہارے سوا کوئی مومن نہیں ہے۔ (یعنی تم میری ایمانی بہن ہو) قرآن مجید میں ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ۔ (الحجرات: ۱۰) تمام مومن بھائی ہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۲۱۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۷۱، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۱۶۶، مسند احمد رقم الحدیث: ۹۲۳۰، عالم الکتب)

حیلہ کی تعریف اور اس کے جواز پر علامہ سرخسی کے دلائل

شمس الائمہ سرخسی متوفی ۴۸۳ھ لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا میں نے یہ قسم کھائی ہے کہ میں اپنے بھائی سے بات نہیں کروں گا، اگر میں نے اس سے بات کی تو میری بیوی کو تین طلاقیں۔ آپ نے فرمایا: تم اپنی بیوی کو ایک طلاق دے دو، اور جب اس کی عدت گزر جائے تو اپنے بھائی سے بات کر لو، پھر اس عورت سے نکاح کر لو، اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حیلہ کی تعلیم دی ہے، اور حیلہ کے جواز میں بکثرت احادیث اور آثار ہیں، اور جو آدمی احکام شرع میں غور کرے گا تو وہ بہت معاملات کو اس طرح پائے گا۔

اگر کوئی شخص کسی عورت سے محبت کرتا ہو اور وہ پوچھے کہ اس سے وصال کا کیا حیلہ ہے؟ تو کہا جائے گا تم اس سے نکاح کر لو، اور اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے تنگ ہو اور وہ یہ سوال کرے کہ اس سے چھٹکارے کی کیا صورت ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ تم اس کو طلاق دے دو، اور اگر طلاق دینے کے بعد وہ نادم ہو اور سوال کرے کہ اب دوبارہ اس سے وصال کا کیا حیلہ ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ تم اس سے رجوع کر لو، اور اگر وہ تین طلاقیں دے چکا ہو اور پھر اس سے وصال چاہتا ہو تو اس کا حیلہ یہ ہے کہ وہ عورت عدت کے بعد کسی اور شخص سے نکاح کرے اور وہ مباشرت کے بعد اس کو طلاق دے دے، پھر اس کی عدت گزرنے کے بعد وہ اس سے دوبارہ نکاح کر لے، سو جو شخص احکام شرعیہ میں حیلہ کو مکروہ سمجھتا ہے وہ درحقیقت احکام شرعیہ کو ہی مکروہ سمجھتا ہے اور حیلہ کو مکروہ سمجھنے کی وجہ صرف غور و فکر کی کمی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس حیلہ کی وجہ سے انسان کسی حرام کام سے بچ جائے یا جس حیلہ کی وجہ سے انسان کسی حلال چیز کو حاصل کر لے وہ حیلہ مستحسن ہے، اور مکروہ تحریمی حیلہ یہ ہے کہ جس حیلہ کی وجہ سے انسان کسی حق کو باطل کرے، یا کسی باطل چیز کو حیلہ سے ملمع کر کے اس کو حق ظاہر کرے، سو جو حیلہ اس طرح کا ہو، وہ مکروہ (تحریمی) ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (المائدہ: ۲) اور تم نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہو اور گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

پس ہم نے حیلہ کی جو پہلی قسم بیان کی ہے، اس میں نیکی اور تقویٰ پر معاونت ہے اور جو دوسری قسم بیان کی ہے، اس میں گناہ اور ظلم پر معاونت ہے۔ (المبسوط ج ۳۰، ص ۲۱۰-۲۰۹، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت)

حیلہ کے جواز میں معترضین کے منشاء غلطی کا ازالہ

شمس الائمہ سرخسی کی ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ فقہاء احناف کے نزدیک وہ حیلہ مستحسن ہے جو نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں کے حصول کے لیے ہو جس میں کسی حرام کام سے بچنا اور کسی حلال چیز کو حاصل کرنا مقصود ہو اور جس حیلہ سے کسی حق کو باطل کیا جائے یا کسی حرام چیز کو حاصل کیا جائے، جس میں ظلم اور گناہ پر معاونت ہو وہ حیلہ ناجائز اور حرام ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص زکوٰۃ یا کسی اور فرض یا اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق میں کسی حق کو ساقط کرنے کا حیلہ کرتا ہے تو وہ ناجائز اور حرام ہے، لہٰذا ایسی مثالوں سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پر طعن کرنا علم اور دیانت سے بہت دور کی بات ہے۔ اگر کوئی

شخص سال پورا ہونے سے مثلاً ایک ماہ پہلے اپنا بقدر نصاب مال زکوٰۃ سے بچنے کے لیے کسی کو ہبہ کر دیتا ہے، تو سال کے بعد بقدر نصاب مال نہ ہونے کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی، لیکن اللہ کے فرض کو ساقط کرنے کے لیے جو اس نے حیلہ کیا ہے، اس کی وجہ سے وہ عذاب کا مستحق ہوگا اور دنیا میں بھی اللہ کا حق کھا کر وہ فیض یاب نہیں ہوگا اور جلد یا بدیر اسے کسی بھاری مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ مکافات عمل ہے اور اس سے بہت کم کوئی بچ سکا ہے۔ جن حضرات نے امام ابوحنیفہ پر متعصبانہ اعتراضات کیے ہیں، کاش وہ جلد بازی نہ کرتے اور ان تمام امور پر غور کر لیتے۔

وفوق كل ذي علم عليم کے ترجمہ میں مصنف کی تحقیق

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وفوق كل ذي علم عليم۔ (یوسف: ۷۶) ہم نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے "اور ہر (متناہی) علم والے سے بڑھ کر ایک عظیم علم والا ہے۔" اور متناہی کی قید اس لیے لگائی ہے تاکہ کوئی شخص یہ اعتراض نہ کرے کہ اگر ہر علم والے سے بڑھ کر کوئی علم والا ہے تو پھر اللہ سے بڑھ کر بھی کوئی علم والا ہونا چاہیے!

تحقیق مقام کے لیے ہم اس آیت کے چند مزید تراجم پیش کر رہے ہیں:

شیخ محمود حسن دیوبندی متوفی ۱۳۳۹ھ اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

اور ہر جاننے والے سے اوپر ہے ایک جاننے والا۔

شیخ امین احسن اصلاحی اس کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

اور ہر علم والے سے بالاتر ایک علم والا ہے۔ (تدبر قرآن ج ۴، ص ۲۳۳)

شیخ اشرف علی تھانوی متوفی ۱۳۶۴ھ لکھتے ہیں:

اور تمام علم والوں سے بڑھ کر ایک بڑا علم والا ہے۔ (بیان القرآن ج ۱، ص ۳۹۰)

شیخ تھانوی نے لفظ کل کو کل مجموعی پر محمول کیا ہے اور اس پر بھی یہ اعتراض ہوگا کہ تمام علم والوں میں اللہ تعالیٰ بھی شامل ہے سو اس ترجمہ کے لحاظ سے اس سے بھی بڑا کوئی علم والا ہونا چاہیے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ اس کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

اور ایک علم رکھنے والا ایسا ہے جو ہر صاحب علم سے بالاتر ہے۔

اس پر بھی یہ اعتراض ہوگا کہ ہر صاحب علم میں اللہ تعالیٰ بھی داخل ہے اور مودودی صاحب نے ایسی کوئی قید نہیں لگائی جس سے اللہ تعالیٰ ہر صاحب علم کے عموم سے خارج ہو سکے، اور اس بناء پر یہ لازم آئے گا کہ اللہ عزوجل سے بھی کوئی بالاتر علم والا ہو۔ (العیاذ باللہ)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

اور ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہے۔ (کنز الایمان ص ۳۹۱)

حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی متوفی ۱۴۰۶ھ اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

اور ہر علم والے سے اوپر (ایک) سب سے زیادہ علم والا ہے۔ (البیان ص ۳۶۷)

حضرت علامہ پیر محمد کرم شاہ الازہری متوفی ۱۴۱۸ھ اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

اور ہر صاحب علم سے برتر دوسرا صاحب علم ہوتا ہے۔ (جمال القرآن ص ۴۰۱)

یہ اس دور کے مشہور تراجم ہیں لیکن تمام تراجم میں ذی علم کو مطلق رکھا ہے اور ایسی کوئی قید نہیں لگائی جس سے ک

ذی علم کے عموم سے اللہ تعالیٰ خارج ہو جاتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ بھی ذی علم ہے، اگر یوں ترجمہ کیا جاتا کہ ہر (متناہی) علم والے کے اوپر ایک عظیم علم والا ہے، یا ہر (حادث) علم والے کے اوپر، یا ہر (فانی) علم والے کے اوپر یا ہر (ممکن) علم والے کے اوپر ایک عظیم علم والا ہے تو یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا، یہ تمام مترجمین اہلِ علم تھے لیکن اس اعتراض کو دور کرنے کی طرف ان کی توجہ منعطف نہیں ہوئی۔

مفسرین نے اس اعتراض کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، امام فخرالدین رازی متوفی ۶۰۶ھ اور علامہ حسن بن محمود نیشاپوری متوفی ۷۲۸ھ نے لکھا ہے: ہر ذی علم کے اوپر ایک عالم ہے اور اللہ تعالیٰ بھی ذی علم ہے، پس لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کے اوپر بھی ایک عالم ہو، اس کا جواب یہ ہے کہ اس قاعدہ کے عموم سے اللہ تعالیٰ خارج ہے اور یہ عام مخصوص عنہ البعض ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۶، ص ۴۸۹، غرائب القرآن ورغائب الفرقان ج ۴، ص ۱۱۱)

قاضی عبداللہ بن عمر البیضاوی المتوفی ۶۸۵ھ نے اس جواب کے علاوہ دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ ذی علم سے مراد مخلوق ہے۔ یعنی مخلوق میں ہر ذی علم کے اوپر ایک عالم ہے، اور اب ہر ذی علم کے عموم میں اللہ تعالیٰ داخل نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ خالق ہے، مخلوق نہیں ہے۔ علامہ کازرونی متوفی ۸۶۰ھ، علامہ محمد بن مصلح الدین القوجوی الحنفی المتوفی ۹۵۱ھ، علامہ شہاب الدین خفاجی حنفی متوفی ۱۰۶۹ھ نے ان دونوں جوابوں کو برقرار رکھا ہے اور ان کی مزید وضاحت کی ہے۔

(انوار التنزیل مع الکازرونی ج ۳، ص ۳۰۲-۳۰۱، حاشیۃ الکازرونی ج ۳، ص ۳۰۲، حاشیۃ الخفاجی ج ۵، ص ۳۴۱، حاشیۃ محی الدین شیخ زادہ ج ۵، ص ۶۲)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

ہر ذی علم کے اوپر ایک عالم ہے۔ اس سے لازم آئے گا کہ اللہ عزوجل کے اوپر بھی ایک عالم ہو، اور یہ ظاہر البطلان ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مخلوقات میں سے ہر ذی علم کے اوپر ایک عالم ہے، کیونکہ یہاں گفتگو مخلوق میں ہو رہی ہے، اور دوسرا قرینہ یہ ہے کہ علیم مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے جو ہر ذی علم سے زیادہ جاننے والا ہے۔ پس متعین ہوگیا کہ علیم سے مراد اللہ تعالیٰ ہے تو اب اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں جو ذی علم ذکر کیا گیا ہے وہ ذی علم لازماً مخلوقات میں سے ہوگا، اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ عام مخصوص البعض ہے۔ (روح المعانی جز ۱۳، ص ۴۵-۴۴، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انہوں نے کہا اگر اس نے چوری کی ہے تو (کوئی نئی بات نہیں) اس سے پہلے اس کا بھائی بھی چوری کرچکا ہے۔ سو یوسف نے اس بات کو دل میں چھپایا اور ان پر ظاہر نہیں کیا۔ اس نے (دل میں) کہا تم خود بدتر خصلت کے ہو، اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو، اسے اللہ خوب جانتا ہے○ (یوسف: ۷۷)

حضرت یوسف کی طرف منسوب کی گئی چوری کے متعلق روایات

جب تلاشی کے بعد شاہی پیالہ بن یامین کی بوری سے نکل آیا تو حضرت یوسف کے تمام بھائیوں کے سر جھک گئے اور انہوں نے آپس میں کہا یہ عجیب بات ہے کہ راحیل نے دو بیٹوں کو جنم دیا اور دونوں چور نکلے، پھر انہوں نے بن یامین سے کہا: اے راحیل کے بیٹے! تمہاری وجہ سے ہم پر کتنے مصائب ٹوٹ پڑے ہیں، بن یامین نے کہا: تمہاری وجہ سے ہم پر کتنے مصائب آ چکے ہیں! تم میرے بھائی کو لے گئے اور تم نے اس کو جنگل میں ضائع کر دیا، اس کے باوجود تم مجھ سے ایسی باتیں کرتے ہو، انہوں نے کہا: شاہی پیالہ تمہاری بوری سے کیسے نکل آیا؟ بن یامین نے کہا: جس نے تمہاری رقم کی تھیلی تمہاری بوریوں میں رکھی تھی، اسی نے میری بوری میں شاہی پیالہ کو رکھا ہے۔

بظاہر اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ انہوں نے بادشاہ سے کہا بن یامین کا چوری کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس کا بھائی جو ہلاک ہو چکا ہے وہ بھی پہلے چوری کر چکا ہے، اور اس کلام سے ان کی غرض یہ تھی کہ چوری کرنا ہمارا شیوہ نہیں ہے، یہ اور اس کا بھائی ہی اس برائی میں ملوث تھے۔

بھائیوں نے حضرت یوسف کی طرف جو چوری منسوب کی تھی اس سلسلہ میں حسب ذیل اقوال ہیں:

(۱) سعید بن جبیر نے کہا: حضرت یوسف کا نانا کافر تھا اور وہ بتوں کی عبادت کرتا تھا۔ بچپن میں حضرت یوسف سے ان کی ماں نے کہا کہ وہ ان بتوں کو چرا کر توڑ دیں، اسی چوری کی طرف ان کے بھائیوں نے نسبت کی تھی۔ وہب بن منبہ اور قتادہ نے بھی اس کو بیان کیا ہے۔

(۲) بچپن میں ان کے گھر کوئی سائل آیا تو حضرت یوسف نے گھر سے کوئی چیز اٹھا کر سائل کو دی تھی، مجاہد نے کہا وہ انڈا تھا، کعب نے کہا وہ بکری تھی، سفیان بن عیینہ نے کہا وہ مرغی تھی۔

(۳) عطاء نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا کہ بھوک کے ایام میں حضرت یوسف اپنے بچپن میں باپ کے دسترخوان سے کچھ چیزیں اٹھا کر مانگنے والوں کو دے دیتے تھے۔

(۴) ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پھوپھی حضرت اسحٰق کی اولاد میں سب سے بڑی تھیں۔ حضرت یوسف نے ان کی گود میں پرورش پائی اور وہ آپ سے محبت کرتی تھیں۔ جب وہ بڑے ہو گئے تو حضرت یعقوب نے ان کو اپنی بہن سے طلب کیا، انہوں نے کہا میں اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ حضرت یعقوب نے کہا: بخدا میں اس کو اب نہیں چھوڑ سکتا، پھر ان کی پھوپھی نے حضرت اسحٰق کا متبرک پٹکا (کمر پر باندھنے کی پٹی) حضرت یوسف کے کپڑوں کے نیچے باندھ دیا، پھر کہا حضرت اسحٰق کا منطقہ گم ہو گیا، تلاش کرو اس کو کس نے لیا ہے، پھر وہ پٹکا حضرت یوسف کے پاس سے برآمد ہوا، پھر انہوں نے حضرت یعقوب کو اس واقعہ کی خبر دی اور کہا اللہ کی قسم! اب یوسف میری ملکیت ہے، اب میں جو چاہوں اس کے ساتھ کروں! حضرت یعقوب نے کہا ٹھیک ہے، پھر جب تک حضرت یوسف علیہ السلام کی پھوپھی زندہ رہیں حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے پاس رکھنے پر قادر نہ ہو سکے۔ سو یہ ہے وہ چیز جس کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی ان کی طرف چوری کی نسبت کرتے تھے۔

(جامع البیان جز ۱۳، ص ۳۹-۳۸، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۷ ص ۲۱۷۸-۲۱۷۷، معالم التنزیل ج ۲، ص ۳۰۷، زاد المسیر ج ۴ ص ۲۶۳، تفسیر کبیر ج ۵ ص ۴۹۰، الجامع لاحکام القرآن جز ۹، ص ۲۰۸)

واضح رہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف ان کے بھائیوں نے چوری کی جو نسبت کی تھی، اس کے متعلق جتنی بھی روایات ذکر کی گئی ہیں ان میں سے کسی پر بھی چوری کی تعریف صادق نہیں آتی، یہ سب ان کے بھائیوں کا ان کی طرف کذب اور بہتان تھا، ان کے زعم میں حضرت یوسف وفات پا چکے تھے اور وہ فوت شدہ شخص کا بھی برائی کے ساتھ ذکر کرنے سے باز نہیں آئے اور یہ اس پر واضح دلیل ہے کہ حضرت یوسف کے بھائی نبی نہ تھے، کیونکہ نبی اعلان نبوت سے پہلے اور بعد صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے معصوم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انہوں نے کہا: اے عزیز! اس کا باپ بہت بوڑھا ہے، آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیں، ہماری رائے میں آپ بہت نیک لوگوں میں سے ہیں○ یوسف نے کہا اللہ کی پناہ! ہم نے جس کی بوری میں اپنا سامان پایا ہے، اس کے علاوہ ہم کسی اور کو رکھ لیں، پھر تو ہم ظالم قرار پائیں گے○ (یوسف: ۷۹-۷۸)

بھائیوں کا حضرت یوسف سے فدیہ لینے کی درخواست کرنا

پہلے تو حضرت یوسف کے بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف چوری کی نسبت کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالی، پھر اس کے بعد نرمی اور عاجزی کا طریقہ اختیار کیا، وہ یہ اعتراف کر چکے تھے کہ جس شخص کے پاس چوری کا مال برآمد ہو اس کو غلام بنا کر رکھ لیا جاتا ہے۔ اب انہوں نے یہ کہا کہ ہرچند کہ چور کی سزا یہی ہے لیکن اس کو معاف کرنا بھی جائز ہے یا پھر فدیہ دے کر اس کو چھڑا لینا بھی جائز ہے۔ آپ اس کے بدلہ میں ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے۔ انہوں نے کہا: ہمارا باپ شیخ کبیر ہے، شیخ کبیر کا معنی یا تو بہت بوڑھا ہے یا اس کا معنی ہے وہ بہت قدر و منزلت والا اور بہت دین دار ہے۔

انہوں نے کہا: ہماری رائے میں آپ بہت نیک لوگوں میں سے ہیں، انہوں نے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق کہا تھا کہ آپ بہت نیک لوگوں میں سے ہیں۔ اس کی متعدد وجوہات ہیں:

(۱) اگر آپ نے ہماری درخواست منظور کر لی تو پھر آپ بہت نیکی کمائیں گے۔

(۲) آپ نے چونکہ ہمارا بہت اعزاز و اکرام کیا ہے اور ہمارے لیے بہت مال خرچ کیا ہے، ہمیں بہت وافر مقدار میں گندم دیا ہے اور ہماری دی ہوئی قیمت بھی ہمیں واپس کر دی، یہ اس کی دلیل ہے کہ آپ بہت نیک لوگوں میں سے ہیں۔

(۳) منقول ہے کہ جب مصر اور اس کے مضافات میں بہت بڑا قحط پڑا اور لوگوں نے غلہ خریدنے کے لیے آخر کار اپنے آپ کو بھی حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ فروخت کر دیا تو پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سب کو آزاد کر دیا اور ان کی املاک بھی ان کو لوٹا دیں، یہ واقعہ بہت مشہور ہو چکا تھا اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا: آپ بہت نیک لوگوں میں سے ہیں، ان کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے بہت لوگوں کے ساتھ نیکی کی ہے تو ہم پر بھی احسان فرمائیں اور بن یامین کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: معاذ اللہ! اگر ہم نے کسی شخص کو بغیر جرم کے اپنے پاس رکھ لیا تو ہم ظالم قرار پائیں گے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ پورا واقعہ، خلاف واقع امور پر مبنی ہے، بن یامین پر چوری کا الزام لگنا اور اس کے فراق کی وجہ سے حضرت یعقوب کو مزید رنج اور غم میں مبتلا کرنا حضرت یوسف علیہ السلام کے منصب نبوت کے کیسے لائق ہے تو اس کا جواب ہم تفصیل سے یوسف: ۷۲ کی تفسیر میں ذکر کر چکے ہیں۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا

جب یوسف کے بھائی اس سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے تنہائی میں سرگوشی کی ان کے بڑے بھائی نے کہا کیا تم کو علم نہیں ہے

اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ

کہ تمہارے باپ نے اللہ کی قسم لے کر تم سے پکا عہد لیا تھا، اور اس سے پہلے تم یوسف کے معاملہ

مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ

میں تقصیر کر چکے ہو، میں اس ملک سے ہرگز نہیں جاؤں گا حتیٰ کہ میرا باپ مجھے اجازت

لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى

دے یا اللہ میرے لیے کوئی فیصلہ فرمائے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے ۝ اپنے باپ کی طرف واپس

اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا

جاؤ اور کہو اے ہمارے باپ! بے شک آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے، اور ہم صرف اسی بات کی گواہی دے سکتے ہیں جو ہمارے

وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ

علم میں ہو اور ہم غیب کے نگہبان نہ تھے ۝ اور آپ اس بستی (والوں) سے پوچھ لیجئے جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے

الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ

پوچھ لیجئے جس کے ساتھ ہم آئے ہیں اور بے شک ہم ضرور سچے ہیں ۝ یعقوب نے کہا بلکہ تمہارے دلوں نے ایک بات

اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ

گھڑ لی ہے تو اب صبر جمیل ہی مناسب ہے، عنقریب اللہ ان سب کو میرے پاس لے

جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ

آئے گا، بے شک وہ خوب جاننے والا بہت حکمت والا ہے ۝ اور ان سے پشت پھیر لی اور کہا

يٰٓاَسَفٰى عَلٰي يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ

ہائے افسوس یوسف (کی جدائی) پر، اور غم سے ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں اور وہ غم

كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا

برداشت کرنے والے تھے ۝ بیٹوں نے کہا آپ یوسف کو (ہی) یاد کرتے رہیں گے حتیٰ کہ آپ سخت بیمار پڑ جائیں گے

اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ

یا ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جائیں گے ۝ یعقوب نے کہا میں اپنی پریشانی اور غم کی شکایت صرف اللہ سے کرتا ہوں اور مجھے

مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ

اللہ کی طرف سے ان باتوں کا علم ہے جن کا تم کو علم نہیں ہے ۝ اے میرے بیٹو! جاؤ یوسف اور اس کے بھائی

يُوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ

کو تلاش کرو، اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ کی

مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٧﴾ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ

رحمت سے تو کافر ہی مایوس ہوتے ہیں ○ سو جب وہ یوسف کے پاس پہنچے

قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ

تو انہوں نے کہا اے عزیز! ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو تکلیف پہنچی ہے اور ہم آپ کے پاس حقیر

مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى

پونجی لے کر آئے ہیں، آپ ہمیں پورا غلہ ناپ کر دے دیں، اور ہم پر صدقہ کریں بے شک اللہ صدقہ کرنے والوں کو

الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿٨٨﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ

جزا دیتا ہے ○ یوسف نے کہا کیا تم کو یاد ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا

اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿٨٩﴾ قَالُوْۤا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا

جب تم جہالت میں تھے ○ انہوں نے کہا کیا واقعی آپ ہی یوسف ہیں؟ یوسف نے کہا میں ہی

يُوْسُفُ وَهٰذَاۤ اَخِيْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ

یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، بے شک اللہ نے ہم پر احسان فرمایا، بے شک جو اللہ سے ڈرتا ہے اور

يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٠﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ

صبر کرتا ہے تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں فرماتا ○ انہوں نے کہا بے شک اللہ نے آپ کو

اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٔيْنَ ﴿٩١﴾ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ

ہم پر فضیلت دی اور بلا شبہ ہم خطا کار تھے ○ یوسف نے کہا آج کے دن تم پر

عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ؗ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿٩٢﴾ اِذْهَبُوْا

کوئی ملامت نہیں ہے، اللہ تمہاری مغفرت فرمائے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے ○ میری

بِقَمِيصِي هٰذَا فَأَلْقُوهُ عَلٰى وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا ۚ

اس قمیص کو لے کر جاؤ اور اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو تو ان کی آنکھیں دیکھنے لگیں گی

وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٩٣﴾ ع

اور اپنے سب گھر والوں کو میرے پاس لے آؤ ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جب یوسف کے بھائی اس سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے تنہائی میں سرگوشی کی، ان کے بڑے بھائی نے کہا: کیا تم کو علم نہیں ہے کہ تمہارے باپ نے اللہ کی قسم لے کر تم سے پکا عہد لیا تھا؟ اور اس سے پہلے تم یوسف کے معاملہ میں تقصیر کر چکے ہو، میں اس ملک سے ہرگز نہیں جاؤں گا، حتیٰ کہ میرا باپ مجھے اجازت دے، یا اللہ میرے لیے کوئی فیصلہ فرمائے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے○ (یوسف: ۸۰)

بڑے بھائی کا واپس جانے سے انکار کرنا

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی منت سماجت کی کہ وہ بن یامین کو چھوڑ دیں اور ان کی جگہ ان میں سے کسی کو رکھ لیں، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے منظور نہیں کیا، جب وہ ناامید ہو گئے تو آپس میں بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے، کہ اب اس مشکل صورت حال کا کس طرح سامنا کیا جائے اور اس پیچیدہ الجھن کا کیا حل تلاش کیا جائے، کیونکہ ان کے باپ نے بن یامین کو ان کے حوالے کرنے سے پہلے ان سے پکی قسمیں لی تھیں کہ وہ بن یامین کی حفاظت کریں گے، سوا اس کے کہ وہ سب کسی مصیبت میں گھر جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان کے بڑے نے کہا، اس میں اختلاف ہے کہ بڑے سے مراد عقل اور دانش مندی میں بڑا مراد ہے یا عمر میں بڑا مراد ہے۔ متعدد اسانید کے ساتھ مجاہد سے مروی ہے کہ زیادہ عقل مند شمعون تھا اور عمر میں بڑا روبیل تھا، قتادہ نے کہا یہاں روبیل ہی مراد ہے جو عمر میں بڑا تھا اور جب بھائی حضرت یوسف کو قتل کرنے لگے تھے تو اسی نے ان کو قتل کرنے سے منع کیا تھا۔ (جامع البیان جز ۱۳ ص ۳۶-۳۵، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۷ ص ۲۱۸۱، زاد المسیر ج ۴ ص ۲۶۶)

روبیل نے کہا: اگر ہم بن یامین کے بغیر اپنے باپ کے پاس واپس گئے تو یہ بڑے شرم کی بات ہے، ہم لوگ پہلے بھی یوسف کے معاملہ میں خیانت کر چکے ہیں اور ہمارے اس اقدام سے ہمارا باپ بہت رنج اور غم میں مبتلا ہو گا، اور جب ہم بن یامین کے بغیر باپ کے پاس جائیں گے تو وہ یہی سمجھے گا کہ جس طرح ہم نے پہلے یوسف کے معاملہ میں خیانت کی تھی اسی طرح اب بنیامین کے معاملہ میں بھی خیانت کی ہے، نیز وہ یہ بھی سمجھے گا کہ ہم نے جو پکی قسمیں کھا کر باپ سے ان کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا، ہم نے ان قسموں اور ان وعدوں کو پورا نہیں کیا، اندریں حالات میں اس وقت تک اس ملک سے نہیں جاؤں گا جب تک میرا باپ مجھے واپس نہ بلائے یا اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے کوئی ایسا سبب بن جائے کہ ہمارا بھائی ہمیں واپس مل جائے اور میں اس کو لے کر باپ کے پاس جاؤں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اس نے کہا) اپنے باپ کی طرف واپس جاؤ اور کہو اے ہمارے باپ! بے شک آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے، اور ہم صرف اسی بات کی گواہی دے سکتے ہیں جو ہمارے علم میں ہو اور ہم غیب کے نگہبان نہ تھے○ اور آپ اس بستی (والوں) سے پوچھ لیجئے جس میں ہم تھے اور اس قافلہ سے پوچھ لیجئے جس کے ساتھ ہم آئے ہیں اور بے شک ہم

ضرور سچے ہیں○ (یوسف: ۸۲-۸۱)

بھائیوں کا حضرت یعقوب کے پاس واپس جانے کا فیصلہ

جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اس معاملہ میں غور و فکر کیا تو انہوں نے یہ طے کیا کہ وہ واپس جائیں اور جس طرح واقعہ پیش آیا ہے بلا کم و کاست اسی طرح اپنے باپ کے سامنے بیان کر دیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے بغیر خود دیکھے یا بغیر کسی گواہی کے کیسے یہ شہادت دی کہ بن یامین نے چوری کی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے یہ دیکھا کہ پیالہ اسی جگہ بوری میں رکھا تھا جس جگہ ان کے سوا اور کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا، ہر چند کہ یہ عینی شہادت تو نہیں تھی لیکن یہ واقعاتی شہادت ہے اور واقعاتی شہادت پر حسب ذیل دلائل ہیں:

واقعاتی شہادت کے حجت ہونے پر قرآن و سنت اور عقل صریح سے دلائل

وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۖ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ۔ (یوسف: ۲۸-۲۶)

اور اس عورت کے رشتہ داروں میں سے ایک شخص نے گواہی دی، اگر اس کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو عورت سچی ہے اور وہ جھوٹوں میں سے ہے○ اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو عورت جھوٹی ہے اور وہ سچوں میں سے ہے○ پھر جب اس نے اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی دیکھی تو اس نے کہا بے شک یہ تم عورتوں کی سازش ہے اور بے شک تمہاری سازش بہت سنگین ہوتی ہے۔

اس واقعہ میں جس شہادت کا ذکر ہے، یہ بھی عینی شہادت نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس شہادت کا انکار نہیں کیا اور نہ اس شہادت کی مذمت کی بلکہ اس شہادت کی حکایت کر کے اس کو مقرر اور ثابت رکھا، اس سے معلوم ہوا کہ واقعاتی شہادت بھی حجت ہوتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو عورتوں کے پاس اپنے اپنے بیٹے تھے، اچانک ایک بھیڑیا آیا اور ان میں سے ایک کے بیٹے کو کھا گیا، ایک عورت نے دوسری عورت سے کہا کہ تیرے بیٹے کو بھیڑیے نے کھایا ہے اور دوسری نے کہا تیرے بیٹے کو کھایا ہے۔ ان دونوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس مقدمہ پیش کیا، حضرت داؤد علیہ السلام نے بڑی عورت کے حق میں فیصلہ کر دیا، پھر وہ دونوں حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے پاس گئیں اور ان کو واقعہ سنایا، انہوں نے کہا چھری لاؤ میں اس بچے کے دو ٹکڑے کر کے دونوں کو ایک ایک ٹکڑا دیتا ہوں، تو چھوٹی عورت کہنے لگی نہ نہ، اللہ آپ پر رحم کرے، یہ اسی کا بیٹا ہے، تب حضرت سلیمان علیہ السلام نے چھوٹی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔

(صحیح مسلم کتاب الاقضیۃ رقم الحدیث: ۲۰، رقم بلا تکرار: ۱۷۲۰، الرقم المسلسل: ۴۴۱۵)

بڑی عورت نے حضرت سلیمان سے کہہ دیا تھا: ٹھیک ہے آپ اس کے دو ٹکڑے کر دیں، لیکن چھوٹی نے فوراً کہا: نہ نہ آپ اسی کو دے دیں۔ اس واقعاتی شہادت سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے جان لیا کہ بچہ اسی کا ہے۔ تب ہی یہ اس کے دو ٹکڑے کرنے پر راضی نہیں ہوئی اور بڑی کا بچہ نہیں ہے کیونکہ وہ تو اس کے دو ٹکڑے کرنے پر راضی تھی، اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ واقعاتی شہادت حجت ہے۔

حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت زبیر سے ایک انصاری نے جھگڑا کیا، پتھریلی زمین سے

پانی کی نالی حضرت زبیر کے باغوں میں آ رہی تھی۔ انصاری نے کہا: اس پانی کو میرے لیے چھوڑ دو، حضرت زبیر نے انکار کیا، پھر وہ دونوں یہ مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے زبیر پہلے تم پانی سے اپنے باغ کو سیراب کرو پھر یہ پانی اپنے پڑوسی کے لیے چھوڑ دو۔ انصاری اس فیصلہ سے غضب ناک ہوا اور اس نے کہا: آپ نے یہ فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ یہ آپ کا پھوپھی زاد ہے! یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہو گیا اور آپ نے فرمایا: اے زبیر! تم پانی دینے کے بعد پانی روک لو، حتیٰ کہ دیواروں کی طرف لوٹ جائے۔ حضرت زبیر نے کہا: میرا گمان ہے کہ یہ آیت اس موقع پر نازل ہوئی ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ۔ (النساء: ۶۵)

آپ کے رب کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہوں گے جب تک کہ اپنے آپس کے جھگڑوں میں آپ کو حاکم تسلیم نہ کریں۔

(الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۲۷، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۳۶۱۷، مسند البزار رقم الحدیث: ۵۹۸، المستدرک ج ۲، ص ۳۰۷)

چونکہ اس پتھریلی زمین میں پانی کی نالی سے پہلے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے باغ میں پانی آتا تھا اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے اس باغ کو حضرت زبیر پانی دیں گے اور پھر وہ انصاری پانی دے گا اور یہ واقعاتی شہادت کی بناء پر فیصلہ ہے۔

اسی طرح قسامت کا فیصلہ بھی واقعاتی شہادت پر مبنی ہے۔

سعید بن مسیب بیان کرتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں قسامت کا رواج تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رواج کو برقرار رکھا۔ انصار کا ایک شخص یہود کے قلعہ میں مقتول پایا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے ابتدا کی اور ان پر پچاس قسمیں لازم کیں، یہود نے کہا ہم ہرگز قسم نہیں کھائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے کہا: کیا تم قسم کھاؤ گے، انہوں نے قسم کھانے سے انکار کیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود پر دیت لازم کر دی، کیونکہ مقتول بہرحال ان کے علاقہ میں پایا گیا تھا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۹، ص ۳۷۶، سنن ابو داؤد ج ۲، ص ۲۶۶)

شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی متوفی ۴۸۳ھ لکھتے ہیں:

جب کوئی شخص کسی محلہ میں مقتول پایا جائے تو اس محلہ والوں پر لازم ہے کہ ان کے پچاس آدمی یہ قسم کھائیں کہ خدا کی قسم نہ ہم نے اس شخص کو قتل کیا ہے نہ ہم اس کے قاتل کو جانتے ہیں، اس قسم کے بعد وہ دیت ادا کریں گے۔

(المبسوط ج ۲۶، ص ۱۰۶، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ۱۳۹۸ھ)

قسامت میں اہل محلہ پر جو قسم اور اس کے بعد جو دیت لازم کی جاتی ہے، یہ بھی واقعاتی شہادت پر مبنی ہے۔

واقعاتی شہادت پر عقلی دلیل یہ ہے کہ ایک شخص کا تازہ تازہ گلا کٹا ہوا ہے اور اس کے پاس ہی ایک شخص خون سے بھرا ہوا چھرا لیے کھڑا ہے اور اس کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے ہیں تو یہ اس کا ثبوت ہے کہ یہی شخص قاتل ہے اور اگر بعد میں لیبارٹری ٹیسٹ سے ثابت ہو جائے کہ چھرے پر لگا ہوا خون اور مقتول کا خون ایک ہی ہے تو پھر اس کے قاتل ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہے گا، اور یہ واقعاتی شہادت ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص گولی لگنے سے مر گیا اور اس کے پاس ایک شخص پکڑا گیا جس کے ہاتھ میں پستول تھا اور بعد میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ثابت ہو گیا کہ مقتول کے جسم سے جو گولی برآمد ہوئی ہے وہ اسی نمبر کی ہے، جس نمبر کی

گولیاں اس کے پستول میں تھیں، اب اس شخص کے قاتل ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور یہ واقعاتی شہادت ہے۔
اسی طرح ایک شخص ٹوپی پہنے اور ایک ہاتھ میں قراقلی ٹوپی لیے ہوئے بھاگ رہا ہے اور دوسرا شخص اس کے پیچھے ننگے سر بھاگ رہا ہے تو یہ اس بات کی واقعاتی شہادت ہے کہ وہ شخص اس کے سر سے ٹوپی اتار کر بھاگا ہے۔
دو آدمی ایک بیل یا اونٹ کے دعوی دار ہیں اور دونوں کے گھر ایک گاؤں میں ہیں، اس گاؤں میں جا کر اس بیل یا اونٹ کو چھوڑ دیا تو جس آدمی کے گھر یا باڑہ میں وہ بیل یا اونٹ چلا جائے تو یہ اس بات کی واقعاتی شہادت ہے کہ وہ بیل یا اونٹ اسی شخص کا ہے۔
الغرض قرآن مجید، احادیث اور عقلی قرائن سے یہ ثابت ہے کہ واقعاتی شہادتیں بھی شرعی حجت اور عقلی دلیل ہیں۔

غیب کے نگہبان نہ ہونے کے محامل

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یعقوب سے کہا: اور ہم غیب کے نگہبان نہ تھے، اس قول کے حسب ذیل محامل ہیں:
(۱) ہم نے یہ دیکھا کہ شاہی کارندوں نے شاہی پیالہ بن یامین کی بوری سے برآمد کر لیا اور حقیقت حال ہمیں معلوم نہیں ہے۔
(۲) مجاہد، حسن اور قتادہ نے کہا: ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ کا بیٹا چوری کرتا ہے، اگر ہمیں یہ پہلے معلوم ہوتا تو ہم اس کو بادشاہ کے پاس نہ لے جاتے اور نہ اس کو واپس لانے کے متعلق آپ کے سامنے پکی قسمیں کھاتے۔
(۳) منقول ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: چلو مان لیا کہ اس نے چوری کی ہے، لیکن بادشاہ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ بنو اسرائیل کی شریعت میں یہ مقرر ہے کہ جس پر چوری ثابت ہو جائے اس کو غلام بنا کر رکھ لیا جائے، ضرور تم نے اپنے کسی مطلب کی وجہ سے بادشاہ کو یہ بتایا ہوگا، تب انہوں نے کہا کہ چوری کا واقعہ رونما ہونے سے پہلے ہم نے بادشاہ سے یہ ذکر کیا تھا، اور اس وقت ہم کو معلوم نہیں تھا کہ یہ واقعہ ہو جائے گا، کیونکہ ہم غیب پر نگہبان نہیں ہیں۔

بستی سے پوچھنے کے معانی

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے کہا: اور آپ اس بستی (والوں) سے پوچھ لیجئے جس میں ہم تھے۔ اکثر مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس بستی سے مراد مصر ہے اور بعض نے کہا: اس سے وہ بستی مراد ہے جو مصر کے دروازہ پر تھی۔ پھر متن قرآن میں یہ عبارت ہے: آپ اس بستی سے پوچھ لیجئے، اس میں عربی کے اسلوب عبارت کے مطابق مضاف محذوف ہے، اور دوسرا معنی علامہ ابوبکر الانباری نے بیان کیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ آپ اس بستی سے پوچھئے، وہاں کے در و دیوار اور بازاروں سے پوچھئے تو وہ آپ کو بتائیں گے کیونکہ آپ انبیاء میں سے ہیں بلکہ اکابر انبیاء میں سے ہیں، جب آپ سوال کریں گے تو کوئی بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان جمادات کو گویا کر دے اور آپ کو صحیح واقعہ کی خبر دے دے اور یہ آپ کا معجزہ ہو جائے، اور اس کا تیسرا معنی یہ ہے کہ جب کوئی چیز بہت بچی ہو اور اس کا صدق بہت واضح ہو تو کہا جاتا ہے کہ تم اس بات کو آسمان اور زمین سے پوچھ لو! اسی نہج پر انہوں نے کہا: آپ بستی سے پوچھ لیجئے۔

بدگمانی دور کرنے کے لیے وضاحت کرنے کا استحباب

اس آیت سے یہ فقہی مسئلہ نکلتا ہے کہ جو آدمی حق اور صدق پر ہو اور اس کو یہ گمان ہو کہ لوگ اس کے متعلق غلط فہمی اور بدگمانی میں مبتلا ہوں گے تو اس کو چاہیے کہ وہ اس بدگمانی اور غلط فہمی کو دور کرے۔

امام غزالی نے احیاء العلوم میں یہ حدیث ذکر کی ہے کہ تہمت کی جگہوں سے بچو۔

(کشف الخفاء ج ۱، ص ۴۴، مطبوعہ الغزالی دمشق)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرے میں مسجد میں اعتکاف میں بیٹھے ہوئے تھے، میں آپ کی زیارت کے لیے گئی اور کچھ دیر آپ سے باتیں کرتی رہی، جب میں جانے لگی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کے دروازے تک مجھے چھوڑنے آئے۔ جب میں حضرت ام سلمہ کے دروازے تک پہنچی تو دو انصاری گزرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذرا ٹھہرو، یہ صفیہ بنت حیی ہے، ان دونوں نے کہا: سبحان اللہ! یارسول اللہ! اور ان کو یہ وضاحت ناگوار ہوئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شیطان انسان کے خون کی گزرگاہوں میں پہنچ جاتا ہے، اور مجھے یہ خطرہ ہوا کہ وہ تمہارے دلوں میں کوئی بدگمانی نہ ڈال دے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۰۳۵، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۱۷۵، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۱۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۷۷۹، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۳۳۵۷)

امام ابوبکر محمد بن جعفر الخرائطی متوفی ۳۲۷ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

بدیل بن ورقاء بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس شخص نے اپنے آپ کو تہمت کی جگہ پر کھڑا کیا اور اس کے متعلق کسی نے بدگمانی کی تو وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔

(مکارم الاخلاق ج ۱، رقم الحدیث: ۵۳۹، مطبوعہ مطبع المدنی ۱۴۱۱ھ، کنز العمال رقم الحدیث: ۸۸۱۵)

موسیٰ بن خلف بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رات کو گشت کر رہے تھے، آپ نے دیکھا کہ ایک آدمی راستہ میں ایک عورت سے باتیں کر رہا ہے۔ حضرت عمر نے اس کو مارنے کے لیے درہ بلند کیا تو اس نے کہا: یا امیر المومنین! یہ میری بیوی ہے؟ آپ نے فرمایا: تم ایسی جگہ باتیں کرتے کہ لوگ تم کو نہ دیکھتے۔ (مکارم الاخلاق رقم الحدیث: ۵۴۱)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یعقوب نے کہا بلکہ تمہارے دلوں نے ایک بات گھڑلی ہے، تو اب صبر جمیل ہی مناسب ہے، عنقریب اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے گا بے شک وہ خوب جاننے والا بہت حکمت والا ہے ○ اور ان سے پشت پھیر لی اور کہا ہائے افسوس یوسف (کی جدائی) پر اور غم سے ان کی آنکھیں سفید ہوگئیں اور وہ غم برداشت کرنے والے تھے ○ بیٹوں نے کہا آپ یوسف کو (ہی) یاد کرتے رہیں گے، حتیٰ کہ آپ سخت بیمار پڑ جائیں گے یا ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جائیں گے ○ یعقوب نے کہا میں اپنی پریشانی اور غم کی شکایت صرف اللہ سے کرتا ہوں، اور مجھے اللہ کی طرف سے ان باتوں کا علم ہے جن کا تم کو علم نہیں ہے ○ (یوسف: ۸۶-۸۳)

بن یامین کے متعلق بات گھڑنے کی توجیہ

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب اپنے بیٹوں کی بات سنی تو جس طرح انہوں نے حضرت یوسف کے متعلق ان کو دی ہوئی خبر پر یقین نہیں کیا تھا، انہوں نے اس خبر پر بھی یقین نہیں کیا، اور فرمایا: بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے، اس سے ان کی مراد یہ نہیں تھی کہ تم نے جھوٹ کہا ہے بلکہ ان کی مراد یہ تھی کہ بن یامین کو میرے پاس سے نکالنے اور اس کو مصر لے جانے اور اس سے منفعت حاصل کرنے کے لیے تم نے ایک بات بنالی تھی، جس کے نتیجہ میں یہ مصیبت آئی، تم نے اس کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے بہت ضد کی اور اس کو اپنے ساتھ واپس لانے کے لیے عہد و پیمان کیے اور قسمیں کھائیں لیکن

تم نے جو کچھ سوچا تھا' تقدیر میں اس کے بالکل خلاف تھا۔

صبر جمیل کی تعریف

حضرت یعقوب نے فرمایا: تو اب صبر جمیل ہی مناسب ہے۔ صبر جمیل کی تعریف میں امام محمد بن محمد غزالی متوفی ۵۰۵ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ سے شکوہ اور شکایت کرنا حرام ہے اور جب آدمی اپنے مرض یا مصیبت کا کسی کے سامنے اظہار کرتا ہے اور وہ اس مرض اور مصیبت کو ناپسند کرتا ہے اور اس سے ناراض ہوتا ہے تو یہ اللہ کے فعل کی شکایت ہے۔ اس لیے یہ حرام ہے' ہاں اگر اس پر قرائن ہوں کہ وہ اللہ کے فعل کو ناپسند نہیں کر رہا اور نہ اس پر ناراض ہے اور وہ اللہ سے شکوہ اور شکایت نہیں کر رہا' بلکہ اپنے درد اور مصیبت کا اظہار کر رہا ہے' تو پھر اپنی تکلیف اور مصیبت کا اظہار کرنا حرام نہیں ہے' لیکن پھر بھی خلافِ اولیٰ ہے' اور اولیٰ یہ ہے کہ وہ مصیبت کا اظہار بالکل نہ کرے کیونکہ اس سے شکایت کا وہم ہوتا ہے' بعض علماء نے کہا جس نے اپنی مصیبت کا اظہار کیا اس نے صبر نہیں کیا اور صبر جمیل کا معنی یہ ہے کہ اس میں بالکل شکایت نہ ہو۔

(احیاء علوم الدین ج ۴' ص ۲۵۵' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۹ھ)

نیز امام غزالی لکھتے ہیں:

حضرت داؤد علیہ السلام نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا: مومن کے تقویٰ پر تین چیزوں سے استدلال کیا جاتا ہے: اس کو جو نعمت نہیں ملی اس کے حصول کا اللہ پر بھروسہ رکھے' اور جو نعمت مل گئی ہو اس پر اللہ سے راضی رہے اور جو نعمت اس سے جاتی رہی ہو اس پر اچھی طرح صبر کرے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی تعظیم اور اس کی معرفت کی نشانی یہ ہے کہ تم اپنی تکلیف کی شکایت نہ کرو اور اپنی مصیبت کا ذکر نہ کرو۔ (ابن ابی الدنیا فی المرض والکفارات) (احیاء علوم الدین ج ۴' ص ۶۲ مطبوعہ بیروت' ۱۴۱۹ھ)

صبر جمیل کے اجر کے متعلق احادیث

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: جب میں اپنے مومن بندہ کو کسی مصیبت (یا مرض) میں مبتلا کرتا ہوں' اور وہ اپنے عیادت کرنے والوں سے میری شکایت نہ کرے تو میں اس کو قید سے آزاد کر دیتا ہوں اور اس کا گوشت پہلے گوشت سے بہتر بنا دیتا ہوں اور اس کا خون پہلے خون سے بہتر بنا دیتا ہوں اور از سر نو اس کے عمل شروع کر دیتا ہوں۔ (سنن کبریٰ للبیہقی ج ۳' ص ۳۷۵' المستدرک ج ۱' ص ۳۴۸)

حسن بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو دو قطرے زیادہ محبوب ہیں' ایک وہ (خون کا) قطرہ جو اس کے راستہ میں گرا ہو' اور ایک وہ آنسو کا قطرہ جو اس شخص کی آنکھ سے گرا ہو جو آدھی رات کو اللہ کے خوف سے کھڑا عبادت کر رہا ہو' اور اللہ تعالیٰ کو دو گھونٹ زیادہ محبوب ہیں: ایک صبر کا وہ گھونٹ جب کوئی شخص سخت درد کو برداشت کر کے صبر کا گھونٹ بھر لے اور دوسرا وہ گھونٹ جب کوئی شخص غصہ کو برداشت کر کے صبر کا گھونٹ پی لے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۷' رقم الحدیث: ۳۴۳۹۸' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۶ھ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ اجر والا وہ گھونٹ ہے کہ بندہ اللہ کی رضا کے لیے غصہ کو ضبط کر کے صبر کا گھونٹ بھر لے۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۱۸۹' مسند احمد ج ۲' ص ۱۲۸)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقہ کو مخفی رکھنا اور مصائب اور بیماریوں کو چھپانا نیکی کے خزانوں میں سے ہے اور جس نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا اس نے صبر نہیں کیا۔

(شعب الایمان رقم الحدیث: ۱۰۰۵۰، کامل ابن عدی ج ۳، ص ۱۰۸۸، قدیم)

حضرت یعقوب کے ہائے افسوس کہنے کی توجیہ

حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: ہائے میرا افسوس یوسف کی جُدائی پر!

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اس کا معنی ہے: ہائے یوسف کے اوپر میرا طویل رنج و غم۔

ابن قتیبہ نے کہا: الاسف کا معنی ہے بہت زیادہ حسرت۔ سعید بن جبیر نے کہا: اس امت کو مصیبت کے وقت کہنے کے لیے جو کلمات دیئے گئے ہیں وہ ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون○ (البقرہ: ۱۵۶) اگر انبیاء سابقین کو یہ کلمات دیئے گئے ہوتے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو بھی یہ کلمات دیئے گئے ہوتے اور وہ یا اسفی علی یوسف کی بجائے انا للہ وانا الیہ راجعون کہتے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: ہائے میرا افسوس، یوسف کی جدائی پر اور یہ تو شکایت کے الفاظ ہیں، پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کا صبر جمیل کدھر گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی شکایت نہیں کی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف شکایت کی ہے، صبر جمیل کے منافی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی شکایت کرتے، انہوں نے تو خود کہا تھا:

اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ۔ میں اپنی پریشانی اور غم کی شکایت صرف اللہ سے کرتا ہوں۔

(یوسف: ۸۶)

ابن الانباری نے کہا: یہ دعائیہ کلمات ہیں اور ان کی مراد یہ تھی اے میرے رب! یوسف کا جو مجھے رنج اور افسوس ہے، اس پر رحم فرما۔ اولاد سے محبت فطرت اور طبیعت کا تقاضا ہے اور اس کی جدائی پر رنج اور غم ہونا یہ بھی فطرت اور طبیعت کا تقاضا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے، ممنوع یہ ہے کہ انسان غم سے چیخ وپکار کرے اور ایسے کام کرے جن سے بے قراری اور بے چینی کا اظہار ہو، دل میں رنج ہو، آنکھوں میں آنسو ہوں اور اپنے رنج و غم کا اللہ سے اظہار ہو اور اس میں اللہ کی شکایت نہ ہو بلکہ اللہ کی طرف شکایت ہو تو یہ تمام امور جائز ہیں اور ان میں کسی کو ملامت نہیں کی جائے گی۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابو سیف لوہار کے پاس گئے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے رضاعی باپ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم کو لیا، ان کو بوسہ دیا اور ان کو سونگھا، پھر ہم اس کے بعد آپ کے پاس گئے اس وقت حضرت ابراہیم اپنی جان کی سخاوت کر رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، تب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا: یارسول اللہ! آپ بھی؟ (رو رہے ہیں) آپ نے فرمایا: اے ابن عوف! یہ آنسو رحمت ہیں! پھر آپ کی آنکھوں میں اور آنسو آئے، آپ نے فرمایا: آنکھ سے آنسو بہتے ہیں اور دل غمگین ہے اور ہم زبان سے صرف وہی بات کہتے ہیں جس سے ہمارا رب راضی ہو، اور اے ابراہیم! ہم آپ کی جُدائی پر غم زدہ ہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۳۰۳، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۱۵، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۳۱۲۶)

امام عبدالرحمٰن بن محمد رازی ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ روایت کرتے ہیں:

لیث بن ابی سلیم روایت کرتے ہیں کہ حضرت جبرئیل قید خانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گئے، حضرت

یوسف نے ان کو پہچان لیا تو ان سے کہا اے مکرم فرشتے! کیا آپ کو حضرت یعقوب کا علم ہے؟ کہا ہاں، پوچھا کیا حال ہے؟ کہا آپ کے غم میں ان کی بینائی جاتی رہی۔ پھر پوچھا انہیں کتنا غم ہے؟ کہا ستر درجہ زیادہ غم ہے۔ پوچھا ان کو اجر بھی ملے گا؟ کہا ہاں! ان کو سو شہیدوں کا اجر ملے گا! (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۷، رقم الحدیث: ۱۱۸۸۴، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

حسن بصری نے کہا: حضرت یعقوب علیہ السلام مسلسل اسی (۸۰) سال تک روتے رہے اور ان کی آنکھیں خشک نہیں ہوئیں اور جب سے ان کی بصارت گئی تھی، اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان سے زیادہ عزت والا کوئی نہیں تھا۔

(زاد المسیر ج ۴، ص ۲۷۱)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بیٹوں نے کہا آپ یوسف کو (ہی) یاد کرتے رہیں گے حتیٰ کہ آپ سخت بیمار پڑ جائیں گے یا ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جائیں گے○ یعقوب نے کہا میں اپنی پریشانی اور غم کی شکایت صرف اللہ سے کرتا ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے ان باتوں کا علم ہے جن کا تم کو علم نہیں ہے○ اے میرے بیٹو! جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو، اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ کی رحمت سے تو کافر ہی مایوس ہوتے ہیں○ (یوسف: ۸۷-۸۵)

مشکل الفاظ کے معانی

جو چیز لائق شمار نہ ہو اور اس میں کوئی خیر نہ ہو اس کو حرض کہتے ہیں، حتیٰ کہ جو شخص ہلاکت کے قریب پہنچ جائے اس کو حرض کہتے ہیں، اس معنی میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے کہا تھا حتی تکون حرضا (یوسف: ۸۵) تحریض کا معنی ہے بیماری کا ازالہ کرنا اور کسی شخص کو کسی کام پر ابھارنا۔ قرآن مجید میں ہے:

حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ۔ مومنوں کو جہاد پر برانگیختہ کیجئے۔

(الانفال: ۶۵)

(المفردات ج ۱، ص ۱۴۹، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

امام واحدی نے اہل معانی سے نقل کیا ہے کہ محبت یا غم کی زیادتی کی وجہ سے جسم یا عقل میں جو فساد ہوتا ہے اس کو حرض کہتے ہیں، اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے اپنے باپ سے کہا کہ آپ ہر وقت یوسف کو یاد کر کے روتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ اس کثرت گریہ و زاری کی وجہ سے آپ کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ آپ اپنے جسم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور خطرہ ہے کہ شدت غم کی وجہ سے آپ کی موت واقع ہو جائے گی۔

بثی: بث کا معنی پھیلانا اور تقسیم کرنا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: وبث فیھا من کل دابۃ۔ (البقرہ: ۱۶۴) اللہ نے زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے۔ انسان جب اپنے غم کو چھپائے رکھے تو اس کو ھم (فکر) کہتے ہیں اور جب دوسروں سے اپنے غم کا اظہار کر دے تو اس کو بث (پریشانی) کہتے ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: میں اپنی پریشانی اور غم کا صرف اللہ سے ذکر کرتا ہوں۔ یعنی چھوٹا غم ہو یا بڑا میں اس کا ذکر صرف اللہ سے کرتا ہوں۔

جن قرائن کی بناء پر حضرت یعقوب کو حضرت یوسف سے ملاقات کا یقین تھا

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: مجھے اللہ کی طرف سے ان باتوں کا علم ہے جن کا تم کو علم نہیں ہے۔ یعنی اللہ کی رحمت، اس کے احسان اور اس کی وحی سے میں ان چیزوں کو جانتا ہوں جن کو تم نہیں جانتے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے

لیے وہاں سے کشادگی لے کر آئے گا جہاں کا مجھے علم بھی نہیں ہے، اس میں یہ اشارہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ توقع تھی کہ ان کی حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات ہو جائے گی، اور اس کی حسب ذیل وجوہات ہیں:

(۱) روایت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس ملک الموت آیا تو آپ نے اس سے پوچھا تھا: آیا تم نے میرے بیٹے یوسف کی روح قبض کرلی ہے، اس نے کہا نہیں، اے اللہ کے نبی! پھر اس نے مصر کی طرف اشارہ کیا آپ اس کو وہاں ڈھونڈیں۔

(۲) حضرت یعقوب علیہ السلام کو علم تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب سچا ہے کیونکہ حضرت یوسف میں سعادت، شرافت اور کمال کے آثار بہت نمایاں تھے اور ان جیسے لوگوں کے خوابوں میں خطاء نہیں ہوتی۔

(۳) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف وحی نازل کی ہو کہ وہ عنقریب ان کو حضرت یوسف سے ملا دے گا، لیکن اس کا وقت معین نہ کیا ہو اس لیے ان کے دل میں قلق اور اضطراب تھا لیکن ان سے ملاقات کا بہرحال یقین تھا۔

(۴) جب حضرت یعقوب کے بیٹوں نے مصر کے بادشاہ کی نیک سیرت اور اس کے اقوال اور افعال کا کامل ہونا بیان کیا تو ان کا خیال تھا کہ یہ یوسف ہی ہوں گے کیونکہ کسی کافر کی ایسی سیرت نہیں ہو سکتی۔

(۵) حضرت یعقوب کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بن یامین چوری نہیں کرتے، ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ بادشاہ نے ان کو کوئی سزا نہیں دی بلکہ بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے پاس رکھا، اس سے ان کو قوی گمان ہو گیا کہ چوری کے بہانہ سے حضرت یوسف نے ان کو اپنے پاس رکھ لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی کے کفر ہونے کی وجوہ

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: اے میرے بیٹو جاؤ، یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو۔

جب ان دلائل سے حضرت یعقوب علیہ السلام نے جان لیا کہ مصر کا بادشاہ ہی دراصل حضرت یوسف ہیں، تو انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا: جاؤ جا کر یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو۔

حضرت ابن عباس نے کہا: اللہ کی رَوح سے مراد اس کی رحمت ہے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد اللہ کا فضل ہے۔ ابن یزید نے کہا: اس سے مراد اللہ کی کشادگی ہے، اور یہ تمام الفاظ متقارب ہیں۔

حضرت ابن عباس نے کہا کہ مومن مصائب اور پریشانیوں میں اللہ تعالیٰ سے خیر اور فضل کی توقع رکھتا ہے، اور راحت اور کشادگی کے ایام میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے، کیونکہ انسان اللہ کی رحمت سے اس وقت مایوس ہو گا جب اس کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ کو اس کی مراد کا علم نہیں ہے یا اس کا یہ عقیدہ ہو کہ اس کو علم تو ہے لیکن وہ اس کی مراد کو پورا کرنے سے عاجز ہے اس پر قادر نہیں ہے، یا اس کا یہ عقیدہ ہو کہ اس کو علم اور قدرت تو ہے لیکن وہ بخیل ہے وہ ایسا کرے گا نہیں، اور یہ تمام وجوہ کفر ہیں۔ اس لیے مومن کو آخر وقت تک یہ امید رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کی امید اور مراد کو پورا کر دے گا، لیکن اگر کسی وجہ سے وقت نکل جائے اور اس کی مراد پوری نہ ہو تو پھر یہ یقین کر لینا چاہیے کہ اس کی مراد کو پورا کرنا اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف تھا، یا اس کی مراد خود اس کے حق میں نقصان دہ تھی اور اس کو اس کا علم نہیں تھا، یا اگر اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ مراد پوری نہیں کی تو وہ اس کے عوض اس کو اس سے اچھی کوئی اور نعمت دنیا میں یا

آخرت میں عطا کرے گا یا اگر اس نے مراد پوری نہ ہونے پر صبر کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں دنیا یا آخرت کی کوئی مصیبت اس سے دور کردے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو جب وہ یوسف کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا: اے عزیز! ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو تکلیف پہنچی ہے' اور ہم آپ کے پاس حقیر پونجی لے کر آئے ہیں' آپ ہمیں پورا غلہ ماپ کر دے دیں اور ہم پر صدقہ کریں' بے شک اللہ صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے○ یوسف نے کہا کیا تم کو یاد ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا جب تم جہالت میں تھے○ انہوں نے کہا کیا واقعی آپ ہی یوسف ہیں؟ یوسف نے کہا میں ہی یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے' بے شک اللہ نے ہم پر احسان فرمایا' بے شک جو اللہ سے ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں فرماتا۔ (یوسف: ۹۰-۸۸)

حضرت یوسف کے بھائیوں نے حضرت یوسف کو ڈھونڈنے کے بجائے غلہ کا سوال کیوں کیا؟

جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ وہ جا کر حضرت یوسف اور بن یامین کو ڈھونڈیں تو انہوں نے اپنے باپ کی بات مان لی اور مصر پہنچ گئے' اور حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا: اے عزیز! ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو تکلیف پہنچی ہے' اور ہم آپ کے پاس حقیر پونجی لے کر آئے ہیں' الخ۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ان کے باپ نے تو ان سے کہا تھا کہ جا کر یوسف اور بن یامین کو تلاش کرو اور انہوں نے مصر پہنچ کر غلہ مانگنا شروع کر دیا' اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ کسی کی تلاش میں نکلتے ہیں وہ اپنے مطلوب اور حصول کے لیے تمام ذرائع اور وسائل اور تمام حیلوں اور بہانوں کو کام میں لاتے ہیں' انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے اپنی تنگ دستی اور بدحالی کا ذکر کیا اور یہ بتایا کہ ان کے پاس غلہ کی قیمت ادا کرنے کے لیے رقم نہیں ہے اور ان کو غلہ کی شدید حاجت ہے' وہ تجربہ کر رہے تھے کہ اگر بادشاہ کا دل ان کے لیے نرم ہو گیا تو ہم اس سے یوسف اور اس کے بھائی کے متعلق معلوم کریں گے اور اگر اس کا دل نرم نہیں ہوا تو خاموش رہیں گے۔

مزجاۃ کا معنی ایسی قیمت جس کو مسترد کر دیا جائے' الازجاء کا معنی ہے کم کم یا آہستہ آہستہ چلانا' ان کے پاس جو پیسے تھے' وہ مقدار میں بھی کم تھے اور ان کی کیفیت بھی بہت معمولی تھی گویا وہ بہت حقیر رقم تھی' اس لیے انہوں نے کہا ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو بھوک اور ہلاکت کا سامنا ہے' ہمیں غلہ کی سخت ضرورت ہے اور ہمارے پاس بہت حقیر رقم ہے' آپ ہمیں پورا غلہ ماپ کر دے دیں اور ہم پر صدقہ کریں۔

سوال کرنے کی شرائط اور احکام

انہوں نے جو حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا تھا کہ آپ ہم پر صدقہ کریں اس سے حقیقتاً صدقہ مراد نہیں تھا کیونکہ وہ انبیاء علیہم السلام کی اولاد تھے اور انبیاء علیہم السلام کی اولاد پر صدقہ حلال نہیں ہے' اس کا معنی تھا آپ ہم پر کرم اور فضل فرمائیں۔ یعنی ہماری رقم کے اعتبار سے جتنے غلے کا ہمارا حق بنتا ہے' ہمیں اس سے زیادہ اپنے فضل سے عنایت فرمائیں' اور ابو سلیمان الدمشقی اور ابوالحسن الماوردی اور ابو یعلیٰ نے یہ کہا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء تھے' ان پر صدقہ حلال تھا۔

اس آیت سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ جب انسان فقر اور فاقہ میں مبتلا ہو تو اس کے لیے اپنی تنگ دستی اور بدحالی کو بیان کرنا جائز ہے' بشرطیکہ اس کا مقصد اللہ کی شکایت کرنا نہ ہو' اور اسی شرط کے ساتھ بیمار کے لیے ڈاکٹر کے سامنے اپنی بیماری کی

کیفیت بیان کرنا جائز ہے اور یہ صبر جمیل کے خلاف نہیں ہے نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت سوال کرنا جائز ہے۔

حضرت قبیصہ بن مخارق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے قبیصہ! سوال کرنا صرف تین شخصوں میں سے کسی ایک کے لیے جائز ہے: ایک وہ شخص جو مقروض ہو (اور اس کے پاس قرض کی ادائیگی کے لیے پیسے نہ ہوں) دوسرا وہ جس کا تمام مال کسی آفت کی وجہ سے ضائع ہو گیا ہو اور تیسرا وہ شخص جو فاقہ سے ہو اور اس کی قوم میں سے تین آدمی یہ گواہی دیں کہ یہ فاقہ سے ہے۔ اے قبیصہ! ان کے علاوہ جو شخص سوال کر کے کھائے گا وہ حرام کھائے گا۔

(تین گواہوں کا ہونا استحباب پر محمول ہے ورنہ جو شخص فاقہ سے ہو اور کھانا خریدنے کے لیے اس کے پاس کوئی چیز نہ ہو اور کوشش کے باوجود اسے کوئی ملازمت یا مزدوری نہ ملی ہو یا وہ بہت کمزور اور بیمار ہو اور فاقہ زدہ ہو' ایسی صورت میں گواہوں کے بغیر بھی اس کے لیے بقدر ضرورت سوال کرنا جائز ہے)

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۰۴۴' سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۱۶۴۰' سنن نسائی رقم الحدیث: ۲۵۷۹)

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا: اللہ صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے یوں نہیں کہا: اللہ آپ کو جزا دے' کیونکہ اس کے خیال میں بادشاہ کافر تھا اور کافر کو آخرت میں اجر نہیں ملتا۔ اس لیے انہوں نے جھوٹ سے بچنے کے لیے توریہ کیا اور کہا اللہ صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔ حدیث میں ہے: توریہ کے ساتھ کلام کرنے میں جھوٹ سے بچنے کی گنجائش ہے۔ (سنن کبریٰ للبیہقی ج ۱۰' ص ۱۹۹) اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سوال کرنے والے کو چاہیے کہ وہ خیرات دینے والے کے لیے دعائیہ کلمات کہے۔

بھائیوں سے ان کے مظالم پوچھنے کی وجوہ

حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے کہا: کیا تم کو یاد ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا جب تم جہالت میں تھے؟ حضرت یوسف کے اس قول کی متعدد وجوہ بیان کی گئی ہیں:

(۱) امام ابن اسحٰق نے کہا ہے کہ جب انہوں نے حضرت یوسف سے کہا: اے امیر ہم اور ہمارے گھر والے فقر اور فاقہ میں گرفتار ہیں۔ آپ ہم پر صدقہ کیجئے تو حضرت یوسف علیہ السلام کا دل نرم ہو گیا۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۹۹۳)

(۲) کلبی نے بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف نے ان سے کہا: مالک بن ذعر نے بتایا ہے کہ میں نے کنوئیں میں ایک ایسا لڑکا دیکھا تھا اور میں نے اس کو اتنے درہموں کے بدلے خرید لیا' تو انہوں نے کہا اے بادشاہ! وہ غلام ہم نے بیچا تھا' تب حضرت یوسف جلال میں آ گئے اور ان کو قتل کرنے کا حکم دیا' ان کو قتل کرنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا کہ یہوذا پلٹ آیا اور اس نے کہا: حضرت یعقوب تو ایک بیٹے کی گمشدگی پر اب تک غمزدہ ہیں اور رو رو کر نابینا ہو گئے' جب ان کو اپنے تمام بیٹوں کے قتل کی خبر پہنچے گی تو ان کا کیا حال ہو گا' پھر کہا: اگر آپ ہمیں قتل ہی کر رہے ہیں تو فلاں فلاں مقام پر فلاں نام کا ہمارا باپ رہتا ہے اس کے پاس ہمارا سامان بھجوا دیں۔ تب یوسف علیہ السلام رو پڑے اور اس پر کہا: کیا تم کو یاد ہے...

(۳) ابو صالح نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ بھائیوں نے مالک بن ذعر کو جو تحریر دی تھی' حضرت یوسف نے وہ تحریر نکال کر ان کو دکھائی تو انہوں نے یہ اعتراف کیا کہ انہوں نے وہ غلام فروخت کیا تھا' پھر حضرت یوسف نے ان کے قتل کا حکم دیا اور پھر مذکور الصدر واقعہ ہے' لیکن یہ دونوں روایتیں موضوع ہیں' حضرت یوسف کی جو سیرت قرآن مجید نے بیان کی ہے' اس کے خلاف ہیں۔

(۴) حضرت یعقوب نے بادشاہ کے نام ایک رقعہ لکھ دیا تھا جس کو پڑھ کر حضرت یوسف کا دل نرم ہو گیا۔
(معالم التنزیل ج ۲، ص ۵۷ ۳، زاد المسیر ج ۴، ص ۲۹۷)

امام رازی متوفی ۶۰۶ھ اور علامہ قرطبی متوفی ۶۶۸ھ نے اس رقعہ کے مندرجات اس طرح ذکر کیے ہیں:
یعقوب اسرائیل اللہ بن اسحٰق ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ کی جانب سے عزیز مصر کے نام! حمد الٰہی کے بعد ہم وہ لوگ ہیں جو نسل در نسل مصائب میں مبتلا ہیں، میرے دادا کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں آگ میں ڈال دیا گیا تھا تاکہ وہ جل جائیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو نجات دے دی، اور آگ کو ان پر ٹھنڈا اور سلامتی والا بنا دیا، اور میرے باپ کے گلے پر چھری رکھی گئی تاکہ اس کو ذبح کر دیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کا فدیہ دے دیا، اور رہا میں تو میرا جو سب سے محبوب بیٹا تھا، اسے اس کے بھائی جنگل میں لے گئے پھر میرے پاس خون آلودہ قمیص لائے اور کہا اس کو بھیڑیئے نے کھا لیا، میں جب سے اس کے فراق میں رو رہا ہوں، اس کا ایک بھائی تھا جس سے مجھے تسلی رہتی تھی، اس کے یہ بھائی اسے اپنے ساتھ لے گئے اور مجھے آ کر یہ بتایا کہ اس نے آپ کے ہاں چوری کی ہے اور آپ نے اس کی سزا میں اس کو رکھ لیا ہے، ہم لوگ نہ خود چور ہیں اور نہ ہماری اولاد چور ہے، اگر آپ نے میرے اس بیٹے کو واپس کر دیا تو میں آپ کو دعا دوں گا اور اگر آپ نے اس کو واپس نہیں کیا تو میں آپ کے خلاف دعاء کروں گا جس کا اثر ساتویں پشت تک آپ کی اولاد کو پہنچے گا، والسلام۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ مکتوب پڑھا تو بے اختیار آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بھائیوں نے پہچان لیا کہ یہ بادشاہ ہی دراصل یوسف ہے۔
(تفسیر کبیر ج ۵، ص ۵۰۴۔ ۵۰۳، الجامع لاحکام القرآن جز ۹، ص ۲۲۴، ۲۲۳)

یہ مکتوب بھی جعلی اور وضعی ہے اور اسرائیلی روایات میں سے ہے کیونکہ اس میں حضرت اسحٰق کو ذبیح اللہ بتایا گیا ہے اور تحقیق یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ذبیح اللہ ہیں۔

قرآن مجید نے اس سلسلہ میں جو فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: کیا تم کو یاد ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا، جب تم جاہل تھے ○ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ حضرت یوسف نے ان کو یاد دلایا کہ تم نے یوسف کے ساتھ کس قدر ظلم کیا تھا اور کتنا بڑا جرم کیا تھا جیسے کسی بڑے مجرم سے کہا جاتا ہے: کیا تم کو علم ہے تم نے کس کی مخالفت کی تھی اور کیا جرم کیا تھا!

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو جو ان کے مظالم یاد دلائے ہیں، ان میں اس آیت کی تصدیق ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۔ (یوسف: ۱۵)

اور ہم نے یوسف کی طرف (کنوئیں میں) یہ وحی کی کہ (ایک وقت آئے گا) تم ان کو ان کی اس کارروائی سے ضرور آگاہ کرو گے اور اس وقت ان کو شعور نہیں ہو گا۔

حضرت یوسف نے فرمایا: اس وقت تم جاہل تھے، گویا حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کا عذر بیان کیا، یعنی جس وقت تم نے یہ ظالمانہ کام کیے تھے اس وقت تم تکبر کی جہالت میں تھے اور اب تم ایسے نہیں ہو، یا اس کا معنی یہ ہے کہ اس وقت تم باپ کی نافرمانی کے عذاب اور صلہ رحم کے تقاضوں سے جاہل تھے اور اپنی خواہش کی پیروی میں ڈوبے ہوئے تھے یا اس کا معنی یہ ہے کہ اس وقت تم اس بات سے جاہل تھے کہ مستقبل میں تمہارے ان مظالم کا کیا نتیجہ نکلے گا اور تم کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ جس کو تم غلام بنا کر چند سکوں کے عوض بیچ رہے ہو، وہ کل بادشاہ بن جائے گا اور تم اس کے دربار میں خوراک کے حصول کے لیے رحم کی فریاد لے کر حاضر ہو گئے!

بھائیوں کا حضرت یوسف کو پہچان لینا

ان کے بھائیوں نے کہا: کیا آپ ہی یوسف ہیں؟ انہوں نے حضرت یوسف کو جو پہچان لیا' اس کی تین وجوہات بیان کی گئی ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب حضرت یوسف علیہ السلام مسکرائے تو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے سامنے کے دانتوں سے پہچان لیا۔

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت یوسف کے ماتھے پر تل کی طرح ایک نشانی تھی' اور حضرت یعقوب' حضرت اسحٰق اور حضرت سارہ کے ماتھے پر بھی اسی طرح کی نشانی تھی۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے سر سے تاج اتارا تو بھائیوں نے اس تل کو دیکھ کر انہیں پہچان لیا۔

(۳) امام ابن اسحٰق نے کہا: پہلے حضرت یوسف نے اپنے اور ان کے درمیان حجاب رکھا ہوا تھا اور اس وقت وہ حجاب اٹھا دیا تھا اس لیے ان کے بھائیوں نے ان کو پہچان لیا۔ (زادالمسیر ج ۴' ص ۲۸۱' مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

حضرت یوسف علیہ السلام کا بھائیوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر کرنا

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ میں وہی ہوں' بلکہ فرمایا: میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے تاکہ ان کے بھائی اس نام سے یہ جان لیں کہ میں وہی ہوں جس پر انہوں نے ظلم توڑے تھے اور اب اللہ تعالیٰ نے مجھے عزت اور سرفرازی عطا فرمائی ہے' میں وہ ہوں جس کو عاجز سمجھ کر تم نے ہلاک کرنے کے لیے کنوئیں میں ڈال دیا تھا' اس کو آج اللہ نے ایسی حکومت اور ایسا اقتدار عطا فرمایا ہے کہ تم اپنی رمق حیات برقرار رکھنے کے لیے اس کے پاس غلہ کی خیرات مانگنے آئے ہو!

حضرت یوسف نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا ہے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یعنی ہمیں دنیا اور آخرت میں ہر قسم کی کامیابی اور کامرانی عطا فرمائی ہے۔

نیز فرمایا: بے شک جو اللہ سے ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں فرماتا۔

اس کا معنی یہ ہے کہ بے شک جو شخص اللہ کی نافرمانی کرنے سے ڈرتا ہے اور لوگوں کے مظالم پر صبر کرتا ہے تو اللہ ان کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ اس آیت کریمہ میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے متعلق فرمایا کہ وہ متقی ہیں اور جیسا کہ بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام زلیخا کے ساتھ زنا کے تمام مقدمات میں ملوث ہو گئے تھے' اگر یہ بات صحیح ہوتی تو آپ کا خود کو متقی فرمانا صحیح نہ ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انہوں نے کہا بے شک اللہ نے آپ کو ہم پر فضیلت دی اور بلاشبہ ہم خطاکار تھے○ یوسف نے کہا آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں ہے' اللہ تمہاری مغفرت فرمائے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے○ میری اس قمیص کو لے کر جاؤ اور اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو تو ان کی آنکھیں دیکھنے لگیں گی اور اپنے سب گھر والوں کو میرے پاس لے آؤ۔ (یوسف: ۹۳-۹۱)

حضرت یوسف کے بھائیوں کا اعتراف خطا کرنا اور حضرت یوسف کا انہیں معاف فرمانا

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا ہے اور جو شخص اللہ سے ڈر کر گناہوں سے بچتا ہے اور لوگوں کی زیادتیوں پر صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اجر کو ضائع نہیں کرتا' تو حضرت یوسف کے بھائیوں نے ان کی تصدیق کی اور ان کی فضیلت کا اعتراف کیا اور کہا: بے شک اللہ نے آپ کو ہم پر فضیلت دی اور بلاشبہ ہم

خطاکار تھے۔

مفسرین کرام نے خاطی اور مخطی میں فرق بیان کیا ہے۔ خاطی وہ ہے جو قصداً خطا کرے اور مخطی وہ ہے جس سے خطا سرزد ہو جائے۔ حضرت یوسف کے بھائیوں نے اپنے آپ کو خاطی کہا تھا کیونکہ انہوں نے حضرت یوسف پر جو مظالم کیے وہ عمداً کیے تھے۔ حضرت یوسف نے کہا: آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔

علامہ عبدالرحمٰن بن علی بن محمد جوزی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

تثریب کا معنی ہے کسی شخص کو اس کا برا کام یاد دلا کر اس کو ملامت کرنا اور عار دلانا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ میں آج کے بعد تم کو تمہاری زیادتیوں پر کبھی ملامت نہیں کروں گا۔ ابن الانباری نے کہا: آپ نے اس طرف اشارہ کیا کہ آج کا دن معاف کرنے کا پہلا وقت ہے اور آپ جیسے شخص کا منصب یہ ہے کہ وہ دوبارہ انہیں ان کا قصور یاد نہ دلائے۔

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے حضرت زبیر بن العوام، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح اور حضرت خالد بن ولید کو گھوڑوں پر سوار کرا کر روانہ کیا (الی قولہ) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا: جو شخص اپنے گھر میں بیٹھ گیا اس کو امان ہے، اور جس نے ہتھیار ڈال دیئے اس کو امان ہے، قریش کے سردار کعبہ میں داخل ہوئے اور ان سے جگہ تنگ ہو گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کا طواف کیا اور مقام ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھی، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم دروازہ کے دونوں چوکھٹ پکڑ کر کھڑے ہو گئے، اور لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت اسلام کرنے لگے، اور اسی سند کے ساتھ یہ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ پر آئے اور دروازہ کی چوکھٹ کے دونوں بازو پکڑ کر کھڑے ہو گئے اور آپ نے (مشرکین مکہ سے) فرمایا: تم کیا کہتے ہو اور کیا گمان کرتے ہو؟ انہوں نے کہا: آپ ہمارے برادر زاد اور عم زاد ہیں اور انہوں نے یہ تین مرتبہ کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اس طرح کہتا ہوں جس طرح حضرت یوسف نے کہا تھا:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ۔ آج تمہیں کوئی ملامت نہیں ہے، اللہ تمہاری مغفرت فرمائے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔

پھر مشرکین مکہ تیزی سے اسلام میں داخل ہونے لگے جیسے ان کے پیروں کی بیڑیاں کھول دی گئی ہوں۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۹، ص ۱۱۸، مطبوعہ ملتان، سبل الہدیٰ والرشاد ج ۵، ص ۲۴۲، مطبوعہ بیروت)

حضرت یوسف کی قمیص سے حضرت یعقوب کی آنکھوں کا روشن ہونا

جب حضرت یوسف کے بھائیوں نے حضرت یوسف کو پہچان لیا تو حضرت یوسف نے ان سے اپنے باپ کا حال پوچھا، بھائیوں نے بتایا کہ ان کی بینائی جاتی رہی ہے، تب حضرت یوسف نے ان کو اپنی قمیص دی اور کہا: یہ قمیص میرے باپ کے چہرے پر ڈال دینا ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔

امام عبدالرحمٰن بن محمد رازی المعروف بابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ روایت کرتے ہیں:

مطلب بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جنت کی قمیصوں میں سے ایک قمیص پہنائی تھی، حضرت ابراہیم نے یہ قمیص حضرت اسحٰق کو پہنائی اور حضرت اسحٰق نے وہ قمیص حضرت یعقوب کو پہنائی اور حضرت یعقوب نے وہ قمیص حضرت یوسف کو پہنائی، پھر انہوں نے اس قمیص کو لپیٹ کی ایک چاندی کی نلکی میں رکھا اور اس کو حضرت یوسف کے گلے میں ڈال دیا، جس وقت حضرت یوسف کو کنوئیں میں ڈالا گیا اور جب ان کو قید میں رکھا گیا اور جس وقت ان کے پاس ان کے بھائی آئے۔ ان تمام اوقات میں وہ نلکی ان کے گلے میں تھی اور اس وقت حضرت یوسف نے اس نلکی سے یہ قمیص نکال کر بھائیوں کے حوالے کی اور کہا: میری اس قمیص کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔ ابھی وہ قمیص فلسطین کے علاقہ کنعان میں تھی کہ حضرت یعقوب نے فرمایا: مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔

یہوذا نے کہا: پہلے حضرت یعقوب کے پاس میں خون آلودہ قمیص لے کر گیا تھا اور میں نے کہا تھا کہ یوسف کو بھیڑیئے نے کھا لیا، اب اس قمیص کو بھی میں لے کر آؤں گا اور یہ بتاؤں گا کہ یوسف زندہ ہیں، جس طرح پہلے میں نے ان کو رنجیدہ کیا تھا اسی طرح اب میں جا کر ان کو خوشخبری دوں گا۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۷، ص ۲۱۹۶، مطبوعہ مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں اور آپ کے بالوں سے بیماروں کا شفایاب ہونا اور دیگر برکتیں

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت اسماء کو بتایا کہ حضرت عبداللہ بن عمر مطلقاً ریشم کو حرام کہتے ہیں تو انہوں نے کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ ہے، انہوں نے ایک طیالسی کسروانیہ جبہ نکالا جس میں ریشم کے پیوند لگے ہوئے تھے اور اس کے سامنے اور پیچھے کے چاک پر یا آستینوں پر ریشم کے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ حضرت اسماء نے کہا: یہ جبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا، جب وہ فوت ہو گئیں تو میں نے اس پر قبضہ کر لیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پہنا کرتے تھے، ہم بیماروں کے لیے اس کو دھوتے ہیں اور اس (کے غسالہ، دھوون) سے ان کے لیے شفا طلب کی جاتی ہے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۰۶۹، مسند احمد ج ۶ ص ۳۴۸-۳۴۷، طبع قدیم، مسند احمد رقم الحدیث: ۲۷۴۸۱، طبع عالم الکتب بیروت)

علامہ شہاب الدین احمد خفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

ہم آپ کے جبہ کو دھو کر اس کا دھوون بیماروں کو پلاتے تھے اور ان کے بدنوں پر ملتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار سے برکت حاصل کرتے تھے تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اللہ تعالیٰ بیماروں کو شفا عطا فرماتا تھا۔

(نسیم الریاض ج ۳، ص ۱۳۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

قاضی عیاض بن موسیٰ متوفی ۵۴۴ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

ابو القاسم بن میمون بیان کرتے ہیں کہ ہمارے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیالوں میں سے ایک پیالہ تھا، ہم بیماروں کے لیے اس میں پانی ڈالتے تھے اور وہ اس سے شفا حاصل کرتے تھے۔

(الشفاء ج ۱، ص ۲۴۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ خفاجی نے لکھا ہے: بیمار اس پیالہ میں پانی ڈال کر پیتے تھے اور شفا طلب کرتے تھے اور اس کو پینے سے آپ کے آثار کی برکت سے ان کو شفا حاصل ہوتی تھی۔ (نسیم الریاض ج ۳، ص ۱۳۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

عثمان بن عبداللہ بن موہب بیان کرتے ہیں کہ میرے گھر والوں نے ایک برتن میں پانی ڈال کر مجھے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا' اسرائیل نے تین انگلیوں کو ملایا یعنی وہ چاندی سے ملمع کی ہوئی ایک چھوٹی سی ڈبیا تھی تین انگل جتنی' اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک بالوں میں سے کچھ بال تھے' جب کسی انسان کو نظر لگ جاتی یا اس کو اور کوئی بیماری ہو جاتی تو وہ آپ کے پاس ایک برتن بھیج دیتا۔ میں نے گھنٹی کی شکل کی ایک ڈبیا دیکھی اس میں سرخ رنگ کے بال تھے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۵۸۹۶' مشکوۃ رقم الحدیث:۴۵۶۸)

حافظ شہاب الدین احمد ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ جو شخص بیمار ہو جاتا وہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک برتن بھیجتا' وہ اس برتن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مبارک بالوں کو رکھتیں پھر اس برتن میں پانی ڈالتیں اور ان کا دھوون اس بیمار کو پلاتیں' یا وہ آدمی شفا طلب کرنے کے لیے اس پانی سے غسل کرتا اور اس کو اس پانی کی برکت حاصل ہوتی۔

(فتح الباری ج ۱۰' ص ۳۵۳' مطبوعہ لاہور' ۱۴۰۱ھ)

امام حافظ احمد بن علی بن مثنی تمیمی متوفی ۳۰۷ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عبدالحمید بن جعفر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک عمرہ کیا' آپ نے اپنے سر کے بال منڈوائے' لوگ آپ کے بال لینے کی طرف جھپٹے' میں نے آپ کی پیشانی کے بالوں کی طرف سبقت کی۔ میں نے آپ کے بال لے کر ان کو اپنی ٹوپی میں رکھ لیا اور میں نے ان بالوں کو اپنی ٹوپی کے اگلے حصہ میں رکھا' اس کے بعد میں جس جنگ میں بھی گیا مجھے فتح حاصل ہوئی۔

(مسند ابویعلیٰ ج ۱۳' رقم الحدیث: ۷۱۸۳' مطبوعہ دار الثقافۃ العربیہ دمشق ۱۴۱۲ھ)

امام ابوالعباس احمد بن ابوبکر بوصیری متوفی ۸۴۰ھ نے اس حدیث کو امام ابویعلیٰ کے حوالے سے ذکر کر کے کہا ہے کہ امام ابویعلیٰ نے اس حدیث کو سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔

(مختصر اتحاف السادۃ المہرۃ بزوائد المسانید العشرۃ ج ۹' رقم الحدیث: ۷۶۶۸' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۷ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ نے بھی امام ابویعلیٰ کی سند سے اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ (المطالب العالیہ ج ۴' رقم الحدیث: ۴۰۴۴) نیز حافظ عسقلانی نے اس حدیث کو امام سعید بن منصور سے تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ (اس تفصیل کو ہم امام طبرانی کے حوالے سے ذکر کریں گے) اور امام ابویعلیٰ کے حوالے سے بھی ذکر کیا ہے۔

(الاصابہ ج ۱' ص ۴۱۳' مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ' الاصابہ ج ۲' ص ۲۱۷' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۵ھ)

امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عبدالحمید بن جعفر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جنگ یرموک کے دن حضرت خالد بن ولید کی ٹوپی گم ہو گئی' حضرت خالد نے کہا: اس ٹوپی کو ڈھونڈو' لوگوں کو وہ ٹوپی نہیں ملی۔ حضرت خالد نے پھر کہا: اس ٹوپی کو تلاش کرو' تو لوگوں کو وہ ٹوپی مل گئی' وہ ایک پرانی ٹوپی تھی' حضرت خالد نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کیا اور اپنا سر منڈوایا' مسلمان آپ کے بالوں کی طرف جھپٹے' میں نے آپ کی پیشانی کے بالوں کی طرف سبقت کی اور ان بالوں کو میں نے اس ٹوپی میں رکھ لیا' پھر میں جس جنگ میں بھی گیا یہ ٹوپی میرے ساتھ رہی اور مجھے فتح عطا کی گئی۔

(المعجم الکبیر ج ۴' رقم الحدیث: ۳۸۰۴' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

حافظ نور الدین الہیثمی المتوفی ۸۰۷ھ نے لکھا ہے: اس حدیث کو امام ابو یعلیٰ اور امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور ان دونوں کے راوی صحیح ہیں۔ (مجمع الزوائد ج ۹، ص ۳۴۸) امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ نے بھی اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ (المستدرک ج ۳، ص ۲۹۹) امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ نے بھی اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ (دلائل النبوۃ ج ۶، ص ۲۴۹) امام ابن الاثیر علی بن محمد الجزری المتوفی ۶۳۰ھ نے بھی اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ (اسد الغابہ ج ۲، ص ۱۴۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴ھ نے اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔

(الشفاء ج ۱، ص ۳۴۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

ملا علی قاری متوفی ۱۰۱۴ھ اور علامہ خفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ (شرح الشفا علی ہامش نسیم الریاض ج ۳، ص ۱۳۳) علامہ بدر الدین عینی متوفی ۸۵۵ھ نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۳، ص ۳۷، مطبوعہ مصر ۱۳۴۸ھ) اور خاتم الحفاظ حافظ جلال الدین السیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے اس حدیث کا امام سعید بن منصور، امام ابن سعد، امام ابو یعلیٰ، امام حاکم اور امام ابو نعیم کے حوالوں سے ذکر کیا ہے۔

(الخصائص الکبریٰ ج ۱، ص ۱۱۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۵ھ)

حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں کی شفایابی کا تو ایک واقعہ ہے اور ہمارے نبی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں، آپ کے برتنوں اور آپ کے بالوں سے حصولِ شفاء کے متعدد واقعات ہیں اور یہ آپ کے مبارک بالوں کی برکت تھی کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ہر جنگ میں فتح حاصل ہوتی تھی۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ

اور جب قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے کہا اگر تم یہ نہ کہو کہ بوڑھا سٹھیا گیا ہے تو

لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ ﴿٩٤﴾ قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ ﴿٩٥﴾

مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے ○ بیٹوں نے کہا اللہ کی قسم آپ اپنی اسی پرانی محبت میں مبتلا ہیں ○

فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا ۖ

پھر جب خوش خبری سنانے والا آیا اور اس نے وہ قمیص اس کے چہرے پر ڈال دی تو وہ فوراً بینا ہو گئے،

قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٩٦﴾

یعقوب نے کہا کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ بے شک مجھ کو اللہ کی طرف سے ان چیزوں کا علم ہے جن کا تم کو علم نہیں ہے ○

قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ ﴿٩٧﴾ قَالَ

بیٹوں نے کہا اے ہمارے باپ! ہمارے گناہوں کی بخشش طلب کیجئے، بے شک ہم گنہ گار ہیں ○ یعقوب نے کہا

سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾ فَلَمَّا

میں عنقریب اپنے رب سے تمہاری بخشش طلب کروں گا، بے شک وہ بہت بخشنے والا، بے حد رحم فرمانے والا ہے ○ پھر

دَخَلُوْا عَلٰي يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا

جب وہ (سب) یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا ان شاء اللہ!

مِصْرَ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَي الْعَرْشِ

آپ سب امن کے ساتھ مصر میں رہیں گے ○ اور اس نے اپنے ماں باپ کو بلند تخت پر بٹھایا

وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ

اور وہ سب یوسف کے لیے سجدہ میں گر گئے، اور یوسف نے کہا اے میرے باپ! یہ میرے اس پہلے خواب

مِنْ قَبْلُ ۡ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ۭ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ

کی تعبیر ہے، بے شک میرے رب نے اس کو سچ کر دکھایا، اور بے شک اس نے مجھ پر احسان کیا جب

اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَاۗءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ

اس نے مجھ کو قید سے رہائی دی، اور شیطان نے میرے اور میرے

اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ

بھائیوں کے درمیان جو عناد پیدا کر دیا تھا، اس کے بعد آپ سب کو گاؤں سے لے آیا، بے شک میرا رب جو چاہتا

لِّمَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۰۰﴾ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ

ہے وہ حسن تدبیر سے کرتا ہے، بے شک وہ بے حد علم والا، بہت حکمت والا ہے ○ اے میرے رب! تو نے مجھے (مصر کی) حکومت

الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ

عطا کی اور مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم عطا کیا، اے آسمانوں اور زمینوں کو ابتداءً پیدا

وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا

کرنے والے، تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے، مجھے (دنیا سے) مسلمان اٹھانا،

وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۱﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ

اور مجھے نیک بندوں کے ساتھ ملا دینا ○ یہ غیب کی بعض خبریں ہیں جس غیب کی ہم آپ کی طرف

اِلَیْكَۚ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَهُمْ یَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

وحی فرماتے ہیں اور جب برادران یوسف اپنی سازش پر متفق ہو رہے تھے اور اپنی سازش پر عمل کر رہے تھے تو اس وقت آپ ان کے پاس

وَمَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا

موجود نہ تھے ○ اور آپ خواہ کتنا ہی چاہیں اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں ○ اور آپ ان سے

تَسْـَٔلُهُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۴﴾ ع

اس (تبلیغ دین) پر کسی اجر کا سوال نہیں کرتے یہ (قرآن) تو صرف تمام جہان والوں کے لیے نصیحت ہے ○

ع ۱۱ / ۵

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے کہا اگر تم یہ نہ کہو کہ بوڑھا سٹھیا گیا ہے تو مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے ○ بیٹوں نے کہا اللہ کی قسم! آپ اپنی اسی پرانی محبت میں مبتلا ہیں ○ پھر جب خوش خبری سنانے والا آیا اور اس نے وہ قمیص اس کے چہرے پر ڈال دی تو وہ فوراً بینا ہو گئے، یعقوب نے کہا کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ بے شک مجھ کو اللہ کی طرف سے ان چیزوں کا علم ہے جن کا تم کو علم نہیں ہے ○ بیٹوں نے کہا اے ہمارے باپ! ہمارے گناہوں کی بخشش طلب کیجئے، بے شک ہم گناہ گار ہیں ○ یعقوب نے کہا میں عنقریب اپنے رب سے تمہاری بخشش طلب کروں گا، بے شک وہ بہت بخشنے والا، بے حد رحم فرمانے والا ہے ○ (یوسف: ۹۸-۹۴)

بہت فاصلہ سے حضرت یعقوب تک حضرت یوسف کی خوشبو پہنچنے کی توجیہ

ابن ابی الہذیل نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ ابھی حضرت یوسف علیہ السلام کا قافلہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے آٹھ راتوں کی مسافت کے فاصلہ پر تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف کی خوشبو آ گئی۔ ابن ابی الہذیل نے دل میں کہا یہ اتنا فاصلہ ہے جتنا بصرہ سے کوفہ تک کا فاصلہ ہے۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۵۱۱۰، تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۹۶۱)

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب حضرت یوسف، حضرت یعقوب کے گھر کے قریب کنوئیں میں تھے تو آپ کو حضرت یوسف کی خوشبو نہیں آئی تو پھر اتنے فاصلہ سے آپ کو حضرت یوسف کی خوشبو کیسے آ گئی؟ اس کے حسب ذیل جوابات ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں حضرت یوسف کا معاملہ حضرت یعقوب سے مخفی رکھا تھا، تاکہ حضرت یوسف مکمل مصیبت میں گرفتار ہوں اور اس پر صبر کرنے سے حضرت یوسف کو اس مصیبت کا اور حضرت یعقوب کو ان کی جدائی کا پورا پورا اجر ملے اور جب مصیبت اور جدائی کے ایام ختم ہو گئے اور کشادگی اور فرحت کا دور آ گیا تو اللہ تعالیٰ نے فاصلہ کے زیادہ ہونے کے باوجود ان کو حضرت یوسف کی خوشبو پہنچا دی۔

(۲) جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا تھا وہ قمیص ایک چاندی کی نلکی میں تھی اور وہ نلکی حضرت یوسف کے گلے میں تھی، جب اس

قمیص کو اس نلکی سے نکالا تو جنت کی خوشبوئیں فضا میں پھیل گئیں اور جب وہ مانوس خوشبوئیں ہواؤں کے دوش پر سوار ہو کر حضرت یعقوب تک پہنچیں تو انہوں نے پہچان لیا کہ یہ حضرت یوسف کی قمیص کی خوشبو ہے اور جب حضرت یوسف کنوئیں میں تھے تو وہ قمیص نلکی میں بند تھی اور اس کی ہوائیں حضرت یعقوب تک نہیں پہنچیں تھیں۔

(۳) صبا (مشرق سے مغرب کی طرف چلنے والی ہوا) نے اللہ تعالیٰ سے اجازت طلب کی تھی کہ خوش خبری دینے والے سے پہلے وہ حضرت یوسف کی خوشبو حضرت یعقوب تک پہنچا دے، تو اللہ عزوجل نے اس کو اجازت دے دی، یہی وجہ ہے کہ ہر غم زدہ تک جب باد صبا کے جھونکے پہنچے ہیں تو اس کی رُوح کو تازگی محسوس ہوتی ہے۔ (زاد المسیر ج ۴، ص ۲۸۴)

تفنّدون کے معانی

حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا: لولا ان تفندون، اس لفظ کے پانچ معنی بیان کیے گئے ہیں:

(۱) مقاتل نے کہا: اس کا معنی ہے اگر تم مجھ کو جاہل قرار نہ دو۔

(۲) عبداللہ بن ابی ہذیل نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: اگر تم مجھے بے وقوف نہ قرار دو۔

(۳) سعید بن جبیر اور ضحاک نے کہا: اگر تم مجھے جھوٹا نہ قرار دو۔

(۴) حسن اور مجاہد نے کہا: اگر تم مجھے بڑھاپے کی وجہ سے زائل العقل نہ قرار دو۔

(۵) ابن قتیبہ نے کہا: اس کا معنی ہے اگر تم مجھے ملامت نہ کرو۔ (زاد المسیر ج ۴ ص ۲۸۵)

ضلال کے معانی

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بیٹوں نے کہا اللہ کی قسم! آپ اپنی ضلال قدیم میں مبتلا ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گئے ہوئے تھے، یہاں بیٹوں سے مراد ان کے پوتے، نواسے اور دیگر مجلس کے حاضرین ہیں۔ ضلال کے اس جگہ تین معانی مراد ہو سکتے ہیں:

(۱) ضلال کے معنی شقاء ہیں یعنی آپ اپنی اسی پرانی بدبختی اور سختی میں گرفتار ہیں جس کی وجہ سے آپ حضرت یوسف کا غم جھیل رہے ہیں۔ مقاتل نے اس معنی پر اس آیت سے استدلال کیا ہے:

فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ۔ (القمر: ۲۴)

(قوم ثمود نے) کہا کیا ہم اپنوں میں سے ہی ایک بشر کی پیروی کریں گے پھر تو ہم ضرور بدبختی اور عذاب میں گرفتار ہوں گے!

(۲) قتادہ نے کہا: آپ اپنی پرانی محبت میں گرفتار ہیں، آپ یوسف کو نہیں بھولتے اور وہ آپ کے دل سے نہیں نکلتا۔ اس معنی پر اس آیت سے استدلال کیا ہے:

اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (یوسف: ۸)

بے شک ہمارا باپ ضرور محبت کی کھلی وارفتگی میں ہے۔

(۳) جنون: قتادہ نے کہا: یہ بہت سنگین کلمہ ہے اور ان کے لیے یہ ہرگز جائز نہیں تھا کہ وہ اللہ کے نبی کی شان میں ایسا کلمہ استعمال کرتے۔ حسن بصری نے کہا: انہوں نے یہ اس لیے کہا کہ ان کے اعتقاد میں حضرت یوسف فوت ہو چکے تھے اور حضرت یعقوب ان کی محبت میں صحیح فکر سے ہٹ چکے تھے اور درحقیقت کہنے والے خود ضلال میں مبتلا تھے۔

حضرت یعقوب کی بینائی کا لوٹ آنا

یہوذا جب حضرت یعقوب کے پاس پہنچا تو اس نے وہ قمیص آپ کے چہرے پر ڈال دی اور آپ اسی وقت بینا ہو گئے۔ آپ بہت خوش ہوئے اور آپ کا سارا غم جاتا رہا اور آپ نے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ مجھے اللہ کی طرف سے ان

چیزوں کا علم ہے جن کا تم کو علم نہیں ہے۔ حضرت یعقوب کو معلوم تھا کہ حضرت یوسف کا خواب سچا ہے اور اس کی تعبیر ضرور پوری ہوگی۔ حضرت یعقوب نے بیٹوں سے پوچھا: یوسف کس دین پر ہے؟ انہوں نے بتایا: وہ دین اسلام پر ہے، تب حضرت یعقوب نے کہا: اب نعمت پوری ہوگئی!

اپنے مظالم کو دنیا میں معاف کرالینا

حضرت یعقوب کے بیٹوں نے کہا: اے ہمارے باپ! آپ ہمارے گناہوں کی بخشش طلب کریں۔ انہوں نے مغفرت کا اس لیے سوال کیا کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام پر بہت ظلم کیے تھے اور اپنے باپ کو ان کی جدائی کے رنج و غم میں مبتلا کیا تھا۔

اور جو شخص کسی مسلمان کو ایذاء پہنچائے خواہ اس کی جان میں یا اس کے مال میں وہ ظالم ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے مظالم کی تلافی کرے، اس کا جو مال چھینا ہے وہ اس کو واپس کرے اور جو اس کو رنج پہنچایا ہے اس کا ازالہ کرے اور دنیا میں اس سے اپنا قصور معاف کرالے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی کی عزت یا اس کی کسی اور چیز پر ظلم کیا ہو اس کو چاہیے کہ وہ اس ظلم کی اس دن آنے سے پہلے تلافی کرے جس دن اس کے پاس کوئی دینار ہوگا نہ درہم ہوگا، اگر اس کے پاس کوئی نیک عمل ہوا تو اس کے ظلم کے برابر وہ نیک عمل لے لیا جائے گا اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوئیں تو مظلوم کے گناہ اس کے اوپر لاد دیئے جائیں گے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۴۴۹، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۰۵۸۰)

بیٹوں کے لیے استغفار کو مؤخر کرنے کی وجوہ

یعقوب نے کہا: میں عنقریب اپنے رب سے تمہاری بخشش طلب کروں گا۔ اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب نے اسی وقت اپنے بیٹوں کے لیے دعا کیوں نہیں کی اور اس کو موخر کس وجہ سے کیا؟ اس کے حسب ذیل جوابات ہیں:

(۱) امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عطا اور عکرمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بھائی یعقوب نے کہا تھا کہ میں عنقریب اپنے رب سے تمہارے لیے بخشش طلب کروں گا، ان کا مطلب یہ تھا کہ حتیٰ کہ جمعہ کی رات آجائے۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۵۱۳۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے کہا: آپ پر میرے ماں اور باپ فدا ہوں! میرے سینہ سے قرآن نکل جاتا ہے اور میں اس کو یاد رکھنے پر قادر نہیں ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو الحسن! کیا میں تم کو ایسے کلمات نہ سکھاؤں جو تم کو نفع پہنچائیں اور جن کو تم وہ کلمات سکھاؤ ان کو بھی وہ کلمات نفع پہنچائیں، اور جو کچھ بھی تم یاد کرو وہ تمہارے سینہ میں محفوظ رہے۔ میں نے کہا ہاں! یا رسول اللہ! آپ سکھایئے! آپ نے فرمایا: جب جمعہ کی شب ہو اگر تم سے ہو سکے تو رات کے آخری تہائی حصہ میں قیام کرو، کیونکہ اس وقت فرشتے حاضر ہوتے ہیں، اور اس وقت دعا قبول ہوتی ہے اور میرے بھائی یعقوب نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا میں عنقریب اپنے رب سے تمہارے لیے بخشش طلب کروں گا۔ (یوسف: ۹۸) ان کی مراد یہ تھی کہ حتیٰ کہ جمعہ کی رات آجائے، اگر تم سے ہو سکے تو اس رات کے وسط میں قیام کرو اور اگر تم سے یہ نہ ہو سکے تو

اس رات کے اول میں قیام کرو، اور چار رکعات نماز پڑھو، پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ اور سورہ یٰسین پڑھو اور دوسری رکعت میں سورہ فاتحہ اور سورہ حٰم الدخان پڑھو اور تیسری رکعت میں سورہ فاتحہ اور سورہ الم السجدہ پڑھو اور چوتھی رکعت میں سورہ فاتحہ اور سورہ تبارک الذی پڑھو، اور جب ان رکعات سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ تعالیٰ کی حمد اور ثناء کرو اور مجھ پر اور باقی انبیاء پر اچھی طرح سے درود شریف پڑھو، اور تمام مومنین اور مومنات کے لیے استغفار کرو اور اپنے فوت شدہ مسلمان بھائیوں کے لیے دعا کرو پھر آخر میں یہ دعا کرو: اے اللہ! جب تک تو مجھے زندہ رکھے مجھے ہمیشہ گناہوں سے بچا کر مجھ پر رحم فرما اور فضول کاموں کی مشقت سے بچا کر مجھ پر رحم فرما، تو میرے جن کاموں سے راضی ہو مجھے ان میں حسن نظر عطا فرما، اے اللہ! آسمانوں اور زمینوں کو ابتداءً پیدا کرنے والے، اے جلال، اکرام اور غیر متصور غلبہ کے مالک! اے اللہ! اے رحمٰن! میں تیرے جلال اور تیری ذات کے نور کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں کہ تو اپنی کتاب کے حفظ کرنے پر میرے دل کو لازم کر دے جیسا کہ تو نے مجھے اس کتاب کی تعلیم دی ہے اور مجھے اس طرح اس کی تلاوت کی توفیق دے جس طرح تو راضی ہو، اے اللہ! آسمانوں اور زمینوں کو ابتداءً پیدا کرنے والے! اے جلال، اکرام اور غیر متصور غلبہ کے مالک! اے اللہ! اے رحمٰن! میں تیرے جلال اور تیری ذات کے نور سے سوال کرتا ہوں کہ تو اپنی کتاب کے پڑھنے کے ساتھ میری آنکھوں کو منور کر دے اور اس کی تلاوت سے میری زبان کو رواں کر دے اور اس سے میرے دل میں کشادگی کر دے اور اس سے میرے سینے کو کھول دے اور اس سے میرے بدن کو صاف کر دے، کیونکہ تیرے سوا میری حق پر کوئی مدد نہیں کر سکتا، اور نہ تیرے سوا کوئی حق کو لا سکتا ہے اور گناہوں سے پھرنا اور نیکیوں کو کرنا اللہ بلند و برتر کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے، اے ابوالحسن! تم تین یا پانچ یا سات جمعہ تک یہ عمل کرنا، اللہ کے اذن سے تمہاری دعا قبول ہوگی، اس ذات کی قسم! جس نے مجھے حق دے کر بھیجا ہے یہ دعا کسی مومن سے تجاوز نہیں کرے گی، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اللہ کی قسم! پانچ یا سات جمعہ گزرے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسی ہی ایک مجلس میں آئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ! پہلے میں چار یا پانچ آیتیں بہ مشکل یاد کرتا تھا، جب میں ان کو یاد کرتا تو وہ میرے سینے سے نکل جاتی تھیں اور اب میں چالیس یا اس سے زیادہ آیتیں حفظ کر لیتا ہوں اور جب میں ان کو زبانی پڑھتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میرے سامنے کتاب اللہ موجود ہے، اور پہلے میں حدیث سنتا تھا تو میرے سینہ سے نکل جاتی تھی اور اب میں احادیث سنتا ہوں اور پھر ان کو بیان کرتا ہوں تو ان سے ایک لفظ بھی کم نہیں ہوتا۔ آپ نے فرمایا: رب کعبہ کی قسم! اے ابوالحسن! میں اس پر یقین کرتا ہوں۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۵۷۰، مطبوعہ دار الجیل بیروت، ۱۹۹۸ء)

(۲) ان سے جلدی دعا کرنے کا وعدہ کر کے ان کو اٹھا دیا، عطا خراسانی نے کہا: بوڑھوں کی بہ نسبت جوانوں سے حاجت جلد پوری ہو جاتی ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ حضرت یوسف نے کہا: آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے اور حضرت یعقوب نے کہا: میں عنقریب اپنے رب سے تمہارے لیے بخشش طلب کروں گا۔

(۳) شعبی نے کہا: حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کے لیے دعا کو اس لیے موخر کر دیا تھا تاکہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام سے پوچھ لیں، اگر انہوں نے اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا تو وہ ان کے لیے استغفار کریں گے اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اے ہمارے باپ! اگر اللہ نے ہمیں معاف کر دیا تو فبہا ورنہ اس دنیا میں ہمارے لیے کوئی خوشی نہیں ہے۔ پھر حضرت یعقوب نے دعا کی اور حضرت یوسف نے آمین کہی، پھر بیس سال تک ان کی دعا قبول نہیں ہوئی، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد کے متعلق آپ کی دعا قبول کر لی ہے

اور ان کی خطاؤں کو معاف کر دیا ہے' اور اس کے بعد ان سے نبوت کا عہد لیا گیا۔ (صحیح یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی نبی نہیں تھے' کیونکہ نبی اعلان نبوت سے پہلے اور بعد تمام صغائر اور کبائر سے عمداً اور سہواً معصوم ہوتا ہے... سعیدی غفرلہ)... (زاد المسیر ج ۴ ص ۲۷۸-۲۷۷' مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر جب وہ (سب) یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا ان شاء اللہ آپ سب امن کے ساتھ مصر میں رہیں گے○ (یوسف: ۹۹)

حضرت یعقوب کا مصر روانہ ہونا اور حضرت یوسف کا استقبال کرنا

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

فرقد السبخی بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر قمیص ڈالی گئی تو ان کی آنکھیں روشن ہو گئیں اور انہیں بتایا کہ حضرت یوسف نے ان سب کو بلایا ہے' پھر حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کے بھائی مصر کی طرف روانہ ہوئے' جب حضرت یوسف کو یہ خبر پہنچی کہ وہ مصر کے قریب پہنچ گئے ہیں تو وہ ان کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آئے اور ان کے ساتھ مصر کے تمام سردار اور معزز لوگ تھے۔ جب یعقوب اور حضرت یوسف ایک دوسرے کے قریب پہنچے' اس وقت حضرت یعقوب اپنے بیٹے یہوذا کے سہارے چل رہے تھے' جب حضرت یعقوب نے حضرت یوسف کے ساتھ گھوڑوں پر سوار سرداروں اور معززین کو دیکھا تو یہوذا سے پوچھا: کیا یہ مصر کا بادشاہ ہے؟ اس نے کہا: نہیں یہ آپ کا بیٹا ہے! جب دونوں ملنے کے قریب ہوئے تو حضرت یوسف نے سلام میں پہل کرنا چاہی تو ان کو منع کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ یعقوب سلام کی ابتداء کرنے کے مستحق ہیں' تب حضرت یعقوب نے کہا: تم پر سلام ہو! اے مجھ سے رنج و غم کو دور کرنے والے۔

(الجامع لاحکام القرآن رقم الحدیث: ۱۵۱۵۱' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

ربیع بن انس نے کہا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام مصر گئے تھے تو ان کے بیٹوں پوتوں اور پڑپوتوں کی تعداد بہتر (۷۲) تھی پھر جب ان کی اولاد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلی تو اس وقت ان کی تعداد چھ لاکھ تھی۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۷' رقم الحدیث: ۱۱۹۸۸)

حضرت یوسف کی ماں کی وفات کے باوجود ان کے والدین کو تخت پر بٹھانے کی توجیہ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب وہ (سب) یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی۔ اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ حضرت یوسف کی والدہ راحیل تو بن یامین کی ولادت کے وقت فوت ہو گئی تھیں' اس سوال کے حسب ذیل جواب ہیں:

(۱) امام ابن جریر نے کہا: اس سے مراد ان کے والد اور ان کی خالہ ہیں۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۵۱۵۴)

امام ابن ابی حاتم نے بھی لکھا ہے کہ حضرت یوسف کی والدہ بن یامین کی ولادت کے وقت فوت ہو گئی تھیں اس لیے اس آیت میں ماں باپ سے مراد حضرت یوسف کے والد اور ان کی خالہ ہیں۔ (قتادہ نے کہا حضرت یعقوب حضرت یوسف کی خالہ سے نکاح کر چکے تھے)... (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۷' ص ۲۲۰۱)

علامہ ابو عبداللہ قرطبی متوفی ۶۶۸ھ نے لکھا ہے کہ ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ماں کو زندہ کر دیا تھا' تاکہ وہ حضرت یوسف کو سجدہ کریں اور حضرت یوسف کے خواب کی تعبیر تحقیقی طور پر واقع ہو۔

قرآن مجید کی ظاہر آیت کے زیادہ موافق یہ ہے کہ حضرت یوسف کی ماں اور ان کے باپ دونوں نے سجدہ کیا۔

ہم اس سے پہلے سورہ بقرہ کی تفسیر میں لکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کو بھی زندہ کر دیا تھا اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز۹، ص۲۳۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کو زندہ کرنے اور ان کے ایمان لانے پر علامہ قرطبی کے دلائل

علامہ قرطبی نے سورہ البقرہ کی تفسیر میں جو لکھا ہے وہ یہ ہے:

ہم نے اپنی کتاب "التذکرہ" میں یہ لکھا ہے: اللہ تعالیٰ نے آپ کے ماں باپ کو زندہ کر دیا تھا اور وہ آپ پر ایمان لائے تھے، ہم نے اس کو اپنی کتاب "التذکرہ" میں تفصیل سے لکھا ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۲، ص ۸۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ قرطبی نے "التذکرہ" میں جو لکھا ہے وہ یہ ہے:

امام ابوبکر احمد بن علی الخطیب نے اپنی کتاب السابق واللاحق میں اور امام ابو حفص عمر بن شاہین متوفی ۳۸۵ھ نے الناسخ والمنسوخ میں، دونوں نے اپنی اپنی سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں حج کیا، آپ مجھ کو ساتھ لے کر عقبۃ الحجون کے پاس سے گزرے، اس وقت آپ غم زدہ تھے اور رو رہے تھے، آپ کو روتا ہوا دیکھ کر میں بھی رونے لگی۔ میں نے عرض کیا: آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: اے حمیرا ٹھہر جاؤ! میں نے اونٹ کے پہلو سے ٹیک لگائی، آپ کافی دیر تک کھڑے رہے، پھر آپ میری طرف آئے اور آپ خوشی سے مسکرا رہے تھے، میں نے آپ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں! آپ میرے پاس آئے اس وقت آپ غمگین تھے اور رو رہے تھے، یا رسول اللہ! میں بھی آپ کو روتا دیکھ کر رونے لگی، پھر آپ میرے پاس آئے اس وقت آپ خوشی سے مسکرا رہے تھے، یا رسول اللہ! اس کا کیا سبب ہے؟ آپ نے فرمایا: میں اپنی ماں حضرت آمنہ کی قبر کے پاس سے گزرا، میں نے اپنے رب اللہ سے سوال کیا کہ اس کو زندہ کر دے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو زندہ کر دیا پھر وہ مجھ پر ایمان لے آئی یا فرمایا: پھر وہ ایمان لے آئی پھر اللہ نے اس کو اسی طرح لوٹا دیا۔ (الناسخ والمنسوخ ص ۲۸۴، رقم الحدیث: ۶۳۰ مطبوعہ دار الباز مکہ مکرمہ ۱۴۱۲ھ) یہ خطیب کی روایت کے الفاظ ہیں اور امام سہیلی نے الروض الانف میں ایسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے جس میں مجہول راوی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ماں اور باپ دونوں کو زندہ کیا اور وہ آپ پر ایمان لے آئے۔ (علامہ عبد الرحمن سہیلی متوفی ۵۸۱ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے یہ دعا کی کہ وہ آپ کے والدین کو زندہ کر دے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے (اکرام کے) لیے ان کو زندہ کر دیا، اور وہ آپ پر ایمان لائے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر موت طاری کر دی، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، اور اس کی رحمت اور قدرت کسی چیز سے عاجز نہیں ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے اہل ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے اپنے فضل سے آپ کو خصوصیت عطا فرمائے اور آپ کی کرامت کی وجہ سے جو چاہے آپ پر انعام فرمائے، صلوات اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ (الروض الانف ج۱، ص۲۹۹، دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۸ھ)

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حدیث صحیح میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی اجازت مانگی تو آپ کو اجازت دی گئی اور آپ نے ان کے لیے استغفار کی اجازت مانگی تو آپ کو استغفار کی اجازت نہیں دی گئی۔ (صحیح مسلم، الجنائز رقم: ۱۰۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۵۷۲، مسند احمد ج ۲ ص ۴۴۱) تو اس کا جواب یہ ہے کہ الحمد للہ ان میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ استغفار سے ممانعت پہلے کا واقعہ ہے اور والدین کریمین کو زندہ کرنے کا واقعہ بعد کا ہے،

امام ابن شاہین نے الناسخ والمنسوخ میں اسی طرح تحقیق کی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! میرا باپ کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا: دوزخ میں۔ جب وہ واپس جانے لگا تو آپ نے اس کو بلا کر فرمایا: میرا باپ اور تمہارا باپ دوزخ میں ہیں۔

اس حدیث میں باپ سے مراد آپ کے چچا ابوطالب ہیں (صحیح مسلم الایمان: ۳۴۷، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۴۶۹۲، مسند احمد ج ۳، ص ۱۱۹)

ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کریمین کو زندہ کرنے کے متعلق جو حدیث ہے وہ موضوع ہے اور وہ قرآن مجید اور اجماع کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰۤئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (النساء: ۱۸)

اور ان لوگوں کی توبہ (مقبول) نہیں ہے جو مسلسل گناہ کرتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ جب ان میں سے کسی شخص کو موت آئے اور وہ کہے کہ میں نے اب توبہ کی اور نہ ان کی (توبہ مقبول) ہے جو کفر کی حالت میں مرجاتے ہیں۔

پس جو شخص کفر کی حالت میں مرگیا اس کو حشر میں ایمان نفع نہیں دے گا بلکہ عذاب کے مشاہدہ کے وقت بھی اس کو ایمان نفع نہیں دیتا تو دوبارہ زندہ کرنے پر ایمان کیسے نفع دے گا!

حافظ ابوالخطاب عمر بن دحیہ نے کہا ہے کہ اس پر یہ اعتراض ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل تسلسل اور تواتر سے آپ کی وفات تک ثابت ہوتے رہے ہیں تو آپ کے والدین کو زندہ کرنا اور ان کا آپ پر ایمان لانا بھی آپ کے اکرام اور آپ کے فضائل کے قبیل سے ہے اور آپ کے والدین کریمین کا زندہ کرنا عقلاً اور شرعاً محال نہیں ہے، کیونکہ قرآن مجید میں ہے کہ بنو اسرائیل کا مقتول زندہ کیا گیا اور اس نے اپنے قاتل کی خبر دی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کرتے تھے، اسی طرح ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ نے مُردوں کو زندہ کیا اور جب ان کا زندہ ہونا محال نہیں ہے تو زندہ ہو کر آپ پر ایمان لانے میں کیا چیز مانع ہے؟ اور سورہ نساء کی آیت: ۱۸ سے جو استدلال کیا گیا ہے کہ جو کفر پر مرے اس کو ایمان نفع نہیں دیتا اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سورج کا غروب ہونے کے بعد طلوع ہونا ثابت ہے، اس کو امام ابو جعفر طحاوی نے ذکر کیا ہے، تو اگر سورج کا غروب ہونے کے بعد طلوع ہونا نافع نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ سورج کو نہ لوٹاتا، اسی طرح اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کریمین کو زندہ کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کی تصدیق کرنے کے لیے نفع بخش نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان کو زندہ نہ فرماتا۔ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے عذاب کے آثار دیکھ لیے تھے اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کو قبول کرلیا، اور ظاہر قرآن میں بھی اسی طرح ہے، اور جس طرح قرآن مجید میں ہے:

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ ۔ (البقرۃ: ۱۶۲)

کفار کے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی۔

اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ ابولہب اور ابوطالب کے عذاب میں تخفیف کی جائے گی تو اس آیت کے عموم میں تخصیص کی گئی ہے، اسی طرح مذکور الصدر دلائل کی بناء پر النساء: ۱۸ میں بھی تخصیص کی جائے گی، اور اس کا یہ جواب بھی دیا گیا ہے کہ والدین کریمین کا زندہ کیا جانا اور ان کا ایمان لانا پہلے کا واقعہ ہے اور یہ آیت بعد میں نازل ہوئی ہے۔

(التذکرۃ ج ۱، ص ۳۷-۳۵، ملخصاً، مطبوعہ دار البخاری المدینۃ المنورۃ، ۱۴۱۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اس نے اپنے ماں باپ کو بلند تخت پر بٹھایا، اور وہ سب یوسف کے لیے سجدہ میں گر گئے، اور یوسف نے کہا: اے میرے باپ! یہ میرے اس پہلے خواب کی تعبیر ہے، بے شک میرے رب نے اس کو سچ کر دکھایا، اور

بے شک اس نے مجھ پر احسان کیا جب اس نے مجھ کو قید سے رہائی دی' اور شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان جو عناد پیدا کر دیا تھا' اس کے بعد آپ سب کو گاؤں سے لے آیا' بے شک میرا رب جو چاہتا ہے وہ حسنِ تدبیر سے کرتا ہے' بے شک وہ بے حد علم والا بہت حکمت والا ہے○ (یوسف: ۱۰۰)

حضرت یوسف کے خواب کی تعبیر پوری ہونے کی مدت میں متعدد اقوال

وہب بن منبہ نے بیان کیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو سترہ سال کی عمر میں کنوئیں میں ڈالا گیا تھا' اور وہ اپنے باپ سے اسی (۸۰) سال غائب رہے اور اپنے باپ سے ملاقات کے بعد تئیس (۲۳) سال مزید زندہ رہے اور عزیز مصر کی بیوی کے بطن سے حضرت یوسف کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ افرائیم اور منشا اور رحمت نام کی ایک بیٹی تھی جو حضرت ایوب کی بیوی بنی اور حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ کے درمیان چار سو سال کی مدت تھی' ایک قول یہ ہے کہ حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کے درمیان تینتیس (۳۳) سال جدائی رہی پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ملا دیا۔ امام ابن اسحٰق نے کہا: اٹھارہ سال جدائی رہی' ان کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن جز۹' ص۲۳۱' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

حضرت یوسف کے خواب اور اس کی تعبیر پوری ہونے کے درمیان جو مدت گزری ہے امام ابن جوزی نے اس کے متعلق سات قول ذکر کیے ہیں: ۴۰ سال' ۲۲ سال' ۸۰ سال' ۳۶ سال' ۳۵ سال' ۷۰ سال' ۱۸ سال۔

(زاد المسیر ج ۴' ص ۲۹۱' مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۴۰۷ھ)

یہ تمام اقوال ظنی ہیں اور کسی قول کی بنیاد کوئی قطعی اور یقینی دلیل نہیں ہے۔

حضرت یوسف کے لیے حضرت یعقوب کے سجدہ کی توجیہات

اس آیت میں مذکور ہے کہ حضرت یوسف کے ماں باپ حضرت یوسف کے لیے سجدہ میں گر گئے' اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب کا حضرت یوسف کو سجدہ کرنا متعدد وجوہ سے موجب اشکال ہے:

(۱) حضرت یعقوب اکابر انبیاء سے ہیں اور حضرت یوسف ہرچند کہ نبی تھے لیکن حضرت یعقوب بلند مرتبہ کے تھے۔

(۲) حضرت یعقوب باپ تھے اور حضرت یوسف بیٹے تھے اور اولاد کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ ماں باپ کے سامنے جھکی رہے:

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ اور نرم دلی کے ساتھ ان کے لیے عاجزی سے جھکنے رہنا۔

(بنی اسرائیل: ۲۴)

دریں صورت ماں باپ کا بیٹے کو سجدہ کرنا عجیب و غریب ہے۔

(۳) حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف کی بہ نسبت بہت عبادت گزار تھے اور ان سے بہت افضل تھے اور افضل کا مفضول کو سجدہ کرنا بہت عجیب ہے۔

اس اعتراض کے متعدد جوابات ہیں:

(۱) اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ان سب نے یوسف کی وجہ سے اللہ کو سجدہ کیا' اس پر یہ اعتراض ہو گا کہ پھر خواب کیسے سچا ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خواب بھی یہی تھا کہ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند نے میری وجہ سے اللہ کو سجدہ کیا۔

(۲) حضرت یوسف بمنزلہ کعبہ تھے اور سجدہ اللہ کو تھا۔

(۳) ہرچند کہ حضرت یعقوب ہر لحاظ سے حضرت یوسف سے افضل تھے لیکن انہوں نے اس لیے حضرت یوسف کو سجدہ کیا تاکہ ان کے بھائیوں کو حضرت یوسف کے سامنے سجدہ کرنے میں عار محسوس نہ ہو جیسے ادارہ کا سربراہ کسی شخص کی تعظیم کرے

تو ادارہ کے باقی ارکان بھی اس کی تعظیم بجالانے میں عار محسوس نہیں کرتے۔

(۴) ہرچند کہ قیاس اور عقل کا یہی تقاضا ہے کہ حضرت یعقوب حضرت یوسف کو سجدہ نہ کرتے لیکن بعض احکام تعبدی ہوتے ہیں، ان میں عقل کا دخل نہیں ہوتا جیسے تیمم وضو کا قائم مقام ہے جب کہ وضو سے منہ صاف ہوتا ہے اور تیمم میں خاک آلود ہاتھ منہ پر ملے جاتے ہیں، نیز اس میں یہ دکھانا ہے کہ نبی میں نفسانیت بالکل نہیں ہوتی، اللہ باپ کو حکم دیتا ہے کہ بیٹے کو سجدہ کرے اور باپ طمانیت قلب کے ساتھ بیٹے کے لیے سجدہ کرتا ہے اور اس کے دل میں بیٹے کے خلاف کوئی میل نہیں آتا، سو ایسے عظیم بندے کی بندگی پر سلام ہو! سلام ہو حضرت یعقوب پر!!

ہماری شریعت میں سجدۂ تعظیم کا حرام ہونا

ہماری شریعت میں سجدۂ تعظیم حرام ہے، حدیث میں ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ دوسرے کے لیے سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۱۵۹، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۱۴۰، کشف الاستار رقم الحدیث: ۱۴۶۶، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۴۱۶۲، المستدرک ج ۴، ص ۱۷۲-۱۷۱، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۷، ص ۲۹۱، مسند احمد ج ۴، ص ۳۸۱، کامل ابن عدی ج ۴، ص ۱۳۹۳، مشکوۃ رقم الحدیث: ۳۲۵۵، مجمع الزوائد ج ۴ ص ۳۱۱-۳۱۰، کنز العمال رقم الحدیث: ۴۴۷۷۳)

قیام تعظیم کی ممانعت کے متعلق احادیث

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی شخص محبوب نہیں تھا، وہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے تو کھڑے نہیں ہوتے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ آپ اس کو ناپسند کرتے ہیں۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۷۵۴، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸ ص ۵۸۶، مسند احمد ج ۳ ص ۱۳۲، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۳۷۸۴)

متکبرین اور جبابرہ کی مخالفت اور اپنے رب کے سامنے تواضع کو پسند کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تعظیم کے لیے کھڑے ہونے کو ناپسند کرتے اور سادگی کے ساتھ بے تکلف ماحول میں رہتے تھے۔

ابو مجلز بیان کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ باہر نکلے تو حضرت عبداللہ بن الزبیر اور ابن الصفوان ان کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے۔ حضرت معاویہ نے کہا تم دونوں بیٹھ جاؤ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: جو شخص اس سے خوش ہوتا ہو کہ لوگ اس کے سامنے اس کی تعظیم کے لیے کھڑے رہیں وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۷۵۵، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۵۲۲۹، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸ ص ۵۸۶، مسند احمد ج ۴، ص ۹۱، المعجم الکبیر ج ۱۹، رقم الحدیث: ۸۱۹، شرح السنہ رقم الحدیث: ۳۳۳۰)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصا سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے تھے، تو ہم آپ کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے۔ آپ نے فرمایا: عجمیوں کی طرح نہ کھڑے ہو، وہ بعض، بعض کی تعظیم کرتے ہیں۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۵۲۳۰، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۸۳۶، مسند احمد ج ۵، ص ۲۵۳)

قیام تعظیم میں مذاہب فقہاء

علامہ ابوسلیمان خطابی شافعی متوفی ۳۸۸ھ لکھتے ہیں:

مسلمانوں کا رئیس، فاضل کے لیے اور حاکم عادل کے لیے کھڑے ہونا اور شاگرد کا استاذ کے لیے کھڑے ہونا مستحب ہے

مکروہ نہیں ہے، اور جس شخص کی صفات ان کے خلاف ہوں ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہونا مکروہ ہے، اور جو شخص تکبر کی وجہ سے اپنے لیے کھڑے ہونے کا حکم دے اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہونا مکروہ ہے، اور بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ عالم کے لیے کھڑے ہونا اور نیک لوگوں کی تعظیم کے لیے کھڑے ہونا منع نہیں ہے اور جس حدیث میں آپ نے فرمایا: جو شخص اس سے خوش ہوتا ہے کہ لوگ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوں وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے، اس کا محمل یہ ہے کہ وہ بیٹھا رہے اور لوگ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوں۔ (معالم السنن مع مختصر سنن ابوداؤد ج ۸، ص ۸۵، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت)

علامہ یحیٰ بن شرف نووی شافعی متوفی ۶۷۶ھ لکھتے ہیں:

آنے والے کی تعظیم و تکریم کے متعلق ہمارا مختار یہ ہے کہ اس شخص کیلئے کھڑا ہونا مستحب ہے جس میں علم، نیکی، شرف، اقتدار اور حکومت کی کوئی فضیلت ہو یا وہ رشتہ دار ہو یا عمر میں بڑا ہو، اور اس کیلئے کھڑا ہونا نیکی اور احترام اور اکرام کی وجہ سے ہو نہ کہ ریاکاری یا اس کے تکبر کی وجہ سے ہو، اور ہم نے جس نظریہ کو اختیار کیا ہے یہی سلف اور خلف کا معمول ہے۔

(الاذکار ج ۱، ص ۳۰۹، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

علامہ ابو عبداللہ قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

مصر اور عجم میں یہ عادت ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے ہیں حتیٰ کہ اگر کوئی شخص دوسرے کی تعظیم کے لیے نہ کھڑا ہو تو وہ اپنے دل میں تنگی محسوس کرتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ اس کے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور اس کے نزدیک اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے، اسی طرح جب وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ایک دوسرے کے لیے خم ہوتے ہیں اور جھکتے ہیں اور یہ عادت مستمرہ ہے بلکہ ان کے آباء و اجداد سے یہ رسم چلی آ رہی ہے، خصوصاً جب وہ حکام اور مال داروں سے ملتے ہیں تو خم ہو کر ملتے ہیں (اسی طرح علماء اور مشائخ سے) اور انہوں نے اس معاملہ میں احادیث اور سنن سے بالکل اعراض کر لیا ہے، حدیث میں ہے:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! ہم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی یا دوست سے ملاقات کرتا ہے، کیا وہ اس کے لیے جھک جایا کرے؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ اس نے کہا: کیا وہ اس سے معانقہ کرے اور اس کو بوسہ دے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، اس نے کہا: کیا وہ اس کا ہاتھ پکڑے اور مصافحہ کرے؟ آپ نے فرمایا: ہاں!

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۷۲۸، مسند احمد ج ۳، ص ۱۹۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۷۰۲، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۴۲۸۷، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۷، ص ۱۰۰)

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن معاذ کے لیے فرمایا:

قوموا الی سیدکم وخیرکم۔ اپنے سردار اور نیک آدمی کی طرف کھڑے ہو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۲۶۲، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۷۶۸)

ہم کہتے ہیں یہ حدیث صرف حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرا جواب یہ ہے حضرت سعد بن معاذ بیمار تھے اور دراز گوش پر سوار ہو کر آ رہے تھے اور آپ نے لوگوں سے کہا ان کو دراز گوش سے اتارنے کے لیے کھڑے ہوں اور کسی بڑے آدمی کی تعظیم کے لیے اس وقت کھڑے ہونا جائز ہے جب وہ اپنی تعظیم سے خوش نہ ہو، اگر وہ اپنی تعظیم سے خوش ہو تو پھر اس کی تعظیم کے لیے کھڑا ہونا جائز نہیں ہے کیونکہ ایسے شخص کے لیے حدیث میں دوزخ کے عذاب

کی وعید ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۹، ص ۲۳۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

آنے والے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہونا جائز ہے بلکہ مستحب ہے، بشرطیکہ وہ تعظیم کا مستحق ہو۔ قنیہ میں مذکور ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد میں بیٹھا ہو یا قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہو اور کوئی شخص آ جائے تو اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہونا مکروہ نہیں ہے بشرطیکہ وہ تعظیم کا مستحق ہو۔ مشکل الآثار میں مذکور ہے دوسرے کے لیے کھڑے ہونا بعینہٖ مکروہ نہیں ہے، جو شخص یہ پسند کرتا ہو کہ اس کے لیے لوگ کھڑے ہوں اس کے لیے کھڑے ہونا مکروہ ہے، اور جس کے لیے قیام نہیں کیا جاتا اگر اس کے لیے قیام کیا جائے تو یہ مکروہ نہیں ہے۔ ابن دہبان نے کہا ہمارے زمانہ میں مناسب یہ ہے کہ یہ فتویٰ دیا جائے کہ جس شخص کے متعلق یہ علم ہو کہ اگر اس کے لیے قیام نہ کیا جائے تو وہ کینہ، بغض اور عداوت رکھے گا خصوصاً جس جگہ کسی شخص کے لیے کھڑے ہونے کا معمول ہو اس شخص کے لیے کھڑے ہونا مستحب ہے، اور جن احادیث میں قیام پر عذاب کی وعید ہے وہ ایسے قیام کے متعلق ہے جیسا ترکوں میں اور عجمیوں میں رواج تھا (یعنی ایک سردار بیٹھا ہو اور دوسرے اس کی تعظیم کے لیے صف بہ صف کھڑے ہوں) میں کہتا ہوں کہ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ عنایہ وغیرہ میں مذکور ہے کہ شیخ حکیم ابو القاسم کے پاس کوئی دولت مند آتا تو وہ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے اور فقراء اور طلبہ کے لیے نہیں کھڑے ہوتے تھے، ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا دولت مند مجھ سے تعظیم کی توقع رکھتا ہے، اگر میں اس کے لیے نہیں کھڑا ہوں گا تو وہ مجھ سے بغض رکھے گا اور فقراء اور طلبہ صرف سلام کے جواب کی توقع رکھتے ہیں اور اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ میں ان سے علمی باتیں کروں۔ (رد المحتار ج ۵، ص ۲۴۲، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

آنے والے کے استقبال کے لیے کھڑے ہونے کے متعلق احادیث

حضرت عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی شخص کو عادات، خصائل اور شمائل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ نہیں دیکھا، جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتیں تو آپ ان کے لیے کھڑے ہو جاتے، ان کو بوسہ دیتے اور ان کو اپنی مجلس میں بٹھاتے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۸۷۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۵۲۱۷، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۹۵۳، المعجم الکبیر ج ۲۲ رقم الحدیث: ۱۰۳۸، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۷، ص ۱۰۱)

حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مدینہ میں آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت میرے حجرے میں تھے۔ انہوں نے آ کر زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برہنہ پشت تہبند گھسیٹتے ہوئے اس کے (استقبال کے) لیے کھڑے ہوئے اور میں نے اس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی آپ کو برہنہ پشت نہیں دیکھا (حضرت ام المومنین کا مطلب ہے کہ انہوں نے کسی اور کے لیے آپ کو برہنہ پشت استقبال کرتے ہوئے نہیں دیکھا) پھر آپ نے حضرت زید بن حارثہ کو گلے لگایا اور ان کو بوسہ دیا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۷۳۲، کتاب الضعفاء للعقیلی ج ۴، ص ۴۲۸)

حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن وہ مکہ سے بھاگ گئے تھے حتیٰ کہ ان کی بیوی ام حکیم بنت الحارث نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے لیے اجازت طلب کی، آپ نے ان کو مامون قرار دے دیا، وہ یمن جا کر ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئیں، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا تو ان کے اکرام کے لیے

کھڑے ہوگئے اور ان کو گلے لگایا اور فرمایا: ہجرت کرنے والے سوار کو خوش آمدید ہو۔

(المعجم الکبیر ج ۱۷، ص ۳۷۳، رقم الحدیث: ۱۰۲۱، حافظ الہیثمی نے کہا اس کی سند منقطع ہے، مجمع الزوائد ج ۹، ص ۳۸۵، اسد الغابہ ج ۴، ص ۶۸، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (حضرت یوسف نے کہا) اے میرے رب تو نے مجھے (مصر کی) حکومت عطا کی اور مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم عطا کیا، اے آسمانوں اور زمینوں کو ابتداءً پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے، مجھے (دنیا سے) مسلمان اٹھانا اور مجھے نیک بندوں کے ساتھ ملا دیناO (یوسف: ۱۰۱)

دعا میں سوال سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنا

حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس چوبیس سال رہے، پھر ان کی وفات ہوگئی، انہوں نے یہ وصیت کی تھی کہ ان کو شام میں ان کے والد کے پہلو میں دفن کر دیا جائے۔ حضرت یوسف ان کی میت کو لے کر خود شام گئے، پھر مصر لوٹ آئے اور اس کے بعد تیئس سال تک زندہ رہے، پھر جب انہوں نے جان لیا کہ انہوں نے ہمیشہ نہیں رہنا اور بہر حال اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے تو انہوں نے یہ دعا کی۔

(غرائب القرآن و رغائب الفرقان ج ۴، ص ۱۲۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۶ھ)

اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے سے پہلے اس کی حمد و ثنا کرنی چاہیے اور اس کی نعمتوں کا بیان کرنا چاہیے اس کے بعد اپنا سوال کرنا چاہیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے جد کریم سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بھی اسی طرح دعا کی تھی:

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ۙO وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ۙO وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ۙO وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ۙO وَالَّذِیْۤ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ؕO رَبِّ هَبْ لِیْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۙO وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ ۙO وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ ۙO وَاغْفِرْ لِاَبِیْۤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ ۙO وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ ۙO یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ O (الشعراء: ۷۸-۸۸)

جس نے مجھے پیدا کیا سو وہی مجھے ہدایت دیتا ہےO اور جو مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہےO اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہےO اور جو مجھے وفات دے گا پھر مجھے زندہ فرمائے گاO اور جس سے مجھے یہ امید ہے کہ وہ قیامت کے دن میری (ظاہری) خطائیں معاف فرما دے گاO اے میرے رب! مجھے حکم عطا فرما اور مجھے صالحین کے ساتھ واصل کر دےO اور میرے بعد آنے والی نسلوں میں میرا ذکر جمیل جاری رکھO اور مجھے نعمت والی جنت کے وارثوں میں شامل کر دےO اور میرے (عرفی) باپ کی مغفرت فرما بے شک وہ گمراہوں میں سے تھاO اور مجھے حشر کے دن شرمندہ نہ کرناO جس دن نہ مال نفع دے گا اور نہ بیٹے۔

اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی طرح دعائیں کی ہیں، پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی ہے پھر آپ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا ہے، میں یہاں صرف ایک مثال پیش کر رہا ہوں:

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص رات کو اٹھے تو یہ کہے: اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے وہ وحدہ لاشریک ہے، اسی کا ملک ہے اور اسی کی حمد ہے اور وہی ہر چیز پر قادر

ہے۔ الحمد للہ، سبحان اللہ، ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر، اور گناہوں سے باز آنا اور عبادت کی طاقت اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں، اس کے بعد یہ کہے: اے اللہ! مجھے بخش دے یا جو بھی دعا کرے تو اس کی دعا قبول ہو گی، پھر اگر اس نے وضو کیا تو اس کی نماز قبول ہو گی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۱۵۴، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۸۷۸، مسند احمد رقم الحدیث: ۲۳۰۴۹، دار ارقم)

موت کی دعا کرنے کے متعلق امام رازی کا نظریہ

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے موت کی دعا کی اور انہوں نے قتادہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت یوسف نے اپنے رب سے ملنے کی دعا کی اور ان سے پہلے کسی نبی نے موت کی دعا نہیں کی، اور اکثر مفسرین کا یہی مختار ہے، پھر انہوں نے لکھا ہے کہ ہر صاحب عقل زندگی کے مقابلہ میں موت کو ترجیح دے گا، کیونکہ دنیا کی نعمتیں زائل ہونے والی ہیں اور آخرت کی نعمتیں باقی ہیں، دنیا کی بڑی لذتیں کھانے، جماع کرنے اور حکومت اور اقتدار میں ہیں۔ کھانے کی لذت بہت عارضی ہے بس جتنی دیر انسان لقمہ چباتا ہے، حلق سے لقمہ نگلنے کے بعد کوئی لذت باقی نہیں رہتی، اور لذت جماع بھی بہت عارضی ہے اور اس کے نتیجہ میں بال بچوں کی ذمہ داریاں پوری کرنے میں انسان تاحیات مشقت میں مبتلا رہتا ہے اور حکومت اور اقتدار کی لذت کے ساتھ ان گنت مسائل، پریشانیاں اور خطرات ہیں اور جب صاحب عقل ان معانی پر غور کرے گا تو وہ یہی تمنا کرے گا کہ حیات جسمانیہ زائل ہو جائے۔ امام رازی فرماتے ہیں: میرا بھی یہی حال ہے، میں جسمانی لذات کے معائب سے واقف ہوں اور میں چاہوں تو ان کے عیوب بیان کرنے میں بڑی ضخیم کتابیں لکھ سکتا ہوں اور اب اکثر اوقات میں، میں حضرت یوسف کی، کی ہوئی دعا کرتا رہتا ہوں کہ مجھے دنیا سے مسلمان اٹھانا اور مجھے نیک بندوں کے ساتھ ملا دینا۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۵۱۷۔ ۵۱۴، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

موت کی دعا کرنے کے متعلق مصنف کی تحقیق

میں امام رازی کے علوم و معارف اور ان کی نکتہ آفرینیوں کی گرد راہ کو بھی نہیں پہنچتا، میں ان کی تحقیقات اور تدقیقات سے استفادہ کرتا ہوں، ان کے دسترخوان علم کا ایک ادنیٰ ریزہ خوار ہوں اور ان کا روحانی شاگرد ہونا اپنے لیے باعث فخر گردانتا ہوں، اس کے باوجود بصد ادب مجھے امام رازی کی اس تحقیق سے اختلاف ہے، میرے نزدیک موت کی تمنا کرنا جائز نہیں ہے، اور حضرت یوسف علیہ السلام نے موت کی تمنا نہیں کی تھی اور نہ اس کی دعا کی تھی بلکہ ان کی دعا یہ تھی کہ اے اللہ! جب تو میری روح کو قبض فرمائے تو حالت اسلام پر میری روح کو قبض فرمانا، اس میں مرنے کی دعا نہیں ہے بلکہ تاحیات اسلام پر جینے کی دعا ہے۔

امام عبد الرحمٰن بن علی بن محمد جوزی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ اے اللہ! مجھ سے اسلام کو سلب نہ کرنا حتیٰ کہ تو مجھے موت عطا کرے، اور ابن عقیل کہتے تھے کہ حضرت یوسف نے موت کی تمنا نہیں کی تھی، انہوں نے یہ سوال کیا تھا کہ ان کی موت صفت اسلام پر آئے اور اس دعا کا معنی یہ ہے کہ جب تو مجھے موت عطا فرمائے تو حالت اسلام پر موت عطا فرمانا۔ (زاد المسیر ج ۴، ص ۲۹۲، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص کسی مصیبت کی وجہ سے ہرگز موت کی تمنا نہ کرے اور اگر اس نے ضرور دعا کرنی ہو تو وہ یوں دعا کرے: اے اللہ! جب تک میرے

لیے زندگی بہتر ہو تو مجھے زندہ رکھ اور جب میرے لیے موت بہتر ہو تو مجھے موت عطا کر۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۶۷۱، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۶۸۰، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۱۰۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۹۷۱، سنن نسائی رقم الحدیث: ۱۸۱۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۲۶۵، مسند احمد ج ۳، ص ۱۰۱، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۹۶۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص موت کی تمنا نہ کرے اور نہ موت آنے سے پہلے اس کی دعا کرے، جب تم میں سے کوئی شخص مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے اور زندگی مومن میں صرف نیکیوں کو زیادہ کرتی ہے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۶۸۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص ہرگز موت کی تمنا نہ کرے، اگر وہ نیک شخص ہے تو ہوسکتا ہے کہ وہ زیادہ نیکیاں کرے اور اگر بدکار ہے تو ہوسکتا ہے وہ توبہ کرلے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۲۳۵، سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۸۱۸)

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: مجھے صالحین کے ساتھ ملا دے، اس پر یہ اعتراض ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام تو خود اکابر انبیاء میں سے ہیں اور صالحین کا اطلاق تو انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ان سے کم مرتبہ کے لوگوں پر بھی ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ صالحین سے حضرت یوسف کی مراد ہے ان کے آباء کرام، حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی تدفین

امام عبد الرحمٰن محمد بن علی بن محمد جوزی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

جب حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے یہوذا کو وصیت کی اور فوت ہوگئے، ان کی تدفین میں لوگوں نے نزاع کیا۔ حضرت یوسف کی برکت کے حصول کے لیے ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ اس کے محلہ میں حضرت یوسف کو دفن کیا جائے، پھر انہوں نے اس پر اتفاق کرلیا کہ حضرت یوسف کو دریائے نیل میں دفن کردیا جائے تاکہ ان پر سے پانی گزر کر سب تک پہنچ جائے، پھر انہوں نے لکڑی کے ایک صندوق میں حضرت یوسف کو دفن کردیا، پھر حضرت یوسف کا صندوق وہیں رہا حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے روانہ ہوئے تو وہ اپنے ساتھ اس صندوق کو لے گئے اور اس صندوق کو کنعان کی سرزمین میں دفن کردیا۔ حسن بصری نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام جب فوت ہوئے تو ان کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔

(زاد المسیر ج ۴، ص ۲۹۲، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

امام الحسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ لکھتے ہیں:

حسن بصری نے کہا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈالا گیا تو ان کی عمر ۱۷ سال تھی اور وہ ۸۰ سال اپنے باپ سے غائب رہے اور حضرت یعقوب سے ملاقات کے بعد ۲۳ سال زندہ رہے اور ۱۲۰ سال کی عمر میں وفات پائی، ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی، اس کے بعد امام بغوی نے امام ابن جوزی کی طرح تدفین کا واقعہ بیان کیا ہے۔

(معالم التنزیل ج ۲، ص ۳۷۹، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ)

حضرت موسیٰ کا ایک بڑھیا کی رہنمائی سے حضرت یوسف کا تابوت نکالنا

امام عبد الرحمٰن بن محمد ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

سعید بن عبد العزیز بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام پر وفات کا وقت آیا تو انہوں نے اپنے بھائیوں کو بلا

کر کہا: اے میرے بھائیو! میں نے دنیا میں کسی سے بھی اپنے اوپر کیے جانے والے ظلم کا بدلہ نہیں لیا اور مجھے یہ پسند تھا کہ میں لوگوں کی نیکیاں ظاہر کروں اور ان کی برائیاں چھپاؤں اور دنیا سے میرا یہی آخرت کے لیے زادراہ ہے' اے میرے بھائیو! میں نے اپنے باپ دادا جیسے عمل کیے ہیں تو تم مجھے ان کی قبروں کے ساتھ ملا دینا' اور ان سے اس بات کا پکا وعدہ لیا' لیکن انہوں نے اپنے وعدہ کو پورا نہیں کیا' حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا' انہوں نے حضرت یوسف کے متعلق معلوم کیا کہ ان کا صندوق کہاں دفن ہے تو صرف ایک بوڑھی عورت کو اس کا پتا تھا' اس کا نام شارح بنت شیر بن یعقوب تھا' اس نے حضرت موسیٰ سے کہا میں ایک شرط پر تم کو اس کا پتا بتاؤں گی۔ اس نے کہا ایک شرط تو یہ ہے کہ میں بوڑھی ہوں میں جوان ہو جاؤں۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا: منظور ہے۔ اس نے کہا دوسری شرط یہ ہے کہ میں جنت میں آپ کے درجہ میں آپ کے ساتھ رہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس سے گریز کر رہے تھے کہ آپ پر وحی ہوئی کہ اس شرط کو بھی مان لو تو آپ نے مان لیا۔ پھر اس بڑھیا نے اس صندوق کی رہنمائی کی تو حضرت موسیٰ نے اس صندوق کو نکال لیا۔ وہ عورت جب ۵۲ سال کی عمر کو پہنچتی تو اس کی جسامت ۳۲ سال کی ہو جاتی' اس نے ۱۶۰۰ یا ۱۴۰۰ سال کی عمر پائی اور حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام نے اس سے شادی کی۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۷' ص ۲۲۰۵' رقم الحدیث: ۱۲۰۱۹' مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ' ۱۴۱۷ھ)

حافظ جلال الدین السیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے بھی اس حدیث کو امام ابن اسحٰق اور امام ابن ابی حاتم کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ (الدر المنثور ج ۴' ص ۵۹۲-۵۹۱' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۴ھ)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت عطا کرنے کا اختیار تھا

امام حافظ احمد بن علی تمیمی متوفی ۳۰۷ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک اعرابی آیا' آپ نے اس کی عزت افزائی کی اور فرمایا: ہمارے پاس آؤ' وہ آیا آپ نے اس سے فرمایا: تم اپنی حاجت بیان کرو۔ اس نے کہا: مجھے سواری کے لیے ایک اونٹنی چاہیے اور بکریاں چاہئیں جن کا ہم دودھ دوہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم بنو اسرائیل کی بڑھیا کی طرح ہونے سے بھی عاجز ہو؟ آپ نے فرمایا: جب حضرت موسیٰ بنو اسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہوئے تو وہ راستہ بھول گئے۔ حضرت موسیٰ نے پوچھا: اس کی کیا وجہ ہے؟ ان کے علماء نے کہا کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات قریب ہوئی تو انہوں نے ہم سے (یعنی ہمارے آباء و اجداد سے) یہ پختہ وعدہ لیا تھا اور اس پر قسم لی تھی کہ ہم مصر سے اس وقت تک روانہ نہیں ہوں گے جب تک ان کی نعش کو ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ حضرت موسیٰ نے پوچھا: ان کی قبر کی جگہ کس کو معلوم ہے؟ انہوں نے کہا: بنو اسرائیل کی ایک بڑھیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو بلوایا پس وہ آئی' حضرت موسیٰ نے فرمایا: مجھے حضرت یوسف کی قبر بتاؤ۔ اس نے کہا اس وقت تک اس کا پتا نہیں بتاؤں گی حتیٰ کہ آپ میری ایک درخواست منظور نہ کریں۔ آپ نے پوچھا: تمہاری کیا درخواست ہے؟ اس نے کہا: میں جنت میں آپ کے ساتھ رہوں! حضرت موسیٰ کو یہ ماننا ناگوار ہوا' تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی کہ آپ اس کی درخواست منظور کرلیں! تو وہ آپ کو دریائے نیل کی اس جگہ پر لے گئی جہاں کا پانی متغیر ہو چکا تھا' اس نے کہا: یہاں سے پانی نکالو' انہوں نے وہاں سے پانی نکالا۔ اس نے کہا: یہاں کھدائی کرو' کھدائی کے بعد وہاں سے حضرت یوسف علیہ السلام کی نعش برآمد کی' جب انہوں نے حضرت یوسف کی نعش اوپر اٹھائی تو ان کو گمشدہ راستہ روز روشن کی طرح مل گیا۔

(مسند ابو یعلیٰ ج ۱۳' ص ۷ ۲۳-۲۳۶' رقم الحدیث: ۷۲۵۴' مطبوعہ دار الثقافت العربیہ' ۱۴۱۳ھ)

حافظ نورالدین الہیثمی متوفی ۸۰۷ھ نے لکھا ہے کہ مسند ابویعلیٰ کی حدیث کے راوی صحیح ہیں اور اسی وجہ سے میں نے اس حدیث کو درج کیا ہے۔
(مجمع الزوائد ج ۱۰، ص ۱۷۱-۱۷۰، مطبوعہ دارالکتب العربی بیروت ۱۴۰۲ھ، موارد الظمآن ج ۲، رقم الحدیث: ۲۴۳۵، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ بیروت، ۱۴۱۴ھ)

امام ابوعبداللہ حاکم نیشاپوری نے اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ روایت کرکے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔
(المستدرک ج ۲، ص ۵۷۲-۵۷۱، علامہ ذہبی نے حاکم کی موافقت کی ہے، حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ نے اس حدیث کا ذکر کیا ہے: المطالب العالیہ ج ۳ رقم الحدیث: ۳۴۶۲)

امام ابوحاتم محمد بن حبان متوفی ۳۵۴ھ نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔
(صحیح ابن حبان ج ۲، ص ۵۰۱-۵۰۰، رقم الحدیث: ۷۲۳)

خاتم الحفاظ حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے اس حدیث کو متعدد ائمہ حدیث کے حوالوں کے ساتھ ذکر کیا ہے۔
(الدرالمنثور ج ۶، ص ۳۰۳-۳۰۲، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ)

امام ابوبکر محمد بن جعفر الخرائطی المتوفی ۳۲۷ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:
حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کسی کام کے متعلق سوال کیا جاتا، اگر آپ کا ارادہ اسے کرنے کا ہوتا تو فرماتے ہاں! اور اگر آپ کا ارادہ نہ کرنے کا ہوتا تو آپ خاموش رہتے، اور آپ کسی کام کے متعلق "نہ" نہیں فرماتے تھے۔ آپ کے پاس ایک اعرابی آیا اور اس نے کچھ سوال کیا، آپ خاموش رہے، اس نے پھر سوال کیا آپ خاموش رہے، پھر اس نے تیسری بار سوال کیا تو آپ نے اسے گویا جھڑکنے کے انداز میں فرمایا: اے اعرابی مانگ کیا چاہتا ہے؟ ہمیں اس پر رشک آیا اور ہم نے گمان کیا کہ اب وہ جنت کا سوال کرے گا۔ اس نے کہا میں آپ سے ایک سواری کا سوال کرتا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تمہیں مل جائے گی، پھر فرمایا: سوال کرو، اس نے کہا: میں اس کے پالان کا سوال کرتا ہوں، آپ نے فرمایا: یہ تمہیں مل جائے گا، پھر فرمایا: سوال کرو، اس نے کہا: میں آپ سے سفرخرچ کا سوال کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: یہ تمہیں مل جائے گا۔ حضرت علی نے کہا: ہمیں اس پر بہت تعجب ہوا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس اعرابی نے جن چیزوں کا سوال کیا وہ اس کو دے دو، پھر اس کو وہ چیزیں دے دی گئیں پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس اعرابی کے سوال میں اور بنی اسرائیل کی بڑھیا کے سوال میں کتنا فرق ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سمندر پار جانے کا حکم ہوا تو آپ کے پاس سواری کے لیے جانور لائے گئے، وہ جانور سمندر کے کنارے تک پہنچے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے منہ پھیر دیئے اور خود بخود پلٹ آئے، حضرت موسیٰ نے کہا: اے رب! یہ کیا ماجرا ہے؟ حکم ہوا کہ تم یوسف کی قبر کے پاس ہو، اس کی نعش کو اپنے ساتھ لے جاؤ وہ قبر ہموار ہو چکی تھی اور حضرت موسیٰ کو پتا نہیں تھا کہ وہ قبر کہاں ہے؟ پھر حضرت موسیٰ نے لوگوں سے سوال کیا کہ تم میں سے کسی کو پتا ہے، وہ قبر کہاں ہے؟ لوگوں نے کہا: اگر کوئی جاننے والا ہے تو وہ بنی اسرائیل کی ایک بڑھیا ہے، اس کو معلوم ہے کہ وہ قبر کہاں ہے۔ حضرت موسیٰ نے اس بڑھیا کو بلوایا، جب وہ پہنچ گئی تو حضرت موسیٰ نے کہا: کیا تم کو حضرت یوسف کی قبر کا علم ہے؟ اس نے کہا: ہاں! حضرت موسیٰ نے کہا: ہمیں بتاؤ۔ اس نے کہا نہیں! اللہ کی قسم! جب تک تم میرا سوال پورا نہیں کرو گے! حضرت موسیٰ نے کہا: بتاؤ تمہارا کیا سوال ہے؟ اس بڑھیا نے کہا: میں یہ سوال کرتی ہوں کہ جنت کے جس درجہ میں تم رہو گے، اسی درجہ میں، میں رہوں! حضرت موسیٰ نے کہا: صرف جنت کا سوال کرو۔ اس نے کہا:

نہیں! اللہ کی قسم! میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گی جب تک کہ میں تمہارے ساتھ جنت میں تمہارے درجہ میں نہ رہوں! حضرت موسیٰ اس کو ٹالتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی: اس کو وہ درجہ دے دو، اس سے تم کو کوئی کمی نہیں ہوگی! حضرت موسیٰ نے اس کو جنت کا وہ درجہ دے دیا، اس نے قبر بتائی اور وہ حضرت یوسف کی نعش لے کر سمندر کے پار گئے۔ (مکارم الاخلاق ج ۲، ص ۶۳۶، رقم الحدیث: ۶۶۹، مطبوعہ مطبع المدنی مصر، ۱۴۱۱ھ)

امام سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ نے بھی اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

(المعجم الاوسط ج ۸، ص ۳۷۷-۳۷۶، رقم الحدیث: ۷۷۶۳، مطبوعہ مکتبہ المعارف ریاض، ۱۴۱۵ھ)

حافظ الہیثمی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰، ص ۱۷۱) امام علی متقی ہندی متوفی ۹۷۵ھ نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ (کنز العمال ج ۱۱، ص ۵۱۶، رقم الحدیث: ۳۲۴۱۲، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ بیروت)

ان حدیثوں کے اہم اور نمایاں فوائد میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اختیار دیا ہے کہ جس شخص کو جو چاہیں عطا کر دیں، کیونکہ آپ نے فرمایا: مانگ اے اعرابی جو چاہتا ہے، اور یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کا سوال کرنے کی ترغیب دی، کیونکہ آپ نے فرمایا کہ تم میں اور بنی اسرائیل کی بڑھیا میں کتنا فرق ہے! اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کی اس پیرزن کو جنت میں اپنا درجہ عطا فرما دیں، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی طرف جنت عطا کرنے کی نسبت فرمائی اور یہ کہ صحابہ کرام کا یہ اعتقاد تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت تک عطا کرنے کا اختیار تھا، اسی طرح بنی اسرائیل کی اس پیرزن کا یہ اعتقاد تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ صرف جنت بلکہ جنت میں اپنا درجہ بھی عطا فرما سکتے ہیں، اور یہ کہ دنیا اور آخرت کی نعمتیں خواہ جنت ہو، ان کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنا شرک نہیں ہے، ان حدیثوں میں قبر سے نعش نکال کر دوسری جگہ دفن کرنے کا بھی ذکر ہے، سو اب ہم اس مسئلہ کی تحقیق کرتے ہیں۔

دفن سے پہلے اور دفن کے بعد میت کو دوسری جگہ منتقل کرنے کی تحقیق

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جنگ احد کے دن میری پھوپھی میرے والد کی نعش لے کر آئیں تاکہ وہ ان کو ہمارے قبرستان میں دفن کر دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک منادی نے ندا کی کہ شہداء کو ان کی قتل گاہوں میں ہی لوٹا دو۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۱۶۵، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۷۱۷، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۰۱۰، سنن الدارمی رقم الحدیث: ۴۵، مسند احمد ج ۳، ص ۲۹۷، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۱۷۰۴)

ملا علی بن سلطان محمد القاری المتوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث کا معنی ہے شہداء کو ان کے مقتل سے منتقل نہ کرو، بلکہ ان کو وہیں دفن کر دو جہاں ان کو قتل کیا گیا تھا، اسی طرح جو آدمی کسی جگہ طبعی موت مر جائے اس کو دوسرے شہر نہ منتقل کیا جائے۔ الازھار میں مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ امر وجوب کے لیے ہے، کیونکہ جب میت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جائے گا تو غالب یہ ہے کہ اس کا جسم متغیر ہو چکا ہوگا، البتہ اگر کوئی ضرورت ہو تو پھر میت کو منتقل کرنا جائز ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے: امام مالک روایت کرتے ہیں:

حضرت عمرو بن الجموح انصاری اور حضرت عبد اللہ بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہما کی قبروں کو سیلاب نے اکھاڑ دیا تھا، ان کی قبریں سیلاب کے قریب تھیں، یہ دونوں ایک قبر میں مدفون تھے، یہ دونوں جنگ احد میں شہید ہوئے تھے ان کی قبر کھودی گئی تاکہ ان کی قبر کی جگہ تبدیل کی جاسکے، جب ان کے جسموں کو قبر سے نکالا گیا تو ان کے جسموں میں کوئی تغیر نہیں ہوا تھا، یوں

لگتا تھا جیسے وہ کل فوت ہوئے ہوں' ان میں سے ایک زخمی تھا اور اس کا ہاتھ اس کے زخم پر تھا' اس کو اسی طرح دفن کیا گیا تھا' اس کے ہاتھ کو اس کے زخم سے ہٹا کر جب چھوڑا گیا تو وہ پھر اپنے زخم پر آ گیا۔ جنگ احد اور قبر کھودنے کے درمیان چالیس سال کا عرصہ تھا۔ (موطا امام مالک رقم الحدیث: ۱۰۲۳' الجہاد: ۵۰' سنن کبریٰ للبیہقی ج ۴' ص ۵۸-۵۷' مطبوعہ ملتان)

امام ابن ہمام نے کہا ہے کہ قبر پر مٹی ڈالنے کے بعد قبر کو کھودا نہ جائے' خواہ مدت کم گزری ہو یا زیادہ' ماسوا عذر کے' اور التجنیس میں مرقوم ہے کہ عذر یہ ہے کہ مثلاً کسی شخص کو غصب شدہ زمین میں دفن کر دیا گیا ہو یا اس زمین پر کسی نے شفعہ کر دیا ہو' یہی وجہ ہے کہ بکثرت صحابہ کو ارض حرب (دشمن اسلام کی زمین) میں دفن کر دیا گیا پھر ان کو ان کے وطنوں میں نہیں لوٹایا گیا' اسی طرح اگر کسی شخص کا قیمتی کپڑا' اس کی رقم اور کوئی قیمتی چیز قبر میں گر گئی تو اس کو نکالنے کے لیے قبر کو کھودنا جائز ہے' اور تمام مشائخ اس پر متفق ہیں کہ کسی عورت کا بیٹا اس کی غیر موجودگی میں کسی اور شہر میں دفن کر دیا گیا اور وہ اس کے فراق پر صبر نہیں کر سکتی تب بھی اس کو یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ اس کو اپنے شہر میں منتقل کر کے دفن کر دے اور اگر کوئی شخص بغیر غسل کے یا بغیر نماز جنازہ کے دفن کر دیا گیا تو اس فرض کی تلافی کے لیے بھی اس کو قبر سے نکالنا جائز نہیں ہے' ہاں دفن سے پہلے اس کو ایک یا دو میل کے فاصلہ تک منتقل کرنا جائز ہے' کیونکہ اتنا فاصلہ تو قبرستان تک بھی ہوتا ہے۔ (یہ ملا علی قاری نے اپنے زمانہ کے اعتبار سے کہا' اب ایک شہر میں کسی قبرستان میں بھی دفن کرنا جائز ہے) امام سرخسی نے کہا ہے کہ میت کو ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کرنا مکروہ ہے' اور مستحب یہ ہے کہ ہر شخص کو اسی قبرستان میں دفن کیا جائے' حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر شام میں فوت ہوئے تھے پھر ان کی میت کو مدینہ لایا گیا تو حضرت عائشہ نے اپنے بھائی کی زیارت کرتے ہوئے فرمایا: اگر تمہارا معاملہ میرے سپرد ہوتا تو میں تم کو وہیں دفن کرتی جہاں تمہاری وفات ہوئی تھی' پھر التجنیس میں مذکور ہے کہ میت کو ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام مصر میں فوت ہوئے تھے اور ان کی میت شام منتقل کی گئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کا تابوت بہت عرصہ کے بعد مصر سے شام منتقل کیا تاکہ ان کی قبر ان کے آباء کرام کے ساتھ ہو التجنیس کی عبارت ختم ہوئی۔ ملا علی قاری اس پر تبصرہ کرتے ہیں کہ یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے کہ یہ ہم سے پہلے کی شریعت اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے خلاف ہم پر حجت نہیں ہے' اور شریعت سابقہ اس وقت حجت ہوتی ہے جب اس کے خلاف قرآن اور حدیث میں کوئی دلیل نہ ہو اور یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے کہ شہداء کو وہیں دفن کرو جہاں وہ قتل ہوئے تھے' اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام کو کسی عذر کی وجہ سے شام منتقل کیا گیا ہو' اور صاحب التجنیس نے گناہ کی نفی کی ہے کراہت کی نفی نہیں کی اور اس مسئلہ میں میت کو منتقل کرنا مکروہ تنزیہی ہے اور وہ خلاف اولیٰ ہے اور اگر کوئی عذر ہو تو پھر خلاف اولیٰ بھی نہیں۔ (صحیح یہ ہے کہ بلا عذر میت کو قبر سے نکال کر دوسری جگہ دفن کرنا مکروہ تحریمی ہے) صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ دفن سے پہلے اگر میت کو ایک شہر سے دوسرے شہر کسی فائدہ کی وجہ سے منتقل کر دیا جائے تو یہ مکروہ نہیں ہے مثلاً حرم شریف کے قرب کی وجہ سے منتقل کیا جائے' یا کسی نبی یا ولی کے قرب کی وجہ سے منتقل کیا جائے یا اس لیے کہ اس کے رشتہ داروں کو اس قبر کی زیارت میں سہولت ہو۔ (مرقات ج ۴ ص ۷۳-۷۲' مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان' ۱۳۹۰ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ دفن سے پہلے میت کو ایک شہر سے کسی دوسرے شہر میں کسی فائدہ اور مصلحت کی بنا پر منتقل کرنا بلا کراہت جائز ہے اور بے فائدہ اور بغیر کسی مصلحت کے میت کو منتقل کرنا مکروہ تنزیہی ہے اور دفن کے بعد کسی عذر کی بنا پر دوسری جگہ میت کو منتقل کرنا بھی جائز ہے اور بغیر کسی ضرورت یا عذر کے دفن کے بعد میت کو قبر سے نکال کر دوسری جگہ دفن

کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

قاضی خاں متوفی ۲۹۵ھ نے لکھا ہے کہ بغیر عذر کے قبر کھود کر میت کو منتقل کرنا جائز نہیں ہے۔

(فتاویٰ قاضی خان علی ہامش الہندیہ ج ۱، ص ۱۹۵، مطبوعہ مصر، ۱۳۱۰ھ)

شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۸۱۰-۸۰۸ میں بھی ہم نے اس مسئلہ کا ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہ غیب کی بعض خبریں ہیں جس غیب کی ہم آپ کی طرف وحی فرماتے ہیں، اور جب برادران یوسف اپنی سازش پر متفق ہو رہے تھے اور اپنی سازش پر عمل کر رہے تھے تو اس وقت آپ ان کے پاس موجود نہ تھے○ (یوسف: ۱۰۲)

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل

اس آیت سے مقصود یہ بتانا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے اس مفصل واقعہ کی خبر دینا، غیب کی خبر ہے، اس لیے یہ آپ کی نبوت کا معجزہ ہے اور آپ کی صداقت کی دلیل ہے، اور اہل مکہ کو علم تھا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کتاب کا مطالعہ کیا ہے اور نہ کسی عالم کی شاگردی اختیار کی ہے نہ اہل علم کی مجلس میں بیٹھے ہیں اور نہ مکہ علماء کا شہر تھا، اس کے باوجود آپ کا حضرت یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ کو بغیر کسی غلطی اور تحریف کے اور کسی سے پڑھے اور سنے بغیر بیان کر دینا، آپ کا معجزہ ہے اور اس پر دلیل ہے کہ آپ پر اللہ کا کلام نازل ہوا ہے، پھر مزید تاکید کے طور پر فرمایا کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی ان کے خلاف سازشیں کر رہے تھے تو آپ ان کے ساتھ نہ تھے، پھر آپ نے ان تمام واقعات کو کیسے جان لیا! اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر آپ کو ان واقعات کا علم نہیں ہو سکتا تھا پس ثابت ہوا کہ آپ پر اللہ کی وحی نازل ہوتی ہے اور یہی آپ کی نبوت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور آپ خواہ کتنا ہی چاہیں اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں○ اور آپ ان سے اس (تبلیغ دین) پر کسی اجر کا سوال نہیں کرتے، یہ (قرآن) تو صرف تمام جہان والوں کے لیے نصیحت ہے○ (یوسف: ۱۰۴-۱۰۳)

اللہ تعالیٰ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا

امام عبدالرحمن بن علی بن محمد جوزی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

قریش اور یہودیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت یوسف اور ان کے بھائیوں کا قصہ دریافت کیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت تفصیل سے یہ واقعات بیان فرمائے، آپ کو امید تھی کہ سورہ یوسف کو سن کر یہ لوگ ایمان لے آئیں گے لیکن آپ کی یہ امید پوری نہ ہوئی اور آپ بہت رنجیدہ اور غمگین ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کا رنج زائل کرنے اور آپ کو تسلی دینے کے لیے یہ آیات نازل فرمائیں۔ (زاد المسیر ج ۴، ص ۲۹۳، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

اس دوسری آیت کا معنی یہ ہے کہ قرآن مجید میں توحید، رسالت، مبدء اور معاد کے دلائل ہیں اور نیک کاموں کی نصیحت ہے۔ قرآن مجید رشد و ہدایت کے مضامین پر مشتمل ہے، آپ کا منصب دولت کمانا نہیں ہے اور نہ آپ نے اس کی کبھی خواہش کی ہے، آپ کی کوشش تو صرف یہ ہے کہ لوگ ہدایت پر آ جائیں اور وہ اُخروی فلاح کو حاصل کر لیں۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ

آسمانوں اور زمینوں میں کتنی ہی ایسی نشانیاں ہیں جن سے لوگ منہ پھیرتے

عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ

ہوئے گزر جاتے ہیں ○ اور ان میں سے اکثر لوگ اللہ پر ایمان لانے کے باوجود بھی شرک

مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ

ہی کرتے ہیں ○ کیا وہ اس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان کے اوپر اللہ کا ایسا عذاب آجائے جو ان کا

اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ

مکمل احاطہ کرلے یا ان پر اچانک قیامت آجائے اور ان کو خبر بھی نہ ہو ○ آپ کہیے

هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ

کہ یہ میرا راستہ ہے، میں پوری بصیرت کے ساتھ (لوگوں کو) اس کی طرف بلاتا ہوں، اور میرے پیروکار بھی (اس کی طرف بلاتے ہیں)

وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا

اور اللہ پاک ہے، اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں ○ اور ہم نے آپ سے پہلے

مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ

صرف مردوں کو رسول بنایا ہے، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے وہ بستیوں کے رہنے والے تھے،

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

کیا ان لوگوں نے زمین میں سفر نہیں کیا تو یہ دیکھ لیتے کہ ان سے پہلے لوگوں کا

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ

کیسا انجام ہوا، بے شک اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے آخرت میں اچھا ٹھکانا ہے

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ

تو کیا تم نہیں سمجھتے ○ حتیٰ کہ جب رسول ناامید ہونے لگے اور لوگوں نے گمان کیا کہ ان سے

قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ

جھوٹ بولا گیا تھا تو رسولوں کے پاس ہماری مدد آگئی سو جس کو ہم نے چاہا وہ بچا لیا گیا اور

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ⑪⓪ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ

مجرموں کی قوم سے ہمارا عذاب دور نہیں کیا جاتا ○ بے شک ان کے قصوں میں

عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۭ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ

عقل والوں کے لیے نصیحت ہے، یہ (قرآن) کوئی من گھڑت بات نہیں ہے بلکہ

تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى

یہ ان کتابوں کا مصدق ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئیں اور اس میں ہر چیز کی تفصیل ہے اور یہ

وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ⑪⑪ ع ۱۲ / ۷ / ۶

مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آسمانوں اور زمینوں میں کتنی ہی ایسی نشانیاں ہیں، جن سے لوگ منہ پھیرتے ہوئے گزر جاتے ہیں○ (یوسف: ۱۰۵)

آسمانوں اور زمینوں میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدت کی نشانیاں

آسمانوں اور زمینوں میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر بہت نشانیاں ہیں جن پر لوگ غور نہیں کرتے۔ اس کائنات میں ہمیں جو سب سے عظیم چیز نظر آتی ہے وہ سورج ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک مقرر نظام کے تحت طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی عظیم قادر و قیوم کے نظام کے تابع اور مسخر ہے، اور جس عظیم قادر اور قیوم نے اس کائنات کی سب سے عظیم چیز کو اپنے نظام کے مسخر اور اپنے احکام کے تابع کیا ہوا ہے، وہی اس کائنات کا پیدا کرنے والا ہے اور اس کو چلانے والا ہے، پھر ہم دیکھتے ہیں کہ زمین میں زرعی پیداوار، حیوانوں اور انسانوں کی تولید اور نشو و نما کا نظام واحد ہے اور اس نظام کی وحدت ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس نظام کا بنانے والا اور اس نظام کو چلانے والا بھی واحد ہے، غرض آسمانوں اور زمینوں میں اللہ کے وجود اور اس کی وحدت پر بہت نشانیاں ہیں لیکن لوگ اس پر غور نہیں کرتے اور ان سے منہ پھیرتے ہوئے گزر جاتے ہیں!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان میں سے اکثر لوگ اللہ پر ایمان لانے کے باوجود بھی شرک ہی کرتے ہیں○ (یوسف: ۱۰۶)

ایمان لانے کے باوجود شرک کرنے والوں کے مصادیق

حسن، مجاہد، عامر اور شعبی نے کہا: یہ آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جو یہ مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کا اور تمام کائنات کا خالق ہے، اس کے باوجود وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ عکرمہ نے کہا: انہی لوگوں کے متعلق یہ آیات نازل ہوئی ہیں:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۔ (الزخرف: ۸۷)

اگر آپ ان سے یہ سوال کریں کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، پھر وہ کہاں بھٹک رہے ہیں!

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۔ (العنکبوت: ٦١)

اگر آپ ان سے سوال کریں کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا ہے' اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے' پھر وہ کہاں بھٹک رہے ہیں!

حسن نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب ہیں' وہ اللہ پر ایمان بھی لاتے ہیں اور شرک بھی کرتے ہیں۔ عیسائی حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں اور یہود عزیر کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں اور یہ شرک ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت منافقین کے متعلق نازل ہوئی ہے جو زبان سے ایمان لاتے تھے اور ان کے دل میں کفر تھا۔

حسن سے یہ روایت بھی ہے کہ یہ آیت ان مشرکین کے متعلق نازل ہوئی ہے جو کسی مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں اور انہیں نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں اور جب اللہ ان کو اس مصیبت سے نجات دے دیتا ہے تو وہ پھر شرک کرنے لگتے ہیں:

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ○ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ○ (الانعام: ٦٣-٦٤)

آپ پوچھئے کہ تمہیں سمندروں اور خشکی کی تاریکیوں سے کون نجات دیتا ہے؟ جس کو تم عاجزی سے اور چپکے چپکے پکارتے ہو' اگر وہ ہمیں اس مصیبت سے نجات دے دے تو ہم ضرور شکرگزاروں میں سے ہو جائیں گے۔ آپ کہئے کہ تمہیں اس مصیبت سے اور ہر سختی سے اللہ ہی نجات دیتا ہے پھر (بھی) تم شرک کرتے ہو!○

اور بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ پر ایمان رکھنے کے باوجود نعمتوں کا اسناد اسباب کی طرف کرتے ہیں' مسبب الاسباب کی طرف نہیں کرتے مثلاً کسی کو بیماری سے شفا ہو جائے تو کہتا ہے فلاں دوا سے یا فلاں ڈاکٹر کے علاج سے وہ شفایاب ہو گیا ہے' یہ نہیں کہتا کہ اسے اللہ نے شفا دی ہے!

اور بعض لوگ ایسے ہیں کہ مصائب اور شدائد میں بھی اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتے' وہ مشائخ اور اولیاء اللہ کے مزاروں پر جاکر ان کو پکارتے ہیں اور ان سے مدد طلب کرتے ہیں اور ان کی نذر اور ان کی منتیں مانتے ہیں! ہرچند کہ اولیاء اللہ سے مدد طلب کرنا اس عقیدہ سے جائز ہے کہ وہ اللہ کی دی ہوئی طاقت سے اور اس کے اذن سے تصرف کرتے ہیں اور یہ شرک نہیں ہے لیکن افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ صرف اللہ سے مدد طلب کی جائے اور بزرگوں کے وسیلہ سے اپنی حاجت برآری کے لیے دعا کی جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

اذا سئلت فاسئل الله واذا استعنت فاستعن بالله۔

جب تم سوال کرو تو اللہ سے سوال کرو اور جب تم مدد طلب کرو تو اللہ سے مدد طلب کرو۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:٢٥١٦' مسند احمد ج١ ص٢٠٧' ٣٠٣' ٢٩٣' المعجم الکبیر رقم الحدیث:١٢٩٨٩' ١٢٩٨٨' عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی رقم الحدیث:٤٢٥' شعب الایمان رقم الحدیث:١٠٧٤' العقیلی ج٣ ص٥٣' الآجری' رقم الحدیث:١٩٨' المستدرک ج٣ ص٥٤١' حلیۃ الاولیاء ج١ ص٣١٤' الآداب للبیہقی رقم الحدیث:١٠٧٣)

اور نذر عبادت مقصودہ ہے' اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کی نذر اور منت ماننا جائز نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا وہ اس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان کے اوپر اللہ کا ایسا عذاب آجائے جو ان کا

مکمل احاطہ کر لے یا ان پر اچانک قیامت آ جائے اور ان کو خبر بھی نہ ہو۔ (یوسف: ۱۰۷)

یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار نہیں کرتے، اور وہ غیر اللہ کی عبادت پر ڈٹے رہتے ہیں، کیا ان کو اس بات کا خوف نہیں ہے کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کا ایسا عذاب آ جائے جو ان کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لے یا اسی حال میں ان پر اچانک قیامت آ جائے اور اللہ تعالیٰ ان کو دائمی عذاب کے لیے دوزخ میں ڈال دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہئے کہ یہ میرا راستہ ہے، میں پوری بصیرت کے ساتھ (لوگوں کو) اس کی طرف بلاتا ہوں، اور میرے پیروکار بھی (اس کی طرف بلاتے ہیں) اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ (یوسف: ۱۰۸)

یعنی اے محمد! صلی اللہ علیک وسلم! آپ ان مشرکین سے کہئے کہ میں جس دین کی دعوت دے رہا ہوں، یہی میرا طریقہ اور میری سنت ہے، اسی طریقہ پر چل کر انسان جنت اور اخروی نعمتوں کو حاصل کر سکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو پوری بصیرت اور یقین کے ساتھ اسلام کی دعوت دینی چاہیے اور علماء کرام جو دین کی تبلیغ کرتے ہیں وہ اللہ کے بندوں کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے امین اور سفیر ہیں، اس کے بعد فرمایا: اللہ پاک ہے یعنی مشرکین جو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ فلاں اللہ کا شریک ہے، فلاں اللہ کا بیٹا ہے، فلاں اللہ کا مددگار ہے اور ایسی ہی دوسری خرافات، اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں سے پاک ہے اور برتر اور بلند ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے آپ سے پہلے صرف مردوں کو رسول بنایا ہے، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے وہ بستیوں کے رہنے والے تھے، کیا ان لوگوں نے زمین میں سفر نہیں کیا تو یہ دیکھ لیتے کہ ان سے پہلے لوگوں کا کیسا انجام ہوا، بے شک اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے آخرت میں اچھا ٹھکانا ہے تو کیا تم نہیں سمجھتے۔ (یوسف: ۱۰۹)

نبوت کے متعلق مشرکین کے شبہ کا ازالہ

منکرین نبوت یہ کہتے تھے کہ اللہ نے اگر کوئی رسول بھیجنا تھا تو کوئی فرشتہ بھیج دیتا، اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ کہتے تھے کہ یہ تو ہماری طرح بشر ہیں، یہ کیسے نبی ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا: کہ ہم نے آپ سے پہلے بھی صرف مردوں کو رسول بنایا ہے، کسی جن یا فرشتہ کو یا عورت کو رسول نہیں بنایا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ بستیوں کے رہنے والے تھے، اس سے مراد ہے کہ وہ شہروں کے رہنے والے تھے، کیونکہ جنگلوں اور دیہاتوں کے رہنے والے عموماً سخت دل اور غیر مہذب ہوتے ہیں اور عقل و فہم سے عاری ہوتے ہیں اور شہروں کے رہنے والے عموماً عقل مند، بردبار اور مہذب ہوتے ہیں۔ حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جنگلیوں اور دیہاتیوں میں سے کوئی نبی بھیجا اور نہ عورتوں میں سے اور نہ جنوں میں سے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا ان لوگوں نے زمین میں سفر نہیں کیا، کیونکہ زمین میں قوم عاد، قوم ثمود، قوم مدین اور قوم لوط پر عذاب کے آثار موجود ہیں، اگر یہ ان علاقوں میں سفر کرتے تو دیکھ لیتے کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کرنے والوں کا کیسا انجام ہوتا ہے۔

اس آیت میں یہ فرمایا ہے: ہم نے آپ سے پہلے مردوں کو رسول بنایا ہے، اس میں یہ دلیل ہے کہ یہ عقیدہ غلط ہے کہ نبی کا مادہ خلقت نور ہوتا ہے، کیونکہ نور مرد یا عورت نہیں ہوتا، تمام انبیاء علیہم السلام نوع انسان سے مبعوث کیے گئے اور وہ سب مرد تھے اور وہ سب نور ہدایت ہیں البتہ ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نور حسی سے بھی وافر حصہ ملا تھا، جب آپ مسکراتے تو آپ کے دانتوں کی جھریوں سے نور کی شعاعیں سی دکھائی دیتی تھیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حتیٰ کہ جب رسول ناامید ہونے لگے اور لوگوں نے گمان کیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا تو رسول کے پاس ہماری مدد آ گئی، سو جس کو ہم نے چاہا وہ بچا لیا گیا اور مجرموں کی قوم سے ہمارا عذاب دور نہیں کیا جاتا O (یوسف: ۱۱۰)

وظنوا انهم قد كذبوا کی توجیہات

اس آیت میں لفظ کذبوا کی قراءت دو طرح سے منقول ہے: ایک وجہ ہے کذبوا ذال پر تشدید کے بغیر اور دوسری وجہ ہے کذّبوا ذال پر تشدید کے ساتھ۔ عاصم، حمزہ اور کسائی کی پہلی قراءت ہے اور باقی قراء کی دوسری قراءت ہے۔

اگر یہ لفظ بغیر تشدید کے پڑھا جائے تو اس کا نائب فاعل رسولوں کی امتیں ہیں، اور اس صورت میں اس کے دو محمل ہیں:

(۱) جب رسول اپنی قوم کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے اور قوم نے یہ گمان کر لیا کہ رسولوں نے ان سے جو مدد اور کامیابی کا وعدہ کیا تھا وہ انہوں نے ان سے جھوٹ بولا تھا تو اچانک ہماری مدد آ پہنچی۔ یہ تفسیر مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۵۲۱۹) امام ابن جریر نے اسی روایت کو اختیار کیا ہے اور ہم نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ اور ہمارے شیخ علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ المتوفی ۱۴۰۶ھ کا ترجمہ بھی اسی روایت پر مبنی ہے۔

(۲) رسولوں نے مایوس ہو کر یہ گمان کر لیا کہ ان سے جو وعدہ کیا گیا تھا وہ جھوٹا تھا تو ہماری مدد آ پہنچی۔ ابن ابی ملیکہ نے اس تفسیر کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ رسل بشر تھے اور ضعیف تھے۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۵۲۲۷) ابن جریج نے کہا: میں بھی اسی طرح کہتا ہوں جس طرح حضرت ابن عباس نے کہا اور حضرت ابن عباس نے یہ آیت پڑھی:

حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۔ (البقرہ: ۲۱۴)

حتیٰ کہ رسول اور ایمان والوں نے کہا اللہ کی مدد کب آئے گی؟ سنو اللہ کی مدد قریب ہے۔

ابن جریج نے کہا: ابن ابی ملیکہ نے بتایا کہ حضرت ابن عباس کا مذہب یہ تھا کہ رسول کمزور تھے، انہوں نے یہ گمان کر لیا کہ ان سے جھوٹا وعدہ کیا گیا تھا۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۵۲۲۸)

اس روایت کی توجیہ عنقریب آئے گی۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں:

مفسرین نے کہا ہے کہ ان کا یہ گمان ضعف بشریت کی وجہ سے تھا، مگر یہ بہت بعید ہے کیونکہ عام مومن کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ یہ گمان کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے جھوٹا وعدہ کیا ہے، بلکہ اس گمان کی وجہ سے وہ ایمان سے خارج ہو جائے گا، تو رسولوں کے حق میں یہ کس طرح جائز ہو گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسا گمان کریں۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام رازی نے اس روایت کو رد کر دیا ہے، اس کے بعد امام رازی لکھتے ہیں:

اگر اس آیت میں کذّبوا تشدید کے ساتھ ہو اور ظن بہ معنی یقین ہو تو اس آیت کا معنی ہو گا کہ رسولوں نے یہ یقین کر لیا کہ ان کی امتوں نے ان کی تکذیب کر دی ہے اور اب وہ ایمان نہیں لائیں گے، تب انہوں نے ان کے خلاف دعاء ضرر کی، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسا عذاب نازل کیا جس نے ان کو ملیامیٹ کر دیا۔

اور اگر اس آیت میں ظن بہ معنی گمان ہو تو اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جب رسول اپنی قوموں کے ایمان لانے سے

مایوس ہوگئے تو انہوں نے یہ گمان کیا کہ جو لوگ ان پر ایمان لاچکے ہیں وہ اب ان کی تکذیب کریں گے کہ رسولوں نے کافروں پر جس عذاب کا وعدہ کیا تھا وہ عذاب اب تک نہیں آیا' اور جب رسولوں نے اپنی امتوں کے متعلق یہ گمان کیا تو کافروں پر عذاب آگیا اور اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو اور مومنوں کو اس عذاب سے بچالیا اور حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس آیت کی جو تاویل کی ہے وہ بہت عمدہ تاویل ہے۔ (تفسیر کبیر ج ٦' ص ۵۲۱' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۵ھ)

امام رازی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے عروہ نے سوال کیا کہ یوسف: ۱۱۰ میں لفظ کذبوا تشدید کے ساتھ ہے یا بغیر تشدید کے' حضرت عائشہ نے فرمایا: بلکہ ان کی قوم نے ان کی تکذیب کی تھی (یعنی یہ لفظ تشدید کے ساتھ ہے) پس میں نے کہا: اللہ کی قسم! ان کو یہ یقین تھا کہ ان کی قوم نے ان کی تکذیب کی ہے اور یہ ان کا گمان نہیں تھا! حضرت عائشہ نے فرمایا: اے عروہ! انہیں اس کا یقین تھا۔ عروہ نے کہا: شاید یہ لفظ بغیر تشدید کے ہو (یعنی انبیاء علیہم السلام نے یہ گمان کیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا) حضرت عائشہ نے فرمایا: معاذ اللہ! رسول اپنے رب کے ساتھ یہ گمان نہیں کر سکتے اور رہی یہ آیت تو یہ رسولوں کے پیروکار تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور انہوں نے رسولوں کی تصدیق کی تھی اور جب ان تک اللہ کی مدد پہنچنے میں دیر ہوگئی' حتیٰ کہ رسولوں کی امتوں میں سے جن لوگوں نے ان کی تصدیق کی تھی وہ اللہ کی مدد آنے سے مایوس ہوگئے اور رسولوں نے یہ گمان کرلیا کہ اب ان کے پیروکار بھی ان کی تکذیب کریں گے تو اللہ کی مدد آگئی۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۸۹)

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت کی چار توجیہات پیش کی گئی ہیں: کذبوا بغیر تشدید کے جو پڑھا گیا ہے اس کی دو توجیہات ہیں: پہلی توجیہ کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں نے یہ گمان کیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا' یہ صحیح توجیہ ہے اور دوسری توجیہ کا خلاصہ ہے کہ رسولوں نے یہ گمان کیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا' یہ باطل توجیہ ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو رد کر دیا ہے اور امام رازی نے بھی ان کی موافقت کی ہے۔ اور اگر کذبوا کو تشدید کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کی بھی دو توجیہات ہیں: پہلی توجیہ کا حاصل یہ ہے کہ رسولوں نے یہ یقین کرلیا کہ ان کی امتوں نے ان کی تکذیب کردی ہے' اور دوسری توجیہ یہ ہے کہ رسولوں نے یہ گمان کیا کہ جو لوگ ان پر ایمان لاچکے ہیں وہ اب ان کی تکذیب کریں گے' یہ حضرت ام المومنین کی توجیہ ہے اور یہ سب سے بہترین توجیہ ہے۔

اس آیت کے ترجمہ میں بعض مترجمین کی لغزش

شیخ محمود حسن متوفی ۱۳۳۹ھ نے اس آیت کے ترجمہ میں لکھا ہے:

یہاں تک کہ جب ناامید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا پہنچی ان کو ہماری مدد پھر بچا دیا ہم نے جن کو چاہا۔

اور شیخ اشرف علی تھانوی متوفی ۱۳۶۴ھ نے اس آیت کے ترجمہ میں لکھا ہے:

یہاں تک کہ پیغمبر مایوس ہوگئے اور ان کو گمان غالب ہوگیا کہ ہمارے فہم نے غلطی کی' ان کو ہماری مدد پہنچی پھر ہم نے جس کو چاہا' وہ بچالیا گیا۔

مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی ۱۳۹۶ھ نے بھی انہی ترجموں کو مقرر رکھا ہے۔ (معارف القرآن ج ۵' ص ۱۶۱)

واضح رہے کہ یہ ترجمے اس روایت پر مبنی ہیں جس کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رد کردیا ہے اور امام رازی نے

اس روایت کو باطل قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ کوئی عام مسلمان بھی یہ گمان نہیں کر سکتا کہ اللہ نے اس سے جھوٹ بولا تھا چہ جائیکہ رسول یہ گمان کریں اور حضرت ابن عباس کی طرف جو یہ روایت منسوب کی ہے اس کی توجیہ یہ ہے کہ اس میں مجاز بالحذف ہے یعنی رسولوں کے پیروکاروں نے یہ گمان کیا تھا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا اور اس روایت کے ظاہر سے حضرت ابن عباس کی تنزیہ کرنا واجب ہے۔ (فتح الباری ج ۸، ص ۳۶۹-۳۶۸)

امام رازی کے علاوہ دیگر مفسرین نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے، ہم چند مفسرین کے حوالے پیش کر رہے ہیں:

امام عبدالرحمن محمد بن علی جوزی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

اس آیت کا معنی ہے: ہم نے آپ سے پہلے صرف مردوں کو رسول بنایا، انہوں نے اپنی قوم کو تبلیغ کی، سو انہوں نے ان رسولوں کی تکذیب کی، تو انہوں نے صبر کیا وہ بڑے عرصہ تک قوم کو دعوت دیتے رہے اور قوم ان کو جھٹلاتی رہی حتیٰ کہ جب رسول مایوس ہو گئے، حضرت ابن عباس نے کہا: وہ اپنی قوم کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے، ایک قراءت کذبوا میں تشدید کی ہے اور معنی یہ ہے کہ رسولوں نے یقین کر لیا کہ ان کی قوم نے ان کی تکذیب کی ہے، اور دوسری قراءت تخفیف کی ہے اور معنی یہ ہے کہ ان کی قوم نے یہ گمان کیا کہ رسولوں نے جو ان سے اللہ تعالیٰ کی مدد کا وعدہ کیا تھا، وہ جھوٹا نکلا تو پھر ہماری مدد آ گئی پس ہم جس کو چاہتے ہیں عذاب سے نجات دیتے ہیں، اور مجرموں کی قوم سے ہمارا عذاب دور نہیں کیا جاتا۔

(زاد المسیر ج ۴، ص ۲۹۶، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ قوم نے یہ گمان کیا کہ رسولوں نے ان کو جو عذاب آنے کی خبر دی تھی وہ جھوٹ تھا، اور ایک قول یہ ہے کہ ان کی امتوں نے یہ گمان کیا کہ رسولوں نے جو ان سے اللہ کی مدد آنے کا وعدہ کیا تھا وہ جھوٹ تھا، اور حضرت ابن عباس سے ایک روایت یہ ہے کہ رسولوں نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے جو وعدہ کیا تھا، اس نے اس کے خلاف کیا اور ایک قول یہ ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ رسولوں کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسا گمان کریں گے اور اگر وہ ایسا گمان کرتے تو وہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے مستحق نہ ہوتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث جو بخاری میں ہے، اس میں بھی اسی کی تائید ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۹، ص ۲۴۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ ابو الحیان محمد بن یوسف اندلسی متوفی ۷۵۴ھ لکھتے ہیں:

ابو علی نے کہا: جس شخص نے اس آیت کا یہ معنی کیا کہ رسولوں نے یہ گمان کیا کہ اللہ نے ان کی زبانوں سے ان کی امتوں کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا اس میں انہوں نے جھوٹ بولا تھا، اور جس شخص نے یہ کہا ہے اس نے بہت بڑی جسارت کی ہے، انبیاء علیہم السلام کی طرف اس طرح کے گمان کی نسبت کرنا جائز ہے اور نہ اللہ کے نیک بندوں کی طرف، اسی طرح جس نے یہ گمان کیا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ مذہب کہ رسول کمزور تھے اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ ان کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کے خلاف کیا گیا ہے، یہ بھی جائز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ رسولوں کی قوموں نے یہ گمان کیا کہ ان کے ساتھ جھوٹا وعدہ کیا گیا تھا۔

(البحر المحیط ج ۶، ص ۳۳۶، ملخصاً مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۲ھ)

حافظ عمر بن اسماعیل بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ لکھتے ہیں:

قریش کے ایک نوجوان نے سعید بن جبیر سے سوال کیا مجھے بتایئے اس آیت کا کیا معنی ہے، میں جب اس آیت کو پڑھتا

ہوں تو میں یہ تمنا کرتا ہوں کہ کاش میں نے اس آیت کو نہ پڑھا ہوتا: حتی اذا استیئس الرسل وظنوا انھم قد کذبوا۔ سعید بن جبیر نے کہا: ہاں! جب رسول اپنی قوموں سے مایوس ہو گئے کہ وہ ان کی تصدیق کریں گے اور ان کی قوموں نے یہ گمان کیا کہ انہوں نے ان سے جھوٹ بولا تھا' پھر امام ابن جریر نے ایک اور سند سے روایت کیا ہے کہ مسلم بن یسار نے سعید بن جبیر سے سوال کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا' تو انہوں نے کھڑے ہو کر سعید کو گلے لگایا اور کہا: اللہ آپ کی پریشانیوں کو دور کرے جس طرح آپ نے میری پریشانیوں کو دور کیا ہے اور امام ابن جریر نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اپنی قوموں کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے اور عذاب آنے میں تاخیر کی وجہ سے ان کی قوم نے یہ گمان کیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا' حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود دونوں سے اسی طرح روایت ہے اور حضرت ابن عباس کے دوسرے قول کو امام ابن جریر نے بالکل کمزور قرار دیا ہے اور اس کو مسترد کر دیا ہے اور اس کا انکار کر دیا اور اس کو قبول نہیں کیا اور اس سے راضی نہیں ہوئے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲' ص ۵۵۰' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۹ھ)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

بعض لوگوں نے یہ تاویل کی ہے کہ ان رسولوں نے اپنی قوم پر عذاب آنے کی خبر دی تھی اور ان کے لیے اس کا وقت معین نہیں کیا گیا تھا تو انہوں نے اپنے اجتہاد سے اس کا وقت مقرر کر لیا' جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے حدیبیہ کے سال کو اپنے اجتہاد سے عمرہ کے لیے مقرر کر لیا تھا' اور جب کافی مدت گزرنے کے بعد بھی عذاب نہیں آیا تو رسول مایوس ہو گئے اور انہوں نے اپنے اجتہاد کی تغلیط اور تکذیب کی' اس کو اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: حتیٰ کہ جب رسول مایوس ہو گئے اور انہوں نے (اپنے اجتہاد کی) تکذیب کی' اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا وعدہ عذاب کی تکذیب کی لہٰذا کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔

اس کے بعد علامہ آلوسی اس تاویل کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کہ رسل علیہم السلام کی تعظیم کے زیادہ موافق اور جو چیز ان کی شان کے لائق نہیں ہے اس کو ان سے زیادہ دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کی طرف اللہ سے بدگمانی کی نسبت کرنے کے بجائے ان کی قوم کی طرف یہ نسبت کی جائے یعنی ان کی قوم نے یہ گمان کیا تھا کہ رسولوں نے ان سے جھوٹا وعدہ کیا ہے۔

(روح المعانی جز ۱۳' ص ۱۰۴-۱۰۳' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۷ھ)

علامہ آلوسی نے یہ غور نہیں کیا کہ اس تاویل میں بڑی خرابی یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے وعدہ عذاب سے مایوس ہو گئے حالانکہ اللہ تعالیٰ سے مایوس ہونا کفر ہے اور جب کہ حضرت ابن عباس کی صحیح روایت کی بناء پر معنی یہ ہو گا کہ رسل عظام اپنی قوم کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے اور بڑے عرصہ تک عذاب نہ آنے کی وجہ سے ان کی قوم نے یہ گمان کیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا' نیز جس تاویل کی بنا پر انبیاء علیہم السلام کی طرف اللہ سے بدگمانی کی نسبت لازم آتی ہے اس کو صرف خلاف اولیٰ کہنا بھی درست نہیں بلکہ اس کو ناجائز کہہ کر مسترد کر دینا چاہیے۔ جس طرح امام رازی اور امام ابوالحیان اندلسی نے کیا ہے اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جس طرح اس روایت کو مسترد کر دیا ہے۔

قرآن مجید کی آیات کے ترجمہ میں اس چیز کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ کوئی ایسی بات نہ کی جائے جو انبیاء علیہم السلام کی شان کے ناموافق ہو۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی اور شیخ امین احسن اصلاحی عام طور پر اس کا خیال نہیں رکھتے لیکن یہاں ان کا ترجمہ حضرت ابن عباس کی صحیح اور غیر مووّل روایت پر مبنی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک ان کے قصوں میں عقل والوں کے لیے نصیحت ہے یہ (قرآن) کوئی من گھڑت بات نہیں ہے، بلکہ یہ ان کتابوں کا مصدق ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئیں اور اس میں ہر چیز کی تفصیل ہے اور یہ مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے○ (یوسف: ۱۱۱)

حضرت یوسف کے قصہ کا احسن القصص ہونا

ان کے قصوں سے مراد حضرت یوسف، ان کے بھائیوں اور ان کے والد کے قصے ہیں اور کسی قصہ کا حسن یہ ہوتا ہے کہ اس میں نصیحت ہو اور حکمت ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس میں عقل والوں کے لیے نصیحت ہے، یعنی جو ان واقعات میں غور و فکر کریں کہ جو شخص کسی کے ظلم و ستم پر صبر کرے اور جب اسے کوئی حسین، جوان اور مقتدر عورت گناہ کی دعوت دے اور وہ اس سے اپنا دامن بچائے خواہ اس کے نتیجہ میں اس کو قید و بند کے مصائب اٹھانے پڑیں تو اللہ تعالیٰ اس کو بہت عمدہ جزا دیتا ہے، اور وہ بھائی جو اپنی طاقت کے بل پر حضرت یوسف پر ظلم کر رہے تھے، ایک وقت آیا کہ وہ حضرت یوسف کے پاس غلہ کی خیرات لینے آئے اور وہ سب ان کے سامنے سجدہ ریز ہوئے، اس سے معلوم ہوا کہ ظالم بالآخر ناکام ہوتا ہے اور مظلوم انجام کار کامیاب ہوتا ہے۔

فرمایا: یہ قرآن کوئی من گھڑت بات نہیں یعنی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یوسف کا قصہ بیان کیا ہے یہ کوئی جھوٹ نہیں ہے بلکہ سابقہ آسمانی کتابوں کے موافق ہے اور ان کا مصدق ہے۔

قرآن مجید میں ہر شے کی تفصیل کا محمل

اور فرمایا: اس میں ہر چیز کی تفصیل ہے، اس کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ اس میں حضرت یوسف کے قصہ کی پوری تفصیل ہے، اور اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اس قرآن میں بندوں کی دنیا اور آخرت کی فلاح سے متعلق تمام احکام شرعیہ کی تفصیل ہے اور ان کی رشد و ہدایت اور اصلاح عقائد اور مبداء اور معاد کی تمام تفصیل اس میں موجود ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ اس میں ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک رونما ہونے والے تمام واقعات کی تفصیل ہے اور آسمانوں اور زمینوں کے تمام حقائق اور ان کے تمام اسرار و رموز اور ان کے تمام منافع اور مضار کی تفصیلات اس قرآن میں ہیں کیونکہ قرآن مجید تاریخ، جغرافیہ اور سائنس کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ رشد و ہدایت کی کتاب ہے اور اس میں رشد اور ہدایت سے متعلق تمام تفصیلات ہیں۔

نیز فرمایا: یہ ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے، قرآن مجید ہدایت تو تمام انسانوں کے لیے ہے، لیکن اس کی ہدایت سے صرف ایمان والے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس لیے فرمایا: یہ قرآن ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

حرفِ آخر

آج مورخہ ۸ ذوالحجہ ۱۴۲۰ھ / ۱۵ مارچ ۲۰۰۰ء کو الحمد للہ سورۂ یوسف کی تفسیر مکمل ہو گئی۔ تبیان القرآن کی یہ پانچویں جلد، ۱۷ مارچ ۱۹۹۹ء کو شروع کی تھی اور آج ۱۵ مارچ ۲۰۰۰ء کو یہ جلد پایہ تکمیل کو پہنچ گئی، اور آج وہ مبارک دن ہے کہ مکہ مکرمہ میں آج یوم عرفہ ہے اور مسلمان حج بیت اللہ کی سعادت سے بہرہ مند ہو رہے ہیں۔ اس جلد میں سورۂ توبہ، سورۂ یونس، سورۂ ھود اور سورۂ یوسف کی تفسیر آ گئی ہے، الٰہ العالمین! آپ نے جس طرح سورۂ یوسف کی تفسیر لکھوا دی ہے، اپنے فضل و کرم سے بقیہ سورتوں کی تفسیر بھی مجھ سے لکھوا دیں، مجھے نیکی اور صحت و عافیت کے ساتھ تاحیات قائم رکھیں اور عزت و کرامت کے ساتھ ایمان پر خاتمہ فرمائیں اور مجھے صالحین کے ساتھ لاحق کر دیں، ہر چند کہ میں ناکارہ اور نااہل ہوں مگر محض

اپنے کرم سے مجھے مرنے سے پہلے اپنے محبوب سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور مرنے کے بعد آپ کی شفاعت عطا فرمائیں اور محض اپنے فضل سے میری مغفرت فرمائیں، اس کتاب کو فیض آفریں بنائیں، اس کے مصنف، اس کے ناشر، اس کے کمپوزر اور مصحح کو، اس کے قارئین اور معاونین کو دنیا اور آخرت کی ہر بلاء اور ہر عذاب سے مامون اور محفوظ رکھیں اور دنیا اور آخرت کی ہر سعادت اور کامیابی اور ہر خوشی عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین، قائد المرسلین اول الشافعین والمشفعین وعلی الہ المطہرین واصحابہ الکاملین وعلی ازواجہ امہات المؤمنین وعلی اولیاء امتہ وعلماء ملتہ اجمعین۔



مآخذ و مراجع

کتب الٰہیہ

۱- قرآن مجید
۲- تورات
۳- انجیل

کتب احادیث

۴- امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت، متوفی ۱۵۰ھ، مسند امام اعظم، مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز، کراچی
۵- امام مالک بن انس اصبحی، متوفی ۱۷۹ھ، موطا امام مالک، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۹ھ
۶- امام عبد اللہ بن مبارک، متوفی ۱۸۱ھ، کتاب الزہد، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
۷- امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم، متوفی ۱۸۲ھ، کتاب الآثار، مطبوعہ مکتبہ اثریہ، سانگلہ ہل
۸- امام محمد بن حسن شیبانی، متوفی ۱۸۹ھ، موطا امام محمد، مطبوعہ نور محمد، کارخانہ تجارت کتب کراچی
۹- امام محمد بن حسن شیبانی، متوفی ۱۸۹ھ، کتاب الآثار، مطبوعہ ادارۃ القرآن، کراچی، ۱۴۰۷ھ
۱۰- امام وکیع بن جراح متوفی ۱۹۷ھ، کتاب الزہد، مکتبۃ الدار مدینہ منورہ، ۱۴۰۴ھ
۱۱- امام سلیمان بن داؤد بن جارود طیالسی حنفی، متوفی ۲۰۳ھ، مسند طیالسی، مطبوعہ ادارۃ القرآن، کراچی، ۱۳۹۱ھ
۱۲- امام محمد بن ادریس شافعی، متوفی ۲۰۴ھ، المسند، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۰ھ
۱۳- امام محمد بن عمر بن واقد متوفی ۲۰۷ھ، کتاب المغازی، مطبوعہ عالم الکتب، بیروت، ۱۴۰۴ھ
۱۴- امام عبد الرزاق بن ہمام صنعانی، متوفی ۲۱۱ھ، المصنف مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۹۰ھ
۱۵- امام عبد اللہ بن الزبیر حمیدی، متوفی ۲۱۹ھ، المسند، مطبوعہ عالم الکتب بیروت
۱۶- امام سعید بن منصور خراسانی، مکی، متوفی ۲۲۷ھ، سنن سعید بن منصور، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

۱۷- امام ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ، متوفی ۲۳۵ھ، المصنف، مطبوعہ ادارۃ القرآن، کراچی، ۱۴۰۶ھ، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۶ھ

۱۸- امام ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ، متوفی ۲۳۵ھ، مسند ابن ابی شیبہ، مطبوعہ دار الوطن بیروت، ۱۴۱۸ھ

۱۹- امام احمد بن حنبل، متوفی ۲۴۱ھ، المسند، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۳۹۸ھ، دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ، دار الحدیث قاہرہ، ۱۴۱۶ھ، عالم الکتب بیروت، ۱۴۱۹ھ

۲۰- امام احمد بن حنبل، متوفی ۲۴۱ھ، کتاب الزہد، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۴ھ

۲۱- امام ابو عبد اللہ بن عبد الرحمٰن دارمی، متوفی ۲۵۵ھ، سنن دارمی، مطبوعہ دار الکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ

۲۲- امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری، متوفی ۲۵۶ھ، صحیح بخاری، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۲ھ دار ارقم بیروت۔

۲۳- امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری، متوفی ۲۵۶ھ، خلق افعال العباد، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ بیروت، ۱۴۱۱ھ

۲۴- امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری، متوفی ۲۵۶ھ، الادب المفرد، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۱۲ھ

۲۵- امام ابو الحسین مسلم بن حجاج قشیری، متوفی ۲۶۱ھ، صحیح مسلم، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ

۲۶- امام ابو عبد اللہ محمد بن یزید ابن ماجہ، متوفی ۲۷۳ھ، سنن ابن ماجہ، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ، دار الجیل بیروت، ۱۴۱۸ھ

۲۷- امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث، بجستانی، متوفی ۲۷۵ھ، سنن ابو داؤد، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ

۲۸- امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث بجستانی، متوفی ۲۷۵ھ، مراسیل ابو داؤد، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت، کتب کراچی

۲۹- امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ، سنن ترمذی، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ، دار الجیل بیروت، ۱۹۹۸ء

۳۰- امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ، شمائل محمدیہ، مطبوعہ المکتبۃ التجاریہ، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۵ھ

۳۱- امام علی بن عمر دار قطنی، متوفی ۲۸۵ھ، سنن دار قطنی، مطبوعہ نشر السنہ، ملتان، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ

۳۲- امام ابن ابی عاصم، متوفی ۲۸۷ھ، الاحاد والمثانی، مطبوعہ دار الرایہ، ریاض، ۱۴۱۱ھ

۳۳- امام احمد عمرو بن عبد الخالق بزار، متوفی ۲۹۲ھ، البحر الزخار المعروف بہ مسند البزار، مطبوعہ مؤسسۃ القرآن، بیروت

۳۴- امام ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ، سنن نسائی، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۱۲ھ

۳۵- امام ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ، عمل الیوم واللیلہ مطبوعہ مؤسسۃ الکتب الثقافیہ، بیروت، ۱۴۰۸ھ

۳۶- امام ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ، سنن کبریٰ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۱ھ

۳۷- امام ابو بکر محمد بن ہارون الرویانی، متوفی ۳۰۷ھ، مسند الصحابہ، مطبوعہ دار لکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ

۳۸- امام احمد بن علی المثنی التمیمی، المتوفی ۳۰۷ھ، مسند ابو یعلیٰ موصلی، مطبوعہ دار المامون تراث بیروت، ۱۴۰۴ھ

۳۹- امام عبد اللہ بن علی بن جارود نیشاپوری، متوفی ۳۰۷ھ، المنتقیٰ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ

۴۰- امام محمد بن اسحاق بن خزیمہ، متوفی ۳۱۱ھ، صحیح ابن خزیمہ، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۹۵ھ

۴۱- امام ابو بکر محمد بن محمد بن سلیمان باغندی، متوفی ۳۱۲ھ، مسند عمر بن عبد العزیز۔

۴۲- امام ابو عوانہ یعقوب بن اسحاق، متوفی ۳۱۶ھ، مسند ابو عوانہ، مطبوعہ دار الباز مکہ مکرمہ

۴۳- امام ابو عبد اللہ محمد الحکیم الترمذی، المتوفی ۳۲۰ھ، نوادر الاصول، مطبوعہ دار الریان التراث القاہرہ، ۱۴۰۸ھ

۴۴- امام ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی، متوفی ۳۲۱ھ، شرح مشکل الآثار، مطبوعہ مؤسستہ الرسالہ بیروت، ۱۴۱۵ھ
۴۵- امام ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی، متوفی ۳۲۱ھ، شرح معانی الآثار، مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان لاہور، ۱۴۰۴ھ
۴۶- امام ابو جعفر محمد بن عمرو العقیلی متوفی ۳۲۲ھ، کتاب الضعفاء الکبیر، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ
۴۷- امام محمد بن جعفر بن حسین خرائطی، متوفی ۳۲۷ھ، مکارم الاخلاق، مطبوعہ مطبعہ المدنی مصر، ۱۴۱۱ھ
۴۸- امام ابو حاتم محمد بن حبان البستی، متوفی ۳۵۴ھ، الاحسان بہ ترتیب صحیح ابن حبان، مطبوعہ مؤسستہ الرسالہ بیروت، ۱۴۰۷ھ
۴۹- امام ابو بکر احمد بن حسین آجری، متوفی ۳۶۰ھ، الشریعہ مطبوعہ مکتبہ دار السلام، ریاض، ۱۴۱۳ھ
۵۰- امام ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی، المتوفی ۳۶۰ھ، معجم صغیر، مطبوعہ مکتبہ سلفیہ، مدینہ منورہ، ۱۳۸۸ھ، مکتب اسلامی بیروت، ۱۴۰۵ھ
۵۱- امام ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی، المتوفی ۳۶۰ھ، معجم اوسط، مطبوعہ مکتبہ المعارف، ریاض، ۱۴۰۵ھ
۵۲- امام ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی، المتوفی ۳۶۰ھ، معجم کبیر، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت
۵۳- امام ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی، المتوفی ۳۶۰ھ، مسند الشامیین، مطبوعہ مؤسستہ الرسالہ بیروت، ۱۴۰۹ھ
۵۴- امام ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی، المتوفی ۳۶۰ھ، کتاب الدعاء مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۳ھ
۵۵- امام ابو بکر احمد بن اسحاق دینوری المعروف بابن السنی، متوفی ۳۶۴ھ، عمل الیوم واللیلۃ، مطبوعہ مؤسستہ الکتب الثقافیہ، بیروت، ۱۴۰۸ھ
۵۶- امام عبد اللہ بن عدی الجرجانی، المتوفی ۳۶۵ھ، الکامل فی ضعفاء الرجال، مطبوعہ دار الفکر بیروت، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۲ھ
۵۷- امام ابو حفص عمر بن احمد المعروف بابن شاہین المتوفی ۳۸۵ھ، الناسخ و المنسوخ من الحدیث، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۲ھ
۵۸- امام عبد اللہ بن محمد بن جعفر المعروف بابی الشیخ، متوفی ۳۹۶ھ، کتاب العظمہ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
۵۹- امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حاکم نیشاپوری، متوفی ۴۰۵ھ، المستدرک، مطبوعہ دار الباز مکہ مکرمہ
۶۰- امام ابو نعیم احمد بن عبد اللہ اصبہانی، متوفی ۴۳۰ھ، حلیۃ الاولیاء، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ
۶۱- امام ابو نعیم احمد بن عبد اللہ اصبہانی، متوفی ۴۳۰ھ، دلائل النبوۃ، مطبوعہ دار النفائس، بیروت
۶۲- امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی، متوفی ۴۵۸ھ، سنن کبریٰ، مطبوعہ نشر السنہ، ملتان۔
۶۳- امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی، متوفی ۴۵۸ھ، کتاب الاسماء والصفات، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت
۶۴- امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی، متوفی ۴۵۸ھ معرفۃ السنن والآثار، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
۶۵- امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی، متوفی ۴۵۸ھ، دلائل النبوۃ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
۶۶- امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی، متوفی ۴۵۸ھ، کتاب الآداب، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۶ھ
۶۷- امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی، متوفی ۴۵۸ھ، کتاب فضائل الاوقات، مطبوعہ مکتبہ المنارۃ مکہ مکرمہ، ۱۴۱۰ھ
۶۸- امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی، متوفی ۴۵۸ھ، شعب الایمان، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۱ھ
۶۹- امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی، متوفی ۴۵۸ھ، البعث والنشور، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۴ھ

۷۰- امام ابو عمر یوسف ابن عبد البر قرطبی، متوفی ۴۶۳ھ، جامع بیان العلم و فضلہ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
۷۱- امام ابو شجاع شیرویہ بن شہردار بن شیرویہ الدیلمی، المتوفی ۵۰۹ھ، الفردوس بماثور الخطاب، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۶ھ
۷۲- امام حسین بن مسعود بغوی، متوفی ۵۱۶ھ، شرح السنہ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۲ھ
۷۳- امام ابو القاسم علی بن الحسن ابن عساکر، متوفی ۵۷۱ھ، مختصر تاریخ دمشق، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۴ھ
۷۴- امام ابو القاسم علی بن الحسن ابن عساکر، متوفی ۵۷۱ھ، تہذیب تاریخ دمشق، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ
۷۵- امام مجد الدین المبارک بن محمد الشیبانی، المعروف بابن الاثیر الجزری، المتوفی ۶۰۶ھ، جامع الاصول، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ
۷۶- امام ضیاء الدین محمد بن عبد الواحد مقدسی حنبلی متوفی ۶۴۳ھ، الاحادیث المختارۃ، مطبوعہ مکتبہ النہضۃ الحدیثیہ، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۰ھ
۷۷- امام زکی الدین عبد العظیم بن عبد القوی المنذری، المتوفی ۶۵۶ھ، الترغیب والترہیب، مطبوعہ دار الحدیث، قاہرہ، ۱۴۰۷ھ، دار ابن کثیر بیروت، ۱۴۱۴ھ
۷۸- امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی، متوفی ۶۶۸ھ، التذکرۃ فی امور الآخرۃ، مطبوعہ دار البخاری، مدینہ منورہ
۷۹- حافظ شرف الدین عبد المومن دمیاطی متوفی ۷۰۵ھ المتجر الرابح، مطبوعہ دار خضر بیروت، ۱۴۱۹ھ
۸۰- امام ولی الدین تبریزی، متوفی ۷۴۲ھ، مشکوۃ، مطبوعہ اصح المطابع دہلی، دار ارقم بیروت
۸۱- حافظ جمال الدین عبد اللہ بن یوسف زیلعی، متوفی ۷۶۲ھ، نصب الرایہ، مطبوعہ مجلس علمی سورت ہند، ۱۳۵۷ھ
۸۲- امام محمد بن عبد اللہ زرکشی، متوفی ۷۹۴ھ، اللآلی المنثورۃ، مکتب اسلامی، بیروت، ۱۴۱۷ھ
۸۳- حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی، المتوفی ۸۰۷ھ، مجمع الزوائد، مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت، ۱۴۰۲ھ
۸۴- حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی، المتوفی ۸۰۷ھ، کشف الاستار، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ بیروت، ۱۴۰۴ھ
۸۵- حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی، المتوفی ۸۰۷ھ، موارد الظمآن، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
۸۶- امام محمد بن محمد جزری، متوفی ۸۳۳ھ، حصن حصین، مطبوعہ مصطفیٰ البابی واولادہ، مصر، ۱۳۵۰ھ
۸۷- امام ابو العباس احمد بن ابو بکر بوصیری، شافعی، متوفی ۸۴۰ھ، زوائد ابن ماجہ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
۸۸- حافظ علاء الدین بن علی بن عثمان ماردینی ترکمان، متوفی ۸۴۵ھ، الجوہر النقی، مطبوعہ نشر السنہ ملتان
۸۹- حافظ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی، متوفی ۸۴۸ھ، تلخیص المستدرک، مطبوعہ مکتبہ دار الباز مکہ مکرمہ
۹۰- حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی، متوفی ۸۵۲ھ، المطالب العالیہ، مطبوعہ مکتبہ دار الباز مکہ مکرمہ
۹۱- امام عبد الرؤف بن علی المناوی، المتوفی ۱۰۳۱ھ، کنوز الحقائق، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ
۹۲- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، الجامع الصغیر، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ۱۳۹۱ھ
۹۳- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، مسند فاطمہ الزہراء
۹۴- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، جامع الاحادیث الکبیر، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۴ھ

۹۵- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، البدور السافرہ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۶ھ، دار ابن حزم بیروت، ۱۴۱۴ھ
۹۶- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، الخصائص الکبریٰ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۵ھ
۹۷- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، الدر المنتثرہ، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ
۹۸- علامہ عبدالوہاب شعرانی، متوفی ۹۷۳ھ، کشف الغمہ، مطبوعہ مطبع عامرہ، عثمانیہ، مصر، ۱۳۰۳ھ، دار الفکر بیروت، ۱۴۰۸ھ
۹۹- علامہ علی متقی بن حسام الدین ہندی برہان پوری، متوفی ۹۷۵ھ، کنز العمال، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ بیروت

کتب تفاسیر

۱۰۰- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، متوفی ۶۸ھ، تنویر المقباس، مطبوعہ مکتبہ آیت اللہ العظمیٰ ایران
۱۰۱- امام حسن بن عبداللہ البصری، المتوفی ۱۱۰ھ، تفسیر الحسن البصری، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ مکہ مکرمہ، ۱۴۱۳ھ
۱۰۲- امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس شافعی، متوفی ۲۰۴ھ، احکام القرآن، مطبوعہ دار احیاء العلوم بیروت، ۱۴۱۰ھ
۱۰۳- امام ابوزکریا یحییٰ بن زیاد فراء متوفی ۲۰۷ھ، معانی القرآن، مطبوعہ بیروت
۱۰۴- امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانی، متوفی ۲۱۱ھ، تفسیر القرآن العزیز، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت
۱۰۵- شیخ ابوالحسن علی بن ابراہیم قمی، متوفی ۳۰۷ھ، تفسیر قمی، مطبوعہ دار الکتاب ایران، ۱۴۰۴ھ
۱۰۶- امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری، متوفی ۳۱۰ھ، جامع البیان، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ۱۴۰۹ھ، دار الفکر بیروت
۱۰۷- امام ابواسحاق ابراہیم بن محمد الزجاج، متوفی ۳۱۱ھ، اعراب القرآن، مطبوعہ مطبع سلمان فارسی ایران، ۱۴۰۶ھ
۱۰۸- امام عبدالرحمٰن بن محمد بن ادریس بن ابی حاتم رازی، متوفی ۳۲۷ھ، تفسیر القرآن العزیز، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ
۱۰۹- امام ابوبکر احمد بن علی رازی، جصاص حنفی، متوفی ۳۷۰ھ، احکام القرآن، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۴۰۰ھ
۱۱۰- علامہ ابواللیث نصر بن محمد سمرقندی، متوفی ۳۷۵ھ، تفسیر سمرقندی، مطبوعہ مکتبہ دار الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۳ھ
۱۱۱- شیخ ابوجعفر محمد بن حسن طوسی، متوفی ۳۸۵ھ، التبیان فی تفسیر القرآن، مطبوعہ عالم الکتب بیروت
۱۱۲- علامہ مکی بن ابی طالب متوفی ۴۳۷ھ، مشکل اعراب القرآن، مطبوعہ انتشارات نور ایران، ۱۳۶۲ھ
۱۱۳- علامہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب ماوردی شافعی، متوفی ۴۵۰ھ، النکت والعیون، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
۱۱۴- علامہ ابوالحسن علی بن احمد واحدی نیشاپوری، متوفی ۴۶۸ھ، الوسیط، مطبوعہ دار الکتب العربیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ
۱۱۵- امام ابوالحسن علی بن احمد الواحدی، المتوفی ۴۶۸ھ، اسباب نزول القرآن، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
۱۱۶- امام ابوالحسن علی بن احمد الواحدی، المتوفی ۴۶۸ھ، الوسیط، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ
۱۱۷- امام ابومحمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی، المتوفی ۵۱۶ھ، معالم التنزیل، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ
۱۱۸- علامہ محمود بن عمر زمخشری، متوفی ۵۳۸ھ، الکشاف، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۷ھ
۱۱۹- علامہ ابوبکر محمد بن عبداللہ المعروف بابن العربی، مالکی، متوفی ۵۴۳ھ، احکام القرآن، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت

۱۲۰- علامہ ابو بکر قاضی عبدالحق بن غالب بن عطیہ اندلسی، متوفی ۵۴۶ھ، المحرر الوجیز، مطبوعہ مکتبہ تجاریہ مکہ مکرمہ
۱۲۱- شیخ ابو علی فضل بن حسن طبرسی، متوفی ۵۴۸ھ، مجمع البیان، مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران، ۱۴۰۶ھ
۱۲۲- علامہ ابو الفرج عبدالرحمٰن بن علی بن محمد جوزی حنبلی، متوفی ۵۹۷ھ، زاد المسیر، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت
۱۲۳- خواجہ عبداللہ انصاری من علماء القرن السادس، کشف الاسرار، وعدۃ الابرار، مطبوعہ انتشارات امیر کبیر تہران
۱۲۴- امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی، متوفی ۶۰۶ھ، تفسیر کبیر، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ
۱۲۵- علامہ محی الدین ابن عربی، متوفی ۶۳۸ھ، تفسیر القرآن الکریم، مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران، ۱۹۷۸ء
۱۲۶- علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی، متوفی ۶۶۸ھ، الجامع لاحکام القرآن مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ
۱۲۷- قاضی ابو الخیر عبداللہ بن عمر بیضاوی شیرازی شافعی، متوفی ۶۸۵ھ، انوار التنزیل، مطبوعہ دار فراس للنشر والتوزیع مصر
۱۲۸- علامہ ابو البرکات احمد بن محمد نسفی، متوفی ۷۱۰ھ، مدارک التنزیل، مطبوعہ دار الکتب العربیہ پشاور
۱۲۹- علامہ علی بن محمد خازن شافعی، متوفی ۷۲۵ھ، لباب التاویل، مطبوعہ دار الکتب العربیہ، پشاور
۱۳۰- علامہ نظام الدین حسین بن محمد قمی، متوفی ۷۲۸ھ، تفسیر نیشاپوری، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۶ھ
۱۳۱- علامہ تقی الدین ابن تیمیہ، متوفی ۷۲۸ھ، التفسیر الکبیر، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۹ھ
۱۳۲- علامہ شمس الدین محمد بن ابی بکر ابن القیم الجوزیہ، متوفی ۷۵۱ھ، بدائع التفسیر، مطبوعہ دار ابن الجوزیہ مکہ مکرمہ
۱۳۳- علامہ ابو الحیان محمد بن یوسف اندلسی، متوفی ۷۵۴ھ، البحر المحیط، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۲ھ
۱۳۴- علامہ ابو العباس بن یوسف السمین الشافعی، متوفی ۷۵۶ھ، الدر المصون، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ
۱۳۵- حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر شافعی متوفی ۷۷۴ھ، تفسیر القرآن، مطبوعہ ادارہ اندلس بیروت، ۱۳۸۵ھ
۱۳۶- علامہ عماد الدین منصور بن الحسن الکازرونی الشافعی، متوفی ۸۶۰ھ، حاشیۃ الکازرونی علی البیضاوی، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۶ھ
۱۳۷- علامہ عبدالرحمٰن بن محمد بن مخلوف ثعالبی، متوفی ۸۷۵ھ، تفسیر الثعالبی، مطبوعہ مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات بیروت
۱۳۸- علامہ ابو الحسن ابراہیم بن عمر البقاعی المتوفی ۸۸۵ھ، نظم الدرر، مطبوعہ دار الکتاب الاسلامی قاہرہ، ۱۴۱۳ھ
۱۳۹- حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ، الدر المنثور، مطبوعہ مکتبہ آیت اللہ العظمٰی ایران
۱۴۰- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، جلالین، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
۱۴۱- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، لباب النقول فی اسباب النزول، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
۱۴۲- علامہ محی الدین محمد بن مصطفیٰ قوجوی، متوفی ۹۵۱ھ، حاشیہ شیخ زادہ علی البیضاوی، مطبوعہ مکتبہ یوسفی دیوبند، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ
۱۴۳- شیخ فتح اللہ کاشانی، متوفی ۹۷۷ھ، منہج الصادقین، مطبوعہ خیابان ناصر خسرو ایران
۱۴۴- علامہ ابو السعود محمد بن محمد عمادی، حنفی متوفی ۹۸۲ھ، تفسیر ابو السعود، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۹۸ھ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ
۱۴۵- علامہ احمد شہاب الدین خفاجی مصری حنفی، متوفی ۱۰۶۹ھ، عنایۃ القاضی، مطبوعہ دار صادر، بیروت، ۱۲۸۳ھ، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ

۱۴۶- علامہ احمد جیون جونپوری، متوفی ۱۱۳۰ھ، التفسیرات الاحمدیہ، مطبع کریمی بمبئی
۱۴۷- علامہ اسماعیل حقی حنفی، متوفی ۱۱۳۷ھ، روح البیان، مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ
۱۴۸- شیخ سلیمان بن عمر المعروف بالجمل، متوفی ۱۲۰۴ھ، الفتوحات الالٰہیہ، مطبوعہ المطبع البہیۃ، مصر، ۱۳۰۳ھ
۱۴۹- علامہ احمد بن محمد صاوی مالکی متوفی ۱۲۲۳ھ، تفسیر صاوی، مطبوعہ دار احیاء الکتب العربیہ، مصر
۱۵۰- قاضی ثناء اللہ پانی پتی، متوفی ۱۲۲۵ھ، تفسیر مظہری، مطبوعہ بلوچستان بک ڈپو کوئٹہ
۱۵۱- شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، متوفی ۱۲۳۹ھ، تفسیر عزیزی، مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی
۱۵۲- شیخ محمد بن علی شوکانی، متوفی ۱۲۵۰ھ، فتح القدیر، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، دار الوفا بیروت، ۱۴۱۸ھ
۱۵۳- علامہ ابو الفضل سید محمود آلوسی حنفی، متوفی ۱۲۷۰ھ، روح المعانی، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، دار الفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ
۱۵۴- نواب صدیق حسن خان بھوپالی، متوفی ۱۳۰۷ھ، فتح البیان، مطبوعہ مطبع امیریہ کبریٰ بولاق مصر، ۱۳۰۱ھ، المکتبۃ العصریہ بیروت، ۱۴۱۲ھ
۱۵۵- علامہ محمد جمال الدین قاسمی، متوفی ۱۳۳۲ھ، تفسیر القاسمی، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۹۸ھ
۱۵۶- علامہ محمد رشید رضا، متوفی ۱۳۵۴ھ، تفسیر المنار، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت
۱۵۷- علامہ حکیم شیخ طنطاوی جوہری مصری، متوفی ۱۳۵۹ھ، الجواہر فی تفسیر القرآن، المکتبۃ الاسلامیہ ریاض
۱۵۸- شیخ اشرف علی تھانوی، متوفی ۱۳۶۴ھ، بیان القرآن، مطبوعہ تاج کمپنی لاہور
۱۵۹- سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، متوفی ۱۳۶۷ھ، خزائن العرفان، مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور
۱۶۰- شیخ محمود الحسن دیوبندی، متوفی ۱۳۳۹ھ و شیخ شبیر احمد عثمانی، متوفی ۱۳۶۹ھ، حاشیۃ القرآن، مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور
۱۶۱- علامہ محمد طاہر بن عاشور، متوفی ۱۳۸۰ھ، التحریر والتنویر، مطبوعہ تونس
۱۶۲- سید محمد قطب شہید، متوفی ۱۳۸۵ھ، فی ظلال القرآن، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۳۸۶ھ
۱۶۳- مفتی احمد یار خان نعیمی، متوفی ۱۳۹۱ھ، نور العرفان، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ گجرات
۱۶۴- مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی ۱۳۹۶ھ، معارف القرآن، مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی، ۱۳۹۷ھ
۱۶۵- سید ابو الاعلیٰ مودودی، متوفی ۱۳۹۹ھ، تفہیم القرآن، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور
۱۶۶- علامہ سید احمد سعید کاظمی، متوفی ۱۴۰۶ھ، التبیان، مطبوعہ کاظمی پبلی کیشنز ملتان
۱۶۷- علامہ محمد امین بن محمد مختار جکنی شنقیطی، اضواء البیان، مطبوعہ عالم الکتب بیروت
۱۶۸- استاذ احمد مصطفیٰ المراغی، تفسیر المراغی، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت
۱۶۹- آیت اللہ مکارم شیرازی، تفسیر نمونہ، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ ایران، ۱۳۶۹ھ
۱۷۰- جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور
۱۷۱- شیخ امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن لاہور
۱۷۲- علامہ محمود صافی، اعراب القرآن و صرفہ و بیانہ، مطبوعہ انتشارات زرین ایران
۱۷۳- استاذ محی الدین درویش، اعراب القرآن و بیانہ، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت

۱۷۴- ڈاکٹر وھبہ زحیلی، تفسیر منیر، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۲ھ
۱۷۵- سعید حوی، الاساس فی التفسیر، مطبوعہ دار السلام

کتب علوم قرآن

۱۷۶- علامہ بدرالدین محمد بن عبداللہ زرکشی متوفی ۷۹۴ھ، البرہان فی علوم القرآن، مطبوعہ دار الفکر بیروت
۱۷۷- علامہ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، الاتقان فی علوم القرآن، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور
۱۷۸- علامہ محمد عبدالعظیم زرقانی، مناہل العرفان، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

کتب شروح حدیث

۱۷۹- حافظ ابو عمر و ابن عبد البر مالکی، متوفی ۴۶۳ھ، الاستذکار، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ بیروت، ۱۴۱۳ھ
۱۸۰- حافظ ابو عمرو ابن عبد البر مالکی متوفی ۴۶۳ھ، تمہید، مطبوعہ مکتبہ القدوسیہ لاہور، ۱۴۰۴ھ، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ
۱۸۱- علامہ ابو الولید سلیمان بن خلف باجی مالکی اندلسی، متوفی ۴۷۴ھ، المنتقی، مطبوعہ مطبع السعادۃ مصر، ۱۳۳۲ھ
۱۸۲- علامہ ابو بکر محمد بن عبداللہ ابن العربی مالکی، متوفی ۵۴۳ھ، عارضۃ الاحوذی، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت
۱۸۳- قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴ھ، اکمال المعلم بہ فوائد مسلم، مطبوعہ دار الوفا بیروت، ۱۴۱۹ھ
۱۸۴- امام عبدالعظیم بن عبدالقوی منذری، متوفی ۶۵۶ھ، مختصر سنن ابوداؤد، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت
۱۸۵- علامہ ابو العباس احمد بن عمر ابراہیم القرطبی المالکی، المتوفی ۶۵۶ھ، المفہم، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت، ۱۴۱۷ھ
۱۸۶- علامہ یحییٰ بن شرف نووی، متوفی ۶۷۶ھ، شرح مسلم، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی، ۱۳۷۵ھ
۱۸۷- علامہ شرف الدین حسین بن محمد الطیبی، متوفی ۷۴۳ھ، شرح الطیبی، مطبوعہ ادارۃ القرآن، ۱۴۱۳ھ
۱۸۸- علامہ ابو عبداللہ محمد بن خلفہ وشتانی ابی مالکی، متوفی ۸۲۸ھ، اکمال اکمال المعلم، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ
۱۸۹- حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی، متوفی ۸۵۲ھ، فتح الباری، مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور
۱۹۰- حافظ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی، متوفی ۸۵۵ھ، عمدۃ القاری، مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر، ۱۳۴۸ھ
۱۹۱- علامہ محمد بن محمد سنوسی مالکی متوفی ۸۹۵ھ، مکمل اکمال المعلم، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ
۱۹۲- علامہ احمد قسطلانی، متوفی ۹۱۱ھ، ارشاد الساری، مطبوعہ مطبعہ میمنہ مصر، ۱۳۰۶ھ
۱۹۳- علامہ عبدالرؤف مناوی شافعی، متوفی ۱۰۰۳ھ، فیض القدیر، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ۱۳۹۱ھ، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ
۱۹۴- علامہ عبدالرؤف مناوی شافعی، متوفی ۱۰۰۳ھ، شرح الشمائل، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی
۱۹۵- علامہ علی بن سلطان محمد القاری، متوفی ۱۰۱۴ھ، جمع الوسائل، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی
۱۹۶- علامہ علی بن سلطان محمد القاری، متوفی ۱۰۱۴ھ، شرح مسند ابی حنیفہ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۵ھ

۱۹۷- علامہ علی بن سلطان محمد القاری، متوفی ۱۰۱۴ھ، مرقات، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، ۱۳۹۰ھ

۱۹۸- علامہ علی بن سلطان محمد القاری، متوفی ۱۰۱۴ھ، الحرز الثمین، مطبوعہ مطبعہ امیریہ مکہ مکرمہ، ۱۳۰۴ھ

۱۹۹- شیخ محمد بن علی بن محمد شوکانی، متوفی ۱۲۵۰ھ، تحفۃ الذاکرین، مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی و اولادہ مصر، ۱۳۵۰ھ

۲۰۰- شیخ عبدالحق محدث دہلوی، متوفی ۱۰۵۲ھ، اشعۃ اللمعات، مطبوعہ مطبع تیج کمار لکھنؤ

۲۰۱- شیخ عبدالرحمٰن مبارک پوری، متوفی ۱۳۲۵ھ، تحفۃ الاحوذی، مطبوعہ نشر السنہ ملتان، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۹ھ

۲۰۲- شیخ انور شاہ کشمیری، متوفی ۱۳۵۲ھ، فیض الباری، مطبوعہ مطبع حجازی مصر، ۱۳۵۷ھ

۲۰۳- شیخ شبیر احمد عثمانی، متوفی ۱۳۶۹ھ، فتح الملہم، مطبوعہ مکتبہ الحجاز کراچی

۲۰۴- شیخ محمد ادریس کاندھلوی، متوفی ۱۳۹۴ھ، التعلیق الصبیح، مطبوعہ مکتبہ عثمانیہ لاہور

کتب اسماء الرجال

۲۰۵- علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی جوزی متوفی ۵۹۷ھ، العلل المتناھیہ، مطبوعہ مکتبہ اثریہ فیصل آباد، ۱۴۰۱ھ

۲۰۶- حافظ جمال الدین ابوالحجاج یوسف مزی، ۷۴۲ھ، تہذیب الکمال، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ

۲۰۷- علامہ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی، متوفی ۷۴۸ھ، میزان الاعتدال، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۶ھ

۲۰۸- حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی، متوفی ۸۵۲ھ، تہذیب التہذیب، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

۲۰۹- حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی، متوفی ۸۵۲ھ، تقریب التہذیب، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

۲۱۰- علامہ شمس الدین محمد بن عبدالرحمان السخاوی، متوفی ۹۰۲ھ، المقاصد الحسنہ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

۲۱۱- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، اللآلی المصنوعہ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ

۲۱۲- علامہ محمد بن طولون متوفی ۹۵۳ھ، الشذرۃ فی الاحادیث المشتہرۃ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۳ھ

۲۱۳- علامہ محمد طاہر پٹنی، متوفی ۹۸۶ھ، تذکرۃ الموضوعات، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ

۲۱۴- علامہ علی بن سلطان محمد القاری، المتوفی ۱۰۱۴ھ، موضوعات کبیر، مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی

۲۱۵- علامہ اسماعیل بن محمد العجلونی، متوفی ۱۱۶۴ھ، کشف الخفاء و مزیل الالباس، مطبوعہ مکتبۃ الغزالی دمشق

۲۱۶- شیخ محمد بن علی شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ، الفوائد المجموعہ، مطبوعہ نزار مصطفیٰ ریاض

۲۱۷- علامہ عبدالرحمٰن بن محمد درویش متوفی ۱۲۷۶ھ، اسنی المطالب، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۲ھ

کتب لغت

۲۱۸- امام اللغۃ خلیل احمد فراہیدی، متوفی ۱۷۵ھ، کتاب العین، مطبوعہ انتشارات اسوہ ایران، ۱۴۱۴ھ

۲۱۹- علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری، متوفی ۳۹۸ھ، الصحاح، مطبوعہ دار العلم بیروت، ۱۴۰۴ھ

۲۲۰- علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی، متوفی ۵۰۲ھ، المفردات، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ

۲۲۱- علامہ محمود بن عمر زمخشری، متوفی ۵۸۳ھ، الفائق، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ
۲۲۲- علامہ محمد بن اثیر الجزری، متوفی ۶۰۶ھ، نہایہ، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ
۲۲۳- علامہ یحییٰ بن شرف نووی، متوفی ۶۷۶ھ، تہذیب الاسماء واللغات، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت
۲۲۴- علامہ جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور افریقی، متوفی ۷۱۱ھ، لسان العرب، مطبوعہ نشر ادب الحوزۃ، قم، ایران
۲۲۵- علامہ مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی، متوفی ۸۱۷ھ، القاموس المحیط، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت
۲۲۶- علامہ محمد طاہر پٹنی، متوفی ۹۸۶ھ، مجمع بحار الانوار، مطبوعہ مکتبہ دارالایمان المدینہ المنورہ، ۱۴۱۵ھ
۲۲۷- علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی، متوفی ۱۲۰۵ھ، تاج العروس، مطبوعہ المطبعہ الخیریہ مصر
۲۲۸- لوئیس معلوف الیسوعی، المنجد، مطبوعہ المطبعہ الکاثولیکیہ، بیروت، ۱۹۲۷ء
۲۲۹- شیخ غلام احمد پرویز، متوفی ۱۴۰۵ھ، لغات القرآن، مطبوعہ ادارہ طلوع اسلام لاہور
۲۳۰- ابو نعیم عبدالحکیم خان نشتر جالندھری، قائد اللغات، مطبوعہ حامد اینڈ کمپنی لاہور

کتب تاریخ، سیرت وفضائل

۲۳۱- امام محمد بن اسحاق، متوفی ۱۵۱ھ، کتاب السیر والمغازی، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۳۹۸ھ
۲۳۲- امام عبدالملک بن ہشام، متوفی ۲۱۳ھ، السیرۃ النبویہ، دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ
۲۳۳- امام محمد بن سعد، متوفی ۲۳۰ھ، الطبقات الکبریٰ، مطبوعہ دار صادر بیروت، ۱۳۸۸ھ، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ
۲۳۴- علامہ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی، المتوفی ۴۵۰ھ، اعلام النبوت، مطبوعہ داراحیاء العلوم بیروت، ۱۴۰۸ھ
۲۳۵- امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری، متوفی ۳۱۰ھ، تاریخ الامم والملوک، مطبوعہ دارالقلم بیروت
۲۳۶- حافظ ابو عمر و یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر، متوفی ۴۶۳ھ، الاستیعاب، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت
۲۳۷- قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی، متوفی ۵۴۴ھ، الشفاء، مطبوعہ عبدالتواب اکیڈمی ملتان، دارالفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ
۲۳۸- علامہ ابوالقاسم عبدالرحمن بن عبداللہ سہیلی، متوفی ۵۷۱ھ، الروض الانف، مکتبہ فاروقیہ ملتان
۲۳۹- علامہ عبدالرحمان بن علی جوزی، متوفی ۵۹۷ھ، الوفا، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر
۲۴۰- علامہ ابوالحسن علی بن ابی الکرم الشیبانی المعروف بابن الاثیر، متوفی ۶۳۰ھ، اسد الغابہ، مطبوعہ دارالفکر بیروت، دارالکتب العلمیہ بیروت
۲۴۱- علامہ ابوالحسن علی بن ابی الکرم الشیبانی المعروف بابن الاثیر، متوفی ۶۳۰ھ، الکامل فی التاریخ، مطبوعہ دارالکتب العربیہ بیروت
۲۴۲- علامہ شمس الدین احمد بن محمد بن ابی بکر بن خلکان، متوفی ۶۸۱ھ، وفیات الاعیان، مطبوعہ منشورات الشریف الرضی ایران
۲۴۳- علامہ علی بن عبدالکافی تقی الدین سبکی، متوفی ۷۴۶ھ، شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام، مطبوعہ کراچی
۲۴۴- حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر شافعی، متوفی ۷۷۴ھ، البدایہ والنہایہ، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۸ھ

۲۴۵- حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی، متوفی ۸۵۲ھ، الاصابہ، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت

۲۴۶- علامہ نور الدین علی بن احمد سمہودی، متوفی ۹۱۱ھ، وفاء الوفاء، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۱ھ

۲۴۷- علامہ احمد قسطلانی، متوفی ۹۱۱ھ، المواہب اللدنیہ، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۶ھ

۲۴۸- علامہ محمد بن یوسف الصالحی الشامی، متوفی ۹۴۲ھ، سبل الہدیٰ والرشاد، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ

۲۴۹- علامہ احمد بن حجر مکی شافعی، متوفی ۹۷۴ھ، الصواعق المحرقہ، مطبوعہ مکتبۃ القاہرہ، ۱۳۸۵ھ

۲۵۰- علامہ علی بن سلطان محمد القاری، متوفی ۱۰۱۴ھ، شرح الشفاء، مطبوعہ دارالفکر بیروت

۲۵۱- شیخ عبد الحق محدث دہلوی، متوفی ۱۰۵۲ھ، مدارج النبوت، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر

۲۵۲- علامہ احمد شہاب الدین خفاجی، متوفی ۱۰۶۹ھ، نسیم الریاض، مطبوعہ دارالفکر بیروت

۲۵۳- علامہ محمد عبد الباقی زرقانی، متوفی ۱۱۲۲ھ، شرح المواہب اللدنیہ، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۳۹۳ھ

۲۵۴- شیخ اشرف علی تھانوی، متوفی ۱۳۶۲ھ، نشر الطیب، مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی

کتب فقہ حنفی

۲۵۵- شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی، متوفی ۴۸۳ھ، المبسوط، مطبوعہ دارالمعرفہ، بیروت، ۱۳۹۸ھ

۲۵۶- شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی، متوفی ۴۸۳ھ، شرح سیر کبیر، مطبوعہ المکتبۃ الشورۃ الاسلامیہ افغانستان، ۱۴۰۵ھ

۲۵۷- علامہ طاہر بن عبد الرشید بخاری، متوفی ۵۴۲ھ، خلاصۃ الفتاویٰ، مطبوعہ امجد اکیڈمی لاہور، ۱۳۹۷ھ

۲۵۸- علامہ ابوبکر بن مسعود کاسانی، متوفی ۵۸۷ھ، بدائع الصنائع، مطبوعہ ایچ- ایم- سعید اینڈ کمپنی، ۱۴۰۰ھ، دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ

۲۵۹- علامہ حسین بن منصور اوزجندی، متوفی ۵۹۲ھ، فتاویٰ قاضی خاں، مطبوعہ مطبعہ کبریٰ بولاق مصر، ۱۳۱۰ھ

۲۶۰- علامہ ابو الحسن علی بن ابی بکر مرغینانی، متوفی ۵۹۳ھ، ہدایہ اولین و آخرین، مطبوعہ شرکت علمیہ ملتان

۲۶۱- علامہ محمد بن محمود بابرتی، متوفی ۷۸۶ھ، عنایہ، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ

۲۶۲- علامہ عالم بن العلاء انصاری دہلوی، متوفی ۷۸۶ھ، فتاویٰ تاتارخانیہ، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، ۱۴۱۱ھ

۲۶۳- علامہ ابوبکر بن علی حداد، متوفی ۸۰۰ھ، الجوہرۃ النیرہ، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان

۲۶۴- علامہ محمد شہاب الدین بن بزاز کردی، متوفی ۸۲۷ھ، فتاویٰ بزازیہ، مطبوعہ مطبع کبریٰ امیریہ بولاق مصر، ۱۳۱۰ھ

۲۶۵- علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی، متوفی ۸۵۵ھ، بنایہ، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۱ھ

۲۶۶- علامہ کمال الدین بن ہمام، متوفی ۸۶۱ھ، فتح القدیر، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ

۲۶۷- علامہ جلال الدین خوارزمی، کفایہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر

۲۶۸- علامہ معین الدین الہروی المعروف بہ محمد ملا مسکین، متوفی ۹۵۴ھ، شرح الکنز، مطبوعہ جمعیۃ المعارف المصریہ مصر

۲۶۹- علامہ ابراہیم بن محمد حلبی، متوفی ۹۵۶ھ، غنیۃ المستملی، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۴۱۲ھ

۲۷۰- علامہ محمد خراسانی، متوفی ۹۶۲ھ، جامع الرموز، مطبوعہ مطبع منشی نوا لکشور، ۱۲۹۱ھ

۲۷۱- علامہ زین الدین بن نجیم، متوفی ۹۷۰ھ، البحر الرائق، مطبوعہ مطبعہ علمیہ مصر ۱۳۱۱ھ

۲۷۲- علامہ حامد بن علی قونوی رومی، متوفی ۹۸۵ھ، الفتاوی حامدیہ، مطبوعہ مطبعہ میمنہ مصر ۱۳۱۰ھ

۲۷۳- علامہ ابو السعود محمد بن محمد عمادی، متوفی ۹۸۲ھ، حاشیہ ابو السعود علی ملا مسکین، مطبوعہ جمعیۃ المعارف المصریہ مصر، ۱۲۸۷ھ

۲۷۴- علامہ خیر الدین رملی، متوفی ۱۰۸۱ھ، الفتاوی خیریہ، مطبوعہ مطبعہ میمنہ مصر ۱۳۱۰ھ

۲۷۵- علامہ علاء الدین محمد بن علی بن محمد حصکفی، متوفی ۱۰۸۸ھ، الدر المختار، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

۲۷۶- علامہ سید احمد بن محمد حموی، متوفی ۱۰۹۸ھ، غمز عیون البصائر، مطبوعہ دار الکتاب العربیہ بیروت، ۱۴۰۷ھ

۲۷۷- ملا نظام الدین متوفی ۱۱۶۱ھ، فتاوی عالم گیری، مطبوعہ مطبع کبری امیریہ بولاق مصر ۱۳۱۰ھ

۲۷۸- علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی، متوفی ۱۲۵۲ھ، منحۃ الخالق، مطبوعہ مطبعہ علمیہ مصر ۱۳۱۱ھ

۲۷۹- علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی، متوفی ۱۲۵۲ھ، تنقیح الفتاوی الحامدیہ، مطبوعہ دار الاشاعۃ العربیہ کوئٹہ

۲۸۰- علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی، متوفی ۱۲۵۲ھ، رسائل ابن عابدین، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۳۹۶ھ

۲۸۱- علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی، متوفی ۱۲۵۲ھ، رد المحتار، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ، ۱۴۱۹ھ

۲۸۲- امام احمد رضا قادری، متوفی ۱۳۴۰ھ، جد الممتار، مطبوعہ ادارہ تحقیقات احمد رضا کراچی

۲۸۳- امام احمد رضا قادری، متوفی ۱۳۴۰ھ، فتاوی رضویہ، مطبوعہ مکتبہ رضویہ کراچی

۲۸۴- امام احمد رضا قادری، متوفی ۱۳۴۰ھ، فتاوی افریقیہ، مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی

۲۸۵- علامہ امجد علی، متوفی ۱۳۷۶ھ، بہار شریعت، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز کراچی

۲۸۶- شیخ ظفر احمد عثمانی تھانوی متوفی ۱۳۹۴ھ، اعلاء السنن مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ

۲۸۷- علامہ نور اللہ نعیمی، متوفی ۱۴۰۳ھ، فتاوی نوریہ، مطبوعہ کمبائن پرنٹرز لاہور، ۱۹۸۳ء

کتب فقہ شافعی

۲۸۸- امام محمد بن ادریس شافعی، متوفی ۲۰۴ھ، الام، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۳ھ

۲۸۹- علامہ ابو الحسین علی بن محمد حبیب ماوردی شافعی، متوفی ۴۵۰ھ، الحاوی الکبیر، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ

۲۹۰- علامہ ابو اسحاق شیرازی، متوفی ۴۵۵ھ، المہذب، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ۱۳۹۳ھ

۲۹۱- امام محمد بن محمد غزالی، متوفی ۵۰۵ھ، احیاء علوم الدین، مطبوعہ دار الخیر بیروت، ۱۴۱۳ھ، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ

۲۹۲- علامہ یحییٰ بن شرف نووی، متوفی ۶۷۶ھ، شرح المہذب، مطبوعہ دار الفکر بیروت

۲۹۳- علامہ یحییٰ بن شرف نووی، متوفی ۶۷۶ھ، روضۃ الطالبین، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۴۰۵ھ

۲۹۴- علامہ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، الحاوی للفتاوی، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ، فیصل آباد

۲۹۵- علامہ شمس الدین محمد بن ابی العباس رملی متوفی ۱۰۰۴ھ، نہایۃ المحتاج، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ

۲۹۶- علامہ ابو الضیاء علی بن علی شبراملسی، متوفی ۱۰۸۷ھ، حاشیہ ابو الضیاء علی نہایۃ المحتاج، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

کتب فقہ مالکی

۲۹۷۔ امام سحنون بن سعید تنوخی مالکی، متوفی ۲۵۶ھ، المدونۃ الکبریٰ، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت
۲۹۸۔ قاضی ابو الولید محمد بن احمد بن رشد مالکی اندلسی، متوفی ۵۹۵ھ، بدایۃ المجتہد، مطبوعہ دار الفکر بیروت
۲۹۹۔ علامہ خلیل بن اسحاق مالکی، متوفی ۷۶۷ھ، مختصر خلیل، مطبوعہ دار صادر بیروت
۳۰۰۔ علامہ ابو عبد اللہ محمد بن محمد الحطاب المغربی، المتوفی ۹۵۴ھ، مواہب الجلیل، مطبوعہ مکتبہ النجاح، لیبیا
۳۰۱۔ علامہ علی بن عبد اللہ بن الخرشی المتوفی ۱۱۰۱ھ، الخرشی علی مختصر خلیل، مطبوعہ دار صادر بیروت
۳۰۲۔ علامہ ابو البرکات احمد دردیر مالکی، متوفی ۱۱۹۷ھ، الشرح الکبیر، مطبوعہ دار الفکر بیروت
۳۰۳۔ علامہ شمس الدین محمد بن عرفہ دسوقی، متوفی ۱۲۱۹ھ، حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر، مطبوعہ دار الفکر بیروت

کتب فقہ حنبلی

۳۰۴۔ علامہ موفق الدین عبد اللہ بن احمد بن قدامہ، متوفی ۶۲۰ھ، المغنی، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۵ھ
۳۰۵۔ علامہ موفق الدین عبد اللہ بن احمد بن قدامہ، متوفی ۶۲۰ھ، الکافی، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ
۳۰۶۔ شیخ ابو العباس تقی الدین بن تیمیہ، متوفی ۷۲۸ھ، مجموعۃ الفتاویٰ، مطبوعہ ریاض، مطبوعہ دار الجیل بیروت، ۱۴۱۸ھ
۳۰۷۔ علامہ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن فتاح مقدسی، متوفی ۷۶۳ھ، کتاب الفروع، مطبوعہ عالم الکتب بیروت
۳۰۸۔ علامہ ابو الحسین علی بن سلیمان مرداوی، متوفی ۸۸۵ھ، الانصاف، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت
۳۰۹۔ علامہ موسیٰ بن احمد صالحی متوفی ۹۶۰ھ، کشاف القناع، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ

کتب شیعہ

۳۱۰۔ نہج البلاغہ (خطبات حضرت علی رضی اللہ عنہ) مطبوعہ ایران و مطبوعہ کراچی
۳۱۱۔ شیخ ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی، متوفی ۳۲۹ھ، الاصول من الکافی، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ تہران
۳۱۲۔ شیخ ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی، متوفی ۳۲۹ھ، الفروع من الکافی، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ تہران
۳۱۳۔ شیخ ابو منصور احمد بن علی الطبرسی من القرن السادس، الاحتجاج، مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات بیروت، ۱۴۰۳ھ
۳۱۴۔ شیخ کمال الدین میثم بن علی بن میثم البحرانی المتوفی ۶۷۹ھ، شرح نہج البلاغہ، مطبوعہ مؤسسۃ النصر ایران
۳۱۵۔ ملا باقر بن محمد تقی مجلسی، متوفی ۱۱۱۰ھ، حق الیقین، مطبوعہ خیابان ناصر خسرو ایران، ۱۳۴۷ھ
۳۱۶۔ ملا باقر بن محمد تقی مجلسی، متوفی ۱۱۱۰ھ، حیات القلوب، مطبوعہ کتاب فروشے اسلامیہ تہران
۳۱۷۔ ملا باقر بن محمد تقی مجلسی، متوفی ۱۱۱۰ھ، جلاء العیون، مطبوعہ کتاب فروشے اسلامیہ تہران

کتب عقائد و کلام

۳۱۸۔ امام محمد بن محمد غزالی، متوفی ۵۰۵ھ، المنقذ من الضلال، مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۵ھ

۳۱۹۔ علامہ ابو البرکات عبد الرحمان بن محمد الانباری، المتوفی ۵۷۷ھ، الداعی الی الاسلام، مطبوعہ دار البشائر الاسلامیہ بیروت، ۱۴۰۹ھ

۳۲۰۔ شیخ احمد بن عبد الحلیم بن تیمیہ، متوفی ۷۲۸ھ، العقیدۃ الواسطیہ، مطبوعہ دار السلام ریاض، ۱۴۱۴ھ

۳۲۱۔ علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی، متوفی ۷۹۱ھ، شرح عقائد نسفی، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی

۳۲۲۔ علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی، متوفی ۷۹۱ھ، شرح المقاصد، مطبوعہ منشورات الشریف الرضی ایران

۳۲۳۔ علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی، متوفی ۸۱۶ھ، شرح المواقف، مطبوعہ منشورات الشریف الرضی ایران

۳۲۴۔ علامہ کمال الدین بن ہمام، متوفی ۸۶۱ھ، مسایرہ، مطبوعہ مطبعہ السعادۃ مصر

۳۲۵۔ علامہ کمال الدین محمد بن محمد المعروف بابن ابی الشریف الشافعی، المتوفی ۹۰۶ھ، مسامرہ، مطبوعہ مطبعہ السعادۃ مصر

۳۲۶۔ علامہ علی بن سلطان محمد القاری المتوفی ۱۰۱۴ھ، شرح فقہ اکبر، مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی واولادہ مصر، ۱۳۷۵ھ

۳۲۷۔ علامہ محمد بن احمد السفارینی، المتوفی ۱۱۸۸ھ، لوامع الانوار البہیہ، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۴۱۱ھ

۳۲۸۔ علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، متوفی ۱۳۶۷ھ، کتاب العقائد، مطبوعہ تاجدار حرم پبلشنگ کمپنی کراچی

کتب اصول فقہ

۳۲۹۔ امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی، متوفی ۶۰۶ھ، المحصول، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ

۳۳۰۔ علامہ علاء الدین عبد العزیز بن احمد البخاری، المتوفی ۷۳۰ھ، کشف الاسرار، مطبوعہ دار الکتاب العربی، ۱۴۱۱ھ

۳۳۱۔ علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی، متوفی ۷۹۱ھ، توضیح و تلویح، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی

۳۳۲۔ علامہ کمال الدین محمد بن عبد الواحد الشہیر بابن ہمام، متوفی ۸۶۱ھ، التحریر مع التیسیر، مطبوعہ مکتبہ المعارف ریاض

۳۳۳۔ علامہ محب اللہ بہاری، متوفی ۱۱۱۹ھ، مسلم الثبوت، مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ

۳۳۴۔ علامہ احمد جونپوری، متوفی ۱۱۳۰ھ، نور الانوار، مطبوعہ ایچ۔ایم۔سعید اینڈ کمپنی کراچی

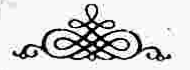
۳۳۵۔ علامہ عبد الحق خیر آبادی، متوفی ۱۳۱۸ھ، شرح مسلم الثبوت، مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ

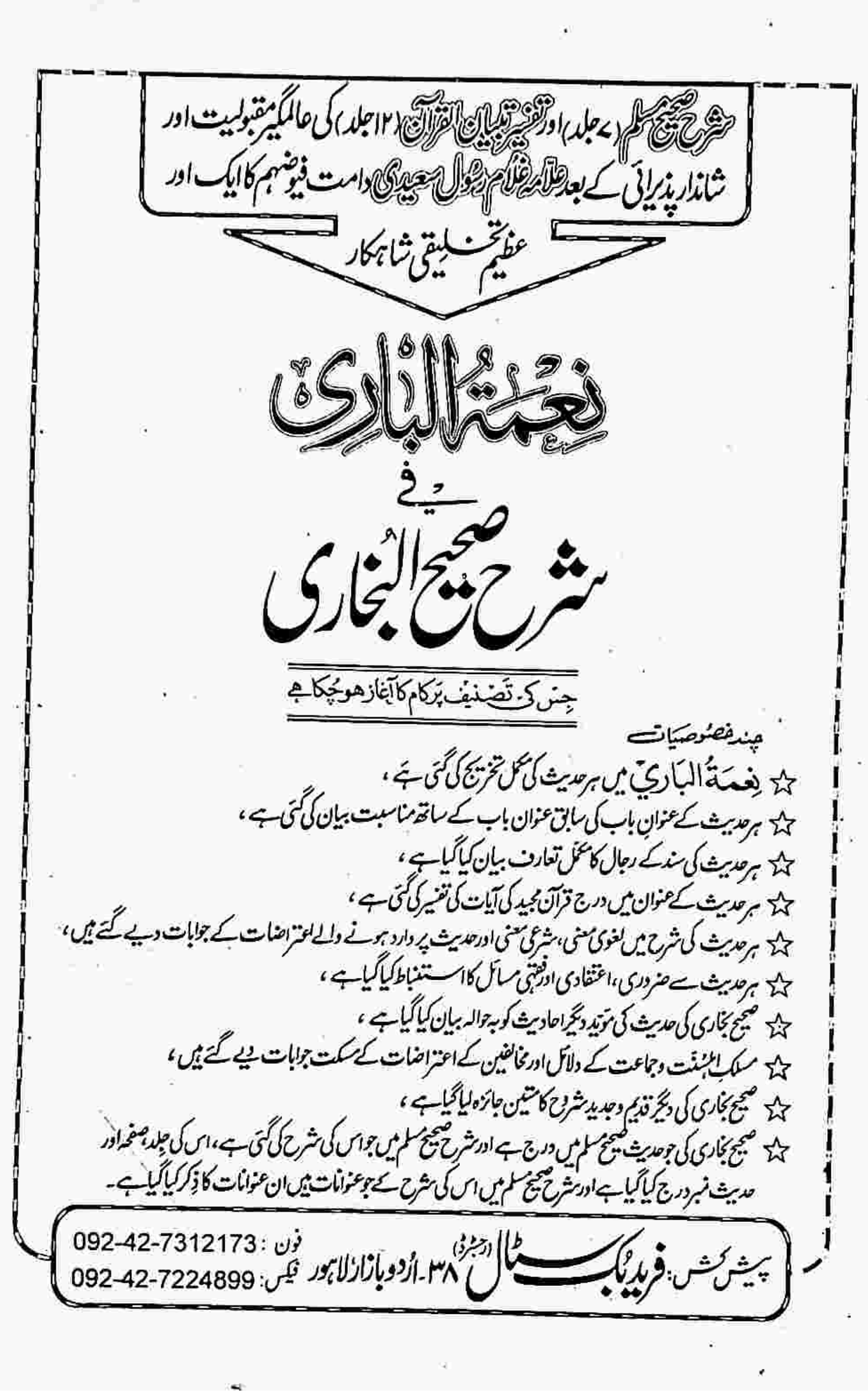
کتب متفرقہ

۳۳۶۔ شیخ ابو طالب محمد بن الحسن المکی المتوفی ۳۸۶ھ، قوت القلوب، مطبوعہ مطبعہ میمنہ مصر، ۱۳۰۶ھ

۳۳۷۔ امام محمد بن محمد غزالی، متوفی ۵۰۵ھ، احیاء علوم الدین، مطبوعہ دار الخیر بیروت، ۱۴۱۳ھ

۳۳۸۔ علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی، متوفی ۶۶۸ھ، التذکرہ، مطبوعہ دار البخاریہ مدینہ منورہ، ۱۴۱۷ھ
۳۳۹۔ شیخ تقی الدین احمد بن تیمیہ حنبلی، متوفی ۷۲۸ھ، قاعدہ جلیلہ، مطبوعہ مکتبہ قاہرہ مصر، ۱۳۷۳ھ
۳۴۰۔ علامہ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی، متوفی ۷۴۸ھ، الکبائر، مطبوعہ دار الغد العربی قاہرہ، مصر
۳۴۱۔ شیخ شمس الدین محمد بن ابی بکر ابن القیم جوزیہ متوفی ۷۵۱ھ، جلاء الافہام، مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت، ۱۴۱۷ھ
۳۴۲۔ علامہ عبد اللہ بن اسد یافعی، متوفی ۷۶۸ھ، روض الریاحین، مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی واولادہ مصر، ۱۳۷۴ھ
۳۴۳۔ علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی، متوفی ۸۱۶ھ، کتاب التعریفات، مطبوعہ المطبعہ الخیریہ مصر، ۱۳۰۶ھ، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ
۳۴۴۔ حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، شرح الصدور، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۴ھ
۳۴۵۔ علامہ ابن حجر مکی، متوفی ۹۷۴ھ، فتاویٰ حدیثیہ، مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی واولادہ مصر، ۱۳۵۶ھ
۳۴۶۔ علامہ عبد الوہاب شعرانی متوفی ۹۷۳ھ، المیزان الکبریٰ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ
۳۴۷۔ علامہ عبد الوہاب شعرانی متوفی ۹۷۳ھ، الیواقیت والجواہر، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۸ھ
۳۴۸۔ علامہ احمد بن حجر ہیتمی مکی، متوفی ۹۷۴ھ، الصواعق المحرقہ، مطبوعہ مکتبہ القاہرہ، ۱۳۸۵ھ
۳۴۹۔ علامہ احمد بن حجر ہیتمی مکی، متوفی ۹۷۴ھ، الزواجر، مطبوعہ د ر الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ
۳۵۰۔ امام احمد سرہندی مجدد الف ثانی، متوفی ۱۰۳۴ھ، مکتوبات امام ربانی، مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی، ۱۳۷۰ھ
۳۵۱۔ علامہ سید محمد بن محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی، متوفی ۱۲۰۵ھ، اتحاف سادۃ المتقین، مطبوعہ مطبعہ میمنہ مصر، ۱۳۱۱ھ
۳۵۲۔ شیخ رشید احمد گنگوہی، متوفی ۱۳۲۳ھ، فتاویٰ رشیدیہ کامل، مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی
۳۵۳۔ علامہ مصطفیٰ بن عبد اللہ الشہیر بحاجی خلیفہ، کشف الظنون، مطبوعہ مطبعہ اسلامیہ طہران، ۱۳۷۸ھ
۳۵۴۔ امام احمد رضا قادری، متوفی ۱۳۴۰ھ، الملفوظ، مطبوعہ نوری کتب خانہ لاہور، مطبوعہ فرید بک سٹال، لاہور
۳۵۵۔ شیخ وحید الزمان، متوفی ۱۳۳۸ھ، ہدیۃ المہدی، مطبوعہ میور پریس دہلی، ۱۳۲۵ھ
۳۵۶۔ علامہ یوسف بن اسماعیل النبہانی، متوفی ۱۳۵۰ھ، جواہر البحار، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ
۳۵۷۔ شیخ اشرف علی تھانوی، متوفی ۱۳۶۲ھ، بہشتی زیور، مطبوعہ ناشران قرآن لمیٹڈ لاہور
۳۵۸۔ شیخ اشرف علی تھانوی، متوفی ۱۳۶۲ھ، حفظ الایمان، مطبوعہ مکتبہ تھانوی کراچی
۳۵۹۔ علامہ عبد الحکیم شرف قادری نقشبندی، نداء یا رسول اللہ، مطبوعہ مرکزی مجلس رضا لاہور، ۱۴۰۵ھ





شرح صحیح مسلم (۷ جلد) اور تفسیر تبیان القرآن (۱۲ جلد) کی عالمگیر مقبولیت اور
شاندار پذیرائی کے بعد علامہ غلام رسول سعیدی دامت فیوضہم کا ایک اور
عظیم تخلیقی شاہکار
نِعمۃُ البارِی
فِی
شرحِ صحیح البُخاری
جس کی تصنیف پر کام کا آغاز ہو چکا ہے
چند خصوصیات
☆ نِعمَۃُ البَارِي میں ہر حدیث کی مکمل تخریج کی گئی ہے،
☆ ہر حدیث کے عنوانِ باب کی سابق عنوان باب کے ساتھ مناسبت بیان کی گئی ہے،
☆ ہر حدیث کی سند کے رجال کا مکمل تعارف بیان کیا گیا ہے،
☆ ہر حدیث کے عنوان میں درج قرآن مجید کی آیات کی تفسیر کی گئی ہے،
☆ ہر حدیث کی شرح میں لغوی معنی، شرعی معنی اور حدیث پر وارد ہونے والے اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہیں،
☆ ہر حدیث سے ضروری، اعتقادی اور فقہی مسائل کا استنباط کیا گیا ہے،
☆ صحیح بخاری کی حدیث کی مؤید دیگر احادیث کو بہ حوالہ بیان کیا گیا ہے،
☆ مسلکِ اہلسنت وجماعت کے دلائل اور مخالفین کے اعتراضات کے مسکت جوابات دیے گئے ہیں،
☆ صحیح بخاری کی دیگر قدیم وجدید شروح کا متین جائزہ لیا گیا ہے،
☆ صحیح بخاری کی جو حدیث صحیح مسلم میں درج ہے اور شرح صحیح مسلم میں جو اس کی شرح کی گئی ہے، اس کی جلد، صفحہ اور
حدیث نمبر درج کیا گیا ہے اور شرح صحیح مسلم میں اس کی شرح کے جو عنوانات ہیں ان عنوانات کا ذکر کیا گیا ہے۔
پیش کش: فرید بک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸۔ اردو بازار لاہور
فون: 092-42-7312173
فیکس: 092-42-7224899